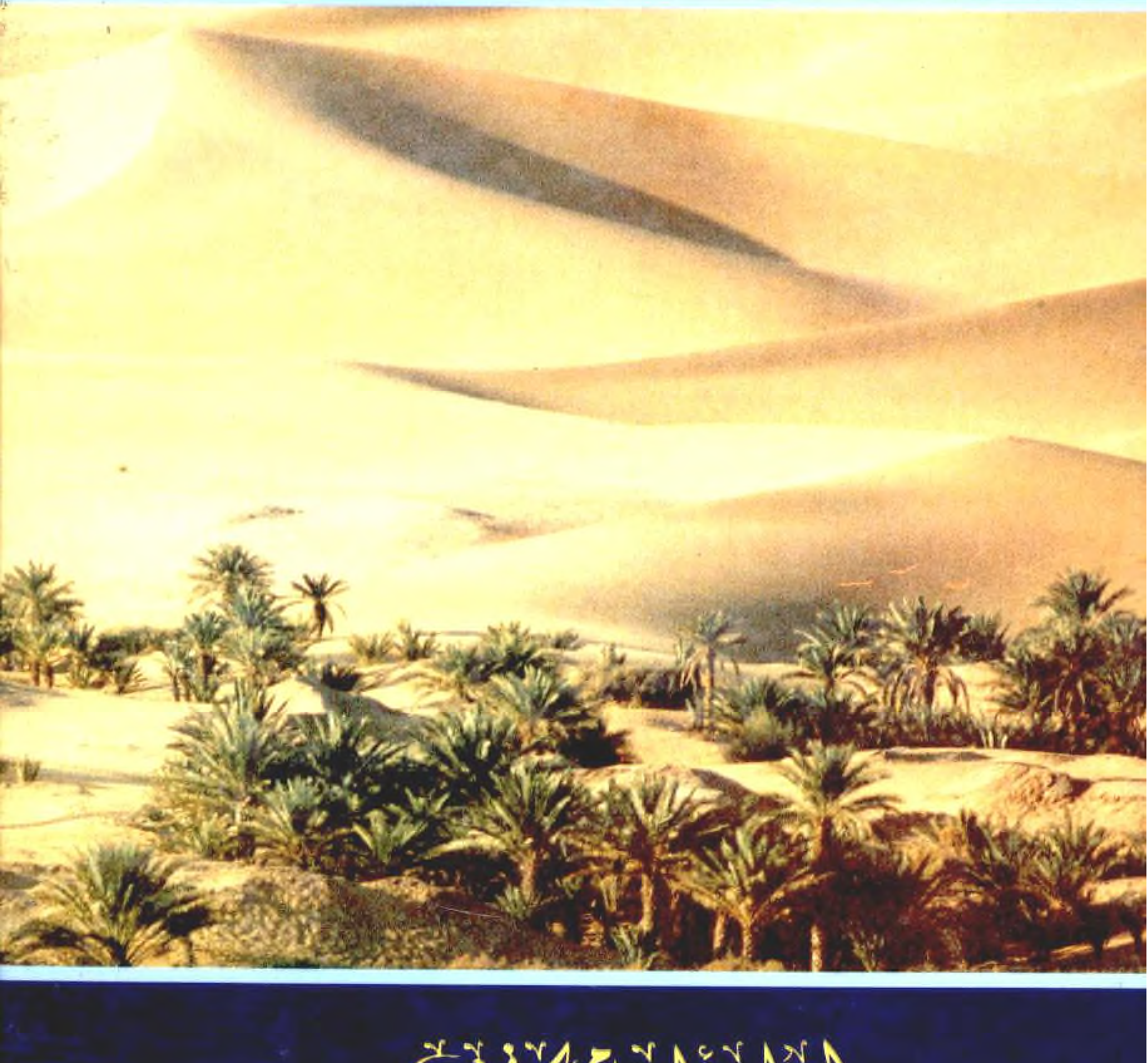
جلد اوّل

سیرت انبیائے کرام علیہم السلام

ابو البشر سیدنا آدم علیہ السلام تا حضرۃ سیدنا شموئیل علیہ السلام



ادارہ اسلامیات

لاہور — کراچی

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ

ہدایت کے چراغ

جلد ۱

یعنی

سیرت انبیائے کرام علیہم السلام

ابو البشر سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و دعوت تک تمام انبیائے کرام کے حالات و واقعات۔ قرآن کریم میں بیان کردہ قصص۔ قدیم اقوام اور سابقہ امتوں کا مستند تذکرہ۔ قرآن وحدیث کے اوراق سے سلیس زبان اور عام فہم انداز میں

ابو البشر سیدنا آدم علیہ السلام تا حضرت سیدنا شموئیل علیہ السلام

تألیف: مولانا محمد عبد الرحمٰن صاحب

استاذ حدیث وتفسیر، ناظم مجلس علمیہ حیدر آباد دکن

ناشر

ادارۂ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور ۲

طباعت اوّل : ربیع الاوّل ۱۴۱۱ھ

: اکتوبر ۱۹۹۰ء

باہتمام : اشرف برادران سلّمہم الرحمان

ناشر : ادارہ اسلامیات، لاہور

مطبع : عرفان افضل پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت :

ادارہ اسلامیات
پبلشرز۔ بک سیلرز۔ ایکسپورٹرز

دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور۔ فون [illegible]

۱۹۰ انارکلی، لاہور۔ پاکستان۔ فون [illegible]

موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی۔ فون [illegible]

ملنے کے پتے

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی، لاہور ۲

دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی ۱

ادارۃ المعارف۔ دارالعلوم کورنگی، کراچی

مکتبہ دارالعلوم۔ دارالعلوم کورنگی، کراچی

فہرست عناوین

تقریظ

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم، ناظم مدارس دعوۃ الحق ہردوئی۔ (یو،پی)

مکرم و محترم مولوی عبد الرحمٰن صاحب زید لطفہ السامی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

آپکی مولفہ کتاب "ہدایت کے چراغ" کی جلد اوّل کا مطالعہ اور اس سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا اُس بات سے بہت مسرت ہوئی کہ آپ نے آیاتِ قرآنی اور احادیثِ شریفہ کی روایاتِ معتبرہ پر حالاتِ حضرات انبیاء کرام کو مدار رکھا نیز اسکے ساتھ ساتھ جن مقامات پر کوئی اشکال یا سوال پیدا ہوتا ہے انکا مفصل اور تحقیقی جواب بھی لکھا گیا ہے۔ کتاب کے مضامین کے لحاظ سے جی چاہتا ہے کہ انکا خلاصہ ایسے طور پر ہوجاوے کہ حضرات انبیاء کرام کے قرآنی حالات جو قرآن پاک میں ہیں نیز انکے بارے میں جو سوال اور اشکال ہے انکا جواب بھی ہوجاوے۔ اس سے امت مسلمہ کے بچوں اور دینی مدارس کے طلبہ کو بھی زیادہ نفع کی توقع ہے۔ یہ ناکارہ دعا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسکو قبول فرمائے اور آپکو اسکی جزائے خیر عطا فرماوے اور امت مسلمہ کو اس سے نفع اُٹھانے کی توفیق عطا فرماوے۔

(حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب) بقلم (قاری) امیر حسن۔

تقریظ

لسانِ مثنوی مولانا حکیم محمد اختر صاحب مدظلہٗ ناظم مجلس اشاعت الحق گلشن اقبال ۲ کراچی۔ پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔

ہمارے محترم ومخلص مولانا عبد الرحمٰن صاحب زید لطفہٗ نے اپنی کتاب مسمّٰی "ہدایت کے چراغ" دو جلدوں میں ترتیب دی ہے۔ موصوف کی اس تالیف کا حصہ اوّل دیدہ زیب حسن طباعت سے آراستہ ہوکر منصۂ شہود میں آچکا ہے۔ اس مطبوعہ حصہ کو جہاں سے بھی دیکھا اس شعر کا مصداق پایا۔

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم ☆ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اسلوب بیاں کی دلکشی، مضامین کی معیاری بلندی اور ہر موضوع کا مدلل افادہ باوجود تعب اور ضعف کے دیر تک مطالعہ کرتا رہا۔ قلب متاثر ہوتا گیا تھا اس کتاب کی نافعیت علمیہ اور عملیہ کا معتقد ہوا اور قرآن پاک کے معجزانہ انداز کے عبرتناک واقعات اور انبیاء علیہم السلام کی پیغمبرانہ تعلیمات اور نافرمان قوموں کی طاغوتی طاقتوں کی تباہ کاریاں، قہر خداوندی کی دہشت خیز عذابوں کی تفصیلات سے ایمان کو تازگی، روح میں بالیدگی اور نفس میں افتادگی اور بندگی کی جو شان پیدا ہوتی ہے وہ اس کتاب "ہدایت کے چراغ" سے آفتاب روشن کی طرح واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو شرفِ حسن قبول بخشے اور صدقہ جاریہ بنائے، امتِ مسلمہ کیلئے "ہدایت کا چراغ" بنائے۔ آمین۔

العارض محمد اختر عفا اللہ تعالیٰ عنہ نزیل جدہ ۵ راگست ۱۹۸۹ء مطابق ۴ محرم ۱۴۱۰ھ

مآخذ و مراجع

(تفسیر، حدیث، تاریخ و سیرت)

(قرآن)

(۱) قرآن حکیم (مطبوعہ تاج کمپنی کراچی)
(۲) تفسیر دُرِّ منثور
(۳) تفسیر ابنِ کثیر
(۴) تفسیر جلالین
(۵) تفسیر ابن جریر طبری (جامع البیان)
(۶) تفسیر روح المعانی
(۷) تفسیر مظہری
(۸) تفسیر قرطبی
(۹) تفسیر بیان القرآن
(۱۰) تفسیر معارف القرآن
(۱۱) تفسیر ماجدی
(۱۲) ترجمہ قرآن شاہ عبد القادر صاحبؒ
(۱۳) ترجمہ قرآن شاہ رفیع الدین صاحبؒ
(۱۴) ترجمہ قرآن شیخ الہند مولنا محمود الحسن صاحبؒ
(۱۵) ترجمہ قرآن مولنا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ
(۱۶) ترجمہ قرآن مولنا اشرف علی صاحب تھانویؒ
(۱۷) ترجمہ قرآن مولنا عبد الماجد صاحب دریاآبادی

(حدیث)

(۱) بخاری شریف
(۲) مسلم شریف
(۳) ترمذی شریف
(۴) ابوداؤد شریف
(۵) نسائی شریف
(۶) ابن ماجہ شریف
(۷) مؤطا امام مالک
(۸) مرقات شرح مشکوٰۃ
(۹) فتح الباری
(۱۰) عینی شرح بخاری

(تاریخ و سیرت)

(۱) قصص القرآن مولنا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
(۲) قصص الانبیاء۔ ابن کثیر
(۳) قصص الانبیاء۔ عبد الوہاب نجارؒ
(۴) تاریخ ابن کثیر
(۵) ارض القرآن۔ مولنا سلیمان ندویؒ
(۶) البدایہ والنہایہ
(۷) سیرت ابن ہشام
(۸) اُسد الغابہ
(۹) زرقانی
(۱۰) زاد المعاد
(۱۱) سیرت المصطفٰے
(۱۲) روض الانف علامہ سُہیلی

ابوالحسن علی الحسنی الندوی

مولانا محمد عبدالرحمن صاحب
مؤلف کتاب ہٰذا کا خصوصی عربی تعارف جو ایک موقع پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے مکۃ المکرمہ میں حاصل کیا گیا تھا۔ ترجمہ درج ذیل ہے:-

بعد حمد وصلوٰۃ :-

حضرت مولانا عبدالرحمن بن احمد شریف صاحب حیدرآبادی سے میں بخوبی واقف ہوں، مولانا علوم دینی واسلامی کے فاضل ہیں۔ جنوبی ہند کے دینی وعلمی حلقوں میں آپ کی بیش بہا خدمات رہی ہیں۔ مولانا نے ہندوستان کے مختلف اداروں سے استفادہ کیا ہے۔ آخر میں مدرسہ مظاہر علوم ضلع سہارنپور (یوپی) سے علوم دینیہ کی تکمیل کی اور اصولِ دین وعلم شریعت میں اعلیٰ سندیں حاصل کیں تحصیل علم کے بعد جامعہ نظامیہ حیدرآباد میں تقریباً پندرہ سال درس وتدریس کے خدمات انجام دی ہیں۔ اسکے علاوہ مولانا موصوف نے عامۃ المسلمین کی تعلیم وتربیت کی جانب بھی خصوصی توجہ دی۔ اس سلسلے میں اہل علم حضرات کیلئے "مجلس علمیہ" کی تاسیس رکھی جس کا دینی وعلمی حلقوں میں اثر رہا ہے۔

چونکہ مولانا توحید وسنت کے داعی وعلمبردار تھے اپنے شہر میں اہل بدعت کی مخالفتوں سے دوچار ہوگئے۔ اسی سال موصوف نے فریضۂ حج ادا کیا اور ان کی خواہش ہے کہ کچھ عرصہ انہی مقاماتِ مقدسہ میں رہ کر علمی ودینی خدمت انجام دیں۔ چنانچہ انہیں اس مقصد کے حصول کے لئے تعاون کی ضرورت ہے۔

مجھے اس بات سے خوشی ہوگی کہ مولانا کے مقصد کی تکمیل ہو۔ اِس بارے میں جو بھی اِن کے ساتھ معاونت کریں میں اُن کا شکرگذار رہوں گا۔

والسلام

کتبہٗ الفقیر الی اللہ

ابوالحسن علی الحسنی الندوی

مکۃ المکرمہ
۳ر صفر ۱۳۹۰ھ

پیشِ لفظ
قرآنِ حکیم اور لسانِ نبوّت

قرآنِ حکیم میں اگلی اور پچھلی قوموں کے حالات مذکور ہیں۔
اسمیں تمہارے فیصلہ جات بھی موجود ہیں۔
یہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والی کتاب ہے۔ مذاق و دل لگی پر مشتمل نہیں۔
جو اس کے خلاف بغاوت کریگا اللہ تعالیٰ اسکو تباہ و برباد کر دے گا۔ اور جو کوئی اسکو چھوڑ کر کسی اور کتاب سے ہدایت و رہنمائی طلب کرے گا اللہ تعالیٰ اسکو گمراہ کر دیگا۔
یہ اللہ عظیم کی مضبوط رسی ہے۔
یہ ذکرِ حکیم اور صراطِ مستقیم ہے۔
اس کے پڑھنے سے خیالات میں بے راہ روی نہیں آتی اور نہ ہی اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔
علم والے اِسکی تلاوت سے سیر نہیں ہوتے ہیں۔
بار بار کی تلاوت سے اُکتاہٹ اور ملال نہیں ہوتا۔
یہ وہی کتاب ہے جسکو جنات نے سُنا تو بے اختیار پکار اُٹھے :۔
اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا الخ (سورہ الجن آیت ۱)
(ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے ..... اور اُسپر ایمان لائے ہیں)
"جو شخص قرآن کے مطابق بات کرے گا وہ سچائی پر قائم رہیگا اور جو اسپر عمل کرے گا وہ اجر پائے گا اور جو اس کے مطابق فیصلہ کرے گا وہ عدل و انصاف کا فیصلہ دے گا اور جس نے اسکی جانب دعوت دی وہ صراطِ مستقیم پر قائم رہا۔" (ترمذی جلد ۲)

اللہ کریم کی بڑی رحمت و عنایت ہے کہ اُس نے انسانی ہدایت و رہنمائی کیلئے آئینی اور فوجداری طرزِ خطاب اختیار نہیں کیا جس میں مرضیات اور نامرضیات کی طویل فہرست ہوتی ہے جیسا کہ حکومت و سلطنت کے آئینی دفعات و قوانین ہوا کرتے ہیں۔

اگرچہ اللہ عظیم کی حاکمانہ و قاہرانہ ذاتِ عالی ہر طرح سزاوار ہے کہ وہ زمین پر اپنی مرضیات اور نامرضیات کا دستور دفعات کی شکل میں نافذ کرے۔ لیکن اُسکے فضل و کرم، احسان و عنایت، جود و سخا رحمت و رأفت نے انسانی رہنمائی اور ہدایت کے لئے اپنی کتابِ مُبین میں آئینی اور فوجداری دفعات کا طرز اختیار نہیں کیا بلکہ وعظ و نصیحت، درس و عبرت، شفقت و محبّت کا عنوان اختیار کیا ہے:۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔

(القمر آیت ۱۷)

(ہم نے قرآن کو نصیحت و عبرت کے لئے بہت آسان کر دیا ہے، پھر کیا کوئی نصیحت قبول کرنے والا ہے)

قرآن حکیم میں وعظ و نصیحت، دعوت و تبلیغ، درس و عبرت کے عموماً چار عنوان اختیار کئے گئے ہیں جنکے ذریعہ انسانیت کو رشد و ہدایت کا راستہ فراہم کیا گیا ہے:۔

(۱) تذکیر بآلآءِ اللہ
(۲) تذکیر بأیّامِ اللہ
(۳) تذکیر بآیاتِ اللہ
(۴) تذکیر بمَا بَعدَ الموت۔

(۱) تذکیر بآلآءِ اللہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر دن رات جن نعمتوں کی ارزانی فرمائی ہے اُن کو یاد دلا کر اپنی اطاعت و شکر گزاری کا فریضہ یاد دلایا جائے کہ جس ذاتِ کریم کے ایسے ایسے کرم و احسان ہوں اُس کو کیوں کر بھولا جا سکتا ہے۔

فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

(اعراف آیت ۶۹، ۷۴)

(اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ)

(۲) تذکیر بأیّامِ اللہ کا یہ مطلب ہے کہ اقوام سابقہ اور مِلل قدیمہ کے حالات اور اُن کے

عروج و زوال کا تذکرہ کرکے نصیحت و عبرت فراہم کی جائے تاکہ موجودہ قومیں اُن حوادث سے دوچار نہ ہوجائیں جو مکافاتِ عمل کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ سورۂ ابراہیم آیت ۵ میں اس تذکیر کا ذکر موجود ہے :-

وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللّٰهِ الآیۃ

جن قوموں نے اللہ تعالیٰ اور اُسکے فرستادہ رسولوں کی اطاعت و پیروی کی اُنھوں نے دنیا و آخرت کی فلاح پائی اور جن قوموں نے سرکشی و بغاوت کی اس کے نتیجے میں عذاب الٰہی کا شکار ہوئے۔

قوم نوح اور اصحاب الرّس، قوم ثمود، قوم عاد، فرعون، قوم لوط، اصحاب الایکہ، قوم تُبّع ان میں سے ہر ایک نے نبیوں کی تعلیمات سے روگردانی کی، اللہ عظیم کا قانونِ مکافات سکو اپنی گرفت میں لے لیا۔

(۳) تذکیر بآیات اللہ کا مفہوم یہ ہے کہ عالم کون و مکان کی نشانیاں دکھلا کر خالقِ کائنات کی ہستی اور اُس کی وحدت کا اعتراف کروایا جائے کہ یہ روشن ستارے، ٹھنڈا چاند، دہکتا سورج، بے ستون آسمان، کشادہ زمین، فلک بوس پہاڑ، رواں دواں دریا، ہواؤں کی ریل پیل، دن رات کا آنا جانا، طلوع و غروب کا منظم نظام، یہ کیا ایسے ہی چل رہا ہے ؟ جبکہ معمولی سی حرکت بھی بغیر کسی سبب نہیں ہوتی تو پھر یہ زمین و خلا اور آسمانوں کا باقاعدہ نظام کسی ہستی کے بغیر کیوں کر قائم و دائم رہ سکتا ہے ؟

اس سارے نظامِ کائناتی کے جزئیات و تفصیلات پر اگر عقل و تدبر سے کام لیا جائے تو تم خود بول اُٹھوگے کہ بیشک جس ذات نے ایسے کامل اور مستحکم انتظامات کئے ہیں وہی ذاتِ واحد قادرِ مطلق اور حکیمِ کل اور سب کا پروردگار ہے۔

فَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

سورۂ یوسف میں اس تذکیر کا اظہار کیا گیا ہے :-

وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ. (آیت ۱۰۵)

(اور زمین و آسمانوں میں اللہ کے بہت سے نشانات ہیں جن پر یہ لوگ بے توجہی سے گزر جاتے ہیں اور اُن کی طرف سے منھ

پھیرے رہتے ہیں)

(۴) تذکیر بما بعد الموت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عالم برزخ (قبر) اور عالم آخرت و قیامت کے حالات و حوادث سُنا کر وعظ و نصیحت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس مخصوص عنوان سے جا بجا خبردار کیا ہے اور ذکرِ آخرت کو قرآن حکیم کی اساسی تذکیر شمار کیا ہے۔

قرآن حکیم کی یہ تذکیر سورۂ قٓ میں بیان کی گئی ہے :-

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (آیت ۴۵)

(پس قرآن کے ذریعہ نصیحت کرو اُس شخص کو جو اللہ کی وعید یعنی بعد الموت کے عذاب سے ڈرتا ہو)

قرآن حکیم کا وعظ و ارشاد عموماً انہی چار عنوانات پر مشتمل ہے۔

زیرِ نظر کتاب قرآنی تذکیر اربعہ کا ایک عنوان ہے (تذکیر بایّام اللہ) اسمیں انبیاء و رسل کی دعوت و تبلیغ، قوموں کا ردِّ عمل اور اللہ عزوجل کے قانونِ مکافات کا تذکرہ چالیس عناوین میں جمع کیا گیا ہے اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ عنوان واحد کے تحت جسقدر بھی مواد قرآن حکیم کے مختلف مقامات پر ملتا ہے اُسکو یکجا کر دیا جائے اور احادیثِ صحیحہ میں اس عنوان کے تحت جو وضاحت آئی ہے اس کو قرآن حکیم کی تشریح و تاویل کے طور پر شریک کیا جائے۔ تاریخ و سیرت سے اُسی قدر استفادہ کیا گیا جو قرآن و حدیث کی وضاحت کے لئے ضروری تھا اور جو اِنکے منشاء اور مُراد سے ٹکراتا نہ ہو۔

آخر میں ہر ہر عنوان کے تحت نتائج و عِبر کا مفید و مؤثر ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے جو قرآنی تذکیر کا مقصد و منشا ہوا کرتا ہے۔ گویا آپ کی یہ کتاب انبیاء و رُسل کی حیاتِ طیّبہ اور اُنکی دعوت و تبلیغ، ایثار و قربانی کا تذکرہ اور قوموں کے عروج و زوال کی رُوئیداد ہے۔ کتاب کا پڑھنے والا قرآنی واقعات اور اخبار کو بیک نظر تفصیل کے ساتھ یکجا مطالعہ کر سکتا ہے۔

قرآنی قصص اور واقعات کے تحت اہل علم حضرات نے بکثرت کتابیں تالیف کیں ہیں جنمیں بعض کتب ماخذ و مرجع کی حیثیت سے معروف و مقبول ہیں۔ انہی معروف و مستند کتب سے زیرِ مطالعہ کتاب مرتّب کی گئی ہے۔ تفصیلات، اختلافات، بحث و مباحثہ جیسے عنوانات سے حتی الامکان احتراز کیا گیا ہے۔ عام طور پر حوادث و واقعات کو تاریخ و سیرت کی کتابوں سے اخذ کیا جاتا ہے اور اسی کو ماخذ و مرجع بھی سمجھا گیا ہے لیکن زیرِ نظر کتاب میں اصل ماخذ

و مرجع قرآن حکیم اور احادیث صحیحہ کو قرار دیا گیا ہے یعنی تاریخ و سیرت سے وہی بات قبول کی گئی ہے جو قرآن حکیم اور احادیثِ صحیحہ سے مطابقت رکھتی ہو اور اسکی روح و منشاء سے ٹکراتی نہ ہو۔ ہمارا احساس و ایقان اسی اصول پر قائم ہے کہ قرآن حکیم میں اقوامِ قدیمہ اور مِلَل سابقہ کے وقائع و حوادث کا جو بھی تذکرہ پایا جاتا ہے وہی اصل ماخذ اور قابل اعتماد غیر مشکوک علمی ذخیرہ ہے۔ اسی اصول پر یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عام طور پر قرآنی واقعات میں اسرائیلی روایات بکثرت نقل کی جاتی ہیں جس کا سلسلہ آغازِ اسلام سے آج تک جاری رہا ہے لیکن زیر مطالعہ کتاب کو اس کثرت سے آپ خالی پائیں گے۔ ہم کو اس سلسلے میں اپنے اسلاف کرام کا عنوان پسند ہے :۔

حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ (اللہ کی کتاب کافی ہے)

کتاب کی تالیف میں جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے اُن کی مکمل فہرست دیدی گئی ہے۔ آپ کتاب کے مضامین کو انہی کتب سے ماخوذ پائیں گے۔

ہمیں اس بات کے اظہار میں خوشی محسوس ہوتی ہے کہ آپ کی یہ کتاب مَصَابِیْحُ الْهُدٰی (ہدایت کے چراغ) کا حرفِ آغاز مسجد الہُدٰی (جدہ) سے شروع ہوا اور پانچ سال کی مسلسل مشغولیت کے بعد شبِ قدر ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ مسجد الحرام (خانہ کعبہ) میں مقامِ ابراہیم کے قریب اختتام کو پہنچا۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّة۔

خطا و نسیان سے کون محفوظ رہا ہے جو آپ کا یہ خادم محفوظ ہوگا۔ بس اس سے زیادہ اور کیا عرض کر سکتا ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ وَصَلَّى اللهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ وَاَفْضَلِ رُسُلِهٖ سَيِّدِنَا وَوَسِيْلَتِنَا فِى الدَّارَيْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللهِ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ وَاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

خادم القرآن
عبدُ الرحمٰن غفرلہٗ
۱۷ رجمادی الآخرہ ۱۴۰۸ھ
مطابق ۵ رفروری ۱۹۸۸ء
یوم الجمعہ

تذکرہ ابو البشر

سیدنا آدم صفی اللہ علیہ السلام

تعارُف سیدنا آدم علیہ السلام موجودہ زمین کے سب سے پہلے انسان اور پہلے نبی و رسول ہیں۔ قرآن حکیم اور احادیث صحیحہ اس بارے میں ساکت ہیں کہ سیدنا آدم علیہ السلام سے پہلے اس زمین پر اور بھی کوئی مخلوق آباد تھی یا نہیں؟ اگرچہ سیدنا آدم علیہ السلام سے پہلے جنّات کی پیدائش ہو چکی تھی اور ملائکۃ اللہ ان سے بھی پہلے وجود میں آچکے تھے، لیکن یہ وضاحت نہیں ملتی کہ موجودہ زمین اِن مخلوقات کا مسکن رہی ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے وہی باتیں بیان کیں ہیں جو بندوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے ضروری تھیں، ایسے مباحث و تحقیقات سے احتراز فرمایا ہے جسمیں نہ اُنکے دنیا کا نفع ہے نہ آخرت کا۔

اس لئے ہمیں بھی ایسے ہی امور کی جانب توجہ دینا چاہیے جو ہمارے لئے نفع بخش ہوں۔

بالفرض سیدنا آدم علیہ السلام سے پہلے موجودہ زمین پر کوئی اور مخلوق آباد تھی جیساکہ طبقات الارض کے ماہرین کا خیال ہے تاہم اس تحقیق سے ہمیں صرف "انکشاف" کی حد تک فائدہ حاصل ہوگا، ہمارا سلسلۂ نسب جس ذات سے ہے وہ ذاتِ گرامی سیدنا آدم علیہ السلام کی ہے جن کا تذکرہ قرآن حکیم نے سب سے پہلے کیا اور بار بار کئی آیات میں بیان کیا ہے۔

قرآن حکیم نے نہایت وضاحت کے ساتھ غیر مشکوک اور غیر مبہم الفاظ میں کئی ایک مقام پر ہمیں یہ بتایا ہے کہ انسانیت کا آغاز خالص انسانیت ہی سے ہوا ہے۔ انسان کی تاریخ کسی غیر انسانی وجود سے قطعاً کوئی بھی رشتہ نہیں رکھتی، وہ اوّل روز ہی سے انسان بنایا

گیا تھا اور اللہ تعالےٰ نے اسکو کامل انسانی شعور کے ساتھ اسکی ارضی زندگی کی ابتدا کی ہے۔

ڈارون کا "نظریہ ارتقاء" (بندر سے انسان ہونا) ویسے یہ نظریہ خود اپنے درست ہونے میں محتاجِ ثبوت ہے تاہم یہ اہم نکتہ ہر مسلمان کے پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ کسی نظریہ پر اگر کچھ دلائل قائم بھی ہوجائیں تو خواہی نخواہی کسی چیز کا بالکلیہ ثابت ہو جانا ضروری ہوجائے ایسا ہرگز نہیں ہے، اگر کسی وقت منطق وعقل کی قوت وطاقت نے کسی معمولی ستون کو سونا ثابت کر دیا ہو اور انسان اُس کے قبول کرنے پر مجبور بھی ہوگیا ہو تاہم پتھر، پتھر ہی رہے گا سونا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ نظریۂ ارتقاء اپنے دلائل میں اگر بہت کچھ سامان رکھتا بھی ہو تو اسکی حیثیت محض ایک "موروثی دفینہ" سے کچھ زیادہ نہیں ہوسکتی۔

حضرت آدم علیہ السلام کا تذکرہ قرآن حکیم کی گیارہ (۱۱) سورتوں میں ملتا ہے۔ اور آپکا اسم گرامی پچیس (۲۵) مرتبہ آیا ہے۔ اور ہر مرتبہ کسی نہ کسی لطیف عنوان کے ضمن میں لایا گیا ہے۔

۱۔ البقرہ ۔ آیات ۔ ۳۱، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۷۔
۲۔ آل عمران ۔ آیات ۔ ۳۳، ۵۹۔
۳۔ المائدہ ۔ آیت ۔ ۲۷۔
۴۔ الاعراف ۔ آیات ۔ ۱۱، ۱۹، ۲۶، ۲۷، ۳۱، ۳۵، ۱۷۲۔
۵۔ الاسراء ۔ آیات ۔ ۶۱، ۷۰۔
۶۔ الکھف ۔ آیت ۔ ۵۰۔
۷۔ مریم ۔ آیت ۔ ۵۸۔
۸۔ طٰہٰ ۔ آیات ۔ ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۲۰، ۱۲۱۔
۹۔ یٰس ۔ آیت ۔ ۶۰۔
۱۰۔ حجر ۔ آیت ۔ ۲۶، ۳۳۔
۱۱۔ صٓ ۔ آیات ۔ ۷۱ تا ۷۴

اللہ تعالےٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی قدرت خاص سے ایسی مٹی سے پیدا کیا جو سخت اور کھنکھنانے کی صفت رکھتی تھی، اس لئے قرآن حکیم نے تین لفظ استعمال کئے ہیں۔

صَلْصَال	حَمَأ	مَسْنُون
سُوکھا گارہ	خمیر شدہ	تغیر پذیر چکنا
بجنے والا	سیاہ کیچڑ	بُودار

ان مختلف الصفات مٹی کا خوبصورت پُتلا بنایا پھر اسمیں روح داخل کی۔ سورۂ حجر میں ان اوصاف کا ذکر آیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ۔ (حجر آیت ۲۸)

اور یاد کرو اُس موقع کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں خمیر شدہ مٹی کے سُوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔

یعنی اوّل گارے کو خوب خمیر کیا کہ اسمیں بُوآنے لگی، پھر وہ خشک ہوگیا، اور خشک ہونے سے کھَن کھَن بولنے لگا۔ جیسے کہ مٹی کا برتن ٹھونک مارنے سے بجا کرتا ہے پھر اُس خشک گارے سے آدمؑ کا پُتلا بنایا گیا۔

انسان (حضرت آدم علیہ السلام) کی پیدائش کی حقیقت جس طرح قرآن حکیم نے بیان کی ہے نوعِ انسانی کی تاریخ کا یہ وہ نادر باب ہے جسکے معلوم ہونے کا کوئی دوسرا ذریعہ انسان کو میسّر نہیں آسکتا۔ تخلیق انسانی کے اس آغاز کو تفصیلی کیفیت کیساتھ سمجھنا انسانی عقل سے بالاتر ہے۔ کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام اس طرح پیدا نہیں ہوئے جس طرح عام انسان پیدا ہوا کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ان کی پیدائش کے مضمون میں واضح طور پر یہ کہا ہے کہ میں نے انھیں اپنی "قدرت خاص" سے پیدا کیا ہے۔ انکی پیدائش کے وہ اسباب نہیں ہیں جو عام انسان کے لئے ضروری ہوتے ہیں بلکہ اپنی قدرتِ خاص سے انہیں بنایا ہے۔ اس خصوصیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ الآیۃ

اے ابلیس تجھکو کس بات نے روکا کہ تو سجدہ کرے اس مخلوق کو (ص آیت ۷۵) جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھ سے بنایا ہے۔

اس لئے ہم اس حقیقت کا پوری طرح ادراک نہیں کرسکتے کہ موادِ ارضی سے بشر کس طرح بنایا گیا؟ اور اس کی صورت گری کیوں کر ہوئی؟ اس لئے ہم انسان کی تخلیق کے بارے میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔

الغرض حضرت آدمؑ کا ان مختلف الصفات مٹی سے ایک خوبصورت پُتلا بنایا گیا اور اسمیں روح داخل کی گئی تو وہ گوشت پوست کے انسان ہوگئے اور عقل و ہوش، قوت

وارادہ، دیکھنے بولنے، سننے سمجھنے، چلنے پھرنے، کے اوصاف کے حامل بن گئے۔ حضرت آدم علیہ السلام جب مکمل انسانی لباس اختیار کر چکے تو فرشتوں کو حکم ہوا کہ آدمؑ کو سجدہ کریں۔ تمام فرشتوں نے بلا توقف تعمیل کی، ابلیس جو جنات کی قسم سے تھا اور تعلیم وتربیت کے لئے فرشتوں میں رکھا گیا تھا غرور وتکبر سے انکار کیا اور اپنی برتری کا اظہار کیا، اسپر اللہ تعالیٰ نے ذلت وخواری کے ساتھ اُسکو زمین پر اُتار دیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر، فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم، ابلیس کا انکار ذیل کی آیات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

قرآنی مضمون

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ۔ الآیۃ
(سورۃ الحجر آیات ۲۶ تا ۳۳)

اور ہم نے انسان کو بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ خمیر کئے ہوئے گارے کی بنی تھی پیدا کیا اور جنات کو آدمؑ سے بہت پہلے آگ سے کہ وہ ایک گرم ہوا تھی پیدا کر چکے تھے۔ اور وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے جب آپ کے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں ایک بشر کو بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ خمیر کئے ہوئے گارے کی بنی ہوگی پیدا کرنے والا ہوں۔ سو جب میں اُسکو پورا بنا چکوں اور اُس میں اپنی مخلوق روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اُسکے آگے سجدہ میں گر پڑنا۔

چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے اُس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دینے سے انکار کیا۔

اللہ تعالیٰ نے پوچھا اے ابلیس تجھے کیا ہوا کہ تو نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دیا؟ تو وہ کہنے لگا کہ میں ایسا نہیں کہ بشر کو سجدہ کروں جسکو آپ نے بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہے پیدا کیا ہے۔

سورۂ اعراف میں اس طرح تفصیل ملتی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ الخ (الاعراف آیت ۱۱، ۱۲، ۱۳)

اور ہم نے تم کو پیدا کیا پھر ہم نے تمہاری صورت بنائی پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو سو سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے، وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل

نہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا؟

بولا میں اُس سے بہتر ہوں کیونکہ تونے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اُسکو مٹی سے۔
فرمایا تو آسمان سے اُتر جا تجھ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تو تکبّر کرے آسمان میں رہ کر، لہٰذا نکل جا بے شک تو ذلیلوں میں شمار ہونے لگا۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوٓا إِلَّآ إِبْلِيسَ۔ الخ (الکہف آیت ۵۰)

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو اُنھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا، وہ جنّوں میں سے تھا، سو اُس نے اپنے رب کے حکم سے خروج کیا۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوٓا الخ (البقرہ آیت ۳۴۔۳۵)

اور جس وقت حکم دیا ہم نے فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو سو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے اُس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آگیا اور ہوگیا کافروں میں سے۔
اور ہم نے آدمؑ سے کہا اے آدمؑ تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو، جس طرح چاہو کھاؤ پیو، امن کی زندگی بسر کرو، مگر اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ ظالموں میں شمار ہوگے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّي خَٰلِقٌۢ بَشَرًا مِّن طِينٍ الخ (ص آیت ۷۱ تا ۷۴)

اور وہ وقت یاد کرو جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔

پھر جب میں اُس کو پوری طرح بنالوں اور اُس میں اپنی مخلوق روح سے کچھ پھونک دوں تو سب فرشتے اُس کے لئے سربسجود ہو جائیں، پس سب ہی نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ مانا گھمنڈ کیا اور وہ (علم الٰہی میں پہلے ہی سے) کافروں میں تھا۔

ابلیس کا مناظرہ

اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے جواب لینے کے لئے پوچھا کہ تجھ کو کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا؟

اللہ تعالیٰ کا یہ سوال اپنے جاننے کے لئے نہ تھا بلکہ ابلیس پر اپنی حُجت پوری کرنے کے لئے تھا۔ ابلیس نے جواب دیا" اس بات نے کہ میں آدمؑ سے بہتر ہوں، کیونکہ

تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدمؑ کو مٹی سے۔
ظاہر ہے آگ مٹی سے افضل ہے کیونکہ مٹی ہمیشہ پستی کی طرف جاتی ہے اور آگ بلندی و رفعت چاہتی ہے۔ اور ہر بلند اپنے کمتر سے افضل ہوا کرتا ہے۔ بھلا میں افضل و اعلیٰ ہو کر بھی آدمؑ جیسے کم درجہ مخلوق کو سجدہ کروں اور اُس کی تعظیم بجا لاؤں؟ میرے نزدیک یہ عقل و دانش کا فیصلہ نہیں۔

یہ تھا خلاصہ ابلیس کی حُجت و دلیل کا جس نے اپنے ہی رب سے مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔ علم جب ناقص ہوتا ہے تو کسی بات کو ثابت کرنے کے لئے کمزور اور بُودے سہارے پہاڑ کی طرح بلند و مضبوط نظر آتے ہیں۔ ابلیس کے ناقص علم نے اِسکو ایسے ہی رہنمائی کی اور وہ گمراہی کی طرف چل پڑا۔

آگ و خاک کا تقابُل جس انداز سے کیا گیا ہے اگر وہ اپنی جگہ درست بھی ہو جائے تب بھی جُرم اپنی جگہ باقی ہے۔ سوال اپنے افضل و غیر افضل کا نہیں تھا بلکہ اطاعت الٰہی کا تھا۔ حکم یہ دیا گیا تھا کہ ہمارے حکم کی تعمیل کرو، اسمیں چھوٹا بڑا، اعلیٰ و کمتر سب یکساں ہیں چنانچہ اس حکم میں مَلَأِ اعلیٰ کے فرشتے بھی شامل تھے جو دیگر فرشتوں سے اعلیٰ و افضل ہیں۔ سب ہی نے سجدہ کیا، حکم کی علت اگر کمتر یا برتر ہوتی تو ملاءِ اعلیٰ کے فرشتوں کو سجدہ نہ کرنا چاہیئے تھا۔ ابلیس کا یہ مناظرہ اِن آیات میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔

قرآنی مضمون

قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا لَكَ أَلَّا تَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ ۔ الخ
(الحجر آیات ۳۲ تا ۳۵)

اللہ نے فرمایا اے ابلیس تجھے کیا ہوا کہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا؟ کہا مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایسے بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے خمیر اُٹھے ہوئے گارے سے بنایا جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے (یعنی آدم کم درجہ مخلوق ہے اور میرا درجہ اُس سے بڑا ہے) حکم ہوا تو یہاں سے نکل جا کہ تُو دھتکارا ہوا ہے اور روزِ جزا تک تجھ پر لعنت ہوتی رہیگی۔

سورۂ اعراف میں اس طرح آیا ہے۔
قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ الخ (الاعراف آیت ۱۲ تا ۱۳)

اللہ نے فرمایا کس بات نے تجھ کو سجدہ کرنے سے منع کیا جبکہ میں نے تجھکو حکم دیا تھا؟ کہا اس بات نے کہ میں آدمؑ سے بہتر ہوں، تونے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسکو مٹی سے۔

فرمایا اچھا تو یہاں سے نیچے اُتر، تجھے حق نہیں کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے، نکل جا کہ درحقیقت تو اُن لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں۔

درازیٔ عمر کی درخواست

بہتر خطا کار وہ ہے جو فوری توبہ کرلے۔ ابلیس کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسکا انکار کرنا بھول یا غفلت کا نتیجہ نہ تھا۔ دیدہ و دانستہ "ارتکاب جرم" تھا۔

جُرم کی پاداش میں جنت سے اُتر جانے کا غضب ناک حکم سُنکر توبہ و ندامت کے بجائے اللہ تعالٰے سے استدعا کرنے لگا کہ قیامت تک میری عمر دراز کر دی جائے اور مجھے ایسی طاقت و قدرت دے دی جائے کہ اولادِ آدم کو ہر طور وطریقے سے گمراہ کرسکوں؛ اللہ تعالٰے کے علم و حکمت کا بھی یہ ہی فیصلہ تھا کہ بنی آدم کی آزمائش کے لئے اسکو لمبی مہلت دی جائے۔ چنانچہ اُس کی یہ درخواست منظور کرلی گئی۔ نہ صرف اُس کو حیاتِ طویل دے دی گئی بلکہ اُس کو وہ اسباب و ذرائع بھی مہیا کر دئے گئے جو انسانوں کو گمراہ کرنے کے لئے درکار تھے۔ اس موقعہ پر اُس نے پھر ایک اور مرتبہ اپنی فطرت کا مظاہرہ کیا۔ کہنے لگا اب جبکہ تونے مجھے راندۂ درگاہ کرہی دیا تو جس آدمؑ کی بدولت یہ رسوائی نصیب ہوئی ہیں بھی آدمؑ کی اولاد کو ذلیل ورسوا کرکے رہوں گا اور اُن کے ہر چار سمت ہوکر گمراہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گا۔ اوران کی اکثریت کو ناشکر گزار بنا دونگا۔ پھر شاید کچھ ہوش میں آکر کہنے لگا البتہ تیرے "مخلص بندے" میرے تسلط سے باہر رہینگے۔

اللہ تعالٰے نے بھی بے نیازی سے جواب دیا مجھکو اسکی کیا پرواہ ہے میرا "قانون مکافات" اپنی جگہ اٹل رہے گا، جو انسان بھی مجھ سے روگردانی کرکے تیری پیروی کرے گا، وہ تیرے ساتھ جہنم کا سزاوار ہوگا اور ابدی لعنت کا مستحق۔

قرآن حکیم کی آیات ذیل انہی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔

قرآنی مضمون

قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ الخ (الاعراف آیات ۱۲ تا ۱۸)

اللہ نے فرمایا (اے ابلیس) تجھکو کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جبکہ میں نے تجھکو حکم دیا تھا؟

کہا میں اُس سے بہتر ہوں، مجھکو تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُسکو مٹی سے،

اللہ نے فرمایا تو پھر تو نیچے اُتر جا۔ تیرا یہ حق نہیں کہ تو یہاں بڑائی جتائے، لہٰذا تو نکل جا بیشک تو ذلیلوں میں سے ہے۔

کہنے لگا مجھے اُس دن تک مہلت دے جس دن سب دوبارہ اُٹھائے جائینگے (یعنی قیامت تک) اللہ نے فرمایا بے شک تُو اُن افراد میں سے ہے جن کو مہلت دی گئی ہے۔

کہنے لگا اچھا جس طرح تو نے مجھے بے راہ کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر اِن انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا۔

پھر (گمراہی کا سامان لیکر) اُن انسانوں کے پاس اُن کے آگے سے اور اُن کے پیچھے سے اور اُن کے دائیں سے اور اُن کے بائیں سے آؤں گا اور تو اُن میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔

اللہ نے فرمایا نکل جا یہاں سے ذلیل وٹھکرایا ہوا ہوکر (اور جان لے) کہ ان میں سے جو تیری پیروی کرینگے تجھ سمیت اُن سب سے جہنم کو بھر دُوں گا۔

قَالَ يَآ اِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ الخ (الحجر آیات ۳۲ تا ۴۴)

اللہ نے فرمایا اے ابلیس تجھے کیا ہوا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا؟

کہا میں ایسے بشر کو سجدہ نہیں کرسکتا جسے تو نے خمیراُ ٹھے ہوئے گارے سے پیدا کیا ہے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے۔ (یعنی معمولی درجہ کی مخلوق)

اللہ نے فرمایا تو یہاں سے نکل جا کہ تو مردود ہے۔

اور بیشک تجھ پر قیامت تک لعنت ہے۔

کہنے لگا خدایا مجھے اُس دن تک مہلت دیدے جبکہ انسان دوبارہ اُٹھائے جائینگے (یعنی قیامت تک)۔

اللہ نے فرمایا بیشک تو مہلت یافتہ لوگوں میں سے ہے۔

اُس دن تک جس کا وقت ہمیں معلوم ہے۔

بولا یارب جیسا کہ تونے مجھ پر نجات کی راہ بند کر دی ہے تو میں ضرور ایسا کروں گا کہ زمین میں انسانوں کے لئے دل فریبیاں پیدا کر کے اُن سب کو بہکا دوں گا۔ البتہ اُن میں سے جو تیرے مخلص بندے ہوں گے (جو میرے بہکانے میں نہیں آئیں گے۔)

اللہ نے فرمایا بس یہی سیدھی راہ ہے جو مجھ تک پہنچانے والی ہے۔ جو میرے مخلص بندے ہیں اُن پر تیرا کچھ بھی زور نہیں چلیگا صرف انہیں پر چلیگا جو (بندگی کی راہ) سے بھٹک گئے ہوں۔ اور اُن سب کے لئے جہنم کے عذاب کا وعدہ ہے (جو کبھی ٹلنے والا نہیں) اس جہنم کے سات دروازے ہیں، ہر دروازے کے لئے اُن لوگوں کے الگ الگ حصے ہیں۔

سورۂ اِسرا میں اللہ تعالےٰ نے شیطان کی اتباع کرنے والوں کا انجام اسطرح بتایا ہے:-

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ الخ

(بنی اسرائیل آیات ۶۱ تا ۶۵)

اور جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا آدمؑ کے آگے جُھک جاؤ، اسپر سب جُھک گئے مگر ابلیس نہ جُھکا، اُس نے کہا کیا میں ایسی ہستی کے آگے جُھکوں جسے تونے مٹی سے پیدا کیا ہے۔

نیز اُس نے کہا کیا تیرا یہی فیصلہ ہے کہ تونے اس (حقیر) ہستی کو مجھ پر بڑائی دی ؟ اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں ضرور اسکی نسل کی بیخ و بنیاد اُکھاڑ کے رہوں گا، البتہ تھوڑے آدمی اس ہلاکت سے بچیں اور کوئی نہ بچے۔

اللہ نے فرمایا جا اپنی راہ لے، جو کوئی بھی ان میں سے تیری راہ چلے گا، اُس کے لئے اور تیرے لئے جہنم کی پوری پوری سزا ہوگی۔

اُن میں سے جس کسی کو تو اپنی صدائیں سنا کر بہکا سکتا ہے بہکانے کی کوشش کرلے، اپنے لشکر کے سواروں اور پیادوں سے حملہ کر، اور اُن کے مال واولاد میں شریک ہوجا، اور اُن سے (طرح طرح کی باتوں کے) وعدے کر، اور شیطان کے وعدے تو سرتاسر دھوکے کے سوا کچھ نہیں ہیں۔

جو میرے سچّے بندے ہیں اُن پر تو قابو پانے والا نہیں، تیرا پروردگار کارسازی کے لئے بس ہے۔

قَالَ یَآاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ الخ (صٓ آیات ۷۵ تا ۸۵)

فرمایا اے ابلیس! کس چیز نے روک دیا تجھ کو سجدہ کرے اُس کو جسکو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ یہ تونے غرور کیا یا تو بڑا تھا درجے میں ؟

بولا میں بہتر ہوں اُس سے، مجھکو تونے آگ سے بنایا ہے اور اُسکو مٹی سے۔

فرمایا نکل جا آسمان سے بیشک تو مردُود ہوگیا ہے۔

اور تجھ پر میری پھٹکار ہے جزا کے دن تک۔

بولا اے رب مجھے مہلت دیدے اُس دن تک جسمیں مُردے اُٹھائے جائیں گے (یعنی قیامت تک)

فرمایا تجھکو مہلت ہے معین وقت کی تاریخ تک۔

بولا قسم ہے تیری عزت کی میں گمراہ کروں گا اُن سب کو۔

مگر جو بندے ہیں تیرے اُن میں سے چُنے ہوئے (وہ میری گمراہی سے دور رہیں گے)

فرمایا تو ٹھیک بات یہ ہے اور میں ٹھیک ہی کہتا ہوں۔

مجھکو بھرنا ہے دوزخ تجھ سے اور جو اُن میں تیری راہ چلیں ان سب کو بھی۔

خلافتِ ارضی

خلیفہ اپنے حاکم کا نائب اور وکیل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب اپنا نائب وخلیفہ بنانے کا ارادہ کیا اور حضرت آدم علیہ السلام کی شکل میں اُسکو صورت دینا چاہی تو فرشتوں کو اطلاع دی کہ میں زمین پر اپنا نائب وخلیفہ بنانا چاہتا ہوں جو میری مرضیات کو زمین پر نافذ کرے گا۔ اور زمین کا وہ مالک بھی ہوگا۔ اسمیں میرے امر ونشار کے مطابق حکومت قائم کرے گا۔ اس اطلاع پر فرشتے حیرانی ظاہر کرنے لگے۔ حیرانی کی وجہ غالباً یہ تھی کہ زمین پر خلافت کی ضرورت آخر کیوں محسوس کی گئی؟ مخلوق تو ہم بھی ہیں کسی دوسری مخلوق کی پیدائش کیا ہماری نااہلی کے سبب سے تو نہیں ہے؟ اس سے قبل جنات بھی تو تھے جنکی سرکشی وبغاوت، کی وجہ سے انھیں دُور دراز

علاقوں میں مقید کر دیا گیا۔ اب جو مخلوق پیدا ہوگی ظاہراً اسمیں خیر و شر ہوگا (کیونکہ خیر محض تو ہم ہیں ہی) ایسی مخلوق سے فتنہ و فساد کی توقع ممکن ہے۔ کہنے لگے پروردگار! ایسی نئی مخلوق سے اگر تیری تسبیح و تقدیس، تہلیل و تکبیر مقصود ہے تو یہ منصب ہمارے لئے زیادہ مناسب ہے کیونکہ ہم ہر لمحہ تیری تسبیح و تقدیس بجالاتے ہیں۔ اور بے چون و چرا تیرا حکم تسلیم کرتے ہیں۔ خدایا کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ نئی مخلوق زمین میں خرابی اور خون ریزی برپا کر دے؟ بارالٰہا تیرا یہ فیصلہ سر آنکھوں پر لیکن اسکی آخر کیا حکمت و مصلحت ہوگی خدایا اس کو ہم جاننا چاہتے ہیں؟

بارگاہِ الٰہی سے انھیں اولاً یہ ادب سکھایا گیا کہ مخلوق کو خالق کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں جب تک کہ حقیقت سامنے نہ آجائے زبان بند رہنی چاہیئے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا حاکمانہ جواب اس طرح دیا۔ جو حقیقت تم نہیں جانتے میں اسکو جانتا ہوں۔ فرشتوں نے یہ جواب سُنکر سرِ تسلیم خم کر دیا۔

آیاتِ ذیل میں یہ ہی مضمون بیان کیا گیا ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً الخ (بقرہ آیت ۳۰)

قرآنی مضمون

اور جب ایسا ہوا کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا کیا ایسی ہستی کو خلیفہ بنایا جارہا ہے جو زمین میں خرابی پھیلائیگی اور خون ریزی کرے گی؟ حالانکہ ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہوئے تیری پاکی و قدوسی کا اقرار کرتے ہیں (کہ تیرا ارادہ بُرائی سے پاک اور تیرا کام نقصان و عیب سے منزّہ ہے) اللہ نے فرمایا میری نظر جس حقیقت پر ہے تمہیں اسکی خبر نہیں۔

اقرار و تسلیم

چونکہ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق پر حیرت کا اظہار کیا تھا اور عجلت میں اللہ تعالیٰ سے یہ سوال بھی کر دیا تھا کہ ایسی مخلوق کی غرض و غایت کیا ہے جبکہ ہم تسبیح و تقدیس کے لئے موجود ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ جواب دیکر خاموش کر دیا تھا کہ اسکی حکمت میں جانتا ہوں تم کو خبر نہیں۔

فرشتوں کے سکوت اور اللہ تعالیٰ کے جواب سے واضح ہوتا ہے کہ فرشتوں کی یہ کوئی گستاخی یا قابل سرزنش بات نہ تھی ورنہ اللہ تعالیٰ کے جواب کا عنوان ایسا نہ ہوتا۔ بہرحال فرشتوں کی نظروں میں حضرت آدم علیہ السلام کا مقام ظاہر نہ تھا اور اللہ کی مشیت تھی کہ حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر فوقیت دی جائے اور اس کا اظہار بھی کر دیا جائے، تاکہ جہاں اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تخلیق کا مشاہدہ ہو وہاں فرشتوں کا اعترافِ قصور بھی انہی کی زبان سے ہو جائے۔

اس کیلئے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے "صفتِ علم" سے کچھ حصہ عطا فرما دیا جسکو قرآنی زبان میں "علم الاسماء" کہا گیا ہے۔

یہ علم کن چیزوں کا تھا؟ قرآنِ حکیم نے اسکی کوئی وضاحت نہیں کی ہے البتہ احادیث نبوی میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ یہ علم "موجودات" کا علم تھا۔ عالم میں جو کچھ بھی تھا اُس کا نام اور حقیقت بتلادی گئی کہ اُس کا یہ نام ہے اور کام یہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اس علم کے حامل ہو گئے اور صفتِ علم سے سرفراز و مفتخر ہوئے۔ اس کے بعد حضرت آدم ؑ کو فرشتوں کے سامنے لایا گیا اور سوال کیا گیا کہ اے فرشتو بتاؤ اِن اِن چیزوں کے کیا نام ہیں اور اِن کی غرض وغایت کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کا یہ سوال بعینہٖ وہی سوال تھا جسکو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا۔ یعنی تخلیق آدم ؑ کی غرض وغایت کیا ہے؟

فرشتوں کے لئے یہ بات بالکل نئی تھی اور وہ اِن چیزوں سے قطعاً ناواقف تھے فوراً بول اُٹھے یاالٰہی! تو ہر عیب سے پاک ہے ہمیں تو صرف اتنا ہی علم ہے جو تو نے ہمیں بخشا ہے۔ تو ہی ہر بات پر قدرت والا اور حکمت والا ہے۔

اس کے بعد تمام فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا اور حضرت آدم ؑ کی فضیلت کا اعتراف بھی فرشتوں سے یہ اعتراف کروانا ویسے بھی بغیر کسی حجت وآزمائش کے ممکن تھا، لیکن یہ بات سوال وجواب کے حدود میں آگئی تھی اس لئے حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت کو دلیل و بُرہان سے واضح کر دیا گیا۔

آیاتِ ذیل اسی واقعہ سے متعلق ہیں۔

قرآنی مضمون | وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ الخ (بقرہ آیت ۳۱)

اور اللہ نے آدمؑ کو ساری چیزوں کے نام سکھا دیئے۔ پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا (اگر تمہارا خیال صحیح ہے کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائیگا) تو ذرا اِن چیزوں کے نام بتاؤ؟

فرشتوں نے عرض کیا عیب سے پاک تو آپکی ہی ذات ہے ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا اور کوئی نہیں۔

اللہ نے آدمؑ سے کہا اے آدمؑ تم اِن چیزوں کے نام اِنھیں بتاؤ؟ جب آدمؑ نے اُن سب کے نام بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا (اے فرشتو!) میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں، جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہیں اور جو کچھ تم چُھپاتے ہو اُسے بھی میں جانتا ہوں۔

جنّت کا قیام

فرشتوں کے اقرار کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں سکونت دے دی گئی، وہ اسمیں ایک عرصہ تک راحت وسکون کی زندگی بسر کرتے رہے۔ لیکن چونکہ انسان تھے مسلسل تنہائی ویکتائی کی وجہ سے وحشت وتنگی محسوس کرنے لگے۔

اللہ علیم وخبیر نے حضرت آدم علیہ السلام کے لئے ایک ہمدم ومُونس حضرت حوّا کی شکل میں پیدا فرما دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام اپنا مُونس ورفیقِ حیات پاکر بیحد مسرور ہوئے اور وہ تنہائی کی کلفت جاتی رہی۔ اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کے سکونِ قلب کا انتظام ہوگیا۔ (تخلیق حوّا کی تفصیل آگے آرہی ہے)

حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوّا کو عام اجازت تھی کہ وہ جنت کے جس حصّے میں چاہیں قیام کریں، ساری آسائشیں مہیّا تھیں جسکو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سُنا اور نہ کسی کے قلب پر اس کا تصور آسکتا تھا۔ اس مکمل عیش وفراوانی کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ایک خاص درخت کے قریب جانے سے منع بھی کر دیا تھا۔ اور یہ بھی تنبیہ کر دی تھی کہ اگر اس کے خلاف ہوا تو یہ ظلم کی بات ہوگی اور آگاہ بھی کر دیا تھا کہ شیطان تم دونوں کا دشمن ہے کہیں تم کو نافرمانی میں بتلا نہ کر دے؟

حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے تھے، اُن سے ارادۃً ایسی کوئی بات ممکن نہ تھی۔ لیکن خطا ونسیان بہرحال ہر بشر میں فطرۃً موجود تھے، حضرت آدم علیہ السلام ایک عرصہ تک اطمینان وبیفکری سے جنت میں مقیم رہے، ابلیس اُسی دن سے اس تاک میں تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے اپنا انتقام لے، اُس نے کسی طرح حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوّا، کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ شجر "شجرۃ الخلد" ہے۔ اِس کا پھل کھانا گویا جنّت میں ابدی زندگی کا ضامن ہے۔ اور یہ زندگی علامت ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ آپ سے ہمیشہ راضی ہے اور راضی رہے گا، اور یہ عالم، ابدی عالم ہے جو ختم نہ ہونے والا ہے۔ پھر اس پر مزید دھوکہ دینے کے لئے اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی قسمیں کھانا اور اپنا خیر خواہ ومخلص ہونا ظاہر کیا۔ اِس دھوکہ سے حضرت آدم علیہ السلام وحضرت حوّا، کو اُس درخت تک لے آیا، حضرت آدم علیہ السلام وقتی طور پر یہ بھول گئے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم امتناعی قسم کا ہے اور نہ اس جانب ذہن گیا کہ یہ حکم کوئی دائمی حیثیت رکھتا ہے، پھر جنت کے دائمی قیام کی خواہش اور قُربِ الٰہی کے شوق نے اُن کے پائے ثبات میں لغزش پیدا کردی۔ دونوں نے اُس درخت کا پھل کھالیا کھانا تو درکنار صرف چکھنا ہی تھا کہ بشری لوازم اُبھرنے لگے۔ دونوں اپنے جسم کی اچانک برہنگی محسوس کرنے لگے، جنّت کا وہ لباس جو دونوں کے لئے زینت وستر پوشی کا کام دیتا تھا اُتر گیا، گھبرا کر درخت کے پتّوں سے اپنا بدن ڈھانکنے لگے۔ یہ حالت اُس لغزش کی پاداش تھی جو اس شکل میں نمودار ہوئی۔

اِسپر کچھ دیر بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اللہ تعالیٰ کا عتاب آمیز خطاب نازل ہوا حضرت آدم علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ اے آدمؑ! کیا میں نے تم دونوں کو درخت کے قریب ہونے سے منع نہ کیا تھا؟ اور کیا میں نے تمہیں یہ تنبیہ نہ کی تھی کہ شیطان تم دونوں کا دشمن ہے؟ حضرت آدم علیہ السلام کو فوراً احساس ہوا کہ غلطی سرزد ہوگئی ہے اور دشمن شیطان نے اپنا کام پورا کر دیا ہے۔ فوری اور بغیر کسی توقف سجدہ میں گر پڑے، ندامت اور اعتراف کے ساتھ اس طرح گویا ہوئے۔ "اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کرلیا ہے اور اگر آپ نے اپنے فضل وکرم سے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم خسارہ والوں میں ہوجائیں گے۔"

اللہ تعالیٰ جو دلوں کے بھیدوں تک کو خوب جانتا ہے حضرت آدم علیہ السّلام وحضرت حوّاء کے پاکیٔ قلب کو اچھیؔ طرح جانتا تھا، عُذر کی خوبی اورعزم وارادے سے خالی خطا ولغزش کو جان کر دونوں کومعاف کر دیا اور یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ اس عمل میں حضرت آدم علیہ السّلام بالکل معصوم ہیں۔ (طٰہٰ آیت ۱۱۵)

لیکن چونکہ علم الٰہی میں وہ وقت آچکا تھا کہ زمین کو "انسانی معمورہ" بنایا جائے اور حضرت آدم علیہ السّلام کو اللہ کی اس زمین پر پہلا خلیفۃ اللہ قرار دیا جائے۔ اس خوشخبری کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام اور اُن کی بیوی حضرت حوّا کو زمین پر اُتار دیا گیا۔ اور یہ ہدایت بھی دی گئی کہ زمین پر بھی تمہارا اور تمہاری اولاد کا دشمن ابلیس موجود رہے گا اور تم کو اس سے بچ کر صراطِ مستقیم پر قائم رہنا ہوگا۔

آیاتِ ذیل انہی تذکروں پر مشتمل ہیں۔

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ الخ (بقرہ آیات ۳۵ تا ۳۹)

قرآنی مضمون

پھر ایسا ہوا کہ ہم نے آدمؑ سے کہا اے آدمؑ تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو، جس طرح چاہو کھاؤ پیو، امن وچین کی زندگی بسر کرو، مگر دیکھو وہ جو ایک درخت ہے کبھی اُس کے قریب نہ ہونا، ورنہ تم دونوں حد سے تجاوز کرنے والے ہوگے۔ (پھر کیا تھا) کہ شیطان کی وسوسہ اندازی نے اُن دونوں کے قدم ڈگمگا دیئے اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کو راحت وسکون کی زندگی سے نکلنا پڑا۔ اللہ کا حکم ہوا کہ یہاں سے چلو، تم میں سے ہر ایک دوسرے کا دشمن ہوگا، اب تمہیں زمین پر رہنا ہے ایک خاص وقت کے لئے (جو علم الٰہی میں مقرر ہے۔ اور اس قیام سے فائدہ اُٹھانا ہے۔ (پھر ایسا ہوا) کہ آدمؑ نے اپنے پروردگار کے القاء سے چند کلمات حاصل کرلئے (جو قبولیت دُعا کے لئے مفید تھے) پس اللہ نے اُن کی توبہ قبول فرمالی اور بلاشبہ وہی رحمت والا درگزر کرنے والا ہے۔ (لیکن جس زندگی سے وہ نکل چکے تھے وہ دوبارہ نہیں مل سکتی تھی) لہٰذا ہمارا حکم ہوا اب تم سب یہاں سے زمین پر اُتر جاؤ لیکن یاد رکھو) جب کبھی ہماری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے اُن کے لئے کوئی خوف ورنج نہ ہوگا۔ اور جو لوگ اِس کو

قبول کرنے سے انکار کرینگے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

سورۂ اعراف میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ الخ (الاعراف آیات ۱۹ تا ۲۵)

اور اے آدمؑ تم اور تمہاری بیوی اس جنت میں رہو، جہاں جس چیز کو تمہارا جی چاہے کھاؤ پیو، مگر اس درخت کے قریب نہ ہونا ورنہ زیادتی کرنے والوں میں ہو جاؤ گے۔ پھر شیطان نے اُن کے دِلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ اُن کا ستر جو اُن سے چھپا ہوا تھا اُن پر کھول دے، اُن سے کہا تمہارے رب نے تمہیں جو اِس درخت سے روکا ہے اُس کی وجہ سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ تم فرشتے بن جاؤ گے (یعنی اس کے کھانے سے) یا تمہیں جنت کی دائمی زندگی حاصل ہو جائے گی۔ اور اُس نے قسم کھا کر اُن سے کہا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ بھی ہوں۔

اس طرح دھوکہ دے کر اُن دونوں کو درخت کے قریب لے آیا، آخر کار دونوں نے اُس درخت کا (مزہ) چکھا تو اُن کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور دونوں اپنے جسموں کو جنت کے پتّوں سے ڈھانکنے لگے، تب اُن کے رب نے اُنہیں پکارا" کیا میں نے تمہیں اُس درخت سے نہ روکا تھا؟ اور کیا میں نے نہ کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔

دونوں (آدمؑ وحوّاؑ) فریاد کرنے لگے" اے ہمارے رب ہم نے اپنے اُوپر ظلم کیا ہے۔ اگر آپ نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم خسارہ والے ہو جائیں گے۔ (اللہ نے توبہ قبول کرنے کے بعد) فرمایا۔ تم سب (مع ابلیس) زمین پر اُتر جاؤ۔ تم میں بعض بعض کا دشمن ہوگا، اور تمہارے لئے ایک خاص مدت تک زمین ہی پر جائے قرار اور سامانِ زینت رہے گا۔ وہیں تم کو جینا اور وہیں مرنا ہے اور اُسی میں سے تم کو (مرنے کے بعد اُٹھایا جائیگا)

سورۂ طٰہٰ میں اس طرح ذکر فرمایا۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا الخ (طٰہٰ آیات ۱۱۵ تا ۱۲۳)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے آدمؑ سے پہلے ہی عہد لے لیا تھا پھر وہ بھول گئے اور ہم نے اُن میں نافرمانی کا قصد نہیں پایا۔ (یعنی اُن سے بھُول ہو گئی)

اور پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کے آگے جُھک جاؤ، سب جُھک گئے مگر ابلیس نہیں جُھکا اُس نے انکار کر دیا۔

اِس پر ہم نے کہا اے آدمؑ یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکال کر رہے پھر تم مشقت میں پڑ جاؤ۔

تمہارے لئے تو اب ایسی زندگی ہے کہ نہ تو اسمیں تم بھوکے رہو گے اور نہ برہنہ اور نہ تمہارے لئے پیاس کی جلن ہوگی نہ سُورج کی تپش۔

لیکن شیطان نے آدمؑ کو وسوسہ میں ڈالا اُس نے کہا اے آدمؑ میں تم کو "شجرۃ الخلد" ہمیشگی کے درخت کا نشان بتا دوں؟ اور ایسے عالم کی خبر دُوں جو کبھی فنا نہ ہو؟

(شیطان کی اس فریب آمیز خیر خواہی پر) آدمؑ اور حوّاؑ نے درخت کا پھل کھا لیا (کھانا ہی تھا کہ) اچانک اُن دونوں کے ستر اُن پر کھُل گئے اور وہ دونوں باغ کے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانکنے لگے۔ غرض کہ آدم اپنے رب کے کہنے پر نہ چلے۔ پس وہ (جنت کی زندگی سے) بھٹک گئے۔

لیکن پھر اللہ نے انھیں برگزیدہ کیا اور اپنی رحمت سے اُنپر متوجہ ہوا اور اُنپر علم و عمل کی راہ کھولدی۔ (چنانچہ اللہ نے انھیں) حکم دیا تم دونوں اکٹھے یہاں سے (زمین کی طرف) اُتر پڑو۔ تم میں سے ہر ایک دوسرے کا دشمن ہوگا (اب تم پر دوسری زندگی کی راہ کھُلے گی) پھر اگر میری طرف سے تمہاری (نسل کے) پاس کوئی پیام ہدایت آئے تو (اس بارے میں میرا قانون یاد رکھو) جو کوئی میری ہدایت پر چلیگا وہ نہ راہ سے بے راہ ہوگا اور نہ دُکھ میں پڑے گا۔

نتائج و عبر

(۱) **تاریخ پیدائش** | یہ بات واضح ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا وجود گرامی

ماقبل تاریخ کا واقعہ ہے۔ اس لئے تاریخ کی روشنی میں اس مسئلہ پر غور کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ تحقیق جدیدہ کی بنیاد پر قیاس وتخمین سے کام لیا جا سکتا ہے چنانچہ طبقات الارض کے ماہرین نے اپنے علم واندازے سے چند ایک قیاس قائم کئے ہیں اُن پر نہ کوئی قطعی رائے قائم کی جاسکتی ہے اور نہ کوئی قابل لحاظ ترجیح دی جاسکتی ہے۔ علامہ شبلیؒ نے یوم جمعہ کو یوم تخلیقِ آدم قرار دیا ہے۔ حدیثِ مسلم بھی اسکی تائید کرتی ہے۔

فِیْہِ خُلِقَ اٰدَمُ (الحدیث) جمعہ کے دن آدمؑ پیدا کئے گئے۔

البتہ اس بارے میں کہ زمین وآسمان کی تخلیق کے کتنے عرصے بعد حضرت آدم علیہ السّلام کی تخلیق ہوئی؟ قرآن حکیم اور احادیث صحیحہ بالکل ساکت ہیں۔ اور صحیح فیصلہ یہی ہے کہ جس بات کو اللہ ورسول نے مخفی رکھا اُسکے ہم بھی درپئے نہ ہوں۔ یہ ہی علم ودانش، دین و دیانت کا تقاضہ بھی ہے۔

(۲) آدم و حوّاء

آدم اور حوّاء کا لفظ دراصل اُس لغت سے متعلق ہے جو دنیا کی معدوم لغات میں شمار کی جاتی ہیں۔ اس لئے اسکے حقیقی لغوی معنی متعین کرنا دشوار ہے تاہم بعض اہل علم نے آدم کا لفظ "ادیم الارض" سے ماخوذ سمجھا ہے۔ ادیمُ الارض کے معنی صفحہ زمین کے ہیں۔ مطلب یہ کہ ایسا جسم جو مٹی سے تیار کیا گیا ہو۔ چونکہ حضرت آدم علیہ السّلام کو اللہ تعالٰے نے مٹی سے پیدا کیا اس لئے آدمؑ نام رکھا گیا۔

"حوّا" حیٌّ سے ماخوذ ہے۔ حَیٌّ کے معنی زندہ شخصیت کے ہیں۔ چونکہ وہ ہر حیٌّ کی ماں ہیں اس لئے اُن کا نام حوّاء ہوگیا۔ واللہ اعلم۔

یا اس وجہ سے کہ وہ ایک حَیّ (زندہ) یعنی آدم علیہ السّلام سے پیدا کی گئی تھیں اس لئے انھیں حوّاء کہا گیا۔

قرآن حکیم کے سورۂ نساء کی پہلی آیت میں حضرت حوّاء کا ذکر اس طرح آیا ہے

وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا الآیۃ (اور حوّاء کو آدمؑ سے پیدا کیا۔)

یعنی بغیر ماں کے آدمؑ کی پشت سے، کہا جاتا ہے کہ آدمؑ جنت میں سورہے تھے

بیدار ہوئے تو پہلو میں حوّا کو بیٹھا دیکھا، فطرت خود بخود مائل ہوگئی دونوں میں اُنس پیدا ہو گیا۔
دوسری تفسیر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حوار کو جنسِ آدمؑ سے پیدا کیا گیا یعنی اُس بقیہ مٹی سے جسکے ذریعہ حضرت آدم علیہ السلام کا جسم بنایا گیا۔ واللہ اعلم۔

(۳) ایک شُبہ اور اُس کا جواب

سیدنا آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے پر ابلیس کو مردود بنا کر جنت سے نکال دیا گیا تھا پھر وہ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں اُس درخت کے قریب کس طرح لایا جبکہ وہ جنت سے باہر ہو چکا تھا؟

اِس کا جواب بعض مفسرین نے قرآن حکیم کے الفاظ سے اخذ کیا ہے جسکا خلاصہ یہ ہے کہ ممکن ہے اس وقت تک ابلیس کا داخلہ جنت میں ممنوع نہیں ہوا ہو۔ اگرچہ وہ اس وقت تک مرُدود و مطرود ہو چکا تھا۔ قرآن حکیم نے حضرت آدم علیہ السلام کے زمین پر اُترنے کے لئے یہ لفظ بیان کئے ہیں۔

اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا۔ تم سب جنت سے نیچے اُتر جاؤ۔

اِهْبِطُوْا جمع کا صیغہ ہے جو آدمؑ اور حوّار اور ابلیس تینوں کو شامل ہے۔ ممکن ہے ابلیس ایک عاصی و مردود کی حیثیت سے اس کام کے لئے جنت کے کنارے آیا ہو اور حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوّار کو دھوکہ دیدیا ہو۔

دوسرا جواب یہ بھی دیا گیا کہ جنت کے باہر ہی سے بذریعہ وسوسہ حضرت آدمؑ اور حوّار کو اُس درخت کے قریب لے آیا ہو۔ قرآن کریم کی آیت فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ الآیۃ (پھر شیطان نے اُن کے دلوں میں وسوسہ ڈالا)

آیت کا مفہوم بھی اس جواب کی تائید کرتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے تار و لاسلکی کے ذریعہ آواز کو دور دراز حصوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ ایسے ہی شیطان نے اپنے وسوسہ کی طاقت سے یہ بات حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں پہنچائی ہو۔

(۴) ابلیس کی حقیقت

ابلیس کے لفظی معنیٰ "انتہائی مایوس" کے ہیں۔ چونکہ یہ راندۂ درگاہ ہونے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے

رحمتِ الٰہی سے مایوس ہوگیا تھا اس لئے اِس کا یہ لقب قرار پایا۔ روایات میں اُس کا اصل نام "عُزازیل" یا حارث بیان کیا گیا ہے۔

دُرِّ منثور میں سعید بن منصورؒ کا قول سورۂ کہف کے تحت نقل کیا گیا ہے کہ ایک بار فرشتوں کے ذریعہ جنات کو اُن کی نافرمانی و بغاوت کی سزا دلائی گئی تھی جسمیں بہت سے جنات قتل ہوئے۔ یہ ابلیس بچّہ سا تھا اِس کو آسمان پر لاکر رکھا گیا فرشتوں کیساتھ تسبیح و تہلیل میں مشغول رہا کرتا تھا۔

قرآنِ حکیم نے اُس کا تعارف اس طرح کیا ہے۔

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ (کہف آیت ۵۰)

وہ جنّات میں سے تھا پھر وہ اپنے رب کی اطاعت سے نکل گیا۔

علم ناقص اور مزاج ناپاک تھا غرور و تکبر میں مبتلا ہوگیا۔

(۵) معیارِ خلافت

خلافتِ الٰہیہ کا مدار کثرتِ ذکر و شغل پر نہیں ہے (یعنی جو سب سے بڑا عبادت گزار ہو اُسکو خلیفہ بنایا جائے) بلکہ کثرتِ علم و فہم پر موقوف ہے، خلافت کے لئے جہاں ذکر و عبادت ضروری ہیں وہاں بنیادی طور پر علم و فہم میں کامل ہونا بھی ضروری ہے۔ فرشتے چونکہ سراپا ذکر و تسبیح تھے اس لئے زمین کی خلافت کے لئے انہیں منتخب نہیں کیا گیا بلکہ ایک ایسی مخلوق کو منتخب کیا گیا جو علم و فہم کی استعداد رکھتی تھی اور وہ حضرت "انسان" ہیں۔

زمین کی خلافت صفتِ علم کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ خلافت کی اہم ذمہ داری انتظام اور عدل کا رکھنا ہے۔ کسی بھی انتظام کے لئے علم اور فہم ضروری ہیں۔ اس لئے زمین کی خلافت کے لئے انسان کا انتخاب کیا گیا۔

انبیاء بنی اسرائیل میں سے ایک نبیؑ جن کا نام حضرت شمویل علیہ السلام بیان کیا جاتا ہے اپنی قوم پر حضرت طالوت کو حاکم مقرر کرنا چاہا جو ساری قوم میں غریب شمار کئے جاتے تھے۔

اس انتخاب پر قوم نے اعتراض کیا کہ وہ تو ایک غریب مفلوک الحال آدمی ہیں نہ اُن کے ہاں مال و دولت ہے اور نہ شان و شوکت، لہذا ہم میں سے کسی مالدار ذی حیثیت

آدمی کو حاکم مقرر کر دیا جائے؟

حضرت شمویل علیہ السلام نے فرمایا کہ طالوت کو اللہ تعالیٰ نے علم وقوت تم سے زیادہ عطا کی ہے وہی خلیفہ اور حاکم بننے کے اہل ہیں (سورہ بقرہ آیت ۲۴۷)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ خلافت کے لئے علم وفہم ضروری ہیں جو انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں اور فرشتوں کی صفت اس سے خالی ہے۔

(۶) معیارِ اُسوہ اور عصمتِ انبیاءؑ

حضرت آدم علیہ السلام صرف انسان و بشر ہی نہیں تھے،

اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی و رسول بھی تھے۔

حضرت ابو ذر غفاریؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے بتائیے کیا آدم نبی تھے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں وہ نبی تھے اور رسول بھی۔ انھیں اللہ تعالیٰ سے شرف تخاطب و تکلم حاصل تھا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۴)

اور یہ عقلی بات بھی ہے جب وہ پہلے انسان تھے تو نسلِ انسانی کے لئے انہی کے ذریعہ پیامِ الٰہی پہنچنا ضروری تھا جبکہ وہی ان کے ہادی و رہبر بھی تھے۔

حضرات انبیاء کرام خطا و معصیت سے معصوم ہوا کرتے ہیں، اُن پر اللہ تعالےٰ کی مستقل حفاظت نگرانی قائم رہتی ہے۔ اگرچہ بشری تقاضوں کے حامل ضرور ہوتے ہیں لیکن اُن کے عمل و ارادے میں ہر قسم کی بدی و شر کے ظہور کو عملاً ناممکن ومحال کر دیا جاتا ہے تاکہ اُن کا ہر قول و عمل بلکہ حرکت وسکون تک انسانیت کے لئے "بہترین نمونہ" بن سکے یہ ہی بات قرآن وحدیث سے ماخوذ ہے۔ البتہ بشریت وانسانیت سے متصف ہونے کی وجہ سے سہو، نسیان، زلّت (لغزش) کا امکان باقی رہتا ہے۔ جو کبھی کبھی عملی بھی اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن ایسی امکانی صورت میں بھی اُنہیں اُس حالت پر باقی نہیں رکھا جاتا بلکہ فوراً ہی خبردار کر دیا جاتا ہے اور وہ اس حالت سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ سہو اور نسیان تو کوئی خطا یا معصیت ہی نہیں ہیں جسکی وضاحت ضروری ہو۔ البتہ زَلّۃ (لغزش) کی تحقیق قابل ذکر ہے۔ لغزش بظاہر ایسے خلافِ واقعہ عمل کو بولا جاتا ہے جہاں عمل وکردار میں بغاوت وسرکشی تو در کنار قصد وارادے کا بھی دخل نہیں ہوتا، بشری تقاضہ کے پیشِ نظر

ایک ایسا عمل پیدا ہوجائے جو بظاہر خلافِ واقعہ سمجھا جائے۔ اس عمل میں نیّت، قصد، ارادہ، قسم کی کوئی چیز شامل نہیں ہوتی۔ اسکی مثال ایسے ہے جیسے ایک دو سالہ معصوم بچّے کے ہاتھ سے کسی کی آنکھ پھوٹ جائے۔ ظاہر ہے اس عمل میں اُس بچّے کے علم وارادہ، بغاوت و سرکشی کو کیا دخل ہے ؟ بغیر کسی نیتِ جُرم اُس سے ایک ایسی بات سرزد ہوگئی جو نہ خطا کہلاتی ہے نہ معصیت و جُرم۔ تقریباً ایسی ہی کیفیت انبیاء کرام کے اُن واقعات کی ہے جو اُن سے بطور لغزش پیدا ہوگئے ہیں۔ اور یہ اُس بشری طبیعت کا خاصہ ہوتا ہے جو اللہ تعالےٰ نے ان کی فطرت سلیمہ میں شامل رکھا ہے۔ ہاں بالارادہ خلاف حکم کو گناہ عصیان وغیرہ کہتے ہیں جسکا صدور انبیاء سے محال ہے اور اُن سے مجھُول چوک کے سرزد ہوجانے میں اللہ کی کئی ایک حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں جنکو محققین نے مختلف تعبیرات سے ظاہر کیا ہے۔ اِن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ امت کے لئے خطا ولغزش میں نبیؐ کا اُسوہ ونمونہ پیشِ نظر رہے، جس طرح نبی اپنی زلّت ولغزش کے فوری بعد رُجوع الی اللہ، توبہ، ندامت، انابت، الحاح وزاری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور معافی و درگزر کا خواستگار ہوتا ہے ایسے ہی امت کو اپنی خطاؤں میں اسی طرح رجوع الی اللہ ہونا چاہیئے۔

موطا امام مالکؒ کی ایک روایت میں اس عنوان کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

اِنّی لأنسی او أنسیٰ لاسنّ (موطا) مجھکو بھلایا جاتا ہے تاکہ اُمت کے لئے سنت قائم ہوجائے۔

امام غزالیؒ نے ایک اور لطیف حکمت لکھی ہے۔ فرماتے ہیں :-

"چونکہ انبیاء کرام کے ہاتھوں معجزات اور خرق عادات کا ظہور ہوتا رہتا ہے اور معجزات کی حقیقت یہی ہے کہ انسانی طاقت ایسے عمل جاری کرنے میں عاجز و درماندہ ہوجائے، تاریخ اُمم یہ بتلاتی ہے کہ بہت سی قومیں انبیاء کرام کے معجزات وخرقِ عادات دیکھکر اِن میں اُلوہیت و ربوبیت کے قائل ہوگئیں تھیں۔ حتیٰ کہ بعض قوموں نے اپنے نبی کو خُدا، خُدا کا بیٹا، شریکِ خدا جیسے مشرکانہ عقیدوں سے متصف سمجھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کی لغزشوں کو اس گمراہی و بدعقیدگی کے انسداد کا ذریعہ بنایا کہ اگر یہ خدا یا خدائی طاقتوں کے حامل ہوتے تو اِن سے لغزشیں نہ ہوتیں اور وہ اپنی لغزشوں پر پہلے ہی متنبہ ہوجاتے اور اُن سے ایسا عمل سرزد نہ ہوتا۔" واللہ اعلم۔

بہرحال انبیاء کرام کی لغزشوں کی حکمت خواہ کچھ بھی ہو یہ نفوسِ قُدسیہ نبوت ورسالت کے ساتھ ساتھ بشریت کے لوازم بھی رکھتے ہیں جنمیں سہو، نسیان، لغزش بھی شامل ہیں جو گناہ یا معصیت قطعاً نہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ پر غور کرنے سے یہ حقیقت مزید واضح ہوجاتی ہے کہ حضرتِ آدم علیہ السلام کی یہ غلطی نہ گناہ تھی نہ معصیت بلکہ ایک قسم کی لغزش تھی۔

سورہ بقرہ کی آیت ۳۶ میں یہ الفاظ ہیں۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ۔ شیطان نے اُن دونوں سے لغزش کرادی۔

یہاں لفظ زلّت استعمال کیا گیا ہے جسکی وضاحت اوپر آچکی ہے۔

حضرت آدمؑ کا یہ عمل لغزش (زلّتہ) تھا خطا یا معصیت نہ تھی۔

اور سورۂ طٰہٰ آیت ۱۲۰ اور سورۂ اعراف آیت ۲۰ میں اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے لفظ وسوسہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ (طٰہٰ آیت ۱۲۰)

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ (اعراف آیت ۲۰)

شیطان نے اُن کو پھسلا دیا (یا) پھر شیطان نے اُن دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا۔

پھر اسی سورۂ طٰہٰ میں تیسری جگہ اس لغزش و وسوسہ کا سبب خود ہی بیان کردیا گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام ہر قسم کے ارادی و عملی گناہ سے پاک تھے۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ آیت ۱۱۵)

اور ہم نے اس سے پہلے آدمؑ کو ایک حکم دیا تھا مگر وہ بھول گئے اور ہم نے (اس عمل میں) اُن کا کوئی عزم وارادہ نہیں پایا یعنی آدم علیہ السلام کا درخت کے قریب ہونا قصدی وارادی عمل نہ تھا بلکہ غفلت و بھول کا نتیجہ تھا۔

قرآن حکیم کی یہ تصریحات انبیاء کرام کی عصمت و پاک دامنی کو واضح کرتی ہیں کہ انبیاء کرام خطاؤں، معصیتوں، اور ذنوب سے پاک ہوتے ہیں۔ یہی سلف وخلف کا عقیدہ ہے اور اسی پر امت کا سوادِ اعظم متفق ہے۔ البتہ بعض ناواقفوں کو سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۲۱ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى۔

سے شُبہ ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے معصیت کا صدور ہوا اور وہ گمراہ ہوگئے۔

غالباً شبہ کی یہ وجہ ہوگی کہ آیت مذکورہ میں لفظ "عصیٰ" اور "غویٰ" مذکور ہیں جن کا عام ترجمہ "نافرمانی کی" اور "گمراہ ہوگئے" لکھا جاتا ہے۔
مطلب یہ ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے (نعوذ باللہ) گناہ کیا اور گمراہ ہوگئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بادی النظر میں ایسے ہی سمجھا گیا مگر جب دیگر آیات کے ساتھ جو اس سلسلے میں موجود ہیں غور کیا جائے تو یہ شبہ بالکل ہی سطحی معلوم ہوگا۔ دراصل یہ ظاہری شبہ ہے جو محض الفاظ کے ظاہر سے پیدا ہوا ہے۔
قرآن حکیم میں بہت سے ایسے لفظ ہیں جو دو دو چار چار معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر "ظُلم" کا لفظ گناہ، زیادتی، شرک کے معنی میں آیا ہے۔ ایسے ہی "ضَلَالَۃٌ" گمراہی، نقصان، غائب ہونا، حیران و پریشان ہونا کے معنی میں آیا ہے۔ انہی الفاظ میں لفظ مَعْصِیَۃٌ اور غَوَایَۃٌ بھی شامل ہیں۔ اِن کے معنی جہاں گناہ کرنا اور گمراہ ہونا آتے ہیں وہاں مَعْصِیَۃٌ کے معنی لغزش کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ لغت کی مشہور کتاب لِسَانُ العرب اور اَقربُ الموارد میں صراحت ہے۔
اَلْمَعْصِیَۃُ قَدْ تُطْلِقُ عَلٰی الزَّلَّۃِ مَجَازًا۔
معصیت مصدر ہے کبھی مجازاً لغزش کے معنی میں بھی آتا ہے۔
اسی طرح غَوٰی، ضَلَّ یا خَابَ کے معنی میں آتا ہے بہک گئے یا نقصان میں پڑ گئے۔
اب آیت وَعَصٰی آدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی کا ترجمہ یہ ہوا:
لغزش کھائی آدمؑ نے اپنے رب کے حکم میں پس وہ نقصان میں پڑ گئے۔
لہٰذا آیت کا یہ مطلب نہیں کہ آدمؑ نے نافرمانی کی اور گمراہ ہو گئے بلکہ صحیح ترجمہ یہ ہوگا۔
لغزش کھائی اور نقصان میں پڑ گئے۔
نقصان یہ کہ جنّت جیسی جگہ چھوٹ گئی۔ جہاں ہر قسم کی آسائش مہیا تھی۔ اور دنیا کی زندگی میں آگئے جہاں نفع و نقصان دونوں پیش آتے ہیں۔

(۷) دو وضاحتیں

شجرِ ممنوعہ کے کھاتے ہی حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواؑ کا وہ لباس جو زیب تن تھا اتر گیا اور ایک دوسرے کے ستر سامنے ہو گئے۔ دونوں درخت کے پتوں سے اپنا ستر چھپانے کی

کی فکر میں پڑ گئے۔

یہ لباس کس چیز کا تھا؟ اور اچانک کیوں اُتر پڑا؟
یہ دو سوال ہیں جن کی وضاحت درج کی جاتی ہے۔

ابن کثیرؒ نے وہب بن مُنبہؒ کے حوالہ سے یہ جواب دیا ہے کہ یہ کوئی مادی لباس نہ تھا بلکہ كَانَ لِبَاسُهُمَا نُوْرًا۔ دونوں کا لباس نُور کا تھا۔ گویا مطلب یہ کہ یہ جنت کا خصوصی لباس تھا جو صرف اسی عالم کے لئے سزاوار تھا۔

حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا، جب دنیا میں اُترنے والے تھے اُسکے مناسب نہ تھا اس لئے وہ لباس اُتار دیا گیا۔ یہ ایسے ہی ہے۔ جیسے پیدائش کے وقت مولود کا وہ لباس جو بطنِ مادر میں زیبِ تن رہتا ہے پیدائش کے بعد اُتار دیا جاتا ہے وہ ایک باریک سی جھلّی ہوتی ہے جو بچّے کے بدن پر لپٹی ہوئی رہتی ہے۔

بعض مفسّرین نے دوسرے سوال کی یہ وضاحت کی ہے کہ لباس کا اچانک اُتر جانا دراصل اُس نادانستہ لغزش کا نتیجہ تھا جو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواءؑ سے سرزد ہوگئی تھی۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل وکرم سے جنّت میں اُنکے ستر پوشی کا انتظام فرمایا تھا، جب اِن حضرات سے یہ لغزش ہوگئی تو اللہ کی حفاظت اُن سے ہٹالی گئی اور اُن کا پردہ کھول دیا گیا اور انھیں خود اپنے نفس کے حوالہ کر دیا گیا۔ گویا اس حقیقت کا اظہار تھا کہ جب کسی انسان سے عدول حکمی ہوگی تو دیر یا سویر اُس کا پردہ کھُل کر رہے گا۔ اور اُسے خود اُسکے حوالہ کر دیا جائے گا۔ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کی دُعاوں میں یہ بھی مذکور ہے۔

اَللّٰهُمَّ لَا تَكِلْنِيْ اِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَلَا تَنْزِعْ مِنِّيْ صَالِحَ مَا اَعْطَيْتَنِيْ۔
خدایا مجھکو ایک لمحہ کے لئے بھی میرے نفس کے حوالہ نہ فرما اور مجھ سے اپنی عطا کردہ نعمت کو نہ چھین لے۔ (الحدیث)

(۸) **ابُوالبشر** حضرت آدم علیہ السلام روئے زمین کے پہلے بشر ہیں اس لئے اُنھیں ابُوالبشر کہا جاتا ہے۔ البتہ طبقات الارض کے بعض ماہرین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ انسانی دنیا سے پہلے بھی اس زمین پر ایک

انسان جیسی مخلوق کا وجود رہا ہے جس کا زمانہ حضرت آدم علیہ السلام سے تیس[۳۰] ہزار سال پہلے کا ہے۔ اس مخلوق کا نام "تیا ندر تال" بتایا جاتا ہے۔ جو چھ کروڑ نفوس پر مشتمل تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ پوری آبادی کسی جرم کی پاداش میں ہلاک وضائع کردی گئی۔ اس تحقیق کی بنیاد آثار قدیمہ کی وہ ہڈیاں ہیں جو زمین کی کھدائی میں ظاہر ہوئے ہیں جو اپنی قد وقامت، شکل وصورت میں موجودہ انسانی اعضاء سے بہت حد تک مشابہت رکھتے ہیں۔

لیکن قرآن حکیم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں کوئی وضاحت نہیں فرمائی۔ تذکرہ سیدنا آدم علیہ السلام کے سلسلے میں جسقدر بھی آیات موجود ہیں اُن سے یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اس زمین کے پہلے بشر ہیں انسانیت کا آغاز انہی سے ہوا۔ یہ ہی زمین کے پہلے انسان اور نبی ہیں۔ نسلِ انسانی حضرت آدم علیہ السلام ہی سے شروع ہوئی۔ یہی اسلامی عقیدہ ہے اور ہمارے علم ویقین کے لئے صرف اس قدر کافی ہے جو ہم کو قرآن جیسے علم یقین اور وحیٔ الٰہی کے بعد حاصل ہوا ہے۔ علم ویقین کے لئے یہ دو ماخذ کافی ہیں۔

(۹) فرشتوں کی حقیقت

حضرت آدم علیہ السلام کے تذکرے میں فرشتوں کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ایک خاص مخلوق ہیں جو "نور" سے پیدا کئے گئے ہیں۔ وہ ہم کو دیکھ لیتے ہیں لیکن ہم ان کو دیکھ نہیں پاتے۔

قرآن حکیم نے فرشتوں کی دو[۲] صفات بیان کی ہیں۔

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ الآية

(سورۃ التحریم آیت ۶)

اللہ جو انھیں حکم دیتا ہے اُسکی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انھیں دیا جاتا ہے اُسے بجالاتے ہیں۔ فرشتے خدائی اختیارات کے حامل نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ اِن کے ذریعہ اس عظیم الشان کائنات کا انتظام چلاتا ہے۔ یہ سلطنت الٰہی کے "اہل کار" ہیں۔ اپنے فرائض منصبی کے لئے جس وقت جو ضرورت پیش آتی ہے ویسی ہی صورت

اختیار کر سکتے ہیں۔ بعض ان میں ایسے قوی ہیں کہ تنہا ایک ایک شہر کو تہس نہس کر سکتے ہیں۔ اِن میں نافرمانی کا کوئی عنصر نہیں۔ یہ خیرِ محض ہوتے ہیں۔

یہ اپنی ذوات میں نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، جاہل قومیں اِنکی قوت وطاقت کا مظاہرہ دیکھ کر اِن کو خدائی میں حصہ دار، خدا کا رشتہ دار، اور بعضوں نے ان کو خُدا کی بیٹیاں قرار دے لیا ہے۔

اسلام نے اِن غیبی ہستیوں کو تسلیم کرنے اور اِن کو خدا کی مخلوق جاننے کی ہر مسلمان پر پابندی عائد کی ہے اور اِس کو اسلام کے بنیادی عقائد میں شمار کیا ہے۔ اِن میں سے بعض کے نام قرآن حکیم اور احادیثِ رسولؐ میں بیان کیۓ گئے ہیں۔ اِن کی جملہ تعداد کا علم صرف اللہ تعالےٰ ہی کو ہے۔

وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ الآیۃ (المدثر آیت ۳۱)

اور تیرے رب کے لشکروں کو خود اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

قرآن حکیم میں فرشتوں کا ذکر (۸۶) آیات میں ۸۸ مرتبہ آیا ہے۔

(۱۰) جنّات کا تعارُف

فرشتوں کی طرح جنّات بھی اللہ تعالےٰ کی مستقل مخلوق ہیں۔ اِن کی تخلیق میں آگ کا عُنصر غالب ہے، یہ بھی مختلف شکل اختیار کر سکتے ہیں، اِن میں نیک و بد دونوں قسم ہیں۔ شریعتِ الٰہی کے یہ بھی مکلف (پابند) ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِن کی طرف بھی مبعوث فرمائے گئے ہیں اسی لئے آپؐ کو "رسول الثقلین" (جن وانس کے رسولؐ) کہا جاتا ہے۔ آپؐ نے اِن کے شہروں کا بھی سفر فرمایا ہے۔ احادیث میں "لَیْلَۃُ الْجِنِّ" کا تذکرہ آیا ہے۔ روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ۶ پانچ دفعہ جنّات کی دعوت پر اِن کے شہروں کا سفر فرمایا ہے۔ اور انکے قبائل میں اسلام کی دعوت دی ہے۔ سینکڑوں جنّات نے اسلام قبول کیا۔ ان کے وفود آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ اور آپؐ سے اسلام و ایمان کی باتیں معلوم کرتے تھے۔ کتب احادیث میں جنّات کے بعض خاص احکام بھی مذکور ہیں۔

قرآن حکیم میں ایک مستقل سورہ (سورۃ الجن) مذکور ہے اور سورۃُ الاحقاف کا آخری رکوع بھی انہی سے متعلق ہے جس کا ترجمہ یہاں قابلِ ذکر ہے۔

اے نبی وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جب ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ کی طرف لے آئے تھے تاکہ وہ قرآن سُنیں، پھر جب وہ اُس جگہ پہنچے (جہاں آپؐ قرآن پڑھ رہے تھے) تو اُنھوں نے آپسمیں کہا خاموش ہو جاؤ، پھر جب قرآن کی تلاوت ختم ہوئی تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔

اُنھوں نے کہا، اے ہماری قوم کے لوگو، ہم نے ایک کتاب سُنی ہے جو موسیٰؑ کے بعد نازل کی گئی ہے، تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی کتابوں کی، رہنمائی کرتی ہے حق اور راہِ راست کی طرف۔

اے ہماری قوم کے لوگو، اللہ کی طرف بُلانے والے کی دعوت قبول کرلو اور اُس پر ایمان لے آؤ، اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں عذاب الیم سے بچا دیگا۔ اور جو کوئی اللہ کے داعی کی بات نہ مانے گا تو وہ زمین (کے کسی حصہ) میں (بھاگ کر خدا کو) ہرا نہیں سکتا اور خدا کے سوا اُس کا کوئی مددگار نہ ہوگا، اور ایسے لوگ صریح گمراہی میں ہونگے۔

(احقاف آیات ۲۹ تا ۳۲)

جنات میں ولادت وموت کا سلسلہ بھی ہے، ان کی عمریں نسبتاً انسانوں سے زیادہ طویل ہوتی ہیں۔ قرآن حکیم نے ان کے بارے میں یہ وضاحت کی ہے کہ وہ انسانوں کو جس طرح دیکھ لیتے ہیں انسان اُن کو دیکھ نہیں سکتا۔

إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (اعراف آیت ۲۷)

بیشک وہ اور اس کے ساتھی تم کو ایسی جگہ سے دیکھ لیتے ہیں جہاں سے تم اُنہیں دیکھ نہیں سکتے۔

قرآن حکیم کی (۳۱) آیات میں (۳۲) مرتبہ جنّ کا لفظ آیا ہے۔

چونکہ فرشتے اور جنّات ہم کو نظر نہیں آتے صرف اس وجہ سے اُن کے وجود کا انکار کردینا کوئی معقول بات نہیں ہوگی۔ کائنات میں آج بھی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو انتہائی حساس دُوربین وخُوردبین سے بھی دیکھی نہیں جاسکتی۔ لیکن اسکے باوجود ماھرین فلکیات ان چیزوں کا اقرار کرتے ہیں اور ایسی غیر مشاہد اشیاء کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں، ماضی قریب میں بہت سی چیزوں کا انکار کیا جاتا تھا لیکن آج انکو تسلیم ہی نہیں بلکہ دلیل سے ثابت بھی کیا جاتا ہے اور اُن کے وجود پر دلائل قائم ہیں۔ فرشتوں اور جنات کے بارے

میں قرآن حکیم ہم کو اِس کا یقین دلاتا ہے اور اُن کے وجود کو مستقل وجود قرار دیتا ہے تو اب ہم کو کسی کے نظریات سے متاثر ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا الآیۃ (سورۃ النساء ع۱۲۲)

اور اللہ کی بات سے زیادہ کس کی بات سچی ہوسکتی ہے؟

(۱۱) ایک مُشتِ خاک

تخلیقِ سیدنا آدم علیہ السلام کے سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ایک مُشتِ خاک پر جب اللہ کی عنایت و توجہ پڑی تو اُسکی عظمت و مرتبت کہاں سے کہاں تک پہنچی، وہ "مسجودِ ملائکہ" ہوئے۔ "خلیفۃُ اللہ" کا منصب اور "صفی اللہ" کا لقب پایا۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت و کرم اگر کسی معمولی شئ پر بھی پڑ جائے تو وہ بڑے سے بڑے مرتبے اور جلیل القدر منصب پر فائز ہوجاتا ہے۔

(۱۲) فطرت کی حکمرانی

لغزش سیدنا آدم علیہ السلام سے یہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ بایں جلالت وعظمت بڑے سے بڑے کمالات پر فائز ہوکر بھی انسان اپنی بشری وطبعی خصوصیات سے خارج نہیں ہوتا۔ سیدنا آدم علیہ السلام جو کمالِ انسانیت کی علامت اور اخلاق خداوندی کے اعلیٰ ترین مظہر ہیں وہ بھی ابلیس لعین کے وسوسہ سے متاثر ہوگئے۔

اخلاق وکردار کی بلندی کے باوجود انسان انسانیت کے دائرے سے باہر نہیں ہوتا۔ وہ نہ فرشتوں کی صف میں جاملتا ہے نہ اللہ نہ اللہ کی صفات کا سہیم وشریک قرار پاتا ہے۔

(۱۳) توبہ کی سُنّت

خطا کار ہونے کے باوجود اگر انسان ندامت کیساتھ اللہ کی جناب میں رجوع ہوجائے تو اس کیلئے "بابِ رحمت" بند نہیں ہوتا اور اللہ تعالےٰ کا یہ قانون قیامت تک کے لئے انسانوں میں جاری کر دیا گیا ہے کہ خطا ارادۃً ہو یا سہواً، چھوٹی ہو یا بڑی، دل کی ندامت کے ساتھ اللہ کے حضور معافی

چاہی جائے تو نہ صرف معاف ہو جائیگی بلکہ قُربِ الٰہی نصیب ہو گا۔ سیدنا آدم علیہ السلام موجودہ زمین کے پہلے انسان ہیں جن سے "توبہ کی سنت" نسلِ انسانی کو ملی۔ تذکرۂ سیدنا آدم علیہ السلام کا یہ خصوصی پہلو ہے جسکو قرآنِ حکیم نے ظاہر کیا ہے۔

(۱۴) **تذکرہ کا عبرتناک پہلو** بارگاہِ الٰہی میں بغاوت، گستاخی، عدولِ حکمی، غرور، تکبّر ایسے خطرناک نتائج پیدا کر دیتے ہیں جسکا ازالہ ممکن نہیں ہوتا، ابلیس کا یہ واقعہ عبرت ناک واقعہ ہے۔ ہزاروں سال کی عبادت و بندگی، مقدس فرشتوں کی معیت، آسمانی قیام اور جنّت کا قُرب سب کے سب ایک "عدولِ حکمی" میں خاک آلود ہو گئے۔

تذکرہ سیدنا آدم علیہ السلام کا یہ خصوصی پہلو عبرت و موعظت میں ایک عظیم درس کی حیثیت رکھتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّ ارْزُقْنَا اِتِّبَاعًا۔

تذکرہ
ہابیل و قابیل
(نسلِ انسانی کے ۲ دو بڑے بھائی)

نسلِ انسانی کے بڑے بھائی

قرآنِ حکیم نے حضرت آدم علیہ السّلام کے پہلے دو بیٹوں کا تذکرہ بغیر کسی نام کی وضاحت کے "اِبْنَیْ اٰدَمَ" آدم کے ۲ دو بیٹے کے الفاظ سے کیا ہے۔

البتہ تورات اور احادیث کی بعض کتب میں اِن دونوں کا نام قابیل اور ہابیل بیان کیا گیا ہے۔ قابیل بڑا بھائی تھا اور ہابیل چھوٹا۔

جب حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوار زمین پر اُتار دئے گئے اور منشاء الٰہی میں اس زمین پر انسانوں کو پیدا کرنا تھا تو انسانی آبادی کے اضافے کے لئے "سنت اللہ" اس طرح جاری ہوئی جسکا تذکرہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رض اور دیگر صحابہ کی روایت سے نقل کیا ہے۔ جسکا مضمون یہ ہے۔

حضرت حوار کو بیک وقت ایک لڑکا اور ایک لڑکی (توأم) پیدا ہوتے تھے اور اِن بچوں کے آپس میں نکاح کا یہ دستور بنایا گیا تھا کہ توأم (جوڑواں) پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کا نکاح دوسرے مرتبہ پیدا ہونے والے توأم لڑکے اور لڑکی کے ساتھ کر دیا جاتا تھا۔ اس شرعی دستور کے مطابق قابیل اور ہابیل کی شادی کا مسئلہ پیش آیا۔ قابیل عمر میں بڑا تھا اور اسکی بہن (جو اسکے ساتھ پیدا ہوئی تھی) ہابیل کی بہن سے بہت زیادہ حسین و جمیل تھی، قابیل یہ چاہتا تھا کہ اپنی توأم بہن سے خود ہی نکاح کرلے اور دستور کے مطابق ہابیل کو یہ موقعہ نہ دے جو اسکا شرعی حق تھا۔ جب یہ کشمکش طویل ہوگئی اور کسی طرح افہام و تفہیم کا سلسلہ کامیاب نہ ہوسکا تو حضرت آدم علیہ السلام نے وحی الٰہی کی ہدایت پر اس نامرضی قضیے کا اس طرح فیصلہ دیا کہ دونوں بیٹے اپنی اپنی کمائی

سے اللہ کی بارگاہ میں قربانی پیش کریں، جسکی قربانی قبول ہو جائے وہی اپنا ارادہ پورا کرنے کا مستحق ہوگا۔ اُس زمانے میں قربانی پیش کرنے کا یہ دستور تھا کہ کسی بلند مقام پر اپنی نذر اور قربانی رکھ دی جاتی، آسمان سے آگ نمودار ہوتی اور اسکو جلا دیتی تھی۔ یہ علامت نذر کے قبول ہونے کی سمجھی جاتی تھی۔ اس دستور کے مطابق ہابیل چھوٹے بھائی نے اپنے جانوروں میں سے ایک فربہ جانور خدا کی نذر کیا۔ اور بڑے بھائی قابیل نے اپنی کھیتی کے غلّے سے ردّی قسم کا کوئی اناج قربانی کے لئے پیش کیا۔

جب دونوں نے اپنی اپنی نذر ایک بلند پہاڑ پر رکھدی تو آسمان سے آگ نمودار ہوئی اور اُس کے چھوٹے بھائی ہابیل کی نذر کو جلا دیا، اور قابیل کی نذر ویسے ہی پڑی رہی۔ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہوگیا کہ ہابیل حق پر ہے اور قابیل ظلم اور ناحق پر۔

لیکن قابیل نے اللہ کے اس فیصلہ کو قبول نہ کیا اور اپنے چھوٹے بھائی ہابیل کا دشمن بن گیا۔ بغض و عداوت نے قابیل کو اس حد تک پاگل بنا دیا کہ وہ اپنے حق پرست بھائی کو قتل کرنے کی فکر میں پڑ گیا۔ بالآخر اپنی حرکات سے ظاہر کر دیا کہ وہ کسی بھی وقت ہابیل کو قتل کر دے گا۔

ہابیل کو جب اسکی اطلاع ہوئی تو وہ اِس گناہ کے تصور سے کانپ گیا اور اپنے تقویٰ و نیکی کو باقی رکھنے کے لئے اپنے ظالم بھائی سے یوں مخاطب ہوا۔

تیری جو مرضی ہو وہ کر گزر، میں تو اس گناہ میں خود کو ملوّث نہیں کروں گا۔ مطلب یہ تھا کہ اگر تو میرے قتل کے درپے ہوتا ہے تو ہو، میں تیرے قتل کے درپئے نہیں ہونگا۔ رہا قربانی والا معاملہ وہ تو واضح ہے کہ اللہ نیک اور حق پرست انسانوں ہی کی قربانی قبول کرتا ہے۔ یعنی اگر تیری قربانی قبول نہیں ہوئی تو یہ میرے کسی قصور کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اسکی وجہ یہ ہے کہ تجھ میں تقویٰ نہیں ہے۔ لہذا میری جان کے بجائے تجھ کو اپنے اندر تقویٰ پیدا کرنے کی فکر کرنی چاہیئے۔ قربانی کے اس امتحان سے تجھ کو ہدایت و نصیحت حاصل کرنی چاہیئے۔ یہ ہی دنیا و آخرت کی فلاح کا ذریعہ ہے۔

انسان کا پہلا قتل

حضرت آدم علیہ السلام کے اس نیک بیٹے ہابیل کی مخلصانہ نصیحت و ہدایت کا اُلٹا اثر ہوا اور قابیل

نے طیش میں آکر اپنے حق پرست بھائی ہابیل کو قتل کر ڈالا۔ اس وقت ہابیل کی عمر بیس سال تھی۔

رُوئے زمین پر ابھی تک قتل انسانی کا حادثہ نہیں ہوا تھا اور غالباً یہ دنیا میں پہلی موت بھی تھی۔ ہابیل مظلوم کی نعش زمین پر پڑی رہی نسلِ انسانی کا یہ پہلا ناحق خون تھا۔

قابیل کا جنونِ انتقام جب سرد پڑا تو یہ فکر سوار ہوئی کہ اپنے اس "عمل بد" کو کس طرح چھپایا جائے؟ اور نعش کا کیا انتظام کیا جائے؟

ابتک دفن کرنیکی سُنت جاری نہیں ہوئی تھی۔ قابیل اپنے مظلوم بھائی ہابیل کی نعش کو اپنی پُشت پر لئے پھرتا رہا، کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی۔ جب تھک گیا تو اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی، ایک کوّے کو دیکھا کہ وہ زمین کُرید کُرید کر گڑھا کر رہا تھا۔ اسکے بعد ایک مُردہ کوّے کو اسمیں چھپا دیا۔

قابیل کو احساس ہوا کہ مجھکو بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے، چنانچہ زمین کھود کر اسمیں اپنے بھائی کی نعش کو چھپا دیا۔ اسی طرح مُردہ جسم سے چھٹکارا پایا۔

اس عمل کے بعد اپنی کم عقلی پر افسوس کرنے لگا کہ ہائے افسوس میں اس کوّے سے بھی گیا گزرا ہوں جو اپنے جرم کو چھپانے کی بھی اہلیت نہیں رکھتا۔ افسوس میں ایک حقیر جانور سے بھی کمتر ہوں اور مجھ میں اتنی بھی عقل نہیں۔ اُسکے بعد اُس کی عقل جاتی رہی اور بدن سیاہ پڑ گیا اور اسی حالت میں وہ فوت ہو گیا۔

قرآن حکیم کی آیات ذیل انہی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔

قرآنی مضمون

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ الخ (مائدہ آیات ۲۷ تا ۳۱)

اور آپ اِن اہل کتاب کو آدم کے دونوں بیٹوں کا قصہ صحیح طور پر پڑھکر سُنائیے جبکہ دونوں نے (بارگاہِ الٰہی میں) ایک ایک نذر پیش کی، ان میں سے ایک کی نذر تو مقبول ہوگئی اور دوسرے کی مقبول نہ ہوئی جسکی نذر قبول نہیں ہوئی تھی کہنے لگا کہ میں تجھکو ضرور قتل کر دوں گا؟ اُس نے جواب دیا کہ اللہ تعالےٰ اہل تقویٰ کا ہی عمل قبول کرتے ہیں۔ اگر تو مجھ پر میرے قتل کرنے کے لئے دست درازی کریگا تب بھی میں تجھ کو قتل کرنے کے لئے ہرگز دست درازی کرنے والا نہیں۔ میں تو پروردگارِ عالم سے ڈرتا

ہوں، میں یوں چاہتا ہوں کہ تو میرے گناہ اور اپنے گناہ سب اپنے سر لے لے۔ پھر اہلِ دوزخ میں شامل ہو جائے، اور یہ ہی سزا ہوتی ہے ظلم کرنے والوں کی۔

سو اُسکے جی نے اسکو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا پھر اُس نے بھائی کو قتل کر ڈالا، جس سے وہ نقصان اُٹھانے والوں میں شامل ہو گیا۔

پھر اللہ نے ایک کوّا بھیجا کہ وہ زمین کو کھودتا تھا تاکہ وہ اُسکو تعلیم کرے کہ اپنے بھائی کی نعش کو کس طریقے سے چھپائے، کہنے لگا افسوس میری حالت پر کیا میں اس سے بھی گیا گزرا کہ اس کوّے ہی کی طرح ہوتا تاکہ اپنے بھائی کی نعش کو چھپا دیتا سو وہ بڑا شرمندہ ہوا۔

نتائج و عبر

(۱) مقتلِ ہابیل

دمشق (ملک شام) کے شمال میں جبل قاسیون پر ایک زیارت گاہِ عام چلی آرہی ہے جو "مقتل ہابیل" کے نام سے مشہور ہے۔ مؤرخ ابن عساکر نے احمد بن کثیرؒ کے تذکرہ میں اُن کا ایک خواب بھی نقل کیا ہے۔ جس میں مذکور ہے کہ احمد بن کثیرؒ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا آپؐ کے ساتھ ہابیل بھی تھے۔ ہابیل نے قسم کھا کر کہا کہ یہ ہی میرا مقتل ہے۔ اس پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی تصدیق فرمائی۔ واللہ اعلم۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی کتاب "البدایہ والنہایہ" میں اس واقعہ کو نقل کر کے یہ کلام کیا ہے کہ اگرچہ یہ خواب سچا ہے تاہم اس سے کوئی شرعی یا تاریخی حکم ثابت نہیں ہوتا۔

(۲) دفن کا پاکیزہ طریقہ

ہابیل چونکہ خدا کا مقبول بندہ تھا اس لئے اُس کے بدن کی تعظیم و تکریم کے لئے دفن کا پاکیزہ طریقہ رائج کیا گیا جو قیامت تک کے لئے نسلِ انسانی کی سنت قرار پائی، اور اس سے بہتر کوئی اور طریقہ آج تک وجود میں نہ آیا۔ دراصل نیکوں کی حیات و موت دونوں ہی قابلِ تذکرہ ہوتی ہیں۔

(۳) قابیل کی حیثیت

قابیل کے کفر یا ایمان کے بارے میں کوئی قابل ذکر روایت موجود نہیں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اُس کا نادم و شرمندہ ہونا اُسکے توبہ و استغفار کی علامت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ندامت بھائی کے قتل پر نہیں تھی بلکہ قتل پر جو نقصانات پیش آئے اُس پر تھی۔ یعنی نعش کے دفن کرنے میں حیران ہونا، اپنے کندھوں پر اُٹھائے اُٹھائے پھرنا، کوے کی تعلیم کا محتاج ہونا، بدحواس ہوجانا، بدن کا سیاہ پڑجانا، حضرت آدم علیہ السّلام کا ناراض ہوجانا وغیرہ وغیرہ۔

محقق تھانوئیؒ اس پر لکھتے ہیں کہ اگر یہ ندامت قتل ہی پر پیدا ہوئی ہو تو تب بھی اِس سے توبہ ثابت نہیں ہوتی کیونکہ توبہ کیلئے شرط یہ ہے کہ ندامت کے بعد معذرت اور فکرِ تدارک بھی ہو اور یہ قابیل سے ثابت نہیں۔ رہا ندامت کا پیدا ہونا محض طبعی طور پر تھا جو عقل کا بھی تقاضہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ صرف ندامت توبہ کی علامت نہیں۔

(۴) مقامِ عبرت

امام احمدؒ نے اپنی مُسند میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا میں جب بھی کوئی ناحق خون ہوتا ہے تو اُسکا گناہ حضرت آدمؑ کے بیٹے (قابیل) کی گردن پر ضرور پڑتا ہے، اسلئے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ظالمانہ قتل کی ابتداء کی ہے اور یہ ناپاک طریقہ جاری کیا (الحدیث)

انسان کو اپنی زندگی میں ہرگز ہرگز ایسا کام نہ کرنا چاہیئے جو آئندہ بدکاروں اور ظالموں کیلئے بُرا نمونہ و مثال بنے، ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ کائنات میں جو بھی شخص آئندہ کسی ظلم اور بدعت کا کام کرے گا تو وہ بانئ ظلم و بدعت بھی اس گناہ میں برابر کا حصہ دار ہوگا۔ گناہ بہرحال گناہ ہے ہی لیکن گناہ کی ایجاد بھی مُوجد کیلئے ہمیشہ ہمیشہ سامانِ جہنم فراہم کرتی رہیگی۔ اسلئے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم بدعت کو سخت ترین گناہ خیال کرتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن مغفلؓ اپنے صاحبزادے کو نماز کے ایک مسئلہ پر تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

بیٹا بدعت سے بچو کیونکہ میں نے اصحاب نبیؐ میں سے ہر ایک کو دیکھا کہ وہ بدعت سے زیادہ اور کسی گناہ کو شدید نہیں سمجھا کرتے تھے۔ (ترمذی ج ۲ ابواب الصلوٰۃ)

تذکرہ سیّدنا ادریس علیہ السّلام

اسمِ گرامی حضرت شیث بن آدمؑ کی اولاد میں پانچویں پشت پر حضرت ادریس علیہ السلام کا اسمِ گرامی بیان کیا گیا ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے "البدایہ والنہایہ" میں ذکر کیا ہے کہ حضرت آدمؑ علیہ السلام اور حضرت شیث علیہ السلام کے بعد یہ تیسرے نبی ہیں۔ حضرت شیث علیہ السّلام کا کوئی تذکرہ قرآن حکیم میں موجود نہیں ہے۔ البتہ تاریخ وسیرت کی کتابوں میں مختصر تذکرہ ملتا ہے۔

حضرت ادریس علیہ السّلام کا سلسلۂ نسب اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

اخنوخ (ادریسؑ) بن یارد بن مہائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم (علیہ السّلام)

حضرت ادریس علیہ السّلام کا ذکر قرآن حکیم میں دو مقام پر آیا ہے ایک سورہ مریم اور دوسرے سورۂ انبیاء میں۔

حضرت ادریس علیہ السّلام کے نام ونسب اور زمانہ بعثت کے متعلق مؤرخین میں سخت اختلافات ہیں۔

تمام اختلافی امور کو سامنے رکھنے کے بعد بھی کوئی فیصلہ کن رائے قائم نہیں جا سکتی حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم نے اپنے مقصد (رُشد وہدایت) کے پیشِ نظر تاریخی وجغرافیائی بحث سے اجتناب کیا ہے۔ اور صرف اُن کی نبوّت، رفعت مرتبت اور اُنکے صفاتِ عالیہ کا ذکر کیا ہے۔ اسی منشاء کے تحت احادیث رسول بھی اس سے آگے نہیں جاتیں۔ البتہ ضروری ضروری تذکرہ کتب احادیث سے مل جاتا ہے۔

قرآنی مضمون

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا الآیۃ
اور یاد کرو قرآن میں ادریسؑ کو، بلاشبہ تھے وہ سچے نبیؑ۔ اور بلند کیا ہم نے ان کا مقام۔ (مریم آیت ۵۶۔۵۷)

وَإِسْمَاعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِينَ۔ الآیۃ
اور اسمٰعیلؑ اور ادریسؑ اور ذوالکفلؑ، ان میں سے ہر ایک صبر کرنے والوں میں سے تھا۔ اور ہم نے انھیں اپنی رحمت میں داخل کر لیا تھا بلاشبہ یہ سب نیکوکاروں میں سے تھے۔ (انبیاء آیت ۸۵۔۸۶)

نتائج وعبر

(۱) علم رمل کی ایجاد

صحیح ابن حبان میں ایک روایت ملتی ہے کہ حضرت ادریسؑ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس زمین پر سب سے پہلے قلم کا استعمال کیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی صحابی نے علم رمل کے بارے میں دریافت کیا کہ یہ علم کیسا ہے؟ (علم رمل چند مخصوص لکیروں ونشانات کا علم ہے جس کے ذریعہ معلومات حاصل کی جاتی ہیں) آپؐ نے ارشاد فرمایا یہ علم ایک نبیؑ کو دیا گیا تھا، پس اگر کسی شخص کے نقوش وخطوط اسکے مطابق آجاتے ہیں تو نشانہ ٹھیک بیٹھ جاتا ہے ورنہ نہیں۔ اکثر محدثین نے اِس نبیؑ سے مراد حضرت ادریس علیہ السلام سمجھا ہے۔ واللہ اعلم۔

بخاری ومسلم کی "حدیث معراج" میں اس قدر تذکرہ اور ملتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر معراج میں حضرت ادریس علیہ السلام سے چوتھے آسمان پر ملاقات کی تھی۔
(صحیح بخاری باب الاسراء صحیح مسلم ج۱ باب الاسراء)

ابن جریر طبریؒ نے اپنی مشہور زمانہ تفسیر میں کعب احبارؓ کی ایک روایت سند کے ساتھ نقل کی ہے۔

لیکن یہ کعب احبارؓ ایک یہودی عالم تھے جو خلافت فاروقی میں مسلمان ہو گئے تھے تورات اور انجیل سے واقعات بکثرت نقل کیا کرتے تھے۔ بہر حال اہل علم ان کے روایت کردہ واقعات پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں کرتے ہیں۔

ابن جریر طبریؒ کعب احبارؓ کی یہ روایت ہلال بن یساف کی سند سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کعب احبارؓ سے حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق اس آیت کا مطلب دریافت کیا۔

وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا۔ (مریم آیت ۵۷)

اور ہم نے ادریس کو بلند مقام پر اُٹھا لیا۔

کعب احبارؓ نے جواب دیا کہ اللہ تعالےٰ نے ایک مرتبہ حضرت ادریس علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ اے ادریسؑ تمام اہل دُنیا روزانہ جس قدر نیک عمل کرتے ہیں میں ہر روز اُتنا اجر و ثواب تم کو عطا کرتا رہوں گا۔

حضرت ادریس علیہ السلام نے جب یہ سُنا تو دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میری حیات دراز ہونی چاہیئے تاکہ نیکیوں کے بڑے بڑے ذخیرے بن جائیں اور جنت کے اعلےٰ درجات نصیب ہوں۔ پھر اُنھوں نے اپنے ایک دوست فرشتے پر اللہ تعالےٰ کی اس وحی کا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا اور یہ بھی خواہش ظاہر کی فرشتۂ موت سے اس بارے میں گفتگو کی جائے تاکہ میری زندگی دراز ہو جائے۔

اِسپر دوست فرشتے نے حضرت ادریس علیہ السلام کو اپنے بازوؤں پر بٹھا کر آسمان کی طرف پرواز کیا۔ جب دونوں چوتھے آسمان سے گزر رہے تھے تو راہ میں فرشتہ موت زمین پر اُتر رہے تھے وہیں دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ دوست فرشتے نے فرشتۂ موت سے حضرت ادریس علیہ السلام کی خواہش کا اظہار کیا، اسپر فرشتۂ موت نے دریافت کیا کہ ادریس کہاں ہیں؟

دوست فرشتے نے کہا میری پُشت پر سوار ہیں!

اسپر فرشتۂ موت نے کہا ابھی ابھی بارگاہِ الٰہی سے حکم ملا ہے کہ میں ادریسؑ کی روح کو چوتھے آسمان پر قبض کروں۔

میں سخت حیرت و تعجب میں تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے جبکہ ادریسؑ زمین پر ہیں۔

اسکے بعد فرشتہ موت نے حضرت ادریس علیہ السلام کی روح وہیں چوتھے آسمان پر قبض کرلی۔

یہ واقعہ نقل کرکے کعب احبارؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے اللہ تعالٰے کے اس ارشاد وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا اور ہم نے ادریسؑ کو بلند مقام پر اُٹھا لیا۔ کی یہی تفسیر ہے۔ (انتہی)

بعینہٖ یہ ہی واقعہ محدث ابن ابی حاتمؒ نے اپنی تفسیر میں ایک دوسری سند سے نقل کیا ہے۔ لیکن دیگر مفسرین نے ان روایات پر تنقید کی ہیں۔ ابن کثیرؒ نے اسکو اسرائیلی روایت[1] کہا ہے۔ تاہم آیت قرآن کی تفسیر اس روایت پر موقوف نہیں ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالٰے نے حضرت ادریس علیہ السلام کو دنیا و آخرت میں بلند مقام عطا کیا ہے۔ یا یہ کہ چوتھا آسمان اُن کی قیام گاہ ہے جیسا کہ بخاری و مسلم کی روایت میں مذکور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج میں حضرت ادریس علیہ السلام سے چوتھے آسمان پر ملاقات کی۔

علاوہ ازیں کعب احبارؒ والی روایت کو تاریخی روایت تسلیم کیا جائے تو اس کی حیثیت صرف نقل روایت سے زیادہ اور کچھ نہ ہوگی۔ اور جن مفسرین نے بھی مذکورہ روایت اپنی اپنی کتاب میں نقل کی ہیں۔ غالباً اُن کا مقصد بھی "نقلِ روایت" سے زیادہ اور کچھ نہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔

(۲) حضرت ادریس علیہ السلام کا مزید تعارف

حضرت ادریس علیہ السلام کا مقام پیدائش مصر کا ایک قریہ "منف" بیان کیا جاتا ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ یونان کا کوئی شہر تھا۔ یونانی لوگ انکو "ہرمس الہرامہ" (ماہرین علوم نجوم کا استاذِ اوّل) کہتے ہیں۔ ہرمس یونان کا ایک مشہور منجم گزرا ہے۔ یونانی لوگ حضرت ادریس علیہ السلام اور ہرمس کو ایک ہی شخص تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایسی بات ہے جس پر کوئی دلیل نہیں۔

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام بابل میں پیدا ہوئے اور وہیں جوان ہوئے۔ ابتدائی عمر میں حضرت شیث بن آدم علیہ السلام سے علم

---

[1] یعنی تورات اور انجیل کے بیان کردہ واقعات۔

حاصل کیا جب سِن شعور کو پہنچے تو نبوت سے سرفراز ہوئے اور اپنی قوم کی ہدایت کے لئے جدوجہد شروع کی۔ لیکن قوم نے ان کی سخت مخالفت کی، البتہ ایک مختصر جماعت ایمان لے آئی۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے قوم کی مسلسل مخالفت کے بعد ہجرت کا ارادہ کرلیا۔ تو مسلمان قوم پر ترکِ وطن بھاری گزرا کہ بابُل جیسا خوبصورت شہر پھر کہاں ملیگا؟

حضرت ادریس علیہ السلام کی تسلّی اور اطمینان دلانے پر قوم نے ہجرت میں ساتھ دیا اور مصر آگئے۔ یہاں پہونچکر یہ لوگ دریائے نیل کی شادابی سے بہت خوش ہوئے، حضرت ادریس علیہ السلام نے یہاں اپنے تبلیغی سلسلے کو جاری رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس وقت ملک مصر میں ۷۲ زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت ادریس علیہ السلام کو اِن تمام زبانوں کا علم عطا کیا تھا۔ ہر قوم میں اُنھی کی زبان کے ذریعہ پیغام حق پہنچاتے تھے۔ اِن شہروں کی تعداد کم وبیش دوسو بیان کی جاتی ہیں۔

اسی دور میں علم فلکیات نہایت عروج پر تھا۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت ادریس علیہ السلام کو علمِ فلکیات کے ساتھ علم طب بھی عطا کیا تھا۔

(۳) حضرت ادریس علیہ السّلام کا حُلیہ مُبارک

گندمی رنگ، دراز قد، سر پر بال قدرے کم، خوبصورت گھنی ڈاڑھی، رنگ وروپ میں ملاحت ودلکشی، مضبوط بازو، عریض مونڈھے، چھریرا بدن، سرمگیں چمکدار آنکھیں، گفتگو باوقار، خاموشی پسند، متین وسنجیدہ، چلتے وقت نگاہیں نیچی، دائم الفکر۔

حضرت ادریس علیہ السلام کی عمر شریف ۸۲ سال بیان کی جاتی ہے۔ اُنکی انگوٹھی پر یہ عبارت کندہ تھی۔ الصّبرُ مع الایمان باللہ یُورِثُ الظفر۔
ایمان باللہ کیساتھ صبر اختیار کرنا کامیابی کا ذریعہ ہے۔
(ماخوذ از تاریخ الحکماء ج ۱)

(۴) حضرت ادریس علیہ السلام کی تعلیمات کا خُلاصہ

۱۔ خدا کی ذات اور اُسکی توحید پر ایمان لانا۔

۲۔ صرف خالقِ کائنات ہی کی عبادت کرنا۔
۳۔ عذابِ آخرت سے بچنے کے لئے نیک اعمال اختیار کرنا۔
۴۔ دنیا سے بے التفاتی رکھنا۔
۵۔ عدل و انصاف کو ہر معاملہ میں پیشِ نظر رکھنا۔
۶۔ مقررہ طریقہ پر ہی عبادتِ الٰہی بجالانا۔
۷۔ ایام بیض (ہر ماہ قمری کی ۱۳-۱۴-۱۵) تاریخ کا روزہ رکھنا۔
۸۔ جہاد کا فریضہ جاری رکھنا۔
۹۔ زکوٰۃ ادا کرنا۔
۱۰۔ طہارت و نظافت سے ہمیشہ متصف رہنا۔
۱۱۔ ہر نشہ آور چیز سے پرہیز کرنا۔
۱۲۔ نذر و قربانی میں اللہ کے نام پر جانوروں کی قربانی کرنا۔
۱۳۔ پھلوں اور پھولوں میں ہر موسم کی پہلی چیز صدقہ کرنا۔

(۵) اقوالِ حکمت

حضرت ادریس علیہ السلام کے بہت سے پند و نصائح اور آداب و اخلاق کے جُملے مشہور ہیں جو مختلف زبانوں میں ضرب المثل اور رموز و اسرار کی طرح مستعمل ہیں۔ اِن میں بعض درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ خدا کی بیکراں نعمتوں کا شکر انسانی طاقت سے باہر ہے۔
۲۔ جو علم میں کمال اور عمل صالح کا خواہشمند ہو اُس کو جہالت کے اسباب اور بدکرداری کے قریب نہ جانا چاہیئے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ کاریگر اگر سینے کا ارادہ کرتا ہے تو سوئی ہاتھ میں لیتا ہے نہ کہ برما۔
۳۔ دُنیا کی بھلائی حسرت ہے اور بُرائی ندامت۔
۴۔ خدا کی یاد اور عمل صالح کیلئے خلوص نیت شرط ہے۔
۔ جھوٹی قسمیں نہ کھاؤ، اور نہ اللہ کے ناموں کو تختۂ مشق بناؤ (یعنی قسمیں کھانے کیلئے) اور نہ جھوٹوں کو قسمیں کھانے پر آمادہ کرو۔ کیونکہ ایسا کرنے میں تم بھی شریک گناہ ہو جاؤ گے۔

۶۔ ذلیل پیشوں کو اختیار نہ کرو۔
۷۔ اپنے بادشاہوں کی اطاعت کرو اور اپنے بڑوں کے سامنے پست رہو۔
۸۔ ہر وقت حمد الٰہی میں اپنی زبان تر رکھو۔
۹۔ حکمت روح کی زندگی ہے۔
۱۰۔ دوسروں کی خوش عیشی پر حسد نہ کرو، اسلئے کہ انکی یہ مسرور زندگی چند روزہ ہے۔
۱۱۔ جو ضروریات زندگی سے زیادہ طالب ہوا وہ کبھی قانع نہ ہوا۔

تاریخ الحکماء کے صفحہ ۳۴۴ پر ہرمس ثالث کے تذکرہ میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ علماء کی ایک جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ طوفانِ نوح ؑ سے پہلے دُنیا میں جسقدر بھی علوم تھے اُن سب کے معلّم اوّل حضرت ادریس علیہ السلام (ہرمس اوّل) ہیں جو مصر کے حصۂ اعلیٰ کے باشندے تھے۔ اِن علماء کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ فلسفہ کی کتابوں میں جن علمی جواہر اور حرکاتِ نجوم کا تذکرہ ملتا ہے۔ سب سے پہلے اِن کا ذکر حضرت ادریس علیہ السلام ہی کی زبانِ مبارک سے ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے ہیکلوں کی تعمیر، علم طب کی ایجاد، ارضی وسماوی اشیاء کے متعلق موزوں قصائد کے ذریعہ اظہار خیال بھی انہی کی اوّلیات میں سے ہیں۔ اُنھوں نے ہی سب سے پہلے طوفان کی اطلاع دے کر بندگانِ خدا کو ڈرایا تھا۔

(۶) حضرت ادریس علیہ السلام کی پیشینگوئی

حضرت ادریس علیہ السلام نے اپنی امت کو یہ بھی بتایا کہ میری طرح اس عالم میں دینی و دُنیاوی اصلاح کیلئے بہت سے انبیاء کرام تشریف لائینگے اور اُنکی نمایاں خصوصیات یہ ہوں گی۔

وہ ہر ایک بُری بات سے پاک ہوں گے، انسانی فضائل میں کامل و مکمل ہوں گے، زمین وآسمان کے احوال سے واقف ہوں گے، مستجابُ الدعوات ہوں گے، اُن کی تعلیم کا خلاصہ کائنات کی اصلاح ہوگا۔

تذکرۂ اوّل الرُّسُل
سیّدنا نُوح علیہ السّلام

اوّل الرُّسل سیّدنا آدم علیہ السّلام کے بعد سیّدنا نوح علیہ السّلام پہلے نبی ہیں جن کو رسالت سے سرفراز کیا گیا۔

رسول ایسے نبی کو کہا جاتا ہے جنکو مستقل کتاب الٰہی یا جدید شریعت دیجاتی ہے ایسے نُفوس قُدسیہ کی جملہ تعداد (۳۱۳) بیان کی جاتی ہے۔

نبیؑ ایسی شخصیت کو کہا جاتا ہے جنہیں اللہ تعالےٰ نے اپنی وحی اور کلام کے لئے منتخب کیا ہو۔ ایسے نفوس قُدسیہ اپنے پیشرو رسول کی تعلیمات کے مبلّغ ہوتے ہیں انپر نہ کوئی مستقل شریعت نازل کی جاتی ہے اور نہ کتاب۔ ایسے نفوس کی تعداد ایک لاکھ سے زائد بیان کی گئی ہے۔

صحیح مسلم باب شفاعت میں حضرت ابوہریرہ رضؓ سے ایک طویل روایت میں یہ صراحت آئی ہے۔ یَا نُوحُ اَنْتَ اَوَّلُ الرُّسُلِ اِلَی الْاَرْضِ (الحدیث)

اے نوح تم زمین پر پہلے رسول ہو (جنھیں مستقل شریعت دی گئی)

سیدنا ادریس علیہ السّلام کی تیسری پُشت میں سیدنا نوح علیہ السلام کا تذکرہ ملتا ہے۔ علمِ انساب کے ماہرین نے بحث و تلاش کے بعد حضرت آدم علیہ السّلام اور حضرت نوح علیہ السّلام کے درمیان ایک ہزار چھبیس سال (۱۰۲۶) کا زمانہ لکھا ہے، لیکن بعض سوانح نگار مؤلفین کو اس تخمینہ سے سخت اختلاف ہے۔ اِن حضرات کا کہنا ہے کہ چھ یا آٹھ پُشتیں سیدنا آدم علیہ السّلام اور سیّدنا نوح علیہ السلام کے درمیان ہیں ان کے لئے اتنا طویل زمانہ ممکن نہیں، بلکہ پانچ سے سات سو سال کا عرصہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ ہر نسل کی عمر اگر ایک سو سال بھی فرض کرلی جائے تو چھ یا آٹھ پشتوں

میں سات آٹھ سو سال کا عرصہ ہونا چاہیئے۔
لیکن اِن حضرات کا یہ قیاس کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتا کیونکہ انہی مؤرخین نے سیدنا آدم علیہ السلام اور اُن کے بیٹوں کی عمریں نہایت طویل لکھی ہیں۔ اسلئے ممکن ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام اور سیدنا نوح علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار چھبیس سال کا زمانہ آجائے۔ واللہ اعلم۔

سلسلۂ نسب

سیدنا نوح علیہ السلام کا سلسلۂ نسب اسطرح بیان کیا گیا ہے نوح بن لامک بن متوشالح بن اخنوخ بن یارد بن مہلئیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم علیہ السلام۔

سیدنا نوح علیہ السلام اور قرآن حکیم

قرآن حکیم کا یہ اپنا خاص اسلوب ہے کہ وہ تاریخی واقعات کو جب بھی بیان کرتا ہے تو اپنے مقصد (جسے روحِ قرآن کہا جاتا ہے) "وعظ و تذکیر" کے پیش نظر واقعہ کے اُن ہی اجزاء کو بیان کرتا ہے جو اس مقصد کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ اسلئے کہیں اختصار اور کہیں تفصیل میں یہ ہی مقصد سامنے ہوتا ہے اور یہ ہی حکمت ہے ایک واقعہ کو کئی کئی بار بیان کرنے میں۔ مقصود وعظ و تذکیر ہے اس لئے ایک ہی واقعہ جابجا ملتا ہے۔ بہت کم ایسا ہے کہ ایک واقعہ پورا کا پورا ایک ہی جگہ آگیا ہو۔ قرآن کے اس اسلوبِ خاص کو ہر جگہ پیشِ نظر رکھنے پر وعظ و تذکیر کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہاتھ آجاتا ہے۔ اسی اُسلوبِ خاص کے مطابق قرآن حکیم نے سیدنا نوح علیہ السلام کا واقعہ کہیں مختصراً اور کہیں تفصیلاً بیان کیا ہے۔

قرآن حکیم کی (۲۸) سورتوں میں اختصار و تفصیل کے ساتھ سیدنا نوح علیہ السلام کا اسم مبارک اور تذکرہ (۴۱) جگہ ملتا ہے۔ لیکن اس واقعہ کی اہم تفصیلات سورۂ اعراف، ہود، مومنون، شعراء، قمر، اور سورۂ نوح میں ملتی ہیں۔

اِن (۲۸) سورتوں کی تفصیل یہ ہے :-

۱۔ سورۂ آلِ عمران ــــ آیت ۳۳
۲۔ " النساء ــــ آیت ۱۶۳

۳ــــ سورہ انعام ــــ آیت ــــ ۸۴
۴ــــ " اعراف ــــ آیات ــــ ۵۹، ۶۹
۵ــــ " توبہ ــــ آیت ــــ ۷۰
۶ــــ " یونس ــــ آیت ــــ ۷۱
۷ــــ " ھود ــــ آیات ــــ ۲۵،۳۲،۳۶،۴۲،۴۵،۴۶،۴۸، ۸۹
۸ــــ " ابراھیم ــــ آیت ــــ ۹
۹ــــ " الاسراء ــــ آیت ــــ ۳، ۱۷
۱۰ــــ " مریم ــــ آیت ــــ ۵۸
۱۱ــــ " الانبیاء ــــ آیت ــــ ۷۶
۱۲ــــ " الحج ــــ آیت ــــ ۴۲
۱۳ــــ " المؤمنون ــــ آیت ــــ ۲۳
۱۴ــــ " الفرقان ــــ آیت ــــ ۳۷
۱۵ــــ " الشعراء ــــ آیات ــــ ۱۰۵،۱۰۶، ۱۱۶
۱۶ــــ " العنکبوت ــــ آیت ــــ ۱۴
۱۷ــــ " الاحزاب ــــ آیت ــــ ۷۰
۱۸ــــ " الصّافّات ــــ آیت ــــ ۷۵، ۷۹
۱۹ــــ " صٓ ــــ آیت ــــ ۱۲
۲۰ــــ " المؤمن ــــ آیات ــــ ۵، ۳۱
۲۱ــــ " الشوریٰ ــــ آیت ــــ ۱۳
۲۲ــــ " قٓ ــــ آیت ــــ ۱۲
۲۳ــــ " الذّاریات ــــ آیت ــــ ۴۶
۲۴ــــ " النجم ــــ آیت ــــ ۵۲
۲۵ــــ " القمر ــــ آیت ــــ ۹
۲۶ــــ " الحدید ــــ آیت ــــ ۲۶
۲۷ــــ " التحریم ــــ آیت ــــ ۱۰
۲۸ــــ " نوح ــــ آیات ــــ ۱ تا ۲۸ (مکمل)

سیدنا نوح علیہ السلام کی دعوت اور قوم کی مخالفت

جیساکہ بیان کیا گیا سیدنا نوح علیہ السلام اور سیدنا آدم علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار سال کا زمانہ گزر گیا، اس طویل عرصے میں انسانی آبادی زمین پر پھیل چکی تھی، بیشتر انبیاء و مصلحین نے سیدنا آدم علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ کو جاری رکھا تھا۔ سیدنا آدم علیہ السلام کی بنیادی تعلیمات میں "توحید" کی دعوت و تبلیغ سب سے اہم حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ہی کام سیدنا شیث علیہ السلام اور سیدنا ادریس علیہ السلام اور دیگر مصلحین نے بھی انجام دیا ہے۔ لیکن اس طویل زمانے میں شیاطین کے بہکانے سے شرک و بُت پرستی پھیل گئی تھی۔ سیدنا نوح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے پہلے تک تقریباً تمام قوم بلکہ ایک قول کے مطابق روئے زمین پر شرک وبت پرستی نے مذہب کی شکل اختیار کرلی تھی، اور انسان "توحید خالص" سے یکسر ناآشنا ہو چکے تھے۔ اللہ واحد کی جگہ سینکڑوں بتوں نے معبودوں کا رُوپ اختیار کر لیا تھا، ان میں پانچ بت "بڑے خدا" قرار پا چکے تھے۔ اور ساری قوم اپنی زندگی کے لیل ونہار انہی بتوں پر تکیہ کرتی تھی۔

آخرکار اللہ تعالٰے نے اپنی سُنتِ قدیمہ کے مطابق انسانوں کی رہنمائی و ہدایت کے لئے اُسی قوم سے سیدنا نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو "توحید خالص" اور اللہ واحد کی عبادت کرنے کی تلقین شروع فرمائی، قوم کا جاہل طبقہ حضرت نوح علیہ السلام کو ستانے اور زدوکوب کرنے کے درپے ہوگیا، اور امراء ورؤسائے قوم نے تکذیب و تحقیر کا شعار اختیار کرلیا، اِن اہلِ دولت کا یہ ادّعا تھا کہ نوحؑ نہ تو دولت وثروت میں ہم سے بڑا ہے اور نہ قوت وطاقت میں ہمارا ہمسر ہے۔ اور نہ وہ انسانیت سے بلند کوئی مرتبہ رکھتا ہے، پھر ہم کیوں اُسکی اطاعت کریں اور کس وجہ سے اُس کو بڑا سمجھیں؟

یہ لوگ جب کبھی کمزور وضعیف افراد کو سیدنا نوح علیہ السلام کے اردگرد دیکھتے تو نہایت حقارت سے کہتے کہ اے نوح تیرے ساتھ تو صرف ایسے ہی لوگ ہیں جو نہ دولت وعزت رکھتے ہیں نہ قوت وشوکت اور نہ عقل ورائے میں ہم سے بہتر ہیں۔ بھلا ہم اِن معمولی

آدمیوں کا ساتھ کیسے دیں؟

نوح علیہ السلام انہیں افہام وتفہیم کے ذریعہ جب قریب کرنا چاہتے تو یہ متکبّرین کی جماعت یہ جواب دیتی کہ اچھا پہلے تم اپنے آدمیوں کو دور کرو ہم اِن کے قریب آنا نہیں چاہتے اسمیں ہماری توہین ہے۔ اسکے بعد ہم تمہاری بات سُنیں گے۔

سیّدنا نوح علیہ السّلام انھیں کبھی تو یہ جواب دیتے کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، یہ اللہ کے مخلص بندے ہیں۔ اگر میں انھیں اپنے سے دور کر دوں تو خدا کے عذاب میں تمہارے ساتھ میں بھی ماخوذ ہو جاؤں گا۔ یہ لوگ اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اُس کی رضاجوئی کے لئے میرا ساتھ دیتے ہیں۔ اللہ کے ہاں اخلاص واطاعت کی قدر ہے، دولت وطاقت کوئی معیار نہیں رکھتے۔ میں تمہارے پاس اللہ کا پیام لیکر آیا ہوں، نہ میں غیب دانی کا دعویٰ کرتا ہوں اور نہ فرشتہ ہونے کا، میں تو اللہ کا بندہ اور اُسکا رسول ہوں نصیحت وہدایت کرنا میرا کام ہے، یہ کمزور ونادار افراد جو سچّے دل سے اللہ پر ایمان لائے ہیں تمہاری نگاہ میں حقیر وبے حیثیت ہیں اور یہ محض اس لئے کہ اِن کے پاس تمہاری طرح دولت وطاقت نہیں، حالانکہ یہ اچھے یا بُرے ہونے کا معیار نہیں، اللہ کی نگاہ میں وہ شخص قابلِ عزت ہے جو اُس کی اطاعت کرتا ہو اور جس نے نیکی کی راہ اختیار کی ہو۔

سیّدنا نوح علیہ السلام کی اس بلیغ تبلیغ پر قوم کے سرداروں نے شہر بدر کردینے کی دھمکی دی۔ اسپر سیدنا نوح علیہ السّلام نے بڑے پُر وقار انداز میں قوم کو مخاطب کیا۔

اے قوم میں اپنی اس خدمت پر نہ تمہارے مال ودولت کی خواہش رکھتا ہوں اور نہ تم میں جاہ ومنصب کی ہوس رکھتا ہوں۔ میری نصیحت وخیر خواہی کا اجر اللہ ہی کے ہاں محفوظ ہے اور وہی بہترین قدر داں ہے۔

سیّدنا نوح علیہ السلام کی مخلصانہ دعوت اور قوم کی کھلی عداوت کا تذکرہ جو تاریخ رشد وہدایت کا زرّیں باب ہے۔ سورۂ نوح سورۂ اعراف اور سورۂ ہود میں اسطرح منقول ہے۔

إِنَّآ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِۦٓ أَنْ أَنذِرْ قَوْمَكَ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ الخ (سورہ نوح آیات ۱ تا ۲۸)

قرآنی مضمون | ہم نے نوحؑ کو اُسکی قوم کی طرف بھیجا (اس ہدایت کے ساتھ) کہ

اپنی قوم کے لوگوں کو خبردار کر دے قبل اسکے کہ اُن پر دردناک عذاب آجائے۔ نوحؑ نے کہا اے میری قوم کے لوگو، میں تمہارے لئے واضح طور پر خبردار کرنے والا رسول ہوں۔ کہ تم اللہ کی بندگی کرو اور اُس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ وہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تم کو ایک مقررہ مدت تک باقی رکھے گا، بیشک اللہ کا مقررہ کردہ وقت جب آجاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا۔ کاش تم جانتے ہوتے؟

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ الخ (اعراف آیات ۵۹ تا ۶۴)

ہم نے نوحؑ کو اُس کی قوم کی طرف بھیجا، اُس نے کہا اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُسکے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، میں تمہارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

قوم کے سرداروں نے جواب دیا ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔

نوحؑ نے کہا اے میرے قوم کے لوگو میں گمراہ نہیں ہوں بلکہ رب العالمین کا رسول ہوں۔ تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تم کو معلوم نہیں۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہے کہ تمہارے پاس خود تمہارے ہی قوم کے ایک آدمی کے ذریعہ تمہارے رب کی تذکیر ونصیحت آئی تاکہ تم خبردار ہو جاؤ اور اللہ سے ڈرو اور شاید کہ تم پر رحم کیا جائے۔

پھر اُن لوگوں نے نوحؑ کو جھٹلایا۔ آخرکار ہم نے اُن کو اور اُن کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں نجات دی اور اُن لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا یقیناً وہ اندھے لوگ تھے

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ الخ

(ہود آیات ۲۵ تا ۳۱)

ہم نے نوحؑ کو اُن کی قوم کی طرف بھیجا (نوحؑ نے کہا) میں تم لوگوں کو واضح طور پر خبردار کرنے والا ہوں۔

اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، بیشک میں تم پر ایک دردناک دن کے عذاب

کا اندیشہ کرتا ہوں۔

سو اُن کی قوم میں جو کافر سردار تھے کہنے لگے ہم تو تم کو اپنا ہی جیسا آدمی دیکھتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ تمہاری پیروی اُنھیں لوگوں نے کی ہے جو ہم میں بالکل ذلیل ہیں اور وہ بھی محض سرسری رائے سے (پیروی اختیار کرلی ہے) اور ہم تم لوگوں کو اپنے سے زیادہ فضیلت والا بھی نہیں پاتے، بلکہ ہم تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔

نوح ؑ نے کہا اے میری قوم بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر میں اپنے رب کے سیدھے راستے پر ہوں اور اُس نے اپنے پاس سے مجھے رحمت عطا فرمائی ہو پھر وہ تم کو نہ سوجھتی ہو تو کیا ہم اُس کو تم پر تھوپ دیں جب کہ تم اُس سے نفرت کئے چلے جاؤ۔

اور اے میری قوم میں تم سے اس پر کچھ مال بھی تو نہیں مانگتا۔ میرا معاوضہ تو صرف اللہ کے ذمہ ہے اور میں اُن لوگوں کو (اپنے سے) دور کرنے والا نہیں جو ایمان لے آئے ہیں وہ اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔

اور اے میری قوم! اگر میں اِن لوگوں کو دُھتکار دوں تو خدا کی پکڑ سے مجھے کون بچائیگا؟ تم لوگوں کی سمجھ میں اتنی بات بھی نہیں آتی؟

اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو تمہاری آنکھیں حقارت سے دیکھتی ہیں انھیں اللہ کوئی بھلائی نہ دے گا۔ اللہ ان کے دلوں کو خوب جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو ظالموں میں میرا شمار ہوگا۔

بے بسی اور فریاد

سیدنا نوح علیہ السلام کی مسلسل نصیحت وخیر خواہی صرف اس وجہ سے تھی کہ قوم رحمت الٰہی کی آغوش میں آجائے اور اُس عذاب سے محفوظ ہوجائے جو انبیاء کرام کو جھٹلانے پر عموماً آیا ہے۔ مگر قوم پر اس خیر خواہی کا کچھ بھی اثر نہ ہوا بلکہ بغض وعناد نے ساری قوم کو اندھا بنا دیا تھا۔ یہ لوگ سیدنا نوح علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں کی ایذا رسانی کے درپے ہوگئے۔ اور ایک شیطانی تحریک اس طرح شروع کی کہ جہاں کہیں بھی سیدنا نوح علیہ السلام

اپنا کلام حق سناتے وہاں لوگوں کو پابند کیا جاتا کہ اپنے کانوں میں اُنگلیاں رکھ لیں یا پھر اپنے چہروں پر کپڑا ڈال کر گزر جائیں تاکہ نوح پہچان تک نہ سکیں، اور اسکے ساتھ ساتھ قوم کے افراد کو سرداروں نے یہ بھی تاکید کرنی شروع کر دی کہ دیکھو اپنے پانچ بڑے خداؤں کو ہرگز ہرگز نہ بھولنا یہ ہی ہمارے نجات دہندہ ہیں اور انہی سے ہماری زندگی قائم ہے۔

سیدنا نوح علیہ السلام اور قوم کی یہ کشمکش طویل عرصہ تک جاری رہی جسکا ذکر قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر آیا ہے۔ سورہ عنکبوت میں اِس طویل کشمکش کا عرصہ ساڑھے نوسو سال بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ شعراء میں یہ وضاحت ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو سنگسار کر دینے کی بھی دھمکی دی گئی۔ یعنی سیدنا نوح علیہ السلام کو آخری و قطعی طور پر جھٹلا دیا گیا۔ سیدنا نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے فریاد کی کہ میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔ اب میرے اور ان کے درمیان قطعی فیصلہ فرما دے۔ ایسا فیصلہ کہ حق اور باطل واضح ہو جائے۔

قرآن حکیم کی آیات ذیل انہی مضامین پر مشتمل ہیں۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ ۷۱ (یونس آیات ۷۱ تا ۷۳)

قرآنی مضمون

اے نبیؐ اپنی قوم کو نوحؑ کا قصہ سُنا دیجیے اُس وقت کا قصہ جب کہ نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا اے میری قوم اگر میرا تمہارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات پڑھکر سنانا تمہارے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے تو میرا بھروسہ اللہ پر ہے۔ تم اپنے سب ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو لیکر ایک متفقہ فیصلہ کر لو، اور جو منصوبہ تمہارے پیشِ نظر ہے اس کو خوب سوچ سمجھ لو تاکہ اُس کا کوئی پہلو تمہاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہنے پائے۔ پھر میرے خلاف اُسکو عمل میں لے آؤ اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔ پس تم نے میری نصیحت سے منہ موڑا (تو میرا کیا نقصان کیا) میں تم سے کسی اجر کا طلب گار نہ تھا میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلمان بنکر رہوں۔ سو انھوں نے نوحؑ کو جھٹلایا پس ہم نے نوحؑ کو اور اُن لوگوں کو جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے بچا لیا اور انہی کو زمین کا جانشین بنایا اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری باتوں کو جھٹلایا تھا، پس دیکھ لو جنھیں خبردار کیا گیا تھا اُن کا کیا انجام ہوا؟

سورۂ مومنون میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ ا۔خ (مومنون آیات ۲۳ تا ۲۶)

اور ہم نے نوح کو اُن کی قوم کی طرف پیغمبر بناکر بھیجا، سو انھوں نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو، اُسکے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے؟ اُن کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا (نوحؑ تو) تمہاری طرح ایک بشر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم میں بڑائی حاصل کرے اور اگر اللہ چاہتا تو اس کام کے لئے فرشتوں کو بھیجتا۔ کیونکہ یہ بات ہم نے اپنے بڑوں میں کبھی نہیں سُنی (کہ اللہ نے کسی بشر کو رسول بنایا ہو) بس یہ ایک ایسا آدمی ہے جسکو جنون ہوگیا ہے۔ لہذا ایک خاص وقت تک انتظار کرلو۔ نوحؑ نے عرض کیا اے میرے رب میری مدد فرمائیے جس بات پر اُنھوں نے مجھے جھٹلایا ہے۔

سورۂ شعراء میں سیدنا نوح علیہ السلام کی خیر خواہی اور قوم کی دھمکی اس طرح بیان کی گئی ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِالْمُرْسَلِيْنَ۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ ا۔خ

(الشعراء آیات ۱۰۵ تا ۱۲۲)

نوحؑ کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔
جبکہ اُنکے (برادری کے) بھائی نوحؑ نے کہا۔ کیا تم (اللہ سے) نہیں ڈرتے؟
میں تمہارا امانت دار رسول ہوں۔
سو تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔
اور میں تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا، میرا صلہ تو ربُّ العالمین کے ذمہ ہے۔ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔
وہ لوگ کہنے لگے کیا ہم تم کو مان لیں ایسی صورت میں جبکہ کم درجہ لوگ تمہارے ساتھ ہیں۔
نوحؑ نے کہا اِن کے کام سے مجھے کیا بحث۔ اِن سے حساب کتاب لینا بس اللہ کا کام ہے، اگر تم سمجھو۔
اور میں ایمان والوں کو (اپنے سے) دُور کرنے والا نہیں ہوں۔

میں تو صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔
وہ لوگ کہنے لگے اے نوح، اگر تم باز نہ آئے تو ضرور سنگسار کر دیئے جاؤگے۔
نوحؑ نے دُعا کی اے میرے رب میری قوم نے مجھکو جھٹلا دیا ہے۔
سُو آپ میرے اور اُن کے درمیان ایک فیصلہ کر دیجئے، اور مجھکو اور جو ایمان لائے ہیں اُن کو نجات دیدیجئے۔
تو ہم نے اُن کو اور جو اُن کے ساتھ بھری کشتی میں تھے نجات دی۔
پھر اسکے بعد ہم نے باقی لوگوں کو غرق کر دیا۔
اسمیں بڑی عبرت ہے، اور اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔
اور بیشک آپ کا رب زبردست مہربان ہے۔
سورۂ عنکبوت میں اُس مدت کو بیان کیا گیا جو سیّدنا نوح علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ کا زمانہ ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ فَلَبِثَ فِیْہِمْ اَلْفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا الخ (العنکبوت آیات ۱۴، ۱۵)

اور ہم نے نوحؑ کو اُن کی قوم کی طرف بھیجا، سُو وہ اُن میں پچاس کم ایک ہزار سال رہے۔ پھر اُن کو طوفان نے آدبایا، اور وہ بڑے ظالم لوگ تھے۔
پھر ہم نے نوح کو اور کشتی والوں کو بچالیا، اور ہم نے اس واقعہ کو تمام جہان والوں کے لئے موجب عبرت بنایا۔
سورۂ صافات میں سیدنا نوح علیہ السلام کی بارگاہ الٰہی میں دُعا کا اس طرح استقبال کیا گیا۔

وَلَقَدْ نَادٰنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِیْبُوْنَ الخ
(الصافات آیات ۷۵ تا ۸۲)

اور ہم کو نوحؑ نے پکارا سُو ہم خوب فریاد سُننے والے ہیں۔
اور ہم نے ان کو اور اُن کی پیروی کرنے والوں کو بڑے بھاری غم سے نجات دے دی۔ اور ہم نے ان کی اولاد کو باقی رہنے دیا۔
اور ہم نے اُن کے لئے آنے والے لوگوں میں یہ بات رہنے دی۔

کہ نوحؑ پر سلام ہو تمام عالموں میں۔
ہم اہل اخلاص کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں۔
بیشک وہ ہمارے ایمان دار بندوں میں سے ہے۔ پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا۔

اور سورۂ نوحؑ میں سیدنا نوح علیہ السلام کی پوری دعوت و تبلیغ کا اس طرح تذکرہ کیا گیا ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّ نَهَارًا ۙ الخ (نوح آیات ۵ تا ۲۴)

نوحؑ نے دعا کی اے میرے رب میں نے اپنی قوم کو دن رات دعوت دی ہے۔
سو میری دعوت نے اُن کے فرار ہی میں اضافہ کیا۔
اور جب بھی میں نے اُن کو بلایا تاکہ تُو اُن کو معاف کر دے، انھوں اپنے کانوں میں اُنگلیاں رکھ لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیا اور (اپنی روش پر) اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔
پھر میں نے اُنھیں بآواز بلند بلایا۔
پھر کھول کر علی الاعلان کہا اور بالکل خُفیہ بھی سمجھایا۔
پھر میں نے کہا کہ معافی چاہو اپنے رب سے بیشک وہ بڑا بخشنے والا ہے۔
وہ تم پر آسمان سے خوب بارش برسائے گا۔
اور تمہیں مال و اولاد سے نوازے گا اور تمہارے لئے باغ پیدا کریگا اور تمہارے لئے نہریں پیدا کرے گا۔
تمہیں کیا ہو گیا کہ تم اللہ کے لئے کسی عظمت کا اعتقاد نہیں رکھتے؟
حالانکہ اُس نے تمہیں طرح طرح سے بنایا ہے۔
کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہہ بہ تہہ بنائے ہیں؟
اور اُن میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا۔
اور اللہ نے تمہیں زمین سے عجیب طرح پیدا کیا۔
پھر وہ تمہیں اسی زمین میں واپس لے جائیگا اور اسمیں سے تم کو پھر (اچانک) نکال کھڑا کرے گا۔

اور اللہ نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا ہے۔ تاکہ تم اُسکے کھُلے راستوں پر چلو پھرو۔

نوحؑ نے کہا اے میرے رب اُنھوں نے میرا کہنا نہیں انا اور ایسے لوگوں کی پیروی کرلی جن کے مال و اولاد نے اُن کو نقصان ہی زیادہ پہنچایا۔

اور جنھوں نے بڑی بڑی (خفیہ) تدبیریں کیں۔

اور جنھوں نے کہا (اپنی قوم کے افراد سے) تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا، اور نہ ودّ کو نہ سُواع کو اور نہ یغوث اور نہ یعوق کو اور نہ نسر کو اور اِن سرداروں نے بہت ساروں کو گمراہ کردیا۔

اور اے اللہ ظالموں کی گمراہی اور بڑھا دیجئے (تاکہ آپ کا عذاب اُنہیں جلد پکڑلے)

اپنے ہاتھوں تباہی

سیّدنا نوح علیہ السلام کی بے لوث نصیحت و خیر خواہی انتہا کو پہنچ گئی اور ہر وہ عنوان جو ہدایت و نصیحت کیلئے درکار تھا باقی نہ رہا توحید کے دلائل اور حجت تکمیل پاگئے، قوم کے پاس اب ایسا کوئی عذر باقی نہ رہا جو بت پرستی کی تائید میں پیش کیا جاسکتا تھا۔ آخر کار اُن کی قوم نے متفق ہوکر سیدنا نوح علیہ السلام سے مطالبہ شروع کردیا کہ بس اب آپ اپنی بات ختم کیجئے۔ ہم بہت سُن چکے، اپنی وہ دھمکی عملاً پوری کردیجئے جو عذاب کی شکل میں ہم پر آنے والی ہے۔

سیدنا نوح علیہ السلام نے قوم کی یہ جرأت اور اللہ عزوجل سے بے خوفی دیکھ کر پھر نہایت تحمل سے سمجھایا کہ اللہ تعالےٰ جب چاہے گا تو یہ بھی ہوجائے گا، لیکن کیا تم کو میری نصیحت کافی نہیں؟ جبکہ میں تمہارا خیر خواہ اور مخلص ہوں؟

رہا عذاب کا لانا میرے قبضے کا نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ نے تو مجھے صرف اپنا رسول بناکر تمہارے پاس بھیجا ہے۔ اُسی کے دست قدرت میں مجرموں کو معاف کرنا یا ہلاک کرنا ہے، لیکن یاد رکھو جب وہ وقت آجائے گا تو پھر کسی کے ٹالے نہ ٹلے گا۔ آیاتِ ذیل میں یہ ہی تذکرہ موجود ہے۔ قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَاَکْثَرْتَ جِدَالَنَا الخ

(ہود آیات ۳۲ تا ۳۴)

قرآنی مضمون قوم نے کہا اے نوحؑ تونے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑ چکا، اور جو تو نے ہم سے (عذاب کا) وعدہ کیا ہے وہ لے آ؟ اگر تو سچوں میں شامل ہے۔

نوحؑ نے کہا اگر اللہ چاہے گا تو وہ اُس عذاب کو بھی ضرور لے آئیگا، اور تم اسکو عاجز کردینے والے نہیں ہو۔

اب اگر میں تمہاری خیرخواہی کرنا بھی چاہوں تو میری خیرخواہی تمہیں کوئی نفع نہیں دی سکتی جبکہ (تمہارے اپنے فیصلے سے) اللہ ہی نے تمہیں بھٹکا دینے کا ارادہ کرلیا ہو۔ وہی تمہارا رب ہے اور اُسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائیگا۔

آخری منزل سیّدنا نوح علیہ السلام قوم کی ہدایت و اصلاح سے جب نا اُمید ہوگئے اور اپنی ساری جدوجہد ختم کرچکے۔ قوم کی ہٹ دھرمی اور عِناد جب اپنی آخری منزل پر آگئی اور ایک طویل زمانہ (جسکی مدت قرآنی صراحت کے مطابق ساڑھے نوسو سال ہے) گزر گیا، تاریخی روایات کے مطابق اس دراز مدت میں اسّی سے کچھ زائد افراد نے ایمان قبول کیا۔ سیّدنا نوح علیہ السلام سخت ملول و آزردہ خاطر تھے۔ اللہ تعالٰی نے تسلّی دی اور حضرت نوح علیہ السلام کو اطلاع دی گئی کہ اب آپ کا کام پورا ہوچکا ہے۔ اس قوم میں اصلاح قبول کرنے والا کوئی نہیں رہا، اِن پر اللہ کا وہ فیصلہ جاری ہونے والا ہے جو سرکش و باغی قوموں کے لئے کیا جاتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام اس اطلاع کے بعد بارگاہِ الٰہی میں دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور ایسی دُعا کی جو منشاء الٰہی کے مطابق تھی اور شاید طبقۂ انبیاء میں کسی نبی نے نہ کی ہو۔

اے رب اِن کافروں میں سے کوئی بھی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ، اگر تونے اِنکو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کردینگے، اور اِن کی نسل سے بھی جو پیدا ہوگا وہ بدکار اور سخت کافر ہی ہوگا۔ (سورۂ نوح آیت ۲۶، ۲۷)

علاوہ ازیں حضرت نوح علیہ السلام کی یہ دُعا کسی بے صبری یا جذباتی بناء پر

نہ تھی بلکہ اُس آخری لمحہ ایک مخلص و مصلح کی زبان سے بے ساختہ نکل پڑتی ہے جو رُشد و ہدایت کی مسلسل اور انتھک کوشش کرتا رہا ہو اور قوم اُسکو قبول نہ کرنے پر کمربستہ ہو چکی ہو، یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور قوم فرعون کے حق میں یہ دعا کی تھی (دراصل یہ اللہ تعالےٰ کا غیبی اشارہ ہوتا ہے) اے پروردگار اِن کے مال غارت کردے اور اِن کے دلوں پر مہر ثبت کردے، یہ ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ دردناک عذاب اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔

اللہ تعالےٰ نے اسکے جواب میں یہ ارشاد فرمایا تھا۔

اے موسیٰ تمہاری دعا قبول کر لی گئی (یونس آیات ۸۸، ۸۹)

بہر حال مصلئ نہ فطرت، اور خداوندی سُنت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی نبی کا پیغام اسکی قوم کو پہنچ جاتا ہے اور آخری حجت پوری ہو جاتی ہے تو پھر ایسی قوم کو صرف اُس مدت تک مہلت ملتی ہے جب تک کہ اِن میں کے کچھ نیک وصالح آدمیوں کے نکل آنے کا امکان رہتا ہے۔ جب اس قوم سے صالح افراد نکل آتے ہیں اور صرف فاسد عناصر ہی کا مجموعہ باقی رہ جاتا ہے تو پھر اُس قوم کو مزید مہلت نہیں دی جاتی، عدل و انصاف کا تقاضہ بھی یہ ہی ہے کہ ایسے بے صلاحیت اور بدکردار لوگوں کو ختم کر دیا جائے کہ کہیں وہ باصلاحیت اور اچھے لوگوں کو خراب نہ کردیں۔ ایسے فاسد عناصر پر رحم کرنا اور اُنھیں یوں ہی چھوڑے رکھنا ساری انسانیت پر ظلم کرنے کے مرادف ہوگا۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام کو وحیٔ الٰہی نے بھی بتلادیا تھا کہ اب جو لوگ باقی ہیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں اس طرح استغاثہ پیش کیا۔

قرآنی مضمون | وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۱۱۲
(نوح آیات ۲۶ تا ۲۸)

اور نوحؑ نے کہا اے میرے رب اِن کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ،

اگر تُو نے اِن کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کردینگے، اور اِن کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا بدکار اور سخت کافر ہی ہوگا۔

اے میرے رب مجھکو اور میرے والدین کو اور ہر اُس شخص کو جو میرے گھر میں مؤمن کی حیثیت سے داخل ہوا ہے اور سب مؤمن مردوں اور مومن عورتوں کو معاف فرمادے، اور ظالموں کے لئے بربادی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ فرما۔

سفینہ اور قوم کا استہزا

سیدنا نوح علیہ السلام کی دعا قبول ہوگئی، وحی الٰہی نے آگاہ کر دیا کہ اب اللہ کا وہ قانونِ جزا نافذ کر دیا گیا ہے جو سرکش و باغی قوموں کے لئے ہوا کرتا ہے۔

قبل اس کے کہ وہ فیصلہ آجائے حضرت نوح علیہ السلام کو ہدایت کی گئی کہ اپنی اور مؤمنین مخلصین کی بقاء و حفاظت کے لئے ایک ایسی کشتی تیار کرلی جائے جو ہمہ گیر طوفان میں نجات و سلامتی کا ذریعہ بنے!

حضرت نوح علیہ السلام اپنے مختصر ساتھیوں کے ساتھ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کاٹ کر لاتے اور کشتی سازی کے لئے دن رات کام میں مشغول ہوگئے۔

یہ ایک عجیب وغریب قسم کا کام تھا وہ قوم جو انجام سے بے خبر تھی اور جس کو نوح علیہ السلام کی باتوں پر یقین و اعتماد نہ تھا اس جہد مسلسل پر اُن کا مزاق اُڑانے لگی، اُنھیں یہ کام نہایت مضحکہ خیز معلوم ہو رہا تھا۔ یہ لوگ اس یقین سے قاصر تھے کہ ساحلِ سمندر سے بہت دور خشکی اور صرف خشکی پر ایک پہاڑ جیسی کشتی کیوں اور کیسے چلے گی؟ اِنکے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آرہی تھی کہ چند روز بعد اس زمین پر یہ کشتی طوفانی موجوں میں خیر و عافیت کے ساتھ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے اصحاب کو نجات دے گی اور قوم کا ایک ایک فرد اس ہمہ گیر طوفان میں غرق ہو کر رہے گا۔

وہ لوگ کشتی سازی کو حضرت نوح علیہ السلام کی دیوانگی کا ایک اور ثبوت قرار دے رہے تھے اور قوم کے افراد سے کہہ رہے تھے کہ نوحؑ کی عقل بھی جاتی رہی۔ یہ زمین پر کشتی چلانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اے قوم اب تو یقین کرلو کہ نوحؑ کی ساری باتیں ایسے ہی بے عقلی کی ہیں۔ نعوذ باللہ منہ۔

حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کے اصحاب نہایت متانت و سنجیدگی سے قوم کے سرداروں کو جواب دیتے کہ وہ وقت قریب آرہا ہے جب خود تمہارا مذاق اُڑے گا۔

آج ہم پر ہنس لو کل ہم تمہاری ہنسی کا جواب دیں گے۔ ایک ایسا عذاب آرہا ہے جو تم کو ہر طرف سے گھیرے گا اور تم کو پہاڑوں کی بلندی بھی نجات نہ دے سکیگی۔

آیات ذیل اسی صورتِ حال کو بیان کر رہی ہیں۔

وَ اُوۡحِیَ اِلٰی نُوۡحٍ اَنَّہٗ لَنۡ یُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِکَ اِلَّا مَنۡ قَدۡ اٰمَنَ الخ

(ہود آیات ۳۶ تا ۳۹)

قرآنی مضمون

اور نوحؑ پر وحی کی گئی کہ جو لوگ ایمان لے آئے وہ لے آئے۔ اب اِن میں سے کوئی دوسرا ایمان لانے والا نہیں، پس اِن کی حرکات پر غم نہ کرو۔ ہماری نگرانی میں ہماری وحی کے مطابق کشتی تیار کرلو، اور اب مجھ سے اُنکے بارے میں گفتگو نہ کرو، بلاشبہ یہ لوگ غرق ہونے والے ہیں۔

نوحؑ کشتی بنارہے تھے اور اُنکی قوم کے سرداروں میں سے کسی جماعت کا اُن کے پاس سے گزر ہوتا تو نوحؑ کا مذاق اُڑاتے۔ حضرت نوحؑ اُس سے کہتے اگر تم ہم پر ہنستے ہو ہم بھی تم پر ہنسینگے۔ عنقریب تم جان لوگے کہ کس پر وہ عذاب آئے گا جو اُسے رُسوا کردیگا اور کس پر وہ دائمی عذاب اُتر پڑے گا ؟

عذاب کی آمد اور ضروری ہدایات

اللہ تعالےٰ کی حفاظت و نگرانی میں سفینہ تیار ہوگیا، تاریخی روایات کے مطابق یہ سفینہ تین سو گز لمبا اور تیس گز اونچا تھا۔ (ابن کثیر) حضرت نوح علیہ السلام کو اطلاع دی گئی کہ قبل اسکے کہ زمین سے پانی اُبلنے لگے ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لیں اور اپنے گھر والوں میں سے بھی اُن افراد کو ساتھ لے لیں جو مؤمن ہیں، البتہ اُن افرادِ خاندان کو اس کشتی میں جگہ نہ دیں جن پر اللہ کا فیصلہ ہوچکا ہے کہ وہ طوفان میں ڈوب مریں گے، اسی طرح اُن لوگوں کو بھی لے لیا جائے جو ایمان لاچکے ہیں اور یہ نہایت قلیل افراد تھے جنکی مجموعی تعداد چالیس سے اسی بیان کی جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

سیدنا نوح علیہ السلام کے افراد خاندان میں اُن کی بیوی کے بارے میں وحیٔ الٰہی نے پہلے ہی وضاحت کردی تھی کہ وہ کافرہ اور ڈوبنے والوں میں شامل ہے

لہٰذا اسکو اپنے ساتھ نہ رکھا جائے۔ اور کافر بیٹا کنعان کے تعلق سے کوئی وضاحت نہ تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کو ہدایت کی گئی کہ جب کشتی میں بیٹھ جائیں تو اللہ کا شکر ان الفاظ سے ادا کیا جائے۔

(۱) اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۔ (مؤمنون آیت ۲۸)

ساری حمد اللہ ہی کے لئے ہے جس نے ہم کو کافروں سے نجات دی۔

(۲) بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖھَا وَ مُرْسٰھَا اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (ہود آیت ۴۱)

اللہ ہی کے نام سے کشتی کا چلنا بھی اور اس کا ٹھیرنا بھی، بلاشبہ میرا رب بڑا غفور اور رحیم ہے۔

(۳) رَبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَکًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ۔ (سورہ مومنون۔ آیت ۲۹)

اے رب مجھکو مبارک جگہ اتاریئے اور تو بہتر اُتارنے والا ہے۔

تیسری بات یہ بیان کی گئی کہ جب عذاب کی آمد شروع ہوجائے تو پیچھے رہ جانے والوں کا خیال نہ کیا جائے، کافروں اور ظالموں کے بارے میں رحم کی درخواست نہ کی جائے اور نہ کسی قسم کی کوئی سفارش۔

ابتک جو ایمان لاچکے ہیں صرف اُنھیں نجات دی جائیگی اور جو بے ایمان ہیں اُنھیں ہلاک کر دیا جائے گا۔

چنانچہ مقررہ وقت پر عذاب کی آمد شروع ہوئی، حضرت نوح علیہ السلام نے اسکی پہلی علامت یہ دیکھی کہ مکانات کے چُولھوں سے پانی اُبلنا شروع ہورہا ہے جو اپنی نوعیت میں نہایت عجیب وغریب بات تھی، اسکے بعد زمین سے جابجا پانی نکلنے لگا۔ حضرت نوحؑ اپنے ساتھ ایمان والوں کو اور ہر جانور کے ایک ایک جوڑے کو کشتی میں بٹھا لیا، کیونکہ یہ طوفان پوری زمین کو اپنی زد میں لینے والا تھا، جب پوری طرح ہدایات کی تکمیل ہوگئی تو اللہ تعالےٰ نے آسمان کو حکم دیا کہ "برس پڑ" اور زمین کے چشموں کو امر کیا گیا کہ پوری طرح "اُبل پڑیں" اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ سب کچھ ہوتا رہا زمین پر پانی کی سطح بلند ہونا شروع ہوئی، مکانات، درخت، چھوٹے موٹے ٹیلے یکے بعد دیگرے ڈوبتے چلے گئے، کافروں نے بلند پہاڑیوں پر پناہ لینی شروع کی، لیکن یہ بلند و بالا پہاڑ بھی انھیں پناہ نہ دے سکے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا کافر بیٹا جسکا نام کنعان بیان کیا جاتا ہے باغی اور نافرمان تھا سب سے بلند پہاڑ کی چوٹی پر جا پہونچا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے آواز دینے پر جواب

دیا کہ مجھے آپکی پناہ درکار نہیں، میں اس بلند و بالا چوٹی کی پناہ میں آگیا ہوں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے دوبارہ متنبہ کیا کہ آج اللہ تعالےٰ کی پناہ کے سوا (جو کشتی کی شکل میں آئی ہے) کوئی اور پناہ گاہ نہیں۔

لیکن یہ آخری نصیحت بھی کام نہ آئی، پیچھے سے اچانک ایک ہولناک موج اُٹھی اور اسکو تنکے کی طرح بہالے گئی اور وہ ڈوبنے والوں میں شامل ہوگیا۔

پانی کا یہ طوفان خود مستقل عذاب تھا لیکن اس عذاب پر اللہ تعالیٰ کا مزید غضب ٹوٹ پڑا، زمین کے دھاروں کو حکم الٰہی ہوا کہ اندرونِ زمین کے بجائے سطح زمین پر نکل پڑیں اور آسمان کو حکم دیا گیا کہ اپنے پانی کے دَھانے کھول دے۔ نیچے اور اوپر سے پانی دریاؤں کی طرح اُبلنا شروع ہوا، دیکھتے دیکھتے آناً فاناً ساری زمین زیرِ آب ہوگئی۔

اس غضبناک طوفان میں کشتیٔ نوح نہایت سُبک روی کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی حفاظت میں چلتی رہی، زمین کا ہر ایک متنفس غرقِ آب ہوگیا۔

آیاتِ ذیل طوفان کی نوعیت انہی ہدایات اور حضرت نوح علیہ السلام کے کافر بیٹے سے متعلق ہیں۔

حَتّٰیٓ اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا الخ

(ہود آیات ۴۰ تا ۴۴)

قرآنی مضمون یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آگیا اور تنور اُبل پڑا تو ہم نے (نوح سے) کہا ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو، اور اپنے گھر والوں کو بھی اور اُن لوگوں کو بھی جو ایمان لا چکے ہیں، سوائے اُن افراد کے جن کی نشان دہی کی جا چکی ہے، اور (سوار ہونے والے) تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوحؑ کیساتھ ایمان لائے تھے۔ اور نوح نے کہا (اے لوگو) سوار ہوجاؤ اس کشتی میں، اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھیرنا بھی، بیشک میرا رب بڑا غفور ورحیم ہے۔ اور وہ کشتی اُن لوگوں کو لئے چلی جارہی تھی ایسے موجوں میں جو پہاڑوں کی طرح تھیں، اور نوح نے بیٹے کو پکارا اور وہ علیحدہ مقام پر تھا، بیٹا ہمارے ساتھ سوار ہوجا، کافروں کے ساتھ نہ رہ۔

اُس نے جواب دیا! میں ابھی کسی بلند پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھ کو طوفان سے بچالے گا، نوحؑ نے کہا آج کوئی چیز اللہ کے حکم کو روکنے والی نہیں، سوائے اسکے کہ اللہ ہی کسی پر رحم فرمائے، اتنے میں ایک موج دونوں کے درمیان حائل ہوگئی۔ اور وہ (بیٹا) بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہوگیا۔ اور حکم ہوا اے زمین اپنا سارا پانی نگل جا اور اے آسمان تھم جا، (چنانچہ) پانی گھٹ گیا اور فیصلہ چکا دیا گیا، کشتی جودی پہاڑ پر ٹک گئی، اور کہدیا گیا دور ہوئی ظالموں کی قوم۔

سورہ القمر میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا الخ (القمر آیات ۹ تا ۱۷)

اِن لوگوں سے پہلے نوحؑ کی قوم جھٹلا چکی ہے۔ اُنھوں نے ہمارے بندے (نوحؑ) کو جھوٹا قرار دیا اور کہا کہ یہ دیوانہ ہے اور (انکو) دھمکایا گیا۔

آخر اُس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں عاجز ہوچکا ہوں اب تو اِن سے بدلہ لے۔ تب ہم نے موسلا دھار بارش سے آسمان کے دروازے کھول دیئے اور زمین سے چشمے جاری کر دیئے۔

پس یہ سارا پانی اُس کام کو پورے کرنے کے لئے مل گیا جو مقدر ہوچکا تھا، اور نوحؑ کو ہم نے ایک تختوں والی اور کیلوں والی کشتی پر سوار کرادیا۔ جو ہماری نگرانی میں چل رہی تھی، یہ تھا بدلہ اُس شخص کی خاطر جسکی ناقدری کی گئی۔ اور اُس کشتی کو ہم نے ایک نشانی بنا دیا۔ پھر کوئی ہے نصیحت قبول کرنے والا؟ دیکھ لو کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات۔ اور ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟

سورۂ مومنون میں حضرت نوح علیہ السلام کو خداوندی ہدایات اسطرح دی گئیں۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ ۔ فَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ أَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ الخ

(المومنون آیات ۲۶ تا ۳۰)

نوحؑ نے کہا پروردگار اِن لوگوں نے جو میری تکذیب کی ہے اُس پر اب تو ہی میری مدد فرما۔ ہم نے نوح پر وحی کی کہ ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق کشتی تیار کرو پھر جب ہمارا حکم آجائے اور تنور اُبل پڑے تو ہر قسم کے جانوروں میں سے ایک ایک

جوڑا لے کر اُسمیں سوار ہو جاؤ اور اپنے اہل وعیال کو بھی ساتھ لے لو، سوائے اُن کے جن کے خلاف فیصلہ ہو چکا ہے، اور ظالموں کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ کہنا یہ اب غرق ہونے والے ہیں۔ پھر جب آپ اپنے ساتھیوں سمیت کشتی میں سوار ہو جائیے تو یوں کہیئے شکر ہے اُس اللہ کا جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے نجات دی۔ (اور یہ بھی کہیئے) پروردگار مجھکو برکت والی جگہ اُتاریئے اور آپ بہترین جگہ دینے والے ہیں۔ اس قصہ میں بڑی نشانیاں ہیں اور آزمائش تو ہم کرکے ہی رہتے ہیں۔

سورۂ ہود میں حضرت نوح علیہ السلام کی پدری شفقت اور اللہ عزوجل کی تنبیہ اور پھر حضرت نوح علیہ السلام کی توبہ وانابت کا ذکر اسطرح ملتا ہے۔

وَنَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ الخ

(سورہ ہود آیات ۴۵ تا ۴۹)

اور نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا کہا اے میرے رب میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب سے بڑا حاکم ہے۔

اللہ نے فرمایا اے نوح وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے وہ تو ایک تباہ کار بچہ ہے۔ لہٰذا تم اس بات کی مجھ سے درخواست نہ کرنا جسکا تمہیں علم نہیں ہیں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم نادان نہ بن جاؤ۔

نوحؑ نے عرض کیا اے میرے رب میں آپکی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ چیز آپ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں اور اگر آپ نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ فرمایا تو میں نقصان اُٹھانے والوں میں ہو جاؤں گا۔

حکم ہوا اے نوح سلامتی سے اُتر جاؤ اور ہماری برکتیں ہیں تجھ پر اور اُن جماعتوں پر جو تیرے ساتھ ہیں، اور کچھ جماعتیں ایسی بھی ہیں جنکو ہم کچھ مدت کیلئے سامانِ زندگی دینگے، پھر انھیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں اس سے پہلے نہ آپ انکو جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم، پس صبر کیجیئے، اچھا انجام اللہ سے ڈرنے والوں کیلئے ہے۔

انجام سفینہ کشتی میں حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ اُن کے مسلمان اہل خاندان

اور مؤمنین کی ایک مختصر جماعت، اور جانوروں کا ایک ایک جوڑا موجود تھا۔ یہ کشتی اُس عظیم طوفان میں ایک مدّت تک چلتی رہی۔ اس کی حفاظت کا کام اللہ تعالٰے نے اپنے ذمہ لیا تھا جسمیں ظاہری اسباب کارفرما نہ تھے، یہ بات معلوم نہیں کہ کتنے دن یہ طوفان رہا؟ البتہ الفاظ قرآن سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عالمگیر طوفان تھا جسمیں کوئی جاندار کشتی والوں کے علاوہ نہ بچا، وہ کشتی پہاڑوں جیسے موجوں میں نہایت سُبک روی سے چل رہی تھی، کشتی والے اپنی آنکھوں سے باغیوں کو ڈوبتا دیکھ رہے تھے، اِن ڈوبنے والوں میں خاص طور پر حضرت نوح علیہ السلام کی کافر بیوی اور کافر بیٹے کی صراحت خود قرآن حکیم نے کی ہے۔

باقی لوگوں کے بارے میں اجمالاً یہ کہدیا گیا کہ اہل ایمان کے علاوہ اوروں کو ہم نے ڈبو دیا۔ بعد کی نسلیں انہی نجات یافتہ کی اولاد ہیں جو کشتی میں موجود تھے۔

طوفان کا مقصد جب پورا ہوگیا یعنی نبیؑ کی تعلیمات کو جھٹلانے والوں کو جب ہلاک کر دیا گیا تو اللہ تعالےٰ کا حکم آسمان و زمین کو ملا، اے آسمان برسنا بند کر دے، اور اے زمین اپنا پانی نگل لے۔

پانی زمین میں جذب ہوگیا اور فیصلہ چکا دیا گیا کشتی جُودی پہاڑ پر ٹک گئی، وہاں سے حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کے اصحاب زمین پر اُتر آئے۔ یہ ایک نئی دُنیا تھی جو ہمہ گیر ہلاکت خیزی کے بعد از سر نو آباد ہوئی، اسی بنا پر حضرت نوح علیہ السلام کو "آدم ثانی" کہا جاتا ہے۔ اور غالباً اسی اعتبار سے اِنھیں حدیث بخاری میں "اَوّلُ الرُّسُل" کہا گیا۔ واللہ اعلم۔

یہ جُودی پہاڑ کُردستان (عراق) کے شمال مشرقی جانب واقع ہے جو آج بھی جودی پہاڑ (جَبَل جودی) کے نام سے معروف ہے، قدیم تاریخوں میں بھی کشتی کے ٹھیرنے کی جگہ یہی بیان کی گئی ہے، حکیم ارسطو کا ایک مشہور زمانہ شاگرد ابیڈنیوس بھی اپنی تاریخ میں اسکی تصدیق کرتا ہے۔ نیز وہ اپنے زمانے کا حال بیان کرتا ہے کہ عراق میں بہت سے لوگوں کے پاس اس کشتی کے ٹکڑے محفوظ ہیں جنہیں وہ گھول گھول کر مریضوں کو پلاتے ہیں اور مریض شفا پاتے ہیں۔

واللہ اعلم۔

نتائج و عبر

(۱) ایک قدیم بین الاقوامی گمراہی اور اُس کا ازالہ

انبیاء کرام کی پوری تاریخ یہ ثبوت پیش کرتی ہے کہ ہر نبیؑ کی قوم نے تقریباً ایک ہی اعتراض دہرایا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم ایسے شخص کو نبی کیسے تسلیم کرلیں جو ہماری ہی قوم سے ہے۔ ہماری طرح کھاتا ہے، چلتا پھرتا ہے، سوتا جاگتا ہے، بال بچے رکھتا ہے، بھوک پیاس کا محتاج ہے۔

وہ تو ہماری طرح ایک "بشر" ہے

نبیوں کے بارے میں قوموں کی یہ جہالت بہت قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے، غالباً حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں جنکو انکی قوم نے سب سے پہلے یہی طعنہ دیا تھا۔ اسی جاہل قوم کی اتباع میں ہر زمانے کے جاہلوں نے اپنے اپنے نبی کے بارے میں یہ عقیدہ گھڑ لیا تھا کہ!

جو بشر ہے وہ رسول نہیں ہوسکتا

اور جو رسول ہوتا ہے وہ بشر نہیں!

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے حضرت نوحؑ کو اس طرح خطاب کیا۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا۔

(ہود آیت ۲۷)

قوم کے کافر سرداروں نے کہا (اے نوحؑ) ہم تم کو اپنا ہی جیسا بشر دیکھتے ہیں۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاۤءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰۤئِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِىۤ اٰبَاۤئِنَا الْاَوَّلِيْنَ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ الخ (المؤمنون آیت ۲۴، ۲۵، ۲۶)

پس اُن کی (نوحؑ) کی قوم میں جو کافر رئیس تھے کہنے لگے کہ یہ شخص (نوحؑ) کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا، اسکی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے، اللہ کو اگر رسول بھیجنا ہوتا تو فرشتے کو بھیجتا، یہ بات تو ہم نے اپنے آباء واجداد میں بھی نہیں سُنی (کہ بشر رسول بن کر آئے ہوں) کچھ نہیں اس آدمی کو ذرا جنون لاحق ہو گیا ہے کچھ مدت اور دیکھ لو (شاید صحت یاب ہو جائے)

نوحؑ نے کہا پروردگار اِن لوگوں نے جو مجھکو جھٹلایا ہے اس پر اب تو ہی میری مدد فرما!

خود حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو اس طرح خطاب فرماتے ہیں۔

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ (الاعراف آیت ۶۳)

کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری ہی قوم کے ایک آدمی (نوحؑ) کے ذریعہ تمہارے رب کی نصیحت آئی کہ تمہیں خبردار کرے اور تاکہ تم اللہ سے ڈرو اور تم پر رحم کیا جائے۔

قوم عاد نے بھی سیدنا ہود علیہ السلام کے بارے میں یہ ہی بات دُھرائی ہے

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ۔ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ۔

(المؤمنون آیت ۳۳۔ ۳۴)

اُن (ہود) کی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا اور جن کو ہم نے دنیا کی زندگی میں آسودہ حال کر رکھا تھا کہنے لگے یہ شخص (ہود) کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا، جو کچھ تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔

اور اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے بشر کی اطاعت قبول کرلی تو گھاٹے ہی میں رہوگے۔

قوم ثمود نے بھی سیدنا صالح علیہ السلام پر یہ ہی اعتراض کیا کہ صالحؑ تو ایک بشر ہے۔ بھلا ہم اسکی کیسے اطاعت کریں؟ نبی انسانوں میں سے نہیں ہوتے، وہ تو

ما ور ار بشر ہوا کرتے ہیں۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۔ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا فَأْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۔ (الشعراء آیت ۱۵۳ ۔ ۱۵۴)

قوم ثمود کہنے لگی (اے صالح) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تُو ایک سحر زدہ شخص ہے اور تُو صرف ہم جیسا ایک بشر ہے۔ اگر تو سچا ہے تو پھر کوئی نشانی لے آ؟

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ۔ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۔ (القمر آیت ۲۳ ۔ ۲۴)

قوم ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔

پس کہنے لگے کیا ہم اپنے میں سے ایک بشر کی پیروی کر لیں؟ تو اس صورت میں ہم بڑی غلطی اور جنون میں پڑ جائیں گے۔

سورۂ یٰسٓ میں ایک قریہ (گاؤں) کا حال لکھا ہے کہ وہاں بھی اللہ تعالےٰ نے چند ایک نبیؑ بھیجے تھے۔ اُس بستی والوں نے بھی اِن نبیوں کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو گزشتہ قوموں نے اپنے اپنے نبیوں کے ساتھ کیا تھا۔

یہ قریہ بعض مفسرین کی تحقیق کے مطابق ملکِ شام کا شہر انطاکیہ تھا۔ اس شہر میں پہلی دفعہ دو نبی تبلیغ کے لئے بھیجے گئے تو گاؤں والوں نے اُنکا انکار کر دیا۔ پھر اللہ تعالےٰ نے اُن دونوں کی مدد کے لئے تیسرے نبی کو بھیجا، اس پر اُن بستی والوں نے یہ کہکر ان تینوں کا انکار کر دیا کہ

تم تو ہم جیسے ہی بشر ہو اور اللہ نے کسی بشر کو رسول نہیں بنایا۔ ہم تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔

آیاتِ ذیل اسی واقعہ سے متعلق ہیں۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۔ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ۔ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ۔ (یٰسین آیت ۱۳ ۔ ۱۴ ۔ ۱۵)

(اے نبیؐ) ان سے ذرا اُن بستی والوں کا قصہ بیان کیجئے جبکہ ہم نے اُن کی

جانب پہلے دو نبی بھیجے سو انھوں نے انکو جھٹلا دیا، پھر ہم نے تیسرے نبی کو اُن کی مدد کے لئے بھیجا۔ اِن سب نے کہا ہم تم لوگوں کی طرف اللہ کی جانب سے بھیجے گئے ہیں۔

بستی والوں نے کہا تم لوگ کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے بشر اور اللہ رحمٰن نے ہرگز تم پر کوئی چیز نازل نہیں کی ہے تم صرف جھوٹے لوگ ہو۔

یہ کہہ کر بستی والوں نے اللہ کے ان تینوں فرستادوں کو جھٹلا دیا۔

اہلِ مَدیَن نے بھی سیدنا شعیب علیہ السلام سے انہی الفاظ میں کلام کیا کہ اے شُعیب تم ایک اچھے سنجیدہ آدمی تھے تم کو اچانک کیا ہوگیا کہ تم نے نبی ہونے کا دعویٰ کر دیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم پر کسی نے جادُو وغیرہ کر دیا ہو؛ بھلا تم بشر ہو کر نبی ؑ ہونے کا دعویٰ کیوں کرتے ہو۔ اگر ایسا ہے تو تم یقیناً جھوٹے ہی ہو۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۔ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَ اِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ. (الشعراء، آیت ۱۸۵۔ ۱۸۶)

قوم شعیب نے کہا اے شعیب یقیناً تم سحرزدہ ہوگئے ہو۔ اور تم تو صرف ہم جیسے بشر ہو اور ہم یقین کرتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔

قومِ ابراہیم نے بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں یہ ہی شُبہ ظاہر کیا کہ وہ تو صرف ایک نوجوان لڑکا ہے جو ہمارے بتوں کے بارے میں اکثر بُری گفتگو کرتا رہتا ہے۔

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ الخ

(الانبیاء، آیت ۵۹۔ ۶۰)

(قوم نے میلے سے واپس آکر جب اپنے بتوں کا یہ حال دیکھا کہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر گر پڑے ہیں) تو کہنے لگے ہمارے خداؤں کا یہ حال کس نے کر دیا؟ بیشک وہ کوئی بڑا ظالم ہی ہوگا۔

بعض لوگوں نے کہا ہم نے ایک نوجوان کو اِن بتوں کا ذکر کرتے سنا تھا جسکا نام ابراہیم ہے۔

فرعون اور قوم فرعون نے بھی سیدنا موسیٰ علیہ السلام وسیدنا ہارون علیہ السلام

کو حقارت کے انداز میں بشر ہی کہتے رہے اور کسی طرح اِن دونوں نبیوں کو تسلیم نہ کیا۔ فرعون تو آخر وقت تک یہ ہی کہتا رہا کہ موسیٰؑ نے تو ہمارے گھر پرورش پائی، جوانی کے کئی سال ہمارے گھر میں گزارے۔ اور اب وہ نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ۔

(الشعراء آیت ۱۸)

فرعون نے کہا کیا ہم نے تجھ کو اپنے ہاں بچہ سا نہیں پالا تھا؟ اور تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں نہیں گزارے؟

قوم فرعون نے بھی یہی اعتراض دُھرایا کہ سیدنا موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) بشر ہیں اور صرف نبوت کے نام پر اقتدار چاہتے ہیں۔

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى۔ (طٰہٰ آیت ۶۳)

آخر کار لوگوں نے کہا کہ یہ دونوں (موسیٰؑ و ہارونؑ) تو محض جادوگر ہیں۔ اِن کا مقصد یہ ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہاری زمین سے بے دخل کر دیں اور تمہارے رسم ورواج کا خاتمہ کر دیں۔

آخر کار قوم نے بشریت کا الزام لگا کر سیدنا موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی نبوت کا انکار کر دیا۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ۔ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ۔ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ۔ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ۔

(المؤمنون آیت ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸)

پھر ہم نے موسیٰؑ اور اُن کے بھائی ہارونؑ کو اپنی نشانیوں اور کھلی دلیل (عصا) کے ساتھ فرعون اور اُن کے ساتھیوں کی طرف بھیجا مگر اُنھوں نے تکبّر کیا اور وہ مغرور قوم ہی تھی۔ پھر کہنے لگے کیا ہم اپنے جیسے دو بشر پر ایمان لے آئیں، خاص طور پر ایسی صورت میں کہ اُن دونوں (موسیٰؑ و ہارونؑ) کی قوم ہماری غلام ہے۔ پس اُن لوگوں نے دونوں کو جھٹلا دیا، پھر وہ ہلاک ہونے والوں میں سے ہو گئے۔

قوم عیسیٰؑ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو ایک بالکل دوسری حیثیت سے دیکھا۔ بیشتر اقوام نے تو اپنے اپنے نبیوں کو صرف بشر خیال کیا اور نبوت کا انکار کر دیا لیکن قوم عیسیٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو بشریت سے ایک قدم آگے بڑھا کر اُلوہیت میں داخل کر دیا۔ گویا بشر تسلیم کرنے کے لئے قطعاً آمادہ نہ ہوئے۔ اس لحاظ سے اس قوم نے سابقہ اقوام سے بالکل مختلف نظریہ قائم کر لیا کہ نبی بشر نہیں ہوتے۔ حضرت عیسیٰؑ یقیناً نبی و رسول تھے لیکن بشر نہ تھے۔ دراصل یہ وہی افراط وتفریط کے مُظاہرے ہیں جو جہالت اور اندھے پن کی وجہ سے پیدا ہوا کرتے ہیں۔

اللہ تعالےٰ نے قوم عیسیٰ کی اس گمراہی کو اِن الفاظ سے رَد فرمادیا۔

اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ۔ (النساء، آیت ۱۷۱)

باز آجاؤ یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

سورۂ آلِ عمران میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقت کو ایک مثال سے سمجھائی گئی اور یہ بتایا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انسان وبشر ہی تھے جیسا کہ دیگر انبیاء کرام انسان وبشر تھے۔ رہا اُن کا بے باپ کے پیدا ہوجانا یہ کوئی دلیل نہیں کہ وہ خدا یا شریک خُدا ہوجائیں۔ اگر بغیر باپ کے اللہ تعالےٰ کی قدرتِ خاص سے وہ پیدا ہوکر خُدا یا شریک خُدا ہو سکتے ہیں تو حضرت آدم علیہ السلام جو باپ اور ماں کے بغیر پیدا ہوئے ہیں اُن کو کیا کہا جائیگا؟

اور حضرت حوّاء بھی تو بغیر ماں کے پیدا ہوئی ہیں، حالانکہ اُن کو کوئی بھی خُدا یا شریکِ خُدا ماننے کے لئے تیار نہیں۔

پھر اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہو گئے ہوں تو انہیں کس طرح خُدا یا شریک خدا کہا جائیگا؟

اللہ تعالےٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقت اس طرح سمجھائی ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ۔

بیشک عیسیٰ کی مثال اللہ کے ہاں آدم کی سی ہے کہ اللہ نے آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا پھر حکم دیا کہ ہو جا پس وہ انسان ہو گئے۔ یہ اصل حقیقت ہے جو تمہارے رب

کی طرف سے بتائی جارہی ہے۔ لہٰذا تم اُن لوگوں میں شامل نہ ہونا جو اس میں شک کرتے ہیں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ۔

(زخرف آیت ۵۹)

ابن مریم تو کچھ نہیں سوائے ایک بندے کے جس پر ہم نے خاص انعام کیا اور اُسکو بنی اسرائیل کے لئے ایک نمونہ بنا دیا۔

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بے باپ کے پیدا کرنا، اور پھر اُن کو وہ معجزے عطا کرنا جو نہ اُن سے پہلے کسی نبی کو دیئے گئے نہ اُن کے بعد، وہ مٹی کا پرندہ بناتے اور اُس میں پھُونک مارتے تو وہ جیتا جاگتا پرندہ بن جاتا، وہ مادرزاد اندھے کو بینا کر دیتے، کوڑھ کے مریض کو شفا دے دیتے، حتیٰ کہ مردہ انسان کو زندہ کر دیتے، اِس غیر معمولی پیدائش اور ان عظیم معجزات کی وجہ سے اُن کو مقامِ بندگی سے بالاتر سمجھنا اور بشریت سے نکال کر خُدا یا الوہیت میں شریک کر دینا نہایت نادانی کی بات ہے۔ وہ حقیقتاً ایک بشر تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات سے نوازکر اپنی قدرت کا نمونہ بنا دیا تھا۔ وہ بنی اسرائیل کے عظیم نبی و رسول تھے۔ یہ ہے حقیقت حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی، جسکو قرآن حکیم نے نہایت وضاحت کے ساتھ غیر مبہم الفاظ میں ظاہر کیا ہے اگرچہ دیگر اقوام نے اپنے اپنے نبیوں کو بشر سمجھا اور نبوت کی تکذیب کی، لیکن قوم عیسیٰ نے اپنے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو غیر بشر سمجھا، دراصل یہ ہی وہ قدیم گمراہی ہے جو انبیاء کرام کے تعارف میں قوموں کو پیش آئی ہے کہیں تحقیر کی گئی اور کہیں عظمت میں غلو کیا گیا۔

قرآن حکیم کے مزید مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قدیم گمراہی و جہالت کا اثر قوم عرب پر بھی پڑا جب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں مبعوث ہوئے تو مشرکین مکہ نے بھی آپ کی نبوت کو یہ کہہ کر جھٹلا دیا کہ

یہ کیسا رسول ہے جو کھاتا پیتا اور بازاروں میں خرید و فروخت کرتا ہے؟ اگر یہ رسول ہوتا تو اسکے ساتھ ایک فرشتہ بھی ہونا چاہیئے تاکہ وہ علامت بنے اسکے رسول

و نبی ہونے کی ؟) یہ تو تم جیسا ہی ایک بشر ہے۔
مشرکین مکّہ کی اس خام خیالی کو قرآن حکیم نے غفلت اور جہالت سے تعبیر کی ہے اور اس مفروضہ خام خیالی کو گمراہی اور اندھا پن قرار دیا ہے۔ سورۂ انبیاء میں یہ مضمون موجود ہے۔

لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا هَلْ هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ۔

(الانبیاء آیت ۳)

اُن کے قلوب غفلت میں پڑے ہیں اور یہ ظالم لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص (محمدؐ) آخر تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے۔ پھر کیا تم آنکھوں دیکھتے جادُو کے پھندے میں پھنس جاؤ گے ؟

وَقَالُوا مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ لَوْلَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا۔ الخ

(الفرقان آیت ۷، ۸، ۹)

مکّہ کے مشرکین نے کہا یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ کیوں نہ اِس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اسکے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو دھمکاتا)

اور یا اس کی طرف کوئی خزانہ اُتار دیا جاتا، یا اسکے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ کھاتا پیتا، اور ظالموں نے (یہاں تک) کہہ دیا کہ اے لوگو! تم تو صرف ایک سحر زدہ شخص کی پیروی کر رہے ہو۔

دیکھو (اے محمد!) یہ لوگ تمہارے لئے کیسی کیسی مثالیں بیان کر رہے ہیں، پس یہ گمراہ ہو گئے ہیں انہیں اب سیدھی راہ سوجھائی نہیں دیتی۔

اللہ تعالےٰ نے مشرکینِ مکّہ کی اس جہالت اور عداوت کا جواب بھی انہی کے انداز پر دیا اور اِن سے سوالیہ انداز میں کہا گیا۔

پہلے کون ایسا نبی آیا ہے جو کھانا نہ کھاتا ہو ؟ بازاروں میں چلتا پھرتا نہ ہو ؟ تم لوگ اور تمہارے آباء و اجداد حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل، حضرت

موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام اور بہت سے دوسرے انبیاء سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ ان حضرات کی رسالت و نبوت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ یہ سب بیوی بچے والے تھے۔ کھانا پینا، بازاروں میں چلنا پھرنا، تجارت و زراعت کرنا، غم و خوشی کے حالات پیش آنا، سب کچھ انپر پیش آتا تھا اور تم خود اسکے قائل ہو۔ پھر اب اگر یہ رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بھی بشر ہیں۔ کھاتے پیتے اور بازاروں میں خرید و فروخت کرتے ہیں تو آخر تعجب کی کیا بات ہے؟

اس عظیم حقیقت کو سورۃ الفرقان میں اس طرح ظاہر کیا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِى الْاَسْوَاقِ ؕ (الفرقان آیت ۲۰)

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم سے پہلے جو رسول بھی ہم نے بھیجے تھے وہ سب کے سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں (خرید و فروخت کیلئے) چلتے پھرتے تھے۔

ایک اور موقعہ پر اللہ تعالےٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اعلان کروایا کہ آپ اپنی حقیقت کا اسطرح واضح اظہار کر دیں کہ آپ کی حیثیت میں کسی قسم کی کوئی پوشیدگی باقی نہ رہے اور سابقہ امتوں کی طرح یہ آخری امت اس گمراہی میں مبتلا نہ ہونے پائے کہ رسول بشر نہیں ہوتے اِنکو فرشتہ ہونا چاہیے یا پھر خدا سے انکی رشتہ داری ہو یا خدائی میں حصہ داری ہو۔

اللہ تعالےٰ کے کلام کا یہ پُر حقیقت اعلان جو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے کروایا گیا کتنا واضح اور کھُلا ہوا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَىَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۔ (الکہف آیت ۱۱۰)

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہو کہ میں بشر ہوں تم جیسا، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے، پس جو کوئی اپنے رب سے ملاقات کا امیدوار ہو اُسے چاہیئے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرے۔

اسکے علاوہ قرآن حکیم کی اور بھی وضاحتیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمانے میں لوگوں کی جہالت کا یہی حال رہا ہے اور تقریباً ہر ایک نبی کو اس سے دوچار ہونا پڑا اور اسی جہل نے بہت سی قوموں کو نبیوں کی روشن ہدایات سے محروم کر دیا۔ یا تو رسولوں کو صرف بشر سمجھا گیا جس کی وجہ سے اطاعت نہیں کی گئی یا پھر فوق البشر جانا اور گمراہ ہو گئے۔ یہ دونوں نظریے جہل اور بے عقلی کی پیداوار ہیں۔ یہود و نصاریٰ کو اسی جہل و بے عقلی نے راہِ حق سے دور کر دیا ہے۔ سورۂ ابراہیم میں مزید وضاحت ملتی ہے:۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى قَالُوْا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ۔ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ۔ (ابراہیم آیت ۱۰، ۱۱)

(انبیاء کے پیغام کو نہ ماننے والوں سے) اُن کے رسولوں نے کہا کیا اللہ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے؟ وہ تم کو دعوت دے رہا ہے تاکہ تمہارے گناہ معاف کر دے اور تم کو ایک مدت مقررہ تک مہلت دے۔ اُن لوگوں نے جواب دیا تم تو ہمارے جیسے ہی بشر ہو، تم ہم کو اُن معبودوں کی عبادت سے روکنا چاہتے ہو جنکی ہمارے باپ دادا نے عبادت کی ہے؟ اچھا تو کوئی واضح دلیل پیش کرو؟ اُن کے رسولوں نے اُن کو جواب دیا ہم تو تم ہی جیسے بشر ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے (نبوت و رسالت) سے سرفراز کرتا ہے۔

سورۂ تغابن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ

تَاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ۔ (التغابن آیت ۵، ۶)

کیا تم کو اُن لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جنھوں نے اس سے پہلے کفر کیا پھر اپنے شامتِ اعمال کا مزہ چکھ لیا؟ اور اُن کیلئے (آگے) دردناک عذاب ہے۔ اس انجام کے مستحق وہ لوگ اس لئے ہوگئے کہ اُن کے پاس اُن کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لیکر آتے رہے مگر اُنھوں نے کہا کیا ہم کو بشر ہدایت دیں گے؟ پس انھوں نے انکار کیا اور منہ پھیر لیا، تب اللہ بھی اُن سے بے پرواہو گیا، اور اللہ تو بے نیاز ہے سزاوارِ حمد ہے۔

سورۂ یوسف میں بھی پوری وضاحت کے ساتھ کہا گیا کہ جتنے بھی رسولؑ دُنیا میں آئے ہیں وہ سب کے سب انسان ہی تھے اور اُن ہی بستیوں کے رہنے والوں میں تھے۔ کیا یہ بات اِن مشرکینِ مکّہ کو معلوم نہیں؟

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى۔ (یوسف آیت ۱۰۹)

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم سے پہلے ہم نے جتنے بھی پیغمبر بھیجے ہیں وہ سب کے سب انسان ہی تھے اور انہی بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے۔

مشرکینِ مکّہ کا یہ خیال تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رسول نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ انسان ہیں۔ قرآن حکیم نے کفارِ مکّہ کے اس جاہلانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے بتلایا کہ یہ کوئی نئی جہالت نہیں جو آج پہلی مرتبہ اِن لوگوں سے ظاہر ہو رہی ہے زمانۂ قدیم سے تمام جہلاء، اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ جو بشر ہے وہ رسول نہیں ہو سکتا اور جو رسول ہے وہ بشر نہیں۔

اسی جہالت نے ہر زمانے کے لوگوں کو ہدایاتِ انبیاء سے محروم رکھا ہے اور وہ نبیوں کی واضح و روشن ترین تعلیمات کو محض یہ کہہ کر رد کر دیا کرتے تھے کہ تم تو بشر ہو رسول کیسے ہو سکتے ہو؟ رسول یا تو فرشتہ ہوگا یا پھر کوئی اور مخلوق، لیکن انسان تو رسول ہو ہی نہیں سکتا۔

ایسے انسانوں کی ہدایت سے محرومی کا سبب قرآن حکیم نے یہی بیان کیا ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى
اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل آیت ۹۴)

لوگوں کے پاس جب نبیوں کی ہدایت آئی تو کوئی چیز انہیں
ایمان لانے سے روکنے والی نہ تھی سوائے اسکے کہ انھوں نے کہا "کیا
اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیج دیا؟"

حالانکہ اللہ تعالٰے نے ہر زمانے میں انسانوں ہی میں سے کسی ایک کو رسولؑ بنایا ہے انسان کی ہدایت کے لئے انسان ہی رسولؑ ہو سکتا ہے نہ کہ کوئی فرشتہ یا بشریت سے بالاتر کوئی اور ہستی، اس حقیقت کو سورۂ انبیاء میں اس طرح واضح کیا ہے :-

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْــَٔلُوْٓا
اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا
يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ۔ (الانبیاء آیت ۷، ۸)

ہم نے تم سے پہلے انسانوں ہی کو رسولؑ بنا کر بھیجا ہے جن پر
ہم وحی کرتے تھے۔ لہٰذا جاننے والوں سے دریافت کر لو اگر تمہیں نہ معلوم
ہو اور نہ ہم نے اُن رسولوں کے جسم ایسے بنائے تھے کہ وہ کھانا نہ کھاتے
ہوں اور نہ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے تھے۔

اور یہ کلام الٰہی کی انتہائی شفقت ہے کہ وہ مشرکین مکہ کی خام خیالی کا بھی جواب دیا ہے :-

قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ
لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا۔

(بنی اسرائیل آیت ۹۵)

اے نبیؐ اِن لوگوں سے کہو کہ اگر زمین پر فرشتے اطمینان سے
چل پھر رہے ہوتے تو ہم اِن پر فرشتے ہی کو رسولؑ بنا کر نازل کرتے۔

قرآن حکیم کی مذکورہ بالا آیت نے مسئلہ کو اور آسان بنا دیا کہ انسانوں کی ہدایت کیلئے انسان ہی ضروری ہے نہ کہ کوئی فرشتہ یا کوئی اور مخلوق؟

فَمَا ذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ۔

حق ظاہر ہو جانے کے بعد قبول نہ کرنا سوائے گمراہی کے اور کیا ہو سکتا ہے؟

اور یہ عجیب تر بات ہے کہ جن لوگوں نے پتھروں اور درختوں میں اُلوہیت کو تسلیم کیا ہے آخر وہ بشریت میں نبوت کو محال کیوں سمجھ رہے ہیں؟

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔

کیا عقل وفہم سے محروم ہو گئے ہیں؟

یہ اللہ کے کلام کا اعجاز وتفوّق ہے کہ اُس نے نبیوں کی بلند ترین عظمت وتقدیس کو صرف دو لفظوں سے ادا کر دیا ہے:۔

کہ وہ "اللہ کے بندے اور اُس کے رسول ہوا کرتے ہیں"۔

(۲) قومِ نوحؑ کے معبود

سیدنا نوح علیہ السلام جس وقت اپنی قوم میں مبعوث ہوئے ہیں اُس وقت ساری قوم بت پرستی میں مبتلا تھی، شرک اُن کا مذہب تھا۔ چھوٹے بڑے سینکڑوں معبود بنا لئے گئے تھے جنکی پرستش کی جاتی تھی۔ اُن میں پانچ بڑے بُت تھے جو "بڑے خدا" کے نام سے پوجے جاتے تھے۔ بعد کے زمانے میں یہ ہی بُت عرب کے جاہلوں میں بھی پوجے جانے لگے۔

۱۔ **وَدّ**: یہ بُت قبیلہ بنو کلب کا معبود تھا جس کا مندر مقام دومۃ الجندل میں بنایا گیا تھا۔ یہ بُت نہایت بلند قامت مردانی جُثّہ (بدن) تھا۔ قریشِ مکہ بھی اسکو معبود تسلیم کرتے تھے اور اُنھوں نے اِس کا نام وُدّ رکھا تھا اور اپنی اولاد کے نام بھی اسی نسبت پر رکھد یا کرتے تھے۔

۲۔ **سُوَاع**: یہ بُت قبیلہ ہُذیل کی دیوی تھی جس کی شکل عورت کے مشابہ تھی۔ ینبوع کے قریب اس کا مندر تھا۔

۳۔ **یغُوث**: یہ قبیلہ طےَ کا بُت تھا۔ حجاز اور یمن کے درمیان مقام جُرش پر اس کا مجسّمہ نصب کیا گیا تھا اس کی شکل شیر کی طرح تھی۔ گویا یہ طاقت وقوت

کا مالک تھا جس کے دستِ قدرت میں کائنات کی ساری طاقتیں سمجھی جاتی تھیں،
قریش کے لوگ بھی اسی بُت کے نام پر اپنے بچوں کے نام رکھ لیا کرتے تھے۔

۴۔ **یَعُوق** : یمن کے علاقے میں قبیلہ ہمدان کا یہ معبود گھوڑے کی شکل پر تھا۔ جس کی پوجا عرب میں بھی کی جاتی تھی۔

۵۔ **نَسر** : حمیر کے علاقے میں قبیلۂ حمیر کا یہ معبود گدھ کی شکل پر تھا۔ شہر سبا (یمن) کے قدیم کتبوں میں اِس کا نام نسُور لکھا ہے۔ اسکے مندر کو بیت نسُور اور اسکے سجادہ نشینوں کو اہلِ نسُور کہا جاتا تھا۔ عرب کے بعض آثار قدیمہ میں جو مندر ظاہر ہوئے ہیں اُن میں مندر کے دروازوں پر گدھ کی تصویر ملتی ہے جو اسی معبود کی علامت ہے۔

وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

(۳) **سُنَّتُ اللّٰہ** طوفان کے آغاز سے قبل سیدنا نوح علیہ السلام کو وحی کے ذریعہ ہدایت دی گئی کہ جب عذاب شروع ہو جائے تو ظالموں کے بارے میں ہم سے سفارش نہ کرنا۔ کیونکہ اِن کو ڈبو دیئے جانے کا فیصلہ کر دیا گیا ہے۔

نبیؑ کا مکمل پیغام جب کسی قوم کو پہنچ جاتا ہے اور اسکی حد پوری ہو جاتی ہے مگر قوم اسکو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی تو پھر سنت اللہ (اللہ کی عادت) یہ رہی ہے کہ اُس قوم کو صرف اُس وقت تک مہلت دی جاتی ہے جب تک اُس میں کچھ بھلے آدمیوں کا وجود باقی ہو۔ مگر جب اُس قوم کے نیک افراد سب نکل چکتے ہیں اور باقی صرف فاسد عناصر کا ہی مجموعہ رہ جاتا ہے تو پھر اُس قوم کو اللہ مہلت نہیں دیتا۔ اُنکی ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے اور اُنھیں کسی بھی شکل میں تباہ کر دیا جاتا ہے۔ نیز اُسکی رحمت کا تقاضہ بھی یہ ہی ہوتا ہے کہ ایسے فاسد مادے کو ضائع کر دیا جائے، چنانچہ قوموں پر جو عذاب آیا ہے وہ اسی نقطۂ انتہا کے بعد آیا ہے۔

قومِ نوحؑ کا انجام بھی اسی سُنت اللہ کے مطابق غرقابی کی شکل میں ظاہر ہوا۔

(۴) دانشمندی یا بے دانشی

سیدنا نوح علیہ السلام دریا سے بہت دُور خشکی پر اپنی کشتی تیار کر رہے تھے اُسوقت لوگوں کو یہ عمل نہایت مضحکہ خیز معلوم ہوا اور ہنس ہنس کر اسکا مزاق اُڑایا گیا کہ کیا یہ کشتی زمین پر چلے گی ؟ سمندر سے سینکڑوں میل دُور کیا زمین کا یہ خطّہ پانی میں تبدیل ہوجائے گا ؟ اور کیا صرف نوحؑ بچ جائے گا اور ہم سب ڈوب جائیں گے ؟

لیکن جو شخص حقیقت کا علم رکھتا ہے اور جسے معلوم تھا کہ کل یہاں سفینے کی ضرورت پیش آئیگی وہ اِن نادانوں کی اس ہنسی دل لگی پر کس قدر تعجب وحیرت کرتا ہوگا کہ یہ کسقدر نادان اور فریب خوردہ ہیں کہ شامت اِن کے سر پر کھڑی ہے مگر یہ مطمئن بیٹھے ہیں اور اُلٹا مجھے دیوانہ سمجھ رہے ہیں۔

اہلِ دنیا نے عقلمندی اور بے وقوفی کا جو معیار قائم کیا ہے وہ اِس واقعہ سے کس قدر مختلف ہے ؟ نبیوں کی تعلیمات پر چلنا دانشمندی ہے یا بے دانشی ؟ اللہ ہمیں چشمِ بصیرت عطا کرے اور توفیقِ عمل بھی !

(۵) طُوفان کی عالمگیری

طوفانِ نوحؑ کے بارے میں مفسرین کی دو رائے ہیں :- اوّل یہ کہ یہ طوفان عالمگیر تھا جو پورے خطۂ ارضی کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ دوئم :- یہ کہ یہ طوفان اُس خاص علاقہ تک محدود تھا جہاں قومِ نوحؑ آباد تھی۔

تاریخی روایات ہر دو خیال کی تائید میں ہیں۔

لیکن قرآنی اشارات پہلی رائے کے قریب ہیں، اگرچہ قرآن حکیم میں کسی جگہ ایسی کوئی وضاحت نہیں ملتی جس سے قطعی طور پر کوئی فیصلہ معلوم ہوجائے۔ بہرحال واقعہ کا انحصار اس پر نہیں کہ یہ طوفان عالمگیر تھا یا محدود ؟ لیکن یہ حقیقت تھی کہ یہ طوفان نہایت ہولناک اور غضبناک قسم کا تھا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

جیسا کہ کہا گیا قرآنی اشارات مفسرین کی پہلی رائے کے زیادہ قریب ہیں

کہ یہ طوفان عالمگیر تھا اور زمین کے پورے خطہ کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا سوائے اہل کشتی کے ہر جاندار اسمیں ہلاک ہوا۔

مندرجہ وجوہات قرآنی اِسکی تائید کرتی ہیں :۔

وجہ اوّل : سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد کی انسانی نسلیں حضرت نوح علیہ السّلام اور اُن لوگوں کی اولاد ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے کشتی میں نجات دی تھی۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا

(بنی اسرائیل آیت ۳)

(اے لوگو) تم اُن لوگوں کی اولاد ہو جنہیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا، بیشک نوح ایک شکر گزار بندہ تھا۔

اس آیت میں اہل مکہ کو بنی اسرائیل کی تاریخ سے عبرت دلائی جارہی ہے کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے کتاب پانے والے (یہود و نصاریٰ) نے جب رسولوں کے مقابلہ میں سر اُٹھایا تو دیکھو اِن کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا ؟ لہٰذا نوحؑ اور اُن کے ساتھیوں کی اولاد ہونے کی حیثیت سے تمہارے لئے بھی لازم ہے کہ تم صرف اللہ واحد ہی کو اپنا معبود بناؤ، کیونکہ جن کی تم اولاد ہو وہ اللہ واحد ہی کو معبود بنانے کی بدولت طوفان کی تباہی سے بچے تھے۔

الغرض آیت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اور قرآن کے دیگر مخاطب (جس میں ساری اقوام شامل ہیں) طوفان نوحؑ سے نجات یافتہ افراد کی اولاد ہیں۔ واللہ اعلم۔

وجہ دوم : سورۂ مریم کی آیت ۵۸ بھی عالمگیر طوفان کی تائید کرتی ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ۔ الخ (مریم آیت ۵۸)

چند انبیاء کرام کا تذکرہ کرنے کے بعد قرآن حکیم نے اس طرح فرمایا:۔

یہ وہ انبیاءؑ ہیں جن پر اللہ نے اِنعام فرمایا آدم کی ذُرّیت میں سے

اور اُن لوگوں کی نسل سے ہیں جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا۔
اِس آیت میں اولادِ ابراہیمؑ اور اولادِ یعقوبؑ کا بھی تذکرہ ہے لیکن یہ سب حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ہی کے ہیں اس لئے
مِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ کا ذکر خاص طور پر اشارہ کرتا ہے کہ بعد کی نسلیں اِنہی افراد کی اولاد سے چلیں۔ معلوم ہوا کہ اہل کشتی کے علاوہ سارے انسان ہلاک ہوگئے تھے۔

وجہ سوم: قرآنی صراحت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو ہدایت فرمائی کہ "کشتی میں ہر جاندار کا ایک ایک جوڑا رکھ لیا جائے۔"
(سورۂ مومنون آیت ۲۷)

اس ارشاد کی واضح اور بلا تکلف توجیہ یہ ہی ممکن ہے کہ طوفان عالمگیر تھا ورنہ نسلِ حیوانی کے تحفظ کا کوئی اور معقول مطلب نہیں ہوسکتا۔ چونکہ طوفان عالمگیر تھا اس لئے نسلِ حیوانی کی بقا و سلامتی کے لئے ہر جوڑا کشتی میں رکھا گیا۔

وجہ چہارم: جب کبھی بھی قوموں پر نبیوں کی آگاہی کے بعد عذاب آیا ہے، آغازِ عذاب سے قبل نبی اور اُن کے اصحاب کو ہجرت کر جانے، شہر سے باہر ہوجانے، یا کسی خاص خطہ میں آجانے کا حکم دیا گیا ہے۔ جسکی وضاحت قرآن حکیم میں موجود ہے۔
لیکن سیدنا نوح علیہ السلام کو طوفان سے قبل جو حکم دیا گیا وہ اِن تمام صورتوں سے بالکل مختلف ہے۔ یعنی حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے ہی ملک میں اپنی ہی قوم کے اندر اُسی خطہ ارضی پر کشتی میں پناہ لینے کی ہدایت کی گئی۔ اگر طوفان عالمگیر نہ ہوتا تو یہ مخصوص صورت اختیار کرنے کی کوئی قابلِ ذکر وجہ معلوم نہیں ہوتی؟ ورنہ زمین کے کسی بھی خطہ میں پناہ لینے کی ہدایت ملتی، یا دیگر انبیاء کی طرح ہجرت کر جانے کا حکم دیا جاتا۔ واللہ اعلم۔
معلوم ہوا کہ طوفان عام تھا پورے خطۂ ارضی کو محیط تھا تب ہی تو کشتی میں پناہ

لینے کی ہدایت کی گئی۔
وجہ پنجم۵: طوفان کی نوعیت کو جن الفاظ اور جس عنوان سے قرآن حکیم نے ذکر کیا ہے وہ اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ یہ طوفان عالمگیر ہی تھا۔
سورۂ قمر آیت ۱۱، ۱۲ کے الفاظ یہ ہیں:۔
فَفَتَحْنَآ أَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ وَّفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا (القمر آیت ۱۱)
پس کھول دیئے ہم نے آسمان کے دروازے موسلا دھار بارش کے ساتھ اور زمین سے چشمے جاری کر دیئے۔
پانی کے آسمانی دروازوں کا کھول دیا جانا اور زمین کو چشمۂ آب میں تبدیل کر دیا جانا عالمی طوفان ہی کی نشان دہی کرتا ہے اور عقلی طور پر بھی یہ ہی مفہوم ہوتا ہے۔
اسی آیت میں فَتَحْنَا کی ایک قرأت فَتَّحْنَا (بالتشدید) بھی مذکور ہے جسکے معنی پوری طرح کھول دینے کے ہیں۔ یعنی پانی کے آسمانی دروازے پوری طرح کھول دیئے گئے۔ ظاہر ہے یہ عنوان کسی معمولی طوفان کے لئے نہیں ہو سکتا۔
سورۂ ہود آیت ۴۴ میں اس طوفان کے اختتام کا تذکرہ اسطرح کیا گیا ہے:۔
وَقِيلَ يَآ أَرْضُ ابْلَعِي مَآءَكِ وَيَا سَمَآءُ أَقْلِعِي الآیۃ
(ہود آیت ۴۴)
حکم دیا گیا، اے زمین اپنا سارا پانی نگل جا اور اے آسمان تھم جا۔
ان الفاظ کا سیدھا سادھا مطلب یہ ہی سمجھ میں آتا ہے کہ طوفان پورے خطۂ ارضی کو محیط تھا۔ نیز سورۂ الصّٰفّٰت (آیت ۷۷) کے الفاظ بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ طوفان سے بچنے والے ہی آئندہ نسلِ انسانی کا سبب بنے ہیں۔ آیت یہ ہے:۔
وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ. الآیۃ

اور ہم نے نوحؑ اور اہلِ سفینہ کی ذُریت ہی کو آئندہ باقی رہنے

والا بنا دیا۔

اس عبارت سے بھی عالمگیر طوفان کی تائید ہوتی ہے۔ نیز سورۂ نوح آیت ۲۶ کے الفاظ بھی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ عذاب عمومی قسم کا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالےٰ کا اذن پاکر یہ دعا کرتے ہیں :-

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۔

(نوح آیت ۲۶)

اے میرے رب ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا

نہ چھوڑ (سب کو ہلاک کر دے)

اللہ تعالےٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی) یہ دُعا قبول فرمائی اور حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی میں اہل ایمان کے ساتھ پناہ لینے کا حکم دیا۔ نیز سورۂ ہود کی آیت ۴۴ میں اللہ تعالےٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی دُعا قبول فرماکر قوم کا یہ انجام اِن الفاظ سے بتلایا۔

وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ۔

اور کہہ دیا گیا کہ دُور ہوئی ظالموں کی قوم۔

معلوم ہوا کہ زمین کے سارے کافر ہلاک ہوگئے تھے۔ واللہ اعلم۔

(۶) شُبہ کا ازالہ

اس تحقیق پر جو اوپر بیان کی گئی کہ طوفان عالمگیر تھا، سوائے اہل سفینہ زمین کا ہر متنفس غرقاب ہوگیا، بادی النظر میں یہ شُبہ پیش آتا ہے کہ یہ عذاب قوم نوحؑ کی بغاوت و سرکشی کی بنا پر آیا تھا لیکن زمین کی دیگر قومیں اسمیں کیوں غرقاب کر دی گئیں ؟ یہ تو بے قصور تھے، علاوہ ازیں زمین کے دیگر جانداروں کو اسمیں کیوں ہلاک کیا گیا ؟ جبکہ جانور غیر مکلف بھی ہیں ؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ شُبہ ضرور پیدا ہوتا ہے خاص طور پر اُن قوموں کے بارے میں جو زمین کے دُور دراز علاقوں میں موجود تھیں اور ممکن ہے جہاں حضرت

نوح علیہ السلام تبلیغ کے لئے تشریف بھی نہ لے گئے ہوں؟
لیکن جیسا کہ یہ شُبہ ظاہری ہے ویسے ہی نہایت سطحی قسم کا بھی ہے "سنت اللہ" یعنی قانون الٰہی کو سمجھنے میں اکثر لوگوں کو غلطی ہوئی ہے اور یہ شُبہ بھی اسی غلطی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ "سنت اللہ" کو سمجھنے کے لئے تھوڑی سی تفصیل جان لینی ضروری ہے۔
ہمارا مشاہدہ ہے کہ جب بھی زمین پر امراض، وبائیں پھوٹ پڑتی ہیں یا طوفان اور زلزلے یا ایسے ہی کوئی دوسرے حوادث پیش آتے ہیں تو وہاں کی آبادی میں نیک و بد، کافر و مسلم، مجرم و غیر مجرم سب ہی اِن کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ جب کسی شہر میں زلزلہ آتا ہے تو نیک و بد دونوں پر یکساں اثر کرتا ہے۔ جب کوئی وبا پھیلتی ہے تو نیک کردار اور بدکردار دونوں ہی اسکی زد میں آتے ہیں اور وہ دونوں کے رشتۂ حیات کیلئے یکساں مُہلک ثابت ہوتی ہے۔
البتہ آخرت کے لحاظ سے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اللہ عزوجل کے باغی و نافرمانوں کے لئے یہ حوادث عذاب الٰہی بن جاتے ہیں اور مطیع فرمانبرداروں کے لئے موجب سعادت اور درجات کی بلندی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ موت تو ہر جاندار کو بہرحال آنی ہی ہے اُن کے مقسوم میں اسی طرح موت مقدر کی گئی تھی۔ لیکن جو عذاب نبیوں کی آگاہی کے بعد آتا ہے اسمیں اللہ تعالےٰ کی سنت اس طرح رہی ہے کہ نبی کو بذریعہ وحی وقت سے پہلے اطلاع دیدی جاتی ہے اور اُنھیں شہر سے دُور چلے جانے کا حکم کیا جاتا ہے۔ اسکے بعد جھٹلانے والوں کو عذاب میں گرفتار کرلیا جاتا ہے۔
یعنی "سنت اللہ" نبیؑ کی حیات میں بدل جاتی ہے، اچانک اور غیر متوقع طور پر عذاب ٹوٹ نہیں پڑتا اور نہ ہی نیک و بد دونوں پر یکساں اثر ہوتا ہے بلکہ نیکوں کو نبیؑ کے ساتھ محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ انبیاءِ کرام کی پوری تاریخ میں "سنت اللہ" کا یہ ہی معاملہ رہا ہے جس کی صراحت قرآن حکیم میں جا بجا موجود ہے۔ لہٰذا طوفانِ نوحؑ میں دُنیائے کفر کا وہ سب حصہ برباد کردیا گیا جو بغاوت و نافرمانی کے انجام میں آنے والے عذاب سے دوچار ہوتا ہے۔
اب یہ معاملہ اللہ تعالےٰ کے سپرد ہے کہ جن عاقل بالغ انسانوں نے

نبیوں کی بغاوت کی تھی اُن کے حق میں یہ طوفان دائمی عذاب بنا اور جو معصوم وغیر عاقل تھے وہ آخرت کے عذاب سے مامون ومحفوظ قرار پائیں گے۔

ایک دوسرا جواب یہ بھی دیا گیا جیسا کہ تفسیر رُوح المعانی میں ابن عساکر کی روایت سے نقل کیا گیا، طوفان نوحؑ سے چالیس سال قبل قوم میں ولادت کا سلسلہ قدرتاً بند ہوگیا تھا جو بچے تھے وہ عاقل و بالغ ہوگئے اور طوفان کے وقت کوئی بھی غیر بالغ نہ تھا اور سب کے سب ظالم و باغی تھے، لہٰذا سب کو ہلاک کردیا گیا۔ رہی جانوروں کی ہلاکت وہ اِن کے حق میں بمنزلہ موت طبعی ثابت ہوئی۔ موت کے لئے آخر کوئی نہ کوئی سبب تو بنتا ہے اِن جانوروں کے حق میں ایسا موقعہ اِنکی طبعی موت کا ذریعہ بنا جو غرقابی کی شکل میں ظاہر ہوا۔

(۷) ایک اور شبہ کا ازالہ

جب کشتی تیار ہوچکی تو اللہ تعالےٰ نے اس کشتی میں جہاں اہل ایمان کو سوار ہونے کا حکم فرمایا وہاں ہر جانور کے ایک ایک جوڑے کو بھی ساتھ رکھ لینے کا امر فرمایا تھا۔ اس پر شبہ ہوتا ہے کہ ایک کشتی میں اتنی بڑی تعداد کیوں کر سما گئی جبکہ اسکے لئے ایک بڑا جنگل بھی ناکافی ہے؟

یہ شبہ بھی محض "سنت اللہ" کو نہ سمجھنے کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ عذاب کی پیشگی اطلاع، طوفان کی نوعیت، تنور سے پانی اُبلنا، آسمان کا پھٹ جانا، زمین کا سراپا چشمہ بن جانا، کشتی کا پہاڑوں جیسی موجوں میں سلامتی کے ساتھ چلنا، پھر محفوظ مقام پر اُتر پڑنا، اہل ایمان کا باقی رہ جانا، سارے باغیوں کا ہلاک ہوجانا، ہر ایک خود اپنی ذات میں نہایت ہی تعجب خیز اور ناقابل فہم ہے۔ لیکن یہ سب واقعات ہیں جو پیش آئے۔

اسی طرح کشتی میں جانوروں کا سما جانا بھی ایک واقعہ ہے اسپر تعجب کیوں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب امور "خرقِ عادات" کے طور پر پیش آئے اور "خرقِ عادات" ایسے ہی اُمور کو کہا جاتا ہے جسکے سمجھنے میں انسانی عقل عاجز و درماندہ ہے۔ معجزات کی حقیقت بھی یہ ہی ہوتی ہے وہ حقیقتاً پیش آتے ہیں لیکن

انسانی طاقت اسکو پیش کرنے یا سمجھنے میں بے بس ہے۔ چونکہ اسمیں خارجی اسباب کارفرما نہیں ہوتے۔ اس لئے ظاہر بین کو شُبہ ہوتا ہے کہ یہ کیوں کر ممکن ہے؟ اور عادۃً ایسے اُمور پیش بھی نہیں آتے اس لئے تعجب وحیرت کا پیدا ہونا ضروری ہے خرقِ عادات اور معجزات میں اسباب کی ضرورت نہیں پڑتی۔

علاوہ ازیں عقلی طور پر بھی ایک بڑی کشتی میں حیوانات کا سما جانا کوئی امر محال نہیں، موجودہ زمانے میں بڑے بڑے جہازوں نے اس حیرت وتعجب کو سرے ہی سے غلط و باطل کر دیا ہے۔ لاکھوں ٹن سامان جہازوں کے ذریعہ اِدھر سے اُدھر منتقل ہو جاتا ہے۔

کشتیٔ نوحؑ کو اگر اس نظرے دیکھیں تو تعجب وحیرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ علاوہ ازیں شُبہ اس لئے بھی پیدا ہوا کہ "ہر ہر جانور کے ایک ایک جوڑے سے" ہر قسم کے جانور سمجھے گئے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ جانوروں کی ایک خاص نوع اور مخصوص تعداد مراد ہے جس کا کشتی میں سما جانا ممکن ہے اور جسکی انسان کو ضرورت تھی تفصیل اسکی یہ ہے کہ

جُملہ حیوانات کو تین طبقات میں تقسیم کر دیا جائے۔

خشکی[۱] کے جانور پانی[۲] کے جانور فضا[۳] کے جانور

انہی کے مجموعہ کو عالَم حیوانات کہا جاتا ہے۔ یقیناً انکی تعداد انسانوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے جسکا تصور بھی مشکل ہے۔

ظاہر ہے کشتی میں یہ سب جانور سوار نہیں تھے اور نہ اسکی ضرورت تھی۔ پانی کے جانور اس سے خود بخود خارج ہیں۔ انکو کشتی میں رکھنے کی قطعاً ضرورت نہ تھی، پانی خود ان کا مسکن تھا۔

فضا کے جانور بھی اسمیں شامل نہیں ہیں کیونکہ اس عالمگیر طوفان سے انہیں کوئی خطرہ نہ تھا جس سے انکی حفاظت کی جاسکے۔

اس طرح جُملہ عالَم حیوانات کا ⅔ (دو تہائی) حصّہ خارج ہوگیا جنکو کشتی میں رکھنے کی ضرورت نہ تھی اور ان کی ہلاکت کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔

اب رہے صرف خشکی کے جانور اگرچہ ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے لیکن

اِن میں وہ جانور جو محتاجِ تناسل نہیں ہیں اُن کو محفوظ کرنے کی ضرورت نہ تھی وہ ویسے بھی پیدا ہو سکتے ہیں، لہٰذا ایسے جانور بھی اسمیں شامل نہ تھے۔ ان کے علاوہ جو اقسام باقی رہ گئے ہیں اُن میں سے صرف وہی جانور سوار کر لئے گئے ہوں جن سے انسانی حاجت وابستہ تھی تاکہ طوفان کے خاتمہ کے بعد بقیہ افرادِ انسانی کو دشواری پیش نہ آئے، سو ایسے جانور بہت قلیل ہیں۔ اِن میں سے ہر ایک کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لینا کچھ مشکل نہیں، اور جن جانوروں سے انسانی حاجت وابستہ نہیں جیسے درندے اور غیر غذائی جانور اُن کو کشتی میں رکھا نہ گیا ہو۔ اور بعد میں اللہ تعالےٰ نے اپنی قدرت سے دوبارہ پیدا کر دیا ہو۔ جیسا کہ پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔ اس طرح کشتی کے جانوروں کی تعداد غیر معمولی نہ ہوئی جس سے شُبہ پیدا ہو۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ عالمگیر طوفان سے نجات یافتہ افراد کی تعداد اسّی مرد اور عورتوں سے کچھ زیادہ نہ تھی جیسا کہ تاریخی روایات کی صراحت ہے۔ اتنی مختصر انسانی دنیا کیلئے کتنے جانور درکار تھے؟ اسکا جواب خود اس شُبہ کو ختم کر دیتا ہے کہ ایک کشتی میں ہر جانور کا ایک ایک جوڑا کیسے سما گیا؟

(۸) آزمائش

تذکرۂ سیدنا نوح علیہ السلام میں قرآن حکیم نے ایک موقعہ پر اس طرح تنبیہہ کی ہے :-

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ۔

(المؤمنون آیت ۳۰)

بیشک اس قصے میں بڑی نشانیاں ہیں، اور آزمائش تو ہم کرکے ہی رہتے ہیں۔

یعنی اس واقعہ میں عبرت آموز سبق ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ توحید کی دعوت دینے والے حق پر تھے اور شرک پر اصرار کرنے والے کفار باطل پر، اور آج وہی صورتِ حال درپیش ہے جو کسی وقت حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان تھی اور یہ کہ مجرمین کو چاہے کتنی ہی ڈھیل ملے لیکن فیصلہ آخر کار ہو کر رہتا ہے اور وہ لازماً اہلِ حق کے حق میں اور اہلِ باطل کے خلاف ہوتا ہے۔

آیت مذکورہ میں اس کے بعد یہ جملہ کہ
"آزمائش تو ہم کرکے ہی رہتے ہیں۔"
اس حقیقت پر خبردار کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کسی قوم کو بھی اپنی زمین اور اسکی بیشمار نعمتوں پر اقتدار عطا کرکے بس یوں ہی اسکے حال پر نہیں چھوڑ دیتا بلکہ اسس کی آزمائش کرتا ہے اور یہ دیکھتا رہتا ہے کہ وہ اپنے اقتدار اور عطاکردہ نعمتوں کو کس طرح استعمال کر رہی ہے۔

قوم نوح کے ساتھ جو کچھ ہوا اسی قانون کے مطابق ہوا اسکو قوت و طاقت، زمین کا اقتدار، مال و دولت کی کثرت، خوشحالی اور چین وسکون جیسی نعمتیں دی گئی تھیں اور ایک طویل عرصہ تک یہ سامان عیش وعشرت باقی رہا، لیکن اللہ کی اس لمبی مہلت نے انھیں اور غافل کر دیا جس کا انجام ہلاکت خیزی کی شکل میں آیا۔ اسی طرح کوئی بھی قوم ایسی نہیں کہ اُسکو بس یوں ہی چھوڑ دیا جائے نعمتوں پر آزمایا جاتا ہے اور اس معاملہ میں ہر ایک کو لازماً سابقہ پیش آتا ہے۔

(۹) بُری صحبت کا انجام

بُری صحبت زہر سے زیادہ مہلک ہوتی ہے جسکا انجام ذلت ورسوائی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، اسی طرح نیک صحبت تریاق ہوتی ہے جو سینکڑوں بُرائیوں سے حفاظت کا ذریعہ بنتی ہے۔

عقلمند انسان کو جیسے نیکی کی تلاش رہتی ہے ویسے ہی بدی سے اجتناب رہتا ہے۔ انسان کے لئے جس طرح نیکی کی ضرورت ہے اُس سے کہیں زیادہ نیک صحبت کی ضرورت ہے اور جس طرح بدی سے بچنا ضروری ہے اُس سے کہیں زیادہ خطرناک بُروں کی صحبت ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا جس نے آغوشِ نبوت میں پرورش پائی ہے اور بیوی جو زندگی بھر رفیقۂ حیات بن کر کافروں کی صحبت اختیار کرتی رہی دونوں نے کافروں کا انجام پایا۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قرآنی مضمون کو اپنی رُباعی میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس طرح ادا کیا ہے :-

(۱) پسرِ نوحؑ با بداں بنشست — خاندانِ نبوتش گم شُد
(۲) سگِ اصحابِ کہف روزے چند — پئے نیکاں گرفت مردم شُد
(۳) صحبتِ صالح تُرا صالح کُند — صحبتِ طالح تُرا طالح کُند

(ترجمہ)

(۱) حضرت نوحؑ کا بیٹا بُروں کا ساتھ دیا — تو خاندانِ نبوت سے جُدا کر دیا گیا
(۲) اصحابِ کہف کا کُتا کہف والوں کا ساتھ دیا — تو وہ انسانوں میں شمار کیا گیا
(۳) نیکوں کی صحبت تجھکو نیک بنا دیتی ہے — بُروں کی صحبت بُرا بنا دیتی ہے

(۱۰) شُکر گزاری

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں قرآن حکیم نے یہ شہادت دی ہے کہ وہ شکر گزار بندے تھے۔ طبرانی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

"نوح علیہ السلام عید الفطر و عید الاضحیٰ کے علاوہ سال بھر روزہ رکھا کرتے تھے، اور حضرت داؤد علیہ السلام نصف سال روزہ رکھا کرتے تھے، اور نصف سال افطار، حضرت ابراہیم علیہ السلام ہر ماہ تین روزے رکھا کرتے تھے۔ اسیطرح حضرت ابراہیمؑ نے سال بھر روزہ رکھا اور سال بھر افطار بھی کیا (الحدیث)

اس حدیث کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ ہر روزہ دس روزوں کے برابر ہے اس طرح ہر ماہ تین۳ روزے تیس۳۰ روزوں کے مساوی ہوتے ہیں گویا ہر ماہ تین روزے رکھنا پورے ماہ روزے رکھنے کے مماثل ہوئے۔ اس لحاظ سے ابراہیم علیہ السلام سال بھر روزہ رہے اور افطار بھی کیا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع میں جب وادی عسفان پر گزر ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس وادی سے حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت ابراہیم علیہ السلام حج کے لئے گزرے ہیں، ابن جریرؒ نے بعض تابعین سے نقل کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قبر شریف مسجد حرام (مکۃ مکرمہ) کے اندر ہے۔ واللہ اعلم۔

(قصص الانبیاء وابن کثیرؒ)

(۱۱) ایک اور قدیم جاہلی مرض

حضرت نوح علیہ السّلام کی مخلصانہ دعوت و تبلیغ پر قوم کے سردار اس طرح سوال کرتے ہیں: "اے نوحؑ کیا ہم تمہیں تسلیم کرلیں جبکہ تمہاری پیروی کرنیوالے کم درجے لوگ ہیں"۔ (شعراء آیت ۱۱۱)

نبیوں اور حق کی دعوت دینے والوں اور مصلحین پر ابتداءً ایمان لانے والے اور انکی دعوت قبول کرنے والے زیادہ تر غریب غرباء عوام الناس ہی ہوتے ہیں جو اِن داعیانِ حق کی دعوت و تبلیغ کا دروازہ ثابت ہوتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لانے والے ابتداءً یہی غریب مچھیرے (ماہی گیر) تھے۔ اور خود ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنے والے اہل ثروت سے کہیں زیادہ غریب عوام ہی تھے۔ تقریباً ہر نبی و رسول کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا ہے۔ قوم نوح کے سرداروں کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی آبادی کے ایک حصہ کو نیچ اور اچھوت قرار دینے کا مرض مشرک جاہلی قوموں میں شروع سے چلا آرہا ہے۔

(۱۲) چند عبرتیں

ہر انسان اپنے قول و عمل کا خود ہی ذمہ دار ہے۔ باپ کی نیکی و بزرگی نافرمان بیٹے کے جرم و بغاوت کا علاج نہیں، اسی طرح بیٹے کی سعادت و نیک بختی باپ کی سرکشی کا بدل نہیں ہوتی۔

جلیل القدر رسول حضرت نوح علیہ السّلام آنکھوں سے اپنے لختِ جگر کو ڈوبتا دیکھ کر بارگاہِ الٰہی میں فریاد کرتے ہیں:۔

"اے میرے رب میرا بیٹا ڈوب رہا ہے، یہ میرے اہل سے ہے
اور تیرا وعدہ سچّا ہے کہ تو میرے اہل کو نجات دے گا، تو ہر فیصلے پر قادر ہے"۔

لیکن بارگاہ خداوندی سے بجائے استجابت یہ تنبیہہ دی جاتی ہے:۔

اے نوحؑ یہ تیرا اہل نہیں کیونکہ یہ "بدعمل" ہے۔ آئندہ ایسا سوال نہ کرنا ہم تم کو نصیحت کرتے ہیں کہ نادانوں جیسے نہ ہوں"۔

جلیل القدر باپ کی نسبت بھی بدعمل بیٹے کو عذاب سے بچا نہ سکی۔

مشرکینِ مکہ بھی اسی خام خیالی میں تھے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور بیت اللہ کے متولی و مجاور ہیں، ہم پر اللہ کا غضب آنہیں سکتا۔

یہود و نصاریٰ بھی اسی زعم و پندار میں تھے کہ ہم نبیوں کی اولاد اور اللہ کے بیٹے و رشتہ دار ہیں۔ ہمیں اگر عذاب ملا بھی تو چند ایک دن کا ہوگا۔ اور آج بھی اس طرح بہت سے غلط کار و بے عمل مسلمان اس جھوٹے و کھوکھلے بھروسوں پر تکیہ کئے ہوئے ہیں کہ ہم فلاں کی اولاد ہیں، فلاں بزرگ کی نسبت رکھتے ہیں، فلاں سلسلے سے وابستہ ہیں، فلاں درگاہ کے سجادہ نشین ہیں، فلاں قبر شریف کے مجاور ہیں، ان سلسلوں کی نسبت ضائع نہ جائیگی اور اللہ ان نسبتوں کی لاج رکھ ہی لے گا وغیرہ وغیرہ۔

حضرت نوح علیہ السلام کا یہ تذکرہ ایسے تمام گمراہ کُن نظریات پر کس زور سے ضرب لگاتا ہے۔

فَاعْتَبِرُوْا يَآ اُولِي الْاَبْصَارِ۔

تذکرہ
سیّدنا ھُود علیہ السّلام
اور
قومِ عاد

تعارُف

حضرت ہود علیہ السلام مشہور زمانہ قومِ عاد کی معزز ترین شاخ "خلُود" کے رکن رکین ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کے ایک صاحبزادے سام کی اولاد میں ساتویں پشت پر حضرت ہود علیہ السلام کا تذکرہ ملتا ہے۔

نسب نامہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:-

ہود بن عبد اللہ بن رباح بن خلود بن عاد بن عوص
بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام۔

حضرت ہود علیہ السلام نہایت سُرخ و سفید رنگ والے وجیہہ، دراز قد، نہایت متین و سنجیدہ اور پُر وقار شخصیت رکھتے تھے۔ ریش مبارک دراز اور خوبصورت تھی۔

سیّدنا ہُود علیہ السّلام اور قرآنِ حکیم

قرآن حکیم میں حضرت ہود علیہ السلام کا اسمِ گرامی سات جگہ آیا ہے۔ سورۂ ہود میں پانچ جگہ اور سورۂ اعراف میں ایک جگہ اور سورۂ شعراء میں ایک جگہ۔

سورۂ اعراف آیت۔ ۶۵
سورۂ ہود آیات۔ ۵۰، ۵۳، ۵۸، ۶۰، ۸۹
سورۂ شعراء آیت۔ ۱۲۴

حضرت ہود علیہ السلام جس قوم کی طرف بھیجے گئے تھے اُس کا نام "عاد" تھا۔ قومِ عاد کا تذکرہ قرآنِ حکیم کی دس سورتوں میں ملتا ہے۔

اعرافؑ ۔ ہودؑ ۔ مومنونؑ ۔ شعراءؑ ۔ فصّلتؑ ۔ احقافؑ ۔ الذاریاتؑ ۔ القمرؑ
الحاقۃؑ ، الفجرؑ

اِن سورتوں میں حضرت ہود علیہ السلام اور قوم عاد کے تذکرے تفصیلاً اور کہیں اختصاراً موجود ہیں۔ قرآن حکیم روئے زمین کی پہلی آسمانی کتاب ہے جس نے قوم عاد کا تذکرہ کیا ہے۔ اور سابقہ آسمانی کتب اس واقعہ سے خالی ہیں۔ اس لحاظ سے اِس قوم کے حالات کا پہلا اور آخری ماخذ یہ ہی کتاب مُبین ہے۔ نیز اس کے بیان کردہ تفصیلات کی تائید طبقات الارض کے ماہرین کی تحقیقات سے بھی ملتی ہیں۔ تاہم چونکہ پہلا ذریعہ قطعی اور یقینی ہے اس لئے قرآن حکیم کے بیان کردہ واقعات کو قطعیت حاصل ہوگی۔ لہٰذا قرآن حکیم کے بیان کردہ تفصیلات ہی قوم عاد کی تاریخ کا اساسی سرمایہ ہیں۔ البتہ اِس کا دوسرا ذریعہ یعنی ماہرین طبقات الارض کی تحقیقات چونکہ تخمینی اور قیاسی ہیں جیسا کہ خود اُن کا اعتراف بھی ہے اس لئے اِن کے بیان کردہ واقعات کی حیثیت ظن وتخمین سے آگے نہیں جاتی۔

حضرت نوح علیہ السلام کی طرح حضرت ہود علیہ السلام کی تبلیغی زندگی بھی نہایت صبر آزما اور طویل کشمکش سے دوچار رہی ہے۔

حضرت ہود علیہ السلام کی تبلیغی جدوجہد کے بیان کرنے سے پہلے قوم عادؑ کا تعارف ضروری ہے۔ جس سے اُس قوم کے مزاج و مذہب پر روشنی پڑتی ہے۔

قومِ عاد

"عاد" عرب کے قدیم قبیلہ کے صاحب قوت و اقتدار افراد کی جماعت کا نام ہے۔ عرب کے قدیم باشندے اپنے وطن سے نکل کر شام، مصر، بابل کی طرف ہجرت کر گئے تھے اور وہاں اپنا قیام کر لیا تھا اسکے بعد غلبہ و تسلط کر کے وہاں اپنی حکومتیں بھی قائم کر لی تھیں۔ انہی کی مختلف جماعتوں کو "عاد" "ثمود" "طسم" "جدیس" کہا جاتا تھا۔ قرآنِ حکیم نے انہی اقوام کو عادِ اُولیٰ کہا ہے۔

عاد عربی زبان کا لفظ ہے جسکے معنی بلند و بالا کے ہیں چونکہ یہ قوم اپنی قدوقامت میں نہایت دراز اور قوی تن تھی اس لئے اِس کا نام عاد پڑ گیا۔

قرآن حکیم نے لفظ عاد کے ساتھ اِرَمْ کا لفظ بھی استعمال کیا ہے جس کے

معنی بھی بلند و مشہور کے ہیں۔ اس لحاظ سے قوم عاد اُمم سابقہ میں نہایت معروف و مشہور قوم گزری ہے۔ قوم عاد کا زمانہ حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً دو ہزار سال قبل کا ہے۔ قرآن حکیم نے قوم عاد کو "مِنۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ" کہہ کر قوم نوح کے خلفاء میں شمار کیا ہے۔ عاد کا مرکزی مقام "ارضِ احقاف" ہے۔ یہ یمن کے علاقے حضرموت کے شمال میں واقع تھا جسکے شرق میں عمان اور شمال میں "ربع الخالی" واقع ہے (طویل وعریض صحرا) مگر آج یہاں ریت کے ٹیلوں کے سوا اور کچھ نہیں۔

قوم عاد کا مذہب بت پرستی تھا۔ یہ قوم اُنہی معبودوں کو پوجتی تھی جو قوم نوح میں رائج تھے۔ اِن کے علاوہ صمود، ہتار، صدا بھی ان کے معبودانِ باطل میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔

چونکہ عاد شروع ہی سے قوت و اقتدار کے مالک رہے ہیں اس لئے وہ اپنی اس نفری و جسمانی طاقت کے گھمنڈ میں اللہ واحد کی حقیقی قوت و اقتدار کو بھول بیٹھے اور اُن کی زبانوں سے

مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً۔

کون ہے ہم سے زیادہ طاقت والا؟ کے نعرے بلند ہونے لگے۔

انھیں اللہ تعالیٰ نے جہاں دنیاوی اقتدار دیا تھا وہاں خوشحالی اور فارغ البالی بھی عطا کی تھی، قوت اور اقتدار کے اسی احساس نے انھیں مست اور مغرور کر دیا تھا۔

کمزوروں پر ظلم کرنا، حق کی مخالفت کرنا، اللہ کے رسولوں کو جھٹلانا، نصیحت و خیر خواہی کرنے والوں کو اپنا دشمن سمجھنا، اپنی قوت و طاقت پر اترانا، متکبر و سرکش امراء کی پیروی کرنا، پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر شان و شوکت کے لئے اونچی اونچی عمارتیں بنانا۔ ان کی زندگی کے یہ ہی لیل و نہار تھے۔

اس بگڑے ہوتے ماحول میں اللہ تعالیٰ نے اسی قوم کے ایک معزز فرد حضرت ہود علیہ السلام کو اِنکی رشد و ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا۔

سیدنا ہود علیہ السلام کی تبلیغ

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم

کو سب سے پہلے اللہ واحد کی عبادت کرنے اور کمزوروں پر ظلم نکرنے کی نصیحت شروع کی اور ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے تھے کہ اے قوم میں اپنی اس نصیحت پر تم سے کوئی اجر وعوض کا خواہاں نہیں ہوں، میرا اجر تو اللہ ہی کے پاس محفوظ ہے۔
حضرت ہود علیہ السلام کی تبلیغ کا خلاصہ یہ تھا:-

"اے قوم کے لوگو! تم اپنی جسمانی قوت اور اقتدار پر گھمنڈ نہ کرو، اللہ کا شکر ادا کرو کہ اُس نے تم کو یہ نعمت بخشی ہے، قوم نوحؑ کی تباہی کے بعد تم کو اس زمین کا مالک بنایا ہے، خوش حالی اور فارغ البالی دولت وثروت عطا کی ہے۔ لہذا اُسکی ان نعمتوں کو نہ بھولو، اور خود ساختہ معبودوں کی پرستش سے باز آجاؤ، جو نہ تم کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان! موت وحیات، نفع وضرر، سب اللہ کے ہاتھ ہے۔"

"اے میری قوم کے لوگو! تم نے عرصے تک اللہ کی نافرمانی کی ہے آج توبہ کرلو اور بُت پرستی سے باز آجاؤ، اللہ کی رحمت وسیع ہے وہ تم کو اپنی رحمت سے معاف کر دیگا، اُس کی مغفرت چاہو وہ بخش دیگا۔ اللہ سے ڈرو وہ تم کو مزید قوت وطاقت دے گا، مال واولاد میں برکت دے گا، آسمان سے تم پر بارش نازل کرے گا۔ یاد رکھو! میں اپنی اس نصیحت وخیر خواہی پر تم سے کچھ اجر وصلہ نہیں مانگتا۔ میرا اجر اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔"

قوم عاد میں باصلاحیت افراد تو صرف چند ایک ہی تھے وہ تو ایمان لے آئے باقی تمام سرکش اور متمرد انسانوں کا مجموعہ تھا جن پر حضرت ہود علیہ السلام کی یہ خیر خواہی نہایت شاق گزرنے لگی۔ پہلے تو انھوں نے حضرت ہود علیہ السلام کا مذاق اُڑایا، پھر دھمکیاں دیں۔ کہنے لگے :- اے ہودؑ!

"تمہارا نصیحت کرنا نہ کرنا ہم پر کوئی اثر نہیں کرے گا، گزشتہ زمانے میں بھی لوگ ایسی باتیں کرتے آئے ہیں۔ اس قسم کی بے وقوفی نہ کرو، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی معبود کی تم پر مار پڑ گئی ہے جس سے تمہاری عقل خراب ہوگئی ہے۔ کیا ہم ایک ہی خدا کے پُجاری

ہو جائیں اور اُن معبودوں کو چھوڑیں جنہیں ہمارے آباء واجداد پوجتے آئے ہیں ؟ بھلا ایک خُدا ہماری ضرورتیں کس طرح پوری کرے گا ؟ اے ہود! اب بس کرو ہم اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں ، اور نہ تم پر ایمان لانے والے ہیں۔ اے ہود! اگر تم سچے ہو تو اپنے خدا کا وہ عذاب جسکی تم دھمکی دیتے آئے ہو لے آؤ ؟ ہم تم سے پھر ایک بار کہتے ہیں کہ ہمارے معبودوں کا ذکر کرنا چھوڑ دو ہم کو یہ بات سخت ناگوار ہے۔"

حضرت ہود علیہ السّلام اِن کے جواب میں فرمایا کرتے :۔

"اے قوم کے لوگو! نہ میں بے وقوف ہوں نہ مجھ پر کسی آسیب کا اثر ہے۔ میں بلاشبہ اللہ واحد کا فرستادہ اور اُسکا بندہ ہوں، میں اللہ کے سامنے ویسے ہی مجبور ہوں جیسے تم ہو، مجھکو بھی وہی بشری تقاضے پیش آتے ہیں جو تم کو پیش آتے ہیں، میں تم ہی جیسا بشر ہوں۔ اللہ تعالےٰ نے مجھکو اپنے کلام اور وحی کے لئے منتخب کیا ہے۔ میں تم کو اُس کی مرضیات اور احکام سے آگاہ کرتا ہوں، میرا بشر ہونا تمہارے لئے تعجب کی بات بن گیا ہے۔ حالانکہ مجھ سے پہلے جتنے بھی رسول آئے ہیں وہ سب بشر ہی تھے اور اپنی ہی قوم سے تھے جیسا کہ میں تمہاری قوم سے ہوں، میں اپنے خُدا اور تم سب کو گواہ بنا کر سب سے پہلے اعلان کرتا ہوں کہ میں اس اعتقاد سے بَری ہوں کہ خدا کے سوا کوئی مجھے نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اگر تمہارے بتوں میں ایسی کوئی قدرت ہے تو وہ مجھے نقصان پہنچانے میں جلدی کریں، میں اپنے خدا ہی پر بھروسہ کرتا ہوں جسکے قبضۂ قدرت میں کائنات کے تمام جانداروں کی موت وحیات ہے"

اے میری قوم کے لوگو! تم پچھلی قوموں کے حالات سے عبرت حاصل کرو، ان کی تباہی و بربادی سے سبق لو۔ اور یہ یاد رکھو کہ جب اللہ تعالےٰ کا فیصلہ ہو جائے گا پھر تمہارا کوئی عذر کام

نہ دے گا۔

قومِ عاد نے جب یہ باتیں سنی تو حیرت میں پڑ گئے اِن کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایک خدا کی پرستش کے کیا معنی ؟ آباء واجداد کے قدیم طریقوں کو ایک نوجوان کے کہنے پر کیوں کر چھوڑا جا سکتا ہے ؟ یہ تو ہمارے بزرگوں کی سخت توہین ہوگی۔ ہم اپنے معبودوں کو کسی حال میں بھی چھوڑنے والے نہیں۔ یقیناً ہُودؑ کو ہمارے معبودوں کی مار پڑ کر ہی رہے گی۔

اس طرح قوم کی مخالفت و سرکشی بڑھتی رہی پھر ان کا غیض و غضب بھڑک اُٹھا۔ حضرت ہود علیہ السلام کی تکذیب و تذلیل کے درپے ہو گئے۔ اُن کو مجنون اور خبطی کہنے لگے۔ آخر کار حضرت ہود علیہ السلام نے اُن کی مسلسل بغاوت و سرکشی کے خلاف یہ اعلان کر دیا کہ :۔

"اگر قوم کا یہ ہی حال رہا اور اُنھوں نے اپنے میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی تو اُن کے لئے ہلاکت یقینی ہے۔ اللہ تعالیٰ اِنہیں ہلاک کر کے دوسری قوم کو زمین کا مالک بنا دے گا۔ اے قوم عقل و ہوش سے کام لے خدا کے فیصلے کا وقت قریب آگیا ہے۔ اُس وقت نادم ہونے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا"۔

قوم نے حضرت ہود علیہ السلام کی مسلسل اور بار بار نصیحت کا غلط فائدہ اُٹھایا اور وہ سرکش و بیباک ہو گئے۔ بگڑ کر حضرت ہود علیہ السلام سے کہنے لگے :۔

"اے ہودؑ تو نے ہم کو اپنے خدا کے عذاب کی دھمکی دی ہے، اب ہم سے تیری روز روز کی نصیحتیں نہیں سنی جاتیں، اگر تو اور تیرا خدا سچا ہے تو وہ عذاب جلد لے آ تاکہ یہ جھگڑا ختم ہو"۔

حضرت ہود علیہ السلام نے پھر بھی خیر خواہی کے انداز میں جواب دیا کہ اگر اسکا تم کو اشتیاق ہے تو وہ دن کچھ زیادہ دور نہیں، اب تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

عذاب کی آمد

چنانچہ عاد کی انتہائی بغاوت و سرکشی اور اپنے مخلص و خیر خواہ

ہادی و رہبر کی مسلسل مخالفت و عناد نے "قانون جزا" کو قریب تر کر دیا۔

نقطۂ آغاز کے طور پر پہلے خشک سالی کی شکل میں عذاب آیا جو اُن سے نعمتوں کے چھین لئے جانے کا باعث ہوا۔

یہ عذاب چونکہ کوئی نیا نہ تھا قوم نے اسکو "حوادثِ زمانہ" خیال کیا۔ حضرت ہود علیہ السلام نے پھر بھی خیر خواہی جاری رکھی۔ سمجھایا کہ یہ تمہاری مکمل ہلاکت و بربادی کا نقطۂ آغاز ہے۔ اب بھی باز آجاؤ مجھ پر ایمان لے آؤ۔ یہی راہِ نجات ہے لیکن بے نصیب قوم پر پھر بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ تب وہ عذاب آیا جو عالم کی تاریخ میں شاید ہی آیا ہو۔

سات رات آٹھ دن مسلسل تیز و تند بادِ صَرصَر کا طوفان آیا، ہوا کا ہر ایک جھٹکا پچھلے جھٹکے سے شدید تر تھا جس نے سارے شہر کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ قوی ہیکل قدو قامت والی قوم جو اپنی جسمانی طاقت کے گھمنڈ میں بدمست ہو چکی تھی اِس طرح بے حس و حرکت چوطرف بکھری پڑی تھی جس طرح آندھی و طوفان کے بعد تناور درخت اکھڑ کر گر پڑتے ہیں۔ خوبصورت ہرا بھرا شہر ویران و کھنڈر بن کر رہ گیا۔ اُن کے قلعہ نما مکانات جو پہاڑوں کو تراش تراش کر بنائے گئے تھے ریت کے تودے بن گئے۔ اُنکی زندگی آنے والی نسلوں کے لئے عبرت بنا دی گئی۔

ہزار ہا برس گزر جانے کے بعد بھی آج اُن کے تباہ شدہ آثار نبیوں کی تعلیمات سے روگردانی کے عواقب و نتائج سے خبردار کر رہی ہیں۔

ہلاک شدہ افراد کی تعداد رُوح المعانی کے مُفسر نے چار ہزار لکھی ہے۔ لیکن بنوسام کی قدیم تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ واللہ اعلم۔

یہ ہے عادِ اُولیٰ کی وہ داستانِ عبرت جو اپنے اندر چشمِ بصیرت کے لئے بیشمار پند و نصائح رکھتی ہے۔ اور اللہ اعلیٰ و برتر کے احکام کی تعمیل اور نبیوں کی اطاعت سے گُریز کے عواقب و نتائج سے خبردار کرتی ہے۔

حضرت ہود علیہ السلام اور قوم عاد کا یہ تذکرہ قرآن حکیم کی مختلف سورتوں میں اس طرح موجود ہے۔

قرآنی مضمون | وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ

اعْبُدُوا اللّٰهَ الخ (اعراف آیات ۶۵ تا ۷۲)

اور عاد کی طرف انکے بھائی ہودؑ کو بھیجا گیا، انھوں نے کہا اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو اسکے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، پھر کیا تم (انکار و بدعملی کے نتائج سے) نہیں ڈرتے؟ اُن کی قوم کے سرداروں نے جو ہودؑ کی بات ماننے سے انکار کر رہے تھے جواباً کہا اے ہود ہم تو تمہیں بے عقلی میں مبتلا سمجھتے ہیں۔ اور ہم کو یقین ہے کہ تم جھوٹے ہو! ہودؑ نے کہا اے میری قوم میں بے عقلی میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ رب العالمین کا رسول ہوں۔ تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمہارا امانتدار خیر خواہ ہوں۔ کیا تم کو اس بات پر تعجب ہوا کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم سے ایک آدمی کے ذریعہ تمہارے رب کی نصیحت آئی ہے تاکہ وہ تم کو خبردار کرے؟ خدا کا یہ احسان یاد کرو کہ قوم نوحؑ کے بعد تم کو زمین کا جانشین بنایا اور تمہیں قد و قامت میں پھیلاؤ بھی زیادہ دیا۔ پس خُدا کی اِن نعمتوں کو یاد کرو امید کہ تم فلاح پاؤ۔

قوم نے جواب دیا اے ہودؑ کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہم صرف ایک اللہ ہی کی عبادت کریں اور اُن معبودوں کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں؟ اچھا تو پھر لے آؤ وہ عذاب جسکی تو ہمیں دھمکی دیتا آیا ہے، اگر تو سچا ہے۔ ہودؑ نے کہا تمہاری رب کی پھٹکار تم پر پڑ گئی ہے اور اُس کا غضب ٹوٹ پڑا ہے۔ کیا تم مجھ سے اُن فرضی ناموں پر جھگڑا کرتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں جن کے لئے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے، اچھا تو تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔

آخر کار ہم نے اپنے کرم سے ہودؑ اور اُن کے ساتھیوں کو بچالیا اور اُن لوگوں کی جڑ کاٹ دی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے اور وہ ایمان لانے والے نہ تھے۔"

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا

اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ۔ الخ

(ہود آیات ۵۰ تا ۶۰)

اور عاد کی طرف اُن کے بھائی ہودؑ کو بھیجا گیا اُنھوں نے کہا اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اُسکے سوا تمہارا اور کوئی معبود نہیں تم نے محض فرضی معبود گھڑ رکھے ہیں۔

اے میری قوم کے لوگو! میں تم سے اِس کام پر کوئی اُجرت نہیں چاہتا، میرا صلہ تو اُسی کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے! اور اے میری قوم کے لوگو! تم اپنے رب سے مغفرت چاہو پھر اُسکی طرف رجوع ہو جاؤ وہ تم پر آسمان کے دروازے کھول دے گا برسنے والے بادلوں سے، اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کر دے گا اور تم مجرموں کی طرح منہ نہ پھیرو۔ قوم نے جواب دیا: اے ہود! تو ہمارے پاس کوئی واضح دلیل لیکر نہیں آیا اور ہم تیرے کہنے پر اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں اور نہ تجھ پر ایمان لانے والے ہیں۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ تیرے اوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی ایک کی مار پڑ گئی ہے۔ ہودؑ نے کہا میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم گواہ رہو کہ یہ جو تم نے اللہ کے سوا دوسروں کو خدائی میں شریک ٹھیرا یا ہے اُس سے میں بیزار ہوں۔ تم سب ملکر میرے خلاف اپنی تدبیر میں کوئی کسر نہ چھوڑو پھر مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ میرا بھروسہ تو اللہ پر ہے جو میرا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی مالک ہے کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی پیشانی اللہ کے قبضے میں نہ ہو۔ بیشک میرا رب سیدھی راہ پر ہے۔ پھر اگر تم منہ پھیرتے ہو (تو پھیر لو) جو پیغام دے کر مجھے تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں نے تم تک پہنچا دیا ہے اور میرا رب تمہاری جگہ دوسری قوم کو زمین کا خلیفہ بنائے گا اور تم اسکو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکوگے بیشک میرا رب ہر چیز پر نگراں ہے۔

اورجب ہمارا حکم آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے ہوڈ اور ان
لوگوں کو جواُن کے ساتھ ایمان لائے تھے نجات دیدی اور ایک
سخت ترین عذاب سے اُنھیں بچالیا۔ اور یہ ہیں عاد جنھوں نے اپنے
رب کی آیات کا انکار کیا اور اُسکے رسولوں کی بات نہ مانی اور ہر متکبر
و سرکش کے حکم کی پیروی کی۔

آخرکار اس دُنیا میں بھی اُن پر پھٹکار پڑی اور قیامت کے
روز بھی (اے لوگو) سُن لو عاد نے اپنے رب کا انکار کیا۔ آگاہ ہوجاؤ
ہلاکت ہوئی عاد کے لئے جو ہوڈ کی قوم ہے :-

ثُمَّ اَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ۔ فَاَرْسَلْنَا
فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ
غَيْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ۔ الخ (المؤمنون آیات ۳۱ تا ۴۱)

پھر ہم نے قوم نوحؑ کے بعد قوموں کا ایک دوسرا سلسلہ
شروع کیا۔ پھر اُن میں اُنہی کی قوم کا رسول بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو
تمہارے لئے اُسکے سوا کوئی معبود نہیں کیا تم ڈرتے نہیں ؟

اُسکی قوم کے جن سرداروں نے ماننے سے انکار کیا اور آخرت
کی پیشی کو جھٹلاتے تھے جن کو ہم نے دنیا کی زندگی میں آسودہ حال کر رکھا
تھا، کہنے لگے یہ شخص ہوڈ کچھ نہیں مگر ایک بشر ہے تم ہی جیسا، جو
کچھ تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔
اور اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت قبول کرلی تو گھاٹے
ہی میں رہو گے۔ یہ تم کو اطلاع دیتا ہے کہ جب تم مر کر مٹی ہوجاؤ گے
اور ہڈیوں کا چورا ہوجائے گا اس وقت تم (قبروں سے) نکالے جاؤ گے۔
بعید بالکل بعید ہے۔ یہ وعدہ جو تم سے کیا جارہا ہے۔ زندگی اور کوئی
نہیں مگر بس یہی دُنیا کی زندگی ہے۔ یہیں ہم کو مرنا ہے اور جینا ہے
اور ہم دوبارہ ہرگز زندہ نہیں کئے جائینگے۔ کچھ نہیں یہ ایک ایسا آدمی
ہے جو اللہ پر جھوٹ بولتا ہے ہم اسپر کبھی یقین کرنے والے نہیں ہیں۔

اسپر ہودؑ نے دُعا مانگی خدایا میری مدد فرما کیونکہ انھوں نے مجھکو جھٹلایا ہے۔ حکم ہوا کہ عنقریب ایسا ہونے والا ہے کہ یہ اپنے کئے پر شرمسار ہونگے۔ چنانچہ فی الحقیقت ایک ہولناک آواز نے اُنہیں آپکڑا اور ہم نے اُنہیں خس وخاشاک کی طرح پامال کر دیا۔ سو برباد ی ہوئی ظالم قوم کے لئے۔

كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِينَ. إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ أَلَا تَتَّقُونَ. الخ (الشعراء آیات ۱۲۳ تا ۱۴۰)

قومِ عاد نے اللہ کے رسولوں کو جھٹلایا۔ جبکہ اُن کے بھائی ہودؑ نے اُن سے کہا کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے؟ میں تمہارے لئے ایک امانتدار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں تم سے اس کام پر کوئی بدلہ طلب نہیں کرتا ہوں میرا اجر تو رب العالمین کے ذمے ہے۔ یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لاحاصل عمارت بناڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا کہ تم کو یہاں ہمیشہ رہنا ہے۔ اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو ظلم کا پنجہ ہی مارتے ہو۔ سو اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔ اور ڈرو اُس اللہ سے جس نے تمہیں وہ کچھ دیا جو تم جانتے ہو۔ تمہیں جانور دیئے، اولاد دی، باغات دیئے، چشمے دیئے۔ بیشک میں ڈرتا ہوں تمپر ایک بڑے عذاب والے دن سے، قوم نے جواب دیا تو نصیحت کر یا نہ کر ہمارے لئے سب یکساں ہے۔ یہ باتیں تو اگلے وقتوں سے یونہی ہوتے چلی آرہی ہیں۔ اور ہم عذاب میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں۔

آخرکار اُنھوں نے ہودؑ کو جھٹلا دیا اور ہم نے بھی اُنہیں ہلاک کر دیا۔ بیشک اسمیں ایک عبرت ہے مگر اِن میں سے اکثر لوگ ماننے والے نہیں ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب وہی زبردست ہے رحم والا ہے۔

فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً. الخ (حٰمٓ السجدہ آیات ۱۵ تا ۱۶)

عاد کا یہ حال تھا کہ وہ زمین پر بغیر کسی استحقاق بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے کون ہے ہم سے زیادہ زُور آور؟ اُنھوں نے یہ غور نہ کیا کہ جس خُدا نے اُنہیں پیدا کیا وہ اِن سے زیادہ زُور آور ہے، اور وہ ہماری آیات کا انکار ہی کرتے رہے۔

آخر کار ہم نے اُن پر بادِ صَرصَر کا طوفان ایسے دنوں میں بھیجا جو (عذاب کی وجہ سے اُن کے حق میں) منحوس تھے تاکہ ہم اُنکو اس دُنیوی حیات میں رُسوائی کے عذاب کا مزہ چکھا دیں۔ اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی زیادہ رُسوا کُن ہے۔ وہاں اُن کی کوئی بھی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔"

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ۔ الخ

(الاحقاف آیات ۲۱ تا ۲۶)

"اے نبیؐ ذرا انھیں عاد کے قومی بھائی ہودؑ کا قصہ سُناؤ جبکہ اُس نے مقامِ احقاف میں اپنی قوم کو خبردار کیا تھا اور ایسے خبردار کرنے والے اُس سے پہلے بھی گزر چکے تھے اور اُس کے بعد بھی آتے رہے کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔

قوم کے لوگوں نے کہا کیا تو اس لئے آیا ہے کہ ہمیں بہکا کر ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دے؟ تو پھر لے آ اپنا وہ عذاب جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے اگر واقعی تو سچا ہے؟ ہودؑ نے کہا اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے میں تمہیں صرف وہ پیغام پہنچا رہا ہوں جسے دیکر مجھے بھیجا گیا ہے مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔ پھر جب اُن لوگوں نے اُس بادل کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے یہ بادل ہے جو ہم کو سیراب کر دے گا، نہیں، بلکہ یہ وہی چیز ہے جسکے لئے تم جلدی مچا رہے تھے۔ یہ ہوا کا طوفان ہے جسمیں دردناک عذاب ہے۔

اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گا۔ آخر کار ان کا حال یہ ہوا کہ اُن کے رہنے کی جگہوں کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اسی طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔

ہم نے اُن لوگوں کو جو اقتدار دیا تھا وہ تم لوگوں کو نہیں دیا اُن کو ہم نے کان دیئے آنکھیں اور دل، مگر نہ وہ کان اُنکے کسی کام آئے نہ آنکھیں نہ دل، کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور اُسی چیز کے پھیر میں آگئے جسکا وہ مذاق اُڑاتے تھے۔"

وَفِیْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْہِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ۔ الخ

(الذّریات آیات ۴۱ تا ۴۲)

اور قوم عاد کے ہلاک ہونے میں خالقِ کائنات کی بہت سی نشانیاں ہیں جبکہ ہم نے اُن پر ایک منحوس آندھی چلادی۔ جس چیز پر ہوکر وہ گزرتی تھی اُسکو بوسیدہ ہڈی کی طرح چورا کئے بغیر نہ چھوڑتی۔"

کَذَّبَتْ عَادٌ فَکَیْفَ کَانَ عَذَابِیْ وَنُذُرِ۔ الخ

(القمر آیات ۱۸ تا ۲۲)

"جھٹلایا عاد نے رسولوں کو پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور کیسی تھی میری تنبیہات ؟ ہم نے ایک مسلسل نحوست والے دن سخت طوفانی ہوا اُن پر بھیج دی۔ جو لوگوں کو اُٹھا اُٹھا کر اس طرح پھینک رہی تھی جیسے وہ جڑ سے اُکھڑے ہوئے کھجور کے تنے ہوں۔ پس دیکھ لو کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات ؟ ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنایا ہے۔ پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا ؟"

وَاَمَّا عَادٌ فَاُہْلِکُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَۃٍ۔ الخ

(الحاقہ آیات ۶ تا ۸)

"اور عاد ایک بڑی شدید طوفانی ہوا سے ہلاک کر دیئے گئے۔ اللہ نے اُس آندھی کو مسلسل سات رات آٹھ دن اُن پر مسلّط

رکھا (تم وہاں ہوتے تو) دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح پچھاڑے گئے ہیں جیسے کھجور کے بوسیدہ تنے ہوں۔ اب کیا اُن میں سے کوئی تمہیں باقی بچا نظر آتا ہے؟ اور اسی جُرم کا ارتکاب فرعون اور اُس سے پہلے لوگوں نے اور تَل پٹ ہو جانے والی بستیوں نے کیا تھا۔ اُن سب نے اپنے رسولوں کی بات نہ مانی تو اللہ نے اُن کو بڑی سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔"

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ۔ الخ (الفجر آیات ۶ تا ۱۴)

"تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا اُونچے ستونوں والے عادِ ارم کے ساتھ۔ اِس جیسی قوم دُنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی۔ ثمود کے ساتھ جنھوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں۔ میخوں والے فرعون کے ساتھ۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی پھیلا رکھی تھی۔ اور ان میں بہت فساد مچا رکھا تھا۔

آخر کار تیرے رب نے اُن پر عذاب کا کوڑا برسا دیا۔
حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب گھات لگائے ہوئے ہے۔"

نتائج و عبر

(۱) احقاف والے

حضرت ہود علیہ السلام جس شہر کی طرف مبعوث کئے گئے تھے اُس کا نام قرآن حکیم نے احقاف بیان کیا ہے۔

احقاف حِقف کی جمع ہے جسکے معنی ریت کے اونچے ٹیلے کے ہیں۔ یہ صحرائے عرب (الربع الخالی) کے جنوب مغربی حصّے کا نام ہے۔ ہزاروں سال قبل یہ سرسبز و شاداب علاقہ تھا جہاں ایک طاقتور متمدن قوم آباد تھی لیکن آج یہاں کوئی آبادی نہیں ایک لق و دق

ریگستان ہے جس کے اندرونی حصے میں جانے کی کوئی ہمت نہیں کرتا۔ ۱۸۴۳ء میں ایک سیاح اس ریگستان کے جنوبی کنارے تک پہنچ گیا تھا وہ کہتا ہے کہ حضرموت شہر کے شمالی سطح مرتفع پر کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو یہ صحرا کم و بیش ایک ہزار فیٹ نشیب میں نظر آتا ہے۔ اسمیں جگہ جگہ ایسے سفید قطعات ہیں جن میں اگر کوئی شئے گر جائے تو وہ ریت میں غرق ہوتی معلوم ہوتی ہے اور بالکل بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ عرب کے صحرا نشین بھی اِن علاقوں میں جانے سے گھبراتے ہیں۔ وہ سیاح کہتا ہے کہ میں ہمت کر کے وہاں تک پہنچا دیکھا کہ ریت نہایت باریک اور نرم ہے۔ میں نے دور سے اس قطعے میں ایک ہتیار پھینکا پچیس منٹ کے اندر اندر وہ ریت میں غرق ہو گیا اور اُس رسّی کا سرا گل گیا جس کے ساتھ وہ بندھا ہوا تھا۔

قوم عاد اسی علاقے میں آباد تھی، موجودہ شہر مُکلاّ سے تقریباً ۱۲۵ میل کے فاصلے پر شمال کی جانب حضرموت میں ایک مقام پر حضرت ہود علیہ السلام کا مزار معروف و مشہور ہے۔ جسکی لوگ زیارت کیا کرتے ہیں۔ اہل حضرموت کا دعویٰ ہے کہ عاد کی ہلاکت کے بعد حضرت ہود علیہ السلام حضرموت کے شہروں کی طرف ہجرت کر آئے تھے اور وہیں وفات پائی۔

حضرت علی رضؓ سے بھی ایک اثر منقول ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام کی قبر شریف حضرموت میں کثیب احمر (سرخ ٹیلہ) پر ہے اور اُن کے سرہانے جھاؤ کا درخت ہے۔ لیکن اہل فلسطین کا ادّعا ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام کی قبر فلسطین میں ہے۔ واللہ اعلم۔

(۳) بے حقیقت نام

حضرت ہود علیہ السلام نے جب تبلیغ کا آغاز کیا تو قوم کے افراد نے آن کو بیوقوف اور جھوٹا کہا، قوم کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اللہ واحد کی عبادت کے کیا معنی؟ صرف ایک ہستی اتنے بڑے نظام کائنات کا انتظام کیونکر کر سکتی ہے؟

ان لوگوں کا خیال تھا کہ کائنات کے لاکھوں شعبوں کے لئے ایک خدا کی کارسازی ممکن نہیں، اس لئے انھوں نے دُنیا کے مختلف امور کیلئے الگ الگ معبود قرار دے لئے تھے اور انکے مختلف نام بھی گھڑ لئے تھے، حضرت ہودؑ نے اُنکی اس تجویز پر بارہا اعتراض کیا کہ اے قوم کیا تم مجھ سے اُن ناموں پر جھگڑتے

ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں جن کے لئے اللہ نے کوئی سند و دلیل نازل نہیں کی ہے۔

یعنی یہ صرف نام ہی نام ہیں جنکی تم عبادت کرتے ہو ان ناموں کے پیچھے کوئی طاقت و اقتدار نہیں، تم نے کسی نام کو بارش کا رب اور کسی کو ہوا کا، کسی کو پانی کا، کسی کو دولت کا، کسی کو صحت و بیماری کا خدا کہتے ہو۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی فی الحقیقت کسی چیز کا بھی رب نہیں ہے۔ لیکن قوم اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر قطعاً آمادہ نہ ہوئی اُنھیں کسی طرح بھی یقین نہیں آتا کہ صرف ایک ہستی اتنے بڑے نظامِ کائنات کو کیونکر قائم رکھ سکتی ہے؟ کائنات کے لئے تقسیم کار ضروری ہے، یہ قوم اللہ تعالیٰ کے لئے اہل کار تجویز کرتی تھی مگر اللہ کے وجود کا انکار نہیں کرتی تھی۔ کائنات کے لئے اللہ کا وجود جانتے و مانتے ہوئے بھی چند فرضی ہستیوں کو حاجت روائی کے لئے پکارا کرتی تھی، اُن کے نام پر نذر و نیاز بھی کی جاتی تھی۔ اُن سے دُکھ درد میں استغاثہ و فریاد بھی کرتے تھے، اور خوشی و مسرت میں اُن کے نام کا وظیفہ بھی پڑھتے تھے۔ اور یہ اتنا قدیم طریقہ تھا کہ اسکو چھوڑنا اُن کے لئے تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ اس طریقے پر اِن کی پشتیں گزر گئیں تھیں۔

موجودہ زمانے میں بھی بعض لوگ کسی انسان کو "مشکل کشا" کہتے ہیں۔ حالانکہ مشکل کشائی کی کوئی طاقت اِس کے پاس نہیں ہوتی ہے۔

کسی کو "گنج بخش" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حالانکہ اُس کے پاس کوئی گنج نہیں کہ کسی کو بخشے۔ کسی کو "داتا" کا لفظ بولتے ہیں حالانکہ وہ کسی شئی کا مالک ہی نہیں کہ داتا بن سکے۔ کسی کو "غریب نواز" کہا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ غریب اُس اقتدار میں کوئی حصہ نہیں رکھتا کہ کسی غریب کو نواز سکے۔ کسی کو "غوث" (فریادرس) کہا جاتا ہے حالانکہ وہ کوئی زور نہیں رکھتا کہ کسی کی فریاد کو پہنچ سکے۔ کسی کو "بندہ نواز" سمجھا جاتا ہے حالانکہ وہ خود بندہ ہے، بندگی کے بندھنوں میں کسا ہوا، کسی کو "دستگیر" کہا جاتا ہے باوجودیکہ وہ خود دست نگر تھا کسی کی کیا دستگیری کرتا؟ درحقیقت یہ اور ایسے سب نام محض نام ہی نام ہیں جنکے پیچھے کوئی اقتدار، قدرت، اور طاقت نہیں جو اِن کے لئے جھگڑا کرتا ہے وہ دراصل صرف ناموں کے لئے جھگڑتا ہے نہ کہ کسی حقیقت کے لئے!

سیدنا ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو یہی حقیقت سمجھانی چاہی لیکن اتنی کھلی حقیقت سمجھی نہ گئی۔

یہ دنیا کا عجوبہ نہیں تو اور کیا ہے کہ مجبور اور بے بس انسانوں نے اپنے ہی وہم و گمان سے خدائی کا جتنا حصہ جس کو چاہا دے ڈالا اور اسکو اپنا مذہب و ایمان بھی بنالیا۔ فَسُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ۔

(۳) آخری مہلت

قوم کی بغاوت و گریز سے حضرت ہود علیہ السلام قطعاً مایوس نہیں ہوئے بلکہ مسلسل افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری رکھا اور مختلف طریقوں سے یہ حقیقت سمجھاتے رہے کہ اے قوم اپنی اس گئی گزری حالت پر بھی اپنے رب سے معافی چاہو، اسکی طرف پلٹ آؤ وہ تم پر رحمت کی بارش کے لئے آسمان کے دروازے کھول دے گا، تمہاری موجودہ قوت میں مزید اضافہ کر دیگا اور تم کو اچھا سامانِ زندگی عطا کرے گا۔

یہ حقیقت قرآن حکیم نے کئی مقامات پر ظاہر کی ہے کہ جب ایک قوم کے پاس نبیؐ کے ذریعہ اللہ عظیم کا مکمل پیغام آجاتا ہے تو اس قوم کی قسمت اس پیغام کے ساتھ وابستہ ہوجاتی ہے، اگر وہ قوم اسکو قبول کرلیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر اپنی نعمتوں و برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے، اور اگر اس پیغام کو قوم رد کردیتی ہے تو کچھ مہلت کے بعد اس قوم کو ہلاک کردیا جاتا ہے۔

انبیاء کرام کی پوری تاریخ یہ ہی نتائج پیش کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہر قوم کے ساتھ یوں ہی رہی ہے۔ البتہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی یہ سنت اس سے مختلف ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اپنی حکمتوں کے پیشِ نظر اس کا اس طرح اظہار فرمایا ہے:-

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ۔ (انفال آیت ۳۳)

اور اللہ تعالےٰ ایسا نہ کرینگے کہ ان میں آپؐ کے ہوتے ہوئے ان کو عذاب دیں، اور اللہ تعالےٰ ان کو عذاب نہ دیں گے جس حالت

ہیں کہ وہ استغفار بھی کرتے رہتے ہیں۔

(۴) ذہنی وفکری ارتداد اور ایک شبہ کا ازالہ

جب ایک شخص قرآن حکیم کے مطالعہ میں بار بار یہ پڑھتا ہے کہ فلاں قوم نے اپنے نبیؑ کو جھٹلایا تو اسکو تباہ کر دیا گیا، فلاں قوم نے نبیؑ کی مخالفت کی جسکے سبب ہلاکت سے دوچار ہوئی۔ کسی کو زمین میں دھنسا دیا گیا کسی قوم پر آسمان سے آگ برس پڑی، کسی قوم کو زلزلہ نے تباہ کر دیا، کسی کو (صاعقہ) بجلی کی کڑک نے آدبایا، کسی قوم کو غرق کر دیا گیا۔ تو دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کے واقعات اب کیوں نہیں ہوتے؟ جبکہ بغاوت و سرکشی، خدا بیزاری، آخرت فراموشی، کفر و شرک، فسق و فجور انتہائی عروج پر ہیں؟

اسکا جواب نہایت آسان ہے۔ دراصل بغاوت و سرکشی کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ ایک بغاوت وہ ہے جو نبیؑ و رسولؑ کی موجودگی میں رُونما ہو، جس قوم میں نبی موجود ہوتا ہے وہ قوم نبی کی راست مخاطب ہوتی ہے اور اللہ عظیم کا پیغام اُس قوم کو براہِ راست ملتا ہے۔ نبی کی زندہ شخصیت جو اپنی ذات میں صداقت و دیانت اور امانت و ہدایت کا سرچشمہ ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی حجت کا زندہ نمونہ ہوتا ہے۔ حق پر واضح دلیل و حجت پیش کرتا ہے اور کبھی معجزات سے اپنی حقانیت واضح کرتا ہے۔ اس طرح اُس قوم پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو جاتی ہے۔ اُس کے بعد اُس قوم کیلئے معذرت و مہلت کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ایسے وقت اللہ کے فرستادہ کو دُو بدو جھٹلانے کے بعد وہ قوم اسکی مستحق ہو جاتی ہے کہ اِس کا حساب برسرِ موقع چکا دیا جائے، سابقہ اقوام انہی بنیادوں پر ہلاکت سے دوچار ہوئی ہیں۔

بغاوت کی دوسری شکل جس پر اس طرح کے واقعات پیش نہیں آتے پہلی صورت سے مختلف ہے۔ جن قوموں کے پاس اللہ واحد کا پیغام براہِ راست نہ آیا ہو بلکہ مختلف واسطوں سے پہنچا ہو اُن کا معاملہ ویسا نہیں جیسا کہ نبی کی موجودگی میں بغاوت و مخالفت کا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت و رسالت کا سلسلہ بند ہو گیا، وحی الٰہی قیامت تک کے لئے روک لی گئی، معجزات کا سلسلہ بھی

باقی نہ رہا، نبی کا وجود جو نور و ہدایت کا چلتا پھرتا نمونہ ہوتا ہے ممکن نہ رہا، ان حالات میں بغاوت وسرکشی وہ نتائج پیدا نہیں کرتی جو نبی کی موجودگی میں بغاوت پر مرتب ہوا کرتے ہیں اسلئے ختم نبوت کے بعد قوم کی سرکشی و بغاوت پر اب اگر ایسے حوادث پیش نہیں آتے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ البتہ تعجب کے قابل کوئی بات ہو سکتی ہے تو یہ کہ اب بھی کسی قوم پر اُسی شان کا عذاب آ جاتا جیسا کہ انبیاء کرام کو دُو بدو جھٹلانے والی قوم پر آتا تھا۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اب مُجرم قوموں پر عذاب آنے بند ہو گئے ہوں۔ آج بھی ایسی گمراہ قوموں پر چھوٹے بڑے تنبیہی عذاب آتے رہتے ہیں۔ لیکن غور و فکر کے زاوئے بدل گئے ہیں۔ خُدا بیزار اور آخرت فراموش اذہان نے ایسے حوادث کو "حادثۂ اتفاقی" کا نام دے لیا ہے یا "گردشِ زمانہ" کا نام رکھ دیا ہے یا پھر کسی اسباب ظاہری کی طرف نسبت کر دی ہے ورنہ جرائم پر جو حوادث آتے ہیں وہ دراصل "عذاب" ہی ہوتے ہیں۔

یہ ذہنی وفکری ارتداد ہے جو اللہ تعالےٰ کی ذات اور اُسکے قوانینِ فطرت کو تسلیم نہ کرنے کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔

(۵) بادِ صَرصَر

قومِ عاد پر جو عذاب آیا اُسکی نوعیت نہایت دلدوز ہے۔ ایک طوفانی ہوا تھی جسکے لئے قرآنِ حکیم نے "رِیحِ صَرصَر" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اسکے معنی ایسی ہوا کے ہیں جسکے چلنے سے سخت شور برپا ہو۔ یہ شور خود ہوا کی آواز سے پیدا ہوتا تھا یا پھر اطراف واکناف کی چیزوں سے ٹکرانے پر پیدا ہوتا ہو۔ بہرحال یہ لفظ نہایت تُند و تیز ہوا کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ طوفانی ہوا مسلسل سات رات آٹھ دن چلتی رہی۔ اسکے زور اور اثر سے لوگ مر مر کر گر پڑے۔ چونکہ یہ لوگ بڑے قد آور اور بڑی ڈیل ڈول کے تھے۔ اسلئے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کھجور کے تنے گر پڑے ہیں۔ جس چیز پر سے یہ ہوا گزر تی گئی اسکو چورا چورا کر کے رکھ دیا۔ جس وقت یہ ہوا آنے لگی اُس وقت قومِ عاد خوشیاں منانے کیلئے باہر نکل پڑے کہ ایک طویل عرصے کے بعد گھٹا گھر کر آئی ہے۔ بارش ہو گی اور سُوکھے کھیتوں پر پانی برسے گا۔ مگر جب وہ آئی تو اس طرح آئی کہ اُن کے پورے

علاقے کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔ سورۃ الذّاریات میں اس بادِ صرصر کیلئے الرِّیۡحُ الۡعَقِیۡمُ کا لفظ آیا ہے جسکے معنی خشک اور بے خبر ہوا کے ہیں۔ دراصل عقیم کا لفظ بانجھ عورت کے لئے بولا جاتا ہے جو اولاد سے نا امید ہو چکی ہو۔ یعنی وہ ایسی ہوا تھی جو اپنے اندر کوئی بھی بھلائی نہیں رکھتی تھی، نہ خوشگوار تھی نہ ہی بارش لانے والی، اور نہ درختوں کو بارآور کرنے والی، پھر اس بے خبری کے ساتھ نہایت شدید آندھی کی شکل میں آئی تھی جس نے لوگوں کو اٹھا اٹھا کر پٹک دیا۔

(۶) **اَیَّامِ نَحِسَات** | قوم عاد پر "ریح صرصر" یا "ریح عقیم" کا عذاب سورۃ قمر میں اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ رِیۡحًا صَرۡصَرًا فِیۡ یَوۡمِ نَحۡسٍ مُّسۡتَمِرٍّ (آیت ۱۹)

"تو ہم نے اُن پر ایک سخت آندھی روانہ کر دی جو دائمی نحوست کے دن واقع ہوئی"۔

اور سورۃ حٰمٓ السجدہ میں اس طرح آیا ہے۔

فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ رِیۡحًا صَرۡصَرًا فِیۡۤ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ الخ (آیت ۱۶)

"پھر ہم نے روانہ کر دی اُنپر بادِ صرصر منحوس دنوں میں"۔ الخ

مشہور یہ ہے کہ یہ عذاب بُدھ کے دن آیا تھا اس لئے قدیم زمانے سے لوگوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ بدھ کا دن منحوس دن ہے۔ اور اس پر ہر زمانے میں مختلف عقیدے قائم ہوتے چلے گئے کہ اس دن کوئی اچھا کام نہیں کرنا چاہیئے۔ بدھ کے دن سفر کرنا عموماً نامبارک ہے۔ کوئی بڑا لین دین اس دن نہ ہونا چاہیئے، بدھ کے دن ناخن نہ کاٹنا چاہیئے، مریض کی عیادت نہ کرنا چاہیئے، اور یہ کہ مرض جذام و برص اسی روز شروع ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اِن توہمات کے پیچھے چند ضعیف احادیث بھی نقل ہوتی چلی آرہی ہیں جس سے بدھ کے دن کی نحوست کا عقیدہ عوام الناس میں رائج ہو گیا۔

علم حدیث کے محققین نے ایسی تمام روایات کو نہایت ضعیف، مہمل، موضوع (جھوٹی) قرار دیا ہے. کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں جو صحیح کہی جا سکے۔

امام المحدثین حافظ سخاویؒ کہتے ہیں کہ جتنے طریقوں سے بھی یہ روایات منقول ہیں سب کی سب غیر مستند ہیں۔ یہ ہی بات علامہ ابن رجب حنبلیؒ، علامہ ابن جوزیؒ، علامہ آلوسیؒ سے منقول ہیں۔ محقق مناویؒ نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ بدھ کے دن کو منحوس سمجھ کر چھوڑ دینا اور نجومیوں جیسے اعتقادات اس باب میں رکھنا حرام اور سخت حرام ہے۔ لہٰذا بدھ کی نحوست کا عقیدہ بے بنیاد بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہفتے کے سارے دن یکساں ہیں کوئی دن اپنی ذات میں نہ نفع پہنچانے والا ہے نہ نقصان۔ رات دن میں بھی کوئی گھڑی ایسی نہیں جو ایک کے لئے اچھی ہو اور دوسروں کے لئے بُری! جب اللہ تعالےٰ چاہتے ہیں تو کسی کیلئے موافق اور کسی کے لئے ناموافق حالات پیدا کر دیتے ہیں۔ نادان آدمی اسکو نحوست پر محمول کر لیتا ہے۔ حالانکہ نحوست کوئی چیز نہیں۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اپنی کسی کتاب میں لکھتے ہیں:-

"اُمم سابقہ میں کوئی دن منحوس اور کوئی نامنحوس رہا ہوگا لیکن خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم جس دن اس جہاں میں رونق افروز ہوئے سارے جہاں سے نحوست قیامت تک کے لئے اُٹھا لی گئی۔"

حدیث بخاری ومسلم سے بھی یہ تائید ملتی ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

لَا عَدْوٰی وَلَا طِیَرَۃَ وَلَا ھَامَۃَ۔ الحدیث۔

نہ کوئی مرض متعدی ہے نہ کوئی بدشگونی درست ہے اور نہ کوئی آواز منحوس ہے۔

نیز ایک اور حدیث میں صراحت کے ساتھ کہا گیا:-

اَلطِّیَرَۃُ شِرْکٌ۔ الحدیث۔

بدشگونی شرک ہے۔

اس ساری تفصیل سے قطع نظر بالفرض بدھ کے دن کو منحوس ہی قرار دیا جائے تو سارے ہفتے کے دن بھی منحوس قرار پائیں گے۔ کیونکہ دوسری آیت میں اَیَّامًا نَّحِسَاتٍ

آیا ہے۔ یعنی یہ عذاب والے دن سات رات اور آٹھ دن تھے تو گویا سارا ہفتہ منحوس قرار پایا، بلکہ ایک دن اُسپر مزید اضافہ کے ساتھ۔ پھر آخر کونسا دن غیر منحوس ہوگا۔؟

اس لئے مرادِ قرآنی ہرگز ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ دن اصلاً منحوس تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آٹھ دن منحوس جو قوم عاد پر مسلّط رہے اس قوم کے لئے بوجہ عذاب منحوس تھے نہ کہ اپنی ذات میں منحوس تھے۔

(۷) تلخی کا جواب شیریں کلامی

حضرت ہود علیہ السلام کو اُنکی قوم اس طرح خطاب کرتی ہے :۔

"بیشک ہم تجھ کو بیوقوف انسان سمجھتے ہیں اور یقیناً تو جھوٹا بھی ہے۔"

حضرت ہود علیہ السلام اِسکا اس طرح جواب دیتے ہیں :۔

"اے میری قوم میں بے وقوف نہیں ہوں، البتہ میں ربّ العالمین کا فرستادہ ہوں، اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچاتا ہوں اور میں تمہارے لئے نہایت خیر خواہ اور امانتدار ہوں۔"

یہ گفتگو ہمیں یہ درس عظیم دیتی ہے کہ اللہ عظیم کے برگزیدہ بندے جب کسی کی نیکی اور خیر خواہی کرتے ہیں تو مخالفوں کی بے ہودہ گوئی اور استہزار و تحقیر کی پرواہ نہیں کرتے اور نہ شکستہ دل ہوتے ہیں اور نہ مایوس ہوکر اپنے فرضِ منصبی سے منھ موڑتے ہیں، اپنی خیر خواہی و نصیحت جاری رکھتے ہیں اور اسی میں اپنی کامیابی و کامرانی سمجھتے ہیں کہ اللہ کا پیغام پہنچتا رہے خواہ کوئی مانے یا نہ مانے۔

انبیاء کرام کا یہ طریقہ امت کے لئے بہترین اُسوہ ہے کہ تبلیغ و پیغامِ حق کی راہ میں بدی کا بدلہ نیکی سے اور تلخی کا جواب شیریں کلامی سے دیا جائے۔

(۸) قدیم جُرثومہ

حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم کو اللہ کی لا زوال نعمتیں یاد دلاتے ہیں اور آئندہ کے لئے وعدہ

فرماتے ہیں کہ اگر تم لوگ اپنے پروردگار کی جناب میں مغفرت طلب کرتے رہو اور اُسی کی طرف رجوع کرتے رہو تو وہ تم پر برسنے والے بادل بھیجے گا اور تمہاری قوتوں میں اضافہ کریگا۔ الخ۔

مگر بے نصیب قوم نے کسی طرح بھی مان کر نہ دیا اور اِسکا بڑا سبب وہ جاہلانہ عقیدہ تھا کہ ہم اپنے باپ دادا کے طور طریقے کو کیوں چھوڑ دیں جو پُشت ہائے پُشت سے چلا آرہا ہے؟ کیا ہمارے آباء واجداد سب کے سب گمراہ تھے؟ اور کیا اُن کے پاس کوئی دلیل و بُرہان نہ تھی؟ اور کیا وہ سب کے سب جاہل تھے؟ وغیرہ وغیرہ۔

یہ مہلک عقیدہ کوئی نیا نہ تھا تقریباً ہر نبی و ہر مُصلح کو اُسکی قوم نے یہ ہی جواب دیا۔ یہ جُرثومہ اقوام کی روحانی زندگی کے لئے ہمیشہ تباہ کُن اور سعادتِ ابدی کے لئے ہلاکت آفرین رہا ہے۔ دُنیا کے عظیمُ المرتبت رسولوں کی قومیں اسی جہالت واندھے پن کی وجہ سے محرومِ ہدایت رہی ہیں، انبیاء کرام کے معجزات اور آیات سے بھی انہیں کوئی نفع نہ ہوا۔ اور آج بھی جن جن قوموں اور جماعتوں میں یہ جراثیم موجود ہیں وہ اپنے نصیحت کرنے والوں اور خیرخواہوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے ہیں جیسا کہ قومِ عاد، قومِ ثمود اور قومِ نوح کے تذکروں میں ملتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْهُ۔

تذکرہ
سیّدنا صالح علیہ السّلام
اور
قومِ ثمود ــ اصحابُ الحِجر

حضرت صالح علیہ السّلام اور قومِ ثمود

قرآن حکیم میں حضرت صالح علیہ السلام کا اسم گرامی نو مقامات پر آیا ہے۔
سورۂ اعراف میں تین جگہ آیت ۷۳، ۷۵، ۷۷
سورۂ ہود میں چار جگہ آیت ۶۱، ۶۲، ۶۶، ۸۹
سورۂ شعراء میں ایک جگہ آیت ۱۴۲، اور سورۂ النمل میں ایک جگہ آیت ۴۵۔
حضرت صالح علیہ السّلام جس قوم میں پیدا ہوئے اسکا نام ثمود ہے اور قوم ثمود کا ذکر قرآن حکیم کی دس سورتوں میں آیا ہے:-
اعراف، ہود، حجر، النمل، فصلت، النجم، القمر، الحاقہ، الفجر، الشمس۔

سلسلۂ نسب

ابن کثیرؒ نے حضرت صالح علیہ السّلام کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے:-
صالح بن عُبید بن آسف بن ماشح بن عُبید بن حادر بن ثمود بن عامر بن ارم بن سام بن نوح علیہ السّلام۔
ان کے علاوہ مشہور تابعی حضرت وہب بن منبہؒ حضرت صالح علیہ السلام اور ثمود کے درمیان صرف دو واسطے نقل کرتے ہیں۔ صالح بن عبید بن جابر بن ثمود۔
چونکہ یہ سب ماقبل تاریخ کی شخصیات ہیں اس لئے ایسے قدیم نسب ناموں میں اختلاف کا پایا جانا کچھ تعجب خیز نہیں۔
حضرت ہود علیہ السّلام کی قوم عاد اولیٰ کی ہلاکت کے بعد جو افراد بچ

گئے تھے اُنکی نسل عادِ ثانیہ کے نام سے مشہور ہوئی جسکو بعد میں قومِ ثمود کا نام دیا گیا۔

ثمود کی بستیاں

قرآن حکیم نے قوم ثمود کا مقام وادیٔ حجر بیان کیا ہے جو حجاز اور ملک شام کے درمیان وسیع و عریض میدان کی شکل میں موجود ہے۔ اور یہ علاقہ آجکل "فجّ النّاقہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اسمیں ثمود کی بستیوں کے آثار و کھنڈرات آج تک موجود ہیں۔ عرب کا مشہور زمانہ مؤرخ مسعودی لکھتا ہے :-

"جو شخص ملک شام سے حجاز کو آتا ہے اُسکی راہ میں اس قوم کے مٹے نشان اور کھنڈرات ملتے ہیں۔ بعض اہلِ تحقیق نے ان بستیوں کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ ایک مصری سیاح کا بیان ہے کہ وہ ایک ایسے مکان میں داخل ہوا جو شاہی محل کہا جاتا ہے اسمیں متعدّد کمرے ہیں اور اس محل کے ساتھ ایک بہت بڑا حوض ہے۔ یہ پورا محل پہاڑ کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ ثمود فنِ تعمیر میں یدطولیٰ رکھتے تھے اور یہ سینکڑوں آثار و کھنڈرات اُن کے فنِ تعمیر کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ قومِ عاد کی طرح اس قوم نے بھی پہاڑوں کو اپنا مسکن بنایا تھا۔ بڑے بڑے پہاڑوں کو تراش تراش کر شان وشوکت ظاہر کرنے کے لئے محلات بناتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کو "عادِ ثانیہ" کہا جاتا ہے۔"

ثمود کا زمانہ

چونکہ یہ قوم بھی اُن اقوام میں سے ہے جو ماقبل تاریخ اپنا وجود رکھتی تھیں اس لئے کوئی واضح زمانہ ظاہر کرنے سے تاریخ عاجز ہے۔ البتہ یہ بات قطعی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ثمود کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے پہلے کا ہے اور اُن کی بعثت سے بہت پہلے یہ قوم ہلاک بھی ہو چکی تھی۔

قرآن حکیم نے یہ تصریح کی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو جب قوم فرعون نے جھٹلایا تھا تو آلِ فرعون ہی میں سے ایک مردِ مومن نے یہ کہہ کر اپنی قوم کو تنبیہہ کی کہ اے

قوم تمہاری اس تکذیب کا نتیجہ کہیں وہ نہ ہو جائے جو تم سے پہلے قوم نوحؑ اور عاد و ثمود اور اُن کے بعد کی قوموں کا ہوا تھا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ثمود کی آبادیوں کے قریب بعض ایسی قبریں بھی پائی جاتی ہیں جن پر آرامی زبان کے کتبے لگے ہوئے ہیں اِن کتبوں پر جو تاریخ کندہ ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے کی ہے۔ اِن آثار سے بعض مؤرخین کو یہ شُبہ ہوا کہ یہ قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد وجود میں آئی، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ در اصل یہ اُن لوگوں کی قبریں ہیں جو اُس قوم کی ہلاکت کے ہزاروں برس بعد اتفاقاً یہاں آکر بس گئے تھے اور اُنھوں نے اپنے بزرگوں کے آثار کی قدامت ظاہر کرنے کے لئے آرامی خط میں کتبے لکھ کر لگا دیئے تاکہ یادگار رہیں، ورنہ وہ قبریں نہ ثمود کی ہیں اور نہ اُن کا یہ زمانہ ہے۔

مصر کا مشہور مؤرخ جرجی زیدان اپنی کتاب "العرب قبل الاسلام" میں انہی آثار کے بارے میں لکھتا ہے۔ اِن میں سب سے زیادہ اہم وہ کھنڈر ہیں جو قصر بنت، قبر باشا، قلعہ، اور بُرج کے نام سے موسوم ہیں، ان پر جو کچھ تحریر ہے وہ نبطی زبان میں کندہ ہے۔ اِن میں سب سے مشہور و معروف وہ کتبہ ہے جو نبطی حروف میں لکھا ہوا ہے اور وہ ولادتِ مسیح علیہ السلام سے قریب زمانہ کا مکتوب ہے۔

کندہ عبارت کا مضمون یہ ہے:۔

"مقبرہ کمکم بنت وائلہ بنت حرم نے اور کمکم کی بیٹی کلیبہ نے اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے بنوایا ہے۔ اس کی بنا بہت اچھے مہینوں میں شروع کی گئی ہے۔ یہ نبطیوں کے بادشاہ حارث کی تخت نشینی کا نواں سال ہے۔ وہ حارث جو اپنے قبیلے کا عاشق صادق ہے۔ پس عمی ذوالشری وعرشہ، لات، عمند، منوت اور قیس کی اُس پر لعنت ہو جو اِن قبروں کو فروخت کرے یا رہن رکھے، یا اُن کے کسی جسم کو یا عضو کو نکالے، یا کمکم اس کی بیٹی اور اُس کی اولاد کے علاوہ کسی کو دفن کرے۔

اور جو شخص بھی اس پر لکھے ہوئے کی مخالفت کرے

اُس پر ذوالشریٰ، ہبل، منوت کی پانچ لعنتیں ہوں، اور جو ساحر اس کے خلاف کرے اُس پر ایک ہزار درہم حارثی کا تاوان واجب ہے۔ مگر یہ کہ اس کے ہاتھ میں محکم کلیبہ یا اسکی اولاد میں سے کسی کے ہاتھ کی تحریر ہو جس میں اُس اجنبی قبر کے لئے صاف وصریح الفاظ میں اجازت موجود ہو اور وہ اصلی ہو جعلی نہ ہو۔

اس مقبرے کو وہب اللاۃ بن عبادہ نے بنایا۔"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کھنڈرات اور قبریں قوم ثمود کے بقایا افراد کی ہیں جو ثمود کی ہلاکت کے ہزاروں سال بعد یہاں آکر بس گئے تھے، قوم ثمود کا زمانہ اِن سے بہت پہلے کا ہے۔

ثمود کا مذہب

ثمود بھی قوم عاد کی طرح بُت پرست تھے جنھوں نے خدائے واحد کے علاوہ بہت سے معبود گھڑ لئے تھے اور انہی کو اپنا حاجت روا کہا کرتے تھے۔ اور جو بت قوم عاد میں پوجے جاتے تھے وہ بھی اِن کے معبودانِ باطل کی فہرست میں شامل تھے۔ اِن میں بھی شان وشوکت، غرور و پندار، فخر و بڑائی کی بیماری عام تھی۔ بڑی بڑی عمارتیں بنانا اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانا ان کی زندگی کے لیل ونہار تھے۔ ان کی اصلاح کے لئے اِن ہی کے قبیلے میں سے حضرت صالح علیہ السلام کو ناصح اور امین پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تاکہ وہ اُن کو سیدھی راہ دکھائیں اور ان کو اللہ عظیم کی نعمتیں یاد دلائیں جن سے وہ صبح وشام مستفید ہوتے تھے۔ اور یہ بات واضح کریں کہ کائنات میں کوئی بھی حاجت روا نہیں سوائے ایک اللہ کے، اور اللہ تعالےٰ نے اپنے نظام میں کسی کو بھی شریک قرار نہیں دیا۔ وہ یکتا ہے اور اُسکے تصرفات میں کوئی شریک نہیں، عبادت و پرستش کا وہی مستحق ہے۔

قوم کا انکار

ثمود کو یہ حیرانی تھی کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ہم ہی کا ایک انسان اللہ کا پیغمبر بن جائے اور اللہ کے احکام سُنانے لگے۔ وہ تعجب سے

یہ کہا کرتے تھے کیا ہماری موجودگی میں اس پر اللہ کی نصیحت اُترتی ہے ؟ یعنی اگر ایسا ہی ہونا تھا تو اسکے ہم مستحق تھے نہ کہ صالح ؟
اور کبھی قوم کے کمزور افراد کو جو مسلمان ہو گئے تھے خطاب کر کے کہتے۔
"کیا تم کو یقین ہے کہ صالح اپنے پروردگار کا رسول ہے" ؟
مسلمان جواب دیتے بیشک ہم تو اُسکے لائے ہوئے پیغام پر ایمان رکھتے ہیں۔
اسپر قوم کے یہ متکبّر غصے میں کہتے :-
"بلاشبہ ہم تو اُس بات کا جسپر تمہارا ایمان ہے انکار کرتے ہیں۔"
غرض حضرت صالح علیہ السلام قوم کو بار بار نصیحت کرتے کہ اے قوم اللہ تعالےٰ کی دی ہوئی نعمتوں پر مغرور نہ ہو۔ یہ تمہاری ظاہری شان و شوکت، مال و دولت، سرسبز و شاداب باغات، سیم و زر کی فراوانی، بلند و بالا عمارات کی رہائش، میوہ و پھلوں کی کثرت، چشموں و نہروں کی آبیاری، صحت و طاقت کی مُہتات سب اللہ کریم کی عطا و بخشش ہے۔ اس کا شکر ادا کرو اور اس کو اپنے رب کی طرف سے سمجھو۔ اور اسکے آگے اپنا سر خم کر دو۔ یہ سامانِ زندگی تمہاری ہلاکت کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ کسی بھی وقت تم سے چھین لیا جا سکتا ہے۔ اسکے حاصل ہونے پر شیخی و غرور نہ کرو۔ یہ سمجھنا سخت غلطی ہے کہ سامانِ زندگی کی فراوانی اللہ تعالےٰ کی رضا و خوشنودی کا ثمرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سی قوموں کو انہی سامانِ عیش سے آزمایا بھی ہے۔ تم پر خدا کی یہ نعمتیں حجت و دلیل قائم کر رہی ہیں اللہ سے ڈرو اور اُس کا حق ادا کرو، تمہارے سامنے قوم عاد کی تباہی موجود ہے۔ اُن کے آثار و کھنڈرات سے درس لو۔ تمہاری طرح اُنھوں نے بھی غرور و تکبّر کیا تھا اُن کے انجام کا تذکرہ تم سنتے آئے ہو۔
لیکن حضرت صالح علیہ السلام کی اس نصیحت و خیر خواہی کا قوم پر کچھ اثر نہیں ہوا، بلکہ اُن کا بغض و عناد ترقی کرتا گیا اور مخالفت بڑھتی ہی رہی وہ کسی طرح بت پرستی سے باز نہیں آئے صرف ایک مختصر کمزور جماعت ایمان لے آئی۔ قوم کے سردار اور سرمایہ دار اس طرح باطل پرستی پر قائم رہے اللہ تعالےٰ کی دی ہوئی ہر قسم کی خوش عیشی کا شکر ادا کرنے کے بجائے کفرانِ نعمت کو اپنا شعار بنا لیا۔ حضرت

صالح علیہ السلام کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا کرتے کہ اگر صالح حق پر ہوتا اور ہم باطل پر تو پھر ہم کو یہ شان و شوکت، عزت و قوت کیوں کر حاصل ہوتی ؟ جبکہ صالح ع اور اُن کے ماننے والے کمزور اور بے قدر ہیں ؟

حضرت صالح علیہ السلام ان کو سمجھاتے کہ دُنیا کی یہ نعمتیں عارضی اور فانی ہیں۔ یہ حق و باطل کا کوئی معیار نہیں ہیں۔ اللہ تعالےٰ کے ہاں اُن کی کوئی قیمت نہیں۔ کیا معلوم پل بھر میں یہ سب کچھ فنا ہو جائے۔ تمہارے سامنے اسکی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ آخر کار مغرور و سرکش قوم نے حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت و نصیحت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اللہ کی نشانی پیش کرنے کا مطالبہ شروع کر دیا کہ اے صالح اگر تم سچے ہو تو اپنے رب سے کہہ کر اس پہاڑ سے کوئی اونٹنی پیدا کر دکھاؤ جو گابھن ہو اور ظاہر ہوتے ہی بچہ جنم دے ؟

نَاقَۃُ اللّٰہ

حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کے اس بے جا مطالبے پر بارگاہِ الٰہی میں دُعا فرمائی اور فریاد رسی چاہی۔ وحی الٰہی نے اطلاع دی کہ قوم کا مطالبہ پورا کر دیا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فہمائش کر دی گئی کہ اگر اس اونٹنی کو ایذاء پہنچائی گئی یا اس کا حق ادا نہ کیا گیا تو معاف نہ کیا جائے گا اور یہی تمہارا مطالبہ تمہاری ہلاکت کا نشان ثابت ہوگا۔ چنانچہ قوم کو خبردار کر دیا گیا کہ

"اللہ تعالےٰ نے تمہارے اور اسکے درمیان پانی کی باری مقرر کر دی ہے کہ ایک دن قومی کنویں سے تم پانی لوگے اور ایک دن اس "ناقۃ اللہ" کا ہوگا۔"

قرآن حکیم نے اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ یہ بھی وضاحت کر دی کہ

"اس نشان کو کوئی ضرر نہ پہنچایا جائے ورنہ عذاب الیم گھیر لے گا۔ چنانچہ قوم نے اس نشان (اونٹنی) کو ہلاک کر دیا اور پھر اللہ کے عذاب سے خود بھی ہلاک ہو گئے۔"

ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں ناقۃ اللہ کے سلسلے میں یہ تفصیل بیان کی ہے جو تاریخ اور بعض روایات صحیحہ پر مشتمل ہے۔

واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ قوم ثمود جب حضرت صالح علیہ السلام کی تبلیغ سے اُکتا گئی تو اس کے سرخیل اور سربرآوردہ افراد نے قوم کی موجودگی میں یہ مطالبہ کیا۔

اے صالحؑ اگر تو واقعی خدا کا رسول ہے تو کوئی نشانی پیش کرتا کہ ہم تیری صداقت پر ایمان لے آئیں؟

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ نشان آنے کے بعد بھی انکار و سرکشی پر قائم رہو؟

قوم کے سرداروں نے وعدہ کیا کہ ہم فوراً ایمان لے آئیں گے۔ تب حضرت صالح علیہ السلام نے اُن سے دریافت کیا کہ تم لوگ کس قسم کا نشان چاہتے ہو؟ قوم نے مطالبہ کیا کہ سامنے والے پہاڑ میں سے ایک ایسی اونٹنی ظاہر کرو جو گابھن ہو اور ظاہر ہوتے ہی بچہ بھی دیدے۔

اس پر حضرت صالح علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں دُعا کی معاً پہاڑ سے ایک بلند قامت قوی الہیکل اونٹنی ظاہر ہوگئی اور اُس نے بچہ بھی جنم دیا۔

یہ عجیب و غریب منظر دیکھ کر اُن سرداروں میں سے ایک جندع بن عمرو اُسی وقت ایمان لے آیا اور دوسرے سرداروں نے بھی اسکی پیروی کرنے کا ارادہ کیا لیکن مندروں کے پجاریوں نے اُن کو باز رکھا۔ اسی طرح دوسروں کو بھی ایمان لانے سے روکا۔ اس پر حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کے تمام افراد کو تنبیہہ کی کہ دیکھو یہ نشانی تمہارے طلب پر بھیجی گئی ہے۔ اللہ تعالےٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ پانی کی باری مقرر رہو۔ ایک دن اس اونٹنی کا ہوگا دوسرا دن قوم کا اور ان کے جانوروں کا۔ اور خبردار اس اونٹنی کو کوئی اذیت نہ پہنچے۔ اگر اس کو کوئی آزار پہنچا تو پھر سمجھ لو کہ تمہاری ہلاکت یقینی ہے۔

قوم نے اس حیرت ناک معجزے کو دیکھ کر اگرچہ ایمان قبول نہ کیا لیکن دلوں کے اقرار کی وجہ سے اُسکو ایذا دینے یا کسی قسم کی خلاف ورزی کرنے کی ہمت بھی نہیں کی اور یہ دستور قائم ہوگیا کہ کنویں کا پانی ایک دن ناقۃ اللہ کا رہتا اور ساری قوم اُس کے دودھ سے فائدہ اُٹھاتی۔ اور دوسرا دن قوم اور اُن کے جانوروں کا رہتا جس سے وہ اپنی ضرورت کا پانی لیتے۔ اسی طرح دن گزرتے گئے، اونٹنی اور اسکا بچہ بغیر کسی روک ٹوک چراگاہوں میں چرتے اور آسودہ رہتے۔ مگر قوم کے دلوں میں آہستہ

آہستہ یہ بات کھٹکنے لگی اور آپس میں صلاح و مشورہ ہونے لگا کہ اس اونٹنی کا خاتمہ کر دیا جائے تو اس باری والے قصّے کا بھی خاتمہ ہو جائے۔ کیونکہ ایک پورا دن ہمارے لئے اور ہمارے جانوروں کے لئے پانی کا فراہم کرنا دشوار ہوتا جا رہا ہے۔

یہ باتیں اگرچہ ہوتی رہتی تھیں لیکن کسی کو اُسکے قتل کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ اُس کا "معجزہ" ہونا ثابت ہو چکا تھا اور قلوب اسکا اقرار کر چکے تھے۔

آخر کار صدوق نامی ایک حسین و جمیل عورت نے اپنے آپ کو قوم کے ایک بدکار مرد مُصدّع کے سامنے پیش کیا اور ایک مالدار عورت عُنیزہ نے اپنی ایک خوبصورت لڑکی کو قُدار نامی بدبخت کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا کہ اگر تم دونوں اس ناقۃ اللہ کو ہلاک کر دو تو یہ دونوں تمہاری مِلک ہیں اِنکو اپنی بیوی بنا لینا۔

اس حسین پیشکش پر قُدار اور مصدّع دونوں آمادہ ہو گئے۔ اور طے پایا کہ رات کی تاریکی میں اونٹنی کو ہلاک کر دیں۔ اسپر چند دوسرے آدمیوں نے بھی مدد کا وعدہ کیا۔

غرض ایسا ہی کیا گیا اور ناقۃ اللہ کو اس سازش سے ہلاک کر دیا گیا۔ اونٹنی کا بچّہ یہ منظر دیکھ کر بھاگا اور پہاڑ پر چڑھ گیا اور چیختا چلاّتا پہاڑوں میں غائب ہو گیا۔

حضرت صالح علیہ السّلام کو جب معلوم ہوا تو آبدیدہ ہو کر فرمانے لگے:۔

"اے بے نصیب قوم آخر تجھ سے صبر نہ ہو سکا اور وہی سانحہ پیش آیا جس کا مجھے خوف تھا۔ اب اللہ کے عذاب کا انتظار کرو، تین روز کے بعد نہ ٹلنے والا عذاب آئے گا جو تم سب کو تہ و بالا کر کے رکھ دے گا۔ (تفسیر ابن کثیر سورۂ اعراف)

تفسیر روح المعانی کے مصنف علامہ آلوسیؒ نے اس عذاب کی یہ تفصیل لکھی ہے کہ

"ثمود پر عذاب آنیکی علامات اگلے صبح ہی سے شروع ہو گئیں پہلے روز اُن سب کے چہرے اس طرح زرد پڑ گئے جیسا کہ خوف کی ابتدائی حالت میں ہوا کرتا ہے۔ دوسرے دن سب کے چہرے سُرخ تھے۔ گویا خوف و دہشت کا یہ دوسرا درجہ تھا۔ تیسرے روز اُن سب کے چہرے سیاہ تھے اور تاریکی چھائی ہوئی۔ گویا خوف و ہراس

کا تیسرا درجہ ہے جس کے بعد موت ہی باقی رہ جاتی ہے۔ تین دن کی اِن علاماتِ عذاب نے اگرچہ اُن کے چہروں کو واقعی زرد، سُرخ اور سیاہ بنا دیا تھا لیکن اُن کی ظاہری شکل یہ صاف بتارہی تھی کہ اُن کے دلوں کو حضرت صالح علیہ السلام کے سچے ہونے کا یقین تھا لیکن عناد و تکبّر نے حق کی پیروی کرنے سے اُنھیں باز رکھا۔ اب جبکہ اللہ عظیم کے حکم کے خلاف "جرم" کر چکے تھے اُسکی پاداش میں حضرت صالح علیہ السلام سے عذاب کی ہولناک خبر سُنی تو اُن پر خوف و دہشت کے آثار پیدا ہو گئے جو فطری تقاضہ تھا، ندامت و توبہ کی علامات نہ تھیں۔ بہر حال ان تین دن کے بعد وہ وقت آگیا جس نے صبح ہوتے ہوتے سب کو تباہ و برباد کر دیا اور آنے والے انسانوں کو "تاریخی عبرت" کا سبق دیا۔ عذاب والی رات سخت تاریک تھی اچانک ایک ہیبتناک آواز نے ہر شخص کو اُسی حالت میں موت کی نیند سُلا دیا۔

قرآن حکیم نے اس مُہلک ترین آواز کو ایک آیت میں "صاعقہ" (کڑک دار بجلی) اور ایک دوسری آیت میں رَجْفَۃ (زلزلہ ڈالدینے والی) اور ایک تیسری آیت میں "صَیحَۃ" (چیخ) کے عنوان سے تعبیر کیا ہے۔

دراصل یہ تمام تعبیرات ایک ہی حقیقت کے مختلف اوصاف ہیں جو خدائی عذاب کی ہولناکیاں ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی ایسی مُہیب آواز جو گرجتی، چمکتی، کوندتی، لرزتی، لرزاتی رات کی تاریکی میں اچانک ٹوٹ پڑی تو جو شخص جس حالت میں تھا اس نے وہیں دم توڑ دیا۔ آواز کے بھیانک شور سے جگر پارہ پارہ ہو گئے۔ انسان ہی کیا پورا کا پورا شہر تہ و بالا ہو گیا۔

ایک طرف ثمود پر یہ قیامت ٹوٹ پڑی دوسری جانب اللہ تعالےٰ نے حضرت صالح علیہ السلام اور اُن کی جماعت کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ اور اُس رُسوا کن عذاب سے بچالیا۔ دوسرے

دن حضرت صالح علیہ السلام نے اِس تل پٹ شدہ شہر کے
ناپاک مُردوں کو اس طرح خطاب کیا :-
اے قوم بلاشُبہ میں نے اپنے پروردگار کا پیغام
تم تک پہنچایا اور نصیحت بھی کی لیکن تم نے نصیحت کرنے والوں کو
پسند ہی نہ کیا ؟"

ہجرت

تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ثمود کی ہلاکت وتباہی کے بعد حضرت صالح علیہ السلام اور اُن پر ایمان لانے والی جماعت کا قیام فلسطین میں ہوا ، مقام اور شہر کے ناموں میں مؤرخین نے مختلف نام بیان کئے ہیں۔

قرآن حکیم نے قوم ثمود کو "اصحاب الحجر" کہا ہے ۔ مقام حجر فلسطین سے قریب تھا اور چونکہ فلسطین اُس زمانے میں سرسبز و شاداب مقام تھا اس لئے عین ممکن ہے کہ وہ حضرات اسی علاقہ میں آکر بس گئے ہوں ۔

تفسیر خازن کے مصنف نے فلسطین کے علاقے میں رَمْلَہ کے قریب جائے قیام بتایا ہے ۔ عام مؤرخین کی رائے ہے کہ ثمود کی ہلاکت کے بعد یہ لوگ اُن ہی بستیوں میں آباد رہے ۔ زمانہ قدیم سے اہل یمن کا ادّعا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام اور اور اُن کی قوم حضرموت آکر آباد ہوئے ۔ اس پر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کا اصلی وطن یہی تھا ۔ اور یہاں ایک قبر کے بارے میں زمانہ قدیم سے بھی شہرت ہے کہ یہ حضرت صالح علیہ السلام کی قبر ہے ۔ رُوح المعانی کے مفسّر علامہ آلوسیؒ نے اعتماد کے ساتھ لکھا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام قوم کی ہلاکت کے بعد مکّہ مکرمہ تشریف لے آئے اور وہیں مقیم ہو گئے اور وفات بھی وہیں پائی اور اُنکی قبر مبارک خانۂ کعبہ کے غربی جانب حرم شریف ہی کے اندر ہے ۔ واللّٰہ اعلم ۔

علامہ آلوسیؒ نے اپنی تفسیر میں ایک قول یہ بھی لکھا ہے کہ
"حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لانے والے افراد کی
تعداد ایک سو بیس (۱۲۰) تھی جنھوں نے حضرت صالح علیہ السلام کے

ساتھ نجات پائی۔ اور ہلاک ہونے والوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار خاندانوں پر مشتمل تھیں۔ الغرض اِن مختلف تفاصیل کے بعد اُس کلام بلاغت نظام قرآن حکیم کی آیات کا مطالعہ کیجئے جو اِن واقعات کا حقیقی سرچشمہ ہیں اور جو عبرت و موعظت کا بے مثال درس ہیں۔

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا الخ

(اعراف آیات ۷۳ تا ۷۹)

قرآنی مضمون

اور ثمود کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اُنھوں نے کہا اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو، اُسکے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی کھلی دلیل آگئی ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے ایک کھلی نشانی ہے۔ لہٰذا اسکو آزاد چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں جہاں چاہے پھرے چرے۔ اسکو کسی بُرے ارادے سے ہاتھ نہ لگاؤ۔ ورنہ ایک دردناک عذاب تمہیں پکڑ لے گا۔ اور یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں اِس کا جانشین بنایا۔ اور زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اُسکے ہموار میدانوں میں عالی شان محلات بناتے ہو، اور اسکے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو۔ پس اللہ کی نعمتیں یاد کرو اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔

اُن کی قوم کے سرداروں نے جو متکبّر تھے کمزور طبقہ کے لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے کہا کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالحؑ اپنے رب کا پیغمبر ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا بیشک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجے گئے ہیں اُسے ہم مانتے ہیں۔ اُن سرداری کے دعویداروں نے کہا جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اُسکا انکار کرتے ہیں۔

پھر اُنھوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور پوری سرکشی کے ساتھ اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی اور صالحؑ سے کہدیا لے آؤ وہ عذاب

جسکی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو واقعی پیغمبروں میں شامل ہے ؟ آخرکار ایک دہلا دینے والی آفت نے اُنہیں آگھیرا اور وہ اپنے گھروں میں آوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے۔ اور صالحؑ یہ کہتے ہوئے اُن بستیوں سے نکل گئے کہ اے میری قوم میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں نے تمہاری بڑی خیر خواہی کی مگر میں کیا کروں کہ تجھے اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں ہیں۔"

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا قَالَ الخ

(ہود آیات ۶۱ تا ۶۸)

اُور ہم نے ثمود کی طرف اُن کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔ اُنھوں نے کہا اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اُسکے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور یہاں تم کو بسایا ہے۔ لہذا تم اُس سے معافی چاہو اور اُسی کی طرف پلٹ آؤ، یقیناً میرا رب ہر ایک کے قریب ہے اور دُعاؤں کا جواب دینے والا ہے۔

اُنھوں نے کہا اے صالحؑ اِس سے پہلے تُو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ کیا تو ہمیں اُن معبودوں کی عبادت سے روکتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے ؟ اور تو جس طریقے کی طرف ہمیں دعوت دیتا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شُبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے۔ صالحؑ نے کہا اے میری قوم تم نے کچھ اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشن دلیل پر قائم ہوں اور اُس نے اپنی رحمت مجھے عطا فرمائی ہے۔ تو پھر کون ہے جو اللہ کے مقابلے میں میری مدد کرے گا۔ اگر میں اُسکے حکم سے سرتابی کروں تم مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے بلکہ تباہی کی طرف لیجانا چاہتے ہو۔ اور اے میری قوم کے لوگو دیکھو یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے ایک نشانی ہے

اے اللہ کی زمین میں چرنے کے لئے چھوڑ دو۔ اور اسکو بُرائی سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ فوراً عذاب آپکڑے گا۔

مگر انھوں نے اونٹنی کو قتل کر ڈالا۔ اس پر صالحؑ نے اُن کو خبردار کر دیا کہ بس اب تین دن اپنے گھروں میں اور رہ بس لو۔ یہ ایسی میعاد ہے جو جھوٹی ثابت نہو گی۔

آخر کار جب ہمارے فیصلے کا وقت آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالحؑ اور اُن لوگوں کو جو اُن کے ساتھ ایمان لائے تھے بچا لیا اور اُس دن کی رُسوائی سے اُن کو محفوظ رکھا۔ بیشک تیرا رب ہی دراصل طاقتور اور بالادست ہے۔

رہے وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا تھا تو ایک سخت دھماکے نے اُن کو پکڑ لیا اور وہ اپنی بستیوں میں اس طرح بے حس و حرکت پڑے رہ گئے کہ گویا وہ وہاں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ سُنو ثمود نے اپنے رب کا کفر کیا۔ سُنو دور پھینک دیئے گئے ثمود۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ۔ الخ

(الحجر آیات ۸۰ تا ۸۴)

اور حجر کے لوگ (قوم ثمود) بھی رسولوں کو جھٹلا چکے ہیں۔ ہم نے اپنی آیات اُن کے پاس بھیجیں پس وہ سب آیات کو نظر انداز ہی کرتے رہے۔ وہ لوگ پہاڑوں کو تراش تراش کر مکانات بناتے تھے کہ محفوظ رہیں (یہ حفاظت کچھ بھی کام نہ آئی) ایک دن صبح کو اُٹھے تو ایک ہولناک آواز نے آپکڑا تھا اور جو کچھ اُنھوں نے اپنی سعی و عمل سے کمایا تھا وہ کچھ بھی اُن کے کام نہ آیا۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ۔ الخ

(الشعراء آیات ۱۴۱ تا ۱۵۹)

جھٹلایا ثمود نے اللہ کے رسولوں کو، جب کہا اُن سے اُنکے بھائی صالحؑ نے کیا تم ڈرتے نہیں ہو۔ میں تمہارے لئے ایک امانتدار

رسول ہوں ۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ۔ میں اس کام کے لئے تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں ۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمّہ ہے ۔ کیا تم اُن سب چیزوں کے درمیان جو یہاں ہیں بس یوں ہی اطمینان سے رہنے دیئے جاؤ گے ۔ ان باغوں اور چشموں میں ۔ اِن کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں ۔ اور تم پہاڑوں کو تراش کر فخریہ اُن میں عمارتیں بناتے ہو ۔ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ۔ اُن زیاں کار لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے ۔

اُنھوں نے جواب دیا تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے ۔ تُو تو ایک ہم جیسا ہی انسان ہے بس لا کوئی نشانی اگر تو سچّا ہے ۔

صالحؑ نے کہا یہ اونٹنی ہے ۔ ایک دن اُسکے پینے کا ہے اور ایک دن تم سب کے پانی لینے کا ۔ اُسکو بُرے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ ایک بڑے دن کا عذاب تم کو آلے گا ۔

مگر اُنھوں نے اُسکی کونچیں کاٹ دیں اور آخر کار پچھتاتے رہ گئے ۔ عذاب نے اُنھیں پکڑ لیا یقیناً اسمیں ایک نشانی ہے ۔ مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَآ إِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ الخ (النمل آیات ۴۵ تا ۵۳)

اور ثمود کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالحؑ کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو تو یکایک وہ دو جھگڑنے والے فریق بن گئے ۔ صالحؑ نے کہا اے میری قوم کے لوگو بھلائی سے پہلے بُرائی کے لئے کیوں جلدی مچاتے ہو ۔ کیوں نہیں اللہ سے مغفرت طلب کرتے شاید کہ تم پر رحم فرمایا جاوے ۔ اُنھوں نے کہا ہم نے تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو بدشگونی کا نشان پایا ہے ۔

صالح نے جواب دیا تمہاری بدشگونی کا علم تو اللہ کے پاس ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم لوگوں کی آزمائش ہو رہی ہے۔

اُس شہر (حجر) میں نو جتھے دار تھے جو ملک میں فساد پھیلاتے تھے اور کوئی اصلاح کا کام نہیں کرتے تھے۔ اُنھوں نے آپس میں کہا (اے لوگو) خدا کی قسم کھا کر عہد کر لو ہم صالحؑ اور اُس کے گھر والوں پر شب خون ماریں گے اور پھر اسکے سرپرست سے کہدینگے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے اور ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔

اور اُنھوں نے ایک خُفیہ تدبیر کی اور ایک خُفیہ تدبیر ہم نے کی جس کی اُنھیں خبر نہ تھی (رات سے پہلے پہاڑ پر ایک پتھر اُنپر لڑھک آیا اور وہ سب دب کر مر گئے۔ (الدّر المنثور)

اب دیکھ لو کہ اُن کی چال کا کیا انجام ہوا۔ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا اُن کو اور اُن کی پوری قوم کو۔ دیکھو وہ اُن کے گھر خالی پڑے ہیں اُس ظلم کی پاداش میں جو وہ کرتے تھے۔ اِس میں ایک نشانِ عبرت ہے اُن لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔ اور بچا لیا ہم نے اُن لوگوں کو جو ایمان لائے تھے اور نافرمانی سے بچتے تھے۔"

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى۔ الخ (حٰمٓ سجدہ آیات ۱۷، ۱۸)

اور رہے ثمود تو اُن کے سامنے ہم نے سیدھی راہ پیش کی مگر اُنھوں نے راستہ دیکھنے کے بجائے اندھا رہنا پسند کیا۔ آخر اُنکی کرتوتوں کی بدولت ذلّت کا عذاب اُن پر ٹوٹ پڑا، اور ہم نے اُن لوگوں کو بچا لیا جو ایمان لائے تھے اور بدعملی سے بچتے تھے۔"

وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ۔ الخ

(الذّٰریات آیات ۴۳ تا ۴۶)

اور تمہارے لئے نشانی ہے ثمود کے واقعہ میں جبکہ اُن سے کہا گیا تھا کہ ایک خاص وقت تک مزے کر لو۔ مگر اس تنبیہ پر بھی

اُنھوں نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ آخر کار اُن کے دیکھتے دیکھتے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب نے اُن کو پکڑ لیا۔ پھر نہ اُن میں اُٹھنے کی سکت تھی اور نہ وہ اپنا بچاؤ کر سکتے تھے۔ اور اِن سے پہلے ہم نے نوح کی قوم کو ہلاک کیا کیونکہ وہ لوگ فاسق تھے۔"

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذُرِ الخ

(القمر آیات ۲۳ تا ۳۲)

ثمود نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ اور کہنے لگے ایک اکیلا آدمی جو ہم ہی میں سے ہے کیا ہم اب اُسکے پیچھے چلیں، اس کے معنی یہ ہونگے کہ ہم بہک گئے ہیں اور جنون میں پڑ گئے۔ کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص تھا جس پر خدا کا ذکر نازل کیا گیا؟ نہیں! بلکہ یہ پرلے درجے کا جھوٹا اور بڑائی جتانے والا آدمی ہے۔

(ہم نے اپنے پیغمبر صالحؑ سے کہا) کل ہی انہیں معلوم ہو جائیگا کہ کون پرلے درجے کا جھوٹا اور بڑائی جتانے والا ہے۔ ہم اونٹنی کو ان کے لئے آزمائش بناکر بھیج رہے ہیں۔ پس اِنکو دیکھتے رہو اور ذرا صبر کیجئے کہ (کہ اِن کا کیا انجام ہوتا ہے) اِن کو آگاہ کردو کہ پانی اِن کے اور اونٹنی کے درمیان تقسیم ہوگا اور ہر ایک اپنی باری کے دن پانی پر آئے گا۔ آخر کار اُن لوگوں نے اپنے آدمی کو پکارا اور اُس نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا اور اونٹنی کو قتل کر ڈالا۔ پھر دیکھ لو کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات۔ ہم نے اُن پر بس ایک ہی چنگھاڑ مسلّط کر دیا۔ پھر وہ اس طرح ہو گئے جیسے کانٹوں کی باڑ لگانے والے کا چورا۔ اور ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا ہے اب ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟"

كَذَّبَتْ ثَمُودُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ۔ الخ

(الحاقۃ آیات ۳ تا ۶)

ثمود اور عاد نے اُس کھڑ کھڑا دینے والی (قیامت) کو

جھٹلایا تو ثمود ایک سخت آواز سے ہلاک کئے گئے۔ اور عاد ایک شدید طوفانی آندھی سے تباہ کر دیئے گئے۔"

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوٰىهَا۔ اِذِ انْبَعَثَ اَشْقٰهَا۔ الخ

(الشمس آیات ۱۱ تا ۱۵)

"ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر (صالحؑ کو) جھٹلایا۔ جب اس قوم کا سب سے زیادہ شقی آدمی (اکڑ کر) اٹھا تو اللہ کے رسول (صالحؑ) نے اُن لوگوں سے کہا خبردار اللہ کی اونٹنی کو ہاتھ نہ لگانا اور اسکے پانی پینے میں حائل نہ ہونا۔ مگر انھوں نے اُنکی بات کو جھوٹا قرار دیا اور اونٹنی کو قتل کر ڈالا۔ آخر کار اُن کے جرم کی پاداش میں اُن کے رب نے اُن پر ایسی آفت نازل کی کہ ایک ساتھ سب کو پیوندِ خاک کر دیا۔ اور اللہ کو (اپنے اس فعل کے) کسی بھی نتیجے کا کوئی خوف نہیں ہے۔"

نتائج و عبر

(۱) قوم کی آزمائش اور ناقۃ اللہ

چونکہ قوم کے مطالبہ پر یہ اونٹنی بلا کسی ظاہری سبب کے پہاڑ سے پیدا ہوئی اِس لئے اِس کا نام ناقۃ اللہ ہو گیا۔ یہ ایسے ہی جیسے حضرت حوّا بغیر ماں کے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے، اور آدم علیہ السلام بغیر ماں باپ کے پیدا کئے گئے۔

یہ اونٹنی جہاں حضرت صالح علیہ السلام کی رسالت پر دلیل و ثبوت اور ایک علامت تھی وہاں قرآن حکیم کی تصریح ہے کہ وہ قومِ ثمود کے لئے آزمائش اور امتحان بھی تھی جو اُن کی تباہی کا نشان ثابت ہوئی۔

ہر زمانے میں اللہ تعالےٰ کی یہ سنت و عادت رہی ہے (جسکو قرآنی الفاظ

میں "سنتہ اللہ" کہا جاتا ہے۔ جب کبھی وہ کسی قوم کی طرف اپنا رسول بھیجتا ہے اور قوم اُسکی ہدایت ونصیحت پر کان نہیں دھرتی توضروری نہیں کہ وہ قوم اس نافرمانی کی پاداش میں فوراً ہی ہلاک کردی جائے۔ ایسی بہت سی قومیں ہیں جنھوں نے اپنے نبیوں کا انکار کیا لیکن اُنہیں زمین پر اللہ کی دی ہوئی مدت پوری کرنے کا موقعہ ملا۔ انہیں کسی اچانک عذاب سے ہلاک نہیں کیا گیا۔

البتہ جس قوم نے اپنے نبی سے اُسکی صداقت کے لئے کوئی نشانی طلب کی اور اسپر یہ وعدہ کیا گیا کہ اگر وہ مطلوبہ نشان ظاہر ہوگیا تو اُن پر ضرور ایمان لائیں گے پھر وہ ایمان نہیں لائے تو اُس قوم کی ہلاکت یقینی ہوجاتی ہے۔ قوم نوحؑ، قوم عاد، قوم ثمود، قوم فرعون وغیرہ کی ہلاکتیں اسی وجہ سے ہوئیں کہ انھوں نے اپنے نبیوں سے معجزات طلب کئے تھے پھر ایمان نہیں لائے۔

البتہ پوری تاریخ انبیاء میں صرف ایک قوم (قوم یونس) اللہ تعالےٰ کے اس قانونِ پاداش سے مستثنیٰ رہی۔ جسکی تفصیل یہ ہے:-

سورۂ یونس آیت ۹۸ کا ترجمہ یہ ہے:-

"پھر کیا کوئی ایسی مثال ہے کہ ایک بستی عذاب دیکھکر ایمان لائی ہو اور اُس کا ایمان اسکے لئے نفع بخش ثابت ہوا ہو؟ یونسؑ کی قوم کے سوا (اسکی کوئی نظیر نہیں) وہ قوم (یونس) جب ایمان لے آئی توہم نے اُسپر سے دُنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ٹال دیا اور ایک مدت تک اُس قوم کو زندگی سے بہرہ مند ہونے کا موقعہ دیا۔"

اِس آیت میں وضاحت کے ساتھ یہ حقیقت ظاہر کی گئی کہ اللہ کے "قانون" "پاداشِ عمل" سے کوئی قوم بچ نہ سکی۔ عذاب آنے کے بعد اگر کوئی قوم ایمان لے آتی ہے تو اُس کا یہ ایمان لانا اللہ تعالےٰ کے ہاں کوئی قیمت نہیں رکھتا اور نہ وہ عذاب سے بچ سکتی ہے۔ فرعون بھی تو نزولِ عذاب کے ساتھ ہی ایمان لے آیا تھا۔ لیکن اُس کا یہ ایمان لانا اللہ تعالےٰ نے یہ کہہ کر رد کردیا کہ اب تو ایمان لاتا ہے؟

الغرض عذاب کے وقت کسی کا ایمان مقبول نہیں ہوتا۔ ایک اور صرف ایک قوم یونس اس "سنتہ اللہ" سے مستثنیٰ رہی ہے۔ اسکی وجوہات سے قرآن حکیم

ساکت ہے اس لئے یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ قوم اس قانون سے مستثنیٰ کیوں کی گئی۔ تاہم مفسرین کرام نے احادیث اور قرآنی اشارات سے جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے :-

"قوم نے آثارِ عذاب دیکھ کر اور یہ معلوم کر کے کہ حضرت یونس علیہ السلام بستی سے نکل گئے ہیں ڈر گئی اور استغفار کرنے لگی۔ چونکہ عذاب واقع نہیں ہوا تھا اس لئے بچا لئے گئے۔"

(تفصیل تذکرہ سیدنا یونس علیہ السلام میں مطالعہ فرمائیں)

(۲) ایک شبہ کا ازالہ "پاداشِ عمل" کا قانون اگرچہ ہر نبی کی قوم کے ساتھ یکساں رہا ہے لیکن اس "سنت اللہ" سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مستثنیٰ رہی ہے اور اس کی تصریح خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے :-

"آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی کہ وہ میری اُمت پر عذاب عام مسلط نہ فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے میری یہ دُعا قبول فرمالی۔" (حدیث حجۃ الوداع شب مزدلفہ والی دُعا)

(بخاری)

اور قرآن حکیم میں اِس دُعا کی مقبولیت کی تصدیق بھی موجود ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۔ الآیۃ

(الانفال آیت ۳۳)

"اے رسول اس حال میں کہ آپ اُن میں موجود ہیں اللہ تعالیٰ (ان کافروں) پر عام عذاب مسلط نہ کریگا۔"

(۳) انسانی خود فریبی بعض دفعہ انسان کو خوش عیشی اور دُنیاوی جاہ و جلال دیکھ کر یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی کہ جب کسی قوم یا فرد کے پاس دُنیاوی آسائش کی فراوانی، صحت و قوت کی بہتات موجود ہے

تو وہ یقیناً اللہ تعالےٰ کے سایۂ رحمت میں ہے اور اسکو اللہ تعالےٰ کی خوشنودی حاصل ہے۔

اس مُہلک نظریہ اور غلط فہمی نے بہت سی قوموں کو انبیاء کرام کی تعلیمات اور ہدایت سے محروم رکھا ہے۔ حالانکہ بعض مرتبہ زیادہ سے زیادہ رفاہیت اور خوش عیشی زیادہ سے زیادہ عذاب وہلاکت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ہے۔

قوم ثمود کے خوش عیشوں کو یہ ہی دھوکہ پیش آیا۔ وہ حضرت صالح ؑ اور اُن کے ساتھیوں کو یہ کہہ کر طعنہ دیا کرتے تھے کہ کیا صالح ؑ جیسے غریب وبے طاقت آدمی کو رسول بنایا گیا ہے۔ انھیں اپنی قوت وطاقت پر گھمنڈ تھا۔ وہ لوگ کسی طرح بھی حضرت صالح علیہ السلام اور ایمان والوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اس خود فریبی نے قوم کے اکثر افراد کو حضرت صالح علیہ السلام کی اطاعت سے دُور رکھا جسکے نتیجے میں وہ عذاب آیا جو تاریخ عالم کا عبرتناک حادثہ ہے۔ اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہر قسم کی نعمت اور فراوانی کا شکر ادا کرنے کے بجائے حضرت صالح ؑ اور اُن کے ساتھیوں کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا:۔

"اے صالح ؑ اگر ہم باطل پرست ہوتے اور اللہ کی خوشنودی اور رضا ہمیں حاصل نہ ہوتی تو آج یہ عزّت و دولت، قوت وطاقت، سرسبز وشاداب باغات، سیم وزر کی بُہتات، بلند و بالا محلات، پانی ونہروں کی کثرت ہمیں حاصل نہ ہوتی ؟ یہ سب نعمتیں اللہ کی رضا وخوشنودی کی علامات ہیں جو ہمیں میسّر ہیں اور جس سے تم محروم ہو۔"

حضرت صالح علیہ السلام اُن لوگوں سے فرماتے :۔

"بیشک یہ سب کچھ اللہ تعالےٰ کی نعمتیں ہیں بشرطیکہ اُن کو پانے والے اُس کا شکر بھی ادا کریں اور اُسکے آگے سر جھکائیں اور بلاشُبہ یہ ہی سامانِ عیش وعشرت عذاب ولعنت کا ذریعہ بھی ہے جبکہ اِن کو شیخی وغرور کے ساتھ برتا جائے۔ اس لئے یہ سمجھنا سخت غلطی ہے کہ ہر سامانِ عیش اللہ تعالےٰ کی رضا وخوشنودی کا ثمرہ

ہوتا ہے ؛ بلکہ آزمائش کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے صراحت سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ کفر و شرک کرنے والوں کو بھی اس دُنیا میں سامانِ عیش دیا جاتا ہے لیکن آخرت کی زندگی تمام نعمتوں سے خالی رہتی ہے۔ (البقرہ آیت ع۱۲٦)

(۴۴) **چند عبرتیں** غزوۂ تبوک کے موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر مقام حجر پر ہوا۔ اس سفر میں صحابہ کرام کی ایک جماعت نے ثمود کے ایک کنویں سے پانی بھرا اور آٹا گوندھ کر روٹی تیار کرنے لگے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوا تو پانی بہا دینے اور ہانڈیاں اُلٹ دینے اور آٹا جانوروں کو کھلا دینے کا حکم فرمایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ یہ وہ بستی ہے جس پر اللہ کا عذاب آیا۔ یہاں نہ قیام کرو اور نہ یہاں کی اشیاء سے فائدہ اُٹھاؤ۔ آگے چل کر پڑاؤ ڈالو ایسا نہ ہو کہ تم بھی کسی بلا میں مبتلا ہو جاؤ!

ایک اور روایت میں یہ بھی ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ :-

اے لوگو! اگر تم اصحابِ حجر کی بستیوں سے گزرو تو انہیں اللہ تعالےٰ سے ڈرتے ہوئے عجز و زاری اور روتے ہوئے داخل ہو۔ ورنہ ان بستیوں میں داخل ہی نہ ہونا۔ اور جب خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حجر میں داخل ہوئے فرمایا کہ اے لوگو اللہ تعالےٰ سے نشانیاں طلب نہ کرو، حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے حضرت صالح علیہ السلام سے نشان طلب کیا تھا تو اللہ تعالےٰ نے پہاڑ کی کھوہ سے پہاڑ جیسی اونٹنی پیدا کیا۔ وہ اپنی باری میں کھا پی کر وہیں واپس چلی جاتی اور جو اُسکی باری کا دن نہ تھا اُس میں قوم ثمود کو اپنے دودھ سے سیراب کرتی تھی۔ مگر ثمود نے آخر سرکشی کی اور ناقۃ اللہ کی کونچیں کاٹ کر اسکو ہلاک کر دیا۔ جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اُن پر چیخ کا عذاب مسلط کر دیا اور وہ اس عذاب سے گھروں کے اندر ہی مُردہ ہو گئے۔ صرف ایک شخص ابورُغال نامی باقی بچا جو

حرم شریف (مکہ) گیا ہوا تھا لیکن جب وہ حدودِ حرم سے باہر آیا فوراً اُسی عذاب کا شکار ہوگیا۔ (تاریخ ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۱۳۸)

(۵) ناپاک مُردوں سے خطاب

عذاب کے اختتام پر حضرت صالح علیہ السلام اپنے شہر واپس لوٹے تباہ حال بستی کے کھنڈرات پر کھڑے ہوکر اُن نعشوں کو جو بکھری ہوئی حالت میں پڑی تھیں اس طرح خطاب کیا :-

"اُے قوم ! بلاشبہ میں نے اپنے رب کا پیغام تم تک پہنچایا اور تم کو نصیحت بھی کی لیکن تم تو نصیحت کرنے والوں کو پسند ہی نہیں کرتے تھے۔" (اعراف آیت ۷۹)

حضرت صالح علیہ السلام کا یہ خطاب اُسی طرز کا تھا جس طرح بدر میں مشرکینِ مکہ کے سرداروں کی ہلاکت کے بعد مُردہ نعشوں کے گڑھے پر کھڑے ہوکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب فرمایا تھا :-

"اُے فلاں ابن فلاں کیا تم کو اللہ تعالیٰ اور اُسکے رسول کی اطاعت پسند آئی ؟ بلاشبہ ہم نے وہ سب کچھ پالیا جو ہمارے رب نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ کیا تم نے بھی وہ پایا جو تمہارے رب نے تم سے وعدہ کیا تھا ؟ (بخاری)

اس قسم کا خطاب انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات میں شمار کیا گیا ہے۔ یہ کوئی عام حالت نہیں ہوتی کہ ہر شخص مُردوں سے اس طرح خطاب کرسکے۔ اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کا خطاب مُردوں کو سنوا دیتا ہے اگرچہ وہ جواب دینے سے قاصر ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام بدر میں مشرکین کی لاشوں کو اس طرح خطاب فرما چکے تو حضرت عمر بن الخطابؓ نے تعجب سے پوچھا۔ یارسول اللہ کیا یہ سُن رہے ہیں ؟ آپؐ نے فرمایا ہاں ! تم سے زیادہ مگر جواب دینے سے عاجز ہیں۔

قرآن حکیم میں اسکی مزید صراحت موجود ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمَاتُ

وَلَا النُّوْرُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ وَمَا يَسْتَوِى الْاَحْيَاءُ
وَلَا الْاَمْوَاتُ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَاءُ وَمَا اَنْتَ
بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِى الْقُبُوْرِ ۝ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ۝

(الفاطر آیت ۱۹ تا ۲۳)

اُندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہے، نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں۔ نہ ٹھنڈی چھاؤں اور دھوپ کی تپش ایک جیسی ہے۔ اور نہ زندے اور مردے مساوی ہیں۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے سُنواتا ہے۔ اور اے نبیؐ تم ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں مدفون ہیں۔ آپ تو صرف خبردار کرنے والے ہو۔ (یعنی اللہ کی مشیت کی بات ہی دوسری ہے وہ چاہے تو پتھروں کو سماعت بخش دے اور اہل سماعت کو بہرہ کر دے، جمادات کو متحرک کر دے اور حیوان کو بے حس و حرکت بنا دے)

(۶) معجزات کی حقیقت

"ناقۃ اللہ" حضرت صالح علیہ السلام کی یہ اونٹنی بغیر کسی ظاہری اسباب کے وجود میں آئی تھی اس لئے اسکو حضرت صالح علیہ السلام کا معجزہ قرار دیا گیا۔ معجزے کی حقیقت کیا ہے؟ اسپر اہل علم حضرات نے بہت تفصیل کیساتھ چھوٹے بڑے مضامین لکھے ہیں۔ یہاں اسکا خلاصہ پیش ہے تاکہ معجزے کی حقیقت معلوم ہو جائے۔ معجزہ عربی زبان میں عاجز کر دینے اور تھکا دینے والی چیز کو کہا جاتا ہے۔ اسلامی بول چال میں ایسے عمل کا نام ہے جو بغیر کسی اسباب کے وجود میں آجائے۔ چونکہ ایسی چیز اچانک اور بغیر کسی اسباب کے ظاہر ہوتی ہے تو انسانی عقل اسکے سمجھنے سے عاجز ہوتی ہے کہ یہ کیوں کر ظاہر ہو گئی اس لئے اس عمل کو معجزہ (یعنی انسانی عقل وفہم کو تھکا دینے اور عاجز کر دینے والی بات) کہا گیا۔ یا یہ معنی کہ اس جیسے عمل کو انسانی طاقت پیدا کر دینے سے عاجز و بے بس ہے۔ اسلئے انبیاء کرام کے معجزات انسانوں کو یہ باور کرانے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ یہ "عمل" انسانی طاقت سے

یا پھر کسی ایسی ہستی کا ہے جسکی طاقت و قدرت سب پر غالب اور بالاتر ہے اور وہ اللہ علیم و قدیر کا دستِ قدرت ہے۔ اس لئے تمام اہل تحقیق اسپر متفق ہیں کہ "معجزہ" اللہ تعالےٰ کا عمل ہوتا ہے۔ جو انبیاء و رُسل کی صداقت اور دلیل کے طور پر انکے مقدس ہاتھوں جاری کیا جاتا ہے۔ چونکہ ایسا عمل عام قانون فطرت کے بظاھر خلاف معلوم ہوتا ہے اسلئے یہ سوال قدرتاً پیدا ہوجاتا ہے کہ کیا قانونِ قدرت میں تبدیلی ممکن ہے؟ جبکہ قرآن حکیم نے نہایت تاکید کے ساتھ کئی مقامات پر یہ صراحت کی ہے کہ اللہ کی سنت (قانون) کو بدلتا ہوا نہ پاؤگے اور نہ اُسمیں تبدیلی ممکن ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ معجزے کی یہ تعریف کرنا کہ وہ قانونِ فطرت یا قانونِ عادت کے خلاف ہوتا ہے غلط قسم کی تعبیر ہے۔

دراصل اللہ تعالےٰ کے قوائین دو قسم کے ہیں :- عادتِ عام، عادتِ خاص۔

عادتِ عام سے اللہ تعالےٰ کے وہ قوائین مراد ہوتے ہیں جو سلسلۂ اسباب میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مثلاً: آگ جلاتی ہے، پانی خنکی و ٹھنڈک پہنچاتا ہے، زہر ہلاک کرتا ہے اور شہد شفا بخشتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ان چیزوں کے درمیان جو رشتہ ہے وہ اپنا اثر کر دکھاتا ہے۔ آگ مجبور ہے کہ جو اسمیں آگرے گا اُسکو جلائے۔ ایسی چیزوں کو قانونِ قدرت کی عادتِ عامہ کہا جائے گا۔

دوسری قسم قانون قدرت کی "عادتِ خاص" ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ سبب اور مسبّب میں تعلق و رشتہ پیدا کرنے والے خالق نے کسی خاص مقصد کے لئے اس درمیانی رشتے کو الگ و جُدا کردیا ہو یا دوسرے الفاظ میں بغیر سبب کے مسبب کو پیدا کردیا ہو جیساکہ جلنے کے اسباب موجود ہوں اور کوئی جسم نہ جلے، یا دو چار انسانوں کے قابل خوراک سے سَو دو سَو انسان شکم سیر ہوجائیں اور پھر اپنی اصل مقدار باقی رہ جائے۔ یہ دونوں باتیں چونکہ عام نگاہوں میں قانونِ قدرت کے خلاف ہیں اس لئے جب یہ یا اس طرح کی کوئی اور شئ رُونما ہوجاتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ "قانونِ قدرت" یا "سنت اللہ" کے خلاف ہے۔

حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی چیزیں پہلی قسم یعنی "عادتِ عام"

کے خلاف تو ہیں لیکن دوسری قسم "عادت خاص" کے خلاف نہیں۔ اور ایسی خلاف عادت چیزیں قانونِ قدرت ہی کی ایک کڑی ہوتی ہیں جو عام حالات سے الگ کسی خاص مقصد کو پورا کرنے کے لئے ظاہر کی جاتی ہیں۔ اب اگر آگ ہو اور کسی جسم کو نہ جلائے یا زہر کھالیا جائے اور ہلاکت نہ ہو تو یہ کہا جائے گا کہ یہ چیزیں عادتِ عام کے خلاف تو ہیں لیکن اللہ کی عادتِ خاص کے خلاف نہیں۔ اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس طرح اللہ تعالےٰ اپنے نبی و رسول کی صداقت کی تصدیق فرماتا ہے اور شک کرنے یا جھٹلانے والوں کو یہ باور کروایا جاتا ہے کہ اگر یہ مدعیٔ رسالت اپنے دعوے میں سچا نہ ہوتا تو خدا کی یہ زبردست تائید کبھی بھی اُسکے ساتھ نہ ہوتی۔ لہٰذا اللہ تعالےٰ کا یہ فعل جو اسکی عادتِ خاص کی شکل میں نبی کے ہاتھ ظاہر ہوا ہے معجزہ کہلاتا ہے اور نبی کی صداقت پر دلیل قرار پاتا ہے۔

معجزہ نبوت و رسالت کا ثبوت فراہم کرتا ہے علامت یا معیار نہیں ہوتا، یعنی اگر کسی نبی سے کوئی بھی معجزہ جاری نہ ہوا تو یہ نہیں کہا جائیگا کہ یہ نبی و رسول نہیں ہیں۔ حقیقت میں نبی کی خود اپنی ذات اپنے بے شمار کمالات و فضائل کی بنا پر ایک چلتا پھرتا معجزہ ہوتا ہے۔

پچھلی امتوں میں ایسے انبیاء بھی گزرے ہیں جنکے ہاتھوں کوئی بھی معجزہ ظاہر نہیں ہوا لیکن وہ اللہ کے فرستادہ نبی و رسول تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر نبی اور رسول معجزہ نہ دکھلائے تو نبی کی صداقت میں کوئی کمی نہیں ہوگی لیکن اگر منکرین کے مطالبہ پر یا از خود رسول معجزہ کا اظہار کرے تو یقیناً معجزہ نبوت کی دلیل اور ثبوت قرار پائے گا اور اُسکا انکار صداقت کا انکار ہوگا جو خالص کفر کی قسم ہے۔

البتہ یہ حقیقت کبھی فراموش نہ ہونی چاہیے کہ کسی شخص سے صرف اس قسم کے خارقِ عادت کوئی عمل صادر ہونے کا نام معجزہ نہیں ہے اور محض اس عمل کے بروئے کار لانے سے وہ نبی یا رسول نہیں ہوسکتا اس لئے کہ نبی اور رسول کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اُسکی تمام زندگی اس طرح آزمائش و امتحان کی کسوٹی پر اُتر چکی ہو کہ اُسکا کوئی شعبۂ زندگی ناقص اور قابل اعتراض نہ ہو بلکہ اُسکی تمام زندگی

میں اخلاق کی بلندی، گناہوں سے معصومیت، صداقتِ گفتار و کردار اور پاکیزہ تعلیمات اپنے درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے ہوں اسکے بعد علمی و عقلی دلائل و براہین کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی آیات (معجزے) بھی پیش کرتا ہو تو بلاشبہ وہ نبی ہے۔

لیکن یہ ساری تفصیلات صرف اور صرف معجزے کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے تحریر کی گئیں ہیں ورنہ ختمِ نبوّت کے بعد نہ اسکی ضرورت ہے اور نہ کسی کو اس کسوٹی پر جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ اب قیامت تک یہ سلسلہ بند ہوگیا ہے۔ البتہ اگر اس قسم کے یا اس جیسے امور کسی نیک و صالح اور متقی انسان سے سرزد ہوجائیں تو وہ "کرامت" کہلائیں گے۔ اور اگر یہ امور کسی بے دین، بےعمل و اباحتی انسان سے جاری ہوں تو انکو "استدراج" سحر، شعبدہ، وغیرہ کہا جائیگا جسمیں مخفی ذرائع کارفرما ہوتے ہیں۔

الغرض معجزہ دراصل نبی کا اپنا عمل نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے جو نبی کے ہاتھوں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ نبی و رسول بھی ایک انسان اور بشر ہوتا ہے اور کسی انسان کی قدرت میں یہ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قوانین عام و خاص میں دخل اندازی یا تغیّر کر سکے۔ لہٰذا معجزہ صرف اللہ عزوجل کا فعل ہوتا ہے جو نبیوں کے ہاتھوں جاری کیا جاتا ہے۔ غزوۂ بدر میں جبکہ تین سو تیرہ (۳۱۳) مسلمانوں کے مقابلے میں سازوسامان سے مسلح ایک ہزار دشمنوں کا لشکر یلغار کرنے آیا تھا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے اُن کی طرف ایک مُشتِ خاک پھینک دی جسکی وجہ سے دشمن کے ہر فرد کی آنکھ میں خاک کے ریزے پہنچے اور وہ بیچین ہوکر آنکھیں ملنے لگا۔ قرآن حکیم نے اس واقعہ کا معجزانہ انداز میں تذکرہ کیا ہے۔

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔

(انفال آیت ۱۷)

"اے نبیؐ جب تم نے مٹھی بھر خاک پھینکی تھی تو تم نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔"

معجزے کی اصل حقیقت کے لئے قرآن حکیم کی یہ آیت بہت کافی ہے۔

ایک مُشت خاک کو یقیناً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ نے پھینکا تھا

جو انسانی حدِ طاقت کے لحاظ سے سَو دو سَو گز کے احاطے میں پھیل سکتے ہیں لیکن اسکا یہ حیرت انگیز اثر کہ دشمن کے محاذ کی دُوری اور اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود اِن سب کی آنکھوں میں پہنچ جانا ایک انسانی ہاتھ کے لئے ناممکن ہے۔ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا فعل تھا کہ اُس کے دستِ قدرت نے اِن تمام دشواریوں کو یکلخت ختم کر کے کنکریوں کو دشمنوں کی صفوں کے اندر پہنچا دیا۔ اور دشمنوں نے اس "خدائی خاکی طوفان" سے بچنے کے لئے منہ پھیر دیا اور شکست کھا بیٹھے۔

کرامت کی بحث "تذکرہ سیدہ مریم" میں آئیگی۔ واللہ اعلم وعلمہٗ اتم۔

(۷) **آثارِ عبرت** | قومِ ثمود کا مسکن شمالی مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی "الحجر" کے نام سے موسوم ہے۔ موجودہ زمانے میں مدینہ و تبوک کے درمیان ایک بستی ہے جسے آج مدائن صالح کہا جاتا ہے۔ یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور قدیم زمانے میں اسکو حجر کہا جاتا تھا۔ اب تک وہاں ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں وہ سنگین عمارتیں موجود ہیں جنکو ثمود کے لوگوں نے پہاڑوں میں تراش تراش کر بنایا تھا اور اب اس شہرِ خموشاں کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی زمانے میں اس شہر کی آبادی چار پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں حجاز کے تجارتی قافلے اِن آثار کے درمیان سے گزرا کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے موقع پر جب اِدھر سے گزر رہے تھے تو آپؐ نے اپنے اصحاب کو یہ آثارِ عبرت دکھائے اور وہ سبق دیا جو آثارِ قدیمہ سے ہر صاحبِ بصیرت انسان کو حاصل کرنا چاہیئے۔ ایک جگہ آپؐ نے ایک کنویں کی نشان دہی فرمائی کہ یہ وہی کنواں ہے جس سے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی پانی پیا کرتی تھی۔ صحابہؓ کو ہدایت کی کہ صرف اسی کنویں کا پانی لینا باقی کنوؤں کا پانی نہ پینا۔

ایک پہاڑی کے درّے کو دکھا کر فرمایا کہ اِسی درّے سے وہ اونٹنی پانی پینے کے لئے آتی تھی۔ چنانچہ وہ مقام آج بھی "فج النّاقہ" کے نام سے مشہور ہے۔ ان کھنڈروں میں جو لوگ سیر کرتے پھر رہے تھے اُن کو آپؐ نے جمع کیا اور اُن کے سامنے ایک خطبہ دیا جسمیں ثمود کے انجام پر عبرت دلائی اور فرمایا کہ یہ اُس قوم کا علاقہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ

کا عذاب نازل ہوا تھا، لہذا یہاں سے جلدی گزر جاؤ۔ یہ سیرگاہ نہیں بلکہ رونے کا مقام ہے۔ الحجر کے گرد و پیش بڑی نحوست پائی جاتی ہے۔ آبادی برائے نام اور روئیدگی بہت ہی کم ہے۔ یہاں چند کنویں ہیں انہی میں سے ایک کنویں کے بارے میں مقامی آبادی میں یہ روایت چلی آرہی ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی اس کنویں سے پانی پیا کرتی تھی۔

اس علاقے کے اطراف میں ہر طرف ایسے پہاڑ نظر آتے ہیں جو بالکل شاخ شاخ ہوگئے ہیں صاف محسوس ہوتا ہے کہ کسی سخت ہولناک زلزلے نے انھیں سطح زمین سے چوٹی تک جھنجوڑ کر قاش قاش کر رکھا ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ مشرق میں خیبر جاتے ہوئے تقریباً (۵۰) میل تک اور شمال کی طرف ریاست اُردن کے حدود میں (۳۰۔۴۰) میل اندر تک چلا جاتا ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ کوئی تین چار سو میل لمبا اور (۱۰۰) میل چوڑا ایک علاقہ تھا جسے ایک عظیم زلزلے نے ہلا کر رکھ دیا۔

اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْهُ۔

(۸) ایک مُشرکانہ نظریہ

حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالےٰ کی یکتائی اور فرمارروائی کی تبلیغ میں اس طرح خطاب فرمایا: "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اسکے سوا تمہارا کوئی بھی اِلٰہ نہیں ہے۔ یہ وہی ہے جس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور یہاں تم کو بسایا، لہذا تم اس سے مغفرت چاہو اور اُسی کی طرف پلٹ آؤ، یقیناً میرا رب قریب ہے اور دُعاؤں کا جواب دینے والا ہے۔"

(ہود آیت ۶۱)

قوم کے مشرکوں کو حضرت صالح علیہ السلام یہ تلقین کرتے ہیں کہ جب تم خود اس بات کو تسلیم کرتے ہو کہ تمہارا خالق صرف اللہ ہی ہے اسمیں اُس کا کوئی شریک و دخیل نہیں تو پھر اللہ کے سوا اور کس کی خدائی ہوسکتی ہے؟ اور کسی دوسرے کو یہ حق کیسے حاصل ہوسکتا ہے کہ تم اُس کی بندگی کرو؟ یہ قوم اپنی مشکلات و حاجات میں اُن مشہور بتوں کو پکارا کرتی تھی جو قوم نوح میں رائج تھے اور اِن کو وہ وسیلہ و ذریعہ سمجھا کرتے تھے۔

یہ ایک عام غلط فہمی ہے جس نے ہر زمانے میں انسان کو شرک میں مبتلا کیا ہے۔ یہ لوگ اللہ تعالےٰ کو اپنے راجوں مہاراجوں اور بادشاہوں پہ قیاس کرتے ہیں جو رعیت سے دُور اپنے محلات میں بیٹھ کر حکومت کرتے ہیں جن کے دربار تک عام رعایا میں سے کسی کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ جن کے حضور میں کوئی درخواست پہنچانی ہو تو مقربینِ بارگاہ میں سے کسی کا دامن تھامنا پڑتا ہے اور پھر اگر خوش نصیبی سے کسی کی درخواست اُن کے آستانے پر پہنچ جاتی ہے تو اِن کا پندار خدائی یہ گوارا نہیں کرتا کہ خود اس درخواست گزار کو جواب دیں بلکہ جواب دینے کا کام مقربین میں سے کسی کے سُپرد ہوتا ہے۔

قریب قریب یہ ہی طرزِ عمل مشرکوں نے اللہ واحد کے لئے اختیار کرلیا ہے اور لوگوں کو ایسا سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے کہ خداوند عالم کا آستانۂ قدس عام انسانوں کی دسترس سے دور بہت دور ہے۔ اس کے دربارِ عظیم تک بھلا کسی عام آدمی کی پہنچ کیسے ہوسکتی ہے؟ وہاں تک دُعاؤں کا پہنچنا اور پھر اُسکا جواب ملنا تو کسی طرح ممکن ہی نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ پاک رُوحوں کا وسیلہ نہ ڈھونڈا جائے اور اُن مذہبی منصب داروں کی خدمات حاصل نہ کی جائیں جو اُوپر تک نذریں نیازیں پہنچانے کے طور وطریقے جانتے ہیں۔ یہی وہ سخت غلطی ہے جس نے بندے اور اللہ واحد کے درمیان بہت سے چھوٹے بڑے معبودوں اور سفارشیوں کا ایک جمِ غفیر کھڑا کردیا ہے اور جسکی عملی صورت میں مہنت گری، آستانگی، مجاورگری، سجادہ نشینی کے مناصب قائم ہوتے چلے گئے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے جاہلیت کے اس قدیم فلسفے کو صرف دو لفظوں سے رَدّ کر دیا ہے:۔

ایک[1] یہ کہ اللہ قریب ہے دوسرے[2] یہ کہ وہ مجیب ہے۔

یعنی تمہارا یہ خیال بھی غلط ہے کہ وہ تم سے دُور ہے اور یہ بھی غلط ہے کہ تم براہِ راست اسکو پکار کر اپنی دعاؤں کا جواب حاصل نہیں کرسکتے، وہ اگرچہ بہت بلند و برتر ہے مگر اس کے باوجود وہ تم سے بہت قریب ہے۔ تم میں سے ہر ایک شخص اپنے پاس ہی اسکو پاسکتا ہے۔ اس سے سرگوشی کرسکتا ہے۔ خلوت وجلوت میں، اپنی عرضیاں خود

اسکے حضور پیش کرسکتا ہے اور پھر وہ براہِ راست اپنے ہر بندے کی دعاؤں کا جواب بھی خود دیتا ہے۔

پس جب سلطانِ کائنات کا دربارِ عام ہر وقت ہر شخص کے لئے کُھلا ہے اور وہ ہر شخص کے قریب ہی موجود ہے تو تم کس حماقت میں پڑے ہو کہ اسکے لئے وسیلے واسطے ڈھونڈتے پھرتے ہو؟

سورۂ بقرہ آیت ۱۸۶ میں اس حقیقت کو مزید وضاحت کے ساتھ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے :-

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔ الآیہ۔

"اور اے نبیؐ میرے بندے تم سے اگر میرے متعلق پوچھیں تو انھیں بتادو کہ میں اُن سے قریب ہی ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے میں اُسکی پکار سُنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں۔ لہذا انہیں چاہیئے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں، یہ بات اُنہیں سُنادو شاید کہ وہ راہِ راست پالیں۔"

یعنی اگرچہ تم مجھے دیکھ نہیں سکتے اور نہ اپنے حواس سے مجھ کو محسوس کرسکتے ہو، لیکن یہ خیال نہ کرو کہ میں تم سے دُور ہوں۔ نہیں! میں اپنے بندے سے اتنا قریب ہوں کہ جب وہ چاہے مجھ سے عرض معروض کرسکتا ہے۔ حتیٰ کہ دل ہی دل میں وہ جو کچھ مجھ سے گزارش کرتا ہے میں اُسے بھی سُن لیتا ہوں اور صرف سنتا ہی نہیں فیصلہ بھی صادر کرتا ہوں۔ جن بے جان اور بے اختیار ہستیوں کو تم نے اپنی نادانی سے قاضی الحاجات اور دستگیر، فریادرس قرار دے رکھا ہے اُن کے پاس تو تم کو دوڑ دوڑ کر جانا پڑتا ہے اور پھر بھی نہ وہ تمہاری شنوائی کرسکتے ہیں اور نہ اُن میں یہ طاقت ہے کہ تمہاری درخواستوں پر کوئی فیصلہ صادر کرسکیں۔ مگر میں کائناتِ بے کراں کا فرماں روائے مطلق ہوں، تمام اختیارات اور تمام طاقتوں کا مالک ہوں، تم سے اتنا قریب ہوں کہ تم خود بغیر کسی واسطے وسیلے اور سفارش کے براہِ راست ہر وقت اور ہر جگہ مجھ تک اپنی عرضیاں پہنچا سکتے ہو۔ لہذا تم اپنی اس نادانی کو چھوڑ دو کہ بے طاقت و بے اختیار ہستیوں کے در پر مارے مارے پھرتے ہو۔ میری دعوت پر لبیک کہو اور میرا دامن

پکڑلو، میری طرف رجوع کرو، مجھ پر بھروسہ کرو اور میری بندگی کرو، اطاعت میں آجاؤ۔

(۹) جاہلیّت اَور اسلام کا طرزِ استدلال

حضرت صالح علیہ السّلام کی پے در پے اور مسلسل دعوت و نصیحت پر قوم نے حیرت و استعجاب سے یوں خطاب کیا :۔

"اے صالح اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ کیا تو ہمیں اُن معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟" (ہود آیت ۶۲)

یہ گویا دلیل ہے اس بات کی کہ یہ معبود کیوں عبادت کے مستحق ہیں؟ اور اِن کی پُوجا کس لئے ہوتی رہنی چاہیئے؟ یہاں جاہلیت اور اسلام کے طرزِ استدلال کا فرق بالکل واضح طور پر نظر آتا ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور اس پر یہ دلیل دی کہ اللہ تعالےٰ ہی نے تم کو پیدا کیا اور زمین میں آباد کیا ہے۔

اسکے جواب میں اِنکی مشرک قوم کہتی ہے کہ ہمارے یہ معبود بھی مستحق عبادت ہیں اور اِن کی عبادت ترک نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ ہمارے باپ داداکے زمانے سے اِن کی عبادت ہوتی چلی آئی ہے۔ یعنی مکھی پر مکھی صرف اس لئے ماری جاتی رہنی چاہیئے کہ ابتداء میں کسی بیوقوف نے اس جگہ مکھی ماردی تھی اور اب اس مقام پر مکھی مارتے رہنے کے لئے اسکے سوا کسی معقول وجہ کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ یہاں مدتوں سے مکھی ماری جارہی ہے۔

سبحان اللہ! اس آیت میں اسلام اور جاہلیت کا طرزِ استدلال اور زاویہ نظر واضح اور عیاں ہے۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعًا۔

(۱۰) نبیؑ کی قوتِ اعتماد

قوم نے حضرت صالح علیہ السلام سے اُنکی صداقت پر دلیل طلب کی تھی اسپر معاً پہاڑ کے اندر سے

ایک زبردست اونٹنی برآمد ہوئی۔ حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کو خبردار کیا:۔

"یہ اونٹنی ہے قومی کنویں سے ایک دن اسکے پینے کا رہے گا
اور ایک دن تم سب کے پانی لینے کا۔ اِسکو بُرائی سے ہرگز نہ چھیڑنا ورنہ
ایک بہت بڑا عذاب تم کو گھیر لے گا۔ (شعراء آیت ۱۵۶)

"یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے نشانی کے طور پر ہے چھوڑ دو
اسے اللہ کی زمین میں چرتی پھرے، ہرگز اسکو بُرے ارادے سے
نہ چھُونا۔ (ہود آیت ۶۴)

یہ چیلنج بجائے خود نہایت سخت تھا لیکن عرب کے مخصوص حالات میں تو کسی قوم کیلئے اس سے بڑھکر کوئی دوسرا چیلنج ہو نہیں سکتا تھا۔ وہاں تو پانی کے ہی مسئلہ پر خون خرابے ہو جاتے تھے۔ قبیلہ قبیلے سے لڑجاتا تھا اور جان جوکھوں کی بازی لگاکر کسی کنویں یا چشمے سے پانی لینے کا حق حاصل کیا جاتا تھا۔ اس سرزمین پر کسی کا اُٹھ کر یہ کہہ دینا کہ ایک دن میری اونٹنی تنہا پانی پیئے گی اور باقی ساری قوم کے آدمی اور جانور دوسرے ہی دن پانی لے سکینگے یہ معنیٰ رکھتا تھا کہ وہ شخص اکیلا پوری قوم کو ایک زبردست چیلنج دے رہا ہے۔ ایک زبردست لشکر کے بغیر آدمی عرب میں یہ بات زبان سے نہ نکال سکتا تھا۔ اور کوئی قوم یہ بات اُس وقت تک نہ سُن سکتی تھی جب تک کہ وہ اپنی آنکھوں سے یہ نہ دیکھ لے کہ چیلنج دینے والے کی پشت پر اتنے شمشیر زن اور تیرانداز موجود ہیں جو مقابلے پر اُٹھنے والوں کو کچل کر رکھ دیں گے۔

لیکن حضرت صالح علیہ السلام نے بغیر کسی لاؤلشکر اور بغیر کسی نفری طاقت تنہا اُٹھ کر یہ چیلنج اپنی قوم کو دے دیا اور قوم نے نہ صرف یہ کہ اُسکو کان لگاکر سُنا بلکہ بہت دنوں تک ڈر کے مارے وہ اسکی تعمیل بھی کرتی رہی۔

انبیاء کرام کا یہ عزم و حوصلہ دراصل اُسی قوتِ اعتماد کا نتیجہ ہے جو اُن کے قلوب میں اللہ تعالےٰ کے وعدوں پر پیدا ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر وہ اللہ تعالےٰ کا امر پاکر اسباب ظاہری سے بے نیاز ہو کر وہ سب کچھ کر جاتے ہیں جسکا اُنہیں حکم ہوتا ہے۔

(۱۱) **بگڑے تمدّن کی علامت** | جس طرح قوم عاد کے تمدن کی نمایاں ترین

خصوصیت یہ تھی کہ وہ اُونچے اُونچے ستونوں والی عمارتیں بناتے تھے۔ اسی طرح قوم ثمود کے تمدن کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت جسکی بنا پر وہ عادِ ثانیہ کے نام سے موسوم ہوئے یہ تھی کہ وہ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر عمارتیں بناتے تھے۔ چنانچہ سورۂ فجر میں جس طرح عاد کو ذات العماد (ستونوں والے) کا لقب دیا گیا ہے اسی طرح ثمود کا ذکر اس حوالے سے کیا گیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ الآیۃ۔

وہ جنھوں نے وادی میں چٹانیں تراشی ہیں۔

اسکے علاوہ قرآن حکیم نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ اپنے ہاں میدانی علاقوں میں بھی بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے تھے۔

تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا۔ (اعراف آیت ۷۴)

اور ان تعمیرات کی غرض وغایت کیا تھی؟ قرآن حکیم اسپر لفظ فٰرِهِیْنَ سے روشنی ڈالتا ہے۔ یعنی یہ سب کچھ اپنی بڑائی اپنی دولت وقوت اور اپنے کمالاتِ فن کی نمائش کے لئے تھا۔ کوئی حقیقی ضرورت ان کے لئے داعی نہ تھی۔

ایک بگڑے ہوئے تمدن کی شان یہی ہوتی ہے۔ ایک طرف معاشرے میں غریب لوگ سر چھپانے کے لئے بھی کوئی ڈھنگ کی جگہ نہیں پاتے دوسری طرف امراء اور اہل ثروت رہنے کے لئے جب ضرورت سے زیادہ محل بنا چکتے ہیں تو بلا ضرورت نمائشی یادگاریں تعمیر کرنے لگتے ہیں۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

(۱۲) قانونِ مکافات

قوم ثمود کی ہلاکت کے بعد اُن کے شہروں کی قسمت کا نقشہ قرآن حکیم نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

"اب دیکھ لو اُن کی چال کا انجام کیا ہوا؟ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا اُن کو اور اُن کی پوری قوم کو۔ پس اُن کے گھر خالی ویران پڑے ہیں اُس ظلم کی پاداش میں جو وہ کرتے تھے۔ اس میں ایک نشانِ عبرت ہے اُن لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔ اور بچا لیا ہم نے

اُن لوگوں کو جو ایمان لائے تھے اور نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے۔

(النمل آیت ۵۱ تا ۵۳)

موجودہ زمانے میں بعض ناواقف لوگوں کو یہ کہتے سُنا گیا کہ یہ واعظانہ باتیں ہیں کہ فلاں شہر یا فلاں علاقہ فسق و فجور سے بھر گیا تھا اس لئے اُس پر سیلاب آگیا یا زلزلے نے اس کی بستیاں اُلٹ دیں یا کسی بلائے ناگہانی نے اسے تَل پٹ کر دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن جو لوگ علم و بصیرت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مشرکین کے معبودوں کی طرح کوئی اندھا بہرا خدا اِس کائنات پر حکومت نہیں کر رہا ہے بلکہ ایک حکیم و دانا صاحب اقتدار ہستی یہاں قسمتوں کے فیصلے کر رہی ہے۔ اس کے ہاں قوموں کو گرانے اور اُٹھانے کے فیصلے اندھا دُھند نہیں کئے جاتے بلکہ حکمت اور عدل کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔ اور ایک قانون مُکافات بھی اس کی کتاب آئین میں شامل ہے جس کی رو سے اخلاقی بنیادوں پر اس دُنیا میں بھی ظالم کیفر کردار کو پہنچائے جاتے ہیں۔

ان حقیقتوں سے جو لوگ باخبر ہیں وہ قوم ثمود کے زلزلے کو اسباب طبعی کا نتیجہ کہہ کر نہیں ٹال سکتے وہ اسے اپنے حق میں تنبیہ کا کوڑا سمجھیں گے اور عبرت حاصل کریں گے۔ وہ اُن اسباب کو سمجھنے کی کوشش کریں گے جن کی بناء پر خالق نے اپنی پیدا کی ہوئی ایک پھلتی پھولتی قوم کو غارت کر کے رکھ دیا۔ وہ اپنے طرزِ عمل کو اُس راہ سے ہٹا لیں گے جو اُس کا غضب لانے والا ہے اور اُس راہ پر ڈالیں گے جو اُس کی رحمت سے ہمکنار کرنے والا ہے۔ اَللّٰھُمَّ اَھْدِنَا وَسَدِّدْنَا۔

(۱۳) اطاعت گُریزی کے اسباب

قوم ثمود کا حضرت صالح علیہ السلام کی پیروی سے انکار کرنا تین وجوہ سے تھا:

۱- یہ کہ وہ بشر ہیں انسانیت سے بالاتر نہیں کہ ہم اُنکی بڑائی مان لیں۔

۲- یہ کہ وہ ہماری اپنی ہی قوم کے ایک فرد ہیں ہم پر اِن کی فضیلت کی کوئی وجہ نہیں۔

۳- یہ کہ وہ اکیلے ہیں کوئی بڑے سردار نہیں جس کے ساتھ کوئی بڑا جتھا ہو، لاؤ لشکر ہو۔

یہ تینوں اسباب خود قرآن حکیم نے بیان کئے ہیں جسکی تفصیل گزشتہ اوراق میں آچکی ہے۔ یہ ہی وہ جہالت تھی جس میں کفارِ مکہ مبتلا تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ماننے سے اِن کا انکار بھی اسی بنیاد پر تھا کہ :-

"آپ بشر ہیں۔ عام آدمیوں کی طرح بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں۔ کل ہمارے ہی درمیان پیدا ہوئے اور آج یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ مجھ کو اللہ نے نبی و رسول بنایا ہے۔ (الفرقان آیت ۷۔۸)

یہ لوگ یہ چاہتے تھے کہ نبی یا تو کوئی فوق البشر ہستی ہو، یا اگر وہ انسان ہی ہو تو ہمارے ملک یا قوم میں پیدا نہ ہوا ہو بلکہ اوپر سے اُتر کر آئے یا باہر سے بھیجا جائے، اور اگر یہ بھی نہیں تو کم از کم اُسے کوئی رئیس ہونا چاہیئے جسکی غیر معمولی شان و شوکت کی وجہ سے یہ مان لیا جائے کہ رہنمائی کے لئے اللہ کی نظرِ انتخاب اس پر پڑی ہے۔

اسی جاہلانہ نظر و فکر سے تقریباً ہر نبی کو سابقہ پڑا ہے۔ تذکرہ سیدنا نوح علیہ السلام میں اسپر تفصیل کے ساتھ بحث آچکی ہے۔

(۱۴) **ہر اقتدار سے بالاتر** ثمود کے لوگوں نے حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت کو جھٹلا دیا جو اُن کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے اور اس جھٹلانے کی وجہ اُن کی سرکشی تھی کہ وہ اُس فجور کے چھوڑنے کو تیار نہ تھے جس میں وہ مُبتلا ہو چکے تھے اور اُس تقویٰ کو قبول کرنا گوارا نہ تھا جسکی طرف حضرت صالح علیہ السلام انھیں دعوت دے رہے تھے۔ آخر کار قوم نے حضرت صالح علیہ السلام کو چیلنج دے دیا کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی نشانی (معجزہ) پیش کرو؟ اسپر حضرت صالح علیہ السلام نے ایک اونٹنی کو معجزے کے طور پر پیش کر دیا اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کر دی کہ خبردار اِس کو بُرائی سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ سخت ترین عذاب سے دوچار ہو جاؤ گے۔ اس وارننگ پر وہ لوگ کچھ مدت تک ڈرتے رہے پھر اپنے سب سے زیادہ شریر و سرکش سردار کو پکارا کہ اس اونٹنی کا قصہ تمام کر دے۔ وہ اس کام کا ذمہ لے کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اونٹنی کو ذبح کر ڈالا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کو خبردار کر دیا کہ بس اب صرف تین دن اپنے گھروں میں اور مزے کر لو اسکے بعد وہ عذاب آجائیگا

جو ساری بستیوں کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دے گا۔ آخر کار اِس گناہ کی پاداش میں اُن کے رب نے اُن پر ایسی آفت توڑی کہ ایک ساتھ سب کو پیوندِ خاک کر دیا۔ اور اللہ کو اپنے اس فعل کے کسی بھی نتیجے کا کوئی خوف نہیں ہے۔"

(الشمس آیت ۱۱۔ ۱۵)

یعنی اللہ تعالےٰ دُنیا کے بادشاہوں اور یہاں کی حکومتوں کے فرمانرواؤں کی طرح نہیں کہ وہ کسی قوم کے خلاف کوئی قدم اُٹھانے کے وقت یہ سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اس اقدام کے کیا کیا نتائج ہوتے ہیں یا کیا کیا ہوسکیں گے؟

لیکن اللہ تعالےٰ کا اقتدار ہر اقتدار سے بالاتر ہے اُسکو اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ ثمود کی تباہی و بربادی پر کسی مافوق قوت وطاقت کا اندیشہ ہو کہ وہ اُسکی مدد اور مدافعت کے لئے ظاہر ہوگی۔ قصّہ کا اختتام اس آیت پر کس قدر بلیغ تر ہے۔

وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا۔ (سورہ والشمس آیت ۱۵)

"اور اللہ کو (اپنے اس فعل کے) کسی بھی نتیجے کا کوئی خوف نہیں۔"

تذکرۂ خلیلُ اللہ

سیّدنا ابراہیم علیہ السلام

اور — نمرود

سلسلۂ نسب تورات میں سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کا نسب نامہ اس طرح مذکور ہے: ابراہیم بن تارخ بن ناحور بن سروج بن رعو بن فالح بن عامر بن شالح بن ارفکشاد بن سام بن نوح علیہ السلام۔

یہ تصریح تورات کے علاوہ کتب تاریخ کے بھی مطابق ہے۔

قرآن حکیم نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آزر بتایا ہے اور تاریخی کتب میں تارخ لکھا گیا ہے۔ اہلِ علم نے اِس کا یہ جواب دیا ہے کہ دونوں نام ایک ہی شخص کے ہیں۔ تارخ اِسمی نام ہے اور آزر وصفی نام۔

آزر عبرانی زبان میں محبِ صنم کو کہا جاتا ہے۔ چونکہ تارخ میں بُت تراشی اور بُت پرستی دونوں وصف موجود تھے اس لئے اُسکو آزر کہا گیا۔ قرآن حکیم نے اُس کے وصفی نام ہی کو بیان کیا ہے۔

مشہور امام تفسیر مجاہدؒ المتوفی ۱۰۳ھ نے لکھا ہے کہ آزر دراصل اُس بُت کا نام تھا جسکا وہ پجاری رہا ہے۔ اس نسبت سے اُس کا نام بھی آزر پڑ گیا۔ قدیم زمانے میں بُت پرست لوگ اپنے بچوں کے نام بتوں کے نام پر رکھ دیا کرتے تھے۔ (ابن کثیر)

تعارُف سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "ابو الانبیاء" (نبیوں کے باپ) کے نام سے یاد فرمایا ہے۔ قرآن حکیم نے بھی سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کو ملّتِ اسلام کے باپ اور اسلام کو "ملّتِ ابراہیم" قرار دیا ہے۔ روایت بخاری میں بھی اس قسم کی تصریح ملتی ہے۔ صحابہؓ نے آنحضور صلی اللہ

علیہ وسلم سے قربانی کے بارے میں دریافت کیا تھا۔

مَا هٰذِهِ الْاَضَاحِيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔

یہ قربانی کیا چیز ہے ؟

آپؐ نے ارشاد فرمایا :۔

سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ (علیہ السلام)

تمہارے باپ ابراہیم کی سنت ہے !

قرآن حکیم نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا تعارف اس طرح کروایا ہے :۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَّلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ اِجْتَبٰهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔

(النحل آیات ۱۲۰ تا ۱۲۳)

"واقعہ یہ ہے کہ ابراہیمؑ اپنی ذات میں ایک پوری اُمت (کی حیثیت) رکھتے ہیں۔ وہ اللہ کے فرمانبردار تھے بالکل ایک رُخ تھے اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے تھے۔ اللہ نے انہیں منتخب کر لیا تھا۔ اور اُنہیں سیدھا راستہ دکھایا تھا۔ اور دُنیا میں اُن کو بھلائی دی اور آخرت میں وہ یقیناً صالحین میں ہوں گے۔ پھر ہم نے تمہاری طرف (اے نبیؐ) وحی بھیجی کہ یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقے پر چلو اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔"

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا :۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا۔ (آل عمران آیت ۶۷)

"ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی۔ البتہ وہ ایک خُدا کی طرف جُھکنے والے مسلمان تھے اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھے۔"

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے :-

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ـ الآیہ (مریم آیت ۴۱)

"اور اے نبیؐ اس کتاب میں ابراہیمؑ کا ذکر کرو بیشک وہ مجسم سچائی اللہ کے نبی تھے۔"

ایک اور جگہ ارشاد ہے :-

وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِن قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَالِمِينَ ـ الآیہ (انبیاء آیت ۵۱)

"اور بلاشبہ ہم نے ابراہیمؑ کو رُشد و ہدایت شروع ہی سے بخشی تھی اور ہم ہی اُسکو جاننے والے ہیں۔"

تورات میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا تعارف اس طرح آیا ہے :-

"حضرت ابراہیم علیہ السّلام عراق کے قصبہ اُدر کے باشندے اور اہل فدّان میں سے تھے۔ اُن کی قوم بُت پرست تھی اور انجیل میں تصریح ہے کہ اُن کے والد نجّاری کا پیشہ کرتے تھے اور اپنی قوم کے مختلف قبائل کے لئے لکڑی کے بُت بناتے اور فروخت کرتے تھے، مگر اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو شروع ہی سے حق کی بصیرت اور رُشد و ہدایت عطا فرمائی تھی اور وہ یقین رکھتے تھے کہ بُت نہ سُن سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کسی کی پکار کا جواب دے سکتے ہیں اور نہ نفع و نقصان کا اُن سے کوئی واسطہ۔"

سیّدنا ابراہیم علیہ السّلام اور قرآنِ حکیم

چونکہ ملّتِ ابراہیمی کا پیغام قرآن حکیم کی رُشد و ہدایت کا پیغام ہے۔ اسلئے قرآن حکیم میں جگہ جگہ سیدنا ابراہیم علیہ السّلام کا تذکرہ ملتا ہے۔ قرآن حکیم کی پچیس ۲۵ سورتوں میں نز ۶۳ آیات کے ضمن میں یہ تذکرہ موجود ہے۔

۱۔ البقرۃ ـــ آیات ـــ ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۴۰، ۲۵۸، ۲۶۰۔

۲۔ آل عمران ـــ آیات ـــ ۳۳، ۶۵، ۶۷، ۶۸، ۸۴، ۹۵، ۹۷،

۳۔ النساء ـــ آیات ـــ ۵۴، ۱۲۵، ۱۶۳۔

۴۔ الانعام ـــ آیات ـــ ۷۴، ۷۵، ۸۳، ۱۶۱۔

۵۔ التوبہ ـــ آیات ـــ ۷۰، ۱۱۴۔

۶۔ ھود ـــ آیات ـــ ۶۹، ۷۴، ۷۵، ۷۶۔

۷۔ ابراھیم ـــ آیت ـــ ۳۵۔

۸۔ النحل ـــ آیات ـــ ۱۲۰، ۱۲۳۔

۹۔ الانبیاء ـــ آیات ـــ ۵۱، ۶۰، ۶۲، ۶۹۔

۱۰۔ الشعراء ـــ آیت ـــ ۶۹۔

۱۱۔ الاحزاب ـــ آیت ـــ ۷۔

۱۲۔ صٓ ـــ آیت ـــ ۴۵۔

۱۳۔ الزخرف ـــ آیت ـــ ۲۶۔

۱۴۔ النجم ـــ آیت ـــ ۳۷۔

۱۵۔ الممتحنہ ـــ آیت ـــ ۴۔

۱۶۔ یوسف ـــ آیات ـــ ۶، ۳۸۔

۱۷۔ الحجر ـــ آیت ـــ ۵۱۔

۱۸۔ مریم ـــ آیات ـــ ۴۱، ۴۶، ۵۸۔

۱۹۔ الحج ـــ آیات ـــ ۲۶، ۴۳، ۷۸۔

۲۰۔ العنکبوت ـــ آیات ـــ ۱۶، ۳۱۔

۲۱۔ الصافات ـــ آیات ـــ ۸۳، ۱۰۴، ۱۰۹۔

۲۲۔ الشوریٰ ـــ آیت ـــ ۱۳۔

۲۳۔ الذاریات ـــ آیت ـــ ۲۴۔

۲۴۔ الحدید ـــ آیت ـــ ۲۶۔

۲۵۔ آلاعلیٰ ـــــ آیت ـــــ ۱۹۔
مجموعہ (۲۵) سورتیں (۶۳) آیات ۔

قومِ ابراہیمؑ | تاریخ عالم میں شاید یہ پہلی قوم ہوگی جس کا سرکاری مذہب بُت پرستی تھا۔ بُت سازی اور بُت پرستی جس درجے اس قوم میں پائی جاتی تھی اسکی مثال بھی دشوار ہوگی۔ ایسے گھناؤنے ماحول میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ آنکھ کھولی تو صنم پرست ماحول ہی دیکھا۔ مگر اللہ تعالےٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو شروع ہی سے حق کی بصیرت اور رشد و ہدایت عطا فرمائی تھی اور وہ یقین رکھتے تھے کہ بُت نہ تو سُن سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کسی کی پکار کا جواب دے سکتے ہیں۔ وہ صبح و شام اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ اِن بے جان مورتیوں کو میرا باپ اپنے ہاتھوں سے بناتا اور گھڑتا رہتا تھا اور شام کو اُسی بُت کے آگے سر جُھکاتا ہے۔ یہ عجیب و غریب کیفیت سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کو بے چین کر دیتی تھی، اُن کا دل و دماغ اس حالت کو قبول کرنے کے لئے قطعاً آمادہ نہ ہوتا تھا۔ جو بُت اپنی ذات ہی میں دوسروں کے محتاج ہوتے ہیں۔ بھلا وہ دوسروں کو کیا نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ عبادت کے وہی لائق ہو سکتا ہے جو زمین و آسمانوں کا مالک و خالق ہو اور جو ساری مخلوقات کی پرورش کرتا ہو۔

سورۂ انبیاء کی آیات اسی عنوان سے متعلق ہیں :۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِنْ قَبْلُ الآیہ

(الانبیاء، آیت ۵۱ تا ۵۶)

قرآنی مضمون | "اور بلاشُبہ ہم نے ابراہیمؑ کو اوّل ہی سے رشد و ہدایت عطا کی تھی اور ہم اسکے جاننے والے تھے، جب اُنھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا یہ مجسمے کیا ہیں جن کو تم لئے بیٹھے ہو؟ کہنے لگے ہم نے اپنے باپ دادا کو اِن ہی کی پُوجا کرتے پایا ہے! ابراہیم نے کہا، بلاشُبہ تم اور تمہارے باپ دادا کھُلی گمراہی میں

ہیں۔ اُن لوگوں نے جواب دیا کیا تو ہمارے لئے کوئی (ان کے علاوہ) حق بات لایا ہے یا یوں ہی مذاق کرنے والوں کی طرح کہتا ہے؟ ابراہیم نے کہا (یہ بُت تمہارے رب نہیں ہیں) بلکہ تمہارا پروردگار زمین و آسمانوں کا پروردگار ہے جس نے اِن سب کو پیدا کیا ہے اور میں اسی بات کا قائل ہوں۔"

باپ کو دعوتِ توحید

سیدنا ابراہیم علیہ السّلام نے اپنے ارد گرد جب یہ ماحول دیکھا کہ قوم پوری کی پوری بُت پرستی ستارہ پرستی اور مظاہر پرستی میں اسقدر منہمک ہے کہ اللہ واحد و برتر کی قدرت مطلقہ اور اُس کی برتری کا کوئی تصور بھی قوم کے قلوب میں باقی نہ رہا تو کمر ہمت چست کی اور ذاتِ واحد کے بھروسہ پر اُن کے سامنے توحید کا پیغام رکھ دینے اور اعلان کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

سب سے پہلے اپنے گھر پر نظر ڈالی۔ خود اُن کا اپنا گھر شرک کا سب سے بڑا مرکز نظر آیا۔ باپ آزر کی بُت سازی پوری قوم کے لئے مرجع و محور بنی ہوئی ہے۔ فطرت نے آواز دی کہ دعوتِ حق کی ابتدا اپنے گھر ہی سے ہونی چاہیئے۔ اس لئے سیدنا ابراہیم علیہ السّلام نے سب سے پہلے اپنے والد آزر ہی کو مخاطب کیا اور فرمایا:

"اے باپ خدا پرستی کے لئے جو طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے اور جسکو آباؤ اجداد کا قدیم طریقہ کہا جاتا ہے۔ یہ صریح گمراہی اور باطل پرستی ہے۔ صراطِ مستقیم وہی ہے جسکی میں دعوت دے رہا ہوں۔ اِن بے جان مورتیوں میں جنکی حیثیت کھلونوں سے کم نہیں عبادت و پرستش کے لائق کوئی بات نہیں، نہ یہ دیکھ سکتے ہیں نہ سُن سکتے ہیں اور نہ کسی کے کام آتے ہیں۔ بھلا ایسے بے جان و بے حرکت خدا یا شریک خدا کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ اے باپ مجھکو علم کی روشنی مل چکی ہے اس روشنی میں آپ چلکر دیکھئے آپکو حق و باطل صاف نظر آئے گا۔ شیطان نے آپکی راہ ماری ہے اور آپکو غلط راہ پر گامزن

کر دیا ہے۔ مجھے سخت اندیشہ ہے کہ کہیں شیطان کی طرح آپ بھی خدا کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔"

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اس مخلصانہ پند و نصیحت کا باپ پر کوئی اثر نہ ہوا قبولِ حق کے بجائے آزر نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو دھمکانا شروع کر دیا کہنے لگا ابراہیمؑ اگر تو بتوں کی بُرائی سے باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ معاملہ حد سے آگے بڑھ گیا ہے اور ایک جانب اگر باپ کے احترام کا مسئلہ ہے تو دوسری جانب ادائے فرض، اور امرِ الٰہی کا سوال تو انھوں نے سوچا اور آخر وہی کیا جو ایسے برگزیدہ انسان اور اللہ کے جلیل القدر پیغمبر کے شایانِ شان تھا۔ باپ کی سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا بلکہ نرمی، حکمت اور اخلاق کریمانہ کے ساتھ یہ جواب دیا:۔

"اُے باپ اگر میری بات کا یہ ہی جواب ہے تو آج میرا آخری سلام عرض ہے۔ میں اللہ تعالےٰ کے سچے دین اور اُسکے پیغام کو نہیں چھوڑ سکتا اور کسی حال بھی بتوں کی پرستش نہیں کر سکتا۔ میں آج تجھ سے جُدا ہوتا ہوں، مگر غائبانہ آپ کے لئے درگاہِ الٰہی میں بخشش کی دُعا کرتا رہوں گا تاکہ آپ کو ہدایت نصیب ہو۔"

سورۂ مریم میں اس گفتگو کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ ۚ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا الآیۃ (مریم آیت ۴۱ تا ۴۸)

قرآنی مضمون

اُور اے نبیؐ اس کتاب میں ابراہیمؑ کا ذکر کرو یقیناً وہ مجسم سچائی اللہ کے نبی تھے۔ اُس وقت کا ذکر کرو جب اُنھوں نے اپنے باپ (آزر) سے کہا! ابا جان آپ کیوں ایسی چیز کی پوجا کرتے ہو جو نہ سنتی ہے نہ دیکھتی ہے اور نہ آپ کے کچھ کام آسکتی ہے۔

ابا جان علم کی ایک روشنی مجھے مل گئی ہے جو آپ کو نہیں حاصل ہے۔ لہذا آپ میرے پیچھے چلئے آپکو سیدھی راہ دکھا دوں گا۔

ابا جان شیطان کی بندگی نہ کیجئے شیطان تو خدائے رحمٰن کا نافرمان ہو چکا ہے۔

ابا جان میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ خدائے رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب آپ کو گھیر لے اور شیطان آپ کا ساتھی ہو جائے۔

باپ نے (یہ باتیں سُنکر) کہا ابراہیم! کیا تو میرے معبود سے پھر گیا ہے؟ یاد رکھ اگر تو ایسی باتوں سے باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر دوں گا اور (اگر اپنی خیر چاہتا ہے تو اپنی جان سلامت لے کر) مجھ سے ہمیشہ کے لئے الگ ہو جا! ابراہیمؑ نے کہا اچھا میرا سلام۔ اب میں اپنے رب سے آپکی بخشش کی دُعا کرتا رہوں گا وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں نے تم سب کو چھوڑا اور اُنھیں بھی جنھیں تم اللہ کے سوا پُکارا کرتے ہو۔ میں اپنے رب کو پکارتا ہوں، اُمید کہ اپنے پروردگار کو پُکار کر میں محروم ثابت نہ ہوں گا۔

قوم کو دعوتِ توحید

باپ اور بیٹے میں جب اتفاق کی صورت نہ بنی اور آزر نے کسی طرح بھی سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی رشد و ہدایت کو قبول نہ کیا تو سیّدنا ابراہیم علیہ السّلام نے باپ آزر سے جدائی اختیار کر لی اور اپنی دعوتِ توحید اور پیغامِ رسالت کو مزید وسیع تر کر دیا۔ اب صرف باپ اور اہل خاندان ہی مخاطب نہ رہے بلکہ پوری قوم کو مخاطب بنا لیا مگر قوم اپنے باپ دادا کے طریقے کو کب چھوڑنے والی تھی اُس نے سیدنا ابراہیم علیہ السّلام کی ایک نہ سُنی اور توحید کی اس دعوت کے سامنے اپنے باطل معبودوں کی طرح گونگے، اندھے، بہرے بن گئے۔ اُن کے کان موجود تھے مگر توحید کی آواز کے لئے بہرے تھے۔ آنکھوں میں بینائی ضرور تھی لیکن حق کی بصارت سے محروم، زبان میں گویائی کی طاقت تھی لیکن اقرارِ توحید کے لئے گُنگ تھی۔ ایک موقع پر سورۂ اعراف میں اسی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے:-

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ

لَّا یبصرون بھا الخ

"اُن کے دل ہیں پَر سمجھتے نہیں، اُن کی آنکھیں ہیں پَر دیکھتے نہیں اور اُن کے کان ہیں پَر اُن سے سُنتے نہیں، یہ لوگ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ بے راہ ہیں، یہی ہیں جو غفلت میں سرشار ہیں۔ (الاعراف آیت ۱۷۹)

جب سیدنا ابراہیم علیہ السّلام نے زور دے کر پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو یہ تم کو کسی بھی قسم کا نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟

تو کہنے لگے کہ ان باتوں کے جھگڑے میں ہم پڑنا نہیں چاہتے۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا یہی کرتے چلے آئے ہیں۔ لہذا ہم بھی وہی کریں گے۔ تب سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ایک خاص اندازِ خطاب اختیار فرما کر سوال کیا اچھا تو میں تمہارے اُن سب بتوں کو اپنا دشمن جانتا ہوں اور اُن سے اعلانِ جنگ کرتا ہوں۔ اگر یہ میرا کچھ بگاڑ سکتے ہیں تو اپنی حسرت نکالیں، میں اپنے خالق و مالک پر اعتماد کرلیتا ہوں۔

یہ ایک ایسا چیلنج تھا جو قوم کو غور کرنے کے لئے کافی تھا۔ مگر آزر اور قوم نے طے کرلیا تھا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السّلام کی کوئی بات سُنی نہ جائیگی۔ اس طرح اُن کا انکار بڑھتا ہی رہا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السّلام کی نصیحت و موعظت کے اس مؤثر انداز کو سورۂ شعراء میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:-

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرَاهِيْمَ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ۔ الخ (الشعراء آیات ۶۹ تا ۱۰۲)

قرآنی مضمون "اور (اے نبیؐ) سنا دیجئے اُن کو ابراہیمؑ کی خبر جب کہا انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کو تم کس کو پُوجتے ہو؟ وہ بولے ہم پوجتے ہیں مورتیوں کو پھر (سارے دن) انہی کے پاس لگے بیٹھے رہتے ہیں۔ ابراہیم نے کہا کیا وہ سنتے ہیں جب تم پُکارتے ہو؟ یا کچھ

بھلا کرتے ہیں تمہارا یا کچھ بُرا؟ بولے نہیں، پر ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو یہی کام کرتے تھے۔ ابراہیمؑ نے کہا بھلا دیکھتے ہو جن کو پوجتے رہے ہو تم اور تمہارے باپ دادا اگلے زمانے کے سو وہ سارے بُت میرے دشمن ہیں مگر رب العالمین جس نے مجھکو پیدا کیا سو وہی مجھکو راہ دکھاتا ہے، اور وہ جو مجھکو کھلاتا ہے پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی شفا دیتا ہے اور وہ جو مجھکو موت دے گا اور پھر مجھے زندہ کرے گا۔ اور جس سے مجھکو اُمید ہے کہ میرے قصور کو معاف کر دے گا انصاف والے دن۔ اے میرے رب مجھکو حکمت عطا فرما اور مجھکو نیکوں میں شامل کر دے۔ اور بعد کے آنے والوں میں مجھکو سچی ناموری عطا کر، اور مجھکو جنت نعیم کے وارثوں میں شامل فرما اور میرے باپ کو معاف کر دے کہ بیشک وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے اور مجھکو اُس دن رُسوا نہ فرما جبکہ لوگ سب زندہ کر کے اُٹھائے جائینگے جبکہ نہ کوئی مال فائدہ دے گا نہ اولاد، بجز اسکے کہ کوئی شخص قلب سلیم لئے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو جائے۔ اُس روز جنت پرہیزگاروں کے قریب لے آئی جائیگی۔ اور دوزخ بہکے ہوئے لوگوں کے سامنے کھول دی جائے گی۔ اور اُن سے پوچھا جائے گا اب کہاں ہیں وہ جنکی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے؟ کیا وہ تمہاری کچھ مدد کرینگے یا خود اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں؟

پھر وہ معبود اور یہ بہکے ہوئے لوگ اور ابلیس کے لشکر سب کے سب اُس جہنم میں اُوپر تلے دھکیل دیئے جائیں گے، وہاں یہ سب آپس میں جھگڑیں گے اور یہ بہکے ہوئے لوگ (اپنے معبودوں سے) کہیں گے۔ اللہ کی قسم ہم تو صریح گمراہی میں تھے جبکہ تم کو رب العالمین کی برابری کا درجہ دے رہے تھے۔ اور وہ مجرم لوگ ہی تھے جنھوں نے ہم کو اس گمراہی میں ڈالا۔ اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے اور نہ کوئی جگری دوست۔

اے کاش! ہمیں ایک دفعہ پھر پلٹنے کا موقع مل جائے تو ہم مومن ہوں۔"

ستارہ پرستی یا خدا پرستی

بت پرست قوموں کے عقیدوں میں کچھ ٹھہراؤ نہیں ہوتا وہ ہر اُس چیز سے خائف ہو جاتے ہیں جس کے ذریعہ نفع یا نقصان ہو جاتا ہو۔ یہ ہی وجہ ہے کہ بہت سی قوموں کے معبود جنگل کے درندے اور پانی کے جانور تک پائے جاتے ہیں۔ قوم ابراہیم میں جہاں بُت پرستی تھی وہاں ستارہ پرستی بھی موجود تھی۔ اِن کا عقیدہ تھا کہ انسانوں کی موت وحیات، اِن کا رزق، نفع ونقصان، خشک سالی، فتح وشکست، غرض کارخانۂ عالم کا نظم ونسق ستاروں اور انکی حرکات کی تاثیر پر چل رہا ہے۔ اس لئے اِن ستاروں کی خوشنودی ضروری ہے۔ اور یہ اُنکی پرستش کے بغیر ممکن نہیں۔

یہ خام خیالی اور باطل عقیدہ ایسا نہیں تھا کہ قوم اسکو اپنے دلوں سے نکال دے۔ وہ اپنے خود ساختہ بتوں سے خود اتنے خائف تھے کہ اُن کو بُرا کہنے والے کے لئے ہر آن یہ تصور کرتے تھے کہ وہ اُن کے غضب میں آکر تباہ و برباد ہو جائے گا تو ایسے اوہام پرستوں کے دلوں میں بلند ستاروں کی پرستش کے خلاف جذبہ پیدا کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس ستارہ پرستی کے خلاف بھی اپنی جدوجہد جاری رکھی اور قوم کے دماغوں کے مطابق ایک عجیب و دلچسپ پیرایۂ بیان اختیار فرمایا۔ تاروں بھری رات میں ایک ستارہ خوب روشن تھا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:۔

"یہ میرا رب ہے۔"

لیکن جب وہ اپنے مقررہ وقت پر نظروں سے اُوجھل ہو گیا تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:۔

"میں چھُپ جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

کچھ دیر کے بعد چاند آب وتاب کے ساتھ نمودار ہوا دیکھ کر فرمایا:۔

"یہ میرا رب ہے۔"

جب سحر کا وقت ہونے لگا تو چاند بھی ماند پڑنے لگا اور جس قدر طلوع آفتاب کا وقت قریب ہوتا گیا چاند کا جسم دیکھنے والوں کی آنکھوں سے اوجھل ہونے لگا تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ایک ایسا جملہ فرمایا جس سے چاند کے رب ہونے کی نفی کے ساتھ ساتھ اللہ واحد کی ہستی کی جانب قوم کی توجہ ہو جائے۔ فرمایا:۔

"اگر میرا حقیقی پروردگار میری رہنمائی نہ کرتا تو میں بھی ضرور گمراہ قوم ہی میں سے ایک ہوتا۔"

صرف یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ تاروں بھری رات کا یہ قصہ ختم ہوا دن نکلا تو آفتاب عالمتاب ظاہر ہوا اور پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنے لگا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اُسپر ایک نظر ڈال کر فرمایا:۔

"یہ ہے میرا رب اور یہ سب سے بڑا ہے۔"

پھر دن بھر چمکنے دمکنے کے بعد سورج بھی روپوش ہونے لگا اور آہستہ آہستہ نظروں سے غائب ہو گیا تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی برأت کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کا بھی اظہار کر دیا کہ طلوع و غروب ہونے والے بھلا اللہ کیوں کر ہو سکتے ہیں؟

"اے قوم میں ان مشرکانہ عقائد سے بری ہوں اور شرک کی زندگی سے بیزار، بلاشبہ میں نے اپنا رُخ صرف اُسی ایک ذات کی جانب کر لیا ہے جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔ میں حنیف ہوں مشرک نہیں۔"

اس کا اعلان کرنا ہی تھا کہ قوم کا غیض و غضب سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر اُبل پڑا، اب باضابطہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑنے لگے اور طرح طرح کی دھمکیاں دینے لگے اور اپنے معبودوں کے قہر و غضب سے ڈرانے لگے کہ عنقریب وہ تیری توہین کا تجھ سے ضرور انتقام لیں گے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بے خوفی کے ساتھ کہا کہ تم مجھے اپنے بتوں سے کیا ڈراتے ہو؟ حالانکہ اللہ نے مجھے صحیح راہ دکھائی ہے۔ مجھے تمہارے بتوں کی کچھ پرواہ نہیں۔ تمہارے بُت کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ میں خدائے واحد کا ماننے والا ہوں جسکے دستِ قدرت میں زمین

وآسمان کی طاقت ہے۔ وہی میرا رب ہے اُسی پر میرا اعتماد ہے۔
اللہ تعالےٰ کی یہ وہ عظیم الشان حُجت تھی جو اُس نے سیدنا ابراہیم علیہ السّلام کی زبان سے بُت پرستی کے خلاف ہدایت وتبلیغ کے بعد ستارہ پرستی کے رَد میں ظاہر فرمائی۔
سورۂ انعام کی آیات اس سلسلہ میں قابلِ غور ہیں :۔
وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً الخ
(انعام آیات ۷۵ تا ۸۴)

قرآنی مضمون "اور ابراہیم کا واقعہ یاد کرو جبکہ اُنھوں نے اپنے باپ آزر سے کہا، کیا تم بتوں کو خدا بناتے ہو؟ بیشک میں تو تمھیں اور تمہاری قوم کو کھُلی گمراہی میں دیکھتا ہوں۔ ابراہیم کو ہم نے اسی طرح نظامِ سلطنت دکھائے تھے اور اس لئے دکھائے تھے تاکہ وہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔ چنانچہ جب ایک رات اُن پر طاری ہوئی تو اُنھوں نے ایک تارہ دیکھا۔ کہا یہ میرا رب ہے! مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولے ڈوبنے والوں کا میں گرویدہ نہیں ہوں۔ پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ ہے میرا رب! مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا کہ اگر میرے ربّ نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہوگیا ہوتا۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا ربّ، یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیمؑ پکار اُٹھے، اے برادرانِ قوم! میں اُن سب سے بیزار ہوں جنھیں تم اللہ تعالےٰ کا شریک ٹھیراتے ہو میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رُخ اُس ہستی کی طرف کرلیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔
اُن کی قوم اُن سے جھگڑنے لگی تو کہا کیا تم لوگ اللہ کے

معاملے میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اُس نے مجھکو سیدھی راہ دکھادی ہے
اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا۔ البتہ میرا
رب جو کچھ چاہے تو وہ ضرور ہوسکتا ہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر
چھایا ہوا ہے۔ کیا تم پھر بھی خیال نہیں کرتے۔

اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے
ڈروں جبکہ تم اللہ کے ساتھ اُن چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے
ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لئے اُس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی
ہے؟ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی واطمینان کا مستحق
ہے؟ بتاؤ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو؟

حقیقت میں امن تو اُنہی کے لئے ہے اور راستی پر وہی ہیں
جو ایمان لائے اور جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) کیساتھ آلودہ
نہیں کیا اور دیکھو یہ ہماری حجت ہے جو ہم نے ابراہیمؑ کو اُس کی قوم
پر دی تھی، جسکے ہم مرتبے بلند کرنا چاہتے ہیں اسکو علم و دلیل کا بُرہان
دیکر بلند کر دیتے ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار حکمت والا علم رکھنے
والا ہے۔

بُتوں کی بے بسی

سیدنا ابراہیم علیہ السلام جنکو اللہ تعالیٰ نے ابتدار ہی سے رُشد و ہدایت کی راہ بتلادی تھی۔ اپنے منصب کا بنیادی مقصد "توحید خالص" کو پیش کرنا تھا جبکی زد میں بُت پرستی اور کواکب پرستی آتی تھی بڑا نازک کام تھا اس وجہ سے بھی کہ یہ قوم کا "سرکاری مذہب" بھی تھا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے افہام و تفہیم کا جو طریقہ اختیار فرمایا تھا اُسکی بنیاد صرف عقلی دلائل یا براہین پر نہ تھی بلکہ حقیقت کو فطری دلائل کی سادگی کے ساتھ واضح کرنا تھا۔ اس لئے کبھی کبھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام فطری اور مشاہداتی طریقوں سے قوم کو توحید کی طرف متوجہ کرنے کا طرز اختیار فرمایا کرتے تھے۔ گزشتہ تذکرے میں اِسی مشاہداتی طریقے سے قوم کو کواکب پرستی سے بیزار کروایا کہ ستارے خواہ شمس و قمر

ہی کیوں نہ ہوں ربّ کہلانے کے قابل نہیں جو ڈوبتا ہو زوال پذیر ہو وہ کس طرح اللہ کہلانے کا مستحق ہے؟

اب یہاں بتوں کی بے بسی اور بے چارگی کا آنکھوں دیکھا منظر قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

قوم نے جب دلائل و براہین کے بعد بھی دعوتِ اسلام قبول نہ کی اور اصنام پرستی اور کواکب پرستی میں اُسی طرح مبتلا رہی تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ایک دن اپنی قوم کے بعض افراد سے یہ کہہ دیا کہ میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک خفیہ تدبیر کروں گا۔ چونکہ بات کچھ صاف و واضح نہ تھی اس لئے قوم نے اس جانب کچھ توجہ نہ کی۔ حُسنِ اتفاق کہ قریب ہی زمانہ میں قوم کا ایک مذہبی میلہ پیش آگیا۔ جب سب اُس کے لئے چلنے لگے تو کچھ لوگوں نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے بھی اصرار کیا کہ وہ بھی ساتھ چلیں، سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اوّل تو انکار فرمایا پھر جب اُس جانب سے اصرار بڑھنے لگا تو ستاروں کی جانب نگاہ کی۔ یہ ایسے ہی تھا جیسا کہ کسی شدید تردد کے وقت آدمی کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے فطری طور پر ایک نگاہ آسمان کی طرف اُٹھا لیتا ہے۔ اس طرح اُس کا یہ دیکھنا کسی خاص مقصد کے تحت نہیں ہوتا۔ اسکے بعد معاً سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میں کچھ بیمار سا ہوں۔ چونکہ قوم کواکب پرستی میں مبتلا تھی اس لئے وہ یہ سمجھے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کسی ستارے کے اثرِ بد میں مبتلا ہیں۔ یہ سوچ کر بغیر کسی اصرار کے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو چھوڑ کر میلے میں چلے گئے۔

اب جبکہ ساری قوم، بادشاہ، کاہن اور مذہبی پیشوا میلے میں مصروف اور شراب و کباب میں مشغول تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ وقت آگیا ہے کہ اپنے نظامِ عمل کی تکمیل کروں اور عملی طور پر قوم پر یہ واضح کر دوں کہ ان دیوتاؤں کی حقیقت کیا ہے؟ موقع پاکر جب کہ پجاری اور مجاور موجود نہ تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام اُن کے مرکزی بُت خانے میں گھس گئے دیکھا تو وہاں دیوتاؤں کے سامنے قسم قسم کے حلووں، پھلوں، میوؤں اور مٹھائیوں کے چڑھاوے رکھے تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے طنزیہ لہجہ میں چپکے چپکے ان مورتیوں سے خطاب کر کے کہا کہ یہ سب کچھ موجود ہے

اِن کو کھاتے کیوں نہیں ؟ پھر کہنے لگے میں بات کر رہا ہوں تم جواب کیوں نہیں دیتے ؟ اسکے بعد اُن سب کو توڑ پھوڑ ڈالا اور سب سے بڑے بُت کے کاندھے پر تبر رکھ کر واپس لوٹ گئے ۔

جب لوگ میلے سے واپس آئے تو مندر میں بتوں کا یہ حال پایا، سخت برہم ہوئے اور ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگے کہ یہ کیا ہوا؟ کس نے کیا ؟ اِن میں وہ لوگ بھی تھے جنکے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کبھی کبھی بتوں کے ساتھ اپنی خُفیہ تدبیر کا تذکرہ کر دیا کرتے تھے ۔ اُنھوں نے فوراً کہا کہ یہ اُس شخص کا کام ہے جس کا نام "ابراہیم" ہے ۔ وہی ہمارے دیوتاؤں کا دشمن بھی ہے ۔ کاہنوں اور سرداروں نے جب یہ سُنا تو غم و غصّہ سے سُرخ ہوگئے اور کہنے لگے اُسکو مجمع کے سامنے پکڑ لاؤ تاکہ سب دیکھیں مجرم کون ہے ؟

یہ گویا حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی منہ مانگی مراد تھی ۔ کیونکہ وہ بھی یہ ہی چاہتے تھے کہ بات صرف پجاریوں، مجاوروں ہی کے سامنے نہ ہو بلکہ عام لوگ بھی موجود ہوں اور سب دیکھ لیں کہ یہ بُت جو اُن کے قاضی الحاجات بنا کر رکھے گئے ہیں کتنے بےبس ہیں اور خود یہ پجاری حضرات اِن کو کیا سمجھتے ہوں گے ۔ اس طرح اِن پجاریوں سے بھی وہی حماقت سرزد ہوئی جو فرعون سے سرزد ہوئی تھی اُس نے بھی جادوگروں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرانے کے لئے ملک بھر کی خلقت جمع کی تھی ۔

اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو سب کے سامنے یہ ثابت کرنے کا موقعہ مل گیا کہ وہ جو کچھ لائے ہیں جادو نہیں ہے بلکہ معجزہ ہے ۔ اور یہاں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو اُن کے دشمنوں نے آپ ہی آپ یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ عوام کے سامنے اُن کے مکر و فریب کا طلسم توڑ دیں ۔ الغرض جب حضرت ابراہیم علیہ السّلام سامنے لائے گئے تو بڑے رُعب داب سے اُن لوگوں نے پوچھا :-

"کیوں ابراہیمؑ تونے ہمارے دیوتاؤں کے ساتھ یہ سب کچھ کیا ہے" ؟

حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے دیکھا کہ اب وہ موقعہ آگیا ہے جس کے لئے میں نے یہ تدبیر اختیار کی تھی مجمع موجود ہے عوام دیکھ رہے ہیں کہ ان کے دیوتاؤں کا کیا حشر

ہوا ہے۔ اس لئے اب کاہنوں اور مذہبی پیشواؤں کو عوام کی موجودگی میں اُن کے باطل عقیدے پر نادم کر دینے کا وقت ہے تاکہ عوام کو آنکھوں دیکھتے معلوم ہو جائے کہ آج تک ان دیوتاؤں سے متعلق جو کچھ ہم سے یہ پجاری اور مجاوروں کی جماعت کہا کرتی تھی سب مکر و فریب ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے نہایت متانت سے جواب دیا:-

"بلکہ یہ سب کچھ اِن کے اِس بڑے سردار نے کیا ہے انہی سے

پُوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں"؟

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے اس جُملہ کا مطلب (اِن کے اس سردار نے کیا ہے) کا اشارہ بڑے بُت کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور خود حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی طرف بھی۔

اگر پہلی بات ہو تو یہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی طرف سے اُن کے عقائد پر ایک طنز کا ہم معنی ہے۔ یعنی اگر اِن کے نزدیک واقعی یہ خُدا ہیں تو اِنھیں اپنے بڑے خدا کے متعلق یہ شُبہ ہونا چاہیئے کہ شاید بڑے حضرت اِن چھوٹے حضرتوں سے کسی بات پر بگڑ گئے ہوں اور سب کا کچومر بنا ڈالا ہو۔ اور اگر دوسرا مفہوم مراد لیا جائے تو حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا یہ منشا اس کارروائی سے یہ تھا کہ اپنے بتوں کا یہ حال دیکھ کر شاید اِن لوگوں کا ذہن میری ہی طرف منتقل ہو جائے گا اور یہ مجھ سے پوچھیں گے تو مجھ کو پھر ان سے صاف صاف بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔ گویا یہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی منہ مانگی مراد تھی۔

الغرض حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی اس یقینی حجّت اور دلیل کا اِن کاہنوں اور مجاوروں کے پاس کیا جواب ہو سکتا تھا وہ ندامت میں ڈوب گئے اور اُن پر ایک سکتہ چھا گیا۔ سوچنے لگے کہ اِسکا کیا جواب دیں؟

آخر کار اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور (اپنے دلوں میں) کہنے لگے واقعی تم خود ہی ظالم ہو۔ بعد ازاں اپنے سروں کو نیچے جھکا کر کہنے لگے اے ابراہیم تو خوب جانتا ہے کہ یہ بولنے والے نہیں ہیں۔

اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اپنے اُس مقصد کو پورا کر لیا جسکے لئے

اُنھوں نے قوم کے مرکزی بُت خانے میں اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔

علاوہ ازیں بُت شکنی کے اس فعل کو بڑے بُت کی طرف منسوب کرنا اس کا مقصد جھوٹ بولنا نہ تھا بلکہ اپنے مخالفین پر حجت قائم کرنا تھا تاکہ یہ لوگ خود اپنی زبان سے اقرار کرلیں کہ ان کے معبود بالکل بے بس ہیں جو اپنے ذاتی نقصان تک کو دور نہیں کرسکتے تو پھر دوسروں کے نفع و نقصان کے مالک کیونکر ہو سکتے ہیں۔

اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حجت و دلیل کامیاب ثابت ہوئی اور قوم نے اعتراف کرلیا کہ ظالم ہم ہی ہیں اور اِن کو زبان سے اقرار کرنا پڑا کہ ہمارے یہ دیوتا جواب دینے یا بولنے کی قطعاً طاقت نہیں رکھتے چہ جائیکہ نفع و نقصان کے مالک ہوں؟ اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کی بے کسی اور بے بسی کو قوم کے سامنے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ مشاہدہ کروایا اور قوم نے سر جھکا کر اسکو تسلیم بھی کرلیا۔ قرآن حکیم نے اس تفصیل کو اس طرح بیان کیا ہے:-

وَلَقَدْ آتَيْنَآ إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِن قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ

عٰلِمِينَ - (انبیاء آیات ۵۱ تا ۶۸)

قرآنی مضمون

اور ہم نے (زمانۂ موسوئی) سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کو اُن کی (شان کے مناسب) خوش فہمی عطا کی تھی اور ہم اُن کے کمالات کو خوب جانتے تھے۔

جب کہا اُنھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہ یہ مورتیں کیسی ہیں جنکی عبادت پر تم لوگ جمے بیٹھے ہو؟ اُنھوں نے جواب دیا ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے کہا کیا تو ہمارے لئے کوئی سچی بات لایا ہے یا مذاق کرنے والوں میں سے ہے تو؟ ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا نہیں بلکہ فی الواقع تمہارا رب وہی ہے جو زمین اور آسمان کا رب ہے اور ان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس پر میں تمہارے سامنے گواہی

دیتا ہوں۔ اور اللہ کی قسم میں تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے بتوں کی ضرور خبر لوں گا؛ چنانچہ اُنھوں نے اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور صرف اُن کے بڑے کو چھوڑ دیا تاکہ شاید وہ اِسکی طرف رجوع کریں۔ (جب آکر اُنھوں نے اپنے خداؤں کا یہ حال دیکھا تو) کہنے لگے، ہمارے خداؤں کا یہ حال کس نے کر دیا؟ بڑا ہی ظالم ہے وہ شخص، (بعض لوگ) بولے ہم نے ایک نوجوان کو اِن کا ذکر کرتے سُنا تھا جس کا نام ابراہیم ہے (علیہ السلام) اُنھوں نے کہا تو پکڑ لاؤ اُسے سب کے سامنے تاکہ لوگ دیکھ لیں (اُسکی کیسی خبر لی جائیگی) (ابراہیم علیہ السلام کے آنے پر) اُن لوگوں نے پوچھا کیوں ابراہیمؑ تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا بلکہ یہ سب کچھ اُن کے اِس سردار نے کیا ہے؟ اِن ہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں؟ یہ سُنکر وہ لوگ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور (اپنے دلوں میں) کہنے لگے واقعی تم خود ظالم ہو۔ پھر اپنے سروں کو نیچے جھکا کر کہنے لگے (اے ابراہیم علیہ السلام) تم خوب جانتے ہو کہ یہ بولنے والی نہیں ہیں۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا پھر کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اُن چیزوں کو پوج رہے ہو جو نہ تمہیں نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ نقصان۔ تُف ہے تم پر اور تمہارے اِن معبودوں پر جنکی تم اللہ کو چھوڑ کر پُوجا کر رہے ہو۔ کیا تم کچھ بھی عقل نہیں رکھتے؟

لوگوں نے کہا کہ جلا ڈالو ابراہیم (علیہ السلام) کو اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی اگر تمہیں کچھ کرنا ہے۔"

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ۔ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ۔ الخ (الصافات آیات ۸۳ تا ۹۸)

اور نوحؑ کے طریقے پر چلنے والوں میں سے ابراہیم (علیہ السلام) بھی تھے۔ جبکہ وہ اپنے رب کی طرف صاف دل سے متوجہ ہوئے جبکہ اُنھوں نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا، تم کس چیز کی عبادت

کرتے ہو۔ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ موٹ کے معبودوں کو چاہتے ہو؟ آخر اللہ رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟

پھر ابراہیم (علیہ السلام) نے ستاروں کو ایک نگاہ بھر کر دیکھا اور کہہ دیا کہ میں بیمار ہوں۔ غرض وہ لوگ ان کو چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر یہ اُن بتوں (کے گھر) جا گھسے (اور بتوں سے) کہنے لگے آپ حضرات کھاتے کیوں نہیں؟ کیا ہوگیا بولتے بھی نہیں ہو؟ اسکے بعد وہ ان پر پل پڑے اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں۔ سو وہ لوگ ابراہیم علیہ السلام کے پاس دوڑتے ہوئے آئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کیا تم اُن چیزوں کو پوجتے ہو جنکو خود تراشتے ہو؟ حالانکہ تم کو اور تمہاری اِن بنائی ہوئی چیزوں کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔ اُنھوں نے (آپس میں) کہا کہ ابراہیم علیہ السلام کیلئے ایک آتش خانہ تیار کرو اور اسکو دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دو۔

اُنھوں نے ابراہیم علیہ السلام کے خلاف ایک کارروائی کرنا چاہی تھی مگر ہم نے اُنہی کو نیچا دکھا دیا۔

بادشاہِ وقت کو دعوتِ توحید

ابھی یہ مشورے ہو ہی رہے تھے کہ شُدہ شُدہ بادشاہِ وقت نمرود تک یہ باتیں پہنچ گئیں۔ اُس زمانے میں عراق کے بادشاہ کا لقب نمرود ہوا کرتا تھا اور یہ رعایا کے صرف بادشاہ ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ خود کو اُن کا رب اور مالک بھی سمجھتے تھے اور رعایا بھی دوسرے دیوتاؤں کی طرح اسکو اپنا خدا اور معبود مانتی تھی اور اس کی بھی اس طرح پرستش کرتی تھی جسطرح دیوتاؤں کی بلکہ اس سے بھی زیادہ پاس وادب کے ساتھ پیش آتی تھی، اس لئے کہ وہ صاحب عقل وہوش ہوتا تھا اور مالکِ تخت وتاج بھی۔

نمرود کو جب معلوم ہوا تو آپے سے باہر ہوگیا اور سوچنے لگا کہ اگر اس شخص کی دعوت وتبلیغ کی سرگرمیاں اس طرح جاری رہیں تو یہ میری ملوکیت اور الوہیت سے بھی رعایا کو برگشتہ کردیگا اور اس طرح باپ دادا کے مذہب کے ساتھ ساتھ یہ سلطنت

بھی زوال میں آجائیگی۔ اس لئے اس کا قصہ ہی تمام کر دینا چاہیئے۔ یہ سوچ کر اُس نے حکم دیا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کو ہمارے دربار میں پیش کیا جائے۔ حضرت ابراہیمؑ نمرود ظالم کے دربار میں حاضر کئے گئے تو نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ تو باپ دادا کے دین کی مخالفت کس لئے کرتا ہے اور مجھکو رب ماننے سے کیوں انکار کرتا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میں خدائے واحد کا بندہ ہوں اس کے علاوہ کسی کو اُسکا شریک نہیں مانتا، ساری کائنات اور تمام عالم اُسی کی مخلوق ہے اور وہی اُن سب کا خالق و مالک ہے، تو بھی اُسی طرح ایک انسان ہے جس طرح ہم سب انسان ہیں۔ پھر تو کس طرح ربّ یا خُدا ہو سکتا ہے؟ اور کس طرح یہ گونگے بہرے لکڑی کے بُت خدا ہو سکتے ہیں؟

نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے دریافت کیا کہ اگر میرے علاوہ تیرا کوئی خدا ہو سکتا ہے تو اُس کا ایسا وصف بیان کر جسکی قدرت مجھ میں نہ ہو۔ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میرا ربّ وہ ہے جس کے قبضے میں موت وحیات ہے۔ وہی موت دیتا ہے اور وہی زندگی بخشتا ہے۔

کج فہم نمرود موت وحیات کی حقیقت سے ناآشنا کہنے لگا اس طرح تو موت وحیات میرے قبضہ وقدرت میں بھی موجود ہے۔ یہ کہکر اُسی وقت ایک بے قصور آدمی کے بارے میں جلاّد کو حکم دیا کہ اسکی گردن ماردی جائے۔ جلاّد نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اور ایک قتل کے سزا یافتہ مجرم کو جیل سے بُلا کر حکم دیا کہ جاؤ ہم نے تمہاری جان بخشدی۔

اسکے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب متوجہ ہو کر کہنے لگا دیکھا میں کسطرح موت وحیات کا مالک ہوں؟۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو محسوس ہوا یا تو یہ بدفہم ہے یا رعایا کو دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ موت وحیات کے معنی ہی نہ سمجھ سکا۔ اس کے ہاں علم تو کجا عقل تک نہیں ہے۔ لہٰذا عقلی دلیل اسکے لئے مفید نہیں ہے کوئی مشاہداتی بات ہی اسکو فائدہ دے سکتی ہے اس لئے دوسرا عنوان اختیار فرمایا اور ایسی دلیل پیش کی جسکا صبح وشام ہر شخص آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے اور شب وروز کی زندگی میں اس سے سابقہ پڑتا رہتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میں اُس ہستی کو اللہ کہتا ہوں جو روزانہ صبح سورج کو مشرق

لاتا ہے اور مغرب کی جانب لے جاتا ہے۔ پس اگر تو بھی خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تو اسکے خلاف سورج کو مغرب سے نکال اور مشرق میں چھپا؟ یہ سُنکر نمرود مبہوت اور لاجواب ہوگیا۔ اسطرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حُجت پوری ہوگئی۔ کیونکہ نمرود کو اِسکا جواب دینے کے لئے تین ہی صورتیں تھیں:۔

اوّل یہ کہ وہ کہہ سکتا تھا کہ ہاں مغرب سے سورج نکالنے کی مجھے قدرت ہے۔

دوم یہ کہ آفتاب پر میری قدرت نہیں ہے۔

سوم یہ کہ اُسی وقت مغرب سے سورج نکال کر دکھا دیتا۔ لیکن یہ ساری صورتیں ایسی تھیں جسکا وہ خود قائل نہ تھا۔ اس لئے اپنے آپ کو خاموش رکھنا ہی مناسب سمجھا۔

بعض غیر مسلموں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دلیل پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر نمرود یہ کہہ بیٹھتا کہ ابراہیمؑ تو ہی اپنے خُدا سے یہ کام کر دکھا؟ تو ابراہیم (علیہ السّلام) کے پاس اس کا کیا جواب ہوتا؟

لیکن یہ اعتراض ہی نہایت کمزور اور سطحی ہے۔ دراصل یہ اعتراض مدعی سُست اور گواہ چُست والوں کا ہے۔ نمرود جانتا تھا کہ جس قوت و اعتماد سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ حُجت پیش کی ہے اُس کا تقاضہ یہی تھا کہ اگر وہ ایسا کہہ دیتا تو ابراہیم علیہ السلام اسکو پورا بھی کر دکھاتے۔ کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بیشمار تائیدات دیکھ چکا تھا۔ اس لئے ایسی ہمت نہ کرسکا۔ علاوہ ازیں اُسکو خود اپنی عاجزی اور بیچارگی کا شدید احساس بھی تھا۔ لہٰذا اس اعتراض کا موقعہ ہی نہ تھا۔ خاموشی میں ہی اپنی نجات سمجھا۔

قرآن حکیم کے سورۂ بقرہ میں اس گفتگو کو مختصر پیرایہ میں اسطرح بیان کیا گیا ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖۤ الخ

(بقرہ آیت ۲۵۸)

قرآنی مضمون کیا تو نے نہیں دیکھا اُس شخص کا واقعہ جس کو اللہ نے بادشاہت بخشی تھی اُس نے کس طرح ابراہیم سے اُس کے پروردگار کے بارے میں مناظرہ کیا؟

جب کہا ابراہیم نے میرا پروردگار تو زندگی بخشتا ہے اور

موت دیتا ہے۔ بادشاہ نے کہا میں بھی زندگی بخشتا ہوں اور موت بھی دیتا ہوں۔

ابراہیمؑ نے کہا بلاشُبہ اللہ تعالےٰ سُورج کو مشرق سے نکالتا ہے لہذا تو اُسکو مغرب سے نکال ؛ پس وہ کافر (بادشاہ) مبہوت اور لاجواب ہوگیا اور اللہ تعالےٰ ظلم کرنے والوں کو راہ یاب نہیں کرتا"۔

یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلَامًا

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے باپ آزر کو توحید کی دعوت دی اسکے بعد قوم کو اس دعوتِ عام میں شریک کیا اور اُنھیں پیغامِ حق سُنایا اور فطرت کے سیدھے سادھے اصول و دلائل پیش کئے۔ حکمت و شیریں کلامی سے اُن پر حق بات کو واضح کیا اور پھر آخر میں بادشاہِ وقت نمرود کو یہ دعوت پہنچائی۔ اس منزل پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوتی جدوجہد کا مرحلہ مکمل ہوجاتا ہے۔

افہام و تفہیم کے سارے سلسلے یکے بعد دیگرے ختم ہوگئے۔ بادشاہِ وقت سے رعایا تک سب نے متفقہ فیصلہ کرلیا کہ دیوتاؤں کی توہین اور باپ دادا کے دین کی مخالفت میں ابراہیم علیہ السلام کو دہکتی آگ میں جلا دینا چاہیئے۔ کیونکہ ایسے سخت مجرم کی سزا یہی ہوسکتی ہے اور دیوتاؤں کی تحقیر کا انتقام اسی طرح لیا جاسکتا ہے۔ اسطرح مادی قوت و طاقت نے مظاہرہ شروع کردیا۔ ہرطرف مخالفت، دشمنی، نفرت و حقارت کا سامان مہیا ہونا شروع ہوا۔

مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہ اسکی پرواہ تھی نہ کسی قسم کا خوف و اندیشہ آپؑ اسی طرح دعوتِ توحید کا کام انجام دیتے رہے۔

اِدھر بادشاہ کے حکم سے قوم نے ایک وسیع و عریض جگہ آگ جلانے کا انتظام شروع کردیا اور مسلسل کئی روز تک آگ جلائی گئی۔ اس زعم میں کہ یہ بہت بڑا کارخیر ہے۔ قوم کا ہر فرد اپنا حصہ لگانا اسمیں اپنی سعادت و نیک بختی سمجھتا تھا۔ کئی دن کے بعد جب اسکے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک گوپھن میں بٹھاکر تیزی سے گھمایا گیا اور دُور ہی سے اُس دہکتی آگ میں پھینک دیا گیا۔

اس وقت اللہ کا وہ واحد سہارا کام آیا جو اپنے نیک بندوں کی آخری دستگیری کے لئے ہوا کرتا ہے آگ کو حکم دیا گیا کہ اے آگ ابراہیمؑ پر ٹھنڈی اور سلامتی بن جا۔ سورۂ صافات میں فرمایا گیا کہ ہم نے اُن کی کارروائی کو نیچا کر دکھایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کچھ دیر کے بعد اس خوفناک آگ سے صحیح وسلامت باہر نکل آئے۔ جنکے قلوب میں نیکی اور "تلاشِ حق" کی فکر تھی وہ اس واقعہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لائے اور قوم کی اکثریت جسمیں نمرود اور اسکے حمایتی تھے بدستور اُسی شرک وکفر پر باقی رہے جو اُن کے آباء واجداد کا مذہب تھا۔

اس واقعہ سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ تمام اشیاء کی خاصیتیں اللہ کے حکم سے قائم ہیں وہ جب چاہے کسی بھی خاصیت کو بدل سکتا ہے۔ معمول کے مطابق آگ کا عمل یہی ہے کہ وہ جلائے اور ہر آتش پذیر چیز اُس میں گر کر جل جائے۔ لیکن آگ کا یہ معمول اپنا ذاتی معمول نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا قائم کیا ہوا ہے۔ معمول اللہ کا پابند ہے، اللہ معمول کا پابند نہیں۔ کسی وقت بھی وہ حکم دے سکتا ہے کہ آگ اپنا عمل چھوڑ دو چنانچہ اس واقعہ میں ایسا ہی ہوا۔

قرآن حکیم نے اس پُراعجاز واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے:۔

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ الخ

(العنکبوت آیات ۱۶ تا ۲۵)

قرآنی مضمون

"اور ابراہیمؑ کو ہم نے بھیجا جبکہ اُس نے اپنی قوم سے کہا، اللہ کی بندگی کرو اور اُس سے ڈرو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ تم اللہ کو چھوڑ کر جنہیں پُوج رہے ہو وہ تو محض بُت ہیں اور تم ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ درحقیقت اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کر رہے ہو وہ تمہیں کوئی رزق بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ سے رزق مانگو اور اُسی کی بندگی کرو اور اُس کا شکر ادا کرو، اُسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔ اور اگر تم جھٹلاتے ہو تو تم سے پہلے بہت سی قوموں نے جھٹلایا ہے۔ اور رسول پر تو صرف صاف صاف پیغام

پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں۔ کیا اِن لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں کہ اللہ کس طرح خلق کی ابتدا کرتا ہے۔ پھر اُس کا اعادہ کرتا ہے۔ یقیناً یہ (اعادہ تو) اللہ کے لئے آسان تر ہے۔ اِن سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اُس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے پھر اللہ دوسری بار بھی زندگی بخشے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جسے چاہے سزا دے اور جس پر چاہے رحم فرمادے۔ اُسی کی طرف تم پھیرے جانے والے ہو۔ تم نہ زمین میں (ہم کو) عاجز کرنے والے ہو نہ آسمان میں، اور اللہ سے بچانے والا کوئی سرپرست اور مددگار تمہارے لئے نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا اور اُس سے ملاقات کا انکار کیا ہے وہ میری رحمت سے مایوس ہو چکے ہیں اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔ پھر اُسکی قوم کا جواب اِس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اُنھوں نے کہا قتل کر دو یا جلا ڈالو اس کو۔ آخر کار اللہ نے اُسے آگ سے بچا لیا۔ یقیناً اسمیں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو ایمان لے آتے ہیں۔ اور ابراہیمؑ نے کہا تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنالیا ہے مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے۔ اور آگ تمہارا ٹھکانہ ہوگی اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا۔

قَالَ اَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنۡفَعُکُمۡ شَیۡئًا وَّ لَا یَضُرُّکُمۡ الخ (الانبیاء آیات ٦٦ تا ٧٣)

اُبراہیمؑ نے کہا کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اُن چیزوں کو پوج رہے ہو جو نہ تمہیں نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ نقصان۔ تُف ہے تم پر اور تمہارے معبودوں پر جنکی تم اللہ کو چھوڑ کر پُوجا کر رہے ہو۔ کیا تم کچھ بھی عقل نہیں رکھتے؟

اُنھوں نے کہا جلا ڈالو اِسکو اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی اگر تمہیں کچھ کرنا ہے۔ ہم (اللہ) نے کہا اے آگ ٹھنڈی ہوجا اور سلامتی

بن جا ابراہیم پر۔

وہ چاہتے تھے کہ ابراہیمؑ کے ساتھ بُرائی کریں مگر ہم نے اُنکو بُری طرح ناکام کر دیا۔ اور ہم اُن کو اور لوطؑ کو بچا کر اُس سرزمین کی طرف نکال لے گئے جسمیں ہم نے دنیا والوں کے لئے برکتیں رکھی ہیں۔ اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحٰق عطا کیا اور یعقوب اس پر مزید عطا کئے گئے۔ اور ہر ایک کو صالح بنایا۔ اور ہم نے اُنکو امام بنا دیا جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے اُنھیں وحی کے ذریعہ نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے کی اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی اور وہ ہمارے عبادت گزار بندے تھے۔"

قَالُوا ابْنُوا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ۔ الخ

(الصافات آیت ۹۷، ۹۸)

"اُن لوگوں نے آپسمیں کہا ابراہیم کے لئے ایک آتش خانہ تیار کرو اور اُسے دہکتی آگ میں پھینک دو۔ اُنھوں نے ابراہیمؑ کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی مگر ہم نے اُنہی کو نیچا دکھا دیا۔"

ہجرتِ ابراہیمی گزشتہ سطور میں یہ بات آچکی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کی ہدایت کے لئے کس درجہ مضطرب اور بے چین تھے۔ افہام وتفہیم کی وہ کون سی صورت نہ تھی جو انھوں نے قوم کو سمجھانے کے لئے اختیار نہ کی ہو؟ سب سے پہلے اپنے باپ آزر کو سمجھایا پھر عوام کے سامنے توحید کی روشنی پیش کی۔ اور آخر میں بادشاہِ نمرود سے بحث ومباحثہ کرکے اسکے سامنے بھی اظہارِ حق کو بہتر سے بہتر اسلوب کے ساتھ ادا کیا۔ اور ہر لمحہ یہی سب کو تلقین کی کہ اللہ واحد کے علاوہ کسی کی پرستش درست نہیں ہے اور اصنام پرستی اور کواکب پرستی کا نتیجہ خُسران اور ذلت کے سوا دوسرا نہیں ہے۔ اس لئے شرک سے باز آنا چاہیئے۔ ملتِ حنفی ہی کو صراطِ مستقیم سمجھنا چاہیئے جسکی اساس صرف توحید الٰہی پر قائم ہے۔ مگر بدبخت قوم نے کچھ نہ سُنا اور کسی طرح رُشد وہدایت کو قبول نہ کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی

بیوی سیدہ سارہؓ اور برادر زادے حضرت لوط علیہ السلام کے سوا غالباً کوئی اور ایمان نہیں لایا۔ اور قوم کے اکثر افراد نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو جلا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اسکے بعد وہ کبھی آگ میں ڈال بھی دیا۔

جب اللہ تعالےٰ نے دشمنوں کے ارادوں کو ذلیل و رسوا کر دیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں آگ کو " بَرْدًا وَسَلَامًا " بنا دیا تو اب حضرت ابراہیمؑ نے ارادہ کر لیا کہ کسی دوسری جگہ جاکر پیغامِ الٰہی سُنائیں اور دعوتِ حق پہنچائیں۔ یہ سوچ کر "فدان آرام" سے (بابل (عراق) کا مشہور شہر جسمیں سیدنا ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے تھے) ہجرت کا ارادہ کر لیا۔

وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ۔

(الصافات آیت ۹۹)

"اور ابراہیمؑ نے کہا میں جانے والا ہوں اپنے پروردگار کی طرف عنقریب وہ میری رہنمائی کرے گا"

یعنی اب مجھے کسی ایسی آبادی میں ہجرت کرنا چاہئیے جہاں اللہ واحد کی صدا سُنی جاتی ہو۔ خدا کی زمین تنگ نہیں۔ میرا کام پہنچانا ہے۔ اللہ اپنے دین کی اشاعت کا سامان خود پیدا کر دیگا۔

بہر حال سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ آزر اور قوم سے جُدا ہو کر دریائے فُرات کے غربی کنارہ کے قریب ایک بستی میں چلے گئے جو "اور کلدانیین" کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کیا ہمراہ سیدہ سارہؓ اور برادر زادہ حضرت لوط علیہ السلام تھے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد یہاں سے حرّان یا حاران کی جانب روانہ ہوگئے اور وہاں توحید کی دعوت پہنچاتے رہے۔ مگر اس عرصہ میں اپنے باپ آزر کے لئے بارگاہِ الٰہی میں دُعا اور استغفار کا سلسلہ جاری رکھا اور ہدایت کیلئے دُعا کرتے رہے۔

یہ سب کچھ اس لئے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نہایت رقیق القلب، رحیم و کریم صفت اور بہت ہی نرم و بُردبار تھے۔

باپ آزر کی جانب سے ہر قسم کی عداوت اور شدت کے باوجود اُنھوں نے

چلتے وقت یہ وعدہ کر لیا تھا کہ اگرچہ میں آپ سے جُدا ہو رہا ہوں تاہم میں آپ کے لئے برابر دُعا کرتا رہوں گا۔ اسی وعدہ کی پابندی میں باپ کے لئے دُعا اور استغفار کر رہے تھے۔

آخر کار حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو وحی الٰہی نے مطلع کیا کہ آزر ایمان لانے والا نہیں ہے۔ اور یہ اُن افراد میں شامل ہے جنھوں نے اپنی نیک فطرت کو فنا کر کے خود کو اس کا مصداق بنا لیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے اپنے باپ آزر سے اپنی برأت کا صاف صاف اعلان کر دیا اور استغفار کا سلسلہ بھی بند کر دیا۔

سورۂ توبہ میں اس برأت کا اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ الخ۔ (سورہ توبہ آیت ۱۱۳، ۱۱۴)

"نبیؐ اور اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں یہ بات زیبا نہیں کہ مشرکوں کے لئے دُعائے مغفرت کریں چاہے وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں (ایسی صورت میں) جبکہ اُن پر یہ بات کھُل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔

(اے مسلمانو) ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ (آزر) کے لئے جو دُعائے مغفرت کی تھی وہ صرف اُس وعدہ کی وجہ سے تھی جو اُنھوں نے اپنے باپ سے کیا تھا۔ مگر جب ابراہیم (علیہ السلام) پر یہ بات کھُل گئی کہ اُن کا باپ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے تعلق ہو گئے۔ حق بات یہ ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) بڑے رقیق القلب، خدا ترس بُردبار تھے۔

ہجرت بجانب فلسطین

حضرت ابراہیم علیہ السلام شہر بابُل کے مختلف علاقوں میں تبلیغ کرتے کرتے فلسطین پہنچے، اس سفر میں آپ کے ہمراہ زوجۂ محترمہ سیّدہ سارہؑ اور برادر زادہ حضرت لوط (علیہ السلام) اور اُن کی بیوی بھی تھیں۔

سورۂ عنکبوت میں اس ہجرت کا تذکرہ اس طرح ملتا ہے :-

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّیْ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (عنکبوت آیت ۲۶)

"پس لوط (علیہ السلام) ابراہیم (علیہ السّلام) پر ایمان لائے اور کہنے لگے میں اپنے پروردگار کی جانب ہجرت کرنے والا ہوں بیشک وہ غالب ہے حکمت والا ہے۔"

روایات حدیث میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ جب حضرت عثمانؓ نے اپنی بیوی سیدہ رُقیہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کی پہلی ہجرت میں شہر مکہ مکرمہ سے ملک حبشہ کی طرف روانہ ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا :-

اِنَّ عُثْمَانَ اَوَّلُ مُهَاجِرٍ بِاَهْلِهٖ بَعْدَ لُوْطٍ (علیہ السلام)
(الحدیث)

"حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے بعد عثمانؓ پہلے مہاجر ہیں جنھوں نے اپنی بیوی سمیت اللہ کے لئے ہجرت کی ہے۔"

حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے فلسطین کے غربی اطراف میں سکونت اختیار کی۔ اس زمانے میں یہ علاقہ کنعانیوں کے زیرِ اقتدار تھا۔ پھر جب قریبی شہر نابلس چلے گئے اور وہاں کچھ عرصہ قیام کیا۔ اس کے بعد یہاں بھی زیادہ مدت قیام نہیں کیا۔ تبلیغ کے سلسلے میں آگے بڑھتے ہی چلے گئے حتیٰ کہ مصر تک جا پہنچے۔

ہجرت بجانب مصر

حضرت ابراہیم علیہ السّلام جب شہر نابُلس سے چلکر ملک مصر پہنچے تو بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق اُن کو وہاں ایک ظالم بادشاہ سے سابقہ پڑا جس کی تفصیل یہ ہے :-

"حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو معلوم ہوا کہ یہاں کا بادشاہ نہایت بدطینت آدمی ہے۔ شہر میں جو کوئی بھی نیا مسافر آجاتا ہے اگر اُسکے ساتھ اُسکی بیوی بھی ہو تو بیوی کو اپنے حرم میں داخل کرلیتا ہے اور شوہر کو قتل کروا دیتا ہے۔ اور اگر مسافر کے ساتھ اُسکی بہن

یا اور کوئی عزیزہ ہو تو مسافر کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو جب یہ صورتِ حال معلوم ہوئی تو متفکر ہو گئے۔ پھر اپنی بیوی سیّدہ سارہؓ سے فرمایا کہ اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے تدبیر کرنی چاہیئے۔ چونکہ تم میری دینی بہن بھی ہو اور اس سرزمین پر میرے اور تمہارے علاوہ دوسرا کوئی مسلمان نہیں ہے۔ اس لئے اگر وہ ظالم تم کو پکڑ لے جائے تو میرے بارے میں اُس سے کہہ دینا کہ یہ میرا بھائی ہے۔

چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ اُس ظالم کے کارندے حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور سیدہ سارہؓ کو پکڑ لے گئے۔ سیّدہ سارہؓ نے سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرما دیا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ یہ کلام خود سیّدنا ابراہیم علیہ السّلام نے فرمایا تھا کہ یہ خاتون میری بہن ہے۔" (بخاری)

کارندوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تو چھوڑ دیا اور سیّدہ سارہؓ کو اُس ظالم کے ہاں پہنچا دیا گیا۔ اور جب شب میں اُس ظالم نے ارادہ ہی کیا تھا کہ اچانک اُس کا ہاتھ شل ہو گیا۔ اور وہ کسی طرح بھی سیدہ سارہؓ کو ہاتھ نہ لگا سکا۔ یہ دیکھ کر اُس نے سیّدہ سارہؓ کو کہا اے بندی تو اپنے خدا سے دُعا کر کہ وہ میرا ہاتھ درست کر دے میں تجھ کو رہا کر دوں گا۔ سیّدہ سارہؓ نے اُسی وقت دُعا کی ہاتھ درست ہو گیا۔ معاً ظالم نے پھر ارادہ کیا دوبارہ اس کا ہاتھ اور زیادہ شل ہو گیا۔ تیسری مرتبہ پھر یہی قصہ پیش آیا۔ تب اُس نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنّی عورت ہے انسان نہیں اسکو جلد رخصت کر دینا چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بڑی آفت پہنچ جائے۔ چنانچہ سیدہ سارہؓ کو اُسی وقت اپنے محل سے رہا کر دیا اور ساتھ ہی (سیّدہ) ہاجرہؓ کو بھی حوالہ کر دیا۔ (جو اسکی بیٹی تھیں اور باپ کے دین سے مختلف، شاید اسی وجہ سے سیدہ ہاجرہؓ کو سیّدہ سارہؓ کے حوالہ کر دیا ہو)

سیّدہ سارہؓ، سیّدہ ہاجرہؓ کو اپنے ساتھ
لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچیں اور سارا قصہ
بیان کیا اور مبارکباد بھی دی کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل وکرم
سے ہم کو اس طرح اُس ظالم سے بچایا اور ساتھ ہی ایک بندی ہاجرہؓ
کو بھی ہمراہ کر دیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضؓ جو اس حدیث کے راوی ہیں
یہاں تک بیان کرنے کے بعد فرمایا اے شریف النسب اہلِ عرب
یہ ہیں وہ ہاجرہ رضؓ جو تم سب کی ماں ہیں۔
بخاری ج ۶ ص ۳۰۱ (بخاری جز ۴ ص ۱۷۱ مصر)

تورات کی روایت یہ کہتی ہے کہ فرعون مصر نے سیّدہ سارہؓ کے اس واقعہ کو کرامت سمجھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ عتاب کیا کہ اُنھوں نے شروع ہی سے یہ کیوں نہ بتادیا کہ سیّدہ سارہؓ ان کی بہن نہیں بیوی ہیں۔ اور پھر بڑے اکرام وانعام کے ساتھ اُن کو مصر سے رخصت کر دیا۔

بہر حال بخاری و مسلم کی روایت ہو یا تورات کی معنی ومفہوم کے اعتبار سے دونوں روایتوں کے درمیان کوئی بنیادی اختلاف نہیں۔ البتہ ان تمام روایات سے اس قدر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی سیّدہ سارہؓ اور اپنے برادر زادہ حضرت لوطؑ کے ساتھ مصر تشریف لے گئے تھے اور یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مصر کی حکومت ایسے خاندان کے ہاتھ میں ہے جو سامی قوم سے تعلق رکھتا تھا اور اس طرح وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسبی سلسلہ میں وابستہ تھا۔ یہاں پہنچکر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور فرعون مصر کے درمیان ضرور کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جس سے اسکو یقین ہوگیا کہ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام اور اُنکا خاندان خدا کا مقبول وبرگزیدہ خاندان ہے۔ یہ دیکھ کر اُس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپکی بیوی سیّدہ سارہ کا آخر میں بہت اعزاز واکرام کیا اور ان حضرات کی ہر قسم کے مال ومنال سے خدمت کی اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے قدیم خاندانی رشتہ کو مضبوط ومستحکم کرنے کے لئے اپنی بیٹی ہاجرہؓ کو بھی حضرت ابراہیمؑ کی زوجیت میں دے دیا جو اس زمانے کے رسم ورواج کے مطابق پہلی اور بڑی بیوی

کی خدمت گزار قرار پائیں۔ چنانچہ اس تاریخی قیاس کی سب سے بڑی شہادت خود یہود کے ہاں بھی موجود ہے۔ اس طرح یہود کی معتبر روایات سے بھی یہ مسئلہ صاف ہوجاتا ہے کہ سیّدہ ہاجرہؓ شاہِ مصر فرعون کی بیٹی تھیں۔ تورات کا ایک معتبر مفسر ربی شلومو اسحاق کتاب پیدائش باب ۱۶ آیت ۱ کی تفسیر میں لکھتا ہے:۔

"جب اُس (شاہ مصر) نے سارہؓ کی وجہ سے کرامات کو دیکھا تو کہا، میری بیٹی کا اس گھر میں لونڈی (خادمہ) ہوکر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ ہوکر رہنے سے بہتر ہے۔" (ارض القرآن جلد ۲ صا۱۲)

اس تفسیر اور تورات کی آیت کو جمع کرنے سے یہ حقیقت آشکارا ہوجاتی ہے کہ تورات میں سیّدہ ہاجرہؓ کو صرف اس لئے لونڈی کہا گیا کہ شاہِ مصر نے اِنکو سیّدہ سارہؓ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سپرد کرتے وقت یہ کہا تھا کہ وہ سارہؓ کی خدمت گزار رہے گی۔ بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ملکِ جبار کی جو روایت ہے اُس میں بھی یہ جُملہ موجود ہے وَاَخْدَمَهَا هَاجَرَ اور سیّدہ ہاجرہؓ کو سیّدہ سارہؓ کے حوالہ کر دیا کہ اِن کی خدمت گزار رہے۔

مشاہدہ حیات بعد الموت

سیدنا ابراہیم علیہ السّلام کو جیسا کہ گزشتہ سطور میں بیان کیا گیا بچپن ہی سے اللہ تعالےٰ نے رُشد وہدایت، علم وفکر، عقل وشعور، طلب وجستجوئے حق کا طبعی ذوق عطا فرمایا تھا وہ ہر شے کی حقیقت تک پہنچنے کی سعی کو اپنی زندگی کا خاص مقصد سمجھتے تھے تاکہ اُس کے ذریعہ اللہ واحد کی ہستی، اُسکی وحدانیت اور اسکی قدرت کاملہ کے متعلق علم الیقین کے بعد حق الیقین حاصل کرسکیں۔ باپ آزر اور قوم اور بادشاہِ وقت نمرود کیساتھ مناظروں اور گفتگو میں اُن کے اس طبعی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

دعوت وتبلیغ کے انہی ایام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حیات بعد الممات یعنی مرنے کے بعد جی اُٹھنے کے متعلق اللہ تعالےٰ سے یہ سوال کیا کہ وہ کس طرح دوبارہ زندہ کرے گا؟ اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا:۔

"اے ابراہیم کیا تم کو اس مسئلہ پر یقین وایمان نہیں؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فوراً جواب دیا کیوں نہیں میں بلا تردد اس پر ایمان رکھتا ہوں۔ البتہ میں چاہتا ہوں کہ قلب کو وہ کیفیت محسوس ہو جائے جو آنکھوں سے دیکھنے پر حاصل ہوتی ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ سوال دراصل آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے متعلق تھا کہ مرنے کے بعد زندہ ہونے کی کیا شکل ہوگی۔ چونکہ یہ مسئلہ عقیدے سے بھی وابستہ تھا اور ہر ملت میں ہر نبی نے مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھائے جانے کی تلقین کی ہے۔ اور اس ملت میں بھی عقیدۂ آخرت کی حیثیت ایسے ہی ہے جیسے اللہ اور اسکی صفات پر ایمان لانے کی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے اُولو العزم رسول جو اس عقیدے کے مبلغ بھی ہیں کسی شک و شُبہ کی وجہ سے یہ مشاہدہ کرنا نہیں چاہتے تھے کہ موت کے بعد حیات کیوں کر ہوگی۔ بلکہ اللہ تعالٰی سے یہ سوال کرنا اپنے طبعی "ذوق و رُجحان" جستجوئے حق" کے ضمن میں تھا۔

یہ ہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالٰی نے پوچھا اے ابراہیم کیا تم کو یقین نہیں؟ جواب میں فوراً فرمایا! کیوں نہیں ضرور ہے۔

مقصود صرف یہ تھا کہ علم و یقین کے باوجود حقیقت اور مشاہدہ بھی ظاہر ہو جائے چنانچہ اللہ تعالٰی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی درخواست قبول فرمائی اور موت کے بعد حیات کا مشاہدہ کروایا۔ معلوم ہوا کہ سوال دراصل عینی مشاہدہ کا تھا جو علم و یقین کے خلاف نہیں ہوا کرتا۔

اس بارے میں مختصر سی وضاحت مزید مفید ہوگی۔

علمی اصطلاح میں کسی بھی شئی کو جاننے پہچاننے کے تین۳ ذریعے ہوا کرتے ہیں۔

اوّل۱ علم الیقین۔ یعنی ایسا علم جو قوی اعتقاد کی حد تک آجائے جو کسی بھی حالت میں شک و شبہ کی راہ سے متزلزل نہ ہو سکے۔ ایسی حالت کو علم الیقین کہا جاتا ہے۔

دوم۲ عین الیقین۔ اگر یہی علم محسوس و ادراک کی حد تک ہو جائے اسکو عین الیقین کہا جائیگا۔ (یعنی اتنا قوی اور پختہ ہو کہ محسوسات کی طرح ہو جائے)

سوم۳ حق الیقین۔ عین الیقین سے آگے کی کیفیت جسکی وجہ سے علم اور مشاہدہ

ایک ہوجائیں ایسی کیفیت حق الیقین کہلائیگی۔ اس علمی اصطلاح کو ایک محسوس تمثیل سے سمجھا جائے۔
مثلاً: زمزم ایک مقدس اور بابرکت پانی ہے اسکے جاننے اور معلوم کرنے کا پہلا درجہ یہ ہے کہ عوام و خواص، ثقہ وغیر ثقہ آدمی سے شہرتِ عام کی حد تک اس کے وجود اور اسکی تعریف کو سُنا ہے۔ جسکی وجہ سے انکار یا شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہی ایسی کیفیت کو علم الیقین کہا جائے گا۔
پھر حُسنِ اتفاق سے مکۃ المکرمہ جاکر چاہِ زمزم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو اب علم کا یہ درجہ پہلے درجے سے زیادہ قوی اور مضبوط ہوگیا۔ ایسی کیفیت کو "عین الیقین" کہا جائیگا۔
اس علم الیقین اور عین الیقین کے بعد اُس زمزم کو شکم سیر ہوکر پی لیا اور اُسکے ذائقہ کی لطافت وملاحت کو قلب کی گہرائی نے بھی محسوس کرلیا۔ اس کیفیت کو حق الیقین کہا جائے گا۔
علم کا یہ وہ آخری درجہ ہے جو فطرتِ انسانی کے تقاضائے تشنگی کی سیرابی کے لئے کافی ہوجاتا ہے۔ یہ ہی مرحلہ انسان کی طلب، جستجو یا طمانیت کی آخری معراج سمجھا جاتا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام بھی اپنے رب سے اسی مرحلے کیلئے سوال کرتے ہیں کہ اے رب مجھے یہ بات دکھلادے کہ تو مرنے کے بعد کس طرح زندہ کرتا ہے۔ یعنی میری تمنا ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کروں کہ حیات بعد الممات کی کیا شکل ہوگی؟
تب اللہ تعالےٰ نے فرمایا اچھا اگر تم کو اس مشاہدہ کی طلب ہے تو چار عدد پرندے لو اور اُن کو ذبح کرکے اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے سامنے والے پہاڑ پر ڈال دو اور پھر کچھ فاصلے پر کھڑے ہوکر اُن کو آواز دو۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور جب اُن کو آواز دی تو وہ سب اجزاء علیحدہ علیحدہ ہوکر فوراً اپنی اپنی شکل پر آئے اور زندہ ہوکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس اُڑتے ہوئے آ گئے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اَرِنِىْ الخ۔ (البقرہ آیت ۲۶۰)

قرآنی مضمون "اور وہ واقعہ بھی پیشِ نظر ہے جب ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ اے رب میرے مجھے دکھادے آپ مُردوں کو کیسا زندہ کرتے ہیں؟ اللہ نے فرمایا کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟"

ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا ایمان تو رکھتا ہوں مگر دل کو اُس کیفیت کے مشاہدہ کے بعد سکون ہو جاتا۔

فرمایا اچھا تو چار پرندے لو اور اُن کو اپنے سے مانوس کرلو۔ پھر اُن کا ایک ایک جُز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو، پھر اُن کو آواز دو وہ تمہارے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ اور خوب جان لے کہ اللہ نہایت با اقتدار اور حکیم ہے۔

تفسیر روح المعانی میں محدث ابن المنذر نے حضرت حسن رضؓ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پرندوں کو ذبح کر کے اُن کے ٹکڑوں کو قریب کے پہاڑوں پر رکھ دیا اور پھر آواز دی آناً فاناً ہڈی سے ہڈی اور پَر سے پَر سب مل ملا کر اپنی اصلی شکل پر اُڑتے ہوئے آگئے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا اے ابراہیمؑ قیامت کے دن انسانوں کو اس طرح زندہ کیا جائیگا۔

سلف صالحین سے اس آیت کی یہ ہی تفسیر ثابت ہے اور روایاتِ حدیث بھی اسکی تائید کرتی ہیں۔

نتائج و عبر

انبیاء کرام کی ایمانی کیفیت

بعض حضرات نے اس واقعہ کی عجیب وغریب تاویلیں کیں ہیں۔ لیکن انبیاء کرام کے ساتھ اللہ تعالےٰ کا جو معاملہ ہے اُسے اگر اچھی طرح ذہن نشین کرلیا جائے تو نہ کسی تاویل کی ضرورت پڑتی ہے نہ ہی شک وشبہ کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

ایک مسلمان کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ قرآن وحدیث کے واقعات کو جس طرح وہ بیان کئے گئے ہیں تسلیم کرلے۔ یہ ہی ایمان کا تقاضہ بھی ہے اور اسی کا مطالبہ بھی۔ لیکن انبیاء کرام کو جو خلافت اللہ تعالےٰ نے سُپرد کی تھی اور وہ جسکی دعوت کے لئے اس دنیا میں بھیجے گئے تھے اُن کیلئے ضروری تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے

وہ تمام حقیقتیں دیکھ لیں جن پر ایمان لانے کی دعوت انھیں دنیا کو دینی تھی۔ انہیں ساری انسانیت کو کامل اعتماد کے ساتھ یہ کہنا تھا کہ تم لوگ قیاس وتخمین کے سہارے چلتے ہو، مگر ہم آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں، تمہارے پاس صرف گمان ہے اور ہمارے پاس علم ہے۔ تم اپنی آنکھوں سے صرف دیوار تک دیکھ سکتے ہو لیکن ہم دیوار کے پیچھے بھی دیکھ لیتے ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام کے سامنے فرشتے عیاناً آئے ہیں۔ اُن کو آسمان و زمین کے نظام حکومت (ملکوت) کا مشاہدہ کروایا گیا۔ اُن کو جنت و دوزخ آنکھوں سے دکھلائی گئی۔ قبر کی زندگی اُن پر کھول دی گئی ۔ اسی طرح حیات بعد الموت کا اُن کے سامنے مظاہرہ کر کے دکھایا گیا ہے۔ نبیوں کے ایمان بالغیب کی حالت، نبوت سے پہلے کی ہوتی ہے۔ نبی ہونے کے بعد اِن کو ایمان بالشہادۃ کی نعمت دی جاتی ہے اور یہ نعمت صرف انہی کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے۔ کیونکہ ان حضرات کو ایک ایسے عالم کی تبلیغ کرنی ہے جو انسانوں سے بالکل چھپا ہوا ہے۔ اب اگر ان حضرات پر یہ عالم منکشف نہ ہو تو ان کی دعوت و تبلیغ میں وہ زور کہاں جو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد ہوتا ہے۔

یہ اُسی قوتِ یقین کا زور ہے کہ اس اُمت میں ایسے حضرات بھی پیدا ہوئے جنھوں نے فرمایا:۔

لَوْ كُشِفَتِ الْحِجَابُ مَا ازْدَادَتْ اِيْمَانِىْ

(غیب کے پردے اُٹھ بھی جائیں تو میرے ایمان ویقین
میں کچھ بھی زیادتی نہ ہوگی)

یہ پُر اعتماد کیفیت دراصل انبیاء کرام کی اُسی دعوت و تبلیغ کا نتیجہ ہے جسکو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اور کانوں سے سُنکر انسانوں تک پہنچایا ہے۔

حیات بعد الموت کا ایک اور واقعہ

تفسیر روح المعانی میں بروایت حاکم حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ و حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے یہ وضاحت بیان کی گئی کہ ایک دفعہ حضرت عُزیر علیہ السلام کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جو

اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی اور سب انسان مرے پڑے تھے۔
حضرت عُزیر علیہ السّلام نے اپنے دل میں کہا کہ یہ آبادی جو ہلاک ہوچکی ہے اسے اللہ تعالےٰ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟

اس سوال کے یہ معنی نہ تھے کہ حضرت عُزیر علیہ السّلام حیات بعد الموت کے مُنکر تھے یا انھیں اسمیں شک وشبہ تھا بلکہ وہ حقیقت کا عینی مشاہدہ چاہتے تھے جیساکہ انبیاء کرام کو کروایا جاتا ہے۔

حضرت عُزیر علیہ السّلام کے اس خیال پر اللہ تعالےٰ نے اُنکی روح قبض کرلی اور وہ پورے سَو برس تک مُردہ پڑے رہے۔ پھر اللہ تعالےٰ نے اُنھیں دوبارہ زندگی بخشی اور اُن سے پوچھا بتاؤ کتنی مُدّت پڑے رہے ہو؟

حضرت عُزیر علیہ السّلام نے فرمایا ایک دن یا اُس سے بھی کچھ کم۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا تم پر سَو برس اسی حالت میں گزر گئے ہیں۔ اب تم ذرا اپنے کھانے پانی کو دیکھو (جو اس سفر میں اُن کے ساتھ تھا) اسمیں ذرّہ برابر بھی تغیّر نہیں آیا جوں کا توں تازہ رکھا ہوا ہے۔ دوسری جانب ذرا اپنے سواری کے خچر کو دیکھو (کہ اسکی ہڈیاں تک بوسیدہ ہوگئی ہیں)

پھر اللہ تعالےٰ نے حضرت عُزیر علیہ السّلام سے فرمایا یہ ہم نے اس لئے کیا ہے کہ ہم آپکو لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں (یعنی ایک ایسے شخص کا زندہ پلٹ آنا جسے دنیا سَو برس پہلے مُردہ سمجھ چکی تھی خود اسکو اپنے ہمعصروں میں ایک جیتی جاگتی نشانی بنا دینے کے لئے کافی تھا) پھر فرمایا اے عُزیر تم دیکھو اپنے خچر کے اس بوسیدہ ہڈیوں کو ہم کس طرح اُٹھا کر گوشت پوست اسپر چڑھا دیتے ہیں۔ چنانچہ آناً فاناً خچر زندہ ہوکر سامنے آگیا

یہ دیکھ کر حضرت عزیر علیہ السّلام نے کہا میں کامل یقین رکھتا ہوں اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔" (بقرہ آیت ۲۵۹)

بنی قطورہ

سیدنا ابراہیم علیہ السّلام نے سیدہ سارہؓ اور سیدہ ہاجرہ رضؓ کے علاوہ ایک اور بھی نکاح کیا تھا۔ اِن خاتون کا نام قطورہ رضؓ تھا اِن کے بطن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چھ بیٹے پیدا ہوئے۔ تورات میں اِنکے نام بھی لکھے گئے ہیں۔

انہی اولاد میں سے مدین یا مدیان کی نسل نے اپنی آبادی شہرِ مَدْیَنْ کے نام سے بسائی اور یہ بعد میں اصحاب مدین کہلائے جن کا تذکرہ قرآن حکیم میں موجود ہے۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے پوتے دُدّان کی نسل اصحاب الایکہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ انہی دونوں قوم کی جانب حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث کئے گئے تھے۔ مشہور مفسّرِ قرآن حضرت قتادہؓ کی یہی رائے ہے۔

پہلی دُعاءِ ابراہیمی کی وضاحت

سورۂ شعراء میں بیشتر انبیاء کرام کی دعوت و ہدایت کا ذکر آیا ہے اسی میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا بھی تذکرہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام اپنی قوم کو توحید کی تلقین اور شرک و کفر سے بیزاری و نفرت کی ترغیب دیتے ہوئے یک بیک اللہ واحد کی جانب دستِ بدعا ہو جاتے ہیں عرض کرتے ہیں:۔

وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ۔

پروردگار جس روز لوگ دوبارہ اُٹھائے جائیں گے تو اُس دن مجھکو رُسوا نہ کرنا۔ (شعراء، آیت ۸۷)

اس آیت کے تحت امام بخاری نے اپنی کتاب "صحیح البخاری" میں حضرت ابوہریرہؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جو کتاب التفسیر میں مختصر اور کتاب الانبیاء میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

کتاب التفسیر میں منقول حدیث کا یہ ترجمہ ہے:۔

"حضرت ابراہیم علیہ السلام قیامت کے دن اپنے (کافر) باپ کو نہایت پراگندہ حالت میں رُوسیاہ دیکھیں گے تو عرض کریں گے پروردگار دنیا میں تونے میری اس دُعا کو قبول فرمالیا تھا

وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ (پھر یہ رسوائی کیسے کہ میدانِ حشر میں اپنے باپ کو اس حال میں دیکھ رہا ہوں) اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائینگے ابراہیمؑ! میں نے کافروں پر جنت کو حرام کر دیا ہے۔"

(بخاری جلد ۶ ص ۱۳۹)

اور کتاب الانبیاء میں یہ روایت اِن اضافات کے ساتھ مذکور ہے:۔

"قیامت میں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کو پراگندہ حال اور رُوسیاہ دیکھیں گے تو اپنے باپ سے مخاطب ہوکر فرمائیں گے کیا میں نے بارہا آپ سے یہ نہیں کہا تھا کہ میری راہِ ہدایت کی مخالفت نہ کرنا؟ آزر جواب دے گا جو ہوا سو ہوا آج کے دن سے میں تیری مخالفت نہیں کروں گا۔ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام درگاہِ الٰہی میں عرض رسا ہوں گے پروردگار تونے میری اس دعا کو قبول کرلیا تھا۔ وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ۔ الٰہی اس سے زیادہ رسوائی اور کیا ہوگی کہ میرا باپ (آزر) آپ کی رحمت سے انتہائی دُور ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیگا میں نے بلاشبہ کافروں پر جنت کو حرام کر دیا ہے۔

پھر ایک فرشتہ آواز دے گا اور بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ خود فرمائیں گے ابراہیم قدموں کے نیچے دیکھو کیا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام دیکھیں گے کہ گندگی میں لتھڑا ہوا ایک بجّو پیروں میں پڑا لوٹ رہا ہے۔ تب فرشتے اُسکی ٹانگیں پکڑ کر جہنم میں پھینک دیں گے۔ (بخاری جلد ۲ ص ۱۶۹)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اس حدیث کے اجزاء پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آزر کو اس لئے مسخ کر دے گا تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حزن وملال جاتا رہے جو آزر کا بشکل انسان رہنے کی صورت میں پیدا ہوا تھا اور وہ اس کی نہایت قابلِ نفرت شکل دیکھ کر متنفر ہوجائیں اور فطرتِ ابراہیمی اس سے بیزار ہوجائے۔ چنانچہ اس حالت میں دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ حزن وملال، جو فطرت

انسانی کا تقاضا تھا دور ہو گیا۔

بعض محدثین جن میں مشہور محدث اسمٰعیلیؒ شامل ہیں۔ اس حدیث کو باوجود صحتِ سند کے "سقم درایت" کی بنا پر قبول نہیں کرتے ہیں کیونکہ اس روایت میں یہ وضاحت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام اپنے باپ کی حالتِ شرک پر موت کو جانتے ہوئے اللہ تعالےٰ سے اُسکی مغفرت کی دُعا کر رہے ہیں جبکہ خود قرآن حکیم میں یہ صراحت موجود ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وحی الٰہی سے معلوم ہو گیا کہ ان کا باپ "عدو اللہ" ہے وہ ایمان نہیں لائے گا تو انھوں نے اُسکے لئے دُعائے مغفرت تو کجا تعلق رکھنا بھی ترک کر دیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ حدیث قرآن حکیم کی وضاحت کے خلاف بھی ہے لہذا بخاری کی یہ تفصیلی روایت مجروح اور لائق طعن ہے۔ اور یہی بات مشہور محدث ابن کثیرؒ نے بھی فرمائی ہے اور اس حدیث پر تفرد کا الزام لگایا ہے۔

"محدث کرمانیؒ نے بھی اس سُقم کو دُور کرنے کے لئے تفصیلی بحث کی ہے جو اپنی جگہ قابلِ مراجعت ہے۔

(فتح الباری جلد ۸ کتاب الانبیاء)

لیکن ان ساری تفصیلات سے قطع نظر خود دعائے ابراہیمی پر غور کیا جائے تو نہ یہ شبہ پیدا ہوتا ہے اور نہ روایت بخاری پر سُقم اور تفرد کا الزام عائد ہوتا ہے۔ تفصیل اسکی یہ ہے:۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی اس دُعا کا تذکرہ سورۂ شعراء میں اس طرح مذکور ہے:۔

"اے میرے رب مجھے حکمت عطا فرما اور مجھے نیکوں میں شامل کر دے، اور میرا اچھا تذکرہ آنے والے انسانوں میں مقرر کر دے اور مجھے جنت النعیم کا وارث بنا، اور میرے باپ کی مغفرت فرما، کیونکہ وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے۔ اور جس دن لوگ دوبارہ اُٹھائے جائیں گے مجھکو رسوا نہ کر۔" (شعراء آیات ۸۳ تا ۸۷)

ان آیات میں وضاحت موجود ہے کہ یہ دُعا دنیاوی زندگی میں کی جا رہی ہے اور یہ بھی صراحت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام باپ کی مغفرت کے لئے دُعا کر رہے ہیں اور سورۂ توبہ آیت ۱۱۴ میں اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے

بارے میں فرمایا :-
"اور ابراہیم نے اپنے باپ کے لئے مغفرت کی دُعا مانگی تھی وہ
ایک وعدہ کی وجہ سے مانگی تھی جو اُنھوں نے اپنے باپ سے کرلیا تھا
پھر جب اُن کو معلوم ہوگیا کہ یہ دشمنِ خدا ہے تو باپ سے دست بردار
ہوگئے بیشک ابراہیم بڑے نرم دل و بُرد بار تھے۔"
اس آیت سے معلوم ہوا کہ باپ کے لئے مغفرت کی دعا کرنا ابتدائی دور کی بات ہے جبکہ باپ کا دشمنِ خدا ہونا معلوم نہ تھا اور جب معلوم ہوگیا تو دُعا کرنا بند کردیا اور بیزار ہوگئے۔ اور حدیث بخاری میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اسمیں باپ کی مغفرت طلبی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ حدیث میں صرف یہ بیان کیا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قیامت کے دن اپنے باپ کو بُری شکل میں دیکھا پھر جناب باری میں فریاد کی: "اے رب آپ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ قیامت کے دن رُسوا
نہیں کروں گا، مگر اس سے زیادہ رُسوائی اور کیا ہوگی کہ میرا باپ
آزر جو رحمت سے دور ہے (میرے سامنے موجود ہے)"۔
حدیث شریف کے یہ الفاظ قابل غور ہیں :-
يَا رَبِّ إِنَّكَ وَعَدْتَنِي أَنْ لَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ
فَأَيُّ خِزْيٍ أَخْزَى مِنْ أَبِي الْأَبْعَدِ الخ (بخاری ج۴ ص۱۶۹)
اس حدیث میں باپ کے لئے طلب مغفرت کا کوئی لفظ نہیں ہے اور نہ مضمونِ حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مُشرک باپ کے لئے دُعا کی جارہی ہے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ دنیا کی زندگی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باپ کے لئے مغفرت کی دُعا سے دست برداری کرلی تھی اور عملاً اس کا ثبوت بھی دیا تھا۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر حدیث بخاری سے یہ مفہوم پیدا کرنا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام قیامت کے دن مشرک باپ کے لئے پھر مغفرت کی دُعا کررہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو ایفائے عہد یاد دلارہے ہیں، حقیقت سے دور نہیں خلاف حقیقت بات ہوگی۔
حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ آزر کی اس بُری حالت پر اپنی رسوائی سے پناہ مانگ رہے ہیں کہ اے میرے رب میری اس رسوائی سے بڑھکر اور کیا رسوائی ہوگی اپنے باپ کو قیامت کے دن بُرے حال کے سامنے دیکھنا عام

نگاہوں میں رسوائی کا باعث ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس رسوائی کو اس طرح دور کر دیا کہ باپ آزر کو حیوانی مکروہ شکل بجو میں تبدیل کر دیا جو انسانی شکل سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اب جبکہ آزر انسان ہی نہیں رہا جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ ہونے کا امکان پیدا ہو جائے تو عالم حشر میں رسوائی کا قطعاً امکان نہ رہا اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی پورا ہو گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی رسوائی سے محفوظ ہو گئے۔ لہٰذا دُعائے ابراہیمی کا خلاصہ یہ ہوگا:۔

"اے اللہ قیامت کے دن یہ رسوائی مجھے نہ دکھا کہ میدانِ حشر میں تمام اوّلین و آخرین کی موجودگی میں ابراہیم (علیہ السلام) کا باپ آزر سزا پا رہا ہو اور ابراہیم (علیہ السلام) کھڑا دیکھ رہا ہو۔"

اس تشریح کے بعد روایت بخاری کا مطالعہ کیا جائے تو حدیث پر سُقم درایت جیسا کہ محدّث اسمٰعیلیؒ کا الزام ہے یا تفرّد کا اطلاق جیسا کہ محدّث ابن کثیرؒ نے کیا ہے کچھ معقول نظر نہیں آتا۔ واللہ اعلم۔

دوسری دُعاءِ ابراہیمی کی وضاحت

سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی دُعاؤں میں ایک مختصر دُعا یہ بھی موجود ہے:۔ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ۔

(الشعراء آیت ۸۴)

"اور بعد کے آنے والوں میں مجھکو سچی ناموری عطا فرما۔"

یعنی بعد کی نسلیں مجھکو ذکرِ خیر کے ساتھ یاد کریں جسکا خلاصہ یہ ہوا کہ دنیا میں مجھ سے وہ کارنامے انجام پائیں جن کی بدولت رہتی دنیا تک میری زندگی خلق خدا کے لئے روشنی کا مینار بنی رہے اور مجھکو انسانیت کے محسنوں میں شمار کیا جائے۔ نہ یہ کہ میں دنیا میں وہ کام کر جاؤں کہ نسل انسانی میرے بعد میرا شمار اُن ظالموں میں کرے جو خود بگڑے ہوئے تھے اور دنیا کو بھی بگاڑ کر چلے گئے۔

یہ محض شہرت یا ناموری کی دُعا نہیں ہے بلکہ سچی شہرت اور حقیقی ناموری کی دُعا ہے جو لازماً ٹھوس اور بیش بہا خدمت کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔ مقصود دینی

خدمات کی بجا آوری ہے جو انسانیت کے لیئے نور اور ہدایت ثابت ہو. جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاؤں میں ایک دُعا اس قسم کی ملتی ہے۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَّفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا۔ "اے اللہ مجھکو میری نگاہوں میں حقیر و کمتر بنا رکھ اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑا و بزرگ تر"

کسی شخص کو سچی ناموری و عزت کا حاصل ہونا اپنے اندر دو فائدے رکھتا ہے۔

اوّل یہ کہ اُس کے نیک کارناموں سے آنے والی نسلوں کو نیک مثال ملتی ہے جس سے وہ بھلائی کا سبق حاصل کرتی ہیں۔

دوئم یہ کہ آدمی کی چھوڑی ہوئی نیک مثال سے قیامت تک جتنے لوگوں کو ہدایت نصیب ہوگی اُن سب کا ثواب اُس شخص کو بھی ملے گا جس نے نیک مثال چھوڑی ہے. علاوہ ازیں قیامت کے روز کروڑوں بندگانِ الٰہی کی یہ گواہی بھی اُسکے حق میں موجود ہوگی کہ وہ دنیا میں بھلائی اور خیر کے چشمے رواں کرکے آیا ہے جس سے نسل پر نسل سیراب ہوتی رہتی ہے. یہی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا مقصد ہے کہ وہ رہتی دنیا تک اپنے لئے خیر کے چشمہ رواں طلب کر رہے ہیں. اللہ تعالےٰ نے آپؑ کی دعا کو اس طرح قبول فرمایا کہ اسلام کو جو آخری دین ہے "مِلّتِ ابراہیم" قرار دیا اور خود سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ابوالانبیاء (نبیوں کے جدِ اعلیٰ) کا لقب عطا کیا گیا۔

تیسری دُعاءِ ابراہیمی کی وضاحت

سورۂ ممتحنہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک خاص دُعا کا تذکرہ موجود ہے. وہ بارگاہِ الٰہی میں دستِ طلب دراز کئے عجز و نیاز کے ساتھ یہ عرض کر رہے ہیں :-

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا ١٢

(الممتحنہ آیت ۵)

"اے ہمارے پروردگار ہمیں کافر لوگوں کا فتنہ (تختۂ مشق)

نہ بنانا" الخ
فِتنہ فَتَنَ سے ماخوذ ہے۔ جب سونے کو آگ پر تپا کر کھوٹ اور میل کو دور کیا جاتا ہے تو ایسے موقعہ پر کہا جاتا ہے فَتَنَ الذَّھَبُ سونا خالص ہوگیا یعنی نقصان سے محفوظ ہوگیا۔ لیکن اصطلاح میں امتحان و آزمائش اور پرکھنے کو کہتے ہیں۔ اس لئے انسان پر جو مصائب و شدائد آتے ہیں وہ اسی مناسبت سے فتنہ کہلاتے ہیں۔ کیونکہ وہ انسان کو صبر یا بے صبری سے دوچار کر دیتے ہیں۔ قرآن حکیم نے مال، اولاد، اور جاہ و منصب کو اسی معنی کے پیشِ نظر فتنہ کہا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کافروں کے لئے اہل ایمان کے فتنہ بننے سے پناہ طلب کر رہے ہیں۔ فتنہ بننے کی متعدد صورتیں ہوسکتی ہیں جن سے ہر مومن کو اللہ تعالےٰ کی پناہ مانگنی چاہیئے۔

مثال کے طور پر اسکی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ کافر اُن پر غالب آجائیں اور اپنے غلبے کو اس بات کی دلیل قرار دیں کہ ہم حق پر ہیں اور اہلِ ایمان برسرِ باطل، ورنہ کیسے ہوسکتا تھا کہ اِن لوگوں کو اللہ کی خوشنودی حاصل ہوتی اور پھر بھی ہمیں اِن پر غلبہ حاصل ہوتا؛ یہ ایک بڑا فتنہ ہے جو اہل ایمان کے ایمان کو متاثر کر سکتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اہل ایمان پر کافروں کا ظلم وستم اُن کی حد برداشت سے بڑھ جائے اور آخر کار وہ اُن سے دب کر اپنے دین اور اخلاق کا سودا کرنے پر اُتر جائیں۔ یہ صورت دُنیا بھر میں مومنوں کی جگ ہنسائی کی موجب ہوگی اور کافروں کو اس سے دین اور اہل دین کی تذلیل کا موقعہ ملیگا۔ یہ فتنہ پہلے فتنہ سے زیادہ سخت تر ہے۔

تیسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ گمراہی کے عام غلبہ اور تسلط کی حالت میں جب کچھ لوگ حق کی دعوت لیکر اُٹھتے ہوں تو انہیں مختلف قسم کے ظالموں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایسے موقعہ پر اللہ تعالےٰ سے دُعا کی جاتی ہے کہ اے اللہ ہم پر ایسا فضل فرما کہ ہم ظالموں کے لئے صرف آزمائش بن کر نہ رہ جائیں اور ہماری دعوت پیچھے نہ ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ جن مراحل سے گزری اُمیں

یہ تینوں مفہوم آجاتے ہیں۔ یہ دُعا بڑے وسیع مفہوم کو ادا کرتی ہے۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا یہ پہلو ہمارے لئے صد ہزار سامانِ عبرت وبصیرت رکھتا ہے۔ غیر اسلامی حکومت ومعاشرت نے ہم کو اس درجہ حقیر و ذلیل بنا دیا ہے کہ ہم نے اپنے عمل کے علاوہ سوچنے سمجھنے کے زاویئے تک بدل دیئے ہیں۔
اللہ کے مقدس رسول سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالےٰ کی جناب میں عجز وزاری کے ساتھ اس ناپاک زندگی سے محفوظ رہنے کے لئے دستِ طلب دراز کیا ہے کہ ہم پر وہ وقت کبھی نہ آئے کہ کفر وشرک کی طاقت وحکومت توحید کے ماننے والوں کو اس آزمائش میں مبتلا نہ کر دے کہ حق و باطل کا امتیاز بھی ہم کھو بیٹھیں۔

ثلٰثِ کذبات

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے واقعات میں اُس موقعہ پر جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور قوم کے بعض افراد کے درمیان میلے کی شرکت کے لئے گفتگو ہو رہی تھی۔ قرآن حکیم نے حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول نقل کیا ہے :-

فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ۔ (صافات آیت ۸۹)

"کہا میں بیمار ہوں"

اور جب بتوں کے توڑ پھوڑ کے سلسلے میں اُن سے دریافت کیا گیا تھا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اِس کا جواب اس طرح دیا تھا :-

قَالَ بَلْ فَعَلَہٗ کَبِیْرُھُمْ ھٰذَا فَسْئَلُوْھُمْ اِنْ کَانُوْا یَنْطِقُوْنَ۔ (انبیاء آیت ۶۳)

"ابراہیمؑ نے کہا بلکہ اِن میں سے سب کے بڑے نے یہ کیا ہے۔ پس اِن سے پوچھو اگر یہ بول سکتے ہوں"؟

تیسری بات بخاری ومسلم اور حدیث کی دوسری کتابوں میں مذکور ہے اور یہ حدیث اِن الفاظ سے شروع ہوتی ہے :-

لَمْ یَکْذِبْ اِبْرَاھِیْمُ النَّبِیُّ عَلَیْہِ السَّلَامُ قَطُّ اِلَّا ثَلٰثَ کَذِبَاتٍ الخ (بخاری جلد ۶ صـ۱۰۳)

"جھوٹ نہیں کہا ابراہیم نبی اللہ علیہ السلام نے مگر تین جھوٹ"

دو تو وہی ہیں جن کا ذکر قرآن حکیم میں آچکا ہے۔ تیسری بات اپنی زوجہ مطہرہ سیدہ سارہ رضہ کے متعلق ہے جبکہ مصر کے ظالم بادشاہ کے کارندوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ یہ عورت کون ہے؟ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ یہ میری بہن ہے۔ (بخاری ج ۴ ص۱۷۱) کتاب بدء الخلق۔

نیز بخاری میں کتاب التفسیر کے ضمن میں سورہ بقرہ کی تفسیر اور اسی طرح کتاب التوحید میں مذکور ہے۔

"میدان حشر میں جب تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کرام سے شفاعت کیلئے کہہ چکینگے پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور اُن سے عرض کریں گے کہ آپ خلیل الرحمٰن ہیں آپ ہماری سفارش بارگاہِ الٰہی میں کیجئے کہ جلد فیصلہ ہو اور ہم اس مصیبت سے نجات پائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرمائیں گے مجھے شرم آتی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچوں اس لئے کہ میں نے دنیا میں تین خطائیں کی ہیں۔ الخ

إِنِّي سَقِيمٌ - بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ - إِنِّي أَخُوكَ - (ابن کثیر)

(بخاری جلد ۳ ص۱۴۹) مصری

کتاب التوحید۔

مَا مِنْهَا كِذْبَةٌ إِلَّا مَا حَلَّ بِهَا عَنْ دِينِ اللهِ

(ابن کثیر)

"رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابراہیم علیہ السلام کے اِن تینوں جھوٹ میں سے ہر ایک صرف اللہ تعالیٰ کے دین کی حمایت و مدافعت ہی کیلئے بولا گیا ہے (جو صورۃً جھوٹ ہے حقیقتاً نہیں)

اس وضاحت کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر کذب سے مراد عام معنی نہیں لئے ہیں اور نہ کذب کے وہ عام معنی یہاں مراد ہو سکتے ہیں جو بول چال میں عیب اور گناہ شمار کیا جاتا ہے بلکہ اسکے برعکس یہ واضح کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام

نے یہ تینوں باتیں نہ اپنی ذاتی اغراض کے لئے کہی ہیں اور نہ دُنیاوی مصلحت کے پیشِ نظر بلکہ مخالفینِ حق کے مقابلہ میں خالص اللہ تعالےٰ کے دین کی حمایت میں کہی ہیں۔ لہذا ایک لمحہ کے لئے بھی اسمیں تردّد کی گنجائش نہیں کہ کذب حضرت ابراھیم علیہ السلام سے اسی طرح دُور ہے جس طرح دن سے رات اور روشنی سے تاریکی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے حضرت ابراھیم علیہ السلام کو اِن اِمتیازی صفات کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ صدیق، مجتبیٰ، مہدی، نبی، رسول، حنیف، جو "سراپا صدق وصفا" والے اوصاف ہیں۔

علاوہ ازیں مفسرین کرام کی ایک جماعت اِن واقعات کو "توریہ" کی شکل قرار دیتی ہے۔ توریہ کا مطلب یہ ہے کہ ایسا ذُو معنی لفظ بولا جائے جسکے دُو معنی ہوں اور سُننے والا اُسکے قریب اور متبادر معنی مراد لے لیکن متکلم کی نیت اُسکے دوسرے معنی کی ہو۔ مثال کے طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر ایک بوڑھی عورت سے فرمایا تھا۔ بوڑھی عورت جنت میں نہ جائیگی۔ یہ سُنکر خاتون رونے لگی۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً الآیۃ مطلب یہ کہ جنت بھی جس کا بھی داخلہ ہوگا جوانی کی حالت میں ہوگا۔ (بوڑھا کوئی نہ ہوگا)

ظاہر ہے آپؐ کے ارشاد بوڑھی عورت جنت میں نہ جائیگی کے دُو معنی تھے اُس بڑھیا نے قریبی معنی سمجھا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسکے دوسرے معنی مراد لئے تھے اسی طرح اور بھی بہت سی مثالیں قرآن وحدیث میں موجود ہیں۔ "توریہ" علم بدیع کی ایک قسم ہے جو کلام میں نُدرت اور کشش پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اب اس وضاحت کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کذبات پر غور کیا جائے تو ان میں سے ایک بھی حقیقی جھوٹ نہیں صورۃً جھوٹ معلوم ہوتا ہے۔

پہلے واقعہ میں جیسا کہ تفصیل آچکی ہے قوم کے لوگ اپنے کسی مذہبی میلے میں جارہے تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان والوں نے اُن سے بھی چلنے کو کہا اسپر حضرت ابراھیم علیہ السلام نے فَنَظَرَ نَظْرَةً فِی النُّجُوْمِ فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ۔ ایک نگاہ تاروں پر ڈالی اور کہا میں بیمار ہوں۔

آسمان کی طرف نگاہ اُٹھانا ایک محاورہ ہے۔ جب آدمی کسی بات پر غور کر کے

جواب دینا چاہتا ہے اُس وقت فطری طور پر آسمان کی طرف ایک نگاہ اُٹھا لیتا ہے پھر جواب دیتا ہے بس ایسے عمل کی یہ ہی حقیقت ہے۔ لیکن مخاطب خاص طور پر جبکہ وہ ستارہ پرست آدمی ہو اسکو کسی اور معنی میں سمجھتا ہے۔ یہ اُسکی اپنی سمجھ ہے۔ دیکھنے والے کی غرض اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ پھر "سقیم" کا لفظ جہاں شدید بیمار پر بولا جاتا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السّلام اُس وقت گو زیادہ بیمار نہ ہوں لیکن طبیعت کی کسلمندی یا خفیف علالت سے متاثر ہوں گے۔ اسی وجہ سے سقیم کے دوسرے بعید معنی مراد لئے لیکن قوم نے پہلا اور قریبی معنی مراد لیا ہے۔ اس طرح جھوٹ بات نہ رہی۔

دوسرا واقعہ جسمیں حضرت ابراہیم علیہ السّلام قوم کے مرکزی بُت خانے میں داخل ہو گئے اور سارے بتوں کو توڑ دیا اور قوم نے جب پوچھا کہ

"اے ابراہیمؑ کیا تو نے ہمارے بتوں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟"

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا:-

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ

"کہا یہ سب کچھ اِن کے اس بڑے سردار نے کیا ہے۔ انہی سے پوچھ لو۔"

(كَبِيْرُهُمْ) (اُن کے بڑے) کا اشارہ بُت کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور خود حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی طرف بھی جو اُن سب کے بڑے ہیں۔

اگر پہلی بات ہے تو یہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی طرف سے اُن کے عقائد پر ایک طنز و اعتراض کا ہم معنی ہے یعنی اگر ان کے نزدیک واقعی یہ خدا ہیں تو انہیں اپنے بڑے خدا کے متعلق یہ شبہ ہونا چاہیئے کہ شاید بڑے حضرت اِن چھوٹے حضرتوں سے کسی بات پر بگڑ گئے ہوں اور سب کا یہ حشر بنا دیا ہو۔ یا پھر بڑے حضرت سے یہ پوچھیں کہ حضور آپ کی موجودگی میں یہ کیا ہوا؟ قوم نے یہ ہی معنی مراد لیا اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے دوسرے معنی مراد لئے ہیں۔ اس طرح حقیقی جھوٹ ثابت نہیں ہوتا۔

تیسرا واقعہ ظالم بادشاہ کے کارندوں سے اپنی بیوی حضرت سارہ رضؓ کے

بارے میں یہ کہنا کہ یہ میری بہن ہے۔ کوئی جھوٹی بات نہیں ہوسکتی۔

ایک عورت بہن بھی ہو اور بیوی بھی ہو ایسا ممکن ہے؟ سیدہ سارہ رضؓ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دینی بہن بھی تھیں، بیوی کے رشتہ سے اسلامی اُخوت کا رشتہ ختم نہیں ہوجاتا۔ علاوہ ازیں ابن کثیرؒ اور دیگر مؤرخین کی تحقیق ہے کہ حضرت سارہؓ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا حاران کی بیٹی تھیں اسلئے چچازاد بہن بھی تھیں اس لحاظ سے بیوی کو بہن کہنا جھوٹ بھی نہیں۔ دینی بہن ہونے کی صراحت خود بخاریؒ کی مذکورہ روایت میں موجود ہے:۔

قَالَ يَا سَارَةُ لَيْسَ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ مُؤْمِنٌ غَيْرِيْ وَغَيْرُكِ وَاِنَّ هٰذَا سَأَلَنِيْ فَاَخْبَرْتُهٗ اَنَّكِ اُخْتِيْ۔

(بخاری جزء رابع ص۱۱۱ مصر)

"اے سارہؓ اس وقت روئے زمین پر میرے اور تمہارے سوا کوئی مومن نہیں اور اس ظالم نے تمہارے بارے میں پوچھا ہے میں نے اُسے بتایا ہے کہ تم میری بہن ہو۔"

بہرحال یہ بخاری و مسلم کی دونوں روایات ہیں جو ہر قسم کے سُقم روایت سے پاک صاف ہیں۔ اگرچہ یہ روایات سیدنا ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر رسول کی جانب کذب کی نسبت کر رہی ہیں لیکن انہی روایات میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر کذب سے وہ عام معنی مراد نہیں لئے جو اخلاقی و دینی ماحول میں گناہ سمجھے جاتے ہیں۔ مَا مِنْهَا كِذْبَةٌ کے الفاظ موجود ہیں۔

"اُن میں سے کوئی ایک بھی جھوٹ نہ تھا۔"

(رواہ ابن ابی حاتم وابن کثیر)

الغرض "ثلث کذبات" سے مراد ایسا کلام جو صحیح اور پاک مقصد کیلئے بولا گیا ہو لیکن سُننے والا اُس کا وہ مطلب نہ سمجھے جو متکلم کی مراد ہے بلکہ اِن الفاظ کو اپنی ذہنی مراد کے مطابق سمجھے۔

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

مشرک کیلئے دعائے مغفرت

قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کے ظلم سے تنگ آکر جب گھر سے نکلنے لگے تو رخصت ہوتے ہوئے فرمایا تھا:۔

سَلَامٌ عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا.

"آپ کو سلام ہے میں آپ کے لئے اپنے رب سے بخشش کی دُعا کروں گا وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔"

اسی وعدے کی بنا پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دعائے مغفرت نہ صرف اپنے باپ کے لئے کی بلکہ ایک دوسرے مقام پر بیان ہوا ہے کہ ماں اور باپ دونوں کیلئے کی ہے۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ (ابراہیم آیت ۴۱)

"اے رب میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما۔"

لیکن بعد میں انھیں خود احساس ہو گیا یا اللہ کی وحی کے ذریعہ معلوم ہوا کہ باپ حق کا دشمن ہے چاہے وہ نبی کا باپ ہی کیوں نہ ہو دعائے مغفرت کا مستحق نہیں ہے۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ.

(توبہ آیت ۱۱۴)

"ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لئے دُعائے مغفرت کرنا محض اس وعدے کی وجہ سے تھا جو انھوں نے اُس سے کیا تھا۔ مگر جب یہ بات اُن پر کھُل گئی کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو ابراہیم (علیہ السلام) نے اُس سے اظہار بیزارگی کر دیا۔"

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیئے کہ (مشرک) اللہ کے باغیوں کے ساتھ جو ہمدردی ممنوع ہے وہ صرف ایسی ہمدردی ہے جو دین کے معاملہ میں دخل انداز ہوتی ہو۔ البتہ انسانی ہمدردی اور دنیوی تعلقات جیسے صلہ رحمی، لین دین، رحمت وشفقت کا برتاؤ تو یہ ممنوع نہیں ہے بلکہ پسندیدہ عمل ہے۔ رشتہ دار خواہ کافر ہو یا مومن اُسکے دنیوی حقوق ضرور ادا کئے جائیں گے۔ مصیبت زدہ انسان کی بہرحال ہمدردی

کی جائے گی۔ حاجت مند آدمی کو ہر حال سہارا دیا جائے گا۔ بیمار اور زخمی کے ساتھ ہمدردی علاج معالجہ میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی جائے گی۔ یتیم کے سر پر یقیناً شفقت کا ہاتھ رکھا جائے گا۔ اس قسم کے معاملات میں ہرگز یہ امتیاز نہ برتا جائے گا کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم۔

مشرکوں اور کافروں کے لئے جس دُعا کی ممانعت ہے وہ آخرت کی معافی و نجات سے متعلق ہے کہ ان کے لئے مغفرت یا نجات کی دُعا کرنا سخت ترین جُرم ہے اللہ تعالےٰ کو یہ بات قطعاً گوارہ نہیں کہ مشرک کے لئے زندگی میں یا بعد موت مغفرت کی دُعا کی جائے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ جو لوگ شرک کی حالت پر فوت ہو جاتے ہیں وہ کسی بھی قیمت معاف نہیں کئے جائیں گے۔

قرآن حکیم کی یہ وضاحت اس آیت میں ملتی ہے :-

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ الآیۃ

"بیشک اللہ معاف نہ کریگا شرک کرنے والوں کو اور اسکے علاوہ چاہے تو معاف کر دے جسکو چاہے۔"

اِنَّہٗ مَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ

"یہ حقیقت ہے کہ جس نے شرک کیا اُس پر اللہ نے جنّت حرام کر دی ہے۔"

ایک شُبہ کی وضاحت

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے تذکرے میں یہ جو بیان کیا گیا کہ جب رات طاری ہوئی تو اُنھوں نے ایک تارا دیکھا اور جب وہ ڈوب گیا تو کہا کہ میں ڈوبنے والوں کو اللہ نہیں سمجھتا۔ پھر چاند دیکھا اور جب وہ بھی ڈوب گیا تو یہی فیصلہ کیا، پھر سورج دیکھا اور جب وہ بھی ڈوب گیا تو فرمایا کہ اے قوم میں ہر اُس معبود سے بَری ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ پھر اللہ واحد کی حقیقت کو پہچان لیا۔

اس واقعہ پر ایک عام شخص کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ کیا بچپن سے آنکھ

کھولتے ہی روز آنہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام پر رات طاری نہ ہوتی رہی تھی؟ اور کیا وہ ہر روز چاند، تاروں، سورج کو طلوع و غروب ہوتے نہ دیکھتے تھے؟

پھر یہ قصہ اس طرح کیوں بیان کیا گیا؟ گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس واقعہ سے پہلے انھیں اِن چیزوں کے دیکھنے کا اتفاق ہی نہ ہوا تھا؟

جواب بالکل صاف ہے اس کے لئے پہلے بطور مثال یہ مشہور بات ذہن میں لے آئیے:۔

نیوٹن (مشہور فلسفی) کے بارے میں یہ بات عام ہے کہ اُس نے باغ میں ایک سیب کو درخت سے گرتے دیکھا اور اُس سے اُس کا ذہن اچانک اس سوال کی طرف متوجہ ہو گیا کہ اشیاء آخر زمین پر ہی کیوں گرا کرتی ہیں؟ آخر وہ اُوپر کیوں نہیں جاتیں؟ یہاں تک وہ غور کرتے کرتے "قانونِ جذب و کشش" کی حقیقت تک پہنچ گیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس واقعہ سے پہلے نیوٹن نے کبھی کوئی چیز زمین پر گرتے نہیں دیکھی تھی؟

جواب ظاہر ہے بارہا دیکھی ہوگی! پھر کیا وجہ ہے کہ اُسی خاص تاریخ کو سیب گرنے کے مشاہدے سے نیوٹن کے ذہن میں وہ حرکت پیدا ہوئی جو اس سے پہلے روزمرّہ کے ایسے سینکڑوں مشاہدات سے نہ ہوئی تھی؟

اِس کا جواب یہ ہی ہے کہ غور و فکر کرنے والا ذہن ہمیشہ ایک طرح کے مشاہدات سے ایک ہی طرح متأثر نہیں ہوا کرتا۔

بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک چیز کو ہمیشہ دیکھتا رہتا ہے اور اُس کے ذہن میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ مگر ایک وقت اُسی چیز کو دیکھ کر یکایک ذہن میں ایک کھٹک پیدا ہو جاتی ہے جس سے فکر کی قوتیں ایک خاص مضمون کی طرف کام کرنے لگتی ہیں۔ یا پہلے سے کسی سوال کی تحقیق میں ذہن اُلجھ رہا ہوتا ہے اور یکایک روزمرّہ ہی کے مشاہدات میں سے کسی ایک چیز پر نظر پڑتے ہی گتھی کا وہ سرا ہاتھ لگ جاتا ہے جس سے ساری اُلجھنیں سُلجھتی چلی جاتی ہیں۔

تقریباً ایسا ہی کچھ معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے ساتھ پیش آیا ہوگا جبکہ وہ کفر اور شرک کے عام ماحول میں اپنی شرک بیزار فطرت کو اُس ماحول سے علیحدہ

کر لینے کے لئے ایک رات چاند، ستاروں کا سہارا لیا اور غور کرتے کرتے بالآخر "توحید الٰہ" کی مرکزی حقیقت تک پہنچ گئے۔ حالانکہ راتیں روز آتی تھیں، چاند، سورج، ستارے سب ہی ہر رات دن ڈوبتے اُبھرتے رہتے تھے۔ لیکن وہ ایک خاص دن تھا جب ایک تارے کے مشاہدے نے اُن کے ذہن کو اُس راہ پر ڈال دیا اور اللہ تعالیٰ کی توفیق نے انھیں منزل تک پہنچا دیا۔

آثارِ کائنات سے رَبِّ کائنات تک

سورۂ انعام کی آیت ۷۵ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اسی طرح کہا گیا ہے:۔

"اور ایسے ہی ہم ابراہیم کو زمین و آسمانوں کا نظام سلطنت دکھاتے تھے۔ اور اس لئے دکھاتے تھے کہ وہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہوجائیں۔"

(انعام آیت ۷۵)

یعنی جس طرح عام انسانوں کے سامنے آثارِ کائنات نمایاں ہیں، اور اللہ کی نشانیاں دکھلائی جاتی رہتی ہیں اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے بھی یہی آثار تھے اور یہی نشانیاں تھیں۔ مگر عام لوگ انھیں دیکھنے کے باوجود بھی اندھوں کی طرح کچھ نہیں دیکھتے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انھیں آنکھیں کھول کر دیکھا۔ یہی چاند، سورج، ستارے جو ہر روز طلوع و غروب ہوتے ہیں عام انسان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ لیکن جب انھیں اُس آنکھوں والے انسان (ابراہیمؑ) نے دیکھا تو انہی نشانات سے وہ حقیقت تک پہنچ گئے۔

دو ٹوک بات

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنے بُت ساز باپ کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں:۔

"ابراہیم کا واقعہ یاد کرو جبکہ اُس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے؟ میں تو تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں۔" (انعام آیت ۷۴)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اتنا کُھل کر صاف صاف کہہ دینا کیا نتائج پیدا کیا ہوگا؟ اور اُسکے نتائج و عواقب سے کس طرح دوچار ہونا پڑا ہوگا؟

اس جرأت و بیباکی پر باپ اور قوم کا جوش و خروش کس طرح پیچ و خم کھایا ہوگا؟ اس کا کچھ اندازہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے معتقدوں اور قادری النسب پیرزادوں کے سامنے حضرت شیخؒ کی اصل تعلیمات اور اُن کی زندگی کے واقعات پیش کر کے یہ کہہ دے کہ جن بزرگ کے تم نام لیوا ہو، تمہارا اپنا طریقہ اُنکے بالکل خلاف ہے۔ اور تم نے آج ان ہی گمراہ لوگوں کی روش اختیار کر لی ہے جن کے خلاف تمہارے مقتدا نے تمام عمر جہاد کیا ہے۔ اسی طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا کتنا عظیم جہاد ہے؟

اندھی تقلید

سورۂ شعراء آیت ۹۰ تا ۱۰۲ کا مضمون پیشِ نظر ہے:۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ الخ۔

"اُس روز جنت پرہیزگاروں کے قریب لے آئی جائے گی اور دوزخ بہکے ہوئے لوگوں کے سامنے کھول دی جائے گی اور اُن سے پوچھا جائے گا کہ اب کہاں ہیں وہ جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے؟ کیا وہ تمہاری کچھ مدد کر رہے ہیں یا خود اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں؟ پھر وہ معبود اور یہ بہکے ہوئے لوگ اور ابلیس کے لشکر سب کے سب اُس دوزخ میں اُوپر تلے دھکیل دیئے جائیں گے۔ وہاں یہ سب آپس میں جھگڑیں گے اور یہ بہکے ہوئے لوگ (اپنے اپنے پیشوا مقتدا سے) کہیں گے کہ اللہ کی قسم ہم تو صریح گمراہی میں مبتلا تھے جبکہ تم کو رب العالمین کی برابری کا درجہ دے رہے تھے۔ اور وہ مجرم لوگ ہی تھے جنھوں نے ہم کو اس گمراہی میں ڈالا۔ اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے اور نہ کوئی جگری دوست۔ کاش ہمیں ایک دفعہ پھر پلٹنے کا موقع مل جائے تو ہم مؤمن ہوں۔"

یہ پیروی کرنے والے معتقدین کی طرف سے اُن لوگوں کی تواضع ہو رہی ہوگی جنہیں

یہی لوگ دنیا میں اپنا بزرگ، پیشوا اور رہنما مانتے رہے تھے، جن کے ہاتھ پاؤں چُومے جاتے تھے، جن کے قول وعمل کو سند مانا جاتا تھا، جن کے حضور نذریں گزرانی جاتی تھیں، جو خود بھی گمراہ تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر گئے۔ آخرت میں جاکر جب حقیقت کھلے گی اور پیچھے چلنے والوں کو معلوم ہوجائے گا کہ آگے چلنے والے خود کہاں آئے ہیں اور ہمیں کہاں لے آئے ہیں تو یہی معتقدین ان کو گمراہ و مجرم ٹھیرائیں گے اور ان پر لعنتیں بھیجیں گے۔ قرآن حکیم میں جگہ جگہ عالم آخرت کا یہ "عبرت ناک نقشہ" کھینچا گیا ہے "تاکہ اندھی تقلید کرنے والے دنیا میں آنکھیں کھولیں اور کسی کے پیچھے چلنے سے پہلے دیکھ لیں کہ وہ ٹھیک بھی جا رہے ہیں یا نہیں۔

سورۂ اعراف میں فرمایا گیا:۔

كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا الخ

(اعراف آیت ۳۸)

"ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہوگا تو اپنے ساتھ کے گروہ پر لعنت کرتا جائے گا یہاں تک کہ جب سب وہاں جمع ہوجائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے متعلق کہے گا کہ اے ہمارے رب یہ ہیں وہ لوگ جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، اب انھیں آگ کا دوہرا عذاب دے۔ اللہ فرمائیگا سب ہی کے لئے دوہرا عذاب ہے مگر تم جانتے نہیں ہو۔

سورہ حٰم السجدہ میں اس طرح ارشاد ہے:۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا الخ

(آیت ۲۹)

"اور کافر اس وقت کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار اُن جنوں اور انسانوں کو ہمارے سامنے لائیے جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا تاکہ ہم اُنھیں پاؤں تلے روند ڈالیں "تاکہ وہ پست و ذلیل ہوکر رہیں"

اور یہی مضمون سورۂ احزاب میں اس طرح مذکور ہے:۔

وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا الخ (آیت ۶۷۔ ۶۸)

"اور وہ کہینگے اے ہمارے رب ہم نے اپنے سرداروں اور
بڑوں کی اطاعت کی اور اُنھوں نے ہم کو سیدھے راستے سے
بھٹکا دیا۔ اے ہمارے رب اُن کو دُوگنا عذاب دے اور اُن پر
سخت لعنت کر۔"

سورۂ ابراہیم میں اس طرح مذکور ہے:۔
وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا الخ
(ابراہیم آیت ۲۱)

"اور یہ لوگ جب سب کے سب اللہ کے حضور پیش ہونگے
تو اُس وقت اُن میں سے جو دنیا میں کمزور تھے وہ اُن لوگوں سے جو
بڑے بنے ہوئے تھے کہیں گے دنیا میں ہم تمہارے تابع تھے اب
کیا تم اللہ کے عذاب سے ہم کو بچانے کے لئے بھی کچھ کر سکتے ہو؟
وہ جواب دیں گے اگر اللہ نے ہمیں نجات کی کوئی راہ
دکھائی ہوتی تو ہم ضرور تمہیں بھی دکھا دیتے۔ اب تو یکساں ہے خواہ
ہم جزع فزع کریں یا صبر، بہرحال ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔"

سورۂ سبا میں اس طرح بیان کیا گیا:۔
وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ الخ
(آیت ۳۱، ۳۲، ۳۳)

"کاش تم دیکھو اِن کا حال اُس وقت جب یہ ظالم اپنے
رب کے حضور کھڑے ہوں گے۔ اُس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام
دھریں گے۔ جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بننے
والوں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مؤمن ہوتے۔ وہ بڑے
بننے والے اِن دبے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے، کیا ہم نے تمہیں
اُس ہدایت سے روکا تھا جو تمہارے پاس آئی تھی؟ نہیں! بلکہ تم
خود مجرم تھے۔ وہ دبے ہوئے لوگ اِن بڑے بننے والوں سے کہیں گے
نہیں بلکہ تمہاری رات دن کی تدبیروں نے روکا تھا۔ جب تم ہم کو

فرمائش کرتے رہتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور اُسکے لئے شریک قرار دیں۔ اور وہ لوگ پشیمانی کو مخفی رکھینگے جبکہ عذاب دیکھیں گے۔ اور ہم اُن منکروں کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے۔ کیا لوگوں کو اسکے سوا اور کوئی بدلہ دیا جا سکتا ہے کہ جیسے اعمال اُنکے تھے ویسی ہی جزا وہ پائیں ؛

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا اِلخ

(آیت ۱۶۶، ۱۶۷)

"اُس وقت کیفیت یہ ہوگی کہ وہی پیشوا اور رہنما جنکی دنیا میں پیروی کی گئی تھی، اپنے پیروی کرنے والوں سے بے تعلقی ظاہر کریں گے اور عذاب کو (آنکھوں سے) دیکھ لینگے۔ اور اُن کے سارے اسباب اور وسائل ٹوٹ جائیں گے۔ اور وہ لوگ جو دنیا میں اُن کی پیروی کرتے تھے کہیں گے کاش ہم کو ایک موقعہ دیا جاتا توجس طرح آج یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں ہم اُن سے بیزار ہوکر دکھائیں گے۔ یوں اللہ اِن لوگوں کے وہ اعمال جو یہ دنیا میں کر رہے ہیں ان کے سامنے اس طرح لائے گا کہ یہ حسرتوں اور پشیمانیوں کے ساتھ ہاتھ ملتے رہیں گے مگر آگ سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے۔"

مذکورہ بالا آیات میں خاص طور پر گمراہ کرنے والے رہنماؤں اور لیڈروں اور اُن کے نادان پیروی کرنے والوں کا انجام اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ جس غلطی میں مبتلا ہوکر پچھلی اُمتیں بھٹک گئیں اس سے مسلمان ہوشیار رہیں اور رہبروں اور رہزنوں میں امتیاز سیکھیں اور غلط پیروی کرنے والوں سے احتیاط رکھیں۔

علم ویقین کی ایک علامت

جب انسان کسی عقیدے کو علم ویقین کی روشنی میں قائم کر لیتا ہے اور وہ عقیدہ اُسکے قلب میں جاگزیں ہو جاتا ہے اور اُسکی روح میں پیوست تو ایسے شخص کا فکر وخیال، طور وطریقہ اس درجہ زبردست اور ثابت وراسخ ہو جاتا ہے کہ کائنات کا

کوئی حادثہ، دنیا کی کوئی سخت سے سخت مصیبت بھی اُسکو اس عقیدے سے نہیں ہٹا سکتی وہ اس کے لئے آگ میں بے خطر کود پڑتا ہے، تختۂ دار پر بے خوف چڑھ جاتا ہے، دشمنوں کے ہجوم میں اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھتا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو نمرود کی عدالت نے آگ میں ڈالدینے کا فیصلہ کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عزم و ثبات میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا۔

ع بے دھڑک کُود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

علم و یقین کے اُس گہرے عقیدے نے آگ کو باغ و بہار کر دیا۔

آج بھی ہو جو براہیم سا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

اسلام کا حُسنِ سلوک

اگر ایک مسلم کے ماں باپ مشرک و کافر ہوں اور وہ کسی طرح شرک سے باز نہ آتے ہوں تو اُن کی مشرکانہ زندگی سے بیزار و علیحدہ رہتے ہوئے بھی اُن کے ساتھ معاملات اور حُسن سلوک میں کسی قسم کی سختی یا زیادتی روا نہیں سمجھی گئی۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ آزر کے ساتھ ادب و اخلاق کا معاملہ گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ باپ کی دھمکی اور سختی کا جواب سَلَامٌ عَلَیْكَ کہہ کر دیا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق عمل اپنے محسن چچا خواجہ ابوطالب کے ساتھ اس مسئلہ کی قطعی شہادت ہے۔

مَثَلُ الاَعْلیٰ

دسترخوان کی وُسعت و کشادگی اگر ریا و نام و نمود سے پاک ہو اور فطری تقاضے کے پیش نظر مہماں نوازی میں وسعتِ قلب اور بلند حوصلگی پائی جاتی ہو تو یہ بات اخلاقِ کریمانہ میں قابلِ تحسین شمار کی جاتی ہے اسکو "سخاوتِ نفس" اور "جود و کرم" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

یہ وصف گرامی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی حقیقتِ نفس بن چکا تھا، مہمان نوازی، دسترخوان کی وسعت، آنے والوں کا اکرام ایسے اوصاف تھے جو

سیدنا ابراہیم علیہ السلام میں "مَثَلُ الْاَعْلٰی" کی حد تک پہنچ گئے تھے۔

تاریخ کی بعض کتابوں میں ایک عجیب واقعہ منقول ہے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حسب دستور حضرت ابراہیم علیہ السلام کسی مہمان کے انتظار میں کھڑے تھے، کیونکہ بغیر مہمان نہ اُن کا دستر خوان بچھتا تھا اور نہ وہ تنہا کھاتے تھے۔ سامنے ایک بہت بوڑھا آدمی نظر پڑا جسکی کمر بھی کمان ہوگئی تھی اور لکڑی کے سہارے بمشکل چل رہا تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام آگے بڑھے اور مسرّت کے ساتھ اُسکو سہارا دیکر گھر لائے۔ دستر خوان بچھایا اور محبت و پیار سے اُسے خوب کھلایا۔ جب کھانے سے فارغ ہو گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اُس اللہ واحد کا شکرادا کر جس نے ہم سب کو یہ نعمتیں دی ہیں۔ بوڑھے مہمان نے غصے میں کہا میں نہیں جانتا کہ تیرا اللہ واحد کون ہے؟ میں تو اپنے معبود کا شکرادا کرتا ہوں جو میرے گھر میں موجود ہے۔

یہ جواب حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بہت شاق گزرا اور اُسکو اپنے گھر سے فوراً رخصت کر دیا۔ لیکن کچھ دیر نہ ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل پر اپنے اس طرز عمل کا شدت سے احساس ہوا۔ خیال آیا کہ جس اللہ واحد کا شکر میں اس بوڑھے سے کروانا چاہتا تھا اُسکی شان تو یہ ہے کہ اُس نے اس بوڑھے کی اس طویل عمر تک اپنی نعمتیں برقرار رکھیں اور اُسکی بُت پرستی و کفر و شرک سے ناراض ہو کر ایک وقت بھی اُس پر اپنے رزق کا دروازہ بند نہیں کیا۔ پھر مجھکو کیا حق تھا کہ اگر اُس نے میری بات نہ مانی اور کلمۂ حق کو قبول نہ کیا تو میں اسکو گھر سے رخصت کر دوں؟ اس حقیقت پسند احساس نے بے چین کر دیا اور اُسکی تلاش میں خود گھر سے نکل پڑے اور اسکو پا کر ندامت و معذرت پیش کی اور اکرام کے ساتھ پھر اپنے گھر لے آئے (کہا جاتا ہے کہ وہ مہمان فرشتہ تھا جو آزمائش کے طور پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے گھر آیا تھا)

بہرحال یہ واقعہ تاریخی حیثیت سے قابل قبول ہو یا نہ ہو لیکن اس حقیقت کا ضرور اعلان کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اخلاقِ کریمانہ کی وہ بلندی جو مثل الاعلیٰ تک پہنچی ہوئی تھی ضرب المثل اور زبان زد خلائق بن گئی۔

بڑوں کا بچپن

اللہ تعالےٰ جن ہستیوں کو اپنے پیغام و رسالت کے لئے چُن لیتا ہے

اُن کے قلب و دماغ کو اپنے نور سے اس درجہ روشن کر دیتا ہے کہ ان کے سامنے حق و صداقت کے ماسوا کوئی اور چیز باقی نہیں رہتی۔ اُن میں ابتدائی عمر ہی سے یہ استعداد و صلاحیت پرورش پاتی ہے۔ وہ اپنے بچپن ہی میں اپنے ہم عمروں میں ممتاز اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ راہِ حق میں ابتلاء اور آزمائش کو خوشی سے سہنا، تسلیم و رضا کا اُسوۂ حسنہ پیش کرنا اُنکی فطرت بن جاتا ہے۔

سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کا کم عمری میں ذبح کے لئے آمادہ ہوجانا اس حقیقت کا شاہد عدل اور باعث صد ہزار عبرت و عظمت ہے۔

تذکرہ ذبیح اللہ

سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام

اور تعمیرِ کعبۃ

ذکرِ ولادت قرآنِ حکیم میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت کا کوئی واضح ذکر نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں جسقدر بھی تفصیلات ملتی ہیں وہ یا تو تورات کے بیان کردہ واقعات ہیں یا پھر تاریخی روایات۔

اکثر مؤرخین نے ولادت کی تفصیلات انہی ذرائع سے حاصل کی ہیں، البتہ سورۂ صافات میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ جب نمرود نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈلوادیا تھا اور اللہ تعالےٰ نے اُسکی اس تدبیر کو ناکام کرکے ان کو صحیح وسالم آگ سے باہر کیا اُسوقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ملک سے ہجرت کر جانے کا ارادہ کرلیا اور چلتے وقت اپنے رب سے دُعا مانگی۔

"الٰہی مجھے نیک وصالح لڑکا عطا فرما!" (صافات آیت ۱۰۰)

اس دُعا پر اللہ تعالےٰ نے اُنھیں ایک "بردبار لڑکے کی بشارت دی۔" (صافات آیت ۱۰۱)

اس لڑکے سے مراد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں جیسا کہ تفصیل آگے آرہی ہے۔

تورات اور دیگر تاریخی کتب میں اُنکی ولادت کا تذکرہ اس طرح ملتا ہے:-

"حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر شریف اسّی سال سے اوپر ہوچکی تھی لیکن گود اولاد سے خالی تھی۔ ایک غلام کو خانہ زاد بنالیا تھا جسکے ساتھ اولاد جیسا معاملہ کیا کرتے تھے۔ اسوقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں۔ بڑی بیوی کا نام سیدہ سارہؑ (عراقیہ)

اور چھوٹی کا نام سیدہ ہاجرہ (مصریہ) سیدہ سارہؓ اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکیں تھیں اس لئے اولاد کے نہ ہونے سے بے چین رہا کرتی تھیں۔

ایک دفعہ انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے عرض کیا کیا ہمارے گھر کوئی اولاد نہ ہوگی؟ اور کیا یہ ہی خانہ زاد ہمارا وارث ہوگا؟ آپ اللہ تعالےٰ سے کیوں نہیں دُعا فرماتے؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی، اللہ تعالےٰ نے فرشتے کے ذریعہ یہ خوشخبری پہنچائی کہ عنقریب تم کو ایک لڑکا ہوگا جس کا نام اسمٰعیل رکھنا، کچھ عرصہ بعد حضرت ہاجرہؓ پر اُمید ہوگئیں، حضرت سارہؓ کو جب اس کا علم ہوا تو انہیں بہ تقاضائے بشریت حضرت ہاجرہؓ سے رشک پیدا ہوگیا۔ بات بڑھتی گئی۔ آخر حضرت ہاجرہؓ سے رنجش پیدا ہوگئی۔ حضرت ہاجرہؓ مجبور ہوکر ایک دفعہ گھر سے دُور چلی گئیں درمیان راہ فرشتے سے ہمکلامی ہوئی، فرشتے نے خوشخبری دی اور تسلی کے کلمات کہے، حضرت ہاجرہؓ اپنے گھر واپس آگئیں، پھر وقت مقررہ پر بشارت کے مطابق لڑکا پیدا ہوا اور اُس کا نام اسمٰعیل رکھا گیا۔

اسمٰعیل "اِسمع" اور "ایل" دو لفظوں سے مرکب ہے۔ عبرانی زبان میں "ایل" کے معنیٰ اللہ کے ہیں اور عربی میں اِسمع کے معنیٰ ہیں سُن۔ چونکہ اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا سُن لی اور حضرت ہاجرہؓ کو فرشتے سے بشارت ملی اس لئے ان کا یہ نام رکھ دیا گیا۔ عبرانی میں اسکا تلفظ "شماع ایل" ہے۔ شماع کے عبرانی معنی بھی سُن کے ہیں۔"

سیّدنا اسمٰعیل علیہ السّلام اور قرآنِ حکیم

قرآن حکیم نے حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کا تعارف اس طرح کروایا ہے:-

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا

نَبِیًّا۔ الخ (مریم آیت ۵۴ تا ۵۵)

"اور آپ اس کتاب (قرآن) میں اسمٰعیل کا ذکر کیجئے۔ بیشک وہ وعدہ کے بڑے سچے اور اللہ کے نبی اور رسول تھے۔ اور وہ حکم کرتے تھے اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے کا اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ شخصیت تھے۔"

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ذکر خیر تذکرہ سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے ضمن میں بھی بکثرت آیا ہے لیکن مستقل طور پر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ذکر مبارک قرآن حکیم کی مندرجہ ذیل سورتوں میں موجود ہے:-

سورۃ بقرۃ ———	آیات ——	۱۲۵، ۱۲۷، ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۴۰
" الانعام ———	آیت ——	۸۶
" النساء ———	آیت ——	۱۶۳
" ابراھیم ———	آیت ——	۳۹
" الصافات ———	آیت ——	۱۰۱
" مریم ———	آیت ——	۵۴
" انبیاء ———	آیت ——	۸۵

وَادِیْ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا سیدہ ہاجرہؓ کے بطن سے حضرت اسمٰعیلؑ کا پیدا ہو جانا سیدہ سارہؓ کے لئے باعث رشک تھا اور شدہ شدہ یہ حالت رنجش کے حدود میں آگئی۔ سیدہ سارہؓ کا اصرار تھا کہ ہاجرہؓ کو مجھ سے دور کر دیا جائے۔ ان کے ساتھ قیام کرنا میرے لئے تکلیف دہ ہو گیا ہے۔ (قصص الانبیاءؑ ابن کثیرؒ)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی افہام و تفہیم اس بارے میں کچھ کارگر ثابت نہ ہوئی اور یہ سلسلہ بڑھتا ہی رہا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو سیدہ سارہؓ کا یہ اصرار بیحد ناگوار تھا مگر اللہ تعالیٰ نے جو علیم و حکیم بھی ہے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو مطلع فرمایا کہ سارہؓ کا مطالبہ پورا کر دیا جائے اسمیں ہر ایک کیلئے بھلائی و خیر ہی ہوگا۔

اسوقت سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام شیر خوار بچہ ہی تھے اور سیدنا اسحٰق ع ابھی پیدا نہ ہوئے تھے۔ اگرچہ تورات اور بعض تاریخی کتب کی صراحت کے مطابق سیدنا اسحٰق پیدا ہو چکے تھے۔ لیکن کتاب بخاری اور بعض دیگر کتب تاریخ میں اسکے خلاف موجود ہے۔

بخاری میں حضرت عبد اللہ بن عباس رض سے یہ تفصیلی روایت ملتی ہے :-

"حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے شیر خوار بچے اسمٰعیل ع اور بیوی سیدہ ہاجرہ رض کو لیکر اپنے وطن سے چلے اور جہاں آج خانہ کعبہ ہے اُس جگہ ایک بڑے درخت کے نیچے زمزم کے موجودہ مقام سے بالائی حصے پر اُن کو چھوڑ گئے۔ یہ جگہ اُس وقت غیر آباد اور ویران تھی۔ پانی کا بھی دُور دُور تک کوئی نشان نہ تھا، اس لئے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ایک مشکیزہ پانی اور تھیلی کھجور بھی اُنکے پاس رکھ دیا اور پیٹھ پھیر کر روانہ ہو گئے۔ سیدہ ہاجرہ رض اُن کے پیچھے پیچھے یہ کہتی ہوئی چلیں اے ابراہیم ہم کو ایسی وادی میں تنہا کہاں چھوڑے جا رہے ہو؟ جہاں نہ آدم ہے نہ آدم زاد، نہ کوئی مونس و غمخوار؟ سیدہ ہاجرہ رض مسلسل یہ کہتی جاتی تھیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام خاموش چلے جا رہے تھے۔ آخر تھک کر حضرت ہاجرہ رض نے پوچھا ابراہیم کیا یہ اللہ کا حکم ہے؟ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا ہاں یہ اللہ کا حکم ہے۔ سیدہ ہاجرہ رض نے جب یہ سُنا تو کہنے لگی پھر تو وہ ہمیں ضائع و برباد نہ کرے گا۔ یہ کہہ کر واپس لوٹ آئیں اور اپنے بچے سے آملیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام چلتے چلتے جب ایک ٹیلے پر ایسی جگہ پہنچے جہاں اُن کا شیر خوار بچہ اسمٰعیل ع اور بیوی ہاجرہ رض نگاہ سے اُوجھل ہو گئے تو اُس جانب جہاں کعبہ ہے رُخ کیا ہے اور ہاتھ اُٹھا کر یہ دُعا فرمائی :-

رَبَّنَآ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ

ذَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ الخ (ابراہیم آیت ۳۷، ۳۸)

"پروردگار! میں نے ایک بے آب و دانہ وادی میں اپنی اولاد میں سے ایک کو تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے (یہ میں نے اسلئے کیا ہے) کہ پروردگار یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔ لہٰذا تُو لوگوں کے قلوب کو ان کی جانب متوجہ فرما اور انہیں کھانے کو پھل عطا فرما۔ شاید کہ یہ شکر کرنیوالے بنیں۔ پروردگار! تُو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اور واقعی اللہ سے کچھ بھی چُھپا ہوا نہیں ہے نہ زمین میں نہ آسمانوں میں۔" (ابراہیم آیت ۳۷، ۳۸)

سیدہ ہاجرہؓ چند روز تک تو مشکیزہ کا پانی پیتی اور تھیلی کے کھجور کھاتی اور اسمٰعیلؑ کو دودھ پلاتی رہی لیکن جب پانی ختم ہو گیا اور کھجور بھی باقی نہ رہے تو سخت پریشان ہوئیں چونکہ وہ بھوکی و پیاسی تھیں اس لئے بچے کے لئے دودھ بھی سُوکھ گیا اور بچہ بھوک، پیاس سے بلبلانے لگا۔ جب بچے کی حالت دگرگوں ہونے لگی اور بچہ بیتاب ہو کر ایڑیاں گھِسنے لگا تو یہ حال دیکھا نہ گیا۔ اسمٰعیلؑ کو چھوڑ کر کچھ دُور جا بیٹھیں تاکہ یہ حالتِ زار کم از کم ارادۃً آنکھوں سے نظر نہ آئے۔ کچھ دیر کے بعد قرار نہ آیا تو قریب کی پہاڑی صفا پر چڑھ گئیں شاید کوئی انسان یا پانی کا نشان مل جائے مگر کچھ نظر نہ آیا۔ پھر بچے کی محبت میں دوڑ کر وادی میں آگئیں۔ اسکے بعد دوسری جانب کی پہاڑی مَروہ پہ چڑھ گئیں۔ جب وہاں بھی کچھ نظر نہ آیا تو پھر تیزی سے لَوٹ کر وادی میں بچے کے پاس آگئیں۔ اسطرح سات مرتبہ کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک بیان فرما کر ارشاد فرمایا، یہی وہ سعی بین الصفا والمروہ ہے جو حج میں لوگ کیا کرتے ہیں۔ آخر جب سیدہ ہاجرہؓ مروہ پہاڑ پر تھیں کان میں آواز آئی، چونک پڑیں اور دل میں کہنے لگیں کہ کوئی آواز دیتا ہے۔ کان لگایا تو پھر آواز آئی، سیدہ ہاجرہؓ نے بلند آواز سے کہا اگر تم مدد کر سکتے ہو تو سامنے آؤ! تمہاری آواز سُنی گئی۔ دیکھا تو اللہ کا فرشتہ، جبرئیلؑ ہے، اس فرشتے نے اپنا پیر اُس جگہ مارا جہاں آج زمزم کا کنواں ہے۔ پانی اُبلنے لگا۔ سیدہ ہاجرہؓ نے جب یہ منظر دیکھا تو خوشی اور مسرت میں پانی کے چاروں طرف باڑ بنانے لگیں مگر پانی برابر اُبلتا رہا۔" یہاں تک بیان فرما کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

"اللہ اُمِّ اسمٰعیلؑ (سیدہ ہاجرہؓ) پر رحم فرمائے اگر وہ زمزم کو اسطرح نہ روکتیں تو وہ آج جاری چشمہ ہوتا۔"

سیدہ ہاجرہؓ نے پانی پیا پھر اسمٰعیلؑ کو دودھ پلایا۔ فرشتے نے سیدہ ہاجرہؓ سے کہا "غم و خوف نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ تجھ کو اور بچے کو ضائع نہ کریگا۔ یہ مقام "بیت اللہ" ہے جسکی تعمیر اس بچے اور اسکے باپ کی قسمت میں مقدر ہو چکی ہے۔ اس لئے اللہ تعالےٰ اس خاندان کو ہلاک نہیں کریگا۔"

"بیت اللہ" کی یہ جگہ قریب کی زمین سے نمایاں تھی مگر پانی کا بہاؤ دائیں بائیں اس حصہ کو برابر کرتا جا رہا تھا۔

انہی دنوں میں قبیلہ بنی جرہم کا ایک قافلہ اس وادی کے قریب گزر رہا تھا دیکھا کہ تھوڑے فاصلے پہ پرندے اُڑ رہے ہیں۔ اہل جرہم نے کہا کہ یہ پانی کی علامت ہے وہاں پانی ضرور ہوگا۔ چنانچہ یہ لوگ وہاں پہنچے اور سیدہ ہاجرہؓ سے اجازت طلب کی کہ ہم بھی یہاں قیام کرنا چاہتے ہیں۔

سیدہ ہاجرہؓ نے کہا کہ قیام کر سکتے ہو لیکن پانی کی ملکیت کے حصہ دار نہ ہوگے۔ جرہم نے یہ بات بخوشی منظور کر لی اور مقیم ہو گئے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاجرہؓ خود بھی باہمی اُنس و رفاقت کے لئے یہ چاہتی تھیں کہ کوئی یہاں آکر مقیم ہو۔

اسکے بعد جرہم نے کچھ آدمی بھیجکر اپنے باقی ماندہ اہل خاندان کو بھی بلایا اور یہاں مکانات بنا کر رہنے لگے۔ اُن ہی میں اسمٰعیل بھی رہتے اور کھیلتے اور اُن کی زبان سیکھتے، جب اسمٰعیل علیہ السلام بڑے ہو گئے تو اُن کے عادات و اطوار اور اُن کی خوبصورتی جرہم کو بہت پسند آئی اور انھوں نے اپنے خاندان کی ایک لڑکی سے اُنکی شادی کر دی۔ اسکے کچھ عرصہ بعد سیدہ ہاجرہؓ کا انتقال ہو گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام وقفہ وقفہ سے اپنے اہل و عیال کو دیکھنے آیا کرتے تھے۔ معمول کے مطابق ایک مرتبہ تشریف لائے تو اسمٰعیل علیہ السلام گھر پر موجود نہ تھے۔ اُن کی بیوی سے دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ روزی کی تلاش میں باہر گئے ہوئے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انجانے میں بہو سے دریافت کیا تمہارے گھر کا کیا حال ہے؟ وہ کہنے لگیں سخت مصیبت و پریشانی ہے اور ہمارا بُرا حال ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اچھا جب اسمٰعیل آجائے تو میرا سلام کہہ دینا اور یہ بھی کہنا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ تبدیل کر دو۔ یہ کہہ کر واپس ہو گئے۔ کچھ دیر بعد جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام گھر آئے گھر میں نورِ نبوت کے اثرات محسوس کئے پوچھا کہ کیا کوئی شخص یہاں آیا تھا؟

بی بی نے سارا قصہ بیان کیا اور پیغام بھی دیا۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ بی بی وہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام تھے اور اُن کا یہ مشورہ ہے کہ میں تم کو طلاق دے دوں۔ لہذا میں تجھ کو جدا کرتا ہوں۔

اسکے بعد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے دوسری شادی کرلی حسب معمول حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک مرتبہ پھر تشریف لائے، اُس وقت بھی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام گھر پر موجود نہ تھے۔

خیریت کے بعد اُسی طرح کے سوالات کئے نیک بی بی نے کہا خدا کا شکر واحسان ہے اچھی گزر رہی ہے۔ دریافت کیا کھانے کو کیا ملتا ہے؟ نیک خاتون نے جواب دیا گوشت! پوچھا اور پینے کو؟ جواب دیا میٹھا پانی! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس موقعہ پر دُعا مانگی:۔

اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِى اللَّحْمِ وَالْمَاءِ۔

اے اللہ ان کے گوشت و پانی میں برکت عطا فرما۔

پھر جب چلنے لگے تو فرمایا کہ اپنے شوہر کو میرا سلام کہنا اور یہ پیغام بھی دینا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ کو محفوظ رکھنا۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جب گھر تشریف لائے تو بی بی نے سارا واقعہ سنایا۔

اسپر حضرت اسمعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام تھے اور اُن کے پیغام کا یہ مطلب ہے کہ تم زندگی بھر میری رفیقۂ حیات رہو۔ الخ

یہ طویل روایت بخاری "کتاب الرؤیا" اور "کتاب الانبیاء" دونوں جگہ موجود ہے۔ دونوں روایت سے یہ ہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کی وادی) میں (یعنی مکہ مکرمہ) بحالت شیرخوارگی پہنچے تھے۔

اگرچہ قرآن حکیم نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت کے متعلق ان کا نام لے کر صاف صاف کوئی ذکر نہیں کیا، البتہ بغیر نام لئے اُن کی ولادت کی بشارت کا تذکرہ کیا ہے۔

کی گود ابھی تک اولاد سے خالی تھی اس لئے بارگاہِ الٰہی میں ایک نیک وصالح فرزند کے لئے دُعا مانگتے ہیں اور اللہ تعالےٰ نے اُن کی دُعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور لڑکے کی ولادت کی بشارت دی۔

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ . فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ. (الصافات آیت ۱۰۰)

"اُے رب مجھکو ایک نیک لڑکا عطا فرما، پس ہم نے اُسکو ایک بُردبار لڑکے کی بشارت دی۔"

یہ غلام حلیم کون ہے؟ وہی اسمٰعیل علیہ السلام جو سیّدہ ہاجرہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے کیونکہ قرآن حکیم نے اس بشارت کے بعد ہی آیت ۱۱۲ میں حضرت اسحٰقؑ کی بشارت کا ذکر کیا ہے :-

وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ . وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَىٰ إِسْحَاقَ. (الصافات آیت ۱۱۲)

"اور بشارت دی ہم نے ابراہیمؑ کو اسحٰقؑ کی جو بلند نیکوکار نبیوں میں سے ایک نبی ہوگا۔ غلامِ حلیم کی بشارت کے بعد اسحٰق علیہ السّلام کا نام لے کر بشارت دینا کُھلی دلیل ہے کہ پہلی بشارت سے مراد حضرت اسحٰق علیہ السّلام ہو نہیں سکتے۔ سوائے اسکے کہ اسمٰعیل علیہ السّلام مراد ہوں۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے دو ہی لڑکے تھے۔

ذبحِ عظیم

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی حیاتِ طیبہ میں کم از کم تین واقعات سخت ترین امتحان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اللہ کے نیک بندوں خصوصاً بارگاہ الٰہی کے مقرّبین کے ساتھ اللہ تعالےٰ کا وہ معاملہ نہیں ہوتا جو عام انسانوں کے ساتھ ہے۔ اُن کو امتحان و آزمائش کی سخت سے سخت منزلوں سے گزرنا بھی پڑتا ہے جسکے نتیجے میں اُن کی زندگی میں قدم قدم پر تسلیم و رضا کے مظاہرے ظاہر ہوتے ہیں جسکے نتیجے میں رہتی دنیا تک انسان اور

انسانیت کے لئے بہترین نمونہ اور مثال قائم ہوجاتی ہے۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا تھا۔
"ہم انبیاء اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے امتحان کی صعوبتوں میں ڈالے جاتے ہیں"
حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی چونکہ اولوالعزم انبیاء میں شمار ہوتے ہیں اسی قانون الٰہی کے تحت مختلف آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اور وہ ہر دفعہ امتحان میں کامل ومکمل طور پر ثابت قدم رہے ہیں۔
جب ان کو آگ میں ڈالا گیا تو اُس وقت جس صبر و استقامت اور تسلیم و رضا کا ثبوت دیا ہے وہ تاریخ انبیاء کا انمول اور نادر واقعہ ہے۔
اسکے بعد اپنے شیرخوار بچے اسمٰعیلؑ اور نیک بیوی سیدہ ہاجرہؓ کو فاران (مکہ) کے بیابان میں چھوڑ آنے کا حکم ملا وہ بھی کچھ معمولی امتحان نہ تھا۔ آزمائش اور سخت آزمائش کا وقت تھا، بڑھاپے اور پیری کی تمناؤں کے مرکز، دن رات کی دعاؤں کے ثمر اور گھر کے چشم وچراغ اسمٰعیلؑ کو صرف خدائی حکم کی تعمیل اور امتثال میں ایک بے آب و دانہ وادی میں چھوڑ آنا اور اس طرح کے پیچھے مڑکر بھی نہ دیکھا کہ کہیں پدری شفقت جوش میں آجائے اور تعمیل حکم میں لغزش پیدا ہوجائے۔
یہ دونوں امتحان کچھ کم نہ تھے کہ تیسرے امتحان کا آغاز ہوگیا۔
ان ہی ایام میں جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام بیوی اور بچے کی خیر خبر لینے کے لئے مکہ مکرمہ آیا کرتے تھے تین شب مسلسل خواب دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالٰے ارشاد فرماتا ہے کہ:۔
"اے ابراہیم اپنے بیٹے کو ہماری راہ میں قربان کرو۔"
انبیاء کرام کا خواب بھی وحی الٰہی کا ایک حصہ ہوتا ہے اس لئے سیدنا ابراہیم علیہ السلام رضا و تسلیم کا پیکر بن کر تیار ہوگئے کہ اللہ تعالٰے کی اس مرضی کو جلد سے جلد پورا کردیں، مگر چونکہ معاملہ صرف اپنی ذات سے متعلق نہ تھا بلکہ اس آزمائش میں کمسن بیٹا بھی شریک تھا اس لئے بیٹے کو اپنا یہ خواب سُنایا اور اللہ کی مرضی کو ظاہر کیا کمسن صاحبزادے نے فوراً سرِ تسلیم خم کردیا اور کہنے لگے ابا جان اگر اللہ تعالٰے

کی یہی مرضی ہے تو انشاء اللہ آپ مجھ کو صابر پائیں گے۔
اس گفتگو کے بعد باپ بیٹے اپنی قربانی پیش کرنے کے لئے جنگل روانہ ہو گئے۔
اس مرحلہ پر حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی عمر شریف کیا تھی؟ اگرچہ بعض مفسرین نے تیرہ سال اور بعض نے کچھ زیادہ لکھی ہیں لیکن کسی مستند روایت میں اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ قرآن حکیم نے اس عمر کو اس طرح بیان کیا ہے:۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ الآیۃ (الصافات آیت ۱۰۲)

"جب وہ لڑکا ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔"

اور بعض نے یہ ترجمہ کیا ہے:۔

"سو جب وہ لڑکا ایسی عمر کو پہونچا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ چلنے پھرنے لگا۔"

اور بعض نے یہ ترجمہ کیا ہے:۔

"سو جب وہ لڑکا ایسی عمر کو پہونچا کہ ابراہیم کے ساتھ جدوجہد کرے۔"

دراصل قرآن حکیم نے اَلسَّعْيَ کا لفظ استعمال کیا ہے جسکے معنی جہاں چلنے اور دوڑنے کے آتے ہیں وہاں جدوجہد کرنے کے بھی ہیں یعنی باپ کے ساتھ جدوجہد میں شریک ہوا، غالباً اسی وجہ سے بعض حضرات نے تیرہ ۱۳ سال عمر لکھی ہے۔ واللہ اعلم۔

الغرض دونوں حضرات اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کے لئے کعبۃ اللہ سے دُور چلے گئے۔ بعض تاریخی وتفسیری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ درمیانِ راہ شیطان نے تین مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہکانے کی کوشش کی، لیکن ہر مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُسے سات کنکریاں مار کر بھگا دیا تھا۔ یہ منیٰ کا میدان تھا جو پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس عمل کو قیامت تک حج کے مناسک میں داخل فرما دیا۔ ہر سال منیٰ کے تینوں جمرات پر لاکھوں حُجاج اسی پسندیدہ عمل کی یادگار میں کنکریاں مارتے ہیں۔ بالآخر جب دونوں باپ بیٹے یہ

بے مثال عبادت انجام دینے کے لئے منیٰ کی قربان گاہ پہنچے تو سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام نے فرمایا ابا جان! ذبح کرنے سے پہلے مجھے ذرا اچھی طرح باندھ دیجئے تاکہ ذبح کے عمل میں تاخیر نہ ہونے پائے اور آپ اللہ تعالےٰ کے منشا کو جلد پورا فرمادیں۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے اسی طرح تیاری کی اور بیٹے کو آخری بوسہ دیا اور پیشانی کے بل خاک پر لٹا دیا۔ قرآن حکیم نے اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے :-

وَ تَلَّہٗ لِلْجَبِیْنِ ۔ (الصافات آیت ۱۰۳)

"اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل خاک پر لٹا دیا۔"

لیکن حضرت ابن عباسؓ سے اس کا مطلب اس طرح منقول ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس طرح کروٹ لٹا دیا کہ پیشانی کا ایک کنارہ زمین سے چھونے لگا۔ (تفسیر مظہری)

لغت کے لحاظ سے یہ تفسیر زیادہ قریب ہے اس لئے کہ جَبین عربی زبان میں پیشانی کی دونوں کروٹوں کو کہا جاتا ہے۔ اور پیشانی کا درمیانی حصہ جَبْہَہ کہلاتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس طرح بیٹے کو لٹا کر گردن پر چھری چلانی شروع کی۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ اس موقعہ پر اللہ تعالےٰ نے اپنی قدرت سے پیتل کا ایک ٹکڑا بیچ میں حائل کر دیا۔ اچانک آواز آئی "اے ابراہیم بس کرو تم نے خواب کو سچ کر دکھایا" بیشک یہ بہت سخت آزمائش تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہاتھ روک لیا، آسمان کی جانب نظر اُٹھائی دیکھا کہ حضرت جبرئیل امین ایک فربہ مینڈھا لئے کھڑے ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی مینڈھا تھا جس کی قربانی حضرت آدم علیہ السلام کے صاحبزادے ہابیلؑ نے پیش کی تھی۔ واللہ اعلم۔

الغرض یہ جنتی مینڈھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا ہوا تھا۔ آپ نے اللہ تعالےٰ کے حکم سے اس کو اپنے بیٹے اسمٰعیلؑ کے عوض ذبح کر دیا۔

اسکو قرآن حکیم نے اس طرح بیان کیا ہے :-

وَ فَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ۔ (الصافات آیت ۱۰۷)

"اور ہم نے ابراہیم کو ایک عظیم ذبیحہ اسکے عوض دے دیا۔"

اس ذبیحہ کو عظیم اس وجہ سے کہا گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا تھا۔ سورہ الصافات میں اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

قرآنی مضمون

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ۔ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ الخ

(الصافات آیات ۹۹ تا ۱۱۳)

اُور ابراہیمؑ نے کہا میں جاتا ہوں اپنے رب کی طرف (ہجرت کرکے) وہ مجھے سیدھی راہ دے گا (چنانچہ ملکِ شام پہنچے اور یہ دُعا کی) اے پروردگار مجھے ایک نیک لڑکا عطا فرما۔ پس ہم نے بشارت دی اُسکو ایک بُردبار لڑکے کی (یعنی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی)، پھر جب وہ ایسی عمر کو پہنچا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ چلنے پھرنے لگے۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا اے میرے بیٹے میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تجھ کو ذبح کرر ہا ہوں سو تم بھی سوچ لو تمہاری کیا رائے ہے؟ وہ بولے ابّا جان آپ کو جو حکم ہوا ہے وہ کرگزریئے انشاء اللہ آپ مجھکو صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔

غرض جب دونوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو تسلیم کرلیا اور باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے پیشانی کی کروٹ لٹا دیا۔ اور ہم نے اُن کو آواز دی کہ اے ابراہیم (علیہ السلام) تم نے خواب کو خوب سچ کر دکھایا (وہ وقت بھی عجیب تھا) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہ تھا بھی بڑا امتحان۔ اور ہم نے ایک عظیم ذبیحہ اُسکے عوض دے دیا۔ اور ہم نے آنی والی نسلوں میں اُنکے متعلق یہ بات رہنے دی کہ ابراہیمؑ پر سلام ہو (چنانچہ آپ کے نام کیساتھ ابتک علیہ السلام لکھا اور بُولا جا رہا ہے) اسی طرح ہم نیکو کاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔ بیشک وہ (ابراہیم علیہ السلام) ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھے۔ اور ہم نے اُنھیں اسحٰقؑ کی بشارت دی جو نبی

ہوگا اور نیکو کاروں میں سے ہوگا۔ اور برکت دی ہم نے ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ
پر اور اُن دونوں کی نسلوں میں بعضے اچھے بھی ہیں اور بعضے ایسے بھی
جو صریح اپنا نقصان کررہے ہیں۔"

ذبیح اللہ آیات مذکورہ میں ذبیح کا نام نہیں لیا گیا صرف "غلامٌ حلیمٌ" کہا گیا کہ وہ نہایت متحمل، صاحبِ برداشت، صابر وشاکر لڑکا تھا۔

باپ نے ابھی مشورہ ہی کیا تھا کہ وہ آمادۂ تعمیل ہوگیا۔ اس طرح سخت ترین امتحان میں پورا اُترا، اللہ نے اُسکے اِس تسلیم ورضا کو قبول فرمالیا اور آسمان سے "ذبح عظیم" نازل کیا اور وہ اُسکا بدل قرار پایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مبارکباد دی گئی اور اُن کے اس عمل کو یادگار بنا دیا گیا (چنانچہ ہر سال ذی الحجہ کی ۱۰ دس تاریخ کو لاکھوں حاجی اور کروڑوں مسلمان اسی ذبح عظیم کی یاد میں اللہ تعالےٰ کے حضور قربانی پیش کرتے ہیں) حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اللہ کا سلام آیا اور حضرت اسحٰق کی بشارت دی گئی۔ مضمون کی ترتیب اور بیان واضح طور پر ظاہر کررہا ہے کہ "غلام حلیم" حضرت اسحٰقؑ کے علاوہ کوئی دوسرا ہی لڑکا تھا، اور ظاہر ہے کہ وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی ہوسکتے ہیں، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ۲ دو ہی لڑکے تھے۔

سورۂ ہود میں مزید وضاحت ملتی ہے کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کو ذبح کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا تفصیل اسکی یہ ہے کہ قوم لوطؑ پر جب عذاب کے فرشتے آئے تو ان کی پہلی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ قوم لوطؑ پر عذاب نازل کرنے آئے ہیں اور ساتھ ساتھ آپ کو بشارت بھی دینا ہے کہ عنقریب آپ کو اسحٰق نامی لڑکا پیدا ہوگا۔ اور اسحٰقؑ سے یعقوبؑ پیدا ہوگا (علیہم السلام)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی جو عمر طبعی کو پہنچ گئی تھیں اس بشارت پر تعجب کرنے لگیں۔ فرشتوں نے جواب دیا کہ یہ تم پر اللہ کی رحمتیں وبرکتیں ہیں اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ آیتِ مذکورہ اس طرح ہے:-

وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ

وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ ۔ (ہود آیت ۷۱)

"اور ابراہیم کی بیوی کھڑی تھیں پس ہنس پڑیں سو ہم نے اُن کو بشارت دی اسحٰقؑ کی اور اسحٰقؑ کے بعد یعقوبؑ کی۔"

اس آیت میں جب حضرت اسحٰق علیہ السلام کو صاحبِ اولاد ہونے کی بشارت ہو چکی تو پھر حضرت اسحٰق علیہ السلام کو ذبح کرنے کا کوئی مطلب نہ ہوتا اور نہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے عظیم امتحان قرار پاتا۔ اس لئے پہلی بشارت میں غلامٍ حلیم سے مراد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی ہیں اور جنھوں نے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مشورہ کرنے پر کہا تھا انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے۔

سورۂ مریم میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا یہی وصف بیان کیا گیا ہے جو سورۂ ہود والی آیت میں موجود ہے:-

وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِسْمٰعِیْلَ اِنَّہٗ کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ۔ (مریم آیت ۵۴)

"اور اے نبیؐ اس کتاب میں اسمٰعیلؑ کا ذکر کرو بلاشبہ وہ وعدہ کے سچے تھے۔"

یہ وہی وعدہ تھا جو اُنھوں نے اپنے والد بزرگوار حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا تھا کہ وہ آپ کے امتحان میں ثابت قدم ہوں گے اور وعدہ پورا کر دکھائیں گے۔

قصص الانبیاء کے مؤلف علامہ عبد الوہاب نجار نے ایک اور قرآنی استدلال بھی پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے ذبحِ عظیم کا یہ واقعہ بیان کر کے آخر میں اس بات پر قصے کو ختم فرمایا ہے:-

وَبٰرَکْنَا عَلَیْہِ وَعَلٰۤی اِسْحٰقَ ۔ الخ۔

(الصافات آیت ۱۱۳)

"اور ہم نے برکت نازل کی اُس پر اور اسحٰق پر۔"

عَلَیْہِ کی ضمیر کا مرجع ذبیح قرار دیا ہے اور یہ ترجمہ کیا ہے۔

"اور ہم نے برکت نازل کی اُس ذبیحؑ پر اور اسحٰقؑ پر۔"

اسکے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ پورا قصہ بیان کرنے کے بعد اسحٰق علیہ السلام کی بشارت

کا ذکر اس بات کے لئے قطعی صراحت ہے کہ صاحبِ قصہ لڑکا حضرت اسحٰق کے علاوہ ہے اور وہ صرف حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام ہی ہو سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ یہ واقعہ مکہ مکرمہ کے قریب منیٰ کے میدان میں پیش آیا۔ اس لئے اہلِ عرب میں زمانہ قدیم سے حج کے دوران قربانی کا طریقہ رائج رہا ہے۔ چنانچہ جو مینڈھا جنّت سے ذبح کے لئے اُتارا گیا تھا اُس کے سینگ سالہا سال تک خانہ کعبہ کے اندر لٹکے رہے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اس کی تائید میں کئی ایک روایات نقل کی ہیں۔

حضرت عامر شعبیؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے :-

"مَیں نے اس مینڈھے کے سینگ کعبہ کے اندر خود دیکھے ہیں"۔

(ابن کثیرؒ ج ۴ صفحہ ۱۸)

"مشہور محدّث سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ اس مینڈھے کے سینگ مسلسل خانہ کعبہ میں لٹکے رہے یہاں تک کہ جب حجاج بن یوسف کے زمانے میں کسی حادثہ سے کعبۃ اللّٰہ میں آتش زدگی ہوئی تو یہ سینگ بھی جل گئے۔

ابن کثیر ج ۴ صـ۱۷)

اور تاریخی روایات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام مکہ مکرمہ میں مقیم رہے ہیں نہ کہ حضرت اسحٰق علیہ السّلام۔ لہٰذا ذبح عظیم کا واقعہ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے ساتھ پیش آیا نہ کہ حضرت اسحٰق علیہ السّلام کے ساتھ پیش آیا۔ رہیں وہ روایات جن میں مختلف صحابہؓ وتابعین کے بارے میں مذکور ہے کہ انھوں نے ذبیح حضرت اسحٰق علیہ السّلام کو قرار دیا ہے۔ ان کے بارے میں حافظ ابن کثیرؒ کی رائے قرین قیاس معلوم ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں :-

"اللّٰہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن بظاہر یہ سارے اقوال کعب الاحبارؓ (نومسلم عالم) سے منقول ہیں۔ اس لئے کہ جب وہ حضرت عمرؓ کی خلافت میں یہودیت چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا تو حضرت عمرؓ کو اپنی پرانی کتابوں کی باتیں سنایا کرتے تھے، بعض اوقات حضرت عمرؓ اُن کی باتیں سُن لیا کرتے تھے، اس سے اور لوگوں کو بھی گنجائش ملی اور

اُنھوں نے بھی کعب احبارؒ سے روایات سُنکر انھیں نقل کرنا شروع کیا۔ ان روایات میں، ہر طرح کی رطب و یابس باتیں جمع تھیں۔ لیکن اس امّت کو ان باتوں میں سے ایک حرف کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔"

(تفسیر ابن کثیر ج۴ صفحہ ۱۷)

الغرض قرآن حکیم نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ذکر بیت اللہ کا تعمیری تذکرہ، تعمیر کرتے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی دُعا و مناجات، اقامتِ صلوٰۃ کا اہتمام، مناسک حج کا بیان اور بیت اللہ کا مرکزِ توحید ہونے کا اعلان، نہایت وضاحت کے ساتھ کئی جگہ بیان کیا ہے۔ ذیل کی آیات انہی تذکروں پر مشتمل ہیں۔

قرآنی مضمون

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ۔ الخ

بیشک پہلا گھر جو انسانوں کے لئے (خدا پرستی کا مرکز) بنایا گیا وہ یہی (عبادت گاہ) ہے جو مکّہ میں ہے برکت والا اور تمام انسانوں کے لئے سرچشمۂ ہدایت۔ اسمیں (دین حق کی) روشن نشانیاں ہیں اُن میں سے ایک مقامِ ابراہیم ہے (یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے اور عبادت کرنے کی جگہ جو اُس وقت سے لے کر آج تک بغیر کسی شک وشُبہ مشہور و معین رہی ہے) اور جو کوئی اُسکے حدود میں داخل ہوا وہ امن و حفاظت میں آگیا اور اللہ کی طرف سے لوگوں کے لئے یہ بات ضروری ہوگئی ہے کہ اگر اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت پائیں تو اس گھر کا حج کریں اور جو کوئی اس حقیقت سے انکار کرے تو یاد رکھو اللہ کی ذات تمام دنیا سے بے نیاز ہے۔"

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا۔ الخ

(بقرہ آیات ۱۲۵ تا ۱۲۹)

"اور (وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے) جس وقت ہم نے خانہ کعبہ

کہ لوگوں کا معبد اور مقامِ امن مقرر کیا (اور آخر میں امت محمدیہ کو حکم دیا کہ برکت کے لئے) مقامِ ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالیا کرو اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کی طرف حکم بھیجا کہ میرے اس گھر کو خوب پاک رکھا کرو بیرونی اور مقامی لوگوں کی عبادت کے لئے اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے واسطے۔ (اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جس وقت ابراہیمؑ نے عرض کیا اے میرے پروردگار اس جگہ کو ایک آباد شہر بنا دیجئے امن وامان والا اور وہاں کے بسنے والوں کو پھلوں کی قسم سے بھی عنایت کیجئے اُن کو جو کہ اللہ پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہوں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور اُس شخص کو بھی جو کافر رہے ایسے شخص کو تھوڑے روز یعنی دنیا میں تو خوب آرام دوں گا، پھر اُس کو کشاں کشاں عذابِ دوزخ میں پہنچا دوں گا اور وہ بُری جگہ ہے رہنے کی۔ اور جب اُٹھا رہے تھے ابراہیم (علیہ السّلام) دیواریں خانہ کعبہ کی اور اسمٰعیل (علیہ السلام) بھی (اور یہ کہتے جاتے تھے) اے ہمارے پروردگار! ہم سے قبول فرمائیے بلاشبہ آپ خوب سننے والے اور جاننے والے ہیں۔

اے ہمارے پروردگار اور ہم کو اپنا اور زیادہ مطیع بنا لیجئے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کیجئے جو آپ کی فرمانبردار ہو اور ہم کو ہمارے حج کے احکام بھی بتا دیجئے اور ہمارے حال پر توجہ فرمائیے اور فی الحقیقت آپ ہی ہیں توجہ فرمانے والے اور مہربانی کرنے والے۔

اے ہمارے پروردگار اور اُس جماعت کے اندر اُن ہی میں کا ایک ایسا رسول بھی مقرر کیجئے جو اُن لوگوں کو آپ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرے اور اُن کو کتاب (الٰہی) اور دانائی کی تعلیم دیا کرے اور اُن کو پاک کر دے بلاشبہ آپ ہی ہیں بڑے زبردست بڑے حکمت والے۔

وَاِذْ بَوَّأْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ۔ الخ

(الحج آیات ۲۶ تا ۳۳)

(اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جب ہم نے ابراہیمؑ کے لئے خانہ کعبہ کی جگہ مقرر کردی اور حکم دیا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، اور میرا یہ گھر اُن لوگوں کے لئے پاک رکھنا جو طواف کرنیوالے ہوں، عبادت میں سرگرم رہنے والے ہوں۔ رکوع سجدہ کرنے والے ہوں۔ (اور حکم دیا کہ) لوگوں میں حج کا اعلان کردے لوگ تمہارے پاس دنیا کے تمام دور دراز راہوں سے آیا کریں گے پا پیادہ اور ہر طرح کی سواریوں پر جو مشقت سفر سے تھکی ہوئی ہوں گی۔ وہ اس لئے آئینگے کہ اپنے فائدہ پانے کی جگہ میں حاضر ہوجائیں اور چند مقرر دنوں میں اُن جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے اُنھیں بخشے ہیں۔ پھر اُس میں سے خود بھی کھائیں اور تنگ دست محتاج کو بھی کھلائیں۔ پھر اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔

(یہ تھا تعمیر کعبہ کا مقصد) اور جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کا احترام کرے تو یہ اُسکے رب کے نزدیک خود اُسی کے لئے بہتر ہے اور تمہارے لئے مویشی جانور حلال کئے گئے ماسوا اُن چیزوں کے جو تمہیں بتائی جاچکی ہیں پس بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو۔ یکسو ہوکر اللہ کے بندے بنو اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گرگیا اب یا تو اُسے پرندے اُچک لے جائینگے یا ہوا اُسکو کسی دور دراز جگہ پھینک دیگی۔

یہ ہے اصل معاملہ (اسے سمجھ لو) اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر (یادگار جگہ) کا احترام کرے تو یہ دلوں کی تقوے کی بات ہے۔

تمہیں ایک وقت مقرر تک اُن (قربانی کے جانوروں) سے فائدہ اُٹھانے کا حق ہے۔ پھر اُن (کے قربان کرنے) کی جگہ اسی قدیم گھر کے پاس ہے۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ۔ الخ

(الحج آیات ۳۶ تا ۳۷)

اُور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لئے شعائر اللہ میں شامل کیا ہے۔ تمہارے لئے اُن میں بھلائی ہے۔ پس اُنہیں کھڑا کرکے اُن پر اللہ کا نام لو اور جب قربانی کے بعد اُنکی پُشتیں زمین پر ٹک جائیں (یعنی پوری طرح ذبح ہو جائیں) تو اُن میں سے خود بھی کھاؤ اور اُنھیں بھی کھلاؤ جو قناعت کئے بیٹھے ہیں اور اُنکو بھی جو اپنی حاجت پیش کریں۔ ایسے ہی ہم نے اِن جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کیا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو۔

نہ اُن (قربانیوں) کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں اور نہ خون مگر اُس کو تمہارا تقوٰی پہنچتا ہے۔ ایسے ہی اُس نے اُن (جانوروں) کو تمہارے لئے مسخر کیا ہے تاکہ اُس کی بخشی ہوئی ہدایت پر تم اُسکی تکبیر کرو اور اے نبیؐ بشارت دیدو نیکوکاروں کو"۔

سیّدنا اسمٰعیلؑ علیہ السّلام کی اَولاد

سیّدنا اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کا ذکر قرآن حکیم یا احادیث نبوی میں تفصیلاً نہیں ملتا، البتہ تورات نے ان کی تفاصیل بیان کی ہیں۔ تورات کے قول کے مطابق سیدنا اسمٰعیل علیہ السّلام کے بارہ ۱۲ لڑکے تھے جو بعد میں بارہ ۱۲ سردار کہلائے اور یہ ہی قبائلِ عرب کے جدِ اعلیٰ بنے ہیں۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی ایک لڑکی کا نام بشامہ یا محلاۃ بھی بیان کیا جاتا ہے۔ تورات کی تصریح کے مطابق اِن لڑکوں کے یہ نام ہیں:-

نابت ۱، قیدار ۲، ادبئیل ۳، مبشام ۴، مشماع ۵، دومہ ۶، مسّا ۷، حدار

تیما[۹]، یطور[۱۰]، نافیش[۱۱]، قیدما[۱۲]۔
یہ اپنی جماعتوں کے بارہ رئیس تھے۔
ان میں دو بڑے بیٹے نابت اور قیدار نے بہت شہرت پائی، عرب مؤرخین نے بھی ان کے حالات بیان کئے ہیں۔
نابت کی اولاد اصحاب الحجر کہلائی اور قیدار کی نسل اصحاب الرّس کے نام سے مشہور ہوئی اِن ہر دو کا ذکر قرآن حکیم میں موجود ہے۔

سیّدنا اسمٰعیلؑ علیہ السّلام اور قرآنِ حکیم

سیّدنا اسمٰعیل علیہ السّلام کا ذکر مبارک قرآن حکیم میں متعدّد بار آیا ہے۔ ان میں ایک جگہ "ذبح عظیم" والی آیت ہے اور دو مقام پر اُس بشارت کے موقعہ پر ذکر آیا ہے جسمیں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو اولاد کی بشارت دی گئی ہے اور سورۂ مریم میں اُن کا نام لے کر اُن کے اوصاف جمیلہ بیان کئے گئے ہیں:-

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمٰعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَبِيًّا۔
وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا۔ (مریم آیت ۵۴، ۵۵)

"اور یاد کرو کتاب میں اسمٰعیلؑ کا ذکر، بلاشبہ وہ وعدہ کے بڑے سچّے اور رسول و نبی تھے اور وہ حکم کرتے تھے اپنے گھر والوں کو نماز کا اور زکوٰۃ کا اور وہ تھے اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ۔"

وَإِسْمٰعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِينَ۔ وَأَدْخَلْنَاهُمْ فِي رَحْمَتِنَا إِنَّهُمْ مِّنَ الصَّالِحِينَ۔ (الانبیاء آیت ۸۵، ۸۶)

"اور اسمٰعیلؑ اور ادریسؑ اور ذوالکفلؑ یہ سب صبر کرنے

والوں میں سے تھے۔ اور اُن سب کو ہم نے اپنی رحمتِ خاص میں شامل کرلیا۔ بلاشبہ وہ سب نیکو کاروں میں سے ہیں۔"

سیّدنا اسمٰعیل علیہ السّلام کی وفات

حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام نے ایک سو چھتّیس (۱۳۶) سال کی عمر میں وفات پائی، اس وقت اُن کی اولاد کا سلسلہ دور دراز علاقوں میں پھیل گیا تھا۔ جس میں حجاز، شام، عراق، فلسطین اور مصر تک شامل ہیں۔

عرب مؤرخین کے بیان کے مطابق حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام اپنی ماں حضرت ہاجرہؑ کے پہلو میں بیت اللہ کے قریب حرم شریف میں مدفون ہیں۔ واللہ اعلم۔

نتائج و عبر

....پہلا وہ گھر خدا کا

بیت اللہ کی مستقل تعمیر سے پہلے دُنیا کے مختلف حصوں میں بتوں اور ستاروں کی پرستش کے لئے ہیکل اور مندر موجود تھے اور اُن ہی کے نام پر بڑی بڑی عمارتیں بنائی جاتی تھیں۔

مصریوں کے یہاں سورج دیوتا اور بعل دیوتا کے ہیکل اور مندر تھے، کنعانیوں نے مشہور قلعہ بعلبک میں اسی بعل کا مشہور ہیکل بنایا تھا جو آج تک یادگار چلا آرہا ہے۔ غزہ کے باشندے "داجون" مچھلی دیبی کے مندر پر چڑھاوے چڑھاتے تھے جسکی شکل انسان کی اور جسم مچھلی کا تھا۔

عمونیوں نے سورج دیوتا کے ساتھ چاند کو بھی دیوی بنا کر پوجا ہے اور اسکے لئے بڑا ہیکل تعمیر کیا۔

فارس نے آگ کی تقدیس مان کر آتشکدے تیار کئے۔

رومیوں نے حضرت مسیحؑ اور پاک دامن مریم کے بُت بنا کر کلیساؤں

کو زینت دی۔ ہندیوں نے مہاتما بدھ، رامچندر، مہاویر، اور مہادیو کو دیوتا اور اوتار مان کر اور کالی دیوی، سیتا دیوی اور پاربتی دیوی کے ناموں سے ہزاروں بتوں کی پرستش کے لئے بڑے بڑے مندر تعمیر کئے۔

مگر ان سب کے برعکس صرف خدائے واحد کی پرستش اور اسکی یکتائی کے اقرار میں سرِ نیاز جھکانے کے لئے دنیا کے بتکدوں میں پہلا اور سب سے پہلا گھر جو اللہ کا گھر کہلایا وہ یہی "خانہ کعبہ" ہے۔

"وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا"

تعمیر کعبہ

کعبۂ مشرفہ کا وجود انسانی تاریخ سے بہت پہلے بیان کیا جاتا ہے۔ زمین پیدا بھی نہ ہوئی تھی اس خطہ پر صرف پانی ہی پانی تھا اسوقت موجودہ خانہ کعبہ کی جگہ پانی پر ایک کثیف قسم کا جھاگ رہا کرتا تھا۔ یہ ہی جگہ کعبۃ اللہ کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ملائکۃ اللہ اسکے اطراف طواف کیا کرتے تھے۔ پھر جب اللہ نے زمین پیدا کرنی چاہی تو اسی جھاگ والے حصے سے زمین کا آغاز ہوا اور پانی کے ہر حصے پر زمین آگئی۔ کعبۃ اللہ ویسے ہی ابھرا ہوا برقرار رہا جو چھوٹے ٹیلے کی شکل میں تھا۔

جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اتارے گئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں بذریعہ وحی اس جگہ کی نشان دہی کی۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے ہاتھوں سے اسکو کچھ اونچا کیا۔ اور وہ اور ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کا طواف کیا کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ کعبۃ اللہ دس مرتبہ تعمیر کیا گیا۔ کسی عربی شاعر نے اس کو ثلاثی میں نظم کیا ہے:-

بنیٰ بیتَ ربِ العرش عشرٌ فَخُذْ هُمُ
مَلائِكَۃُ اللہ الکرام و آدمُ
فشیثٌ فابراهیمٌ ثمّ عمالِقٌ
قُصَیٌّ وقُریشٌ قبلَ هذین جُرْهُمُ

وعبد اللہ بن الزبیر بنی کذا
بناہ حجاج و ھذا متمم

اللہ کا یہ گھر دس مرتبہ از سرِ نو تعمیر کیا گیا۔
(۱) فرشتوں نے (۲) حضرت آدم علیہ السلام نے (۳) حضرت شیث علیہ السلام نے (۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے (۵) قوم عمالقہ نے (۶) قبیلہ جُرہُم نے (۷) قُصیٰ نے (۸) قریش نے (۹) عبداللہ بن زبیرؓ نے (۱۰) حجاج بن یوسف نے۔

لیکن قرآن حکیم نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو کعبۃُ اللہ کا بانی اوّل کہا ہے۔ وہ اور اُن کے صاحبزادے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اسکے معمارِ اوّل شمار کئے گئے ہیں۔ اگرچہ کعبۃ اللہ کا وجود دنیا کے روزِ اوّل ہی سے تسلیم کیا گیا ہے لیکن اس کی باقاعدہ تعمیر و عمارت سازی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل وجود میں نہ آئی تھی۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں ایک روایت نقل کی ہے کہ بیت اللہ کی سب سے پہلی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں رکھی گئی اور ملائکۃ اللہ نے اُن کو وہ مقام بتایا جہاں کعبہ کی تعمیر ہوئی تھی مگر ہزاروں سال کے حوادث نے عرصے سے اُسکو بے علامت کر دیا تھا لیکن ہر دور میں وہ ایک ٹیلہ یا اُبھری ہوئی زمین کی شکل میں موجود تھا۔ یہی وہ مقام ہے جسکو وحی الٰہی نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بتایا، اُنھوں نے حضرت اسمٰعیل کی مدد سے وہاں کھودنا شروع کیا تو سابق تعمیر کی بنیادیں منظر آنے لگیں۔ انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی پہلی باقاعدہ تعمیر کی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ جس پتھر پر کھڑے ہوکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبۃ اللہ کی دیوار اُٹھا رہے تھے وہ غیر محسوس طور پر بلند ہوتا جاتا تھا یہاں تک کہ کعبۃ اللہ کی دیواریں اپنی بلندی تک آگئیں۔ یہ ہی پتھر آج "مقام ابراہیم" کے نام سے معروف ہے جسکے پیچھے طواف کی دو رکعت ادا کی جاتی ہیں۔

جب تعمیر اس حد پر پہنچی جہاں آج حجر اسود نصب ہے تو جبرئیل امین نے اُن کی رہنمائی کی اور حجر اسود جو قریب کی پہاڑی میں منجانب اللہ محفوظ تھا

نکال کر دیا۔ یہ جنت سے نازل شدہ پتھر تھا تاکہ وہ کعبۃ اللہ میں نصب کر دیا جائے۔
کعبۃ اللہ کی موجودہ تعمیر کے بارے میں یہ تفصیل بھی تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف ۲۵ یا ۳۵ سال کی تھی اس وقت کسی بڑے سیلاب کی وجہ سے عمارت کعبہ منہدم ہو گئی تھی یہ وہ زمانہ تھا جبکہ قریش اُسکے متولی اور نگراں کار تھے۔ سیلاب کے اختتام پر قریش کے سرداروں نے اس کی از سر نو تعمیر کرنی چاہی اور اسکے لئے انھوں نے یہ طے کیا کہ اس تعمیر میں حلال و پاک روپیہ استعمال کیا جائے۔
اس طرح تعمیر شروع کی گئی لیکن سرمایہ کم ثابت ہوا اور حلال روپیہ فراہم نہ ہو سکا۔ مشورہ کے بعد انھوں نے طے کیا کہ جسقدر بھی تعمیر ممکن ہو سکے کر دی جائے چنانچہ اساسِ ابراہیمی کا کچھ حصہ (جسکا نام حطیم کعبہ ہے) تعمیر سے رہ گیا۔ تعمیر کی اساس میں دوسرا تغیر یہ کیا کہ خانہ کعبہ کے دو دروازوں میں سے ایک مغربی دروازہ بند کر دیا مشرقی دروازہ باقی رکھا۔
تیسرا تغیر یہ کیا کہ خانہ کعبہ کی چوکھٹ کو اپنی اصلی حالت سے تبدیل کر کے بہت اُونچا کر دیا۔
قواعد ابراہیمی میں یہ تبدیلی اپنے اپنے مفادات کے تحت کی گئی تھی اسطرح وہ جسکو چاہتے تھے خانہ کعبہ کے اندر جانے سے روک دیتے تھے۔
۸ھ میں مکہ فتح ہوا اسلامی دور کا مکہ معظمہ میں آغاز ہوا۔ خانہ کعبہ کو آثار شرک سے پاک کیا گیا اور اسمیں داخلہ کو عام کر دیا گیا۔ لیکن آخر وقت یعنی چراغِ نبوت گُل ہونے تک تعمیری شکل وہی باقی رہی جسکو قریش نے قائم کی تھی۔
خلافت راشدہ میں جبکہ اسلام مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ سے نکل کر عرب و عجم میں پھیل گیا تھا اُسوقت بھی اس جانب توجہ نہ دی گئی۔ ان ادوار میں خانہ کعبہ کے یہ تینوں تغیرات بدستور باقی رہے۔ ۶۰ھ ملکِ شام میں حضرت معاویہ رضؓ کی حکومت تھی۔
حضرت معاویہ بن سفیان نے اپنی وفات سے قبل اپنے بیٹے یزید بن معاویہ کو اپنا جانشین و خلیفہ نامزد کیا۔ چنانچہ وفات کے بعد یزید بن معاویہؓ کی بیعت

لوگوں نے قبول کر لی لیکن اسکی بیعت سے بہت سے لوگوں کو اختلاف بھی تھا۔
بعض اسلامی ریاستوں میں اسکی مخالفت بھی ہوئی لیکن اسکو قوت سے دبا دیا گیا خاص طور پر مدینہ منورہ میں اس بیعت کا استقبال نہ کیا گیا۔ مکہ مکرمہ میں جو دارالاسلام و دارالایمان کی حیثیت رکھتا تھا اسمیں بھی اس بیعت کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی اور لوگ کسی صحیح خلیفہ کی تلاش میں تھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اس وقت قریش کے سب سے پر اعتماد اور صاحب علم تقویٰ بزرگ کی حیثیت سے معروف تھے مکہ مکرمہ میں لوگوں نے اصرار کر کے انکے ہاتھ بیعت کر لی اور انھیں اپنا خلیفہ نامزد کر لیا۔
اس بیعت کی اطلاع جب یزید بن معاویہؓ کو ہوئی تو وہ غضبناک ہوا اور ابتدائً مصالحت و بات چیت کے لئے اپنے قاصد کو مکہ مکرمہ روانہ کیا، لیکن یہ بات چیت ناکام رہی، آخر کار یزید بن معاویہؓ نے اپنی فوج کے ایک سردار مُسلم بن عُقبہ کو حضرت ابن زبیرؓ کی گرفتاری کے لئے ایک بڑی فوج دے کر مکہ مکرمہ کی طرف روانہ کیا لیکن درمیان راہ مُسلم کی وفات ہو گئی۔ وفات سے قبل اُس نے اپنی فوج کے ایک اور سردار حُصین بن نُمیر کندی کو اس مہم کے لئے نامزد کر دیا اس نے مکہ مکرمہ پہنچکر سخت حملہ کیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے چند دن اس کا مقابلہ کیا پھر بعد مشورہ حرم شریف میں اپنے اصحاب کے ساتھ پناہ لی حُصین نے حضرت ابن زبیرؓ اور اُن کے ساتھیوں کا محاصرہ کر لیا اور اپنا دباؤ سخت تر کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ حُصین اور اُس کے ساتھیوں نے پہاڑ کے اوپر سے منجنیق (گوپی) چلائے جس سے خانہ کعبہ کی عمارت کو سخت نقصان پہنچا۔
اسی طوفان بدتمیزی میں حصین کو ملک شام سے خبر ملی کہ یزید بن معاویہؓ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس خبر سے فائدہ اُٹھا کر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے قریش کے چند با اثر افراد کو حصین کی طرف بھیجا تاکہ گفتگو کریں ان میں مشہور صحابیٔ رسول حضرت عبداللہ بن عمروؓ بھی شریک تھے اُنھوں نے حُصین کو ملک شام واپس ہو جانے پر راضی کر لیا اس طرح یہ نامرضی قضیہ اختتام کو پہنچا۔
اسکے بعد حضرت ابن زبیرؓ نے قریش کے با اثر افراد کو جمع کیا اور اُنھیں اپنی خالہ اُم المومنین عائشہ صدیقہ کی وہ روایت بیان کی جسکو وہ اکثر سنا کرتے تھے۔
"سیدہ عائشہ صدیقہؓ فرماتی تھیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کو یہ خواہش تھی کہ خانہ کعبہ کو ابراہیمی بنیاد پر پورا کر دیا جائے۔ قریش نے خرچ کی کمی کے باعث حطیم کو خانہ کعبہ سے خارج کر دیا تھا لیکن اسکو گرا کر از سر نو تعمیر کرنے میں بعض نومسلموں کے قلوب میں شک و شبہ پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لئے آپ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ (بخاری و مسلم)

اب جبکہ مکہ مکرمہ میں خلافت مکمل ہو گئی ہے تو پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کو پوری کر دینا چاہیئے اور اللہ کے گھر کا حق بھی یہی ہے کہ اسکو اپنی قدیم بنیادوں پر قائم کر دیا جانا چاہیئے۔ اس رائے کی اگرچہ اکثر صحابہ نے تائید کی لیکن بعض نے خاص طور پر حضرت عبد اللہ بن عباس رضؓ نے مخالفت کی کہ اگر یہ سلسلہ چل پڑا تو ہر آنے والا خلیفہ اپنے پیشروؤں کی مخالفت میں خانہ کعبہ کو تعمیل کا میدان بنالے گا۔

آخر کار یہ طے ہوا کہ خانہ کعبہ کو بناء ابراہیمی پر قائم کر دیا جائے۔ چنانچہ اسکو گرا کر قواعدِ ابراہیمی پر از سرِ نو قائم کر دیا گیا۔ یہ خانہ کعبہ کی نویں تعمیر تھی جو حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کے ہاتھوں پوری ہوئی۔

اس طرح خانہ کعبہ کے وہ تینوں تغیرات ختم کر دیئے گئے اور خانہ کعبہ اپنی اصلی حالت پر لوٹ آیا۔ پھر ملکِ شام میں یزید بن معاویہؓ کی وفات کے بعد لوگوں نے اسکے بیٹے معاویہ بن یزید کو اپنا خلیفہ تسلیم کر لیا لیکن اس خدا ترس بیٹے نے تین دن کے بعد یہ کہہ کر خلافت سے دستبرداری کر لی کہ میں ایسی خلافت پر رہنا نہیں چاہتا جسکی بنیاد ظلم اور فساد پر رہی ہے۔

اسکے بعد لوگوں نے عبد الملک بن مروان کو اپنا خلیفہ بنا لیا۔ عبد الملک بن مروان نے مدینہ منورہ کی گورنری کے لئے حجاج بن یوسف کو نامزد کیا اور حکم دیا کہ یزید بن معاویہ کی ناکام مہم کو پورا کرنے کے لئے مکہ مکرمہ روانہ ہو جائے۔ حجاج نے مکہ مکرمہ پہنچکر حملہ کیا اور شدید معرکہ کے بعد مکہ مکرمہ پر قبضہ کر لیا۔ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ اور اُن کے بہت سارے ساتھی اس معرکہ میں شہید ہو گئے۔ یہ واقعہ ۷۳ھ کا ہے۔

اسکے بعد حجاج نے اپنے امیر عبد الملک بن مروان کو لکھا کہ ابن زبیرؓ نے ہمارے آباء و اجداد قریش کی بنا کردہ تعمیر کعبہ کو منہدم کر کے خانہ کعبہ کی تعمیرِ جدید

کی ہے اس بارے میں امیر المومنین کی کیا رائے ہے؟
عبد الملک بن مروان نے حکم دیا کہ خانہ کعبہ کو اپنے آباء و اجداد کی بنا کردہ بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کر دیا جائے۔ چنانچہ حجاج بن یوسف نے خانہ کعبہ کو منہدم کر کے بنائے قریش پر از سر نو تعمیر کر دیا اور اس تعمیر میں وہ تینوں امور شامل کر دیئے گئے۔
(۱) حطیم کو خانہ کعبہ سے جدا کر دیا گیا
(۲) خانہ کعبہ کے دونوں دروازوں میں سے ایک مغربی دروازہ بند کر دیا گیا۔
(۳) کعبہ کی چوکھٹ کو سابقہ کی طرح بلند کر دیا گیا۔
یہ خانہ کعبہ کی دسویں تعمیر جدید تھی جو مشہور زمانہ گورنر حجاج بن یوسف کے ہاتھوں عمل میں آئی اور آج ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۸ء میں انہی بنیادوں پر قائم ہے۔
کہا جاتا ہے کہ اس تعمیر کے بعد عبد الملک بن مروان عمرہ ادا کرنے کی غرض سے مکہ مکرمہ آیا۔ بیت اللہ کے طواف کے بعد یہ کلمات کہے:۔
قَاتَلَ اللّٰهُ ابنَ الزّبیرِ حیثُ یَکْذِبُ عَلٰی اُمِّ
الْمُؤْمِنِیْنَ عَائِشَۃَ رض۔
"اللہ ابن الزبیر کا برا کرے اس نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رض
پر جھوٹی بات منسوب کر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعمیر کعبہ
کے سلسلے میں اپنی خواہش کا اظہار فرمایا تھا۔"
لیکن حارث بن ابی ربیعہ رح نے جو موقعہ پر موجود تھے فوری اسکی تردید کر دی اور فرمایا کہ میں نے خود بھی حضرت عائشہ رض سے یہ حدیث سنی ہے۔
اسپر عبد الملک بن مروان نے افسوس کا اظہار کیا اور کہنے لگا اگر یہ بات مجھے پہلے معلوم ہو جاتی تو میں اس تغیر کی جرأت نہ کرتا۔
چنانچہ جب یہ واپس ملک شام پہنچا تو وہاں کے علماء سے مزید مشورہ لیا کہ کیا میں پھر کعبہ کو اسکی اصلی حالت پر تعمیر کر دوں؟
لیکن کسی نے بھی اسکو اس بات کی اجازت نہیں دی۔ وہ ہمیشہ اس پر افسوس ہی کرتا رہا۔
"اسکے بعد ہارون رشید المتوفی ـــــھ یا مہدی بن المنصور نے

اپنے دورِ حکومت میں امام مالک بن انسؒ سے فتویٰ لینا چاہا کہ خانہ کعبہ
کو بنائے قریش سے تبدیل کر کے قواعدِ ابراہیمی پر پورا کر دیا جائے؟
اسپر امام مالکؒ نے سختی سے منع کر دیا اور اس عمل کو خانہ کعبہ کی
توہین اور تحقیر قرار دیا۔ اسکے بعد یہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔
(قصص الانبیاء ابن کثیرؒ)

اور آج خانہ کعبہ بنائے قریش ہی پر قائم ہے۔ مغربی دروازہ بند ہے۔ حطیم
خانہ کعبہ سے باہر ہے۔ اور کعبہ کا دروازہ بلند چوکھٹ پر قائم ہے۔
وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَۃِ۔

تذکرہ

سیّدنا اسحٰق علیہ السّلام

ولادتِ باسعادت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر شریف جب ۱۰۰ سو برس کی ہوئی تو اللہ تعالےٰ نے فرشتوں کے ذریعہ انھیں بشارت پہنچائی کہ حضرت سارہؓ کے بطن سے بھی تمہیں ایک اور لڑکا ہوگا اس کا نام اسحٰق رکھنا۔ اسوقت حضرت سارہؓ کی عمر شریف نوّے سال تھی۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام اپنے بڑے بھائی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے عمر میں تیرہ ۱۳ سال چھوٹے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحٰق کی بشارت بھی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی طرح ملی۔ جب حضرت اسمٰعیلؑ کی بشارت ملی تھی تو غُلَامٌ حَلِیْمٌ (ایک بُردبار لڑکا) کے الفاظ سے ملی تھی۔ اور حضرت اسحٰقؑ کی بشارت غُلَامٌ عَلِیْمٌ (علم والا لڑکا) کے الفاظ سے ملی جسکی تفصیل یہ ہے :-

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوطؑ علیہ السلام کا تاریخی زمانہ ایک ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہوتے ہیں جو شہر سدوم کی طرف مبعوث کیئے گئے تھے۔ قوم لوط کی سرکشی و بغاوت جب اُس حد کو پہنچ گئی جو علم اللہ میں کسی قوم کے تباہ و برباد کرنے کی آخری حد ہوتی ہے تو اللہ تعالےٰ نے اُس شہر کو اوندھا کر دینے کے لئے چند فرشتے بھیجے اور ساتھ ساتھ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی بشارت بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سنانے کا حکم دیا۔ فرشتے انسانی شکل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھر آئے۔ چونکہ ابتداءً اُنھوں نے اپنا تعارف نہیں کروایا تھا اسلئے

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خیال کیا کہ یہ کوئی اجنبی مہمان ہیں سلام کا جواب دے کر فوراً اُن کی ضیافت کے انتظام میں مشغول ہو گئے، اور کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ایک بُھنا ہوا بچھڑا اُن کی ضیافت کے لئے لے آئے، لیکن مہمانوں نے دسترخوان پر اپنا ہاتھ نہیں بڑھایا اور کھانے میں تامّل کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان پر شُبہ ہونے لگا اور یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ کسی بُرے ارادے سے تو نہیں آئے؟ اس سے دل میں کچھ خوف سا بھی پیدا ہوا۔

اُس زمانے کا دستور تھا کہ جب کوئی شخص کسی کی ضیافت قبول کرنے سے انکار کرتا تو یہ سمجھا جاتا کہ وہ مہمان کی حیثیت سے نہیں آیا ہے بلکہ قتل و غارت کی نیت سے آیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کھاتے کیوں نہیں؟

مہمانوں نے اس استقبال کا یوں جواب دیا:۔

"ڈرو نہیں ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں (اسلئے کھانے پینے کی ہمیں ضرورت نہیں پڑتی) ہم تو قوم لوطؑ پر عذاب نازل کرنے آئے ہیں۔"

اسپر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ خوف دُور ہوا جو دل میں پیدا ہوا تھا، اسکے بعد فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک لڑکے کی بشارت دی جو ذی علم ہوگا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ دیگر انبیاء کی طرح نبی ہوگا۔ کیونکہ انسانوں میں سب سے زیادہ علم انبیاء کرام ہی کو ہوتا ہے۔ اس لڑکے سے مراد حضرت اسحٰق علیہ السلام ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کہنے لگے کیا تم مجھ کو اس حالت میں لڑکے کی بشارت دیتے ہو جبکہ مجھ پر بڑھاپا آگیا ہے؟ ایسی حالت میں مجھکو کس چیز کی بشارت دیتے ہو؟ فرشتے بولے ہم آپ کو امر واقعی کی بشارت دیتے ہیں عنقریب تمہاری بیوی سارہؓ کو لڑکا

ہوگا آپ نااُمید نہ ہوں۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا بھلا اپنے رب کی رحمت سے کون نااُمید ہوسکتا ہے ؟ سوائے گمراہ لوگوں کے۔
جب یہ گفتگو ہو رہی تھی تو سیّدہ سارہؓ قریب ہی کھڑی سُن رہی تھیں اولاد کی خبر سنکر حیرت سے بولتی پکارتی آئیں۔ اِنکے اس تعجب کو دور کرنے کے لئے فرشتوں نے اِنھیں بھی یہی خوشخبری سُنائی کہ تمہارے ہاں اسحٰقؑ نامی جلیل القدر بیٹا ہوگا بلکہ مزید یہ بھی خوشخبری دی کہ اس بیٹے کے بعد پوتا بھی یعقوبؑ نامی عالیشان پیغمبر ہوگا۔
اس دُہری بشارت پر سیّدہ سارہؓ نے فرطِ حیرت اور تعجب میں اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور کہنے لگیں ہائے میری کم بختی کیا اب میرے ہاں اولاد ہوگی جبکہ میں بڑھیا اور بانجھ بھی ہوں اور یہ میرے میاں بھی تو بوڑھے ہو چکے ہیں ؟
فرشتوں نے کہا تعجب نہ کرو اللہ کا یہی منشا ہے اور اللہ کا فضل وکرم تو تم اہل خاندان پر ہمیشہ ہی رہا ہے۔
فرشتوں نے سیّدہ سارہؓ کو یہ خوشخبری اس لئے بھی سنائی کہ اس سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری بیوی سیّدہ ہاجرہؓ سے حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہو چکے تھے مگر سیّدہ سارہؓ اس وقت تک بے اولاد تھیں اور اس وجہ سے وہ ہمیشہ ملولِ خاطر رہا کرتی تھیں۔"

فرشتوں کی آمد، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ضیافت، سیّدہ سارہؓ کا تعجب، اور فرشتوں کی بشارت کا ذکر ذیل کی آیات میں اس طرح موجود ہے :-

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ۔ الخ

(ہود آیات ۶۹ تا ۷۳)

قرآنی مضمون | "اور بلاشبہ ہمارے فرشتے ابراہیمؑ کے پاس بشارت

لے کر آئے اُنھوں نے ابراہیمؑ کو سلام کیا۔ اور ابراہیمؑ نے سلام کا جواب دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ابراہیمؑ بچھڑے کا بُھنا گوشت لائے، اور جب اُنھوں نے دیکھا کہ مہمانوں کے ہاتھ اُس طرف نہیں بڑھتے تو ابراہیمؑ نے اُن کو اجنبی محسوس کیا اور اُن سے خوف کھایا۔ مہمان کہنے لگے خوف نہ کرو ہم لوطؑ کی قوم پر عذاب کیلئے بھیجے گئے ہیں۔ اور ابراہیم (علیہ السّلام) کی بیوی (سارہؓ) جو قریب ہی کہیں کھڑی تھیں ہنس پڑیں۔ پس ہم نے اسکو اسحٰقؑ کی اور اسکے بعد اسکے بیٹے یعقوبؑ کی بشارت دی۔

سارہؓ کہنے لگیں ہائے میری کم بختی کیا میرے اولاد ہو گی جبکہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرے شوہر ہیں بالکل بوڑھے، واقعی یہ بھی عجیب بات ہے۔

فرشتوں نے کہا کیا تم خدا کے کاموں میں تعجب کرتی ہو؟ اس خاندان کے لوگوں پر تو اللہ (تعالےٰ) کی رحمت اور اسکی برکتیں ہیں بیشک وہ تعریف کے لائق بڑی شان والا ہے۔"

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ الخ

(الذاریات آیات ۲۴ تا ۳۰)

کیا ابراہیم (علیہ السلام) کے معزز مہمانوں (فرشتوں) کی حکایت آپ تک پہنچی ہے؟

جب کہ وہ اُن کے پاس آئے پھر اُن کو سلام کیا، ابراہیم (علیہ السلام) نے بھی کہا سلام (اور کہنے لگے کہ) تم انجان لوگ معلوم ہوتے ہو؟

پھر ابراہیمؑ اپنے گھر کی طرف چلے اور ایک فربہ بچھڑا بُھنا ہوا لائے اور اُس کو اُن کے پاس لاکر رکھا کہنے لگے آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں؟ (جب پھر بھی نہ کھایا) تو اُن سے دل میں خوف پیدا ہوا۔ اُنھوں نے کہا تم ڈرو نہیں (ہم انسان نہیں بلکہ فرشتے ہیں) اور یہ (کہکر)

ان کو ایک فرزند کی بشارت دی جو بڑا عالم (یعنی نبی) ہوگا۔ اتنے میں ان کی بیوی (حضرت سارہؓ جو کہیں کھڑی سُن رہی تھیں اولاد کی خبر سنکر) بولتی پکارتی آئیں پھر (جب فرشتوں نے اُن کو بھی یہ ہی خبر سنائی تو تعجب سے) ماتھے پر ہاتھ مارا اور کہنے لگیں کہ (اوّل تو) بُڑھیا (پھر) بانجھ بھی ہوں۔

فرشتے کہنے لگے تمہارے پروردگار نے ایسے ہی فرمایا ہے اور کچھ شک نہیں کہ وہ بڑا حکمت والا بڑا جاننے والا ہے (یعنی اگرچہ یہ بات تعجب کی ہے مگر تم تو خاندانِ نبوت میں رہتی ہو تم کو تعجب نہ ہونا چاہیئے)

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرٰهِيْمَ. الخ

(الحجر آیات ۵۱ تا ۵۶)

"اور آپ اے نبی ان لوگوں کو ابراہیم کے مہمانوں (کے قصہ) کی بھی اطلاع دیجیئے۔ جب کہ وہ مہمان (جو کہ واقع میں فرشتے تھے) اُن کے پاس آئے پھر (آکر) انھوں نے السلام علیکم کہا۔ ابراہیم نے کہا ہم تو تم سے خائف ہیں۔

انھوں نے کہا کہ آپ خائف نہ ہوں کیونکہ ہم (فرشتے ہیں) آپکو ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں جو بڑا عالم ہوگا۔

ابراہیمؑ کہنے لگے کیا تم مجھ کو اس حالت پر (فرزند کی) بشارت دیتے ہو کہ مجھ پر بڑھاپا آگیا ہے سُو (ایسی حالت میں مجھکو) کس چیز کی بشارت دیتے ہو؟

وہ بولے کہ ہم آپ کو ایک یقینی بات کی بشارت دیتے ہیں (یعنی آپکے ہاں ایک لڑکا ہونے والا ہے)

سُو آپ نا امید نہ ہوں (مراد حضرت اسحٰق علیہ السلام ہیں)

ابراہیم نے کہا کہ بھلا اپنے رب کی رحمت سے کون نا امید ہوتا ہے بجز گمراہ لوگوں کے۔"

نتائج و عبر

(۱) **سُنّتِ ابراہیمی** حضرت اسحٰق علیہ السلام جب آٹھ یوم کے ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُن کا ختنہ کروایا۔

اسحٰق کا اصلی تلفظ یصحق ہے۔ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے جسکا عربی ترجمہ یَضحَکُ ہے جسکے معنی (ہنستا ہے)

اللہ تعالےٰ کے فرشتوں نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو سَو برس کی عمر اور سیدہ سارہؓ کو نوّے سال کی عمر میں جب بیٹا ہونے کی بشارت دی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تعجب و اچنبھا ہوا تھا اور سیدہ سارہؓ ہنس پڑی تھیں اسلئے بیٹے کا نام اسحٰق تجویز ہوا۔ یا اس لئے یہ نام رکھا گیا کہ ان کی پیدائش سیدہ سارہؓ کی مسرت و شادمانی کا باعث بنی۔ واللہ اعلم۔

(۲) **سیدنا اسحٰقؑ کا نکاح** قرآن حکیم میں اس تعلق سے کوئی ذکر نہیں اور نہ احادیث میں ایسا کوئی قصہ ملتا ہے جیسا کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا تذکرہ آیا ہے۔ البتہ تورات میں حضرت اسحٰق علیہ السلام کے نکاح کا ایک طویل قصہ مذکور ہے جسکا خلاصہ درج کیا جاتا ہے:۔

"حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے منھ بولے بیٹے الیعزر دمشقی سے فرمایا کہ میں نے طے کیا ہے کہ اسحٰق کی شادی اپنے خاندان اور باپ دادا کی نسل میں کروں؟ اس لئے تو ساز و سامان لیکر جا اور شہر فدّان آرام میں میرے بھتیجے بتوئیل بن ناحور کو یہ پیغام دے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح اسحٰق سے کردے۔ اگر وہ راضی ہوجائے تو اُس سے یہ بھی کہدینا کہ میں اسحٰقؑ کو اپنے پاس سے جُدا کرنا نہیں چاہتا۔ لہٰذا اپنی لڑکی کو میرے ساتھ رخصت کردے۔ الیعزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حکم کے مطابق فدّان آرام روانہ ہوگیا۔ جب آبادی کے قریب پہنچا تو اپنے اونٹ کو بٹھایا تاکہ حالات

معلوم کرے، الیعزر نے جس جگہ اپنا اونٹ بٹھایا تھا اُسی کے قریب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے بتوئیل کا خاندان آباد تھا۔ ابھی یہ اسی میں مشغول تھا کہ سامنے ایک حسین لڑکی نظر آئی جو پانی کا گھڑا لئے اپنے مکان جارہی تھی، الیعزر نے اُس سے پانی مانگا۔ لڑکی نے پانی دیا اور اُسکے اونٹ کو بھی پلایا اسکے بعد اُس لڑکی نے مسافر کا حال پوچھا الیعزر نے بتوئیل کا پتہ دریافت کیا، لڑکی نے کہا وہ میرے باپ ہیں، اسکے بعد الیعزر کو مہمان بناکر اپنے گھر لے آئی، مکان پہنچکر اپنے بھائی لابان کو اطلاع دی لابان نے الیعزر کی بیحد خاطر و مدارات کی اور آمد کی غرض پوچھی۔ الیعزر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیغام پہنچایا۔ لابان کو اس سے بیحد مسرت ہوئی اور اس نے بہت سارا ساز و سامان دے کر اپنی بہن جسکا نام رُفقہ کہا جاتا ہے الیعزر کے ہمراہ رخصت کردیا۔ اگرچہ یہ روایت تورات سے منقول ہے لیکن اپنے مضامین کے لحاظ سے ناقابل اعتبار سمجھی گئی ہے" واللہ اعلم

(۳) حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد

سیدہ رُفقہؓ سے حضرت اسحٰق علیہ السلام کے توأم دو لڑکے علی الترتیب عیصو اور یعقوب پیدا ہوئے، اسوقت حضرت اسحٰق علیہ السلام کی عمر شریف ساٹھ سال تھی اور بعض نے چالیس سال لکھی ہے۔ واللہ اعلم۔

تذکرہ
سیّدنا لوط علیہ السلام

تعارف

حضرت لوط علیہ السلام سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہوتے ہیں، دونوں کا اصلی وطن عراق کے شہر بصرہ کے قریب "ارض بابل" کے نام سے معروف تھا۔ شہر بابل کا تذکرہ سورۂ بقرہ میں موجود ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا گھرانہ بت پرستی و بت سازی میں مشہور تھا اور ساری قوم بُت پرست تھی۔ اس قوم کی ہدایت کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مسلسل جدوجہد، دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں قوم نے، ماں باپ نے، بادشاہِ وقت نے انکو شہر بدر کر دیا تھا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی حضرت سارہؓ اور بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کے ساتھ وطن عراق سے ملک شام کی طرف ہجرت فرمائی۔ نہر اردن پر پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام علاقہ کنعان میں جاکر مقیم ہوگئے جو بیت المقدس کے قریب ہے اور حضرت لوط علیہ السلام اردن اور بیت المقدس کے درمیان شہر سدوم کے لوگوں کی ہدایت کے لئے مامور کئے گئے۔

سدوم کا علاقہ پانچ بڑے شہروں پر مشتمل تھا جن کے یہ نام بیان کئے جاتے ہیں:۔

اہل سدوم

سدوم، عمورہ، ادمہ، صبوبیم، بالع (دیا) صوغر۔

اِن شہروں کے مجموعہ کو قرآن حکیم نے مُؤتَفِکَۃ، مُؤتَفِکَات (تلپٹ شدہ بستیاں) کے الفاظ سے کئی ایک جگہ بیان کیا ہے۔

سدوم اِن شہروں کا دار السلطنت اور مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام

نے یہیں قیام فرمایا تھا۔ زمین نہایت سرسبز و شاداب تھی۔ ہر طرح کے غلّے اور پھلوں کی کثرت تھی۔

اِن شہروں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے دروازے کھول دیئے تھے، دولت و ثروت کے نشہ میں مبتلا ہو کر یہ لوگ عیش و عشرت ہوا و ہوس کے اُس کنارے تک پہنچ گئے تھے جہاں انسان غیرت و حیا، اور اچھے و بُرے کی فطری تمیز بھی کھو بیٹھتا ہے ایسے خلافِ فطرت فواحش میں مبتلا ہو گئے جو حرام و گناہ ہونے کے علاوہ فطرتِ سلیمہ کے لئے باعثِ نفرت ہیں۔ اور ایسے گھناؤنے کام کرنے لگے جو جانوروں میں بھی غالباً رائج نہیں ہیں۔

یہ لوگ خباثت میں ڈوب گئے تھے، بات صرف اس حد تک ہی نہیں رہی بلکہ وہ فطرت اور پاکیزگی کی راہ سے ہٹکر ایک گندی خلافِ فطرت راہ پر چل پڑے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اِن کی ساری رغبت اور تمام دلچسپی اب اسی گندی راہ ہی میں تھی۔ یہ اخلاق کے زوال اور نفس کے بگاڑ کا انتہائی مرتبہ ہے جس سے فرو تر کسی مرتبہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ قوم اپنے عیوب و فواحش کے علاوہ ایک خبیث عمل کی موجد تھی، یعنی اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے وہ عورتوں کے بجائے نوعمر لڑکوں سے اختلاط رکھتے تھے۔ دنیا کی قوموں میں اِس عمل کا اُس وقت تک قطعاً کوئی رواج نہ تھا۔ یہی بدبخت قوم تھی جس نے اس ناپاک عمل کو ایجاد کیا ہے۔ وہ اپنی اس بدکرداری کو کوئی عیب ہی نہیں سمجھتے تھے علی الاعلان فخر کے ساتھ اس کو کرتے تھے۔

ملک اُردن جہاں آج بحرِ میّت یا بحرِ لوط واقع ہے یہی وہ جگہ ہے جس میں سدُوم اور عامورہ کی بستیاں آباد تھیں اسکے قریب بسنے والوں میں آج بھی یہ اعتقاد ہے کہ پہلے وہ تمام حصّہ جو اب سمندر نظر آتا ہے کسی زمانے میں خشک زمین تھی اور اُس پر شہر آباد تھے۔ یہ مقام شروع سے سمندر نہ تھا بلکہ قوم لوط پر عذاب آیا اور اس سرزمین کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور سخت زلزلے اور بھونچال آئے جسکے نتیجے میں یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر کے نیچے چلی گئی اور پانی اُبھر آیا۔ اسی لئے اس کا نام بحرِ میّت (بحرِ مُردار) اور بحرِ لُوط ہے۔

تینؔ قومی جرائم | اہل سدوم کے معاشرے میں بیشمار جرائم کی فہرست ملتی ہے لیکن اس معاشرے کے تین جرائم ایسے ہیں جنکو تاریخی حیثیت کے اعتبار سے اُم الخبائث کا نام دیا جاسکتا ہے۔

اوّل مرد کی مرد کے ساتھ بدفعلی۔ دوم مسافروں کو لوٹ لینا۔ سوم اپنے مجالسِ عام میں اعلاناً سب کے سامنے گناہ کرنا۔

قرآن حکیم نے اِنکے پہلے دو گناہ کی تصریح کی ہے لیکن تیسرے جرم کی تعیین نہیں کی کہ وہ کس قسم کا تھا؛ اجمالاً یہ وضاحت کی ہے کہ وہ اپنی مجالسِ عام میں علی الاعلان گناہ کرتے تھے۔

ان تین گناہوں میں سب سے بدترین گناہ پہلا عمل ہے جو اِن سے پہلے دُنیا میں کسی نے نہیں کیا تھا اور جنگل کے جانور بھی اس سے پرہیز کرتے ہیں مصنف روح المعانی نے لکھا ہے کہ یہ گناہ باتفاقِ امت زنا سے زیادہ شدید ہے۔

اسکے علاوہ اِن کی بداعمالیوں میں ایک عمل یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ باہر سے آنے والے تاجروں اور سوداگروں کا مال ایک نئے انداز سے لوٹ لیا کرتے تھے چنانچہ اِن کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی سوداگر باہر سے آکر شہر سدوم میں آکر مقیم ہوجاتا تو اس کے مال کے دیکھنے کے بہانے سے ہر شخص تھوڑی تھوڑی چیزیں اُٹھاتا اور لے کر چل دیتا اور تاجر حیران و پریشان ہوکر رہ جاتا، اب اگر وہ اپنے مال کا شکوہ کرتا اور رونے دھونے لگتا تو اِن لُٹیروں میں سے ایک آتا اور لُوٹی ہوئی دو ایک چیزیں دکھلا کر کہنے لگتا کہ بھائی میں تو صرف اتنا لے گیا تھا تو تمہاری یہ چیز موجود ہے۔ وہ تاجر رنجیدہ آواز میں کہتا کہ میں اسکو لے کر کیا کروں گا؟ جہاں میرا سارا سامان لُٹ گیا وہاں یہ بھی سہی۔ جا تو ہی اپنے پاس رکھ لے۔ جب یہ معاملہ ختم ہوجاتا تو دوسرا آتا اور وہ بھی اسی طرح کوئی معمولی چیز دکھا کر وہی کہتا جو پہلے نے کہا تھا اور سوداگر رنج وغم میں اس سے بھی پہلی بات کہہ کر لوٹا دیتا اسی طرح سب لوگ اُس کا مال ہضم کرجاتے۔

اسی طرح ایک اور واقعہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ حضرت لوط علیہ السّلام کی خیروعافیت معلوم کرنے کے لئے

اپنے خانہ زاد الیعزر دمشقی کو سدوم بھیجا۔ جب یہ اُس بستی کے قریب پہنچا اسکو اجنبی سمجھکر ایک سدومی نے اسکے سر پر ایک پتھر مار دیا۔ الیعزر کے سر سے خون جاری ہوگیا، پھر آگے بڑھکر وہ سدومی کہنے لگا کہ میرے پتھر کی وجہ سے تیرا سر سُرخ ہوگیا ہے لہذا مجھے اس رنگریزی کا معاوضہ ادا کر؟ اور اس مطالبے پر اسکو کھینچتا ہوا سدوم کی عدالت میں لے گیا۔ حاکم سدوم نے مدعی کا بیان سنکر کہا کہ بیشک الیعزر کو سدومی کے پتھر مارنے کی اُجرت دینی چاہیئے۔

الیعزر یہ فیصلہ سنکر غصہ میں آگیا اور ایک پتھر اٹھاکر حاکم کے سر پر دے مارا اور حاکم کا سر سُرخ کردیا اور پھر کہنے لگا کہ میرے پتھر مارنے کی جو اُجرت ہے وہ تو اِس سدومی کو دیدے اور یہ کہہ کر وہاں سے بھاگ آیا۔

یہ واقعات اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں۔ صحیح ہوں یا غلط لیکن اِن سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اہل سدوم کس قدر فحش، ظلم، بے حیائی، بداخلاقی اور فسق و فجور میں مبتلا تھے کہ اُس زمانے میں قوموں نے اُن کی جانب اس قسم کے واقعات عام طور پر منسوب کئے ہیں۔

دعوت و تبلیغ

ان حالات میں حضرت لوط علیہ السّلام نے ان کو اِن کی بیحیائیوں اور خباثتوں پر ملامت کی اور شرافت و طہارت کی زندگی پر رغبت دلائی اور ممکن طریقوں سے اُن کو اللہ تعالےٰ کا پیام سنایا اور گزشتہ اقوام کی بداعمالیوں کے نتائج و عواقب بتاکر عبرت دلائی مگر اِن بے نصیبوں نے اس کا کچھ بھی اثر قبول نہیں کیا بلکہ حضرت لوط علیہ السّلام کو دھمکیاں دینے لگے کہ اگر تمہارا یہی حال رہا تو تمہیں شہر بدر کردیا جائے گا۔ تم بڑے پاکباز بننے کی کوشش کرتے ہو۔ پھر اپنے سرداروں کو آواز دیتے کہ لوط اور اُن کے ساتھیوں کو اپنے شہر سے نکال باہر کرو۔ یہ لوگ پاکباز ہیں اور پاکی و طہارت کی باتیں کرتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ہمارے یہ کام اگر حرام و ناجائز ہیں تو پھر تم کو ہمارے شہر میں رہنے کی کوئی گنجائش نہیں کوئی اور شہر دیکھ لو اور ہمیں اپنا یہ کام آزادانہ کرنے چھوڑ دو۔ یہ لوگ نہ صرف بے حیا و بدکردار اور بداخلاق تھے بلکہ اخلاقی پستی میں اس حد تک گر گئے تھے کہ انھیں اپنے درمیان چند ایک

نیک انسانوں اور نیکی کی طرف بلانے والوں اور بدی پر ٹوکنے والوں کا وجود تک گوارہ نہ تھا، وہ فحش کاری میں یہاں تک آگے بڑھ گئے تھے کہ اصلاح وخیر خواہی کی آواز کو بھی برداشت نہ کر سکتے تھے اور پاکی وطہارت کے اس تھوڑے سے مقدس عنصر کو بھی نکال باہر کرنا چاہتے تھے جو ان کی گندی فضا میں باقی رہ گیا تھا۔

ایسے تباہ کن حالات میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے انکو دی گئی مہلت اپنے آخری حد تک آگئی اور علم اللہ میں وہ ڈھیل جو مجرم قوموں کو دی جاتی ہے پوری پوری ہو چکی تو اب اُنکے استیصال کا فیصلہ صادر ہوا۔ کیونکہ جس قوم کی اجتماعی زندگی میں پاکیزگی کا ذرا سا بھی عنصر باقی نہ رہ سکے پھر اُسکے زمین پر زندہ رہنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ سڑے ہوئے پھلوں کے ٹوکرے میں جب تک چند ایک اچھے پھل موجود ہوں اُس وقت تک تو ٹوکرے کو رکھا جا سکتا ہے مگر جب اچھے پھل بھی اس میں سے نکل جائیں تو پھر اس ٹوکرے کا کوئی مصرف اِسکے سوا نہیں رہتا کہ اس کو کسی کچرے کی جگہ پر اُلٹ دیا جائے۔

ملائکۃُ اللہ کی آمد

اہل سدوم اپنی خرمستیوں میں منہمک تھے ادھر دوسری جانب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جو شہر سدوم سے بارہ پندرہ میل پر مقیم تھے یہ واقعہ پیش آیا:۔

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام شکار کے لئے جنگل کی سیر کر رہے تھے کہ دیکھا کہ تین آدمی کھڑے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہایت متواضع ومہمان نواز تھے اور ہمیشہ اُن کا دستر خوان مہمانوں کے لئے وسیع تھا۔ اس لئے ان تینوں کو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے اور ان کو اپنے گھر لے گئے اور ایک فربہ بچھڑا تل بھون کر مہمانوں کے سامنے رکھ دیا۔ مگر مہمان کھانے کی طرف کچھ مائل نہ ہوئے۔ یہ دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سمجھا کہ شاید یہ دشمن لوگ ہیں جو عام رواج کے خلاف کھانے سے انکار کر رہے ہیں۔ پھر ان کو کچھ خوف ہونے لگا کہ آخر یہ کون لوگ ہیں اور کس لئے آئے ہیں؟

مہمانوں نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اضطراب دیکھا تو اُن سے ہنس کر کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں۔ ہم اللہ تعالےٰ کے فرشتے ہیں اور قوم لوط کی تباہی کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ اور یہاں سے شہر سدوم جائیں گے۔

اور آپ کو ایک فرزند کی بشارت بھی دینے آئے ہیں جو عنقریب آپ کے ہاں پیدا ہوگا۔ اس وضاحت پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان ہوگیا کہ یہ کوئی دشمن نہیں ہیں بلکہ اللہ کے فرستادہ فرشتے ہیں تو اب اُنکی قلبی رقت اور محبت و شفقت جو ایک نبی کو امت سے ہوتی ہے اُبھر آئی اور اُنھوں نے فرشتوں سے قوم لوط کے بارے میں جھگڑنا شروع کردیا فرمانے لگے تم اس قوم کو کیسے برباد کرنے جارہے ہو جس میں لوط (علیہ السلام) جیسا برگزیدہ بندہ موجود ہے۔ وہ تو میرا برادرزادہ بھی ہے اور وہ مجھ پر ایمان بھی لاچکا ہے بھلا تم لوگ ایسی قوم کو کس طرح ہلاک کروگے جبکہ وہ اُن میں موجود ہے؟

فرشتوں نے جواب دیا، ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں مگر اللہ تعالےٰ کا فیصلہ یہی ہے کہ قومِ لوط اپنی سرکشی، بغاوت، بے حیائی اور فواحش پر اصرار کی وجہ سے ہلاک کردی جائے۔

ہاں لوط (علیہ السلام) اور اُن کا خاندان اس ہلاکت سے محفوظ رہے گا۔ البتہ لوط (علیہ السلام) کی بیوی اپنی قوم کی حمایت اور اُن کا ساتھ دینے پر قوم کے ساتھ عذاب کا مزہ چکھے گی۔

قرآن حکیم کا یہ مضمون ذیل کی آیات میں تفصیلاً موجود ہے:۔

قرآنی مضمون فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرٰهِيمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ۔ الخ

(ہود آیات ۷۴ تا ۷۶)

پُھر جب ابراہیم (علیہ السلام) سے خوف جاتا رہا اور اُن کو ہماری بشارت (ولادتِ اسحٰق) کی پہنچ گئی تو وہ ہم سے قوم لوط کے متعلق جھگڑنے لگے۔

بیشک ابراہیم (علیہ السلام) بُردبار، نہایت نرم دل اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع ہونے والے تھے۔ (آخر کار ہمارے فرشتوں نے اُن سے کہا) اے ابراہیم (علیہ السلام) اس معاملے میں نہ پڑو بلاشبہ

رب کا حکم آچکا ہے اور بلا شبہ اُن پر عذاب آنے والا ہے جو ٹل نہیں سکتا۔

سورۃ الذاریات میں بھی یہی تذکرہ موجود ہے :۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ. قَالُوٓا إِنَّآ أُرْسِلْنَآ إِلَىٰ قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ. الخ

(الذاریات آیات ۳۱ تا ۳۷)

"ابراہیم (علیہ السّلام) نے کہا اے اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتو! تم کس لئے آئے ہو؟ انھوں نے جواب دیا ہم مجرم قوم کی جانب بھیجے گئے ہیں۔ تاکہ اُن پر پتھروں کی بارش کریں۔ (ایسے پتھر) جو نشان کر دیئے گئے ہیں تیرے رب کی جانب سے حد سے گزرنے والوں کیلئے (جو اُن کو ہلاک کر دیں) پھر ہم نے جتنے ایماندار تھے سب کو وہاں سے علیحدہ کر دیا۔ بجز مسلمانوں کے ایک گھر کے اور کوئی گھر ہم نے نہیں پایا (یعنی پورا شہر تہس نہس ہوگیا) اور ہم نے اس واقعہ میں ایسے لوگوں کے لئے عبرت رکھی ہے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں۔"

سورۂ عنکبوت میں بھی یہی تذکرہ ملتا ہے :۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ إِبْرَٰهِيمَ بِالْبُشْرَىٰ قَالُوٓا إِنَّا مُهْلِكُوٓا أَهْلِ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ إِنَّ أَهْلَهَا كَانُوا ظَالِمِينَ.

(العنکبوت آیات ۳۱ تا ۳۲)

"اور جب ہمارے فرشتے ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس بشارت (اسحٰق) لے کر آئے کہنے لگے بیشک ہم ہلاک کرنے والے ہیں اس (سدوم) شہر کے بسنے والوں کو بلا شبہ اس کے باشندے ظالم ہیں۔

ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا اس شہر میں تو لوط (علیہ السلام) (پیغمبر) موجود ہے؟ بولے ہمیں خوب معلوم ہے جو اس بستی میں آباد ہے۔ البتہ ہم لوط (علیہ السّلام) اور اُن کے خاندان کو نجات دینگے مگر انکی

بیوی کو نہیں کہ وہ بھی شہر میں رہ جانے والوں کے ساتھ ہے۔"

ملائکۃ اللہ اور سیدنا لوط علیہ السلام

حضرت لوط علیہ السلام اللہ تعالےٰ کا پیغام اپنی قوم کو مسلسل دیتے رہے لیکن قوم اپنی بداخلاقیوں پر اُسی طرح قائم رہی۔ حضرت لوط علیہ السلام نے یہاں تک غیرت دلائی کہ اے قوم تم اس بات کو نہیں سوچتے کہ میں رات دن تمہاری نصیحت وخیر خواہی میں مشغول ہوں کبھی بھی میں نے تم سے اپنی سعی وکوشش کا کوئی بدلہ طلب نہیں کیا ہے اور نہ کسی اُجرت کا طالب ہوں۔ میرے پیش نظر صرف اور صرف تمہاری خیر خواہی اور سعادت وفلاح کے سوائے اور کچھ نہیں مگر تم ذرا بھی توجہ نہیں کرتے؟ لیکن اس ساری خیر خواہی کا اثر اُنکے مجرم دلوں پر کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ وہ حضرت لوط علیہ السلام کو شہر بدر کرنے اور سنگسار کرنے کی دھمکی دیتے رہے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی اور اُن کی سیاہ بختی نے کسی طرح انکو پاکیزہ زندگی پر آمادہ نہ ہونے دیا، تب اُس قوم کو بھی وہی سابقہ پیش آیا جو اللہ تعالےٰ کے قانونِ جزا کا یقینی وحتمی نتیجہ ہوتا ہے۔

الغرض اللہ کے یہ فرستادہ فرشتے جن کے بارے میں حضرت ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ:۔

> "حضرت جبرئیلؑ، حضرت میکائیلؑ، حضرت اسرافیلؑ تھے۔ یہ فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے روانہ ہوکر شہر سدوم پہنچے اور حضرت لوط علیہ السلام کے ہاں مہمان ہوئے۔ فرشتے حسین وجمیل نوعمر لڑکوں کی شکل وصورت میں آئے تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے جب ان مہمانوں کو دیکھا تو گھبرا گئے اور اندیشہ کیا کہ بدبخت قوم میرے ان مہمانوں کے ساتھ معلوم نہیں کیا معاملہ کرے گی؟
>
> کیونکہ ابھی تک مہمانوں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم فرشتے ہیں اور قوم کو سزا دینے آئے ہیں۔ ابھی اسی تردد میں تھے کہ قوم کو خبر لگ گئی کہ لوط (علیہ السلام) کے گھر چند حسین وجمیل لڑکے مہمان آئے ہیں۔ بس کیا تھا یکدم ٹوٹ پڑے اور حضرت لوط علیہ السلام

سے مطالبہ کرنے لگے کہ تم اِن لڑکوں کو ہمارے حوالے کر دو۔
حضرت لوط علیہ السلام نے اِن سے کہا کہ یہ میرے معزز مہمان ہیں، میں انہیں تمہارے کیوں کر حوالہ کر دوں؟ یہ سخت بات ہے کہ مہمانوں کی بے عزّتی کی جائے۔
اے قوم کے لوگو! کیوں اس لعنت میں گرفتار ہو، خواہشات نفس کے لئے فطری طریقہ اختیار کرو، حلال طور پر عورتوں کو اپنا رفیقۂ حیات بناؤ، قوم میں لڑکیوں کی کمی نہیں، اپنے عقد نکاح میں انھیں داخل کر لو، لیکن قوم نے اِسکا یہ ہی جواب دیا کہ اے لوطؑ تم کو معلوم ہے کہ ہم کو عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور تم جانتے ہی ہو کہ ہمارا ذوق اور مزاج کیا ہے؟ حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر ایسا ہی ہے تو تم میرے مہمانوں کے ساتھ زیادتی نہ کرو۔ اے یہ میرے مہمان ہیں مہمان۔ اِسپر بدبخت قوم نے جواب دیا اے لوطؑ ہم نے تم سے بارہا کہہ دیا تھا کہ تم دوسروں کی ذمہ داری قبول نہ کرو۔
حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا اے قوم! کیا تم میں کوئی سمجھدار آدمی بھی نہیں ہے کہ کم از کم وہ بات تو سمجھے؟ اللہ کے لئے مجھے رسوا نہ کرو اور مجھکو معاف کرو۔ لیکن قوم اپنی مستی میں اندھی ہو چکی تھی۔ آخر حضرت لوط علیہ السلام پکار اُٹھے اے کاش! کہ آج میرے ہاں کوئی قوت و طاقت ہوتی تو اپنے مہمانوں کی حفاظت کر لیتا اور تمہیں مزہ چکھاتا۔ اِدھر حضرت لوط علیہ السلام کی بیقراری و پریشانی دیکھ کر مہمانوں نے کہا اے لوطؑ گھبرائیے نہیں ہم اللہ کے فرستادہ فرشتے ہیں یہ ہرگز ہرگز ہمارے قریب بھی نہیں آسکتے چہ جائیکہ کچھ بدتمیزی کریں۔ ہم اس قوم کا عذاب لے آئے ہیں۔ اللہ کا فیصلہ ہو چکا ہے، وہ ٹلنے والا نہیں۔ ابھی صبح بھی نہ ہونے پائے گی کہ اسکا کام تمام ہو جائے گا۔
پھر فرشتوں نے کہا اے لوطؑ تم اور تمہارے گھر والے صبح سے پہلے پہلے شہر سے باہر ہو جائیں اور یاد رکھو کہ کوئی بھی تم میں سے پلٹ کر

بھی نہ دیکھے۔ البتہ آپکی بیوی انہی بے حیاؤں کے ساتھ رہے گی اور تمہارا ساتھ نہ دے گی۔ آپ اُسکی فکر نہ کریں وہ بھی ہلاک ہونے والوں میں شامل ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام اپنے اہل خاندان اور مسلمین کو لیکر گھر سے باہر ہو گئے۔ چلتے وقت بیوی نے آپکی رفاقت سے انکار کر دیا اور قوم کا ساتھ دینا پسند کیا۔ آخر حضرت لوط علیہ السلام نے رات ہی کو شہر چھوڑ دیا۔ جب آخر شب ہوئی تو ابتداءً ایک ہیبت ناک چیخ نے شہر والوں کو دہلا دیا اور پھر پورے شہر کو مع زمین اوپر اُٹھا کر انتہائی بلندی سے الٹ دیا گیا اور اسکے بعد پتھروں کی تیز بارش بھی برسائی گئی، وہی سب کچھ ہوا جو نافرمان قوموں کی سرکشی کا انجام ہوا کرتا ہے۔"

صحیح بخاری کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ کے متعلق فرمایا کرتے تھے:۔

"اللہ تعالےٰ لوط (علیہ السلام) پر رحم فرمائیں وہ کسی مضبوط جماعت کی پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔"

اور ترمذی کی روایت میں اسکے ساتھ یہ اضافہ بھی ملتا ہے کہ:۔

"حضرت لوط علیہ السلام کے بعد اللہ تعالےٰ نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جسکا کنبہ قبیلہ اُسکا حمایتی نہ رہا ہو۔" (قرطبی)

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کفار قریش نے ہزار تدبیریں کیں لیکن آپکے خاندان نے آپکی حمایت کی، اگرچہ مذہباً وہ آپؐ کے موافق نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پورے بنی ہاشم اُس مقاطعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے جس میں کفار قریش نے آپکا کھانا پانی بند کر دیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ:۔

"اُس وقت جب قوم لوط اِن کے گھر پر چڑھ آئی تھی تو حضرت لوط علیہ السلام نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا تھا اور یہ گفتگو اس

شریر قوم سے اس طرح ہو رہی تھی کہ فرشتے مکان کے اندر تھے۔ اِن لوگوں نے دیوار پھاند کر اندر گھسنے کا ارادہ کیا اُسپر حضرت لوط علیہ السلام کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آگئے "اُے کاش! آج مجھے کسی مضبوط جماعت کی حمایت حاصل ہوتی"

مہمانوں نے جب حضرت لوط علیہ السلام کا اضطراب دیکھا تو حقیقت کھول دی اور کہنے لگے کہ آپ دروازہ کھول دیں اب ہم اِن کو عذاب کا مزہ چکھاتے ہیں۔ دروازہ کھولا تو جبرئیل امین نے اپنے ایک پَر کا اشارہ قوم کی آنکھوں کی طرف کیا جس سے وہ سب اندھے ہو گئے اور بھاگنے لگے۔ اسکے بعد فرشتوں نے حضرت لوطؑ سے کہا آپ رات کے آخری حصے میں اپنے گھر والوں کو لیکر یہاں سے نکل جائیے اور ہر ایک کو ہدایت کیجئے کہ کوئی پیچھے مڑکر نہ دیکھے"

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بھی ساتھ چلی مگر جب قوم پر عذاب کا دھماکہ سنا تو پیچھے مڑکر دیکھا اور قوم کی تباہی پر افسوس کرنے لگی اسی وقت ایک پتھر آیا جس نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ (قرطبی ومظہری)

اس عذاب کی کیفیت کو قرآن حکیم نے اس طرح بیان کیا کہ:-

"جب ہمارا عذاب آگیا تو ہم نے ان بستیوں کے اوپر کا حصہ نیچے کر دیا اور اُن پر ایسے پتھروں کی بارش کی جن پر ہر ایک کے نام کی علامت تھی۔ یہ چار بڑے شہر تھے جن میں یہ خبیث قوم آباد تھی، قرآن حکیم نے اِن شہروں کو "مُؤْتَفِکَاتِ" کے نام سے موسوم کیا ہے (تل پٹ شدہ بستیاں)

انہی روایات میں یہ وضاحت بھی آئی ہے کہ:-

جُبرئیل امین نے اپنا پَر ان سب شہروں کی زمین کے نیچے پہنچا کر سب کو اس طرح اوپر اُٹھالیا کہ ہر چیز اپنی جگہ قائم رہی، پانی کے برتن سے پانی تک گرنے نہ پایا، آسمان کی طرف سے کتوں اور جانوروں اور انسانو کی آوازیں آرہی تھیں۔ اِن سب بستیوں کو آسمان کی طرف سیدھا اُٹھائ

کے بعد اوندھا کرکے پلٹ دیا۔ جو ان کے خبیث عمل کے مناسب حال تھا۔"
ملائکۃ اللہ کی حضرت لوط علیہ السلام کے ہاں آمد اور گفتگو، قوم کا ہجوم کرنا، اور رُسوا کن عذاب کی تفصیلات ذیل کی آیات میں موجود ہے :-

قرآنی مضمون فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ۣالْمُرْسَلُوْنَ. قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ. الخ (الحجر آیات ۶۱ تا ۷۷)

پُس جب بھیجے ہوئے فرشتے خاندانِ لوطؑ کے پاس آئے۔ لوطؑ نے کہا تم لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہو؟ اُنھوں نے کہا نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ ہم تمہارے پاس وہ بات لے کر آئے ہیں جس میں لوگ شک کیا کرتے ہیں (یعنی ہلاکتِ قوم کی خبر) ہمارا آنا ایک امرِ حق کے لئے ہے اور ہم اپنے بیان میں سچے ہیں۔ پس چاہیئے کہ رات کے آخری حصہ میں اپنے گھر والوں کو لیکر نکل جائیے۔ اور اُن کے پیچھے قدم اُٹھائیے اور اس بات کا خیال رکھیے کہ کوئی پیچھے مڑکر نہ دیکھے اور جہاں جانے کا حکم دیا گیا ہے چلے جائیے۔

اور ہم نے لوط (علیہ السلام) پر یہ حقیقت ظاہر کر دی کہ شہر والوں کی بیخ و بنیاد صبح ہوتے ہوتے اُکھڑ جانے والی ہے۔

(اور اسی اثناء میں ایسا ہوا کہ) شہر کے لوگ خوشیاں مناتے لوط (علیہ السلام) کے گھر آ پہنچے۔ لوط (علیہ السلام) نے کہا دیکھو یہ میرے مہمان ہیں تم میری رسوائی نہ کرو۔ اور اللہ سے ڈرو اور مجھ کو رُسوا نہ کرو۔

وہ کہنے لگے کیا ہم آپ کو دنیا بھر کے لوگوں سے منع نہ کر چکے تھے؟ لوط (علیہ السلام) نے کہا یہ میری بہو بیٹیاں ہیں اگر تم کو کچھ کرنا ہی ٹھیرا ہے۔

اے نبیؐ آپ کی جان کی قسم وہ اپنی مستی میں مدہوش تھے۔
پس سورج نکلتے نکلتے اُن کو سخت آواز نے آدبایا۔ پھر ہم نے اُن بستیوں کا اوپری تختہ نیچے کر دیا اور اُن پر کنکر کے پتھر برسانا شروع کئے۔ اس

واقعہ میں کئی نشانیاں ہیں اہل بصیرت کے لئے۔ اور یہ بستیاں ایک آباد سڑک پر ملتی ہیں۔ اُن بستیوں میں اہلِ ایمان کے لئے بڑی عبرت ہے۔"

وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ الخ۔

(العنکبوت آیات ۳۳ تا ۳۵)

"اور جب ہمارے وہ فرستادہ لوط (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو لوط (علیہ السلام) اُنکے آنے کی وجہ سے مغموم ہوئے (کیونکہ فرشتے نہایت حسین لڑکوں کی شکل میں آئے اور لوط (علیہ السلام) کو اپنی قوم کی نامعقول حرکت کا خیال آیا) اور اُن کے سبب سے دل تنگ ہوا اور وہ فرشتے کہنے لگے آپ اندیشہ نہ کریں اور نہ مغموم ہوں ہم آپ کو اور آپکے خاص متعلقین کو بچا لینگے بجز آپکی بیوی کے کہ وہ عذاب میں رہ جانے والوں میں ہوگی۔

ہم اس بستی کے باشندوں پر ایک آسمانی عذاب اُن کی بدکاریوں کی سزا میں نازل کرنے والے ہیں۔

اور ہم نے اس بستی کے کچھ ظاہری نشان (ابتک) رہنے دیئے ہیں اُن لوگوں کے عبرت کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔"

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ۔ الخ

(ہود آیات ۷۷ تا ۸۳)

اور جب ہمارے وہ فرشتے لوط (علیہ السلام) کے پاس آئے تو لوط (علیہ السلام) اُن کی وجہ سے مغموم ہوئے اور ان کے سبب تنگ دل ہوئے اور کہنے لگے کہ آج کا دن بہت بھاری ہے (کیونکہ قوم حسین لڑکوں پر فریفتہ تھی) اور اُن کی قوم ان کے پاس دوڑی ہوئی آئی اور وہ پہلے سے نامعقول حرکتیں کیا ہی کرتے تھے، لوط علیہ السلام کہنے لگے اے میری قوم یہ میری بہو بیٹیاں (جو تمہارے گھروں میں

ہیں وہ تمہارے لئے پاکیزہ ہیں۔ اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے بارے میں مجھکو رسوا نہ کرو کیا تم میں کوئی بھی بھلا مانس نہیں؟ وہ لوگ کہنے لگے آپ کو معلوم ہے کہ ہم کو آپ کی اِن بیٹیوں کی کوئی ضرورت نہیں اور آپ کو تو معلوم ہے جو ہمارا مطلب ہے۔

لوط (علیہ السلام) فرمانے لگے کیا خوب ہوتا اگر میرا تمپر کچھ زور چلتا یا کسی مضبوط پایہ کی پناہ پکڑتا۔ فرشتے کہنے لگے اے لوطؑ ہم تو آپ کے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں آپ تک ہرگز انکی رسائی نہیں ہوگی سُو آپ رات کے کسی حصہ میں اپنے گھر والوں کو لیکر چلے جائیے اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑکر بھی نہ دیکھے ہاں مگر آپ کی بیوی نہ جائیگی اُس پر بھی وہی آفت آنے والی ہے جو اور لوگوں پر آئے گی، انکے دعوے کا وقت صبح کا ہے کیا صبح کا وقت قریب نہیں؟

سو جب ہمارا حکم آپہنچا تو ہم نے اس زمین کا اوپر کا تختہ نیچے کر دیا اور زمین پر کنکر کے پتھر برسانا شروع کئے جو لگاتار گر رہے تھے جن پر آپ کے رب کا خاص نشان بھی تھا اور یہ بستیاں اِن ظالموں (یعنی مشرکینِ مکّہ) سے کچھ دُور نہیں ہیں۔"

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ۔ الخ

(الشعراء آیات ۱۶۰ تا ۱۷۵)

قُوم لوطؑ نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ جبکہ اُن کے بھائی لوط (علیہ السلام) نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں ہو۔ میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں۔ سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اور میں تم سے اسپر کوئی صلہ نہیں چاہتا۔ بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمّہ ہے۔ کیا تمام دنیا جہان والوں میں تم مردوں سے یہ فعل کرتے ہو۔ اور تمہارے رب نے جو تمہارے لئے بیویاں پیدا کی ہیں اُن کو نظر انداز کئے رہتے ہو بلکہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔

وہ لوگ کہنے لگے اے لوط (علیہ السلام) اگر تم باز نہیں آؤگے

توضرور نکال دیئے جاؤگے۔

لوط (علیہ السلام) فرمانے لگے میں تمہارے اس کام سے سخت نفرت رکھتا ہوں۔

لوط (علیہ السّلام) نے دُعا کی اے میرے رب مجھ کو اور میرے متعلقین کو اُن کے اس کام سے نجات دے۔

سو ہم نے اُن کو اور اُن کے متعلقین سب کو نجات دی۔ بجز ایک بڑھیا بیوی کہ وہ رہ جانے والوں میں رہ گئی۔ (یہ عورت دل سے کافر تھی اور قوم کے بدمعاشوں سے ملی ہوئی)

پھر ہم نے اور سب کو ہلاک کر دیا۔ اور ہم نے اُن پر ایک خاص قسم کی بارش برسائی سو کیا بُرا برساؤ تھا جو اُن لوگوں پر برسا جنکو ڈرایا گیا تھا۔

بیشک اسمیں عبرت ہے اور اِن میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور بیشک آپ کا رب بڑی قدرت والا بڑی رحمت والا ہے۔"

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ۔ الخ (التحریم آیت ۱۰)

اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے نوح (علیہ السّلام) کی بیوی اور لوط (علیہ السّلام) کی بیوی کا حال بیان کرتا ہے وہ دونوں ہمارے خاص بندوں میں سے دو بندوں کے نکاح میں تھیں سو اُن عورتوں نے اُن دونوں بندوں کا حق ضائع کیا تو وہ دونوں نیک بندے اللہ کے مقابلے میں اُن دونوں کے ذرا کام نہ آسکے اور حکم ہوگیا کہ اور جانے والوں کے ساتھ تم دونوں بھی دوزخ میں جاؤ۔"

نتائج و عبر

قومِ لوطؑ کا وطن

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ اپنے چچا کے ساتھ ملک عراق سے نکلے اور کچھ مدت تک شام فلسطین اور مصر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ انکی دعوت و تبلیغ میں مشغول رہے، پھر مستقل نبوت سے سرفراز ہوئے، اللہ نے انہیں شہر سدوم کے باشندوں کی اصلاح کے لئے مامور فرمایا، جنمیں لواطت جیسا قابل نفرت عمل رائج تھا۔ بقول حضرت عمرو بن دینارؒ یہ فعل دنیا میں اس سے پہلے کسی نے رائج نہیں کیا تھا۔ یہ قوم اسکی موجد تھی۔ تفسیر درِ منثور میں حضرت حذیفہ رضؓ سے ایک قول یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ جیسا کہ اس قوم کا مرد، مرد سے ملوّث تھا، اسی طرح اس قوم کی عورتوں میں بھی اسی جیسا فعل (مُساحقت) رائج تھا۔

یہ قوم اُس زمانے میں اِس علاقہ میں رہتی تھی جسے آجکل شرق اُردن کہا جاتا ہے۔ بائبل میں اس قوم کا صدر مقام "سدوم" بتایا گیا ہے جو یا تو بُحیرۂ مُردار کے قریب کسی جگہ واقع تھا یا اب بُحیرۂ مُردار میں غرق ہو چکا ہے۔

سدوم کے علاوہ اِن کے چار بڑے شہر اور بھی تھے جنکو قرآنِ حکیم نے "مُؤتَفِکَاتِ" (تل پٹ شدہ بستیاں) کے نام سے موسوم کیا ہے۔

ان شہروں کے درمیان کا علاقہ ایسا گلزار بنا ہوا تھا کہ میلوں تک بس ایک باغ معلوم ہوتا تھا۔ جس کے حُسن وجمال کو دیکھ کر انسان پر مستی طاری ہو جائے مگر آج اس رُسوائے زمانہ قوم کا نام ونشان دنیا سے بالکل ناپید ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی ٹھیک طرح سے متعین نہیں کیا جا سکتا کہ یہ بستیاں کس مقام پر واقع تھیں۔ اب صرف بُحیرۂ مُردار ہی اسکی ایک یادگار باقی رہ گیا ہے جسے آج بحرِ لوط کہا جاتا ہے۔ اس حصے میں پانی کے نیچے کچھ ڈوبی ہوئی بستیوں کے آثار کا پتہ چلا ہے۔ ماہرین طبقات الارض کا خیال ہے یہ بستیاں قومِ لوط ہی کے شہر تھے۔

نرالا گناہ قرآن حکیم اور احادیث نبویہ نے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام جس قوم کی جانب مبعوث کئے گئے تھے وہ قوم اپنی اخلاقی گراوٹ میں اس قدر دور جا چکی تھی کہ اب اس کا پلٹ آنا ناممکن ہوگیا تھا۔ اہل جرائم نے جُرم کو جُرم ہی سمجھا ہے لیکن اس قوم نے جرائم کو "قومی شعار" قرار دے لیا تھا۔ مجالس اور عام مقامات پر علی الاعلان فحش و بے حیائی کرنا اِن کا محبوب مشغلہ تھا۔ یہ ایسا عمل تھا جس کی ماضی میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

مرد سے مرد مشغول ہو جائے اور عورت، عورت سے ملوّث ہو۔ یہ ایسا عمل تھا جو عموماً جنگل کے جانوروں میں بھی نہیں پایا جاتا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ یہ قوم اپنے میں چند نیک انسانوں اور نیکی و شرافت کی دعوت دینے والوں کو برداشت نہ کرتی تھی وہ پاکی و طہارت کے اس تھوڑے سے عنصر کو بھی نکال باہر کر دینا چاہتی تھی جو اِنکے گھناؤنے ماحول میں نورِ ہدایت کا ذریعہ تھے۔

قرآن حکیم نے اس قوم کے تین بڑے جرائم کا ذکر کیا ہے :-

"تم مردوں سے بدفعلی کرتے ہو، مسافروں کو لوٹ لیا کرتے ہو، عام مجلسوں میں علی الاعلان فحش کرتے ہو۔"

(العنکبوت آیت ۲۹)

جن تین گناہوں کا آیت میں ذکر ہے ان سب میں شدید ترین پہلا گناہ ہے جو اِن سے پہلے دنیا میں کسی نے ایجاد نہیں کیا۔ باتفاق امّت یہ گناہ زنا سے بھی زیادہ شدید ہے۔

لواطت کی شرعی سزا قرآن حکیم اور احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لواطت ایک بدترین گناہ ہے جس پر ایک پوری کی پوری قوم اللہ کے شدید ترین غضب میں گرفتار ہوئی۔ اسکے بعد روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے کو پاک رکھنے کے لئے حکومت کے فرائض میں شامل ہے کہ اس جُرم کے مرتکبین کو سخت ترین، عبرت ناک سزا دی جانی چاہیئے۔ حدیث شریف میں مختلف سزائیں بیان کی گئی ہیں۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ملتے ہیں :۔

اُقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ بِہٖ۔ (الحدیث)

"فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو۔"

ایک روایت میں اتنا اضافہ اور بھی ہے :۔

اَحْصَنَا اَوْ لَمْ یُحْصِنَا۔

(شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ)

ایک اور روایت میں یہ حکم بھی ملتا ہے :۔

فَارْجُمُوا الْاَعْلٰی وَالْاَسْفَلَ۔ (الحدیث)

اوپر والا اور نیچے والا دونوں سنگسار کر دیئے جائیں۔

چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایسا کوئی مقدمہ پیش نہیں ہوا اسلئے آپؐ نے عملاً ایسی کوئی سزا جاری نہیں فرمائی۔

صحابہ کرام میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ایسے مجرم کو تلوار سے قتل کر دیا جائے اور دفن کر دینے کے بجائے اُسکی لاش کو جلا دیا جائے۔

اسی رائے سے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی اتفاق فرمایا تھا۔

حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی رائے یہ ہے کہ ایسے مجرم کو کسی بوسیدہ عمارت کے نیچے کھڑا کرکے وہ عمارت اُن پر ڈھا دی جائے۔

حضرت ابن عباسؓ کا فتوٰی یہ ہے کہ بستی کی سب سے اونچی عمارت پر سے اُسکو سر کے بل پھینک دیا جائے اور پرسے پتھر برسائے جائیں۔ یہ ہی قول امام ابوحنیفہؒ کا بھی ہے تاکہ قرآن حکیم نے اس لوطی قوم پر عذاب کی جو صورت بیان کی ہے اس سے مماثلت پیدا ہو جائے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ فاعل و مفعول واجب القتل ہیں۔

امام شعبیؒ، زہریؒ، امام مالکؒ و امام احمدؒ کے ہاں اسکی سزا سنگساری ہے۔

حضرت سعید بن مُسیبؒ، عطاءؒ، حسن بصریؒ، ابراہیم نخعیؒ، سفیان ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ کی رائے ہے کہ اس جرم پر وہی سزا دی جائیگی جو زنا کی سزا ہے۔ یعنی غیر شادی شدہ کو سو کوڑے مارے جائیں گے اور جلا وطن کر دیا جائے گا اور شادی شدہ

کو رجم (سنگسار) کیا جائے گا۔

سزاؤں کے اختلاف کی وہی وجہ ہے جو اوپر بیان کی گئی کہ اس سلسلے میں کوئی مخصوص حدِ شرعی ثابت نہیں ہے۔ اسکے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے جرائم ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہایت قبیح اور بدترین قسم کے شمار کئے جاتے ہیں، ایسے تمام جرائم پر امیر المؤمنین کو شریعتِ اسلامی کی جانب سے تعزیرات جاری کرنے کا اختیار دیا گیا ہے اور تعزیرات کے لئے کوئی خاص سزا مقرر نہیں کی گئی ہے بلکہ جیسے حالات و تقاضے ہوں اُس لحاظ سے ایسے مجرم کو عبرت ناک سزا دی جائے۔ امام ابوحنیفہؒ و امام شافعیؒ کا ایک قول لوطی کے بارے میں یہ ہی منقول ہے۔ (اعاذنا اللہ منہا)

ایک ضروری تنبیہ

فعلِ لواطت اپنی قباحت و شناعت میں جسقدر بھی شدید ہے ویسے ہی شدید سزا کا بھی مستحق ہے اس لئے ہر زمانے میں ایسے مجرموں کو مختلف سزائیں دی جاتی رہیں ہیں۔ اور اس فعل کو کسی بھی حیثیت سے کبھی روا نہ رکھا گیا۔

اس سلسلے میں یہ بات قطعی طور پر ملحوظ رکھی جانی چاہیئے کہ شوہر کا اپنی بیوی سے لواطت کرنا بھی حرام ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

مَلْعُوْنٌ مَنْ اَتَى الْمَرْأَةَ فِي دُبُرِهَا۔ (ابوداؤد)

"اپنی بیوی سے یہ فعل کرنے والا ملعون ہے۔"

اور ایک حدیث میں اسطرح بیان کیا گیا ہے:۔

لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ اِلٰى رَجُلٍ جَامَعَ اِمْرَأَتَهٗ فِي دُبُرِهَا۔

(ابن ماجہ، مسند احمد)

"اللہ اس مرد پر ہرگز نظرِ رحمت نہیں کریگا جو اپنی بیوی کیساتھ یہ عمل کرتا ہے۔"

جامع ترمذی کی ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں۔

مَنْ اَتٰى حَائِضًا اَوْ اِمْرَأَةً فِي دُبُرِهَا اَوْ كَاهِنًا

فَصَدَّقَہٗ فَقَدْ کَفَرَ بِمَآ اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ۔ (الحدیث)

"جس نے حائضہ عورت سے مجامعت کی، یا عورت کے ساتھ عمل قوم لوط کیا، یا کاہن کے پاس گیا اور اُسکی پیش گوئی کی تصدیق کی، اُس نے ان تمام باتوں کا انکار کر دیا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئیں ہیں۔"

پاکیزہ طریقہ اور شُبہ کا جواب

عذاب کے فرشتے جب حضرت لوط علیہ السلام کے گھر پہنچے تو حضرت لوط علیہ السلام بہت گھبرائے اور دل تنگ ہوا اور زبان سے یہ الفاظ نکل پڑے کہ:-

"آج بڑی مصیبت کا دن ہے۔"

یہ فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں تھے جو قوم کی مرغوب ترین شئے تھی۔ ان مہمانوں کا آنا ہی تھا کہ قوم کے لوگ بے اختیار حضرت لوط علیہ السلام کے گھر پر ٹوٹ پڑے۔ کیونکہ پہلے سے وہ ایسی ہی بدکاریوں کے خوگر تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے کہا بھائیو! یہ میری بیٹیاں موجود ہیں یہ تمہارے لئے پاکیزہ ہیں، غیر فطری طریقہ کیوں اختیار کرتے ہو۔ کچھ تو خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے ذلیل و رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں؟ جو موقعہ و محل کا پاس و لحاظ کرے۔

حضرت لوط علیہ السلام کا یہ ارشاد "یہ میری بیٹیاں موجود ہیں" سر سری نظر میں یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ نبی اپنی پاک اولاد کو اس ناپاک کام کے لئے کس طرح پیش کر سکتا ہے؟ جب کہ حضرت لوط علیہ السلام نے پیش کر دیا۔

یہ شبہ دراصل قرآنی اسلوب کو نہ سمجھنے کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ خود آیت سے ایسا کوئی مفہوم ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی صاحبزادیوں کو بُرائی کے لئے پیش کیا ہے۔ پوری آیت اس طرح ہے:-

قَالَ یٰقَوْمِ ھٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ ھُنَّ اَطْھَرُ لَکُمْ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ۔ (ہود آیت ۷۸)

"کہا اے میری قوم کے لوگو! یہ میری بیٹیاں ہیں وہ تمہارے

لئے پاکیزہ تر ہیں۔"
وہ تمہارے لئے پاکیزہ تر ہیں کا فقرہ ایسا غلط مفہوم لینے کی کوئی گنجائش نہیں رکھتا کیونکہ زنا کبھی بھی کسی بھی ملت وجماعت میں پاکیزہ تر نہیں سمجھا گیا ہے۔ پھر آیت کا دوسرا فقرہ "اللہ سے ڈرو" اور زیادہ تاکید کرتا ہے کہ تم اپنے ارادے میں اللہ سے ڈرو۔

حضرت لوط علیہ السلام کا منشا صاف طور پر یہ ہی تھا کہ اپنی شہوتِ نفس کو اس فطری اور جائز طریقے سے پورا کرو جو اللہ نے مقرر کیا ہے اور اس کے لئے عورتوں کی کمی نہیں۔ اور اس مفہوم کا واضح قرینہ یہ بھی ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی صرف ۲ دو ہی بیٹیاں تھیں۔ ظاہر ہے نعوذ باللہ پوری قوم کے لئے کس طرح پیش کی جاتیں اور پوری قوم جو گھر پر چڑھ آئی تھی اُن کی تعداد سینکڑوں تھی۔ لہذا آیت کا وہ مفہوم نہیں جس پر شبہ پیدا ہو۔

تفسیر قرطبی میں ایک اور جواب نقل کیا گیا ہے:۔

"حضرت لوط علیہ السلام نے جب یہ محسوس کیا کہ قوم کی مدافعت مشکل ہے تو ان کو شر سے باز رکھنے کے لئے فرمایا کہ تم اس شر و فساد سے باز آجاؤ میں اپنی دونوں لڑکیاں تمہارے سرداروں کے نکاح میں دے دوں گا۔ اُس قوم میں ۲ دو سردار بڑے تسلیم کئے جاتے تھے اور وہی اس ہجوم کے بانی مبانی بھی تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اتفاق کر لیا کہ اپنی صاحبزادیوں کا نکاح ان ۲ دو سرداروں سے کر دیا جائے۔ اُس ملت میں مسلمان لڑکی کا نکاح کافر سے جائز تھا، جیسا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں بھی مسلم و کافر کا نکاح جائز تھا۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ۲ دو صاحبزادیوں کا نکاح عتبہ بن ابی لہب اور ابوالعاص بن ربیع سے کیا تھا۔ حالانکہ یہ دونوں کافر تھے۔ بعد میں وہ آیات نازل ہوئیں جن میں مسلمان عورت کا نکاح کافر مرد سے حرام قرار پایا۔" (قرطبی)

الغرض حضرت لوط علیہ السلام نے رفع فساد کے لئے قوم سے اس طرح خطاب فرمایا کہ یہ میری لڑکیاں موجود ہیں جو تمہارے لئے پاکیزہ تر ہیں۔ اور بعض دیگر مفسرین نے ایک دوسری حیثیت سے جواب دیا جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

هٰؤُلَآءِ بَنَاتِیْ سے پوری قوم کی لڑکیاں مراد ہیں۔ کیونکہ پیغمبر اپنی قوم کے لئے "مثل باپ" ہوتا ہے اور پوری امت اس کی اولاد ہوتی ہے جیسا کہ قرآن حکیم کی آیت

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ۔ (الاحزاب آیت ۶)

نبیؐ تو اہل ایمان کے لئے اُن کی اپنی ذات پر مقدم ہے اور نبی کی بیویاں اُن کی مائیں ہیں۔"

حضرت ابن مسعودؓ کی تفسیر وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ کے الفاظ بھی ملتے ہیں جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اُمت کا باپ کہا گیا ہے۔ اب اس تفسیر کے مطابق حضرت لوط علیہ السلام کے اس قول کا یہ مطلب ہوگا کہ:۔

"اُے قوم تم اپنی خبیث عادت سے باز آجاؤ، شرافت کے ساتھ قوم کی لڑکیوں سے نکاح کرو۔ اُن کو اپنی بیویاں بناؤ، یہ سب میری بیٹیاں ہی تو ہیں۔"

امام تفسیر حضرت مجاہدؒ سے منقول ہے :۔

كُلُّ نَبِیٍّ اَبٌ لِّاُمَّتِهٖ۔

ہر نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے۔ (روح المعانی)

اسی طرح حضرت ام سلمہؓ (زوجۃ النبیؐ) کا ارشاد ہے :۔

اَنَا اُمُّ الرِّجَالِ مِنْكُمْ وَالنِّسَاءِ۔

میں تمہارے مرد و عورتوں کی ماں ہوں۔ (روح المعانی)

دو۲ اہم وضاحتیں قوم لوط پر عذاب نازل ہونے سے پہلے شہر سدوم کا حال سورۂ الذاریات کی آیاتِ ذیل اس طرح بیان کرتی ہیں :۔

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِیْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ فَمَا وَجَدْنَا فِیْهَا غَیْرَ بَیْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۔

(الذاریات آیت ۳۵۔۳۶)

"پھر ہم نے اُن سب لوگوں کو نکال لیا جو اُس بستی میں مؤمن تھے (یعنی حضرت لوط علیہ السلام اور اہل ایمان) سو ہم نے اُس بستی میں سوائے ایک گھر کے مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا (یعنی صرف حضرت لوط علیہ السلام کا گھر، باقی سب کافروں کے گھر تھے)

۱۔ اقوام و ملل سابقہ میں اللہ تعالےٰ کا قانونِ مکافات، اُس وقت تک کسی قوم کی کامل تباہی کا فیصلہ نہیں کرتا تھا جب تک اُس قوم میں کچھ قابلِ لحاظ بھلائی موجود رہی ہو۔

مگر جب حالات یہ ہو جائیں کہ کسی قوم کے اندر آٹے میں نمک کے برابر بھی خیر باقی نہ رہے تو ایسی صورت میں اللہ کا قانون یہ تھا کہ نبیؑ اور اُن پر ایمان لانے والوں کو اپنی قدرتِ خاص سے کسی نہ کسی طرح بچا کر نکال دیتا تھا اور باقی لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا تھا جو ہر ہوشمند تاجر اپنے ٹوکرے کے سڑے ہوئے پھلوں کے ساتھ کیا کرتا ہے کہ اچھے پھلوں کو نکال لیتا ہے اور سڑے حصّے کو پھینک دیتا ہے۔ یہی حال قوم لوط کے ساتھ پیش آیا۔

۲۔ مسلمان صرف اُسی امّت کا نام نہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیرو ہے بلکہ آپؐ سے پہلے کے تمام انبیاء کرام اور اُن کے پیرو بھی مسلمان ہی تھے ان سب کا دین یہی اسلام تھا۔

قرآن حکیم نے آیت مذکورہ بالا میں مؤمن اور مسلم کو ایک قرار دیا ہے۔ مؤمن اور مُسلم کے الفاظ اس آیت میں بالکل ہم معنیٰ استعمال ہوئے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ جو مؤمن ہے وہ مسلم ہے اور جو مسلم ہے وہ مؤمن بھی ہے۔ ایمان اور اسلام قرآن حکیم کی دو ہم معنیٰ اصطلاحیں ہیں اگرچہ لغت کے لحاظ سے آپس میں کچھ فرق ہو جائے ممکن ہے لیکن قرآن حکیم کی زبان میں اسلام اُس کامل مکمل دین حق کا نام ہے جو نوعِ انسانی کے لئے آسمان سے نازل کیا گیا ہے جسکے مفہوم میں ایمان (تصدیق) اور اسلام (اطاعت) دونوں شامل ہیں۔

اس سلسلے میں چند ایک آیات ملاحظہ ہوں جو ایمان اور اسلام کے اتحاد کو ثابت کرتی ہیں:۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔
"یقیناً اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔" (آل عمران آیت ۱۵)
وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ الخ
"اور جو اسلام کے سوا اور کوئی دین چاہے گا اُسکا دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اُٹھانے والوں میں ہوگا۔" (آل عمران آیت ۸۵)
وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ (المائدہ آیت ۳)
"اور میں نے تمہارے لئے دین کی حیثیت سے اسلام کو پسند کرلیا ہے۔"
فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا۔ الآیۃ (آل عمران آیت ۲۰)
"پھر اگر وہ اسلام لے آئیں تو اُنھوں نے ہدایت پالی۔"
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (آل عمران آیت ۱۰۲)
"اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے اور تم کو ہرگز موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔"
هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا۔ الآیۃ
"اُس اللہ نے تمہارا نام پہلے بھی مسلم رکھا اور اس کتاب (قرآن) میں بھی (تم کو مسلمان کہا گیا)" (الحج آیت ۷۸)
مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا۔ الآیۃ (آل عمران آیت ۶۷)
"ابراہیم (علیہ السلام) نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی، بلکہ وہ تو ایک خالص مسلم تھے۔"

یہ اور اس مضمون کی کئی ایک آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور ایمان ایک ہی معنی کے دو عنوان ہیں۔ اور یہ خیال کچھ درست نہیں کہ مسلم سے مراد وہ شخص ہے جو دل سے ایمان نہ لایا ہو بلکہ ظاہری طور پر اسلام قبول کرلیا ہو۔ اور مومن سے مراد وہ شخص ہے جو دل سے تصدیق کرچکا ہو۔ اگرچہ بعض حضرات نے اس قسم کی تعریف کی ہے لیکن اُن کا منشا صرف اتنا ہے کہ لغت کے لحاظ سے یہ دونوں لفظ مختلف

معنی رکھتے ہیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

ظاہر ہے اوپر کی آیات پڑھکر کون خیال کرسکتا ہے کہ اللہ کے ہاں صرف ظاہری طور پر اسلام قبول کرلینا پسندیدہ بات ہوگی ؟ اور یہ کہ اللہ تعالے نے صرف ظاہری اسلام کو آسمانی دین بنایا ہے ؟ اور یہ کہ صرف ظاہری اسلام فلاح کا ذریعہ ہے ؟ اور یہ کہ (نعوذ باللہ) حضرت ابراہیم علیہ السلام صرف مسلم ہی تھے ؟

اس لئے یہ خیال کرنا قطعی درست نہیں کہ اسلام سے مراد اطاعت بلا ایمان ہے اور مسلم قرآن کی زبان میں ظاہراً اسلام قبول کرنے والے کو کہتے ہیں یہ بات درست نہیں۔ البتہ یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ بعض مقامات پر ایمان اور اسلام کے لغوی معنیٰ مراد لئے گئے ہیں جو اپنے سیاق وسباق کے لحاظ سے متعین کئے جا سکتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ قرآن حکیم کی زبان میں ایمان اور اسلام ایک ہی دین کا نام ہے جو آسمان سے نازل ہوا ہے۔ لہذا اسلام کے ماننے والے کو مؤمن اور مسلم کہا جائے گا۔

آیتُ اللہ | قومِ لوط پر عذاب کے بعد قرآن حکیم نے شہر کے کھنڈرات کو آیت (نشانی) سے تعبیر کیا ہے :-

وَ تَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ۔

(الذاریات آیت ۳۷)

"اُس عذاب کے بعد ہم نے وہاں بس ایک نشانی اُن لوگوں کے لئے چھوڑ دی جو عذاب الیم سے ڈرتے ہیں۔"

اس نشانی سے مراد بُحیرۂ مردار (سمندر) ہے جسکا جنوبی علاقہ آج بھی ایک عظیم تباہی کے آثار پیش کر رہا ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کا خیال ہے کہ قوم لوط کے پانچ بڑے شہر شدید زلزلے سے زمین میں دھنس گئے ہوں اور اُن کے اوپر بحیرہ مردار کا پانی پھیل گیا ہو۔ کیونکہ بُحیرہ کا وہ حصہ جو "اللسان" نامی چھوٹے سے جزیرہ نما کے جنوب میں واقع ہے۔ واضح طور پر بعد کی پیداوار معلوم ہوتا ہے اور قدیم بُحیرۂ مردار کے جو آثار اس جزیرہ نما کے شمال تک نظر آتے ہیں وہ جنوب میں پائے جانے والے آثار سے بہت مختلف ہیں۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے اس سے یہ بات اخذ کی ہے کہ جنوب کا حصہ پہلے

اس بُحیرے کی سطح سے بلند تھا بعد میں کسی زلزلے سے دھنس کر نیچے چلا گیا، اسکے دھنسنے کا زمانہ بھی ۲ دو ہزار برس قبلِ مسیح کے قریب معلوم ہوتا ہے اور یہ قیاس تاریخی طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کا زمانہ ہے۔ ۱۹۶۵ء میں آثارِ قدیمہ کی تلاش کرنے والی ایک امریکی جماعت کو اللسان جزیرہ پر ایک بہت بڑا قبرستان ملا جسمیں بیس ہزار سے زیادہ قبریں ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قریب میں کوئی بڑا شہر آباد تھا چونکہ ایسے کسی شہر کے آثار آس پاس کہیں موجود نہیں ہیں جس سے متصل اتنا بڑا قبرستان بن سکتا ہو۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ جس شہر کا یہ قبرستان ہے وہ بُحیرے میں غرق ہو چکا ہو۔ بُحیرے کے جنوب میں جو علاقہ ہے اس میں اب بھی ہر طرح تباہی کے آثار موجود ہیں اور زمین میں گندھک، رال، کول تار، اور قدرتی گیس کے اتنے ذخائر پائے جاتے ہیں جنھیں دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ کسی وقت بجلیوں کے گرنے سے یا آتش فشاں کا لاوا نکلنے سے یہاں ایک جہنم پھٹ پڑی ہوگی۔ ممکن ہے قرآن حکیم کی آیت مذکورہ :- وَ تَرَكْنَا فِيهَآ اٰيَةً سے مراد یہی آثارِ تباہی مراد ہوں۔

(ہم نے اس شہر میں ایک نشانی چھوڑ دی)

واللہ اعلم۔

تذکرۂ لُوط (علیہ السلام) کا قرآنی درس

سورۂ ہود میں حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ نقل کرنے کے بعد اس تذکرے کو اس آیت پر ختم کیا گیا :- وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ۔ (ہود آیت ۸۳)

(پتھراؤ کا یہ عذاب آج بھی ظالموں سے کچھ دور نہیں)

یعنی جو لوگ اس قوم کی طرح ظلم و بے حیائی پر جمے بیٹھے ہیں وہ اپنے آپ کو اس جیسے عذاب سے دور نہ سمجھیں آج بھی یہ عذاب آسکتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں بھی کچھ لوگ وہ عمل کریں گے جو قوم لوط کیا کرتی تھی، جب ایسا ہونے لگے تو انتظار کرو کہ اُن پر بھی وہی عذاب آئے جو قوم لوط پر آیا تھا۔ اعاذنا اللہ منہ۔

چند اعلیٰ خصلتیں

تذکرہ حضرت لوط علیہ السلام میں یہ بات آچکی ہے کہ جب

فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب لے کر آئے تو اِن کی پہلی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام اُنھیں سلام کا جواب دیکر اپنے گھر لے آئے اور ایک بچھڑا ذبح کر کے بُھنا گوشت مہمانوں کے سامنے رکھ دیا اور فرمایا کیا آپ حضرات کھائیں گے نہیں ؟

مفسرین میں ابن کثیرؒ نے اس مختصر معاملے سے میزبانی کے چند اہم نکات بیان کئے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ مہمانوں سے پہلے پوچھا نہیں کہ کیا میں آپ کیلئے کھانا لاؤں؟ بلکہ چپکے سے چلے گئے اور اُن کی مہمانی کے لئے اپنے پاس جو سب سے اچھی چیز کھانے کی تھی یعنی بچھڑا ذبح کیا اسکو بھونا اور لے آئے۔ فَجَآءَ بِعِجۡلٍ سَمِيۡنٍ. الآیۃ

دوسری بات یہ کہ کھانا لانے کے بعد مہمانوں کو زحمت نہیں دی کہ اُنہیں کھانے کے لئے بلاتے بلکہ جہاں وہ مہمان بیٹھے ہیں وہیں لاکر سامنے رکھ دیا۔ فَقَرَّبَهٗۤ اِلَيۡهِمۡ. الآیۃ

تیسری بات یہ کہ میزبانی کے وقت انداز گفتگو میں کھانے پر اصرار نہ تھا بلکہ اسطرح فرمایا اگرچہ آپ کو حاجت نہ سہی مگر ہماری خاطر کچھ نوش فرمالیں۔ اَلَا تَاۡكُلُوۡنَ. الآیۃ

میزبانی کے یہ اعلیٰ طور طریقے ہیں جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی پاکیزہ فطرت میں موجود تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

"جو شخص اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیئے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔" (الحدیث)

تذکرہ

سیّدنا یعقوب علیہ السّلام

تعارُف حضرت یعقوب علیہ السّلام سیدنا اسحٰق علیہ السّلام کے بیٹے اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے پوتے ہیں۔ اِن کی والدہ کا نام رُفقہؒ تھا۔ یہ اپنی والدہ کے چہیتے اور پیارے تھے۔ اِن کے حقیقی بھائی عیسُو کو حضرت اسحٰق علیہ السّلام بہت چاہتے تھے۔

توراۃ کی روایت کے مطابق دونوں بھائیوں میں نااتفاقی کے باعث حضرت یعقوب علیہ السّلام اپنی والدہ کے مشورے پر جب شہر فدّان آرام کو چلے گئے تو اِن کے حقیقی ماموں لابان نے اُن سے عہد لیا کہ وہ دسؔ سال تک اُن کے ہاں رہ کر اُنکی بکریاں چرائیں تو وہ اس مدّت کو مہر قرار دے کر اپنی لڑکی سے شادی کر دینگے۔ چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السّلام نے اُس مدت کو پورا کیا تو لابان نے اپنی بڑی لڑکی لئیہ کا نکاح اُن سے کرنا چاہا مگر حضرت یعقوب علیہ السّلام کی والدہ محترمہ کا رجحان چھوٹی لڑکی راحیل کی طرف تھا۔ لابان نے یہ عذر کیا کہ یہاں کے دستور کے مطابق بڑی لڑکی کے نکاح سے پہلے چھوٹی لڑکی کا نکاح نہیں ہوسکتا اس لئے تم اس رشتے کو منظور کرلو اور یعقوب کے قیام میں مزید دسؔ سال اور اضافہ کرکے اُن کو میری خدمت میں رکھو تو راحیل بھی نکاح میں دیدی جائے گی (اُس شریعت میں دوؔ بہنوں کا ایک نکاح میں جمع کرنا جائز تھا) چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السّلام نے اُس مدت کو بھی پورا کیا اور راحیل یعنی چھوٹی لڑکی سے بھی نکاح کرلیا۔ اِن دونوں کے علاوہ لئیہ (بڑی بیوی) کی کنیز زُلفا اور راحیل کی کنیز بلہا بھی حضرت یعقوب علیہ السّلام کی زوجیت میں آگئیں۔ ان سب خواتین سے اولاد بھی ہوئی اور بنیامین (حضرت یوسفؑ کے چھوٹے

بھائی) کے علاوہ حضرت یعقوب علیہ السّلام کی تمام اولاد اپنے ماموں ہی کے ہاں زمانۂ قدیم میں پیدا ہوئی۔ اور جب حضرت یعقوب علیہ السّلام وطن واپس آ گئے تو یہاں بِنیامین پیدا ہوئے۔

لابان نے حضرت یعقوب علیہ السّلام کو اپنے ہاں بیسؔ سال رکھنے کے بعد بہت سارا ساز و سامان دے کر رخصت کیا اور یہ وہاں اپنے دادا سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کے دار الہجرت فلسطین میں آ کر مقیم ہو گئے اور اپنی بقیہ زندگی وہاں ہی گزاری۔ حضرت یعقوب علیہ السّلام جس زمانے میں شہر فدان آرام اپنے ماموں کے ہاں چلے گئے تھے اُس زمانے میں اِنکے بھائی عیسُو ناراض ہو کر اپنے چچا حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے پاس آ بسے تھے اور اُن کی صاحبزادی سے شادی کر کے قریب ہی کے شہر میں آباد ہو گئے تھے۔ یہ صاحب تاریخی کتب میں ادوم کے نام سے مشہور ہیں۔ اس عرصہ میں دونوں بھائیوں کے تعلقات اُستوار ہو گئے اور وہ ایک دوسرے کو تحفے تحائف بھیجا کرتے تھے۔

یہ تمام تفصیلات تورات اور اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں۔ قرآن حکیم اِن تمام باتوں سے یکسر خاموش ہے اور وہ صرف حضرت یعقوب علیہ السّلام کے جلیل القدر نبی، صاحب صبر و استقامت رسول، اور سیّدنا یوسف علیہ السّلام کے برگزیدہ باپ ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ اور اسی ضمن میں نام کی صراحت کے بغیر یوسف علیہ السّلام کے دوسرے بھائیوں کا بھی ذکر آجاتا ہے:۔

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ الآیۃ۔

تذکرہ سیّدنا یوسف علیہ السّلام کے ضمن میں حضرت یعقوب علیہ السّلام کا ذکر جا بجا آیا ہے چنانچہ یہی تذکرہ حضرت یعقوب علیہ السّلام کا بھی تذکرہ شمار کیا گیا ہے۔ تذکرہ سیّدنا یوسف علیہ السّلام میں یہ باتیں مطالعہ کیجئے:۔

سیّدنا یعقوب علیہ السّلام قرآن حکیم میں

قرآن عزیز میں سیّدنا یعقوب علیہ السّلام کا اسم گرامی دسؔ جگہ ملتا ہے۔ اگرچہ سورۂ یوسفؑ میں جا بجا ضمائر اور اوصاف کے لحاظ سے ان کا تذکرہ موجود ہے۔

آیات متعلقہ کی تفصیل یہ ہے :-

سورۂ بقرہ	آیات	۱۳۲ ، ۱۳۳ ، ۱۳۶ ، ۱۴۰
سورۂ انعام	آیت	۸۴
سورۂ مریم	آیت	۶
سورۂ انبیاء	آیت	۷۲
سورۂ نساء	آیت	۱۶۳
سورۂ یوسف	آیات	۶ ، ۳۸
سورۂ صٓ	آیت	۴۵

بنی اسرائیل

حضرت یعقوب علیہ السلام کا عبرانی نام اسرائیل ہے. قرآن حکیم میں جا بجا اسی نام سے یاد کیا گیا ہے. اِسرا کے معنی (عبد) اور اِیل کے معنی (اللہ) یعنی عبد اللہ، اور بنی اسرائیل کے معنی "اولادِ یعقوب" قرآن حکیم نے اہل کتاب یہود و نصاریٰ کو بنی اسرائیل کہہ کر مخاطب کیا ہے (یعنی اولادِ یعقوب) حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا اسم گرامی مشہور و معروف ہے. انہی کی نسل میں ہزارہا انبیاء و رسل پیدا ہوئے ہیں جنہیں انبیاء بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔

اولادِ یعقوب علیہ السلام

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ ۱۲ لڑکے تھے. گزشتہ سطور میں آچکا ہے کہ بنیامین کے علاوہ اُن کی ساری اولاد شہر فدان آرام میں ہی پیدا ہوئی تھی. صرف بنیامین (حضرت یوسفؑ کے چھوٹے حقیقی بھائی) فلسطین (ارض کنعان) میں پیدا ہوئے، حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد آپکی مختلف بیویوں سے ہوئی ہے جنکی تفصیل یہ ہے :-

زوجہ ۱ محترمہ لئیہ بنت لابان سے مندرجہ ذیل اولاد ہوئی۔

(۱) راؤبین (۲) شمعون (۳) لاوی (۴) یہودا (۵) ویساکر (۶) زبولون۔

زوجہ ۲ ثانیہ راحیل بنت لابان سے ۲ دو لڑکے پیدا ہوئے۔

(۷) یوسف علیہ السلام (۸) بن یمین (بن یامین)
زوجۂ ثالثہ بلہا سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔
(۹) دان (۱۰) نفتالی۔
زوجۂ رابعہ زُلفا سے دو لڑکے تولّد ہوئے۔
(۱۱) جاد (۱۲) اشیر۔
یہ بارہ لڑکے اپنی اپنی قوم کے سردار بنے اور اُن کی اولاد کثرت سے پھیلی۔
یہ تفصیل تورات سے منقول ہے اور دیگر تاریخی کتب میں بھی پائی جاتی ہے۔
واللہ اعلم۔

سیدنا یعقوب علیہ السلام کا بیشتر تذکرہ حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرہ میں آرہا ہے۔ قرآن حکیم نے بھی سیدنا یعقوب علیہ السلام کا تذکرہ مستقل طور پر ذکر نہیں کیا البتہ کئی ایک جگہ اِن کا اسم گرامی اور اِن کا اُولو العزم رسول ہونا بیان کیا ہے۔ کنعانیوں کی اصلاح و تبلیغ کے لئے حضرت یعقوب علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا۔ ساری زندگی کنعان (فلسطین) ہی میں تبلیغ فرماتے رہے۔ البتہ آخری عمر میں اپنے عظیم المرتبت صاحبزادے سیدنا یوسف علیہ السلام سے ملنے کے لئے مصر تشریف لائے اور غالباً وہیں وفات پائی۔

تذکرہ
سیّدنا یوسف علیہ السّلام
اور
عزیزِ مصر

تعارُف سیّد نا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی تیسری پُشت سے سیّدنا یوسف علیہ السلام کا وجودِ باسعادت ملتا ہے۔ سلسلۂ نسب اسطرح ہے:-

یوسفؑ بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم (علیہم السلام)

حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ محترمہ کا اسم گرامی راحیل بنت لابان ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے بارہ۱۲ بیٹوں میں حضرت یوسف علیہ السلام سے بے حد محبت و تعلق خاطر تھا، کسی بھی وقت اُن کی جُدائی گوارا نہیں فرماتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا:-

"تمام انسانوں میں اللہ کے ہاں مکرّم کون ہے؟"

آپؐ نے ارشاد فرمایا:-

"اَکرمُ النَّاسِ یوسف نبیُ اللّٰه ابن نبی اللّٰه ابن نبی اللّٰه ابن خلیل اللّٰه (علیهم السّلام)"

(بخاری کتاب التفسیر)

امام احمدؒ نے اپنی مُسند میں ایک روایت ابن عمرؓ سے نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

"الکریمُ اِبنُ الکریم اِبنُ الکریم اِبنُ الکریم"

یُوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراھیم (علیهم السلام)

سیّدنا یوسف علیہ السلام بھی اپنے والد، دادا، پردادا کی طرح سنِ رُشد کو پہنچ کر نبوت و رسالت سے سرفراز ہوئے اور ملّتِ ابراہیمی کی دعوت و تبلیغ کے علمبردار

ہے، قرآن حکیم میں تذکرۂ انبیاء کے ضمن میں غالباً یہ ہی ایک ایسا تذکرہ ہے جو نہایت تفصیل کے ساتھ صرف یکجا ملتا ہے۔

قرآن حکیم اور حضرت یوسف علیہ السلام

سیدنا یوسف علیہ السلام کا اسم گرامی قرآن حکیم کی چھبیس (۲۶) آیات میں موجود ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:-

سورۂ انعام   آیت   ۸۴۔

سورۂ یوسف   آیات   ۴،۷،۸،۹،۱۰،۱۱،۱۷،۲۱،۲۹،۴۶،۵۱،۵۶،۵۸،۶۹،۷۶،۷۷،۸۰،۸۴،۸۵،۸۷،۸۹،۹۰،۹۴،۹۹۔

سورۂ مومن   آیت   ۳۴۔

اَحۡسَنُ الۡقَصَصِ

قرآن حکیم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرے کو احسنُ القصص (نہایت عمدہ قصّہ) کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ قصہ صرف اس ایک سورت میں ملتا ہے۔ پورے قرآن میں کسی اور جگہ موجود نہیں جیسا کہ دیگر انبیاء و رسل کے تذکرے بار بار اپنے خاص مقصد کے تحت ملتے ہیں۔

پورا قصہ ایک جگہ ہونے کے باعث جسقدر عبرتیں، حکمتیں اور مواعظ و نصائح اس سورت میں یکجا ملتی ہیں کسی اور قصہ میں یکجا جمع نہیں ہیں۔

قصص اور واقعات کے بیان کرنے میں صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ ہے عبرت و نصیحت، وعظ و تذکیر، سورۂ یوسف اس حیثیت سے پورا کا پورا وعظ و تذکیر ہے۔

سورۂ یوسف کے شانِ نزول کے بارے میں روایاتِ حدیث کا خلاصہ یہ ہے:-

"مکہ مکرمہ کے مشرکین نے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق علماء یہود سے گفتگو کی اور اپنی عاجزی و پریشانی کا اظہار کیا کہ

ہم اِنکو جھُوٹا ثابت کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں، کوئی ایسی تدبیر بتائی جائے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جھُوٹا ثابت کر دیا جائے اور وہ عاجز ہو جائے۔

یہود کے علماء نے اُن مشرکین سے کہا کہ اس مدعی نبوّت کو تنگ کرنے اور جھوٹا بنانے کے لئے تم لوگ اُن سے یہ سوال کرو کہ یعقوب علیہ السلام کی اولاد ملک شام سے مصر کیوں منتقل ہوئی؟ اگر یہ نبی نہیں تو ہرگز ہرگز نہ بتا سکے گا۔

کفارِ مکّہ نے یہود علماء کی ہدایت پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا، اِن کے اِس مطالبہ پر سورۂ یوسفؑ نازل ہوئی اور آپؐ نے وہ سب کچھ اُن کو سُنا دیا جو سورۂ یوسفؑ میں موجود ہے۔" (ابن کثیر)

واقعہ یہ ہے کہ یہودی علماء نے اس سوال کا اس لئے انتخاب کیا تھا کہ یہ واقعہ مکہ مکرمہ میں مشہور نہ تھا اور نہ ہی وہاں کوئی یہودی یا عیسائی عالم تھا جو کسی کو بتا سکے۔ ایسے حالات میں جبکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم امّی لقب تھے نہ کسی مکتب میں درس لیا تھا اور نہ مکہ مکرّمہ میں کوئی درسگاہ تھی اور نہ ہی آپؐ نے نبوت سے پہلے کبھی یہ واقعہ کسی سے سنا تھا۔ ان مخصوص حالات میں نہایت تفصیل اور کامل وضاحت کے ساتھ حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کا طویل واقعہ بیان کر دینا خود نبوت کی ایک کھُلی دلیل تھی اور آنحضورؐ کا یہ صریح معجزہ تھا لیکن جس کی قسمت میں بے نصیبی ہو بھلا اُسکو اِس سے کہاں ہدایت مل سکتی تھی۔ جو ہدایت کے طالب تھے وہ تو ایمان لائے اور بقیہ عناد و سرکشی ہی میں پڑے رہے۔

چند تمہیدی باتیں

تذکرہ سیدنا یوسف علیہ السلام سے پہلے چند باتیں بطور "تمہید" واقعہ کی وضاحت کے لئے ضروری ہیں:-

جیسا کہ لکھا گیا حضرت یوسف علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کے پوتے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پڑپوتے ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہؔ بیٹے تھے جو اُن کی چار بیویوں سے پیدا ہوئے۔ اِن میں حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین ایک بیوی سے ہیں۔ (یعنی حقیقی بھائی)

حضرت یعقوب علیہ السلام کا قیام فلسطین میں تھا جہاں حضرت اسحٰق علیہ السلام اور اُن سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام رہا کرتے تھے۔

تورات کی تحقیق کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کی پیدائش ۱۹۰۶ء قبل مسیح یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے تقریباً دو ہزار سال پہلے بتائی جاتی ہے۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر شریف سولہ سترہ سال کی ہوئی بھائیوں نے سازش کر کے اُنھیں کنویں میں پھینک دیا تھا، اور جس قافلہ نے اُنھیں کنویں سے نکالا تھا وہ شرق اُردن سے آرہا تھا اور مصر کی جانب رواں دواں تھا۔

قافلے نے حضرت یوسف علیہ السلام کو غلام سمجھ کر بازارِ مصر میں فروخت کر دیا۔ مصر کا دار السلطنت اُس زمانے میں (منف) تھا جسکے کھنڈرات آج بھی قاہرہ کے جنوب میں چودہ پندرہ میل کے فاصلہ پر پائے جاتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں وہاں پہنچے تھے۔ دو چار سال عزیز مصر کے شاہی محل میں مقیم رہے پھر عزیز مصر کی بیوی کی سازش پر آٹھ نو سال جیل میں زندگی بسر کی۔ جب تختِ مصر پر بیٹھے اِسوقت آپکی عمر شریف تیسؔ سال تھی اور اس کے بعد تقریباً اسیؔ سال تک تخت و تاج کے تنہا وارث رہے اور جس عدل و انصاف سے حکمرانی کی وہ تاریخِ عالم کا بے مثال نمونہ ہے۔

اپنی حکومت کے نویں یا دسویں سال اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام اور پورے خاندان کو فلسطین سے مصر منتقل کر دیا اور اپنی عمر کے ایکسو دس (۱۱۰) سال میں وفات پائی۔ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

آغاز قصہ اور نزاع الاخوات

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی تمام اولاد میں حضرت یوسف علیہ السلام سے بے حد

محبت و پیار رکھتے تھے. خود نبی تھے، نورِ نبوّت کے حامل تھے. اپنے علم و فراست سے مستقبل قریب میں حضرت یوسف علیہ السلام کی نبوت و رسالت کو دیکھ رہے تھے.

علاوہ ازیں حضرت یوسف علیہ السلام اپنے دیگر بھائیوں سے اخلاق و عادات میں یکسر مختلف تھے. ماں باپ کا احترام، اطاعت شعاری، خلوص و خدمت یہ ایسے اوصاف تھے جو ایک ہونے والے نبی کے لئے ویسے بھی ضروری تھے حضرت یوسف علیہ السلام میں جمع تھے، باپ کی یہ محبت و چاہت برادرانِ یوسف کے لئے بیحد شاق اور ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گئی وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے کہ کسی طرح بھی اپنے باپ کے قلب سے یوسف علیہ السلام کی محبت کو دُور کر دیں یا پھر خود یوسف علیہ السلام ہی کو دُور کر دیا جائے تاکہ سارا قصہ ہی ختم ہو جائے. اُنھی سازشوں کے دوران حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک خواب دیکھا کہ گیارہ ستارے اور شمس و قمر اُن کے آگے سجدہ ریز ہیں. یہ عجیب و غریب خواب تھا جو دنیائے انسانیت نے کبھی نہ دیکھا ہوگا.

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد بزرگوار سے یہ خواب بیان کیا، حضرت یعقوب علیہ السلام پر خواب کی حقیقت منکشف ہو گئی. بیٹے سے کہا یہ خواب کسی کے آگے نہ دُھرایا جائے ایسا نہ ہو کہ اُس کو سُنکر تیرے بھائی بُرائی سے پیش آئیں. کیونکہ شیطان انسان کے پیچھے لگا ہوا ہے. اس موقعہ پر قرآن حکیم نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی تعبیرِ خواب کو بیان نہیں کیا تا آنکے وہ خواب حقیقت بنکر سامنے آ گیا.

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ گیارہ ستاروں سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کے گیارہ بھائی اور شمس و قمر سے والدین مراد ہیں.

تفسیر قرطبی میں مزید یہ وضاحت ملتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ محترمہ راحیلؓ اگرچہ اس خواب سے پہلے وفات پا چکی تھیں مگر انکی بہن حضرت یعقوب علیہ السلام کے نکاح میں آ گئی تھیں. خالہ ماں کے قائم مقام ہوتی ہے خصوصاً جبکہ وہ والد کی زوجیت میں آ جائے تو عرفاً اسکو ماں ہی کہا جاتا ہے.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اَلْخَالَۃُ بِمَنْزِلَۃِ الْاُمِّ. الحدیث
(خالہ ماں کے قائم مقام ہے.)

خوابِ یوسفی کا یہ تذکرہ قرآن حکیم میں اس طرح موجود ہے :-

قرآنی مضمون

الٓرٰ تِلْكَ اٰيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِيْنِ . الخ
(یوسف آیات ۱ تا ۶)

الٓرٰ۔ یہ روشن کتاب کی آیات ہیں۔ ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔

اے نبیؐ ہم اس قرآن کے ذریعہ سے جو ہم نے تمہاری طرف بھیجا ہے ایک نہایت اچھا قصہ تمہیں سناتے ہیں اور تم اس سے پہلے (اس قصے سے) بے خبر تھے۔

جب یوسف (علیہ السلام) نے اپنے باپ سے کہا اے ابا میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج و چاند کو دیکھا ہے، دیکھتا کیا ہوں کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔

باپ نے کہا اے میرے بیٹے تو اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں سے بیان نہ کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تیرے ساتھ کوئی خفیہ چال چل جائیں، بلاشبہ شیطان انسان کے لئے کھلا دشمن ہے۔ اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو برگزیدہ کریگا اور تجھ کو (تاویلِ حدیث) خواب کی تعبیریں سکھائیگا اور اپنی نعمتیں تجھ پر اور اولادِ یعقوب پر پوری کرے گا۔ جس طرح کہ اُس نعمتِ نبوت کو پورا کیا تیرے اجداد پر پہلے سے یعنی ابراہیم و اسحٰق (علیہم السلام) پر بیشک تیرا پروردگار بڑا علم والا حکمت والا ہے۔"

برادرانہ سازش

جامع ترمذی میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سچا خواب نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔ اور خواب معلق رہتا ہے جبکہ کسی سے بیان نہ کیا جائے۔ جب بیان کر دیا گیا اور سننے والے نے کوئی تعبیر دیدی تو تعبیر کے مطابق واقع ہوجاتا ہے۔

اس لئے خواب ہر کسی سے بیان نہ کیا جائے۔ صرف عالم سے یا پھر اپنے خیر خواہ سے بیان کیا جائے۔

الغرض حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا خواب حضرت یعقوب علیہ السلام سے بیان کیا اور اسکو محفوظ رکھا، اس خواب کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت اور زیادہ ہوگئی۔ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے سے جُدا ہونے نہیں دیتے" باپ کا یہ عمل سوتیلے بھائیوں کو اور زیادہ مشتعل کر دیا، اور اب وہ اس تاک میں رہنے لگے کہ یوسف علیہ السلام کے خلاف کوئی آخری کارروائی کردی جائے، چنانچہ حسد کی بھڑکتی ہوئی آگ نے ایک روز برادرانِ یوسف کو یوسف علیہ السلام کے خلاف سازش کرنے پر مجبور ہی کر دیا۔

سب بھائیوں نے مشورہ کیا پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نہایت خیر خواہی ومحبت کے پیرایہ میں کہنے لگے اباجان! آپ یوسفؑ کو ہمارے ساتھ سیر وتفریح کے لئے کیوں نہیں بھیجتے؟ آپ اسکو ہمیشہ اپنے ساتھ ہی رکھتے ہیں؟ وہ بھی بچہ ہے کھیل کود کا اُسکو بھی موقعہ ملنا چاہیئے آخر آپ کو اُسکے بارے میں کیا اندیشہ ہے؟ اور ہم اتنے بھائی کیا اُسکی کوئی حفاظت نہیں کر سکیں گے؟ آپ کو ہم پر اعتماد کرنا چاہیئے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی فراستِ نبوت سے جان گئے کہ اِن سوتیلے بھائیوں کے دلوں میں کھوٹ ہے اور وہ یوسف علیہ السلام کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں مگر آپ نے صاف صاف لفظوں میں اس اندیشہ کو ظاہر نہیں فرمایا تاکہ کہیں وہ بگڑ کر علانیہ دشمنی پر آمادہ نہ ہوجائیں۔ اس لئے بجائے واضح طور پر اپنا اندیشہ ظاہر کرنے کے اشارۃً کنایۃً اُن پر یہ بات واضح کردی کہ واقعی مجھ کو یوسف علیہ السلام کے بارے میں اندیشہ ہے کہ کہیں کوئی بھیڑیا اُسکو اُٹھا نہ لے جائے اور تم کو اُس کی خبر تک نہ ہو۔

سب بھائیوں نے بیک زبان کہا اگر ایسا ہوا تو یقیناً ہم نے سب کچھ گنوا دیا۔ بھلا کہیں ایسا ممکن بھی ہے؟ ہم اتنے ہوکر اپنے ایک عزیز بھائی کی حفاظت تک نہ کرسکیں؟ اباجان! آپ کوئی اندیشہ نہ کریں اور ہر طرح مطمئن رہیں ہم اسکی پوری حفاظت کریں گے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا یہ اندیشہ اور بھائیوں کی سازشی تفصیلات قرآن حکیم میں اس طرح موجود ہیں :-

قرآنی مضمون

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ۔ الخ

(یوسف آیات ۷ تا ۱۴)

"یقیناً یوسف (علیہ السلام) اور اُسکے بھائیوں کے قصے میں پوچھنے والوں کے لئے بڑی عبرتیں ہیں۔ جبکہ وہ (آپس میں) کہنے لگے کہ یوسف (علیہ السلام) اور اس کا بھائی (بن یامین) ہمارے باپ کو زیادہ محبوب ہے۔ حالانکہ ہم ایک پورا جتھا ہیں۔ بلاشبہ ہمارا باپ صریح خطا پر ہے۔ یوسف کو قتل کر ڈالو یا کسی ملک میں پھینک آؤ تاکہ تمہارے باپ کی توجہ و محبت تمہاری طرف سمٹ آجائے اور یہ کام کرنے کے بعد نیک قوم بن کر رہنا۔

ان میں سے ایک نے کہا یوسف کو قتل نہ کرو اور اسکو کسی گمنام کنویں میں ڈال دو تاکہ کوئی اس کو اُٹھا لیجائے۔ اگر تم کو ایسا کرنا ہی ہے۔ (مشورہ کرنے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس آئے) کہنے لگے اے ابا جان آپ کو کیا ہوا کہ آپ یوسف کے بارے میں ہم پر اعتماد نہیں کرتے حالانکہ ہم اسکے خیر خواہ ہیں۔ کل اسکو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے کہ وہ کھائے پئے اور کھیلے کودے اور بلاشبہ ہم اسکے نگہبان ہیں۔

یعقوب علیہ السلام نے فرمایا مجھے اس سے رنج و دُکھ پہنچتا ہے کہ تم اُسکو اپنے ساتھ لے جاؤ اور مجھے یہ خوف و اندیشہ ہے کہ اسکو بھیڑیا کھا جائے اور تم غافل رہو (کیونکہ اُس جنگل میں بھیڑیے بہت تھے) سب نے کہا اگر اسکو بھیڑیا کھا گیا جبکہ ہم سب طاقتور ہیں تو بلاشبہ ایسی صورت میں تو ہم نے سب کچھ گنوا دیا (بھلا ایسا کہیں ممکن ہے)"

جھوٹا خون

حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کی مزید انتقامی کارروائی سے

بچنے کے لئے حضرت یوسف علیہ السلام کو اُنکے ہمراہ جانے کی اجازت دے دی اسطرح برادران یوسف نے اپنے مکر و فریب میں کامیابی حاصل کی اور یوسف علیہ السلام کو سیر و تفریح کے بہانے جنگل لے گئے اور پھر اپنے متفقہ مشورے کے مطابق ایک ایسے کنویں میں ڈال دیا جسمیں پانی نہ تھا اور عرصہ سے خشک پڑا تھا۔ قرآن حکیم نے اس کنویں کو "غَيٰبَتِ الْجُبِّ" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ غیابہ ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیز کو چُھپالے اور غائب کردے۔ اسی لئے قبر کو بھی غیابہ کہا جاتا ہے (کیونکہ وہ لاش کو چُھپا دیتی ہے) اور جُب ایسے کنویں کو کہتے ہیں جسکی من پختہ بنی ہوئی نہ ہو۔ یعنی ایک ایسا ویران اور بے آب گڑھا جو آبادی سے دُور درختوں میں چُھپا ہوا ہو۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو جبراً و قہراً اسمیں اُتار دیا گیا۔ قرطبیؒ نے نقل کیا ہے کہ اسوقت حضرت یوسف علیہ السلام نابالغ تھے اور تفسیر مظہری میں تصریح ہے کہ اسوقت ان کی عمر سات سال تھی۔

امام قرطبی اور دیگر مفسرین نے کنویں میں ڈالنے کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:۔

> جُب اُن کو کنویں میں ڈالنے لگے تو حضرت یوسف علیہ السلام کنویں کی مَن سے چمٹ گئے۔ بھائیوں نے اُن کا کُرتا اُتارا اور اُن کے ہاتھ باندھے۔ اُس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے پھر رحم کی درخواست کی مگر وہی جواب ملا کہ گیارہ ستارے جو تجھ کو سجدہ کرتے تھے اُن ہی کو بُلا وہ تیری مدد کریں گے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ خواب کسی طرح بھائیوں کو معلوم ہوگیا تھا جس کی وجہ سے اُن کی آتش غضب بھڑک اُٹھی تھی۔ الغرض حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک ڈول میں رکھ کر کنویں میں لٹکا دیا۔ جب درمیان تک پہنچے تو رسّی کاٹ دی۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے بندے کی حفاظت فرمائی، نیچے گرنے کی وجہ سے چوٹ نہ آئی اور قریب ہی ایک چٹان نظر آئی اسپر حضرت یوسف علیہ السلام صحیح سالم بیٹھ گئے۔ بعض روایات میں یہ وضاحت ہے کہ جبرئیل امین کو حکم دیا گیا تھا کہ تہہ میں گرنے سے پہلے اُنہیں چٹان پر بٹھا دیا جائے۔

تین یوم تک کنویں میں رہے اُن کا ایک بھائی جسکا نام یہودا
بیان کیا جاتا ہے اور جو اپنے بھائیوں کی اس سازش کا مخالف تھا،
لیکن بھائیوں کی مخالفت کی طاقت نہ رکھتا تھا۔ ہر روز روٹی اور پانی چھپکے
سے کنویں میں اُتار دیا کرتا تھا۔ لیکن اُسکی ہمت اتنی نہ ہوئی کہ باپ
حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ واقعہ بیان کر دے۔ اِدھر اللہ تعالیٰ
نے حضرت یوسف علیہ السلام کی تسلّی اور اطمینان کے لئے اُنپر وحی
نازل کی جسمیں کسی آئندہ زمانے میں بھائیوں کی ملاقات اور اُن پر
بالادستی کی خوشخبری تھی اور یہ کہ وہ لوگ محتاج و فقیر بنکر آپ کے
پاس آئیں گے آپ اُن کو پہچان لیں گے لیکن وہ لوگ آپ کو پہچان
نہ سکیں گے۔"

یہ وحی جو کنویں میں نازل ہوئی (بقول تفسیر مظہری) وحی نبوت نہ
تھی کیونکہ وہ چالیس سال کی عمر میں عطا ہوتی ہے بلکہ یہ وحی ایسے ہی تھی جیسے حضرت
موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بذریعہ وحی مطلع کیا گیا تھا یا جیسے حضرت مریمؑ سے کلام کیا گیا
یا شہد کی مکھی کی طرف وحی کی گئی۔ حضرت یوسف علیہ السلام پر وحی نبوت کا سلسلہ
مصر پہنچنے اور جوان ہونے کے بعد شروع ہوا جیسا کہ اسی سورہ میں تصریح ہے:۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا۔ (آیت ۲۲)

اور جب یوسفؑ اپنی پوری جوانی کو پہنچے تو ہم نے انہیں
علم و حکمت (نبوت) عطا کی۔

مگر دیگر مفسرین جیسے ابن جریرؒ، ابن ابی حاتمؒ نے اسکو وحی نبوت ہی قرار دیا ہے۔ یہ
ایسے ہی ہے جیسے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں نبوت عطا کی گئی۔

الغرض حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈال کر واپسی کے وقت
ایک جانور کے خون سے حضرت یوسف علیہ السلام کا کرتہ سرخ کیا اور عشاء کے وقت
روتے پیٹتے حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس پہنچے حضرت یعقوب علیہ السلام اِنکی
آواز سن کر باہر آئے پوچھا کہ کیا واقعہ ہے؟ کیا تمہاری بکریوں کے گلّے پر کسی نے حملہ
کر دیا ہے؟ اور یوسف کہاں ہے؟

سب نے یک زبان ہو کر کہا ہم نے آپس میں دوڑ لگائی اور یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ اس درمیان میں بھیڑیا آیا اور یوسفؑ کو کھالیا۔ دیکھئے یہ اس کا کُرتہ ہے جو ہم کو مقامِ حادثہ پر ملا ہے۔ اے ابا جان! آپ کو تو یقین نہیں آئے گا خواہ ہم کتنے ہی سچے کیوں نہ ہوں؟

قرآن حکیم نے اس خُون آلود کرتے کا وصف بِدَمٍ کَذِبٍ (جھوٹا خون) بیان کیا ہے۔ حقیقتاً یہ جھوٹا خون تو تھا ہی لیکن صورۃً بھی جھوٹا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے انہیں جھوٹا ثابت کرنے کے لئے اُن بھائیوں کو غافل اور بے عقل بنا دیا کہ کُرتے پر خُون لگانے کے ساتھ اُس کو جا بجا سے پھاڑ بھی دیتے۔ جس سے بھیڑیے کا کھا جانا ثابت ہوتا، انھوں نے یوسف علیہ السلام کے صحیح و سالم کُرتے پر جانور کا خُون لگا کر باپ کو دھوکہ میں ڈالنا چاہا (لیکن جھوٹے کو عقل نہیں ہوتی) خود دھوکہ کھا گئے کرتے کو پھاڑا نہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے صحیح و سالم کُرتہ دیکھ کر فرمایا:۔

"میرے بیٹو! یہ بھیڑیا کیسا حکیم و عقلمند تھا کہ یوسف کو اسطرح کھایا کہ کہیں سے کُرتہ تک نہ پھٹنے پایا؟"

اسطرح حضرت یعقوب علیہ السلام پر اُن کا مکر و فریب و جعل سازی کا راز فاش ہوگیا۔ فرمایا یوسف علیہ السلام کو تو بھیڑیے نے نہیں کھایا بلکہ تمہارے دلوں نے ایک بات گھڑ لی ہے۔ اب میرے لئے بہتر یہ ہی ہے کہ میں صبر کروں اور جو کچھ تم کہتے ہو اُس پر اللہ سے مدد طلب کروں چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام سب سے الگ ہو کر یکسو ہو گئے اور اللہ تعالےٰ سے فریاد کرنے لگے۔ اس ساری سازش اور جھوٹے خون اور مکر و فریب کا تذکرہ ان آیات میں اس طرح مذکور ہے:۔

قرآنی مضمون

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَ اَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ الخ (یوسف آیات ۱۵ تا ۱۸)

اور (سابقہ طے شدہ فیصلہ کے مطابق) سب نے پختہ عزم کرلیا کہ اُن کو کسی اندھیرے کنوئیں میں ڈال دیں (تو جو کچھ تجویز کیا تھا عمل درآمد کیا) (اور اُس وقت اُنکی تسلی کے لئے) ہم نے (اللہ تعالےٰ نے) اُن کے

پاس وحی بھیجی کہ (اے یوسف غم نہ کرنا ہم تم کو یہاں سے نجات دیکر بڑے درجے پر پہنچادیں گے اور ایک دن وہ ہوگا کہ) تم اُن لوگوں کو یہ بات جتلاؤ گے اور وہ تم کو (بوجہ اسکے کہ تم ایک اونچی حالت میں ہوگے) پہچان تک نہ سکیں گے۔

(غرض یوسف علیہ السلام کا تو یہ قصہ ہوا) اور (اُدھر) وہ لوگ اپنے باپ کے پاس عشار کے وقت روتے ہوئے پہنچے۔

کہنے لگے ابا جان ہم سب تو آپس میں دوڑنے لگ گئے اور یوسفؑ کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا۔ پس ایک بھیڑیا (آیا اور) انکو کھا گیا اور آپ تو ہمارا کیوں یقین کریں گے گو ہم کیسے ہی سچے ہوں۔

اور یوسفؑ کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے (تاکہ اپنے قول کی سند میں پیش کریں) یعقوب (علیہ السلام) نے (دیکھا تو کرتہ کہیں سے پھٹا نہیں چرا نہیں تھا تو) کہا کہ یوسف کو بھیڑیا وغیرہ نے نہیں کھایا) بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنا لی ہے سو (خیر) صبر ہی کروں گا جسمیں شکایت کا نام ونشان نہ ہوگا اور جو باتیں تم بناتے ہو اُن میں اللہ ہی مدد کرے ۔"

دورِ غلامی

حضرت یعقوب علیہ السلام بیٹوں کی اس مکروفریب والی گفتگو کے بعد تھک ہار کر یکسو ہوگئے اور غالباً وحی الٰہی یا پھر الہام وفراستِ نبوت سے اطمینان ہوگیا کہ یوسف علیہ السلام کا فراق ایک طویل عرصہ تک برقرار رہے گا۔ سکوت اختیار کرلیا۔ اِدھر ملک شام سے ایک قافلہ مصر جارہا تھا۔ راستہ بھول کر اس غیر آباد کنوئیں پر پہنچا، پانی کی ضرورت ویسے بھی سفر میں پیش آتی ہے۔ خاص طور پر جبکہ دُور دُور تک پانی کا نشان نہ ملتا ہو کنوئیں کو دیکھ کر ایک شخص نے جسکا نام مالک بن دُعبر بتایا جاتا ہے ڈول کنوئیں میں ڈالا حضرت یوسف علیہ السلام نے خدائی قدرت کا مشاہدہ کیا۔ اُس ڈول کی رسّی پکڑلی اُوپر پہنچے، اس کمسن حسین وجمیل لڑکے کو دیکھ کر وہ پکار اُٹھا :- یٰبُشْرٰی هٰذَا غُلَامٌ۔ (اے بڑی خوشی کی بات ہے یہ تو ایک بڑا اچھا لڑکا نکل آیا۔)

حدیثِ معراج میں یہ عبارت ملتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں شبِ معراج میں یوسف علیہ السلام سے ملا تو دیکھا کہ اللہ تعالےٰ نے پورے عالم کے حُسن وجمال میں سے آدھا حُسن اُن کو عطا فرمایا ہے اور باقی آدھا سارے جہاں میں تقسیم ہوا ہے۔ (صحیح مسلم)

ابتدائً تو مالک بن دُعبر نے تعجّب سے پکارا تھا مگر بعد میں اُسکو خیال آیا کہ اِسکا چرچا نہ کیا جانا مناسب ہے تاکہ اِسکو چُھپا کر رکھا جا سکے اور پھر فروخت کر کے رقم وصول کر لی جائے۔ اصل میں قرآنی الفاظ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً یعنی چُھپا لیا اسکو ایک مالِ تجارت سمجھکر، ممکن ہے قافلہ کے چند لوگوں نے ایسا کیا ہو یا یہ بھی تفسیر ممکن ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حقیقتِ واقعہ کو چُھپا کر یوسف علیہ السلام کو ایک مالِ تجارت بنالیا جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ بڑا بھائی یہودا روزانہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں روٹی و پانی خفیہ طور پر پہنچانے آیا کرتے تھے، تیسرے روز جب اُن کو کنویں میں نہ پایا تو واپس آکر اپنے دیگر بھائیوں سے واقعہ بیان کیا۔ یہ سب بھائی جب وہاں پہونچے اور تحقیق کرنے پر قافلہ والوں کے ہاں یوسف علیہ السلام برآمد ہوئے تو اُن سے کہا کہ یہ لڑکا ہمارا غلام ہے بھاگ کر یہاں آگیا تھا تم نے بہت بُرا کیا کہ اسکو اپنے قبضہ میں رکھا۔ مالک بن دُعبر اور اسکے ساتھی سہم گئے کہ ہم چور سمجھے جائینگے اسلئے بھائیوں سے یوسف علیہ السلام کی خریداری پر بات چیت ہونے لگی تو اب آیت کے یہ معنی ہوئے کہ برادرانِ یوسف نے خود ہی یوسف علیہ السلام کو ایک مالِ تجارت بنالیا اور فروخت کر دیا:- وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ۔ یعنی اللہ تعالےٰ کو اِن کی سب کارگزاریاں معلوم تھیں۔ اسکے بعد برادرانِ یوسف نے یوسف علیہ السلام کو بیچ دیا (یا) قافلہ والوں نے یوسف علیہ السلام کو بہت تھوڑی سی قیمت میں خرید لیا یعنی گنتی کے چند درہم کے معاوضہ میں دونوں تفسیریں منقول ہیں۔

"حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت کے مطابق بیسؔ درہم میں یہ معاملہ ہوا۔" (ابن کثیر، جلالین)

دسؔ بھائیوں نے دوؔ دوؔ درہم تقسیم کر لئے۔ اِس معاملت کے اختتام کو قرآنی جملہ نہایت بلیغ پیرایہ میں ادا کرتا ہے۔

"برادرانِ یوسف اس معاملہ میں دراصل مال کے خواہشمند نہ تھے۔" (یعنی اِن کا اصل مقصد تو یوسف علیہ السّلام کو باپ سے جدا کرنا تھا اس لئے تھوڑے سے دراہم میں معاملہ کرلیا)

قرآن حکیم میں قافلہ والوں کا تذکرہ اس طرح موجود ہے۔

قرآنی مضمون

وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ. الخ (آیت ۱۹-۲۰)

"(اُدھر) ایک قافلہ آنکلا (جو مصر کو جاتا تھا) اُنھوں نے اپنا آدمی پانی لانے کے واسطے (یہاں کنویں پر) بھیجا اور اُس نے اپنا ڈول ڈالا (تو یوسف نکل آئے مارے خوشی کے) کہنے لگا اے خوشخبری یہ تو (خوبصورت) لڑکا ہے اور اسکو مال تجارت قرار دیکر چھپالیا اور اللہ کو ان سبکی کارگزاریاں معلوم تھیں اور اُن کو بہت ہی کم قیمت میں بیچ ڈالا یعنی گنتی کے چند درہم کے بدلے اور وہ لوگ کچھ ان کے قدردان تو تھے ہی نہیں۔"

بازارِ مصر میں

غرض اسطرح حضرت یوسف علیہ السّلام کو تاجروں کے قافلہ نے خرید کر اپنا غلام بنالیا اور مال تجارت کے ساتھ اُن کو بھی مصر لے گئے۔ سیّدنا یوسف علیہ السّلام کی زندگی کا یہ پہلو جو صورۃً غلامی کی شکل میں پیدا ہوا لیکن اپنے اندر نبوّت اور تخت وتاج کی عظمتیں پوشیدہ رکھتا ہے۔ یہ ہی وہ پہلا زینہ تھا جس نے انھیں مصر کے تختِ شاہی پر لا بٹھایا۔

حضرت یوسف علیہ السّلام اپنی قسمت پر شاکر، مصائب پر صابر، اور اللہ کے فیصلہ پر راضی، سرِ نیاز خم کئے مصر کے بازار میں فروخت ہونے جارہے ہیں۔

ابن کثیرؒ نے امام مجاہدؒ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ برادرانِ یوسف کچھ دُور قافلہ والوں کے ساتھ چلے اور ان لوگوں سے کہا کہ دیکھو اس غلام کو بھاگ جانے کی عادت ہے کھُلا نہ چھوڑنا یہاں تک کہ اسکو لے کر مصر نہ پہنچ جانا۔ جب بھائیوں کو اس

کو اس بات کا اطمینان ہوگیا کہ قافلہ مصر کے راستہ پر چل پڑا تو اپنے گھر واپس ہو گئے۔ مصر پہنچکر قافلہ والوں نے حضرت یوسف علیہ السّلام کو "بازار مصر" میں فروخت کرنے کا اعلان کیا۔ تفسیر قرطبیؒ میں مذکور ہے کہ لوگوں نے بڑھ بڑھ کر قیمتیں لگانا شروع کیا یہاں تک کہ وزنِ یوسف علیہ السلام کے برابر سونا اور اسی کے برابر مُشک اور ریشمی کپڑے قیمت لگ گئی۔

یہ دولت اللہ تعالےٰ نے عزیز مصر کے لئے مقدّر کی تھی، مصری افواج کا ایک افسر، شاہی خاندان کا رئیس جس کا نام فوطیفار تھا۔ مصر کے بازار سے گزر رہا تھا یوسف علیہ السلام پر نظر پڑی تو صورت و شکل سے بیحد متأثر ہوگیا اور منہ بولی قیمت دے کر اپنے گھر لے آیا اور اپنی بیوی سے کہا کہ دیکھو اسکو عزت سے رکھنا۔ عجب نہیں کہ یہ ہم کو فائدہ بخشے یا ہم اسکو اپنا بیٹا بنالیں۔ امام قرطبیؒ لکھتے ہیں کہ اسوقت یہ رئیس لاولد تھا۔ قرآن حکیم نے اسکا نام عزیز مصر بیان کیا ہے۔ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ یہ شخص ملکِ مصر کا وزیر خزانہ تھا اور بادشاہِ مصر اس زمانے میں قوم عمالقہ کا ایک شخص ریّان بن اُسید تھا جو بعد میں حضرت یوسف علیہ السلام پر ایمان لایا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی ہی میں انتقال کر گیا۔

عزیز مصر جس نے حضرت یوسف علیہ السّلام کو خریدا تھا اسکی بیوی کا نام راعیل یا زلیخا بیان کیا جاتا ہے اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ یوسف علیہ السّلام کے ساتھ غلاموں جیسا معاملہ نہ کرنا، اِن کی ضروریات کا اچھا انتظام کرنا (قرآن حکیم نے اس عورت کو امرأة العزیز (عزیز کی بیوی) کہا ہے۔

اس طرح حضرت یوسف علیہ السّلام شاہی خاندان میں اولاد کی طرح رہنے لگی اسی نازونعمت میں سِنّ شعور کو پہنچے۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ دنیا میں تینؔ آدمی بڑے عقلمند اور قیافہ شناس ثابت ہوئے ہیں :-

اوّل عزیز مصر جس نے اپنے قیاس و اندازے سے اپنی بیوی کو یہ ہدایت دی کہ یوسف کا اکرام کرنا۔

دوم حضرت شعیب علیہ السّلام کی وہ صاحبزادی جس نے حضرت

موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے باپ کو مشورہ دیا کہ ابا جان انکو ملازم رکھ لیجئے اسلئے کہ بہترین ملازم وہ شخص ہے جو قوی اور امانتدار بھی ہو۔

سوم حضرت ابوبکر صدیق رض جنھوں نے اپنی وفات سے پہلے حضرت عمر فاروق رض کو خلافت کے لئے نامزد فرمایا۔ (قرطبی)

بازارِ مصر میں خریداری کا تذکرہ اس طرح آیا ہے:۔

قرآنی مضمون

وَقَالَ الَّذِی اشْتَرٰهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِیْ الخ
(یوسف آیت ۲۱-۲۲)

مصر کے جس شخص نے یوسفؑ کو خریدا اُس نے اپنی بیوی سے کہا اسکے قیام کا اچھا انتظام کرنا بعید نہیں کہ یہ ہمارے لئے فائدہ مند ثابت ہو، یا ہم اسے بیٹا بنالیں (مشہور یہ ہے کہ اُسکے ہاں اولاد نہ تھی) اسی طرح ہم نے یوسفؑ کو زمین کی حکومت دے دی اور تاکہ اُن کو خوابوں کی تعبیر دینا بتلادیں اور اللہ تعالےٰ اپنے کام پر غالب ہے (جو چاہے کر دے) لیکن اکثر آدمی اس بات کو جانتے نہیں۔

سخت ترین آزمائش

فارسی کا ایک مقولہ ہے "مقرّبان رابیش بود حیرانی" بڑوں کی آزمائش بھی بڑی ہوتی ہے۔

چاہِ کنعان کی مصیبت کم نہ تھی۔ دورِ غلامی سے بھی سابقہ پڑا۔ بازارِ مصر میں غلاموں کی طرح فروخت ہوئے۔

اب جوانی کی وہ کٹھن آزمائش شروع ہوئی جسمیں صرف اور صرف خدا کی حفاظت سہارا بنتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام سن بلوغ کو پہنچ گئے ہیں۔ جوانی کا عالم تھا، حُسن و خوبروئی کا کوئی ایسا پہلو نہ تھا جو ان کے اندر موجود نہ ہو۔ عزیز مصر کی بیوی اُن پر بُری طرح فریفتہ ہوگئی۔

قرآن حکیم نے اس حادثہ کو اس طرح بیان کیا ہے:۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا (الآیۃ آیت ۲۳)

"اور پھسلایا یوسفؑ کو اس عورت نے جس کے گھر میں وہ
رہتے تھے اسکے نفس کے معاملہ میں اور دروازے بند کر دیئے
اور کہنے لگی آجاؤ تم ہی سے کہتی ہوں"

اگرچہ یہ عورت عزیزِ مصر کی بیوی ہے جیسا کہ دوسرے موقعہ پر بیان کیا گیا ہے لیکن مذکورہ آیت میں اَلَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا (وہ عورت جس کے گھر میں یوسف رہا کرتے تھے) کے مبہم عنوان سے اُس عورت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس عنوان میں یہ نزاکت ملحوظ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے گناہ سے بچنے کی مشکلات میں اس بات نے اور بھی اضافہ کر دیا تھا کہ وہ اسی عورت کے مکان میں اسی کی پناہ میں رہتے تھے۔ اس کے کہنے کو نظر انداز کرنا کچھ آسان نہ تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام خانوادۂ نبوت کا چشم وچراغ تھے، خود بھی منصبِ نبوت پر فائز ہو چکے تھے۔ بقول حسن بصریؒ اسوقت عمر شریف چالیسؒ سال ہو چکی تھی۔ بھلا ان سے یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اس ناپاکی اور فحش میں مبتلا ہو جائیں، لیکن عورت بے قابو ہو کر جب کمرے کا دروازہ بند کر دے اور اصرار کرنے لگے تو یہ وقت ہر ایک کے لئے سخت آزمائش کا ہو جاتا ہے۔ شاہی خاندان کی عورت، حسن و بہار سے معمور، محبوب نہیں عاشق بنکر جب کسی کا پیچھا کرے تو کونسا ذریعہ ہے جو آدمی کو گناہ سے باز رکھے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے آپ کو چوطرف سے گھرا ہوا پایا تو پیغمبرانہ انداز میں سب سے پہلے اللہ تعالےٰ کی پناہ مانگی مَعَاذَ اللّٰهِ (اللہ کی پناہ) (یعنی اپنے عزم وارادہ پر بھروسہ نہیں کیا) اسکے بعد حکمت وموعظت کے ساتھ زلیخا کو نصیحت کرنا شروع کیا کہ وہ بھی اللہ تعالےٰ سے ڈرے اور اپنے ارادے سے باز آجائے۔ فرمایا:۔

"وہی میرا رب ہے اُس نے مجھے عزت کی جگہ دی اور مجھ کو
کہاں سے کہاں پہنچایا ایسے محسن ومُربّی کے حکم میں خیانت کروں اور
اُسکو نظر انداز کر دوں؟ یقیناً ظلم کرنے والوں کو کبھی فلاح نصیب نہیں ہوتی"

قرآن حکیم نے اس نازک ترین کشمکش کو اس طرح واضح کیا ہے:۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا۔ الخ (آیت ۲۲ تا ۲۴)

"اور جب یوسف اپنی جوانی کو پہنچے ہم نے انھیں حکمت و علم عطا فرمایا اور ہم نیک لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اور جس عورت کے گھر میں یوسف رہا کرتے تھے وہ اُن سے اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے اُن کو پھُسلانے لگی اور گھر کے سارے دروازے بند کردیئے اور کہنے لگی بس آجاؤ تم ہی سے کہتی ہوں، یوسفؑ نے کہا اللہ بچائے وہ میرا مربّی ہے کہ مجھ کو اچھی طرح رکھا ایسے حق فراموشوں کو فلاح نہیں ہوا کرتی اور البتہ اُس عورت نے یوسفؑ سے ارادہ کیا اور وہ بھی اُس سے ارادہ کرتے اگر اپنے پروردگار کے بُرہان کو نہ دیکھ پاتے۔ اسی طرح ہوا تاکہ ہٹائیں ہم اُن سے بُرائی اور بے حیائی کو بیشک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہیں۔"

"بُرہانِ رب" (دلیل ومعجزہ) صاحب جلالین نے حضرت ابن عباسؓ سے اسکی تفسیر یہ نقل کی ہے کہ زُلیخا کے اس ہیجان خیز ارادے کے وقت اللہ کی قدرت سے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے والد محترم حضرت یعقوب علیہ السلام اچانک نظر آئے اور انھوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے سینے پر ہاتھ رکھا جس سے معاً قلب کے وساوس تک جاتے رہے۔" (جلالین)

عظیم کامیابی

پچھلی آیات میں یہ بیان آیا ہے کہ جس وقت عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو شریک گناہ کرنے کی کوشش میں مشغول تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام اس سے بچ رہے تھے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے پسندیدہ بندے کی اعانت کے لئے بطور معجزہ کوئی چیز سامنے کردی جس سے قلب کے سارے وساوس دور ہوگئے۔

اس "برہان رب" کا مشاہدہ کرتے ہی حضرت یوسف علیہ السلام وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور باہر نکلنے کے لئے دروازے کی طرف دوڑے، عزیز مصر کی بیوی اُن کو پکڑنے کے لئے پیچھے دوڑی اور حضرت یوسف علیہ السلام کا کُرتہ پکڑلیا

لیکن وہ اپنے عزم کے مطابق نہ رُکے تو کرتہ پیچھے سے پھٹ گیا اور وہ باہر نکل آئے۔ اسی کشمکش میں وہ بھی باہر نکل پڑی۔ جب دونوں باہر آئے تو دیکھا کہ عزیز مصر سامنے کھڑا ہے۔ زلیخا سہم گئی اور بات نبھانے کے لئے یوں الزام تراشا: اے میرے سرتاج! جو شخص آپکی بیوی کے ساتھ بُرا ارادہ کرے اُسکی سزا اِسکے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ اسکو قیدخانے میں ڈال دیا جائے یا اور کوئی سخت سزا دی جائے۔ عورت کا عشق ابھی خام تھا اس لئے صحیح حال ظاہر کر دینے پر قادر نہ ہوئی۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنی پیغمبرانہ شرافت اور عفو و درگزر کی بنا پر ممکن ہے اس کا یہ رازِ بد فاش نہ کرتے مگر جب اُسی نے پیش قدمی کر کے حضرت یوسف علیہ السلام پر ہی بدترین تہمت کا اشارہ کر دیا تو مجبور ہو کر اُنھوں نے حقیقت کا اظہار کر دیا:-

"اے عزیز مصر یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کے لئے پھسلا رہی تھی۔"

معاملہ بڑا پُرخطر اور نازک تھا۔ عزیز مصر کے لئے اِس کا فیصلہ کرنا بڑا دشوار تھا۔ کہ ان میں کسکو سچّا سمجھے؟ شہادت و ثبوت کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ مگر اللہ تعالےٰ کی دائمی سنت اپنے برگزیدہ بندوں کے بارے میں جاری رہی ہے کہ وہ جہاں اپنے نیک بندوں کو گناہ سے بچا لیتے ہیں ایسے ہی ان کو اِس دُنیا کی رسوائی سے بھی بچانے کا انتظام معجزانہ انداز سے فراہم کر دیتے ہیں۔ عموماً ایسے مواقع پر ایسے چھوٹے معصوم بچوں سے کام لیا گیا جو عادۃً شہادت دینا تو درکنار بولنا اُن کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ مگر بطور معجزہ اُن کو گویائی عطا کر دی جاتی ہے تاکہ اپنے مقبول بندوں کی برأت و طہارت کا انتظام ہو جائے۔ جیسے حضرت مریمؑ پر جب لوگوں نے تہمت لگائی تو صرف ایک دن کے بچے حضرت عیسٰیؑ کو اللہ تعالےٰ نے گویائی عطا فرما کر اُن کی زبان سے اپنی والدہ کی پاکی ظاہر فرما دی۔ (مریم آیت ۳۰)

"بنی اسرائیل کے ایک بزرگ جُریجؒ پر اسی طرح کی ایک تہمت ایک بڑی سازش کے ساتھ باندھی گئی تو نوزائیدہ بچے نے اُن کی برأت کے لئے شہادت دی۔" (بخاری)

"جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فرعون کو شبہ ہُوا جب کہ وہ

صندوق سے برآمد ہوئے تھے تو زوجۂ فرعون کی خادمہ کی شیر خوار بچی کو گویائی عطا ہوئی اُس نے حضرت موسیٰؑ کو بچپن میں فرعون سے بچا لیا۔

(بخاری شریف)

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے مطابق ایک شیر خوار بچے کو گویائی عطا کی اور وہ بھی نہایت حکیمانہ انداز کی، یہ چھوٹا بچہ اسی گھر کے گہوارے میں پڑا تھا یہ کس کو گمان ہو سکتا تھا کہ وہ زلیخا کی اس نازیبا حرکات کو دیکھ رہا ہے اور سمجھ رہا ہے اُس نے عزیز مصر کے اس تذبذب کو اس طرح دُور کر دیا، اچانک یوں گویا ہوا:۔

یُوسف کے کُرتے کو دیکھو اگر وہ آگے سے پھٹا ہے تب تو زُلیخا کا کہنا سچّا ہے اور یوسف جھوٹے ہیں، اور اگر قمیص پیچھے سے پھٹا ہے تو یوسف سچّے ہیں اور زلیخا جھوٹی (کیونکہ جب وہ پیچھے سے پھٹا ہے تو اس میں اسکے سوا کوئی دوسرا احتمال ہی نہیں کہ یوسف بھاگ رہے تھے اور زلیخا انکو روکنا چاہتی تھی اسی کشمکش میں کُرتہ پھٹ گیا)

جب بتلائی ہوئی علامت کے مطابق کُرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا مشاہدہ کیا گیا تو حضرت یوسف علیہ السّلام کی برارت ظاہر ہوگئی۔

(مسند احمد، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم)

عزیز مصر نے موقعہ کی نزاکت جان کر اپنی عزت و ناموس کی خاطر معاملہ کو درگزر کرتے ہوئے کہا یوسف علیہ السّلام سچّے تم ہی ہو، اس عورت کے معاملے کو درگزر کرو اور اس قصہ کو یہیں ختم کرو۔ پھر بیوی سے کہا یہ سب تیرا مکر وفریب ہے اور تم عورتوں کا مکر وفریب بہت ہی بڑا ہوتا ہے۔ اے زلیخا تو اپنی اس حرکتِ بد کے لئے استغفار کر اور معافی مانگ!

آزمائش میں حضرت یوسف علیہ السلام کی کامیابی کا تذکرہ قرآن حکیم میں اس طرح موجود ہے:۔

وَ اسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّ اَلْفَيَا

سَیِّدَهَا لَدَا الْبَابَ۔الخ (یوسف آیات ۲۵ تا ۳۵)

اور دونوں آگے پیچھے دروازے کی طرف دوڑے اور اُس عورت نے اُن کا کُرتہ (کھینچ کر) پھاڑ دیا اور دونوں نے (اتفاقاً) اُس عورت کے شوہر کو دروازہ کے پاس (کھڑا) پایا، عورت (شوہر کو دیکھ کر سٹ پٹائی اور بات بناکر) بولی کہ جو شخص تیری بیوی کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کرے اُس کی سزا بجز اسکے اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ جیل خانہ بھیجا جائے یا اور کوئی دردناک سزا ہو۔ یوسفؑ نے کہا (یہ بالکل جھوٹ ہے) یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کے لئے پُھسلاتی تھی اور (اُس موقع پر) اُس عورت کے خاندان میں سے ایک گواہ نے (جو کہ شیر خوار بچہ تھا) گواہی دی کہ اِن کا کُرتہ (دیکھو کہاں سے پھٹا ہے) اگر آگے سے پھٹا ہے تو عورت سچی اور یہ جھُوٹے ہیں اور اگر وہ کُرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو عورت جھوٹی اور یہ سچے ہیں۔ (غرض اس فیصلہ کے مطابق وہ کُرتہ دیکھا گیا تو پیچھے سے پھٹا ہوا نکلا) سو جب (عزیز نے) اُن کا کرتہ پیچھے سے پھٹا دیکھا (عورت سے) کہنے لگا یہ تم عورتوں کی چالاکی ہے بیشک تمہاری چالاکیاں بھی بہت بڑی ہوتی ہیں۔

(پھر یوسف کی طرف متوجہ ہوکر کہنے لگا) اے یوسفؑ اس بات کو جانے دو (یعنی اس کا چرچا نہ کرو) اور (عورت سے کہا) اے عورت تو اپنے قصور کی معافی مانگ بیشک سرتاسر تو ہی قصوروار ہے۔

حُسنِ یوسفی کا آشکارا

عزیز مصر نے اگرچہ رسوائی سے بچنے کے لئے اس قصہ کو یہیں ختم کر دیا مگر بات پوشیدہ نہ رہ سکی۔ شُدہ شُدہ شاہی خاندان کی عورتوں میں یہ چرچا ہونے لگا کہ عزیزِ مصر کی بیوی کسقدر بے حیا ہے کہ اپنے غلام پر فریفتہ ہوگئی۔ اتنے بڑے خاندان کی عورت غلام کے ساتھ تعلق پیدا کرنا چاہتی ہے۔

یہ طعن و تشنیع جب عام ہوگئے تو زلیخا پر یہ بات سخت گراں گزری اور چاہا کہ اس بدنامی کو دور کر دینا چاہیئے اور اسکے لئے شاہی خاندان کی عورتوں سے ایسا انتقام لینا چاہیئے کہ وہ بھی اس بدنامی میں شریک ہوجائیں۔

یہ سوچ کر اُس نے ایک دن شاہی خاندان کی عورتوں کو ایک پُرتکلف دعوت دے دی جب سب دسترخوان پر بیٹھ گئیں جو غالباً ہمہ قسم کے پھلوں سے پُر ہوگا سب کے ہاتھوں میں چھُریاں دے دی گئیں تاکہ پھل کاٹ کر کھائیں۔ عین اس موقعہ پر جب وہ پھل کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھیں عزیز کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السّلام کو حکم دیا کہ وہ دسترخوان پر آئیں۔ حضرت یوسف علیہ السّلام مالکہ کے تعمیلِ حکم میں باہر نکلے تو تمام عورتیں جمالِ یوسف کو دیکھ کر مبہوت رہ گئیں اور اس قدر بے خبر ہوگئیں کہ پھلوں کو کاٹنے کے بجائے خود اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور انھیں احساس بھی نہ ہوا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور بے ساختہ زبانوں پر یہ جملہ آیا کہ کون کہتا ہے کہ یہ انسان ہے ؟ خدا کی قسم یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر عزیز مصر کی بیوی نہایت خوش ہوگئی اور اپنی کامیابی اور طعن کرنے والیوں کی شکست پر فخر کرتے ہوئے کہنے لگی یہی تو وہ غلام ہے جس کے عشق و محبت کے بارے میں تم نے مجھ کو بدنام کر رکھا ہے۔

اب تمہارا خود کیا حال ہے ؟ بتاؤ میرا فریفتہ ہونا بیجا ہے یا بجا ؟ بیشک میں نے اس کا دل اپنے قابو میں لینا چاہا تھا مگر وہ بے قابو نہ ہوا۔ اب میں تم سب سے کہتی ہوں کہ اگر یہ میرا کہا نہ مانا تو یہ قید خانہ جائیگا یا ذلیل و رسوا ہوگا۔

قرآن حکیم نے اس دعوت کا تذکرہ اس طرح کیا ہے :-

قرآنی مضمون

وَ قَالَ نِسْوَةٌ فِی الْمَدِیْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۔ الخ

(یوسف آیات ۳۰ تا ۳۲)

اور (جب اس قصّہ کا چرچا ہوا تو) چند عورتوں نے جو شہر میں رہتی تھیں یہ بات کہی کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام سے اپنا (ناجائز) مطلب حاصل کرنے کے واسطے پھُسلاتی ہے (کیسی پست طبیعت ہے

کہ غلام پر گرتی ہے)اُس غلام کا عشق اُسکے دل میں جگہ کر گیا ہے ہم تو اُسکو صریح غلطی میں دیکھتے ہیں۔

سو جب اُس عورت نے اُن عورتوں کی بدگوئی (کی خبر) سُنی تو کسی کے ہاتھ اُن کو بُلا بھیجا (کہ تمہاری دعوت ہے) اور اُنکے واسطے مسند تکیے لگایا اور (جب وہ آئیں اور اُن کے روبرو مختلف کھانے اور میوے حاضر کئے) اور ہر ایک کو اُن میں سے ایک ایک چاقو (بھی) دیئے اور یوسفؑ سے کہا ذرا اِن کے سامنے تو آجاؤ سو عورتوں نے جو اُن کو دیکھا تو (اُن کے جمال سے) حیران رہ گئیں اور (اُسی حیرت میں) اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور کہنے لگیں حاشا للہ یہ شخص آدمی ہرگز نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔

وہ عورت بولی تو (دیکھ لو) وہ شخص یہی ہے جسکے بارے میں تم مجھکو بُرا بھلا کہتی تھیں اور واقعی میں نے اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی خواہش کی تھی مگر یہ پاک صاف رہا اور پھر اگر یہ آئندہ کو میرا کہنا نہ کرے گا (جیسا کہ اب تک نہیں کیا) تو بیشک جیل خانہ بھیج دیا جائے گا اور بےعزت بھی ہوگا۔ (یہ حالت دیکھ کر جب سب عورتوں نے بھی حضرت یوسف علیہ السّلام سے کہنا شروع کیا کہ تم کو اپنی محسنہ سے ایسی بے توجہی مناسب نہیں تھی جو یہ کہے تم کو ماننا چاہیئے) یوسف علیہ السّلام نے جو یہ باتیں سُنیں تو اللہ تعالےٰ سے دعا کی کہ اے میرے رب جس کام کی طرف یہ عورتیں مجھکو بلا رہی ہیں اس سے تو جیل خانہ جانا ہی مجھ کو زیادہ پسند ہے اور اگر آپ اے رب اِن کے داؤ پیچ کو مجھ سے دفع نہ کریں گے تو میں اُن کی (طلب) کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادانی کا کام کر بیٹھوں گا۔ سو اُن کی دُعا اُن کے رب نے قبول کی اور اُن عورتوں کے داؤ پیچ کو اُن سے دُور رکھا۔ بیشک وہ (دعاؤں کا) بڑا سُننے والا (اور اُن کے احوال کا) خوب جاننے والا ہے۔ (پھر یوسف

علیہ السلام کی پاک دامنی کی) مختلف نشانیاں دیکھنے کے بعد اُن لوگوں کو یہی مصلحت معلوم ہوئی کہ اُن کو ایک وقت (خاص) تک قید میں رکھیں۔

قیدخانے میں

جب یوسف علیہ السلام نے عورتوں کا متفقہ فیصلہ سُنا اور ایک نہیں ساری عورتیں ہاں میں ہاں ملا رہی ہیں تو اللہ کے حضور دستِ بدُعا ہوئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی دُعا بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوئی اور اللہ نے اُن عورتوں کے سب مکر و فریب دُور کر دیئے، لیکن حکمتِ الٰہی میں یہ ہی بہتر تھا کہ یوسف علیہ السلام جیل خانہ چلے جائیں، حضرت یوسف علیہ السلام کو عزیز مصر کے گھر میں رہ کر عصمت بچانا ایک مشکل کام تھا۔

الغرض حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ بھیجدیا گیا۔ اس طرح ایک بے خطا کو خطا کار اور معصوم کو مُجرم بنا دیا گیا تاکہ عزیز کی بیوی ذلت اور رسوائی سے محفوظ ہو جائے۔ تورات کی تصریح کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کے علمی و عملی جوہر قید خانے میں بھی چھُپ نہ سکے۔ قید خانے کا داروغہ ان کا معتقد ہو گیا۔ قرآن حکیم سے بھی اس بات کی تائید نکلتی ہے اس لئے کہ اُس زمانے کے قیدخانوں کے حالات کے پیشِ نظر حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس قیدیوں کا آنا جانا اور انکی عظمت و نیک نفسی کا اعتراف کرنا اسکو واضح کرتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاک اوصاف کی قید خانہ میں کافی شہرت تھی۔ حسن اتفاق سے یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو نوجوان بھی داخل قید خانہ ہوئے اِن میں سے ایک شاہی ساقی تھا اور دوسرا شاہی باورچی خانہ کا داروغہ۔

ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ یہ دونوں اس الزام میں گرفتار ہوئے کہ انھوں نے بادشاہ کے کھانے پینے میں زہر دینے کی کوشش کی تھی۔ مقدمہ زیر تحقیق تھا اس لئے دونوں کو جیل میں رکھا گیا۔ یوسف علیہ السلام اپنے پیغمبرانہ اخلاق کے سبب سب قیدیوں کی دلداری کرتے، جسکو غمگین دیکھا تسلّی دیتے، کوئی بیمار ہوتا تو عیادت کرتے، صبر کی تلقین کرتے، رہائی کی اُمید دلاتے اور رات کو عبادت میں مشغول رہتے۔ ان کے یہ حالات دیکھ کر جیل کے سب قیدی غیر معمولی متأثر تھے۔ یہ دو قیدی جو حضرت یوسف علیہ السلام

کے ساتھ جیل میں داخل ہوئے تھے ایک روز انھوں نے کہا کہ آپ ہمیں نیک معلوم ہوتے ہیں اس لئے ہم اپنا ایک خواب بیان کرتے ہیں تاکہ آپ اس کی تعبیر بتائیں۔ ایک نے یعنی شاہی ساقی نے کہا میں نے خواب دیکھا ہے کہ انگور سے شراب نکال رہا ہوں، اور دوسرے نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیوں کا ٹوکرا ہے اُس میں سے جانور نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔

براہِ کرم اُنکی تعبیر بتائیں آپ یقیناً نیک لوگوں میں سے ایک ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اُن سے نرمی اور محبت سے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے جو علم مجھے عطا فرمایا ہے ان میں علم تعبیر کے علاوہ یہ علم بھی شامل ہے کہ میں تمہارا مقررہ کھانا جو تمہارے لئے آتا ہے اسکے آنے سے پہلے ہی میں تمہیں بتلا دیتا ہوں کہ کس قسم کا کھانا اور کیسا اور کتنا اور کس وقت آئے گا اور وہ ٹھیک اُسی طرح نکلتا ہے: ذٰلِکُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ (یعنی یہ کوئی رَمَل یا جَفَر کا فن نہیں کوئی کہانت یا شعبدہ نہیں بلکہ) میرا رب مجھے بذریعہ وحی تعلیم کرتا ہے

مگر میں تم سے ایک اور بات کہتا ہوں ذرا اس پر بھی غور کرو میں نے اُن لوگوں کی ملت کو اختیار نہیں کیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بھی مُنکر ہیں، میں نے اپنے باپ دادا یعنی ابراہیم، اسحٰق، یعقوب کی ملّت کی پیروی اختیار کر لی ہے۔ ہم کسی کو اللہ کے ساتھ شریک نہیں ٹھہراتے، یہ اللہ کا فضل ہے جو اس نے ہم پر اور ایمان والوں پر کیا ہے لیکن اکثر لوگ اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے۔

اے دوستو! کیا تم نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ کئی ایک معبودوں کا ہونا بہتر ہے یا اللہ وحدہٗ لاشریک اور سب پر غالب ہے۔ تم اسکے علاوہ جس جس کی بھی عبادت کرتے ہو اُن کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ چند نام نہیں جنکو تمہارے باپ دادا نے گھڑ لیا ہے، اللہ نے اُن کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی ہے حکومت تو صرف اللہ ہی کے لئے ہے اُس نے یہ حکم دیا ہے کہ اُس کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے یہی سیدھا دین ہے مگر اکثر آدمی اس بات کو نہیں جانتے۔

اس دعوت و تبلیغ کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام اِن دونوں کے خواب کی تعبیر کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے۔

دوستو! جس نے یہ دیکھاہے کہ وہ انگور نچوڑ رہا ہے وہ آزاد ہو کر بادشاہ کے ساقی کی خدمت پھر انجام دے گا۔ اور جس نے روٹیوں والا خواب دیکھاہے اُسکو سولی دی جائیگی اور پرندے اُسکے سرکو نوچ نوچ کھائیں گے۔ جس کی تعبیر تم نے چاہی ہے وہ نافذ ہو چکی ہے اور فیصلہ یہی ہے۔"

چنانچہ ایسے ہی ہوا ابھی کچھ وقت گزرا نہ تھا کہ ایک آزاد ہو کر اپنی سابقہ خدمت پر بحال ہو گیا دوسرا مجرم ثابت ہو کر سولی پر چڑھا دیا گیا اور پرندوں نے اُسکی بوٹیاں اُڑا دیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام جب دونوں کی تعبیر خواب بیان کر دیئے تو ساقی سے یہ بھی کہا تھا کہ جب تو دربار میں جائے گا اپنے بادشاہ سے میرا ذکر کر دینا کہ ایک بے گناہ قید خانہ میں پڑا ہوا ہے۔

لیکن وہ شخص اس بات کو بھول گیا اور اُسکو یاد نہ رہا کہ اپنے ایک محسن کو قید خانے سے چھڑوانا باقی ہے۔ اگرچہ یہ بات قرین قیاس نہیں کہ اپنے ایسے محسن کو آدمی بھول جائے لیکن قرآن حکیم نے اسکی حقیقت یہ بتلائی کہ شیطان اُسپر مسلط ہو گیا اور اُسے یہ بات یاد کرنے کا موقعہ ہی نہ دیا اور اس پر ایک عرصہ ایسے ہی گزر گیا۔ اس طرح چند سال مزید قید خانے میں حضرت یوسف علیہ السلام کو رہنا پڑا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا قید خانے میں جانا، وہاں قیدیوں میں تبلیغ کرنا، خواب کی تعبیر دینا، آیاتِ ذیل میں اس طرح موجود ہے:۔

قرآنی مضمون

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ . الخ-

(یوسف آیت ۳۶ تا ۴۲)

اُور یوسف کے ساتھ اور بھی دو نوجوان جیل خانے میں

داخل ہوئے، اُن میں سے ایک نے یوسف علیہ السلام سے کہا میں اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ شراب (بنانے کے لئے انگور کا رس) نچوڑ رہا ہوں۔ اور دوسرے نے کہا کہ میں اپنے آپ کو اس طرح دیکھ رہا ہوں کہ اپنے سر پر روٹیوں کا ٹوکرا لئے ہوئے ہوں (اور) اُس میں سے پرندے (نوچ نوچ) کر کھا رہے ہیں، ہم کو اس خواب کی تعبیر بتلائیے آپ ہم کو نیک آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

(حضرت) یوسف (علیہ السلام) نے (چاہا کہ جب یہ میرے معتقد ہیں تو اِن کو اوّلاً ایمان کی دعوت دینا چاہیئے) فرمایا کہ (دیکھو) جو کھانا تمہارے پاس آتا ہے جو کہ تم کو کھانے کے لئے (جیل خانے) میں ملتا ہے۔ میں اُس کے آنے سے پہلے اسکی حقیقت تم کو بتلا دیا کرتا ہوں (کہ فلاں چیز آئے گی اور ایسی ہوگی) اور یہ بتلا دینا اُس علم کی بدولت ہے جو مجھکو میرے رب نے تعلیم فرمایا ہے (یعنی بذریعہ وحی معلوم ہو جاتا ہے) میں نے تو اُن لوگوں کا مذہب (پہلے ہی سے) چھوڑ رکھا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور جو آخرت کے بھی منکر ہیں۔ اور میں نے اپنے ان (بزرگوار) باپ داداؤں کا مذہب اختیار کر رکھا ہے ابراہیمؑ کا اور اسحٰقؑ کا اور یعقوبؑ کا۔ ہم کو کسی طرح زیبا نہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی شئی کو شریک عبادت قرار دیں اور یہ (عقیدۂ توحید) ہمپر اور لوگوں پر بھی خدا تعالےٰ کا ایک فضل ہے لیکن اکثر لوگ (اس نعمت کا) شکر ادا نہیں کرتے۔

اے قید خانہ کے رفیقو (ذرا سوچ کر بتاؤ کہ عبادت کے واسطے) متفرق معبود اچھے ہیں یا ایک معبود برحق جو سب سے زبردست ہے؟ تم لوگ تو اللہ کو چھوڑ کر صرف چند بے حقیقت ناموں کی عبادت کرتے ہو جنکو تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے (آپ ہی آپ) ٹھیرالیا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے تو اِن (کے معبود ہونے) کی کوئی دلیل بھیجی نہیں (اور) حکم (دینے کا اختیار صرف) اللہ ہی کو ہے

(اور) اُس نے حکم دیا ہے کہ بجز اُس کے اور کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا راستہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اے قید خانے کے رفیقو! تم میں سے ایک تو (جُرم سے بری ہوکر) اپنے آقا کو (بدستور) شراب پلایا کرے گا اور دوسرا (مجرم قرار پاکر) سولی دیا جائے گا اور اُس کے سر کو پرندے (نوچ نوچ) کھائینگے جس بارے میں تم پوچھتے تھے وہ اسی طرح مقدّر ہوچکا۔ اور (جب وہ جیل خانے سے جانے لگے تو) جس شخص پر رہائی کا گمان تھا اُس سے یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ اپنے آقا کے سامنے میرا بھی تذکرہ کرنا (کہ ایک شخص بے قصور قید میں ہے اُس نے وعدہ کرلیا) پھر اسکو اپنے آقا سے (یوسف علیہ السلام) کا تذکرہ کرنا شیطان نے بھلادیا تو (اس وجہ سے) قید خانے میں اور بھی چند سال اُن کا رہنا ہوا۔"

خوابِ سُلطانی

حضرت یوسف علیہ السلام اسی طرح قید خانے میں مقیم رہے بعض مفسرین نے اس مدت کو سات سال بیان کیا ہے۔ اسی درمیان میں بادشاہِ وقت جسکا نام ریّان اور لقب فرعون تھا ایک خواب دیکھا اور خواب کی نوعیت سے سخت پریشان ہوا دربار کے اہل علم اور کاہنوں کو جمع کر کے تعبیر معلوم کرنی چاہی لیکن وہ خواب کسی کی بھی سمجھ میں نہ آیا سب نے یہ جواب دیا کہ یہ پراگندہ قسم کا خواب ہے جسکی کوئی حقیقت نہیں ہے اگر کوئی صحیح خواب ہوتا تو ہم اسکی تعبیر بیان کردیتے۔ خواب یہ تھا:-

"سات عدد موٹی گائیں ہیں اور سات دبلی گائیں، یہ دُبلی گائیں موٹی گائیوں کو نگل گئیں۔ اسی طرح سات سرسبز و شاداب بالیں ہیں اور سات خشک (خوشہ گندم) اِن خشک بالیوں نے سرسبز بالیوں کو کھالیا۔"

بادشاہ دربار کے اِن کاہنوں کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ اسی اثناء رہاشدہ ساقی کو یوسف علیہ السلام کی بات یاد آئی اور اُس نے آگے بڑھکر کہا اے بادشاہ اگر مجھے کچھ مہلت دیں تو میں اسکی تعبیر لاسکتا ہوں۔

بادشاہ نے اجازت دے دی وہ اُسی وقت قید خانہ پہنچا اور حضرت یوسف علیہ السّلام کو بادشاہ کا خواب سُنایا اور کہا کہ آپ اسکی تعبیر بیان فرمائیے کیوں کہ آپ سچائی کے پیکر ہیں آپ ہی اسکو حل کر سکتے ہیں اور کیا عجب ہے کہ جن لوگوں نے مجھے بھیجا ہے جب میں صحیح تعبیر لے کر اُن کے پاس واپس جاؤں تو وہ لوگ آپ کی حقیقی قدر و منزلت جان لیں گے۔

حضرت یوسف علیہ السّلام کے صبر و تحمّل کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساقی کو نہ ملامت کی اور نہ برسوں بھولے رہنے پر تعجب کیا اور نہ تعبیر علم میں بخل سے کام لیا، نہ یہ سوچا کہ جن ظالموں نے مجھے برسوں بے قصور زندان میں ڈالے رکھا ہے وہ اگر تباہ ہوجائیں اور خواب کا حل نہ پاکر برباد ہو جائیں تو اچھا ہے ان کی یہی سزا ہونی چاہیئے، ایسا کچھ بھی نہیں کیا بلکہ اُسی خواب کی تعبیر دی اور اپنی جانب سے اس سلسلہ میں صحیح تدبیر بھی بتلادی کہ خواب کے مضر اثرات سے کیسے بچا جا سکتا ہے۔

"فرمایا اس خواب کی تعبیر اور اس کی بنار پر جو کچھ تم کو کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ تم سات برس تک لگاتار کھیتی کرتے رہو گے اور یہ تمہاری خوشحالی کے سال ہیں۔ اور جب کھیتی کے کٹنے کا وقت آئے تو جس قدر مقدار تمہارے سال بھر کھانے کے لئے ضروری ہے اسکو الگ کر لو اور باقی غلّہ کو اُن کی بالیوں ہی میں رہنے دو تاکہ محفوظ رہے گلے سڑے نہیں اسکے بعد سات برس مسلسل قحط سالی کے ہوں گے وہ تمہارا جمع کیا ہوا تمام ذخیرہ ختم ہوجائے گا۔ اسکے بعد پھر ایک سال ایسا آئے گا کہ خوب پانی برسیگا کھیتیاں ہری بھری ہوجائیں گی اور لوگ پھلوں اور دانوں سے عرق اور تیل کثرت سے نکالیں گے۔ یعنی موٹی گائیں اور سرسبز بالیں خوشحالی کی علامت ہیں اور دُبلی گائیں اور خشک بالیں قحط سالی کی علامت ہیں جو خوشحالی کی پیداوار کو کھا جائیں گے"۔

بادشاہ کے خواب میں تو بظاہر اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ سات سال اچھی پیداوار کے ہوں گے۔ پھر سات سال قحط کے، مگر حضرت یوسف علیہ السّلام نے اس پر ایک اضافہ یہ بھی بیان کر دیا کہ:-

قحط سالی کے بعد پھر ایک سال خوب بارش اور پیداوار کا ہوگا حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ یہ اضافہ بطور وحی بیان کیا تاکہ اُن لوگوں کو مزید اطمینان ہو اور تعبیر کا منجانب اللہ ہونا معلوم ہو جائے۔

دوسرا حکیمانہ مشورہ یہ بھی دیا کہ غلّے کو خوشوں ہی میں رہنے دیا جائے تاکہ قحط کے سالوں میں کام آسکے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غلّہ جب تک خوشوں میں رہتا ہے اسکو کیڑا وغیرہ متاثر نہیں کرتا۔

الغرض جب یہ ساقی تعبیرِ خواب لیکر بادشاہ کے پاس آیا اور اسکو خبر دی، بادشاہ اور اہل دربار اس تعبیر سے غیر معمولی متاثر ہوئے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے علم فہم کا اعتراف کیا۔

تعبیرِ خواب کا تذکرہ قرآن حکیم کی آیات ذیل میں اس طرح موجود ہے:۔

قرآنی مضمون

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّيٓ أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَٰتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعَ سُنۢبُلَٰتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَٰتٍ الخ

بادشاہ نے کہا میں نے خواب دیکھا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں جنکو سات دُبلی گائیں کھا رہی ہیں، اور اناج کی سات بالیں ہری ہیں اور دوسری طرف سات سوکھی، اے اہل دربار مجھے اس خواب کی تعبیر بتاؤ اگر تم خواب کی تعبیر بیان کر سکتے ہو۔

اُنھوں نے کہا یہ تو پریشان خواب ہیں اور ہم اس طرح کے خوابوں کا مطلب نہیں جانتے۔

اُن دو قیدیوں میں سے جو نجات پایا تھا اور اُسے ایک مدّتِ دراز کے بعد اب بات یاد آئی کہا میں آپ حضرات کو اسکی تعبیر بتاتا ہوں مجھے ذرا (قید خانے میں یوسفؑ کے پاس) بھیج دیں۔

(اُس نے جاکر کہا) یوسفؑ اے سراپا صدق مجھے اس خواب کا مطلب بتائیے کہ سات موٹی گائیں ہیں جنکو سات دُبلی گائیں

کھا رہی ہیں، اور سات ہری بالیں ہیں اور سات سوکھی، تاکہ میں اُن کے پاس جاؤں (اور بیان کروں) تاکہ (اس کی تعبیر اور اس سے آپ کا حال اُن کو بھی معلوم ہو جائے۔

یوسف (علیہ السلام) نے کہا سات برس تک لگا تار تم لوگ کھیتی باڑی کرتے رہو گے، اس دوران جو فصلیں تم کاٹو اُن میں سے بس تھوڑا سا حصہ جو تمہاری خوراک کے کام آئے نکال لو اور باقی کو اُس کی بالیوں ہی میں رہنے دو۔

پھر اس کے بعد سات سال بہت سخت (قحط) کے آئیں گے جو کہ اُس (تمام) ذخیرے کو کھا جائیں گے۔ جسکو تم نے اِن برسوں کے واسطے جمع کر کے رکھا ہوگا۔ البتہ تھوڑا سا جو (بیج کے واسطے) رکھ چھوڑو گے۔ پھر ان (سات برس) کے بعد ایک برس ایسا آئے گا جس میں لوگوں کیلئے خوب بارش ہوگی اور اُس میں رس نچوڑیں گے۔ (یعنی کثرت سے پیداوار ہوگی)"

دربارِ مصر میں

ساقی نے حضرت یوسف علیہ السلام کی ساری گفتگو بادشاہ کو سنائی اور ساتھ ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام کے اخلاق و عادات جسکا اُس نے قید خانے میں مشاہدہ کیا تھا بیان کیا، بادشاہ اس عجیب و نادر تعبیر کو سُنکر متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس بات کا خواہشمند ہوا کہ ایسے شخص کو دیکھنا چاہیئے۔ چنانچہ اپنے ایک قاصد کو حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاں بھیجا اور اپنے شوقِ ملاقات کا اظہار کیا، حضرت یوسف علیہ السلام نے باہر نکلنے سے معذرت چاہی اور فرمایا کہ اس طرح تو میں قید خانے سے باہر آنہیں سکتا جب تک کہ اُن عورتوں کا معاملہ واضح نہ ہو جائے جنھوں نے بے خودی میں اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے آخر ایسا کیوں ہوا؟ میرا پروردگار تو اِن کے مکر و فریب کو خوب جانتا ہی ہے۔

اللہ تعالےٰ اپنے انبیاء کو جس طرح دین کامل عطا فرماتے ہیں ایسے ہی عقلِ کامل اور معاملہ فہمی کی بھی پوری پوری صلاحیتیں مہیا فرماتے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام نے

ایسے اہم موقعہ پر جب کہ خود بادشاہ دعوت رہائی دے رہا ہو قابل توجہ نہ سمجھا۔

اس وقت دانشمندی کا تقاضہ یہی تھا کہ رہائی سے پہلے جس عیب کی تہمت لگائی گئی تھی اور جس وجہ سے جیل میں برسوں ڈالا گیا تھا اُسکی حقیقت بادشاہ اور عام لوگوں پر پوری طرح واضح ہوجائے اور عصمتِ یوسفی پر کوئی شُبہ باقی نہ رہے۔

علاوہ ازیں منصبِ نبوّت کی ادائیگی کے لئے جس اعتماد و اعتقاد کی عوام کو ضرورت ہے وہ اس تہمت کے ساتھ مفید ثابت نہیں ہوتی اور دعوت و تبلیغ کا کام جو آپ کا نصب العین تھا کامل طور پر جاری و ساری نہ ہوسکتا تھا

حضرت یوسف علیہ السّلام نے قاصد کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ بادشاہ سے کہو کہ وہ پہلے اُس تہمت کی حقیقت کو واضح کرے اُس کے بعد میری رہائی کا اعلان کرے۔

قرآن حکیم نے قید خانے سے نہ نکلنے کی یہی وجہ بیان کی ہے، حضرت یوسف علیہ السّلام نے فرمایا میں نے قید خانے سے نکلنے میں یہ تاخیر اس لئے کی ہے کہ عزیزِ مصر کو یقین ہوجائے کہ میں نے اُسکی غیر موجودگی میں اُسکے حق میں کوئی خیانت نہیں کی۔

(یوسف آیت ۵۲)

اور دوسری حکمت یہ بھی ارشاد فرمائی گئی کہ اس تحقیقات سے لوگوں کو معلوم ہوجائے گا کہ اللہ تعالےٰ خیانت کرنے والوں کے مکر و فریب کو چلنے نہیں دیتا۔

الغرض بادشاہ نے جب یہ سُنا تو اُن عورتوں کو طلب کیا اور اُنھیں پابند کیا کہ حقیقی واقعات بیان کر دیں تاکہ معاملہ کی اصل صورت سامنے آئے۔ صورتِ حال کچھ ایسی ہوچکی تھی کہ عورتوں کو حقیقی واقعات بیان کئے بغیر چارہ نہ رہا، سب نے یک زبان ہوکر کہا :-

"خُدا کی پناہ! ہم نے یوسفؑ میں کوئی بُرائی نہیں پائی"

عزیز کی بیوی نے جب یہ منظر دیکھا کہ شہر کی ساری معزز خواتین یک زبان ہیں تو اسی میں اپنی عافیت سمجھی کہ جُرم کا اقرار کر لیا جائے۔ آخر وہ بھی بول پڑی کہ اب تو حق بات ظاہر ہو ہی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے ہی اُن سے اپنے مطلب کی خواہش کی تھی اور بیشک سچّے تو وہی ہیں۔

بادشاہ اور اہل دربار پر جب یہ حقیقت واضح ہوئی تو سب نے حضرت یوسفؑ

سے ملاقات کرنے اور انھیں باعزت دربار میں تشریف لانے کے لئے آدمی بھیجے۔ اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام بازار مصر سے دربار مصر پہنچے۔

اس شاہی اعزاز و اکرام کا شہرہ ملک مصر میں جسقدر بھی ہوا ہوگا اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ لوگ حضرت یوسف علیہ السلام کے اخلاق و کردار کے بارے میں اس حد سے آگے ہو رہے تھے جو انسانی اخلاق و کردار کی آخری حد ہوا کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو انسانی فطرت کا اظہار کرنا پڑا اور یہ کہ کوئی انسان اللہ کے فضل و کرم اور تائید کے بغیر فلاح نہیں پاسکتا۔ قید خانے کی رہائی سے پہلے یہ اعلان فرمارہے ہیں:-

"لوگو! میں اپنے نفس کو بالذات بری اور پاک نہیں بتلاتا کیونکہ نفس تو ہر ایک کا بُری ہی بات بتلاتا ہے، بجز اُس نفس کے جس پر میرا رب رحم کرے (یعنی میری یہ پاکدامنی صرف خدائے کریم کا فضل و کرم ہے۔")

بادشاہ اور اُمراء نے دربار میں حضرت یوسف علیہ السلام کا شاہی استقبال کیا اور انکو اپنا مقرّب خاص قرار دیا اور اعزاز و خطاب سے موسوم کیا۔

قرآن حکیم کی آیات ذیل انہی تفصیلات پر مشتمل ہیں:-

قرآنی مضمون

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ﴿٥٠﴾

(یوسف آیات ۵۰ تا ۵۷)

(غرض وہ شخص تعبیر لیکر دربار میں پہونچا) اور (جاکر بیان کیا) بادشاہ نے (جو سُنا تو متاثر ہوا) اور حکم دیا کہ اُن کو میرے پاس لاؤ پھر جب اُن کے پاس قاصد پہنچا تو آپ نے فرمایا تو اپنی سرکار کے پاس لوٹ جا پھر اُس سے دریافت کر کہ اُن عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے میرا رب اُن عورتوں کے فریب کو خوب جانتا ہے۔

(چنانچہ بادشاہ نے اُن عورتوں کو جمع کیا اور) کہا کہ تمہارا کیا واقعہ ہے جب تم نے یوسف سے اپنے مطلب کی خواہش کی ؟ عورتوں نے جواب دیا کہ حاشا للہ ہم کو اُن میں ذرہ برابر بھی تو بُرائی کی بات نہیں معلوم ہوئی (وہ بالکل پاک ہیں) عزیز کی بیوی (جو کہ حاضر تھی) کہنے لگی کہ اب تو حق بات (سب پر) ظاہر ہی ہوگئی (اب چُھپانا بیکار بات ہے سچ یہی ہے کہ) میں نے ہی اُن سے اپنے مطلب کی خواہش کی تھی (نہ کہ اُنھوں نے) اور بیشک وہی سچے ہیں۔ (اُس وقت) یوسفؑ نے فرمایا کہ یہ تمام اہتمام (جو میں نے کیا) محض اس وجہ سے تاکہ عزیز کو معلوم ہوجائے یقین کے ساتھ کہ میں نے اسکی عدم موجودگی میں اُسکی آبرو میں دست درازی نہیں کی اور یہ (بھی معلوم ہوجائے) کہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا۔ اور (باقی) میں اپنے نفس کو (بالذات) بری (اور پاک) نہیں بتلاتا (کیونکہ) نفس تو (ہرایک کا) بُری ہی بات بتلاتا ہے۔ بجز اُس (نفس) کے جس پر میرا رب رحم کرے۔ بیشک میرا رب بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے۔

اور بادشاہ نے کہا ان کو میرے پاس لاؤ میں اُن کو خاص اپنے کام کے لئے رکھوں گا۔ پس جب بادشاہ نے اُن سے باتیں کیں (اور باتوں سے اور زیادہ فضل و کمال ظاہر ہوا) تو بادشاہ نے کہا کہ ہمارے نزدیک آج سے تم بڑے معزز اور امانت دار ہو۔

یوسف علیہ السلام نے کہا اے بادشاہ مُلکی خزانوں پر مجھ کو مامور کردیجئے میں اُن کی حفاظت (بھی) رکھوں گا اور (حساب کتاب کے طریقہ سے بھی) خوب واقف ہوں۔

(پھر بعد میں یہ ہی بادشاہ ہوگئے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے) اور ہم نے ایسے (عجیب) طور پر یوسف علیہ السلام کو ملک (مصر) میں بااختیار بنادیا کہ اُس میں جہاں چاہیں رہیں سہیں ہم جس پر چاہیں اپنی عنایت متوجہ کردیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے

اور آخرت کا اجر تو کہیں زیادہ بڑھ کر ہے ایمان اور تقویٰ والوں کیلئے۔

دربارِ یوسفی اور بھائیوں کی آمد

اللہ تعالےٰ کے عطا و کرم کا یہ کیسا عجیب و غریب واقعہ ہے کل تک جو کنعان میں "گلہ بانی" کر رہا تھا وہ آج وقت کی سب سے بڑی متمدن قوم کا مختار و مالک بنکر "جہاں بانی" کر رہا ہے۔ بادشاہِ وقت نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی تمام مملکت کا امین اور کفیل بنا دیا اور شاہی خزانوں کی کنجیاں اُن کے حوالہ کر کے اپنا مختار عام قرار دے لیا، حضرت یوسف علیہ السلام نے سلطنت مصر کے مختار عام ہونے کے بعد خوابِ سلطانی سے متعلق وہ تمام تدابیر شروع کر دیں جو چودہ سال کے اندر مفید کار ہو سکتی تھیں تا کہ رعایا قحط سالی کے ایام میں بھوک اور پریشان حالی سے محفوظ رہ سکے، انہی ایام میں عزیزِ مصر کا انتقال ہو گیا اور زلیخا کا نکاح حضرت یوسف علیہ السلام سے انجام پایا۔ (درمنثور)

غرض جب قحط سالی کا زمانہ شروع ہوا تو یہ قحط صرف ملک مصر ہی میں نہ تھا بلکہ دور دراز علاقوں تک پھیلا ہوا تھا ارضِ کنعان جو فلسطین کا ایک حصہ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا وطن ہے (اور آج بھی یہ ارضِ کنعان خلیل نامی ایک پُر رونق شہر کی صورت میں موجود ہے جہاں حضرات ابراہیم و اسحٰق و یعقوب اور یوسف علیہم السلام کے مزارات معروف ہیں۔) یہ خطہ بھی قحط کی زد سے نہ بچا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے خاندان میں بے چینی پیدا ہوئی ساتھ ساتھ مصر کی یہ شہرت عام ہو گئی تھی کہ وہاں غلّہ قیمتاً مل جاتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاحبزادوں سے کہا کہ مصر میں بادشاہ نے اعلان کیا ہے کہ اس کے پاس بڑی مقدار میں غلّہ موجود ہے تم سب جاؤ اور غلّہ خرید کر لاؤ اور چونکہ یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ایک آدمی کو ایک اونٹ کے بار سے زیادہ غلّہ نہیں دیا جاتا اس لئے سب صاحبزادوں کو روانہ کرنے کی تجویز ہوئی مگر سب سے چھوٹے بیٹے بنیامین کو جو حضرت یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی تھے روک لیا گیا کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام

کے گُم ہوجانے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کو ان سے زیادہ محبت ہوگئی تھی اور وہ کسی وقت بھی ان کو اپنے سے جدا نہیں ہونے دیتے تھے۔

دس بھائیوں کا یہ قافلہ کنعان سے مصر روانہ ہوا جب دربار میں پہنچے تو حضرت یوسف علیہ السلام شاہی لباس میں شاہانہ تخت و تاج کے مالک ہونے کی حیثیت سے سامنے آئے۔ معلوم ہوا کہ کنعان کا قافلہ ہے۔ سرسری گفتگو میں پہچان لیا کہ یہ سب بھائی ہیں لیکن بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو نہ پہچانا کیونکہ ان بھائیوں نے اپنے بھائی کو سات سال کی عمر میں فروخت کر دیا تھا جسکو اس وقت حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق چالیس سال ہو چکے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے پہچان لینے کے تعلق سے ابن کثیرؒ میں مزید یہ وضاحت درج ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے مزید اطمینان کے لئے چند ایسے سوالات بھی کئے جو مُشتبہ انسانوں کے تعلق سے کئے جاتے ہیں۔ ایک سوال یہ بھی تھا کہ آپ لوگوں کی زبان عبرانی ہے یہاں کیسے پہونچے؟ اُنھوں نے کہا بادشاہ ہمارے ملک میں قحط واقع ہے اور ہم نے آپ کی تعریف سُنی اس لئے غلّہ لینے آئے ہیں ہم اگرچہ غیر ملکی ہیں لیکن کسی دشمن کے جاسوس نہیں ہم لوگ کنعان کے رہنے والے ہیں۔ ہمارے باپ اللہ کے رسولوں میں سے ایک رسول ہیں جنکا نام یعقوب بن اسحٰق علیہم السلام ہے۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کے بارے میں دریافت کیا کہ تمہارے والد کی اور بھی کوئی اولاد ہے؟ جواب دیا کہ ہم بارہ ۱۲ بھائی تھے جن میں سے ایک چھوٹے بھائی کو بچپن میں بھیڑیے نے کھا لیا تھا اور ہمارے والد کو سب سے زیادہ اُسی سے محبت تھی اسکے بعد اُسکے چھوٹے بھائی کے ساتھ زیادہ محبت کرنے لگے اور اسی لئے اس وقت بھی اس کو سفر میں ہمارے ساتھ نہیں بھیجا ہمیشہ اسکو اپنے پاس ہی رکھتے ہیں۔

یہ تفصیلات سُنکر حضرت یوسف علیہ السلام نے حکم دیا کہ ان کو شاہی مہمانخانے میں ٹھیرایا جائے اور قاعدہ کے مطابق غلّہ دے دیا جائے۔

غلّہ کی تقسیم میں یہ ضابطہ قائم کیا تھا کہ ہر شخص اپنا غلّہ خود حاصل کرے۔ امام قرطبیؒ نے اس کی مقدار ایک وَسَق یعنی ساٹھ صاع لکھی ہے جو ہمارے موجودہ وزن کے لحاظ سے ۲۱۰ دو سو دس سیر کے قریب ہوتی ہے۔

جب بھائیوں نے غلّہ لے لیا اور قیمت ادا کردی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے انھیں جانے کی اجازت دے دی اور ساتھ ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ جب دوبارہ ضرورت پڑے تو پھر آجانا اور اپنے سوتیلے بھائی کو بھی ضرور لانا تاکہ اُسکا حصّہ بھی دیدیا جائے۔ تم لوگوں نے دیکھ لیا کہ میں ہر ایک کو پورا پورا غلّہ دیا کرتا ہوں اور اکرام و مہمانی میں بھی کوئی کمی نہیں کرتا۔ سب بھائیوں نے شکریہ ادا کرکے واپس ہونے کا ارادہ کیا، اُدھر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے غلّے کے کارندوں کو خُفیہ حکم دے دیا تھا کہ ان کے غلّے کے اندر اُنکی ادا کردہ قیمت چُھپاکر رکھدی جائے اسطرح کہ اُنھیں خبر تک نہ ہو تاکہ جب یہ اپنے گھر پہنچ کر سامان کھولیں گے تو اپنی نقدی واپس ملنے پر دوبارہ جلد آنے کا ارادہ کریں گے۔ ابن کثیرؒ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے اس تدبیر کی کئی ایک مصلحتیں لکھی ہیں۔ ممکن ہے بھائیوں سے کھانے کی قیمت لینا پسند نہ کیا ہو اور اپنے پاس سے قیمت ادا کردی ہو۔ یا یہ خیال آیا ہو کہ ممکن ہے ان کے پاس مزید نقدی یا زیور نہ ہو جسکی وجہ سے دوبارہ نہ آسکیں۔

ایک تیسری وجہ اور بھی لکھی ہے جو نہایت لطیف ہے وہ یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ جب اُن کی قیمت اُن کو واپس پہنچ جائیگی اور والد ماجد کو اسکا علم ہوگا تو وہ اللہ کے رسول ہیں اس واپس شدہ رقم کو مصری خزانے کی امانت سمجھ کر ضرور واپس بھیج دیں گے۔ اس طرح بھائیوں کا دوبارہ آنا یقینی ہوجائے گا۔ واللہ اعلم۔

چنانچہ ایسے ہی ہوا جب اِن لوگوں نے اپنا سامان کھولا تو اُس میں اُن کی اداشدہ رقم مل گئی کہنے لگے اباجان! مصری کارندوں کی غلطی سے ہماری نقدی ہمارے سامانِ غلّہ میں واپس آگئی ہے اسکو واپس کردینا چاہیئے۔ ویسے بھی اُس بادشاہ نے ہمارا اکرام واحترام کیا ہے اور ہمیں ہر طرح کی راحت پہنچائی ہے۔ ہم اپنے چھوٹے بھائی بنیامین کو بھی بحفاظت اپنے ساتھ لے جائیں گے اور اُسکا حصّہ بھی لیتے آئیں گے۔

بیٹوں کے اصرار پر اور غلّہ کی قیمت واپس آجانے پر حضرت یعقوب علیہ السّلام نے یہی مناسب سمجھا کہ بچّوں کو دوبارہ بھیجنا چاہیئے۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السّلام کی گمشدگی کا واقعہ بھی یاد تھا بیٹوں سے فرمایا کیا میں تم پر ایسا ہی اعتماد کروں جیسا کہ اس سے پہلے اسکے بھائی یوسفؑ کے بارے میں کیا تھا؟

مطلب یہ تھا کہ تمہاری بات کا کیا اعتبار؟ تم پر اعتماد کر کے ایک دفعہ اپنے عزیز بیٹے کو کھو چکا ہوں تم نے اُس وقت بھی یہی کہا تھا کہ ہم اتنے ہوتے ہوئے بھی (یوسف) کی حفاظت نہ کرسکیں گے۔

غور کر کے فرمایا اچھا اب میں پھر اللہ پر ہی بھروسہ کرتا ہوں اور وہی بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ میری ضعیفی پر دوہرا صدمہ نہ ڈالے گا۔ اس طرح اپنے چھوٹے بیٹے بنیامین کو ساتھ کرنے پر راضی ہو گئے اور بیٹوں سے عہد و پیمان لیا کہ بنیامین کو اپنے ساتھ رکھو گے اور اُسکو واپس لے آؤ گے۔

جب بیٹے چلنے لگے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے شہر مصر میں داخل ہونے کے لئے ایک خاص وصیت کی کہ اب تم گیارہ بھائی وہاں جارہے ہو تو شہر کے ایک ہی دروازے سے سب داخل نہ ہونا بلکہ شہر پناہ کے قریب پہنچ کر متفرق ہو جانا اور پھر مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ وصیت کیوں فرمائی؟ اس کا کیا مقصد تھا؟ قرآن حکیم اسکی وضاحت سے ساکت ہے البتہ اسقدر تذکرہ ضرور ملتا ہے کہ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی احتیاطی تدبیر تھی جو اللہ کی مشیت کے آگے کچھ بھی کام نہ آسکی۔ بس حضرت علیہ السلام کے دل میں ایک کھٹک سی تھی جسکو دور کرنے کے لئے انھوں نے اپنی سی کوشش کرلی۔ قرآن حکیم نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو وَاِنَّہٗ لَذُوْعِلْمٍ

(اور بیشک وہ ہماری دی ہوئی تعلیم سے صاحب علم تھا)

کے عنوان سے تعارف کروایا ہے۔

یعنی بیٹوں کی حفاظت کے لئے ایک طرف تو دُنیاوی تدبیر اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ دوسری طرف اس بات کا بھی اظہار فرمایا کہ کوئی انسانی تدبیر اللہ کی مشیت کو نافذ ہونے سے روک نہیں سکتی اور اصل حفاظت اللہ کی حفاظت ہے۔ بھروسہ اپنی تدبیروں پر نہیں بلکہ اللہ کے فضل وکرم پر ہونا چاہیئے۔ تدبیر اور توکل کا یہ توازن انبیاء کرام کی سیرت سے معلوم ہوسکتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو سفر سے پہلے اسی تعلیم کی تلقین فرمائی تھی۔

بعض دیگر مفسرین نے مختلف دروازوں سے داخل ہونے کی ایک حکمت یہ لکھی ہے کہ یہ سب بیٹے صحت مند، صاحب جمال، صاحب وجاہت تھے۔ ایسا نہ ہو کہ جب لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ سب ایک باپ کی اولاد اور بھائی بھائی ہیں تو کسی بد نظر کی نظر لگ جائے جس سے اِن کو کوئی تکلیف پہونچے، یا اجتماعی طور سے داخل ہونے پر کچھ لوگ حسد کرنے لگیں اور تکلیف پہنچائیں۔ واللہ اعلم۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اِنکو یہ وصیت پہلے سفر میں نہیں کی اس دوسرے سفر کے موقع پر فرمائی اسکی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ پہلی مرتبہ تو یہ لوگ مصر میں مسافرانہ اور شکستہ حالت میں داخل ہوئے تھے نہ کوئی اُنھیں جانتا تھا اور نہ کسی کے توجہ دینے کا خطرہ تھا، مگر پہلے سفر میں جب ان کا غیر معمولی اکرام و اعزاز ہوا جس سے ارکان دولت اور شہر کے لوگوں تک میں تعارف ہو گیا تو اب یہ خطرہ قوی ہو گیا کہ کسی کی نظر لگ جائے یا کچھ لوگ حسد کرنے لگیں۔ واللہ اعلم۔

دربارِ یوسفی میں بھائیوں کی آمد، اور غلّے کا حاصل کرنا اور بادشاہ سے ہمکلامی، اور غلّے کے لئے دوبارہ سفر کرنا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا بیٹوں سے عہد و پیمان لینا، قرآن حکیم کی آیات ذیل میں واضح طور پر موجود ہے:۔

قرآنی مضمون | وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ۔ الخ (یوسف آیات ۵۸ تا ۶۸)

اور یوسفؑ کے بھائی (مصر) آئے پھر یوسفؑ کے پاس پہونچے سو یوسف نے تو اُن کو پہچان لیا اور اُنھوں نے یوسفؑ کو نہ پہچانا۔

اور جب یوسفؑ نے اُن کا سامان تیار کر دیا تو فرمایا کہ اپنے علاتی بھائی کو بھی لانا، تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں پورا ناپ کر دیتا ہوں اور میں سب سے زیادہ مہمان نوازی کرتا ہوں۔ اور اگر تم (دوبارہ آئے اور) اُس کو میرے پاس نہ لائے تو نہ میرے پاس تمہارے نام کا غلّہ ہوگا اور نہ تم میرے پاس آنا۔

وہ بولے (دیکھیے ہم (اپنی حدِ امکان تک تو) اُس کے باپ

سے اسکو مانگیں گے اور ہم اس کام کو ضرور کر دیں گے (آگے باپ کے اختیار میں ہے)

اور (جب وہ لوگ وہاں سے چلنے لگے تو) یوسفؑ نے اپنے نوکروں سے کہہ دیا کہ ان کی جمع کردہ پونجی (جسکے عوض انھوں نے غلّہ مول لیا ہے) اِن ہی کے اسباب میں (چھپاکر) رکھدو تاکہ جب اپنے گھر جائیں تو اس کو پہچانیں شاید (یہ دیکھ کر) پھر دوبارہ واپس آئیں۔ غرض جب لوٹ کر اپنے باپ (یعقوب علیہ السّلام) کے پاس پہنچے کہنے لگے اے ابّا (ہماری بڑی خاطر ہوئی اور غلّہ بھی ملا مگر بنیامین کا حصّہ نہیں ملا بلکہ بغیر بنیامین کے آئندہ بھی) ہمارے لئے (مطلقاً) غلّہ کی بندشں کر دی گئی سو (اس صورت میں ضروری ہے کہ) آپ ہمارے بھائی (بنیامین) کو ہمارے ساتھ بھیجدیجئے تاکہ ہم (پھر) غلّہ لاسکیں اور ہم اُن (بنیامین) کی پوری حفاظت رکھیں گے۔

یعقوب (علیہ السلام) نے کہا کہ بس (رہنے دو) میں اس کے بارے میں بھی تمہارا ویسا ہی اعتبار کرتا ہوں جیسا کہ اس سے پہلے اسکے بھائی (یوسفؑ) کے بارے میں تمہارا اعتبار کرچکا ہوں۔ سو (خیر اگر لے ہی جاؤ گے تو) اللہ (کے سُپرد) وہی سب سے بڑھکر نگہبان ہے۔ (میری نگہبانی سے کیا ہوتا ہے) اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔

اور (اس گفتگو کے بعد) جب اُنھوں نے اسباب کھولا تو (اُس میں) اُنکی جمع کردہ پونجی (بھی) ملی کہ اُن ہی کو واپس کر دی گئی ہے کہنے لگے اے ابّا (دیکھئے) اور ہم کو کیا چاہیئے یہ ہماری جمع کردہ پونجی بھی تو ہم ہی کو لوٹا دی گئی (ایسا کریم بادشاہ ہے) اور اپنے گھر والوں کے واسطے اور غلّہ لائیں گے اور اپنے بھائی (بنیامین) کی خوب حفاظت رکھیں گے۔ اور ایک اونٹ کے بوجھ کا غلّہ اور زیادہ لائیں گے (کیونکہ جسقدر اسوقت لائے ہیں) یہ تو تھوڑا سا غلّہ ہے۔ یعقوب (علیہ السّلام) نے کہا کہ اس وقت تک ہرگز اسکو تمہارے ساتھ نہ بھیجوں گا جب تک

اللہ کی قسم کھا کر مجھ کو پکّا قول نہ دوگے کہ تم اسکو ضرور لے ہی آؤ گے
ہاں اگر کہیں گھر ہی جائے تو مجبوری ہے (چنانچہ سب نے اس پر
قسم کھائی) سو جب وہ قسم کھا کر اپنے باپ کو قول دے چکے تو اُنھوں
نے فرمایا کہ ہم لوگ جو کچھ بات چیت کر رہے ہیں یہ سب اللہ کے حوالے۔
اور (چلتے وقت) یعقوب نے (اُن سے فرمایا) کہ اے میرے بیٹو!
جب مصر پہنچو تو) سب کے سب ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا
بلکہ علیحدہ علیحدہ دروازوں سے جانا اور (یہ محض ایک ظاہری تدبیر ہے)
(باقی) اللہ کے حکم کو تم پر سے ٹال نہیں سکتا حکم تو بس اللہ ہی کا ہے
اُسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اُسی پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ
رکھنا چاہیئے۔
اور جب (مصر پہنچکر) جس طرح اُن کے باپ نے کہا تھا
(اُسی طرح) شہر کے اندر داخل ہوئے تو باپ کا ارمان پورا ہوگیا۔
(باقی) اُن کے باپ کو اُن سے (یہ تدبیر بتلا کر) خدا کا حکم ٹالنا مقصود نہ
تھا لیکن یعقوب کے جی میں (بدرجہ تدبیر) ایک ارمان (آیا) تھا جس کو
اُنھوں نے ظاہر کر دیا اور بلاشبہ وہ بڑے عالم تھے بایں وجہ کہ ہم نے
اُن کو علم دیا تھا لیکن اکثر لوگ اسکا علم نہیں رکھتے۔"

دربارِ یوسفی اور دوسرا داخلہ

صورت یہ پیش آئی کہ جب برادرانِ یوسف کنعان سے دوبارہ روانہ ہوئے تو راستہ میں بنیامین کو تنگ کرنا شروع کیا کبھی اسکو باپ کی محبت وعشق کا طعنہ دیتے۔ کبھی اس بات پر حسد کرتے کہ عزیزِ مصر نے خصوصیت کے ساتھ اِسکو کیوں طلب کیا ہے؟ بنیامین یہ سب کچھ سنتے اور خاموش رہتے۔ جب یہ منزلِ مقصود پر پہنچے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہوئے اور انھوں نے دیکھا کہ یہ لوگ وعدہ کے مطابق ان کے حقیقی بھائی بنیامین کو بھی ساتھ لے آئے ہیں تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو خاص اپنے ساتھ ٹھیرایا۔

امام تفسیر قتادہؒ نے لکھا ہے کہ سب بھائیوں کے قیام کا حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ انتظام کیا تھا کہ دو دو کو ایک ایک کمرے میں ٹھیرایا گیا۔ یہ گیارہ بھائی تھے بنیامین تنہا رہ گئے اُن کو اپنے ساتھ قیام کرنے کا حکم دیا۔ جب تنہائی کا موقع آیا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے حقیقی بھائی پر راز فاش کر دیا اور بتلایا کہ میں ہی تمہارا حقیقی بھائی یوسف ہوں اب تم کوئی اندیشہ نہ کرو اب بُرائی کا دور ختم ہو گیا اب یہ لوگ تم کو کسی قسم کی ایذا نہیں دیں گے۔

توراۃ میں مذکور ہے کہ یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی بڑی خاطر مدارات کی نوکروں کو حکم دیا کہ انکو شاہی مہمان خانوں میں اُتاریں اور انکے لئے پُرتکلف دعوت کا سامان کیا، چند روز کے قیام کے بعد جب یہ رخصت ہونے لگے تو یوسف علیہ السلام نے حکم دیا کہ اِن کے اونٹوں کو غلے سے اسقدر لاد دیا جائے جتنا کہ یہ برداشت کر سکیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح اپنے عزیز بھائی بنیامین کو اپنے پاس روک لیں مگر انتہائی اضطراب و بے چینی کے باوجود اُن کے لئے ایسا کرنا ممکن نہ تھا اس لئے کہ حکومت مصر کے قانون میں کسی غیر مصری کو بغیر کسی معقول وجہ کے روک لینا سخت ممنوع تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کسی طرح نہیں چاہتے تھے کہ اس وقت لوگوں پر یا اُن کے بھائیوں پر اصل حقیقت منکشف ہو۔ اس وجہ سے خاموش رہے اور جب قافلہ روانہ ہونے لگا تو کسی کو اطلاع کئے بغیر نشانی کے طور پر اپنا چاندی کا پیالہ بنیامین کے سامان میں رکھ دیا۔

کنعان کے اس قافلہ نے ابھی تھوڑی ہی مسافت طے کی ہو گی کہ یوسف علیہ السلام کے کارندوں نے شاہی برتنوں کی دیکھ بھال کی تو اُس میں قیمتی پیالہ نہ پایا سمجھے کہ شاہی محل میں کنعانیوں کے سوا دوسرا کوئی نہیں آیا اس لئے اُنھوں نے ہی یہ چوری کی ہے فوراً دوڑے اور چلائے، قافلے والو ٹھہرو تم چور ہو۔

برادرانِ یوسف کارندوں کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے ہم پر خواہ مخواہ کیوں الزام لگاتے ہو آخر معلوم تو ہو کہ تمہاری کیا چیز گُم ہو گئی ہے؟

کہا گیا کہ بادشاہ کا قیمتی پیالہ گُم ہو گیا ہے اور اُن میں سے ایک نے آگے بڑھکر کہا کہ جو شخص چوری کا پتہ لگا دیگا اُس کو ایک اونٹ غلہ انعام میں ملے گا

اور میں اس بات کا ضامن ہوں۔

برادرانِ یوسف نے کہا خدا جانتا ہے کہ ہم مصر میں فساد کرنے کی غرض سے نہیں آئے اور تم لوگ جانتے ہو کہ ہم اس سے پہلے بھی غلّہ لینے آئے تھے۔

ہم لوگ چور نہیں ہیں کارندوں نے کہا۔ اچھا جس کے پاس یہ چوری ثابت ہو جائے اُسکی سزا کیا ہونی چاہیئے ؟

برادرانِ یوسف نے کہا وہ خود آپ اپنی سزا ہے۔ یعنی وہ تمہارے حوالہ کر دیا جائے گا تاکہ اپنے جرم کی پاداشں میں پکڑا جائے اور ہم اپنے ملک میں ایسی زیادتی کرنے والوں کو یہی سزا دیا کرتے ہیں۔

کارندوں نے یہ جواب سُنا تو غلّے کی تلاشی لی اور جب اُن میں پیالہ نہ نکلا تو آخر میں بنیامین کے سامان کی تلاشی لی اُس میں پیالہ موجود تھا۔ کارندوں نے قافلہ کو واپس لوٹا کر عزیز مصر کی خدمت میں معاملہ پیش کیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے معاملہ کی نوعیت کو سُنا تو دل میں بیحد مسرور ہوئے کہ میری معمولی سی تدبیر پر اللہ تعالےٰ نے میرا مقصد پورا کر دیا، اودھر بنیامین بھی اس واقعہ کو اپنی مرضی کے مطابق پا کر خاموش رہے۔

برادرانِ یوسف نے جب یہ دیکھا تو اُن کی آتشِ حسد بھڑک اُٹھی اور اُنھوں نے یہ جھوٹ بھی بولنے کی جرأت کی کہ اگر بنیامین نے یہ چوری کی ہے تو تعجب کا مقام نہیں ہے اس سے پہلے اسکا بڑا بھائی یوسفؑ بھی چوری کر چکا ہے (چوری کی یہ کہانی آئندہ صفحات پر آرہی ہے) حضرت یوسف علیہ السلام نے جبکہ یہ دیکھا کہ میرے منہ پر ہی جھوٹ بول رہے ہیں ضبط سے کام لیا اور پھر بھی راز فاش نہ کیا (کیونکہ بذریعہ وحی الٰہی آپ پر اسکی پابندی تھی)

کہنے لگے تمہارے لئے سب سے بُری جگہ ہے کہ تم ایسا جھوٹا الزام لگا رہے ہو اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اللہ تعالےٰ اسکی حقیقت کا خوب جاننے والا ہے۔

برادرانِ یوسف نے جب یہ ماحول دیکھا تو بہت گھبرائے اور باپ کا عہد و پیمان یاد آگیا آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ کس صورت سے بنیامین کو حاصل کریں؟ اور باپ تک پہنچائیں۔

ہم تو پہلے ہی اپنا قول ہار چکے ہیں صرف ایک صورت یہ باقی ہے کہ بادشاہ سے خواہش کریں اور عرض معروض کریں کہ عزیز مصر بنیامین کو اپنی مہربانی سے معاف کر دے۔ چنانچہ کہنے لگے عزیز مصر! ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے اُس کو اِسکے پہلے بھائی یوسفؑ کا بھی بیحد غم ہے۔ اب اگر یہ بھی اُن سے جُدا ہو جائیگا تو وہ شدت غم سے ہلاک ہو جائیں گے۔

اے بادشاہ اگر ایسا ممکن نہیں تو اسکی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو سزا کیلئے روک لیجئے آپ رحم و کرم والے ہیں۔

عزیز مصر نے کہا اللہ کی پناہ! یہ بات کیسے ممکن ہے؟ ہم اگر ایسا کریں تو ظالم قرار پائیں گے۔ جب سب اس جانب سے مایوس ہو گئے تو اب تنہائی میں بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے۔

اِن میں سے بڑے نے کہا بھائیو! تم کو معلوم ہے کہ والد نے بنیامین کے متعلق کسقدر سخت اور پختہ عہد و پیمان ہم سے لیا تھا اور اس سے پہلے تم نے یوسف کے ساتھ جو ظلم و زیادتی کی ہے وہ بھی سامنے ہے۔ اس لئے میں تو اب اس جگہ سے اس وقت تک ٹلنے والا نہیں کہ یا والد مجھے کنعان آنے کی اجازت دیں۔ یا اللہ میرے لئے کوئی دوسرا فیصلہ کردے۔ لہذا تم سب باپ کے پاس جاؤ اور عرض کرو کہ تمہارے بیٹے بنیامین نے چوری کی اور جو بات ہمارے سامنے آئی ہے وہی صاف صاف آپ کے سامنے کہہ دی گئی ہے۔ ہم کو کچھ غیب کا علم تو تھا نہیں کہ پہلے سے جان لیتے کہ بنیامین سے ایسی حرکت سرزد ہونے والی ہے۔ اور یہ بھی ذکر کر دینا کہ آپ مصر والوں سے اسکی تصدیق کر لیں۔ نیز اُس قافلہ سے بھی جس کے ساتھ ہم مصر سے یہاں آئے ہیں۔

اس مشورہ کے بعد وہ سب کنعان واپس ہو گئے اور اپنے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام سے سب کچھ واقعہ کہہ سنایا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی فراستِ نبوت اور اپنے سابقہ تجربے کی بنا پر جو بیٹوں نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا شدت سے محسوس کیا کہ یہ واقعہ بھی جھوٹا ہے۔ فرمایا کہ نہیں نہیں یہ بات ایسی نہیں تمہارے دلوں نے ایک بات گھڑلی ہے لیکن اب صبر کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں بس میں صبر

کرتا ہوں مجھے اللہ سے اُمید ہے کہ وہ ایک دن اِن گم کردہ گان کو پھر جمع کر دیگا اور ایک ساتھ مجھے ملا دے گا۔ بلاشبہ وہ علیم و حکیم ہے۔ اسکے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں سے یکسوئی کرلی اور رُوتے روتے اپنی آنکھیں سفید کرلیں۔ بیٹوں نے جب یہ دیکھا تو کہنے لگے بخدا کیا آپ اسی طرح یوسف کی یاد میں گھُلتے رہو گے؟ اور کیا اسی غم میں اپنی جان دے دو گے؟

حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ سنکر فرمایا:۔

"میں تم سے تو شکوہ نہیں کرتا اور نہ تم کو کچھ کہتا ہوں، بیں اپنے غم و مصیبت کو اپنے اللہ ہی کی طرف پیش کرتا ہوں"۔

اسکے بعد بھی بیٹوں سے فرمایا:۔

"دیکھو ایک مرتبہ پھر مصر جاؤ اور یوسف علیہ السلام اور اسکے بھائی کی تلاش و جستجو کرو اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو۔ ——— اس لئے کہ اللہ کی رحمت سے ناامیدی و مایوسی کافروں کا شیوہ ہے"۔

قرآن حکیم نے دربارِ یوسفی میں بھائیوں کی دوبارہ آمد اور بادشاہ کے پیالہ کی گمشدگی کا تذکرہ اور بنیامین (برادر یوسف) کو عزیز مصر کے حوالہ کرنے کا ذکر اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونے اور بنیامین کے حادثہ کی تفصیل اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا صبر و ضبط اِن آیات میں بیان کیا ہے:۔

قرآنی مضمون

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوسُفَ اٰوٰى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّىٓ اَنَا اَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۔الخ

(یوسف آیات ۶۹ تا ۸۷)

"اور جب یہ لوگ (برادرانِ یوسف) یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے (اور بنیامین کو پیش کرکے کہا کہ ہم آپ کے حکم کے مطابق انکو لائے ہیں) یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ملا لیا (اور تنہائی میں اُن سے کہہ

دیا کہ میں بھائی (یوسف) ہوں سو یہ لوگ جو کچھ (بدسلوکی کیا) کرتے رہے ہیں اُسکا رنج نہ کرنا۔

پھر جب یوسف (علیہ السّلام) نے اُن کا سامان غلّہ اور روانگی کا انتظام کر دیا تو (بطورِ نشانی) پانی پینے کا برتن اپنے بھائی کے اسباب میں رکھ دیا پھر (کارندوں کو اس کی اطلاع ہونے پر کہ پیالہ موجود نہیں ہے) ایک پکارنے والے نے پکارا کہ اے قافلہ والو تم ضرور چور ہو۔ وہ ان کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے؟

(کارندوں نے) کہا کہ ہم کو بادشاہی پیمانہ نہیں ملتا (وہ غائب ہے) اور جو شخص اُسکو لاکر حاضر کرے اُسکو ایک شتر بار غلّہ (بطور انعام) ملے گا اور میں اُسکے دلوانے کا ذمہ دار ہوں۔

یہ لوگ کہنے لگے بخدا تم کو خوب معلوم ہے کہ ہم ملک میں فساد پھیلانے نہیں آئے ہیں اور نہ ہم لوگ چوری کرنے والے ہیں۔

اُن (کارندوں نے) کہا اچھا اگر تم جھوٹے نکلے (اور تم میں سے کسی پر سرقہ ثابت ہو جائے) تو اُس (چور) کی کیا سزا ہوگی؟

بھائیوں نے (شریعتِ یعقوبی) کے مطابق جواب دیا کہ اُسکی سزا یہ ہے کہ وہ شئے جس شخص کے اسباب میں ملے پس وہی شخص اپنی سزا ہے (یعنی جسکا مال ہے وہ اُسکو اپنا غلام بنالے) ہم لوگ ظالموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔

پھر اُس نے یوسف کے (حقیقی) بھائی کے تھیلے کی تلاشی سے پہلے اُن سب کے تھیلوں کی تلاشی لی پھر (اخیر میں) اُس برتن کو اُسکے بھائی کے تھیلے سے برآمد کر لیا ہم نے یوسف (علیہ السلام) کی خاطر سے اس طرح (بنیامین کو روکنے کی) تدبیر فرمائی (کیونکہ) یوسفؑ اپنے بھائی کو اُس بادشاہ (مصر) کے قانون کی رُو سے نہیں لے سکتے تھے (کیونکہ قانون مصر میں چوری کی سزا تادیب یا جرمانہ تھا) مگر یہ ہے کہ اللہ ہی کو منظور تھا۔ (اس لئے یوسف علیہ السلام کے دل

میں تدبیر آئی اور بھائیوں کے منہ سے یہ جواب خود نکلا) ہم جس کو چاہتے ہیں (علم میں) خاص درجوں تک بڑھا دیتے ہیں اور تمام علم والوں سے بڑھکر ایک بڑا علم والا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ)

(حاصل یہ کہ جب ان کے اسباب سے وہ برتن برآمد ہوا اور بنیامین روک لئے گئے تو وہ سب بڑے شرمندہ ہوئے اور) کہنے لگے کہ (صاحب) اگر اُس نے چوری کی تو (تعجب نہیں کیونکہ) اسکا ایک بھائی (تھا وہ) بھی (اسی طرح) اس سے پہلے چوری کر چکا ہے۔

(جسکا قصہ تفسیر درمنثور میں اس طرح لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اُنکی پھوپی حضرت یعقوب علیہ السلام کی بہن پرورش کیا کرتی تھیں۔ جب یہ ذرا ہوشیار ہوئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے لینا چاہا لیکن وہ بہت چاہتی تھیں اس لئے اپنے پاس اور رکھنا چاہا اس کے لئے پھوپی نے یہ تدبیر کی کہ یوسف علیہ السلام کی کمر میں ایک پٹکا کپڑوں کے اندر باندھ کر مشہور کر دیا کہ پٹکا گم ہو گیا اور سب کی تلاشی لی تو یہ یوسف علیہ السلام کی کمر سے برآمد ہوا۔ اس طرح قانون یعقوبی کی دفعہ سے فائدہ اٹھا کر یوسف علیہ السلام کو مزید اپنے پاس اور کچھ مدت رکھ لیا۔ اسی واقعہ کی طرف بھائیوں نے اشارہ کیا کہ اگر یہ بنیامین نے چوری کی ہے تو کوئی تعجب نہیں اس سے پہلے اسکے بھائی یوسف نے بھی بچپن میں چوری کی ہے)

پس یوسف (علیہ السلام) نے اس بات کو (جو آگے آرہی ہے) اپنے دل میں پوشیدہ رکھا اور اس کو اُن کے سامنے (زبان سے) ظاہر نہیں کیا یعنی (دل میں) یوں کہا کہ اس (چوری کے) درجہ میں تم تو اور بھی زیادہ بُرے ہو (یعنی ہم دونوں بھائیوں سے تو حقیقی سرقہ صادر نہیں ہوا اور تم نے تو اتنا بڑا کام کیا کہ کوئی مال غائب کرتا ہے تو تم نے آدمی غائب کر دیا کہ مجھ کو باپ سے جُدا کر دیا) اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو (کہ ہم چور ہیں) اسکی (حقیقت) کا اللہ ہی کو خوب علم ہے۔

(جب بھائیوں نے دیکھا کہ یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو ماخوذ کر لیا اور اُس پر قابض ہو گئے تو براہ خوشامد) کہنے لگے اے عزیز! اس (بنیامین) کا ایک بہت بوڑھا باپ ہے (اور وہ اِس کو بہت چاہتا ہے اسکے غم میں خُدا جانے اسکا کیا حال ہو جائے) سو آپ (ایسا کیجئے) کہ اسکی جگہ ہم میں سے ایک کو رکھ لیجئے (اور اپنا غلام بنا لیجئے) ہم آپ کو نیک مزاج دیکھتے ہیں۔

یوسف (علیہ السلام) نے کہا ایسی (بے انصافی) کی بات سے خدا بچائے کہ جسکے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے اُسکے سوا دوسرے شخص کو پکڑ کے رکھ لیں (اگر ہم ایسا کریں تو) اس حالت میں ہم بڑے بے انصاف سمجھے جائیں گے۔

پھر جب اِن کو یوسف (علیہ السلام) سے (انکے صاف جواب پر) بالکل اُمید نہ رہی (کہ بنیامین کو دیں گے) تو (اس جگہ سے) علیحدہ ہو کر باہم مشورہ کرنے لگے۔ اُن میں سے سب سے بڑا جو تھا اُس نے کہا (کہ تم لوگ جو واپس چلنے کی صلاح کر رہے ہو تو) کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ تم سے اللہ کی قسم پر پکا قول لے چکے ہیں (کہ تم بنیامین کو اپنے ساتھ ضرور لاؤ گے) اور اس سے پہلے یوسف کے بارے میں تم لوگ کوتاہی کر ہی چکے ہو (سو ان حالات میں) میں تو اس زمین سے ٹلتا نہیں تاوقتیکہ میرے باپ (خود) مجھکو (حاضری کی) اجازت نہ دیں یا اللہ تعالےٰ اس مشکل کو سُلجھا دے اور وہی خوب سلجھانے والا ہے۔ (لہٰذا مجھکو تو یہاں چھوڑ دو اور) تم واپس اپنے باپ کے پاس جاؤ (اور جا کر اُن سے) کہو کہ اباجان آپ کے صاحبزادے (بنیامین) نے چوری کی (اس لئے گرفتار کر لئے گئے) اور ہم تو وہی بیان کرتے ہیں جو ہم کو (مشاہدہ سے) معلوم ہوا ہے اور ہم (قول و قرار دیتے کے وقت) غیب کی خبروں کے حافظ تھے نہیں (کہ یہ چوری کرے گا ورنہ ہم تو کبھی عہد و پیمان نہ کرتے) (اگر ہمارے کہنے کا یقین نہ ہو تو)

اُس بستی (یعنی مصر) والوں سے پوچھ لیجئے جہاں ہم (اُس وقت) موجود تھے (جب چوری برآمد ہوئی) اور اُس قافلہ والوں سے پوچھ لیجئے جن میں ہم شامل ہوکر (یہاں) آئے ہیں اور یقین جانئے ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔ (چنانچہ سب بھائیوں نے بڑے کو وہاں چھوڑا اور خود آکر سارا قصہ بیان کیا) یعقوب (علیہ السلام) (واقعہ یوسفؑ کے سبب ان سے غیر مطمئن ہوگئے تھے) فرمانے لگے (کہ بنیامین چوری میں ماخوذ نہیں ہوا) بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے لہٰذا (پہلے کی طرح) میں صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہوگا۔ اللہ سے اُمید ہے کہ اُن سب کو مجھ تک پہنچا دے گا کیونکہ وہ (حقیقت حال سے) خوب واقف ہے اور وہ بڑی حکمت والا ہے۔

اور (یہ جواب دیکر) اُن سے دوسری طرف رُخ کرلیا اور (بوجہ اس نئے غم سے پُرانا غم تازہ ہوگیا) کہنے لگے ہائے یوسف افسوس اور غم سے (روتے روتے) اُن کی آنکھیں سفید پڑ گئیں اور وہ (غم کی شدّت سے اپنے آپ) گھٹا کرتے تھے۔

بیٹے کہنے لگے بخدا (معلوم ہوتا ہے) تم سدا کے سدا یوسفؑ کی یاد میں لگے رہو گے یہاں تک کہ گھل گھل کر جان بلب ہوجاؤ گے یا یہ کہ بالکل مر ہی جاؤ گے۔

یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا (تم کو میرے رونے سے کیا بحث) میں تو اپنے رنج وغم کی صرف اللہ ہی سے شکایت کرتا ہوں (تم سے تو کچھ نہیں کہتا) اور اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ اے میرے بیٹو! (ایک بار پھر) جاؤ اور یوسف اور اُس کے بھائی کی تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے نااُمید نہ ہو بیشک اللہ کی رحمت سے وہی لوگ نااُمید ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔"

دربار یوسفی اور تیسرا داخلہ | حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک

طویل وقفہ کے بعد بیٹوں کو حکم دیا کہ جاؤ یوسف علیہ السلام اور اُسکے بھائی کو تلاش کرو اور مایوس نہ ہو۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس سے پہلے کبھی اس طرح کا حکم نہ دیا تھا ورنہ اس سے قبل بھی تلاش کا کام لیا جاسکتا تھا۔ دراصل یہ سب چیزیں تقدیر الٰہی کے تابع تھیں۔ اس سے پہلے ایسا حکم دینا یا اسکا خیال آنا مقدر نہ تھا، اب غالباً اللہ کے علم میں ملاقات کا وقت آچکا تھا اس لئے اسکے مناسب تدبیر دل میں ڈال دی گئی۔ آیت میں دونوں کی تلاش کا رُخ ملکِ مصر ہی کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ بنیامین کے بارے میں تو معلوم تھا کہ انکو عزیز مصر نے روک لیا ہے مگر یوسف علیہ السلام کو مصر میں تلاش کرنے کی بظاہر کوئی قابل اعتبار توجیہہ معلوم نہیں ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا ارادہ فرماتے ہیں تو اُس کے مناسب اسباب جمع فرمادیتے ہیں اور وہ چیز حاصل ہوجاتی ہے۔ اس لئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس مرتبہ تلاش و تفتیش کے لئے پھر مصر جانے کی ہدایت فرمائی۔

الغرض برادران یوسف نے کچھ تو باپ کے اصرار اور کچھ اس لئے بھی کہ قحط کی شدت انتہائی درجہ پر پہنچی ہوئی تھی اور غلے کا آس پاس نام و نشان نہ تھا۔ تیسری بار مصر کا ارادہ کیا اور جب دربار شاہی میں پہنچے تو کہنے لگے اے عزیز! ہم کو اور ہمارے گھروالوں کو قحط نے سخت پریشانی میں ڈال دیا ہے اور اس مرتبہ ہم پونجی (قیمت غلہ) بھی بہت تھوڑی لائے ہیں جو حاضر ہے۔ اب معاملہ خرید فروخت کا نہیں ہے ہم سے قیمت ادا نہیں ہوسکتی اس لئے آپ کی خدمت میں یہ درخواست ہے کہ ازراہ کرم ہم کو غلے کی پوری مقدار دے دیجئے اور ہمیں ضرورتمند جان کر اپنی جانب سے احسان فرمائیے، اللہ تعالےٰ صدقہ وخیرات کرنے والے کو نیک بدلہ دیتا ہے۔

بھائیوں کی اس درخواست میں تین گزارشیں نہایت ہی رقت آمیز تھیں جس کو قرآن حکیم نے ان الفاظ سے ادا کیا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجَاةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۔ (آیت ۸۸)

اے سردار با اقتدار، ہم اور ہمارے اہل و عیال سخت مصیبت

میں مبتلا ہیں، اور ہم کچھ حقیر سی پونجی لے کر آئے ہیں۔ ہمیں بھرپور غلّہ عنایت فرمائیے اور ہم کو خیرات دیجئے۔ یعنی ہماری اس گزارش پر جو کچھ آپ دیں گے وہ گویا آپ کا صدقہ ہوگا۔ یہ حقیر سی پونجی کیا تھی قرآن وحدیث میں اسکی کوئی وضاحت نہیں ملتی البتہ مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ کھوٹے دراہم تھے جو بازار میں رائج نہ تھے۔ بعض نے کہا کچھ گھریلو قسم کا سامان تھا۔ یہ لفظ "مزجٰۃٍ" کا ترجمہ ہے۔ اسکے اصل معنی ایسی چیز کے ہیں جو خود نہ چلے بلکہ اسکو زبردستی چلایا جائے۔

حضرت یوسف علیہ السّلام نے جب بھائیوں کا یہ گیا گزرا حال دیکھا تو دل بھر آیا، طبعی طور پر قوتِ ضبط ٹوٹ رہی تھی اظہار حقیقت کی جو پابندی منجانب اللہ مقرر تھی غالباً اُسکے خاتمہ کا وقت بھی آچکا تھا۔

تفسیر قرطبی اور تفسیر مظہری میں حضرت ابن عباس رضؓ سے ایک روایت درج ہے کہ اس موقعہ پر یعقوب علیہ السلام نے عزیز مصر کے نام ایک خط لکھ کر دیا تھا جس کا مضمون یہ تھا:۔

منجانب یعقوب صفی اللہ ابن اسحٰق نبیّ اللہ ابن ابراہیم خلیل اللہ،

بخدمت عزیز مصر!

"امابعد، ہمارا پورا خاندان بلاؤں اور آزمائشوں میں معروف رہا ہے، میرے دادا ابراہیم خلیل اللہ کا نمرود کی آگ سے امتحان لیا گیا، پھر میرے والد اسحٰق کا شدید امتحان لیا گیا۔ اسکے بعد میرے ایک لڑکے کے ذریعہ میرا امتحان لیا گیا جو مجھ کو سب سے زیادہ محبوب تھا، یہاں تک کہ اُسکی مفارقت میں میری بینائی جاتی رہی، اس کے بعد اسکا ایک چھوٹا بھائی مجھ غمزدہ کی تسلّی کا سامان تھا جس کو آپ نے چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے، اور میں بتلاتا ہوں کہ ہم نبیوں کی اولاد ہیں۔ نہ ہم نے کبھی چوری کی ہے نہ ہماری اولاد میں کوئی چور پیدا ہوا ہے۔"

والسلام

حضرت یوسف علیہ السّلام نے جب یہ خط پڑھا تو بے ساختہ رونے لگے، کچھ سنبھل کر بھائیوں سے سوال کیا تم کو کچھ یہ بھی یاد ہے کہ تم نے یوسف اور اُسکے بھائی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا جبکہ تم لوگ جہالت میں سرشار تھے ؟

برادرانِ یوسف نے یہ سوال سُنا تو چکرا گئے کہ عزیز مصر کو اس قصہ سے کیا واسطہ ؟ پھر کچھ غور و تامّل کیا تو بچپن کے کچھ علامات محسوس ہوئے، شک و شبہ کے انداز میں کہا :۔

کیا سچ مچ تم ہی یوسف ہو ؟

حضرت یوسف علیہ السّلام نے فرمایا ہاں میں ہی یوسف ہوں اور یہ بنیامین میرا حقیقی بھائی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ہم پر احسان فرمایا اور جو شخص بھی برائیوں سے بچے اور ثابت قدم رہے تو اللہ تعالےٰ نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

اب برادرانِ یوسف کے ہاں سوائے ندامت اور اعتراف جرم کے اور کوئی سہارا نہ تھا۔ اپنی ساری حاسدانہ حرکتوں کا نقشہ سامنے آگیا جس کو کل کنعانیوں کے کنویں میں پھینکا تھا وہ آج مصر کے تخت و تاج کا مالک ہے۔ شرم سے سر جھکا کر کہنے لگے :۔

"بخدا اس میں شک نہیں کہ اللہ نے آپ کو ہم پر فضیلت بخشی ہے اور واقعی ہم خطاکار ہیں"

حضرت یوسف علیہ السّلام نے اپنے خطاکار بھائیوں کی خستہ حالی اور پشیمانی کو دیکھا تو اپنی عالی ظرفی اور پیغمبرانہ اخلاق کے مطابق وہی کہا جو تمام انبیاء کی سنت رہی ہے :۔

"آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے"

یعنی جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اب پچھلی باتوں کو فراموش کر دینی چاہیئے۔ میں بارگاہِ الٰہی میں دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہاری خطاؤں کو معاف فرماوے۔

اب تم لوگ کنعان واپس جاؤ اور ساتھ میرا پیراہن بھی لیتے جاؤ۔ یہ میرے والد کی آنکھوں پر ڈال دینا۔ انشاء اللہ اسکی خوشبو آنکھوں کو روشن کر دیگی اور

پھر تمام خاندان کو مصر لے آنا۔

امام تفسیر ضحاکؒ اور مجاہدؒ سے منقول ہے کہ اس کرتے کی خصوصیت عام کپڑوں سے مختلف تھی۔ یہ کرتہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے لئے جنت سے اس وقت لایا گیا تھا جبکہ اُن کو برہنہ کر کے آگِ نمرود میں ڈالا گیا تھا۔ پھر یہ جنت کا لباس ہمیشہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے ہاں محفوظ رہا اور ان کی وفات کے بعد حضرت اسحٰق علیہ السّلام کے ہاں رہا۔ پھر اُن کی وفات کے بعد حضرت یعقوب علیہ السّلام کو ملا، آپ نے ایک بڑی متبرک شئ کی حیثیت سے اسکو ایک نلکی میں بند کر کے حضرت یوسف علیہ السّلام کے گلے میں بطور تعویذ ڈال دیا تھا تاکہ نظر بد سے محفوظ رہیں۔ برادرانِ یوسف نے جب اُن کا کرتہ والد کو دھوکہ دینے کے لئے اُتار لیا اور وہ برہنہ کر کے کنویں میں ڈال دیے گئے تو جبرئیل امین تشریف لائے اور گلے میں پڑی ہوئی نلکی کھول کر اُس سے کرتہ برآمد کیا اور حضرت یوسف علیہ السّلام کو پہنا دیا، اور یہ اُن کے پاس برابر محفوظ چلا آیا اس وقت بھی جبرئیل امین نے حضرت یوسف کو مشورہ دیا کہ یہ جنت کا لباس ہے۔ اسکی خاصیت یہ ہے کہ نابینا کے چہرے پر ڈال دیا جائے تو وہ بینا ہو جائے اور فرمایا کہ اسکو اپنے والد کے ہاں بھیج دیا جائے وہ بینا ہو جائیں گے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السّلام کا حسن وجمال اور ان کا وجود خود جنت کی ہی ایک چیز تھی اس لئے ان کے جسم سے متصل ہونے والے ہر کُرتے میں یہ خاصیت ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

بہرحال برادرانِ یوسف کا یہ قافلہ اپنے وطن کنعان روانہ ہوا ساتھ میں "پیراہنِ یوسفی" بھی تھا۔ ابھی قافلہ شہر مصر سے باہر ہی ہوا تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السّلام نے اپنے گھر والوں سے کہا اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے میں اسکی عقل ماری گئی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھ کو یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔

شہر مصر سے کنعان تک حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق آٹھ دن کی مسافت کا راستہ تھا، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اسّی فرسخ تقریباً ڈھائی سو میل کا فاصلہ تھا۔

یہ عجائب قدرت سے ایک بات تھی کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام اپنے

وطن کنعان ہی کے ایک کنویں میں تین روز تک پڑے رہے اُس وقت یہ خوشبو محسوس نہیں ہوئی۔

الغرض گھر والوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس ارشاد پر تعجب اور افسوس کے ساتھ کہا بخدا آپ تو اپنے اُسی پرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں کہ یوسفؑ زندہ ہیں اور وہ پھر ملیں۔ گے۔ یعنی اس قدر زمانہ گزر جانے کے باوجود آپ کو یوسفؑ ہی کی رٹ لگی ہے۔

کچھ دن نہ گزرے تھے کہ کنعانی قافلہ بخیر تمام پہنچ گیا اور برادرانِ یوسفؑ نے ان کا پیراہن حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر ڈال دیا آنکھیں فوراً روشن ہوگئیں فرمانے لگے؛ دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ؟

برادرانِ یوسف کے لئے یہ وقت بڑا رُسوا کن تھا شرم وندامت میں سر جھکائے بولے ابا جان! آپ اللہ کی جناب میں ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لئے دُعا فرمائیے۔ بلاشبہ ہم سخت خطاکار اور قصوروار ہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا عنقریب میں اپنے رب سے تمہارے لئے مغفرت کی دُعا کروں گا، بلاشبہ وہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

دربارِ یوسفی میں برادران یوسف کی تیسری آمد اور اپنی خستگی و زبوں حالی کا اظہار اور حضرت یوسف علیہ السلام سے تعارف اور معافی کی درخواست اور پیراہنِ یوسفی کا تذکرہ آیاتِ ذیل میں تفصیلاً مذکور ہے۔

قرآنی مضمون

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِيْنَ.

(یوسف آیات ۸۸ تا ۹۸)

(الغرض تیسری مرتبہ برادران یوسف مصر پہنچکر) جب یوسف (علیہ السلام) کے پاس (جنکو عزیز مصر سمجھ رہے تھے) پہنچے کہنے لگے

اے عزیز ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو (قحط کی وجہ سے) بڑی تکلیف پہنچ رہی ہے اور (چونکہ ہم کو ناداری نے گھیر لیا ہے اس لئے خریداری کے لئے کھرے دام میسر نہیں ہوئے) ہم کچھ یہ نکمّی چیز لائے ہیں سو آپ (اپنی مہربانی سے اسکے بدلہ) پورا غلّہ دے دیجئے اور ہم کو خیرات سمجھ کر دیجئے بیشک اللہ تعالےٰ خیرات دینے والوں کو (اچھّی) جزا دیتا ہے۔ یوسف (علیہ السّلام) نے فرمایا (کہو) وہ بھی تم کو یاد ہے جو کچھ تم نے یوسفؑ اور اسکے بھائی کے ساتھ (برتاؤ) کیا تھا جب کہ تمہاری جہالت کا زمانہ تھا۔

کہنے لگے کیا سچ مُچ تم ہی یوسف ہو؟ اُنھوں نے فرمایا (ہاں) میں یوسف ہوں اور یہ (بنیامین) میرا (حقیقی) بھائی ہے ہم پر اللہ نے بڑا احسان کیا واقعی جو شخص گناہوں سے بچتا ہے اور (مصائب پر) صبر کرتا ہے تو اللہ تعالےٰ ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

کہنے لگے بخدا کچھ شک نہیں تم کو اللہ نے ہم پر فضیلت عطا فرمائی اور بیشک ہم خطاوار تھے۔

یوسف (علیہ السّلام) نے فرمایا کہ نہیں تم پر آج (میری طرف سے) کوئی الزام نہیں ہے (بے فکر رہو) اللہ تعالےٰ تمہارا قصور معاف کرے اور وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔

اب تم (میرے باپ کو جاکر بشارت دینا اور بشارت کے ساتھ) میرا یہ کُرتہ (بھی) لیتے جاؤ اور اس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو (اس سے) اُن کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی اور اپنے گھر والوں کو میرے پاس لے آؤ۔

اور جب قافلہ (شہر مصر سے) چلا تو اُن کے باپ (یعقوب علیہ السّلام نے اپنے پاس والوں سے) کہنا شروع کیا کہ اگر تم مجھ کو بڑھاپے میں بہکی باتیں کرنے والا نہ سمجھو تو میں ایک بات کہوں کہ

مجھ کو یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔
وہ (پاس والے) کہنے لگے کہ بخدا آپ تو اپنے اسی پرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں (کہ یوسف زندہ ہے اور ملاقات کرے گا)
(حضرت یعقوب علیہ السلام خاموش ہو رہے) پس جب خوشخبری لانے والا آپہنچا تو (آتے ہی) اُس نے وہ کُرتہ اُن کے منھ پر لاکر ڈال دیا پس فوراً ہی اُن کی آنکھیں کھُل گئیں۔
آپؑ نے بیٹوں سے فرمایا کیوں میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے (اسی لئے میں نے یوسف کی تلاش کے لئے تم کو بھیجا تھا)
سب بیٹوں نے کہا اے ہمارے باپ ہمارے لئے (خدا سے) ہمارے گناہوں کی دعائے مغفرت کیجئے ہم بیشک خطاوار تھے۔
یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا عنقریب تمہارے لئے اپنے رب سے دُعائے مغفرت کروں گا بیشک وہ غفور رحیم ہے"۔

دربارِ یوسفی اور چوتھا داخلہ

حضرت یعقوب علیہ السلام نے بینائی کے لوٹ آنے کے بعد سفر کی تیاری شروع فرمادی؛

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس مرتبہ اپنے بھائیوں کے ساتھ دوسو ۲۰۰ اونٹوں پر لدا ہوا بہت سامان اور کپڑا اور دوسری ضروریات روانہ کیں تھیں تاکہ پورا خاندان مصر کے لئے تیار ہوکر آئے۔ خاندانِ یعقوبی کے جملہ افراد بہتّر ۷۲ یا ترانوے ۹۳ نفوس مرد اور عورتوں پر مشتمل تھے۔ دوسری طرف جب مصر کے قریب یہ قافلہ پہنچا تو حضرت یوسف علیہ السلام اور اعیان سلطنت اور ملک مصر کے ہزاروں باشندے استقبال کے لئے شہر سے باہر موجود تھے۔
جب یہ قافلہ مصر پہنچا تو حضرت یوسف علیہ السلام اپنے والدین اور افرادِ خاندان کو شاہی سواریوں میں بٹھا کر شہر لے آئے اور شاہی محل میں اُتارا۔

اس وقت مصر کا دار السلطنت رعمیس تھا اور وہ "جشن کا شہر" کہلاتا تھا۔
جب تمام باتوں سے فراغت پالی تو ارادہ کیا کہ دربار منعقد کریں تاکہ بزرگ باپ اور افراد خاندان کا تعارف ہو اور تمام درباری اُن کے عزت و احترام سے آگاہ ہوجائیں۔ دربار منعقد ہوا تمام درباری اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام شاہی محل سے نکل کر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوئے۔ اس وقت تمام درباری دستور کے مطابق سجدہ کے لئے گر پڑے۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ خاندانِ یوسفی نے بھی یہی عمل کیا۔ یہ دیکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے بچپن کا خواب یاد آیا اور اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام سے کہا:۔

"اے اباجان! یہ ہے تعبیر اُس خواب کی جو مدت ہوئی میں نے دیکھا تھا میرے رب نے اُسے سچ کر دکھایا"

یعنی والدین اور سب بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ کیا، حضرت ابن عباس رضؓ نے فرمایا یہ سجدۂ شکر تھا جو اللہ تعالٰے کے لئے کیا گیا تھا حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے نہیں کیا گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام اِن تمام آغاز و انجام کے اس حُسن خاتمہ کو دیکھ کر بے اختیار ہو گئے اور اللہ کی جناب عالی میں اس طرح گویا ہوئے:۔

"اے پروردگار تو نے مجھے حکومت عطا کی اور مجھ کو خوابوں کی تعبیر کا علم عطا کیا، اے آسمان و زمین کے خالق تو ہی دنیا و آخرت میں میرا کارساز ہے، مجھکو حالت فرمانبرداری میں دُنیا سے اُٹھائیے اور مجھ کو نیک بندوں میں شامل رکھئے"

تفسیر ابن کثیر رحؒ میں حضرت حسنؒ کی روایت سے نقل کیا گیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو جس وقت بھائیوں نے کنویں میں ڈالا تھا تو اُن کی عمر سترہ سال کی تھی، پھر اسّی سال والد سے غائب رہے اور والدین کی ملاقات کے بعد تیئیس ۲۳ سال زندہ رہے۔ اور ایکسو بیس ۱۲۰ سال کی عمر میں وفات پائی اور دریائے نیل کے کنارے سپردِ خاک کئے گئے۔
مؤرخ ابن اسحاق نے حضرت عروہ بن زبیرؓ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکل جائیں تو بذریعہ وحی اُن کو یہ حکم ملا تھا کہ یوسف علیہ السلام کی لاش کو بھی مصر میں نہ چھوڑیں اُسکو اپنے ساتھ لے کر ملک شام چلے جائیں اور اُن کے آباء و اجداد کے قریب دفن کریں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تفتیش کر کے ان کی قبر دریافت کی جو ایک سنگ مرمر کے تابوت میں تھی اس کو اپنے ساتھ لیکر ارض کنعان (فلسطین) لے گئے اور حضرت اسحٰق و حضرت یعقوب علیہما السلام کے پہلو میں دفن کر دیا۔

(مظہری)

الغرض چوتھی مرتبہ برادرانِ یوسف کا مع والدین دربارِ یوسفی میں آنا، اہل دربار اور برادرانِ یوسف کا سجدہ میں گر پڑنا اور بچپن کے خواب کا حقیقت اختیار کرنا آیاتِ ذیل میں وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔

قرآنی مضمون

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰی یُوْسُفَ اٰوٰی اِلَیْهِ اَبَوَیْهِ وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ۔ الخ

(یوسف آیات ۹۹ تا ۱۰۲)

پھر جب یہ سب کے سب یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو انھوں نے (سب سے مل ملا کر) اپنے والدین کو اپنے پاس (تعظیماً) جگہ دی اور کہا سب مصر میں چلئے انشاء اللہ وہاں امن چین سے رہیئے۔

(وہاں پہنچکر تعظیماً) اپنے والدین کو تختِ شاہی پر اُونچا بٹھایا (اُس وقت سب کے قلوب پر یوسف علیہ السلام کی ایسی عظمت طاری ہوئی کہ) سب کے سب اُن کے سامنے سجدہ میں گر گئے (یہ حالت دیکھ کر یوسف علیہ السلام) کہنے لگے کہ اے ابّا جان یہ ہے میرے خواب کی تعبیر جو پہلے زمانے میں دیکھا تھا (کہ شمس و قمر اور گیارہ ستارے مجھ کو سجدہ کرتے ہیں) یہ میرے رب نے اُس (خواب) کو سچا کر دیا اور میرے

ساتھ (ایک) اُس وقت احسان فرمایا جس وقت مجھ کو قید سے نکالا (اور اس رتبۂ سلطنت تک پہنچایا) اور بعد اسکے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان میں فساد ڈلوا دیا تھا (مگر اللہ کی عنایت ہے کہ وہ) تم سب کو باہر سے (یہاں) لے آیا (اور سب کو ملا دیا) بلاشبہ میرا رب جو چاہتا ہے اُس کی تدبیر لطیف کر دیتا ہے۔ بلاشبہ وہ بڑا علم والا حکمت والا ہے۔

اے میرے رب آپ نے مجھ کو سلطنت کا بڑا حصہ دیا اور مجھ کو خوابوں کی تعبیر دینا تعلیم فرمایا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے آپ میرے کارساز ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ فرمانبرداری کی حالت میں مجھکو دنیا سے اُٹھا لیجئے اور خاص نیک بندوں میں شامل کر دیجئے۔ یہ قصہ (جو بیان کیا گیا) غیب کی خبروں میں سے ہے۔ ہم وحی کے ذریعہ سے آپ کو یہ قصہ بتلاتے ہیں اور آپ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اُن (برادرانِ یوسف) کے پاس اُس وقت موجود نہ تھے جبکہ انھوں نے اپنا ارادہ (یوسف کو کنوئیں میں ڈال دینے کا پختہ) کر لیا تھا اور وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے گو آپ کا کیسا ہی جی چاہتا ہو۔ آپ اُن سے اس (قرآن) پر کچھ معاوضہ تو چاہتے نہیں یہ (قرآن) تو صرف تمام جہان والوں کے لئے ایک نصیحت ہے"۔

قصہ کا اختتام

حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ عجیب و غریب قصہ غور و فکر کرنے والوں کے لئے اپنے پہلو میں نہایت اہم اخلاقی مسائل رکھتا ہے۔ در اصل یہ قصہ ایک واقعہ ہی نہیں بلکہ کمالات و اخلاق کی ایک ایسی زریں داستان ہے جسکا ہر پہلو وعظ و نصیحت، عبرت و بصیرت کے جواہر سے لبریز ہے۔

قوتِ ایمانی، استقامت، ضبطِ نفس، صبر و شکر، عفت و دیانت، امانت عفو و درگزر، جذبۂ تبلیغ، اعلاء کلمۃ اللہ کا عشق، صلاح و تقویٰ جیسے اخلاق فاضلہ اور

صفاتِ کاملہ کا ایک نادر الوجود سلسلۃُ الذہب ہے جو اس قصہ کے ہر نقش میں نظر آتا ہے۔
چند امور خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

نتائج و عبر

پاکیٔ فطرت اگر کسی شخص کی ذاتی سرشت عمدہ ہو اور اسکا ماحول بھی پاک و مقدس اور لطیف ہو تو ایسے شخص کی زندگی اخلاق و کردار میں نمایاں صفات کی حامل ہوتی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی مقدس زندگی اسکی بہترین مثال ہے. وہ حضرت یعقوب علیہ السلام و حضرت اسحٰق علیہ السلام و حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام جیسے اُولوالعزم نبیوں کی اولاد تھے اس لئے نبوت و رسالت کے گہوارہ میں نشو نما پائی اور خانوادۂ نبوت کے ماحول میں تربیت حاصل کی. ذاتی نیک نہادی اور فطری پاکی نے جب ایسے لطیف ماحول کو دیکھا تو تمام کمالات اور اوصاف حمیدہ چمک اُٹھے۔

عقل انسانی اس مجموعۂ کمالاتِ ہستی کو دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتی ہے۔

استقامت کا اثر اگر کسی شخص میں ایمان باللہ مستقیم و مستحکم ہو اور اُس پر اسکا اعتماد و یقین راسخ و مضبوط ہو جائے تو پھر زندگی کی تمام صعوبتیں اور مشکلات اس پر آسان بلکہ خوشگوار ہو جاتی ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام کی تمام زندگی میں یہ اثر نمایاں نظر آتا ہے. تختِ مصر پر فائز ہونے کے بعد اپنے محبوب والدین کو طلب فرما سکتے تھے لیکن مرضیٔ خداوندی کے انتظار میں نصف صدی سے زائد عرصہ اپنا تعارف نہیں کروایا۔

ابتلاء و آزمائش دولت و ثروت کی شکل میں ہو یا مصیبت و ہلاکت کی

صورت میں ہو ہر حالت میں انسان کو اللہ تعالےٰ ہی کی جانب رجوع ہونا چاہیئے اور اُسی سے التجا کرنی چاہیئے کہ وہ ثابت قدم رکھے اور استقامت بخشے۔

عزیز مصر کی بیوی اور حسین و جمیل مصری عورتوں کی ترغیبات اور اُنکی مرضیات پوری نہ کرنے پر قید کی دھمکیاں اور پھر قید و بند کے مصائب، اِن تمام حالات میں حضرت یوسف علیہ السلام کا اعتماد اور اُن کی دُعاؤں اور التجاؤں کا مرکز صرف ایک ہی اللہ بزرگ و برتر کی ذات تھی۔ تذکرہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا یہ پہلو استقامت (ثابت قدمی) کا بہترین نمونہ ہے۔

عزتِ نفس

خود اعتمادی انسان کے بلند اوصاف میں ایک بڑا وصف ہے۔ اللہ تعالےٰ نے جس کسی کو یہ دولت بخش دی وہی دنیا کے مصائب و آلام سے گزر کر دنیوی اور دینی بلندی حاصل کرتا ہے۔ خود اعتمادی کی مختلف اقسام میں ایک قسم "عزتِ نفس" بھی ہے جو شخص خودداری اور عزتِ نفس سے محروم ہے وہ انسان نہیں ایک مضغۂ گوشت ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی عزتِ نفس کا یہ عالم ہے کہ برسوں کی مظلومانہ قید بندی سے رہائی کا حکم ملا تو مسرّت و شادمانی کے ساتھ فوراً اُسکو لبیک نہیں کہا بلکہ صاف انکار کر دیا کہ میں اُس وقت تک قید خانے سے باہر نہیں آؤں گا تاوقتیکہ یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ مصری عورتوں نے مکر و فریب سے جس قسم کا معاملہ میرے ساتھ کیا تھا اُسکی اصل حقیقت کیا ہے؟

جب حقیقت واضح ہوگئی تو عزت و سرفرازی کے ساتھ قید خانے سے باہر آئے اسی کا نام عزتِ نفس ہے۔

حقیقتِ صبر

صبر ایک عظیم الشان خصلت ہے جو بہت سی بُرائیوں کے لئے سپر اور ڈھال کا کام دیتا ہے۔ قرآن حکیم میں ستّر سے زائد مقامات پر اسکی فضیلت کا اعلان آیا ہے اور بہت سے مراتب و درجات کا مدار اسی فضیلت پر رکھا گیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کو نصف ایمان قرار دیا ہے۔ صبر کے لفظی معنی تنگی اور ناخوشگواری کی حالت میں اپنے کو روکے رہنے کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں نفس کو عقل پر غالب نہ آنے دیا جائے اور قدم دائرہ شریعت سے باہر نہ نکالا جائے۔ صبر کی مختلف اقسام ہیں۔ یعنی جن اشیاء کی جانب صبر کو منسوب کیا جاتا ہے اُس کے مختلف نام ہو جاتے ہیں:۔

(۱) اگر بطن و شرمگاہ کی ناجائز خواہشات کے مقابلہ میں صبر کیا جائے تو اس کا نام "عِفّت" قرار پاتا ہے۔

(۲) اگر دولت و ثروت کی فراوانی میں صبر کیا جائے یعنی بُخل و تکبّر سے پرہیز کیا جائے تو اس کو "ضبطِ نفس" کہا جاتا ہے۔

(۳) اگر میدانِ جنگ اور اس قسم کے خطرناک حالات پر صبر ہے تو اس کو "شجاعت" کہا جاتا ہے۔

(۴) اگر غیظ و غضب کے حالات پر صبر کیا جائے تو اس کو "حُلم" کہا جاتا ہے۔

(۵) اگر حوادث زمانہ پر صبر کیا جائے تو اس کا نام "وُسعتِ صدر" (کشادہ دلی وحوصلہ مندی) کہا جاتا ہے۔

(۶) اگر دوسروں کے پوشیدہ عیوب پر صبر کیا جائے یعنی اسکو ظاہر نہ کیا جائے تو اس کا نام "شرافت" قرار پاتا ہے۔

(۷) اگر بقدرِ ضرورت معیشت پر صبر کیا جائے (یعنی جو مل جائے اسپر راضی رہنا اور افسوس نہ کرنا) اسکو "قناعت" کہا جاتا ہے۔

(۸) اگر لذائذ اور عیش پسندی کے مقابلے میں صبر ہو تو اس کا نام "زہد" قرار پاتا ہے۔

(۹) اگر گناہ و معصیت و نافرمانی پر صبر کیا جائے (یعنی احتیاط کی جائے) اس کا نام "تقوٰی" ہے۔

(۱۰) اگر مصیبتوں پر صبر ہے تو اس کا نام "صبر" ہی ہے۔

اللہ تعالےٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو صبر و رضا کے اِن تمام مراحل میں وہ

کمال عطا فرمایا تھا جسکو "مثلِ اعلیٰ" کہا جاتا ہے. مثلاً :-

(۱) برادرانِ یوسف کی ایذار رسانیوں پر صبر (۲) آزاد ہونے کے باوجود غلام بن جانے پر صبر (۳) عزیز مصر کی بیوی اور مصری عورتوں کی پُر فریب ترغیبات پر صبر (۴) قید خانے کے مصائب پر صبر (۵) عزیز مصر کی دولت وثروت کے وکیل بن جانے پر صبر (یعنی اظہارِ تکبّر سے پرہیز) (۶) ہر حالت میں زہد وقناعت کی زندگی بسر کی اور اس پر صبر کیا (۷) ایذار رسا بھائیوں کی ندامت کے وقت اختیارِ صبر یعنی وسعتِ قلب کا ثبوت دیا انھیں نہ صرف درگذر کر دیا بلکہ اکرام وعزت بھی عطا کی۔

آخری بات حضرت یوسف علیہ السلام کے اخلاق کریمانہ اور صفاتِ عالیہ کی مدحت ومنقبت کے لئے سب سے اہم وہ جملہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے حق میں ارشاد فرمایا ہے :-

الکریم ابن الکریم ابن الکریم ابن الکریم یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم (علیہم السلام) (الحدیث)

یعنی وہ سلسلۂ نسب جو چار پشتوں سے کرامتِ نبوت سے مستفیض ہے۔

اور ایک روایت میں اسطرح مذکور ہے :-

اکرمُ الناس یوسف نبی اللہ ابن نبی اللہ ابن نبی اللہ ابن ابراہیم خلیل اللہ (بخاری کتاب التفسیر)

لوگوں میں بزرگ تر یوسف نبی اللہ ابن نبی اللہ ابن نبی اللہ ابن خلیل اللہ ہیں۔

حقیقتِ خواب تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی رح لکھتے ہیں کہ انسانی نفس جس وقت نیند یا بے ہوشی کی وجہ سے ظاہری تدابیر سے فارغ ہو جاتا ہے تو اسکی قوتِ خیالیہ تیز ہو جاتی ہے اور اسمیں کچھ صورتیں دکھائی دیتی ہیں اسی کا نام خواب ہے۔

اسکی تین قسمیں ہیں جن میں سے دو بالکل باطل ولغو ہیں جنکی کوئی اصلیت نہیں ہوتی، تیسری قسم اپنی ذات کے اعتبار سے صحیح وصادق ہے مگر اس صحیح قسم میں بھی کبھی کچھ عوارض شامل ہوکر اسکو بھی فاسد اور ناقابل اعتبار کر دیتے ہیں۔

تفصیل اسکی یہ ہے کہ خواب میں انسان مختلف صورتیں اور واقعات دیکھتا ہے کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بیداری کی حالت میں جو صورتیں انسان دیکھتا ہے وہی خواب میں شکل بن کر نظر آجاتی ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شیطان کچھ صورتیں اور واقعات اسکے ذہن میں ڈال دیتا ہے خوش کرنے والے یا ڈرانے والے، یہ دونوں قسمیں باطل اور بے حقیقت ہیں ان کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔ پہلی قسم کو "حدیث النفس" اور دوسری قسم کو "تسویل شیطانی" کہا جاتا ہے۔

خواب کی تیسری قسم جو صحیح اور قابل اعتبار ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کا الہام ہے جو اپنے بندے کو خواب میں خبردار کرنے یا خوشخبری دینے کے لئے کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے خزانۂ غیب سے بعض چیزیں اسکے قلب و دماغ میں ڈال دیتا ہے۔ خواب میں دیکھی ہوئی ایسی چیزیں اصل وبنیاد رکھتی ہیں انہی کی تعبیر ممکن ہے۔

طبرانیؒ نے سند صحیح کے ساتھ ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

"مومن کا خواب ایک کلام ہے جس میں وہ اپنے رب سے شرف گفتگو حاصل کرتا ہے۔" (تفسیر مظہری)

قرآن حکیم کی ایک آیت لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ (یونس آیت ۶۴) کی تفسیر میں حضرت ابو الدرداءؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کیا ہے کہ بُشریٰ سے مراد اچھے خواب ہیں جسکو مسلمان دیکھتا ہے یا کسی کو دکھایا جاتا ہے (ترمذی شریف)

اس لئے صرف وہ خواب صحیح طور پر الہام من اللہ اور حقیقت ثابتہ ہوگا جو اللہ کی طرف سے ہو اور اسمیں کچھ عوارض شامل نہ ہوں اور اسکی تعبیر بھی صحیح دی گئی ہو۔

انبیاء علیہم السلام کے سب خواب ایسے ہی ہوتے ہیں اس لئے اُن کے

خواب بھی وحی الٰہی کا درجہ رکھتے ہیں۔

لیکن عام مسلمانوں کے خواب ہر طرح کا احتمال رکھتے ہیں اس لئے وہ کسی کے لئے حجت اور دلیل نہیں ہوتے۔ اِن خوابوں میں بعض اوقات طبعی اور نفسانی صورتوں کی آمیزش ہو جاتی ہے اور بعض اوقات گناہوں کی ظلمت و کدورت صحیح خواب پر چھا کر اس کو ناقابل اعتبار بنا دیتی ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات تعبیر سمجھ میں نہیں آتی۔
خواب کی یہ تینؔ قسمیں جو ذکر کی گئیں ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں:۔

"آپؐ نے ارشاد فرمایا خواب کی تین قسمیں ہیں ایک قسم شیطانی ہے جسمیں شیطان کی طرف سے کچھ صورتیں ذہن میں آجاتی ہیں۔

دوسری قسم وہ جو آدمی اپنی بیداری میں دیکھتا رہتا ہے وہی صورتیں خواب میں آجاتی ہیں۔

تیسری قسم جو صحیح اور حق ہے وہ نبوّت کے اجزاء میں سے چھیالیسواں جُزء ہے یعنی اللہ تعالےٰ کی طرف سے الہام ہے۔

خواب کی تیسری قسم جو حق اور صحیح ہے اسکو نبوت کا ایک جزء قرار دیا گیا ہے۔

صحیح بخاری میں ایک روایت ہے لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتِ۔ یعنی آئندہ نبوت باقی نہ رہے گی سوائے مبشرات کے، صحابہؓ نے پوچھا مبشرات سے کیا مراد ہے آپ نے ارشاد فرمایا "سچے خواب"! (بخاری)

بعض روایات میں خواب کو نبوت کا چالیسواں حصہ قرار دیا گیا ہے اور بعض میں چھیالیسواں اور بعض میں اُنچاسواں حصّہ اور بعض میں ستّرواں حصہ ہونا منقول ہے۔
یہ سب روایتیں تفسیر قرطبیؒ میں جمع کر کے مشہور محدث ابن عبد البرؒ کی یہ تحقیق نقل کی گئی ہے کہ اس اختلاف میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ہر روایت اپنی جگہ درست صحیح مفہوم رکھتی ہے۔ عود کا ایک اختلاف خواب دیکھنے والے کے مختلف حالات کی بنا پر ہے جو شخص سچائی، امانت، دیانت اور کمال ایمان کے ساتھ متصف ہو گا اس کا خواب نبوت کا چالیسواں حصہ ہو گا اور جو اِن اوصاف میں کچھ کم ہے اسکا چھیالیسواں

یا اُنچاسواں یا پچاسواں حصہ ہوگا اور جو اس سے کم ہے اُس کا خواب نبوت کا سترواں حصہ ہے۔ واللہ اعلم۔

یہاں یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ سچے خواب کا جزءِ نبوت ہونا کیا مراد رکھتا ہے؟ تفسیرِ مظہری میں اسکی ایک توجیہہ یہ بیان کی گئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحیٔ نبوت کا سلسلہ ۲۳ سال جاری رہا ان تیئیس سال کو ششماہی میں تقسیم کر دیا جائے تو چھیالیس ششماہی بنتے ہیں۔ نبوت کی پہلی ششماہی میں (تقریباً تین سال) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی الٰہی اکثر بصورت خواب آیا کرتی تھی اور بقیہ پینتالیس ششماہیوں میں یہی وحیٔ نبوت حضرت جبرئیل امین کے پیغام رسانی کی صورت میں آئی اس حساب سے نبی کریم کے سچے خواب وحی نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہوئے اور چالیسواں حصہ ہونے کی یہ توجیہہ کی گئی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف جب چالیس سال کی ہوئی اُس وقت آپ کو وحیٔ نبوت سے سرفراز کیا گیا اس سے پہلے آپ کو بکثرت خواب نظر آتے تھے جو دن کی روشنی میں سچے ثابت ہوتے تھے اس لحاظ سے بعض روایات میں سچے خوابکو نبوت کا چالیسواں حصہ کہا گیا۔ اور جن روایات میں کم و بیش عدد مذکور ہیں اسکو کلام تقریبی پر محمول کیا گیا ہے یا پھر وہ روایات سنداً متکلم فیہ ہیں۔ واللہ اعلم۔

امام قرطبیؒ نے ایک اور لطیف توجیہہ کی ہے لکھتے ہیں کہ خواب میں بعض اوقات انسان ایسی چیزیں دیکھتا ہے جو اس کی قدرت میں نہیں مثلاً یہ دیکھے کہ وہ آسمان پر اُڑ رہا ہے، یا غیب کی ایسی چیزیں دیکھ رہا ہے جن کا علم حاصل کرنا اُس کی قدرت میں نہ تھا تو اس کا یہ دیکھنا یا جاننا بجز امداد و الہام الٰہی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا جو اصل میں نبوت کا خاصہ ہے اسلئے سچے خواب کو نبوت کا جزء کہا گیا ہے۔

یہ ساری بحث تو نبی کے خواب کے بارے میں واضح ہے لیکن غیر انبیاء کے خواب نہ نبوت ہیں اور نہ نبوت کا حقیقی جزء۔ البتہ سچے ہونے میں نبی کے خواب سے مشابہت رکھتے ہیں اس لئے ایسے خواب کو جزءِ نبوت کہا گیا۔

ایک تیسری توجیہہ اور بھی ممکن ہے وہ یہ کہ حدیث بخاری میں سچے خوابوں کو مبشرات (خوشخبری دینے والے) کہا گیا ہے۔ حدیث کے یہ الفاظ ہیں :-

لَمْ یَبْقَ مِنَ النُّبُوَّۃِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ (الحدیث)

یعنی نبوت کا کوئی جزء سوائے مبشرات کے باقی نہ رہا۔

صحابۂ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ مبشرات کیا ہیں؟

ارشاد فرمایا سچے خواب۔ (بخاری)

ابتداءِ نبوت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بکثرت یہ مبشرات آیا کرتے تھے جس کا سلسلہ بعد میں کم ہوگیا۔ چونکہ یہ بلند حالت نبوت سے متعلق رہی ہے اس لئے سچے خوابوں کو نبوت کا جزء کہا گیا۔

اس تفصیل میں یہ بات اچھی طرح ملحوظ رہنی چاہیئے پوری امتِ اسلامیہ کا متفق عقیدہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ قرآن حکیم میں آپکو خاتم النبیین کہا گیا اور آپ کو قیامت تک کے تمام انسانوں کا ہادی و رسول کہا گیا ہے:- وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا۔ (الآیۃ)

اس لئے کوئی یہ نہ سمجھے کہ کسی چیز کا ایک جزء ہونے سے اُس چیز کا موجود ہونا لازم نہیں آتا۔ اگر کسی شخص کا ایک بال یا ایک ناخن کہیں موجود ہو تو کوئی معمولی سی عقل رکھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا اور نہ سمجھ سکتا کہ یہاں وہ شخص موجود ہے۔

مشین کے بہت سے کل پُرزوں میں سے اگر کسی کے ہاں ایک پُرزہ ہو یا ایک اسکرُو موجود ہو اور وہ عقل مند کہنے لگے کہ میرے پاس فلاں مشین موجود ہے تو دنیا بھر کے انسان اسکو جھوٹا یا فریب خوردہ یا بیوقوف کہیں گے۔

سچے خواب حسبِ تصریح حدیث بلاشبہ جزءِ نبوت ہیں، مگر نبوت نہیں، نبوت تو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے۔

ایسے ہی ایک اور وضاحت بھی ضروری ہے۔ سچے خواب کو جیسا کہ احادیث میں بشارت یا تنبیہ کا نام دیا گیا ہے اس کی حقیقت اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ ایسا خواب نہ خود دیکھنے والے کے حق میں حجت ہے نہ دوسروں کے لئے۔

بعض ناواقف لوگ ایسے خواب دیکھ کر طرح طرح کے وساوس میں مبتلا ہوجاتے ہیں اسکو کوئی اپنی بزرگی اور ولایت کی دلیل سمجھنے لگتا ہے تو کوئی اس سے حاصل ہونے والی بات کو شرعی احکام کی طرح درجہ دینے لگتا ہے۔

یہ سب باتیں بے بنیاد ہیں خصوصاً جب یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سچے خوابوں میں بعض دفعہ نفسانی یا شیطانی اثرات کی آمیزش کا بھی احتمال ہے۔

حدیث صحیح میں خواب کی جو حقیقت بیان کی گئی ہے وہی اُسکی حقیقی حیثیت ہے یعنی خوشخبری دینے والے خواب، اس سے بہتر اسکی اور کوئی وضاحت ممکن نہیں۔

جامع ترمذی اور ابن ماجہ میں ایک روایت موجود ہے جسمیں یہ صراحت ملتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب کی تین قسموں کا بیان کیا ہے:۔

"ایک اللہ کی طرف سے بشارت۔
دوسرے نفسانی خیالات۔
تیسرے شیطانی تصورات۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے بچپن میں جو خواب دیکھا تھا، یا عزیز مصر نے قحط سالی کو سات عدد موٹی گائیوں اور سات عدد دُبلی گائیوں کی شکل میں دیکھا تھا یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ اُحد کے موقعہ پر ارشاد فرمایا تھا میں نے خواب دیکھا کہ میری تلوار ٹوٹ گئی ہے اور دیکھا کہ کچھ گائیں ذبح ہو رہی ہیں جسکی تعبیر آپؐ نے حضرت حمزہؓ کی شہادت اور بہت سے مسلمانوں کی شہادت قرار دی۔ جو بہت بڑا حادثہ تھا چنانچہ غزوۂ اُحد میں حضرت حمزہ رضؓ کے علاوہ ستر صحابہ شہید ہوئے"۔

اس قسم کے جملہ خواب بشارت اور الہام من اللہ کی قسم سے ہیں۔ خواب کی حقیقت اور اُس کے اقسام کے بعد یہ بات بھی سمجھنی چاہیئے کہ خواب کوئی خواب و خیال کی بات نہیں ہے جیسا کہ بعض نادان لوگ کہہ دیا کرتے ہیں بلکہ سچے خواب کی حقیقت بڑی گہری ہوتی ہے اور بعض خواب صبح روشن کی طرح ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک بات یہی کافی ہے کہ تعبیر خواب کا علم، علوم انبیاء میں شمار کیا گیا ہے اور مستقل طور پر یہ علم سیدنا یوسف علیہ السلام کو عطا کیا گیا تھا، اگر خواب کوئی حقیقت نہ ہوتا تو علم تعبیر کا کیا مطلب ہوتا؟ اور وہ علوم نبوت کیوں قرار پاتا؟

یہی وجہ ہے کہ احادیث میں یہ ہدایات ملتی ہیں کہ اپنا خواب ہر کس و ناکس سے بیان نہ کیا جائے بلکہ ایسے شخص سے بیان کیا جائے جو نیک و متقی اور مخلص قسم کا ہو

اور وہ علم تعبیر سے مناسبت بھی دکھتا ہوتا کہ وہ غلط تعبیر دے کر خواب کا اثر ضائع نہ کر دے، کیوں کہ حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے کہ خواب معلق رہتا ہے جب تک کہ تعبیر نہ دی جائے اور جب تعبیر دے دی جاتی ہے تو حقیقت بن جاتا ہے۔

حدیث کے یہ الفاظ ہیں:۔

اَلرُّؤْیَا عَلٰی رَجُلٍ طَائِرٌ مَا لَمْ تُعَبَّرْ فَاِذَا عُبِّرَتْ وَقَعَتْ (اَیْ وقعت کما عبرت) (رواہ ابوداؤد)

اس حدیث میں خاص طور پر یہ نکتہ ظاہر کیا گیا ہے کہ جیسی تعبیر دی جائیگی ویسے ہی واقع ہوگی اور یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ پہلی تعبیر ہی خواب کی حقیقت ہوتی ہے اس لئے خواب کو ہر کس و ناکس سے بیان نہ کرنا چاہیئے۔

زمانۂ نبوّت میں ایک شخص نے خواب دیکھا کہ وہ چار پائی (پلنگ) کو نگل گیا ہے اُس نے اپنے ایک دوست سے یہ خواب بیان کیا اُس دوست نے مزاحاً کہہ دیا تو پھر تیرا پیٹ پھٹ گیا۔ کچھ دیر بعد اُسکی موت واقع ہوگئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو آپؐ نے ارشاد فرمایا اُس کے دوست کی تعبیر نے اسکو ہلاک کر دیا۔ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا اُس خواب کی یہ تعبیر نہ تھی جو بیان کی گئی بلکہ اُس خواب میں اشارہ تھا کہ اس شخص کی شہرت اطرافِ عالم میں پھیل جائیگی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے کسی موقعہ پر ایک شخص کے خواب کی تعبیر بیان کی اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:۔

اَصَبْتَ بَعْضًا وَاَخْطَأْتَ بَعْضًا (بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد)

"اے ابوبکرؓ تم نے تعبیر کا بعض حصہ صحیح بیان کیا اور بعض میں غلطی کی۔"

اس حدیث سے تعبیر خواب کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔

حقیقتِ نظر | حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے لڑکوں کے دوسرے سفرِ مصر کے وقت خصوصیت سے یہ وصیت فرمائی تھی کہ اے بیٹو! جب تم شہر مصر میں داخل ہونے لگو تو شہر کے ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ متفرق ہوکر

مختلف دروازوں سے ہونا۔ عام مفسرین قدیم وجدید نے اسکی معقول وجہ یہی بیان کی ہے کہ چونکہ یہ سب گیارہ بھائی صحت مند، قدآور، صاحب جمال اور صاحب وجاہت تھے کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کی بد نظر لگ جائے اور انھیں کوئی نقصان ہو جائے۔

نظر لگنا اور اس سے کوئی تکلیف یا نقصان پہنچ جانا ایک مسلّمہ حقیقت ہے محض جاہلانہ وہم وخیال کی بات نہیں جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسکی تصدیق فرمائی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ نظر بد ایک انسان کو قبر میں اور اونٹ کو ہنڈیا میں داخل کر دیتی ہے۔ مطلب یہ کہ نظر بد کا اثر موت کے قریب کر دیتا ہے۔

حدیث بخاری ومسلم میں بکثرت احادیث اس سلسلے میں منقول ہیں۔ ایک حدیث صحیح میں یہ جملہ بھی ملتا ہے :-

وَمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَامَّۃٍ۔

یعنی میں پناہ مانگتا ہوں نظر بد سے (قرطبی)

صحابہ کرام میں ایک صحابی رسول ابوسہل بن حنیفؓ کا واقعہ معروف ومشہور ہے وہ ایک موقعہ پر غسل کرنے کے لئے کپڑے اُتارے اُنکے نرم ونازک سفید بدن پر عامر بن ربیعہؓ کی نظر پڑگئی اور اُن کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ آج تک اتنا حسین بدن کسی کا نہیں دیکھا۔ اسکے بعد حضرت سہل بن حنیفؓ کو سخت بخار چڑھ گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اسکی اطلاع ہوئی آپ نے یہ علاج تجویز فرمایا کہ عامر بن ربیعہؓ کو حکم دیا جائے کہ وہ وضو کریں اور وضو کا پانی کسی برتن میں جمع کریں پھر یہ پانی سہل بن حنیفؓ کے بدن پر ڈال دیا جائے، چنانچہ ایسے ہی کیا گیا تو بخار فوراً اُتر گیا اور وہ بالکل تندرست ہو کر جس مہم پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جارہے تھے روانہ ہو گئے۔ اس واقعہ پر آپؐ نے عامر بن ربیعہؓ کو یہ تنبیہہ فرمائی تھی :-

عَلَامَ یَقْتُلُ اَحَدُکُمْ اَخَاہُ اَلَّا بَرَّکْتَ اِنَّ الْعَیْنَ حَقٌّ۔ (الحدیث)

"کوئی شخص اپنے بھائی کو کیوں قتل کرے، تم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ جب ان کا بدن تمہیں خوب صورت نظر آیا تو برکت کی دعا کر دیتے،

نظر کا ہونا حق بات ہے۔

بعض احادیث میں ہے کہ کسی اچھی چیز کو دیکھ کر مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہنے سے نظر بد کا اثر چلا جاتا ہے اور نظر نہیں لگتی۔

عقلی طور پر بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نظر اور خیال کو حالات کے بدلنے اور متغیر کرنے میں کافی دخل اور تعلق ہے۔ انسان کی قوتِ خیالیہ میں اتنا زور اور اثر ہے کہ وہ اشیاء پر اپنا زبردست اثر چھوڑتی ہے حتیٰ کہ بعض اوقات اسی اثر کے نتیجے میں چیزوں کی شکلیں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر کسی انسان کی غضبناک آنکھیں اپنے پورے غیظ و غضب کے ساتھ کسی دوسرے انسان پر پڑ جاتی ہیں تو یہ خوف زدہ ہو کر کانپنے لگتا ہے حالانکہ اس شخص پر کوئی ظاہری عمل واقع نہیں ہوا لیکن انسان کی عام حالت میں ایک تبدیلی آجاتی ہے اور چہرے کا رنگ و روپ بدل جاتا ہے بسا اوقات انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے اور آپ نے یہ بھی سُنا ہوگا کہ بعض دفعہ موت واقع ہوگئی۔ یہ زبردست انقلاب اُسی غضبناک نظروں ہی کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے اور غضبناک اپنی ذات میں نہ کوئی جسم ہے اور نہ کوئی ظاہری عمل صرف ایک نظر ہے جس نے اپنی قوت و طاقت سے ایک عجیب و غریب شکل پیدا کر دیا۔

اسی طرح کسی خوفزدہ اور سہمے ہوئے انسان پر کوئی محبت و پیار سے نظر ڈالے اور زبان سے کچھ نہ کہے تو اُسکی نظرِ کرم کا اثر فوری طور پر اُسکے خوف و ہراس کو دُور کر کے چہرے کی رونق کو واپس لے آتا ہے۔ یہاں بھی اُسی نظر کا اثر ہے جس نے یہ تغیّر پیدا کر دیا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات جان بلب انسان جو خوف کے مارے نیم مُردہ ہو چکا تھا صرف نظرِ عنایت کے باعث اُٹھ کھڑا ہوا۔

یہ سب نظر و خیال ہی کے کرشمے ہیں۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے جن اشیاء کو بھی پیدا فرمایا ہے اُن میں کچھ نہ کچھ خاصیتیں رکھی ہیں۔ انسان کے جسم میں آنکھ اور زبان وغیرہ ایسے عضو ہیں جن میں ہزار ہا تاثیریں پوشیدہ ہیں۔

سحر اور مسمریزم کے تصرفات بھی انہی اسباب عادیہ میں سے ہیں جہاں نظر و خیال کی قوت سے بڑے بڑے انقلابات معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ان میں بھی کوئی اپنی ذاتی تاثیر نہیں ہوتی بلکہ یہ سب اسباب اللہ تعالیٰ کی قدرتِ مُطلقہ اور مشیتِ کاملہ کے

تابع ہیں، تقدیر خداوندی کے مقابلہ میں نہ کوئی تدبیر مفید ہوسکتی ہے نہ کوئی مُضر، اسلئے حدیث کا یہ ارشاد کہ نظر کا لگ جانا ایک حقیقت ہے۔ اسی معنی میں استعمال کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر بدنظری کا اثر فوری ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر تدبیر کامیاب ہوجائے۔

تفسیر وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا

تذکرہ سیدنا یوسف علیہ السلام میں ایک عظیم ابتلا و آزمائش کا ذکر آچکا ہے کہ عزیز مصر کی بیوی نے گھر کے دروازے بند کر کے اِن کو گناہ کی طرف بُلانے کی کوشش کی اور اپنی طرف راغب کرنے کے لئے سارے اسباب جمع کر دیئے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے عین اس وقت اپنی حجت و برہان حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے کر دی جس کی وجہ سے وہ زلیخا سے پیچھا چھڑا کر بھاگ نکلے اور گھر سے باہر ہو گئے۔ اس نازک موقعہ پر قرآن حکیم نے پُر خطر صورتِ حال کو اس جملہ سے ادا کیا ہے:۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا (سورۂ یوسف آیت ۲۴)

اور البتہ عورت نے فکر کیا اُس کا اور اُس نے فکر کیا عورت کا۔

اس آیت میں لفظ "ھَمّ" جسکے معنی خیال و فکر اور ارادہ کے ہیں زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام دونوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس آیت کے بعد والی آیت میں اس کشمکش کا اختتام اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ عورت کے اصرار سے نجات پانے کیلئے حضرت یوسف علیہ السلام دوڑے اور دروازے سے باہر ہو گئے۔

اس حقیقت کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام گُناہ تو کیا کرتے ارادہ بھی نہیں کیا بلکہ ارادے کے خلاف عمل کیا اور باہر نکل آئے۔ اس سیاقِ کلام کو پیشِ نظر رکھ کر "ھَمّ" والی آیت کا ترجمہ کیا جائے تو سوائے اسکے اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ

"اور اُس عورت نے اُن کا (پورا) ارادہ کرلیا اور (قریب تھا کہ) وہ بھی اُس کا ارادہ کرتے اگر اپنے رب کی دلیل کو اُنھوں نے نہ دیکھا ہوتا۔"

یا یہ ترجمہ ہوگا:۔

"اور اُس عورت نے اُن کا ارادہ کیا اور (اُسکے شدید اصرار پر) یوسفؑ کے (دل میں) اُس کا خیال آتا اگر اپنے رب کی دلیل کو انھوں نے نہ دیکھا ہوتا۔"

اس تشریح سے واضح ہوا کہ زلیخا کا ھَمّ اور تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کا ھَمّ اور۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو جو خیال پیدا ہوا وہ گناہ کا خیال نہ تھا۔ عربی زبان میں لفظ ھَمّ دو معنی کے لئے بولا جاتا ہے۔ ایک کسی کام کا قصد و ارادہ کرلینا، دوسرے محض دل میں خیال و وسوسہ پیدا ہونا۔ پہلی صورت گناہ کی ہے۔ دوسری صورت گناہ کی نہیں یہ ایسے ہی جیسے موسم گرما کے روزوں میں ٹھنڈے پانی کی طرف طبعی میلان اور خیال آجاتا ہے۔ حالانکہ روزے میں پینے کا ارادہ قطعاً نہیں ہوتا۔ اس قسم کا خیال نہ انسان کے اختیار میں ہے نہ اس پر کوئی مواخذہ ہے اور نہ کوئی گناہ ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا ھَمّ ایسے ہی تھا۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

"اللہ تعالےٰ نے میری امت کے لئے گناہ کے وسوسے اور خیال کو معاف کردیا ہے جبکہ وہ اس پر عمل نہ کرے۔ (قرطبی)

امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں لفظ ھَمّ کا دونوں معنوں میں استعمال عرب کے محاورات اور اشعار کی شہادتوں سے ثابت کیا ہے۔ نیز اسی آیت میں بھی خود یہ فرق اشارۃً موجود ہے۔ اگر دونوں کا ھَمّ ایک طرح کا ہوتا تو اس جگہ علیحدہ علیحدہ بیان کرنے کے بجائے یکجا اس طرح بیان ہوتا وَلَقَدْ ھَمَّا (اور دونوں نے ارادہ کیا) اس تعبیر کو چھوڑ کر الگ الگ وَلَقَدْ ھَمَّتْ بِہٖ وَھَمَّ بِھَا بیان کیا گیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا ھَمّ (ارادہ) جُدا جُدا تھا۔

اس تفسیر کی مزید تائید یہ بھی ہے کہ زلیخا کے ھَمّ کو (لقد) لام اور قَد کے ساتھ ظاہر کیا گیا جو تاکیدِ کلام کے لئے آتا ہے جو معنی میں تاکید اور پختگی پیدا کرتا ہے۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کے ھَمّ میں یہ تاکید نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ھَمّ ویسا نہیں تھا جیسا کہ زلیخا کا ھَمّ تھا۔

خلاصہ کلام یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں جو خیال یا فکر پیدا

ہوا وہ محض غیر اختیاری وسوسہ کے درجے میں تھا جو قطعاً گناہ نہیں ہے۔ پھر اس وسوسہ کے خلاف حضرت یوسف علیہ السلام کا عمل کرنا اللہ کے نزدیک اِنکے درجے کی بلندی کا باعث ہوا۔

ایک اور تفسیر بھی بیان کی گئی ہے جو قرآن کے اسلوب و بیان کے بہت قریب ہے۔ پوری آیت اس طرح ہے :۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ۔

ترجمہ اس طرح ہوگا :۔

"اور البتہ اُس عورت نے یوسفؑ کا ارادہ کیا اور یوسف بھی عورت کا ارادہ کرتے اگر اپنے پروردگار کے بُرہان کو نہ دیکھے ہوتے۔"

مطلب یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی خیال پیدا ہوجاتا اگر اللہ کی حُجّت و بُرہان کو نہ دیکھتے۔ لیکن بُرہانِ رب کو دیکھنے کی وجہ سے وہ اس ھَمّ اور خیال سے بھی بچ گئے۔ یہ بات بالکل واضح ہے۔ البتہ اس صورت میں کلام کے اندر جملوں کی تقدیم و تاخیر ماننا پڑے گا۔ اور یہ کوئی نادر بات یا محاورہ عرب کے خلاف بھی نہیں۔ خود قرآن حکیم میں اسکی نظیر موجود ہے۔

اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا۔

(القصص آیت ۱۰)

لہٰذا مذکورہ عبارت قرآنی میں عام قواعدِ عربی کے لحاظ سے کلام اس طرح ہوگا۔

لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ لَقَدْ هَمَّ بِهَا۔

"اگر یوسف بُرہانِ رب نہ دیکھے ہوتے تو البتہ ارادہ کرجاتے۔

(روح المعانی)

چونکہ بُرہان رب دیکھ لیا تھا اس لئے ارادہ و خیال تک نہ کرسکے۔ اس تفسیر کی رو سے ھَمّ (ارادے) کی نفی ہوگی۔

دونوں تفسیروں کی بنیاد پر بہرحال یہ مشترکہ حقیقت مل جاتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام بُرے ارادے سے دُور رہے، اور اللہ کا کلام یہی ظاہر بھی کرنا چاہتا ہے۔

قرآن حکیم نے یہ واضح نہیں کیا کہ "برہانِ رب" جو حضرت یوسف علیہ السّلام کے سامنے آئی کیا چیز تھی؟

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، امام مجاہدؒ، سعید بن جبیرؒ، محمد بن سیرینؒ، امام حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے بطور معجزہ اُس خلوت گاہ میں حضرت یعقوب علیہ السّلام کی صورت اس طرح سامنے کر دی کہ وہ اپنی اُنگلی دانتوں سے دبائے کھڑے ہیں اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ عزیز مصر کی صورت اُن کے سامنے کر دی گئی۔ اور بعض دیگر نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السّلام کی نظر اچانک چھت کی طرف اُٹھی تو یہ آیت لکھی نظر آئی :-

لَا تَقْرَبُوا الزِّنَآ اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَّسَآءَ سَبِیْلًا۔

"یعنی زنا کے پاس نہ جاؤ کیونکہ وہ بڑی بے حیائی کا کام ہے اور نہایت بُرا راستہ ہے۔" (بنی اسرائیل آیت ۳۲)

اور بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السّلام کی نبوت و رسالت خود برہان رب تھی۔

امام تفسیر ابن جریرؒ نے اِن تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد جو بات تحریر فرمائی ہے وہ اہل تحقیق کی نگاہوں میں پسندیدہ نظروں سے دیکھی گئی ہے۔

لکھتے ہیں کہ جتنی بات قرآن حکیم نے بتلا دی ہے صرف اسی حد تک اکتفا کرنا چاہیئے، یعنی یہ کہ حضرت یوسف علیہ السّلام نے کوئی ایسی چیز دیکھی جس سے دل کا وسوسہ جاتا رہا۔ اس چیز کی تعیین میں وہ سب احتمال ہو سکتے ہیں جو مفسرین کرام نے ذکر کئے ہیں لیکن قطعی طور پر کسی ایک چیز کو متعین نہیں کیا جا سکتا۔ (ابن کثیر)

یہ مسئلہ عصمتِ انبیاء قرآن و سنت سے ثابت ہونے کے علاوہ عقلاً بھی اس لئے ضروری ہے کہ اگر انبیاء کرام سے گناہ سرزد ہو جانے کا امکان و احتمال رہے تو اِن کے لائے ہوئے دین اور وحی پر اعتماد کا کوئی راستہ نہیں رہتا اور ان کی بعثت اور ان پر کتاب نازل کرنے کا کوئی فائدہ باقی نہیں رہتا۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے اپنے ہر پیغمبر کو ہر گناہ سے معصوم رکھا ہے۔

قرآن حکیم نے انبیاء علیہم السلام کو "مُخلَصین" کے عنوان سے تعبیر کیا ہے۔
مُخْلَص (بفتح لام) کے منتخب کے معنی میں آتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے کارِ رسالت اور وحی اور اصلاح خلق کے لئے جن افراد کو اپنی جانب سے انتخاب فرماتا ہے وہ مخلَصین کہلاتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ ہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

اِنَّہٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ. (یوسف آیت ۲۴)
وہ ہمارے منتخب بندوں میں سے ایک ہیں۔

ایک عبرت

جن دنوں حضرت یوسف علیہ السلام جیل میں محبوس تھے جیل کے افسر یا قیدیوں میں سے کسی نے آپ سے اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کیا کہ ہمیں آپ سے بہت محبت ہے۔
حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:-
"محبت صرف اللہ سے کرو، جب کسی نے مجھ سے محبت کی تو مجھ پر آفت ہی آئی، بچپن میں میری پھوپی کو مجھ سے محبت تھی اسکے نتیجے میں مجھ پر چوری کا الزام لگا، پھر میرے والد نے مجھ سے محبت کی تو بھائیوں کے ہاتھوں کنوئیں میں گرا، پھر غلامی اور جلا وطنی میں مبتلا ہوا، اب عزیز مصر کی بیوی نے مجھ سے محبت کی تو اس جیل میں۔" (ابن کثیرؒ مظہری)

ایک نصیحت

"عالم و مقتدا کو جہاں اپنے عمل و کردار کی حفاظت ضروری ہے وہاں اسکی بھی فکر ہونی چاہیئے کہ اس کی طرف سے لوگوں میں بدگمانی پیدا نہ ہو، اگرچہ یہ بدگمانی سراسر غلط اور بے جا ہی کیوں نہ ہو، ایسی صورت سے بھی بچنے کی تدبیر کرنی چاہیئے۔ بدگمانی خواہ کسی جہالت یا کم فہمی ہی کے سبب سے ہو بہرحال ان کی دعوت و تبلیغ کے کام میں خلل انداز ہوتی ہے۔ پھر لوگوں میں ان کی بات کا وزن نہیں رہتا۔" (قرطبی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تہمت کے مواقع سے بھی بچو، یعنی ایسے حالات اور مواقع سے بھی اپنے آپ کو بچایا جائے جہاں کسی کو تہمت لگانے کا موقعہ ہاتھ آئے۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تمام عیوب اور گناہوں سے معصوم ہیں اپنے لئے بھی اس احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے ایک مرتبہ ازواج مطہرات میں سے ایک بی بی آپؐ کے ساتھ کسی کھلی جگہ مصروفِ گفتگو تھیں ایک صحابی اتفاقاً اُدھر سے گزرنے لگے تو آپؐ نے اُنھیں طلب کیا اور فرمایا یہ میری بیوی (اُمّ سلمہؓ) ہیں۔ وہ سہم گئے اور عرض کیا یارسول اللہ کیا میں آپؐ پر کوئی بدگمانی کرسکتا ہوں؟

آپؐ نے یہ اس لئے فرمایا کہ کہیں دیکھنے والے کو کسی اجنبی عورت کا شُبہ نہ ہوجائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہائی اور شاہی دعوت کا پیغام ملنے کے باوجود رہائی سے پہلے اس بات کی کوشش فرمائی کہ لوگوں کے شُبہات دُور ہوجائیں، دعوت کا پیام لانے والوں کو صاف فرمادیا:۔

قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ الآیۃ (آیت ۵۰)

"جب شاہی فرستادہ یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا **تو کہا** اپنے آقا کے پاس واپس جا اور اُس سے پوچھ کہ اُن عورتوں کا کیا واقعہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ خود کاٹ لئے تھے۔ میرا رب تو ان کے مکروفریب سے خوب واقف ہے۔"

بُرا دوست

"ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے دریافت فرمایا ایسے رفیق کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جس کا یہ حال ہو کہ اگر تم اُسکا اعزاز واکرام کرو، کھانا کھلاؤ، کپڑا پہناؤ تو وہ تمہیں بلا اور مصیبت میں ڈال دے، اور اگر اسکی توہین کرو، بھوکا ننگا رکھو تو وہ تمہارے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے۔؟

صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ اس سے زیادہ بُرا تو دنیا

میں کوئی دوست نہیں ہوسکتا. آپؐ نے ارشاد فرمایا اُس ذات کی قسم جسکے دست قدرت میں میری جان ہے وہ تمہارا اپنا نفس ہے جو تمہارے پہلو میں ہے۔ (قرطبی)

حضرت یوسف علیہ السلام نے نفس کے تعلق سے فرمایا:۔

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیۡ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ۔

(آیت ۵۳)

"میں اپنے نفس کی برأت نہیں کرتا نفس تو بدی پر اُکسانے والا ہی ہے"

آیت مذکورہ میں نفس انسانی کو امّارہ (بُرائی پر اکسانے والا) ظاہر کیا گیا ہے۔

سورہ قیامہ میں اسی نفس انسانی کو لَوَّامَہْ (بُرائی پر ملامت کرنے والا) کا لقب دیا گیا ہے۔

سورۂ فجر میں اسی نفس انسانی کو مُطْمَئِنَّہْ (اطمینان والی روح) کا لقب دیکر جنت کی بشارت دی گئی۔

نفس کی یہ تین قسمیں قرآن حکیم نے بیان کی ہیں۔

توضیح اسکی یہ ہے کہ ہر نفس انسانی اپنی ذات میں اَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ (بُرے کاموں کا تقاضہ کرنے والا ہے لیکن جب انسان اللہ اور آخرت کے خوف سے اس کے تقاضے کو پورا نہ کرے تو اس کا نفس لَوَّامَہْ بن جاتا ہے یعنی بُرے کاموں پر ملامت کرنے والا اور اِن سے توبہ کرنے والا جیسا کہ نیک وصالحین کے نفوس ہوتے ہیں۔ اور جب کوئی انسان نفس کے خلاف مجاہدہ کرتے کرتے اپنے نفس کو اس حالت تک پہنچادے کہ بُرے کاموں کا تقاضہ بھی اسمیں نہ رہے تو وہ نفس مطمئنہ کہلاتا ہے۔ یہ کیفیت عموماً کثرتِ عبادت اور گناہوں سے سخت پرہیز کے بعد پیدا ہو جاتی ہے تاہم اس کیفیت کا ہمیشہ قائم رہنا یقینی نہیں ہوتا۔ اس لئے اس سے بے فکر ہوجانا سخت خطرہ پیدا کر دیتا ہے۔ صدیقین وصالحین کے نفوس عموماً ایسے ہی ہو جاتے ہیں لیکن انبیاء کرام کو عطاء خداوندی سے ایسا نفس مطمئنہ بغیر کسی سابقہ مجاہدہ کے نصیب ہو جاتا ہے اور وہ ہمیشہ اسی حالت پر قائم رہتا ہے اسمیں کسی قسم کا ضُعف یا تخلّف نہیں ہوتا۔ جس شخص کو نفس مطمئنہ

نصیب ہوجائے وہ بھی اللہ کی رحمت ہی کا نتیجہ ہے۔

پُر معنی خاموشی

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں یہ بات انتہائی حیرت انگیز ہے کہ ایک طرف تو اِن کے والد ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام ان کے فراق میں روتے روتے نابینا ہوگئے۔ دوسری جانب حضرت یوسف علیہ السلام چالیس سال کے طویل زمانے میں ایک مرتبہ بھی اپنی خیریت اور اطلاع کسی ذریعہ سے اُنھیں پہنچانے کی زحمت نہ کی جبکہ عزیز مصر کے گھر میں ہر طرح کی سہولت ممکن تھی، علاوہ ازیں جیل کی آٹھ دس سالہ زندگی میں بھی ایسا نہ سوچا اور خاص طور پر جب مصر کا اقتدار ہاتھ آیا اس وقت تو خود چل کر والد کی خدمت میں حاضری دیتے لیکن یہ بھی نہ کیا، حتیٰ کہ جب بھائی غلّہ لینے کے لئے آئے تو اِن کو بھی اصل واقعہ کے اظہار کئے بغیر رخصت کردیا۔

یہ تمام حالات کسی عام انسان سے بھی تصور نہیں کئے جاسکتے۔ جبکہ اللہ کے برگزیدہ رسول سے یہ صورت کیسے برداشت ہوئی؟

اس طویل اور حیرت انگیز خاموشی کا جواب غالباً یہی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنی حکمتِ خاص کے تحت حضرت یوسف علیہ السلام کو اس کے اظہار سے روک دیا ہوگا اور یہی جواب حضرت یعقوب علیہ السلام کے صبر کا ہے۔ تفسیر قرطبی میں اسکی یہ ہی وجہ لکھی ہے۔ واللہ اعلم۔

اللہ کی حکمتوں کو خود وہی جانے۔ انسان اِسکا کہاں ادراک کرسکتا ہے۔ کبھی کوئی چیز کسی کے سمجھ میں آجاتی ہے تو وہ اُسکو بیان کردیتا ہے ورنہ ہزار ہا امور ایسے ہیں جن کی حقیقت سے دنیا عاجز اور بے بس ہے لیکن وہ بعد میں ہی مفید ومناسب ظاہر ہوئی یہی وجہ تھی کہ اس واقعہ کے ابتداء ہی میں جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ اندازہ ہوچکا تھا کہ یوسف علیہ السلام کو بھیڑیے نے نہیں کھایا ہے بلکہ بھائیوں کی کوئی سازش ہے تو اس کا طبعی تقاضہ یہ تھا کہ اسی وقت جگہ پر پہونچتے اور تحقیق فرمالیتے۔ مگر اللہ تعالےٰ نے اُن کا دھیان اس طرف نہ جانے دیا اور پھر مدتوں کے بعد بیٹوں سے فرمایا:-

"جاؤ یوسف اور اسکے بھائی کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے

مایوس نہ ہو۔"
جب اللہ تعالےٰ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کے سب اسباب اسی طرح جمع کر دیتے ہیں کہ ایک چیز عدم سے وجود میں اور وجود سے عدم میں آجاتی ہے۔ اللہ کے قدرت قاہرہ کی یہی حقیقت ہے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ۔

انبیاء ورُسل کی قوّتِ ادراک

سورۂ یوسف آیت ۹۴تا۹۶ کا ترجمہ پھر یکبار پڑھیئے :-

"اور جب قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو اُن کے باپ (یعقوب علیہ السلام) نے (اپنے شہر کنعان میں) کہا میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں، تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں (کہ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہوں)
گھر کے لوگ بولے اللہ کی قسم آپ ابھی تک اپنے اُسی پرانے غلط خیال میں ہیں۔ پھر جب خوشخبری لانے والا آیا اُس نے یوسف علیہ السلام کا قمیص یعقوب علیہ السلام کے منہ پر ڈال دیا یکایک اُن کی بینائی لوٹ آئی، تب کہا میں تم سے کہتا نہ تھا بیشک میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

اس سے انبیاء علیہم السلام کی غیر معمولی قوتوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی قافلہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قمیص لے کر مصر سے چلا ہے اِدھر سینکڑوں میل کے فاصلے پر حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے گھر میں اُس کی مہک پا لیتے ہیں۔
انبیاء علیہم السلام کو یہ قوتیں اللہ کی بخشش و انعام کے طور پر بعض اوقات دے دی جاتی ہیں اور اللہ تعالےٰ جب اور جس وقت چاہتا ہے ان قوتوں سے کام کرنے کا موقعہ فراہم کرتا ہے۔ ایسی فوق البشر قوتیں کسی مخلوق کی ذاتی اور ابدی نہیں ہوتیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام برسوں مصر میں موجود رہے اور کبھی حضرت یعقوب علیہ السلام کو اِن کی خوشبو نہ آئی، دُور نہیں گھر کے قریب ہی بھائیوں نے کنویں

میں پھینک دیا تھا اِس کا احساس تک نہ ہوا۔ تین دن تک مظلومانہ کنویں میں پڑے رہے پر کوئی خبر نہ لے سکے۔

"شہر مصر سے کنعان کا فاصلہ اُس زمانے میں آٹھ دن کی مسافت پر تھا۔ (ابن عباسؓ)

اور حضرت حسن بصریؒ کے قول کے مطابق اسّی فرسخ تقریباً ڈھائی سو میل کا فاصلہ تھا۔ جب اللہ کی مشیّت و مرضی ہو جاتی ہے یکایک قوتِ ادراک کی تیزی کا یہ عالم ہو گیا کہ ابھی اُن کا قمیص مصر سے چلا ہے اور وہاں اُن کی مہک آنی شروع ہو گئی۔

فَسُبْحَانَ مَنْ لَّا يَمُوْتُ وَلَا يَغُوْثُ۔

شیخ سعدیؒ نے اس واقعہ کو اپنی رُباعی میں اس طرح ادا کیا ہے :-

یکے پُرسید از آں گم کردہ فرزند	ایک شخص نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے پوچھا
کہ اے روشن گُہر پیرِ خرد مند	اے روشن دل پیر خرد مند
چرا در چاہِ کنعانش نہ دیدی	آپنے اپنے بیٹے یوسف کو اپنے شہر کنعان کے میں کیوں نہ دیکھا
ز مصرش بوئے پیراہن شنیدی	جبکہ ملکِ مصر سے اُنکے قمیص کی خوشبو پائی ؟
بگفتا حالِ ما برقِ جہانست	فرمایا ہمارا حال دُنیا کے برق کی طرح ہے۔
دمے پیدا و دم دیگر نمانند	کبھی اچانک ظاہر ہو جاتی ہے اور کبھی بالکل غائب۔

سجدہ کی حقیقت

جب حضرت یعقوب علیہ السلام اور برادرانِ یوسف مصر کے دار السلطنت پہنچے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام نے اعیانِ سلطنت کے ساتھ عظیم ماں باپ کا استقبال کیا اور اپنے والدین کو اُٹھا کر اپنے پاس تخت پر بٹھایا اسوقت سب کے سب یوسف علیہ السلام کے آگے بے اختیار سجدے میں گر پڑے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا اے ابا جان! یہ تعبیر ہے میرے اُس خواب کی جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ (یوسف آیت ۱۰۰)

لفظ سجدہ سے بکثرت لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے حتیٰ کہ ایک جماعت نے اسی آیت سے استدلال کر کے بادشاہوں، پیروں، درویشوں اور قبروں کو سجدہ کرنے کا جواز

نکال لیا ہے۔ اور چونکہ قرآن وحدیث میں سجدہ صرف اللہ کے لئے بیان کیا گیا ہے اور کسی مخلوق کے لئے نہیں تو اس ممانعت سے بچنے کے لئے انھوں نے سجدہ کو دو قسم میں تقسیم کر دیا :-

سجدۂ عبادت، سجدۂ تحیۃ (تعظیمی)

"سجدۂ عبادت" کو اللہ کے ساتھ خاص کر دیا کہ یہ صرف اللہ ہی کے لئے کیا جا سکتا ہے اور "سجدۂ تحیۃ" عام ہے کسی کی تعظیم و تکریم کے لئے احتراماً سجدہ کیا جا سکتا ہے اور یہ عبادت کے جذبہ سے خالی ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تقسیم ہی اپنی ذات میں غلط ہے کیونکہ ہر "سجدۂ عبادت" "تعظیم کا حامل ہوتا ہے۔ عبادت دراصل انتہائی تعظیم ہی کا نام ہے۔ لہٰذا ہر "سجدہ تحیۃ" "سجدۂ عبادت" ہی ہوگا۔ پھر سجدہ کی تقسیم ہی غلط قرار پاتی ہے۔

بہرحال یہ ساری غلط فہمیاں صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ آیت میں سجدہ کو موجودہ اسلامی سجدہ کا ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے یعنی دونوں ہاتھ، گھٹنے، پیشانی کا زمین پر رکھ دینا حالانکہ سجدہ کے حقیقی معنی محض جھکنے اور خم ہو جانے کے ہیں۔ تذکرہ یوسف علیہ السلام میں بھائیوں کا سجدہ میں گر جانا اسی معنی میں ہے کہ وہ سب حضرت یوسف علیہ السلام کے بلند مرتبے کو دیکھ کر جھک گئے۔ یہ معنی اس لئے بھی درست ہیں کہ جھکنے والوں میں حضرت یعقوب علیہ السلام بھی ہیں اور ظاہر ہے کہ ایک جلیل القدر پیغمبر و رسول کا غیر اللہ کو سجدہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اور نہ یہ ممکن ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے کو سجدہ کریں۔ جبکہ سجدہ کسی بھی ملت میں غیر اللہ کے لئے روا نہ رکھا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں جہاں سجدہ کا ذکر آیا ہے وہ صرف اللہ واحد کے لئے خاص ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ سجدۂ عبادت ہے اور عبادت کسی بھی آسمانی ملت میں غیر اللہ کے لئے شرک قرار دی گئی ہے تو غیر اللہ کے لئے سجدہ کرنے کا کوئی جواز ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَہُنَّ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ (حٰمٓ سجدہ آیت ۳۷)

"سجدہ نہ سورج کو کرو نہ چاند کو، اور اُس اللہ کو کرو جس نے اِن سب چیزوں کو پیدا کیا ہے جبکہ تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔"

سورج و چاند کو پوجنے والے بھی زبان سے یہی کہتے ہیں کہ ہماری غرض ان چیزوں کی

پرستش ہے اللہ ہی کی پرستش ہے مگر اللہ تعالےٰ نے صاف صاف بتلا دیا ہے کہ یہ چیزیں پرستش کے لائق نہیں ہیں عبادت کا مستحق صرف ایک اللہ ہے کسی بھی غیر کی عبادت و پرستش کرنا اللہ واحد سے بغاوت کرنے کا مترادف ہے۔

"حدیث صحیحین میں ہے کہ حضرت معاذ رضؓ جب ملکِ شام گئے وہاں دیکھا کہ نصاریٰ اپنے بزرگوں کو سجدہ کرتے ہیں تو واپس آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سجدہ کرنے لگے آپ نے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر میں کسی کو سجدہ کرنا جائز سمجھتا تو عورت کو کہتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کیا کرے"۔ (بخاری و مسلم)

اسی طرح حضرت سلمان فارسیؓ نے اپنی قوم کی عادت کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کرنا چاہا تو آپؐ نے فرمایا:-

لَا تَسْجُدْ لِی یَا سَلْمَانُ وَاسْجُدْ لِلْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ۔

"اے سلمانؓ مجھے سجدہ نہ کر بلکہ سجدہ صرف اُسی ذات کو کر جو حی وقیوم ہے جسکو کبھی فنا نہیں۔ (ابن کثیر)

جن اہل علم نے بھی یہ جو لکھا ہے کہ پہلی شریعتوں میں تعظیمی سجدہ جائز تھا لیکن اس شریعت میں یہ بھی ممنوع ہو گیا یہ غالباً اس لئے لکھا ہے کہ چونکہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا تھا یا فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا ہے۔

حالانکہ یہ کوئی جواب نہیں کیونکہ یہاں دعویٰ اور دلیل ایک ہی ہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ پہلی شریعتوں میں سجدہ تعظیمی جائز تھا اور دلیل بھی یہی ہے کہ برادرانِ یوسف نے تعظیمی سجدہ کیا ہے۔

اگر یہ کسی دلیل سے ثابت ہو جائے کہ پہلی شریعتوں میں سجدہ تعظیمی جائز تھا تو پھر ثبوت میں برادرانِ یوسف کا عمل دلیل ہو سکتا تھا۔

نہ جانے کس بنیاد پر یہ لکھ دیا گیا کہ پہلی شریعتوں میں تعظیمی سجدہ جائز تھا جبکہ قرآن وحدیث میں سجدہ کو عبادت قرار دیا گیا ہے اور اللہ کے لئے خاص کیا گیا ہے۔

دراصل یہ ساری غلط فہمیاں جیسا کہ لکھا گیا ہے آیت میں سجدہ کو موجودہ اسلامی

سجدہ کا ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

قدیم تہذیب اور جاہلی دور میں یہ عام طریقہ تھا اور آج بھی بعض ملکوں میں اس کا رواج ہے کہ کسی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے یا کسی کا استقبال کرنے کے لئے یا محض سلام کرنے کے لئے سینے پر ہاتھ رکھ کر کسی حد تک آگے کی طرف جھکتے ہیں۔ اسی جھکاؤ کے لئے عربی میں سجود اور انگریزی میں (BOW) کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔

بائبل میں اسکی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ قدیم زمانے میں یہ طریقہ آداب تہذیب میں شامل تھا۔ ایک مقام پر بائبل میں یہ ذکر ملتا ہے کہ بابل کی اسیری کے زمانے میں جب اخسویرس بادشاہ نے ہامان کو اپنا امیر الامرا بنایا اور حکم دیا کہ سب لوگ سجدۂ تعظیمی بجالایا کریں تو مردکی نے جو بنی اسرائیل کے اولیاء اللہ میں سے تھے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا، تلمود میں اس واقعہ کی شرح کرتے ہوئے یہ تفصیل دی گئی ہے:-

"بادشاہ کے ملازمین نے کہا آخر تو ہامان کو سجدہ کرنے سے کیوں انکار کرتا ہے؟ ہم بھی آدمی ہیں مگر شاہی حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ اُس نے جواب دیا تم لوگ نادان ہو! کیا ایک فانی انسان جو کل خاک میں ملجانے والا ہے اس قابل ہوسکتا ہے کہ اُسکی بڑائی مانی جائے؟ کیا میں اُسکو سجدہ کروں جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا! کل بچہ تھا آج جوان ہے کل بوڑھا ہوگا اور پرسوں مرجائے گا؟ نہیں میں تو اُس ازلی و ابدی خدا ہی کے آگے جھکوں گا جو حی و قیوم ہے جو کائنات کا خالق اور حاکم ہے، میں تو بس اُسی کی تعظیم بجالاؤں گا اور کسی کی نہیں۔"

یہ تقریر نزول قرآن سے تقریباً ایک ہزار برس پہلے ایک اسرائیلی مومن کی زبان سے ادا ہوئی ہے اور اسمیں کوئی شائبہ نہیں کہ غیر اللہ کو کسی بھی معنی میں سجدہ کرنا جائز ہو۔

برادران یوسف کا سجدہ کرنا یا فرشتوں کا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا، اگر اس سجدہ سے مراد وہ عمل ہو جسے اسلامی اصطلاح میں سجدہ کہا جاتا ہے تو پھر وہ اللہ کی بھیجی ہوئی کسی شریعت میں کبھی کسی غیر اللہ کے لئے جائز نہیں رہا ہے۔

قدیم کتب تفاسیر اسپر شاہد ہیں کہ قرآن حکیم میں جہاں بھی غیر اللہ کیلئے سجدہ کا لفظ آیا ہے اُس سے مراد صرف جھک جانا ہے یا زمین بوس ہونا، بے انتہا تواضع کرنا مراد ہے۔

فرشتے اللہ کے حکم پر آدم علیہ السلام کے آگے جھک گئے۔ برادرانِ یوسف اور ماں باپ حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت و شان دیکھ کر جھک گئے۔

(تفسیر کبیر، معالم التنزیل، جلالین، روح المعانی، کشاف وغیرہ)

یہاں اس فرق کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ سجدۂ تعظیمی کا رواج اگر قدیم تہذیبوں میں رائج و معروف تھا بادشاہوں کے درباریں عام طور پر کیا جاتا تھا یا بلند و اونچی شخصیات کے لئے بھی بطور تعظیم ادا کیا جاتا ہو، ممکن ہے ایسا گزشتہ ادوار میں رہا ہو لیکن کسی آسمانی شریعت میں یا نبیوں کے قائم کردہ نظام میں غیر اللہ کے لئے سجدۂ تعظیم کا ثبوت اور اس کا رواج قرآن و حدیث کی تصریح کا محتاج ہے جو باوجود تحقیق و تلاش کے ہمیں حاصل نہ ہو سکا۔

یہی وجہ ہے کہ تمام قدیم مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ برادرانِ یوسف کا سجدہ یا فرشتوں کا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا تعظیماً آگے جھکنا تھا یا زمین بوس ہونا تھا۔

علاوہ ازیں اگر برادرانِ یوسفؑ نے اپنے بھائی کو اسلامی سجدہ ہی کیا ہو تب بھی یہ اس بات کا ثبوت نہیں بنتا کہ غیر اللہ کے لئے سجدہ جائز ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اپنے رواج و تہذیب کی بناء پر ایسا کئے ہوں۔ قرآن حکیم نے صرف واقعہ نقل کیا ہے کوئی ترغیب یا تعریف نہیں کی ہے۔

علاوہ ازیں بکثرت مقامات پر اللہ نے سجدہ کو صرف اپنی ذات کے لئے خاص کیا ہے۔ بہر حال قدیم کتبِ تفسیر کی مراجعت کے بعد اس مسئلہ میں جو حقیقت ظاہر ہوئی وہ درج کر دی گئی ہے۔ واللہ اعلم و علمہٗ اتم۔

ایک گہری حقیقت

سیدنا یوسف علیہ السلام کے اس تفصیلی قصہ سے قرآن حکیم ایک اور گہری حقیقت بھی انسان کے ذہن نشین کراتا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالٰے جو کام کرنا چاہتا ہے وہ بہر صورت پورا ہو کر رہتا ہے۔ انسان اپنی مختلف تدبیروں اور منصوبوں سے اس کو روکنے یا بدلنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بسا اوقات انسان ایک کام اپنے منصوبے کی خاطر کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں نے

اپنا منصوبہ پورا کر لیا ہے مگر نتیجہ میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ نے اُسی کے ہاتھوں سے وہ کام لے لیا جو اُسکے اپنے منصوبے کے خلاف اور اللہ کی مرضی و منشار کے عین مطابق تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جب انھیں کنویں میں پھینک رہے تھے تو اُن کا گمان تھا کہ ہم نے اپنی راہ کا کانٹا ہمیشہ کے لئے دور کر دیا، مگر فی الواقع انھوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اُس بامِ عروج کی پہلی سیڑھی پر اپنے ہاتھوں لا کھڑا کیا جس پر اللہ کو پہنچانا منظور تھا۔ عزیز مصر کی بیوی نے یوسف علیہ السلام کو قید خانے میں ڈالکر اپنے نزدیک تو اُن سے انتقام لے لیا مگر فی الواقع اُس نے اِن کے لئے تختِ سلطنت تک پہنچنے کا راستہ فراہم کیا اور اپنی اس تدبیر سے خود اپنے لئے اسکے سوا کچھ نہ کمایا کہ وقت آنے پر فرمانروائے سلطنت کی "محسنہ" کہلانے کے بجائے علی الاعلان اپنی خیانت کے اعتراف کی شرمندگی اُٹھانی پڑی۔

یہ محض دو چار مستثنیٰ واقعات نہیں ہیں بلکہ تاریخ ایسے بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے جو اس گہری حقیقت کی گواہی دیتی ہیں کہ اللہ تعالےٰ جسے اُٹھانا چاہتا ہے ساری دنیا ملکر اُسکو گرا نہیں سکتی، بلکہ دُنیا جس تدبیر کو اسکے گرانے کی نہایت کارگر اور یقینی تدبیر سمجھ کر اختیار کرتی ہے اللہ تعالےٰ اُسی تدبیر میں سے اُسکے اُٹھنے اور اُبھرنے کی صورتیں نکال دیتا ہے اور اُن لوگوں کے حصّے میں رُسوائی کے سوا کچھ نہیں آتا جنھوں نے اُسے گرانا چاہا تھا اور اسی طرح اسکے برعکس اللہ جسے گرانا چاہتا ہے اُسے کوئی تدبیر سنبھال نہیں سکتی بلکہ سنبھالنے کی ساری تدبیریں اُلٹی پڑتی ہیں اور ایسی تدبیریں کرنے والوں کو منھ کی کھانی پڑتی ہے۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ۔

رُوحِ تذکرہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے معاملہ پر چسپاں کر کے قرآن حکیم نے گویا ایک واضح پیشگوئی کر دی تھی جسے آئندہ دس سال کے واقعات نے حرف بحرف صحیح ثابت کر دیا۔

اس سورہ کے نزول پر دو ڈیڑھ سال ہی گزرے ہوں گے کہ اہلِ قریش

برادرانِ یوسف کی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی اور آپ کو بحکم الٰہی مکّہ مکرمہ سے نکلنا پڑا۔ پھر اُن کی توقعات کے خلاف جیسا کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ اُنھوں نے آپؐ کو مکّہ مکرمہ سے نکال کر گویا آپ کے لائے ہوئے دین کا خاتمہ کردیا۔ لیکن آپؐ کو اس جلاوطنی میں ویسا ہی عروج واقتدار نصیب ہوا جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السّلام کو ہوا تھا۔

پھر فتح مکّہ کے موقع پر ٹھیک ٹھیک وہی کچھ پیش آیا تھا جو مصر کے پایۂ تخت میں یوسف علیہ السّلام کے سامنے اُن کے بھائیوں کی آخری حضوری کے موقع پر پیش آیا تھا، جہاں برادرانِ یوسف انتہائی عجز و درماندگی کی حالت میں اُن کے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے کہ :-

تَصَدَّقْ عَلَيْنَآ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِيْنَ ۔

(آیت ۸۸)

تو حضرت یوسف علیہ السّلام نے انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود انہیں معاف کر دیا اور فرمایا :-

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ۔ (آیت ۹۲)

"آج تم پر کوئی گرفت نہیں اللہ تمہیں معاف کرے وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔"

اسی طرح یہاں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شکست خوردہ قریش سرنگوں کھڑے ہوئے تھے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اِن کے ایک ایک ظلم کا بدلہ لینے کے موقف میں تھے آپؐ نے دریافت کیا تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟

اُنھوں نے عرض کیا :-

اَخٌ كَرِيْمٌ وَّابْنُ اَخٍ كَرِيْمٍ۔

"آپ ایک عالی ظرف بھائی ہیں اور ایک عالی ظرف بھائی کے بیٹے ہیں۔"

اس پر آپؐ نے فرمایا :-

فَاِنِّیْ اَقُوْلُ لَکُمْ کَمَا قَالَ یُوْسُفُ لِاِخْوَتِہٖ
لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ
اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ۔

"میں تمہیں وہی جواب دیتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو دیا تھا کہ آج تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ تمہیں معاف کیا۔"

لَقَدْ کَانَ فِیْ یُوْسُفَ وَاِخْوَتِہٖٓ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیْنَ۔

"یوسف علیہ السلام اور اُن کے بھائیوں کے قصے میں اِن پوچھنے والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔"

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ۔

تذکرہ
سیّدنا شعیب علیہ السّلام
اور
اصحابُ الایکہ

تعارف مشہور اسلامی مؤرخ محمد بن اسحاق کے بیان کے مطابق حضرت شعیب علیہ السّلام حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے صاجزادے مَدین کی اولاد میں سے ہیں اور حضرت لوط علیہ السّلام سے بھی رشتۂ قرابت رکھتے ہیں۔

جس بستی میں ان کا قیام تھا اُس کو بھی شہر مَدین کہا جاتا تھا۔ گویا مدین ایک قوم کا بھی نام ہے اور ایک شہر کا بھی۔ یہ شہر آج بھی شرق اُردن کی بندرگاہ معان کے قریب موجود ہے۔

حضرت شعیب علیہ السّلام کو اللہ تعالےٰ نے وعظ ونصیحت کا معجزانہ انداز عطا کیا تھا۔ اسی حُسنِ خطابت کی وجہ سے انھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے "خطیب الانبیا" کے لقب سے یاد فرمایا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السّلام کا اسم گرامی قرآن حکیم میں دس جگہ آیا ہے۔

سورۂ اعراف	آیات	۸۵، ۸۸، ۹۰، ۹۲
سورۂ ھود	آیات	۸۴، ۸۷، ۹۱، ۹
سورۂ شعراء	آیت	۱۷۷
سورۂ عنکبوت	آیت	۳۶

قومِ شعیبؑ حضرت شعیب علیہ السّلام کی بعثت مَدین میں ہوئی۔ مدین کسی مقام کا نام نہیں ہے بلکہ قبیلہ کا نام ہے۔ یہ قبیلہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے بیٹے مَدین کی نسل سے تھا جو اُن کی تیسری بیوی قطورہ سے پیدا ہوا تھا اسلئے حضرت

ابراہیم علیہ السلام کا یہ خاندان بنی قطورا کہلاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں تھیں۔ سارہؓ، ہاجرہؓ، قطوراؓ۔

حضرت سارہ کے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام تھے ان کے دو بیٹے تھے حضرت یعقوب علیہ السلام جو بنی اسرائیل کے باپ قرار پائے، دوسرے عیسو جنکا لقب ادوم تھا۔

سیدہ ہاجرہؓ کے بطن سے صرف ایک بیٹا ہوا جن کا نام حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہے۔ سیدہ قطوراؓ کے بطن سے کئی ایک بچے ہوئے جن میں ایک کا نام مدین تھا۔ عرب ہی میں ان کے باپ نے اُن کو بسایا تھا۔

انہی تینوں ازواج سے حسب ذیل مشہور زمانہ قومیں پیدا ہوئیں۔

۱۔ بنو قطوراؓ میں سے اہل مدین اور اہل ودان (اصحاب الایکہ) حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم۔

۲۔ بنو سارہؓ میں سے ادوم (یعنی حضرت ایوب اور ان کی قوم)

۳۔ بنو ہاجرہؓ میں سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام، اصحاب الحجر، قیدار، قریش۔

مدین اپنے اہل وعیال کے ساتھ اپنے سوتیلے بھائی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے پہلو میں حجاز آکر آباد ہوگیا تھا۔ پھر یہی خاندان آگے چل کر ایک بڑا قبیلہ بن گیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام بھی چونکہ اسی نسل سے تھے اس لئے انکی بعثت کے بعد یہ قوم، قومِ شعیب کہلائی۔

مدین، اصحابُ الایکہ

مفسرین کرام اس بارے میں مختلف الخیال ہیں۔ آیا مدین اور اصحاب الایکہ ایک ہی قبیلے کے دو نام ہیں یا دو جدا جدا قبیلے ہیں، بعض کا خیال ہے کہ دونوں جُدا جُدا قبیلے ہیں۔ مدین متمدن اور شہری قبیلہ تھا اور اصحاب الایکہ دیہاتی وبدوی قبیلہ تھا جو جنگل اور بَن میں آباد تھا۔ "ایکہ" کے معنی خود جنگل اور بَن کے ہیں۔ اس لئے اسکو جنگل والا یا بَن والا کہا گیا۔

قرآن حکیم نے اس قبیلے کی آبادی کے متعلق دو لفظوں سے اس کا تعارف کرایا ہے۔

ایک یہ کہ یہ قبیلہ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ پر آباد تھا۔
وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ (حجر آیت ۷۹)
اور قوم لوط اور مدین دونوں بڑی شاہراہ پر آباد تھے۔
دوسرے یہ کہ وہ اصحاب الایکہ تھے (جھنڈ والے یا بن والے)
كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ. (شعراء آیت ۱۷۶)
"ایکہ والوں نے رسولوں کو جھٹلایا۔"
عربی زبان میں "ایکہ" ایسی سرسبز و شاداب جھاڑیوں کو کہا جاتا ہے جو ہرے بھرے درختوں کی کثرت سے جھنڈ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔
تفسیر روح المعانی میں ابن عساکر کے حوالہ سے یہ مرفوع حدیث نقل کی گئی ہے:۔
اِنَّ مَدْيَنَ وَاَصْحَابَ الْاَيْكَةِ اُمَّتَانِ بَعَثَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلَيْهِمَا شُعَيْبًا. (الحدیث)
"مدین اور اصحاب الایکہ دو قومیں تھیں جنکی جانب حضرت شعیب علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا۔"
ان دونوں باتوں کے جان لینے کے بعد مدین کی آبادی کا پتہ آسانی سے معلوم ہوسکتا ہے وہ یہ کہ مدین کا اصل علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا، قدیم زمانے میں جو تجارتی شاہراہ بحر احمر کے کنارے یمن سے مکہ اور ینبوع ہوتی ہوئی ملک شام تک جاتی تھی اور ایک دوسری شاہراہ جو عراق سے مصر کی طرف جاتی تھی اُس کے عین چوراہے پر اس قوم کی بستیاں آباد تھیں۔ عرب کے تجارتی قافلے مصر اور شام کی طرف جاتے ہوئے اسکے آثار قدیمہ کے درمیان سے گزرا کرتے تھے۔
حافظ ابن کثیرؒ کی تحقیق ہے کہ یہاں ایکہ نامی ایک درخت تھا اہل قبیلہ چونکہ اسکی عبادت کیا کرتے تھے لہٰذا اس نسبت سے مدین کو اصحاب الایکہ کہا گیا۔
گویا یہ دو نام ایک ہی قبیلے کے ہیں۔ اس خیال کی تائید میں بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ آب و ہوا کی لطافت، نہروں اور آبشاروں کی کثرت نے اس مقام کو اس قدر شاداب اور پُرفضا بنا دیا تھا اور یہاں میووں، پھلوں اور خوشبودار پھولوں کے

کے اسقدر باغات اور چمن تھے کہ اگر ایک شخص آبادی سے باہر کھڑے ہو کر نظارہ کرتا تھا تو اس کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ ایک نہایت خوبصورت اور شاداب گھنے درختوں کا جھنڈ ہے۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم نے اسکو "ایکہ" (جھنڈ) کہہ کر تعارف کروایا۔

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں خیال اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ بلاشبہ دو الگ قبیلے ہیں مگر ہیں ایک ہی نسل کی دو شاخیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو اولاد اُنکی تیسری بیوی سیدہ قطورا کے بطن سے تھی وہ عرب اور اسرائیل کی تاریخ میں بنی قطورا کے نام سے معروف رہی ہیں، اِن میں سے ایک قبیلہ جو سب سے زیادہ مشہور ہوا وہ مدین بن ابراہیم کی نسبت سے اصحاب مدین کہلایا۔

باقی سیدہ قطورا کی دوسری اولاد جن میں بنی ودان نسبتہً زیادہ مشہور ہیں۔ شمالی عرب میں تیمار اور تبوک کے درمیان آباد ہوئے۔ ان کا صدر مقام تبوک تھا جسے قدیم زمانے میں ایکہ کہتے ہیں۔

اصحاب مدین کا آغاز عہد دو ہزار بیس برس قبل مسیح شمار کیا جاتا ہے کیونکہ یہی زمانہ مدین کے پدر محترم حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ہے۔

قرآن حکیم میں مدین کا ذکر دو وجہ سے آیا ہے۔

اوّل۔ حضرت شعیب علیہ السلام

دوم۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعلق سے۔

سورہ طٰہٰ آیت ۴۰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چند سال قیامِ مدین کا ذکر ہے۔ سورہ قصص آیت ۲۲ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونا بیان کیا گیا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام اِن دونوں قبیلوں کے پیغمبر تھے، ان دونوں قبیلوں کے عادات و اطوار تقریباً یکساں تھے۔ چونکہ دونوں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے، ایک ہی زبان بولتے تھے۔ اِن کے علاقے بھی ایک دوسرے سے قریب اور متصل تھے۔ اور اِن دونوں شاخوں کا پیشہ بھی تجارت تھا، دونوں میں ایک ہی طرح کی تجارتی بے ایمانیاں اور مذہبی و اخلاقی بیماریاں پائی جاتی تھیں۔ چونکہ

یہ لوگ اُس زمانے میں بین الاقوامی تجارت کی دو بڑی شاہراہوں پر آباد تھے جسکی وجہ سے بڑے پیمانے پر رہزنی کا سلسلہ پھیلا رکھا تھا دوسری قوموں کے تجارتی قافلوں کو بھاری ٹیکس لئے بغیر گزرنے نہ دیتے تھے اور راستہ کا امن خطرے میں ڈال رکھا تھا۔"

سورۂ اعراف آیت ۸۶ میں ان کی اس بدعملی کا تذکرہ موجود ہے۔

دعوت و تبلیغ

حضرت شعیب علیہ السلام جس قوم میں مبعوث ہوئے وہ قوم خدا بیزاری اور معصیت کاری کا شکار تھی۔ یہ صرف افراد کی حد تک ہی محدود نہ تھا بلکہ ساری قوم اسی گرداب ہلاکت میں مبتلا تھی۔ ایک لمحہ کے لئے بھی ان کو یہ احساس نہ تھا کہ یہ سب کچھ گناہ و معصیت ہے بلکہ وہ اپنے ان اعمال پر فخر کیا کرتے تھے۔

یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسولوں پر ایمان نہ لاکر جہاں حقوق اللہ کی خلاف ورزی کر رہے تھے وہاں خرید و فروخت میں ناپ تول گھٹا کر لوگوں کے حقوق بھی ضائع کر رہے تھے۔ مزید یہ کہ راستوں اور سرِراہ بیٹھ کر آنے جانے والے مسافروں کو ڈرایا دھمکایا کرتے اور لوٹ مار مچایا کرتے تھے۔

یہ ان کے شدید جرائم تھے جن کی اصلاح کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا۔

اللہ کی توحید اور شرک بیزاری کا اعتقاد تو تمام انبیاء کرام کی مشترکہ تعلیم ہے جو حضرت شعیب علیہ السلام کے حصہ میں بھی آئی مگر قوم کی مخصوص بداخلاقیوں پر توجہ دلانے اور اُن کو راہ راست پر لانے کے لئے اُنھوں نے اس قانون کو بھی اہمیت دی کہ خرید و فروخت کے معاملہ میں ہمیشہ یہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ جو جس کا حق ہے وہ پورا پورا اُسکو ملے۔

اپنی اس قوم کی اصلاح کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام نے تین ۳ باتیں خصوصیت سے فرمائی ہیں :-

اوّل ۱ یہ کہ اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اُسکے سوا تمہارا اور کوئی

معبود نہیں۔

یہی وہ دعوت توحید ہے جو تمام انبیاء کرام دیتے آئے ہیں اور جو تمام عقاید اور اعمال کی بنیاد ہے۔ چونکہ یہ قوم بھی مخلوق پرستی میں مبتلا تھی اس لئے ان کو سب سے پہلے یہی پیغام دیا۔

دُوم یہ بات فرمائی کہ ناپ اور تول میں کمی زیادتی نہ کرو ٹھیک ٹھیک معاملہ کرو۔

سُوم یہ کہ تم لوگوں کو ڈرانے دھمکانے اور اللہ کے راستہ سے روکنے کے لئے راستوں پر نہ بیٹھا کرو۔"

اسکا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ عام شاہراہوں پر بیٹھ کر حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس آنے والوں کو ڈراتے دھمکاتے تھے اور اجنبی اور مسافروں کے مال و اسباب بھی لوٹ لیا کرتے تھے۔

علامہ قرطبیؒ نے اِن کا یہ عمل بھی نقل کیا ہے کہ وہ لوگ عام مسافروں سے ناجائز ٹیکس بھی وصول کیا کرتے تھے۔

حضرت شعیب علیہ السلام بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے۔ شیریں کلامی، حُسن خطابی، ادائے بیان اور طاقت لسانی میں بہت نمایاں امتیاز رکھتے تھے۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنھیں خطیب الانبیاء کے لقب سے یاد کیا ہے۔ اپنی قوم کو نرم و گرم ہر طریقے سے رُشد و ہدایت کے کلمات ارشاد فرمائے مگر بے نصیب قوم پر اسکا کوئی اثر نہ ہوا، چند ضعیف اور کمزور انسانوں کے علاوہ کسی نے بھی ان کے پیغامِ حق پر کان نہیں دھرا وہ خود بھی اسی طرح بد عمل رہے اور دوسروں کی راہ بھی مارتے رہے، لیکن حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوتِ حق جاری رہی۔ قوم کے سر برآوردہ افراد نے جنکو اپنی شوکت و طاقت پر غرور تھا حضرت شعیب علیہ السلام کو دھمکایا کہ یا تجھ کو اور تیری قوم کو اپنی اس بستی سے نکال باہر کر دیں گے یا پھر تم کو ایسا مجبور کر دیں گے کہ تم ہمارے دین میں لوٹ آؤ۔

حضرت شعیب علیہ السلام پھر بھی یہ فرماتے تھے کہ

"اے قوم میں اپنی مقدور بھر تمہاری اصلاح کی کوشش

کروں گا اور میں جو کہتا ہوں اُسکی صداقت اور سچائی کے لئے اللہ کی حجت اور دلیل اور کھلی نشانی بھی پیش کر رہا ہوں، اسپر میں کوئی عوض و بدلہ بھی تو طلب نہیں کر رہا ہوں، میرا اجر تو صرف اللہ ہی کے ہاں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اللہ کا عذاب تم کو ہلاک و برباد نہ کر دے جیسا کہ تم سے پہلے قوم نوحؑ اور قوم ہودؑ اور قوم صالحؑ کو پیش آچکا ہے۔ اور قوم لوطؑ کا معاملہ تم سے کچھ دور نہیں ہے۔ دیکھو اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور اُسکی طرف لوٹ جاؤ۔ بیشک میرا پروردگار بڑا ہی رحمت والا اور بڑا ہی محبت والا ہے۔"

اصلاح قوم کے لئے یہ طویل جدوجہد، وعظ و تذکیر، قوم کی بغاوت و سرکشی اور عبرتناک انجام قرآن حکیم کی آیات ذیل میں تفصیلاً مذکور ہے:-

قرآنی مضمون

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ الخ (ہود آیات ۸۴ تا ۹۳)

"اور ہم نے مدین والوں کی طرف اُن کے بھائی شعیبؑ کو پیغمبر بنا کر بھیجا انھوں نے فرمایا اے میری قوم کے لوگو تم صرف اللہ کی عبادت کرو اُسکے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور تم ناپ تول میں کمی نہ کرو (کیونکہ) میں تم کو فراغت کی حالت میں دیکھتا ہوں (پھر تم کو ناپ تول میں کمی کرنیکی کیا ضرورت ہے۔ یعنی اللہ نے تمہیں بہت کچھ دے رکھا ہے پس کفرانِ نعمت سے بچو) اور میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا ایسا دن نہ آجائے جو سب پر چھا جائے گا۔

اور اے میری قوم کے لوگو ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا پورا کیا کرو، لوگوں کو اُن کی چیزیں (اُن کے حق سے) کم نہ دو اور ملک میں فساد پھیلاتے نہ پھرو۔

اگر تم میرا کہا مانو تو جو کچھ اللہ کا دیا بچ رہے اُسی میں تمہارے لئے بہتری ہے اگر تم کو یقین آئے، اور میں تم پر پہرہ دینے والا تو

نہیں ہوں۔

لوگوں نے کہا اے شعیبؑ کیا یہ تیری نمازیں (جو تو اپنے رب کے لئے پڑھتا ہے) تجھے یہ حکم دیتی ہیں کہ ہم اِن چیزوں کو چھوڑ دیں جنکی پرستش ہمارے بڑے کرتے آئے ہیں اور اس بات کو چھوڑ دیں کہ ہم اپنے مال میں جو چاہیں تصرف کریں واقعی آپ بڑے عقلمند دین پر چلنے والے ہیں۔

شعیبؑ نے کہا اے میری قوم کے لوگو کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشن دلیل رکھتا ہوں اور اُس کے فضل وکرم کا یہ حال ہو کہ اچھی سے اچھی روزی عطا فرما رہا ہو (تو پھر میں بھی چُپ رہوں اور تمہیں راہِ حق کی طرف نہ بُلاؤں) اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جس بات سے تمہیں روک رہا ہوں خود اُسکے خلاف چلوں میں تمہیں جو کچھ کہتا ہوں اُس پر عمل بھی کرتا ہوں۔ میں اسکے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ جہاں تک میرے بس میں ہے اصلاح حال کی کوشش کروں۔ میرا کام بنتا ہے تو اللہ ہی کی مدد سے بنتا ہے۔ میں نے اُسی پر بھروسہ کیا اور اُسی کی طرف رجوع ہوں۔ اور اے میری قوم کے لوگو!

میری ضد میں آکر کہیں ایسی بات نہ کر بیٹھنا کہ تمہیں بھی ویسا ہی معاملہ پیش آجائے جیسا کہ قوم نوحؑ کو یا قوم ہودؑ کو یا قوم صالحؑ کو پیش آچکا ہے اور قوم لوطؑ کا معاملہ تو تم سے کچھ دور نہیں ہے اور دیکھو اللہ سے معافی مانگو اور اُسی کی طرف لوٹ جاؤ۔ میرا پروردگار بڑا ہی رحمت والا بڑا ہی محبت والا ہے۔

لوگوں نے کہا اے شعیبؑ تم جو کچھ کہتے ہو اُس میں اکثر باتیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہم لوگوں میں ایک کمزور آدمی ہو اور اگر (تمہارے ساتھ) تمہاری برادری کے آدمی نہ ہوتے تو ہم تمہیں ضرور سنگسار کر دیتے اور تم ہمارے

سامنے کوئی ہستی نہیں۔

شعیب نے کہا اے میری قوم کے لوگو! کیا اللہ سے بڑھ کر تم پر میری برادری کا دباؤ ہوا؟ اور اللہ تمہارے لئے کچھ نہ ہوا کہ اُسے پیچھے ڈال دیا؟ (اچھا) جو تم کرتے ہو میرے پروردگار کے احاطۂ علم سے باہر نہیں۔

اے میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ کام کئے جاؤ، میں بھی اپنی جگہ سرگرم عمل ہوں، بہت جلد معلوم کر لوگے کہ کس پر عذاب آتا ہے جو اُس کو رُسوا کرے گا اور کون فی الحقیقت جھوٹا ہے انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کروں گا۔"

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ قَدْ جَآءَتْکُمْ بَیِّنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ الخ

(الاعراف آیات ۸۵ تا ۹۰)

"اور ہم نے مدین والوں کی طرف اُن کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا اُنھوں نے فرمایا اے میری قوم تم صرف اللہ کی عبادت کرو اُس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں، تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے (میرے نبی ہونے پر) واضح دلیل آچکی ہے تو تم ناپ تول پورا پورا کیا کرو اور لوگوں کا اُن کی چیزوں میں نقصان نہ کرو (جیسا کہ تمہاری عادت ہے) اور روئے زمین پر بعد اُسکے کہ اُسکی درستی کر دی گئی فساد نہ پھیلاؤ۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم میری تصدیق کرو۔ اور تم راستوں پر اس غرض سے نہ بیٹھا کرو کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو دھمکیاں دو اور ان کو اللہ کی راہ سے روکو اور اُس راہ میں کجی اور (شبہات) کی تلاش میں لگے رہو اور اُس حالت کو یاد کرو جبکہ تم کم تھے پھر اللہ نے تم کو زیادہ کر دیا اور دیکھ لو کیسا بُرا انجام ہوا فساد کرنے والوں کا۔ اور اگر تم میں سے بعضے تو اُس حکم پر جسکو دیکر مجھے بھیجا گیا ہے ایمان لاتے ہیں اور بعضے ایمان نہیں لائے تو ذرا

ٹھیر جا یہاں تک کہ ہمارے درمیان اللہ تعالیٰ (عملی) فیصلہ کئے دیتے ہیں اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہیں۔

اُنکی قوم کے متکبر سرداروں نے کہا اے شعیبؑ (یاد رکھ) ہم تجھ کو اور جو تیرے ہمراہ ایمان لانے والے ہیں۔ اُن کو اپنی بستی سے نکال باہر کر دیں گے یا یہ کہ تم ہمارے مذہب میں لوٹ آجاؤ۔ شعیبؑ نے جواب دیا کیا ہم تمہارے مذہب میں آجائیں گے گو ہم اسکو مکروہ (اور قابل نفرت) ہی سمجھتے ہوں؟ (ایسی صورت میں) ہم تو اللہ پر جھوٹی تہمت لگانے والے ہو جائیں گے۔

اگر (خدا نہ کرے) ہم تمہارے مذہب میں آجائیں (خصوصاً) بعد اسکے کہ اللہ نے ہم کو اس سے نجات دی ہو اور ہم سے ممکن نہیں کہ تمہارے مذہب میں آجائیں لیکن ہاں اللہ ہی نے جو ہمارا مالک ہے (ہمارے) مقدر میں کیا ہو۔ ہمارے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ ہم اللہ ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہماری اس قوم کے درمیان فیصلہ کر دیجئے حق کے موافق اور آپ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں۔

اور اُن کی قوم کے کافر سرداروں نے (شعیب علیہ السلام کی یہ تقریر سُنکر) کہا (اے لوگو!) اگر تم شعیب کی راہ پر چلنے لگو تو بیشک بڑا نقصان اُٹھاؤ گے۔

كَذَّبَ أَصْحَابُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ. إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُونَ. الخ (الشعراء آیات ۱۷۶ تا ۱۹۱)

اصحاب الایکہ نے پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ اُن سے شعیب (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں ہو۔ میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں۔ سو تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔ اور میں تم سے اسپر کوئی صلہ نہیں چاہتا بس میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔

تم لوگ پورا پورا ناپا کرو اور نقصان نہ کیا کرو۔ اور سیدھی ترازو
سے تولا کرو۔ اور لوگوں کا اُن کی چیزوں میں نقصان نہ کیا کرو اور
زمین میں فساد نہ مچایا کرو۔ اور اُس (خُدا) سے ڈرو جس نے تم کو تمام
اگلی مخلوق کو پیدا کیا ہے۔

وہ لوگ کہنے لگے (اے شعیب) تجھ پر تو کسی نے بڑا
بھاری جادو کر دیا ہے۔ اور تو تو محض ہماری طرح ایک بشر ہے
اور ہم تجھکو صرف جھوٹے لوگوں میں خیال کرتے ہیں۔ سو اگر تو
سچوں میں سے ہے تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے۔

شعیبؑ نے کہا تمہارے اعمال کو میرا رب خوب جانتا ہے
سو اُن لوگوں نے (شعیبؑ) کو جھٹلا دیا پھر اُنکو سائبان
کے واقعہ نے آپکڑا بیشک وہ بڑے سخت دن کا عذاب تھا۔

اسمیں عبرت ہے، اور ان میں اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔
اور بیشک تیرا رب بڑی قدرت والا بڑی رحمت والا ہے۔"

آخری انجام

آخر وہی ہوا جو قانون الٰہی کا ابدی و سرمدی فیصلہ ہے۔ یعنی حُجت و برہان کی روشنی آنے کے بعد بھی جب باطل پر اصرار ہو اور اُسکی صداقت کا مذاق اُڑایا جائے اور اُسکی اشاعت میں رکاوٹیں ڈالی جائیں تو پھر اللہ تعالےٰ کا عذاب اُس مجرمانہ زندگی کا فیصلہ اور خاتمہ کر دیتا ہے اور آنے والی نسل کے لئے اسکو عبرت و موعظت بنا دیا کرتا ہے۔

قرآن حکیم نے نافرمانی اور سرکشی کی پاداش میں قوم شعیب کو دو قسم کے عذاب سے دوچار کر دیا۔ ایک زلزلہ کا عذاب اور دوسرا آگ کی بارش کا عذاب۔

فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ

یعنی اُنکو سخت اور عظیم زلزلے نے آپکڑا۔

أَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ۔

سایہ کے دن والے عذاب نے اُنہیں پکڑ لیا۔

جس کا مطلب یہ کہ پہلے اُن پر گہرے بادل کا سایہ آیا جب سب اُسکے نیچے جمع ہو گئے تو اسی بادل سے اُن پر آگ برسائی گئی۔

"حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے اِن دونوں آیتوں کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر پہلے دن ایسی سخت گرمی مسلّط ہوئی گویا جہنّم کا دروازہ اِن کی طرف کھول دیا گیا ہو جس سے ان کا دم گھٹنے لگا نہ کسی سایہ میں چین آتا تھا نہ پانی میں۔ یہ لوگ گرمی سے گھبرا کر تہہ خانوں میں گھُس گئے تو وہاں اوپر سے بھی زیادہ سخت گرمی پائی، پریشان ہو کر شہر سے جنگل کی طرف بھاگے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ایک گہرا بادل بھیج دیا جسکے نیچے ٹھنڈی ہوا تھی۔ یہ سب لوگ گرمی سے بدحواس تھے دوڑ دوڑ کر اُس بادل کے نیچے جمع ہو گئے۔ اُس وقت یہ سارا بادل آگ ہو کر اُن پر برس پڑا اور اسکے بعد زلزلہ بھی آیا جس سے یہ پوری قوم راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔" (بحر محیط)

بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ممکن ہے قوم شعیب کے مختلف حصّے ہوں بعض پر زلزلہ آیا اور بعض عذاب ظُلّہ سے ہلاک کر دیئے گئے ہوں۔ واللہ اعلم۔

قرآن حکیم نے اس عذاب کی نوعیت کو اس طرح بیان کیا ہے :-

قرآنی مضمون

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِىْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ. الخ (اعراف آیات ۹۱ تا ۹۳)

پُس اُنھیں ایک دہلا دینے والی آفت نے آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔

جن لوگوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا وہ ایسے مٹے کہ گویا کبھی اِن گھروں میں بسے ہی نہ تھے۔ شعیبؑ کو جھٹلانے والے ہی آخر کار برباد ہو کر رہے۔

اور شعیبؑ یہ کہہ کر اِن کی بستیوں سے نکل گئے کہ اے میری قوم کے لوگو میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچا دیئے اور

تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا اب میں اُس قوم پر کیسے افسوس کروں جو قبول حق سے انکار کرتی ہے۔"

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا. الخ۔ (ہود آیات ۹۴ تا ۹۵)

"اور جب ہمارے فیصلہ کا وقت آگیا تو ہم نے اپنی رحمت سے شعیب اور اُن کے ساتھی ایمان والوں کو بچا لیا اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا اُن کو ایک سخت دھما کے نے ایسا پکڑا کہ وہ اپنی بستیوں میں بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے گویا وہ کبھی وہاں رہے بسے ہی نہ تھے۔ سنو! مدین کو رحمت سے دوری ہوئی جیسا ثمود رحمت سے دور ہوئے تھے۔"

وَإِنْ كَانَ أَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ. الخ

(حجر آیت ۷۸، ۷۹)

"اور ایکہ والے ظالم تھے تو دیکھ لو کہ ہم نے بھی اُن سے انتقام لیا، اور اِن دونوں (قوم لوطؑ و قوم شعیبؑ) کے اُجڑے ہوئے علاقے کھلے راستے پر واقع ہیں۔"

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ. الخ

سو اُنھوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا آخر کار سائبان والے دن کا عذاب اُن کو آپکڑا بیشک وہ بڑے خوف ناک دن کا عذاب تھا۔ یقیناً اسمیں ایک نشانی ہے مگر اِن میں اکثر ماننے والے نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔

مدفنِ پاک یمن کے علاقہ حضرموت میں ایک قبر جو زیارت گاہِ خاص و عام ہے وہاں کے باشندوں کا یہ دعوٰی ہے کہ یہ حضرت شعیب علیہ السّلام کی قبر شریف ہے۔

حضرت شعیب علیہ السّلام اہل مدین کی ہلاکت کے بعد حضر موت ہجرت کر آئے تھے اور وہاں ہی اُن کی وفات ہوئی۔

صاحب قصص الانبیاء علاّمہ عبدالوہاب نجّارؒ کی رائے ہے کہ یہ بات کچھ صحیح نہیں ہے۔ مشہور یہ ہے کہ حضرت شعیب علیہ السّلام قوم کی ہلاکت کے بعد مکہ مکرّمہ آگئے تھے اور وہاں ہی وفات ہوئی۔ وہ اور اُن کے ساتھیوں کی قبریں مکہ مکرّمہ میں دارالندوہ کے قریب ہیں۔ (دارالندوہ زمانۂ جاہلیت میں اہل مکّہ کا مشورہ گاہ تھا، جہاں قوم کے فیصلے اور معاملات طے کئے جاتے تھے)

نتائج و عبر

عبرت ہی عبرت

پچھلی امتوں اور قوموں کے واقعات صرف قصہ یا کہانیاں نہیں ہیں بلکہ عبرت و نصیحت کے لئے سرمایہ ہیں۔ ان میں جہاں تاریخ و سیرت پائی جاتی ہے وہاں نتائج و انجام کا بہت بڑا ذخیرہ بھی ہاتھ آتا ہے جو قوموں کے عروج و زوال کے اسباب پیدا کرتا ہے۔ قرآن حکیم نے انبیاء سابقین کے مسلسل تذکرے کے بعد انجام و نتیجے کے طور پر خلاصہ کلام اس طرح بیان کیا ہے:-

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا
وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ،
وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ،
وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا،
وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ.

(العنکبوت آیت ۴۰)

آخر کار ہر ایک کو ہم نے اُسکے جُرم میں پکڑلیا۔
پھر اُن میں سے بعض پر ہم نے سخت طوفانی ہوا بھیجی، (جیسے قوم عاد)
اور اُن میں سے بعض کو زبردست دھماکے نے پکڑلیا، (جیسے قوم ثمود)

اور اُن میں سے بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا، (جیسے قارون)
اور اُن میں سے بعض کو ہم نے ڈبو دیا، (جیسے فرعون اور اُسکے لشکر)
اور اللہ ایسا نہ تھا کہ اُن پر ظلم کرتا لیکن یہی لوگ اپنے اوپر ظلم کیا کرتے تھے۔

یہ تمام واقعات جو یہاں تک بیان کئے گئے ہیں اُن کا روئے سخن دو طرف ہے:۔

ایک تو یہ کہ اہل ایمان کو اسمیں وعظ و تذکیر ہے کہ وہ پست ہمت اور دل شکستہ نہ ہوں، مشکلات اور مصائب میں صبر و استقلال قائم رکھیں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں۔ انجام حق و صداقت کا ہی ہوگا اور ظالموں کو شکست و رسوائی ہوگی۔

دوسرے اُن ظالموں کو بھی سنایا جا رہا ہے جو انبیاء کی تعلیمات و ہدایات کو اہمیت نہیں دے رہے ہیں اُنھیں جو مہلت دی جارہی ہے وہ خدائی ڈھیل ہے جو قدیم زمانے سے مجرم قوموں میں اللہ کی سنت چلی آرہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس حلم و بُرد باری کا یہ مطلب نہیں کہ اگر بغاوت و سرکشی پر فوراً پکڑا نہیں جارہا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجرموں پر کوئی انصاف کرنے والی طاقت نہیں ہے اور زمین پر جس کا جو جی چاہے بیخوف اختیار کرتا رہے؟

یہ غلط فہمی جس انجام سے دوچار کرکے رہے گی وہ وہی انجام ہے جو تم سے پہلے قوم نوحؑ اور قوم ابراہیمؑ، قوم لوطؑ، عاد و ثمود، قوم شعیبؑ دیکھ چکی ہیں اور جیسے قارون، فرعون، ہامان نے بھی دیکھا ہے۔

اس ضمن میں جتنی قوموں کا بھی ذکر کیا گیا ہے وہ سب کی سب شرک میں مبتلا تھیں اور اپنے معبودوں کے بارے میں ان کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ ہمارے حامی و مددگار اور نگراں ہیں۔ ہماری قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر کے تاریخی واقعات ہیں اُن کے یہ تمام عقائد و اوہام اس وقت بالکل بے بنیاد ثابت ہوئے جب اللہ کی طرف سے ان کی بربادی کا فیصلہ کر دیا گیا۔ اسوقت نہ کوئی دیو، دیوتا، نہ کوئی اوتار، نہ کوئی ولی، نہ روح، نہ جن و فرشتہ جسے وہ پوجتے تھے ان کی مدد کو آیا نہ ہی کوئی سفارش کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے نظام کائنات کا اعتراف کئے بغیر یہ سارے بے بنیاد سہاروں پر کبھی بھی اپنا نظام حیات تعمیر نہیں ہوسکتا۔ اس کائنات میں جملہ اختیارات کا مالک

صرف اور صرف ایک رب ہے۔ اُسی کا سہارا سہارا ہے۔ اُسی پر اعتماد قابل اعتماد ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (بقرہ آیت ۲۵۶)

"جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا اُس نے مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے۔"

طاغوت کا صحیح ترجمہ اردو زبان میں مشکل ہے اسکے لئے قریب ترین ترجمہ شیطان سے کیا جاسکتا ہے۔ عربی زبان میں اس کا وسیع ترین مفہوم ہے۔ یعنی ہر معبود باطل اور سرکش و گمراہ کرنے والا۔

معیارِ دیانت | حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم کو اس طرح نصیحت کرتے ہیں:-

"اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی واضح رہنمائی آگئی ہے۔ لہٰذا اب وزن اور پیمانے امانت و دیانت سے پورے کرو، لوگوں کو اُن کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو، اس طرح زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اسکی اصلاح ہو چکی ہے، اسی میں تمہاری بھلائی ہے اگر واقعی تم مومن ہو۔"

(اعراف آیت ۸۵)

حضرت شعیب علیہ السلام کے اس خطاب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ خود مدعی ایمان تھے جیساکہ بنی اسرائیل ابتداً مسلمان تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد چھ آٹھ سو برس تک مشرک اور بداخلاق قوموں کے درمیان رہتے رہتے یہ لوگ بھی شرک اور بداخلاقیوں میں مبتلا ہوگئے تھے مگر اس کے باوجود ایمان کا دعویٰ اور اسپر فخر برقرار تھا۔

حضرت شعیب علیہ السلام اپنی اس بگڑی قوم کو فہمائش کرتے ہیں کہ اگر تم مومن ہو تو تمہارے نزدیک خیر و بھلائی، راست بازی و دیانت ہونی چاہیئے۔ ناپ تول میں کمی زیادتی دین و دیانت کا تقاضہ نہیں اور یہ بات دیانت کے تقاضے سے بالکل مختلف ہے۔ ایمان کا دعویٰ ہو اور پھر اُس کے تقاضے کے خلاف عمل ہو یہ سراسر دھوکہ ہے۔

سنت اللہ | قرآن حکیم نے حضرت شعیب علیہ السلام اور اِن سے پہلے کے انبیاء

کا مسلسل تذکرہ کرنے کے معاً بعد یہ جامع ضابطہ بیان کیا ہے :-

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں نبی بھیجا ہو اور اس بستی کے لوگوں کو پہلے تنگی اور سختی میں مبتلا نہ کیا ہو، اس خیال سے کہ شاید وہ نرم پڑیں۔ پھر ہم نے اُن کی بدحالی کو خوش حالی سے بدل دیا۔ یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پھولے اور کہنے لگے کہ ہمارے آباء واجداد پر بھی اچھے اور بُرے دن آتے رہے ہیں۔ آخر کار ہم نے انھیں اچانک پکڑ لیا اور انھیں خبر تک نہ ہوئی۔

اور اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقوی کی روش اختیار کرتے تو ہم اِن پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔ مگر انھوں نے (نبیوں کو) جھٹلایا۔ لہذا ہم نے اُس بُری کمائی کے عوض میں اُنھیں پکڑ لیا۔

پھر کیا اُن بستیوں کے لوگ اب اس سے بے خوف ہوگئے ہیں کہ ہماری گرفت کبھی اچانک اُن پر رات کے وقت نہ آئیگی جبکہ وہ سوتے پڑے ہوں ؟ یا اُنہیں اطمینان ہوگیا ہے کہ ہماری پکڑ کبھی یکایک اُن پر دن کے وقت نہ آپڑے جبکہ وہ کھیل کو د رہے ہوں۔ کیا یہ لوگ اللہ کی پکڑ سے بے خوف ہیں ؟ حالانکہ اللہ کی پکڑ سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہے۔

(اعراف آیت ۹۴ تا ۹۹)

تاریخ کا یہ احمقانہ تصوّر ہر دور میں دُہرایا گیا کہ حالات کا اُتار چڑھاؤ، قسمت کا بناؤ، بگاڑ، زمانے کے حوادث و انقلاب اللہ حکیم و دانا کے تدبیر و انتظام پر نہیں بلکہ گردش زمانہ کا نتیجہ ہیں، کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں بڑی، اچھے اور بُرے دن اتفاقی حوادث ہیں۔ یہی وہ احمقانہ ذہنیت ہے جس کا نقشہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسطرح کھینچا ہے :-

لَا يَزَالُ الْبَلَاءُ بِالْمُؤْمِنِ حَتّٰى يَخْرُجَ نَقِيًّا مِّنْ ذُنُوْبِهٖ، وَالْمُنَافِقُ مَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْحِمَارِ لَا يَدْرِيْ فِيْمَ رَبَطَهٗ اَهْلُهٗ وَلَا فِيْمَ اَرْسَلُوْهُ۔ (الحدیث)

آفات وحوادث مومن کی اصلاح کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ گناہوں سے پاک صاف ہوکر نکلتا ہے۔ لیکن منافق کی حالت بالکل گدھے کی سی ہوتی ہے جو یہ نہیں سمجھتا کہ اُسکے مالک نے اُسے کیوں باندھا تھا اور کیوں اسے چھوڑ دیا۔ (الحدیث)

پس جب کسی قوم کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ نہ مصائب سے اُس کا دل خدا کے آگے جُھکتا ہے اور نہ نعمتوں پر وہ شکر گزار ہوتی ہے تو پھر اسکی بربادی اس طرح اسکے سر منڈلانے لگتی ہے جس طرح چیل کوّے کسی مُردار پر منڈلانے لگتے ہیں اور کچھ دیر نہیں لگتی کہ اُپر جھپٹ پڑیں۔

زمانے کا اُتار چڑھاؤ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے کچھ دنوں بعد مکّہ کے لوگوں نے آپ کی دعوت وتبلیغ کے خلاف سخت اور تکلیف دہ رویہ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا کی :-

اِلٰہی! حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں جیسا ہفت سالہ قحط پڑا تھا ویسے ہی قحط سے مشرکین مکّہ کے مقابلے میں میری مدد فرما!

چنانچہ اللہ تعالےٰ نے آپکی دُعا قبول فرمائی اور اہل مکّہ کو سخت قحط میں مبتلا کر دیا نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگوں نے مُردار کھانا شروع کر دیا۔ چمڑے اور ہڈیاں تک کھا گئے۔ آخر کار مکّہ کے لوگوں نے جن میں ابوسفیان پیش پیش تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ہمارے لئے اپنے رب سے دُعا کیجیے۔ آپؐ نے دُعا فرمائی آنًا فانًا قحط جاتا رہا۔ جب اُن کے بھلے دن آئے تو لوگوں کی گردنیں پہلے سے زیادہ اکڑ گئیں اور جن لوگوں کے دل کچھ نرم پڑے تھے اُن کو اشرار قوم نے یہ کہہ کہہ کر ایمان لانے سے روک دیا کہ میاں یہ تو زمانے کا اُتار چڑھاؤ ہے۔ پہلے بھی قحط آتے رہے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے البتہ اس مرتبہ ایک لمبا قحط پڑ گیا، ولاحول ولا قوۃ الا باللہ العزیز الحکیم۔

دین بیزاری مرض

حضرت شعیب علیہ السلام کی اس تبلیغ پر کہ اللہ کی عبادت

کرو اُسکے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ناپ تول میں کمی نہ کرو، آج میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں مگر مجھے اندیشہ ہے کہ کل تم پر ایسا دن آنے والا ہے جسکا عذاب سب کو گھیر لیگا۔ (ہود آیت ۸۴)

قوم کے لوگوں نے جواب دیا اے شعیب کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم اِن سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جنکی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں؟ یا یہ کہ ہم کو اپنے مال و دولت میں اپنے منشار کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟ بس تو ہی ایک عالی ظرف اور راستباز آدمی رہ گیا ہے؟ (ہود آیت ۸۷)

یہ طعن آمیز فقرہ جسکی روح آج بھی آپ اپنے موجودہ ماحول میں پائیں گے۔ جو بندے دین سے غافل فسق و فجور میں مبتلا ہیں وہ ایسے ہر موقعہ پر ایک دیندار کو یہ طعنہ دینے سے گریز نہیں کرتے کہ جناب انہیں "دینداری کا مرض" لگ گیا ہے۔ یہ بہت پاکیزہ آدمی ہیں اِنپر نماز کا دورہ پڑ گیا ہے، اب یہ وعظ و نصیحت کا درس دینے لگ گئے ہیں۔ دراصل دینداری کو فاسق و فاجر قسم کے لوگ ایک مستقل خطرہ خیال کرتے ہیں۔ چونکہ نماز دینداری کا سب سے پہلا اور نمایاں وصف ہے اس لئے جب کسی شخص کو اپنے میں نماز پڑھتا دیکھتے ہیں تو انھیں فوراً احساس ہوجاتا ہے کہ اس شخص پر "مرض دینداری" کا حملہ ہوگیا ہے۔ (اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم)

حضرتِ شعیب علیہ السلام کی سیرت میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ لمبی لمبی نمازیں پڑھا کرتے تھے ان کے رکوع و سجود بھی طویل ہوتے تھے۔ قوم نے جو مرض "خدا بیزاری" میں مبتلا تھی یہ طعنہ دیا:-

"اے شعیبؑ کیا تجھے تیری نماز حکم دیتی ہے کہ ہم لوگ اپنے طور وطریقے چھوڑ دیں"

نئی روشنی نہیں، تاریک خیالی

حضرت شعیب علیہ السلام کو اُنکی قوم یہ جواب دیتی ہے :-

"ہم کو اپنے مال و دولت میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف

کرنے کا پورا اختیار ہے۔ (ہود آیت ۸۷)

یہ اسلام اور جاہلیت کا اختلاف ہے۔ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کے سوا جو طریقہ بھی ہے غلط ہے۔ اور جاہلیت کا نظریہ یہ ہے کہ باپ دادا سے جو طریقہ چلا آرہا ہو انسان کو اسکی پیروی کرنی چاہیئے اور اس تقلید کے لئے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ باپ دادا کا طریقہ ہے۔

علاوہ ازیں اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ دین و مذہب اللہ کی بندگی ہی کے دائرے میں محدود نہیں بلکہ تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست غرض زندگی کے تمام شعبوں میں ہونی چاہیئے۔ انسان کسی چیز پر بھی اللہ کی مرضی سے آزاد ہو کر خود مختارانہ تصرف کا حق نہیں رکھتا۔

جاہلیت کا نظریہ یہ ہے کہ دین و مذہب کا تعلق صرف پوجا پاٹ مراسم کی حد تک ہے رہے زندگی کے دُنیوی معاملات اسمیں انسان کو پوری آزادی ملنی چاہیئے جس طرح چاہیں کام کریں۔ زندگی کو مذہبی اور دُنیوی دائروں میں الگ الگ تقسیم کرنے کا تخیل آج کوئی نیا تخیل نہیں بلکہ آج سے تقریباً چار ہزار برس پہلے بھی حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو اس تقسیم پر ویسا ہی اصرار تھا جیسا آج اہل مغرب اور اُن کے مشرقی شاگردوں کو ہے۔

یہ فی الحقیقت کوئی "نئی روشنی" نہیں ہے بلکہ یہ وہی "پرانی تاریک خیالی" ہے جو ہزار ہا برس پہلے کی جاہلیت میں بھی اسی شان وآن سے پائی جاتی تھی۔

سنگ دلی نہیں رحمدلی

وعظ و تذکیر کے اختتام پر حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم کو "دعوت استغفار" دیتے ہیں:-

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ۔

(ہود آیت ۹۰)

"اپنے رب سے معافی مانگو اور اُسکی طرف پلٹ آؤ، بے شک میرا رب رحیم ہے محبت کرنے والا ہے۔"

یعنی اللہ تعالےٰ کو اپنی مخلوق سے کوئی دشمنی عداوت نہیں کہ کسی کو خواہ مخواہ سزا

دینے ہی کو اس کا جی چاہے اور اپنے بندوں کو مار مار کر ہی اُسکا جی خوش ہو۔
اللہ کے بندے جب سرکشیوں سے باز نہیں آتے اور اُس حد سے بھی گزر جاتے ہیں جو بندگی کے حدود میں ہوتی ہے تو پھر وہ قانونِ انصاف کو حرکت میں لے آتا ہے اور بادلِ ناخواستہ سزا دیتا ہے۔ ورنہ اُس کا حقیقی حال تو یہی ہے کہ انسان خواہ کتنے ہی قصور کرے جب بھی اپنے افعال پر نادم ہو کر اُسکی طرف پلٹ آتا ہے تو اُسکی دامنِ رحمت کو اپنے لئے وسیع تر پاتا ہے، کیونکہ اُسکو اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق سے بے پایاں محبت و پیار ہے۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسکی ایک نہایت بلیغ اور مؤثر مثال ارشاد فرماتے ہیں حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:۔

"ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چند قیدی گرفتار ہو کر آئے اِن میں ایک عورت بھی تھی جس کا شیرخوار بچہ کہیں چھوٹ گیا تھا اور وہ ایسی بے چین تھی کہ جس بچے کو پالیتی اپنے سینے سے چمٹا لیتی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حال دیکھ کر ہم لوگوں سے پوچھا بتاؤ اگر اس کا اس کو بچہ مل جائے تو کیا اپنے بچے کو اپنے ہاتھوں آگ میں پھینک دے گی؟
ہم نے بلا توقف عرض کیا ہرگز نہیں۔
ارشاد فرمایا:۔
اَللّٰهُ اَرْحَمُ بِعِبَادِهٖ مِنْ هٰذِهٖ بِوَلَدِهَا۔
(الحدیث)
"اللہ کا رحم اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ ہے جو یہ عورت اپنے بچے کے لئے رکھتی ہے۔"

اور یہ نکتہ بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیئے کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے بچوں کی پرورش کے لئے ماں باپ کے دل میں محبت پیدا کی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالےٰ اس محبت کو دلوں میں پیدا نہ کرتا تو ماں باپ سے بڑھ کر بچوں کا کوئی دشمن نہ ہوتا، کیونکہ سب سے بڑھ کر وہ انھی کیلئے

تکلیف دہ ہوتے ہیں۔

اب ہر شخص کے لئے یہ بات قابل غور ہے کہ جو خدا "محبتِ مادری" اور "شفقتِ پدری" کا خالق ہے خود اُس کے اندر اپنی مخلوق کے لئے کیسی کچھ محبت نہ ہوگی؟

خطیب الانبیاء حضرت شعیب علیہ السلام کا یہ وعظ آج کے انسانوں کے لئے بھی دعوتِ عمل دے رہا ہے۔

وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ۔ (ہود آیت ۹۰)

تذکرہ
سیّدنا موسیٰ و سیّدنا ہارون علیہم السلام
اور
قارون — فرعون — ھامان

تعارف حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سلسلۂ نسب چند واسطوں کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ اِن کے والد محترم کا اسم گرامی عمران اور والدہ محترمہ کا نام یوکابد بیان کیا جاتا ہے۔ سلسلۂ نسب اس طرح ہے :-

موسیٰ بن عمران بن قاہت بن لاوی بن یعقوب علیہ السلام۔

حضرت ہارون علیہ السلام سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے حقیقی بڑے بھائی ہیں جو عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تین چار سال بڑے تھے۔

حضرت عمران کے گھر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ایسے زمانے میں ہوئی جبکہ فرعون مصر اسرائیلی لڑکوں کے قتل کا فیصلہ کرچکا تھا اور اس کا سلسلہ عملاً جاری تھا شہر میں جا بجا ایسے کارندے مامور تھے جو اسرائیلی خاندان کی عورتوں پر نگرانی کیا کرتے تھے۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور اُن کے اہل خاندان ان کی ولادت کے وقت سخت پریشان تھے کہ کس طرح بچے کو قاتلوں کی نگاہ سے محفوظ رکھا جائے؟ اور یہ بات تذکرہ سیدنا یعقوب علیہ السلام میں آچکی ہے کہ بنی اسرائیل (اولاد یعقوب علیہ السلام) حضرت یوسف علیہ السلام کے دور حکومت میں ملک مصر آچکے تھے اور وہیں آباد بھی ہوگئے تھے اسطرح بنی اسرائیل حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درمیانی صدیوں میں ملک مصر ہی میں مقیم رہے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ سولہویں صدی قبل مسیح کا ہے۔ اثری تحقیقات کے مطابق آپ کا سن ولادت ۱۵۲۰ء قبل مسیح اور سال وفات ۱۴۰۰ء قبل مسیح بیان

کیا جاتا ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جس دورِ حکومت میں پیدا ہوئے اُس فرعون کا نام بعض مؤرخین ولید بن مصعب بن ریّان اور دوسرے مصعب بن ریّان بتاتے ہیں۔ اور بعض اہل تحقیق نے صرف ریّان یا ریان ابا لکھا ہے۔ ابن کثیرؒ کی رائے ہے اُسکی کنیت ابو مرہ تھی۔ یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ فرعون شاہانِ مصر کا لقب ہے کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں۔ اِن شاہان مصر کا سلسلہ تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہو کر ۳۳۲ء قبل مسیح تک اکتیس (۳۱) خاندان ملکِ مصر پر حکمراں رہے ہیں۔

الغرض حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اُس فرعونِ مصر کے زمانے میں ہوئی جبکہ "قتل اولاد" کا قانون مصر میں سختی کے ساتھ نافذ تھا۔ جوں توں کر کے والدین نے تین ماہ تک معصوم موسیٰ (علیہ السلام) کو ہر ایک کی نگاہ سے اوجھل رکھا اور اُنکی پیدائش کی مطلق کسی کو خبر نہ ہونے دی۔ لیکن جاسوسوں کی نگرانی اور حالات کی نزاکت کی وجہ سے زیادہ عرصے تک اس واقعہ کے پوشیدہ رہنے کی توقع کم ہو تی گئی۔ اس لئے ان کی والدہ محترمہ سخت پریشان رہنے لگیں۔

اس سخت و نازک وقت خداوندِ قدوس کی دستگیری ہوئی جسکی تفصیل "حدیث الفتون" کے نام سے سنن نسائی کتاب التفسیر میں موجود ہے۔

ابن کثیرؒ نے بھی اپنی تفسیر میں اس طویل حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس روایت کو مرفوعاً یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان قرار دیا ہے اور اسکے بعد اپنا یہ فیصلہ بھی درج کیا ہے :-

وَصَدَّقَ ذٰلِكَ عِنْدِیْ۔

یعنی اس حدیث کا مرفوع ہونا میرے نزدیک درست ہے۔

اسکے بعد یہ بھی نقل کیا ہے کہ ابن جریرؒ اور ابن ابی حاتمؒ نے اپنی اپنی تفسیروں میں یہ روایت نقل کی ہے مگر موقوفاً یعنی حضرت ابن عباسؓ کا اپنا کلام قرار دیا ہے۔ مگر ابن کثیر جیسے ناقد حدیث اور نسائیؒ جیسے امام حدیث نے اسکو مرفوع تسلیم کیا ہے۔ علاوہ ازیں جن محدثین نے اِسکو مرفوع تسلیم نہیں کیا انھوں نے بھی اسکے مضمون پر کوئی نکیر نہیں کی ہے۔ واللہ اعلم۔

الغرض پوری حدیث کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام

کی ولادت اور اُس وقت کے حالات کا تفصیلی علم حاصل ہوتا ہے۔

جیسا کہ لکھا گیا یہ حدیث حدیثُ الفُتُون کے نام سے موسوم ہے۔ فتون کا لفظ آیت قرآنی سے لیا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنے احسانات شمار کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا:۔

وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا (طٰہٰ آیت ۴۰)

یعنی اے موسیٰ ہم نے آپ کو بار بار مبتلائے آزمائش کیا۔

(قالہٗ الضحاک)

حَدِیْثُ الفُتُوْن

قاسم بن ابی ایوب فرماتے ہیں کہ مجھ سے سعید بن جبیرؒ نے بیان کیا کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی:۔ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا۔

اور تونے (اے موسیٰ) ایک شخص کو مار ڈالا پھر بچادیا ہم نے تجھکو اُس غم سے اور ہم نے تجھ کو بار بار مبتلائے آزمائش کیا (اور پھر اس سے خلاصی دی)

اسمیں لفظ فتون سے کیا مراد ہے؟ (کتنی ایک آزمائش)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس کا واقعہ بڑا طویل ہے کل صبح سویرے آجانا بتادوں گا، جب اگلا دن آیا میں سویرے ہی حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوگیا تاکہ کل کا وعدہ یاد دلاؤں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا سنو ایک روز فرعون اور اسکے ہمنشینوں میں اس بات کا ذکر آیا کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ فرمایا تھا کہ انکی ذرّیت میں انبیاء اور بادشاہ پیدا فرماتے رہیں گے۔ بعض شرکاء مجلس نے کہا ہاں بنی اسرائیل تو اسکے منتظر ہیں جس میں اُن کو ذرا بھی شک نہیں کہ اُن کے اندر کوئی نبی ورسول پیدا ہوگا اور پہلے اِن لوگوں کا خیال تھا کہ وہ نبی حضرت یوسف بن یعقوب علیہ السلام ہیں جب اُن کی وفات ہوگئی تو کہنے لگے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو وعدہ کیا گیا تھا یہ اُس کے مصداق نہیں (کوئی اور نبی پیدا ہوگا جو اس وعدہ کو پورا کریگا) فرعون نے جب یہ بات

سُنی تو فکرمند ہوگیا کہ اگر بنی اسرائیل (اولادِ یعقوب) میں جنکو اس نے غلام بنا رکھا ہے کوئی نبی و رسول پیدا ہوگیا تو وہ ان کو مجھ سے آزاد کرالے گا۔ اس لئے حاضرین مجلس سے دریافت کیا کہ اس آفت سے بچنے کا کیا راستہ ہے؟ حاضرین مجلس آپس میں مشورے کرتے رہے آخر سب کی رائے اس بات پر متفق ہوگئی کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو اُسکو قتل کر دیا جائے تاکہ نبی کے پیدا ہونے اور قوم بنی اسرائیل کو آزاد کرانیکا امکان ہی ختم ہوجائے۔ چنانچہ ایسے آدمی مقرر کئے گئے جو بنی اسرائیل کے گھروں میں اچانک جاکر معائنہ کرتے جہاں کوئی لڑکا نظر آتا اسکو اُٹھالے آتے اور ذبح کرکے دفن کر دیتے۔ قتلِ اولاد کا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا لیکن دربار کے چند آدمیوں کو احساس ہوا کہ اب تو ہماری سب خدمتیں اور محنت ومشقت کے کام بنی اسرائیل ہی انجام دیتے ہیں۔ اگر یہ سلسلۂ قتل جاری رہا تو اس قوم کے بوڑھے تو اپنی موت مرجائیں گے اور بچے ذبح ہوتے رہیں گے تو آئندہ بنی اسرائیل میں کوئی مرد نہ رہے گا جو ہماری اور ہماری اولاد کی خدمت انجام دے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ مشقت کے سارے کام ہمیں خود انجام دینا پڑے گا۔ اس اندیشہ کے بعد اب یہ رائے قرار پائی کہ ایک سال میں پیدا ہونیوالے لڑکوں کو چھوڑ دیا جائے، دوسرے سال میں پیدا ہونے والے لڑکوں کو ذبح کر دیا جائے اس طرح بنی اسرائیل میں کچھ جوان بھی رہیں گے جو اپنے بوڑھوں کی جگہ لے سکیں اور پھر ان کی تعداد اتنی زیادہ بھی نہ ہوگی جس سے فرعونی حکومت کو خطرہ ہوسکے، یہ بات سب کو پسند آئی اور یہی قانون نافذ کر دیا گیا۔

ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ایک حمل ایسے وقت ہوا کہ جبکہ بچوں کو زندہ چھوڑ دینے کا سال تھا اسمیں حضرت ہارون پیدا ہوئے، فرعونی قانون کی رُو سے انھیں کوئی خطرہ نہ تھا۔

دوسرا سال جو لڑکوں کے قتل کا تھا اسمیں حضرت موسیٰ بطنِ مادر میں آئے تو اُن کی والدہ پر غم وخوف طاری تھا کہ اب اگر لڑکا پیدا ہوگا تو قتل کر دیا جائے گا۔

حضرت ابن عباسؓ نے قصے کو یہاں تک پہنچا کر فرمایا کہ اے ابن جبیرؒ فُتُون یعنی آزمائش کا یہ پہلا موقعہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام ابھی دُنیا میں پیدا بھی نہیں ہوئے کہ اُن کے قتل کا منصوبہ موجود تھا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔

اس وقت اللہ تعالٰے نے اُنکی والدہ کو بذریعہ وحی یہ تسلی دی :۔

فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ اِنَّا رَادُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۔

(سورہ قصص آیت ۷)

"جب تم کو اپنے بچے پر اندیشہ ہو تو اُسکو دریا میں ڈالدو اور تم کوئی خوف اور غم نہ کرو ہم اُسکو تمہارے پاس واپس کردینگے اور اُسکو رسول بنانے والے ہیں "۔

جب موسیٰ علیہ السلام پیدا ہو گئے تو اللہ تعالٰے نے والدہ کو حکم دیا کہ اسکو ایک تابوت (صندوق) میں رکھ کر دریا (نیل) میں ڈال دو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے حکم کی تعمیل کردی۔

جب وہ تابوت کو دریا کے حوالہ کر چکی تو شیطان نے وسوسہ ڈالا کہ یہ تو نے کیا کام کیا؟ اگر بچہ تیرے پاس رہ کر ذبح بھی کر دیا جاتا تو اپنے ہاتھوں سے کفن دفن کر کے کچھ تسلّی تو ہو جاتی اب تو اس کو دریا کے جانور کھا جائینگے۔

(موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اسی غم و فکر میں مبتلا تھیں کہ) دریا کی موجوں نے تابوت کو ایک ایسی چٹان پر پھینک دیا جہاں فرعون کی باندیاں لونڈیاں نہانے دھونے کے لئے جایا کرتی تھیں اُنھوں نے جب یہ تابوت دیکھا تو اُٹھا لیا اور کھولنے کا ارادہ کیا تو اُن میں سے کسی نے کہا اگر اسمیں سے کچھ رکھ لیا ہوگا اسکے بعد ہم کچھ بھی کہیں یقین نہ آئے گا۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس تابوت کو اسی طرح اُٹھا کر فرعون کی بیوی کے آگے رکھ دینا چاہیئے۔

فرعون کی بیوی نے جب تابوت کھولا تو اسمیں ایک ایسا لڑکا دیکھا جس کو دیکھتے ہی اُس کے دل میں اُسکی اتنی محبت پیدا ہو گئی جو اس سے پہلے کسی بچے سے نہیں ہوئی۔

دوسری طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ بوسوسۂ شیطانی اللہ تعالٰے کے اس وعدہ کو بھول گئیں اور حالت یہ ہوگئی :۔

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فَارِغًا۔ الآیہ (سورہ قصص)

یعنی موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا دل ہر خوشی اور ہر خیال

خالی ہوگیا (صرف موسیٰ کی فکر غالب آگئی) ادھر جب لڑکوں کے قتل پر مامور پولیس والوں کو فرعون کے گھر میں ایک لڑکا آجانے کی خبر ملی تو وہ چھُریاں لیکر فرعون کی بیوی کے پاس پہنچ گئے کہ یہ لڑکا ہمیں دے دو تاکہ ذبح کردیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے یہاں پہونچکر پھر ابن جبیرؒ کو مخاطب کیا کہ اے ابن جبیرؒ فُتُون یعنی آزمائش کا یہ (دوسرا) واقعہ ہے۔

فرعون کی بیوی نے اِن لشکری لوگوں کو جواب دیا کہ ابھی ٹھیرو کہ صرف ایک لڑکے سے تو بنی اسرائیل کی قوت نہیں بڑھ جائیگی میں فرعون سے اس بچے کی جان بخشی کراتی ہوں۔

اگر فرعون نے بخش دیا تو یہ بہتر ہوگا ورنہ تمہارے معاملہ میں دخل نہ دوں گی اور یہ بچہ تمہارے حوالہ ہوگا۔ یہ کہہ کر وہ فرعون کے پاس گئی اور کہنے لگی کہ یہ بچہ میری اور آپکی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

فرعون نے کہا ہاں تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہونا تو معلوم ہے (کیونکہ اس وقت تک کوئی اولاد نہ تھی) مگر مجھ کو اسکی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اسکے بعد حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اُس ذات کی جسکی قسم کھائی جاسکتی ہے اگر فرعون اُس وقت بیوی کی طرح اپنے لئے بھی موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیتا تو اللہ تعالےٰ اُسکو بھی ہدایت عطا کردیتا جیسا کہ اُسکی بیوی کو ہدایتِ ایمان عطا کی۔

(بہر حال بیوی کے کہنے پر فرعون نے اُس لڑکے کو قتل سے آزاد کر دیا) اب فرعون کی بیوی نے اسکو دودھ پلانے کے لئے اپنے آس پاس کی عورتوں کو بُلایا، سب نے چاہا کہ موسیٰ کو دودھ پلانے کی خدمت انجام دیں مگر بچہ کسی کا دودھ پینے کو تیار نہیں تھا۔ اب فرعون کی بیوی کو یہ فکر ہوگئی کہ جب یہ کسی کا دودھ نہیں لیتا تو زندہ کیسے رہے گا۔ اس لئے اپنی کنیزوں کے سپرد کیا کہ اسکو بازار اور لوگوں کے مجمع میں لیجائیں شاید کسی عورت کا دودھ قبول کرلے۔

دوسری طرف موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے بے چین ہوکر اپنی بیٹی (موسیٰ کی بہن) کو کہا کہ ذرا باہر جاکر تلاش کر اور لوگوں سے دریافت کر کہ اُس تابوت اور بچہ کا

کیا انجام ہوا؟ وہ زندہ بھی ہے یا دریائی جانوروں کی غذا بن چکا ہے۔

اس وقت تک اُن کو اللہ تعالےٰ کا وہ وعدہ یاد نہیں آیا جو حالتِ حمل میں اُن سے بچے کی حفاظت اور چند روز مفارقت کے بعد واپسی کا کیا گیا تھا، حضرتِ موسیٰ کی بہن باہر نکلیں تو (اللہ کی قدرت کا مشاہدہ کیا) فرعون کی کنیزیں اُس بچے کو لئے ہوئے دودھ پلانے والی عورتوں کی تلاش میں ہیں۔ جب بہن نے یہ معاملہ دیکھا کہ بچہ کسی کا دودھ نہیں لیتا اور یہ کنیزیں پریشان ہیں تو اِن سے کہا کہ میں تمہیں ایک ایسے گھرانے کا پتہ دیتی ہوں جہاں مجھے امید ہے کہ یہ اُن کا دودھ بھی پی لے گا اور وہ لوگ اس کو خیر خواہی ومحبت کے ساتھ پرورش بھی کریں گے۔ یہ سُن کر کنیزوں نے اُس کو شبہ میں پکڑ لیا کہ یہ عورت شاید اس بچے کی ماں یا قریبی عزیز ہے جو اتنے وثوق کے ساتھ کہہ رہی ہے کہ وہ گھر والے اسکے خیر خواہ اور ہمدرد ہیں (اسوقت یہ بہن بھی پریشان ہوگئیں)

حضرت ابن عباسؓ نے اس جگہ پہنچکر پھر ابن جبیرؒ کو خطاب کیا کہ یہ (تیسرا) واقعہ فُتُون یعنی آزمائش کا ہے۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے بات بنائی اور کہا کہ میری مراد اس گھر والوں کے ہمدرد وخیر خواہ ہونے سے مراد یہی ہے کہ فرعونی دربار تک اُس خاندان کی رسائی ہوگی جس سے اُنکو منافع ملنے کی اُمید ہوگی اس لئے وہ اس بچے کی محبت وخیر خواہی میں کوئی کسر نہیں کریں گے۔ یہ سُن کر کنیزوں نے اُن کو چھوڑ دیا۔

یہ واپس آکر اپنی والدہ کو واقعہ کی خبر دی اور اپنے ساتھ لیکر اُس جگہ پہنچیں جہاں یہ کنیزیں جمع تھیں، کنیزوں کے کہنے پر اُنھوں نے بھی بچے کو گود میں لیا، موسیٰؑ فوراً اُنکے سینے سے چمٹ کر دودھ پینے لگے یہاں تک کہ سیر شکم ہوگئے، یہ خوشخبری فرعون کی بیوی کو پہنچی کہ اس بچے کے لئے دودھ پلانے والی مل گئی۔ فرعون کی بیوی نے اُن کو طلب کیا اُنھوں نے آکر حالات دیکھے اور یہ محسوس کیا کہ فرعون کی بیوی میری ضرورت محسوس کر رہی ہے تو ذرا خودداری سے کام لیا، فرعون کی بیوی نے کہا کہ آپ یہاں محل میں رہ کر اس بچے کو دودھ پلایا کریں کیونکہ مجھے اس بچے سے اتنی محبت ہے کہ میں اسکو اپنی نظروں سے غائب دیکھ نہیں سکتی۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے کہا میں تو اپنے گھر اور بچوں کو چھوڑ کر یہاں قیام نہیں کرسکتی۔

ہاں اگر آپ اس بات پر راضی ہوں کہ بچہ میرے سپُرد کریں میں اپنے گھر رکھ کر

اسکو دودھ پلاؤں گی اور یہ وعدہ کرتی ہوں کہ بچے کی خیر خواہی اور حفاظت میں ذرہ برابر کوتاہی نہ کروں گی۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو اسوقت اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ یاد آگیا جسمیں کہا گیا تھا کہ چند روز کی جدائی کے بعد ہم موسیٰ کو تمہارے پاس واپس کردینگے اس لئے وہ اپنی بات پر مزید اصرار کرنے لگیں۔ فرعون کی بیوی نے مجبور ہوکر اُن کی بات مان لی، کیونکہ بچہ کسی طرح بھی کسی کا دودھ پینے کو تیار نہ تھا۔ اس طرح والدہ نے اُسی دن موسیٰ کو اپنے گھر لے آئیں اور اللہ تعالےٰ کا وہ وعدہ پورا ہوا کہ اس بچے کو دریا میں ڈال دے اور تو نہ خوف کر نہ غم کر بیشک ہم اُس بچے کو تیرے پاس پہنچا دیں گے۔

کچھ عرصہ بعد فرعون کی بیوی نے اُن کی والدہ سے کہا کہ بچے کو لاکر دکھلا جاؤ۔

اِدھر سب درباریوں کو حکم دیا کہ یہ بچہ آج ہمارے محل میں آرہا ہے تم میں کوئی بھی ایسا نہ رہے جو اس کا اکرام نہ کرے اسکی نگرانی میں خود کرتی ہوں کہ تم لوگ اس معاملہ میں کیا کرتے ہو۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ جس وقت موسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کے ساتھ گھر سے نکلے ہیں اُسی وقت سے اُن پر تحفوں کی بارش ہونے لگی۔ جب فرعون کی بیوی کے ہاں پہنچے تو اس نے بھی اپنے پاس سے خاص تحفے اور ہدایا پیش کئے۔ فرعون کی بیوی بچے کو دیکھ کر بیحد مسرور ہو رہی تھی اسکے بعد کہا کہ اب میں اس بچے کو فرعون کے پاس لے جاتی ہوں تاکہ وہ بھی خوش ہو۔ جب وہ لے کر فرعون کے پاس پہنچی تو فرعون نے فرطِ مسرت سے اُنکو گود میں لے لیا۔ موسیٰ نے غیر شعوری طور پر فرعون کی ڈاڑھی پکڑ کر زمین کی طرف جھکا دیا، اسوقت دربار کے لوگوں نے فرعون سے کہا کہ آپ نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی ابراہیم (علیہ السلام) سے جو وعدہ کیا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک رسول پیدا ہوگا جو آپ کے ملک و مال کا وارث ہوگا۔ آپ پر غالب آئے گا اور آپکو شکست دے گا۔

یہ وعدہ پورا ہو رہا ہے (ویسے بھی اس بچے کی جان بخشی پر دربار میں سرگوشیاں جاری تھیں) اس اندیشہ پر فرعون متنبہ ہوا اور اُسی وقت جلادوں کو طلب کیا تاکہ بچے کو ذبح کر دیا جائے۔

حضرت ابن عباسؓ نے یہاں پہنچکر پھر ابن جبیرؓ کو خطاب کیا کہ یہ چوتھا واقعہ

فُتُون یعنی آزمائش کا ہے کہ موت پھر منڈلانے لگی۔
فرعون کی بیوی نے یہ جو منظر دیکھا تو کہا کہ جناب والا! آپ یہ بچّہ مجھے دے چکے ہیں پھر اب یہ کیا معاملہ ہو رہا ہے۔؟
فرعون نے کہا کہ تم یہ نہیں دیکھتیں کہ یہ لڑکا اپنے عمل سے گویا یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ مجھ کو زمین پر پچھاڑ کر غالب آجائے۔
بیوی نے کہا (کہ بچّے نے یہ معاملہ بچپن کی عام عادت کے مطابق شوخی اور غیر شعوری طور پر کیا ہے) تجربے کے طور پر آپ پھر اسکا امتحان لیں دو آگ کے انگارے اور دو عدد موتی منگوائیے اور دونوں اس بچّے کے آگے رکھ دیجئے۔ اگر یہ موتیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا اور آگ کے انگاروں سے بچا تو آپ سمجھ لیں کہ اس بچے کے افعال عقل وشعور کے ساتھ دیدہ ودانستہ ہیں۔ اور اگر یہ بچہ موتیوں کے بجائے آگ کے انگاروں کی طرف ہاتھ بڑھائے تو یہ یقین ہوجائے گا کہ یہ کام کسی عقل وشعور سے نہیں کیا گیا کیونکہ کوئی عقل والا انسان فطرۃً آگ کو ہاتھ میں نہیں لیتا (فرعون نے اس معقول تجویز کو پسند کیا) دو انگارے اور دو عدد موتی بچّے کے سامنے رکھ دیئے گئے تو بچّے نے انگارے اُٹھائے (اور منھ میں ڈال لئے) فرعون نے جب یہ دیکھا تو فوراً اُن کے ہاتھ سے انگارے چھین لئے (بعض دوسری روایات میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اولاً موتیوں کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا کہ جبرئیل امین نے اُن کا ہاتھ انگاروں کی طرف پھیر دیا) (اس طرح فرعون کی بیوی کی بات چل گئی) کہا دیکھا آپ نے بچّے کا ڈاڑھی پکڑنا کیا حیثیت رکھتا ہے؟
اس طرح اللہ تعالےٰ نے پھر یہ موت بھی موسیٰ علیہ السّلام سے ٹلا دی کیونکہ اُن سے آگے کام لینا تھا (اسطرح موسیٰ علیہ السّلام فرعون کے شاہانہ اعزاز و اکرام اور شاہانہ خرچ پر اپنی والدہ کی نگرانی میں پرورش پاتے رہے یہاں تک کہ جوان ہوگئے)
اُن کے شاہی اکرام و اعزاز کو دیکھ کر فرعون کے لوگوں کو بنی اسرائیل پر وہ ظلم اور ستم کرنے کی ہمت کم ہوتی رہی جو اس سے پہلے آل فرعون کی طرف سے ہمیشہ بنی اسرائیل پر ہوتا رہتا تھا۔
ایک روز موسیٰ علیہ السّلام شہر کے کسی گوشہ میں چلے جارہے تھے کہ دیکھا کہ دو آدمی آپسمیں لڑ رہے ہیں جنمیں ایک فرعونی (آل فرعون سے) تھا اور دوسرا

اسرائیلی (قوم موسیٰ سے) تھا۔

اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السّلام کو دیکھ کر امداد کے لئے پکارا۔ موسیٰ علیہ السّلام کو فرعونی کی بے جا جسارت پر غصّہ آگیا جبکہ وہ جانتا ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) اسرائیلیوں کی حفاظت و مدد کرتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السّلام کو ممکن ہے اللہ تعالےٰ نے اُن کی والدہ محترمہ یا کسی اور ذریعہ سے یہ معلوم کروا دیا ہو کہ یہ دودھ پلانے والی عورت ہی تمہاری حقیقی والدہ ہیں اور یہ کہ موسیٰ بھی خود اسرائیلی ہیں۔ غرض موسیٰ علیہ السّلام نے شدید غضب کی حالت میں اُس فرعونی کے ایک مُکّا رسید کیا جسکو وہ برداشت نہ کرسکا اور وہیں مر گیا۔ اتفاق سے وہاں کوئی اور آدمی موجود نہ تھا جو فرعون تک مخبری کردے جب یہ فرعونی موسیٰ علیہ السّلام کے ہاتھ مارا گیا تو انھوں نے استغفار کیا اور کہا یہ کام شیطان کی طرف سے ہوا ہے۔ پھر بارگاہِ الٰہی میں مغفرت طلب کی۔

"اے میرے پروردگار میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے (کہ یہ خطا مجھ سے سرزد ہوگئی) مجھے معاف فرما دیجئے، اللہ تعالےٰ نے معاف فرما دیا کیونکہ وہ ہی معاف کرنے والا اور بہت رحمت والا ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السّلام اس واقعہ کے بعد خوف و ہراس کے عالم میں یہ جاننے کی کوشش کرتے رہے کہ اس فرعونی کے قتل پر آل فرعون کا ردِعمل کیا ہوا؟ معلوم ہوا کہ فرعون تک یہ معاملہ اس عنوان سے پہنچا ہے کہ کسی اسرائیلی نے آلِ فرعون کے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے۔ لہٰذا اسرائیلیوں سے اِس کا انتقام لیا جائے اور اس معاملہ میں کسی قسم کی ڈھیل نہ دی جائے۔

فرعون نے اس کا یہ جواب دیا کہ اسکے قاتل کو تلاش کر کے مع شہادت پیش کیا جائے۔ میں اس کا انتقام ضرور لوں گا۔

آل فرعون یہ سنکر گلی کوچوں بازاروں میں گھومنے لگے کہ کہیں اس کا سراغ مل جائے مگر اُنھیں اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔

اچانک ایک اور واقعہ پیش آگیا کہ ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السّلام اپنے گھر سے نکلے ہی تھے کہ اُسی اسرائیلی کو دیکھا کہ کسی دوسرے فرعونی شخص سے جھگڑ رہا ہے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو دیکھ کر اُس نے سابقہ کی طرح مدد کرنے پکارا مگر حضرت

موسیٰ علیہ السلام گزشتہ واقعہ پر نادم وشرمندہ ہی ہو رہے تھے اور اس وقت اُسی اسرائیلی کو لڑتے دیکھ کر اس پر ناراض ہوئے (کہ خطا دراصل اسی اسرائیلی کی معلوم ہوتی ہے یہ جھگڑالو قسم کا آدمی ہے ہر وقت جھگڑتا ہی رہتا ہے) مگر بطور تنبیہ اپنے قومی آدمی اسرائیلی کو غصہ سے کہا کہ تو نے کل بھی جھگڑا کیا تھا آج پھر لڑ رہا ہے؟

اسرائیلی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس تنبیہہ سے خوف زدہ ہوگیا اور اُن کے الفاظ سے اسکو یہ شبہ ہوا کہ یہ آج مجھے ہی قتل کر دیں گے تو فوراً بول پڑا اے موسیٰ کیا تم چاہتے ہو کہ مجھے بھی قتل کر ڈالو جیسے کہ کل تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا؟

یہ باتیں ہونے کے بعد یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ مگر فرعونی شخص نے آل فرعون کے اُن لوگوں کو جو کل کے قاتل کی تلاش میں تھے جاکر خبر دے دی کہ خود اسرائیلی نے موسیٰ سے کہا ہے کہ تم نے کل ایک آدمی قتل کر دیا ہے۔ یہ خبر فرعون تک فوراً پہنچائی گئی۔ فرعون نے اپنے آدمی موسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کرنے روانہ کردیئے۔

دوسری طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیر خواہوں میں سے ایک شخص جو شہر کے کسی بعید حصے میں رہتا تھا کسی طرح اُسے یہ خبر ملی کہ فرعونی سپاہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تلاش میں نکل چکے ہیں اُس نے کسی طرح موسیٰ علیہ السلام تک پہنچکر یہ خبر دے دی کہ موسیٰ آپ کی تلاش کے لئے ایک جماعت نکل چکی ہے تاکہ آپ کو اُس قتل کے بدلہ میں قتل کر دیا جائے۔ لہذا میں آپ کی خیر خواہی کے لئے کہتا ہوں کہ آپ شہر سے نکل جائیے۔

یہاں پہنچکر حضرت ابن عباسؓ نے پھر ابن جبیرؓ کو مخاطب کیا کہ اے ابن جبیرؓ یہ (پانچواں) واقعہ فتون یعنی آزمائش کا ہے کہ موت سر پہ آچکی ہے اللہ نے نجات کا سامان پیدا فرمادیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ خبر سُنکر شہر سے فوراً نکل گئے اور شہر مَدْیَنْ کی طرف رُخ کیا۔

یہ آج تک شاہی ناز ونعمت میں پلے تھے کبھی محنت ومشقت کا نام تک نہ جانتے تھے مصر سے نکل پڑے مگر راستہ بھی کہیں کا نہ جانتے تھے مگر اپنے رب پر بھروسہ تھا دل میں کہا مجھے اُمید ہے کہ میرا رب مجھے راستہ دکھادے گا جب شہر

مدین کے قریب پہنچے تو شہر سے باہر ایک کنویں پر لوگوں کا اجتماع دیکھا جو اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے اور کچھ دور دیکھا کہ دو لڑکیاں اپنی بکریوں کو سمیٹے ہوئے الگ کھڑی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے پوچھا کہ تم الگ کیوں کھڑی ہو؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہم سے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ اِن سب لوگوں سے مزاحمت اور مقابلہ کریں اس لئے ہم انتظار میں ہیں کہ جب یہ سب لوگ فارغ ہوجائیں تو جو کچھ بچا پانی مل جائیگا اُس سے ہم اپنا کام نکال لیں گے۔ (اور ہمارے باپ تو بہت بوڑھے آدمی ہیں)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اُن کی شرافت سے متأثر ہوئے اور خود آگے بڑھ کر کنویں سے پانی نکالنا شروع کیا اللہ تعالےٰ نے قوت و طاقت بخشی تھی بڑی جلدی ان کی بکریوں کو سیراب کردیا۔

یہ عورتیں اپنی بکریوں کو لیکر گھر آگئیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گئے اور اللہ تعالےٰ سے دُعا کی "میرے پروردگار میں محتاج ہوں اُس نعمت کا جو آپ میری طرف بھیجیں۔" (مطلب یہ تھا کہ طعام و قیام کا کوئی انتظام ہوجائے) یہ لڑکیاں اپنے ہر روز کے وقت سے پہلے گھر پہنچیں تو اُن کے والد کو تعجب ہوا پوچھا کہ آج جلد کیسے آگئیں؟

لڑکیوں نے کسی اجنبی آدمی کے تعاون کرنے کا قصہ بیان کیا۔ والد نے ایک لڑکی کو کہا کہ اُس مرد کو بلاؤ جس نے یہ احسان کیا ہے۔ وہ آئیں اور موسیٰ علیہ السلام کو اپنے ساتھ لیکر گھر پہنچیں۔ والد نے اُن سے حالات دریافت کئے اور تسلّی دی کہ تم نے ظالم قوم سے نجات پالی، ہم نہ فرعون کی سلطنت میں ہیں نہ اُسکا ہم پر کچھ حکم چل سکتا ہے۔

اس کے بعد اِن دونوں میں سے ایک لڑکی نے اپنے باپ کو مشورہ دیا اباجان! اِن کو آپ ملازم رکھ لیجئے کیونکہ ملازمت کیلئے وہ بہتر آدمی ہیں قوی بھی ہیں اور امانتدار بھی۔

والد کو لڑکی کی بات سُن کر غیرت آئی پوچھا بیٹی تم کو اُن کے یہ صفات کیسے معلوم ہوئے؟ لڑکی نے عرض کیا اُن کی قوت و طاقت کا اندازہ تو اُن کے کنویں سے پانی کھینچنے پر ہوا کہ سب لوگوں سے پہلے اُنھوں نے اپنا کام تمام کرلیا دوسرا کوئی اُنکی برابری نہ کرسکا۔ اور امانت و دیانت کا حال اس طرح معلوم ہوا کہ جب میں اُن کو بُلانے گئی ہوں تو پہلی نظر میں اُنھوں نے دیکھا کہ میں ایک عورت ہوں تو اپنا سر نیچا کرلیا اور اُس وقت تک اپنا

سر نہیں اُٹھایا جب تک کہ میں نے اُن کو آپکا پیغام نہیں پہنچا دیا۔
اسکے بعد اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ تم میرے پیچھے پیچھے چلو اور اپنے گھر کا راستہ پیچھے سے بتلاتی چلو۔ یہ بات صرف وہی مرد کرسکتا ہے جو امانتدار ہو اور مومن دیندار ہو۔
والد کو لڑکی کی اس دانشمندانہ بات پر مسرت ہوئی اور اسکی تصدیق فرمائی اور خود بھی انھیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ موسیٰ علیہ السلام ایسے ہی با اخلاق انسان ہیں۔ اُس وقت لڑکیوں کے والد نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ کیا آپکو یہ بات پسند ہے کہ میں اِن دونوں میں سے ایک کا نکاح آپ کے ساتھ کر دوں ؟ جسکی شرط یہ ہوگی کہ آپ آٹھ سال تک ہمارے ہاں مزدوری کریں ؟ اور اگر آپ پورے دس سال تکمیل کر دیں تو آپ کا اختیار ہوگا۔ ہم آپ پر زیادہ مشقت ڈالنا نہیں چاہتے (یہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے)
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس عقد کو منظور کر لیا جسکی رُو سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر صرف آٹھ سال کی خدمت بطور معاہدہ لازم ہوگئی باقی دو سال کا وعدہ اختیاری رہا (یہ غالباً اُس زمانے کا مہر تھا)
حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک نصرانی عالم مجھے ملا اُس نے سوال کیا کہ تم جانتے ہو کہ موسیٰ علیہ السلام نے دونوں میعادوں سے کون سی میعاد پوری کی ؟
میں نے کہا مجھے معلوم نہیں کیونکہ اُس وقت حضرت ابن عباسؓ کی یہ حدیث الفتون مجھے معلوم نہ تھی۔ اسکے بعد میں حضرت ابن عباسؓ سے ملا اور یہ سوال اُن سے کیا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ آٹھ سال کی مدت تو پورا کرنا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر واجب تھا ہی لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے رسول (موسیٰ علیہ السلام) کا اختیاری وعدہ بھی پورا کروانا مقصود تھا اس لئے دس سال کی مدت پوری کی۔ اس کے بعد میں اُس نصرانی عالم سے ملا اور اُسکو یہ خبر دی تو اُس نے کہا کہ تم نے جس شخص سے یہ بات معلوم کی ہے کیا وہ تم سے زیادہ علم والے ہیں ؟
میں نے کہا ہاں وہ بہت بڑے عالم اور ہم سب میں افضل ترین ہیں !
(الغرض دس سال کی میعاد پوری کرنے کے بعد جب) حضرت موسیٰ علیہ السلام

اپنی اہلیہ محترمہ کو لیکر (حضرت شعیب علیہ السلام) کو وطن شہر مدین سے رخصت ہوئے (تاکہ اپنے وطن مصر چلیں) راستہ معلوم نہ تھا موسم سخت سرد تھا۔ راہ میں آگ کی ضرورت پیش آئی کوہ طور پر آگ نظر آئی (جو حقیقت میں انوار الٰہی تھے) آگ لینے گئے وہاں حیرت انگیز مناظر کے بعد معجزہ عصا اور ید بیضا اور اسکے ساتھ منصب نبوّت و رسالت عطا ہوئی اور یہ حکم دیا گیا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور اُسے اللہ کا پیغام پہنچاؤ (جس کی تفصیل قرآن میں موجود ہے)

اسکے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ میں فرعونی دربار کا مفرور ملزم قرار دیا گیا ہوں اور مجھ سے فرعونی کا قصاص بھی لئے جانے کا حکم نافذ ہو چکا ہے۔ اب میں کس تدبیر کے ساتھ دعوتِ رسالت لے کر فرعون کے پاس جاؤں نیز اپنی لکنتِ زبان کا عذر بھی سامنے تھا۔ اللہ کی جناب میں عرض معروض پیش کی، اللہ تعالےٰ نے اُن کی خواہش پر اُن کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو شریکِ رسالت بنا کر اُن کے پاس وحی بھیجدی اور یہ حکم دیا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شہر مصر سے باہر استقبال کریں، چنانچہ جب موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے تو ہارون علیہ السلام سے ملاقات ہوئی دونوں بھائی حسب الحکم فرعون کو دعوتِ حق دینے کے لئے اُس کے دربار میں پہنچے، کچھ دیر تو انھیں دربار میں حاضری کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ پھر اجازت ملی دونوں بھائیوں نے فرعون سے اپنا تعارف کروایا اور کہا:-

ہم دونوں تیرے رب کے پیغمبر ہیں!

فرعون نے پوچھا:-

تمہارا رب کون ہے؟

موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے وہ بات کہی جس کا قرآن نے خود ذکر کیا ہے۔

"ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اُسکی رہنمائی کی"

اسپر فرعون نے پوچھا کہ پھر تم دونوں کیا چاہتے ہو؟ اور ساتھ ہی اُس مقتول کا واقعہ ذکر کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مجرم ٹھیرایا (اور اپنے گھر میں اُن کی پرورش پانے کا احسان جتلایا)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دونوں باتوں کا جواب دیا جو قرآن حکیم میں مذکور ہے۔ (یعنی مقتول کے معاملہ میں اپنی خطا اور غیر ارادی قتل کا اعتراف کیا اور پرورش کے بارے میں کہا کہ یہ اللہ کا فیصلہ تھا جو کچھ اللہ کو منظور تھا وہ ہوگیا) اسکے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو خطاب کیا کہ تم اللہ پر ایمان لاؤ اُسکے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے اور بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کردو۔

فرعون نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ اگر تمہارے پاس رسولِ رب ہونیکی کوئی دلیل ہو تو پیش کرو اسپر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر ڈال دیا تو وہ ایک زبردست اژدھا کی شکل میں منہ کھولے فرعون کی طرف لپکا، فرعون خوفزدہ ہوکر اپنے تخت کے نیچے چھپ گیا اور موسیٰ علیہ السلام سے پناہ طلب کی کہ اسکو روک لیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسکو پکڑ لیا۔

اسکے بعد اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال کر نکالا تو وہ (سورج کی طرح) چمکنے لگا۔ یہ دوسرا معجزہ تھا جو فرعون کے سامنے آیا پھر دوبارہ گریبان میں ہاتھ ڈالا تو وہ اپنی اصلی حالت پر آگیا۔

فرعون نے ہیبت زدہ ہوکر اپنے اہل دربار سے مشورہ کیا، ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟

درباریوں نے متفقہ طور پر کہا کہ یہ دونوں جادوگر ہیں اپنے جادو کے ذریعہ ہم کو اپنے ملک سے نکال باہر کرنا چاہتے ہیں۔ اور ہمارے دین ومذہب کو مٹانا چاہتے ہیں۔ آپ ان کی کوئی بات نہ مانیں کیونکہ آپ کے ملک میں بڑے بڑے جادوگر ہیں۔ آپ ان کو بلالیجیئے وہ اپنے جادو سے اِنکے جادو پر غالب آجائیں گے۔

فرعون نے اپنی مملکت کے سب شہروں میں حکم دے دیا کہ جتنے آدمی جادوگری میں ماہر ہوں وہ سب کے سب دربار میں حاضر کردیئے جائیں۔

ملک بھر کے جادوگر جمع ہوگئے تو اُنھوں نے فرعون سے پوچھا کہ جس جادوگر سے آپ ہمارا مقابلہ کروانا چاہتے ہیں وہ کیا عمل کرتا ہے؟

فرعون نے جواب دیا کہ وہ اپنی لاٹھی کو سانپ بنا دیتا ہے۔ جادوگروں نے بڑی بے فکری سے کہا یہ تو کوئی چیز نہیں۔ ہمیں خود لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپ بنادینے کا جو جادو حاصل ہے اسکا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ مگر پہلے یہ طے کردیجیے کہ اگر ہم اسپر

غالب آگئے تو کیا انعام ملے گا؟

فرعون نے کہا کہ تم میرے خاندان کا جزء اور مقربین خاص میں داخل ہو جاؤ گے اور تمہیں وہ سب کچھ مل جائیگا جو تم چاہو گے۔

اسکے بعد مقابلہ کا وقت اور جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے طے کر کے اپنی عید کا دن اور صبح چاشت کا وقت مقرر کر دیا۔

ابن جبیرؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے مجھ سے بیان فرمایا ان کا یَوْمُ الزِّیْنَۃ (یعنی عید کا دن) جس میں اللہ تعالٰے نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور جادوگروں پر فتح عطا فرمائی عاشوراء (۱۰ محرم) کا دن تھا۔

جب سب لوگ ایک وسیع میدان میں مقابلہ دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے تو فرعون کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ ہمیں یہاں ضرور رہنا چاہیے تاکہ یہ ساحر یعنی موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) اگر غالب آگئے تو ہم بھی اِن پر ایمان لے آئیں ان لوگوں کی یہ گفتگو بطور مزاح و استہزاء تھی (کیونکہ اِنھیں یقین تھا کہ یہ ہمارے جادوگروں پر ہرگز غالب نہ آئیں گے)

جب میدان میں سب جمع ہو گئے تو جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا پہلے آپ اپنا سحر دکھائیں یا ہم پہلے ڈال کر ابتدا کریں؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم ہی پہل کرو۔ اُنھوں نے اپنی لاٹھیوں اور رسیوں کو زمین پر یہ کہتے ہوئے پھینکا کہ قسم ہے فرعون کی ہم ہی غالب آئیں گے۔ دیکھتے دیکھتے یہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ بن کر چلنے لگیں۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایک قسم کا خوف طاری ہوا۔ اللہ تعالٰے نے موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی حکم دیا کہ اپنی عصا ڈال دو۔

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عصا ڈالدی تو وہ ایک بڑا اژدھا بن گیا جس کا مُنھ کھلا ہوا تھا پھر اس اژدھا نے اُن تمام سانپوں کو نگلنا شروع کیا جو جادوگروں نے لاٹھیوں اور رسیوں سے بنائے تھے۔

جادوگر اپنے فن کے ماہر تھے۔ یہ ماجرا دیکھ کر اُنھیں یقین ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ عمل جادو نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف سے معجزہ ہے اس پر اُسی وقت اعلان کر دیا کہ

ہم اللہ پر اور موسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے دین پر ایمان لے آئے اور ہم اپنے پچھلے عقائد سے توبہ کرتے ہیں۔

فرعون اور اُسکے ساتھی مغلوب ہوگئے اور ذلّت اور رسوائی کے ساتھ اُس میدان سے پسپا ہوئے۔ جس وقت یہ مقابلہ ہو رہا تھا فرعون کی بیوی آسیہ پھٹے پرانے کپڑے پہن کر یہ دعا کر رہی تھی کہ اللہ تعالےٰ موسیٰ علیہ السلام کی مدد کرے اور آلِ فرعون یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ فرعون کی وجہ سے پریشان ہے۔

اسکے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بھی کوئی معجزہ دکھاتے اور اللہ کی طرف سے اُسپر حجت پوری ہو جاتی تو وعدہ کر لیتا تھا کہ اب بنی اسرائیل کو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھیجدوں گا۔ اور جب موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے وہ خطرۂ عذاب ٹل جاتا تو کہہ دیتا کہ کیا آپ کا رب اور کوئی نشانی دکھا سکتا ہے؟

یہ سلسلہ چلتا رہا بالآخر اللہ تعالےٰ نے قومِ فرعون پر طوفان، ٹڈی دل، کپڑوں میں جوئیں، برتنوں اور کھانوں میں مینڈک، خون وغیرہ کا عذاب یکے بعد دیگر مسلّط کئے جن کو قرآن حکیم میں "اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ" کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

اور فرعون کا یہ حال تھا کہ جب اُن میں سے کوئی عذاب آتا اور اُس سے وہ اور اُسکی قوم عاجز ہو جاتی تو موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کرتا کہ کسی طرح یہ عذاب ٹلجائے تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دیں گے۔ پھر جب وہ عذاب ٹل جاتا تو بدعہدی کرتا، یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی قوم کے ساتھ ہجرت کر جائیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سب کو لے کر رات کے وقت شہر سے نکل گئے۔ فرعون کو جب اطلاع ملی کہ یہ سب لوگ چلے گئے ہیں تو اپنی فوج کو جمع کرکے اُن کے تعاقب میں روانہ کر دیا۔

اِدھر اللہ تعالےٰ نے اُس دریا کو حکم دیا جو موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے درمیان حائل ہوگیا تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام تجھ پر اپنی عصا ماریں تو تجھ میں بارہ راستے بن جانے چاہیئے، جن سے بنی اسرائیل کے بارہ قبائل الگ الگ گزر سکیں اور جب یہ گزر جائیں تو اُن کے تعاقب میں آنے والوں پر یہ دریا کے بارہ حصے پھر ملجائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب دریا کے قریب پہنچے تو یہ یاد نہ رہا کہ لاٹھی مارنے

سے دریا میں راستے پیدا ہوں گے۔ اسپر اُن کی قوم نے اُن سے فریاد کی اے موسیٰ اب تو ہم پکڑے گئے۔ (کیونکہ پیچھے فرعونی فوجوں کو آتا دیکھا اور سامنے یہ دریا حائل تھا۔) اسوقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ کا وہ وعدہ یاد آیا فوراً دریا پر اپنی لاٹھی مار دی۔ یہ وہ وقت تھا کہ بنی اسرائیل کے پچھلے حصّوں سے فرعونی افواج کے اگلے حصے تقریباً مل چکے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ضربِ عصا سے دریا میں بارہ راستے بن گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تمام بنی اسرائیل ان راستوں سے گزر گئے، فرعونی افواج جو ان کے تعاقب میں تھی دریا کے ان راستوں میں اپنے گھوڑے اور پیادے ڈال دیئے تو دریا کے یہ مختلف راستے پھر آپس میں مل گئے۔

بنی اسرائیل جب دریا کے دوسرے کنارے پہنچ گئے تو دیکھا کہ ساری فوج دریا میں ہلاک ہوگئی ہے اور فرعون کی لاش کو موجوں نے کنارے پر پھینک دیا ہے۔ فرعونیوں کی ہلاکت کا مشاہدہ آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ آگے چلے راستہ میں ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے ہاتھوں بنائے ہوئے بتوں کی عبادت و پرستش کر رہی تھی۔ بنی اسرائیل یہ منظر دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گزارش کرنے لگے اے موسیٰ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی معبود بنا دیجئے جیسا کہ اُنھوں نے معبود بنا رکھا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ تم عجیب قوم ہو کہ ایسی جہالت کی باتیں کرتے ہو۔ یہ لوگ جو بتوں کی عبادت میں مشغول ہیں انکی عبادت برباد ہونے والی ہے۔ تم اپنے رب کے اتنے معجزات اور انعامات دیکھ چکے ہو پھر بھی تمہارے یہ جاہلانہ خیالات نہیں بدلے۔

یہ کہہ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے اور ایک مقام پر پہنچ کر اُن سب کو ٹھیرا دیا اور فرمایا کہ تم سب یہاں ٹھیرو میں اپنے رب کے پاس جاتا ہوں۔ تیس۳۰ دن کے بعد واپس آؤں گا اور میرے پیچھے ہارون علیہ السلام میرے نائب رہیں گے ہر کام میں ان کی اطاعت کرنا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اُن سے رخصت ہوکر کوہِ طور تشریف لے گئے اور تیس۳۰ دن کا مسلسل روزہ رکھا مگر تیس۳۰ دن رات کے مسلسل روزے سے جو ایک قسم

کی بُو منھ میں پیدا ہو جاتی ہے یہ فکر ہوئی کہ اس بُو کے ساتھ اللہ تعالےٰ سے شرف ہمکلامی نامناسب ہے مسواک کر کے منھ صاف کر لیا۔ جب تجلّی گاہ پر حاضر ہوئے تو اللہ تعالےٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ تم نے افطار کیوں کر لیا؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا میرے پروردگار مجھے خیال ہوا کہ آپ سے ہمکلامی کے لئے منھ کی بُو دور کر لوں، ارشاد ہوا موسیٰ! کیا تمھیں خبر نہیں کہ روزہ دار کے منھ کی بُو ہمارے نزدیک مُشک کی خوشبو سے بھی زیادہ محبوب ہے۔ اب آپ لوٹ جائیے اور دس۱۰ دن مزید روزے رکھئے پھر ہمارے پاس آئیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم کی تعمیل کی۔

اِدھر جب موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے دیکھا کہ مقررہ مدت تیس۳۰ دن گزر گئے اور وہ واپس نہیں آئے تو یہ بات اُن کو ناگوار معلوم ہوئی اور وہ حضرت ہارون علیہ السلام کی اطاعت سے نکل گئے۔

قوم میں سامری نامی ایک شخص جو گاؤ پرست ذہنیت رکھتا تھا اُس سے ایک عجیب واقعہ رُونما ہوا اُس نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کا ایک اثر دیکھا تھا (یعنی جہاں اُن کا قدم پڑتا اسمیں زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے تھے) اُس نے خاص اُس جگہ سے ایک مشتِ خاک اُٹھالی اور اُسکو ایک مصنوعی بچھڑے کے مُنھ میں ڈال دیا جس میں کوئی روح نہ تھی مگر اس خاک کے اثر سے اسمیں حرکت اور آواز پیدا ہو گئی۔

حضرت ابن عباس رضؓ نے اس روایت کو نقل کرتے ہوئے فرمایا واللہ وہ کوئی زندہ آواز نہ تھی بلکہ ہوا اُسکے پچھلے حصہ سے داخل ہو کر منھ سے نکلتی تھی اُسی سے یہ آواز پیدا ہو جاتی تھی۔

یہ عجیب و غریب قصہ دیکھ کر بنی اسرائیل کئی فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک جماعت نے سامری سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟

اُس نے کہا یہی تمہارا خدا ہے! لیکن موسیٰ راستہ بھول کر دوسری طرف چلے گئے ہیں۔ دوسری جماعت نے یہ کہا کہ ہم سامری کی اس بات کی اُس وقت تک تکذیب نہیں کر سکتے جب تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حقیقت حال نہ بتائیں۔

ایک اور جماعت نے کہا کہ یہ سب شیطانی دھوکہ ہے۔ یہ ہمارا رب نہیں ہو سکتا

ہم اسپر ایمان نہیں لائیں گے ۔ ایک جماعت کے دل میں سامری کی بات اُتر گئی اور اُس نے سامری کی تصدیق کرکے اُسکو اپنا خدا تسلیم کر لیا۔

حضرت ہارون علیہ السلام نے یہ فسادِ کبیر دیکھا تو فرمایا اے قوم تم لوگ فتنہ میں پڑ گئے ہو تمہارا رب تو رحمٰن ہے تم لوگ میری پیروی کرو اور میرا حکم مانو۔

قوم نے کہا کہ پھر یہ بتلائیے موسیٰ علیہ السلام کو کیا ہوا؟ ہم سے تیس دن کا وعدہ کرکے گئے تھے یہ وعدہ خلافی کیوں کی گئی اب چالیس دن پورے ہو رہے ہیں؟

قوم کے چند بیوقوفوں نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کا مقام بھول گئے ہیں اُن کی تلاش میں پھر رہے ہوں گے۔

اس طرح جب چالیس یوم پورے ہو گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ سے شرف ہمکلامی نصیب ہوا، اللہ تعالےٰ نے اُن کو اس فتنہ کی خبر دی جس میں اُن کی قوم مبتلا ہو گئی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں سے غصہ اور افسوس کی حالت میں واپس آئے سکے بعد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: واپس آکر موسیٰ علیہ السلام سے وہ امور سرزد ہوئے و قرآن میں تم نے پڑھی ہیں یعنی موسیٰ علیہ السلام نے غصے میں اپنے بھائی ہارون علیہ السلام ے سر کے بال پکڑ کر اپنی طرف کھینچے اور تورات کی وہ تختیاں جو کوہِ طور سے لائے تھے نیچے ھ دیا۔ پھر غصہ ٹھنڈا ہونے کے بعد بھائی ہارون علیہ السلام کا عذر قبول کیا اور اپنی اِن یر شعوری حرکات پر اللہ تعالیٰ کی جناب میں توبہ و استغفار کیا۔ اسکے بعد سامری کے پاس ئے اور اُس سے کہا کہ تونے یہ حرکت کیوں کی؟

اُس نے جواب دیا میں نے رسول کے نشان قدم کی مٹی اٹھالی اور میں سمجھ یا تھا کہ اس سے آثارِ حیات پیدا ہو جائیں گے۔ پس میں نے اُسکو بچھڑے میں ڈال دیا اور یسے ہی میرے دل نے یہ بات سجھائی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو جھڑکا اور فرمایا جا اب تیری سزا یہ ہے ۔ تو زندگی بھر یہ کہتا پھرے کہ مجھے کوئی نہ چھوئے (ورنہ وہ بھی عذاب میں گرفتار ہو جائیگا) ر تیرے لئے ایک مدت مقرر ہے جس کے خلاف نہ ہوگا۔ اور دیکھ تو اپنے اس معبود کو جس کی تونے پرستش کی ہے ہم آگ میں جلائیں گے اور پھر اس کی راکھ کو دریا میں بہا دینگے۔

اگر یہ خدا ہوتا تو ہم کو اس عمل پر قدرت نہ ہوتی۔

اس وقت بنی اسرائیل کو یقین ہوگیا کہ ہم فتنے میں مبتلا ہوگئے ہیں اور سب کو اُس جماعت پر رشک آنے لگا جس کی رائے حضرت ہارون علیہ السّلام کے مطابق تھی۔

جب بنی اسرائیل کو اپنے گناہِ عظیم کا احساس ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گزارش کی کہ اپنے ربّ سے دُعا کیجئے کہ وہ ہمارے لئے توبہ کا دروازہ کھول دے جس سے ہمارے گناہ کا کفّارہ ہوجائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اس کام کے لئے بنی اسرائیل میں سے ستّر نیک اور ممتاز لوگوں کا انتخاب کیا جو اُن کے علم میں گوسالہ پرستی سے بھی دور رہے تھے ان کو لے کر کوہِ طور پر پہنچے تاکہ اِن کی قبولِ توبہ کے بارے میں عرض کریں۔ جب یہ کوہِ طور پر پہنچے ہیں زمین پر ایک زلزلہ آیا جس سے موسیٰ علیہ السّلام کو بڑی شرمندگی ہوئی اللہ کی جناب میں عرض کیا :-

"اے میرے پروردگار اگر آپ ان کو ہلاک ہی کرنا چاہتے ہیں تو اِس وفد کے آنے سے پہلے ہی اُن کو اور مجھکو ہلاک فرما دیتے۔ کیا آپ ہم سب کو اس لئے ہلاک کرتے ہیں کہ ہم میں کچھ بیوقوفوں نے گناہ کیا ہے۔"

اس زلزلے کی وجہ یہ تھی کہ اِس وفد میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی تحقیق و احتیاط کے باوجود کچھ ایسے بھی لوگ شامل ہوگئے تھے جو پہلے گوسالہ پرستی میں مبتلا ہوگئے تھے اور اُن کے دلوں میں گوسالہ (بچھڑے) کی عظمت و بڑائی بیٹھی ہوئی تھی۔

الغرض حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی اس دُعا و فریاد کے جواب میں ارشاد ہوا :-

"میری رحمت تو سب کو شامل ہے اور میں عنقریب لکھدونگا اپنی رحمت کا پروانہ اُن لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اتباع کرتے ہیں اُس رسول اُمّی کا جس کا ذکر لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے پاس تورات اور انجیل میں۔"

یہ سنکر حضرتِ موسیٰ علیہ السّلام نے عرض کیا :-

"میرے پروردگار میں نے آپ سے اپنی قوم کی توبہ کے بارے
میں عرض کیا تھا آپ نے جواب میں رحمت کی عطا میری قوم کے علاوہ
دوسری قوم کے متعلق ارشاد فرمایا ہے تو پھر آپ میری پیدائش کو
اُس نبی اُمّی کی اُمّت مرحومہ میں رکھ دیتے تو اچھا تھا۔"

اس پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی توبہ قبول ہونے کا ایک طریقہ بیان کیا کہ ان میں سے ہر شخص اپنے متعلقین میں سے باپ، بیٹے جس سے ملے اُس کو تلوار سے قتل کر دے اُسی جگہ پر جہاں یہ گوسالہ پرستی کا گناہ کیا تھا۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وہ ساتھی جن کا حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم نہ تھا اور جن کو نیک اور صالح سمجھ کر ساتھ لے لیا تھا مگر حقیقت میں اُن کے دل میں گوسالہ پرستی کا جذبہ موجود تھا وہ بھی اپنے دل میں نادم ہو کر تائب ہوگئے اور اُس شدید حکم پر عمل کیا جو اُن کی توبہ قبول ہونے کیلئے بطور کفّارہ نافذ کیا گیا تھا۔ اور جب سب نے یہ عمل کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے قاتل و مقتول دونوں کی خطا معاف فرما دی۔

اسکے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر ارض (شام) کی طرف چلے گئے وہاں ایک ایسے شہر پر پہنچے جس پر قوم جبّارین کا قبضہ تھا جن کی شکل وصورت اور قد و قامت بھی ہیبت ناک تھی۔ اُن کے ظلم وستم اور طاقت و قوت کے عجیب وغریب قصّے قوم کو معلوم ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس شہر میں داخل ہونا چاہتے تھے مگر بنی اسرائیل کہنے لگے اے موسیٰ اس شہر میں تو بڑے ظالم لوگ ہیں جن کے مقابلہ کی ہم میں طاقت نہیں اور ہم تو اس شہر میں اُس وقت تک داخل نہیں ہوں گے جب تک یہ جبّارین وہاں موجود ہیں، ہاں وہ یہاں سے نکل جائیں تو پھر ہم اس شہر میں داخل ہو سکتے ہیں۔

ایسے نازک وقت میں دوآدمیوں نے جن پر اللہ کا انعام ہوا تھا قوم سے کہنے لگے اے قوم اللہ کے نام پر شہر کے دروازے تک تو پہنچو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا اور تم کو غلبہ دے گا اور اللہ پر اعتماد کرو جب کہ تم ایمان لا چکے ہو۔

اس روایت کے راوی یزید بن ہارون سے پوچھا گیا ان دوآدمیوں سے مراد کون ہیں؟

فرمایا کہ حضرت ابن عباسؓ انکو قوم جبارین میں شمار کرتے تھے جو اُس شہر سے آکر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے۔

ان دونوں نے بنی اسرائیل پر اپنی قوم کا رُعب طاری دیکھ کر کہا کہ ہم اپنی قوم کے حالات سے خوب واقف ہیں تم اِن کے ڈیل ڈول اور اُن کی بڑی تعداد سے ڈر رہے ہو حقیقت یہ ہے کہ اُن میں دل کی قوت بالکل نہیں اور نہ مقابلہ کرنے کی ہمت ہے تم ذرا شہر کے دروازے تک تو چلو تو خود دیکھ لینا کہ (وہ ہتھیار ڈال دیں گے) اور تم ہی اُن پر غالب آجاؤ گے۔

یہ سُنکر بھی بنی اسرائیل آمادہ نہ ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہایت کورا جواب اس بدتمیزی کے ساتھ دیا:-

"اے موسیٰ ہم تو اس شہر میں اُس وقت تک ہرگز داخل نہ ہوں گے جب تک وہ جبارین وہاں موجود ہیں، اگر آپ پھر بھی اُن سے مقابلہ کرنا چاہتے ہوں تو آپ اور آپ کا رب جاکر اُن سے لڑ بھڑ لیجئے ہم تو یہیں بیٹھے ہیں:"

حضرت موسیٰ علیہ السلام ہر قدم پر قوم کی سرکشی اور بیہودگی کا مشاہدہ کرتے آرہے تھے مگر صبر وتحمل سے کام لیتے رہے کبھی اُن کے لئے بددُعا نہیں کی لیکن اِس وقت اُن کے اس بیہودہ جواب سے بہت شکستہ اور غمگین ہو گئے اور اُن کے لئے بددُعا کی اور اُن کے حق میں فاسقین کے الفاظ استعمال فرمائے، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا قبول فرمالی اور اللہ تعالیٰ نے بھی اُس قوم کو فاسقین ہی کے نام سے یاد کیا، اور اس ارض مقدسہ سے اُن لوگوں کو چالیس سال کے لئے محروم کر دیا اور ایک کھُلے میدان میں اُن کو ایسا قید کر دیا کہ صبح سے شام تک چلتے رہتے کہیں قرار نہ تھا (اسی زمانے میں اُن کو مَن وسلویٰ بطور غذا کے ملا کرتا تھا۔ سخت گرمی میں بادلوں کا سایہ مہیا ہوا کرتا تھا اور معجزانہ طور پر اُن کے کپڑے نہ میلے ہوتے تھے اور نہ پھٹتے تھے۔ اسی زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک مربع پتھر دیا گیا تھا جس پر لاٹھی مارنے پر بارہ چشمے پھوٹ پڑتے تھے جو بنی اسرائیل کے ۱۲ بارہ قبیلوں میں متعین کر کے تقسیم کر دیئے گئے تھے اور جب بھی یہ لوگ کسی مقام سے نقل مقام کرتے اور دوسری منزل پر قیام

کرتے تو معجزانہ طور پر اُس پتھر کو وہیں موجود پاتے۔ (قرطبی)

نقد و تبصرہ جیسا کہ لکھا گیا اس طویل حدیث پر بعض مفسرین نے کلام بھی کیا ہے تاہم دوسرے مفسرین و محدثین نے اس روایت پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ اِن میں نسائی جیسے امام حدیث اور ابن کثیر جیسے ناقد حدیث شامل ہیں۔

علاوہ ازیں جن اہل علم نے اس حدیث پر تنقید کی ہے وہ اس حدیث کے مضمون پر نہیں بلکہ اسکے موقوف و مرفوع (یعنی کلام رسول یا کلامِ راوی) پر کی ہے۔ روایت کا مضمون بے غبار ہے۔ اس کا اکثر حصّہ تو خود قرآن کریم کی آیات میں موجود ہے اور بقیہ حصّہ بھی آیاتِ قرآنی سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن حضرات نے بھی اس روایت پر تنقید کی ہے مضمونِ حدیث پر کسی قسم کی نکیر نہیں ہے گویا اِن حضرات نے بھی روایت کی معنویت کو درست سمجھا ہے۔ ورنہ جہاں سنداً کلام کیا گیا ہے کوئی وجہ نہیں کہ متن حدیث پر سکوت اختیار کیا جائے؛ جبکہ ناقدینِ حدیث دونوں پر کلام کیا کرتے ہیں۔ یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ روایت کا مضمون صحیح و درست ہے۔

حدیثِ مذکور اگر مرفوعاً ثابت بھی نہ ہو تو نفسِ حدیث پر کلام کے لئے تنقید ضروری ہے جو یہاں موجود نہیں۔

بالفرض اس حدیث کو موقوف ہی تسلیم کر لیا جائے جیسا کہ بعض اہل علم کی تحقیق ہے تب بھی کوئی محذور لازم نہیں آتا۔ کیونکہ اسکے راوی اس امت کے سب سے بڑے عالم حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہیں جن کا فہم قرآنی اور علم اکابر صحابہ بھی تسلیم کرتے تھے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ بنی اسرائیل کے واقعات کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ مشہور اسرائیلی عالم کعب احبار رحمہ اللہ سے سُنا کرتے تھے اور بعض دفعہ اُن سے نقل بھی کر دیا کرتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جن اہل علم نے بھی اس قسم کی روایات پر تنقید کی ہے وہ اسی حیثیت سے کی ہے کہ یہ اسرائیلی روایت ہے۔ محققین نے جہاں اسرائیلی روایات پر تنقید کی ہے وہاں یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے روایات نقل کرنے کی اجازت بھی دی ہے۔

حَدِّثُوْا عَنْهُمْ وَلَا حَرَجَ (الحدیث)

پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ جیسا "حِبْرُ الْاُمَّۃ" (امت کا سب سے بڑا عالم) اگر کعب احبارؓ سے کوئی روایت نقل کرتا ہو تو اس پر محض اس وجہ سے تنقید کرنا کہ وہ اسرائیلی روایت ہے کوئی معقول بات نہ ہوگی۔

اسرائیلی روایت قابلِ جرح وہاں سمجھی جائیگی جب کہ وہ بات قرآن وحدیث کے مفہوم ومنشاء سے ٹکراتی ہو اور "حدیث فتون" کا مضمون قرآنی مضمون کے مخالف تو کجا قرآنی تصریحات سے بہت حد تک مطابقت بھی رکھتا ہے اس لئے اس روایت کو نقل کرنے اور بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ابن جریرؒ اور ابن ابی حاتم رح جیسے ائمہ تفسیر نے بھی اس روایت کو اپنی اپنی تفسیروں میں نقل کیا ہے۔

ابن کثیرؒ نے جہاں اس روایت کو اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے وہاں اُن کا اپنا فیصلہ یہ ہے کہ یہ پوری روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ارشاد فرمودہ ہے اور اپنے اس فیصلے پر ایک معقول دلیل بھی لکھتے ہیں:۔

> جب حضرت معاویہؓ نے حضرت ابن عباسؓ کو یہ حدیث روایت کرتے سُنا تو اِس بات کو منکر اور غلط قرار دیا جو اس حدیث میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس قبطی (فرعونی) کو قتل کیا تھا تو اُس کی مخبری اُس دوسرے فرعونی نے کی جس سے دوسرے روز یہ اسرائیلی لڑ رہا تھا۔
>
> وجہ یہ تھی کہ اس فرعونی کو تو کل کے واقعۂ قتل کا علم نہ تھا وہ اسکی مخبری کیسے کرسکتا تھا؟ اسکی خبر تو صرف اُسی لڑنے والے اسرائیلی کو معلوم تھی (لہذا یہ بات غلط ہے کہ قتل کی مخبری فرعونی شخص نے کی)
>
> جب حضرت معاویہؓ نے اُن کی حدیث کے اس جُز کا انکار کیا تو حضرت ابن عباسؓ کو غصہ آیا اور حضرت معاویہؓ کا ہاتھ پکڑ کر سعد بن مالک زہریؓ کے پاس لے گئے اور اُن سے کہا اے ابو اسحاقؓ کیا تمہیں یاد ہے جب ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتیلِ موسیٰ

کے بارے میں حدیث بیان فرمائی تھی اور اس راز کا افشا کرنیوالا اور فرعون کے پاس مخبری کرنے والا اسرائیلی تھا یا فرعونی؟ سعد بن مالکؓ نے فرمایا فرعونی تھا۔ کیونکہ اُس نے اسرائیلی سے یہ کلام سُن لیا تھا کہ کل کا واقعۂ قتل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے ہوا تھا، اسی بنا پر اُس نے اِسکی شہادت فرعون کے پاس پہنچا دی۔"

حضرت ابن عباسؓ کا یہ واقعہ اس بات کا واضح ثبوت پیش کرتا ہے کہ اُنھوں نے یہ طویل حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے سُنی ہے۔ جسکی تائید حضرت سعد بن مالک نے بھی فرمائی اور حضرت معاویہؓ نے بھی اسکو تسلیم کیا۔ اس ساری بحث سے ہٹکر بھی قرآن حکیم کے بیان کردہ واقعات کی تفسیر نہ اس طویل حدیث پر موقوف ہے اور نہ کوئی عقیدہ ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی حلال وحرام احکام کا تعلق ہے۔ اِن تمام وجوہات کے باوجود بھی معلوم نہیں جدید مفسرین کو اس حدیث کے نقل کرنے میں کیوں خوف لگتا ہے؟ (واللہ اعلم وعلمہٗ اتم)

جدید سانحہ ملتِ اسلامیہ کا یہ بڑا سانحہ ہے کہ موجودہ دور میں بعض اہل علم مغربی مؤرخین اور مستشرقین کی جدید تحقیقات سے اس قدر مرعوب اور متاثر ہو جاتے ہیں کہ اِن کی ہر جدید تحقیق قابل اعتماد نہ سہی قابل نقل وبیان ضروری سمجھی جاتی ہے اور اسلامی مؤرخین کا تاریخی ذخیرہ جن میں بعض اکابرِ ملت بھی شامل ہیں قابل التفات تک نہیں۔ (فالی اللہ المشتکیٰ)

ان ساری تفاصیل کے بعد قرآن حکیم کا بیان کردہ مضمون پڑھا جائے جو تذکرہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا حقیقی تذکرہ ہے۔ معلوم ہوگا کہ اس عظیم المرتبت رسول کا تذکرہ کس قدر اہمیت اور اپنے اندر کتنے بصائر وعبر اور مواعظ وحکمت کا نادر ذخیرہ رکھتا ہے۔ اسی حکمت کے پیش نظر قرآن حکیم نے حسب ضرورت اور حسب موقع ومحل جگہ جگہ اس قصے کے اجزاء کو کہیں مجملاً اور کہیں مفصلاً بیان کیا ہے۔

سیدنا موسیٰ وہارون علیہم السلام قرآن حکیم کی (۳۷) سورتوں کی ۵۱۴

آیات میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور بنی اسرائیل اور فرعون کا واقعہ ملتا ہے جن کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ سورۂ بقرہ — آیات ۴۰ تا ۶۱، ۶۳ تا ۷۵، ۸۳ تا ۸۷، ۹۲ تا ۹۳، ۱۰۸ تا ۱۳۶،
۲۔ سورۂ نساء " ۱۵۳ تا ۱۵۶، ۱۶۴۔
۳۔ سورۂ مائدہ — " ۱۲، ۱۳، ۲۰ تا ۲۶، ۳۲، ۴۵، ۷۰، ۷۱،
۷۸، ۷۹۔
۴۔ سورۂ انعام — " ۸۴ تا ۹۰، ۱۴۶، ۱۵۴۔
۵۔ سورۂ اعراف — " ۱۰۳ تا ۱۵۷، ۱۵۹ تا ۱۷۱۔
۶۔ سورۂ انفال — آیت ۵۴۔
۷۔ سورۂ یونس — آیات ۷۴ تا ۹۳۔
۸۔ سورۂ ہود — " ۹۶ تا ۹۹، ۱۱۰۔
۹۔ سورۂ ابراہیم — " ۵، ۶، ۸۔
۱۰۔ سورۂ نحل — آیت ۱۲۴۔
۱۱۔ بنی اسرائیل — آیات ۲ تا ۷، ۱۰۱ تا ۱۰۴۔
۱۲۔ سورۂ کہف — " ۶۰ تا ۸۲۔
۱۳۔ سورۂ مریم — " ۵۱ تا ۵۳۔
۱۴۔ سورۂ طٰہٰ — " ۹ تا ۹۸۔
۱۵۔ سورۂ انبیاء — " ۴۸، ۴۹۔
۱۶۔ سورۂ مومنون — " ۴۵ تا ۴۹۔
۱۷۔ سورۂ فرقان — " ۳۵، ۳۶۔
۱۸۔ سورۂ شعراء — " ۱۰ تا ۶۶۔
۱۹۔ سورۂ نمل — " ۷ تا ۱۴۔
۲۰۔ سورۂ قصص — " ۳ تا ۴۸۔
۲۱۔ سورۂ عنکبوت — " ۳۹، ۴۰۔
۲۲۔ سورۂ سجدہ — " ۲۳، ۲۴۔

۲۳ــــ سورہ احزاب ــــ آیات ۷، ۶۹۔
۲۴ــــ سورہ الصّٰفّٰت ــــ " ۱۱۴ تا ۱۲۲۔
۲۵ــــ سورہ مومن ــــ " ۲۳ تا ۴۵۔
۲۶ــــ سورہ زخرف ــــ " ۴۶ تا ۵۶۔
۲۷ــــ سورہ دخان ــــ " ۱۷ تا ۳۳۔
۲۸ــــ سورہ جاثیہ ــــ " ۱۶، ۱۷۔
۲۹ــــ سورۃ الذاریات ــــ " ۳۸ تا ۴۰۔
۳۰ــــ سورہ قمر ــــ " ۴۱ تا ۵۵۔
۳۱ــــ سورہ صف ــــ آیت ۵۔
۳۲ــــ سورہ جمعہ ــــ آیات ۵، ۶
۳۳ــــ سورۃ تحریم ــــ آیت ۱۱۔
۳۴ــــ سورۃ الحاقۃ ــــ آیات ۹، ۱۰۔
۳۵ــــ سورہ مزمل ــــ " ۱۵، ۱۶۔
۳۶ــــ سورۃ النازعات ــــ " ۱۵ تا ۲۵۔
۳۷ــــ سورہ فجر ــــ " ۱۰ تا ۱۳۔

جُملہ آیات ۵۱۴۔

اسی طرح حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے اسمائے گرامی قرآن حکیم کی جن سورتوں میں مذکور ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اسم گرامی قرآن حکیم کی (۳۶) سورتوں میں (۱۰۷) جگہ ملتا ہے جسکی تفصیل یہ ہے:۔

۱ــــ سورہ بقرہ ــــ میں ۱۲ مقام پر آیا ہے۔
۲ــــ سورہ نساء ــــ میں ۲ " "
۳ــــ سورہ مائدہ ــــ میں ۲ " "
۴ــــ سورہ انعام ــــ میں ۲ " "
۵ــــ سورہ اعراف ــــ میں ۱۶ " "

۶۔ سورہ یونس ۔ میں ۸ مقام پر آیا ہے
۷۔ سورہ ھود ۔ میں ۲ " "
۸۔ سورہ ابراہیم ۔ میں ۳ " "
۹۔ سورہ بنی اسرائیل ۔ میں ۳ " "
۱۰۔ سورہ کہف ۔ میں ۲ " "
۱۱۔ سورہ مریم ۔ میں ۱ " "
۱۲۔ سورہ طٰہٰ ۔ میں ۱۴ " "
۱۳۔ سورہ انبیاء ۔ میں ۱ " "
۱۴۔ سورہ مومنون ۔ میں ۲ " "
۱۵۔ سورہ فرقان ۔ میں ۱ " "
۱۶۔ سورہ شعراء ۔ میں ۸ " "
۱۷۔ سورہ نمل ۔ میں ۲ " "
۱۸۔ سورہ قصص ۔ میں ۱۴ " "
۱۹۔ سورہ احزاب ۔ میں ۱ " "
۲۰۔ سورہ سجدہ ۔ میں ۱ " "
۲۱۔ سورہ صٰفّٰت ۔ میں ۲ " "
۲۲۔ سورہ مومن ۔ میں ۴ " "
۲۳۔ سورہ زخرف ۔ میں ۱ " "
۲۴۔ سورہ ذاریات ۔ میں ۱ " "
۲۵۔ سورہ صف ۔ میں ۱ " "
۲۶۔ سورہ النازعات ۔ میں ۱ " "

جملہ (۱۰۷) مقامات پر اسم گرامی موجود ہے۔

حضرت ہارون علیہ السلام کا اسم گرامی قرآن حکیم کی (۱۱) سورتوں میں

(۱۴۱) جگہ موجود ہے :-

۱ — سورہ بقرہ — میں ۱ مقام پر آیا ہے
۲ — سورہ نساء — میں ۱ " "

۳	سورہ انعام	میں	۱	مقام پر آیا ہے۔
۴	سورہ اعراف	میں	۱	" "
۵	سورہ یونس	میں	۱	" "
۶	سورہ طٰہٰ	میں	۳	" "
۷	سورہ انبیاء	میں	۱	" "
۸	سورہ مومنون	میں	۱	" "
۹	سورہ فرقان	میں	۱	" "
۱۰	سورہ شعراء	میں	۲	" "
۱۱	سورہ قصص	میں	۱	" "

جملہ (۱۴۱) مقامات پر اسم گرامی موجود ہے۔

قرآنی مضمون

طٰسٓمّٓ۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ۔ نَتْلُوْا عَلَيْكَ ، مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔ الخ۔ (القصص آیات ۱ تا ۱۳)

طٰسٓمّٓ۔ یہ کھلی کتاب کی آیات ہیں۔
ہم آپکو موسیٰ اور فرعون کا کچھ قصہ ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں۔ اُن لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں۔ بیشک فرعون سرزمین میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور اُس نے وہاں کے باشندوں کی مختلف جماعتیں کر رکھا تھا کہ اُن میں سے ایک جماعت کا زور گھٹا رکھا تھا اُن کے بیٹوں کو ذبح کر دیتا تھا اور اُن کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا بیشک وہ بڑے مفسدوں میں سے تھا۔

اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زمین میں زور گھٹایا جارہا تھا ہم اُن پر احسان کریں اور ان کو پیشوا بنائیں اور اُن کو مالک بنائیں اور اُن کو زمین میں حکومت دیں اور فرعون اور ہامان اور اُنکے تابعین کو اُن کی جانب سے وہ واقعات دکھلائیں جن سے وہ بچاؤ کر رہے تھے۔

اور ہم نے موسیٰ کی والدہ کو الہام کیا کہ تم اِنکو دودھ پلاؤ، پھر جب تم کو اُن کی وجہ سے اندیشہ ہو تو اُن کو دریا میں ڈال دینا اور نہ تو اندیشہ کرنا اور نہ غم کرنا، ہم اُن کو پھر تمہارے ہی پاس ضرور واپس پہنچا دیں گے اور اُن کو پیغمبر بنا دیں گے۔

چنانچہ فرعون کے لوگوں نے موسیٰ کو اُٹھا لیا تاکہ وہ اُن لوگوں کے لئے دشمن اور غم کا سبب بنیں۔ بلاشبہ فرعون اور ہامان اور ان کے تابعین (اس بارے میں بہت) چوکنے والے تھے (کہ اپنے دشمن کو اپنے گھر میں پالا) اور فرعون کی بیوی نے (فرعون سے) کہا کہ یہ (بچہ) میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اسکو قتل نہ کرنا۔ عجب نہیں کہ (بڑا ہو کر) ہم کو کچھ فائدہ پہنچا دے یا ہم اُسکو (اپنا) بیٹا ہی بنالیں اور ان لوگوں کو (انجام کی) خبر نہ تھی۔

اور موسیٰ کی والدہ کا دل بیقرار ہو گیا قریب تھا کہ وہ موسیٰ کا حال ظاہر کر دیتیں اگر ہم اُن کے دل کو اس غرض سے مضبوط نہ کئے ہوتے تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں ہو۔

اور اُنھوں نے موسیٰ کی بہن (اپنی بیٹی سے) کہا ذرا موسیٰ کا سراغ تو لگا سو اُس نے موسیٰ کو دور سے دیکھا اور ان لوگوں کو یہ خبر نہ تھی (کہ یہ اُن کی بہن ہیں اور اس فکر میں آئی ہیں) اور ہم نے پہلے ہی سے موسیٰ پر دودھ پلانے والیوں کی بندش کر رکھی تھی (یعنی کسی کا دودھ نہ لیتے تھے) سو وہ (بہن) کہنے لگیں کیا میں تم لوگوں کو کسی ایسے گھرانے کا پتہ بتاؤں جو تمہارے لئے اس بچے کی پرورش کریں اور وہ اسکے خیر خواہ بھی ہوں۔

غرض ہم نے موسیٰ کو اُن کی والدہ کے پاس (اپنے وعدہ کے موافق) واپس پہنچا دیا تاکہ اُن کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور تاکہ غم میں نہ رہیں اور تاکہ اس بات کو جان لیں کہ اللہ تعالےٰ کا وعدہ سچا ہوتا ہے لیکن اکثر لوگ یقین نہیں رکھتے۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ ۔ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ ۔الخ (طٰہٰ آیات ۳۷ تا ۴۰)

اور (تجھے اے موسیٰ معلوم بھی ہے) ہم تجھ پر پہلے بھی ایک مرتبہ احسان کر چکے ہیں ؟ (ہم تجھے بتاتے ہیں اُس وقت کیا ہوا) جب ہم نے تیری ماں کے دل میں یہ بات ڈال دی تھی، کہ بچے کو ایک صندوق میں ڈال دے اور صندوق کو دریا میں چھوڑ دے دریا اُسکو کنارے پر ڈال دے گا۔ پھر اسکو وہ اُٹھالے گا جو میرا دشمن ہے نیز اُس بچے کا بھی دشمن ہے اور اے موسیٰ ہم نے اپنے فضل خاص سے تجھ پر محبت کا سایہ ڈال دیا تھا (کہ اجنبی بھی تجھ سے محبت کرنے لگے) اور یہ اس لئے کہ ہم چاہتے تھے تو ہماری نگرانی میں پرورش پائے۔

تیری بہن جب وہاں سے گزری تو (یہ ہماری ہی کارفرمائی تھی کہ) اُس نے (فرعون والوں کو) کہا کیا میں تمہیں ایسی عورت بتلا دوں جو اُس بچے کو پالے پوسے۔ اور اس طرح ہم نے تجھے پھر تیری ماں کی گود میں لوٹا دیا کہ اُسکی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور (بچہ کی جدائی سے) غمگین نہ ہو۔

غیر ارادی قتل

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک عرصہ تک شاہی محلات میں زندگی بسر کی جو غالباً آبادی سے دور شہر کے باہر تھے جیسا کہ بادشاہوں کے محل ہوا کرتے ہیں۔ فطری صلاحیتیں اور شاہی زندگی نے اُنھیں نہایت قوی اور مضبوط جوان کی طرح بنا دیا۔ چہرے سے رعب ٹپکتا تھا اور جسم کی ساخت بھی پُروقار باعظمت تھی۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ وہ اسرائیلی ہیں اور مصری خاندان سے ان کا کوئی رشتۂ قرابت

نہیں اُنھوں نے یہ بھی بار ہا دیکھا کہ بنی اسرائیل پر سخت مظالم ہو رہے ہیں اور وہ لوگ مصر میں ذلّت و غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ دیکھ کر اُن کا خون جوش مارنے لگتا تھا اور موقعہ بہ موقعہ بنی اسرائیل کی حمایت و نصرت میں پیش پیش ہوجاتے تھے۔

ایک مرتبہ شہری آبادی کے ایک کنارے جا رہے تھے کہ دیکھا ایک فرعونی ایک اسرائیلی کو بیگار کے لئے گھسیٹ رہا ہے۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تو لگا فریاد کرنے اور مدد چاہنے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعونی کی اس حرکت پر غصہ آیا اور اُسکو باز رکھنے کی کوشش کی لیکن اُس فرعونی نے توجہ نہ دی اسپر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غصہ میں ایک گھونسا رسید کیا۔ فرعونی اس ضرب کو برداشت نہ کرسکا اور اُسی وقت دم توڑ دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس عمل پر بہت افسوس ہوا، اللہ سے فوری معافی طلب کی اللہ نے انھیں معاف بھی فرما دیا (کیونکہ اس عمل میں نہ ارادہ تھا نہ نیت)

دوسرے دن بھی ایسا ہی ایک اور واقعہ پیش آیا۔ دیکھا کہ وہی کل والا اسرائیلی ایک اور فرعونی سے جھگڑ رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر کل کی طرح آج بھی مدد کا طالب ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ بات ناگوار گزری کہ اس کا روز کا جھگڑا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جھگڑالو قسم کا آدمی ہے تنبیہہ کے طور پر فرمایا کہ :-

اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ۔

تو بلاشبہ کھُلا گمراہ آدمی ہے۔

وہ اسرائیلی سمجھا کہ کل تو فرعونی کو مارا تھا شاید آج میری خبر لیں فوراً بول پڑا :-

اے موسیٰ جس طرح کل تم نے ایک فرعونی کو مار ڈالا تھا کیا

آج مجھکو قتل کرنا چاہتے ہو؟

فرعونی نے جب یہ بات سُنی تو اُس قتل کا راز فاش کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کا حکم جاری ہوا۔ کسی خیر خواہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع دی کہ اس وقت مصلحت یہی ہے کہ آپ شہر چھوڑ دیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس مشورے کو قبول کیا اور ارض مدین کی جانب روانہ ہو گئے۔

قرآن حکیم نے اس خیر خواہ کا نام نہیں بیان کیا صرف دو وصف بیان کئے ہیں۔

اول یہ کہ وہ شخص شہر کے آخری کنارے سے دوڑتا ہوا آیا،
دوم یہ کہ اُس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا ایک بڑی جماعت آپکے قتل کا مشورہ کر رہی ہے۔

شہر کے آخری کنارے سے آیا تھا، او رعرب میں یہ مثل معروف ہے الاطراف مسکنی الاشراف (شہر کے کنارے شرفاء کے رہنے کی جگہ ہے) معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی شریف ومعزز آدمی تھا۔
دوسرے یہ خبر دینا کہ ایک بڑی جماعت قتل کا مشورہ کر رہی ہے۔
یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ علم اُسی شخص کو ہو سکتا ہے جو فرعون اور اُسکے ارکان کے درمیان نمایاں حیثیت رکھتا ہوگا۔

فرعونی کے قتل کا واقعہ قرآن حکیم کی سورہ قصص میں اسطرح ملتا ہے :۔

قرآنی مضمون

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا۔ الخ

(قصص آیات ۱۴ تا ۲۱)

اور جب موسیٰ اپنی پوری جوانی کو پہونچے اور اُن کا نشوونما مکمل ہوگیا تو ہم نے اُن کو حکمت وعلم عطا کیا (نبوت سے پہلے) اور ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔

(ایک روز) وہ شہر میں ایسے وقت داخل ہوئے جبکہ اہل شہر غفلت میں تھے وہاں دو آدمیوں کو لڑتے پایا۔ ایک اُن کی اپنی قوم کا تھا اور دوسرا اُن کی دشمن قوم کا تھا، سو اُن کی برادری کے آدمی نے دشمن قوم والے کے خلاف مدد کے لئے پکارا، موسیٰ نے اسکو ایک گھونسا مارا اور اُس کا کام تمام کر دیا۔

موسیٰ نے کہا کہ یہ تو شیطانی حرکت ہوگئی، بیشک شیطان تو سخت دشمن کھلا گمراہ کن ہے (پھر نادم ہوکر) موسیٰ نے کہا اے میرے پروردگار میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے پس میری مغفرت فرما دیجئے چنانچہ اللہ نے ان کی مغفرت فرما دی کیونکہ وہ غفور رحیم ہے۔

موسیٰ نے عہد کیا کہ اے میرے پروردگار یہ احسان جو تو نے مجھ پر کیا ہے اسکے بعد میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا۔

دوسرے روز موسیٰ صبح سویرے ڈرتے ہوئے اور ہر طرف سے خطرہ محسوس کرتے شہر میں جا رہے تھے کہ اچانک دیکھا کہ وہی شخص ہے جس نے کل موسیٰ سے مدد کے لئے پکارا تھا آج پھر پکار رہا ہے، موسیٰ نے کہا تو تو بڑا بہکا ہوا آدمی ہے۔

پھر جب موسیٰ نے ارادہ کیا کہ فرعونی کو پکڑے جو موسیٰ اور اسرائیلی کا دشمن تھا تو وہ اسرائیلی (غلط فہمی میں) کہا، اے موسیٰ کیا تم مجھے آج اُسی طرح قتل کرنا چاہتے ہو جس طرح کل ایک آدمی کو قتل کر چکے ہو؟ پس تم زمین میں اپنا زور بٹھانا چاہتے ہو اور صُلح کروانا نہیں چاہتے (اس کلام سے شہر میں بات پھوٹ گئی) (اسکے بعد) ایک شخص شہر کے کنارے سے دوڑتا ہوا آیا اور بولا اے موسیٰ! سرداروں میں آپ کے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں۔ لہٰذا یہاں سے جلد نکل جائیے میں آپ کا خیر خواہ ہوں (یہ خبر سنتے ہی) موسیٰ ڈرتے اور سہمتے نکل گئے اور دُعا کی اے میرے رب مجھے ظالموں سے بچا۔"

ہجرت حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے نکلنے کا ارادہ کئے تو شہر مدین کا انتخاب کیا۔ مدین ملکِ شام کا ایک شہر تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے مدین کے نام پر موسوم تھا۔ یہ علاقہ فرعونی حکومت سے خارج تھا اور مصر سے آٹھ منزل (مساوی (۱۶۰) میل) کے فاصلہ پر واقع تھا۔ چونکہ یہ سفر اچانک حادثہ کے طور پر پیش آیا تھا اس لئے ساتھ کوئی رفیق سفر اور زادِ راہ نہ تھا۔

تاریخ طبری میں سعید بن جبیرؓ کی روایت سے نقل کیا گیا ہے کہ اس تمام سفر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خوراک درختوں کے پتّوں کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ اس بے سروسامانی کی حالت میں ارضِ مدین پہنچے۔

مآءِ مدین دیکھا کہ ایک کنوئیں پر بھیڑ لگی ہوئی ہے اور جانوروں کو پانی پلایا جا رہا ہے۔

اس ہجوم سے کچھ دور دو لڑکیاں کھڑی ہیں اور اپنے جانوروں کو پانی پر جانے سے روک رہی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احساس ہوا کہ یہاں بھی وہی سب کچھ ہو رہا ہے جو دنیا کی ظالم طاقتوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیاں کمزور و غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ جب یہ قوی و سرکش اپنے جانوروں کو سیراب کر چکیں تو بچا کھچا پانی اپنے جانوروں کو پلائیں، الغرض یہ حال حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دیکھا نہ گیا آگے بڑھ کر پوچھا:۔

تمہاری کیا پریشانی ہے؟ اپنے جانوروں کو پانی کیوں نہیں پلاتیں؟

دونوں لڑکیوں نے جواب دیا ہم مجبور ہیں اگر جانوروں کو آگے بڑھاتے ہیں تو یہ طاقتور زبردستی ہم کو پیچھے ہٹا دیتے ہیں اور ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں اُن میں یہ طاقت نہیں کہ یہ خدمت انجام دیں۔ اور جب یہ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا کر واپس ہو جاتے ہیں اسوقت ہم بچا کھچا پانی حاصل کرتے ہیں یہی ہمارا روز کا معاملہ ہے۔

یہ سنکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بڑی غیرت آئی۔ آگے بڑھ کر بھیڑ بھاڑ چیرتے ہوئے کنویں پر جا پہنچے اور کنویں کا بڑا ڈول اُٹھایا اور تنہا کھینچ کر لڑکیوں کے جانوروں کو سیراب کر دیا۔ جب ان لڑکیوں کے جانوروں نے پانی پی لیا تو وہ گھر پہنچیں خلافِ عادت جلد واپسی پر ان کے والد کو تعجب ہوا پوچھا بیٹی آج کیا بات ہے جو تم جلد لوٹ آئی ہو؟ دونوں نے گزرا قصّہ سنایا کہ کس طرح ایک اجنبی نے انکی مدد کی۔

باپ نے کہا جاؤ جلد اُس اجنبی کو لے آؤ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نیک بخت آدمی ہے؟

اِدھر باپ بیٹی میں یہ گفتگو ہو رہی تھی اُدھر حضرت موسیٰ علیہ السلام جانوروں کو سیراب کرنے کے بعد قریب ہی کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ مسافرت و غربت اور پھر بھوک پیاس سے نڈھال ہو چکے تھے۔ اللہ تعالےٰ کے آگے ہاتھ پھیلائے۔ مناجات شروع کر دی:۔

الٰہی میں بھوکا ہوں، حالت سفر میں ہوں، میری مدد فرما،
جو بھی میرے لئے بہتر ہو اپنے فضل سے نازل فرما۔ میں تیری ہر
نعمت کا محتاج ہوں۔

باپ کے مشورہ پر اُن دونوں میں کی ایک لڑکی تیزی سے وہاں پہنچی تو دیکھا کہ وہ نیک دل آدمی کنوئیں کے قریب ہی بیٹھا ہے۔ شرم وحیا کے ساتھ نیچی نظریں کیئے لڑکی نے کہا :-

آپ ہمارے گھر چلیئے ہمارے والد آپ کو بلاتے ہیں،

تاکہ وہ آپکو آپ کے اُس احسان کا بدلہ عنایت کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس غیر متوقع دعوت کو رد کرنا مناسب نہ سمجھا اُٹھ کھڑے ہوئے اور لڑکی کو ہدایت کی کہ وہ پیچھے پیچھے چلے اور اشارے سے گھر کی رہنمائی کرے۔ جب گھر پہنچے تو لڑکیوں کے والد بزرگوار نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا استقبال کیا، اعزاز واکرام کے ساتھ ملاقات کی۔ پہلے کھانا کھایا پھر حالات دریافت کیئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی کی ساری تفصیل بیان کی۔ فرعون کا ظلم، بنی اسرائیل کی حالتِ زار کا تذکرہ کیا اور بعد میں اپنے اُس غیر ارادی قتل کا بھی واقعہ بیان کیا۔ اسپر ان بزرگ نے تسلی دی اور فرمایا کہ اللہ کا شکر کرو اب تمہیں ظالم قوم سے نجات مل گئی۔

شیخ کبیر

یہ بزرگ کون تھے ؟ اس موقعہ پر قرآن حکیم میں کوئی صراحت موجود نہیں، لڑکیوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بڑے بوڑھے آدمی تھے جو اپنی پیرانہ سالی کے باعث اس قابل نہ تھے کہ گھر کی ضروریات خود اپنے ہاتھوں پورا کریں۔ اور غالباً گھر میں ان کے سوا اور کوئی مرد بھی نہ ہوگا تب ہی گھر کی عورتیں ضروری کام کے لئے باہر نکلتی تھیں۔

اس ساری صورت حال کو لڑکیوں نے ایک مختصر فقرے میں ادا کیا ہے :-

وَاَبُوْنَا شَیْخٌ کَبِیْرٌ (سورہ قصص آیت ۲۳)

ہمارے والد بہت بوڑھے آدمی ہیں۔

اس فقرے کی ادائی میں لڑکیوں کی حیاداری کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک اجنبی سے غیر ضروری بات بھی نہ کرنا چاہتی تھیں، مگر یہ بھی پسند نہ تھا کہ یہ اجنبی ہمارے خاندان کے متعلق کوئی غلط رائے قائم کرے اور اپنے ذہن میں یہ خیال کرے کہ یہ کیسے لوگ ہیں جن کے

مرد گھر بیٹھے رہیں اور عورتیں کام کریں؟

بہر حال ان شیخ کبیر کے بارے میں قرآن حکیم نے کسی ایک جگہ بھی ان کا نام نہیں بتایا ہے اور نہ کوئی ایسی قوی روایت موجود ہے جو نام کو متعین کر دے۔ اسلئے مفسرین و مؤرخین کے مختلف اقوال پائے جاتے ہیں جن میں مشہور و معروف اور اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام ہیں۔ امام تفسیر ابن جریر طبریؒ نے یہی قول حضرت حسن بصریؒ کا نقل کیا ہے۔ محدّث ابن ابی حاتم نے بھی یہی بات کہی ہے جو قرآنی سیاق و سباق کے مطابق بھی ہے۔

بعض مؤرخین نے اس شیخ کا نام یثرون لکھا ہے اور یہ حضرت شعیب علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ اور بعض نے ان کا نام یثری لکھا ہے۔ طبری نے سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ موسیٰ کو اجیر رکھنے والا مدین کا شیخ "یثری" نامی تھا۔ توراۃ میں اسی سے ملتا جلتا نام "یثرو" بتایا گیا ہے۔ اور بعض نے ان کا نام "حوباب" لکھا ہے۔

مؤرخ اسلام علامہ سیّد سلیمان ندویؒ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت شعیبؑ کا اسم گرامی حُوباب تھا اور یثرو ایک اعزازی لقب تھا جسکے معنی کامل کے ہیں جس طرح یہودیوں کے ہاں کاہن اور مسلمانوں کے ہاں امام کا لفظ بولا جاتا ہے۔

قرآن حکیم نے ان کا نام شعیب کہا ہے جو باب کی تصحیف ہے۔

حقیقت میں یہ سب ایک ہی نام ہیں جو زبان و لغت کے لحاظ سے مختلف تلفظ میں ادا کئے گئے ہیں۔ بہر حال نام کی تعیّن میں کوئی قطعی بات معلوم نہیں ہوتی جو کچھ بھی ہیں وہ قیاس و اندازے ہیں لیکن جن اہل علم نے ان بزرگ کا نام شعیب علیہ السلام بتایا ہے وہ زیادہ قابل ترجیح ہے اور اسی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ایک وجہ تو اسکی یہ ہے کہ عام طور پر حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ ایک بیان کیا گیا ہے۔

دوسری وجہ یہ کہ شہر مدین کی جانب جو رسول بھیجے گئے تھے وہ حضرت شعیب علیہ السلام ہیں۔ ان کے علاوہ قرآن حکیم میں اس شہر کی جانب کسی اور مشہور و معروف رسول کے روانہ کئے جانے کا ذکر نہیں ملتا۔

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا۔ (ہود آیت ۸۴)
مدین کی جانب اُنکے بھائی شعیبؑ کو رسول بنا کر بھیجا گیا۔
اصحاب الایکہ بھی اہل مدین ہی کو کہا جاتا ہے جنکی تفصیل تذکرہ سیّدنا شعیب علیہ السلام میں آچکی ہے۔
کَذَّبَ اَصْحٰبُ الْاَیْکَۃِ الْمُرْسَلِیْنَ۔ اِذْ قَالَ لَھُمْ شُعَیْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ۔ (شعراء آیت ۱۷۶)
تیسری وجہ یہ کہ سورہ ہود میں انبیاء کرام کے سلسلہ وار تذکروں میں حضرت شعیب علیہ السلام کے تذکرے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کا ایک زمانہ ہے۔ لہٰذا مدین کے یہ شیخ کبیر حضرت شعیب علیہ السلام ہیں۔ واللہ اعلم۔
بار مدین کا تذکرہ آیاتِ ذیل میں اسطرح موجود ہے :-

قرآنی مضمون

وَلَمَّا تَوَجَّہَ تِلْقَآءَ مَدْیَنَ قَالَ عَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ یَّھْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ۔ الخ

(القصص آیات ۲۲ تا ۲۵)

اور (مصر سے نکل کر) جب موسیٰ نے مدین کا رُخ کیا تو اُنھوں نے (دل میں) کہا اُمید ہے کہ میرا رب مجھے صحیح راستے کی رہنمائی کرے گا۔

اور جب وہ مدین کے کنویں پر پہنچے تو دیکھا کہ وہاں بہت سے لوگ (اپنے جانوروں کو) پانی پلا رہے ہیں اور دو عورتوں کو پایا کہ وہ اُس بھیڑ کے پیچھے اپنے جانوروں کو روک رہی ہیں۔ موسیٰ نے کہا تمھیں کیا پریشانی ہے؟ کہنے لگی ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں جب تک یہ چرواہے اپنے جانور نکال نہ لے جائیں، اور ہمارے والد ایک بوڑھے آدمی ہیں۔

(یہ سُن کر) موسیٰ نے اُن کے جانوروں کو پانی پلا دیا پھر

ایک سایہ کی جگہ جا بیٹھے، پھر کہا پروردگار جو خیر بھی تو مجھ پہ نازل کردے میں اُس کا محتاج ہوں۔

پس آئی موسیٰ کے پاس اُن دونوں میں سے ایک چلتی ہوئی شرم وحیا سے، بولی میرے والد آپ کو بُلاتے ہیں تاکہ بدلہ دیں اُس کام کا جو آپ نے ہمارے جانوروں کو سیراب کیا ہے۔

پھر جب موسیٰ اُن کے پاس پہنچے اور اُن سے (تمام) قصہ بیان کیا (تو اُس شیخ کبیر نے) کہا اب اندیشہ نہ کرو، تم ظالم قوم سے نجات پاگئے۔"

توراۃ میں شیخ کبیر کی لڑکیوں کی تعداد سات بیان کی گئی ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن ابن کثیرؒ نے اِن ہر دو اقوال میں اس طرح مطابقت پیدا کی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ مدین کے اس بزرگ کی سات لڑکیاں ہوں مگر مارِ مدین پر جو واقعہ پیش آیا اس میں صرف دو لڑکیاں ہی موجود تھیں جیسا کہ قرآن حکیم کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے۔

شیخ کبیر اور دامادی رشتہ

حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور مدین کے اس بزرگ کے درمیان یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اُس لڑکی نے جو موسیٰ علیہ السّلام کو بُلانے گئی تھی اپنے باپ سے کہا:۔

"اے ابّا جان! آپ اس مہمان کو اپنے جانور چرانے اور پانی مہیّا کرنے کے لئے مقرر کر لیجئے کیونکہ یہ وہی اجیر بہتر اور مناسب ہوتا ہے جو قوی اور امانتدار بھی ہو۔"

مفسرین لکھتے ہیں کہ باپ کو لڑکی کی یہ گفتگو عجیب سی معلوم ہوئی پوچھا بیٹی تجھکو اس مہمان کی قوت وامانت کا حال کیونکر معلوم ہوا؟

لڑکی نے جواب دیا قوت کا اندازہ تو اس سے معلوم ہوا کہ کنویں کا بڑا ڈول اس نے تنہا بھر کر کھینچ لیا اور امانت کا حال اس طرح کہ جب میں اُنھیں بُلانے گئی تو اُس نے مجھے دیکھ کر اپنی نظریں نیچی کرلیں اور دوران گفتگو ایک مرتبہ بھی نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ اور جب چلنے لگا تو مجھکو پیچھے چلنے کو کہا اور خود آگے آگے چلا

اور میں اُسکی صرف اشاروں سے رہنمائی کرتی رہی۔
بزرگ باپ نے بیٹی کی اِن باتوں کو سُنا تو بہت خوش ہوا،
بیٹی کا مشورہ پسند آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا اگر تم آٹھ
سال میرے پاس رہو اور میری بکریاں چراؤ تو میں اپنی دونوں میں سے
ایک بیٹی کا نکاح تم سے کردوں گا اور اگر تم اس مدت میں مزید دوؔ
سال اور بڑھا کر دسؔ سال پورے کر دو تو اور بھی زیادہ بہتر ہوگا اور
یہی اس لڑکی کا مہر ہوگا۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس شرط کو منظور کرلیا
اور کہا کہ یہ میری مرضی پر چھوڑ دیے کہ میں اِن دونوں مدّتوں میں سے
جس کو چاہوں پورا کر دوں۔"

طرفین کی اس باہمی رضامندی کے بعد شیخ کبیر نے اس بیان کردہ مدت کو مہر قرار
دے کر سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے اپنی ایک لڑکی کا نکاح کر دیا۔
بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ختم مدّت پر عقد نکاح عمل میں آیا اور عقد کے
فوراً بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی کے ساتھ جن کا نام "صفورہ" بیان کیا
جاتا ہے مصر روانہ ہو گئے۔
عقد نکاح کی یہ گفتگو قرآن حکیم میں اسطرح موجود ہے۔

قرآنی مضمون

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ۔ الخ

(قصص آیات ۲۶ تا ۲۸)

ان دونوں میں سے ایک لڑکی نے کہا ابا جان! اس شخص
کو نوکر رکھ لیجئے۔ بہترین آدمی جسے آپ نوکر رکھیں وہی ہو سکتا ہے
جو قوی اور امانت دار ہو۔
باپ نے (موسیٰ سے) کہا میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دوؔ
بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں بشرطیکہ تم آٹھ

سال تک میرے ہاں ملازمت کرو۔ اور اگر دس سال پورے کردو تو یہ تمہاری مرضی ہوگی۔ میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا، تم انشاء اللہ مجھے نیک آدمی پاؤ گے۔

موسیٰ نے جواب دیا یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہوگئی۔ ان دونوں مدّتوں میں سے جو مدت بھی پوری کردوں مجھ پر کوئی جبر نہ ہوگا اور جو کچھ قول و قرار ہم کر رہے ہیں اللہ اُس پر نگہبان ہے۔

قیامِ مدین کا تذکرہ آیتِ ذیل سے معلوم ہوتا ہے:۔

فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى الخ (طٰہٰ آیت ۴۰)

پھر تم نے مدین میں چند سال قیام کیا۔ پھر اب ٹھیک اپنے وقت (مقررہ) پر اے موسیٰ تم آگئے اور میں نے تم کو اپنے کام کا بنالیا ہے۔"

از روئے معاہدہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت آٹھ سال تھی لیکن اُنھوں نے پورے دس سال مکمل کیے۔ یہ بات انبیاء علیہم السلام کی سیرت کا پتہ دیتی ہے۔ یہ حضرات اپنے اخلاق و کردار کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔

حضرت حسن بن علیؓ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آٹھ کے بجائے دس سال مکمل کئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے بھی یہی بات خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:۔

قَضٰى مُوْسٰى اَتَمَّ الْاَجَلَيْنِ وَاَطْيَبَهُمَا عَشْرَ سِنِيْنَ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دونوں مدتوں میں سے وہ مدت پوری کی جو زیادہ کامل اور اپنے خسر کے لئے زیادہ خوشگوار تھی یعنی دس سال۔

تاج نبوت اور عطائے معجزہ

قرآن حکیم نے یہ نہیں بتایا کہ مدت پوری

ہونے کے بعد کتنے عرصے تک حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین میں قیام پذیر رہے ؟
بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ختم مدّت کے فوری بعد اپنی بیوی کو لے کر مصر روانہ ہو گئے۔

فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَى الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهِ ۔ الآیہ۔

پھر جب موسیٰ نے مدّت پوری کر دی اور اپنے اہل کو لے کر چل پڑے۔

غالباً اس آیت سے یہ بات اخذ کی گئی ہو۔
لیکن معالم التنزیل میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مدت کے ختم ہونے پر فوراً روانہ نہ ہوئے بلکہ مزید دس سال اپنے خُسر کے ہاں قیام کیا، تورات میں بھی ایسی ہی تصریح موجود ہے۔
اور اس بات کو اس حقیقت سے بھی تقویت ملتی ہے کہ جب حضرت موسےٰ علیہ السلام گھر سے چلے تو وادی مقدس میں اللہ تعالےٰ کی جانب سے انھیں کہا گیا کہ ظالم فرعون اور اسکی قوم کی طرف جاؤ اور ان کو اللہ کا پیام پہنچاؤ۔ اسپر حضرت موسےٰ علیہ السلام نے فرمایا:-

"پروردگار میں نے اُن فرعونیوں میں سے ایک کو قتل کیا تھا مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ مجھے قتل نہ کر دیں ؟

اس گفتگو کے وقت تک قتل والے معاملہ کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر جانیکی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بھلا وہ مدّتِ عقد کے فوری بعد کیسے روانہ ہوتے ؟
بہر حال حقیقت حال کا علم اللہ علیم وخبیر ہی کے ہاں ہے اور یہ ہی مناسب اور قابل احتیاط طرز ہے کہ ایسے امور میں جسکو اللہ تعالےٰ نے پوشیدہ رکھا ھم بھی پوشیدہ سمجھیں۔
الغرض ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی سیدہ صفورہؓ اور تورات کی تصریح کے مطابق اپنے دونوں بچوں سمیت شہر مدین سے اپنے وطن مصر کیلئے روانہ ہو گئے رات ٹھنڈی تھی سردی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا، آگ جلانے کا ارادہ کیا لیکن چقماق نے سخت خُنکی کی وجہ سے کام نہ دیا۔ قریب کی وادی میں نگاہ ڈالی تو ایک شعلہ

چمکتا نظر آیا۔ بیوی سے کہا تم یہاں ٹھیرو میں آگ لے آؤں گا تاکہ تاپنے کا بھی انتظام ہو جائیگا۔ اور اگر وہاں کوئی رہبر مل گیا تو بھٹکی ہوئی راہ کا بھی کھوج لگ جائے گا۔ جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ عجیب و غریب منظر ہے درخت پر روشنی نظر آرہی ہے۔ مگر نہ درخت کو جلاتی ہے اور نہ ہی گُل ہوتی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے آگے بڑھے۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتے آگ دور ہوتی جاتی۔ اس صورت حال سے کچھ خوف سا پیدا ہوا۔ ارادہ کیا کہ واپس لوٹ جائیں۔ جوں ہی پلٹے آگ قریب ہوگئی اور اُس میں سے یہ آواز آئی :-

"اے موسیٰ میں ہی اللہ ہوں سارے جہان والوں کا۔"

یہ آواز سُنکر حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے تو دوبارہ پکارا گیا :-

"اے موسیٰ میں ہوں تمہارا پروردگار یہاں اپنی جوتی اتاردو تم یہاں طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑے ہو۔ اور دیکھو میں نے تم کو اپنی رسالت کے لئے چن لیا ہے اب میں جو کچھ بھی وحی کروں اسکو غور سے سنو۔"

شہر مدین سے روانگی اور درمیان راہ میں نبوت سے سرفرازی اور عصا و ید بیضا کا معجزہ آیاتِ ذیل میں وضاحت کے ساتھ ملتا ہے :-

قرآنی مضمون

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا۔ الخ (قصص آیات ۲۹ تا ۳۵)

"جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی اور اپنے اہل کو لے کر چلے تو کوہ طور کی جانب ایک آگ نظر آئی۔ اپنے گھر والوں سے کہا ٹھیرو میں نے ایک آگ دیکھی ہے شاید میں وہاں سے کوئی خبر لے آؤں یا اُس آگ سے کوئی انگارہ ہی اُٹھا لاؤں تاکہ تم لوگ اُس سے تاپ سکو۔

پھر جب وہ وہاں پہونچے تو وادی کے داہنے کنارے پر مبارک خطہ میں ایک درخت سے پکارا گیا کہ اے موسیٰ میں ہی اللہ ہوں سارے جہان والوں کا پروردگار۔

اور یہ کہ پھینک دو اپنی لاٹھی کو پھر جب دیکھا اُس کو کہ وہ لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے اور مڑ کر بھی نہ دیکھا (ارشاد ہوا) موسیٰ پلٹ آؤ اور خوف نکرو تم بالکل محفوظ ہو۔

اپنا ہاتھ گریباں میں ڈالو وہ چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے اور خوف دور کرنے کے واسطے اپنا بازو پھر اپنے سے ملالینا (جس سے ہاتھ اپنے اصلی رنگ پر لوٹ آئے گا) پس یہ دّو سند تمہارے رب کی طرف فرعون اور اُسکے درباریوں کے پاس جانے کیلئے ہیں بیشک وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں۔

موسیٰ نے عرض کیا اے میرے رب میں نے اُن میں کے ایک آدمی کا قتل کیا ہے سو میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔ اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ خوش بیان ہے اُسکو میرے ساتھ مدد کیلئے روانہ فرما تاکہ وہ میری تصدیق کرے گا مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھے جھٹلا دیں گے۔

اللہ نے فرمایا ہم تیرے بھائی کے ذریعہ تیرے بازو کو مضبوط کریں گے اور تم دونوں کو غلبہ دیں گے۔ پھر وہ لوگ تم دونوں تک (ہرگز) نہیں پہنچ پائیں گے۔ ہماری نشانیوں کے زور سے غلبہ تمہارا اور تمہاری پیروی کرنیوالوں کا ہی ہوگا۔"

وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ ۔ إِذْ رَأَىٰ نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا ۔ الخ (طٰہٰ ۹ تا ۲۳)

اور تمہیں کچھ موسیٰ کی خبر بھی پہنچی ہے؟
جب کہ انھوں نے ایک آگ دیکھی اور اپنے گھر والوں سے کہا ذرا ٹھیرو میں نے ایک آگ دیکھی ہے شاید تمہارے لئے ایک آدھا انگارہ لے آؤں یا اس آگ پر مجھے (راستے کے متعلق) کوئی رہنمائی ملجائے؟
جب وہاں آئے تو پکارا گیا اے موسیٰ! میں ہی تمہارا

رب ہوں اپنی جوتیاں اُتار دو تم وادی مقدس طویٰ میں موجود ہو اور میں نے تم کو چُن لیا ہے۔ لہذا اب کان لگا کر سنو جو کچھ وحی کی جاتی ہے۔
میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں پس تم میری بندگی کرو اور میری یاد کے لئے نماز قائم کرو۔ بیشک قیامت ضرور آنے والی ہے۔ میں اُس کا وقت پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر متنفس اپنی سعی کے مطابق بدلہ پائے۔
پس تجھ کو اُس قیامت کی فکر سے روک نہ دے وہ شخص جو اُس قیامت پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہش نفس کی پیروی کر لیا ہے ورنہ تم ہلاکت میں پڑ جاؤ گے۔
اور اے موسیٰ! یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟
موسیٰ نے جواب دیا یہ میری لاٹھی ہے اس پر ٹیک لگا کر چلتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں اور بھی بہت سے کام ہیں جو اس سے لیتا ہوں۔
ارشاد فرمایا اے موسیٰ ذرا اسکو (زمین پر) ڈال دو!
پس موسیٰ نے اُسکو ڈال دیا اچانک وہ ایک سانپ تھا جو دوڑنے لگا۔
فرمایا! (اے موسیٰ) اسکو پکڑ لو اور ڈرو نہیں ہم اس کو ویسا ہی کر دیں گے جیسا یہ (پہلے لاٹھی) تھی۔ اور ذرا اپنا ہاتھ اپنی بغل میں دباؤ چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے یہ دوسری نشانی ہے۔ یہ اس لئے کہ ہم تم کو اپنی بڑی بڑی نشانیاں دکھانے والے ہیں۔"

اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِاَهْلِهٖٓ اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا۔ الخ
(النمل آیات ۷ تا ۱۲)

(انھیں اس وقت کا قصہ سناؤ) جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا مجھے ایک آگ سی نظر آئی ہے۔ میں ابھی یا تو وہاں سے کوئی خبر لے آتا ہوں یا کوئی انگارا چُن لاتا ہوں تاکہ تم لوگ گرم ہو سکو۔

پس جب وہ وہاں پہنچے تو پکارا گیا مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور جو اسکے اطراف میں ہے پاک ہے اللہ رب جہانوں کا پروردگار۔
اے موسیٰ یہ میں ہوں اللہ زبردست اور حکمت والا۔ اور اپنی لاٹھی ڈال دو۔ جوں ہی موسیٰ نے دیکھا لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے اور مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اے موسیٰ ڈرو نہیں میرے حضور رسول ڈرا نہیں کرتے۔ البتہ جو ظلم کیا اور پھر اس بُرائی کے بعد بھلائی سے بدل لیا تو میں معاف کرنے والا مہربان ہوں۔ اور ذرا اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں داخل کرلو چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے۔ یہ (دو نشانیاں) نو نشانیوں میں سے ہیں فرعون اور اُسکی قوم کی طرف (لے جانے کیلئے) بیشک وہ لوگ بدکردار قوم ہیں۔"

شرف ہمکلامی

قرآن حکیم کی آیات سابقہ کے پیش نظر دو باتیں کتب تفسیر میں زیر بحث آئی ہیں۔

اوّل موسیٰ علیہ السلام نے جس روشنی کو دیکھا وہ آگ نہ تھی بلکہ تجلی الٰہی کا نور تھا۔ لیکن جو آواز اس پردۂ نور سے سنی گئی وہ فرشتے کی آواز تھی؟ یا خود رب العالمین کی ندا تھی؟

بعض مفسرین کی رائے ہے کہ یہ فرشتے کی آواز تھی جسکے ذریعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا۔

بعض دیگر مفسرین کی رائے ہے کہ یہ براہِ راست ندائے الٰہی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس ندا کو بغیر کسی واسطہ یا ذریعہ کے سُنا، یہ اس طرح جیسا کہ پیغمبرانِ خُدا وحی الٰہی کو سُنا کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم نے اپنے کلامِ عظیم کے لئے خود یہ اپنا قانون بیان کیا ہے کہ عام فطری قوائے بشری اس قابل نہیں کہ اللہ تعالےٰ سے براہِ راست عزت ہمکلامی حاصل کرسکیں۔ اللہ تعالےٰ سے شرف ہمکلامی کے صرف تین طریقے ہیں :۔

وحی، وراء حجاب، فرشتے کے ذریعہ (شوریٰ آیت ۵۱)
وحی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بغیر کسی اسباب کے قلب میں کوئی بات ڈال دی جائے۔
وراء حجاب کا مطلب یہ کہ غیبی ندا جو رسولوں کو کی جاتی ہے۔
فرشتوں کے ذریعہ کلام کا مطلب یہ کہ اللہ کا کلام فرشتہ پڑھکر سنائے۔
اب ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہِ طور پر جو کلام کیا گیا وہ ان ہی تینوں صورتوں میں سے ایک ہوسکتا ہے۔ وحی اور فرشتے کا ذریعہ یہاں موجود نہیں۔ لہذا ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے اور وہ وراء حجاب کی ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پکارا گیا۔

قرآن حکیم نے جہاں جہاں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہمکلامی کا ذکر کیا ہے وہاں وحی یا فرشتے کا ذریعہ موجود نہیں ہے۔
سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۱ سے یہی بات مفہوم ہوتی ہے کہ یہ کلام پسِ پردہ تھا:-

فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ الآیۃ

پس جب موسیٰ اُس آگ کے قریب آئے تو پکارے گئے اے موسیٰ میں ہوں تمہارا پروردگار۔

اس لحاظ سے جن مفسرین کرام نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ کلام براہِ راست ندا کے طور پر تھا قابل ترجیح معلوم ہوتا ہے۔

وادی مقدس

طویٰ کی وادی مقدس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ آپ اس مقدس وادی میں کھڑے ہیں لہذا اپنی جوتیاں اُتار دیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وجہ خود ارشاد فرمائی ہے:-

کَانَتَا مِنْ جِلْدِ حِمَارٍ مَّیِّتٍ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جوتیاں مردہ گدھے کی کھال سے بنائی گئی تھیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

(یعنی غیر مدبوغ تھیں) لہذا وہ چمڑا پاک نہ تھا۔ اگرچہ خشک تھا۔
الغرض حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ آواز سنی کہ اللہ تعالےٰ نے انھیں

اپنے کلام و پیام کے لئے منتخب فرمایا ہے اور انبیاء سابقین کی طرح سچے دین کی تلقین اور فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کی رہائی کی اہم خدمات انجام دینے کے لئے پسند فرمالیا ہے تو انتہائی مسرت میں حیران کھڑے رہ گئے۔ آخر پھر اسی جانب سے ابتدا ہوئی پوچھا گیا اے موسیٰ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟ بس کلام شروع ہوگیا بولے یہ میری لاٹھی ہے۔ اسپر سہارا لیتا ہوں اور بکریوں کے لئے پتے وغیرہ جھاڑ لیتا ہوں۔ اسکے علاوہ اور بھی بہت سے مقاصد پورے کرتا ہوں۔

اسکے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دو عظیم معجزے عنایت کیے گئے۔

عصا، ید بیضا۔

اور فرمایا گیا یہ ہماری جانب سے تمہاری نبوت و رسالت کے دو بڑے نشان ہیں تمہاری دعوت و پیغام کی تائید و نصرت میں تم کو دیئے جاتے ہیں ضرورت پر ان سے کام لیا جائے۔ اور ارشاد ہوا کہ اب فرعون اور اس کی قوم کو راہِ ہدایت دکھاؤ اُنھوں نے بہت سرکشی اور نافرمانی اختیار کر رکھی ہے اور اپنے غرور و تکبر میں بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے سو اُن کو غلامی سے نجات دلائی جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالےٰ کے اس ارشاد پر عرض کیا پروردگار میرے ہاتھ سے ایک مصری کا قتل ہوگیا تھا اس لئے مجھے خوف ہے کہ کہیں وہ مجھے پاکر قتل نہ کردیں۔ علاوہ ازیں مجھے یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ میری شدت کے ساتھ تکذیب کردیں گے اور مجھے جھٹلائیں گے۔ لہٰذا جب آپ نے یہ منصب عالی عطا کی ہے تو میرے سینے کو فراخ اور نور سے معمور کر دیجئے اور اس خلافت کو آسان بنا دیجئے اور میری زبان میں پڑی ہوئی گرہ کو کھول دیجئے تاکہ لوگوں کو میری بات سننے سمجھنے میں آسانی ہو اور چونکہ میری گفتگو میں روانی نہیں ہے اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح ہے اس لئے اُس کو بھی اپنی اس نعمت نبوت سے نواز کر میرا شریک کار بنا دیجئے۔

اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اطمینان دلایا کہ تم ہمارا پیغام لے کر ضرور جاؤ اور ان لوگوں کو حق کی راہ دکھاؤ۔ وہ تمہارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکیں گے۔ ہماری مدد تمہارے ساتھ رہے گی اور جو نشانات ہم نے تم کو دیئے ہیں وہ تمہاری کامیابی کا ذریعہ ثابت ہوں گے اور انجام کار تم ہی غالب ہو گے۔ ہم تمہارے

بھائی ہارون کو تمہارا شریکِ کار بناتے ہیں تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور اس کو صحیح راہ دکھاؤ۔

داخلۂ مصر | مؤرخ سُدّی لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام منصبِ رسالت سے سرفراز ہوکر وادیٔ مقدس سے اُترے تو اپنی بیوی کے پاس پہنچے جو وادی کے سامنے والے جنگل میں منتظر تھیں اُن کو ساتھ لیا اور یہیں سے تعمیلِ حکم الٰہی میں مصر روانہ ہوگئے۔ منزل بمنزل طے کرتے ہوئے رات کے وقت مصر میں داخل ہوکر اپنے مکان پہنچے مگر اندر داخل نہ ہوئے والدہ صاحبہ کے آگے ایک مسافر کی حیثیت میں ظاہر ہوئے۔ یہ مکان مہمان نواز گھر تھا حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی خوب خاطر مدارات کی گئی اسی دوران اُن کے بڑے بھائی حضرت ہارون آ پہنچے۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے مصر پہنچنے سے قبل اُنھیں نبوت سے سرفراز کیا جاچکا تھا اور اُنھیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آمد کی اطلاع بھی دی جاچکی تھی وہ بھائی کو دیکھ کر لپٹ گئے اور پھر انکے اہل و عیال کو گھر کے اندر لے گئے اور والدہ صاحبہ کو سارا حال سنایا۔ تب سارے خاندان نے خوشیاں منائیں۔

شرفِ ہمکلامی، عطائے نبوت، معجزات، وادیٔ مقدس کا ذکر اور مصر میں داخلہ کا مفصل تذکرہ آیات ذیل میں ترتیب وار مذکور ہے۔

قرآنی مضمون | وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ. الخ (طٰہٰ آیات ۱۷ تا ۲۳)

(اور ندائے غیبی نے پوچھا) اے موسیٰ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟

عرض کیا میری لاٹھی ہے چلنے میں اس کا سہارا لیتا ہوں، اسی سے بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں، اور میرے لئے اسمیں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں۔

حکم ہوا اے موسیٰ اسے زمین پر ڈالدو۔

پس موسیٰ نے ڈال دیا تو وہ اچانک سانپ تھا جو دوڑ

رہا ہے۔
حکم ہوا اسکو پکڑلو اور خوف نہ کرو ہم اُسے پھر اسکی اصلی حالت پر کئے دیتے ہیں۔ (اور نیز حکم ہوا) اپنا داہنا ہاتھ اپنے پہلو میں رکھ لو اور پھر نکالو تو وہ چمکتا ہوا بغیر کسی عیب کے نکلے گا۔ یہ (تمہارے لئے) دوسری نشانی ہے۔ (اور یہ دونوں نشانیاں) اس لئے (دی گئی ہیں) کہ آئندہ تم کو اپنی قدرت سے ہم بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں گے۔"

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشَّاهِدِينَ۔ (قصص آیات ۴۴ تا ۴۶)

(اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اس وقت مغربی گوشے میں موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو یہ فرمانِ شریعت عطا کیا ہے اور نہ آپ شاہدین میں شامل تھے۔ بلکہ اسکے بعد (آپؐ کے زمانے تک) ہم نے بہت سی نسلیں پیدا کیں اور اُن پر بہت زمانہ گزر چکا ہے اور نہ آپؐ اہل مدین کے درمیان موجود تھے کہ ان کو ہماری آیات سنا رہے ہوتے مگر (اس وقت کی یہ خبریں) بھیجنے والے ہم ہیں۔ اور آپ طور کے دامن میں بھی اُس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو پکارا تھا مگر یہ آپؐ کے رب کی رحمت ہے (کہ یہ معلومات آپ کو دی جارہی ہیں) تاکہ آپ اُن لوگوں کو خبردار کریں جن کے پاس آپؐ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا شاید کہ وہ نصیحت قبول کریں۔"

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ۔ إِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى۔ (النازعات آیات ۱۵ تا ۱۹)

کیا آپ تک موسیٰ کا قصہ پہنچا؟
جب کہ اُسکے رب نے اُسکو طُویٰ کی وادی مقدس میں پکارا (اے موسیٰ) جاؤ تم فرعون کی طرف بیشک اُس نے سرکشی کی ہے۔ پھر اُسکو کہو کیا تجھ کو رغبت ہے اس بات کی کہ تو سنور جائے؟ اور میں تجھکو سیدھی راہ دکھاؤں تیرے رب کی طرف تاکہ تجھ کو ڈر ہو۔"

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى۔ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ
لِيْ صَدْرِيْ۔ الخ (طٰہٰ آیات ۲۴ تا ۳۶)

(حکم ہوا) اب تم فرعون کے پاس جاؤ بیشک وہ سرکش ہوگیا ہے
موسیٰ نے عرض کیا پروردگار میرا سینہ کھول دیجئے اور میرا
کام میرے لئے آسان کردیجئے اور میری زبان کی گرہ کھول دیجئے تاکہ
وہ لوگ میری بات (اچھی طرح) سمجھ سکیں اور میرے لئے میرے خاندان
سے ایک وزیر مقرر کردیجئے۔ ہارون جو میرا بھائی ہے اُسکے ذریعہ میرا
ہاتھ مضبوط فرما۔ اور اُسکو میرے کام میں شریک فرما تاکہ ہم آپکی خوب
پاکی بیان کرسکیں اور آپ کا ذکر کثرت سے کریں۔ اور آپ ہمارے حال
پر ہمیشہ نگراں رہے ہیں۔"

ارشاد ہوا دیا گیا جو تونے مانگا اے موسیٰ۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ۔ الخ
(طٰہٰ آیات ۴۲ تا ۴۸)

اے موسیٰ جاؤ تم اور تمہارے بھائی میری نشانیوں کے ساتھ
اور دیکھو میری یاد میں تقصیر نہ کرنا۔ جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ
سرکش ہوگیا ہے۔

پس اُس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے
یا ڈر جائے۔

دونوں نے عرض کیا پروردگار ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر
زیادتی کر بیٹھے یا پل پڑے گا۔

ارشاد ہوا ڈرو نہیں میں تم دونوں کے ساتھ ہوں (سب
کچھ) سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔

لہٰذا تم دونوں اُسکے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم دونوں تیرے
پروردگار کے فرستادہ ہیں۔ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کیلئے
چھوڑ دے اور اُنھیں تکلیف نہ دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی

نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی ہے اُس کے لئے جو راہِ راست کی پیروی کرے۔

بیشک ہماری طرف وحی کی گئی ہے کہ عذاب ہے اُس شخص کے لئے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَا مَعَهُ أَخَاهُ هَارُونَ وَزِيرًا ۔ الخ (فرقان آیات ۳۵ تا ۳۶)

"اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اُسکے ساتھ اُن کے بھائی ہارون کو مددگار بنایا۔ اور اُن سے کہا تم دونوں جاؤ اُس قوم کی طرف جس نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا ہے۔ آخر کار اُن لوگوں کو ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا۔"

وَإِذْ نَادَى رَبُّكَ مُوسَى أَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۔ الخ (الشعراء آیات ۱۰ تا ۱۷)

(اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ان اہل مکہ کو اس وقت کا قصہ سناؤ) جبکہ تمہارے رب نے موسیٰ کو پکارا کہ (اے موسیٰ) ظالم قوم کے پاس جائیے (جو) فرعون کی قوم ہے کیا وہ نہیں ڈرتے؟

عرض کیا اے میرے رب مجھے خوف ہے کہ وہ لوگ مجھے جھٹلا دیں گے اور میرا سینہ گھٹتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی سو آپ ہارون کی طرف رسالت بھیجیں۔ اور مجھ پر اُن کے ہاں ایک جرم کا الزام بھی ہے۔ اس لئے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

ارشاد ہوا ہرگز نہیں تم دونوں جاؤ ہماری نشانیاں لے کر بیشک ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سنتے رہیں گے۔ فرعون کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو ہم کو رب العالمین نے اس لئے بھیجا ہے کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے۔

وَأَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَآهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلَّى مُدْبِرًا وَلَمْ يُعَقِّبْ يَا مُوسَى لَا تَخَفْ ۔ الخ (النمل آیات ۱۰ تا ۱۲)

اور اپنی لاٹھی ذرا پھینک دے جونہی دیکھا تو وہ لاٹھی گویا سانپ تھی بَل کھا رہی ہے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اے موسیٰ ڈرو نہیں میرے حضور پیغمبر ڈرا نہیں کرتے۔ الّا یہ کہ کسی نے قصور کیا ہو پھر اگر بُرائی کے بعد اُس نے بھلائی سے (اپنے فعل کو) بدل لیا تو میں معاف کرنے والا مہربان ہوں۔ اور ذرا اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے، یہ (دو نشانیاں اُن) نو نشانیوں میں سے ہیں۔ فرعون اور اُسکی قوم کی طرف (لے جانے کیلئے) بلاشُبہ وہ بڑے بدکردار لوگ ہیں۔"

الغرض ان آیات میں عصائے موسیٰ کے معجزہ یا آیت اللہ ہونے کو مختلف تعبیرات سے ادا کیا گیا ہے۔

سورہ طٰہٰ میں حَيَّةٌ تَسْعٰى (دوڑتا بَل کھاتا سانپ) کہا گیا۔ اور سورۂ نمل اور سورۂ قصص میں جَانٌّ (پتلا پھرتیلا سانپ) کہا گیا۔ اور سورۂ شعراء میں ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ (واضح موٹا اژدھا) بیان کیا گیا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ عصائے موسیٰ کی اگرچہ یہ تعبیرات لفظی اعتبار سے مختلف ہیں لیکن حقیقت اور معنی کے لحاظ سے مختلف نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے مختلف اوصاف کو ادا کیا گیا ہے۔ یعنی ذات کے لحاظ سے وہ حقیقی حَيَّةٌ سانپ تھا اور تیز روی کے لحاظ سے جَانٌّ تیز رو پھرتیلا سانپ تھا اور جسامت کے پیشِ نظر وہ ثُعْبَانٌ موٹا اژدھا تھا یعنی بیک وقت اسمیں یہ مختلف اوصاف تھے۔

سورۂ قصص میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دونوں معجزوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا :-

وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ۔

(آیت ۳۲ سورہ قصص)

اور خوف سے بچنے کے لئے اپنا بازو اپنی طرف بھینچ لے۔

اس آیت میں کس قسم کے خوف کا ذکر ہے؟ مفسرین نے مختلف قسم کے خوف کی تعیین کی ہے۔ بعض نے کہا کہ سانپ کا ڈر مراد ہے اور بعض نے کہا فرعون کے دربار کا خوف مراد ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے ہر قسم کے خوف کے وقت اپنا ہاتھ اپنے بازو میں دبا لیا جائے تو خوف جاتا رہے گا۔ یعنی جب کبھی بھی کوئی خطرناک موقع ایسا آجائے جس سے دل میں خوف واندیشہ پیدا ہو تو اپنا بازو بھینچ لیا کرو اس سے تمہارا دل قوی ہوجائیگا اور رُعب و دہشت کی کوئی کیفیت باقی نہ رہے گی۔ اس بھینچ لینے کی دو شکلیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ ہاتھ کو پہلو کے ساتھ لگا کر دبا لیا جائے۔

دوسری شکل یہ کہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کی بغل میں رکھ کر دبایا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ تدبیر اس لئے بتلائی گئی کہ وہ ایک ظالم بادشاہ کا مقابلہ کرنے کے لئے بغیر کسی لاؤ لشکر اور ساز و سامان کے بھیجے جارہے تھے یقیناً ایسے خوفناک مواقع پیش آنے والے تھے جن میں فطری طور پر ہراساں اور خوفزدہ ہونا ممکن تھا۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے اس سے تحفظ کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ تدبیر اختیار کرنیکی ہدایت کی جس سے خوف و اندیشہ جاتا رہے گا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس عمل سے فائدہ اُٹھایا اور بے خوف واندیشہ دربارِ فرعون میں جا پہنچے اور دُو بدو کلام اور بحث و مناظرہ کیا۔

یہ دراصل کوئی تیسری نشانی نہ تھی بلکہ خوف اور ڈر کو دُور کرنے کا ایک علاج تھا۔ واللہ اعلم۔

فرعون اور دعوتِ حق

مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام بے خوف وخطر فرعون کے دربار میں داخل ہوگئے۔ فرعون نے اس اچانک آنیکی غرض پوچھی ؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہارون علیہ السلام نے جواب دیا کہ اللہ نے ہم دونوں کو اپنا پیام و رسالت دیکر تیرے پاس بھیجا ہے۔ ہم تجھ سے دو باتوں کا مطالبہ کرنے آئے ہیں۔

پہلی بات تو یہ کہ اُس خدا پر ایمان لا جو ساری کائنات کا خالق ہے۔

دوسری بات یہ کہ بنی اسرائیل پر ظلم کرنے سے باز آ اور اُن کو اپنی غلامی سے نجات دے۔

فرعون نے جب یہ سُنا تو غضبناک ہوگیا کہنے لگا اے موسیٰ آج تو میرے آگے

بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کرتا ہے وہ دن بھول گیا جب کہ تو نے میرے گھر پرورش پائی اور بچپن کی زندگی گزاری؟ اور کیا تو یہ بھی بھول گیا کہ تو نے ایک مصری کو قتل کیا تھا اور پھر یہاں سے فرار ہوگیا تھا؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ساری باتوں کا اعتراف کیا اور قتل کے بارے میں یہ وضاحت کی کہ میں نے دانستہ کوئی قتل نہیں کیا البتہ اُس ظالم مصری کو دھمکانے کے لئے ایک گھونسا رسید کیا تھا جس پر اُس نے دم توڑ دیا۔ اس سے زیادہ میرا اور کوئی قصور نہیں۔

پھر جب میں نے یہاں سے کوچ کیا تو اللہ تعالےٰ نے میری خطا معاف کردی اور مجھکو نبوت و رسالت سے سرفراز کیا ہے۔

میں تجھ کو خدائے واحد کی طرف دعوت دیتا ہوں، اُسکے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ رب العالمین ہے۔

یہ سنکر فرعون حیرت و تعجب سے کہنے لگا موسیٰ کیا میرے علاوہ اور بھی کوئی رب ہے؟ اگر یہ صحیح ہے تو اسکی حقیقت بیان کر؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہمارا رب وہی ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور اُس ساری مخلوق کو بھی جو اِن کے درمیان ہے۔

فرعون اس کا جواب نہ دے سکا اور درباریوں سے کہنے لگا مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے یہ مجنوں اور پاگل انسان ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اگر تم لوگ ذرا سی بھی عقل سے کام لو تو اس حقیقت کو پا سکتے ہو۔

فرعون کے دربار میں دعوتِ حق کا تذکرہ قرآن حکیم کی مختلف سورتوں میں اس طرح موجود ہے:۔

قرآنی مضمون

وَقَالَ مُوسٰى يٰفِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعٰلَمِينَ۔ الخ (اعراف آیات ۱۰۴، ۱۰۵)

اور موسیٰ نے کہا اے فرعون میں رب العالمین کا فرستادہ ہوں۔

میرے لئے کسی طرح زیبا نہیں کہ اللہ تعالےٰ پر حق اور سچ کے علاوہ کچھ اور کہوں۔ بلاشبہ میں تمہارے لئے تمہارے رب کی طرف سے دلیل اور نشان لایا ہوں۔ لہذا میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے۔"

فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُولَا إِنَّا رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ الخ

(الشعراء ع۱۶ تا ع۳۳)

سو تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو ہم کو ربُّ العالمین نے اس لئے بھیجا ہے کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے۔

فرعون نے کہا کیا ہم نے تجھ کو اپنے ہاں بچہ سا نہیں پالا تھا؟ تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں گزارے۔

اور اسکے بعد تو کر گیا جو کچھ کر گیا (یعنی ایک شہری کا قتل بھی کیا) اور تو (اے موسیٰ) بڑا احسان فراموش آدمی ہے۔

موسیٰ نے جواب دیا اس وقت وہ کام میں نے نادانستگی میں کر دیا تھا۔

پھر میں تمہارے خوف سے بھاگ گیا اسکے بعد میرے رب نے مجھ کو حکمت (نبوت) عطا فرمائی اور مجھے رسولوں میں شامل فرمالیا۔

اور میری پرورش کا یہ احسان جسکو تو مجھ سے جتا رہا ہے کیا ایسا احسان ہے کہ تو بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھے؟

فرعون نے کہا اور یہ رب العالمین کیا ہوتا ہے؟

موسیٰ نے جواب دیا آسمانوں اور زمین کا رب، اور اُن سب چیزوں کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں اگر تم یقین لانے والے ہو۔

فرعون نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے کہا کیا تم لوگ نہیں سنتے ہو؟

موسیٰ نے کہا تمہارا رب بھی اور تمہارے اُن آباء واجداد

کا رب بھی جو گزر چکے ہیں۔
فرعون نے حاضرین سے کہا تمہارے یہ رسول صاحب جو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں پاگل معلوم ہوتے ہیں۔
موسیٰ نے کہا مشرق ومغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب اگر تم لوگ عقل رکھتے ہو۔
فرعون نے کہا اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو تجھے بھی اُن لوگوں میں شامل کر دوں گا جو قید خانوں میں پڑے ہوئے ہیں۔
موسیٰ نے کہا اگرچہ میں تیرے سامنے ایک واضح دلیل بھی لے آوں ؟
فرعون نے کہا اچھا تو لے آ اگر تو سچا ہے۔
موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا تو یکایک وہ ایک نمایاں اژدہا تھا اور (پھر) اپنا ہاتھ (بغل سے) کھینچا تو وہ سب دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا۔

اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ۔الخ

(طٰہٰ آیات ۴۸ تا ۵۶)

ہم کو وحی کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ اُس شخص کیلئے عذاب ہے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔
فرعون نے کہا تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ ؟
موسیٰ نے جواب دیا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُسکی ساخت بخشی پھر اسکو راستہ بتایا۔
فرعون بولا اور پہلے جو نسلیں گزر چکیں ہیں انکا کیا انجام تھا؟
موسیٰ نے کہا اُسکا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتے میں محفوظ ہے۔ میرا رب نہ چوکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔
وہی جس نے زمین کا فرش بچھایا اور اُس میں تمہارے چلنے

کے لئے راستے بنائے اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اُسکے ذریعہ سے مختلف اقسام کے نباتات کے جوڑے نکالے۔

کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ یقیناً اسمیں بہت سی نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے۔ اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تمہیں واپس لے جائیں گے اور اسی میں سے تم کو دوبارہ نکالیں گے۔

اور ہم نے فرعون کو اپنی ساری نشانیاں دکھائیں مگر وہ جھٹلائے چلا گیا اور نہ مانا۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى الخ (القصص آیات ۳۶ تا ۴۲)

پھر جب موسیٰ ان لوگوں کے پاس ہماری کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو اُنھوں نے کہا کہ یہ کچھ نہیں ہے سوائے بناوٹی جادو، اور یہ باتیں تو ہم نے اپنے باپ دادا کے زمانے میں کبھی نہیں سنی ہیں۔

اور موسیٰ نے کہا میرا رب اُس شخص کے حال سے خوب واقف ہے جو اُسکی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ آخری انجام کس کا اچھا ہونا ہے۔ حق یہ ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پاتے۔

اور فرعون نے کہا اے اہل دربار! میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا۔ پس اے ہامان ذرا اینٹیں پکوا کر میرے لئے ایک اونچی عمارت تیار کر شاید میں اُسپر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کو دیکھ سکوں اور میں تو اسے یقیناً جھوٹوں میں سمجھتا ہوں۔

اور اُس نے اور اُس کے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور گمان کیا کہ انھیں کبھی ہماری طرف پلٹنا نہیں ہے۔

آخر کار ہم نے اُسے اور اُسکے لشکروں کو پکڑا پھر سمندر میں پھینک دیا سو اب دیکھو اُن ظالموں کا کیا انجام ہوا۔

ہم نے انھیں جہنم کی طرف دعوت دینے والے پیش رو بنا دیا اور قیامت کے دن وہ کہیں سے کوئی مدد نہ پا سکیں گے۔

اور ہم نے اِس دنیا میں اُن کے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے دن بڑی قباحت میں مبتلا ہوں گے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا هَامَانُ ابْنِ لِي صَرْحًا لَّعَلِّي أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ الخ (المؤمن آیت ۳۶ تا ۳۷)

"فرعون نے کہا اے ہامان میرے لئے ایک بلند عمارت تیار کر تاکہ میں آسمانوں کی بلندیوں اور اُن کے ذرائع تک قدرت حاصل کر سکوں۔ اس طرح موسیٰ کے خدا کا حال (بھی) معلوم کر سکوں اور ہیں تو اُس کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔ اسی طرح فرعون کے لئے اُس کی بدعملی کو خوبصورت کر دیا گیا اور وہ راہِ حق سے روک دیا گیا اور فرعون کے مکر کا آخری انجام ہلاکت ہے۔"

شاہ عبد القادر صاحبؒ نے موضح القرآن میں لکھا ہے کہ آیت مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي۔ (فرعون نے کہا اے درباریوں میں تمہارے لئے اپنے سوا کوئی خدا نہیں جانتا)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون دہری تھا اور تفسیر و تاریخ کے کتب میں جو مصر قدیم کے تاریخی حوالجات نقل کئے گئے ہیں اُن سے یہی پتہ چلتا ہے کہ اہل مصر دیوتاؤں کے پرستار تھے۔ اور ان کا سب سے بڑا دیوتا "آمن راع" (سورج دیوتا) تھا۔ یہ لوگ خدائے واحد کے قائل نہ تھے بلکہ کائنات کی تخلیق اور اُن کے ہر معاملات اور حوادث کا تعلق ستاروں اور دیوی دیوتاؤں ہی سے متعلق سمجھا کرتے تھے۔ یہ ایسے ہی جیسا کہ ہندوستان کے جین مت قوم کا عقیدہ ہے۔ یہ قوم بھی خدائے واحد کی منکر اور دیوتاؤں کی پرستش کرتی ہے بلکہ کائنات کی تخلیق اور اُن کے ہر معاملات اور حوادث کا تعلق ستاروں اور دیوی دیوتاؤں ہی سے متعلق سمجھا کرتے تھے۔ یہ ایسے ہی جیسا کہ ہندوستان کے جین مت قوم کا عقیدہ ہے۔ یہ قوم بھی خدائے واحد کی منکر اور دیوتاؤں کی پرستش کرتی ہے۔

ہامان ہامان کے متعلق قرآن کریم نے کوئی تصریح نہیں کی کہ یہ کسی شخصیت کا نام ہے

یاعہدہ اور منصب کا نام ہے۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرعون کے کسی با اعتماد آدمی کا ہی نام ہے جو فرعون کے احکام اور مرضیات کو نافذ کرتا ہوگا۔ فرعون کا یہ کہنا کہ اے ہامان ایک بلند عمارت تعمیر کر، شخصی خطاب معلوم ہوتا ہے جو عموماً با اعتماد افراد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

اسی طرح عمارت کے تعلق سے بھی قرآن حکیم میں ایسی کوئی وضاحت نہیں ملتی کہ ہامان نے فرعون کے اس حکم کی تعمیل میں کوئی عمارت تعمیر کی یا نہیں؟

یہاں بھی قرآن حکیم نے فرعون کا صرف حکم نقل کیا ہے لیکن تاریخی روایات میں موجود ہے کہ ہامان نے اس محل کی تعمیر کیلئے پچاس ہزار معمار جمع کئے اور محل کو اتنا اونچا کیا کہ اس زمانے میں اس سے بلند کوئی عمارت نہ تھی، پھر جب یہ تعمیر مکمل ہوگئی تو اللہ تعالےٰ کے حکم سے جبرئیل امین نے ایک ضرب میں اسکے تین ٹکڑے کرکے گرا دیا۔ جس سے فرعونی فوج کے ہزاروں آدمی دب کر مر گئے۔ (قرطبی)

بہرحال واقعہ کا انحصار اسپر نہیں کہ ہامان کی شخصیت کیا تھی؟ اور محل تعمیر ہوا تھا یا نہیں؟ مقصود تو یہ تھا کہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنی شکست کو چھپانے کے لئے اگرچہ مذکورہ بالا طریقہ اختیار کیا مگر وہ خود بھی سمجھتا تھا کہ یہ ایک دھوکہ ہے اور بس۔

آغازِ مقابلہ

فرعون کا خدشہ بڑھتا ہی رہا اسکو حق و باطل کی اس کشمکش میں اپنے لئے سخت خطرہ نظر آرہا تھا۔ بقول شخصے تنگ آمد بجنگ آمد، اُس نے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے خلاف طاقت و قوت کا فیصلہ کرلیا اور یہ دھمکی دی کہ اے موسیٰ اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو اپنا معبود قرار دیا تو میں تجھکو قید میں ڈال دونگا اور بنی اسرائیل پر اپنی گرفت مضبوط کردوں گا۔ اسپر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

اگرچہ میں تیرے پاس اللہ واحد کی جانب سے ایک واضح دلیل لیکر آیا ہوں تب بھی تیرے غلط راستے کو اختیار کرلوں؟

فرعون نے کہا اگر واقعی تو سچا ہے تو پھر وہ نشان دکھا؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھرے دربار میں اپنا عصا زمین پر ڈالا وہ اچانک ایک اژدھا کی شکل اختیار کرلیا اور یہ حقیقت تھی، نظر کا دھوکہ نہ تھا۔

اسکے بعد اپنے ہاتھ کو گریبان کے اندر لے جاکر باہر نکالا تو وہ ایک روشن ستارے کی طرح چمکتا ہوا نظر آیا۔ یہ دوسری نشانی تھی جو پہلی مرتبہ فرعون اور اہل دربار کے آگے پیش کی گئی۔

فرعون کے درباریوں نے جب یہ دیکھا کہ ایک اسرائیلی کے ہاتھوں اپنی قوم اور اپنے بادشاہ کی شکست ہورہی ہے تو وہ بیقرار ہوکر کہنے لگے، بلاشبہ موسیٰ بڑا جادوگر ہے اور اس کا ارادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو سرزمین مصر سے باہر کردے اور تختِ مصر پر قابض ہوجائے۔

باہمی مشورہ سے طے پایا کہ فی الحال موسیٰ اور ہارون کو مہلت دی جائے اور اس دوران مملکت کے ماہر جادوگروں کو دار السلطنت میں جمع کیا جائے اور پھر مقابلہ کرایا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ بہتر ہے ایسا کوئی انتظام ہوجائے اور اس کے لئے ملک کے قومی دن کا انتظار کیا جائے تاکہ اس مقابلہ کا انجام ہر شخص دیکھ سکے۔

یہ نبوت و رسالت کے عزم و ارادہ کا ایک کھلا ثبوت ہے کہ وہ حق کے اظہار کیلئے بڑا سے بڑا خطرہ مول لیتا ہے۔ انبیاء و رسل کو اللہ کی ذات پر کس قدر اعتماد ہوتا ہے وہ اس واقعہ سے بخوبی سمجھ میں آتا ہے۔

الغرض یوم الزینہ (جشن کا یوم) مقابلہ کے لئے طے پایا، فرعون نے اپنے ارکان دولت کے نام احکام جاری کردیئے کہ مملکت میں جسقدر بھی ماہر جادوگر ہوں انھیں جلد از جلد جمع کرلیا جائے۔

بہرحال جشن کا دن آیا سب لوگ میدان میں جمع ہوگئے۔ فرعون اپنے ارکانِ دولت کے ساتھ میدان میں تخت نشین ہوا۔ لاکھوں افراد حق و باطل کا یہ مقابلہ دیکھنے جمع ہیں۔ ایک جانب مصر کے تمام نامی گرامی جادوگر جمع ہیں دوسری طرف حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام حق و صداقت کے اظہار کیلئے کھڑے ہیں۔ آپس میں گفتگو کے بعد طے پایا کہ مقابلہ کا آغاز جادوگر کریں گے۔

چنانچہ یہ ساری تفصیل آیات ذیل میں اسطرح مذکور ہے :-

قرآنی مضمون | قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِيْنَ ۔الخ

(الشعراء آیات ۲۳ تا ۳۳)

فرعون نے کہا اور یہ ربُّ العالمین کیا ہوتا ہے ؟

موسیٰ نے جواب دیا آسمانوں اور زمین کا رب اور اُن سب چیزوں کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں اگر تم یقین کرنے والے ہو؟ فرعون نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے کہا سنتے ہو؟

موسیٰ نے کہا تمہارا رب بھی اور تمہارے اُن آباء واجداد کا رب بھی جو گزر چکے ہیں!

فرعون نے (حاضرین سے) کہا تمہارے یہ رسول صاحب جو تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں بالکل پاگل ہیں۔

موسیٰ نے کہا مشرق و مغرب اور جو کچھ اِن کے درمیان ہے سب کا رب اگر تم لوگ عقل رکھتے ہوں۔

فرعون نے کہا اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو تجھ کو یقیناً قیدیوں میں شامل کر دوں گا۔

موسیٰ نے کہا اگرچہ میں تیرے آگے ایک کھُلی دلیل لے آوں؟

فرعون نے کہا اچھا تو لے آ، اگر تو سچوں میں سے ہے۔

پس موسیٰ نے اپنا عصا ڈال دیا تو یکایک وہ حقیقی اژدھا تھا اور (اسکے بعد) انھوں نے اپنا ہاتھ (بغل سے) کھینچا تو وہ سب دیکھنے والوں کے آگے چمک رہا تھا۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ ۔الخ

(اعراف آیات ۱۰۴ تا ۱۱۲)

موسیٰ نے کہا اے فرعون میں رب العالمین کا فرستادہ رسول ہوں۔ میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے

سو انہ کہوں میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے کھلی دلیل لے کر آیا ہوں۔ لہذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔
فرعون نے کہا اگر تو کوئی نشانی لایا ہے تو اسکو پیش کر اگر تو سچا ہے۔
موسیٰ نے اپنا عصا ڈال دیا تو اچانک وہ حقیقی اژدہا تھا۔
(اور پھر) اپنا ہاتھ (اپنی گریبان سے) نکالا تو وہ دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا۔
(اسپر) فرعون کے قوم کے سرداروں نے کہا کہ یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے۔ تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے اب کیا حکم کرتے ہو؟
(پھر اُن سب نے فرعون کو مشورہ دیا) کہا اِسکو اور اسکے بھائی (ہارون کو) مہلت دیجیئے اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دیجئے کہ ہر ماہر جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ الخ
(یونس آیات ۷۵ تا ۷۹)

پھر اُن (نبیوں) کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا مگر انھوں نے بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ مجرم لوگ تھے۔
پس جب ہمارے پاس سے حق اُن کے سامنے آیا تو اُنھوں نے کہہ دیا یقیناً یہ تو کُھلا جادو ہے۔
موسیٰ نے کہا تم لوگ حق کو ایسا کہتے ہو جبکہ وہ تمہارے سامنے آگیا کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر کبھی فلاح نہیں پاتے۔
انھوں نے جواب دیا (اے موسیٰ) کیا تو اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اُس طریقے سے پھیر دے جسپر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا

ہے اور زمین میں بڑائی تم دونوں کی قائم ہوجائے تمہاری بات تو ہم
ماننے والے نہیں ہیں۔ اور فرعون نے کہا (اپنے سرداروں سے) ہر
ماہر فن جادوگر کو میرے پاس حاضر کرو۔"
وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى. الخ
(طٰہٰ آیات ۵۶ تا ۵۹)

فرعون نے کہا اے موسیٰ کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا
ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال باہر کرے۔
اچھا تو ہم بھی تیرے مقابلے میں ویسا ہی جادو لاتے ہیں۔
لہذا طے کرلے اپنے اور ہمارے درمیان ایک دن (مقابلہ کا) نہ ہم اس
سے پھریں گے نہ تو پھرنا کھلے میدان میں۔
موسیٰ نے کہا جشن کا دن تمہارے لئے طے ہوا اور یہ کہ دن
چڑھے لوگ جمع ہوں۔ پس فرعون پلٹا اور اپنے داؤ پیچ جمع کئے پھر
مقابلہ کے لئے آیا۔
قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ. الخ
(اعراف آیات ۱۰۹ تا ۱۲۷)

فرعون کی قوم کے سرداروں نے آپس میں کہا کہ یقیناً یہ شخص
(موسیٰ) بڑا ماہر جادوگر ہے۔ تم کو تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا
ہے اب کیا کرنا چاہتے ہو؟
اُن سب نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اِسکو اور اسکے بھائی
(ہارون) کو انتظار میں رکھئے اور شہروں میں ہرکارے روانہ کر دیجئے۔ کہ
ہر ماہر فن جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں۔
(چنانچہ) جادوگر فرعون کے پاس آگئے انھوں نے کہا اگر
ہم غالب رہے تو ہمیں اِس کا صلہ تو ضرور ملے گا؟
فرعون نے کہا ہاں! اور تم مقرّبِ دربار ہوجاؤ گے۔
جادوگروں نے کہا اے موسیٰ تم اپنا جادو ڈالوگے یا ہم

ڈالیں ؟

موسیٰ نے جواب دیا تم ہی ڈالو۔ بس جادوگروں نے اپنا جادو پیش کیا تو لوگوں کی نگاہوں کو مسحور کر دیا اور دلوں کو خوفزدہ کر دیا اور بڑا ہی زبردست جادو لے آئے۔ اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنا عصا ڈال دے! (بس اُس کا پھینکنا تھا کہ آن کی آن میں) وہ ان جادوگروں کے جھوٹے کرتبوں کو نگلتا چلا گیا۔ (اس طرح جو حق تھا) پس وہ حق ثابت ہوا اور جو کچھ اُن جادوگروں نے بنایا تھا باطل ہو کر رہ گیا)

پس فرعون اور اُسکے جادوگر مقابلہ میں ہار گئے اور ذلیل و خوار ہو کر لوٹ گئے۔ اور جادوگر (اللہ واحد کے لئے) سجدے میں گر پڑے۔ اور کہنے لگے کہ ہم رب العالمین پر ایمان لائے۔ جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔

فرعون نے کہا تم موسیٰ پر ایمان لائے قبل اسکے کہ میں تمہیں اجازت دوں؟ یقیناً یہ کوئی خُفیہ سازش تھی جو تم نے اس شہر میں کی تاکہ اسکے باشندوں کو شہر بدر کرو۔ اچھا اس کا نتیجہ اب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔

میں تمہارے ہاتھ پیر مخالف سمتوں سے کٹوا دوں گا۔ پھر اسکے بعد تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔

انھوں نے جواب دیا بہرحال ہمیں اپنے رب ہی کی طرف پلٹنا ہے۔ اور تو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم نے اُنھیں مان لیا، اے رب ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اُٹھا تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرمانبردار ہوں"

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوسَىٰٓ اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ۔ الخ۔ (یونس آیات ۸۰ تا ۸۲)

پھر جب جادوگر آگئے تو موسیٰ نے اُن سے کہا جو کچھ تم کو پھینکنا ہو پھینکو۔ پھر جب انھوں نے اپنے جادو کی رسیاں وغیرہ پھینک دیں تو موسیٰ نے کہا یہ جو کچھ تم نے پھینکا ہے یہ جادو ہے اللہ تعالیٰ ابھی اسے باطل کئے دیتا ہے۔ یقیناً اللہ مفسدوں کے کام کو سُدھرنے نہیں دیتا۔ اور اللہ تعالےٰ حق کو اپنے احکام کے مطابق ضرور ثابت کر دکھائیگا اگرچہ مجرموں کو ایسا ہونا پسند نہ آئے۔

ظہورِ حق

جادوگر جو اپنے فن کے ماہر اور کامل تھے جب عصا موسیٰ (علیہ السلام) کا یہ معجزہ دیکھا تو وہ حقیقت حال کو سمجھ گئے اور جس بات کو اس وقت تک فرعون اور اُس کے درباری پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے وہ اس کو چھپا نہ سکے اور جادوگروں نے برسرِ عام اعتراف کرلیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ عمل جادو سے بالاتر اللہ کا معجزہ ہے۔ اسکو جادو سے کوئی نسبت نہیں اور پھر فوراً اللہ کی عظمت کے آگے سجدہ میں گر پڑے اور اعلان کر دیا کہ ہم موسیٰ اور ہارون کے پروردگار پر ایمان لے آئے وہی رب العالمین ہے۔

فرعون نے جب یہ دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شکست دینے کی جو آخری صورت تھی وہ بھی ختم ہوگئی۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ مصری عوام بھی ہاتھ سے جائیں اور حضرت موسیٰ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائیں تو اس نے مکر وفریب کا ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا ساحروں سے کہنے لگا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ تم سب کا استاذ ہے اور تم سب نے آپسمیں سازش کر رکھی تھی تب ہی تو تم میری اجازت کے بغیر موسیٰ کے رب پر ایمان لے آئے۔

اب میں تمہیں عبرتناک سزا دوں گا تاکہ آئندہ کسی کو ایسی بے وفائی کی جرأت نہ ہو۔ پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے جانب سے کٹواؤں گا اسکے بعد سولی پر چڑھا دوں گا۔

قرآنی مضمون

جادوگروں کا اعترافِ شکست اور فرعون کا غیض وغضب

آیاتِ ذیل میں ظاہر کیا گیا ہے :-

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ الخ

(طٰہٰ آیات ۷۱ تا ۷۶)

قرآنی مضمون

فرعون نے کہا تم میرے حکم کے بغیر موسیٰ پر ایمان لے آئے یقیناً یہ تمہارا سردار ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا، میں تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤں گا اور کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا پھر تمہیں پتہ چلے گا ہم دونوں میں کون سخت عذاب دینے والا ہے اور کس کا عذاب دیرپا ہے؟

جادوگروں نے کہا ہم یہ کبھی نہیں کر سکتے کہ سچائی کی جو روشن دلیلیں ہمارے سامنے آگئی ہیں اور جس خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اُس سے منہ موڑ کر تیرا حکم مان لیں تو جو فیصلہ کرنا چاہتا ہے کر گزر تو زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ دنیا کی اس زندگی کا فیصلہ کر دے۔

ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لا چکے ہیں کہ وہ ہماری خطائیں بخش دے خصوصاً جادوگری کی خطا کہ جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا۔ ہمارے لئے اللہ ہی بہتر ہے اور باقی رہنے والا وہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو مجرم بنکر اپنے رب کے حضور حاضر ہوگا اُسکے لئے جہنم ہے جس میں وہ نہ جیئے گا اور نہ مرے گا۔

اور جو اُسکے حضور مؤمن کی حیثیت سے حاضر ہوگا کہ نیک عمل کئے ہوں ایسے سب لوگوں کے لئے بلند درجے ہیں۔ جنت عدن کے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے یہ جزاء ہے اُس شخص کی جو پاکیزگی اختیار کرے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ الخ (اعراف آیات ۱۲۳ تا ۱۲۶)

فرعون نے کہا تم اسپر ایمان لے آئے ہو قبل اسکے کہ میں تمہیں اجازت دیتا؟ یقیناً یہ کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اس

دار السلطنت میں کی تاکہ تم اسکے رہنے والوں کو نکال باہر کرو اچھا تو اب اسکا نتیجہ تم کو معلوم ہو جائے گا۔

میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف جانب سے کٹوا دوں گا اسکے بعد تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔

جادوگروں نے جواب دیا بہر حال ہمیں اپنے رب ہی کی طرف پلٹنا ہے۔

تو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اسکے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم نے انھیں مان لیا۔

اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اُٹھا تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرمانبردار رہوں"

فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ. قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الخ

(الشعراء آیات ۴۶ تا ۵۱)

پس سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے۔

کہنے لگے کہ ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے۔ جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔

فرعون نے کہا تم نے موسیٰ کی بات مان لی قبل اسکے کہ میں تمہیں اجازت دیتا! ضرور یہ تمہارا بڑا سردار ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔ اچھا ابھی تم جان لوگے میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور تم سب کو ضرور سولی پر چڑھا دوں گا۔

جادوگروں نے جواب دیا کچھ پروا نہیں، ہم اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں گے۔ اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہمارے گناہ معاف کر دیگا کیونکہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے ہیں۔

انتقامی کاروائی تاریخی روایات میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ جادوگروں

کے ایمان لانے کے بعد قومِ فرعون کے چھ لاکھ آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔ اس طرح اس مقابلہ سے پہلے تو صرف دو فرد حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے مخالف تھے۔ اب ایک بہت بڑی جمعیت فرعون کی مخالف ہوگئی اور یہ صورتِ حال ایسی نہ تھی کہ اسپر سکوت اختیار کیا جائے۔ دربار میں مشورے ہوئے اور یہ طے پایا کہ بنی اسرائیل میں جو بھی لڑکا پیدا ہو اسکو قتل کر دیا جائے۔ قتلِ اولاد کا یہ حکم اس لئے دیا گیا تاکہ بنی اسرائیل میں اس سے سراسیمگی اور خوف و دہشت پیدا ہو جائے اور لوگ اپنے سابقہ دین پر لوٹ آئیں اور ان کی طاقت و قوت بڑھنے نہ پائے۔ قتل اولاد کا یہ حکم دوسری مرتبہ جاری کیا گیا، پہلی مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے کیا گیا تھا اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوّت اور رسالت کے دور میں جاری ہوا۔ فرعون کی جانب سے بڑے پیمانے پر انتقامی کاروائی کا تذکرہ آیاتِ ذیل میں اسطرح موجود ہے :-

قرآنی مضمون

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ ۚ

(اعراف آیات ۱۲۷ تا ۱۲۹)

اور فرعون کی قوم میں سے ایک جماعت نے فرعون سے کہا کیا تو موسیٰ اور اسکی قوم کو یوں ہی چھوڑ دے گا کہ وہ زمین مصر میں فساد کرتے پھریں اور تجھکو اور تیرے معبودوں کو ٹھکرائیں، فرعون نے کہا ہم اُن کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی لڑکیوں کو (باندیاں بنانے کے لئے) زندہ رکھیں گے اور ہم اِن پر ہر طرح غالب ہیں۔

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو۔ بلاشبہ زمین اللہ کی مِلک ہے وہ اپنے بندوں میں جسے چاہتا ہے وارث بنا دیتا ہے اور اچھا انجام اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے ہی ہوتا ہے۔

قوم نے جواب دیا اے موسیٰ آپ کے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبت میں تھے اور آپ کے پیغام لانے کے بعد بھی مصیبت ہی

میں گرفتار ہیں، موسیٰ نے کہا وہ وقت قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو برباد کردے گا اور تم کو زمین کا خلیفہ بنا دے گا اور پھر دیکھے گا کہ تم کس طرح عمل کرتے ہو۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ الخ

(المؤمن آیت ۲۳ تا ۲۷)

"اور ہم نے موسیٰ کو اپنے احکام اور واضح دلیل دیکر بھیجا فرعون اور ہامان اور قارون کی جانب تو اُنھوں نے کہا (موسیٰ) ساحر ہے کذّاب ہے۔

پھر جب موسیٰ ہماری طرف سے حق اُن کے سامنے لے آئے تو اُنھوں نے کہا کہ جو لوگ موسیٰ کے ساتھ ایمان لائے ہیں اُن کے بیٹوں کو قتل کر ڈالو اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دو (مگر) کافروں کی چال اکارت ہی گئی۔

(اور ایک روز) فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا چھوڑو مجھے، میں موسیٰ کو قتل کئے دیتا ہوں اور اسکو چاہیئے کہ اپنے رب کو پکارے مجھکو اندیشہ ہے کہ وہ (کہیں) تمہارے دین (نہ) بدل ڈالے یا ملک میں کوئی خرابی پھیلائے۔

موسیٰ نے کہا میں نے ہر اُس متکبّر کے مقابلے میں جو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتا اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے۔"

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ۔ الخ

(یونس آیات ۸۷ تا ۸۹)

اور ہم نے موسیٰ اور اُن کے بھائی ہارون کے پاس وحی بھیجی کہ تم دونوں اپنے اُن لوگوں کے لئے (بدستور) مصر میں گھر برقرار رکھو اور تم سب اپنے اُنھیں گھروں میں نماز پڑھنے کی جگہ قرار دے لو۔ اور نماز کے پابند رہو اور (اے موسیٰ) آپ مسلمانوں کو بشارت دے دیں۔

اور موسیٰ نے (دُعا میں) عرض کیا کہ اے ہمارے رب آپنے

فرعون کو اور اُسکے سرداروں کو سامانِ زینت اور طرح طرح کے مال دنیوی زندگی میں اے ہمارے رب اسی واسطے دیئے ہیں کہ وہ آپ کی راہ سے (لوگوں کو) گمراہ کریں، اے ہمارے رب اُن کے مالوں کو نیست و نابود کر دیجئے اور اُن کے دلوں کو سخت کر دیجئے۔ سو یہ ایمان نہ لانے پائیں یہاں تک کہ عذاب الیم کو دیکھ لیں۔

اللہ نے فرمایا تم دونوں کی دُعا قبول کر لی گئی سو تم مستقیم رہو اور اُن لوگوں کی راہ نہ چلنا جن کو علم نہیں ہے۔

مردِ مؤمن

فرعون نے اگرچہ اپنے سرداروں اور اہل دربار کو یہ اطمینان دلا دیا تھا کہ موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون (علیہما السلام) سے تمہیں کسی بات کا اندیشہ نہ کرنا چاہیئے کیونکہ ان کی اولاد کا سلسلہ چلنے والا نہیں اور انجام کار بنی اسرائیل خود بخود اقلیت میں آجائیں گے اور ہمیشہ کی طرح ہماری غلامی کی خدمت انجام دیا کریں گے۔ لیکن فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غلبہ اور تسلط کا خوف دل ہی دل میں پریشان کئے ہوئے تھا۔ قتلِ اولاد کے حکم سے بھی اُسکو سکون نہ تھا، آخر اُس نے یہی فیصلہ کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کو قتل کر دیا جائے تاکہ اندیشہ کا خاتمہ ہی ہو جائے۔

ایک روز اپنے اہل دربار سے کہا اگر موسیٰ کو ہم نے یوں ہی چھوڑ دیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تمہارے دین کو بھی آہستہ آہستہ بدل ڈالے اور ملک مصر میں فساد مچا دے۔ لہذا مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کر دیا جائے۔ اہل دربار نے اسکی رائے سے اتفاق کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اس کارروائی کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ میں ایسے متکبر و مغرور سے کیا خوف کروں جو اللہ کے یوم حساب سے نہیں ڈرتا۔ میرا سہارا تو میرا پروردگار ہے میں اُسی کی پناہ میں ہوں۔

فرعون اور اسکے اہل دربار کی اس گفتگو میں ایک مصری "مردِ مومن" بھی موجود تھا جس نے ابھی تک اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا تھا اُس نے جب یہ سُنا تو اپنا

ایمان ظاہر کئے بغیر اہلِ دربار سے یوں مخاطب ہوا:-

"اے لوگو! تم اُسکو قتل کرنیکی رائے ظاہر کرتے ہو اس سے پہلے کہ تم اپنے ارادے کو پورا کرو ایک بات پر پھر غور کرلو، اُس شخص (موسیٰ) نے تمہیں ایسی کھلی کھلی نشانیاں دکھادی ہیں جس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح ظاہر ہوچکی ہے کہ وہ تمہارے رب کا فرستادہ ہے۔ اگر ایسی صریح نشانیوں کے باوجود تم اُس کو جھوٹا سمجھتے ہو تب بھی تمہارے لئے یہ مناسب نہیں کہ اسکو قتل کردو بلکہ اُسکو اُسکے حال پر چھوڑ دو۔ کیونکہ دوسرا قوی احتمال یہ بھی ہے کہ اگر وہ سچا ہے تو پھر تم اس کو قتل کرکے اللہ کے عذاب میں مبتلا ہوجاؤ گے۔"

ائمہ تفسیر میں حضرت مقاتلؒ اور حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ یہ مردِ مومن فرعون کا چچا زاد بھائی تھا اور یہ وہی شخص تھا جو شہر کے کنارے سے دوڑ کر آیا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ خبر دی تھی کہ اے موسیٰ قبطی کے قتل کے مقدمہ میں اہلِ دربار نے تم کو قصاصاً قتل کردینے کا فیصلہ کیا ہے۔ لہذا میں تم کو مشورہ دیتا ہوں کہ تم فوری ملک مصر سے ہجرت کرجاؤ۔

بعض مفسرین نے اس مردِ مومن کا نام حبیب بیان کیا ہے اور بعض نے شمعان لکھا ہے۔ اور مشہور مؤرخ ثعلبی نے حضرت ابن عباسؓ سے اس کا نام حزقیل نقل کیا ہے۔

مؤرخ سہیلی نے دوسرے نام شمعان کو ترجیح دی ہے کیونکہ حبیب اُس شخص کا نام ہے جسکا واقعہ سورہ یٰسین میں آیا ہے۔

قرطبیؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صدیقین صرف چند ایک ہیں، ایک حبیب نجار جن کا قصہ سورۂ یٰسین میں موجود ہے۔ دوسرے آل فرعون کا "رجل مومن" تیسرے ابوبکر صدیق رضؓ اور یہ ان سب میں افضل ہیں۔"

آیات ذیل میں اسی رجل مؤمن کا خطاب نہایت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے یہ تاریخ بنی اسرائیل کا ایک اہم ترین واقعہ ہے جسکو خود بنی اسرائیل فراموش کرگئے ہیں۔ یہ

قصہ انبیاء کرام کی دعوت و تبلیغ کے ضمن میں بڑی اہمیت اور قدر و قیمت رکھتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت میں جہاں فرعون، ہامان، قارون جیسے متکبّر اور مغرور انسان نظر آتے ہیں وہاں حق و صداقت کی تائید و نصرت کرنے والے، پہاڑوں سے زیادہ سخت و بلند تر حوصلہ رکھنے والے افراد بھی انبیاء کی دعوت و تبلیغ سے پیدا ہوئے ہیں۔

فرعون کے بھرے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والا مردِ مومن اس طرح مخاطب ہے :-

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗ الخ

(المؤمن آیات ۲۸ تا ۴۴)

قرآنی مضمون

ایک مومن شخص جو فرعون کے خاندان سے تھا (اور اب تک) اپنا ایمان پوشیدہ رکھا تھا، کہنے لگا کیا تم ایک شخص کو محض اس بات پر قتل کرتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس بیّنات لے کر آیا ہے اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اُسی پر پلٹ پڑے گا اور اگر وہ سچا ہے تو وہ جو کچھ پیشین گوئی کر رہا ہے اُس میں سے کچھ تو تم پر ضرور ہی واقع ہو گا۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا اور جھوٹا ہو۔

اے میری قوم کے لوگو! آج تمہیں بادشاہی حاصل ہے کہ اس سرزمین میں تم حاکم ہو لیکن اگر اللہ کا عذاب ہم پر آگیا تو پھر کون ہے جو ہماری مدد کر سکے گا، فرعون نے کہا میں تو تم لوگوں کو وہی رائے دے رہا ہوں جو مجھے مناسب معلوم ہوتی ہے اور میں اُسی راستے کی طرف تمہاری رہنمائی کرتا ہوں جو بالکل ٹھیک ہے۔

(بہرحال) وہ شخص جو ایمان لایا تھا اُس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! مجھے خوف ہے کہ کہیں تم پر بھی وہ دن نہ آجائے جو اس سے پہلے بہت سی جماعتوں پر آچکا ہے۔ جیسا دن قوم نوح اور عاد اور ثمود اور اُنکے بعد والوں پر آیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی

ارادہ نہیں رکھتا۔

اور اے قوم مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم پر فریاد و فغاں کا دن نہ آجائے (یعنی قیامت کا دن) جس دن تم پُشت پھیر کر بھاگ کھڑے ہو گے مگر اُس وقت اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا اور سچ یہ ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دے اُسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہے۔

اور اس سے پہلے یوسف (علیہ السّلام) بھی تمہارے پاس بیّنات لیکر آئے تھے مگر تم اُن کی لائی ہوئی تعلیم کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہے پھر جب اُن کا انتقال ہوگیا تو تم نے کہا اب اُن کے بعد اللہ کوئی رسول ہرگز نہیں بھیجے گا، اسی طرح اللہ اُن سب لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیتا ہے جو حد سے گزرنے والے (اور) شکّی ہوتے ہیں۔ اور جو اللہ کی آیات میں جھگڑا کرتے ہیں بغیر اسکے کہ اُن کے پاس کوئی دلیل آئی ہو۔ یہ رویّہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے نزدیک سخت مبغوض ہے۔ اس طرح اللہ ہر متکبّر جبّار کے دل پر ٹھپّہ لگا دیتا ہے۔

فرعون نے کہا اے ہامان! میرے لئے ایک بلند عمارت تیار کر تاکہ میں آسمان پر جانیکی راہوں تک پہنچ جاؤں۔ پھر (وہاں سے) موسیٰ کے خدا کو دیکھوں۔ اور میں تو دراصل موسیٰ کو جھوٹا ہی سمجھتا ہوں۔ اس طرح فرعون کے لئے اسکی بدعملی خوشنما بنادی گئی اور وہ راہِ راست سے روک دیا گیا اور فرعون کی ساری چالبازی (اُس کی اپنی) تباہی کے راستے میں ہی کام آئی۔

اور اُس مومن شخص نے کہا اے میری قوم کے لوگو میری بات مانو میں تمہیں صحیح راستہ بتاتا ہوں۔ اے میری قوم! یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے اور ہمیشہ قیام کی جگہ آخرت ہی ہے۔ جو بُرائی کرے گا اُس کو اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنی اُس نے بُرائی کی ہے اور جو نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ ہو وہ مومن۔ ایسے سب لوگ جنّت میں داخل ہوں گے جہاں اُن کو بے حساب رزق دیا جائے گا۔

اور اے میری قوم کے لوگو! آخر یہ کیا بات ہے کہ میں تو تم لوگوں
کو نجات کی طرف بُلاتا ہوں اور تم لوگ مجھے آگ کی طرف دعوت دیتے
ہو۔ تم لوگ مجھے اس بات کی دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ سے کفر کروں
اور اُسکے ساتھ ان ہستیوں کو شریک ٹھیراؤں جنہیں میں نہیں جانتا
حالانکہ میں تمہیں اُس زبردست مغفرت کرنے والے خدا کی طرف
دعوت دے رہا ہوں۔

حق یہ ہے اور اسکے خلاف نہیں ہوسکتا کہ جن کی طرف تم مجھے
بُلا رہے ہو وہ نہ دنیا ہی میں کوئی پکارے جانے کے لائق ہے اور نہ
آخرت ہی میں، اور حقیقت یہ ہے کہ ہم سب کو اللہ کے پاس جانا ہے اور
حد سے گزرنے والے ہی اہل جہنم ہیں۔

پس آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں عنقریب وہ وقت آئے گا جب
تم اُسے یاد کروگے اور میں اپنا معاملہ اللہ ہی کے سپرد کرتا ہوں بیشک
وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے۔"

مردِ مؤمن اور انجام خیر

آل فرعون کے اس حق پرست انسان کی تقریر کا آخری جُملہ :-

"آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں عنقریب وہ وقت آئے گا جب
تم اُسے یاد کروگے اور میں اپنا معاملہ تو اللہ کے سپرد کرتا ہوں"

اس آخر جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں کہتے وقت اُس مردِ مومن کو پورا یقین تھا کہ اس حق گوئی کی پاداش میں پوری قوم کا عتاب اس پر ٹوٹ پڑے گا اور اسی پر بس نہیں ہوگا بلکہ اپنے اعزازات و مفادات کے علاوہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ مگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی محض اُس نے اللہ کے بھروسے پر اپنا وہ فرض انجام دیدیا جو دنیا میں صرف اُولو العزم انسان ہی دیا کرتے ہیں۔

امام تفسیر حضرت مقاتلؒ لکھتے ہیں کہ اس مردِ مومن کے پیچھے قوم فرعون ٹوٹ پڑی اور یہ کسی طرح ایک پہاڑ کی طرف بھاگ نکلے اور اُن کی گرفت میں نہ آسکے۔ اللہ تعالیٰ

نے قوم فرعون کی بُری تدبیروں سے اُن کو بچا لیا مگر خود قوم فرعون سخت عذاب میں پکڑی گئی جسکا انجام غرقابی کی شکل میں ظاہر ہوا اور آخرت کا عذاب اسکے علاوہ، مردِ مومن کے انجام کے سلسلے میں یہ آیات آئی ہیں۔ اسی طرح آل فرعون کے انجام کے بارے،

قرآنی مضمون فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ. الخ (المؤمن آیات ۴۵ تا ۵۰)

آخرکار اُس مرد مومن کو اللہ تعالےٰ نے اُن لوگوں کی بُری چالوں سے جو اُنھوں نے اُسکے خلاف چلیں بچا لیا اور فرعون کے ساتھی خود بدترین عذاب کے چکر میں آگئے۔

دوزخ کی آگ ہے جس کے سامنے صبح و شام وہ پیش کئے جاتے ہیں اور جب قیامت قائم ہوگی تو حکم ہوگا کہ آل فرعون کو شدید ترین عذاب میں داخل کردو۔ پھر ذرا خیال کرو اُس وقت کا جب یہ لوگ دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں گے۔ دُنیا میں جو لوگ کم درجہ تھے وہ بڑے درجے والوں سے کہیں گے کہ ہم تو تمہارے ہی تابع تھے اب کیا یہاں تم نارِ جہنم کی تکلیف کے کچھ حصّے سے ہم کو بچا لوگے؟ وہ بڑے درجے والے جواب دیں گے۔ ہم سب یہاں ایک حال میں ہیں بلاشبہ اللہ بندوں کے درمیان قطعی فیصلہ کرچکا ہے۔

پھر یہ دوزخ میں پڑے ہوئے لوگ جہنم کے پہرہ داروں سے کہیں گے (اے فرشتو) اپنے رب سے دُعا کرو کہ وہ ہمارے عذاب میں بس ایک دن ہی کی تخفیف کردے۔

وہ پوچھیں گے کیا تمہارے پاس رسول بیّنات لیکر نہیں آئے تھے؟ جواب دیں گے ہاں کیوں نہیں! جہنم کے پہرہ دار کہینگے "پھر تو تم ہی دُعا کرو اور کافروں کی دُعا اکارت ہی جانے والی ہے۔"

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ ارشاد فرمایا کہ آل فرعون کی روحیں سیاہ جانوروں کی شکل میں

ہر روز صبح وشام دو مرتبہ جہنم کے سامنے لائی جاتی ہیں اور انھیں جہنم دکھلا کر کہا جاتا ہے کہ یہ تمہارا ٹھکانہ ہے۔ (تفسیر مظہری)

تسع آیات (۹ معجزے)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ مسلسل کا فرعون اور اسکے سرداروں پر مطلقاً اثر نہیں ہوا، سوائے معدودے چند سب نے مخالفت وبغاوت اختیار کرلی۔ پھر بنی اسرائیل کی ذبح اولاد کا قانون چل پڑا جسکے نتیجے میں مظلوم بنی اسرائیل کی اولاد نرینہ ذبح ہونے لگی اور فرعون کی پرستش کا زور شور سے رواج شروع ہوا۔

اس درمیان حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ فرعون اور فرعونیوں کو خبردار کردیا جائے کہ اگر یہ ہی طور وطریقہ جاری رہا تو عنقریب اللہ کا عذاب نازل ہونے والا ہے۔ اس آگاہی پر بھی کوئی توجہ نہ دی گئی تو تب یکے بعد دیگر عذاب الٰہی آنے شروع ہوئے۔ جب کسی عذاب سے پریشان ہوجاتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کرتے کہ یہ عذاب اپنے رب سے دعا کرکے دور کردیا جائے تو ہم ایمان لے آئینگے پھر جب وہ عذاب جاتا رہتا تو پھر وہی روش اختیار کرلیتے۔ اسی طرح خدا کی طرف سے انھیں ہر بار مہلت دی جاتی رہی لیکن ہر بار پہلے سے زیادہ ہی سرکشی اختیار کرلیتے، جب انھوں نے اسکو ایک مذاق بنالیا تو پھر اللہ کا وہ آخری عذاب آیا جسکے نتیجے میں فرعون اور اہل فرعون غرق کردیئے گئے۔ وہ عذاب جس کو قرآن حکیم نے "آیات بیّنات" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے کس قسم کے تھے اور ان کی تعداد کتنی تھی؟ اسکی کوئی واضح تحدید متعین نہیں کی جاسکتی۔ سورۂ بنی اسرائیل میں نو ۹ نشانیوں کا ذکر ملتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ الآیۃ۔ (آیت ۱۰۱)

اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو نو واضح نشانات دیئے۔

اور سورہ طٰہٰ، نمل، زخرف، النازعات میں تعداد کی وضاحت کے بغیر صرف "آیات" کہکر ذکر کیا گیا کہیں "آیات بیّنات" اور کہیں "آیات مفصّلات" اور ایک موقعہ پر الآیۃ الکبریٰ اور کہیں آیاتنا سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ان تفصیلی اور اجمالی تعبیرات کے علاوہ مذکورہ بالا سورتوں میں علیحدہ علیحدہ

نشانات کا بھی ذکر موجود ہے۔ اگر اِن سب کو جمع کر دیا جائے تو حسب ذیل فہرست مرتب ہو سکتی ہے :-

عصا[۱]، ید بیضا[۲]، سنین[۳] (قحط سالی) نقص ثمرات[۴] (پھلوں کا نقصان) طوفان[۵]، جراد[۶] (ٹڈی دل) قمل[۷] (جوں) ضفادع[۸] (مینڈک) دم[۹] (خون) فلق بحر[۱۰] (دریا کا پھٹ جانا) من و سلوٰی[۱۱] (حلوا اور بٹیر) غمام[۱۲] (بادل کا سایہ) انفجار عیون[۱۳] (پتھر سے چشموں کا بہہ پڑنا) نتق جبل[۱۴] (پہاڑ کا اکھڑ کر سروں پر آجانا) نزول تورات[۱۵]۔

یہ پندرہ آیات تو ایسی ہیں جن کا ذکر قرآن حکیم میں موجود ہے۔ اسکے علاوہ کتب حدیث میں مزید تشریح بھی ملتی ہے۔

ترمذی شریف جلد دوم کتاب التفسیر میں حضرت صفوان بن عسال رضؓ کی ایک حدیث جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک مرتبہ دو یہودیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت کا امتحان لینا چاہیئے۔ مشورہ کے بعد وہ آپ کی خدمت میں آئے اور پوچھا کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ کو جو تسع آیات (نو آیات) دیئے تھے اُن کی تشریح کیجئے ؟ آپ نے ارشاد فرمایا وہ نو آیات یہ ہیں :-

"شرک نہ کرنا، زنا نکرنا، کسی کا ناحق قتل نکرنا، چوری نکرنا، جادو نکرنا، سُود نہ کھانا، پاک دامن کو تہمت نہ لگانا، میدان جنگ سے فرار نہ ہونا اور اے یہود تمہارے لئے خصوصیت کے ساتھ یہ حکم بھی تھا کہ یوم سبت (ہفتہ کے دن) کی خلاف ورزی نکرنا۔"

یہ سُنکر وہ یہودی آپ کے ہاتھ چومے اور واپس چلے گئے۔

(ترمذی)

اس طرح تسع آیات کی ایک تشریح یہ بھی ملتی ہے، لیکن یہ تشریح قرآنی تشریح سے بالکل مختلف ہے۔ قرآن میں جن آیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُن میں سے ایک بھی اسمیں شامل نہیں ہے۔ اس لئے مفسرین کرام نے اس حدیث کا مختلف طور پر جواب دیا ہے جو علم حدیث سے تعلق رکھتا ہے جس کا یہاں موقعہ نہیں۔

تسع آیات کی ایک اور تشریح حضرت ابن عباس رضؓ سے بھی منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ تسع آیات سے مراد حسب ذیل نشانیاں ہیں :-

عصا، ید بیضا، سنین، نقص ثمرات، طوفان، جراد، قمل، ضفادع، دم۔
ائمہ تفسیر حضرت مجاہدؒ، حضرت عکرمہؒ، حضرت شعبیؒ، حضرت قتادہؒ نے بھی اس تشریح کی تائید کی ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کے قول کو قابل ترجیح قرار دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آیات کا لفظ قرآن حکیم میں معجزے اور احکام الٰہیہ دونوں معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اسی لئے مفسرین کی ایک جماعت نے تسع آیات سے معجزے مراد لئے ہیں اور نو۹ کے عدد سے حصر مراد نہیں ہے یعنی یہ ضروری نہیں کہ جملہ معجزات نو۹ سے زائد نہ ہوں۔ آیت مذکورہ میں کسی خاص اہمیت کے پیش نظر نو۹ عدد کی تصریح کی گئی ہے اور جیسا کہ اوپر نقل کیا گیا ہے ایک صحیح حدیث میں اِن نو۹ آیات سے احکام الٰہیہ مراد ہیں۔ اس لئے بعض دیگر مفسرین نے تسع آیات سے احکام الٰہیہ مراد لیا ہے۔

الغرض حضرت ابن عباسؓ نے تسع آیات کی جو تفصیل بیان فرمائی ہے اُس کی وضاحت مفسرین کرام نے اس طرح بیان کی ہے:۔

(۱) **عصا**۔ اُس لکڑی کا نام ہے جو عام طور پر چلتے پھرتے سہارے کا کام دیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خاص لکڑی جو جنّت سے اُتاری گئی تھی اسکی خاصیت یہ تھی کہ اگر اسکو پتھر پہ مارا جائے تو اسکے ضرب سے پتھر میں پانی کے چشمے پھوٹ پڑتے تھے۔ یہ لکڑی حسب ضرورت دراز بھی ہوجاتی تھی جسکے ذریعہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام جانوروں کے لئے اُونچے درختوں سے پتے جھاڑ لیا کرتے تھے۔ اس لکڑی کو سحر کے مقابلہ میں ڈال دیا جاتا تو وہ اژدہا بنکر جادو کے سارے کرتبوں کو ہضم کر جاتا تھا۔ فرعونی جادوگروں کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اسی لکڑی کو پھینک کر وہ عظیم الشان منظاہرہ کیا کہ جادوگر حیران رہ گئے اور اپنے جادو سے توبہ کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السّلام پر ایمان لے آئے جسکا تذکرہ گزشتہ اوراق میں تفصیل سے آچکا ہے۔

(۲) **ید بیضا**۔ جسکا ترجمہ روشن ہاتھ کیا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا یہ داہنا ہاتھ تھا جو معجزے ظاہر کرنے کے کام میں آتا تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈال کر باہر نکالتے تو وہ نصف النہار کے

سورج کی طرح چمکنے لگتا تھا۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ اس وقت ہاتھ کو دیکھنے کی تاب نہ رہ سکتی تھی۔ پھر جب اسکو دوبارہ گریبان میں ڈال لیتے تو وہ عام ہاتھ کی طرح ہو جاتا تھا۔ اس معجزے سے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کی۔ اور فرعون کے دربار میں بھی اس کا کئی بار مظاہرہ فرمایا تھا۔

(۳) **سنین** (قحط سالی) فرعون اور اہل فرعون کی مسلسل بغاوت و سرکشی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انھیں ایک ہولناک قحط سالی کی پیشین گوئی فرمائی جسکو قوم نے مزاح اور دھمکی سے تعبیر کیا لیکن جب وہ شروع ہوا تو بلبلا اُٹھے۔ تفسیری روایات کے مطابق یہ قحط ان کے شہروں پر مسلسل سات سال تک رہا۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت قتادہؒ کی روایت کے مطابق قحط اور خشک سالی کا عذاب گاؤں کے لئے تھا اور پھلوں کی کمی کا عذاب شہروں پر مسلط تھا۔ اس طرح غلّہ اور پھلوں کی کمی کے باعث پوری قوم کا عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا۔

(۴) **نقص ثمرات**۔ (یعنی پھلوں کی کمی کا عذاب) جیساکہ بیان کیا گیا قحط سالی میں جہاں ہر قسم کی پیداوار بند ہو گئی اسی طرح ایک عذاب پھلوں کی کمی کا بھی آیا جس کی وجہ سے شہر کے باغات اُجڑ گئے اور پورا ملک ویران سا ہو گیا۔ دراصل کسی بھی شہر کی خوبصورتی کے لئے درخت اور باغات ضروری ہیں۔ کوہستانوں میں اس لئے وحشت برستی ہے کہ وہاں سرسبزی کا نام و نشان نہیں ہوتا اور اگر یہی کیفیت شہروں میں قصبوں میں پیدا ہو جائے تو انسانی آبادی کے لئے بدترین مصیبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اہل فرعون کی مسلسل نافرمانی و ظلم کے نتیجے میں ایک عذاب اس قسم کا آیا۔

(۵) **طوفان**۔ اکثر مفسرین کرام نے اس طوفان سے پانی کا طوفان مراد لیا ہے جس میں اولے بھی برستے تھے۔ اگرچہ طوفان دوسری چیزوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ قوم فرعون کے سب گھروں اور زمینوں کو پانی کے طوفان نے گھیر لیا نہ کہیں بیٹھنے لیٹنے کی جگہ رہی نہ زمین میں کاشت کرنے کا موقعہ رہا۔

(۶) **جراد**۔ (ٹڈیوں کا عذاب) اس سے مراد ٹڈی دل ہے جو غول بیابانی کی شکل میں کھیتوں اور باغات پر ٹوٹ پڑتا ہے اور آناً فاناً میلوں لمبے چوڑے کھیتوں کو چٹ کر جاتا ہے۔ اگر یہ ایک مرتبہ بھی آجائے تو پوری فصل تباہ ہو جاتی ہے جبکہ یہ بطور عذاب اُن پر مسلّط کر دیا گیا تھا جب کبھی کھیت اور باغات سر سبز ہوئے یہ دل ٹوٹ پڑتا اور سب چٹ کر جاتا تھا۔ بعض روایات میں یہ بھی بیان کیا گیا کہ یہ ٹڈیاں لکڑی کے دروازوں اور چھتوں اور گھریلو سامان سب کو کھا گئیں۔

(۷) **قُمّل**۔ جسکے معنی جُوں کے ہیں۔ اِس کا اطلاق جُوں، چھوٹی مکھی، مچھر، سُرسُری وغیرہ پر کیا جاتا ہے۔ قمّل کا یہ عذاب بھی وبائی شکل میں آیا۔ اناج اور غلّے میں بھی یہ اتنی کثرت سے پیدا ہو گئے کہ کسی محفوظ ذخیرہ کو بھی تباہ کئے بغیر نہ چھوڑا۔ ملک کے سارے گودام بھوس کی طرح مغز سے خالی ہو گئے۔ دوسری طرف انسانی سروں اور کپڑوں میں بھی بکثرت پیدا ہو گئے، سروں کے بال اُکھڑ گئے اور چہرے بے رونق ہو گئے۔ اس عذاب نے بھی ساری زندگی تلخ کر دی۔

(۸) **ضفادع**۔ (مینڈکوں کا عذاب) مینڈک کی پیدائش اور رہائش عموماً پانی میں ہوا کرتی ہے اور یہ مخلوق دراصل پانی کے جانوروں میں شمار ہوتا ہے لیکن جب اللہ کے عذاب کے طور پر مسلّط ہو جائے۔ تو اِن مینڈکوں نے انسانی گھروں کا رُخ کیا۔ اس کثرت سے گھروں میں پیدا ہونے لگے کہ کوئی جگہ خالی نہ چھوڑی جہاں مینڈکوں نے اپنا ٹھکانہ نہ بنالیا ہو۔ بستروں میں، کپڑوں میں، کھانے پینے کے برتنوں میں۔ حتیٰ کہ پکی ہوئی غذاؤں تک میں پیدا ہو گئے۔

اس حیرتناک عذاب سے سب رو پڑے اور ہر دفعہ کی طرح وعدہ کیا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کریں گے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے یہ عذاب دور ہوا تو پھر وہی مخالفت و سرکشی شروع کر دی۔

(۹) **دم**۔ (خون کا عذاب) اس سے مراد ایسا عذاب تھا جو ہر کھانے پینے کی چیزوں کو خون میں تبدیل کر دیا کرتا تھا۔ جب کوئی غذا تیار کی جاتی تو تیار ہونے کے بعد معاً خون بن جاتی۔ کنویں، حوض، نہر کسی بھی ذریعہ سے پانی نکالا جائے

تو وہ خون کی شکل میں برآمد ہوتا۔ بھوک و پیاس سے عاجز و درماندہ ہوگئے۔ نجات کی کوئی صورت نہ تھی جو انہیں میسّر آتی اور مفسرین کرام یہ عجیب و غریب بات بھی نقل کرتے ہیں کہ ایک ہی دستر خوان پر بیٹھ کر ایک اسرائیلی (قوم موسیٰ) اور ایک فرعونی کھانا کھاتے تو جو لقمہ اسرائیلی اُٹھاتا وہ اپنی حالت پر کھانا ہوتا تھا اور جو لقمہ یا پانی کا گھونٹ فرعونی اُسی دستر خوان سے منھ میں لیتا، خون بن جاتا۔ یہ عذاب بھی بدستور سات دن تک باقی رہا۔ بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے رفع ہوا لیکن قوم پھر وہی بغاوت پر اُتر آئی۔

قرآن حکیم نے اِن سارے عذاب کے تذکرے کے بعد یہ خصوصی نوٹ بھی بیان کیا ہے۔

> اور جب ان پر کوئی عذاب واقع ہوتا تو یوں کہتے اے موسیٰؑ ہمارے لئے اپنے رب سے اس بات کی دُعا کرو جس کا اُس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے (یعنی اپنے رب سے دُعا کرنے کے بعد) تو ہم ضرور بالضرور آپ کے کہنے سے ایمان لے آئیں گے اور ہم بنی اسرائیل کو بھی رہا کر کے آپ کے ہمراہ کر دیں گے۔ پھر جب ہم اُن سے اُس عذاب کو اُسی مدت کے لئے ہٹا دیتے جس تک اُنھیں پہنچنا تھا تو وہ فوراً عہد شکنی کرنے لگتے۔
>
> (اعراف آیت ۱۳۴، ۱۳۵)

ابن منذر نے حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ اِن میں سے ہر عذاب قوم فرعون پر سات روز تک مسلط رہتا تھا۔ ہفتہ کے دن شروع ہوتا پھر دوسرے ہفتے کو دور ہو جاتا پھر تین ہفتے کی اِنھیں مہلت دی جاتی تھی تاکہ وہ توبہ کر لیں لیکن جونہی وہ عذاب رفع ہوتا سرکشی و بغاوت پر اُتر آتے۔

امام بغویؒ نے ان ہی حضرت ابن عباسؓ سے ایک اور روایت نقل کی ہے کہ جب پہلی مرتبہ قوم فرعون پر قحط کا عذاب آیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے رفع ہو گیا مگر یہ لوگ اپنی سرکشی سے باز نہ آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی اے میرے پروردگار یہ ایسے سرکش لوگ ہیں کہ عذاب قحط سے بھی متأثر نہیں ہوئے اور معاہدہ کر کے پھر گئے۔ اب ان پر کوئی ایسا عذاب مسلط فرما دیجئے جو اِن کے لئے دردناک ہو

اور میری قوم کے لئے وعظ کا کام بھی دے اور بعد میں آنے والوں کے لئے درس عبرت بنے تو اللہ تعالےٰ نے اُنپر یکے بعد دیگر عذاب کا سلسلہ جاری فرمادیا۔ تسع سنین کی تفصیلات اور فرعون اور قوم فرعون کا ظلم و نافرمانی آیاتِ ذیل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے :۔

قرآنی مضمون

وَأَدْخِلْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ فِي تِسْعِ آيَاتٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِ الخ

(نمل آیت ۱۲)

اور داخل کر تو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں وہ نکلے گا روشن ہو کر۔ بغیر کسی مرض، وعیب کے (یہ اُن) نو آیات میں سے ایک ہے جو فرعون اور اسکی قوم کے لئے بھیجی گئیں بلاشبہ وہ نافرمان قوم تھی۔

فَأَرَاهُ الْآيَةَ الْكُبْرَىٰ فَكَذَّبَ وَعَصَىٰ الآیہ۔

(النازعات آیت ۲۰، ۲۱)

پس دکھایا اُس فرعون کو ایک بڑا نشان (یعنی عصا کا نشان) پھر اُس نے جھٹلا دیا اور نافرمانی کی۔

فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ وَنَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّاظِرِينَ۔ (اعراف آیت ۱۰۷، ۱۰۸)

پس ڈال دیا موسیٰ نے اپنا عصا تو وہ اچانک ایک واضح اژدھا تھا۔ اور گریبان سے اپنا ہاتھ کھینچا تو وہ دیکھنے والوں کے آگے روشن تر تھا۔

وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ الخ (اعراف آیت ۱۳۰ تا ۱۳۵)

اور ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پھلوں کی کمی (کے عذاب) میں پکڑ لیا کہ شاید ان کو ہوش آجائے۔

مگر اُن کا یہ حال تھا کہ جب اچھا زمانہ آتا تو کہتے کہ ہم اسی کے

مستحق ہیں اور جب بُرا زمانہ آتا تو موسیٰ اور اُن کے ساتھیوں کو اپنے لئے فالِ بد ٹھیراتے۔ حالانکہ اُنکی فالِ بد تو درحقیقت اللہ کے پاس تھی مگر ان میں اکثر بے علم تھے۔

اُنھوں نے موسیٰ سے کہا کہ اے موسیٰ تو ہمیں مسحور کرنے کے لئے خواہ کوئی نشانی لے آئے ہم تیری بات ماننے والے نہیں ہیں۔

آخر کار ہم نے اُن پر طوفان اور ٹڈی دل، جُوئیں، مینڈک اور خون (کے عذاب) بھیجے۔ یہ سب نشانیاں علیحدہ علیحدہ تھیں مگر وہ سرکشی کئے چلے گئے اور وہ بڑے ہی مجرم لوگ تھے۔ جب کبھی بھی اُنپر کوئی بلا نازل ہوتی تو کہتے اے موسیٰ تجھے اپنے رب کی طرف سے جو منصب حاصل ہے اس کی بنا پر ہمارے حق میں دُعا کر، اگر اب کے تو ہم پر سے یہ بلا ٹلوا دے تو ہم تیری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے۔

پھر جب ہم اُنپر سے وہ عذاب ایک وقت مقرر تک کے لئے جسکو وہ بہر حال پہنچنے والے تھے ہٹا لیتے تو وہ یکلخت اپنے عہد سے پھر جاتے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۖ فَاسْأَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ الخ

(بنی اسرائیل آیت ۱۰۱)

اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی نشانیاں عطا کیں۔ اب تم خود بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ جب وہ سامنے آئیں تو فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ میں سمجھتا ہوں کہ تو ایک سحر زدہ آدمی ہے۔

قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنتُم مُّلْقُونَ ۔ الخ

(الشعراء آیات ۴۳ تا ۴۸)

موسیٰ نے کہا (اے جادوگرو) پھینکو جو تمہیں پھینکنا ہے؟ انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینک دیں اور بولے عزتِ فرعون کی قسم ہے ہم ہی غالب ہوں گے۔ پھر موسیٰ نے اپنا عصا

ڈال دیا تو یکایک وہ اِن کے جھوٹے کرشموں کو ہڑپ کرتا چلا گیا۔ اس پر سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے۔ کہنے لگے کہ ہم ایمان لائے رب العالمین پر جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَقَالَ إِنِّي رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ. الخ (الزخرف آیات ۴۶ تا ۴۸)

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اُسکے اعیانِ سلطنت کے پاس بھیجا تو اُس نے جاکر کہا کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں۔

پھر جب اُس نے ہماری نشانیاں اُن کے سامنے پیش کیں تو وہ ٹھٹھے مارنے لگے۔

ہم یکے بعد دیگرے اُن کو ایسی نشانی دکھاتے چلے گئے جو پہلی سے بڑھ چڑھ کر تھی اور ہم نے اُن کو عذاب میں پکڑ لیا تاکہ وہ اپنی روش سے باز آئیں۔

تعاقب اور فلق بحر

سورۂ اعراف میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی اطلاع کے مطابق کوئی عذابِ عام مصر پر نازل ہوتا تو فرعون حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے کہتا تھا کہ اے موسیٰ تم اللہ سے دُعا کرکے اس عذاب کو دُور کروادو، پھر جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہم مان لیں گے۔ مگر جب وہ بلا ٹل جاتی تھی تو فرعون اپنی اُسی ہٹ دھرمی پر تُل جاتا تھا۔ عذاب کا یکے بعد دیگر اور وہ بھی قبل از قبل پیش گوئی کے بعد آجانا۔ یہ ایک ایسا کھُلا معجزہ تھا جسکو دیکھ کر ایک معمولی سی عقل رکھنے والا آدمی بھی یہ فیصلہ کرسکتا تھا کہ ایک سچّے آدمی کے کہنے پر ایسی ملک گیر بلاؤں کا آنا اور پھر اسکے کہنے پر اُن کا دُور ہوجانا صرف رب العالمین ہی کے تصرف کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے فرعون سے صاف صاف کہہ دیا تھا:۔

لَقَدْ عَلِمْتَ مَا أَنْزَلَ هَٰؤُلَاءِ إِلَّا رَبُّ السَّمَاوَاتِ

وَ الْاَرْضِ ۔ (بنی اسرائیل آیت ۱۰۲)

توخوب جان چکا ہے کہ یہ نشانیاں زمین و آسمانوں کے مالک
کے سوا کسی اور نے نازل نہیں کی ہیں ۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۔الآیۃ

(النمل آیت ۱۴)

اور ان لوگوں نے معجزات کا انکار صرف ظلم اور تکبر کی وجہ سے
کیا حالانکہ ان کے قلوب اس کا یقین کر چکے تھے ۔

جب نوبت یہاں تک پہنچی کہ انکار بغض و عداوت کی حد تک پہنچ گیا ۔ جا بجا مزاق اڑایا جانے لگا ، دھمکیاں دی جانے لگیں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ اب تم بنی اسرائیل کو لیکر مصر سے فلسطین ہجرت کر جاؤ ۔

مصر سے فلسطین یا ارض کنعان جانے کے دو راستے ہیں ایک خشکی کا راستہ جو قریب تر تھا دوسرا البحر قلزم (بحر احمر) کا راستہ جسکو عبور کر کے وادی سینا کی راہ اختیار کی جائے ۔ یہ دور کی راہ تھی مگر اللہ تعالیٰ کی مصلحت کا یہی تقاضہ ہوا کہ وہ خشکی کی راہ چھوڑ کر دور کی راہ اختیار کریں اور دریائے قلزم کو پار کر کے جائیں ۔ بظاہر اسمیں یہ مصلحت پوشیدہ معلوم ہوتی ہے کہ خشکی کی راہ اختیار کرنے میں فرعون اور اُس کی فوج سے جنگ ضروری ہو جاتی ۔ کیونکہ انھوں نے بنی اسرائیل کو قریب ہی آلیا تھا اور اگر دریا کا معجزہ پیش نہ آتا تو فرعون بنی اسرائیل کو واپس مصر لیجانے میں کامیاب ہو جاتا ۔ الغرض حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات بحر احمر کی راہ ہو لئے اور روانہ ہونے سے پہلے مصری عورتوں کے زیورات اور قیمتی ملبوسات جو ایک تہوار میں مستعار لئے تھے وہ بھی واپس نہ کر سکے کہ کہیں اہل مصر پر اصل حال واضح نہ ہو جائے ۔

ادھر بعض نے فرعون کو اطلاع دی کہ بنی اسرائیل مصر سے فرار ہونے کے لئے شہروں سے نکل گئے ہیں ۔ فرعون اُسی وقت ایک زبردست لشکر لیکر اُن کے تعاقب کے لئے نکل پڑا اور صبح ہونے سے پہلے پہلے اُن کے سروں پر جا پہنچا ۔

بنی اسرائیل کی تعداد بقول تورات اسوقت چھ لاکھ تھی ۔ پَو پھٹنے کے وقت جب انھوں نے پیچھے مڑکر دیکھا تو فرعون کو سر پر پایا گھبرا کر کہنے لگے (یہاں تورات

کی روایت بڑی دلچسپ ہے)

"اے موسیٰ کیا مصر میں قبریں نہ تھیں جو تو ہم کو مرنے کے لئے بیابان میں لے آیا؟ (خروج باب ۱۴ آیات ۱۱، ۱۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انھیں تسلی دی اور فرمایا خوف نہ کرو میرا رب میرے ساتھ ہے وہ تم کو نجات دے گا اور تم ہی کامیاب ہوگے۔ پھر بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہوئے وحی الٰہی نے حکم دیا کہ اپنی لاٹھی کو پانی پر مارو پانی پھٹ کر بیچ میں راستہ نکل آئے گا۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی کیا دریائے قلزم پر اپنی لاٹھی کا مارنا ہی تھا کہ پانی پھٹ کر دونوں جانب دو پہاڑوں کی طرح کھڑا ہوگیا اور بیچ میں راستہ نکل آیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم سے تمام بنی اسرائیل اس میں اتر گئے اور خشک زمین کی طرح اس سے پار ہوگئے۔

فرعون نے جب یہ منظر دیکھا تو اپنی قوم کو آواز دی کہ یہ وقت بہت مناسب ہے آگے بڑھو اور بنی اسرائیل کو جا پکڑو۔ چنانچہ فرعون اور اس کا تمام لشکر بنی اسرائیل کے پیچھے اسی راستے پر جا پڑا۔ لیکن اللہ کی قدرت آگے آئی جب بنی اسرائیل کا ہر فرد دوسرے کنارے پر سلامتی کے ساتھ پہنچ گیا تو پانی کو حکم دیا کہ وہ اپنی اصلی حالت پر آجائے بس آناً فاناً دریا کے دونوں پاٹ پھر مل گئے اور فرعون اور اس کا تمام لشکر جو ابھی درمیان ہی میں تھا غرق آب ہوگیا۔

یہ قرآن حکیم ہی کا انکشاف ہے جس کا واحد ذریعہ وحی الٰہی کے سوا کچھ نہیں۔ جب فرعون غرق ہونے لگا اور ملائکۃ العذاب سامنے نظر آنے لگے تو پکار کر کہنے لگا:۔

میں اسی ایک وحدہٗ لاشریک لہٗ ہستی پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں اطاعت کرنے والوں میں سے ایک ہوں۔ (یونس آیت ۹۰)

مگر یہ ایمان چونکہ حقیقی ایمان نہ تھا بلکہ گزشتہ فریب کاریوں کی طرح نجات حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ایک مضطربانہ بات تھی اس لئے اللہ کی طرف سے یہ جواب دیا گیا۔

آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ. (یونس آیت ۹۱)

اب یہ کہہ رہا ہے حالانکہ اس سے پہلے جو اقرار کا وقت تھا
اسمیں انکار اور خلاف ہی کرتا رہا اور درحقیقت تو مفسدوں میں سے تھا۔
یعنی اللہ کو خوب معلوم تھا کہ وہ مسلمین میں سے نہیں بلکہ مفسدین میں تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ فرعون کی یہ پکار ایمان لانے اور یقین کرنے کے لئے نہ تھی بلکہ عذاب الٰہی کا مشاہدہ کرنے کے بعد اضطراری اور بے اختیاری کی حالت میں نکلتی ہے۔ ایسی دُعا و پکار موت کے وقت ناقابل قبول ہوتی ہے۔ قرآن حکیم نے اس کے لئے ایک عام قاعدہ بیان فرمایا ہے :۔

فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِىْ قَدْ خَلَتْ فِىْ عِبَادِهٖ۔ (المومن آیت ۸۵)

پس اُنکو نفع نہ دے گا اُن کا اپنا ایمان جبکہ انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا یہ اللہ کا مقرر کردہ ضابطہ ہے جو ہمیشہ اسکے بندوں میں جاری رہا ہے۔

توبہ اور ایمان بس اُسی وقت تک نفع دیتے ہیں جب تک آدمی اللہ کے عذاب یا موت کی گرفت میں نہ آجائے۔ عذاب آجانے یا موت کے آثار شروع ہوجانے کے بعد ایمان لانا یا توبہ کرنا اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہے۔

اس موقعہ پر اللہ کی جانب سے یہ بھی جواب دیا گیا۔
آج کے دن ہم تیرے جسم کو اُن لوگوں کے لئے جو تیرے پیچھے آنے والے ہیں نجات دیں گے کہ وہ عبرت کا نشان بنے۔
(یونس آیت ۹۲)

جدید تحقیقات کی روشنی میں قاہرہ کے عجائب خانہ میں (رئیس ثانی) فرعونِ موسیٰ کی نعش موجود ہے۔ یہ سمندر میں تھوڑی دیر غرق رہنے کی وجہ سے اس کے ناک کے کچھ حصہ کو مچھلی نے کھا لیا تھا آج بھی تماشا گاہ خاص و عام ہے۔

فرعون کا تعاقب اور سمندر کا پھٹ جانا اور بنی اسرائیل کا نجات پاجانا اور فرعون کا غرق ہونا قرآن حکیم کی مندرجہ آیات میں تفصیلاً و اختصاراً اس طرح موجود ہے۔

قرآنی مضمون | وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِىْ

فَاضْرِبْ لَهُمْ ۔الخ (طٰہٰ آیات ۷۷ تا ۷۹)

اور پھر دیکھو ہم نے موسیٰ پر وحی بھیجی کہ اب میرے بندوں کو راتوں رات مصر سے نکال لیجا پھر سمندر میں اُن کے گزرنے کے لئے خشکی کی راہ نکال لے تجھکو نہ تعاقب کرنے والوں سے اندیشہ ہوگا نہ اور کسی طرح کا خطرہ۔

پھر فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ اُن کا پیچھا کیا پس پانی کا ریلا جیسا کچھ اُن پر چھانے والا تھا چھا گیا۔ (یعنی جو کچھ اُن پر گزرنی تھی گزر گئی) اور فرعون نے اپنی قوم پر راہ نجات گم کر دی انھیں سیدھی راہ نہیں دکھائی۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۔الخ

(الشعراء آیات ۵۲ تا ۶۵)

ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ راتوں رات میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔

پھر فرعون نے (فوج جمع کرنے کے لئے) شہروں میں نقیب بھیج دیئے۔ (اور کہلا بھیجا) کہ یہ کچھ مٹھی بھر لوگ ہیں اور انھوں نے ہم کو بہت ناراض کیا ہے۔ اور ہم سب کو ان لوگوں سے خطرہ ہے۔

اس طرح ہم نے اُنھیں اِن کے باغوں اور چشموں اور خزانوں اور ان کی بہترین قیام گاہوں سے نکال باہر کیا۔

یہ تو ہوا اُن کے ساتھ، اور (دوسری طرف) بنی اسرائیل کو ہم نے ان سب چیزوں کا وارث کر دیا۔ صبح ہوتے ہی یہ لوگ اُن کے تعاقب میں چل پڑے۔

پھر جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسیٰ کے ساتھی کہنے لگے بیشک ہم تو پکڑے گئے۔

موسیٰ نے کہا ہرگز نہیں میرے ساتھ میرا رب ہے وہ ضرور میری رہنمائی کرے گا۔

پس ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ اپنا عصا سمندر پر مارو یکایک سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہوگیا۔ اور اُس جگہ ہم دوسری جماعت کو بھی قریب لائے۔ موسیٰ اور اُن سب لوگوں کو جو اُس کے ساتھ تھے ہم نے بچا لیا۔ پھر دوسروں کو غرق کر دیا۔ بیشک اس واقعہ میں ایک نشانی ہے مگر ان لوگوں میں اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔ اور درحقیقت تیرا رب زبردست بھی ہے رحیم بھی ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ. (اعراف آیات ۱۳۶ تا ۱۳۷)

تب ہم نے اُن سے انتقام لیا اور اُنھیں سمندر میں غرق کر دیا کیونکہ اُنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا اور اُن سے بے پروا ہوگئے تھے۔

اور اُن کی جگہ ہم نے اُن لوگوں کو جو کمزور بنا کے رکھے گئے تھے اُس زمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالامال کر رکھا تھا، اور اس طرح بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدۂ خیر پورا ہوا۔ کیونکہ اُنھوں نے صبر سے کام لیا تھا اور جو کچھ فرعون اور اُسکی قوم نے تیار کیا تھا اور جو جو اونچی عمارتیں بنائی تھیں اُن سب کو ہم نے ملیامیٹ کر دیا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْیًا وَّعَدْوًا ۔۔۔۔ (یونس آیات ۹۰ تا ۹۲)

اور پھر ایسا ہوا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اُتار دیا۔ یہ دیکھ کر فرعون اور اُس کے لشکر نے پیچھا کیا۔ مقصود یہ تھا کہ ظلم و شرارت کریں، لیکن جب حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ فرعون سمندر میں غرق ہونے لگا تو اُس وقت پکار اُٹھا، میں یقین کرتا ہوں کہ اُس ہستی کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں اور میں بھی اُنہی فرمانبرداروں

سے ہوں۔

(ہم نے کہا) ہاں اب تو ایمان لایا حالانکہ پہلے برابر نافرمانی کرتا رہا اور تو دنیا کے مفسد انسانوں میں سے ایک تھا۔

پس آج ہم ایسا کریں گے کہ تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں سے) بچالیں گے تاکہ اُن لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آنے والے ہیں ایک نشانی بنے اور اکثر انسان ہماری نشانیوں سے یکلخت غافل ہیں۔

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ. الخ (القصص آیات ۳۹ تا ۴۲)

اور اُس نے اور اس کے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور سمجھے کہ انھیں کبھی ہماری طرف پلٹنا نہیں ہے۔

آخرکار ہم نے اُسے اور اُسکے لشکروں کو پکڑا اور سمندر میں پھینک دیا۔ اب دیکھ لو اِن ظالموں کا کیسا انجام ہوا۔

اور ہم نے انھیں جہنم کی طرف دعوت دینے والے پیشوا بنادیئے اور قیامت کے دن وہ کوئی مدد نہ پاسکیں گے۔

اور ہم نے اس دُنیا میں اُن کے پیچھے لعنت لگادی اور قیامت کے دن وہ بڑی بُرائی میں مبتلا ہوں گے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَاءَهُمْ رَسُولٌ كَرِيمٌ. الخ (الدخان آیات ۱۷ تا ۳۱)

اور ہم اِن سے پہلے فرعون کی قوم کو اسی آزمائش میں ڈال چکے ہیں جبکہ اُن کے ہاں ایک نہایت شریف رسول آیا۔ (اور اُس نے کہا) کہ اللہ کے بندوں (بنی اسرائیل) کو میرے حوالہ کرو میں تمہارے لئے ایک امانتدار رسول ہوں۔ اور اللہ کے مقابلہ میں سرکشی نہ کرو میں تمہارے سامنے کھلی دلیل پیش کرتا ہوں۔ اور میں اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے چکا ہوں اس سے کہ تم مجھ کو سنگسار کرو۔

اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھ سے الگ ہی رہو۔
آخر کار موسیٰ نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ لوگ مجرم ہیں۔ (جواب دیا گیا) اچھا تو راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑو، تم لوگوں کا پیچھا کیا جائے گا۔
اور سمندر کو اُسکے حال پر کُھلا چھوڑ دو یہ سارا لشکر غرق ہونے والا ہے۔ کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے اور کتنے ہی عیش کے سروسامان جن میں وہ مزے کر رہے تھے اُن کے پیچھے دھرے رہ گئے۔
یہ ہوا اُن کا انجام اور ہم نے دوسروں کو اِن چیزوں کا وارث بنا دیا۔ پھر نہ آسمان اُن پر رویا نہ زمین اور نہ اُنھیں ذرا سی بھی مہلت دی گئی۔
اور البتہ ہم نے بنی اسرائیل کو ذلت کے عذاب سے نجات دی۔ فرعون سے نجات دی جو حد سے گزر جانے والوں میں فی الواقع بڑے اونچے درجے کا آدمی تھا۔

فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ۔ الخ (بنی اسرائیل آیات ۱۰۳ تا ۱۰۴)

آخر کار فرعون نے ارادہ کیا کہ موسیٰ اور بنی اسرائیل کو زمین سے اکھاڑ پھینکے مگر ہم نے اُسکو اور اُسکے ساتھیوں کو اکٹھا غرق کر دیا۔
اور اُسکے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تم زمین میں رہو سہو پھر جب آخرت کے وعدے کا وقت آئے گا تو ہم تم سب کو ایک ساتھ لا کھڑا کریں گے۔

وَفِيْ مُوْسٰۤى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۔ الخ
(الذاریات آیات ۳۸ تا ۴۰)

(اور تمہارے لئے نشانی ہے) موسیٰ کے قصے میں جب ہم نے اُنھیں کھلی دلیل دیکر فرعون کے پاس بھیجا۔ تو وہ اپنے بل بوتے پر اکڑ گیا اور بولا

یہ جادوگر ہے یا مجنوں ہے۔
آخرکار ہم نے اُسے اور اُسکے لشکروں کو پکڑا اور سب کو
سمندر میں پھینک دیا اور وہ ملامت زدہ ہوکر رہ گیا۔"

عبرتناک انجام

فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ کوئی تاریخی داستان نہیں بلکہ حق و باطل کے معرکوں میں ایک عظیم الشان قابل عبرت معرکہ ہے۔ ایک جانب غرور و نخوت، جبروظلم ہے دوسری طرف صبرو استقامت، مظلومیت اور خدا پرستی۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے فرعون اور قوم فرعون کی ہلاکت کے بعد عبرت وبصیرت کے لئے اس جانب خصوصی توجہ دلائی ہے کہ اس قسم کے لوگوں کے لئے آخرت کی ابدی و سرمدی زندگی میں کس قدر سخت عذاب اور خدا کی پھٹکار کے کیسے کیسے عبرتناک سامان مہیا ہیں تاکہ سلیم و نیک نہاد فطرت لوگ اِس کا مطالعہ کریں اور اُن جیسے اعمال سے خود بھی بچیں اور دوسروں کو بھی بچائیں اور اسکی ترغیب دیں۔

فرعون اور قوم فرعون کا عبرتناک انجام آیاتِ ذیل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

قرآنی مضمون

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۔الخ
(ہود آیات ۹۶ تا ۱۰۸)

اور موسیٰ کو ہم نے اپنی نشانیوں اور کُھلی دلیل کے ساتھ فرعون اور اُسکے اعیانِ سلطنت کی طرف بھیجا۔
آخرکار قوم نے فرعون کے حکم کی پیروی کی حالانکہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔ قیامت کے روز وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور انہیں دوزخ کی طرف لے جائیگا اور وہ کیسی بدتر جائے ورود ہے جس پر کوئی پہنچے۔
اور اِن لوگوں پر دنیا میں بھی لعنت پڑی اور قیامت کے دن بھی پڑے گی کیسا بُرا بدلہ ہے یہ جو کسی کو ملے۔
یہ چند بستیوں کی سرگزشت ہے جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں اِن میں سے بعض اب بھی کھڑی ہیں اور بعض کی فصل کٹ چکی ہے۔

اور ہم نے اُن پر ظلم نہیں کیا۔ لیکن اُنھوں نے آپ ہی اپنے اوپر ستم ڈھایا ہے اور جب اللہ کا حکم آگیا تو اِن کے وہ معبود جنھیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارا کرتے تھے اِن کے کچھ کام نہ آسکے اور اُنھوں نے ہلاکت و بربادی کے سوا انھیں کچھ فائدہ نہ دیا۔

اور تیرا رب جب کسی ظالم بستی کو پکڑتا ہے تو پھر اُسکی پکڑ ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔ فی الواقع اسکی پکڑ بڑی سخت اور دردناک ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسمیں ایک نشانی ہے ہر اُس شخص کے لئے جو عذاب آخرت کا خوف کرے۔ وہ ایک دن ہوگا جس میں سب لوگ جمع ہوں گے اور پھر جو کچھ بھی اُس روز ہوگا سب کی آنکھوں کے سامنے ہوگا۔ ہم اسکے لانے میں بہت زیادہ تاخیر نہیں کر رہے ہیں بس ایک مختصر گنی چنی مدت اسکے لئے مقرر ہے۔ جب وہ دن آئے گا تو کسی کی بات کرنے کی مجال نہ ہوگی اِلّا یہ کہ خدا کی اجازت سے۔ پھر کچھ لوگ اُس روز بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت۔

پس جو بدبخت ہوں گے وہ دوزخ میں جائینگے (جہاں گرمی اور پیاس کی شدت سے) وہ ہانپیں گے اور پھنکارے ماریں گے۔ اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں۔ اِلّا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے بے شک تیرا رب جو کچھ چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔

اور رہے وہ لوگ جو نیک بخت نکلیں گے تو وہ جنت میں جائیں گے۔ اسمیں ہمیشہ رہیں گے جب تک زمین و آسمان قائم ہیں۔ اِلّا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔ ایسی بخشش اُن کو ملے گی جس کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ۔۲۰۔ع۴ (قصص آیات ۴۱، ۴۲)

اور ہم نے انھیں جہنم کی طرف دعوت دینے والے پیشوا بنا دیا اور قیامت کے دن کوئی مدد نہ پاسکیں گے۔

اور ہم نے اس دنیا میں اُن کے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے روز وہ بڑی بُرائی میں مبتلا ہوں گے۔

فَوَقٰهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۔الخ (مومن آیات ۴۵ تا ۵۰)

آخر کار اُن لوگوں نے جو بُری چالیں اُس رجل مؤمن کے خلاف چلیں اللہ نے اُن سب سے اُسکو بچالیا اور فرعون کے ساتھی خود بدترین عذاب کے پھیر میں آگئے۔

دوزخ کی آگ ہے جسکے سامنے صبح وشام وہ پیش کئے جاتے ہیں اور جب قیامت کی گھڑی آجائیگی تو حکم ہوگا کہ آلِ فرعون کو شدید عذاب میں داخل کرو۔

پھر ذرا خیال کرو اُس وقت کا جب یہ لوگ دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں گے۔ دنیا میں جو لوگ کم درجہ تھے وہ بڑے درجے والوں سے کہیں گے کہ ہم تمہارے تابع تھے اب کیا یہاں تم نارِ جہنم کی تکلیف کے کچھ حصے سے ہم کو بچالو گے؟

وہ بڑے درجے والے جواب دیں گے ہم سب یہاں ایک حال میں ہیں بیشک اللہ بندوں کے درمیان فیصلہ کر چکا ہے۔

اور (پھر) یہ دوزخ میں پڑے ہوئے لوگ جہنم کے پہرہ داروں سے کہیں گے۔ اپنے رب سے دُعا کرو کہ ہمارے عذاب میں بس ایک آدھے دن کی تخفیف کردے۔

وہ پوچھیں گے کیا تمہارے پاس تمہارے رسول نشانیاں لیکر نہیں آتے رہے؟ وہ کہیں گے ہاں! جہنم کے پہرہ دار بولیں گے پھر تو تم ہی دُعا کرو اور کافروں کی دُعا اکارت ہی جانے والی ہے۔

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۔الخ

(دُخان آیات ۴۳ تا ۵۰)

بلاشبہ زقّوم کا درخت گنہگار کی غذا ہوگی۔تیل کی تلچھٹ جیسا

پیٹ میں اس طرح جوش کھائے گا۔ جیسے کھولتا ہوا پانی جوش کھاتا ہے۔
(اے فرشتو) پکڑو اسے اور دھکیلتے ہوئے لے جاؤ اسکو جہنم کے بیچوں
بیچ۔ پھر انڈیل دو اسکے سر پر کھولتے پانی کا عذاب۔ چکھ اس کا مزہ
بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تو۔
یہ وہی چیز ہے جسکے آنے میں تم لوگ شک رکھتے تھے۔

پہلا مطالبہ بحر قلزم کو پار کرنے کے بعد بنی اسرائیل نے اپنی آنکھوں سے فرعون اور اسکی فوج کو غرق ہوتے دیکھا پھر اُن کی بیشمار نعشوں کو سمندر کی موجوں نے اپنی غیض وغضب کے ساتھ ساحل پر لا پھینکا۔

یہ سارا منظر اُن کے سامنے تھا اللہ تعالےٰ کی تائید ونصرت آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، لیکن اُن کی ذہنیت کو اہل مصر کی برسہابرس کی غلامی نے کچھ اس قدر بگاڑ دیا تھا کہ اس کا اندازہ اس بات سے بآسانی کیا جاسکتا ہے کہ یہ قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چالیس سالہ زندگی کی تربیت و رہنمائی میں زندگی بسر کرلینے کے بعد بھی اپنے اندر سے اُن مشرکانہ اثرات کو نہ نکال سکی جو فراعنۂ مصر کی بندگی کے دور میں پیدا ہو گئے تھے درمیان راہ میں ایک بت خانہ نظر آیا جہاں بہت سارے انسان بتوں کی پرستش میں مصروف تھے۔ بنی اسرائیل کو یہ نقش باطل بہت پسند آیا۔ اس منظر کو دیکھ کر ان بگڑے ہوئے مسلمانوں میں سے بہتوں کی پیشانیاں اس آستانے پر سجدہ کرنے کے لئے بیتاب ہوگئیں جبکہ وہ اپنے بڑوں کو سجدہ کرتے ناک رگڑتے دیکھا تھا۔ جاہلیت کا پوشیدہ جذبہ بھڑک اٹھا، کہنے لگے اے موسیٰ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا معبود تجویز کر دیجئے جیسا کہ ان کا معبود ہے۔

اسپر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تم بڑی جاہل قوم ہو، یہ لوگ جن کے طریقے کو تم پسند کر رہے ہو ان سب کے اعمال ضائع جانے والے ہیں۔ یہ باطل کی پیروی کر رہے ہیں تم کو اس کی حرص نکرنا چاہیئے کیا میں تمہارے لئے اللہ کے سوا کسی اور کو معبود بنا دوں؟ جبکہ وہی سب کا معبود ہے۔

دوسرا مطالبہ بنی اسرائیل نے بحر قلزم کو پار کرنے کے بعد جس سرزمین پر قیام کیا

وہ عرب کی زمین تھی جو قلزم کے مشرق میں واقع ہے۔ یہ لق و دق میدان بے آب و دانہ جو تورات کی زبان میں بیابان شور وادی سینا کے نام سے مشہور ہے جس کا سلسلہ کوہ طور تک پہنچتا ہے۔ جب اس قطعہ میں پہنچے تو بھوک و پیاس کی وجہ سے گھبرا اُٹھے یہاں دور دور تک سبزہ اور پانی کا نام و نشان نہ تھا حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے فریاد کرنے لگے آپ ہم کو کہاں لے آئے؟ کیا یہاں ہم بھوک و پیاس کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر مرجائیں اچھا تو یہ ہی تھا کہ بحرِ قلزم میں ڈوب مرتے۔

قوم کی بے صبری اور بے اعتمادی پر حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے بارگاہِ الٰہی میں التجا کی وحی الٰہی نے انھیں حکم دیا کہ اپنا عصا زمین پر ماریں، حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے تعمیل کی تو فوراً بارہ چشمے پھوٹ پڑے اس وقت بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے سب کے لئے ایک ایک چشمہ مقرر ہوگیا، بنی اسرائیل کو جب پانی سے اطمینان ہوگیا تو کہنے لگے پانی کا انتظام تو ہوگیا لیکن زندگی کے لئے صرف پانی تو کافی نہیں ہمیں بھوک لگی ہے کھائیں کہاں سے؟

حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے پھر رب العالمین کی بارگاہ میں دُعا کی اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی، اے موسیٰ تمہاری دُعا قبول ہوئی پریشان نہ ہو اب ہم غیب سے سب انتظام کر دیتے ہیں۔ پھر ایسا ہوا کہ جب رات ختم ہوئی صبح صبح بنی اسرائیل نے دیکھا کہ زمین اور خشک درختوں پر جگہ جگہ سپید اولوں کے دانوں کی طرح شبنم کی صورت میں آسمان سے کوئی چیز برس کر گری پڑی ہے۔ کھایا تو نہایت شیریں حلوے کی مانند تھا۔ یہ قرآنی الفاظ میں "منّ" تھا۔ پھر دن میں تیز ہوا چلی اور کچھ دیر کے بعد بٹیروں کے غول در غول آکر زمین پر بیٹھ گئے۔ بنی اسرائیل نے اُنھیں آسانی سے پکڑا اور تل بھون کر کھانے لگے۔ "یہ سلویٰ" تھا۔

اسی طرح روزانہ بغیر کسی زحمت و مشقت کے یہ دونوں نعمتیں مفت مہیا ہوگئیں۔ لیکن چونکہ ہر نعمت اپنے میں کچھ نہ کچھ آزمائش بھی رکھتی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی معرفت بنی اسرائیل کو یہ بھی آگاہی دی کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق من و سلویٰ کو کام میں لائیں۔ دوسرے دن کے لئے ذخیرہ نہ کریں، ہم ان کو ہر صبح یہ نعمت فراہم کرتے رہیں گے۔ لیکن یہ بگڑے انسان کب سکون و اطمینان سے بیٹھتے مزاج

وعادات میں ٹیڑھا پن تھا۔ اللہ اور اسکے رسول موسیٰ علیہ السلام پر غیر متزلزل یقین نہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُس آگاہی کو کوئی اہمیت نہ دی۔ رزق فردا کے اندیشے میں مبتلا ہوگئے اور ہر روز دوسرے دن کی غذا کا ذخیرہ کرنے لگے۔ اگرچہ انھیں ہر روز نیا من وسلویٰ ملا کرتا تھا کسی بھی قوم میں جب اللہ و رسول پر بے اعتمادی کا مرض پیدا ہوجاتا ہے اُسکے آثار ایسی ہی شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فہمائش کچھ مفید ثابت نہ ہوئی۔ آخر کار ایک مدت کے بعد اسُ آسمانی دستر خوان" سے بھی محروم ہوگئے۔ نعمتوں کا حق ادا نکرنے پر ایسے ہی نتائج سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

تیسرا مطالبہ کھانے پینے کی ضروریات سے جب اطمینان ہوگیا تو اب بنی اسرائیل نے اُسی وادی میں تیسرا مطالبہ شروع کردیا۔ گرمی کی شدت ہے، سایہ دار درختوں اور مکانات کی راحت میسّر نہیں ہم بہت پریشان ہیں ایسا نہ ہو کہ گرمی کی تپش اور سورج کی تمازت ہماری زندگی کا خاتمہ کردے۔ ہم اب زیادہ صبر نہیں کرسکتے ؟ ہمارے لئے ہمارا ملک مصر ہی اچھا تھا اگرچہ وہاں ہم غلامانہ زندگی بسر کررہے تھے لیکن رہنے سہنے کا تو انتظام تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُنھیں تلقین کی کہ اللہ پر اعتماد رکھو، اُسکے فیصلوں پر شکایت وحکایت بڑے سخت نتائج پیدا کردیتی ہے۔ تم لوگ اللہ سے ڈرو اُس نے تمہاری آزادی کا وعدہ کیا ہے وہ ضرور نجات دے گا اور سب انتظام اپنے وقت مقررہ پر پورا ہوگا۔ لیکن جب اللہ و رسول پر یقین ہی متزلزل تھا ایسی اہم اور زرین نصیحت کیسے مفید ہوسکتی تھی۔ ہر روز حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دق کرنے لگے۔

بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کی اس بے صبری کا استغاثہ بارگاہِ الٰہی میں پیش کردیا اور اُس کے فضل وکرم کی التجا کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سنی گئی آنًا فانًا بادلوں کے جُھنڈ بنی اسرائیل پر سایہ فگن ہوگئے اور بنی اسرائیل جہاں بھی سفر کرتے بادلوں کا یہ سائبان اُن پر محفوظ چھتریوں کا کام دیتا۔

اس طرح بنی اسرائیل کی مسلسل بے صبری اور بے اعتمادی کے باوجود وادی تیہ بطور آزمائش "جنت نشان" بن گیا۔

چوتھا مطالبہ یہ "خدائی نشانات" اللہ و رسول پر اعتماد کرنے کے لئے کیا کچھ کم تھے ؟ مگر جب فطرت میں سلامتی باقی نہیں رہتی اور توکل واعتماد علی اللہ سے دل خالی ہوجاتا ہے تو ایسے بڑے بڑے معجزات بھی انسان کو مطمئن نہیں کرتے.

بنی اسرائیل پر وادی تیہ میں اللہ کے یہ انعامات اور پیغمبر کی موجودگی جو سب سے بڑی نعمت ہے مہیا ہیں. ان خصوصی حالات میں انھوں نے ایک عجیب وغریب مطالبہ پیش کر دیا ایک مرتبہ سب جمع ہو کر کہنے لگے :-

"اے موسیٰ ہم روز روز ایک طرح کی غذا کھاتے رہنے سے اُکتا گئے ہیں اب ہم کو اس "منّ وسلویٰ" کی ضرورت نہیں ہے. اپنے خدا سے دُعا کرو کہ وہ ہمارے لئے زمین سے سبزی، کھیرا، گیہوں، دال مسور، پیاز جیسی چیزیں اُگائے تاکہ ہم خوب کھائیں."

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی اِس بیہودگی پر بہت غصّہ آیا فرمانے لگے :-

"تم بھی کسقدر احمق ہو کہ ایک عمدہ و بہترین غذا کو چھوڑ کر ایک معمولی اور گھٹیا قسم کی چیزوں کے خواہشمند ہو ؟ اس طرح اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کے خلاف اپنی پسند کو اختیار کرنا صریح کفرانِ نعمت ہے اللہ سے ڈرو ایسے بے جا مطالبات سے باز آؤ."

لیکن قوم کے بگڑے ذہنوں کو یہ بات پسند نہ آئی اپنے مطالبہ پر اصرار کرنے لگے. اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وحی الٰہی سے اشارہ پاکر قوم سے کہا، اچھا قریب کی بستی میں چلے جاؤ وہاں تم کو یہ سب چیزیں وافر مقدار میں مل جائیں گی.

اس طرح خود اپنی ذاتی تجویز سے ایک ایک نعمت سے محروم ہوتے چلے گئے. اللہ تعالیٰ کے مذکورہ بالا احسانات کا جواب یہ لوگ کیسی کیسی مجرمانہ بے باکیوں کیساتھ دیتے رہے اور پھر کس طرح مسلسل تباہی کے گڑھے میں گرتے چلے گئے.

مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ چاروں نعمتیں ۱پانی، ۲منّ وسلویٰ، ۳بادلوں کا سایہ، چالیس برس تک اُس مسافرت کے زمانے میں بنی اسرائیل کو ملتی رہیں، چھ لاکھ سے زائد انسانی قافلہ بغیر کسی مشقت اور فاقہ کشی کے اس وادی میں کھاتا پیتا رہا.

وادیٔ تیہ کی یہ صحرا نوردی ایک بڑے مقصد کے لئے کرائی جارہی تھی جس کے بعد ایک آسمانی اور قانونِ شریعت کا نفاذ کا مقصد پورا ہونا تھا۔

لیکن بنی اسرائیل اسکی تعلیم و تربیت کے ہر مرحلہ پر ناکام ثابت ہوئے۔

قرآن حکیم نے اِن چاروں مطالبات کی تفصیل اور اس کا انجام آیاتِ ذیل میں بیان کیا ہے:-

قرآنی مضمون

وَجَاوَزْنَا بِبَنِیۤ اِسْرَآئِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْکُفُوْنَ عَلٰۤی اَصْنَامٍ لَّهُمْ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰـهًا کَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ الخ (اعراف آیات ۱۳۸ تا ۱۴۰)

اور بنی اسرائیل کو ہم نے سمندر سے پار کر دیا پھر وہ ایک ایسی قوم پر گزرے جو اپنے بتوں سے چمٹی بیٹھی تھیں، کہنے لگے اے موسیٰ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا معبود مقرر کر دے جیسا کہ اِن لوگوں کے معبود ہیں، موسیٰ نے کہا افسوس تم پر بلاشبہ تم جاہل قوم ہو۔ لاریب ان لوگوں کا طریقہ تو ہلاکت کا طریقہ ہے اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں باطل ہے۔ باوجود اسکے کہ اللہ نے تم کو تمام کائنات پر فضیلت دی ہے پھر بھی میں تمہارے لئے اللہ واحد کے سوا اور معبود تلاش کروں؟

وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا۔ الخ (بقرہ آیت ۶۰)

اور پھر وہ واقعہ بھی یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی طلب کیا تھا اور ہم نے حکم دیا تھا اپنی لاٹھی سے فلاں چٹان پر ضرب لگاؤ (موسیٰ نے اس حکم کی تعمیل کی) چنانچہ بارہ ۱۲ چشمے پھوٹ نکلے اور تمام لوگوں نے اپنے اپنے پانی پینے کی جگہ معلوم کر لی (اُس وقت تم لوگوں سے کہا گیا تھا کہ اس بے آب و گیاہ بیابان میں تمہارے لئے زندگی کی تمام ضرورتیں مہیا ہوگئی ہیں بس) کھاؤ پیو خدا کی بخشش سے فائدہ اُٹھاؤ

اور ایسا نہ کرو کہ ملک میں فتنہ و فساد پھیلاؤ (یعنی ضروریاتِ معیشت کے لئے لڑائی جھگڑا کرو یا ہر طرف لوٹ مار مچاتے پھرو)

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۔الخ (بقرہ آیت ۵۷)

اور (پھر جب ایسا ہوا تھا کہ صحرا سینا کی بے آب و گیاہ زمین میں دھوپ کی شدت اور غذا کے نہ ملنے سے تم ہلاک ہو جانے والے تھے) تو ہم نے تمہارے سروں پر بادل کا سایہ پھیلا دیا اور مَنّ و سلوٰی کی غذا فراہم کر دی (تم سے کہا گیا) اللہ نے تمہاری غذا کے لئے جو اچھی چیزیں مہیا کر دی ہیں انھیں بفراغت کھاؤ (اور کسی طرح کی تنگی و قلت محسوس نہ کرو لیکن اس پر بھی تم اپنی بدعملیوں سے باز نہ آئے، غور کرو) تم نے ناشکریوں سے ہمارا کیا بگاڑا خود اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔"

وَمِنْ قَوْمِ مُوسٰى أُمَّةٌ يَهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۔الخ (اعراف آیات ۱۵۹ تا ۱۶۰)

اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو لوگوں کو سچائی کی راہ چلاتا ہے اور سچائی کے ساتھ (ان کے معاملات میں) انصاف بھی کرتا ہے۔

اور ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ خاندانوں کے بارہ گروہوں میں تقسیم کر دیا اور جب لوگوں نے موسیٰ سے پانی مانگا تو ہم نے وحی کی کہ اپنی لاٹھی (ایک خاص) چٹان پر مارو چنانچہ بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور ہر جماعت نے اپنی اپنی جگہ پانی کی معلوم کر لی اور ہم نے بنی اسرائیل پر بادل کا سایہ کر دیا تھا اور (اُن کی غذا کے لئے) مَن و سلوٰی اُتارا تھا، ہم نے کہا تھا یہ پسندیدہ غذا کھاؤ جو ہم نے عطا کی ہے (اور فتنہ و فساد میں نہ پڑو) اُنھوں نے نافرمانی کر کے ہمارا تو کچھ نہ بگاڑا خود اپنے ہاتھوں اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔

يٰبَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ قَدْ أَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ الخ (طٰہٰ آیت ۸۰ تا ۸۲)

اے بنی اسرائیل میں نے تمہارے دشمن سے تم کو نجات دی اور تم سے (برکتوں اور کامرانیوں) کا وعدہ کیا جو کوہ طور کے دہنی جانب ظہور میں آیا تھا، تمہارے لئے صحرائے سینا میں منّ وسلویٰ مہیّا کیا۔ تمہیں کہا گیا یہ پاک غذا مہیا کر دی گئی ہے شوق سے کھاؤ (مگر اس بارے میں نافرمانی نہ کرو) کروگے تو میرا غضب نازل ہو جائے گا اور جس پر میرا غضب نازل ہوا تو وہ بس ہلاکت میں گرا اور بیشک میں بڑا ہی بخشنے والا ہوں جو کوئی توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور سیدھی راہ پر قائم رہے:"

(علامہ عبدالوہّاب نجّار نے اپنی کتاب "قصص الانبیاء" میں لکھا ہے کہ پانی کے وہ چشمے جن کا ذکر بنی اسرائیل کے واقعات میں آیا ہے۔ بحر احمر کے مشرقی بیابان میں نہر سوئز سے زیادہ دور نہیں ہیں اور اب بھی "عُیُونِ موسیٰ" (موسیٰ کے چشمے) کے نام سے مشہور ہیں۔ ان چشموں کا پانی اب بہت کچھ سوکھ گیا ہے اور بعض کے تو آثار بھی قریب قریب معدوم ہو گئے ہیں اور کہیں کہیں ان چشموں پر اب کھجور کے باغات نظر آتے ہیں) واللہ اعلم۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۔الخ (بقرہ آیت ۶۱)

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم اب ایک قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کریں گے پس اپنے پروردگار سے ہمارے لئے دُعا کرو کہ وہ زمین سے ہمارے لئے سبزی، ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز (جیسی چیزیں) اُگائے ؟ موسیٰ نے کہا کیا تم بہتر اور عمدہ چیز کے بدلے میں گھٹیا چیز کے خواہشمند ہو ؟ کسی شہر میں جا کر قیام کرو بلاشبہ وہاں یہ سب چیزیں مل جائیں گی۔

کوہِ طُور اور اعتکاف | حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ

تھا کہ جب بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے تو انھیں ایک مستقل کتاب وشریعت دی جائیگی۔

مصر سے نکلنے کے بعد جب اُنھیں خود مختار قوم کی حیثیت حاصل ہوگئی تو حکم خداوندی کے تحت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر طلب کیا گیا تاکہ انھیں بنی اسرائیل کے لئے شریعت عطا کی جائے۔

اس سلسلے کی یہ پہلی طلبی تھی اور اس کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو چالیس دن کا اعتکاف پورا کرنا طے کیا گیا تاکہ چالیس دن روزے رکھ کر شب و روز عبادت وریاضت کرکے اللہ تعالےٰ کے اُس کلام کو اخذ کرنے کی اپنے میں استعداد پیدا کریں جواُن پر نازل ہونے والا تھا۔ دراصل اس اعتکاف کی مدّت صرف تیس دن تھی بعد میں دس دن اور بڑھا کر چالیس دن کر دیئے گئے۔

علامہ دیلمیؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے (لیکن دیلمیؒ محققین کی نظر میں مجروح ہیں)

"جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک ماہ کا اعتکاف جب ختم ہوگیا تو اُنھوں نے اللہ تعالےٰ سے ہمکلامی کی فکر میں مسواک کیا۔ چونکہ مسلسل یکماہ روزوں کی حالت میں گزر گیا تھا اس لئے منھ میں بُو محسوس کرتے تھے۔ لہذا اُنھوں نے یہ پسند نہیں کیا کہ رب العالمین سے اس حالت میں ہمکلام ہوں، اس کے لئے انھوں نے ایک خوشبودار گھاس کو چبالیا اور کچھ کھا بھی لیا۔

وحی الہٰی نے آگاہ کیا، اے موسیٰ تم نے ہمکلامی سے پہلے روزہ کیوں افطار کرلیا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسکی وجہ بیان کی، ارشاد ہوا کہ اس مدت کو دسؔ دن بڑھا کر پورے چالیس دن کرلیا جائے، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارے ہاں روزہ دار کے منھ کی بُو مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ عزیز ہے۔" (تفسیر روح المعانی جلد ۹ صفحہ ۳۸)

قرآن حکیم نے صرف اسی مقدار پر اکتفا کیا ہے کہ یہ مُدت پہلے تیسؔ دن تھی اور پھر بڑھا کر چالیسؔ دن کردی گئی اس اضافہ کی کوئی وجہ مذکور نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور پر جانے لگے (اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو جو عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تین سال بڑے تھے لیکن کارِ نبوت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماتحت اور مددگار تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام کی نبوت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کرکے اپنے وزیر کی حیثیت سے مانگا تھا اور اللہ نے انھیں نبوت کے لئے منتخب بھی فرما لیا تھا)

ایسے وقت میں حضرت ہارون علیہ السلام کو قوم میں اپنا جانشین بنایا اور ہدایت فرمائی کہ بنی اسرائیل کو راہِ حق پر قائم رکھیں اور اِن کی ہر طرح نگرانی کریں۔

جب چالیس دن پورے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہمکلامی کا شرف بخشا۔ کیا کلام فرمایا؟ قرآن حکیم اس کی تفصیل سے ساکت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کلام کی لذّت وکیفیت سُرور سے شادکام ہوکر مشاہدہ و دیدار کے خواہشمند ہوئے عرض کیا الٰہی اپنی لذتِ دیدار سے سرفراز فرما!

جواب ملا اے موسیٰ! تم ہمارے مشاہدہ کی تاب نہ لاسکو گے۔ البتہ ہم اپنی ذات کی تجلی کا ظہور اس پہاڑ پر کریں گے اگر یہ پہاڑ اس تجلّی کو برداشت کر گیا تو پھر تم یہ سوال کرنا؟

اسکے بعد طُور پر ذاتِ حق کی تجلّی نے ظہور کیا تو پہاڑ کا وہ حصہ معًا ریزہ ریزہ ہوگیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس نظارہ کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہوگئے اور گر پڑے۔ جب ہوش آیا تو اللہ عزوجلّ کی حمد وثنا کی اور اپنے سوال پر نادم ہوئے اور اقرار کیا کہ میں ایمان لاتا ہوں کہ تو دیکھے جانے سے بہت بالا وبرتر ہے۔

قرآن حکیم کی آیات ذیل اسی واقعہ سے متعلق ہیں۔

قرآنی مضمون

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۔ الخ

(اعراف آیات ۱۴۲ تا ۱۴۳)

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا (کہ کوہ طور پر آکر اعتکاف کریں) اور مزید دس راتوں کو اِن تیس راتوں کا تتمہ بنا دیا

اس طرح اُن کے پروردگار کا (مقرر کیا ہوا) وقت (سب ملکر) پوری چالیس راتیں ہوگیا اور موسیٰ (علیہ السلام) نے (چلتے وقت) اپنے بھائی ہارون سے کہہ دیا تھا کہ میرے پیچھے تم میری قوم میں میری جانشینی کرنا اور اصلاح کرتے رہنا اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے طریقے پر نہ چلنا۔

جب موسیٰ ہمارے مقرر کردہ وقت پر آئے اور اُس کے رب نے اُس سے لُطف و عنایت کا کلام کیا تو موسیٰ نے التجا کی اے میرے پروردگار اپنا دیدار مجھ کو دکھلا دیجئے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں، اللہ نے فرمایا تم مجھکو ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ البتہ ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھو اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تب تو مجھے دیکھ سکوگے پھر جب اُسکے رب نے پہاڑ پر تجلّی کی تو اُسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہوکر گر پڑے۔ جب ہوش آیا تو کہا پاک ہے تیری ذات میں تیری جناب میں توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلے میں اس پر یقین کرتا ہوں۔"

نزول تورات

اس گفتگو کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات کی تختیاں عنایت کی گئیں اور تاکید کی گئی کہ اس کتاب کو مضبوطی سے تھام لو اور اسکے احکام کو قائم کرو اور قوم کو بھی اسپر عمل کرنیکی تلقین کرو۔ میں نے اس کتاب میں دینی و دنیوی فلاح کی تفصیل بیان کردی ہے۔ حلال و حرام، خیر و شر، امر و نہی کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔

اس مقام پر دو باتیں قابل توجہ ہیں:۔

(۱) علماءِ اسلام کہتے ہیں کہ اس واقعہ میں جن احکام کا نزول ہوا وہ "کتاب تورات" ہے جو تختیوں پر لکھی ہوئی تھیں۔

(۲) علماء نصاریٰ کی ایک جماعت کا ادّعا ہے کہ اس سے مراد وہ "احکام عشرہ" ہیں جو مذہب موسوی کی شریعت یا احکام عہد کے نام سے موسوم ہیں یعنی خدا کے سوا کسی کو نہ پوجنا، زنا نہ کرنا، چوری نہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔

لیکن قرآن حکیم اور تورات کے بعض قدیم نسخوں سے جسکی نشان دہی شیخ رحمت اللہ کیرانوی نے اپنی مشہورِ آفاق کتاب "اظہار الحق" میں درج کی ہے۔ احکام سے مراد کتابِ تورات ہی لی گئی ہے۔ قرآن حکیم میں نزول احکام کے تذکرے میں اسکو کتاب اور فرقان کے الفاظ سے یاد کیا گیا جو کتاب کی صفات ہیں۔

ان حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر جو الواح (تختیاں) دی گئیں وہ تورات کی تختیاں تھیں احکام عشرہ یا احکام عہد نہیں تھیں۔ انہی تختیوں میں جہاں احکام و مواعظ تھے وہاں ایک پیشگوئی بھی موجود ہے۔

سَأُورِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ۔ (اعراف آیت ۱۴۵)

عنقریب میں تم کو نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا۔

(۱) اس دار سے مراد کون سا مقام ہے؟ اہل علم نے مختلف نام لکھے ہیں۔

(۱) بعض نے کہا اس دار سے عاد وثمود کے کھنڈر مراد ہیں جسکو دیکھ کر عبرت ونصیحت لی جاسکے۔

(۲) بعض نے شہر مصر مراد لیا ہے کہ بنی اسرائیل نکالے جانے کے بعد دوبارہ اسمیں عزت کے ساتھ داخل ہوں گے۔

(۳) امام تفسیر قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے ملک شام کی مقدس سرزمین مراد ہے جہاں اُس زمانے میں قوم عمالقہ کے ظالم وجابر بادشاہوں کی حکومت تھی اور جہاں اب بنی اسرائیل کو داخل ہونا تھا۔

رہی یہ بات کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُس وقت کے بوڑھے ان بستیوں میں داخل نہ ہوسکے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتقال ارضِ مقدس میں داخل ہونے سے پہلے ہی وادی تیہ میں ہوگیا تھا۔ اسی طرح بنی اسرائیل کے بوڑھوں پر بھی آگے کی تفصیل کے مطابق اس کا داخلہ حرام کر دیا گیا تھا۔ تو آیت کی یا تو یہ مراد ہے کہ بنی اسرائیل کے جوانوں کے داخلے سے (جنکی اکثریت تھی) سب کا داخلہ مراد لیا گیا ہے۔ یا پھر یہ مراد ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں اپنے مددگار یوشع بن نون اور کالب بن یوفنہ اور چند بنی اسرائیل کے بہادروں کو ارض مقدس میں اس لئے بھیجا تھا کہ وہ وہاں کے مفصل حالات معلوم کر آئیں کہ ہم کس طرح طاقتور دشمن کو شکست دے کر ارض مقدس

میں داخل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے اُس کا مشاہدہ کر کے حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور بنی اسرائیل کو تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اس طرح معدودے چند افراد کا ارض مقدس میں داخل ہو کر اسکو دیکھ آنا اور پھر سب کو وہاں کے حالات سے آگاہ کرنا گویا سب کا دیکھ آنا مراد ہو سکتا ہے۔ آیتِ مذکورہ میں اسی طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت قتادہؒ کے قول کے مقابلہ میں پہلا قول اس لئے ضعیف ہے کہ اس واقعہ کے بعد بنی اسرائیل کبھی قومی یا جماعتی حیثیت سے مصر میں داخل نہیں ہوئے۔

دوسرا قول بھی اس لئے قابل اعتنا نہیں کہ اگرچہ ثمود کے آثار وادی سینا کے قریب ضرور تھے مگر قوم عاد کے آثار و کھنڈر تو عرب کے مغربی حصہ میں واقع تھے جو وادی سینا سے مہینوں کی راہ تھی تو ایسی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ بنی اسرائیل کو صرف اِن محو شدہ آثار و کھنڈرات دکھانے کے لئے بھیجا جاتا اور اس کے لئے اللہ کا وعدہ اس شان کے ساتھ بیان ہوتا۔

ایک تیسرا قول یہ بھی ہے دارُ الفاسقین سے مراد جہنم ہے کافروں کے لئے تہدیداً کہا گیا ہے۔

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو تورات دی گئی اور ساتھ ہی یہ بھی فہمائش کر دی گئی کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ جب کسی قوم کو ہدایت پہنچ جاتی ہے اور اُس پر حُجّت پوری ہو جاتی ہے پھر وہ قوم سمجھ سے کام نہیں لیتی۔ گمراہی اور باپ دادا کی بُری راہ و رسم پر ہی قائم رہنے پر اصرار کرتی ہے تو پھر ہم بھی اُس کو گمراہی میں چھوڑ دیتے ہیں اور ہمارے پیغامِ حق میں اُن کے لئے کوئی حصہ باقی نہیں رہتا اس لئے کہ اُنھوں نے قبولِ حق کی استعداد اپنی بغاوت و سرکشی سے زائل کر دی۔ ان ساری تفصیلات کو قرآن حکیم نے اپنے خاص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

قرآنی مضمون

قَالَ يٰمُوسٰىٓ اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ۔ الخ

(اعراف آیات ۱۴۴ تا ۱۴۷)

فرمایا اے موسیٰ میں نے لوگوں پر تم کو اپنی پیغمبری اور ہمکلامی

سے ممتاز کیا ہے۔ تو اب جو کچھ میں نے تم کو عطا کیا ہے اُسکو لے لو اور شکر کرنے والوں میں ہو جاؤ۔

اور ہم نے اس کے لئے تورات کی تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور (احکام میں سے) ہر شیٔ کی تفصیل لکھ دی ہے۔ لہذا اسکو مضبوطی کے ساتھ تھام لو اور اپنی قوم کو حکم دو کہ اسکے اچھے احکام کو لازم کریں۔ عنقریب میں تم لوگوں کو نافرمانی کا مقام دکھا دوں گا۔

میں اپنی نشانیوں سے اُن لوگوں کو برگشتہ ہی رکھوں گا جو روئے زمین پر تکبر کرتے ہیں بغیر کسی حق کے، اور اگر یہ ساری نشانیاں بھی دیکھ لیں جب بھی ان پر ایمان نہ لائیں گے اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھ پائیں تو اسے اپنا راستہ نہ بنائیں اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھ پائیں تو اُسے اپنا راستہ بنالیں۔ یہ ساری شامت اس سبب سے ہے کہ اُنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور اُن کی طرف سے اپنے کو غافل رکھا۔

اور جن لوگوں نے ہماری نشانیوں اور آخرت کے پیش آنے کو جھٹلایا اُن کے اعمال اکارت گئے اور اُن کو بدلہ اُسی کا ملے گا جو کچھ کہ وہ کرتے رہے ہیں۔"

وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن بَعْدِهِ وَأَنتُمْ ظَالِمُونَ ‎.۱۰ الخ (بقرہ آیات ۵۱ تا ۵۳)

اُور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کر لیا تھا پھر تم نے اُن کے پیچھے گوسالہ کو اختیار کر لیا اور تم سخت ظالم تھے۔ (مراد بچھڑے کی پوجا پاٹ ہے) پھر ہم نے تم کو اسکے بعد بھی معاف کر دیا کہ شاید تم شکر گزار بن جاؤ۔

اور وہ وقت یاد کرو جبکہ ہم نے موسیٰ کو کتاب اور معجزہ دیا تاکہ تم راہ یاب ہو جاؤ۔"

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِن بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولَىٰ بَصَائِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ

يَتَذَكَّرُوْنَ ۔ (قصص آیت ۴۳)

اور بیشک ہم نے پہلی قوموں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ کو کتاب دی جو لوگوں کے لئے بصیرتیں مہیا کرنے والی اور ہدایت و رحمت ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کرلیں۔

مصنوعی خُدا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم و تربیت میں رہنے والی قوم کی ذہنی و فکری حالت کا اندازہ گزشتہ واقعات سے کیا جاسکتا ہے۔ اسپر مزید ایک اور شہادت جو متعجب خیز ہی نہیں افسوسناک وعبرت ناک بھی ہے فراہم ہوتی ہے۔

کوہ طور پر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے پروردگار کی طلب پر مقیم تھے نیچے وادی میں بنی اسرائیل نے سامری کی قیادت میں خود ہی اپنا معبود منتخب کرکے اسکی پرستش شروع کردی۔

واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تورات کے لینے کے لئے تشریف لے جانے لگے تو اپنی قوم بنی اسرائیل سے فرمایا تھا کہ لوگو میرا اعتکاف کی مُدت تیس یوم ہے۔ ختم مُدت پر میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ ہارون علیہ السلام تمہارے نگراں رہیں گے انکی پیروی کرنا اور ان کو اپنا امیر جاننا۔

کوہ طور پر جانے کے بعد وہ مدت تیس کے بجائے چالیس دن ہوگئی۔ اس تاخیر سے ایک شخص سامری نامی نے فائدہ اُٹھایا، اُس نے جب دیکھا کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاخیر سے مضطرب ہو رہے ہیں تو اُس نے قوم سے کہا کہ تم اپنے وہ تمام زیورات میرے پاس لے آؤ جو تم نے مصریوں سے مستعار لئے تھے اور پھر ہجرت کی وجہ سے واپس نہ کرسکے۔ میں تمہارے لئے فائدے کی ایک بات پیدا کردوں؟

سامری گو ظاہر میں مسلمان تھا مگر اُسکے دل میں کفر و شرک کی نجاست پوشیدہ تھی۔ جب بنی اسرائیل نے تمام زیورات لاکر اسکے حوالے کردیئے تو اس نے اُن کو بھٹی میں ڈال کر گلادیا اور اُس سے ایک بچھڑے کا جسم تیار کیا اور اپنے پاس سے ایک "مُشت خاک" اسکے اندر ڈال دی۔ اس کا ڈالنا تھا کہ بچھڑے میں حیات کے

آثار پیدا ہو گئے اور وہ بھائیں بھائیں کی آواز کرنے لگا۔ اب سامری نے بنی اسرائیل سے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام سے غلطی اور بھول ہو گئی کہ وہ اللہ کی تلاش میں کوہ طور پر گئے ہیں تمہارا معبود تو یہ موجود ہے۔

گزشتہ واقعات سے یہ اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ صدیوں تک مصر کی غلامی نے بنی اسرائیل میں مشرکانہ رسوم اور عقائد کو محبوب بنا دیا تھا اور وہ اس ماحول میں کافی حد تک متاثر ہو چکے تھے اور گوسالہ پرستی جو قوم مصر کا قدیم عقیدہ تھا اور اُنکے مذہب میں اسکو بہت اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ انکے ایک بڑے دیوتا "حورس" کا مُنہ گائے کی شکل کا تھا اور وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ کرۂ زمین گائے کے سر پر قائم ہے۔

سامری نے جب بنی اسرائیل کو ترغیب دی کہ وہ اسکے بنائے ہوئے گوسالہ کو اپنا معبود سمجھیں اور اسکی پوجا کریں تو انھوں نے بغیر کسی تردد اسکو قبول کر لیا۔

حضرت ہارون علیہ السلام نے یہ دیکھا تو قوم کو سمجھایا کہ ایسا نکرو یہ تو گمراہی کا راستہ ہے مگر اُنھوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کی بات نہ مانی اور کہنے لگے کہ جبتک موسیٰ نہ آجائیں ہم اس سے باز آنے والے نہیں۔ نوبت جب یہاں تک پہنچی تو اللہ تعالےٰ کی مصلحت کا تقاضہ ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس واقعہ کی اطلاع دے دی جائے اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا، موسیٰ تم نے قوم کو چھوڑ کر یہاں آنے میں اسقدر عجلت کیوں کی؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا خدایا! اس لئے کہ آپ کے پاس آکر قوم کے لئے ہدایت حاصل کر سکوں۔

اللہ تعالےٰ نے اُنھیں بتایا کہ جس ہدایت کے لئے تم اس قدر مضطرب ہو وہ تو اس گمراہی میں مبتلا ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سُنا تو اُن کو سخت رنج وصدمہ ہوا اور ندامت کے ساتھ قوم کی طرف واپس ہوئے اور قوم سے یوں مخاطب ہوئے :- اے قوم تم نے یہ کیا کیا؟ مجھ سے ایسی کون سی تاخیر ہو گئی تھی جو تم نے یہ آفت برپا کی؟ یہ فرماتے ہوئے غیض وغضب میں کانپ رہے تھے حتیٰ کہ ہاتھ سے تورات کی الواح بھی گر گئیں۔

بنی اسرائیل نے کہا کہ ہمارا کوئی قصور نہیں، مصریوں کے زیورات کا جو بوجھ ہم ساتھ لئے پھر رہے تھے وہ سامری نے ہم سے مانگ لیا اور اس طرح ہم کو بتلا کیا۔

قوم کا یہ شرک ایک نا قابل برداشت جرم تھا۔ خاص کر منصب نبوت کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ علاوہ ازیں حضرت موسیٰ علیہ السلام ویسے بھی اشدُّ فی امر اللہ کا مزاج رکھتے تھے۔ بھائی ہارون علیہ السلام کی گردن پکڑلی اور داڑھی کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ حضرت ہارون نے فرمایا برادر میری اسمیں کوئی خطا نہیں ہے۔ میں نے انہیں ہر چند سمجھایا مگر انھوں نے کسی طرح نہ مانا اور اصرار کرنے لگے کہ جب تک موسیٰ نہ آجائیں ہم تمہادی بات سُننے والے نہیں۔ بلکہ اُنھوں نے مجھ کو کمزور پاکر میرے قتل کا ارادہ کرلیا تھا۔ جب میں نے یہ حالت دیکھی تو خیال کیا کہ اب اگر اُن سے لڑائی کی جائے اور اسکے بعد مومنین کاملین اور اُن میں جھگڑا برپا ہو تو کہیں مجھ پر یہ الزام نہ لگایا جائے کہ میرے پیچھے تم نے تفرقہ ڈالا۔ اس لئے میں خاموش رہا۔ میرے بھائی میرے سر کے بال نہ کھینچئے اور نہ میری داڑھی پر ہاتھ چلائیے اس طرح دوسروں کو ہنسنے کا موقعہ ملے گا۔

حضرت ہارون علیہ السلام کی یہ معقول بات سنکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصّہ فرو ہوا، اسکے بعد سامری کی جانب متوجہ ہوئے اور پوچھا :-

اے سامری تو نے یہ کیا ڈھونگ مچایا ہے ؟

جواب دیا میں نے ایک ایسی بات دیکھی جو ان اسرائیلیوں میں سے کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ یعنی غرق فرعون کے وقت جبرئیل علیہ السلام کو میں نے گھوڑے پر سوار دیکھا تھا اور اُن کا گھوڑا جس جگہ بھی قدم رکھتا تھا اُس حصّہ خاک میں حیات و زندگی کے آثار پیدا ہوجاتے تھے اور خشک زمین پر سبزہ اُگ آتا تھا تو میں نے اُس خاک کی ایک مُٹھی بھرلی تھی اور پھر اسکو اس بچھڑے میں ڈال دیا۔ معاً اسمیں زندگی پیدا ہوگئی اور وہ بھاں بھاں کرنے لگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ اس وقت حالتِ تحمّل میں تھے ورنہ معلوم نہیں اس کا کیا حشر کردیتے ؟ عتاب آمیز لہجے میں فرمایا اب تیرے لئے دنیا میں یہ سزا تجویز کی گئی ہے کہ تو پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرے گا اور جب کوئی انسان تیرے قریب آئے تو اُس سے بھاگتے ہوئے یہ کہے گا، دیکھو مجھے ہاتھ نہ لگانا، پھر اُسکے بدن کو ایسا بنا دیا گیا کہ کسی بھی انسان کے چھُونے سے ہلاکت خیز تکلیف ہوجاتی تھی۔

فرمایا یہ تو تیرا دنیوی عذاب ہے اور قیامت کے دن ایسے نافرمانوں کے لئے

جو عذاب مقرر ہے وہ تیرے لئے وعدۂ الٰہی کی صورت میں پورا ہونے والا ہے اور جس گوسالہ کو تو نے معبود بنایا ہے اُسکو آگ میں ڈال کر خاک کر دیا جائے گا تاکہ تجھکو اور تیرے اِن بیوقوف پیروی کرنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے معبود اور خُدا کی قدر وقیمت کیا ہے؟

وہ دوسروں پر تو کیا کرم وعنایت کرتا خود اپنے آپ کو نہ بچا سکا۔

علاوہ ازیں دنیاوی زندگی میں اِن لوگوں کو جنھوں نے گوسالہ پرستی کی تھی یہ سزا ملی کہ انھیں ارض مقدس (فلسطین) میں موت تک داخلہ نہ ہو سکا اور اُن کی توبہ یہ قرار دی گئی کہ ایک اندھیری رات میں ایک دوسرے کو قتل کریں۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا تقریباً ستّر ہزار آدمی مارے گئے اور تورات کی روایت کے مطابق تین ہزار آدمی مارے گئے۔

جب نوبت یہاں تک پہنچی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام درگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوئے اور عرض کیا بارالٰہا اب اِن پر رحم فرما اور ان کی خطاؤں کو بخش دے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا قبول ہوئی اور اللہ نے قاتل ومقتول دونوں کو بخش دیا۔

یہ ساری تفاصیل قرآن حکیم کی آیات ذیل میں اس طرح موجود ہیں:۔

قرآنی مضمون

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ الخ (بقرہ آیت ۵۴)

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے قوم بلاشبہ تم نے گوسالہ بنانے میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا ہے۔ پس اپنے خالق کی طرف رجوع کرو اور اپنی جانوں کو قربان کرو۔ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔ پھر وہ تم پر رجوع بہ رحمت ہوگا۔ بلاشبہ وہ بڑا رحمت والا رحم کرنے والا ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ۔ الخ (بقرہ آیت ۹۲، ۹۳)

اور یقیناً موسیٰ تمہارے پاس کھلے ہوئے نشان لیکر آئے، اسپر

بھی تم نے اُن کے پیچھے بچھڑے کو اختیار کر لیا اور تم تو ظالم ہی لوگ تھے۔
اور وہ وقت بھی یاد کرو جب ہم نے تم سے قول و قرار لیا تھا اور تمہارے اوپر کوہ طور کو اُٹھا دیا تھا کہ اسکو مضبوطی کے ساتھ پکڑو جو کچھ ہم نے تمہیں دیا تھا اور غور سے سنو، تم نے کہا ہاں ہم نے سُن لیا مگر ہم نے مانا نہیں اور اُن کے دلوں میں گوسالہ اُن کے کفر کے سبب پیوست ہو گیا تھا، آپ کہہ دیجئے بُری ہے وہ بات جس کا حکم تمہارا ایمان تمہیں دے رہا ہے اگر تم واقعی ایمان والے ہو۔"

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ . الخ (اعراف آیات ۱۴۸ تا ۱۵۴)

اور موسیٰ کی قوم نے اُن کے طور پر جانے کے بعد ایک بچھڑا اپنے زیوروں سے بنا لیا یعنی ایک جسم جس کے اندر ایک آواز تھی۔ کیا اُن کو یہ تک نہ سُوجھا کہ وہ نہ تو اُن سے بات کر سکتا تھا اور نہ انھیں کوئی راہ بتلا سکتا تھا اسکو اُنھوں نے معبود بنا لیا اور وہ بڑا ہی ظلم کرنے والے تھے۔

اور جب وہ نادم ہوئے اور محسوس کیا کہ وہ تو بڑی گمراہی میں پڑ گئے تو بولے کہ اگر ہمارا پروردگار ہم پر رحم نہ کرے اور ہماری مغفرت نہ کرے تو ہم ضرور نقصان والے ہوں گے۔

اور جب موسیٰ رنج و غصّے سے بھرے ہوئے اپنی قوم کے پاس واپس آئے تو بولے تم لوگوں نے میرے پیچھے بہت ہی بُری حرکت کی، کیا تم نے اپنے پروردگار کے حکم آنے سے پہلے ہی جلد بازی کر دی۔ اور توراۃ کی تختیاں تو ایک طرف ڈال دیں اور اپنے بھائی کے سر کے بال پکڑ کر لگے انھیں اپنی طرف گھسیٹنے، ہارون نے کہا اے میرے پیارے بھائی مجھے تو لوگوں نے بے حقیقت سمجھا اور قریب تھا کہ مجھے قتل ہی کر ڈالیں۔ سُو میرے اوپر دشمنوں کو نہ ہنسوائیے اور مجھے اُن ظالم لوگوں کے زُمرے میں داخل نہ کر لیجئے۔

موسیٰ نے کہا اے میرے پروردگار مجھے اور میرے بھائی

سے درگزر فرما اور ہم دونوں کو اپنی رحمت خاص میں داخل فرمالے اور تو سب مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔

بیشک جن لوگوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنالیاہے اُن پر اُن کے پروردگار کی طرف سے غضب اور ذلّت بہت جلد پڑے گی اسی دُنیا کی زندگی میں' اور ہم تہمت گھڑنے والوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔

اور جن لوگوں نے گناہوں کے کام کئے پھر اسکے بعد انھوں نے توبہ کرلی اور ایمان لے آئے تو بیشک تمہارا رب اسکے بعد ان کے حق میں بڑا مغفرت والا بڑا رحمت والا ہے۔

اور جب موسیٰ کا غصّہ فرد ہوا تو اُنھوں نے تختیوں کو اُٹھالیا اور اُس نسخۂ توریت میں ہدایت اور رحمت تھی اُن لوگوں کے لئے جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔"

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى۔ الخ (طٰہٰ آیات ۸۳ تا ۹۸)

(اور جب موسیٰ طور پر حاضر ہوئے تو ہم نے پوچھا) اے موسیٰ کس بات نے تم کو جلدی کرنے پر اُبھارا؟ اور (تم قوم کو پیچھے چھوڑ آئے۔

موسیٰ نے عرض کیا وہ بس میرے پیچھے آہی رہے ہیں، میں جلدی کرکے تیرے حضور آگیا، تاکہ اے میرے رب تو مجھ سے خوش ہو جائے۔

فرمایا اچھا سنو ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے انھیں گمراہ کرڈالا۔ موسیٰ سخت غصّے اور رنج کی حالت میں اپنی قوم کی طرف پلٹے، کہا اے میری قوم کے لوگو! کیا تمہارے رب نے تم سے اچھے وعدے نہیں کئے تھے؟ پھر کیا ایسا ہوا کہ تم پر بڑی مدّت گزرگئی (اور تم یاد نہ رکھ سکے) یا تم اپنے رب کا غضب ہی اپنے اوپر لانا چاہتے تھے کہ تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی؟

اُنھوں نے جواب دیا ہم نے آپ سے وعدہ خلافی کچھ اپنے

اختیار میں نہیں کی لیکن معاملہ یہ ہوا کہ لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے ہم لد گئے تھے اور ہم نے بس اُن کو پھینک دیا تھا۔ پھر اسی طرح سامری نے بھی کچھ ڈالا اور اُن کے لئے ایک بچھڑے کی مُورتی بنا کر نکال لایا۔ جس میں سے بیل کی سی آواز نکلتی تھی، لوگ پُکار اُٹھے یہی ہے تمہارا خُدا اور موسیٰ کا خُدا، موسیٰ اسے بھول گئے۔

کیا وہ دیکھتے نہ تھے کہ نہ وہ اُن کی بات کا جواب دیتا ہے اور نہ اُن کے نفع ونقصان کا کچھ اختیار رکھتا ہے۔ ہارونؑ موسیٰؑ کے آنے سے پہلے ہی اِن سے کہہ چکے تھے کہ لوگو! تم اسکی وجہ سے فتنہ میں پڑ گئے ہو تمہارا رب تو رحمٰن ہے پس تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔

مگر انھوں نے ہارون سے کہہ دیا کہ ہم تو اسی کی پرستش کرتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ واپس نہ آجائے؟ موسیٰ (قوم کو ڈانٹنے کے بعد ہارون کی طرف متوجہ ہوئے) بولے اے ہارون تم نے جب دیکھا تھا کہ یہ گمراہ ہو گئے ہیں تو کس چیز نے تم کو روکا کہ میرے پاس چلے آتے تو کیا تم نے بھی میرے حکم کی خلاف ورزی کی۔

ہارون نے جواب دیا اے میری ماں کے بیٹے میری داڑھی نہ پکڑ نہ میرے سر کے بال، مجھے اس بات کا اندیشہ تھا کہ تم آکر یہ نہ کہو کہ تو نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا۔

موسیٰ نے کہا اے سامری تیرا کیا معاملہ ہے؟

اُس نے جواب دیا میں نے وہ چیز دیکھی ہے جو اُن لوگوں نے نہیں دیکھی ہے۔ پس میں نے رسول کے نقش قدم سے ایک مُٹھی اُٹھالی اور اُسکو ڈال دیا، میرے نفس نے مجھے کچھ ایسا ہی سُجھایا۔

موسیٰ نے کہا اچھا تو جا، اب زندگی بھر تجھے یہی پکارتے رہنا ہے کہ مجھے نہ چھونا اور تیرے بازپُرس کا ایک وقت مقرر ہے جو تجھ سے ہرگز نہ ٹلے گا اور دیکھ اپنے اس خُدا کو جس پر تو ریجھا ہوا ہے اب ہم اسے

ضرور جلا دیں گے اور ریزہ ریزہ کرکے دریا میں بہادیں گے۔
لوگو! تمہارا خُدا تو بس ایک ہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی
معبود نہیں ہر چیز پر اس کا علم حاوی ہے۔

خیانت اور ہلاکت

جب بنی اسرائیل کا جُرم معاف کر دیا گیا اور توبہ کے ضمن میں مقتولین کو شہید کا درجہ اور جو زندہ رہ گئے انھیں معافی کا درجہ دے دیا گیا۔ اسکے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم سے اللہ تعالےٰ کی وہ فہمائش بھی سُنا دی کہ اس کتاب کو مضبوطی سے تھام لو اور اسکے مطابق عمل کرو اس میں تمہاری ہدایت و فلاح کے طور وطریقے ہیں۔ اب تمہارا فرض ہے کہ اس کتاب پر ایمان لاؤ اور اس کے احکام کی تعمیل کرو۔ بنی اسرائیل بہرحال بنی اسرائیل ہی تھے کہنے لگے اے موسیٰ ہم کیسے یقین کریں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے؟ ہم اتنی بڑی بات صرف آپ کے کہنے سے کیسے قبول کریں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بغیر دیکھے ایک بات کی تصدیق کرلیں؟ ہم اسپر اُسوقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ اللہ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں اور اپنے کانوں سے یہ سُن لیں کہ یہ ہماری کتاب ہے اسپر ایمان لاؤ؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انھیں سمجھایا کہ یہ بے جا سوال ہے ان آنکھوں سے خدا کو کس نے دیکھا ہے جو تم لوگ دیکھنا چاہتے ہو؟ یہ بڑی جرأت کی بات ہے اور سخت گستاخی بھی۔

لیکن بنی اسرائیل کا اصرار بدستور قائم رہا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جناب باری میں عرض کی الٰہی اس قوم پر رحم فرما، اور اپنے کتاب پر عمل کرنے کی اُنھیں توفیق دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا قبول ہوئی وحی آئی کہ قوم کے ستّر ذمہ دار افراد کا انتخاب کرلو اور انھیں کوہِ طور پر لے آؤ ہم اسکی تصدیق کروادیں گے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں سے ستّر سرداروں کا انتخاب کیا اور اُن سے عہد لیا کہ وہ واپس آکر شہادت دیں۔ قوم نے بھی اس انتخاب سے اتفاق کیا، اس طرح حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے تمام قبائل سے ستّر سرداروں کو چُن

لیا اور طور پر لے آئے. کوہِ طور پر ایک سفید بادل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گھیر لیا اور اللہ تعالےٰ سے ہمکلامی شروع ہوئی ، اِن سرداروں نے بھی اللہ تعالےٰ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلام سُنا جب بات ختم ہوئی اور وہ سفید بادل دور ہوا تو اِن ضدی سرداروں نے اپنا پہلا اصرار قائم رکھا کہ کیا معلوم کس کا کلام تھا ؟ ہم نے تو صرف کانوں سے سُنا، کلام کرنے والا تو ہمیں نظر نہیں آیا بھلا اے موسیٰ ہم اپنی قوم کو کس طرح شہادت دیں کہ یہ کلام اللہ ہی کا تھا۔

لہذا ہم اب بھی وہی کہتے ہیں کہ جب تک کہ اللہ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں ایمان نہیں لائیں گے. اس احمقانہ اصرار پر غضب الٰہی ٹوٹ پڑا۔ ایک ہیبت ناک چمک وکڑک و زلزلے نے اُن کو پکڑ لیا اور سب ہلاک ہوگئے۔ جمہور علماء کا یہی قول ہے کہ یہ لوگ حقیقتاً مر گئے۔

(روح المعانی)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ حال دیکھا تو بارگاہِ الٰہی میں عاجزی کیساتھ دُعا مانگی الٰہی اگر یہ چند بیوقوف بیوقوفی کر بیٹھیں تو کیا ہم سب کو ہلاک کر دیا جائے گا۔ اے اللہ انہیں اپنی رحمت سے معاف فرما۔

اللہ تعالےٰ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا وپکار پسند آئی ان سب کو دوبارہ زندگی عطا کر دی گئی. اس طرح اِن لوگوں نے اللہ کے کلام کے ساتھ موت کا مزہ بھی چکھا. اس واقعہ کی تفصیل قرآن حکیم میں اس طرح موجود ہے :-

قرآنی مضمون

وَاخْتَارَ مُوسٰى سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۔الخ

(اعراف آیات ۱۵۵ تا ۱۵۷)

اور موسیٰ نے اپنی قوم سے ستّر مرد کا انتخاب کیا ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت کے لئے، پھر جب انھیں زلزلے نے آپکڑا تو موسیٰ نے کہا اے میرے پروردگار اگر تجھے یہی منظور ہے تو تو نے اس کے قبل ہی اُنکو اور مجھکو ہلاک کر دیا ہوتا، کیا تو ہمیں اُس حرکت پر ہلاک کر دے گا جو ہم میں

ان چند بے وقوفوں نے کی ہے؟ یہ تو بس تیری طرف سے آزمائش ہے۔ اِن آزمائشوں سے جس کو تو چاہے گمراہی میں ڈال دے اور جسکو چاہے ہدایت پر قائم کر دے، تو ہمارا کارساز ہے ہماری مغفرت فرما اور ہم پر رحم فرما اور تو ہی بہترین مغفرت کرنے والا ہے

اور ہمارے حق میں بھلائی لازم کر دے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ہم تو تیرے آگے جُھک گئے ہیں، اللہ نے فرمایا اپنا عذاب میں اُس پر واقع کرتا ہوں جسکے لئے چاہتا ہوں اور میری رحمت تو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ سو اسکو ان لوگوں کے لئے تو ضرور ہی لازم کر دوں گا جو خوفِ خدا رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو لوگ ہماری نشانیوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

جو لوگ اس نبی اُمّی کی پیروی کرتے ہیں جسکو وہ اپنے ہاں لکھا ہوا پاتے ہیں تورات اور انجیل میں انھیں وہ نیک کرداری کا حکم دیتا ہے اور انھیں بد کرداری سے روکتا ہے اور اُن کے لئے پاکیزہ چیزیں جائز بتاتا ہے اور ان پر گندی چیزیں حرام رکھتا ہے اور اُن پر سے بوجھ اور قیدیں جو اُن پر اب تک تھیں اُتار دیتا ہے۔ سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور اُس کا ساتھ دیا اور اُس کی مدد کی اور اُس نور کی پیروی کی جو اُسکے ساتھ اُتارا گیا ہے سو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۔

(بقرہ آیت ۵۵، ۵۶)

"اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم تجھ پر اُس وقت تک ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ اللہ کو بے حجاب اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیں، پس آنکھوں دیکھتے تم کو بجلی کی کڑک نے آپکڑا۔ پھر ہم نے تم کو موت کے بعد زندہ کیا تاکہ تم شکر گزار رہو۔"

رفعِ طور

الغرض جب یہ ستّر سردار دوبارہ زندگی پاکر قوم کی جانب واپس ہوئے اور

قوم سے سارا قصہ کہہ سُنایا اور بتایا کہ موسیٰ علیہ السّلام جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ حق ہے اور بلا شبہ وہ اللہ کے فرستادہ ہیں۔ اس آنکھوں دیکھی شہادت کے بعد اب کوئی گنجائش ہی نہ تھی جو تسلیم و اطاعت کے لئے ضروری ہوتی، لیکن قوم کی کجروی بدستور باقی رہی اور قبولِ حق میں وہی معاندانہ رویہ اختیار کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے ارشادات پر توجہ نہ کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اس ناگفتہ بہ حالت کا تذکرہ جنابِ الٰہی میں کیا اور مدد چاہی۔ بارگاہِ الٰہی سے جواب دیا گیا کہ اب اِن نافرمانوں کے لئے ایک اور حجّت عطا کرتا ہوں اب اسی ذریعہ سے یہ لوگ تورات کو قبول کرلیں گے۔ چنانچہ ایک دن زبردست زلزلے کے ذریعہ پورا کوہِ طور سروں پر معلّق ہوگیا۔ اس طرح گویا وہ چھتری ہے جس کا سایہ سروں اور جسموں پر پڑتا ہے۔ اس ہیبت ناک منظر میں آواز آئی، کتاب تورات کو قبول کرلو اور اُسکو مضبوطی سے عمل کے لئے تھام لو۔

اس عظیم الشان نشانی کو دیکھ کر سارے بنی اسرائیل نے احکام کی تعمیل کا وعدہ کیا اور اقرار کیا کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اسی کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ اس اقرار کے بعد کوہِ طور سروں سے دور ہوا اور اپنی جگہ آبیٹھا، روایات میں ہے کہ ایک فرشتے نے اللہ کے حکم سے یہ عمل انجام دیا۔

چند دن تو بنی اسرائیل پر اس کا خوف مسلّط رہا پھر وہی بے راہ روی عود کر آئی زیادہ عرصہ تک اس عہد پر قائم نہ رہ سکے اور پھر خلاف ورزی شروع کردی۔

رفع طور کا یہ واقعہ قرآن حکیم میں آیات ذیل میں مختصر مگر نہایت صاف اور واضح الفاظ میں موجود ہے:۔

قرآنی مضمون

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ۔ الخ

(بقرہ آیت ۶۳)

اور جب ہم نے تم سے قول و قرار لیا اور ہم نے طور پہاڑ کو اُٹھا کر تمہارے اوپر معلّق کر دیا۔ قبول کرو جو کتاب کہ ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی کے ساتھ اور یاد رکھو جو احکام اسمیں ہیں، جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔

پھر تم اس قول و قرار کے بعد بھی پھر گئے، سو اگر تم لوگوں
پر خدا تعالےٰ کا فضل و رحم نہ ہوتا تو ضرور تباہ ہو جاتے۔
وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ
وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۔الخ (اعراف آیت ۱۷۱)
"اور وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے جب ہم نے پہاڑ کو اُٹھا کر
چھت کی طرح اُن کے اوپر معلق کر دیا اور ان کو یقین ہو گیا کہ اب اِن پر
گرا، اور کہا کہ قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی کے ساتھ
اور یاد رکھو جو احکام اسمیں ہیں جن سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاوٴ۔"

ارضِ مقدس

سینا کے جس مقام میں اس وقت بنی اسرائیل تھے یہ فلسطین سے قریب تھا۔ بنی اسرائیل کے باپ دادا حضرت ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام سے اللہ تعالےٰ کا وعدہ تھا کہ ایک زمانہ بعد تمہاری اولاد کو پھر سے اس ارض مقدس کا مالک بنا دیا جائے گا جو دوسروں کے قبضے میں چلا گیا تھا تاریخی روایات میں مشہور بات یہی ہے کہ ملک شام اور بیت المقدس پر عمالقہ قوم کا قبضہ تھا جو قوم عاد کی نسل سے تعلق رکھتے تھے بڑے بڑے ڈیل ڈول اور ہیبت ناک قد و قامت کے لوگ تھے۔

فرعون سے نجات پانے اور کوہِ طور پر کتاب و شریعت ملنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ملا کہ اپنی قوم کو لے کر بیت المقدس فتح کریں اور اس کے لئے ارض مقدس پر جہاد کریں اور وہاں کے ظالم و جابر حکمرانوں کو نکال کر عدل و انصاف قائم کریں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ بھی وعدہ فرمایا کہ فتح تمہاری ہوگی اور ظالم دشمن شکست کھا جائیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تعمیلِ حکم میں اپنی قوم بنی اسرائیل کو لیکر ملک شام کا رُخ کیا جانا تو بیت المقدس پر تھا جب نہر اُردن سے پار ہو کر دنیا کے قدیم ترین شہر "اَریحا" پر پہونچے جسکی خوشحالی اور سرسبزی ضرب المثل تھی۔ یہاں کچھ دن قیام کیا اور بنی اسرائیل کے بارہ سرداروں کو (جن کا ذکر گزشتہ آیات میں آچکا ہے) محاذ جنگ کی صورتِ حال اور

دشمن کی طاقت وقوت کا اندازہ لگانے آگے روانہ کیا۔جب یہ لوگ شہر کے قریب ہی پہنچے تھے کہ قوم عمالقہ کا ایک آدمی انھیں مل گیا اور وہ صرف اکیلا ان بارہ کو گرفتار کر کے اپنے بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا کہ یہ لوگ جنگ کے ارادے سے آئے ہیں، بعضوں نے مشورہ دیا کہ انھیں قتل کر دیا جائے، بعض نے کہا انھیں جیل بھیج دیا جائے۔ آخر یہ طے ہوا کہ انھیں قوم کی قوت وطاقت کا مشاہدہ کرا کے آزاد کر دیا جائے تاکہ یہ اپنی قوم میں جاکر عمالقہ کی شان وشوکت کا ذکر کریں تاکہ انھیں کبھی جنگ کرنے کا خیال تک نہ آئے۔ چنانچہ انھیں آزاد کر دیا گیا۔یہ رہا ہو کر اپنی قوم بنی اسرائیل کے پاس مقام "آریحا" پہنچے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس عجیب وغریب قوم کی ناقابل قیاس قوت وشوکت کا ذکر کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قلب تو مطمئن تھا کیونکہ انھیں فتح کی پیشگوئی مل چکی تھی لیکن قوم پر اندیشہ ہوا کہ اگر انھیں یہ تفصیلات معلوم ہو جائیں تو ہمت ہار بیٹھیں گے۔ ان بارہ۱۲ سرداروں کو ہدایت کی کہ یہ حالات پوشیدہ رکھے جائیں کسی پر ظاہر نہ ہوں مگر ان میں سے دس۱۰ سرداروں نے اسکو فاش کر دیا صرف دو۲ سردار جن کے نام یوشع بن نون اور کالب بن یوقنا تھے موسوی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس راز کو کسی پر ظاہر نہ کیا۔ بہرحال بنی اسرائیل میں جب یہ تفصیلات پھیل گئیں تو وہ رونے پیٹنے لگے اور کہنے لگے کہ اچھا تو یہی تھا کہ ہم بھی قوم فرعون کی طرح دریا میں ڈوب مرتے یا پھر مصر ہی میں غلام بنے پڑے رہتے یہاں تو سوائے موت کے اور کیا ہے ؟ بھلا ایسی بڑی قوت وطاقت سے کہیں مقابلہ بھی ہو سکتا ہے؟

یہ سُنکر اُن دو۲ بزرگوں نے جو اللہ تعالےٰ کے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتے تھے نصیحت کے لہجہ میں کہا اے قوم ذرا ہمت کرو چند قدم اُٹھا کر شہر کی طرف چلو اللہ کی مدد ونصرت آئے گی یقیناً تمہاری ہی فتح ہوگی۔جوں ہی تم بیت المقدس کے دروازے پر داخل ہوگے دشمن بھاگ کھڑا ہوگا۔ اللہ پر اعتماد کرو، کامیابی ہم کو ہی ہوگی۔

مگر بنی اسرائیل جب اپنے پیغمبر کی بات ماننے کو تیار نہ تھے تو ان دونوں بزرگوں کی بات کا کیا لحاظ رکھتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہایت ذلیل وشرمناک جواب دیا:-

"اے موسیٰ بس تم اور تمہارا رب دونوں جاؤ اور لڑو، ہم یہاں بیٹھتے ہیں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ بیہودہ جواب سُنا تو بہت افسردہ خاطر ہوئے اور

انتہائی رنج و ملال کی حالت میں درگاہ الٰہی عرض کیا الٰہی میں اپنے اور ہارون کے سوا کسی پر قابو نہیں رکھتا سو ہم دونوں حاضر ہیں اب تو ہمارے اور اِن نافرمانوں کے درمیان جُدائی کردے، اِن سے اب کسی خیر کی توقع نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی تم غمگین نہ ہو ان کی نافرمانی کا تم پر کوئی بوجھ نہیں۔ اب ہم نے اِن کے لئے یہ سزا تجویز کردی ہے کہ یہ چالیس سال اسی میدان میں بھٹکتے پھریں گے اور اِن کو ان کے آبا و اجداد کے قدیم شہر ارضِ مقدس میں جانا نصیب نہ ہوگا۔ ہم نے اُن پر ارضِ مقدس حرام کر دیا ہے۔ چنانچہ اس صحرا نوردی کی شکل اس طرح شروع ہوئی، بطور سزا انھیں چالیس سال تک ایک محدود علاقہ میں محصور و مقید ہونا پڑا، ظاہری طور پر ان کے اطراف کوئی حصار نہ تھا نہ اُن کے ہاتھ پیر کسی قید و بند میں جکڑے ہوئے تھے بلکہ یہ سب کھُلے میدان میں تھے اور اپنے وطن مصر کی طرف جانے کے لئے ہر روز صبح سے شام تک سفر کرتے مگر شام کو پھر وہیں نظر آتے جہاں سے صبح کو چلے تھے۔ یہ اللہ کی طرف سے عذاب تھا جو اُن پر مسلّط ہوگیا تھا۔ ناقابلِ فہم طور پر یہ صحرا نوردی مسلسل چالیس سال تک جاری رہی لیکن انھیں اس وادی سے نکلنے اور اپنے وطن مصر پہنچنے کی کوئی شکل پیدا نہ ہوئی۔ اسی دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کا انتقال بھی ہوگیا اور یہ بے باپ کی اولاد کی طرح اس وادی تیہ میں حیران و پریشان پھرتے رہے۔ ان کے بعد اللہ تعالےٰ نے دوسرے پیغمبران کی ہدایت کے لئے بھیجے۔

اللہ کی سزاؤں کے لئے نہ پولس اور نہ اُن ہتھکڑیوں کی ضرورت ہے جس سے قیدیوں کو مقید کیا جاتا ہے۔ نہ جیل خانے کی مضبوط دیواروں اور آہنی دروازوں کی ضرورت ہے۔ جب وہ کسی کو محصور اور نظر بند کرنا چاہتے ہیں تو کھُلے میدان میں بھی قید کرسکتے ہیں۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ ساری کائنات اُس کی مخلوق اور محکوم ہے۔ جب کائنات کو کسی کے قید کرنے کا حکم ہوجاتا ہے تو پھر اُسکی ساری ہوا، اور فضا، زمین و مکان اسکے لئے جیل خانہ بن جاتی ہے۔

چنانچہ یہ سارا میدان جو مصر اور بیت المقدس کے درمیان ہے جس کا طول و عرض حضرت مقاتلؒ کی تفسیر کے مطابق تیس فرسخ لمبائی اور نو فرسخ چوڑائی ایک فرسخ

کم و بیش تین میل کا قرار دیا جائے تو کل نوّے میل کا طول اور ستائیس میل کے عرض کا رقبہ ہو جاتا ہے) اور بعض روایات کے مطابق صرف ۱۸ × ۳۰ میل کا رقبہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پوری قوم کو جسکی تعداد حضرت مقاتلؒ کے بیان کے مطابق چھ لاکھ نفوس پر مشتمل تھی مقید کر کے رکھ دیا۔ اس میدان کے اندر اس عرصہ میں اس قوم کے جوان اور بوڑھے فوت ہو گئے۔ صحیح روایات کے مطابق اس چالیس سالہ دور میں پہلے حضرت ہارون علیہ السلام کا انتقال ہوا پھر اسکے چھ ماہ بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی وفات پا گئے۔ اِن کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع بن نون کو بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے نبی بنا کر مامور فرمایا۔ چالیس سالہ دورِ قید ختم ہونے کے بعد قوم کے نوجوانوں کو لیکر حضرت یوشع علیہ السلام بیت المقدس کی فتح کے لئے چل پڑے۔ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق ملک شام اِن کے ہاتھوں فتح ہوا اور ملک کی ناقابل قیاس دولت اِن کے ہاتھ آئی۔

اہل تفسیر نے ایک نکتہ یہ بھی لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو جو بھی سزا دیتے ہیں وہ اُنکے اعمال بد کی ہم شکل ہوتی ہے، اس نافرمان قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوال پر یہ گستاخانہ جواب تھا،

اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ۔ (ہم تو یہیں بیٹھتے ہیں)

اللہ تعالیٰ نے انھیں چالیس سال تک یہیں بٹھا دیا۔ نعوذ باللہ من غضبہ وعقابہ۔

ارض مقدس کا تذکرہ آیاتِ ذیل میں موجود ہے۔

قرآنی مضمون

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ۔ الخ (مائدہ آیات ۲۰ تا ۲۹)

اور وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم اللہ کا وہ احسان تم اپنے اوپر یاد کرو جب اُس نے تمہارے اندر نبی پیدا کئے اور تمہیں خود مختار کیا اور تمہیں وہ دیا جو دنیا میں کسی قوم کو بھی نہیں دیا گیا۔

اے میری قوم کے لوگو! اس زمین مقدس میں داخل ہو جاؤ جسے اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے اور پچھلے پیروں واپس نہ ہونا ورنہ

بالکل ہی خسارہ میں پڑ جاؤ گے۔

وہ بولے اے موسیٰ اُس سرزمین پر تو بڑی زبردست قوم آباد ہے، اور ہم تو وہاں ہرگز نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں البتہ وہ اگر وہاں سے نکل جائیں تو بلاشبہ داخل ہونے کو تیار ہیں۔ اس پر وہ دو آدمی جو اللہ سے ڈرنے والوں میں تھے اور اُن دونوں پر اللہ کا فضل تھا بولے تم اُن پر چڑھائی کر کے شہر کے دروازے تک تو چلو، سو جس وقت تم دروازہ میں قدم رکھو گے اُسی وقت غالب آجاؤ گے اور اللہ ہی پر بھروسہ رکھو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

وہ لوگ بولے اے موسیٰ ہم ہرگز وہاں کبھی بھی نہ داخل ہونگے جب تک کہ وہ لوگ وہاں موجود ہیں۔ سو آپ خود اور آپ کا خدا چلا جائے اور آپ دونوں لڑ بھڑ لیں ہم تو یہاں سے ٹلتے نہیں۔

موسیٰ نے عرض کی اے میرے پروردگار میں تو سوائے اپنے اور اپنے بھائی ہارون کے کسی اور پر اختیار نہیں رکھتا۔ لہٰذا تو ہی ہمارے اور اس بے حکم قوم کے درمیان فیصلہ کر دے۔

ارشاد ہوا اچھا تو وہ ملک اُن پر چالیس سال کے لئے حرام کر دیا گیا۔ یہ لوگ اسی زمین پر بھٹکتے پھریں گے۔ سو آپ اس بے حکم قوم پر ذرا بھی غم نہ کیجئے۔

ذبح بقرہ

بنی اسرائیل کے واقعات میں ذبح گائے کا واقعہ بھی خاصی شہرت رکھتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس واقعہ کو بھی خصوصیت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اُسکے نتائج سے بھی آگاہ کیا ہے۔ یہ واقعہ غالباً نزولِ تورات سے قبل کا ہے۔ بنی اسرائیل اپنی ہمسایہ قوم سے جہاں عادات و اطوار میں ہمشکل ہو گئے تھے وہاں عبادات و اعتقادات میں بھی کافی حد تک متأثر ہو گئے تھے۔ قدیم زمانے سے مصر میں گائے کی تقدیس اور اُسکی پوجا چلی آ رہی تھی۔ بنی اسرائیل کو بھی اس مرض کی چھوت لگ گئی تھی انکو ایک واقعہ میں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا جو دراصل اِن کے ایمان کا امتحان تھا کہ اگر وہ واقعی اب

اللہ کے سوا کسی کو معبود نہیں سمجھتے تو یہ عقیدہ اختیار کرنے سے پہلے جس بُت کو معبود سمجھتے رہے ہیں اُس سے اپنے ہاتھ اُٹھالیں۔ یہ امتحان بڑا سخت تھا۔ جن قلوب میں گائے پرستی موجود تھی وہ اس کو کسی طرح بھی کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ لیکن اللہ کو یہی منظور تھا کہ ایک دفعہ عملاً اس "معبود بقری" کو خود عابدوں کے ہاتھ ذبح ہوتا دیکھے اور مومن کافر سے ممتاز ہوجائے اور معبود باطل کی بے چارگی اور بے بسی بھی عیاں ہوجائے۔

ملا علی قاری نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں اس کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے کسی گھر شادی کا پیام دیا لیکن گھر والوں نے اسکو قبول نہ کیا اس شخص نے خفیہ طور پر اُس لڑکی کے باپ کو قتل کردیا، اسکے بعد وہ لاپتہ ہوگیا، آخر کار شُبہ کی تہمت نے بہت سے خانوادوں میں باہمی اختلاف اور کشمکش کی صورت اختیار کرلی۔ کسی طرح قاتل کا پتہ نہ چلتا تھا قوم نے موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اس نزاع کا حل تلاش کیا جائے ورنہ قبائلی جنگ کے چھڑ جانے کا اندیشہ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں دُعا کی اور مدد چاہی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور قاتل کی نشان دہی کے لئے یہ نسخہ تجویز فرمایا، قوم سے کہا جائے کہ ایک گائے ذبح کی جائے اور اُسکے گوشت کے ایک حصے کو مقتول کے جسم سے لگایا جائے، مقتول زندہ ہوکر اپنے قاتل کا نام و نشان بتلادے گا۔ اس طرح یہ معاملہ واضح ہوجائے گا۔

مسئلہ کا حل بھی ضروری تھا اِدھر گائے کا ذبح کرنا (گویا اپنے معبود کو ذبح کرنا) بھی بڑا سخت امتحان تھا، بنی اسرائیل نے اسکو ٹالنے کی کوشش کی اور کج بحثی شروع کردی کہ اے موسیٰ کیا تم ہم سے مذاق کرتے ہو؟ قاتل کی نشان دہی سے گائے کو کیا تعلق ہے؟ بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خیر خواہی سے کہا کہ نعوذ باللہ میں مذاق یا جھوٹ کیوں کروں۔ یہ تو جاہلوں کا طریقہ ہے۔ جب بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صفائی سے مطمئن ہوگئے تو پوچھنے لگے اچھا اگر یہ واقعی اللہ کا حکم ہے تو یہ بتایا جائے کہ وہ گائے کیسی ہو؟ اُس کا رنگ کیسا ہو؟ اُس کی عمر کیا ہو؟ کن کن صفات کی حامل ہو وغیرہ وغیرہ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ہر سوال کا جواب اللہ تعالیٰ سے معلوم کرکے بتلایا کرتے تھے آخر کار جب سب سوالات ختم ہوگئے اور حیلہ جوئی کا کوئی موقعہ باقی نہ رہا تو بادل ناخواستہ

گائے کو ذبح کیا اور گائے کے گوشت سے مقتول کی لاش پر ضرب لگائی گئی، یک بیک مقتول میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ اُٹھ بیٹھا، اپنے قاتل کا نام ونشان بیان کرکے پھر ڈھیر ہوگیا۔ تاریخی روایت میں اس کا نام عامیل بیان کیا گیا ہے اور اس کا قاتل خود اس کا بھتیجہ تھا۔ اس طرح بیک کرشمہ سہ کار ہوئے :۔

اوّل اللہ کی قدرت کا ایک نشان ظاہر ہوا۔

دوم قاتل کا نام ونشان ملا۔

سوم گائے کی تقدیس وعظمت پر بھی کاری ضرب لگی کہ اس نام نہاد معبود کے پاس اگر کچھ بھی طاقت ہوتی تو اُسے ذبح کرنے سے ایک آفت ٹوٹ پڑتی۔

اس واقعہ سے جہاں یہ نتائج ظاہر ہوئے وہاں اس سے ایک بڑی حقیقت کا بھی اظہار کیا گیا، وہ یہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُس مردے کو زندہ کرکے اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا ہے، اسی طرح وہ قیامت کے دن بھی اسی طرح مُردوں کو دوبارہ زندگی عطا کریگا۔

الغرض یہ واقعہ بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک "عظیم نشان" ہے۔ بنی اسرائیل (قوم موسیٰ) کو جتنی کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے نشان (معجزات) دکھائے ہیں اگر واقعی دوسری قوم کے سامنے یہ مظاہرے کئے جاتے تو وہ ہمیشہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی فرمانبردار بن جاتی اور اُسکے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی نافرمانی کا خطرہ نہ گزرتا۔ لیکن ان کے دل پتھر سے زیادہ سخت ہوگئے تھے۔ پتھر میں سختی ہوتے ہوئے بھی اُس سے مخلوق خدا کو بہت سے فائدے ہیں مگر ان کی زندگی میں سوائے خسارہ اور نقصان کے کچھ باقی نہ رہا۔ قرآن حکیم نے اس واقعہ کے بعد ان کے قلوب کی حالت کو اِن الفاظ سے تعبیر کیا ہے :۔

> اسکے بعد ان کے دل سخت ہوگئے گویا کہ وہ پتھر ہیں یا پتھر سے
> زیادہ سخت، (کیونکہ) بعض پتھروں سے پانی نکل کر نہریں بہتی ہیں اور کوئی
> پتھر اِن میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ پھٹ جاتا ہے اور اس میں سے پانی نکلتا ہے،
> اور کوئی اِن میں سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ کی ہیبت سے نیچے آگرتا ہے،
> اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اُس سے بے خبر نہیں۔ (بقرہ آیت ۷۴)

مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے قلوب کی سختی اور حق کے قبول کرنے میں بے اثری کا یہ عالم ہے کہ اگر محاورہ اور بول چال کے مطابق یوں کہا جائے کہ اُن کا دل پتھر

کی چٹان بن گیا ہے تب بھی اُسکی شدت وصلابت کی صحیح تصویر نہیں بنتی اس لئے کہ پتھر اگرچہ سخت ترین ہے مگر ناکارہ نہیں کیونکہ ہم پہاڑوں کا مشاہدہ کرتے ہیں ان ہی سخت چٹانوں سے دریا بہہ رہے ہیں اور اُن سے شیریں وٹھنڈے پانی کے چشمے جاری ہیں، اور اگر اِن پہاڑوں میں کوئی زلزلہ آجائے یا اللہ کی مشیت کا کوئی اور فیصلہ ہوجائے تو پہاڑوں کی یہ بلند و بالا چٹانیں روئی کے گالوں کی طرح اُڑکر سرنگوں ہوجاتی ہیں۔ اور اللہ کے خوف وخشیت کا زبانِ حال سے اعتراف کرتی ہیں، مگر قوم بنی اسرائیل پر نہ آیت اللہ کا اثر ہوتا ہے نہ پیغمبر کی سراپا خیر ونصیحت کا اور نہ نافرمانی کرتے وقت اللہ کا خوف اُن کے دلوں پر طاری ہوتا ہے۔

اہل سنت کا ایک گروہ کہتا ہے کہ خشیتِ الٰہی کا یہ اثر پتھروں میں اپنے حقیقی ولفظی معنوں میں ہے۔

یعنی بعض پتھروں میں گداز کا جُزء ہوتا ہے گو اُن کے مرتبۂ جمادیت کے مطابق سہی اور ان میں فہم وادراک کی قوتیں ہوتی ہیں گو مجری سطح کے مطابق ہی۔ جیسے طور کہ آخر پہاڑ ہی تھا لیکن تجلّی الٰہی کے وقت جلالتِ ربّانی سے چورچور ہوگیا۔ قرآن حکیم اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے :۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ
وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ

(اسراء آیت ۴۴)

"اسکی پاکی بیان کررہی ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور وہ سب چیزیں جو اُن کے درمیان ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اُس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کررہی ہو مگر تم اُن کی تسبیح نہیں سمجھتے ہو حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی بُردبار درگزر کرنے والا ہے۔"

ذبح بقرہ کا یہ عجیب وغریب واقعہ قرآن حکیم نے اس طرح بیان کیا ہے۔

قرآنی مضمون

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ

بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ۔ الخ (بقرہ آیات ۶۷ تا ۷۲)

اور وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تمہیں اللہ حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو، وہ بولے آپ ہم سے ہنسی کررہے ہیں؟ موسیٰ نے کہا اللہ مجھے اس سے پناہ میں رکھے کہ میں جاہلوں میں ہو جاؤں۔

وہ بولے ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ گائے کیسی ہو، موسیٰ نے کہا اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو اور نہ بن بیاہی بلکہ دونوں عمروں کے درمیان ہو، سو اب کر ڈالو جو کچھ تمہیں حکم ملا ہے۔

وہ بولے ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ اُس کا رنگ کیسا ہو؟ موسیٰ نے کہا اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے خوب گہرے زرد رنگ کی ہو دیکھنے والوں کو بھی اچھی معلوم ہوتی ہو!

وہ بولے اپنے پروردگار سے ہماری طرف سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ اور کیسی ہو؟ اس لئے کہ گائے میں ہمیں اشتباہ پڑ گیا ہے اور خدا نے چاہا تو ہم ضرور راہ پا جائیں گے۔

موسیٰ نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ گائے محنت کرنے والی نہ ہو جو زمین کو جوتتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہو۔ سالم ہو اس میں کوئی داغ دھبّہ نہ ہو، وہ بولے اب آپ ٹھیک پتہ لائے۔ پھر اُنھوں نے اُسے ذبح کر دیا اور وہ لگتے نہ تھے کہ ایسا کریں گے۔

(اور وہ گائے ایک ایسے نوجوان کی تھی جو اپنی ماں کی بہت خدمت کیا کرتا تھا اس سے وہ گائے خریدی گئی اتنے مال میں جتنا اس کی کھال میں سونا آسکتا تھا۔)

اور وہ وقت یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا پھر تم اس باب میں لڑنے جھگڑنے لگے (یعنی ایک دوسرے پر الزام دینے لگے) اور اللہ تعالیٰ کو ظاہر کرنا تھا جو تم چھپاتے تھے (یعنی قاتل کو ظاہر کرنا تھا)

تو ہم نے کہا کہ اس میت پر اس گائے کا کوئی ٹکڑا مارو، یوں ہی اللہ مردوں کو زندہ کرے گا اور تم کو اپنی نشانیاں دکھائے گا تا کہ تم عقل سے کام لو۔

اسپر بھی تمہارے دل اسکے بعد سخت رہے۔ چنانچہ وہ پتھر جیسے ہیں بلکہ سختی میں اُس سے بھی بڑھکر اور پتھر تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ کی خشیت سے نیچے آگرتا ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے۔"

قارُون

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جن مخالف طاقتوں سے سابقہ پڑا انہیں قارون کا نام بھی شہرت رکھتا ہے۔ قرآن حکیم نے ایک مستقل رکوع میں اس کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اس قصہ کا آغاز ہی اس نسبت سے کیا گیا کہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برادری سے تعلق رکھتا تھا۔

حضرت ابن عباس کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حقیقی چچازاد بھائی تھا (قرطبی)

روح المعانی نے محمد بن اسحاق کی ایک روایت نقل کی ہے کہ قارون توریت کا حافظ اور عالم تھا مگر سامری کی طرح منافق ثابت ہوا، حضرت موسیٰ علیہ السلام جن ستّر افراد کو کلام الٰہی سُنانے کوہ طور پر لے گئے تھے اُن میں یہ بھی شامل تھا۔ جس کا مفصل واقعہ گزشتہ اوراق میں آچکا ہے۔

حضرت عطارؒ سے روایت ہے کہ اسکو حضرت یوسف علیہ السلام کا ایک عظیم الشان مدفون خزانہ مل گیا تھا جسکی وجہ سے دولت کے انبار حاصل ہوگئے تھے اور وہ اپنے مال و دولت کے نشہ میں دوسروں پر ظلم و ستم کیا کرتا تھا، اسکے خزانے اتنے زیادہ تھے کہ ان کی کنجیاں اتنی تعداد میں تھیں کہ ایک طاقتور جماعت بھی اسکو اُٹھائے تو بوجھ سے جُھک جائے، اور ظاہر ہے قفل کی کنجی بہت ہلکے وزن کی ہوتی ہے جسکا اُٹھانا اور پاس رکھنا مشکل نہیں مگر کثرتِ عدد کے سبب اتنی ہوگئیں تھیں کہ ان کا وزن ایک طاقتور جماعت کے لئے بھی بھاری تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قوم نے ایک مرتبہ اسکو نصیحت کی کہ اللہ نے تجھے بے شمار دولت و ثروت بخشی ہے۔ لہٰذا اس کا شکر ادا کر اور مال کا حق زکوٰۃ و صدقات دے کر غرباء و مساکین کی مدد کر، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی لوگوں پر احسان کر، اپنا وہ حصّہ جو تو دنیا سے لے جائے گا فراموش نکر (یعنی صرف کفن) مگر اُسکو یہ نصیحت پسند نہ آئی نہایت متکبرانہ لہجہ میں جواب دیا :۔

"میری یہ دولت و ثروت اللہ کی عطا کردہ نہیں ہے یہ تو میری محنت و قابلیت اور عقل و ہنر کا نتیجہ ہے۔ یہ کوئی فضل و کرم نہیں جو استحقاق کے بجائے احسان کے طور پر دیا جاتا ہو۔"

اسکے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام اسکو برابر نصیحت کرتے اور راہِ ہدایت کی تلقین کرتے رہے لیکن جب اس نے دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس طرح باز نہیں آتے تو اُن کو اور اُن کی قوم کو مرعوب کرنے کے لئے ایک دن بڑے کرّوفر سے نکلا حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ایک مجمع میں پیغامِ الٰہی سُنا رہے تھے کہ قارون ایک بڑی جماعت اور خاص شان و شوکت اور خزانوں کی نمائش کے ساتھ سامنے سے گزرا۔

بنی اسرائیل نے جب قارون کی اس شان و شوکت کو دیکھا تو اُن میں سے کچھ آدمیوں کے دلوں کو انسانی کمزوری کا یہ جذبہ بے چین کر دیا، ان کی زبانوں سے یہ الفاظ نکل گئے،

"اے کاش! یہ دولت و ثروت، شان و شوکت ہم کو بھی نصیب ہوتی۔"

اسی وقت قوم کے بعض اہل علم افراد نے مداخلت کی اور ان سے کہا،

"خبردار خبردار! اس دنیوی زیب و زینت پر نہ جانا اور اسکے حرص میں نہ گرنا تم عنقریب دیکھو گے کہ اس غرور و نخوت کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ تمہارے لئے ایمان و عمل صالح ہی بہترین ذخیرہ ہیں۔"

قارون کی اس شان و شوکت کا تذکرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان کیا ہے :۔

بنی اسرائیل کا ایک شخص (قارون) اپنے لباس کی شان و شوکت کے ساتھ اکڑتا چلا جا رہا تھا اچانک زمین میں دھنسا دیا گیا اور وہ قیامت

تک اسی طرح دھنستا جائے گا۔ (بخاری)

ابن عباسؓ کی ایک روایت سے اسکے دھنسائے جانے کی یہ کیفیت ملتی ہے :۔

ایک دفعہ قارون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بدنام اور ذلیل کرنے کے لئے ایک بدکار عورت کو کثرت سے مال دیا اور اسکو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ بھرے مجمع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پہ بدکاری کا الزام لگائے۔ اس بدکار عورت نے ایسا ہی کیا جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک مجمع کو خطاب کر رہے تھے، اس الزام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام مجمع سے علیحدہ ہوئے دو رکعت نماز پڑھی اس کے بعد اُس عورت کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا اے عورت تو اس بات پر اللہ کی قسم کھا اور اللہ سے ڈر۔ عورت پر اس خطاب سے کچھ ایسی ہیبت طاری ہوگئی کہ اُس نے اعتراف کیا کہ قارون نے اسکو اس بات پر آمادہ کیا ہے اور اب وہ اللہ کی جناب میں توبہ کرتی ہے۔ اسپر حضرت موسیٰ علیہ السلام سجدہ ریز ہوگئے اور بارگاہِ الٰہی میں فریاد کی، اللہ نے وحی بھیجی کہ اے موسیٰ میں نے زمین کو حکم دیا ہے کہ وہ آپ کی اطاعت کرے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے زمین کو حکم دیا کہ وہ قارون اور اسکے سازوسامان کو نگل لے، زمین نے نگلنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ اور اُس کا مکان زمین میں دھنس گیا۔ (قصص الانبیاء، ابن کثیر)

یہ سارا واقعہ بنی اسرائیل کی آنکھوں کے سامنے ہوا اسپر جن لوگوں نے کل تک حسرت و تمنا ظاہر کی تھیں اُن لوگوں نے اس ہولناک منظر کو دیکھ کر توبہ کی کہنے لگے اے بربادی اگر ہم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو ہم بھی ایسے ہی دھنسائے جاتے اور بیشک ناشکری کرنے والے فلاح نہیں پاتے۔

قارون کا یہ واقعہ قرآن حکیم کی اِن آیات میں موجود ہے :۔

قرآنی مضمون

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۔۲۰۔۲۔

(قصص آیات ۷۶ تا ۸۲)

یہ ایک واقعہ ہے کہ قارون موسیٰ کی قوم کا ایک شخص تھا پھر اُن پر تکبر کرنے لگا اور ہم نے اسکو اس قدر خزانے دیے تھے کہ اُن کی کنجیاں کئی کئی زور آور شخصوں کو گرانبار کر دیتی تھیں، جبکہ اُسکو اسکی برادری نے کہا تو اس مال پر نہ اترا واقعی اللہ تعالےٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ قارون موسیٰ کی قوم کا ایک شخص تھا پھر اُن پر تکبر کرنے لگا اور ہم نے اسکو اس قدر خزانے دیے تھے کہ اُن کی کنجیاں کئی کئی زور آور شخصوں کو گرانبار کر دیتی تھیں، جبکہ اُسکو اسکی برادری نے کہا تو اس مال پر نہ اترا واقعی اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

تجھ کو اللہ نے جتنا دے رکھا ہے اس میں عالم آخرت کی بھی جستجو کیا کر اور دنیا سے اپنا حصہ فراموش نہ کر اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی بندوں کے ساتھ احسان کیا کر اور دنیا میں فساد کا خواہاں نہ ہو بیشک اللہ تعالیٰ اہل فساد کو پسند نہیں کرتا۔

قارون کہنے لگا کہ مجھ کو یہ سب کچھ میری ذاتی ہنرمندی سے ملا ہے، کیا اُس (قارون) نے یہ نہ جانا کہ اللہ تعالےٰ اس سے پہلے امتوں میں ایسے ایسوں کو ہلاک کر چکا ہے جو قوت میں اس سے بھی کہیں بڑھے ہوئے تھے اور مجمع بھی اُن کا اس سے زیادہ تھا اور مجرموں سے تو اُن کے گناہ پوچھے نہیں جاتے (الا توبیخاً وتثبیتاً) ایک روز وہ اپنی قوم کے سامنے پورے ٹھاٹھ باٹ سے نکلا، جو لوگ حیاتِ دُنیا کے طالب تھے وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے یہ تو بڑا نصیبے والا ہے۔

اور جو لوگ علم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے افسوس تمہارے حال پر اللہ کا ثواب بہتر ہے اُس شخص کے لئے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور یہ دولت نہیں ملتی سوائے صبر کرنے والوں کو۔

آخر کار ہم نے اسے اور اُسکے گھر کو زمین میں دھنسا دیا پھر کوئی اُسکو حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلہ میں اُسکی مدد کو آتا اور نہ خود وہ اپنی

مدد آپ کرسکا۔

اب وہی لوگ جو کل اُسکی منزلت کی تمنّا کر رہے تھے کہنے لگے افسوس ہم بھول گئے تھے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے اندازہ سے دیتا ہے۔ اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا۔ افسوس ہم کو یاد نہ رہا کہ کافر فلاح نہیں پایا کرتے۔ وہ آخرت کا گھر تو ہم اُن لوگوں کے لئے خاص کر دیتے ہیں جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد چاہتے ہیں۔ اور اچھا انجام تو صرف اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے ہے۔ جو کوئی بھلائی لے کر آئے گا اُس کے لئے اُس سے بہتر بھلائی ہے اور جو بُرائی لے کر آئے تو برائیاں کرنے والوں کو ویسا ہی بدلہ ملے گا جیسے وہ عمل کرتے تھے۔"

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ. اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سَاحِرٌ كَذَّابٌ. (مومن آیت ۲۳، ۲۴)

"اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور کھلی حجت دیکر فرعون اور ہامان اور قارون کے پاس بھیجا تھا۔ پس اِن سب نے کہا کہ یہ تو جادوگر ہے بڑا جھوٹا۔"

وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ. الخ

(عنکبوت آیت ۳۹، ۴۰)

اور قارون اور فرعون اور ہامان کو ہم نے ہلاک کیا اور موسیٰ اُن کے پاس نشانیاں لے کر آئے مگر اُنھوں نے زمین میں اپنی بڑائی کا زعم کیا حالانکہ وہ سبقت لے جانے والے نہ تھے۔

آخر کار ہم نے ہر ایک کو اُسکے گناہ میں پکڑا پھر اُن میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا، اور کسی کو غرق کر دیا

اللہ اُن پر ظلم کرنے والا نہ تھا مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔

بے وفا الزام تراشیاں

بنی اسرائیل روز اوّل ہی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بُت پرستی کی فرمائش، گوسالہ پرستی، قبولِ تورات سے انکار، ارض مقدس میں داخلے سے گُریز، منّ وسلویٰ پر ناشکری۔ یہ اور اس قسم کے تمام واقعات اسکی شہادت دیتے ہیں کہ یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے کس قدر بے وفا ثابت رہے ہیں اسکے علاوہ ذہنی وفکری طور پر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کثرت سے ایذاء دیتے رہے اور گندی تہمتوں سے بھی باز نہ آئے۔ احادیث میں ایسی ایذاء رسانیوں اور تہمتوں کے چند ایک واقعات مذکور ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس اولوالعزم رسول نے اپنی قوم سے کیا کچھ نہیں برداشت کیا ہے۔

> ایک موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کی ایذاء دہی پر اس طرح اظہارِ حقیقت فرماکر تسکین حاصل کی، موسیٰ علیہ السلام پر اللہ کی رحمتیں ہوں ان کو اللہ کی راہ میں اس سے زیادہ ایذاء دی گئی مگر اُنھوں نے صبر کیا۔ (ترمذی، ابوداؤد)

سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو فہمائش کی کہ اے ایمان والو اُن لوگوں جیسے نہ ہونا جنھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو ایذائیں دیں پھر اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو اُن سب باتوں سے بری کر دیا جو وہ کہا کرتے تھے۔

اُن واقعات میں ایک مشہور واقعہ بخاری ومسلم میں مذکور ہے جسکے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

> حضرت موسیٰ علیہ السلام عام نبیوں کی طرح شرم وحیا زیادہ رکھتے تھے حتیٰ کہ وہ اپنے برہنہ بدن کے کسی حصہ پر بھی اپنی نگاہ پڑنے نہیں دیتے تھے اسکے برعکس بنی اسرائیل مجمع عام میں برہنہ ہو کر غسل کرنے کے عادی تھے اس لئے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اکثر وقت تنگ کرتے تھے اور اُن کا مذاق اُڑایا کرتے تھے کبھی کہتے تھے کہ موسیٰ (علیہ السلام)

کے خاص حصۂ جسم پر برص کے داغ ہیں، کبھی کہتے تھے کہ اِن کو اُدرہ
(شرم گاہ کا متورّم ہوجانا) کا مرض ہے یا کوئی اور قسم کا مرض ہے تب ہی تو
چھپ کر علیٰحدہ غسل کرتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام سنتے اور خاموش
رہتے۔ آخر اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی ہوئی کہ اِن کو اُس تہمت سے پاک اور
بری کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام علیٰحدہ آڑ میں
غسل کر رہے تھے اور کپڑے اُتار کر ایک پتھر پر رکھ دیئے تھے۔ پتھر
اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُن کے کپڑے لے بھاگا اور ایسی جگہ جا کر رُکا
جہاں بنی اسرائیل موجود تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام انتہائی گھبراہٹ
اور غصّے کی حالت میں اُس پتھر کے پیچھے یہ کہتے ہوئے دوڑے ثَوْبِیْ
حَجَرْ ثَوْبِیْ حَجَرْ اے پتھر میرے کپڑے! اے پتھر میرے کپڑے! پتھر
جب مجمع کے سامنے ٹھہر گیا تو سب نے اچانک دیکھ لیا کہ حضرت موسیٰ
علیہ السلام پر جو مختلف الزامات لگائے جاتے ہیں وہ سب غلط ہیں
اور وہ ہر عیب سے پاک صاف ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اس
اچانک واقعہ کا ایسا اثر پڑا کہ غصے میں جھنجھلا کر پتھر پر لاٹھی سے ضرب
لگانا شروع کیا جس سے اُس پر نشان پڑ گئے۔ (بخاری کتاب التفسیر)

اس طرح غیر شعوری طور پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صفائی کرا دی اور انھیں اس ذہنی کوفت سے نجات دی جو قوم کی طرف سے مسلسل دی جا رہی تھی۔

ایک[۲] اور واقعہ بھی محدث ابن ابی حاتم نے حضرت علی رضؓ سے روایت کیا ہے کہ:۔

جس زمانے میں بنی اسرائیل وادی تیہ میں مقیّد تھے اُن دنوں
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام پہاڑ (ہور) پر مصروف
عبادت تھے انہی دنوں حضرت ہارون علیہ السلام کا انتقال ہوگیا حضرت
موسیٰ علیہ السلام نے انکی تجہیز و تکفین کی اور نیچے اتر کر قوم کو اطلاع دی۔
بنی اسرائیل نے اسپر یہ مشہور کر دیا کہ موسیٰ نے ہارون کو قتل کر دیا ہے۔
اس تہمت پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سخت صدمہ پہنچا، پھر اللہ تعالیٰ
نے ایک فرشتے کو حکم دیا کہ وہ ہارون علیہ السلام کی نعش کو مجمع میں

پیش کردے جب انھوں نے یہ دیکھا تو اطمینان ہوا کہ واقعی ہارون علیہ السلام
پر قتل کا کوئی نشان نہیں ہے۔"

تورات میں بھی اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔
ایک تیسرا واقعہ حضرت ابن عباسؓ سے کتب تفاسیر میں منقول ہے کہ

جب قارون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت بہت ناگوار گزرنے لگی تو ایک دن اس نے ایک پیشہ ور عورت کو کچھ روپے دیکر اس پر آمادہ کیا کہ جس وقت حضرت موسیٰ وعظ و نصیحت میں مشغول ہوں اس وقت آپ پر الزام لگا نا کہ یہ شخص مجھ سے تعلق رکھتا ہے۔ (نعوذ باللہ)
چنانچہ ایک دن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام وعظ فرما رہے تھے اس بدکار عورت نے آپ پر یہ الزام دھر دیا حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ سنکر سجدہ میں گر پڑے اور پھر سر اٹھا کر اس عورت کی جانب مخاطب ہوئے کہ تو نے جو کچھ ابھی کہا ہے کیا اللہ کی قسم کھا کر کہہ سکتی ہے؟
یہ سنکر عورت پر رعشہ طاری ہوگیا اور اس نے اعتراف کیا کہ قارون نے مجھے روپیہ پیسہ دے کر اس الزام پر آمادہ کیا ہے ورنہ آپ اس سے بری اور پاک ہیں۔
تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قارون کے لئے بددعا کی اور وہ اللہ کے حکم سے زمین میں دھنسا دیا گیا۔"

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ کسی آیت کے شانِ نزول کے لئے کسی ایک واقعہ کا مخصوص ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ شانِ نزول کی اصل حقیقت یہ ہے کہ "زمانۂ نبوت" میں پیش آنے والے وہ تمام واقعات جو کسی آیت کا مصداق بن سکتے ہوں، اس آیت کے لئے یکساں طور پر شانِ نزول کہے جا سکتے ہیں۔ قرآن حکیم نے ایذاءِ بنی اسرائیل کا ایک واقعہ اس طرح بیان کیا ہے جو ایذاء رسانی ہیں تو واضح ہے لیکن "نوعیت ایذاء" میں مجمل ہے اور بقول شاہ ولی اللہؒ ہر واقعہ کا شانِ نزول ہو سکتا ہے۔ وہ عظیم آیت یہ ہے۔

قرآنی مضمون | يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى

فَبَرَّأَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا۔ (احزاب آیت ۶۹)

اے ایمان والو تم اُن بنی اسرائیل کی طرح نہ ہونا جنھوں نے موسیٰ کو ایذا پہنچائی پھر اللہ نے اُن کو اُس بات سے بری کر دیا جو وہ اُنکے متعلق کہا کرتے تھے اور موسیٰ تو اللہ کے ہاں عزت والے ہیں۔"

وَإِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ أَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ۔ الخ (صف آیت ۵)

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا اے قوم تو کس لئے مجھکو ایذا پہنچاتی ہے جبکہ تجھکو معلوم ہے کہ میں تمہاری جانب اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، پھر جب وہ کجی پر اڑ بیٹھے تو اللہ نے بھی اُن کے دلوں پر کجی مسلط کر دی اور اللہ نافرمان قوم کو راہ یاب نہیں کیا کرتا۔

عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں ایک اہم واقعہ اُس ملاقات کا بھی ہے جو اُن کے اور ایک بزرگ (عبد صالح) کے درمیان پیش آیا۔ سورۂ کہف میں اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے اور بخاری ومسلم میں بھی یہ واقعہ تفصیلاً آیا ہے۔

قرآن حکیم نے اس واقعہ میں جس بزرگ کی ملاقات کا ذکر کیا ہے اُن کے نام کی کوئی وضاحت نہیں کی کہ وہ کون بزرگ تھے؟ صرف عبداً من عبادنا کہہ کر ذکر کیا ہے۔ (ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ) احادیث میں خاص طور پر بخاری ومسلم کی روایات میں اس بندے کا نام خِضر بتایا گیا ہے۔ اور عام شہرت بھی اسی نام کی ہے۔ اکثر مفسرین اسی نام سے یہ واقعہ نقل کرتے ہیں۔ بحث یہاں اُن کے نام یا لقب کی نہیں ہے جو بھی نام ہو بہرحال، واقعہ ضرور پیش آیا۔ یہاں بخاری کی روایت کے مطابق اس واقعہ کی تفصیل لکھی جاتی ہے:۔

سعید بن جبیرؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے عرض کیا کہ نوف بکالی (یہودی عالم) کہتا ہے کہ خضر علیہ السلام کے ساتھ جن موسیٰ کا واقعہ پیش آیا وہ مشہور ومعروف موسیٰ علیہ السلام نہیں ہیں بلکہ

اور شخص ہیں جن کا نام بھی موسیٰ تھا۔ کیا یہ بات درست ہے؟

حضرت ابن عباسؓ نے نہایت برہمی لہجہ میں فرمایا اللہ کا دشمن جھوٹ کہتا ہے۔ اسکے بعد فرمایا کہ مجھے حضرت ابیّ بن کعبؓ نے خود یہ حدیث بیان کی ہے کہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل میں وعظ فرما رہے تھے (غالباً وعظ علمی اور تحقیقی قسم کا تھا) کسی نے پوچھا اے موسیٰ اس زمانے میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی جانب اشارہ کرکے کہا کہ "میں ہوں"! اللہ تعالیٰ کو اُنکی یہ بات پسند نہ آئی اور اُن پر اُسی وقت اللہ کی جانب سے عتاب ہوا کہ تمہارا منصب تو یہ تھا کہ اس جواب کو علم الٰہی کے سپرد کرتے اور کہتے "اللہ اعلم" (یعنی اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے یا یہ کہ اللہ زیادہ علم والا ہے) اسکے بعد اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل کی کہ جہاں دو سمندر ملتے ہیں وہاں ہمارا ایک بندہ ہے جو تم بھی زیادہ علم والا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا پروردگار تیرے اُس بندے تک رسائی کا کیا طریقہ ہے تاکہ میں اُس سے ملاقات کروں؟ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اطلاع دی کہ ایک مچھلی اپنے توشہ دان میں رکھ لو اور سفر شروع کردو جہاں یہ مچھلی گُم ہوجائے اُسی جگہ وہ شخص ملیگا۔ (بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ بھُنی ہوئی مچھلی تھی اور بعض نے کہا کہ زندہ مچھلی تھی)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مچھلی اپنے توشہ دان میں رکھ لی اور اپنے ایک شاگرد کو جن کا نام یوشع بن نون تھا رفیق سفر بنایا اور اُس مردِ صالح کی تلاش میں روانہ ہوگئے (مجمع البحرین دو سمندروں کا سنگم جس کی نشان دہی کی گئی تھی کہاں تھے اور اِن سے کون سے دریا مراد ہیں قرآن حکیم اور احادیث صحیحہ میں کوئی وضاحت نہیں ملتی قیاس کا تقاضہ یہی ہے کہ یہ اُس زمانے میں کوئی مشہور و معروف سنگم رہا ہو جسکے لئے نام ا[illegible]

محل وقوع کی صراحت نہ سمجھی گئی ہو، واللہ اعلم۔ بعض مفسرین نے بحر روم اور بحر قلزم کا سنگم مراد لیا ہے اور یہ بھی قرین قیاس ہے کہ سوڈان کے پایۂ تخت خرطوم کے قریب بحر الابیض اور بحر الازرق مراد ہوں جیسا کہ بعض کا خیال ہے) یہ سفر سمندر کے کنارے کنارے تھا۔ الغرض سفر کرتے کرتے ایک مقام پر پہنچے یہاں آرام لینے کی خاطر کچھ دیر کے لئے ایک چٹان پر دونوں سو گئے۔

یوشع بن نون نے دیکھا کہ توشہ دان کی مچھلی میں اچانک حرکت پیدا ہوئی اور وہ زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی، مچھلی پانی کے جس حصے پر بہتی ہوئی گئی اور جہاں تک گئی وہاں پانی کے اندر ایک لکیر جیسی بن گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمندر میں ایک سرنگ سی بن گئی (یہ واقعہ حضرت یوشع کے لئے حیرت انگیز ضرور تھا لیکن کوئی نیا یا پہلا قسم کا نہ تھا کیونکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کثرت سے معجزات کا مشاہدہ کرتے رہتے تھے) جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے سفر کی تیاری میں اس واقعہ کو بیان کرنا بھول گئے اور جیسا کہ قرآن حکیم کی تصریح ہے اس بات کو یاد دلانا شیطان نے بھلا دیا۔ اس طرح آگے سفر جاری رہا ایک دن رات مسلسل چلتے رہے دوسرے دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ آج غیر معمولی تھکن اور پستی محسوس ہو رہی ہے اچھا وہ مچھلی لاؤ تا کہ بھوک رفع کریں۔؟

اس موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کی بتائی ہوئی منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کوئی تھکان نہیں ہوا تھا مگر منزل سے آگے غلطی سے نکل گئے تو اب تھکان بھی محسوس ہونے لگا، یوشع بن نون نے کہا ہاں مجھے کہنا یاد نہ رہا جس وقت ہم پتھر کی چٹان پر تھے وہیں مچھلی کا یہ تعجب خیز واقعہ پیش آیا اس میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ توشہ دان سے نکل کر سمندر میں چلی گئی اور اس کی رفتار پر سمندر میں بھی راستہ بنتا چلا گیا۔ واقعی شیطان نے یہ بات آپ سے

ذکر کرنا بھلا دیا۔ اسپر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا جس مقام کی تلاش ہم کو ہے وہ وہی مقام تھا یہ کہہ کر پھر دونوں نشاناتِ قدم پر واپس لوٹے اور اُس چٹان تک جا پہنچے، وہاں دیکھا کہ عمدہ لباس میں ایک آدمی بیٹھا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُنھیں سلام کیا۔ اُس شخص نے کہا تمہاری سرزمین میں سلام کہاں؟ (یعنی اس سرزمین میں تو مسلمان نہیں رہتے)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ خضر علیہ السلام تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا میرا نام موسیٰ ہے۔ خضر علیہ السلام نے پوچھا موسیٰ بنی اسرائیل؟ حضرت موسیٰ نے کہا ہاں، میں آپ سے وہ علم حاصل کرنے آیا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے صرف آپ ہی کو عنایت کیا ہے!

خضر علیہ السلام نے فرمایا تم میرے ساتھ رہ کر اُن معاملات پر صبر نکر سکوگے جو میرے ساتھ پیش آتے ہیں۔ اے موسیٰ! اللہ تعالیٰ نے مجھکو ایسی مخفی چیزوں کا علم عطا کیا ہے جو تم کو نہیں دیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا انشاء اللہ آپ مجھکو صبر کرنے والا ضبط کرنے والا پائیں گے۔ اور میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہ کروں گا۔

حضرت خضر علیہ السلام نے کہا تو پھر شرط یہ رہے گی کہ جب آپ میرے ساتھ رہیں تو کسی معاملہ کے متعلق بھی جسکو آپ کی نگاہیں دیکھ رہی ہوں مجھ سے کوئی سوال نہ کریں، میں خود آپ کو اُسکی حقیقت بتادوں گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ شرط منظور کرلی اور دونوں ایک جانب روانہ ہوگئے (یہاں اسکی صراحت نہیں ملتی کہ یوشع بن نون بھی ساتھ رہے یا انھیں واپس کر دیا گیا) جب سمندر کے ایک کنارے پہنچے تو سامنے ایک کشتی نظر آئی حضرت خضر علیہ السلام نے ملاّحوں سے کرایہ پوچھا وہ لوگ غالباً خضر علیہ السلام کو جانتے تھے لہذا کرایہ لینے سے انکار کیا اور اصرار کرکے دونوں کو کشتی پر سوار کرلیا اور کشتی روانہ ہوگئی۔

ابھی کچھ دُور بھی نہ چلے تھے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کا ایک تختہ اُکھاڑ کر کشتی میں سوراخ کر دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ضبط نہ ہو سکا کہنے لگے جناب کشتی والوں نے تو ہم پر احسان کیا اور ہمیں مفت سوار کر لیا اور آپ نے اِس کا یہ بدلہ دیا کہ اُن کی کشتی خراب کر دی؟ اس طرح تو سب لوگ ڈوب جائیں گے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا میں تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میری باتوں پر صبر نہ کر سکیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا مجھ سے بھول ہو گئی براہِ کرم آپ اس پر گرفت نہ کریں اور میرے معاملہ میں سخت گیری سے کام نہ لیں۔

اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ پہلا سوال حقیقتاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھول کی وجہ سے تھا۔ اس اثنا میں ایک چڑیا کشتی کے کنارے آ بیٹھی اور سمندر سے ایک قطرہ پانی پی لیا، حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مخاطب ہو کر فرمایا، اے موسیٰ علم الٰہی کے مقابلہ میں میرا اور آپ کا علم اس قدر بے حقیقت ہے جیسا کہ سمندر کے سامنے یہ قطرہ۔

الغرض کشتی کنارے لگی دونوں حضرات اُتر کر ایک جانب روانہ ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پیچھے پیچھے چل رہے تھے کچھ دُور چند بچے کھیلتے نظر آئے، حضرت خضر علیہ السلام اُن کی جانب بڑھے اور ایک بچے کو قتل کر دیا۔ اس اچانک اور غیر متوقع بلاوجہ قتل پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قطعاً ضبط نہ ہو سکا کہنے لگے حضرت آپ نے یہ کیا کیا؟ ایک بے گناہ معصوم جان کو یوں ہی قتل کر دیا؟ یہ تو بہت بُرا کام کیا۔

حضرت خضر علیہ السلام نے کہا میں نے تو شروع ہی میں کہہ دیا تھا کہ آپ میرے ساتھ رہ کر صبر و ضبط سے کام نہ لے سکیں گے۔ اس موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چونکہ یہ بات پہلی بات سے بھی سخت تر تھی اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام ضبط نہ کرنے میں معذور تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا خیر اس مرتبہ اور نظر انداز

کر دیجئے. اسکے بعد اگر میں کوئی سوال کروں تو پھر عذر خواہی کا کوئی موقع نہیں رہے گا اور اسکے بعد آپ کو اختیار رہوگا کہ مجھے جُدا کر دیں.

اس طرح حضرت خضر علیہ السلام نے دوسری مرتبہ بھی درگزر کر دیا اسکے بعد آگے روانہ ہوگئے، یہاں تک کہ ایک بستی پر گزر ہوا جہاں کے باشندے خوشحال معلوم ہورہے تھے دونوں مسافر بزرگوں نے ان لوگوں سے مہمان داری کی درخواست کی لیکن یہ اسقدر بخیل ثابت ہوئے کہ ایک وقت کی ضیافت کا بھی انتظام نہ کیا اور صاف انکار کر دیا. حضرت خضر علیہ السلام آگے جانے کے لئے چل پڑے ابھی اسی بستی سے گزر رہے تھے کہ ایک مکان ایسا بوسیدہ نظر پڑا جسکی دیوار جھکی ہوئی تھی اور وہ گرنے کے قریب تھا حضرت خضر علیہ السلام نے اسکی مرمت کردی اور اسکو درست کر دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بے ساختہ پھر ٹوک دیا اور کہنے لگے جناب ہم اس بستی میں بھوکے پیاسے مسافرانہ حالت میں پہنچے مگر ان ناقدر شناسوں نے نہ ہماری مہمان داری کی نہ رہنے کو جگہ دی اور آپ نے مفت میں ایک شخص کے مکان کو درست کر دیا، اگر کرنا ہی تھا تو کچھ اُجرت لے لیتے؛ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا بس اب میری اور آپکی جدائی کا وقت آگیا لہذا اب آپ کا میرے ساتھ رہنا ممکن نہیں. خدا حافظ.

اسکے بعد حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رخصت کرتے وقت اُن تینوں معاملات کی حقیقت بیان کی اور سمجھایا کہ یہ سب باتیں اللہ کی طرف سے تھیں جن پر آپ صبر نہ کر سکے.

یہ واقعہ نقل فرما کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارا تو جی یہ چاہتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تھوڑا اور صبر کرتے تو ہم کو اللہ تعالیٰ کے رُموز و اسرار کی مزید معلومات حاصل ہوتیں.

الغرض ان تینوں واقعات کی حقیقت حضرت خضر علیہ السلام نے جو بیان کی ہے وہ درج ذیل ہے :-

(۱) جس کشتی کو خراب کیا گیا دراصل یہ کشتی چند ایسے غریبوں کی تھی جن کے متعلق مشہور اسرائیلی عالم کعب احبارؒ نے لکھا ہے کہ وہ جملہ دسؔ بھائی تھے جن میں پانچ اپاہج اور معذور تھے بقیہ پانچ بھائی محنت مزدوری کر کے اپنے اور پانچ معذور بھائیوں کی روزی کا انتظام کرتے تھے۔ ان کی مزدوری یہ تھی کہ دریا میں کشتی چلاتے تھے اور اس کا کرایہ حاصل کرتے تھے۔

امام بغویؒ نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ یہ کشتی جس سمت جا رہی تھی وہاں ایک ظالم بادشاہ کی حکمرانی تھی وہ ہر اچھی اور نئی کشتی کو زبردستی چھین لیا کرتا تھا، حضرت خضر علیہ السلام نے اسکے تحفظ کے لئے کشتی کو عیب دار بنا دیا تاکہ وہ ظالم بادشاہ اسپر توجہ نہ کرے اور یہ غریب و شریف لوگ اس مصیبت سے محفوظ ہو جائیں۔ چنانچہ آگے چل کر ایسا ہی واقعہ پیش آیا اور یہ کشتی چھوڑ دی گئی۔

(۲) اور وہ لڑکا جس کو قتل کیا گیا تھا اسکی حقیقت یہ ہے کہ اس لڑکے کی طبیعت میں کفر و سرکشی اور والدین کے خلاف بغاوت تھی اور علم الٰہی میں یہ طے تھا کہ اگر یہ بالغ ہوگا تو کافر ہوگا جس سے دوسرے انسانوں کو بھی گمراہ کرے گا اور والدین کے لئے بھی مصیبت بن جائیگا، اس لڑکے کے والدین نیک اور بزرگ انسان تھے اور اللہ کو یہ منظور تھا کہ یہ لڑکے کی مصیبت سے محفوظ رہیں اس لئے اِسکو بالغ ہونے سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا۔

ابن ابی شیبہؒ اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے ایک روایت نقل کی ہے کہ مقتول لڑکے کے والدین کو اللہ تعالٰی نے اسکے بدلہ ایک لڑکی عطا کی جس کے بطن سے ایک نبی پیدا ہوئے اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق اس لڑکی کے بطن سے دوؔ نبی پیدا ہوئے اور بعض دیگر روایات میں یہ وضاحت بھی آئی ہے کہ اس لڑکی

کے بطن سے پیدا ہونے والے نبی علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی امت کو ہدایت دی۔ (تفسیر مظہری و قرطبی)

(۳) اور جس گرتی دیوار کو درست کر کے سیدھا کر دیا گیا اُس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ اللہ کے ایک مقبول بندے کا مکان تھا جسکے دو چھوٹے بچے تھے اس نے مرنے سے پہلے اپنے اِن بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک خزانہ دیوار کے نیچے دفن کر دیا تھا۔ ترمذی اور حاکم میں ایک روایت درج ہے۔ حضرت ابوالدرداء رضی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ وہ سونے اور چاندی کا ذخیرہ تھا۔ اور اس نیک بندے کی نیت یہ تھی کہ جب یہ بچے بڑے ہو کر اپنا مکان درست کریں گے انھیں یہ خزانہ مل جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے مقبول بندے کی نیت کے مطابق اِن یتیم بچوں کے لئے مدفون خزانے کی حفاظت کا اس طرح انتظام فرمایا کہ اُس گرتے مکان کو کچھ عرصہ کے لئے مضبوط کر دیا، اسکے لئے حضرت خضر علیہ السلام سے اُس کی مرمت کرا دی۔ انتہیٰ

محمد بن منکدرؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک نیک بندے کی نیکی و صلاحیت کی وجہ سے اُس کی اولاد اور اولاد کی اولاد اور اُسکے خاندان کی اور اُس کے آس پاس کے مکانات کی بھی حفاظت فرماتے ہیں۔ (مظہری)

مشہور صوفی حضرت شبلیؒ (ایک دفعہ اپنی غیر اختیاری حالت میں) نے فرمایا تھا کہ میں اس شہر اور پورے علاقے کے لئے اللہ کی امان ہوں، جب اُن کی وفات ہوگئی تدفین کے کچھ دیر بعد کفّارِ دیلم نے دریائے دجلہ کو عبور کر کے بغداد پر قبضہ کر لیا، اس وقت عام لوگوں کی زبان پر یہ کلمہ تھا کہ ہم پر دُوہری مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔ یعنی حضرت شبلیؒ کی موت اور کفار کا قبضہ۔ (قرطبی ج ۱۱ صفحہ ۳۹)

الغرض یہ حقائق ہیں جو اِن واقعات میں پوشیدہ تھے جس کا علم سوائے اللہ کے اور کسی

کو ممکن نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کو اِن حقائق پر بذریعہ وحی مطلع فرما دیا جسکو انھوں نے اللہ کے حکم و منشاء کے مطابق انجام دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا یہ مفصل تذکرہ قرآن حکیم کی آیات ذیل میں موجود ہے:-

قرآنی مضمون

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا۔ الخ (کہف آیات ۶۰ تا ۸۲)

(ذرا ان کو وہ قصہ سناؤ جو موسیٰ کو پیش آیا تھا) جبکہ موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر پہنچ نہ جاؤں یا پھر ایک زمانے تک چلتا ہی رہوں گا۔

پس جب وہ دونوں اُن کے سنگم پر پہنچے تو اپنی مچھلی کو وہ بھول گئے اور مچھلی نے دریا میں اپنی راہ لی اور چل دی۔ پھر جب دونوں آگے بڑھ گئے (اور دور نکل گئے) تو موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا کہ ہمارا ناشتہ تو لاؤ ہم کو تو اس سفر میں بڑی تکلیف پہنچی ہے۔

خادم نے کہا آپ نے دیکھا یہ کیا ہوا؟ جب ہم اُس چٹان کے پاس ٹھیرے ہوئے تھے اس وقت مچھلی کا خیال نہ رہا اور شیطان نے مجھ کو ایسا غافل کر دیا کہ میں اِس کا ذکر آپ سے کرنا بھول گیا، مچھلی تو عجیب طریقے سے نکل کر دریا میں چلی گئی۔

موسیٰ نے کہا اسی جگہ کی تو ہمیں تلاش تھی چنانچہ وہ دونوں اپنے نقش قدم پر پھر واپس ہوئے اور وہاں اُنھوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا کیا تھا۔

موسیٰ نے اُس بندے سے کہا کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں؟ تاکہ آپ مجھے بھی اُس مفید علم کی تعلیم دیں جو آپ کو سکھائی گئی ہے۔

اُس بندے نے جواب دیا آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکتے۔ اور جس چیز کا علم آپ کو نہ ہو آخر آپ اس پر صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں۔

موسیٰ نے کہا انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں کسی معاملہ میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا۔

اُس بندے نے کہا اچھا اگر آپ میرے ساتھ چلتے ہیں تو مجھ سے کوئی بات نہ پوچھیں جب تک میں خود اُس کا آپ سے ذکر نہ کر دوں۔

پس وہ دونوں روانہ ہوئے یہاں تک کہ جب وہ ایک کشتی میں سوار ہوئے تو اُس بندے نے اُس کشتی میں شگاف ڈال دیا، موسیٰ نے کہا آپ نے اسمیں شگاف ڈال دیا تاکہ سب کشتی والوں کو ڈبو دیں؟ یہ تو آپ نے ایک سخت حرکت کر ڈالی؛

اُس بندے نے کہا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے۔

موسیٰ نے کہا آپ میری بھول چوک پر گرفت نہ کیجئے اور نہ میرے معاملہ میں سختی سے کام لیجئے۔

پھر وہ دونوں آگے چلے یہاں تک کہ اُنکو ایک لڑکا ملا اُس بندے نے اس لڑکے کو اچانک قتل کر دیا۔

موسیٰ نے کہا آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی حالانکہ اُس نے کسی کا خون نہیں کیا تھا یہ کام تو آپ نے بہت ہی بُرا کیا؟

اُس بندے نے کہا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکو گے؟

موسیٰ نے کہا اس کے بعد اگر میں آپ سے کچھ پوچھوں تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں، اب تو آپ کو میری جانب سے عذر مل گیا ہے۔

پھر وہ دونوں آگے چلے یہاں تک کہ ایک بستی میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں سے کھانا طلب کیا مگر اُن لوگوں نے ضیافت سے انکار کر دیا، پھر وہاں انھوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی۔ اُس بندے

نے اس دیوار کو پھر قائم کر دیا، موسیٰ نے کہا اگر آپ چاہتے تو اس کام کی اُجرت لے سکتے تھے.

اُس بندے نے کہا بس یہ وقت ہماری اور آپکی علیحدگی کا ہے اب میں اُن واقعات کی حقیقت بتلائے دیتا ہوں جن پر آپ سے صبر نہ ہوسکا.

اُس کشتی کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ چند غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے میں نے چاہا کہ اُسے عیب دار کر دوں کیونکہ آگے ایک ایسے بادشاہ کا علاقہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا.

رہا وہ لڑکا تو اُس کے والدین مؤمن تھے ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ لڑکا اپنی سرکشی اور کفر سے اُن کو تنگ کرے گا. اس لئے ہم نے چاہا کہ اُنکا رب اُسکے بدلے اُن کو ایسی اولاد دے جو اخلاق میں بھی اُس سے بہتر ہو اور جس سے صلہ رحمی بھی زیادہ متوقع ہو.

اب اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں. اس دیوار کے نیچے ان بچوں کے لئے ایک خزانہ مدفون ہے اور اُن کا باپ ایک نیک آدمی تھا اس لئے تمہارے رب نے چاہا کہ یہ دونوں بچے بالغ ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں، یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا ہے. اور میں نے اپنے اختیار سے کچھ بھی نہیں کیا ہے. یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر آپ صبر نہ کر سکے.

وفات موسیٰ علیہ السلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ساری زندگی اپنی قوم کے ساتھ بڑے صبر آزما حالات و واقعات میں بسر ہوئی حتیٰ کہ موت بھی غربت و مسافرت کی حالت میں جبکہ قوم کے ساتھ وادی تیہ میں مقیم تھے پیش آئی. حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک اولوالعزم رسول کی طرح رشد وہدایت میں مشغول رہے اور ہر قسم کی ایذاء برداشت کی.

بخاری و مسلم میں ایک روایت حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے وہ فرماتے

ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ السلام نے مالِ غنیمت میں سے کچھ مال لوگوں میں تقسیم فرمایا تھا۔ ایک شخص (منافق) کہنے لگا کہ اس تقسیم میں اللہ کی رضاجوئی کا لحاظ نہ رکھا گیا، کسی مسلمان نے یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کردی تو آپ کا چہرہ مبارک غصے و غضب سے سرخ ہوگیا ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالےٰ موسیٰ پر رحم فرمائے اُن کو اس سے بھی زیادہ اذیت پہنچائی گئی اور اُنھوں نے صبر کیا، باوجود قوم کی مسلسل عہد شکنی اور شرارت کے آخر وقت تک نصیحت و خیر خواہی جاری رکھی اور اُن کی اصلاح میں مشغول رہے یہاں تک کہ زندگی کا آخری وقت آگیا اور اسی وادی تیہ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

بخاری و مسلم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا تذکرہ اس طرح ملتا ہے:

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آیا تو اُن کے پاس فرشتہ حاضر ہوا (یہاں یہ بات خاص طور پر ملحوظ رکھنی چاہئے کہ موت کے وقت انبیاء کرام کے بارے میں اللہ کا قانون عام انسانوں سے مختلف ہوتا ہے نبی کی وفات سے قبل ان کو اسکی اطلاع دی جاتی ہے اور انکی رضامندی حاصل کی جاتی ہے) فرشتۂ موت نے حضرت موسیٰ سے کہا أَجِبْ رَبَّكَ اپنے پروردگار کی جانب سے پیغامِ اَجل قبول کیجئے (چونکہ فرشتہ انسانی شکل میں تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام جان نہ سکے) اور اسکے ایک طمانچہ رسید کردیا جس سے اُسکی آنکھ پھوٹ گئی، وہ فوری روانہ ہوگیا اور بارگاہِ الٰہی میں شکایت کی کہ تیرا بندہ موت نہیں چاہتا، اور یہ کہ اُس نے طمانچہ رسید کردیا ہے۔ اللہ تعالےٰ کی جانب سے اسکی آنکھ درست کردی گئی اور حکم دیا گیا کہ موسیٰ کے پاس پھر جاؤ اور کہو کہ یہ اللہ کا ارشاد ہے کہ اگر دنیا میں مزید رہنا چاہتے ہو تو کسی بیل کی کمر پر تم اپنا ہاتھ رکھ دو جس قدر بال تمہاری مٹھی میں آجائیں گے ہم ہر بال کے عوض تمہاری حیاتِ دنیوی میں ایک ایک سال کا اضافہ کردیں گے۔

فرشتے نے دوبارہ حاضر ہوکر اللہ تعالیٰ کا پیغام سُنایا، حضرت

موسیٰ علیہ السلام نے دریافت کیا کہ اسکے بعد کیا ہوگا؟ فرشتے نے جواب دیا کہ آخر پھر موت ہوگی۔ تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اگر حیات طویل کے بعد پھر وہی موت ہے تو تاخیر کی کیا ضرورت لقاء رب ہی بہتر ہے۔ دُعا کی اے اللہ اس آخری وقت مجھکو ارض مقدس سے قریب کردے۔

(اللہ نے حضرت موسیٰ کی خواہش پوری فرمادی غیبی طور پر اُنھیں ارض مقدس (فلسطین) سے قریب کردیا گیا اور کثیب احمر (سرخ ٹیلہ) کے قریب موت آئی اور وہیں دفن کئے گئے)

مشہور مؤرخ ضیاء مقدسی کہتے ہیں کہ مقام اریحاء میں سرخ ٹیلہ کے قریب ایک قبر ہے جسکو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر بتایا جاتا ہے دوسرے تاریخی اقوال کے مقابلہ میں یہ قول زیادہ قرین قیاس ہے اسلئے کہ وادی تیہ کے سب سے قریب وادی مقدس کا علاقہ اریحاء کی بستی ہے اور اسی جگہ وہ کثیب احمر واقع ہے جسکا ذکر حدیث میں آیا ہے۔

(فتح الباری ج ۶ صفحہ ۳۴۳)

ایک عمدہ تشریح

وفاتِ موسیٰ علیہ السلام کا جو واقعہ بخاری ومسلم میں موجود ہے اسمیں چند امور وضاحت طلب ہیں۔

یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان اگر نبوت ورسالت جیسے عظیم الشان الٰہی منصب پر بھی فائز ہو تب بھی بشریت سے خارج نہیں ہوتا اور نہ تقاضائے بشریت سے خالی۔ موت اپنی ظاہری شکل میں کسی بھی بشر کو مطلوب نہیں ہوتی بلکہ وہ اس سے گُریز کرتا ہے۔ البتہ جب اللہ تعالےٰ کسی بندے پر موت کی حقیقت منکشف کردیتا ہے تو اُسکے مقرب بندوں کے لئے وہی موت سب سے زیادہ محبوب شئ بن جاتی ہے اور اس کے لئے وہ بیقرار ہوجاتا ہے۔

موت کسی کے نزدیک خواہ محبوب شئ ہو یا غیر محبوب بہرحال ایک نہ ٹلنے والا حکم ہوتا ہے جس سے کسی کو بھی مفر نہیں، اس لئے تمنا یہ نہ ہونی چاہیئے کہ عمر دراز"

حاصل ہوجائے بلکہ یہ آرزو ہونی چاہیئے کہ زندگی کا لمحہ جو بھی میسر ہوجائے وہ پاکی و نیکی میں گزرے تاکہ جب موت آئے تو یہ حقیقی و ابدی زندگی بن جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعۂ موت میں فرشتۂ موت کو طمانچہ رسید کرنا ایک ایسا واقعہ ہے جسکو بخاری و مسلم نے سندِ صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے۔ یہ کوئی امر محال یا ناممکن بات نہیں ہے۔ انبیاء کرام کی سیرتوں میں اس سے بھی عجیب تر واقعات رُونما ہوتے ہیں جنکے بکثرت تذکرے انہی صفحات میں آچکے ہیں۔ گفتگو صرف اسمیں ہونی چاہیئے کہ آیا یہ واقعہ سند صحیح کے ساتھ نقل ہوتا آیا ہے یا نہیں؟ اگر یہ بات ثابت ہے تو پھر روایت کو مِن وعَن طریقہ پر قبول کرنا چاہیے یا اسمیں تاویل و تمثیل کا پہلو اختیار کرنا چاہیے؟ یہ ایک علمی و اصولی بحث ہے۔ بعض اہل علم نے ایسی صورتوں میں تاویل و تمثیل کا پہلو اختیار کیا ہے جیساکہ محدّث ابن قتیبہ رح نے اس واقعہ میں اختیار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موت کا یہ واقعہ حقیقت کے ساتھ وابستہ نہیں ہے بلکہ یہ تخیلی و تمثیلی واقعہ ہے۔ بہرحال ایسے حضرات کا احترام اپنے مقام پر، لیکن اکثر اہل علم جن میں اہل تحقیق کی کثرت ہے پہلے مفہوم کو اختیار کیا ہے۔ کسی واقعہ کا عجیب تر ہونا یا عقل و قیاس سے ماوراء ہونا اسکے قبول یا عدم قبول کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ ثبوت یا عدم ثبوت کا محتاج ہے تو اب حدیث کے الفاظ کی تعبیر اس طرح ہونی چاہیئے ممکن بھی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں فرشتہ پیغامِ اجل لیکر آیا اور یہ تو وہ بشری شکل وصورت میں تھا جیساکہ عام طور پر انبیاء کرام کی زندگیوں میں سابقہ رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس فرشتے کو اس حالت میں اس طرح پہچان نہ سکے جیساکہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام عذاب کے فرشتوں کو ابتداءً نہ پہچان سکے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ ناگوار گزرا کہ ایک اجنبی شخص اچانک اُنکے خلوت کدہ میں گھس آیا اور موت کا پیغام دینے لگا بشری تقاضہ اُبھر آیا طیش میں ایک طمانچہ رسید کردیا۔ چونکہ فرشتہ بھی بشری شکل میں تھا بشری اثرات مرتب ہوگئے اور آنکھ مجروح ہوگئی۔ مگر جس طرح عذاب کے فرشتوں نے آہستہ آہستہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ و حضرت لوط علیہم السلام کو اپنی اصل حقیقت سے آگاہ کردیا تھا، موت کے فرشتے نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگاہ نہ کیا اور فوراً غائب ہوگیا اور بارگاہِ الٰہی میں فریادرس ہوا۔

حدیث کے یہ الفاظ بڑے ہی دلچسپ ہیں:-

اَرْسَلْتَنِیْ اِلیٰ عَبْدٍ لَّا یُرِیْدُ الْمَوْتَ۔ (بخاری)

"اے رب آپ نے مجھے ایسے بندے کی جانب بھیجا جو موت نہیں چاہتا"

پھر اللہ تعالیٰ نے اُس فرشتے کو ملکوتی ہیئت پر واپس کر دیا اور اس طرح وہ اس عیب سے بری ہو گیا جو بشری شکل میں آنکھ مجروح ہونے سے پیدا ہو گیا تھا۔

موت کے فرشتے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیالات سے واقف ہوئے بغیر خود ہی یہ سمجھ لیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام موت کے نام سے خفا ہو گئے اور وہ موت نہیں چاہتے۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتہ کی اس غلط فہمی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جلالتِ شان دونوں کے اظہار کے لئے یہ طریقہ اختیار فرمایا حکم دیا کہ دوبارہ جاؤ اور حضرت موسیٰ کو ہمارا پیغام پہنچاؤ۔

اُدھر فرشتہ پیغام حاصل کر رہا تھا اور اِدھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اجنبی شخص کے غائب ہو جانے پر فوراً یہ محسوس کر لیا کہ درحقیقت یہ معاملہ انسانی معاملات سے جُدا دوسرے عالم کا ہے۔ چنانچہ جب فرشتۂ اجل نے دوبارہ حاضر ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیغامِ الٰہی سنایا تو ان کا لہجہ اور طرزِ گفتگو دوسرا ہو گیا اور پھر انجام کار وہ رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ فصلوات اللہ وسلامہٗ علیہ۔

تورات اور بعض کتب تاریخ کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر شریف ایکسو بیس ۱۲۰ سال ہوئی اور آپ کے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان تقریباً ڈھائی سو سال کا عرصہ رہا ہے۔ واللہ اعلم۔

رُتبہ جسے دُنیا میں خُدا دیتا ہے

گزشتہ صفحات میں تفصیل سے یہ حقیقت بیان ہو چکی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی انبیاء و رُسل کی فہرست میں خصوصی شان رکھتے ہیں جن نبیوں کی زندگی دعوت و تبلیغ میں سرگرم عمل رہی ہے اور جنھوں نے اپنی اپنی قوم سے سخت ترین دُکھ و رنج اُٹھائے ہیں اُن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اسم گرامی بھی سرِ فہرست ہے۔

قرآن کریم اور احادیث صحیحہ میں اُنکی جلالتِ شان وعظمت کا بکثرت ذکر آیا ہے۔ اس حیثیت سے حضرت ختم المرسلین محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو الانبیاء ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے بعد حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا اسم گرامی عام طور پر لیا جاتا ہے۔

قرآن حکیم نے جا بجا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات بیان کئے ہیں۔ تذکرۂ انبیاء میں شاید کسی اور نبی کے واقعات اتنی کثرت سے بار بار دُہرائے گئے ہوں۔ حسب ذیل آیات میں خصوصیت کے ساتھ اُن کی ثنا ومنقبت کا اظہار کیا گیا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مُوسَىٰ إِنَّهُ كَانَ مُخْلَصًا وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا۔ الخ (مریم آیت ۵۱)

اور یاد کرو موسیٰ کو قرآن میں کہ بے شک وہ تھے اللہ کے خاص بندے اور رسول تھے نبی تھے۔ اور ہم نے اُن کو طور کی داہنی جانب سے آواز دی اور اُن کو قریب کر کے اُن سے راز کی گفتگو کی۔ اور ہم نے اپنی عنایت سے اُن کے بھائی ہارون کو نبی بنایا۔

قَالَ يَا مُوسَىٰ إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَاتِي وَبِكَلَامِي۔ (اعراف آیت ۱۴۴)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ بلاشک میں نے تم کو لوگوں پر فضیلت دی اپنی پیغامبری اور اپنی ہمکلامی سے۔

وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا۔ (نساء آیت ۱۶۴)

اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا جیسا کہ حقیقتاً کلام ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ۔ الخ

(صافات آیت ۱۱۴ تا ۱۲۲)

اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ اور ہارون پر احسان کیا۔ اور اُن دونوں کو اور اُن کی قوم کو بڑی مصیبت سے نجات دی۔ اور ہم نے اُن کی مدد کی کہ وہ فرعون اور قوم فرعون پر غالب رہے۔ اور ہم نے اُن دونوں کو روشن کتاب دی۔ اور ہم نے اُن دونوں کو راہِ مستقیم کی ہدایت بخشی۔ اور اُن کا ذکر خیر پچھلے لوگوں میں باقی چھوڑا۔ سلامتی ہو موسیٰ

اور ہارون پر۔

بے شک ہم اسطرح نیکو کاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔ بے شک وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا وَكَانَ عِندَ اللَّهِ وَجِيهًا۔ (احزاب آیت ۶۹)

اے ایمان والو تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہونا جنھوں نے موسیٰ کو ایذا پہنچائی پھر اللہ نے اُن کو اس بات سے بری کر دیا۔ جس کو اُن کی زبانیں کہہ رہی تھیں اور موسیٰ تو اللہ کے نزدیک باعزت تھے۔

بخاری و مسلم کی روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے :۔

مجھکو موسیٰ پر فضیلت نہ دو، اس لئے کہ جب قیامت کے دن لوگوں پر دہشت سے غشی طاری ہو جائیگی تو سب سے پہلا شخص جس کو ہوش آئے گا وہ میں ہوں گا، دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام عرش الٰہی کا پایہ پکڑے کھڑے ہیں، اب میں نہیں کہہ سکتا کہ اِن کو مجھ سے پہلے غشی سے ہوش آیا تھا یا یہ آج مدہوشی سے بری کر دیئے گئے ہیں۔"

ابن کثیرؒ نے اس روایت پر یہ تعلیق کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ازراہِ تواضع وانکسار ہے ورنہ ایک اورحدیث صحیح میں آپؐ کا یہ ارشاد خود نقل کیا گیا ہے :۔

أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ۔ (الحدیث)

"میں کُل اولادِ بنی آدم کا سردار ہوں اور یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں۔"

خود قرآن حکیم میں آپ کو خاتم النبیّن کہا گیا ہے جو آپکی برتری کی واضح دلیل ہے۔ بہرحال مذکورہ بالا احدیث حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جلالت قدر اور عظمت کا اظہار کرتی ہے نیز حدیثِ معراج میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو مکالمات منقول ہیں اُن سے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عظمت وشان کا نمایاں اظہار ہوتا ہے۔ الغرض حضرت موسیٰ علیہ السلام اُن اولوالعزم انبیاء ورسل میں شمار ہوتے ہیں جنکا تذکرہ قرآن حکیم نے نہایت اہتمام کیساتھ کیا ہے اور بار بار یاد کیا ہے۔ جیسا کہ آپنے گزشتہ صفحات میں تفصیل پڑھی ہے۔

فصلوات اللہ وسلامہٗ علیہ۔

نتائج و عبر

رُوحِ تذکرہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام، بنی اسرائیل، فرعون اور قوم فرعون کی یہ طویل تاریخ ایک داستان یا حکایت نہیں ہے بلکہ حق و باطل کا معرکہ، ظلم و انصاف کی جنگ، غلامی و آزادی کی کشمکش، مظلوم کی سربلندی، ظالم و سرکش کی ذلت و پستی، حق کی فتح باطل کی شکست، صبر کا امتحان، ناشکری و بے صبری کا انجام، قوموں کے عروج و زوال کی دستاویز، نبیوں کی دعوت و تبلیغ کی تاریخ اور اُسکے عواقب و نتائج کا مستند ذخیرہ ہے۔

حق کا اعجاز

حق اور سچائی کو جس نے بھی دل سے قبول کر لیا سچائی اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتی اُسکے دل و دماغ پر اسی کا غلبہ ہو جاتا ہے اور اُسکی زبان سے وہی صدائے حق نکلتی ہے جسکو اُس نے کچھ دیر پہلے قبول کیا تھا، یہی حق کا اعجاز ہے اور اُسکی سچی علامت بھی۔

ساحرانِ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ سے پہلے یہ نعرہ بلند کیا تھا:۔

وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُوْنَ۔

(شعراء، آیت ۴۴)

فرعون کے جاہ و جلال کی قسم آج ہم ہی غالب ہوں گے۔

لیکن جب مقابلہ ہوا اور "ساحری کرشمے" تاتار ہو گئے جادوگروں پر اپنی سحری طاقت کی بے بسی کا انکشاف ہوا تو فوری اعتراف کر لیا اور سجدے میں گر پڑے اور دولتِ ایمان سے سرشار ہو کر فرعون کی دھمکی کا اس طرح جواب دیا:۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِیْ

فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ، اِنَّمَا تَقْضِیْ ھٰذِہِ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا
اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا. الآیۃ (طٰہٰ آیت ۷۲)

ساحروں نے کہا ہم یہ کبھی نہیں کر سکتے کہ روشن دلائل سے منھ موڑ کر تیرا حکم مان لیں اور اُس خدا سے جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، جو تو فیصلہ کیا ہے وہ کر گزر، تو زیادہ سے زیادہ جو کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ دنیا کی اس زندگی کا فیصلہ کر دے، ہم تو ایمان لا چکے ہیں۔

صبر کی پُونجی

مشہور مقولہ ہے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ یہ بات حقیقتاً قرآن حکیم کے واقعات سے لی گئی ہے۔ بنی اسرائیل مصر میں عرصہ دراز تک محکومی، بیچارگی، غربت و افلاس میں بسر کرتے رہے، قتلِ اولاد کی مصیبت سے بھی دوچار رہے، عورتوں کی باندیاں بننے کی ذلّت و رسوائی بھی اُٹھاتے رہے، اور خود بھی فرعونیوں کے ظلم و ستم سے عاجز و بے بس ہو گئے، مگر وہ وقت آ ہی گیا جو صبر کا نتیجہ کہلاتا ہے۔ ظلم کو کبھی بھی بقا نہیں رہی مظلوم کی آہ نے اسی دنیا میں ظالم کو مزہ چکھایا ہے۔ فرعون کی تباہی اور اُن کی غرقابی نے اُنھیں ہر قسم کے مصائب سے نجات بخشا۔

قرآن حکیم نے اس حقیقت کو صبر کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ بِمَا
صَبَرُوْا. الآیۃ (اعراف آیت ۱۳۷)

اور بنی اسرائیل پر تیرے رب کا نیک وعدہ پورا ہوا اس وجہ سے کہ انھوں نے صبر کیا۔

باطل کی طاقت کتنی ہی زبردست اور پُرشوکت ہو انجام اس کا نامرادی اور شکست کے سوا کچھ نہیں۔ یہ وعدۂ اللہ ہمیشہ سے جاری رہی ہے کہ جن قوموں کو ذلیل و حقیر سمجھا گیا ایک دن ایسا بھی آیا ہے کہ وہی ضعیف و کمزور قومیں زمین کی وارث بنی ہیں اور حکومت و اقتدار اُنکے ہاتھ میں آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ظالم حکمراں کا اقتدار ناپائیدار رہا ہے۔

کسی قوم پر کافر و ظالم حکمراں کا مسلّط ہونا اُس حکمراں کی عند اللہ مقبولیت کی علامت

نہیں بلکہ وہ ایک طرح کا عذاب ہے جو محکوم قوم کی بدعملیوں کے باعث پاداش عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اَعْمَالُکُمْ عُمَّالُکُمْ (الحدیث)

تمہارے اعمال خود تمہارے حاکم ہوتے ہیں۔

اخلاقی کمزوری

جب فرعون اور اہل فرعون کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی "الٰہا اب انھیں سزا دے یہ کسی طرح راہِ راست پر نہیں آتے۔

عذاب کا سلسلہ شروع ہوا یکے بعد دیگر پانچ عذاب آئے [1] پانی کا طوفان، [2] ٹڈی دل، [3] جوؤں کی کثرت، [4] مینڈک کی کثرت، [5] پانی کا خون ہو جانا۔

ہر عذاب کے وقت فرعون اور اسکی قوم درخواست گزار ہوتی اے موسیٰ اگر یہ عذاب ہم پر سے دفع ہو گیا تو ہم تجھ پر ایمان لے آئیں گے اور جب وہ دفع ہو جاتا پھر وہی تمرد اور سرکشی کرنے لگتے۔ اس طرح ایک مدت تک انھیں مہلت ملتی رہی اور جب کسی طرح باز نہ آئے آخر کار عذاب الٰہی سے غرق کر دیئے گئے۔

یہ ایک انسانی کمزوری ہے جو ازل سے چلی آرہی ہے۔ مصیبت کے وقت انسان پکارنے لگتا ہے کہ اگر یہ ٹل جائے تو وہ پھر اس گناہ کے قریب بھی نہ جائیگا لیکن بہت کم ایسا ہوا ہے کہ انسان اپنے عہد پر قائم رہا ہو، لیکن اسکے باوجود بھی اللہ تعالیٰ کی ڈھیل بڑی دراز ہوتی ہے جس سے انسان دھوکہ میں پڑ جاتا ہے اور جب وہ اُس آخری حد کو پہنچ جاتا ہے جو علم الٰہی میں اُسکی آخری مہلت تھی تو پھر اللہ کی گرفت اُس کا خاتمہ کر دیتی ہے یا پھر اُس نعمت کو ہمیشہ کے لئے چھین لیتی ہے جس کا وہ ناشکر گزار رہا ہے۔ قوم فرعون کی یہ حالت آنے والے انسانوں کے لئے عبرتناک درس ہے۔

عزم وہمت کی موت

مسلمانوں کے لئے "غلامی" یا "محکومانہ زندگی" ایک بڑی لعنت اور عذاب ہے اور اسپر قانع ہو کر مطمئن ہو جانا دراصل عذاب الٰہی اور لعنت الٰہی پر قناعت کر لینے کے مرادف ہے

یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوتِ حق دیتے ہوئے یہ مطالبہ بھی کیا تھا کہ بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے آزاد کر اور اُن کو میرے ساتھ کر دے تاکہ میں انھیں یہاں سے نکال لے جاؤں۔

غلامی اور محکومانہ زندگی کے اثرات بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ اِن میں سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہمت وعزم کی روح پست اور مجروح ہو جاتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہی انسان اس ذلت آمیز زندگی کو نعمت سمجھنے لگتا ہے۔ اس طرح اسکی قوتِ عمل مضمحل ہو جاتی ہے اور وہ قدم قدم پر دوسروں کا سہارا ڈھونڈنے لگتا ہے۔ بنی اسرائیل کی مسلسل غلامانہ زندگی نے انھیں اسقدر پست اور کم ہمت کر دیا تھا کہ اپنے ارضِ مقدس (اصلی وطن) میں داخلہ اور وعدۂ نصرت کے باوجود اُنھوں نے وہ تاریخی جملے کہہ دیئے جو صرف غلام قوم ہی کہہ سکتی ہے:-

فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ.

اے موسیٰ تم اور تمہارا رب دونوں جاکر اُن سے لڑو ہم تو یہیں بیٹھتے ہیں۔

دراصل یہی عزم وہمت کی موت ہے جو اُسی غلامانہ زندگی کا نتیجہ ہے جو محکوم قوموں کا نصیبہ بن جاتی ہے۔

کمالِ دانائی

سورۂ طٰہٰ میں فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مکالمہ اسطرح درج ہے:-

ہم تیرے رب تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی ہے اُس شخص پر جو راہِ راست کی پیروی کرے۔

ہم کو وحی کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اُس کے لئے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔

فرعون نے کہا اچھا تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے؟

موسیٰ نے جواب دیا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُسکی ساخت بخشی ہے پھر اسکو ہدایت کی۔

فرعون نے کہا تو پھر پہلے جو نسلیں گزر چکی ہیں اُن کا کیا

انجام ہوا؟

موسیٰ نے جواب دیا اس کا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتے میں محفوظ ہے۔ میرا رب نہ چوکتا ہے نہ بھولتا ہے۔

(طٰہٰ آیات ۵۱ تا ۵۲)

فرعون کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر بات یہی ہے کہ اُس رب کے سوا کوئی دوسرا رب نہیں تو یہ ہم سب کے باپ دادا جو نسل درنسل دوسرے ارباب کی بندگی کرتے چلے آئے ہیں آخر انکے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ سب گمراہ تھے؟ کیا وہ سب عذاب کے مستحق تھے؟

یہ ایک ایسا جاہلانہ سوال تھا جس کا جواب بر وقت دینا کچھ آسان نہ تھا، اہلِ حق کی تبلیغ کے خلاف یہ ہتھکنڈہ ہمیشہ استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ یہ طرز جاہلوں کو مشتعل کرنے اور اپنے لئے راہ فراہم کرنے کے لئے بڑا مؤثر ثابت ہوا ہے۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے کہ ہاں وہ سب کے سب جاہل گمراہ تھے اور جہنم کا ایندھن ہوں گے تو چاہے یہ حق گوئی کا بڑا زبردست نمونہ ہوتا مگر یہ جواب اپنی حقانیت کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بجائے فرعون کے مقصد کی تقویت کا سبب بن جاتا اور قوم بدک کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کٹ جاتی۔ لیکن آنجناب نے کمال دانائی سے ایسا حکیمانہ جواب دیا جو بجائے خود حق بھی تھا اور فرعون کے جاہلانہ ہتھکنڈے کا جواب بھی۔

فرمایا وہ لوگ جیسے کچھ بھی تھے اپنا کام کر کے اللہ کے ہاں جا چکے ہیں، میرے پاس انکے اعمال اور نیتوں کو جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان کے بارے میں کوئی حکم لگا دوں، ان کا پورا عمل اللہ کے ہاں محفوظ ہے اللہ کی نگاہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں اور نہ وہ کسی بات کو بھولتا ہے۔ اِن کے ساتھ جو بھی معاملہ خدا کو کرنا ہے اُسکو وہی جانتا ہے۔ (طٰہٰ آیت ۶۲)

یہ تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کمالِ دانائی کہ ایک سوالِ جاہلانہ کا ایسا جواب حکیمانہ دیا کہ بجائے خود حق بھی تھا اور ساتھ ساتھ اس نے فرعون کے اُس زہریلے ہتھکنڈے

کو بھی تار تار کر دیا۔ انبیاء کرام کے کلام کا یہی اعجاز ہے جو انھیں اللہ کی جانب سے مہیا کیا جاتا ہے۔

ظلم کی اعانت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے نادانستہ ایک قبطی (فرعونی) کا قتل ہو گیا تھا جسپر اُنھوں نے اپنے رب سے اسطرح معذرت کی تھی:۔

اے میرے رب میں نے اپنے آپ پر ظلم کر ڈالا ہے میری مغفرت فرمادے، اللہ نے ان کو معاف فرمادیا۔ (قصص آیت ۱۶)

(اس معافی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عہد کیا کہ) اے میرے رب یہ احسان جو تو نے مجھ پر کیا ہے اسکے بعد میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا۔ (قصص آیت ۱۷)

یعنی اب میں کسی ظالم کی اعانت نہیں کروں گا اور نہ اُسکی پشت پناہی۔

علماء سلف نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ مسلمانوں کو ظالم کی پشت پناہی یا اعانت سے کامل طور پر اجتناب کرنا چاہیئے ظالم خواہ فرد ہو یا گروہ ہو یا حکومت وسلطنت۔

مشہور تابعی عطاء بن ابی رباحؒ سے کسی نے عرض کیا کہ میرا بھائی بنی اُمیہ کی حکومت میں کوفے کے امیر کا کاتب (سکرٹری) ہے۔ معاملات کے فیصلے کرنا اس کا کام نہیں ہے البتہ جو فیصلے امیر کرتا ہے وہ اس کے قلم سے جاری ہوتے ہیں۔ یہ نوکری وہ نہ کرے تو مفلس ہو جائے گا (مقصد یہ تھا کہ سلاطین بنوامیہ کے امراء عموماً غلط سلط فیصلے کر دیا کرتے تھے اس سے بعض حقداروں کی حق تلفی ہو جایا کرتی تھی) حضرت عطاءؒ نے جواب میں یہی آیت پڑھی جو "عہد موسیٰ" کہلاتی ہے۔ اسکے بعد فرمایا کہ تیرے بھائی کو چاہیئے کہ اپنا قلم پھینک دے رزق دینے والا اللہ ہے۔

اسی طرح ایک اور کاتب نے عامر شعبیؒ سے پوچھا تھا کہ جناب میں احکام لکھ کر جاری کرنے کا ذمہ دار ہوں فیصلے کرنے کا ذمہ دار نہیں ہوں کیا یہ رزق میرے لئے حلال ہے؟

حضرت عامر شعبیؒ نے جواب دیا کہ اگر حاکم نے کسی بے گناہ کے قتل کا فیصلہ کیا ہو یا کسی کا مال ناحق ضبط کیا ہو ؟ یا کسی کے گھر گرانے کا حکم دیا ہو اور وہ تمہارے قلم سے جاری ہو جائے تو کیا یہ درست ہے ؟

اسکے بعد امام موصوف نے مذکورہ بالا آیت پڑھی جسے سنتے ہی کاتب نے کہا میں توبہ کرتا ہوں آج کے بعد میرا قلم امراء بنوامیہ کے احکام جاری کرنے میں استعمال نہ ہوگا۔

اسپر حضرت عامرؒ نے فرمایا پھر اللہ بھی تمہیں رزق سے محروم نہ کرے گا۔

روح المعانی میں ایک اور واقعہ درج ہے کہ امیر عبد الرحمٰن بن مسلم نے حضرت ضحاکؒ کو صرف اس خدمت کے لئے مقرر کرنا چاہا کہ وہ شہر بخارا کے ملازمین کی تنخواہیں جاکر تقسیم کر دیا کریں۔ مگر اُنھوں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ اِن کے دوست نے کہا ضحاک تم کو کیا ہوگیا آخر اسمیں کیا حرج ہے ؟ حضرت ضحاکؒ نے جواب دیا کہ میں ظالموں کے کسی کام میں بھی مددگار بننا نہیں چاہتا۔

امام ابوحنیفہؒ کا یہ واقعہ تو بہت ہی مشہور ہے کہ انھوں نے عباسی دور کے خلیفہ منصور عباسی کے ایک فوجی افسر حسن بن قحطبہؒ کو ملازمت چھوڑ دینے کی تلقین کی تھی جسپر حسنؒ نے یہ کہہ کر استعفےٰ دے دیا تھا کہ امیرالمومنین آج تک میں نے آپ کی حکومت کی حمایت میں جو کچھ بھی کیا ہے یہ اگر اللہ کی راہ میں تھا تو میری نجات کے لئے اتنا کافی ہے لیکن اگر یہ ظلم کی راہ میں صرف ہوا تو میں اپنے نامۂ اعمال میں مزید گناہ کا اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔ یہ کہہ کر ملازمت سے علیحدہ ہوگئے (خلیفہ منصور کے بعض احکام غیر صحیح ہوا کرتے تھے) ظلم کی حمایت خواہ کسی بھی شکل میں ہو آخرت کا بڑا خسارا پیدا کر دیتی ہے۔
اللھم احفظنا منہ۔

حیادار لڑکیاں

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شہر مدین کی جن دو لڑکیوں کی خدمت انجام دی تھی اور پھر اُن لڑکیوں نے اپنے باپ سے سارا واقعہ بیان کیا، بوڑھے باپ نے اپنی لڑکی کو دوبارہ بھیجا کہ اُس اجنبی مسافر کو لے آؤ۔

لڑکی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے بوڑھے باپ کا جو پیغام پہنچایا قرآن حکیم نے اُسکی کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے:۔

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ قَالَتْ اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا۔الخ

(قصص آیت ۲۵)

(کچھ دیر نہ گزری کہ) ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی اُن کے پاس آئی کہنے لگی میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تاکہ آپ کو بدلہ دیں اُس خدمت کا جو آپنے ہماری بکریوں کو سیراب کیا ہے۔

بات شرم و حیا کی اس لئے تھی کہ ایک اجنبی مرد کے پاس اکیلے آئی تھی اگر گھر میں کوئی خادم ہوتا تو اِسکی نوبت ہی نہ آتی۔

حضرت عمرؓ نے اس آیت کی یہ تفسیر بیان کی ہے:۔

جَآءَتْ تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ قَآئِلَةً بِثَوْبِهَا عَلٰى وَجْهِهَا لَيْسَتْ بِسَلْفَعٍ مِّنَ النِّسَآءِ دَلَاجَةً وَّلَاجَةً خَرَّاجَةً۔

(ابن جریر، ابن ابی حاتم)

"وہ شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی اپنا چہرہ گھونگھٹ میں چھپائے ہوئے آئی، اُن بیباک عورتوں کی طرح دندناتے چلی نہیں آئی جو ہر طرف نکل جاتی اور رہر جگہ گھس جاتی ہیں۔"

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حیا داری کا تصور کتنا قدیم اور شرفاء کی خاص علامت رہا ہے۔ صحابہ کرام کے عہد میں بھی یہ تصور جو قرآن حکیم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت سے اِن بزرگوں نے جو سمجھا تھا وہ یہی تھا کہ عورتوں کو اجنبیوں کے سامنے کھلے پھرنا اور گھر سے باہر بے باکانہ چلت پھرت اسلامی حیا داری کے بالکل خلاف ہے۔ حضرت سیدنا عمرؓ اپنے صاف الفاظ میں چہرہ ڈھانکنے کو حیا کی علامت اور اسے اجنبی مردوں کے سامنے کھولنے کو بے حیائی قرار دے رہے ہیں۔

شہر مدین کے سردار حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادیوں کی یہ غیرت

وحیاداری اونچی اونچی شریف زادیوں کے لئے کتنی سبق آموز ہے۔

اسلامی تہذیب اور فقہی نزاکت

حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے ہجرت کر کے جب شہر مدین کے شیخ کبیر کے ہاں مہمان ہوئے، کچھ دن بعد شیخ کبیر (حضرت شعیب علیہ السلام) نے ان کو اپنا داماد بنانا چاہا اور اسکے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اسطرح خطاب کیا:۔

قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ الخ۔

(قصص آیت ۲۷)

باپ نے (موسیٰ سے) کہا میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں بشرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کریں۔

آیتِ بالا کے تحت فقہاء نے لکھا ہے کہ لڑکیوں کے ولی کو چاہیئے کہ اگر کوئی مرد صالح مل جائے تو اس کا انتظار نہ کرے کہ مرد کی طرف سے نکاح کی تحریک ہو بلکہ خود ہی تحریک کر دینا انبیاء کی سنت رہی ہے۔

نیز سیدنا عمرؓ نے اپنی صاحبزادی حضرت حفصہؓ کے بیوہ ہو جانے کے بعد از خود ہی حضرت صدیق اکبرؓ اور اسکے بعد سیدنا عثمان غنیؓ سے اُن کے نکاح کی پیش کش کی تھی۔ پھر بعد میں ہر دو صاحبین کی رائے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد (نکاح) میں آئی۔ (قرطبی)

نیز آیت مذکورہ میں لفظ اُنْكِحَكَ جس کا ترجمہ میں آپ کا نکاح کرنا چاہتا ہوں، فقہاء کرام نے ایک لطیف نکتہ بیان کیا ہے کہ لڑکی کے ولی کو نکاح کی معاملت کرنی چاہیئے، لڑکی خود معاملت نہ کرے، جیساکہ مغربی تہذیب کی لڑکیاں خود اپنا معاملہ طے کر لیتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کہیں کسی ضرورت یا مجبوری سے کسی بالغ لڑکی نے اپنا نکاح خود کر لیا تو آیا وہ نکاح صحیح ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اس مسئلے میں ائمہ فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رح کی تحقیق ہے کہ ایسا نکاح درست ہو جاتا ہے۔

بہر حال آیت سے یہ مسئلہ غیر متعلق ہے۔ لیکن اسلامی تہذیب کی نشان دہی

ضرور ہوتی ہے۔

آخرت کی نعمتیں اور زحمتیں

ایک نادر تفسیر

فرعون اور اہل فرعون کو قرآن حکیم نے "ائمہ جہنم" قرار دیا ہے۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ لَا یُنْصَرُوْنَ۔ (قصص آیت ۴۱)

"اور ہم نے انھیں جہنم کی طرف دعوت دینے والے پیشوا بنادیا
اور قیامت کے روز وہ کہیں سے مدد نہیں پا سکیں گے۔"

فرعون اور اسکے ارکانِ سلطنت تو اپنی دانست میں صلاح و فلاح کی طرف دعوت دے رہے تھے لیکن قرآن حکیم نے انھیں "داعی الی النار" قرار دیا ہے۔

اکثر مفسرین کرام نے آیت میں استعارہ اور مجاز قرار دیا ہے۔ یعنی اَلنَّار سے مراد اعمال کفر و شرک ہیں جن کا نتیجہ جہنم کی آگ (اَلنَّار) ہے، لیکن صوفیہ کے سرخیل محی الدین ابن عربی نے اِس کا ایک معنی خیز مطلب بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ آخرت کی جزا و سزا (نعمتیں اور زحمتیں) حقیقتاً اعمال ہی ہیں۔ انسان جو عمل دنیا میں کرتا ہے یہاں اُس کا کوئی ٹھوس جسم نہیں ہوتا صرف شکل و صورت ہی ہے لیکن یہی شکل و صورت عالم آخرت میں اپنا جسم اختیار کرے گا۔ نیک و صالح اعمال جنت کی نعمتیں بن جائیں گے اور بد اعمال کفر و شرک جہنم کے عذاب بن جائیں گے۔

جنت کی یہ نعمتیں اور جہنم کے یہ عذاب دراصل وہی اعمال ہیں جو دنیا میں انسان نے کئے تھے۔ اسلئے جو شخص اس دُنیا میں کسی کو کفر و شرک کی دعوت دے رہا ہو وہ حقیقتاً نارِ جہنم کی دعوت دے رہا ہے۔ اگرچہ اِس دنیا میں اُسکی شکل آگ کی نہیں ہے مگر اُسکی حقیقت آگ ہی ہے۔

اس تفسیر پر فرعون اور اعیان فرعون کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ "ائمہ جہنم" ہیں حقیقت پر محمول ہے مجاز یا استعارہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم

ابن عربیؒ کی یہ وضاحت قرآن حکیم کی دیگر آیات سے بھی مطابقت رکھتی ہے۔

سورہ کہف کی آیت وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا الآیۃ (۴۹)

اور اُن لوگوں نے جو بھی عمل کیا تھا اسکو آخرت میں موجود پایا۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔ (الزلزال آیت ۶، ۷، ۸)

اُس روز لوگ مختلف جماعتیں ہوکر واپس ہوں گے تاکہ اپنے اعمال کو دیکھ لیں (میدان حشر میں ہر ایک کے اعمال دکھلا دیئے جائینگے) سُو جس شخص نے ذرّہ برابر نیکی کی وہ اُسکو دیکھ لے گا اور جس شخص نے ذرّہ برابر بدی کی وہ اسکو دیکھ لے گا۔

یہ آیات بھی اس حقیقت کی طرف نشان دہی کرتی ہیں کہ آخرت میں دنیا کے اپنے اعمال کو لوگ دیکھ لیں گے۔ یقیناً اِس دنیا میں وہ اعمال اپنا کوئی جسم نہیں رکھتے ہیں لیکن آخرت میں وہ ایسے ہوجائیں گے کہ ہر شخص اپنا عمل خود دیکھ سکے گا۔

فیصلہ کُن بات

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں جب پہلی مرتبہ دعوتِ رسالت لیکر پہنچے ہیں اس وقت اُنھیں دو نشانیاں دی گئیں جنکو قرآنی زبان میں "آیات" اور علم کلام کی زبان میں "معجزات" کہا جاتا ہے۔ یہ دونشانیاں اس بات کے ثبوت میں دی گئیں تھیں کہ وہ اللہ تعالےٰ کے نمائندہ اور فرستادہ ہیں جو کائنات کا خالق اور فرماں روا ہے۔

انبیاء کرام نے جب کبھی اپنے کو ربّ العالمین کا رسول کہہ کر قوم کو دعوت دی ہے تو لوگوں نے ان سے یہی مطالبہ کیا ہے کہ اگر وہ سچے ہوں تو کوئی نشانی پیش کریں۔

فرعون اور اہل فرعون نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہی مطالبہ کیا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسکے لئے دو نشان پیش کئے جس کا تذکرہ اس آیت میں آیا ہے:۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ۔ (اعراف آیت ۱۰۷، ۱۰۸)

پھر موسیٰ نے اپنا عصا ڈال دیا تو وہ یکایک جیتا جاگتا اژدھا

تھا۔ اور اپنی گریباں سے ہاتھ نکالا تو وہ دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا۔"

ایسے نشانات یا معجزات عام قوانینِ فطرت کے خلاف تو ہوتے ہیں لیکن فطرت کے خلاف نہیں ہوتے۔ البتہ خارقِ عادت ہوتی ہیں یعنی عام واقعات سے اس کا تعلق نہیں ہوتا جو لوگ معجزات کے قائل نہیں ہیں اُن کی خدمت میں فیصلہ کُن سوال صرف یہ ہے کہ

اللہ تعالےٰ نظام کائنات کو ایک قانون کے مطابق چلا دینے کے بعد کیا معطل ہو چکا ہے اور کیا اب اس چلتے ہوئے نظام میں کبھی کسی موقع پر کوئی مداخلت یا تبدیلی نہیں کر سکتا؟ اگر اس کا جواب یہ ہو کہ ہاں وہ معطل ہو چکا ہے تو پھر ایسے لوگوں کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ وہ کائنات کے قادرِ مطلق کے علاوہ کس اور خدا کا تصوّر رکھتے ہیں اِن سے ہماری بحث نہیں ہے۔ اور اگر وہ ایک ایسے فعّال، مقتدر، مدبّر اللہ کا اعتقاد رکھتے ہیں جسکا تعارف قرآن حکیم کی بے شمار آیات پیش کرتی ہیں تو پھر اُن کے لئے یہ تسلیم کرنا مشکل نہیں ہے کہ جو اللہ نظام کائنات کو ایک قانون پر چلانے کے بعد ہر آن اُس پر باخبر ہے اور ہر وقت اسکو اختیار حاصل ہے کہ وہ اشیاء کی شکلوں اور واقعات کی مقررہ رفتار میں جزئی طور پر یا کلّی طور پر جیسا چاہے تغیّر کر دے تو ایسے حضرات کے لئے معجزات کو سمجھنا اور تسلیم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ ظاہر ہے جب آپ کا یہ اعتقاد ہو گا کہ اژدہے جس طرح پیدا ہوا کرتے ہیں وہ اُسی طرح پیدا ہو سکتے ہیں اُس کے سوا کسی اور ڈھنگ پر کوئی اژدھا پیدا کر دینا اللہ کی قدرت سے باہر ہے تو پھر آپ نے ایک ایسے خدا کا تصور اپنے ذہن میں رکھا ہے جو ایک حد پر عاجز و بے بس بھی ہو جاتا ہے۔ یقیناً یہ تصوّر رب العالمین کے تصوّر سے بالکل مختلف ہے۔

لیکن اسکے برعکس آپ کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ وہ ہے جو بے جان مادّے میں زندگی پیدا کرتا ہے اور جسکو چاہے جب چاہے جیسی چاہے صورت عطا کر سکتا ہے تو ایسے اللہ کے حکم سے لاٹھی کا اژدھا بن جانا کیا مشکل

اور ناقابل فہم ہے ؟

حقیقت یہ ہے کہ معجزات کا تعلق "خدائی اقتدار" سے متعلق ہے بحث معجزات کے تسلیم کرنے نہ کرنے میں نہیں ہے بلکہ اللہ عظیم کی صفتِ اقتدار کے ماننے یا نہ ماننے سے متعلق ہے۔

عظیم انقلاب اور دلیل راہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعونی ساحروں کے مقابلہ کا انجام قرآن حکیم نے یہ ظاہر کیا ہے :- وَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ۔ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ رَبِّ مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ۔ الخ

(اعراف آیت ۱۲۰ تا ۱۲۶)

اور جادوگر سجدے میں گر پڑے۔ کہنے لگے ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔

ساحروں کا ایمان لانا کسی سازش کا نہیں بلکہ سچے اعتراف کا نتیجہ تھا۔ فرعون نے اس کو مکر وفریب اور سازش قرار دے کر یہ دھمکی دی کہ میں ابھی تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا دوں گا اور اس کے بعد تم سب کو سُولی پر چڑھاؤں گا۔

ساحروں نے جواب دیا بہرحال ہمیں لوٹنا تو اپنے رب ہی کی طرف ہے (اپنی طبعی موت نہ سہی اس طرح حضور رب میں پہنچ جائیں گے)، تُو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم نے اُنھیں مان لیا۔

"اے رب ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دُنیا سے اُٹھا تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرمانبردار ہوں"۔

یہ تھا جواب ساحروں کا جو ابھی چند لمحوں پہلے اپنے آقا و مولیٰ فرعون کے عزت و جلال کی قسم کھا کر کہہ رہے تھے کہ ہم ہی غالب ہوں گے اور سرکاری مذہب کی نصرت وحمایت کے صلہ میں فرعون سے پوچھ رہے تھے کہ سرکار! اگر ہم آپ کے دین کو موسیٰ کے حملہ سے بچالے جائیں تو ہمیں کیا انعام ملے گا ؟

ان ہی لمحات میں ایمان کی جو روشنی ملی تو جادوگروں کی سیرت میں کتنا عظیم انقلاب آگیا، نعمتِ ایمان نصیب ہوئی انکی حق پرستی اور اُولوالعزمی اس حد کو پہنچ گئی کہ فرعون کی جھوٹی کبریائی کو ٹھوکر مارتے ہوئے اُس کے بدترین سزاؤں کو بھگتنے کے لئے تیار ہیں جنکی وہ دھمکی دے رہا تھا مگر اُس حق کو چھوڑنے کے لئے قطعاً تیار نہیں جس کی صداقت اِن پر کھل چکی ہے۔

اِن ساحروں کا مندرجہ ذیل کلمہ قیامت تک کے لئے حق پرستوں کا دلیل را قرار پایا:۔

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا۔

(طٰہٰ آیت ۷۲)

تجھکو جو کرنا ہے وہ کرگزر تو زیادہ سے زیادہ بس اسی دنیا کی زندگی کا خاتمہ کرسکتا ہے۔

قبر کی زندگی

فرعون اور آلِ فرعون کا اُخروی انجام اس طرح بیان کیا گیا:۔

اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ۔ (المومن آیت ۴۶)

"دوزخ کی آگ ہے جس کے سامنے صبح وشام وہ پیش کئے جاتے ہیں اور جب قیامت قائم ہوگی تو حکم ہوگا کہ آل فرعون کو شدید ترین عذاب میں داخل کردو۔"

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اس آیت کی تفسیر یہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ آل فرعون کی روحیں سیاہ پرندوں کی شکل میں ہر روز صبح وشام دو مرتبہ جہنم کے سامنے لائی جاتی ہیں اور جہنم دکھلا کر اُن سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا اصلی ٹھکانہ یہی ہے۔ (مصنف عبد الرزاق مظہری)

بخاری ومسلم کی ایک روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے:۔

جب تم میں کوئی مرجاتا ہے تو عالم برزخ (قبر کی زندگی) میں صبح وشام اُس کو وہ مقام دکھایا جاتا ہے جہاں قیامت کے حساب کے

بعد اُس کو پہنچنا ہے اور یہ مقام دکھلا کر اُس سے کہا جاتا ہے کہ آخر کار
تجھے یہاں پہنچنا ہے۔ اگر یہ شخص اہل جنت میں سے ہے تو اس کا مقام
جنت اسکو دکھلایا جائے گا اور اگر اہل جہنم میں سے ہے تو اُس کا مقام
جہنم اسکو دکھلایا جائے گا۔"

آیتِ مذکورہ بھی عذاب قبر کا واضح ثبوت ہے جس کا بکثرت ذکر احادیث میں آیا ہے اس لئے اسپر اُمّت کا اجماع ہو چکا ہے کہ قبر کی زندگی بھی ایک حقیقت ہے ایسے ہی جیسا کہ عالم حشر، جنت، جہنم وغیرہ۔

اللہ تعالےٰ یہاں واضح الفاظ میں عذاب کے دو مرحلوں کا ذکر فرما رہے ہیں ایک ایسا عذاب جو قیامت آنے سے پہلے فرعون اور آلِ فرعون کو دیا جا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُنھیں صبح و شام دوزخ کی آگ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جسے دیکھ دیکھ کر وہ سخت کرب و بے چینی میں مبتلا ہیں اور جن کا وہ دائمی ٹھکانہ قرار پائے گا۔

عذاب کا دوسرا مرحلہ وہ ہوگا جب قیامت آجائیگی تو اُنھیں اور مجرموں کے ساتھ جہنم میں جھونک دیا جائے گا جو اُن کی اصلی اور دائمی بدترین زندگی ہوگی۔

قرآن حکیم نے اس درمیانی زندگی کو جو موت کے بعد حشر سے پہلے ہوگی "برزخ" کے نام سے یاد کیا ہے اسی کو قبر کی زندگی بھی کہا جاتا ہے جسکی مزید وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی ہے :-

قبر یا تو جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے
گڑھوں میں کا ایک گڑھا۔ (الحدیث)

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۔ (مومنون آیت ۱۰۰)
اور اُن کے پیچھے ایک پردہ (آڑ) ہے اُس دن تک جس دن
وہ دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔ (اس آڑ سے یہی قبر کی زندگی (برزخ)
مراد ہے۔

جہنم کے رہنما

فرعون کے اُخروی تذکرے میں خصوصیت کے ساتھ یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنی

قیادت میں اپنے مُریدوں کو جہنم کی جانب لیتا جائے گا۔

يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَ
بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُودُ. الخ (ہود آیت ۹۸، ۹۹)

قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا پھر (اپنی پیشوائی میں) اُن کو دوزخ میں جا اُتارے گا اور بُری ہے وہ جگہ اُترنے کی جہاں یہ اُتارے جائیں گے۔

اور اس دنیا میں بھی لعنت اُن کے ساتھ رہی اور قیامت کے دن بھی پڑے گی۔ کیسا بُرا صلہ ہے یہ جو اِن کو دیا گیا۔

قرآن حکیم کی اس آیت اور احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ دنیا میں کسی قوم یا جماعت کے رہنما ہوتے ہیں وہی قیامت کے دن بھی اُن کے رہنما ہوں گے۔

جن لوگوں نے دنیا میں حق کی دعوت دی اور اُسی کی رہنمائی کرتے رہے تو جن جن لوگوں نے اُن کی پیروی کی اور اُن کا ساتھ دیا وہ آخرت میں بھی انہی کے ساتھ ہوں گے اور اُن کے یہ رہنما آخرت کے بھی رہنما ہوں گے اور اپنے اِن رہنماؤں کی سرکردگی میں جنّت کی طرف رواں دواں ہوں گے۔

اور جو لوگ دنیا کی زندگی میں کفر و شرک، فسق و فجور یا گمراہی کی طرف لوگوں کو ترغیب دیا کرتے تھے اور اُسی کی رہنمائی میں زندگی بسر کرتے تھے تو جو لوگ یہاں ان کی پیروی کر رہے ہیں وہ آخرت میں بھی اُن کے پیچھے ہوں گے اور انہی کی سرپرستی میں جہنم رسید ہوں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے اس حقیقت کی مزید توضیح ہوتی ہے کہ آپؐ نے فرمایا

"قیامت کے دن جاہلیت کی شاعری کا جھنڈا عرب جاہلیت کے مشہور شاعر اِمرؤالقیس کے ہاتھ میں ہوگا اور عرب جاہلیت کے تمام شعراء اسی کی پیشوائی میں جہنم کی راہ لیں گے۔"

اور یہ ظاہر ہے کہ جن رہنماؤں نے دنیا میں لوگوں کو گمراہ کیا اور حق کی راہ سے ہٹایا اُن کے پیرو جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ یہ ظالم ہم کو کس خوفناک انجام کی طرف کھینچ لائے

ہیں تو وہ اپنی ساری مصیبتوں کا ذمہ دار انہی کو قرار دیں گے اور اُن کا یہ جلوس اس شان سے دوزخ کی جانب رواں ہوگا کہ آگے آگے تو وہ گمراہ رہنما ہوں گے اور پیچھے پیچھے اُن کے ان مریدوں کا ہجوم ہوگا جو اُن پر لعنتیں برساتا ہوا جارہا ہوگا۔

قرآن حکیم نے سچائی پر چلنے والوں اور حق کا ساتھ دینے والوں کا تذکرہ بھی بڑی شان سے کیا ہے :-

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔ (سورۂ نساء آیت ۶۹)

"اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے لوگ بھی اِن حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے۔ یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صلحاء اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔"

حقیقت یا تاویل

بنی اسرائیل نے جب تورات کو قبول کرنے میں پس وپیش کیا تو اللہ تعالےٰ نے اُن کے سروں پر کوہ طور کو اٹھوا کر معلق کر دیا اور اُن سے کہا گیا کہ تورات کو قبول کرو ورنہ یہ پہاڑ تم پر گرا دیا جائیگا۔ بنی اسرائیل اسوقت مارے دہشت کے سجدے میں گر پڑے اور قبولیت کا اعتراف کیا۔

سورۂ بقرہ اور سورۂ اعراف کی دونوں آیات سے یہ واقعہ ثابت ہے۔

کسی پہاڑ کا جڑسے اکھڑ کر فضا میں معلق ہو جانا نہ عقلاً محال ہے نہ قانونِ قدرت کے منافی ہے البتہ عجیب وحیرت زدہ ضرور ہے۔ خاص طور پر جب بطور معجزہ کے ایسا عمل واقع ہو تو اسپر تعجب وحیرت بھی غلط ہے کیونکہ آیت اللہ کے معنی یہی ہیں کہ وہ عام اسباب سے ہٹکر امرالہٰی کے تحت صادر ہوتا ہے۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ آیات کے ظاہری معنی کو بغیر کسی مجبوری کے تاویل کے ذریعہ تمثیلی قرار دیا جائے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ

(بقرہ آیت ۶۳)

اور جب ہم نے تم سے قول وقرار لیا (کہ تورات پر عمل

کریں گے) اور ہم نے کوہ طور کو اٹھا کر تمہارے اوپر معلق کر دیا۔ الخ
وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ۔ الخ

(اعراف آیت ۱۷۱)

اور وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے جب ہم نے پہاڑ کو اٹھا کر چھت کی طرح اُن کے اوپر معلق کر دیا اور اُن کو یقین ہو گیا کہ وہ پہاڑ اُن پر اب گرنے والا ہے۔"

پہلی آیت میں رفع کے معنی بلند ہونا، اونچا ہونا کے ہیں لیکن اس کے بعد لفظ فَوق (اوپر) کا لفظ اس کے ساتھ محض تاکید کے لئے تو نہیں آتا بلکہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ پہاڑ واقعی طور پر اُنکے اوپر آ گیا تھا۔ اسی طرح نَتَقَ کے معنی حرکت میں آنا، زلزلہ آنا، جڑسے اُکھڑنا، تینوں معنی میں آتا ہے اسکے بعد بھی فَوْقَهُمْ فوق کا لفظ آیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ پہاڑ جڑ سے اُکھڑ کر اُن کے اوپر آ گیا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے نَتَقْنَا کی تفسیر رَفَعْنَا سے ادا کی ہے۔

الغرض قدیم مفسرین نے اس واقعہ کو حقیقت پر محمول کیا ہے مجاز یا تمثیل نہیں جیسا کہ بعض کو شبہ ہوا ہے۔ رہی یہ بات کہ اس صورت میں جبر و اکراہ سے کام لیا گیا جو دین میں جائز نہیں ہے اور غالباً اسی شبہ کی وجہ سے بعض اہل علم نے یہاں حقیقی رفع مراد نہیں لیا ہے۔

لیکن یہ شبہ کوئی زیادہ وزن نہیں رکھتا اگر غور سے کام لیا جائے تو اکراہ اور تثبیت میں فرق ہے۔

اکراہ جبر و زیادتی کو کہا جاتا ہے اور تثبیت ثابت قدمی اور مضبوطی کے معنی میں آتا ہے۔ کسی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے پر کبھی مجبور نہیں کیا جائیگا۔ کیونکہ یہ اکراہ ہے۔ لیکن جو شخص مسلمان ہو کر اسلامی عہد و پیمان کا پابند ہو گیا اسکے بعد اگر وہ احکامِ اسلامی کی خلاف ورزی کرنے لگے تو اس پر یقیناً جبر کیا جائیگا۔ کیونکہ یہ ثابت قدمی کے خلاف ہے اور خلاف ورزی کی صورت میں سخت سے سخت سزا بھی دی جائیگی جیسا کہ اسلامی تعزیرات میں بہت سی سزائیں مقرر ہیں۔

اطاعت قبول کرنے کے بعد بغاوت کرنا برداشت نہیں کیا جاتا جیسا کہ باغیوں کی سزا قتل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں بھی مُرتد کی سزا قتل تجویز کی گئی ہے اور کافر

کی سزا قتل نہیں ہے۔ الغرض لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کا تعلق غیر مسلموں سے ہے کہ ان کو جبر و طاقت سے مسلمان نہیں بنایا جائیگا اور بنی اسرائیل کے اس واقعہ میں اُنپر پہاڑ کو معلق کر کے اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ لوگ مسلمان تھے عہد و پیمان کر چکے تھے اسکے باوجود تورات کے احکام کو قبول کرنے سے انکار کر رہے تھے اس لئے اُنپر جبر و اکراہ سے کام لیا گیا جسکی ضرورت تھی۔ لہٰذا جن اہل علم نے رفع طور کو محض تمثیلی انداز بیان پر محمول کیا ہے ہم اس تاویل کو صحیح نہیں سمجھتے۔ قرآن اور حدیث دونوں اسکو بالکل ایک واقعہ کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ اسکو محض ایک تمثیلی واقعہ قرار دیا جائے بلکہ یہ واقعہ بالکل اُسی طرح پیش آیا جس طرح عالم خارجی میں واقعات پیش آتے ہیں۔ اور یہی کیا ہے ؟ بنی اسرائیل کی پوری تاریخ ایسے بہت سے حوادث رکھتی ہے۔ کس کس کی تاویل کی جائیگی ؟ حقیقت یہ ہے کہ قوانین فطرت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ایسے اشکال پیدا ہوجاتے ہیں اور معجزات تو قوانینِ فطرت ہی کی ایک خاص قسم ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص اس کو بھی بعید از امکان قرار دیتا ہے تو یہ اُس کے دائرۂ فکر کی تنگی کا ثبوت ہے یا پھر الحاد و بے دینی کے مرض کا شکار ہے۔ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ۔

حیاتِ خضر اور مسائلِ سہ گانہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مجمع البحرین پر جس بندے سے ملاقات ہوئی قرآن حکیم نے اُن کا اسم گرامی ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا (ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ) کہا ہے۔ البتہ صحیح بخاری کی تفصیل حدیث میں اُن کا نام خِضر ظاہر کیا گیا ہے (خضر کے معنی سر سبز و شاداب کے ہیں) اہل تفسیر جن میں امام بخاری بھی شامل ہیں۔ (قصص الانبیاء ابن کثیرؒ) نے اسکی وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہ جس جگہ بیٹھ جاتے تو وہاں سرسبز گھاس اُگ جاتی تھی اور زمین سرسبز ہوجاتی۔ قرآن حکیم نے یہ بھی واضح نہیں کیا ہے کہ وہ دیگر انبیاء کرام کی طرح کوئی نبی تھے یا رسول ؟

اس سلسلہ میں تین باتیں تفصیل طلب ہیں :-

(۱) خِضر نام ہے یا لقب (۲) وہ ولی ہیں یا نبی و رسول (۳) اُنھیں حیات ابدی حاصل ہے یا وفات پاچکے ؟

اہل تفسیر کی کتابوں میں اِن سوالات کے جوابات میں بہت سے اقوال ہیں اور اس بارے میں چھوٹی بڑی کتابیں اور مضامین کثرت سے لکھے گئے ہیں جن کا خلاصہ تقریباً یہی ہے کہ

(۱) پہلے سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ خِضَر نام ہے لیکن اکثر اہلِ علم نے اسکو اُن کا لقب بتایا ہے اور نام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ بلیا بن ملکان، ایلیا بن ملکان، خضرون، معمر، الیاس، الیسع میں سے کوئی ایک نام تھا۔

تکملہ محدّث ابن عساکر اور امام دارقطنی کی رائے ہے کہ وہ قابیل بن آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ ابن قُتیبہ نے وہب بن منبّہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔

اور بعض دیگر مؤرخین کا خیال ہے کہ وہ حضرت اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اور جن لوگوں نے انھیں فرشتہ کہا ہے نہایت ضعیف قول ہے جسکی تائید نہ مروی روایات کرتی ہیں نہ تاریخ وسیرت کی کتابیں۔ جس قدر بھی روایات ہیں وہ سب کی سب اولادِ آدم ہی قرار دیتی ہیں البتہ سلسلۂ نسب میں مختلف ہیں۔

(۲) دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ فقط عبد صالح (نیک بندے) تھے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ رسول تھے۔ مگر اکثر اہل تفسیر نے اُنکو نبی قرار دیا ہے۔

(۳) تیسرے سوال کے جواب میں بعض علماء کا خیال ہے کہ اُن کو حیاتِ ابدی حاصل ہے اور وہ ابتک زندہ ہیں۔ اس بارے میں کثرت سے حکایات اور روایات بھی نقل کی جاتی ہیں جنکی حیثیت تاریخی روایات سے زیادہ اہم نہیں ہے۔

محدثین کی ایک بڑی جماعت کی تحقیق ہے کہ اُن کے لئے حیات ابدی کا ثبوت نہ قرآن حکیم سے ثابت ہے اور نہ احادیث صحیحہ سے۔ لہٰذا وہ بھی عام انسانوں کی طرح اپنی طبعی عمر کو پہنچکر وفات پاگئے۔ صوفیہ کرام کی ایک بڑی تعداد اُن کے حیات کی قائل ہے اور اس بارے میں وہ حضرات اپنے مشاہدات تک بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت خضرؑ کو دیکھا ہے اور ملاقات بھی کی ہے۔ واللہ اعلم

چونکہ یہ مسئلہ قرآن وحدیث سے متعلق ہے اور انہی دو ذریعہ سے ہمیں انکا

علم بھی ہوا ہے اس لئے قرآن و حدیث ہی سے اس کا فیصلہ کرنا چاہیئے اور یہی عقل و دانش کا بھی تقاضہ ہے۔

ان ہر سہ مسائل میں حقیقت یہ ہے کہ پہلی بات کے متعلق قرآن حکیم میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ نہ حضرت خضر کا نام موجود ہے نہ لقب بلکہ قرآن حکیم نے عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا (ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ) کہکر ان کا واقعہ بیان کیا ہے۔ البتہ بخاری و مسلم کی صحیح روایات میں ان کا نام خِضر بیان کیا گیا ہے۔ لہذا یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ وہ عبد صالح حضرت خِضر تھے۔ البتہ اُنکے لقب وغیرہ کی بحث اس سلسلے میں تاریخی روایات اور اقوال اس درجے مختلف ہیں کہ اُن کے ذریعہ کسی نتیجہ پر پہنچنا یقیناً دشوار ہے اور اسکی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے۔

لہذا ہمارے علم کے لئے اُن کا اتنا تعارف کافی ہے کہ وہ اللہ کے خاص بندوں میں سے ایک بندے تھے جنہیں اللہ نے اپنے علم سے خصوصی طور پر سرفراز کیا تھا۔ اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہم زمانہ تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اُن کی خدمت میں چند حقائق کے انکشاف کے لئے روانہ کیا گیا تھا جسکی تفصیل قرآن حکیم نے بیان کی ہے۔

(کہف آیات ۷۱ تا ۸۲)

دوسری بات کے تعلق سے حقیقت سے قریب تر یہی ہے کہ وہ "نبی" تھے۔ کوئی صاحبِ کتاب یا صاحبِ شریعت رسول نہیں تھے۔ قرآن و حدیث میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا ہے کہ وہ کسی قوم کی جانب مبعوث کیئے گئے ہوں۔ جیساکہ دیگر انبیاء کے بارےمیں وضاحتیں اور اشارے ملتے ہیں۔ ان کے لئے نبوت کا ثبوت بھی اگرچہ قطعی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن قرآن حکیم نے اُن کا جس انداز سے ذکر کیا ہے وہ انداز کلام نبیوں پر ہی صادق آتا ہے۔ غیر نبی کے لئے ایسا کوئی عنوان قرآن حکیم نے اختیار نہیں کیا اسلئے حقیقت سے قریب تر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی تھے جنہیں اللہ کی طرف سے وحی (جو صرف انبیاء ورسل ہی کے لئے مخصوص ہے) کی گئی۔ اس کے لئے دو بڑی وجہ قرآن حکیم سے ملتی ہیں:-

وجہ اوّل۔ اللہ تعالٰی نے حضرت خضر علیہ السلام کا تعارف اسطرح کروایا ہے:-

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا
وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔ (کہف آیت ۶۵)

پھر پایا ایک بندہ ہمارے بندوں میں سے جسکو دی تھی ہم نے
رحمت اپنے پاس سے اور سکھایا تھا اپنے پاس سے ایک علم۔

آیت میں تین لفظ خصوصی طور پر ذکر کئے گئے ہیں ایک اُن کا خاص بندہ ہونا دوسرے اللہ نے انھیں اپنی رحمت خاص سے کچھ حصہ عطا کیا تھا۔ تیسرے اپنے پاس سے انھیں علم خاص دیا۔

یہ انداز کلام اور عنوان خاص قرآن حکیم میں صرف انبیاء کرام کے لئے استعمال ہوا ہے اور اس عنوان سے ایک خصوصیت نمایاں ہوتی ہے جو عام انسانوں کے لئے چسپاں نہیں ہوتی۔

ویسے اللہ نے عام انسان کو علم بھی عطا کیا ہے رحمت سے بھی سرفراز کیا ہے لیکن کسی خاص فرد کے لئے ایسا عنوان نہیں ملتا جیسا کہ اس واقعہ میں اُس بندے کے لئے اختیار کیا گیا ہے اس لئے حضرت خضر علیہ السلام کا نبی ہونا حقیقت سے قریب تر ہے۔

دوسری وجہ۔ حضرت خضر علیہ السلام نے قتل ولد کی جو وجہ بیان کی ہے اسمیں یہ صراحت بھی موجود ہے:۔

وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ۔ (کہف آیت ۸۲)

یہ کام میں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا۔

جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ وحی الٰہی کا امر تھا جسکے تحت لڑکا قتل کیا گیا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ کسی بھی مذہب میں کسی عام انسان کو یا ولی کو اسکی اجازت نہیں رہی کہ وہ اپنے وجدان یا الہام سے کسی کو قتل کرے اور خاص طور پر ہماری اس شریعت میں جسکا ماخذ یہی قرآن حکیم ہے۔ اس میں کوئی اجازت نہیں ملتی کہ بے گناہ قتل کیا جائے۔ لہٰذا کسی کا بے گناہ قتل صرف وحی الٰہی کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ رائے، قیاس، وجدان، الہام وغیرہ سے کچھ مشتبہ جوانب واضح ہو سکتے ہیں لیکن قتل جیسا قبیح اور بڑا جرم جائز نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا حضرت خضر علیہ السلام کا آخر میں یہ فرمانا کہ میں نے یہ کام اپنی طرف سے نہیں کیا ہے

واضح دلیل ہے کہ وحی الٰہی انکو نصیب تھی اور یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ انسانوں میں صرف انبیاء ورسل ہی کو وحی کی جاتی ہے۔

مسائل سہ گانہ میں تیسرا مسئلہ حضرت خضر علیہ السلام کی حیات ابدی سے متعلق ہے۔

اس سلسلے میں تمام اہل تحقیق محدثین ومفسرین کی قطعی رائے ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کو حیات ابدی حاصل نہیں ہے اور وہ عام انسانوں کی طرح اپنی طبعی عمر کو پہنچکر وفات پا گئے۔

قرآن حکیم اور احادیث صحیحہ میں ایسی کوئی وضاحت نہیں کہ وہ فرشتوں کی طرح زندہ ہیں اور اپنا مفوضہ کام انجام دیتے ہیں۔ امام بخاری ان کے حیات کے قائل نہیں ہیں اپنی کتاب صحیح بخاری میں اس کی تائید کے لئے احادیث بھی نقل کئے ہیں۔ اسی طرح امام مسلم نے بھی اپنی کتاب صحیح مسلم میں حدیث نقل کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ وہ وفات پا چکے ہیں۔

دیگر ائمہ حدیث سے پوچھا گیا کہ کیا خضر زندہ ہیں؟
تو انھوں نے قرآن حکیم کی اس آیت سے اسکی تردید کی

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ (انبیاء آیت ۳۴)

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی بشر کو حیاتِ ابدی نہیں دی۔

نیز قرآن حکیم نے انبیاء سابقین کی موت کا اعلان کیا ہے :-

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔

(آل عمران آیت ۱۴۴)

اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو رسول ہی ہیں اُن سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔

چونکہ حضرت خضرؑ بھی نبی ہیں وہ بھی اس آیت میں شامل ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سے پوچھا گیا تھا کیا حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں؟ جواب دیا کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو اُن پر واجب تھا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ پر ایمان لاتے اور آپ کی معیت میں غزوات میں شریک ہوتے اور آپ کا ہر طرح تعاون کرتے جیسا کہ صحابہ نے کیا ہے۔

صوفیہ کرام میں سے ایک مشہور بزرگ ابوالفضل مرسیؒ نے بھی اُنکی وفات کا ذکر کیا ہے۔

مشہور ناقدِ حدیث ابن الجوزیؒ نے حضرت علی بن موسیٰ رضارحؒ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ وفات پا چکے ہیں۔ (قصص الانبیاء ابن کثیرحؒ)

نیز قرآن حکیم کی یہ آیت بھی اس نظریہ کی تردید کرتی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام بقید حیات ہیں :۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ۔

(آل عمران آیت ۸۱)

"اور جب اللہ نے نبیوں سے عہد و پیمان لیا کہ میں نے جو کچھ تم کو کتابیں اور علم دیا ہے پھر آئے تمہارے پاس رسول (محمدؐ) جو تصدیق کرنے والا ہے تمہارے پاس والی کتاب کی تو اُس رسول پر تم ضرور ایمان لاؤ گے اور اُسکی ضرور مدد کرو گے ؟ اللہ نے فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا ؟ سب بولے ہم نے اقرار کیا ! ارشاد فرمایا تو اب گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔"

اہلِ تحقیق لکھتے ہیں کہ اگر حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہوتے خواہ وہ نبی ہوں یا ولی تو اُن کا فرض تھا کہ وہ علی الاعلان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ پر ایمان لاتے اور تمام غزوات میں آپ کی اعانت کرتے مگر کسی بھی صحیح روایت سے اِن باتوں میں کسی ایک بات کا بھی ثبوت نہیں ملتا۔ حالانکہ غزوۂ بدر اور حنین وغیرہ میں جبرئیل امین اور ملائکہ کی آمد اور اعانت تک کی تصریحات قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔ لہذا قرآن حکیم کی اس آیتِ میثاق سے اِن کا زندہ رہنا ثابت نہیں ہوتا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی دلیل کا ماخذ یہی آیتِ میثاق ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے بھی آیتِ میثاق کی تفسیر میں یہی مضمون بیان کیا ہے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس نبی و رسول کو مبعوث کیا ہے مبعوث کرنے سے پہلے اُس سے عہد و پیمان لیا کہ اگر تمہارے زمانے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوجائیں تو تم اُن پر ایمان لاؤ گے اور اُنکی مدد کروگے، اسی طرح ہر نبی وفات سے قبل اپنی اپنی امت کو یہ تلقین کر گئے ہیں کہ اگر تم لوگ زندہ رہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوگئے تو تم اُن پر ایمان لانا اور اُن کی ہرطرح نصرت کرنا۔

(ذکرہ البخاری عن ابن عباسؓ)

قرآن حکیم کی اِن آیات کے علاوہ بخاری ومسلم کی یہ صحیح روایت بھی اس عقیدہ کی تردید کرتی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام ابتک زندہ وموجود ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عشاءؑ کی نماز سے فارغ ہوکر فرمایا کیا تم نے آج رات کچھ دیکھا؟ پھر فرمایا یہ حقیقت ہے کہ آج جو شخص بھی روئے زمین پر موجود ہے ایک صدی گزرنے پر اُن میں سے ایک بھی زمین پر زندہ باقی نہیں رہے گا۔ (بخاری مسلم کتاب الفضائل)

اس حدیث صحیح کی پیشگوئی کے مطابق بھی حضرت خضر علیہ السلام کی حیات ابدی کے لئے کوئی گنجائش نہیں نکلتی اور نہ اُن کا کوئی استثنار کسی روایت سے ثابت ہے۔ حالانکہ یہ روایت بخاری ومسلم کے علاوہ اور کتب حدیث میں بھی منقول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور محدّث ابن القیمؒ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ کتب احادیث میں ایک صحیح روایت ایسی موجود نہیں ہے جس سے حضرت خضر علیہ السلام کی حیات کا ثبوت ملتا ہو۔ مشہور مفسّر ابن حبّان اَندلسیؒ نے بھی یہی دعویٰ کیا ہے کہ اُمت کا سوادِ اعظم اس بات کا قائل ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام وفات پاگئے۔

اور حقیقت یہی ہے کہ جس مسئلہ کا تعلق قرآن وحدیث سے ہو اسکو اسی ذریعہ سے حل کرنا چاہیئے۔ تاریخی روایات، واقعات، مشاہدات، اقوال مشائخ وغیرہ سے نہ عقیدہ ثابت ہوتا ہے اور نہ کوئی قطعی حکم جاری کیا جاسکتا ہے۔

حیاتِ خضر علیہ السلام کے سلسلے میں جتنی بھی روایات نقل کی جاتی ہیں وہ سب کی سب ضعیف، غریب، مرسل، منقطع، موضوع قسم کی ہیں جسکے نقل کرنے والوں کے لئے محدثین نے مجہول، مجروح، متروک، غیر معروف، حتیٰ کہ اُسکے بعض راویوں کو کذابین کی فہرست میں شامل کیا ہے۔

مشہور ناقد الحدیث ابن الجوزیؒ نے اس مضمون پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام "عجالۃ المنتظر فی شرح حال الخضر" ہے۔ اسمیں وہ ساری روایات جمع کردی ہیں جو اُن کے حیات کے بارے میں نقل کی جاتی ہیں اور اِن سب پر محدثانہ کلام بھی کیا ہے اور اُن کا ضعف اور غیر صحیح ہونا ثابت کیا ہے۔

اسی طرح مشہور محدث ومفسر ابن کثیرؒ نے بھی اپنی کتاب "قصص الانبیاء" میں بھی اُن تمام روایات کو نقل کیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے اور اکثر روایات موضوع ہیں۔

مزید معلومات اور علمی بحث کے لئے البدایہ والنہایہ ج ۱، روح المعانی ج ۱۵، عینی شرح البخاری ج ۷، فتح الباری ج ۶، اصابہ ج ۱ قابل مطالعہ ہیں۔ ان میں وہ ساری تفصیلات موجود ہیں جس کا خلاصہ ہم نے سطور بالا میں لکھا ہے۔

البتہ ایک روایت امام شافعیؒ نے اپنی مُسند میں نقل کی ہے جسمیں بیان کیا گیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دن ایک اجنبی شخص آئے اور صحابۂ کرام کو اِن کلمات سے تسلّی دی :-

"اللہ کی بارگاہ میں صبر ہی ہر مصیبت کا عوض اور ہر فوت ہونے والی شئی کا بدلہ ہے، اللہ ہی پر بھروسہ کرو اور اُسی کی طرف رجوع ہو کیونکہ محروم وہ شخص ہے جو مصیبت کے ثواب سے محروم ہو جائے۔"

یہ حدیث الفاظ کے تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ امام بیہقی نے بھی نقل کیا ہے۔

ابن کثیر فرماتے ہیں کہ مُسند شافعی کی اس روایت میں قاسم بن عبد اللہ العمری متروک الحدیث ہے۔

امام احمدؒ اور یحییٰ بن معین جیسے ناقدین حدیث نے کہا کہ یہ شخص جھوٹ بولتا تھا۔ امام احمدؒ نے یہ بھی کہا کہ احادیث گھڑ لیا کرتا تھا۔

روایت بیہقی میں عباد بن عبد الصمد راوی کے بارے میں خود بیہقی فرماتے ہیں کہ ضعیف ہے۔

ابن حبانؒ اور عقیلیؒ لکھتے ہیں کہ اسکی روایات اکثر موضوع ہوتی ہیں۔امام بخاریؒ نے کہا کہ یہ منکر الحدیث ہے۔ ابو حاتمؒ نے کہا کہ یہ نہایت ضعیف الحدیث ہے۔ ابن عدیؒ نے کہا کہ یہ غالی قسم کا شیعی مسلمان تھا حضرت علیؓ کی شان میں احادیث گھڑتا تھا۔

الغرض حیات خضر علیہ السلام کے بارے میں جسقدر بھی روایات ہیں اُن کا یہی حال ہے کہ یا تو وہ سنداً ضعیف ہیں یا پھر متناً منکر اور غریب ہیں۔

ابن کثیر نے ساری روایات کو جمع کرنے کے بعد لکھا کہ یہ سب احادیثِ مرفوعہ ضعیف الاسناد ہیں ان سے کوئی حجت قائم نہیں کی جاسکتی اور نہ دین میں اِن کا اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ (قصص الانبیاء، ص۴۶۳)

البتہ بخاری و مسلم میں ایک روایت امام زہریؒ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

قیامت کے قریب دجال نکلے گا اور ساری زمین کا چکر لگائیگا لیکن مدینہ منورہ میں اُس کا داخلہ نہ ہو سکے گا وہ باہر مقیم رہے گا اس کے مقابلہ کے لئے ایک شخص مدینہ منورہ سے نکل کر آئے گا جو اُس زمانے کا سب سے بہترین انسان ہوگا وہ دجال سے مخاطب ہو کر کہیگا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ تو وہی دجال ہے جسکی اطلاع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔

دجال لوگوں سے کہے گا کہ اے لوگو! اگر میں اسکو قتل کر کے دوبارہ زندہ کر دوں تو کیا تم میرے بارے میں پھر بھی شک کرو گے؟ لوگ کہیں گے نہیں! پھر دجال اُس خیر النّاس کو قتل کر دے گا اور دوبارہ زندہ بھی کر دے گا، (لوگ یقین کرلیں گے) لیکن وہ مقتول کہے گا کہ میں اب پوری بصیرت کے ساتھ شہادت دیتا ہوں کہ تو وہی دجال ہے جسکی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ پھر دجال اُن کو دوبارہ قتل کرنے کا ارادہ کریگا لیکن عاجز و بے بس ہو جائیگا اور قتل نہ کر سکیگا۔

اِنّ خیر النّاس" کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ حضرت خضر
علیہ السلام ہوں گے۔ اسی وجہ سے اکثر لوگوں نے اس حدیث کی یہی
تفسیر کی ہے اور اس سے ثابت کیا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام
بقید حیات ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔

لیکن اسی روایت کے ایک راوی ابواسحاق ابراہیم الفقیہہ
کہتے ہیں کہ یہ معمّر کا قول ہے جو اس روایت کو زُہری سے نقل کرتے ہیں۔
(قصص الانبیاء، ابن کثیر ص۴۶۳)

اس حدیث میں رَجُلٌ مِّنْ خَیْرِ النَّاسِ اور دوسری روایت میں شَابٌّ مُّمْتَلِئٌ شَبَابًا، ایک نوجوان جسکی جوانی بھرپور ہوگی) کے الفاظ ہیں۔ بعض راویوں نے اس سے مراد حضرت خضر علیہ السلام سمجھا ہے۔ لیکن حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نام کی کوئی تصریح نہیں فرمائی۔

حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق اور بھی بہت سی عجیب وغریب روایات تفسیر و تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں محققین، اہل علم کی نگاہ میں سب موضوع اور بے اصل ہیں اور یہودی روایات سے ماخوذ ہیں۔ اسلئے ناقابل اعتماد ہیں۔

مشہور مفسّر ابوحیّان نے اپنی تفسیر البحر المحیط میں متعدد
بزرگوں کے واقعات نقل کئے ہیں جن کی حضرت خضر علیہ السلام سے
ملاقات ہوئی ہے مگر آخر میں یہ بھی لکھ دیا ہے:۔

وَالْجُمْهُورُ عَلَىٰ أَنَّهُ مَاتَ (البحر المحیط ص۱۴۷ ج۶)

لیکن جمہور علماء کی رائے یہی ہے کہ وہ وفات پاگئے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

تذکرہ
سیدنا یوشع بن نون علیہ السلام

سلسلۂ نسب وتعارف حضرت یوشع علیہ السلام کا سلسلۂ نسب بنی اسرائیل کے دیگر انبیاء کرام کی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ مؤرخین نے انھیں اسباطِ یوسف (اولاد یوسف علیہ السلام) میں شمار کیا ہے اور سلسلۂ نسب اس طرح بیان کیا ہے:-

یُوشع بن نون بن فراہیم بن یوسفؑ بن یعقوبؑ بن سیدنا ابراہیم علیہم السلام۔

قرآن حکیم میں حضرت یوشع علیہ السلام کا نام مذکور نہیں ہے البتہ سورہ کہف میں ۲ دو جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق سفر (نوجوان) کا ذکر موجود ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کے لئے تشریف لے گئے تھے تو اپنے ساتھ بطور رفیق سفر ایک نوجوان کو لے لیا تھا جو حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات تک ہمسفر رہے۔ یہی نوجوان حضرت یوشع ہیں جن کا ذکر ان آیات میں ملتا ہے:-

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا۔ الآیۃ (کہف آیت ۶۰)

اور وہ وقت یاد کرو جبکہ موسیٰ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ میں برابر چلا جاؤں گا یہاں تک کہ اُس موقعہ پر پہنچ جاؤں جہاں ۲ دو دریا آپس میں ملتے ہیں یا یوں ہی زمانۂ دراز تک چلتا رہوں گا۔

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ آتِنَا غَدَاءَنَا الخ (کہف آیت ۶۲)

پھر جب دونوں آگے بڑھ گئے تو موسیٰ نے اپنے خادم سے

فرمایا ہمارا ناشتہ لاؤ۔

فَتیٰ نوجوان کو کہتے ہیں اور خادم عموماً ایسے ہی رکھے جاتے ہیں۔ یہ خادم جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا رفیقِ سفر بنایا تھا بخاری کی روایت کے مطابق اِن کا نام یوشع بیان کیا گیا ہے۔ یہ حدیث حضرت ابی بن کعبؓ سے منقول ہے۔ اس لحاظ سے حضرت یوشع علیہ السلام کا ذکر بھی قرآن حکیم میں آجاتا ہے۔ اس وجہ سے اکثر مفسرین نے اِن نوجوان کا نام یہی بیان کیا ہے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیاتِ طیّبہ میں آپؐ کے خادم تھے اور حضرت ہارون وحضرت موسیٰ علیہما السلام کی وفات کے بعد ان کے جانشین بنے۔ کتاب تورات میں بھی حضرت یوشع (یشوع) کا بکثرت ذکر موجود ہے۔ اہل کتاب انکی نبوت پر اتفاق رکھتے ہیں۔ مفسرین کی ایک بڑی جماعت بھی اِن کو نبی قرار دیتی ہے اور یہی اسلامی مؤرخین کی بھی تحقیق ہے۔

اور بعض دیگر مفسرین کرام کی رائے کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل کو ارض مقدس (فلسطین) میں داخل ہونے کا حکم دیا تھا تو اس سے پہلے ارض مقدس کے جابر وظالم لوگوں کی تحقیق حال کے لئے جن دو شخصوں کو روانہ کیا تھا اِن میں ایک یہی حضرتِ یوشع علیہ السلام ہیں جنھوں نے آکر یہ بیان کیا تھا کہ قوم اگرچہ زبردست ڈیل ڈول کی ہے لیکن ان کے دل کمزور اور بے قوّت ہیں، مقابلہ ہوتے ہی بھاگ کھڑے ہوں گے۔ (مزید تفصیل تذکرہ سیدنا موسیٰؑ میں آچکی ہے) چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے چالیس سال بعد انہی کی قیادت میں بنی اسرائیل اپنے آبائی وطن ارض مقدس (فلسطین) میں داخل ہوئے اور جہاد کرتے کرتے کنعان، شام، اُردن سے تمام ظالم طاقتوں کو نکال باہر کیا۔

ارضِ مقدّس کی بازیابی

حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کی رہنمائی حضرت یوشع علیہ السلام کے ہاتھ آئی، انہی کی قیادت میں بنی اسرائیل نے چالیس سالہ زندگی گزاری، اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو لیکر اپنے آبائی وطن میں قیام کریں اور وہاں قوم عمالقہ اور دوسری ظالم قوموں سے جہاد کریں اور اپنا آبائی وطن حاصل کریں۔ تورات میں بھی

اس کا ذکر موجود ہے۔ حضرت یوشع علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام سنایا اور اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت کی بھی خوشخبری دی۔ سب کے سب وادی تیہ سے نکل کر ارض کنعان کے سب سے بڑے شہر آریحا کی جانب بڑھے اور سخت مقابلہ کے بعد دشمن کو شکست دی اسکے بعد تمام ارض مقدس پر قابض ہوگئے اور پھر اپنے آبائی وطن کے مالک بنے۔

تورات میں مزید یہ وضاحت ملتی ہے کہ جب بنی اسرائیل جنگ کے لئے تیار ہوئے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے تابوتِ سکینہ (خاص صندوق) ان کے ساتھ تھا جسمیں عصائے موسیٰؑ پیرہن ہارون اور من وسلویٰ کے برتن کے علاوہ دوسری تبرکات بھی تھیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا تھا کہ تم منّ وسلویٰ کو محفوظ کرلو تاکہ تمہاری آئندہ نسلیں بھی مشاہدہ کرلیں کہ تم پر اللہ کا انعام ہوا تھا۔ یہ صندوق وراثتہً خاندان میں محفوظ چلا آرہا تھا اور اسکی حفاظت کی جاتی تھی مصائب اور جنگوں میں اسکو ساتھ رکھ کر برکت حاصل کی جاتی تھی۔ قرآن حکیم میں بھی اس تابوت سکینہ کا ذکر موجود ہے۔ طالوت کے قصہ میں اُن کے نبی نے قوم سے کہا تھا کہ طالوت کے بادشاہ مقرر ہونے کی یہ علامت ہے کہ

> اُس کے عہد میں وہ صندوق (تابوتِ سکینہ) تمہارے پاس پہنچ جائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے سکونِ قلب کا سامان ہے اور جس میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں جسکو فرشتے اُٹھائے ہوئے ہوں گے بیشک اسمیں تمہارے لئے بہت بڑی نشانی ہے۔ (بقرہ آیت ۲۴۸)

اسکی تفصیل تذکرہ سیدنا داؤد علیہ السلام میں آئیگی) ابن اثیر فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی ہی میں ارض مقدس (فلسطین) کی فتح کے لئے حضرت یوشع علیہ السلام کو امیر لشکر نامزد کر دیا تھا پھر جب اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا تو اُنھوں نے بنی اسرائیل کی معیت میں ارض مقدس کو مشرک قوموں سے پاک کیا۔ اسطرح شہر آریحا کی فتح تمام ارض مقدس کی فتح ونصرت کا ذریعہ بنی۔ قرآن حکیم نے یہ وضاحت نہیں کی کہ پہلے کس شہر کو فتح کیا صرف قریہ (شہر) کہہ کر اس کا ذکر کیا ہے۔ حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ غالباً یہ قریہ بیت المقدس تھا۔

ناسپاسی یا شکر گزاری

اللہ تعالیٰ نے جب بنی اسرائیل پر رحم فرمایا اور شہر

فلسطین میں اُن کا فاتحانہ داخلہ ہوا تو حکم دیا گیا کہ اس مقدس شہر میں مغرور اور متکبرانہ طور پر داخل نہ ہوں بلکہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے خشوع وخضوع کے ساتھ توبہ و استغفار کرتے داخل ہوں۔ مگر فتح ونصرت کے بعد بنی اسرائیل کی سابقہ فطرت لوٹ آئی اور وہ اللہ تعالٰی کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مغرور اور متکبر انسانوں کی طرح شہر میں داخل ہوئے، اتراتے، سر بلند کیے ہوئے توبہ و استغفار کے بجائے سوقیانہ الفاظ کہتے ہوئے داخل ہوئے۔ اس ناسپاسی اور خدا فراموشی حالت پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور ایک آسمانی عذاب نے اُنھیں گھیر لیا۔

قرآن حکیم نے اس آسمانی عذاب کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی صرف رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ (آسمانی عذاب) کہہ کر اپنے غضب کا اظہار کیا ہے۔ امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ یہ آسمانی عذاب طاعون تھا جو اُن کے شہر میں داخل ہونے کے بعد پھوٹ پڑا جس سے بہت بڑی تعداد ہلاک ہوگئی۔ بعض مفسرین نے ہلاک شدہ انسانوں کی تعداد ستر ہزار لکھی ہے۔ واللہ اعلم۔

قرآن حکیم نے اس واقعہ کو دو مقام پر قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے:-

قرآنی مضمون

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا الخ (البقرہ آیت ۵۸)

اور جب ہم نے حکم دیا کہ اس شہر میں داخل ہو اور اپنی مرضی کے مطابق جو چاہو کھاؤ پیو اور شہر کے دروازے میں نیاز مندی کے ساتھ جھکتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے داخل ہونا الٰہی ہماری خطاؤں کو معاف فرما، تو پھر ہم تمہاری خطاؤں کو بخش دیں گے اور عنقریب نیکوکاروں کو مزید دینگے۔ سو ظالموں نے اُس قول کو جو اُن سے کہا گیا تھا دوسرے قول (سوقیانہ) میں بدل دیا۔ پس ہم نے بھی ظالموں پر اُن کی نافرمانی کی وجہ سے آسمان سے سخت عذاب بھیج دیا۔

وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا الخ (اعراف آیت ۱۶۱)

اور جب اُن سے کہا گیا تم اس شہر میں سکونت اختیار کرو اور جس طرح تمہارا جی چاہے کھاؤ پیو اور یہ کہتے ہوئے شہر میں داخل ہو خدایا

ہماری خطاؤں کو معاف فرما، اور شہر میں عاجزی کے ساتھ جھکتے ہوئے داخل ہو تو ہم تمہاری خطاؤں کو بخش دینگے اور عنقریب نیکوکاروں کو مزید دیں گے۔
پس ظالموں نے اُس قول کو جو اُنھیں بتایا گیا تھا دوسرے قول سے بدل دیا سو ہم نے اُن پر آسمان سے عذاب نازل کر دیا ان کے ظالم ہونے کی وجہ سے۔

بخاری کی ایک روایت کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل نے "حِطَّۃٌ" (معاف فرما) کی جگہ "حَبَّۃٌ فِی شَعْرَۃٍ" (ہم کو محفوظ غلّے کی ضرورت ہے) کہتے ہوئے داخل ہوئے۔ گویا اللہ تعالےٰ کے حکم کے ساتھ مذاق کر رہے تھے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل اپنے سُرینوں کو اُبھارتے اُن کے بَل پر مٹکتے ہوئے داخل ہو رہے تھے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اِن آیات میں اپنے سچّے اور نیک بندوں اور متکبّر انسانوں کے درمیان ایک امتیاز کر دیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کے فرمانبردار بندے اپنی ذاتی سربلندی کیلئے نہیں لڑتے بلکہ زمین سے شرک و کفر ظلم و فساد کو مٹانے کے لئے جنگ کرتے ہیں اور جب غلبہ پاتے ہیں تو اللہ تعالےٰ کا نام بلند کرتے ہیں اور نیازمندی اور سجدہ ریزی سے شکر ادا کرتے ہیں۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو تواضع وانکساری کی یہ کیفیت تھی کہ اونٹنی پر بیٹھے بیٹھے اس قدر جھکے جا رہے تھے کہ ریش مبارک کجاوے کے سرے سے مسّ کر جاتی تھی اور جب حرم شریف میں داخل ہوئے تو بارگاہ الٰہی میں آٹھ رکعت نماز شکرانہ ادا کی۔

یہی حال صحابہ کرام کا تھا حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر جب بیت المقدس فتح ہوا اور حضرت سعد بن ابی الوقاصؓ کے ہاتھ پر ایران فتح ہوا تو حریمِ قدس اور ایوانِ کسریٰ میں داخل ہوتے ہی سجدہ ریز ہو کر نماز شکرانہ ادا کی۔

نتائج و عبر

اعترافِ نعمت

حضرت یوشع علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے مذکورہ واقعہ میں جو بات قابل توجہ اور یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ جب کسی انسان کو مصیبت یا کسی آزمائش سے نجات ملے اور وہ کامیاب ہو کر فائز المرام ہو تو غرور و نخوت سے یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ یہ کامیابی میری اپنی استعداد اور قابلیت کا نتیجہ ہے بلکہ وہ اللہ واحد کا شکرگزار بنے اور اپنے عجز و بندگی کا اعتراف کرتے ہوئے اسکو فضلِ الٰہی قرار دے۔ ایسے عمل پر اللہ تعالیٰ کی دائمی سنت یہ چلی آرہی ہے کہ اس نعمت کو محفوظ کر دیا جاتا ہے اور اس میں مزید اضافہ بھی ہوتا ہے۔

سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ۔
نیکی کرنے والوں کو مزید دیتے ہیں۔
لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ الآیہ
اگر تم نے نعمت کا شکر ادا کیا تو میں نعمت اور زیادہ کروں گا۔

کُفرانِ نعمت

جس فرد یا جماعت پر اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان کھلی نشانیوں کے ذریعہ ہوا کرتا ہے وہ اگر شکر و اطاعت کے بجائے ناسپاسی اور نافرمانی پر اُتر تی ہے تو پھر جلد ہی اللہ تعالیٰ کی سخت پکڑ کا شکار بھی ہو جاتی ہے کیونکہ اُسکی یہ ناسپاسی اور نافرمانی نعمت کے مشاہدہ اور تجربے کے بعد ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں کفرانِ نعمت اپنی آخری حد پر آجاتی ہے جو یقیناً سخت سزا کی مستحق ہے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ۔

(اعراف آیت ۱۶۲)

تذکرہ
سیدنا حزقیل علیہ السلام

تمہید حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کی رہنمائی کے لئے بکثرت انبیاء تشریف لائے جن کا سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک چلتا رہا۔ ان درمیانی صدیوں میں کتنے انبیاء و رسل مبعوث ہوئے اُن کی پوری تعداد کا علم اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ قرآن حکیم نے اُن میں سے چند ایک انبیاء کا ذکر کیا ہے اور اِن میں بھی بعض کا تذکرہ تفصیلی طور پر اور بعض کا اجمالی طور پر اور بعض کا صرف نام ہی مذکور ہے۔

اِن پیغمبروں کے درمیان تاریخی ترتیب بھی مختلف فیہ ہے۔ تاہم ابن جریر طبریؒ اور ابن کثیرؒ کی تحقیق کے مطابق حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام منصبِ نبوت پر فائز ہوئے۔ پھر ان کی جانشینی کالب بن یوحنا کے حصے میں آئی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن مریم بنت عمران کے شوہر تھے۔ ابن کثیرؒ کی تحقیق کے مطابق یہ بنی اسرائیل کے قائد و رہنما تھے نبی یا رسول نہ تھے۔ اور ابن جریر طبریؒ لکھتے ہیں کہ حضرت یوشع علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کی قیادت کے لئے جس ہستی کو منتخب کیا گیا وہ حضرت حزقیل علیہ السلام ہیں۔ واللہ اعلم

نام ونسب وبعثت تورات کی تصریح کے مطابق وہ بوذی کاہن کے بیٹے ہیں اور ان کا نام حزقی ایل ہے۔ یہ لفظ عبرانی زبان کا ہے جس کے معنی اللہ کی قدرت کے ہیں۔ حضرت حزقیل علیہ السلام کے بچپن ہی میں والد کا انتقال ہوگیا تھا ماں کی زیر پرورش رہے۔ اور جس وقت نبوت سے سرفراز ہوئے ماں نہایت عمر رسیدہ ضعیف ہوچکی تھی اسی وجہ سے اِنکو تورات میں ابن العجوز (بڑھیا کا بیٹا) کے نام سے یاد

کیا گیا ہے۔

حضرت حزقیل علیہ السلام نے عرصۂ دراز تک بنی اسرائیل کی رہنمائی و قیادت کی ہے تاہم اِن کا اسم مبارک قرآن حکیم میں موجود نہیں البتہ سورہ بقرہ میں ایک بیان کردہ واقعہ کے متعلق عام مفسرین کا خیال ہے کہ وہ واقعہ انہی سے منسوب ہے۔

سیّدنا حزقیلؑ اور قرآنِ حکیم

کتب تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ اور بعض دیگر صحابہ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ کسی زمانے میں بنی اسرائیل کی ایک بڑی جماعت سے اُن کے پیغمبر حضرت حزقیل علیہ السّلام نے فرمایا کہ فلاں دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور اللہ کے نام کو بلند کرنے کیلئے جہاد کرو! یہ حکم سنتے ہی پوری جماعت کی جماعت خوف کے مارے، بھاگ کھڑی ہوگئی اور ایک دُور دراز علاقہ میں پناہ لی اور اپنے اس عمل سے اُنھوں نے یقین کر لیا کہ اب وہ اپنی موت سے محفوظ ہو گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو اِن کی یہ حرکت سخت ناپسند آئی اور اُسی علاقہ میں اللہ کا غضب ٹوٹ پڑا اور ہر ایک کو اُسکی موت نے آپکڑا سب کے سب ہلاک ہوگئے۔

ایک ہفتے کے بعد حضرت حزقیل علیہ السلام کا اُن پہ گزر ہوا دیکھا کہ پوری قوم موت کی آغوش میں چلی گئی ہے۔ اِن کی اس حالت پر انھیں نہایت افسوس ہوا اور اللہ تعالیٰ کی جناب میں معذرت پیش کی اور دُعا مانگی کہ اُن کو موت کے عذاب سے نجات مل جائے تاکہ اُن کی زندگی خود اُن کے لئے اور دوسروں کے لئے عبرت و نصیحت بنے

چنانچہ حضرت حزقیل علیہ السلام کی دُعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ خاص سے اُن سب کو دوبارہ زندہ کر دیا پھر اُن لوگوں نے عرصۂ دراز تک حضرت حزقیل علیہ السّلام کی رہنمائی میں زندگی بسر کی۔

حکم جہاد سے فرار کا یہ واقعہ قرآن حکیم میں مختصراً اسطرح مذکور ہے:۔

قرآنی مضمون

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۔ الخ (بقرہ آیت ۲۴۳)

اے مخاطب کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے
اپنے گھروں سے ہزاروں کی تعداد میں نکلے، سو اللہ نے اُن کو (غضب سے)
کہا مر جاؤ (سو اُن پر موت طاری ہوگئی) پھر اللہ نے اُنھیں زندہ کر دیا۔ بیشک
اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں ادا کرتے۔

جہاد کے خوف سے بھاگ جانے والوں پر اللہ تعالیٰ نے موت کا عذاب مسلّط کر دیا تاکہ اس واقعہ سے لوگ عبرت حاصل کریں اور ان کے قلوب میں شجاعت و بہادری کا جذبہ پیدا ہو اور بُزدلی و نامردی سے نفرت پیدا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس مختصر واقعہ کے بعد ہی مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ کا حکم سنایا اور یہ بھی جتلایا کہ خدا کی راہ میں جہاد اور قربانی سے گریز کرنا زوال و انحطاط کا باعث ہوتا ہے جیسا کہ بنی اسرائیل کی روگردانی پر ظاہر ہوا۔

جہاد سے فرار کی سب سے بڑی وجہ زندگی سے محبت اور موت کا ڈر ہے۔ ایک اور جگہ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ (ترجمہ) "موت تم کو پالے گی خواہ تم مضبوط قلعوں اور برجوں ہی میں کیوں نہ ہو۔" یہاں اللہ نے خود ان کو مشاہدہ کرا دیا کہ وہ جس موت کے خوف سے بھاگ کر اور اپنے کو محفوظ سمجھ کر جس جگہ آئے تھے موت وہاں بھی آ کر رہی۔

نتائج و عبر

حیات بعد الموت دنیا میں اللہ تعالیٰ کے عام قانون کے مطابق اگرچہ دوبارہ زندگی نہیں ملتی جو مر چکا وہ دوبارہ زندہ نہیں ہوگا البتہ قیامت میں دوبارہ زندگی کا واقعہ پیش آئے گا، لیکن اسی عالم میں اللہ تعالیٰ کے قانونِ خاص (قدرۃ اللہ) کے پیشِ نظر کسی حکمت و مصلحت کی بنا پر اگر کسی مُردے کو دوبارہ حیات حاصل ہو جائے صرف ممکن ہی نہیں بلکہ واقع ہوا ہے۔ قوم حزقیل علیہ السلام کا یہ قرآنی واقعہ اِس کا واضح ثبوت ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جو ذات جس شئی کو ترکیب دیتی ہے وہ ترکیب کے بکھر جانے کے بعد دوبارہ اُس کو ترکیب دے سکتی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ بکھرے اجزاء کی دوبارہ ترکیب

کے ممکن ہونے کے بعد حیات بعد الموت کا انکار کیا جائے جو بعض خاص حالات میں نبی اور رسول کی تصدیق اور تائید کے لئے اسی دنیا میں بصورت معجزہ ظاہر ہوجاتا ہے۔ اسکی مزید تفصیل معجزات کی حقیقت میں گزشتہ صفحات پر آچکی ہے۔

اکسیرِ حیات

جہاد اگر چہ قوم کے بعض افراد کے لئے پیغامِ موت بن کر اُن کو دنیوی لذائذ سے محروم کر دیتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ پوری امت اور قوم کے لئے اکسیر حیات ثابت ہوتا ہے اور ملک وملّت کی دوام وبقا کا ذریعہ بنتا ہے اور جو لوگ اس راہ میں کام آجاتے ہیں اُن کے لئے دائمی حیات اور باعزت موت کا باعث ہوتا ہے۔ موت وحیات کا یہی وہ فلسفہ ہے جس نے مسلمانوں کی زندگی کو دوسری قوموں سے اسطرح ممتاز کردیا کہ اللہ کا نام بلند کرنے والا مسلمان اگر زندہ رہا تو غازی اور مجاہد بنتا ہے اور اگر اس راہ میں کام آجاتا ہے تو شہید کے باعزت نام سے یاد کیا جاتا ہے:۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ. (بقرہ آیت ۱۵۴)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے اُنھیں مردہ نہ کہو بلکہ حقیقی حیات تو اُن ہی کو حاصل ہے لیکن تم اسکی حقیقت سے آگاہ نہیں۔

تہوّر یا شجاعت

اسلام نے شجاعت کو خُلُقِ حَسَنْ قرار دیا ہے اور بُزدلی کو نامردی اور عیب شمار کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کیا مسلمان سے گناہ ہوسکتا ہے؟ فرمایا ہاں ممکن ہے! پوچھا گیا کیا مومن بُزدل ہوسکتا ہے؟ ارشاد فرمایا نہیں! (الحدیث) حق پر قائم رہتے ہوئے غیر سے بے خوف ہوجانا شجاعت اور بہادری ہے بیجا قوت آزمائی یا بے مقصد ہجوم کرنا شجاعت نہیں تہوّر کہلاتا ہے جو انسانی کمالات سے متعلق نہیں ہے۔ سیّدنا حزقیل علیہ السّلام کے اس واقعہ میں شجاعت اور تہوّر کا نمایاں فرق معلوم ہوتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکلے اور جب دشمن کو دیکھا تو پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

تذکرہ
سیّدنا الیاسُ علیہ السّلام

تمہید

حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السّلام کے بعد قرآن حکیم میں اُن کے ابتدائی جانشینوں کے نام مذکور نہیں ہیں۔ حضرت یوشع علیہ السّلام کا ذکر دو جگہ آیا ہے مگر ایک جگہ فتیٰ (نوجوان) یعنی صاحب موسیٰ کہہ کر ذکر کیا گیا اور دوسری جگہ سورہ مائدہ میں حضرت یوشع اور کالب بن یوفنا کو رجلان (دو شخص) کہہ کر ذکر کیا ہے اور حضرت حزقیل علیہ السّلام کا ذکر مبارک ایک قصّہ کے ضمن میں سمجھا گیا ورنہ آیت میں اُن کے کسی نام یا وصف کا ذکر نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السّلام کے بعد قرآن حکیم میں سب سے پہلے جس نبی کا ذکر صراحت کے ساتھ آیا ہے وہ حضرت الیاس علیہ السّلام ہیں۔ یہ حضرت حزقیل علیہ السلام کے جانشین اور بنی اسرائیل میں ایلیا نبی کے نام سے مشہور ہیں۔

اسمِ گرامی اور سلسلہ نسب

قرآن حکیم نے ان کا نام الیاس بتایا ہے اور انجیل میں اِن کو ایلیا نبی کہا گیا ہے۔ حضرت الیاس علیہ السّلام کا ذکر خیر قرآن حکیم میں صرف دو مقام پر آیا ہے۔ ایک سورۂ انعام میں دوسرے سورۂ صافّات میں۔ سورۂ انعام میں تو صرف انبیاء کرام کی ایک فہرست میں آپکا اسم گرامی موجود ہے اور کوئی واقعہ یا تفصیل موجود نہیں۔ البتہ سورۂ صافّات میں آپ کی دعوت و تبلیغ کا مختصر تذکرہ ملتا ہے۔

کتب تفسیر میں آپؑ کے متعلق مختلف روایات ملتی ہیں جن میں بیشتر اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت الیاس اور حضرت ادریس علیہ السلام ایک ہی رسول کے نام ہیں لیکن اہل تحقیق نے اِن اقوال کی تردید کی ہے جسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم نے حضرت ادریس اور حضرت الیاس علیہما السلام کا تذکرہ جُدا جُدا کیا ہے اور دونوں کی نوعیتِ دعوت کو بھی مختلف بیان کیا ہے۔

علاوہ ازیں تمام مؤرخین نے حضرت ادریس علیہ السلام کا جو سلسلۂ نسب بیان کیا ہے وہ حضرت الیاس علیہ السلام کے سلسلۂ نسب سے بالکل مختلف ہے اور پھر تاریخی لحاظ سے دونوں میں صدیوں کا تفاوت بھی ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے بھی اپنی تاریخ "البدایہ والنہایہ" ص۳۳۹ پر تمام اقوال نقل کرنے کے بعد صحیح اسی کو قرار دیا ہے کہ دونوں حضرات مستقل رسول ہیں۔

حضرت ادریس علیہ السلام سیدنا نوح و سیدنا ابراہیم علیہما السلام کے درمیانی دور میں مبعوث ہوئے ہیں اور حضرت الیاس علیہ السلام اسرائیلی نبی ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد مبعوث ہوئے

مؤرخ طبری نقل کرتے ہیں کہ حضرت الیاس علیہ السلام، حضرت الیسع علیہ السلام کے چچازاد بھائی تھے اور اِنکی بعثت حضرت حزقیل علیہ السلام کے بعد ہوئی اور یہ کہ حضرت الیاس علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ سلسلۂ نسب اس طرح بیان کیا گیا ہے :- الیاس بن یاسین بن فخاض بن لیعزار بن ہارون (علیہ السلام)

سیدنا الیاس علیہ السلام اور قرآنِ حکیم

حضرت الیاس علیہ السلام اُردن کے علاقہ جلعاد میں پیدا ہوئے۔ اُس وقت ملک میں جو بادشاہ حکمران تھا اس کا نام کتاب بائیبل میں اَخی آب اور عربی تواریخ میں اَجبْ یا اخِبْ مذکور ہے۔

اسکی بیوی بعل نامی ایک بُت کی پرستار تھی اور اُس نے ملک میں بعل کے نام پر ایک بڑی قربان گاہ تعمیر کروا کر تمام بنی اسرائیل کو بُت پرستی کی راہ پر ڈال دیا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت الیاس علیہ السلام کو اسی قوم کی اصلاح و تربیت کیلئے مبعوث کیا تھا۔

دیگر انبیاء کرام کی طرح حضرت الیاس علیہ السلام کو بھی اپنی قوم کے ساتھ شدید

کشمکش سے دوچار ہونا پڑا۔ اِن کی قوم نے بھی اِن کو جھٹلایا اور چند مخلص بندوں کے سوا کسی نے بھی حضرت الیاس علیہ السلام کا ساتھ نہ دیا۔ بعض کتب تفسیر میں تفصیل کے ساتھ حالات بیان کئے گئے ہیں۔ خاص طور پر تفسیر مظہری میں علامہ بغوی کے حوالہ سے تفصیلی تذکرہ موجود ہے جو غالباً اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہے۔ دیگر کتب تفاسیر میں بھی ان واقعات کے بعض اجزاء حضرت وہب بن منبہؒ اور کعب احبارؒ کے حوالہ سے بیان کئے گئے ہیں جو اسرائیلی روایات نقل کرنے میں مشہور ہیں۔

ان تمام روایات میں جو قدرِ مشترک بات ہے وہ یہ کہ حضرت الیاس علیہ السلام نے اسرائیلی بادشاہ اخی آب اور اسکی رعایا کو بَعل نامی بُت کی پرستش سے منع کر کے اللہ واحد کی دعوت دی مگر دو چار حق پرست انسانوں کے علاوہ کسی نے بھی یہ بات نہ مانی بلکہ آپکو طرح طرح سے پریشان کیا یہاں تک کہ بادشاہ اور اسکی بُت پرست بیوی نے آپکو قتل کرنے کا منصوبہ بنالیا، آپ کو جب اسکی اطلاع ملی تو ایک دور افتادہ غار میں پناہ لی اور ایک عرصہ دراز تک وہیں مقیم رہے۔ اس درمیان ملک پر قحط سالی کا عذاب آیا ساری قوم پریشان ہوگئی اور آپ کو تلاش کرنے لگی تاکہ آپ سے دُعا کرواکر قحط سالی سے نجات پائیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم پر غار سے باہر آئے اور شہر کے بادشاہ اخی آب سے ملے اور بتایا کہ یہ عذاب اُس بُت پرستی اور شرک کی وجہ سے آیا ہے لہذا تم لوگ اب بھی توبہ کرلو عذاب دور ہوسکتا ہے۔ پھر آپ نے اپنی صداقت وسچائی کے لئے یہ بھی فرمایا کہ تم لوگ کہتے ہو کہ بَعل نامی بُت کے ساڑھے چار سو نبی ہیں جو اُس کی طرف سے مامور کئے گئے ہیں تم اُن سب کو ایک دن جمع کرو کہ وہ بَعل کے نام قربانی پیش کریں اور میں اللہ واحد کے نام قربانی پیش کروں گا جس کی قربانی کو آسمانی آگ آکر جلادے اُس کا دین سچا ہے۔[۱] اس تجویز کو بادشاہ اور اُس کی قوم نے پسند کیا۔ چنانچہ کوہِ کرمل کے مقام پر یہ اجتماع ہوا بَعل کے جھوٹے نبیوں نے بَعل کے نام پر قربانی پیش کی اور دوپہر تک بَعل سے التجائیں کرتے رہے مگر کوئی جواب نہ آیا، اس کے بعد حضرت الیاس علیہ السلام نے اپنی قربانی پیش کی۔ اسپر آسمان سے ایک آگ نمودار ہوئی اور اُس نے حضرت الیاس علیہ السلام کی قربانی کو جلاکر خاک کردیا۔ یہ دیکھ کر بہت سے لوگ سجدے میں گر پڑے اور حضرت الیاس علیہ السلام پر ایمان لے آئے لیکن بَعل کے یہ جھوٹے نبی اب بھی نہ مانے۔ اسکے بعد حضرت الیاس علیہ السلام نے انھیں وادی

[۱] زمانۂ قدیم میں اللہ تعالیٰ نے حق اور باطل کو جانچنے کیلئے یہ طریقہ مقرر کیا تھا۔ مزید تفصیل تذکرہ ہابیل وقابیل میں دیکھی جاسکتی ہے۔

قیثون میں قتل کروادیا۔

اس واقعہ کے بعد موسلا دھار بارش ہوئی اور قحط سالی دور ہوگئی لیکن بادشاہ اخی آب اور اسکی بت پرست بیوی اب بھی ایمان نہیں لائے وہ حضرت الیاس علیہ السلام کے اور بھی زیادہ دشمن ہوگئے اور آپکو قتل کرنے کی سازش میں پڑ گئے۔ آپ نے پھر روپوشی اختیار کی اور کچھ عرصہ کے لئے دوسرے شہر یہودیہ ہجرت کر گئے وہاں بھی بَعل پرستی کی وبا پھیل چکی تھی آپ نے حکمت کے ساتھ اپنی تبلیغ جاری رکھی وہاں کے حاکم نے بھی آپکی اطاعت سے انکار کیا اور آپ کی پیشگوئی کے مطابق کچھ عرصہ بعد ہلاک ہوگیا۔ پھر آپ دوبارہ اسرائیل تشریف لائے اور پھر یہاں کے بادشاہ اخی آب اور اُسکے بیٹے اختریاہ کی ہدایت کے لئے جدوجہد شروع فرمادی مگر وہ بدستور اپنے مذہب پر قائم رہا۔ آخر کار مختلف بیماریوں کا شکار ہوکر فوت ہوگیا۔ اسکے بعد اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی حضرت الیاس علیہ السلام کو اُٹھالیا۔

کُتب تفسیر میں یہ وضاحت نقل ہوتے چلی آرہی ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کی قوم جس بُت کی پوجا کرتی تھی اس کا نام بَعل تھا اور وہ سونے کا مجسمہ تھا بیس گز اُس کا قد تھا اُسکے چار منھ تھے اُسکی خدمت کے لئے چار سو خادم مقرر تھے۔ (روح المعانی ج ۲۳ ص ۱۲۴)

قرآنی مضمون

سورۂ صافات میں حضرت الیاس علیہ السلام کی تبلیغ کا ذکر اس طرح موجود ہے:۔

وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ. اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ. الخ (صافات آیات ۱۲۳ تا ۱۳۲)

اور بلاشبہ الیاس رسولوں میں سے ہیں۔

وہ وقت قابل ذکر ہے جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے؟

کیا تم بَعل کو پکارتے ہو اور سب سے بہتر پیدا کرنے والے خالق کو چھوڑ دیتے ہو۔

اللہ ہی تمہارا اور تمہارے باپ داداؤں کا پروردگار ہے.
پس اُنھوں نے الیاس کو جھٹلایا تو بے شک وہ لائے جائینگے
پکڑے ہوئے (جہنم میں) بجز اُن کے جو اللہ کے مخلص بندے ہیں.
اور ہم نے بعد کے لوگوں میں الیاس کا ذکر باقی رکھا.
الیاس پر سلام ہو.
بیشک ہم نیکو کاروں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں.
بیشک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے ہیں.
وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيسٰى وَاِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ.

(انعام آیت ۸۵)
اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو بھی ہم نے ہدایت عطا کی. یہ سب صالحین میں شمار ہیں.

نتائج و عبر

ایک تفسیری نکتہ

سورۂ انعام کے دسویں رکوع میں مسلسل اٹھارہ ۱۸ انبیاء کرام کے اسماء گرامی آئے ہیں. ان میں حضرت الیاس علیہ السلام کا اسم گرامی بھی موجود ہے. اور آخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں. آپ بھی ان کی پیروی کیجئے. ان سب کو ہم نے جہان والوں پر برتری بخشی ہے.

قرآن حکیم نے اس فہرست میں انبیاء کرام کو تین جُدا جُدا طبقوں میں بیان کیا ہے:-
پہلے طبقے میں حضرت داود، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون علیہم السلام.
دوسرے طبقے میں حضرت زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس علیہم السلام.
تیسرے طبقے میں حضرت اسمٰعیل، الیسع، یونس، لوط علیہم السلام.
اس ترتیب کی حکمت میں مفسرین کرام نے مختلف توجیہات لکھی ہیں، لیکن مفسر المنار نے بہت عمدہ حکمت بیان کی ہے جس کا حاصل یہ ہے:-

انبیاء بنی اسرائیل میں خصوصی امتیازات کے پیشِ نظر تین قسم کی جماعتیں گزری ہیں:۔

۱ بعض انبیاء صاحب تخت و تاج اور دولت و ثروت کے مالک تھے

۲ بعض ان کے بالکل برعکس زاہدانہ اور راہبانہ زندگی کے حامل تھے انھیں دولت و ثروت سے تعلق ہی نہیں بلکہ سخت بیزاری تھی۔

۳ تیسرا طبقہ چند انبیاء کرام کا ایسا بھی تھا جو نہ اپنی قوم کے حاکم تھے نہ صاحب دولت و ثروت تھے اور نہ ہی صرف زاہدانہ زندگی کے حامل تھے بلکہ اپنی قوم کے ساتھ متوسط معاش بھی رکھتے تھے نہ وہ محتاج تھے اور نہ صاحب دولت و ثروت۔

قرآن حکیم نے سورۂ انعام کے اس دسویں رکوع میں غالباً اسی خصوصی امتیاز کے پیشِ نظر ان انبیاء کرام کو سلسلہ وار تین طبقوں میں ذکر کیا ہے:۔

۱ پہلی فہرست میں حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام جو صاحبِ حکومت رسول ہیں اور حضرت ایوب و حضرت یوسف علیہما السلام اگرچہ صاحبِ مملکت نہ تھے لیکن اوّل الذکر ایک چھوٹی سی ریاست کے مالک تھے اور ثانی الذکر حکومت مصر کے وزیر اور مختارِ کل تھے۔ اسکے بعد حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا اسم گرامی آیا ہے جو نہ صاحبِ حکومت تھے نہ وزیرِ مملکت بلکہ اپنی قوم کے پیغمبر اور اُن کے سردار تھے (اس حیثیت سے صاحب اقتدار بھی تھے)

۲ دوسری فہرست میں حضرت زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس علیہم السلام کا تذکرہ ہے جو اپنے زُہد و قناعت میں مشہور زمانہ ہیں۔ ساری زندگی نہ اپنے لئے مکان بنایا نہ کھانے پینے کا سامان فراہم کیا دن بھر تبلیغ حق میں مشغول رہتے اور رات کو یاد الٰہی میں صرف کرتے جب نیند آتی تو ہاتھ کا تکیہ سر کے نیچے رکھ کر سو جاتے (اللہ اکبر)

۳ تیسری فہرست میں حضرت اسمٰعیل، الیسع، یونس، لوط علیہم السلام

کا ذکر ہے جن کی زندگی درمیانہ حالت کی رہی ہے انھوں نے نہ حکومت وسرداری کی اور نہ خالص زہد و قناعت اختیار کیا بلکہ متوسط زندگی سے وابستہ رہ کر تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے رہے اور قوم کی خیر خواہی میں اپنی زندگی صرف کردی۔

حیاتِ الیاسؑ علیہ السلام

حضرت خضر علیہ السلام کی طرح حضرت الیاس علیہ السلام کی حیات کے بارے میں بھی مؤرخین اور مفسرین نے تفصیلی بحث کی ہے۔ تفسیر مظہری میں علامہ بغویؒ کے حوالہ سے جو طویل روایت بیان کی گئی ہے اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ

حضرت الیاس علیہ السلام کو ایک آتشین گھوڑے پر سوار کرکے آسمان کی طرف اُٹھا لیا گیا تھا اور وہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی طرح زندہ ہیں۔ (مظہری ج ۸ ص۱۴۱)

علامہ سیوطیؒ نے بھی ابن عساکر اور حاکم کے حوالہ سے کئی ایک روایات نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہیں۔

کعب احبارؓ سے ایک روایت منقول ہے کہ چار انبیاء کرام ابتک زندہ ہیں۔ دو زمین میں حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت الیاس علیہ السلام اور دو آسمان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام۔
(دُرِ منثور ج ۵ ص۲۸۵)

اور بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت خضر اور حضرت الیاس علیہم السلام ہر سال رمضان المبارک میں بیت المقدس میں جمع ہوتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں۔ (تفسیر قرطبی ج ۱۵ ص۱۱۶)

لیکن مشہور ناقد حدیث حافظ ابن کثیرؒ نے اِن روایات کو صحیح قرار نہیں دیا۔ ان جیسی روایات کے بارے میں اُن کا اپنا یہ فیصلہ ہے:-

وَهُوَ مِنَ الْإِسْرَائِيلِيَّاتِ الَّتِيْ لَا تُصَدَّقُ وَلَا تُكَذَّبُ بَلِ الظَّاهِرُ اَنَّ صِحَّتَهَا بَعِيْدَةٌ۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱ ص۳۳۸)

یہ اُن اسرائیلی روایات میں سے ہیں جنکی نہ تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان روایات کی صحت بعید تر ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کعب احبار اور وہب بن منبہؒ جیسے علماء نے جو اہل کتاب کے علوم کے ماہرین میں سے تھے۔ اس قسم کی روایات مسلمانوں کے آگے بیان کی ہونگی جس سے حضرت الیاس علیہ السلام کی حیات کا نظریہ مسلمانوں میں پھیل گیا ورنہ قرآن وحدیث میں ایسی کوئی دلیل نہیں ملتی جس سے ان کی حیات کا عقیدہ قائم کیا جاسکے یا یہ کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان پر اُٹھالئے گئے ہوں۔ البتہ ایک روایت مستدرک حاکم میں ملتی ہے جس میں یہ بات مذکور ہے کہ تبوک کی راہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت الیاس علیہ السلام سے ہوئی۔

لیکن اس روایت کو محدثین نے موضوع (گھڑی ہوئی) قرار دیا ہے۔ مشہور ناقدِ حدیث علامہ ذہبیؒ اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں:-

> یہ حدیث موضوع ہے اللہ اُس کا بُرا کرے جس نے یہ حدیث گھڑی ہے اس سے پہلے میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ امام حاکم کی بیخبری اس حد تک پہنچ سکتی ہے کہ وہ اس حدیث کو صحیح قرار دیں۔

(دُرِمنثور ج ۵ ص۲۸۶)

الغرض کسی سندِ صحیح سے یہ ثابت نہیں ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام بقیدِ حیات ہیں۔ لہٰذا اس معاملہ میں احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ سکوت اختیار کیا جائے اور اسرائیلی روایات کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر عمل کیا جائے کہ

"نہ اُن کی تصدیق کرو نہ تکذیب"

کیونکہ قرآن حکیم کی تفسیر اور عبرت ونصیحت کا مقصد اس کے بغیر بھی پورا ہوجاتا ہے

واللہ اعلم۔

تذکرہ
سیدنا الیسع علیہ السلام

تعارف | حضرت اُلیَسَعَ علیہ السلام بنی اسرائیل پیغمبر ہیں۔ قرآن حکیم میں اور انبیاء کی طرح ان کا کوئی مستقل تذکرہ موجود نہیں البتہ انبیاء کرام کی فہرست میں انکو شمار کیا ہے اور صرف نام کی حد تک تذکرہ موجود ہے۔ اسرائیلی روایات میں بھی آپ کا اسم گرامی الیسع بیان کیا گیا ہے۔ کتب تاریخ میں یہ وضاحت بھی آئی ہے کہ آپ حضرت الیاس علیہ السلام کے چچازاد بھائی تھے۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں سلسلۂ نسب اس طرح لکھا ہے اور آپ کو حضرت یوسف علیہ السلام کی اولاد میں شمار کیا ہے :-

الیسع بن عدی بن شوتم بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہم السلام۔

بعثت | حضرت الیسع علیہ السلام حضرت الیاس علیہ السلام کے نائب اور خلیفہ ہیں۔ بچپن ہی سے آپ کی رفاقت میں رہتے تھے۔ تعلیم و تربیت بھی حضرت الیاس علیہ السلام سے پائی۔ اور جب حضرت الیاس علیہ السلام کا انتقال ہوا تو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی رہنمائی کے لئے حضرت الیسع علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز کیا۔ آپ نے حضرت الیاس علیہ السلام ہی کے طریقہ پر بنی اسرائیل کی قیادت فرمائی اور آخر عمر تک یہی خدمت انجام دیتے رہے۔

مزید تفصیلات سے قرآن حکیم اور احادیث صحیحہ ساکت ہیں۔

قرآن حکیم اور سیدنا الیسع | قرآن حکیم میں دو مقام پر حضرت الیسع علیہ السلام

کا اسم گرامی ملتا ہے اور صرف ذکر اسم پر اکتفا کیا گیا ہے اور آپ کو انبیاء کرام کی فہرست میں شمار کیا ہے۔

سورۂ انعام آیت ۸۶ اور سورۂ صٓ آیت ۴۸۔

وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ (انعام آیت ۸۶)

اور اسمٰعیل اور الیسع اور یونس اور لوط اور اِن سب کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت عطا کی ہے۔

وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ۔ (صٓ آیت ۴۸)

اور یاد کرو اسمٰعیلؑ اور الیسعؑ اور ذوالکفلؑ کو اور یہ سب اچھے لوگوں میں ہیں۔

حضرت الیسع علیہ السلام کی زندگی کا یہ اہم نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کی صحبت نے انھیں خلافت اور پھر اس کے بعد نبوت سے سرفراز کیا۔ نیکوں کی صحبت حصولِ خیر کے لئے نہایت مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ نیکوں کی صحبت کے چند لمحات بسا اوقات انقلابِ زندگی کا ذریعہ بنے ہیں۔

عارف رومیؒ کہتے ہیں :-

یک زمانہ صحبتے با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریاء

تذکرہ سیدنا شموئیل علیہ السلام

تمہید حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد تقریباً ساڑھے تین سو سال بنی اسرائیل میں نہ کوئی بادشاہ پیدا ہوا نہ پوری قوم کا کوئی ایک سردار تھا۔ خاندانوں اور قبائل میں چھوٹے چھوٹے سردار حکومت کرتے تھے اور اُن کے مناقشات و معاملات کے فیصلے مقرر کردہ قاضی انجام دیتے تھے اور موجودہ نبی ان تمام امور کی نگرانی کے ساتھ ساتھ دعوت و تبلیغ کی خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ حضرت یوشع علیہ السلام نے بھی اپنی آخر عمر تک یہی خدمت انجام دی اور قوم کے معاملات اور باہمی مناقشات کے فیصلوں کے لئے قاضیوں کو مقرر کیا تاکہ وہ آئندہ بھی اسی طرح اپنا نظام قائم رکھیں، کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے کسی قاضی کو منصب نبوت عطا ہوجاتا اور وہ دونوں خدمتیں انجام دیتے تھے۔ چونکہ پوری قوم کا کوئی ایک حکمراں یا سردار نہ ہوتا تھا اس لئے ہمسایہ اقوام اِن پر اکثر حملہ آور ہوتی رہتی تھیں اور بنی اسرائیل ان کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔ کبھی قوم عمالقہ چڑھ آتے اور کبھی فلسطین کبھی مدیانی قوم حملہ آور ہوتی تو کبھی آرامی قوم چھاپہ مارتی۔ آئے دن کی اس لوٹ مار، غارت گری سے پوری قوم بنی اسرائیل منتشر اور بے قوت ہوگئی تھی یہاں تک کہ چوتھی صدی موسوی کے آخر جبکہ عیلی کاہن کا دور تھا فلسطینی قوم نے اُنپر زبردست حملہ کیا اور شکست دے کر متبرک صندوق "تابوت سکینہ" بھی چھین لے گئے جسکی حفاظت بنی اسرائیل صدیوں سے کرتے چلے آرہے تھے۔ اس متبرک صندوق میں تورات کا اصلی نسخہ اور حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے عصا اور پیرہن اور من و سلویٰ کا برتن محفوظ تھا۔ فلسطینوں نے اس صندوق کو اپنے مشہور مندر "بیت دجون" میں رکھدیا یہ مندر ان کے سب سے بڑے دیوتا "دجون" کے نام سے موسوم تھا۔

اس بُت کا چہرہ انسانی شکل کا اور جسم مچھلی کا تھا۔ قصص الانبیاء کے مؤلف نجار مصری کہتے ہیں کہ فلسطین کے مشہور شہر رملہ کے قریب آج بھی ایک بستی بیت دجون کے نام سے پائی جاتی ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ تورات میں دجون کے جس مندر کا ذکر ہے وہ یہیں واقع ہوگا اور اسی نسبت سے بستی کا نام "بیت دجون" رکھ دیا گیا ہو۔

نام ونسب

عیلی کاہن کی وفات کے بعد قضاۃ میں سے ایک قاضی شموئیل کو جو تقویٰ وطہارت میں ممتاز تھے منجانب اللہ منصبِ نبوت عطا ہوئی اور وہ بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لئے مامور ہوئے۔

تاریخ کی بعض کتابوں میں یہ تفصیل بھی ملتی ہے کہ جب حضرت الیسع علیہ السلام کی وفات ہوگئی اسوقت مصر اور فلسطین کے درمیان بحر روم کے خطہ پر آباد عمالقہ قوم میں سے جالوت نامی جابر و ظالم حکمراں نے بنی اسرائیل کو مغلوب کر کے اُن کی آبادیوں پر قبضہ کرلیا اور اِن کے بہت سے سرداروں اور قبیلہ کے معزز لوگوں کو گرفتار کر کے ساتھ لے گیا اور تورات کو بھی جلا کر راکھ کر دیا۔ بنی اسرائیل کے لئے یہ ایسا نازک دور تھا کہ اِن میں نہ کوئی نبی و رسول موجود تھا اور نہ کوئی سردار اور امیر۔ خاندانِ نبوت میں سے صرف ایک حاملہ عورت کے اور کوئی باقی نہ تھا۔ ایسی بے سروسامانی کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے قوم پر کرم فرمایا اور اُس خاتون کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام شموئیل رکھا گیا اور اس بچے کی تعلیم و تربیت کے لئے بنی اسرائیل کے ایک بزرگ کو مقرر کیا گیا۔ شموئیل نے اُن بزرگ سے تورات حفظ کی اور دینی تعلیم حاصل کی۔ جب سنّ رُشد کو پہنچے تو تمام بنی اسرائیل میں ممتاز اور نمایاں تھے آخر اللہ تعالیٰ نے اِن کو منصب نبوّت سے سرفراز فرمایا اور قوم کی رُشد و ہدایت پر مامور کیا۔ کسی بھی قوم میں نبی و رسول کا مبعوث ہونا اُسکی نشاۃ ثانیہ کا باعث ہوتا ہے اور خدا کی تائید و نصرت اُس نبی کے لئے شاملِ حال ہو جاتی ہے۔ یہاں سے پھر بنی اسرائیل کے عروج و اقبال کا آغاز ہوا۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ حضرت شموئیل علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل سے تھے اور سلسلہ نسب یہ ہے :-

شموئیل بن حنّہ بن عاقر بن ...... عاقر سے اوپر کی کڑیاں

مذکور نہیں ہیں۔
شموئیل عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کا عربی میں ترجمہ اسمٰعیل سے کیا جاتا ہے اور کثرت استعمال سے شموئیل ہوگیا۔

طالُوتُ کی حکمرانی

بنی اسرائیل پر قوم عمالقہ کے ظلم وستم جب زیادہ ہوگئے تو انھوں نے اپنے نبی حضرت شموئیل علیہ السّلام سے درخواست کی کہ ہم پر ایک بادشاہ مقرر کردیں جسکی قیادت میں ظالموں کا مقابلہ کیا جاسکے اور جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ دشمنوں کی لائی ہوئی مصیبت کا خاتمہ کیا جاسکے۔

حضرت شمویل علیہ السّلام نے ان کے اصرار ومطالبہ پر اپنا یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر تم پر اللہ تعالےٰ کی جانب سے کوئی بادشاہ مقرر ہوگیا اور تم نے اُسکی مخالفت کی یا اگر وہ جہاد کا حکم دے تو کہیں بُزدل ثابت نہ ہوجاؤ اور جہاد سے انکار کر بیٹھو۔

بنی اسرائیل نے بڑی قوت سے جواب دیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جہاد جیسے مقدس فریضہ کا انکار کردیں۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ دشمنوں نے ہم کو بہت زیادہ ذلیل وکمزور کردیا ہے اور اُنھوں نے ہم کو ہمارے گھروں تک سے نکال باہر کیا ہے اور ہماری اولاد کو قید کرلیا ہے۔ ان کے اِس اصرار پر حضرت شمویل علیہ السّلام نے بارگاہِ الٰہی میں دُعا کی کہ ایسا کوئی انتظام فرمایا جائے جس سے قوم کی خواہش پوری ہو۔

درخواست منظور ہوئی اور اولادِ یعقوب (علیہ السّلام) سے ایک شخص بادشاہ نامزد ہوا جو علم اور جسم کے لحاظ سے نمایاں حیثیت رکھتا تھا اس کا نام طالوت تھا

بنی اسرائیل نے جب یہ سُنا تو منھ بنانے لگے اور ناگواری سے کہنے لگے یہ شخص تو غریب خاندان کا ہے اس کے پاس تو معمولی سی دولت بھی نہیں یہ کس طرح ہمارا بادشاہ ہوسکتا ہے۔ بادشاہت کا حق تو اس سے زیادہ ہم رکھتے ہیں ہم میں سے کسی کو بادشاہ مقرر کردیجئے۔

اس مخالفت کی ایک وجہ مؤرخین یہ لکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک عرصہ دراز سے نبوّت کا سلسلہ حضرت یعقوب علیہ السّلام کی نسل سے اولادِ لاوی میں اور حکومت وسرداری کا سلسلہ اولادِ یہودا میں چلا آرہا تھا اب جبکہ حضرت شموئیل علیہ السّلام نے

اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ شرف اولادِ بنیامین میں منتقل کر دیا تو بنی اسرائیل کے اِن سرداروں میں حسد پیدا ہوا اور وہ اسکو برداشت نہ کر سکے۔

بہرحال جب انھوں نے خلافِ توقع حکومت کو اولادِ بنیامین میں منتقل ہوتے دیکھا توحسد کی آگ نے انھیں برافروختہ کر دیا اور حضرت شموئیل علیہ السلام سے جھگڑا کرنے لگے۔

حضرت شموئیل علیہ السلام نے انھیں سمجھایا کہ مال و دولت کی کثرت کسی بڑائی یا بزرگی کی علامت نہیں ہے حکمرانی کے ذاتی اوصاف کے لئے قوتِ علم وطاقتِ جسم ضروری ہیں اور یہ دونوں وصف طالوت میں ممتاز و نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اس لئے اسکو بادشاہ مقرر کیا گیا ہے اسکی رہنمائی میں تم جہاد کرو اور اپنے آبائی وطن (فلسطین) کو حاصل کرو، اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اس شخص کے ساتھ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جسکو چاہے زمین کی حکمرانی کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔

آیاتِ ذیل میں اس واقعہ کو تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے:۔

قرآنی مضمون

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی ۘ الخ۔ (بقرہ آیات ۲۴۶، ۲۴۷)

کیا تم کو بنی اسرائیل کی اُس جماعت کا حال معلوم نہیں جس نے موسیٰ کے بعد اپنے زمانے کے نبی (شموئیل) سے درخواست کی کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے ہمارے لئے ایک حکمراں مقرر کر دیجئے! نبی نے اُن سے کہا کچھ بعید نہیں کہ اگر تم کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو تم لڑنے سے انکار کر دو!

سرداروں نے کہا ایسا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں جبکہ ہم اپنے اصلی گھروں سے نکالے جا چکے ہیں اور اپنی اولاد سے بھی علیحدہ کئے جا چکے ہیں، پھر جب اُن کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو تھوڑے سے آدمیوں کے علاوہ سب نے پیٹھ دکھلا دی، اور اللہ تو ظالموں سے خوف واقف ہے۔ آخر کار اُن کے اصرار پر اُن کے نبی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو حاکم مقرر کر دیا ہے۔

جب اُنھوں نے یہ بات سنی تو (اطاعت و فرمانبرداری کے بجائے) کہنے لگے وہ ہم پر کیسے حکمراں بن سکتا ہے جبکہ اُس سے کہیں زیادہ حکمراں بننے کے ہم حقدار ہیں، علاوہ ازیں اُس کو مال و دولت کی وسعت بھی حاصل نہیں تب نبی نے فرمایا (حکمراں کا جو معیار تم نے بنا لیا ہے وہ غلط ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے حکمرانی کی قابلیت و استعداد میں تم پر اُس کو برگزیدہ اور فائق کیا ہے اور علم کی فراوانی اور جسم کی قوت و طاقت دونوں میں اُسکو وسعت بخشی ہے اور حکومت و قیادت تمہارے چاہنے سے نہیں ملتی بلکہ اللہ جسکو چاہتا ہے اپنی زمین کی حکمرانی بخش دیتا ہے وہ بڑی وسعت والا جاننے والا ہے۔

تابُوتِ سکینہ

حضرت شموئیل علیہ السلام کی یہ حکیمانہ نصیحت کچھ مفید ثابت نہیں ہوئی قوم کا اصرار بڑھتا ہی گیا کہ بادشاہت کے لئے کسی دولت مند انسان ہی کا انتخاب ضروری ہے۔ آخر قوم کے دولتمند لوگ ایک غریب و مفلس کی کیونکر اطاعت قبول کرینگے۔ جب یہ نزاع طویل ہوگئی تو قوم کے بعض سرداروں نے کہا کہ اگر طالوت کا انتخاب اللہ تعالیٰ کی جانب سے طے پاچکا ہے تو اسکے لئے کوئی دلیل اور نشان چاہیئے تاکہ ہمیں بھی یقین ہوجائے کہ طالوت کا انتخاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

حضرت شموئیل علیہ السلام کی دُعا پر اللہ تعالےٰ نے ایک نشان و علامت عطا کی فرمایا کہ اے لوگو! تمہارے علم و یقین کے لئے اللہ تعالےٰ نے یہ نشانی روانہ کی ہے وہ یہ کہ جو متبرک صندوق تمہارے ہاتھوں سے چھین لیا گیا تھا جس میں تورات کا اصلی نسخہ اور حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے تبرکات محفوظ ہیں۔ وہ طالوت کی بدولت تمہارے پاس واپس آجائے گا۔ یہ اُسکے حق اور منجانب اللہ ہونیکی علامت ہوگی۔ اِدھر اللہ تعالےٰ نے ایسا انتظام فرمایا کہ وہ دشمن جو اس صندوق کو لے کر اپنے وطن چلے گئے تھے اسکو جہاں کہیں رکھتے وہاں کوئی نہ کوئی وبا اور بلا آجاتی۔ اس طرح اُن کے پانچ شہر ویران ہوگئے تھے آخر پریشان ہوکر اُن کافروں نے دو بیلوں پر اسکو لاد کر ہانک دیا۔ فرشتے بیلوں کو ہانک کر طالوت کے دروازے پر پہنچادیئے۔ صبح کے وقت قوم نے جو یہ تابوت دیکھا تو طالوت کی بادشاہت پر یقین لائے اور جہاد کے لئے آمادہ ہوگئے۔

تابوتِ سکینہ کا یہ واقعہ قرآن حکیم کی آیاتِ ذیل میں اس طرح آیا ہے :-

قرآنی مضمون

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۔الخ (بقرہ آیت ۲۴۸)

اور اُن کے نبی نے اُن سے کہا کہ طالوت کے بادشاہ ہونے کی یہ علامت ہے کہ وہ صندوق تمہارے پاس آجائے گا جسمیں تسکین کی چیز ہے تمہارے رب کی طرف سے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں جنکو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام چھوڑ گئے ہیں اُس صندوق کو فرشتے لے آئیں گے اسمیں تم لوگوں کے واسطے پوری نشانی ہے اگر تم یقین لانے والے ہو۔

چنانچہ حضرت شموئیل علیہ السلام کی یہ بشارت پوری ہوئی اور بنی اسرائیل کے آگے ملائکۃ اللہ نے تابوت سکینہ طالوت کو پیش کر دیا۔ اس طرح ان پر ظاہر ہو گیا کہ طالوت کا بادشاہ مقرر ہونا منجانب اللہ ہے۔

جہادِ مقدّس اور قتلِ جالوت

جب طالوت بادشاہ مقرر کر دیئے گئے تو انھوں نے بنی اسرائیل کو دشمنوں (فلسطینیوں) کے مقابلہ کیلئے کوچ کرنے کا حکم دیا اور ایک بڑی تعداد طالوت کی سرکردگی میں روانہ ہوئی، درمیان سفر حضرت طالوت نے خیال کیا کہ جنگ کا معاملہ بیحد نازک مرحلہ ہوتا ہے اور بنی اسرائیل عرصۂ دراز سے فریضۂ جہاد چھوڑ بیٹھے ہیں۔ بعض مرتبہ ایک شخص کی بزدلی یا منافقانہ حرکت پوری فوج کو نقصان پہنچا سکتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ بنی اسرائیل کو جہاد سے پہلے آزما لیا جائے کہ کون شخص تعمیل حکم اور ضبطِ نفس کا حامل ہے اور کس میں یہ اوصاف پائے نہیں جاتے تاکہ ادائے فریضہ سے قبل ہی ایسے عناصر کو علیحٰدہ کر دیا جائے۔

چنانچہ جب یہ لشکر ایک دریا کے کنارے پہنچا تو حضرت طالوت نے اعلان کیا کہ اللہ تعالےٰ اس نہر کے ذریعہ تمہارا امتحان لینا چاہتے ہیں وہ یہ کہ کوئی شخص بھی اس سے پانی نہ پیئے اور جو خلاف ورزی کرے گا اُس کو لشکر سے نکال دیا جائے گا۔

البتہ سخت پیاس کی حالت میں گھونٹ بھر پانی پی کر حلق تر کر لینے کی اجازت ہے۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ نہرِ اُردن پر پیش آیا۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے حضرت برار بن عازبؓ کہتے ہیں کہ ہم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپس میں یہ بات چیت کیا کرتے تھے کہ اصحابِ بدر کی تعداد اصحابِ طالوت کے برابر ہے۔ (بخاری باب المغازی)

الغرض جب یہ لشکر دریا کے پار ہوگیا تو جن لوگوں نے خلاف ورزی کر کے پانی پی لیا تھا وہ اپنے دشمن جالوت کی قوت و طاقت کو دیکھ کر کہنے لگے کہ ہم جالوت جیسے قوی ہیکل اور اُس کی فوجی طاقت سے لڑنے کی ہمت نہیں پاتے لہٰذا ہمیں واپس لوٹنے کی اجازت دی جائے۔

لیکن جن لوگوں نے ضبطِ نفس اور اطاعتِ امیر کا ثبوت دیا تھا انھوں نے جرأت اور بے خوفی سے کہا کہ ہم دشمن کا مقابلہ ضرور کریں گے اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ اللہ کی تائید و نصرت سے بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آگئی ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ اللہ پر اعتماد اور ثابت قدمی ہو۔

اسکے بعد اِن مخلص مجاہدین کا لشکر آگے بڑھا اور دشمن کی فوج کے آگے صف آرا ہوگیا، دشمن کی فوج کا سردار جالوت نامی مشرک دیو ہیکل شخص تھا اور اس کے لشکر کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ مجاہدین نے اللہ کی بارگاہ میں اخلاص و تضرع کے ساتھ دعا کی کہ اے اللہ ہمیں صبر و ہمت عطا کر اور ہمیں ثابت قدمی نصیب کر اور دشمنوں پر ہمیں کامیابی عطا فرما۔

تورات اور تاریخی کتب میں مذکور ہے کہ جالوت کی غیر معمولی طاقت و قوت نے بنی اسرائیل کو متأثر کر رکھا تھا اور اس کے آگے پیش قدمی کی ہمت کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی لیکن بنی اسرائیل کے اس لشکر میں ایک غیر معروف نوجوان جو اس سے قبل نہ شجاعت و بہادری میں کوئی شہرت رکھتا تھا نہ جنگ آزمودہ تھا جالوت کی مسلسل للکار پر مقابلہ کے لئے آگے بڑھا لیکن بنی اسرائیل کے سردار حضرت طالوت نے انھیں روکا اور کہا کہ ابھی تم ناتجربہ کار لڑکے ہو جالوت کے مقابلے کی برداشت نہ کر سکو گے لیکن اس نوجوان کا اصرار بڑھتا ہی گیا آخر حضرت طالوت کو اجازت دینی پڑی۔ یہ بہادر نوجوان حضرت داؤد علیہ السلام تھے (جو بعد میں نبوت سے سرفراز ہوئے)

کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے باپ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اور شرکتِ جنگ

کے ارادے سے بھی نہ آئے تھے بلکہ باپ کی جانب سے بھائیوں اور دوسرے اسرائیلیوں کے حالات معلوم کرنے بھیجے گئے تھے۔ جب انھوں نے جالوت کی جنگ طلبی للکار کو بار بار سنا اور اسرائیلیوں کی پس و پیش کو دیکھا تو اُن سے رہا نہ گیا اور وہ جالوت جیسے دیو ہیکل تجربہ کار آزمودہ جنگ کے مقابلے میں تنہا دوڑ پڑے اور میدانِ جنگ میں جالوت کو للکارا، جالوت نے اپنے مقابلہ میں ایک نوجوان کو دیکھ کر حقیرانہ انداز میں کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی مگر جب دونوں میں نبرد آزمائی شروع ہوگئی تو جالوت کو حضرت داؤد کی بے پناہ قوت و طاقت کا اندازہ ہوا اور وہ اپنے دفاع کی فکر میں پڑ گیا عظیم داؤد نے موقعہ پاکر اپنی گوپھن سنبھالی اور تاک کر پے در پے تین پتھر اسکے سر پر مارے اور جالوت کا سر پاش پاش کر دیا، آگے بڑھکر اُس کی گردن بھی کاٹ ڈالی۔ جالوت کے قتل کے بعد جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ جالوتی طاقت شکست کھانے لگی آخر کار میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوگئی۔ بنی اسرائیل فاتحانہ شہر فلسطین میں داخل ہوئے اور دشمنوں کی سب سے بڑی طاقت سے نجات پائی۔

اس واقعہ کے بعد فاتح سیدنا داؤدؑ کی شجاعت و دلیری کا ہر ایک معترف ہوگیا اور وہ ہر ایک کے ہر دل عزیز رہنما بن گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے سیدنا داؤد علیہ السلام کو نبوت و رسالت سے سرفراز کیا اور ایسی عظیم حکومت عنایت فرمائی جو تاریخ عالم میں ضرب المثل بن گئی (تفصیل تذکرہ سیدنا داؤد علیہ السلام میں ملاحظہ فرمائیے) حضرت طالوت کا یہ واقعہ اور ظالم جالوت کی ہلاکت اور سیدنا داؤد علیہ السلام کی عظیم الشان دلیری و شجاعت کا تذکرہ قرآن حکیم کی آیات ذیل میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

قرآنی مضمون

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ . الخ

(بقرہ آیات ۲۴۹ تا ۲۵۲)

پھر جب طالوت فوجوں کو لیکر (بیت المقدس سے قوم عمالقہ کی طرف) چلے تو انھوں نے کہا اللہ تعالےٰ تمہارا امتحان کریں گے ایک نہر سے۔ لہٰذا جو شخص اس نہر سے افراط کے ساتھ پانی پیئے گا وہ تو میرے ساتھیوں میں نہیں اور جو اس کو زبان پر بھی نہ رکھے وہ میرے ساتھیوں

میں ہے لیکن جو شخص اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر پی لے (تو اُسے اجازت ہے)
الغرض سب نے اُس نہر سے بے تحاشا پینا شروع کر دیا مگر تھوڑے سے
آدمیوں نے اُن میں سے (چکھا تک نہیں اس امتحان کی حکمت غالباً یہ معلوم
ہوتی ہے کہ ایسے مواقع پر جوش وخروش بھیڑ بھڑکا بہت ہو جایا کرتا ہے
لیکن وقت پر جمنے والے کم ہوتے ہیں اور اس وقت ایسوں کا اکھڑ جانا باقی
لوگوں کے پاؤں بھی اکھاڑ دیتا ہے۔ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگوں
کا علیحدہ کرنا منظور تھا۔ تفسیر بیان القرآن)

سُو جب طالوت اور جو اہل ایمان ان کے ہمراہ تھے نہر سے پار
اُتر گئے (تو ان لوگوں نے جو بے تحاشا پانی پی لیا تھا) کہنے لگے آج تو ہم میں
جالوت اور اُسکے لشکر سے لڑنے کی طاقت نہیں معلوم ہوتی (یہ سُنکر) وہ
لوگ جنہیں قیامت کے دن اللہ کے رو برو پیش ہونے کا یقین تھا کہنے
لگے کہ کثرت سے بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی جماعتوں پر اللہ
کے حکم سے غالب آگئی ہیں اور اللہ تعالیٰ ثابت قدم رہنے والوں کا ساتھ
دیتے ہیں اور جب جالوت اور اُسکی فوجوں کے سامنے میدان میں آئے
تو کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار ہم پر ثابت قدمی (غیب سے)
نازل فرمائیے اور ہمارے قدم جمائے رکھئے اور ہم کو اِس کافر قوم پر
غالب کیجئے (مؤمنین کی اس دُعا کی ترتیب بڑی پاکیزہ ہے کہ غلبہ کیلئے
چونکہ ثابت قدمی کی ضرورت ہے اس لئے پہلے اس کی دُعا کی گئی۔ اور
ثابت قدمی کا انحصار تقویتِ قلب پر ہے اس لئے ثابت قدمی سے
پہلے تقویت قلب کی دُعا کی) پھر طالوت والوں نے جالوت والوں کو
اللہ تعالیٰ کے حکم سے شکست دی اور داؤد (علیہ السلام) نے جالوت
کو قتل کر ڈالا اور (پھر) اللہ تعالیٰ نے داؤد کو سلطنت اور حکمت
(نبوت) عطا فرمائی اور جو جو بھی اللہ تعالیٰ کو منظور تھا اُن کو تعلیم فرمایا۔
اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعضے آدمیوں کو بعضوں کے ذریعہ
سے دفع کرتے رہا کرتے تو سرزمین (تمام تر) فساد سے بھر جاتی لیکن

اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں جہان والوں پر۔
یہ اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں (یعنی یہ قصّہ جو ذکر کیا گیا) جس کو
صحیح صحیح طور پر ہم تم کو پڑھ پڑھ کر سنا رہے ہیں (اور اس سے ثابت
ہوا کہ) اے نبیؐ آپ بلاشبہ پیغمبروں میں سے ہیں۔

بعض اسرائیلی روایات میں ہے کہ جالوت کی زبردست قوت وطاقت اور اُس کے لشکروں کی تعداد کا اندازہ کر کے حضرت طالوت نے جنگ سے پہلے اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص بھی جالوت کو قتل کر دے گا میں اُس سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دوں گا اور حکومت میں بھی حصّہ دوں گا۔

چنانچہ جب حضرت داؤد (علیہ السلام) نے جالوت کو قتل کر دیا تو حضرت طالوت نے حسب وعدہ اپنی لڑکی میکال کا نکاح اُن سے کر دیا اور حکومت میں بھی حصّہ دار بنا دیا۔

اسی دوران حضرت شموئیل علیہ السلام کا انتقال ہو گیا اور حضرت داؤد علیہ السلام اُنکی جگہ بنی اسرائیل کے نبی و رسول قرار پائے اور دنیاوی قیادت بھی حاصل ہوئی جس کا مفصل ذکر تذکرہ سیدنا داؤد علیہ السلام میں مطالعہ کیجئے۔

نتائج و عبر

مرکزیّت :-

بنی اسرائیل پر دشمنوں کے مسلسل حملوں اور غیر محفوظ زندگی نے مجبور کیا کہ اِن غیر یقینی حالات میں کسی رہنما اور قائد کا انتخاب ہونا چاہیئے چنانچہ انھوں نے حضرت شموئیل علیہ السلام سے یہ مطالبہ کیا کہ ہماری دُنیاوی زندگی کے تحفظ کے لئے ایک حکمراں منتخب فرمادیں۔

اُبْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ۔

(بقرہ آیت ۲۴۶)

جس قوم کے نصیبے میں عروج مقدّر ہوتا ہے اس کے بعض صالح افراد میں غیر شعوری طور پر

یہ احساس شدّت سے پیدا ہوجاتا ہے کہ اپنے لئے ایک مرکز بنایا جائے اور ایک قابلِ اعتماد رہنما کا انتخاب کیا جائے۔ یہ غیر شعوری احساس دراصل قوموں کی نشاۃ ثانیہ کا ذریعہ بنتا ہے اور جو قومیں ایسے حسّاس افراد سے محروم رہتی ہیں وہ بہت جلد دنیا سے معدوم ہوجاتی ہیں۔

جاہلی اعتقاد:۔

قوم کی خواہش و اصرار پر اُس زمانے کے نبی نے حضرت طالوت کو امیرِ لشکر مقرّر کر دیا تھا جو غیر معروف ہونے کے علاوہ دولت و ثروت سے تہی دست تھے۔ اقوام واُمم کے مختلف اعتقادات میں ایک عقیدہ یہ بھی رہا ہے کہ قیادت وحکومت اُسی شخص کو ملنی چاہیے جو دولت و ثروت کا مالک اور قوم میں نمایاں حیثیت رکھتا ہو اور حسب ونسب بھی معروف ومشہور ہو۔ بنی اسرائیل کا دامن بھی اس فاسدِ خیال سے خالی نہ تھا اُنھوں نے بھی حضرت طالُوت کی امارت پر اعتراض کرتے ہوئے یہ کہہ دیا۔

نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ۔ (بقرہ آیت ۲۴۷)

ہم اُسکے مقابلہ میں زیادہ مستحق حکومت ہیں اور اُس کو تو وسعتِ دولت بھی حاصل نہیں ہے۔

مگر اسلام نے اس جاہلانہ عقیدے کے خلاف یہ واضح کیا کہ اللہ تعالٰے کے نزدیک حکومت وقیادت کا تعلق دولت وثروت سے وابستہ نہیں ہے اور نہ حسب ونسب اسکے لئے علامت ہیں بلکہ علم وحکمت، قوت و انصاف جس فرد میں پائے جاتے ہیں عموماً اُس کا انتخاب عمل میں آتا ہے۔

حضرت شمویل علیہ السّلام نے اس فطری قانون کے مُطابق قوم کو جواب دیا:۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ۔ (بقرہ آیت ۲۴۷)

بیشک اللہ نے تم پر طالوت کو فضیلت دی ہے اور اُس کو علم وجسم کی وسعت عطا کی ہے۔

روحِ کامرانی :-

جب حق و باطل کا معرکہ پیش آتا ہے اور حق کی جانب سے مخلصین فدا کارانہ جذبات کے ساتھ حق کی حمایت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور انہیں خود اعتمادی سے زیادہ توکل علی اللہ کی روح سرایت کر جاتی ہے تو پھر کامیابی کا مدار قوت اور کثرت افراد پر نہیں ہوتا۔ بلکہ بسا اوقات قلت کثرت پر غالب ہو جاتی ہے اور کثرت مغلوب ہو کر بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔

اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے اس طرح ادا کیا ہے :-

كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ ۔ (بقرہ آیت ۲۴۹)

کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئی ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

(الحمد للہ "ہدایت کے چراغ" جلد اوّل ختم ہوئی)

بطوافِ کعبہ رفتم بحرم کُشادہ دیدم
کہ بُرونِ در تُو کردی کہ درونِ خانہ آئی

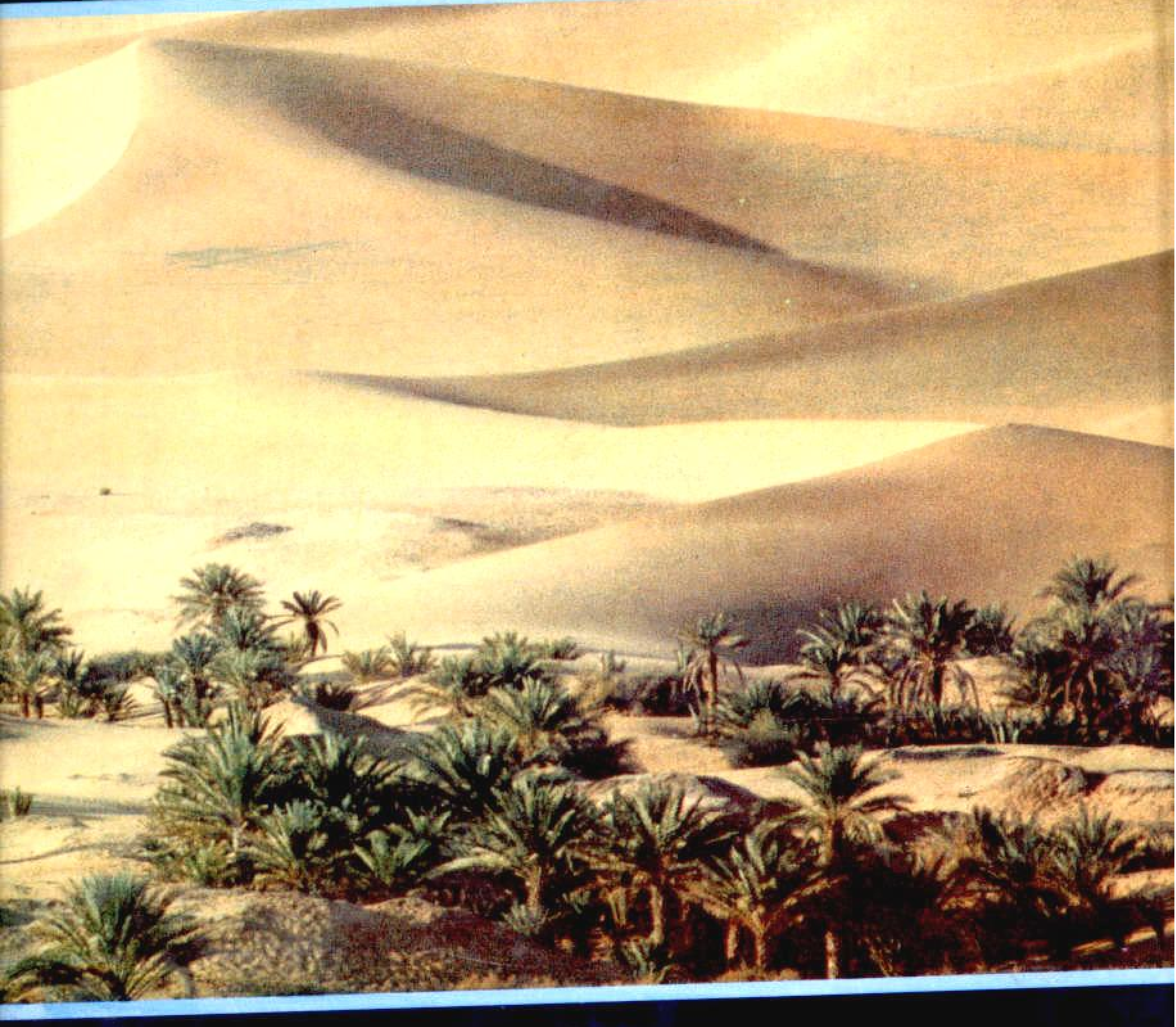
بزمین چوں سجدہ کردم ز زمیں ندا برآمد
کہ مرا بشاد کردی تو بسجدۂ خدائی

(الحمد للہ "ہدایت کے چراغ" جلد اوّل ختم ہوا)

جلد دوم

سیرتِ انبیائے کرام علیہم السلام

حضرۃ سیدنا داؤد علیہ السلام تا خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم



ادارہ اسلامیات

لاہور — کراچی

تبصرۃً وذکریٰ لکلِ عبدٍ منیبٍ

ہدایت کے چراغ

جلد ۲

یعنی

سیرت انبیائے کرام علیہم السلام

ابو البشر سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء سیدنا محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و دعوت تک تمام انبیائے کرام کے حالات و واقعات۔ قرآن کریم میں بیان کردہ قصص۔ قدیم اقوام اور سابقہ امتوں کا مستند تذکرہ۔ قرآن و حدیث کے اوراق سے سلیس زبان اور عام فہم انداز میں

حضرت سیدنا داؤد علیہ السلام تا خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

تالیف: مولانا محمد عبد الرحمن صاحب
استاذ حدیث و تفسیر، ناظم مجلس علمیہ حیدر آباد دکن

ناشر
ادارۂ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور ۲

طباعت اوّل : ربیع الاوّل ۱۴۱۱ھ

: اکتوبر ۱۹۹۰ء

باہتمام : اشرف برادران سلمہم الرحمان

ناشر : ادارہ اسلامیات، لاہور

مطبع : عرفان افضل پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت :

ادارہ اسلامیات

پبلشرز۔ بک سیلرز۔ ایکسپورٹرز

٭ ــــ دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور۔ فون ۷۲۳۳۱۲، ۷۲۴۳۸۵، فیکس ۹۲-۴۲-۷۲۴۳۸۵	٭ ــــ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان فون ــــ ۷۲۳۹۹۱، ۷۳۵۲۵۵	٭ ــــ موہن روڈ چوک اردو بازار، کراچی فون ۷۲۲۴۰۱

ملنے کے پتے

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی، لاہور ۲

دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی ۱

ادارۃ المعارف۔ دارالعلوم کورنگی، کراچی

مکتبہ دارالعلوم۔ دارالعلوم کورنگی، کراچی

تصریح

وزارة الاعلام

(الاعلام الداخلی)

جدّہ

الرقم: ٢٩٣٦/م اج

التاریخ: ١٦/٩/١٤٠٩ھ

ادارة الاعلام الداخلی۔جدّہ

فہرست عناوین

قصص القرآن

تالیف:

حضرت مولانا
قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی

اِدارۂ اِسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

● دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور۔ فون ۷۳۲۴۴۱۲، ۔ فیکس ۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲
● ——— ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان ۔ فون ۷۲۴۳۹۹۱ - ۷۳۵۳۲۵۵
● ——— موہن روڈ، اُردو بازار، کراچی ۔ فون ۷۷۲۲۴۰۱

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ

خلیفۃ الرسولؐ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نہایت مفصل و مبسوط تذکرہ
حالات و سوانح، دینی و سیاسی خدمات، کارناموں اور اخلاق و مکارم پر جامع و تحقیقی کتاب

مُرتّبہ

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے فاضل دیوبند
پروفیسر علی گڑھ یونیورسٹی

اِدارۂ اسلامیات
۱۹۰ - انارکلی ○ لاہور

تذکرہ
سیدنا داؤد علیہ السلام
(ذا الأید)

تعارف تذکرۂ حضرت شموئیل علیہ السلام میں حضرت داؤد علیہ السلام کا مختصراً ذکر آچکا ہے کہ وہ جالوت سے معرکہ آرائی میں اپنی بے نظیر شجاعت وصلاحیت کا مظاہرہ کرچکے تھے جس کی وجہ سے بنی اسرائیل میں اُن کی شخصیت قابل احترام ہوچکی تھی۔ پھر یہی حضرت داؤد آگے چل کر اللہ تعالیٰ کی جانب سے نبوت ورسالت سے بھی سرفراز ہوئے اور "خلیفۃ اللہ" کے معزز لقب سے پکارے گئے۔ آپ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد یہودا کی نسل سے ہیں۔

ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخ میں حضرت داؤد علیہ السلام کا سلسلۂ نسب اس طرح بیان کیا ہے :-

داؤد بن ایشا بن عوید بن عابر بن سلمون بن نحشون بن عویناذب بن ارم بن حصرون بن فرص بن یہودا بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام۔

تورات میں مذکور ہے کہ ایشا کے بہت سے لڑکے تھے اور حضرت داؤد اُن میں سب سے چھوٹے تھے۔ محمد بن اسحاق نے وہب بن منبہؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نسبتاً پستہ قد، نیلگوں آنکھیں، جسم پر بال بہت کم تھے۔ چہرہ اور جسم سے نفاستِ طبع اور طہارتِ قلب ظاہر ہوتی تھی۔

قرآن حکیم اور سیدنا داؤد علیہ السلام قرآن حکیم کی نو سورتوں میں آپ کا ذکر خیر آیا ہے کہیں تفصیل کے ساتھ

اور کہیں مختصر طور پر اسم گرامی سولہ[۱۶] جگہ موجود ہے۔
آیات کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

سورۂ بقرہ ——	آیت	۲۵۱
" نساء ——	"	۱۶۳
" مائدہ ——	"	۷۸
" انعام ——	"	۸۴ تا ۹۰
" اسراء ——	"	۵۵
" انبیاء ——	"	۷۸ تا ۸۲
" نمل ——	"	۱۵ تا ۴۴
" سباء ——	"	۱۰ تا ۱۴
" ص ——	"	۱۷ تا ۲۶ - ۳۰ تا ۴۰
—— کُل آیات		۷۱

نبوت و رسالت

بنی اسرائیل میں حضرت داؤد علیہ السلام کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی ایک یہ علامت بھی ہے کہ حضرت طالوت کی موجودگی ہی میں قوم نے انھیں اپنا حاکم اور سردار تجویز کر لیا تھا۔ اس طرح عنانِ حکومت بھی حضرت داود علیہ السلام کے ہاتھ آگئی۔ اسکے بعد اللہ تعالےٰ کا ایک خاص انعام یہ بھی ہوا کہ وہ منصب نبوت سے بھی سرفراز کر دیئے گئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے بنی اسرائیل میں عرصہ دراز سے یہ سلسلہ قائم تھا کہ ایک خاندان کے ساتھ ہمیشہ حکومت وابستہ تھی اور دوسرے خاندان سے نبوت و رسالت کا سلسلہ چلتا تھا۔ اولادِ یعقوب میں سے یہودا کے گھرانے میں نبوت کا سلسلہ تھا اور افراہیم کے خاندان میں حکومت و سلطنت تھی۔

حضرت داؤد علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنکے اندر یہ دونوں نعمتیں یکجا جمع کر دی گئی تھیں وہ اللہ کے پیغمبر و رسول بھی تھے اور صاحب تخت و تاج بھی۔

علاوہ ازیں انبیاء کرام کی جماعت میں حضرت آدم علیہ السلام کے علاوہ

کسی اور نبی کو "خلیفۃ اللہ" کے لقب سے قرآن حکیم نے یاد نہیں کیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام دوسرے نبی و رسول ہیں جن کو یہ لقب دیا گیا۔

حدودِ حکومت

حضرت داؤد علیہ السلام کی شجاعت و بسالت، قوتِ فکر و تدبیر یہ ایسے بلند اوصاف تھے کہ ہر موقعہ پر فتح و نصرت شاملِ حال رہتی تھی۔ دشمن خواہ کتنا ہی قوی اور لاتعداد ہو ہمیشہ کامیابی شاملِ حال رہتی تھی۔ اقتدار کے ہاتھ آنے کے تھوڑے ہی عرصہ میں شام، عراق، فلسطین، شرق اُردن کے تمام علاقوں پر غلبہ و تسلّط حاصل ہو گیا تھا۔ کثرتِ لشکر اور وسعتِ حدود مملکت کے ساتھ ساتھ وحی الٰہی کے شرف نے ان کی عظمت و شان کو اور بھی زیادہ بلند کر دیا تھا۔ رعایا کو یقین تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے کوئی معاملہ رکھدیا جائے یا کوئی پیچیدہ مسئلہ پیش آجائے جسمیں صدق و کذب کا امتیاز مشکل ہو جائے تو وحیٔ الٰہی کے ذریعہ ان پر حقیقتِ حال منکشف ہو جاتی ہے اس لئے جن و انس کو کبھی یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ اُن کے احکام کی خلاف ورزی کریں۔

ابن جریرؒ نے اپنی تاریخ میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ دو آدمی ایک بیل کا قضیہ لیکر حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس آئے اور ہر ایک دعویٰ کرتا تھا کہ یہ میرا ہے دوسرا غاصب ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس قضیہ کا فیصلہ دوسرے دن تک مؤخر کر دیا، دوسرے دن دونوں کو طلب فرما کر مدّعی سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی کے ذریعہ تیرے قتل کو واجب قرار دیا ہے۔ لہٰذا تو سچ سچ بات ظاہر کر دے۔ اُس نے کہا اے اللہ کے سچے نبی اس مقدمہ میں تو میرا بیان قطعاً سچا ہے اور یہ بیل میری ملکیت ہے۔ البتہ اس جھگڑے سے پہلے میں نے اس شخص کے باپ کو دھوکا دے کر قتل کر دیا تھا۔ یہ سُنکر حضرت داؤد علیہ السلام نے اُس کو قصاص میں قتل کرنے کا حکم دیا۔"

اس قسم کے واقعات ہوتے تھے جن کی وجہ سے حضرت داؤد علیہ السلام کے حکم کے آگے

سب فرمانبردار تھے۔
آیاتِ ذیل انہی تفصیلات سے متعلق ہیں:۔

قرآنی مضمون | وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ۔ (بقرہ آیت ۲۵۱)

اور اللہ نے اُن کو حکومت اور نبوت عطا کی اور جو علم چاہا وہ سکھایا۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ الخ

(صٓ آیت ۲۶)

اے داؤد ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ لہٰذا تم لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ حکومت کرنا اور خواہش نفس کی پیروی نکرنا کہ وہ تم کو اللہ کی راہ سے دور کر دیگی۔ اور بیشک جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں اُن کے لئے سخت عذاب ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے۔

وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا الآیۃ (انبیاء آیت ۷۹)

اور ہم نے ہر ایک (داؤد و سلیمان) کو حکومت بخشی اور علم عطا کیا۔

وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ۔

(صٓ آیت ۲۰)

اور ہم نے ان کی سلطنت مضبوط کر دی تھی اور ہم نے حکمت اور فیصلہ کُن بات کہنے کی صلاحیت بخشی تھی۔

کتاب اللہ زبور | بنی اسرائیل کی رُشد و ہدایت کے لئے بنیادی طور پر تورات ہی اللہ کی کتاب تھی۔ اس کے مطابق انبیاء بنی اسرائیل قوم کی رہنمائی کیا کرتے تھے لیکن حالات و واقعاتِ زمانہ کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو بھی کتاب عطا کی تھی جسمیں تورات کے مطابق احکام تھے اور

زید چند تشریحات بھی تھیں لیکن اس کا بیشتر حصہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تسبیح و تقدیس پر مشتمل تھا۔ پھر اللہ تعالےٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو ایسا دل آویز لحن عطا فرمایا تھا کہ جب وہ زبور شریف کی تلاوت فرماتے تو جنات و انسان حتیٰ کہ پرندے اور وحشی جانور تک وجد میں آجاتے تھے۔

روایات حدیث میں یہ بھی ہے کہ یہی تلاوت جب دریا کے کنارے کی جاتی تو بہتا پانی رُک جاتا تھا۔ مصنف عبد الرزاق اور دیگر کتب حدیث میں یہ روایت موجود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ابو موسیٰ اشعریؓ کی تلاوتِ قرآن کو سماعت فرماتے تو یہ ارشاد فرماتے :۔ "ابو موسیٰؓ کو اللہ تعالیٰ نے لحن داؤدی عطا کی ہے۔"

زبور کے معنیٰ حصے اور ٹکڑے کے ہیں چونکہ یہ کتاب دراصل تورات کی تکمیل کے لئے نازل کی گئی تھی تو اس کا نام زبور رکھا گیا گویا یہ بھی تورات کا ایک حصہ اور جزء رہے۔

زبور چند ایک قصائد اور مسجع کلمات کا مجموعہ تھا جس میں اللہ تعالےٰ کی حمد و ثنا، انسان کی عبدیت و عجز کا اعتراف اور پند و نصائح، نتائج و عبر کے مضامین تھے۔ مسند احمد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زبور کا نزول رمضان المبارک میں ہوا اور وہ مواعظ و حکم کا مجموعہ تھی۔

اسی کتاب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے تعلق سے بشارتیں موجود تھیں۔ قرآن حکیم میں اس کی تصدیق موجود ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ
يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ۔ (انبیاء آیت ۱۰۵)

اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔

مفسرین نے یہ تصریح کی ہے کہ آیت مذکورہ میں زبور کے جس واقعہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام کی بشارت سے متعلق ہے۔

بخاری شریف کتاب الانبیاء میں ایک روایت ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام پوری زبور کو اتنے مختصر وقت میں تلاوت کر لیا کرتے کہ جب وہ گھوڑے پر زین کسنا شروع کرتے تو تلاوت بھی شروع کر دیتے اور جب کس کر فارغ ہوجاتے تو پوری زبور تلاوت

کر چکے ہوتے۔

دراصل یہ حضرت داؤد علیہ السلام کا معجزۂ تلاوت تھا جو اللہ تعالےٰ نے انھیں عطا کیا تھا۔

تسخیر حیوانات، اور تسبیح جبال و طیور

یوں تو سب ہی رسول خصوصی شرف و امتیاز کے حامل ہو۔ اور اللہ تعالےٰ انھیں اپنے بے شمار انعام و اکرام سے ہے تاہم درجات کے لحاظ سے "فرق مراتب" بھی ہیں اور امتیازی درجات و مراتب اُن کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ الآیۃ

(بقرہ آیت ۲۵۳)

ان رسولوں میں ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق بھی قرآن حکیم نے چند خصوصیات کا ذکر کیا ہے اور یہ خصوصیات نبیوں میں بہت کم نبیوں کو دیئے گئے ہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام اللہ تعالےٰ کی تسبیح و تقدیس میں بہت زیادہ مشغول رہتے تھے اور اس قدر خوش الحان تھے کہ جب زبور شریف کی تلاوت کرتے یا اللہ کی حمد و ثنا فرماتے تو اِن کے دل نشیں لحن سے نہ صرف انسان و جن بلکہ چرند و پرند بھی بے خود ہو جاتے اور آپ کے گرد جمع ہو کر اللہ تعالےٰ کی تسبیح شروع کر دیتے۔ قرآن حکیم نے اسکی بھی تصریح کی ہے کہ پہاڑ بھی حضرت داؤد علیہ السلام کی حمد و ثنا میں شریک ہو جاتے اور اللہ تعالیٰ کی حمد میں گونج اُٹھتے۔

چرند و پرند اور پہاڑوں کا اپنی اپنی زبانوں سے تسبیح کرنا ایک حقیقت تھی جو بطور معجزہ حضرت داؤد علیہ السلام کو عطا کی گئی تھی۔

بے زبان مخلوقات اور جمادات کا تسبیح پڑھنا کوئی تمثیل یا مجاز نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے جسکو قرآن حکیم نے غیر مبہم الفاظ میں ظاہر کیا ہے:-

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَ
اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ۔ الآیۃ

(بنی اسرائیل آیت ۴۴)

ساتوں آسمان اور زمین اُسکی تسبیح کرتے ہیں اور وہ سب
مخلوقات جو اِن کے درمیان ہیں اور کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں جو
اللہ کی تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم اُن کی تسبیح کا فہم وادراک نہیں کرسکتے۔

آیتِ بالا میں خود اس شُبہ کا جواب موجود ہے کہ جب ہر چیز تسبیح کرتی ہے تو پھر ہم اُسکو کیوں نہیں سُن پاتے جبکہ سُننے کے لئے اللہ تعالےٰ نے ہمیں کان دیئے ہیں؟

شُبہ کا جواب قرآن حکیم یہ دیتا ہے کہ اِن مخلوقات کی تسبیح کا فہم انسانوں کو میسّر نہیں ہے۔ یہ ایسے ہی جیسا حیاتِ شہدار کا ادراک عام انسانوں کو نہیں ہے۔ وہ زندہ ہیں مُردہ نہیں۔

مشہور محدث ابن حزمؒ نے اپنی کتاب "الفصل" میں اس موقعہ پر ایک شبہ پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام تو یہ بیان کرتا ہے کائنات کی ہر شئے اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے لیکن ایک دہری (اللہ تعالےٰ کا منکر) انسان بھی شئے میں داخل ہے۔ حالانکہ وہ کسی لمحہ اللہ کی تسبیح نہیں کرتا لہٰذا آیت کا عموم کیسے باقی رہے گا۔

علامہ ابن حزمؒ کا یہ شُبہ دراصل کوئی حقیقی وزن رکھتا اور نہ اتنا اہم ہے۔ شاید شبہ بیان کرتے وقت اُن کی نظر قرآن حکیم کے اُس مطلب و مراد سے اُوجھل ہوگئی جو اس مقام پر قرآن کے پیشِ نظر ہے۔

قرآن حکیم یہ خود بیان کررہا ہے اور اُس کا مقصدِ بیان بھی یہی ہے کہ نافرمان انسان کے علاوہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح بیان کررہی ہے اور یہ انسان ہی ہے جو انکار اور بغاوت کررہا ہے۔ قرآن حکیم کا سیاق وسباق خود اس کا اظہار کررہا ہے۔

الغرض قرآن حکیم کا یہ ارشاد کہ کائنات کی ہر شئے اللہ کی حمد وثنا کرتی ہے اپنے حقیقی معنی پر محمول ہے اور زبانِ حال کے ساتھ اسکی تاویل کرنا عقل ونقل دونوں کے خلاف ہے۔ البتہ اُن کی یہ تسبیح وتحمید انسانوں کے عام فہم وادراک سے بالاتر رکھی گئی ہے اور اللہ تعالےٰ کی مرضی ومشیت کے تحت کبھی کبھی انبیاء ورسل کو اس کا فہم وادراک عطا ہوجاتا ہے جو اُن کے لئے بطور معجزہ و دلیل کے ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جب وہ صبح وشام اللہ کی حمد وثنا کرتے تو چرند وپرند اور پہاڑ بھی بلند آواز سے اللہ کی تسبیح وتحمید میں اُن کی ہمنوائی

کرتے اور حضرت داؤد علیہ السلام اُن کی تسبیح کو ظاہری کانوں سے سنتے۔ قرآن حکیم کی آیاتِ ذیل انہی حقائق کا اظہار کرتی ہیں۔

قرآنی مضمون

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ۔ (انبیاء آیت ۷۹)

اور ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو داؤد کے تابع کر دیا کہ وہ داؤد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور ہم ہی ہیں ایسا کرنے کی قدرت ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوُدَ مِنَّا فَضْلًا يٰجِبَالُ اَوِّبِىْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ

(سبا آیت ۱۰)

اور بیشک ہم نے داؤد کو اپنی جانب سے فضیلت بخشی ہے (وہ یہ کہ ہم نے حکم دیا) اے پہاڑو اور پرندو تم داؤد کے ساتھ ملکر تسبیح اور پاکی بیان کرو۔

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِىِّ وَالْاِشْرَاقِ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً كُلٌّ لَّهٗٓ اَوَّابٌ۔ (ص آیت ۱۸، ۱۹)

بیشک ہم نے پہاڑوں کو داؤد کے لئے مسخر کر دیا کہ اُن کے ساتھ صبح وشام تسبیح کرتے ہیں اور پرندوں کے پرے کے پرے جمع ہوتے اور سب اُن کی تسبیح کی وجہ سے مشغول ذکر رہتے۔

علامہ عینی نے محققین کے اس مسلک کو مختصر طور پر مگر مدلل بیان کیا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی حمد وثنا کرتی ہے وہ لکھتے ہیں:۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ الآیۃ کے معنی اہل تحقیق یہی بیان کرتے ہیں کہ ہر چیز اللہ کی حمد وثنا کرتی ہے اور ہر شئی کو اُسکے درجے کے مناسب زندگی حاصل ہے۔ نباتات میں زندگی اُس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کہ وہ سبز رہے اور خشک ہوجانا اُس کی موت کا اعلان ہے۔

جمادات کی زندگی اُسکے سالم و محفوظ رہنے سے وابستہ ہے

اور اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا اسکی موت کا پیغام ہے۔ اور اہل تحقیق کا یہی مسلک ہے کہ آیت بغیر تاویل کے اپنے عموم پر ہے۔ البتہ اسمیں اختلاف ہے کہ یہ اشیاء کیا حقیقۃً تسبیح کرتی ہیں یا اپنے حال سے صانع وخالق پر دلالت کرنا ہی خود انکی تسبیح ہے؟ تو اہل تحقیق کا فیصلہ یہی ہے کہ یہ اشیاء حقیقۃً تسبیح کرتی ہیں (گو ہمارے ادراک سے بالا تر ہو) اور جبکہ عقل بھی اسکو محال نہیں سمجھتی اور نص قرآنی بھی بصراحت اس کا اظہار کرتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا وہی مطلب لیا جائے جو اہل تحقیق نے سمجھا ہے۔ (عینی شرح بخاری ج ۱ ص ۔۔۔)

اہل عقل کا اسپر اتفاق ہے کہ گفتگو اور قول کے لئے "نطق وزبان" شرط نہیں اگر کسی شئی میں حیات اور صوت (آواز) موجود ہیں تو اسکی جانب قول کی نسبت درست وصحیح ہے۔ لہذا جانوروں کا تسبیح کرنا کچھ بعید نہیں، جدید سائنس کے دور میں تو یہ مشاہدہ ہو رہا ہے کہ نباتات کے اندر بھی "حیات واحساس" دونوں موجود ہیں۔ "چھوئی موئی" کا درخت ہاتھ لگانے سے مرجھا جاتا ہے اور ہاتھ الگ ہونے سے پھر شاداب ہو جاتا ہے۔ "مردم خور درخت" انسان یا حیوان کے قریب ہونے پر اس کا احساس کرتا ہے اور فوراً اپنی شاخیں دراز کر کے اسکو اپنی گرفت میں کر لیتا ہے یہ تو رات دن کے مشاہدات ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں کنکریوں کا کلمہ پڑھنا اُسطوانۂ حنانہ کا رو پڑنا حیوانات کا آپ سے کلام کرنا اس قدر مشہور ومعروف ہے کہ اس کا انکار سورج کے انکار کے مساوی ہے۔

لوہا اور فولاد جبکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی حکومت وسلطنت وسیع ترتھی باوجود اسکے مملکت کے مالیہ سے ایک درہم بھی نہیں لیتے اور اپنا اور اہل وعیال کی معاش کا بار بیت المال پر نہیں ڈالتے تھے بلکہ اپنی محنت اور ہاتھ کی کمائی سے حلال روزی حاصل کرتے اور اسی کو ذریعہ معاش بنایا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے اسی وصف معاش کو حدیث شریف میں اس طرح سراہا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کسی انسان کا بہترین رزق اسکے اپنے ہاتھ کی محنت سے کمایا ہوا رزق ہے۔ اور اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی محنت سے روزی کماتے تھے۔ (بخاری کتاب التجارہ)

علامہ عینی لکھتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام دُعا مانگا کرتے تھے الٰہی ایسی صورت پیدا فرما دے کہ میرے لئے ہاتھ کی کمائی آسان ہو جائے میں بیت المال پر اپنی معاش کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کی اس خواہش کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح پورا فرمادیا کہ اُن کے ہاتھ میں لوہے اور فولاد کو نرم کردیا جب وہ کوئی چیز بنانا چاہتے تو بغیر کسی آلات و اوزار کے فولاد کو جس طرح چاہتے کام میں لاتے اور وہ اُن کے ہاتھ میں آتے ہی موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا۔

قرآن حکیم نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے :۔

قرآنی مضمون

وَ اَلَنَّا لَہُ الْحَدِیْدَ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِی السَّرْدِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ

اور ہم نے داؤد کے لئے لوہا نرم کر دیا کہ بنائیں زرہیں کشادہ (جنگی آہنی لباس) اور ان کے جوڑیں مناسب انداز رکھیں اور تم سب نیک کام کریں میں خوب دیکھ رہا ہوں جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو۔

وَ عَلَّمْنٰہُ صَنْعَۃَ لَبُوْسٍ لَّکُمْ لِتُحْصِنَکُمْ مِّنْۢ بَاْسِکُمْ فَہَلْ اَنْتُمْ شٰکِرُوْنَ۔ (انبیاء آیت ۸۰)

اور ہم نے داؤد کو سکھائی زرہ بنانے کی صنعت تمہارے نفع کے لئے تاکہ تم لڑائی کے موقعہ پر اس سے بچاؤ حاصل کر سکو پس کیا تم شکر گزار بنتے ہو۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے لوہے کی صنعت نے اس حد تک ترقی کرلی تھی کہ فولاد کو پگھلا کر اُس کی سپاٹ تختیاں بنالی جاتی تھیں اور پھر اُن کو جوڑ کر جنگی لباس تیار کیا جاتا تھا لیکن یہ لباس بہت وزنی اور بھاری بھر کم جسم رکھتا تھا جو صرف قوی ہیکل انسانوں کے استعمال کے لئے ممکن تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام پہلے رسول ہیں جنکو اللہ تعالےٰ نے تعلیم وحی کے ذریعہ ایسی زرہیں ایجاد کرنے کی توفیق دی جو باریک زنجیروں کے حلقوں سے بنائی جاتی تھیں ہلکی اور کم وزن ہونے کی وجہ سے ہر انسان اسکو پہن کر میدانِ جنگ میں آسانی سے نقل و حرکت کر سکتا تھا۔

مَنطِقُ الطَّیر حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ بھی شرف عطا فرمایا تھا کہ وہ پرندوں کی بولیاں سمجھ لیا کرتے تھے اور وہ پرندوں سے گفتگو بھی کر لیتے تھے۔ منطق طیر کی تفصیلی بحث تذکرہ سیدنا سلیمان علیہ السلام میں آرہی ہے:۔

فصلِ خصومات قرآن حکیم نے حضرت داؤد علیہ السلام کے دورِ حکمرانی کے دو۲ مقدمات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جیسا کہ گذشتہ اوراق میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فہم کامل اور جھگڑا چکانے کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا (قرآن حکیم نے اس خصوصیت کو "فصل الخطاب" کے عنوان سے ظاہر کیا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں دو شخص ایک مقدمہ لیکر حاضر ہوئے ان میں سے ایک نے کہا کہ میری تیار شدہ کھیتی کو اس کے بکریوں نے چرچگ کر تباہ کر دیا ہے اور میرا پورا کھیت ختم ہو گیا ہے دوسرے نے اس کا اعتراف کیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے علم وحکمت کے پیشِ نظر یہ فیصلہ دیا کہ مدعی کی کھیتی کا نقصان چونکہ مدعیٰ علیہ کے بکریوں کی قیمت کے قریب قریب ہے لہذا یہ پورا گلہ بطور تاوان مدعی کو دیدیا جائے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جو ابھی کم عمر تھے اس وقت اپنے والد ماجد کے نزدیک ہی بیٹھے تھے کہنے لگے اباجان اگرچہ آپ کا فیصلہ صحیح ہے مگر اس سے بھی زیادہ مناسب شکل یہ ہے کہ مدعیٰ علیہ کا تمام ریوڑ مدعی کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ اسکے دودھ اور اون سے فائدہ اٹھائے اور مدعیٰ علیہ سے کہا جائے کہ وہ اس مدت میں مدعی کے کھیت کی خدمت انجام دے اور جب کھیت کی پیداوار اپنی اصلی حالت پر آجائے تو کھیت مدعی کے سپرد کر کے اپنا ریوڑ واپس لے لے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو بیٹے کا یہ فیصلہ بہت پسند آیا اور اسی کے مطابق فیصلہ دیا۔

قرآن حکیم نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اس معاملہ میں صاحبزادے سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ زیادہ مناسب رہا۔

فصلِ خصومات کا دوسرا مشہور واقعہ قرآن حکیم نے قدرے تفصیل سے بیان

کیا ہے۔

یہ واقعہ دراصل حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش سے متعلق ہے۔ قرآن حکیم نے اس واقعہ کو اسی آزمائشی حیثیت سے بیان کیا ہے کہ اس آزمائش میں حضرت داؤد علیہ السلام سے کچھ لغزش سی ہوگئی تھی جس پر اُنھوں نے اپنی بندگی اور اعترافِ تقصیر کا فوری اظہار کیا اور یہ بات اللہ تعالیٰ کو بہت پسند آئی اور اسی غرض کے تحت یہ واقعہ قرآن حکیم میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کے نیک بندوں سے جب کوئی نادانستہ لغزش ہوجاتی ہے تو وہ فوری متنبہ ہوجاتے ہیں اور بارگاہِ الٰہی میں توبہ واستغفار کیلئے سربسجود ہوجاتے ہیں۔ انبیاء کرام کے ایسے واقعات جن میں اُن سے کچھ لغزش ہوگئی اسی غرض کے لئے قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کا ممنوعہ درخت سے کچھ کھا لینا، حضرت نوح علیہ السلام کا اپنے مشرک بیٹے کے لئے دُعا کرنا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے آپ کو بیمار ظاہر کرنا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ ایک قبطی کا مارا جانا، حضرت یونس علیہ السلام کا وحی الٰہی کا انتظار کئے بغیر ہجرت کرجانا وغیرہ۔

اِن واقعات کا قرآن حکیم میں دُھرایا جانا اسی مقصد کے تحت ہے کہ اطاعت گزار بندوں سے جب بھی کوئی لغزش ہوجاتی ہے بغیر کسی تاخیر بارگاہِ الٰہی میں توبہ واستغفار کرتے ہیں۔ انبیاء کرام کا یہ اُسوہ ساری انسانیت کے لئے درس اور رہنمائی کا ذریعہ قرار پاتا ہے جو ایسے واقعات میں قرآن حکیم کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔

الغرض حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک ایسا ہی واقعہ قرآن حکیم نے بیان کیا ہے جس میں اُن کو کسی آزمائش میں ڈال دیا گیا تھا وہ دراصل دو آدمیوں کا جھگڑا تھا جس کا جلد فیصلہ دینے میں حضرت داؤد علیہ السلام سے لغزش ہوگئی اور اسکے بعد ہی انہیں اسکا احساس ہوا تو فوری درگاہِ الٰہی میں طالبِ مغفرت ہوئے اللہ تعالیٰ کو اِن کی یہ "انابت" بہت پسند آئی اُنھیں معاف کردیا اور اُن کی رفعتِ شان کو اور زیادہ بلند کردیا۔

قرآن حکیم اور احادیث صحیحہ میں اس واقعہ کی تفصیلات موجود نہیں اور نہ مستند اسلامی تاریخ میں اس واقعہ کی تفاصیل ملتی ہیں جن جن کتب تفسیر میں اس تعلق سے جو واقعہ لکھا گیا ہے وہ خالص اور خالص اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہے۔ محققین نے اِسکی شدت سے تردید کی ہے۔

لہٰذا اسکو نظر انداز کر کے اور ان تمام تفصیلات سے الگ ہو کر اہل تحقیق نے آیات کی جو تفسیر کی ہیں وہ یا تو آثار صحابہ سے منقول ہے یا قرآن حکیم کے سیاق و سباق سے ماخوذ ہے اس لئے یہی صحیح اور قابل توجہ ہے۔

علاوہ ازیں اوپر تفصیل سے لکھا جا چکا ہے کہ کسی بھی واقعہ کے نقل کرنے میں قرآن حکیم کا مقصد اُس واقعہ کے نتائج اور عبر کا اظہار کرنا ہوتا ہے نہ کہ واقعات کی تفصیلات اور اُسکی جزئیات۔

علامہ ابن حزم ظاہریؒ لکھتے ہیں کہ واقعہ صرف اس قدر ہے کہ ۲ دو شخص اچانک محراب داؤد میں داخل ہو گئے جہاں حضرت داؤد علیہ السلام مشغولِ عبادت تھے اور چونکہ ان دونوں کا معاملہ ایک نازک شکل اختیار کرنے والا تھا اس لئے اُس کے طے کرانے میں دونوں کو عجلت تھی جلد بازی میں دروازہ کھلوانے کے بجائے دیوار پھاند کر داخل ہو گئے۔

حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے روزمرہ کے معمولات کو چار دنوں پر اس طرح تقسیم کر لیا تھا:-

ایک ۱ دن خالص عبادتِ الٰہی کے لئے۔

ایک ۱ دن فصلِ مقدمات کے لئے۔

ایک ۱ دن بنی اسرائیل کی رُشد و ہدایت کے لئے۔

ایک ۱ دن خالص اپنی ذات کے لئے۔

یہ دونوں شخص عبادت الٰہی والے دن داخل ہوئے اور وہ بھی دیوار پھاند کر، حضرت داؤد علیہ السلام نے اچانک خلافِ معمول اس طرح ۲ دو انسانوں کو موجود پایا تو بتقضائے بشری گھبرا گئے۔ دونوں نے صورت حال کا اندازہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ آپ خوف نہ کریں ہم دونوں ایک جھگڑے میں آپ سے فیصلہ لینے آئے ہیں۔ یہ کہہ کر اُن میں سے ایک نے اپنی بات شروع کر دی کہ یہ میرا بھائی ہے اسکے پاس ننا نوے ۹۹ دنبیاں (بکریاں) ہیں اور میرے پاس صرف ایک ہی دُنبی (بکری) ہے۔ یہ مجھ سے اصرار کرتا ہے کہ یہ ایک دُنبی بھی میرے حوالہ کر دے اور اس نے گفتگو میں مجھے مغلوب کر دیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے جواب دیا اس شخص نے اپنی دنبیوں کے ساتھ تیری دُنبی ملا لینے کا مطالبہ کر کے یقیناً تجھ پر ظلم کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ مل جُل کر ساتھ رہنے والے لوگ اکثر ایک دوسرے پر زیادتیاں

کرتے رہتے ہیں۔ بس وہی لوگ اس سے بچے ہوئے ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔

یہاں یہ شبہ نہ ہونا چاہیئے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک ہی فریق کی بات سُنکر اپنا فیصلہ کیسے دے دیا؟ حقیقت یہ ہے کہ جب مدّعی کی شکایت پر مدّعا علیہ خاموش رہا اور اسکی تردید میں کچھ نہ بولا تو یہ خود اس کے اقرار کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے اس لئے حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی یہ رائے قائم کی کہ واقعہ وہی کچھ ہے جو مدّعی بیان کر رہا ہے۔

بہرحال حضرت داؤد علیہ السلام نے یکطرفہ فیصلہ دے دیا۔ لیکن بات کے ختم ہوئے کچھ دیر بھی نہ ہوئی تھی کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو شدّت سے احساس ہوگیا کہ اللہ تعالےٰ نے دراصل اس واقعہ سے میری آزمائش کرلی ہے فوری توبہ و استغفار کرتے ہوئے سجدہ میں گر پڑے۔

چونکہ قصور کی نوعیت ایسی شدید نہ تھی کہ اُسے معاف نہ کیا جاتا۔ اللہ تعالےٰ نے اُنھیں معاف کردیا اور دنیا و آخرت میں ان کو جو بلند مقام عطا تھا وہ بھی برقرار رہا۔

ہمارا خیال ہے کہ واقعہ کی یہ تشریح آیاتِ قرآنی سے ہٹکر نہیں ہے اور نہ اصولِ دین سے ٹکراتی ہے اور نہ عقلِ سلیم کے خلاف پڑتی ہے۔ علاوہ ازیں اقوالِ سلف کے خلاف بھی نہیں ہے۔ لہٰذا بعض مخالف روایات پر نہ نقد و تبصرہ کی ضرورت ہے اور نہ اُس پر سہارا کرنے کی ضرورت۔

اسکے بعد قرآن حکیم نے حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش سے متعلق جو واقعہ نقل کیا ہے نگاہِ عبرت سے پڑھا جائے۔

قرآنی مضمون

وَهَلْ أَتَاكَ نَبَأُ الْخَصْمِ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ الخ

(صٓ آیات ۲۱ تا ۲۶)

کیا آپ کو خبر پہنچی ہے اُن مقدمے والوں کی جو دیوار چڑھ کر اُس کے عبادت خانے میں گھُس آئے۔ جب وہ داؤد کے پاس پہنچے تو وہ اُنھیں دیکھ کر گھبرا گئے۔ اُنھوں نے کہا ڈریے نہیں ہم دو فریق مقدمہ ہیں جن میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ آپ ہمارے درمیان

ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کردیجئے اور بے انصافی نہ کیجئے اور ہمیں راہِ راست بتائیے۔

یہ میرا بھائی ہے اسکے پاس ننانوے دُنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک ہی دُنبی ہے۔ اِس نے کہاہے کہ یہ ایک دُنبی بھی میرے حوالہ کردے اور اُس نے گفتگو میں مجھے مغلوب کر دیاہے۔

داؤد نے کہا اس شخص نے اپنی دُنبیوں کے ساتھ تیری دُنبی ملالینے کا مطالبہ کرکے یقینا تجھ پر ظلم کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ مِل جُل کر ساتھ رہنے والے لوگ اکثر ایک دوسرے پر زیادتیاں کرتے رہتے ہیں۔ بس وہی لوگ اس سے بچے ہوئے ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں اور ایسے لوگ کم ہی ہیں، اور (یہ بات کہتے کہتے) داؤد سمجھ گئے کہ ہم نے دراصل اُن کی آزمائش کی ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے رب سے معافی چاہی اور سجدے میں گر پڑے اور رجوع کر لیا۔

تب ہم نے (بھی) ان کا قصور معاف کیا اور یقیناً وہ ہمارے ہاں عزت کا مرتبہ ہے اور بہتر ٹھکانہ ہے۔

اے داؤد ہم نے تم کو ملک میں (اپنا) نائب مقرر کیا ہے سو لوگوں میں انصاف کے ساتھ حکومت کرنا اور نفس کی خواہش پر نہ چلنا کہ وہ تم کو اللہ کی راہ سے ہٹا دیگی۔ بیشک جو لوگ اللہ کی راہ سے ہٹ گئے ہیں اُن کے لئے سخت عذاب ہے۔

ایک اور تشریح

قرآن حکیم کے سیاق وسباق اور آثار صحابہ سے استنباط پر مبنی گزشتہ توجیہہ سے جُدا اس واقعہ کی ایک اور تفسیر ہے جسکو مشہور محدّث حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے نقل کی ہے اور دیگر محدّثین نے اس روایت کو صحیح اور حسن تسلیم کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"ایک مرتبہ حضرت داؤد علیہ السلام نے جناب الٰہی میں ازراہِ ناز

عرض کیا الٰہی دن رات میں ایک ساعت بھی ایسی نہیں گزرتی کہ داؤد یا آلِ داؤد میں سے کوئی شخص ایک لمحہ کے لئے بھی تیری تسبیح و تہلیل میں مشغول نہ رہتا ہو (حضرت داؤد علیہ السلام نے دن و رات کے تمام اوقات اپنے گھر والوں پر تقسیم کر دیئے تھے کہ گھر ذکر الٰہی سے خالی نہ رہے) اللہ تعالیٰ کو اپنے اس مقرب اور مقبول بندے داؤد علیہ السلام کا یہ انداز پسند نہ آیا وحی آئی اے داؤد یہ جو کچھ بھی ہے صرف ہماری توفیق اور فضل و کرم کا نتیجہ ہے ورنہ تم میں یا تمہاری اولاد میں یہ قدرت کہاں کہ وہ اس نظم پر قائم رہ سکیں اور اب جبکہ تم نے یہ دعویٰ کر ہی دیا ہے تو میں تم کو ضرور آزمائش میں ڈالوں گا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے استدعا کی الٰہی جب ایسا ہو تو پہلے مجھے اطلاع دے دی جائے۔ لیکن آزمائش کے معاملہ میں حضرت داؤد علیہ السلام کی استدعا قبول نہیں ہوئی اور اُنھیں اس طرح آزمائش میں ڈال دیا گیا۔ جو قرآن حکیم میں مذکور ہے۔

یعنی حضرت داؤد علیہ السلام اس قضیے کے فیصلہ دینے میں تسبیح و تہلیل سے محروم ہو گئے اور اُس وقت آلِ داؤد میں بھی کوئی شخص عبادتِ الٰہی میں مشغول نہ تھا۔ بس یہی آزمائش تھی جس کا تذکرہ قرآن حکیم نے کیا ہے۔

وفات اور عمر شریف

مشہور محدث حاکمؒ نے اپنی کتاب مستدرک میں ایک روایت نقل کی ہے جو کتب صحاح ستہ میں بھی منقول ہے جس کا مضمون یہ ہے :-

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے عالم بالا میں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے اُن کی تمام اولاد کو نکال کر اُن کے سامنے پیش کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی اِن اولاد میں ایک خوبصورت چمکتی ہوئی پیشانی والے لڑکے کو دیکھا اور دریافت کیا پروردگار یہ کون لڑکا ہے؟

جواب ملا تمہاری اولاد میں بہت بعد میں آنے والا تمہارا لڑکا داؤد ہے۔
حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا الٰہی میں اپنی عمر کے چالیس سال
اس لڑکے کو بخشتا ہوں۔
مگر جب حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کا وقت آیا تو
حضرت آدم علیہ السلام نے ملک الموت سے کہا ابھی تو میری عمر میں
چالیس سال باقی ہیں۔ فرشتے نے جواب دیا آپ بھول گئے آپ نے
اپنی عمر کا یہ حصہ اپنے بیٹے داؤد کو بخش دیا تھا۔ پس آدم علیہ السلام
بھُولے۔ اُنکی ذرّیت بھی بھولنے لگی۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر شریف سو سال کی ہوئی۔
تورات اور کتب تواریخ میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے پیرانہ سالی میں انتقال
کیا اور اسرائیلیوں پر چالیس سال حکومت کی۔

جعفر بن محمد کہتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ستّر
سال حکومت کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام
کا انتقال یوم السبت (ہفتے کے دن) اچانک ہوا جبکہ وہ اپنے عبادت
والے دن ذکر الٰہی میں مشغول تھے اور پرندوں کی ٹکڑیاں پرے باندھے
اُن پر سایہ فگن تھیں۔ (مستدرک، فیض الباری)

نتائج و عبر

خلافت اور حکومت خلیفۃ اللہ کی خلافت اور بادشاہ کی حکومت کے
درمیان یہ واضح فرق نظر آئے گا کہ اوّل الذکر میں ہر
قسم کی شان وشوکت کے باوجود تواضع، انکساری، خدمت خلق، عدل وانصاف
کا نمایاں حصہ ملے گا اور ثانی الذکر میں کبر ونخوت، جبر وانانیت، زعم وپندار کا غلبہ
نظر آئے گا۔ وہ مخلوق خدا کو ایک مقدس امانت کے بجائے محکوم اور آلۂ کار سمجھیگا۔

قرآن حکیم اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ
اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔
(الحج آیت ۴۱)

جن لوگوں کو ہم زمین کی خلافت دیتے ہیں وہ نمازوں کو قائم کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور نیکی کا حکم کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

حضرت سیدنا داؤد علیہ السلام کی چالیس سالہ خلافت میں یہ سب چیزیں نظر آتی ہیں۔

قانونِ سرفرازی

زمانۂ قدیم سے اللہ تعالےٰ کا یہ قانون چلا آرہا ہے کہ جو شخص عزت وعروج پر پہنچنے کے بعد جس قدر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر اور اس کے فضل وکرم کا اعتراف کرتا ہے اُسی قدر اُسکو مزید انعام واکرام سے نوازا جاتا ہے۔ خاصانِ الٰہی کی زندگی میں یہ کیفیت نمایاں نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی اگلی زندگی پچھلی زندگی سے ممتاز اور کمالات سے بھرپور ہوا کرتی ہے۔

وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی۔ (والضحیٰ آیت ۴)

حضرت داؤد علیہ السلام بایں جلالتِ قدر معمولی لغزش پر توبہ واستغفار کرتے کرتے سجدہ میں گر پڑے۔ اسکے صلہ میں اللہ تعالےٰ نے اُنھیں یہ خوشخبری دی۔

وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰی وَحُسْنَ مَاٰبٍ۔ (ص آیت ۲۵)

اور یقیناً ہمارے ہاں اُنکا مرتبہ ہے اور اچھا ٹھکانہ۔

مشترکہ تجارت اور ضمانت

سیدنا داؤد علیہ السلام کے تذکرہ میں فصلِ مقدمات کے دو واقعے بیان کئے گئے ہیں جنکی تفصیل گزشتہ اوراق میں آچکی ہے۔ اِن میں ایک مقدمہ کا فیصلہ دینے کے بعد سیدنا داؤد علیہ السلام اپنا تاثر اس طرح بیان کرتے ہیں۔

وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَیَبْغِیْ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ اِلَّا الَّذِیْنَ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ۔ (ص آیت ۲۴)

اور اکثر شرکار (کی عادت ہے کہ) ایک دوسرے پر (یوں ہی) زیادتی کیا کرتے ہیں مگر ہاں جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں۔ (ایسی زیادتی سے احتیاط کرتے ہیں) اور ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں۔

قرآن حکیم کی اس آیت میں مشترکہ کاروبار ــــــــ کا ایک عام عیب بیان کیا گیا ہے اور آج کے دور میں اس کا عام چلن دیکھا بھی جاتا ہے۔ مشترکہ تجارت میں ہر شریک مال تجارت کا اور نفع کا مالک ہوتا ہے اور اسی مِلکی تصوّر سے مالکانہ حقوق اور قوتِ اختیار کا شدید احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہی احساس کبھی کبھی ظلم و زیادتی، خُورد و بُرد، چوری و خیانت کے حدود میں داخل کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے کاروبار، قدیم مشترکہ تجارتیں، لمیٹڈ کارخانے، شرکار کی خودغرضی، ظلم و خیانت اور ایک دوسرے کی حقوق تلفی کے باعث تباہ و برباد ہو گئے ہیں۔ البتہ اس مصیبت سے وہی تجارت محفوظ رہی ہے جسکے شرکار صاحب ایمان اور اعمالِ صالحہ کے پابند رہے ہوں۔ قرآن حکیم نے جہاں یہ تجارتی عیب بیان کیا ہے وہاں اس کا علاج بھی بیان کیا ہے اور یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ ایسے نیک و صالح شرکار بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ مشترکہ کاروبار کرنے والوں کے لئے قرآن حکیم کی یہ آیت تجارت کیلئے حفاظت و امانت کی حیثیت رکھتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی اس ضمانت کی شہادت دیتی ہے۔ آپؐ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَنَا ثَالِثُ الشَّرِيْكَيْنِ مَالَمْ يَخُوْنَا الخ (الحدیث)

دو شریک تجارت میں میری حیثیت تیسرے شریک کی ہے۔ جب تک دونوں خیانت کے مرتکب نہ ہوں۔ جب وہ خیانت کرتے ہیں تو میں جُدا ہو جاتا ہوں۔

گویا مشترک تجارت کا ایک شریک خود رب العالمین بھی ہے بشرطیکہ اس تجارت میں خیانت یا چوری نہ ہو۔

ذَا الْاَيْدِ سیّدنا داؤد علیہ السلام کا ایک لقب "ذَا الْاَيْدِ" بھی بیان کیا گیا ہے۔ (ص آیت ۱۷) اسکا لفظی ترجمہ "ہاتھوں والا" اور یہ لفظ جب صفت کے طور پر استعمال کیا جائے تو اس کے لفظی معنی مراد نہیں ہوتے اور نہ اس معنی کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ "ید" کے معنی جہاں ہاتھ کے آتے ہیں وہاں طاقت و قوت کے بھی آتے ہیں۔ لہٰذا جب کسی کی صفت

کے طور پر یہ لفظ بولا جائے تو ان کے لازمی معنی "صاحبِ قوت" کے ہوتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے حضرت ابراہیم واسحاق ویعقوب علیہم السلام کا یہی لقب بیان کیا ہے۔ (ص آیت ۴۵)

سیدنا داؤد علیہ السلام کی صفت میں یہ لفظ قرآن حکیم نے استعمال کیا ہے جس کا غیر مبہم ترجمہ قوتوں والا ہوگا۔ ان قوتوں سے کونسی قوت مراد ہے؟ تفصیلات سے قرآن حکیم ساکت ہے لیکن قرآن حکیم نے مختلف عنوانات کے تحت اُن کے جو اوصاف بیان کئے ہیں اُن میں مثلاً جسمانی قوت بھی مراد ہے جس کا مظاہرہ حضرت داؤد علیہ السلام سے جنگ جالوت کے موقعہ پر ظاہر ہوا۔ قوتِ فیصلہ بھی مراد ہے کہ ہر بات کا فیصلہ نہایت خوبی سے کر دیا کرتے تھے اور جب بولتے تو نہایت فیصلہ کن تقریر ہوتی۔

فوجی وسیاسی طاقت بھی مراد ہے جسکی بدولت اُنھوں نے مشرک قوموں کو شکست دیکر ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھی اور اپنا آبائی وطن فلسطین بھی آزاد کروالیا۔

اخلاقی طاقت بھی مراد ہے جسکی بدولت اُنھوں نے بادشاہی میں فقیری کی اور زندگی بھر اپنے ہاتھ کی کمائی سے روزی حاصل کی۔

عبادت کی طاقت بھی مراد ہے جس کا یہ حال تھا کہ جن وانس کی حکمرانی اور جہاد فی سبیل اللہ کی بے شمار مشغولیت کے باوجود زندگی بھر ایک دن روزہ رکھتے ایک دن افطار کرتے رہے اور ہر روز ایک تہائی رات عبادت میں گزارتے تھے۔

امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں حضرت ابوالدرداءؓ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر آتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے:۔

كَانَ اَعْبَدَ الْبَشَرِ۔ (الحدیث)

وہ انسانوں میں سب سے بڑے عبادت گزار بندے تھے۔

تذکرہ
سیدنا سلیمان علیہ السلام
اور
ملکۂ سبا

تعارف حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں لہذا ان کا نسب بھی یہودا (اولادِ یعقوب) کے واسطے سے حضرت یعقوب علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔

قرآن حکیم نے ان کو اولاد ابراہیم (علیہ السلام) میں شمار کیا ہے۔ والدہ ماجدہ کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ تورات اور دیگر کتب تاریخ میں بنت سبع نام بتایا گیا ہے لیکن اہل تحقیق نے اسکی تردید کی ہے کیونکہ اسی تورات کی وضاحت کے مطابق یہ نام حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک فوجی افسر اُوریاہ کی بیوی کا تھا۔ اس لئے بھی یہ نام تاریخی حیثیت سے صحیح نہیں ہے۔

البتہ ایک حدیث میں صرف اس قدر منقول ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سلیمان بن داؤد (علیہ السلام) کی والدہ نے ایک دفعہ اپنے بیٹے سلیمان (علیہ السلام) کو یہ نصیحت فرمائی :۔

> بیٹا رات بھر نہ سوتے رہا کرو اس لئے کہ رات کے اکثر حصہ کو نیند میں گزارنا انسان کو قیامت کے دن اعمالِ خیر سے محتاج بنا دیتا ہے۔ (ابن ماجہ)

قرآن حکیم نے بھی صرف اسقدر بتایا ہے کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے واسطے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں :۔

> وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ۔ (انعام آیت ۸۵)

> اور ہم نے ابراہیم کو اسحٰق و یعقوب عطا کئے ہر ایک کو ہدایت

بخشی اور نوح کو بھی ابراہیم سے پہلے ہدایت بخشی اور اِس ابراہیم کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان کو ہدایت عطا کی۔

قرآنِ حکیم اور سیدنا سلیمان علیہ السلام

قرآنِ حکیم میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر مبارک ۱۶ سولہ جگہ آیا ہے۔ ان میں چند مقامات پر کچھ تفصیلی ذکر موجود ہے اور اکثر جگہ مختصر طور پر اُن انعامات کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُن پر اور اُن کے والد بزرگوار حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئے ہیں۔ اُن مقامات کی تفصیلات یہ ہیں:۔

سورہ بقرہ — آیت ۱۰۲
〃 نساء — 〃 ۱۶۳
〃 انعام — 〃 ۸۵
〃 انبیاء — آیات ۷۸، ۷۹، ۸۱۔
〃 نمل — 〃 ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۳۰، ۳۶، ۴۴۔
〃 سبا — آیت ۱۲
〃 ص — آیات ۳۰، ۳۴۔

جملہ ۱۶ سولہ آیات۔

وارثِ داؤد علیہ السلام

حضرت سلیمان علیہ السلام کی فطرت ہی میں اللہ تعالیٰ نے ذکاوت، فصلِ مقدمات اور اصابت رائے کا کمال رکھا تھا بچپن ہی میں اس کے مظاہرے پائے گئے۔ اپنے والد حضرت داؤد علیہ السلام کی معیت میں جب سِنِ شعور کو پہنچے تو اس وقت حضرت داؤد علیہ السلام کا انتقال ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اِنھیں نبوت سے سرفراز کیا اور حکومت میں بھی حضرت داؤد علیہ السلام کا جانشین بنایا۔ قرآن حکیم نے اسی جانشینی کو حضرت داؤد علیہ السلام کی وراثت قرار دیا ہے۔ گویا وہ حکومت کے ساتھ ساتھ اپنے والد کی نبوت میں بھی وارث قرار پائے۔ نبوت کوئی وراثت کی چیز نہیں ہے جو لازماً اولاد کے حصے میں آئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے

بعض انبیاء علیہم السلام پر یہ بھی فضل کیا ہے کہ اُنکی اولاد کو نبوت میں بھی اُن کا جانشین بنایا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام بھی اُن انبیاء کرام میں سے ایک ہیں۔

اسکے علاوہ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی خصوصیات اور امتیازات سے نوازا تھا جسکی بدولت وہ طبقۂ انبیاء و رسل میں ممتاز حیثیت سے معروف ہیں:-

وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ الآیۃ (نمل آیت ۱۶)

اور وارث ہوئے سلیمانؑ (حضرت) داؤد (علیہ السلام) کے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا الآیۃ (نمل آیت ۱۵)

اور ہم نے داؤد و سلیمان کو علم عطا کیا۔

مَنْطِقَ الطَّيْرِ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی امتیاز حاصل تھا کہ وہ پرندوں کی بولیاں سمجھ لیتے تھے اور اُن سے کلام بھی کر لیا کرتے تھے۔ قرآن حکیم نے اس خصوصیت کو جس اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے وہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ ایسی عظیم الشان نعمت تھی جسکو آیت اللہ کہا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں خود حضرت سلیمان علیہ السلام اس عظیم نعمت کو "فضل مبین" قرار دیتے تھے۔

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِينُ۔ (نمل آیت ۱۶)

یہ منطق الطیر (پرندوں کی بات چیت) بلاشبہ ایسے ہی تھی جیسا کہ ایک انسان دوسرے سے بات کرتا ہے۔ جسمیں صوت (آواز) اور الفاظ کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عطا و بخشش تھی اس لئے اسکو اسباب دُنیوی سے کوئی علاقہ نہ تھا اور نہ یہ اکتسابی طور پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ دنیا میں لوگ آج بھی پرندوں اور چرندوں کی آواز سے اُن کا منشاء و مراد جان لیتے ہیں جیسا کہ پالتو جانوروں کی بھوک پیاس کے وقت کی آواز، مالک کو دیکھ کر خوشی و مسرّت کی آواز، دشمن کو دیکھ کر خوفناک آواز وغیرہ یہ اور اس قسم کی آوازوں کو سمجھنا "منطق الطیر" نہیں ہے بلکہ قیاس و تخمین ہے جنکو زیادہ سے زیادہ علم اشارات کہا جا سکتا ہے۔ یہ علم تھوڑے تجربے سے ہر ایک کو حاصل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح منطق الطیر سے وہ علم بھی مراد نہیں جو موجودہ علمی دور میں علم زولوجی کی راہ سے حاصل کیا گیا ہے اس لئے کہ یہ بھی محض اٹکل کا تیر ہے جو قیاس و ظن سے حاصل

کیا گیا اسمیں قطعیت تو کُجا قیاس بھی مشکوک ہے۔ خود علم حیوانات کے ماہرین کے نزدیک بھی یہ غیر یقینی ہے۔ علاوہ ازیں یہ خود ایک اکتسابی علم ہے جو تھوڑی بہت محنت و توجہ کے بعد ہر شخص کو حاصل ہوسکتا ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس علم کو قرآن حکیم نے جس اہتمام اور قدر فرمائی کے انداز میں بیان کیا ہے وہ ایسا معمولی اور غیر اہم نہیں ہوسکتا جسپر احسان و کرم جتلایا جائے اور حضرت سلیمان علیہ السلام اسکو ایک عظیم الشان نعمت قرار دیں۔

یقیناً یہ ایک عظیم الشان معجزہ تھا جو اسباب دُنیوی سے بالا تر قانونِ خاص کے تحت حضرت سلیمان علیہ السلام کو عنایت کیا گیا تھا وہ چرند و پرند کی بولیاں انسان ناطق کی گفتگو کی طرح سمجھتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ہُدہُد کا مکالمہ جس انداز سے قرآن حکیم نے بیان کیا ہے وہ اسکی واضح شہادت ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

قرآن حکیم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس شرف خاص کا اس طرح ذکر کیا ہے:۔

قرآنی مضمون

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ

(نمل آیت ۱۵، ۱۶)

اور بیشک ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا اور ان دونوں نے کہا تعریف اللہ ہی کے لئے زیبا ہے جس نے اپنے بہت سے مومن بندوں پر ہم کو فضیلت عطا کی ہے۔

اور سلیمان داؤد کے وارث ہوئے اور انھوں نے کہا اے لوگو! ہم کو پرندوں کی بولیوں کا علم دیا گیا ہے اور ہم کو ہر چیز بخشی گئی ہے بیشک یہ اللہ کا کھلا ہوا فضل ہے۔

نادرُ الوجود حکمرانی

حضرت سلیمان علیہ السلام کے خصوصی امتیازات میں سے ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے "ہوا" کو انکے زیر فرمان کر دیا تھا وہ جب اور جہاں چاہتے اُس کو چلنے اور رُک جانے کا حکم دیتے تھے۔ ہوائیں اُنکے

حکم سے نرم اور سبک رفتار ہوجاتی تھیں اور جب تیز روی کا حکم دیتے تو برق رفتاری کا یہ عالم ہوتا کہ اُس کے دوش پر سوار ہو کر ایک ماہ کی مسافت صبح کے اولین ساعت میں اور ایک ماہ کی مسافت شام کے آخری لمحات میں طے کر لیتے تھے۔ اِن کا تختِ شاہی ہوا اپنے کاندھوں پر لیکر جہاں وہ چاہتے پہنچادیتی تھی۔

تسخیرِ ریاح اور مسافتِ رفتار کی یہ کیفیت کوئی تمثیلی یا مجازی حیثیت سے نہ تھی بلکہ ایک حقیقت تھی جو ہر طرح کی تاویل و تخیل سے بالاتر ہے۔ یہ ایسے ہی جیسا کہ آجکل ہوائی جہاز پر سفر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح عام قوانینِ قدرت کے تحت کائنات کی اشیاء کو اسباب کے ساتھ مربوط کر دیا ہے۔ اسی طرح اپنے کچھ قانونِ خاص کے تحت انبیاء و رُسل کے ساتھ وہ معاملہ فرمایا ہے جسکو اسلامی زُبان میں معجزہ یا آیت کہا جاتا ہے۔ ہوا کا تابعِ امر ہونا اسی قسم سے ہے۔

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے زیرنگیں نہ صرف انسان ہی تھے بلکہ جنات اور حیوانات بھی تابع فرمان تھے اور یہ اقتدار ایسا تھا کہ کائنات میں شاید ہی کسی اور کو عطا کیا گیا ہو۔

اس عطائے خاص کے بارے میں قرآن حکیم یہ بھی اظہار کرتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک مرتبہ بارگاہ الٰہی میں یہ دُعا کی :-

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي
إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ۔ (صٓ آیت ۳۵)

اے پروردگار مجھ کو بخش دے اور مجھکو ایسی حکومت عطا کر جو میرے بعد کسی کے لئے بھی میسّر نہ ہو بے شک تو بہت دینے والا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا کو قبول فرمایا اور ایک ایسی عجیب و غریب حکومت دی کہ نہ اُن سے پہلے کسی کو نصیب ہوئی اور نہ اُن کے بعد کسی کو میسّر آئی۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک صبح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا گزشتہ شب ایک سرکش جن نے اچانک یہ کوشش کی کہ میری نماز میں خلل ڈالے۔ اللہ تعالےٰ نے مجھکو اُس پر قابو دے دیا اور میں نے اسکو پکڑلیا۔ اسکے بعد میں نے ارادہ کیا کہ اُس کو

مسجد کے ستون سے باندھ دوں تاکہ تم لوگ دن میں اُس دیکھ سکو مگر اس وقت مجھ کو اپنے بھائی سلیمان (علیہ السلام) کی یہ دُعا یاد آگئی کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا:۔

رَبِّ هَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ الآیۃ

یہ یاد آتے ہی میں نے اُسکو ذلیل کر کے چھوڑ دیا (بخاری کتاب الانبیاء)

یہ عمل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے کہ آپنے اپنی شخصیت کو حضرت سلیمانؑ سے بالاتر کرنا پسند نہیں کیا۔

تعمیر بیت المقدس

اللہ تعالیٰ نے جنّات کو ایسی مخلوق بنایا ہے جو مشکل سے مشکل اور سخت سے سخت کام انجام دے سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اس تسخیر کی بدولت حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ ارادہ کیا کہ مسجد اقصیٰ کے چاروں جانب ایک بڑا شہر آباد کیا جائے اور مسجد کی از سر نو تعمیر بھی کی جائے، اُن کی خواہش تھی کہ مسجد اور شہر کو بیش قیمت پتھروں سے بنوائیں اور اسکے لئے دور دراز علاقوں سے قیمتی اور حسین پتھر فراہم کئے جائیں۔ چنانچہ جنات سے یہ خدمت لی وہ دور دراز علاقوں سے خوبصورت اور بڑے بڑے پتھر جمع کر کے لائے، اور شہر بیت المقدس کی تعمیر کا کام انجام دیتے۔

اس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے مسجد اقصیٰ اور شہر کی تعمیر جدید عمل میں آئی جو آج تک لوگوں کے لئے باعثِ حیرت ہے کہ ایسے دیو پیکر پتھر اور چٹانیں کہاں سے لائے گئے؟ کس طرح لائے گئے؟ اور اُس زمانے کے مختصر و محدود وسائل کے باوجود وہ کون سے آلات استعمال کئے گئے جن کے ذریعہ اُن پتھروں کو ایسی بلندیوں پر پہنچا کر باہم پیوست کر دیا گیا یہ سب کام حضرت سلیمان علیہ السلام کی نگرانی میں جنات کی جماعتوں نے انجام دیا تھا۔ جنات نے بیت المقدس کی تعمیر کے علاوہ اور بھی تعمیرات کیں اور بعض ایسی چیزیں بھی بنائیں جو اس زمانے کے لحاظ سے عجیب و غریب سمجھی جاتی تھیں۔

تفسیر بیضاوی میں ایک اسرائیلی روایت نقل کی گئی ہے جس سے جنات کی صنعت گری کا پتہ چلتا ہے۔ جنات نے تختِ سلیمانی کو اس کاریگری سے

بنایا تھا کہ تخت کے نیچے دو زبردست اور خونخوار شیر کھڑے کئے اور دو گدھ معلق تھے اور جب حضرت سلیمان علیہ السلام تخت پر جلوہ افروز ہونے کے لئے تخت کے قریب تشریف لے آتے تو وہ دونوں شیر اپنے بازو پھیلا کر بیٹھ جاتے اور تخت نیچا ہو جاتا اور وہ اس پر بیٹھ جاتے تو پھر شیر کھڑے ہو جاتے اور فوراً ہیبتناک گدھ اپنے پروں کو پھیلا کر حضرت حضرت سلیمان علیہ السلام کے سر پر سایہ فگن ہو جاتے تھے۔

(بیضاوی سورہ سبا)

اسی طرح جنات نے پتھر کی بڑی اور بھاری دیگیں بنائی تھیں جو اونچے اونچے چولہوں پر قائم تھیں اور اپنی بلند و بالا قامت کی وجہ سے حرکت میں نہیں آتی تھیں۔ بڑے بڑے حوض پتھر کی چٹانوں میں تراش کر بنائے تھے اور اس طرح شہر بیت المقدس اور ہیکل (مسجد اقصیٰ) اور ان سب اشیاء کی تعمیر میں صرف سات سال صرف ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کے منجملہ احسانات میں سے ایک عظیم احسان یہ بھی تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو پگھلے ہوتے تانبے کے چشمے فراہم کئے گئے تھے جسکو تعمیرات کے استحکام میں گارے اور چونے کے بجائے استعمال کیا جاتا تھا۔ بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کا یہ انعامِ خاص تھا کہ زمین کے جن حصوں میں تانبا پانی کی طرح پگھل کر بہہ رہا تھا اُن چشموں کو حضرت سلیمان علیہ السلام پر آشکارا کر دیا تھا اور اُن سے پہلے کوئی شخص زمین کے اندر دھات کے چشموں پر آگاہ نہ تھا۔

ابن کثیرؒ نے حضرت قتادہؓ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ پگھلے ہوئے تانبے کے یہ چشمے ملک یمن میں تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر ظاہر کر دیا تھا۔

(البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۲۸)

قرآنی مضمون | وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلٰى

الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْہَا وَکُنَّا بِکُلِّ شَیْءٍ عٰلِمِیْنَ ۔ (انبیاء آیت ۸۱)

اور مسخر کر دیا سلیمان کے لئے تیز و تند ہوا کہ اُن کے حکم سے اُس زمین پر چلتی تھی جسکو ہم نے برکت دی تھی اور ہم ہر شئے کے جاننے والے ہیں۔ (یعنی ملک یمن سے ملک شام جو اُس زمانے میں ایک ماہ کی مسافت پر تھا چند گھنٹوں میں ہوا انکو وہاں پہنچا دیا کرتی تھی)

وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ غُدُوُّھَا شَہْرٌ وَّرَوَاحُہَا شَہْرٌ الخ

(سبأ آیت ۱۲، ۱۳)

اور سلیمان کے لئے مسخر کر دیا ہوا کو کہ صبح کو ایک ماہ کی مسافت طے کراتی تھی اور شام کو ایک ماہ کی مسافت، اور ہم نے اُن کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہا دیا اور ایسے جن اُن کے تابع کر دیئے جو اپنے رب کے حکم سے اُن کے آگے کام کرتے تھے اور اُن میں سے جو ہمارے حکم سے سرتابی کرتا اسکو ہم بھڑکتی آگ کا مزہ چکھاتے۔[۱] وہ جنات اُن کے لئے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتے اُونچی عمارتیں اور مجسمے اور حوض جیسے بڑے بڑے لگن اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی بھاری دیگیں، اے داؤد کے خاندان والو عمل کرو شکر گزاری کے طریقے پر اور میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار ہیں۔

فَسَخَّرْنَا لَہُ الرِّیْحَ تَجْرِیْ بِاَمْرِہٖ رُخَآءً حَیْثُ اَصَابَ

(صٓ آیت ۳۶)

اور مسخر کر دیا ہم نے ہوا کو سلیمان کے لئے کہ وہ چلتی ہے اُن کے حکم سے نرمی کے ساتھ جہاں وہ پہنچنا چاہتے۔

وَمِنَ الشَّیٰطِیْنِ مَنْ یَّغُوْصُوْنَ لَہٗ وَیَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِکَ وَکُنَّا لَہُمْ حٰفِظِیْنَ ۔ (انبیاء آیت ۸۲)

اور شیاطین (سرکش جنوں) میں سے ہم نے ایسے بہت سوں کو سلیمان کا تابع بنا دیا تھا جو ان کے لئے سمندر میں (موتی نکالنے کے لئے) غوطے لگاتے اور اُس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے اِن سب کے نگراں ہم ہی تھے۔

---

[۱] جنات و شیاطین صبح و شام سیدنا سلیمان علیہ السلام کے سامنے صف بستہ ادب و احترام سے کھڑے ہوتے تھے اور حکم کے منتظر رہتے تھے۔

وَحُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ جُنُوْدُہٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّیْرِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ (النمل آیت ۱۷)

اور سلیمان کے لئے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کئے گئے تھے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔

وَالشَّیٰطِیْنَ کُلَّ بَنَّاءٍ وَّغَوَّاصٍ وَّاٰخَرِیْنَ مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ. هٰذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِکْ بِغَیْرِ حِسَابٍ.

(ص آیت ۳۷، ۳۸، ۳۹)

اور سرکش جنوں کو بھی اُنکے تابع کر دیا۔ ہر طرح کے معمار اور غوطہ خور اور دوسرے وہ بھی جو زنجیروں میں جکڑے رہتے تھے (سرکش و باغی قسم کے) ہم نے سلیمان سے کہا یہ ہماری عطا ہے تم کو اختیار ہے جسکو چاہو دو اور جس سے چاہے روک لو کوئی حساب کتاب نہیں۔

اصیل اور سُبک رفتار گھوڑے

حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعاتِ زندگی میں ایک مختصر واقعہ قرآن حکیم نے نقل کیا ہے۔ اس واقعہ کی روئیداد قرآن حکیم میں موجود ہے۔ اس لئے مفسرین نے اسکی وضاحت مختلف عنوان سے کی ہیں۔ پہلے جس حد تک قرآن حکیم نے واقعہ بیان کیا ہے اسکو مِنْ وَعَنْ نقل کیا جانا مناسب ہے پھر اہل تفسیر کی وضاحت درج کی جائے۔ قرآن حکیم نے اس واقعہ کا آغاز اس طرح فرمایا ہے:-

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَیْمٰنَ نِعْمَ الْعَبْدُ الخ

(صٓ آیت ۳۰ تا ۳۳)

اور داؤد کو ہم نے سلیمان (جیسا بیٹا) عطا کیا وہ بہترین بندہ تھا کثرت سے اپنے رب کی طرف رجوع کرنے والا۔

(اس کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے) جب اسکے سامنے شام کے وقت اصیل اور سُبک رفتار گھوڑے پیش کئے گئے تو وہ کہنے لگے (افسوس) میں اس مال کی محبت کی خاطر اپنے رب کی یاد سے غافل ہو گیا یہاں تک کہ آفتاب پردہ (مغرب) میں چھپ گیا

(غالباً کوئی نماز فوت ہوگئی پھر خادموں کو حکم دیا کہ) اِن گھوڑوں کو ذرا میرے سامنے لاؤ (چنانچہ لائے گئے) سو انھوں نے اِن گھوڑوں کی پنڈلیوں اور گردنوں پر (تلوار سے) ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا (یعنی اِن کو ذبح کر دیا) (درمنثور) (یہ مالی صدقہ تھا جو بطور کفارہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں تقسیم کر دیا گیا)

بس اسی حد تک قرآن حکیم نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اس میں یہ تفصیل نہیں ہے کہ غفلت کیوں ہوگئی؟ وہ ذکر اللہ کیا تھا جو گھوڑوں کے معائنہ میں چھوٹ گیا؟

حافظ ابن کثیرؒ نے اس واقعہ کی حقیقت اس طرح بیان کی ہے کہ ایک روز حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں کے معائنہ میں اسقدر منہمک ہوگئے کہ عصر کا وقت جو نماز پڑھنے کا معمول تھا فوت ہوگیا اور سورج غروب ہوگیا۔ اس انہماک پر سخت افسوس ہوا کہ مال (گھوڑوں) کی محبت نے یادِ الٰہی سے غافل کر دیا لہٰذا اسکی تلافی کرنی چاہیئے پھر اُنھوں نے گھوڑوں کو طلب کیا اور اُن کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے قربان کر کے مساکین میں تقسیم کر دیا۔

اس تفصیل کی تائید ایک مرفوع حدیث سے بھی ہوتی ہے جسکو امام سیوطیؒ نے معجم طبرانی کے حوالہ سے نقل کی ہے:۔

عَنْ اُبَیِّ بن کعبؓ عن النبی صلے اللّٰہ علیہ وسلم
فی قولہ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ الآیۃ
قال قطع سُوْقَهَا وَاَعْنَاقَهَا بالسیف (الحدیث)

حضرت اُبی بن کعبؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ۔ کی یہ تفسیر بیان کی ہے کہ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے تلوار سے اِن گھوڑوں کی پنڈلیوں اور گردنوں کو کاٹنا شروع کیا۔

امام سیوطیؒ نے اس حدیث کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔

(درمنثور ج ۵ ص ۳۰۹)

اس حدیث کو امام طبرانی نے اپنی کتاب اوسط میں نقل کر کے لکھا ہے اس میں ایک راوی سعید بن بشیر ہیں جن کو امام شعبہؒ

نے ثقہ کہا ہے اور امام ابن معینؒ نے ضعیف قرار دیا ہے البتہ اس کے باقی راوی ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد ج۷، ص۹۹)

الغرض اس حدیث کی وجہ سے ابن کثیرؒ کی تفسیر کافی مضبوط اور قابل ترجیح ہو جاتی ہے البتہ اس پر ایک ظاہری شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک نادانستہ غفلت کی وجہ سے چند ایک گھوڑوں کو قربان کر دینا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔

لیکن یہ شبہ بالکل سطحی قسم کا ہے۔ اللہ تعالے کی خوشنودی کے لئے قربانی پیش کرنا ہر مذہب میں عبادت سمجھا گیا ہے اور خاص کر ملّتِ اسلامی میں جس کی پیروی کرنے والوں میں ایک حضرت سلیمان علیہ السلام بھی ہیں۔ جانوروں کو بلاکسی مقصدِ صحیح کے ذبح کرنا یقیناً اسراف اور گناہ کا کام ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے ذبح کرنا اور اُس کا گوشت تقسیم کر دینا پسندیدہ بات ہے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ مال و دولت کی مشغولیت ذکرِ الٰہی سے غفلت کا سبب بن جائے۔

اس حقیقت کی تائید احادیثِ مشہورہ سے بھی ہوتی ہے۔

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اَبُو جہمؓ صحابی نے ایک شامی چادر ہدیۃً پیش کی تھی جس پر کچھ نقش و نگار تھے آپؐ نے اُس چادر میں نماز ادا کی پھر حجرہ میں تشریف لائے اور حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ یہ چادر ابوجہمؓ کو واپس کر دو کیونکہ نماز میں قریب تھا کہ اسکے نقش و نگار مجھے فتنے میں ڈال دیتے۔ (مؤطا امام مالکؒ)

اسی طرح حضرت ابو طلحہ انصاری ایک مرتبہ اپنے باغ میں نماز پڑھتے ہوئے ایک پرندے کو دیکھنے میں مشغول ہو گئے (کہ وہ درختوں کی کثرت کی وجہ سے باہر نکلنے میں دِقّت محسوس کر رہا تھا) جس سے نماز کی طرف دھیان نہ رہا۔ پھر آپ نے وہ پورا باغ صدقہ کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو آپؐ نے خوشی کا اظہار فرمایا۔

معلوم ہوا کہ اگر مال و دولت کی محبت میں ذکر الٰہی فوت ہو جائے یا اللہ تعالے کی یاد سے غفلت ہو جائے تو مال و دولت کا

صدقہ وخیرات کر دینا ایک اچھا عمل ہے۔ لیکن اسمیں یہ بات ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ ایسی صورت میں مال کو ضائع کرنا درست نہیں جس سے اسراف لازم آجائے۔ صوفیائے کرام میں حضرت شبلیؒ کا ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے اسی قسم کی غفلت میں بطور سزا اپنے کپڑے جلادیئے تھے لیکن اِنہی صوفیہ میں سے ایک صوفی شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ نے اُن کے اس عمل کو صحیح قرار نہیں دیا۔ (روح المعانی)

القاءِ جسد قانونِ ابتلاء (آزمائش) بھی ایک مستقل سنت اللہ ہے جو عام طور پر مجرموں کے لئے جاری ہوتا ہے لیکن خاصانِ خدا بھی اس سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہ بات اللہ تعالےٰ ہی کے علم میں ہے کہ نیکوں کی آزمائش میں جہاں درجات کی بلندی مقصود ہوتی ہے وہاں اور بھی حکمتیں پوشیدہ رہتی ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی اللہ نے ایک واقعہ میں آزمایا جسکو قرآن حکیم نے القاءِ جسد سے تعبیر کیا ہے۔ (ایک ناتمام جسم کا واقعہ) آیات قرآنی میں یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب یہ آزمائش پیش آئی تھی وہ کیا تھی؟ صرف اس قدر وضاحت ہے کہ اُن کی کرسی پر ایک ناتمام جسم ڈالا گیا اور وہ فوراً اللہ کی جناب میں رجوع ہوئے اور مغفرت چاہی۔

گزشتہ صفحات میں بھی یہ بات کہی گئی ہے کہ قرآن حکیم کا مزاج اور اُس کا اسلوب صرف واقعات نقل کرنا نہیں ہے بلکہ اُس کے نتائج اور حقائق سے آگاہ کرنا مقصود ہوتا ہے تاکہ انسانیت کو عبرت ونصیحت فراہم ہو۔ اسی اسلوب کے پیشِ نظر واقعات کا تکرار اور کہیں اجمال کہیں تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ ابتلائی واقعہ بھی اسی نوعیت سے تعلق رکھتا ہے۔ واقعہ کی پہلی آیت ہی اس مقصدِ اصلی پر روشنی ڈالتی ہے۔

"اور بیشک ہم نے سلیمانؑ کو آزمایا اور ڈال دیا ہم نے اُن کی کرسی پر ایک ناتمام جسم پھر وہ اللہ کی جانب رجوع ہوئے۔"

(صٓ آیت ۳۴)

تاہم مفسرینِ کرام نے اس واقعہ کی تفصیل میں دو عنوان اختیار کی ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ قرآنی واقعات میں قیاس اور تخمین سے کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیئے۔ صرف اسی قدر یقین رکھنا چاہیئے کہ اِن آیات میں اللہ تعالےٰ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اُس نے کسی آزمائش میں مبتلا کیا جس کا تعلق تختِ سلیمان اور ایک جسم کا تختِ سلیمان پر ڈالے جانے سے متعلق ہے اسکی کیفیت نامعلوم ہے کہ وہ جسد (جسم) کیا تھا؟ کیوں ڈالا گیا؟ اسمیں کس قسم کی آزمائش تھی؟ لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے دیگر انبیاء ورسل کی طرح فوری بارگاہِ الٰہی میں رجوع کیا، مغفرت طلب کی اور اس کے بعد ایک ایسی حکومت کی دُعا کی جو بے نظیر اور بے مثال ہو۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے اُن کی دُعا قبول فرمائی اور اُن کی مقبولیت اور عظمتِ شان کو سراہا۔

آیاتِ زیرِ بحث کی تفسیر میں یہ طریقہ حافظ ابن کثیرؒ اور ابن حزمؒ اور دیگر جلیل القدر محدثین ومفسرین نے اختیار کیا ہے۔

بقیہ دیگر محدثین نے اِن آیات کی تفسیر میں یہ لکھا ہے:۔

"ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک لشکر کسی مہم سے ناکام واپس لوٹا جس پر حضرت سلیمان علیہ السلام کو سخت ناگوار گزرا اور انھوں نے شدتِ غضب میں یہ خیال ظاہر کیا کہ آج کی شب میں اپنے حرم کے ساتھ ازدواجی فریضہ ادا کروں گا تو میری ہر ایک بیوی سے لڑکا پیدا ہوگا اور وہ میدانِ جہاد کا مجاہد بنے گا۔ اس وقت حرم میں کئی ایک بیویاں تھیں۔ لیکن اپنے اس اظہارِ خیال میں اِنشاء اللہ کہنا بھول گئے۔"

اللہ تعالےٰ کو ایک اولوالعزم پیغمبر کا یہ طرز پسند نہ آیا اور اُس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس دعوئ کو اس طرح غلط ثابت کر دیا کہ تمام ازواج مطہرات میں سے صرف ایک بیوی کے مُردہ ناتمام بچہ پیدا ہوا جس کو کسی خادم نے اِن کے سامنے ایسے وقت پیش کیا جبکہ وہ تخت پر متمکن تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو شدت سے احساس ہوا کہ یہ نتیجہ ہے اُس بات کا جسکو میں اپنے پُراعتماد لہجہ میں انشاء اللہ کہے بغیر ادا کیا تھا۔ چنانچہ اُسی وقت وہ اللہ تعالےٰ کی جانب رجوع ہوئے اور مغفرت طلب کی اور پھر وہ دُعا مانگی جس کا ذکر قرآن حکیم میں صراحتاً موجود ہے۔

محدثین کرام اپنی اس تفسیر کی دلیل میں بخاری و مسلم کی درج ذیل حدیث پیش کرتے ہیں اور اسی کو اس تفسیر کی سند قرار دیتے ہیں :-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ سُلَیْمَانُ بْنُ دَاؤدَ لَاَطُوْفَنَّ اللَّیْلَةَ عَلٰی سَبْعِیْنَ اِمْرَأَةً تَحْمِلُ کُلُّ اِمْرَأَةٍ فَارِسًا یُجَاهِدُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ. الخ

(بخاری کتاب الانبیاء)

"حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایک مرتبہ سلیمان بن داود علیہ السلام نے فرمایا کہ آج کی رات میں اپنی ستر بیویوں کے پاس جاؤں گا ہر ایک بیوی سے ایک ایک شہ زور لڑکا پیدا ہوگا جو اللہ کی راہ میں جہاد کریگا. حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر نے یا فرشتے نے اُن سے کہا انشاءاللہ! مگر حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس جُملہ پر دھیان نہ رہا اور نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی بیوی بھی حاملہ نہ ہوئی البتہ ایک بیوی کے ناتمام بچہ پیدا ہوا جس کا ایک بازو نہ تھا."

اسکے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر سلیمان (علیہ السلام) انشاءاللہ کہہ دیتے تو ہر ایک حرم کے بطن سے مجاہد فی سبیل اللہ پیدا ہوتا.

بہر حال واقعہ کی تفصیل کچھ بھی ہو نفسِ واقعہ اپنی جگہ قائم ہے. قرآن حکیم یہ بتانا چاہتا ہے کہ اللہ کے نیک بندوں سے جب کبھی بھی بھول یا غفلت ہوگئی وہ فوری طور پر بارگاہ الٰہی میں سربسجود ہوئے. اللہ سے غفلت ایسی چیز نہیں ہے جسکو نظرانداز کردیا جائے حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ اسوۂ حسنہ انسانوں کے لئے نصیحت وعبرت ہے.

اِن آیات کی تفسیر میں بیان کردہ تفاسیر کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی روایات کتب تفسیر میں درج ہیں جن کا اسلامی روایات سے دُور کا بھی تعلق نہیں اور بلاشبہ وہ تمام تر یہودی روایات اور قصص ہیں جنکو روایات کہنا بھی روایات کی توہین ہے.

محدث ابن کثیرؒ نے اور دیگر محدثین کرام نے اِن کو خرافات اور ہزلیات سے تعبیر کیا ہے ان کو لکھنا اور پڑھنا سوائے اضاعتِ وقت

کے اور کچھ نہیں۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر ابن کثیر)

قرآنی مضمون

القاء جسد کا یہ واقعہ آیاتِ ذیل میں اس طرح آیا ہے :۔
وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ الخ۔ (صٓ آیت ۳۴)

اور بیشک ہم نے سلیمان کو آزمایا اور ڈال دیا ہم نے اُسکی کرسی پر ایک (بے روح) جسم پھر وہ اللہ کی طرف رجوع ہوئے۔
کہا اے پروردگار مجھے بخش دے اور مجھ کو ایسی حکومت عطا کر جو میرے بعد کسی کو میسر نہ آئے بیشک تو ہی بخشنے والا ہے۔
تب ہم نے اُن کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا کہ وہ اُن کے حکم سے نرم رفتار سے چلتی تھی جہاں وہ پہنچنا چاہتے۔

وادیٔ نملہ

گزشتہ صفحات میں یہ وضاحت آچکی ہے کہ حیوانات کی بُولیاں سمجھنا اُن علوم سے متعلق نہیں جسکو اہل دُنیا جانتے یا سمجھتے ہیں۔ یہ علم خاص اللہ کی طرف سے اُن انبیاء و رسل کو دیا جاتا ہے جن کے تحت رشد و ہدایتِ انسانی کی ذمہ داری سُپرد کی جاتی ہے۔ طبقۂ انبیاء میں حضرت داؤد علیہ السلام و حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ علم خاص عطا و بخشش اور معجزہ کے طور پر دیا گیا تھا۔ جس طرح ایک انسان دوسرے انسان کی گفتگو بے تکلف سن لیتا ہے اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام پرندوں کی بولیاں سُن لیا کرتے تھے اور اُن کی مراد اور مفہوم سے آگاہ ہو جاتے تھے۔

اللہ کی اس عطا پر حضرت سلیمان علیہ السلام اظہار تشکر کے طور پر اس کو "فُضلِ مبین" قرار دیتے تھے۔ اس حقیقت کی اہمیت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جس سورہ میں اس "فضل مبین" کا ذکر آیا ہے اُس کا نام ہی "سورہ نمل" رکھا گیا ہے۔ (چیونٹی کے قصے والی سورت)۔

بعض روایاتِ حدیث میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں بارش نہیں ہوئی قحط کی حالت پیدا ہوگئی حضرت سلیمان علیہ السلام

اپنی جماعت کے ساتھ صلوٰۃِ استسقاء کے لئے میدان میں نکلے راہ میں دیکھا کہ ایک چیونٹی اپنے اگلے پیر اُٹھائے آسمان کی جانب نظر کئے یہ دُعا کر رہی ہے :-

خدایا ہم بھی تیری مخلوق ہیں اور تیرے فضل و کرم کے
محتاج، ہم کو بارش سے محروم رکھ کر ہلاک نہ فرما۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب انکی مناجات ختم ہوئی تو قوم سے فرمایا واپس چلو ایک حیوان کی دُعا نے ہمارا کام پورا کر دیا۔ اب بارش ضرور ہوگی۔

(تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۲۔ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۵۹)

وادیٔ نملہ (چیونٹیوں کی وادی) کا ایک واقعہ قرآن حکیم نے نقل کیا ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا تھا۔ مؤرخ ابن بطوطہ اور بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ وادی عسقلان کے قریب تھی لیکن مفسّرین کی ایک بڑی تعداد نے اس کا مقام ملک شام بتایا ہے۔

قصہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام جن وانس اور حیوانات کے ایک عظیم لشکر کے جلوٗ میں کسی جگہ تشریف لے جا رہے تھے لشکر کی کثرت اور ہجوم کے باوجود کسی طبقہ کے افراد کی مجال نہ تھی کہ وہ اپنے درجہ اور رُتبہ کے خلاف آگے پیچھے ہو جائے۔ سب فرمانبردار غلاموں کی طرح فوج در فوج چل رہے تھے چلتے چلتے لشکر ایک ایسی وادی میں پہنچا جہاں چیونٹیاں بے شمار تھیں اور پوری وادی اِن کا مسکن بنی ہوئی تھی چیونٹیوں کے سردار نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس عظیم لشکر کو دیکھ کر اپنی قوم سے کہا اے چیونٹیوں تم فوراً اپنے اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ کہیں سلیمان اور اُن کا لشکر تمہیں بے خبری میں روند نہ ڈالے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے چیونٹیوں کے سردار کی جب یہ بات سُنی تو انھیں ہنسی آگئی۔ اس عظیم انکشاف پر اللہ عزوجل کا شکر ادا کیا اور مزید نیکی و پرہیزگاری کی دُعا کی۔

وادیٔ نملہ کا یہ واقعہ قرآن حکیم کی آیات ذیل میں اس طرح آیا ہے :-

قرآنی مضمون

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی كَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ الخ
(النمل آیات ۱۵ تا ۱۹)

اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم عطا کیا اور انھوں نے کہا کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی۔

اور داؤد کے وارث سلیمان ہوئے اور اُس نے کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں بیشک یہ (اللہ کا) کھلا فضل ہے۔

اور سلیمان کے لئے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کئے گئے تھے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔

یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیوں اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور ان کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انھیں خبر بھی نہ ہو۔

سلیمان اس کی بات پر مسکراتے ہوئے ہنس پڑے اور کہنے لگے:۔ اے میرے رب مجھے یہ توفیق دے کہ میں تیرا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر انعام کیا ہے اور یہ کہ میں وہ نیک عمل کروں جو تجھ کو پسند آئے اور مجھکو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔“

ہُدہُد اور ملکۂ سبا

قرآن حکیم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک اور عجیب و غریب تاریخی واقعہ قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے جو نہایت دلچسپ ہونے کے باوجود نتائج و عبر کے پیش نظر بصیرت افروز ہے۔ یہ حقیقت تو اوپر آچکی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکمرانی جہاں انسان اور جنات پر تھی وہاں چرند و پرندوں پر بھی حاوی تھی۔

ایک مرتبہ دربار سلیمانی اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ منعقد تھا۔ انسان، جنات، حیوانات بھی صف در صف کھڑے تھے حضرت سلیمان علیہ السلام ان کا معائنہ فرمارہے تھے کہ پرندوں کی صف میں ہُدہُد پرندہ موجود نہ تھا اُسکی اس غیر حاضری

کو محسوس کر کے دریافت کیا، کیا بات ہے میں ہُدہُد کو موجود نہیں پاتا ؟ اگر وہ واقعی غیر حاضری کا مرتکب ہوا ہو تو میں اسکو سخت سزا دوں گا یا پھر ذبح کر ڈالونگا۔ اِلّا یہ کہ وہ اپنی غیر حاضری کی کوئی معقول وجہ بیان کردے

یہ عتابِ سلیمانی ہو ہی رہا تھا کہ ہُدہُد حاضر ہو گیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی باز پرس پر کہنے لگا :-

"میں ایک ایسی یقینی اطلاع لایا ہوں جسکی خبر آپ کو اس سے پہلے حاصل نہیں"

وہ یہ کہ یمن کے علاقے میں ملک سبا کی ایک ملکہ رہتی ہے جو ملک پر حکمرانی کرتی ہے اور اللہ نے اسکو سب کچھ دے رکھا ہے اور اُس کا تخت اپنی خاص خوبیوں کے اعتبار سے نہایت عظیم الشان ہے۔ ملکہ اور اسکی قوم آفتاب پرست ہے اور شیطان نے انھیں گمراہ کر رکھا ہے اور وہ خدائے واحد کی عبادت نہیں کرتے اور شیطان نے اُن کی آفتاب پرستی کو اُنکے لئے خوشنما بنا دیا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ سُنکر فرمایا کہ اچھا تیری بات کی صداقت کا ابھی علم ہو جائے گا اگر تو سچا ہے تو میرا یہ خط لیجا اور اسکو اُن تک پہنچا دے اور انتظار کر کہ وہ اس کے متعلق کیا گفتگو کرتے ہیں۔

ہُدہُد خط لیکر اُڑا اور ایسے وقت وہ خط گرایا جب ملکۂ سبا دربار کر رہی تھی۔ خط ملکہ کی گود میں گرا۔ ملکہ خط پڑھکر اہل دربار سے کہنے لگی کہ ابھی ابھی میرے پاس ایک معزز مکتوب آیا ہے جس کی عبارت یہ ہے :-

"یہ خط سلیمان کی جانب سے اور اللہ کے نام سے شروع ہے جو بڑا مہربان رحم والا ہے۔
تم کو ہم پر سرکشی اور سربلندی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے اور تم میرے پاس اللہ کے فرمانبردار (مسلم) ہو کر آؤ۔"

تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ قدیم زمانے میں خطوط رسانی کا کام پرندوں سے بھی لیا جاتا تھا۔ پرندوں کو اس حد تک سُدھایا جاتا تھا کہ جس کسی کو خط پہنچانا ہوتا تھا اُس سمت پرندے کو اُڑا دیا جاتا تھا اور وہ ٹھیک ٹھیک اُسی سمت اُڑتا ہوا مُرسَل الیہ تک پہنچ جاتا تھا۔

ملکہ سبا نے خط کی عبارت پڑھکر کہا اے ارکانِ دولت تم جانتے ہو کہ میں نے

اہم معاملات میں تمہارے مشورے کے بغیر کبھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے اس لئے اب میں تم سے مشورہ طلب کرتی ہوں مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

ارکانِ دولت نے کہا جہاں تک مرعوب ہونے کا تعلق ہے تو اسکی قطعاً ضرورت نہیں کیونکہ ہم زبردست طاقت اور جنگی قوت کے مالک ہیں۔ رہا آخری فیصلہ وہ آپ کے ہاتھ میں ہے جو مناسب ہو اسکے لئے حکم کی ضرورت ہے۔

ملکہ نے کہا بیشک ہم طاقتور اور صاحب اقتدار ہیں لیکن سلیمان کے معاملے میں ہم کو عجلت نہیں کرنی چاہیئے۔ پہلے ہم کو اُن کی قوت وطاقت کا اندازہ کر لینا چاہیئے۔ کیونکہ جس عنوان کے ساتھ یہ خط لکھا گیا ہے وہ ایسا نہیں کہ اسکو نظرانداز کر دیا جائے۔ اس لئے میرا اپنا خیال یہ ہے کہ پہلے اپنے چند قاصد روانہ کروں اور وہ سلیمان کے لئے عمدہ اور قیمتی تحفے لیجائیں اس بہانہ سے وہ اُن کی شان وشوکت کا اندازہ لگا سکیں گے اور یہ بھی معلوم ہو جائیگا کہ وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ اگر واقعی وہ زبردست قوت وشوکت کے مالک ہیں تو پھر اُن سے لڑنا فضول ہے اس لئے کہ صاحب شوکت بادشاہوں کا یہ دستور رہا ہے کہ جب وہ کسی شہر میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو اس شہر کو برباد اور باعزت شہریوں کو ذلیل وخوار کر دیتے ہیں۔ اس لئے بلاوجہ بربادی مول لینی مناسب نہیں ہے۔

اہل دربار نے ملکہ کی دانشمندانہ بات پر اتفاق کیا، کیونکہ یہ خط کئی ایک وجوہ سے اہم تھا۔

ایک[۱] یہ کہ وہ عجیب غیر معمولی طریقے سے آیا تھا بجائے اسکے کہ کوئی سفارت اُسے لاکر دیتی ایک پرندے نے لاکر ٹپکایا۔

دوسرے[۲] یہ کہ وہ فلسطین وشام کے فرمانروا سلیمان علیہ السلام کی جانب سے ہے۔

تیسرے[۳] یہ کہ اُس خط کو اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے حالانکہ اُس وقت دنیا میں کہیں کسی سلطنت کے مراسلوں میں یہ طریقہ رائج نہ تھا۔

پھر ان سب باتوں سے ہٹکر جس اختصار اور صاف صاف باتوں کا اظہار کیا گیا ہے وہ اسکی اہمیت اور زیادہ بڑھا دیتا ہے کہ اسمیں واضح طور پر یہ دعوت دی گئی ہے کہ مخالفت چھوڑ کر اطاعت اختیار کریں اور تابع فرمان بنکر یا مسلمان ہو کر حاضر ہو جائیں۔ خط کی عبارت میں (وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ) مسلم ہو کر حاضر ہونے کا حکم تھا۔

مسلم ہو کر حاضر ہونے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ مطیع بن کر حاضر ہو جائیں دوسرے یہ کہ دین اسلام قبول کر کے حاضر ہوں۔

پہلا مفہوم حضرت سلیمان علیہ السلام کی شان فرماں روائی سے مطابقت رکھتا ہے جبکہ دوسرا مفہوم شانِ پیغمبری کے شایانِ شان ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ جامع لفظ ہر دو مفہوم کی ادائی کے لئے لکھا گیا ہو۔ الغرض قاصدوں کا انتخاب کیا گیا اور تحفہ وتحائف میں قیمتی اشیاء رکھے گئے۔ تاریخی روایات میں جہاں بیشمار تفصیلات ہیں وہاں چند خصوصی چیزیں یہ تھیں:-

کچھ سونے کی اینٹیں، کچھ جواہرات اور ایک سو غلام،
اور ایک سو کنیزیں اور ساتھ ہی ملکہ کا ایک خصوصی خط جس میں
چند اہم سوالات تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اسکے تحفوں کی تفصیلات اُن کے پہنچنے سے پہلے بتلادی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنات کو حکم دیا کہ دربار سے تیس میل کی مسافت میں سونے چاندی کا فرش کر دیا جائے اور راستہ میں دوطرفہ مختلف نوع کے جانوروں کو کھڑا کر دیا جائے، اسی طرح اپنے دربار کو خاص اہتمام سے مزین کیا اور اس کے دائیں بائیں چار چار ہزار سونے کی کرسیاں ایک طرف اہل علم کے لئے دوسری طرف اہل دربار وزراء واعیان سلطنت کے لئے رکھدی گئیں، جواہرات سے پورا دربار مزین کیا گیا۔

ملکہ سبأ کے قاصدوں نے راہ میں سونے کی اینٹوں پر جانوروں کو کھڑا دیکھا تو اپنے تحفے سے شرما گئے۔ جُوں جُوں آگے بڑھے دوطرفہ چرند و پرند کی صفیں دیکھیں پھر جنات کی صفیں دیکھیں تو مرعوب ہو گئے۔ لیکن جب دربار میں پہنچے تو حضرت سلیمان علیہ السلام کی تواضع واکرام سے مانوس ہوئے۔ اور وہ خوف جاتا رہا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے حشم وخدم کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔

ملکۂ سبا کے تحائف پیش کیے گئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا تم نے اور تمہاری ملکہ نے میرے پیغام کو غلط سمجھا شاید تم نے یہ سمجھ لیا کہ میں اِن قیمتی اشیاء سے خوش وراضی ہو جاؤں گا، حالانکہ تم دیکھ رہے ہو کہ اللہ تعالٰے نے مجھ کو کیا کچھ عنایت

کیا ہے۔

لہذا تم اپنے ہدایا واپس لیجاؤ اور اپنی ملکہ سے کہنا کہ اگر تم نے میری اطاعت نہ کی تو میں ایسے عظیم لشکر کے ساتھ ملک سبا تک پہنچ جاؤں گا پھر تم اُسکی مدافعت اور مقابلہ سے عاجز ہو رہو گے۔ انجام کار سب کے سب ذلیل وخوار ہوکر شہر بدر ہو جاؤ گے۔

قاصدوں نے واپس ہوکر ملکۂ سبا کو پوری روئداد سُنائی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی شان وشوکت کا جو مشاہدہ کیا تھا وہ تفصیلاً سنایا اور خاص طور پر یہ بات کہی کہ اُن کی حکومت نہ صرف انسانوں پر ہے بلکہ جن اور چرند وپرند بھی اُن کے زیر فرمان ہیں۔

ملکہ اور ارکانِ دولت نے جب یہ تفصیل سُنی تو سب نے طے کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے لڑنا اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوکر اطاعت قبول کرلی جائے۔ چنانچہ ملکۂ سبا اپنے ارکان دولت اور حشم وخدم کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پایۂ تخت فلسطین کی جانب روانہ ہوگئی۔ مُلکِ سبا کی فلسطین کی یہ مسافت تقریباً ڈیڑھ ہزار میل سے زائد بتائی جاتی ہے۔ ملکہ سبا جب بیت المقدس کے قریب پہنچ گئی اور دو ایک دن کی مسافت باقی رہ گئی تھی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو وحیٔ الٰہی کے ذریعہ معلوم ہوگیا کہ ملکہ سبا اطاعت اختیار کرنے کے لئے آرہی ہے۔

عِفرِیتٌ مِّنَ الجِنِّ

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے اہل دربار کو جمع کیا اور اُن سے مخاطب ہوکر فرمایا، میں چاہتا ہوں کہ ملکۂ سبا کے یہاں پہنچنے سے پہلے پہلے اُس کا شاہی تخت اُٹھا کر یہاں لے آیا جائے اور غالباً منشا اس کا یہ تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام دعوت وتبلیغ کے ساتھ ساتھ ملکہ اور اُسکے درباریوں کو ایک معجزہ دکھانا چاہتے تھے تاکہ اُنھیں معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء ومرسلین کو کیسی کیسی غیرمعمولی قدرتیں عطا فرماتا ہے اور یہ یقین بھی ہو جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام واقعی اللہ کے نبی ورسول ہیں۔

یہ سُنکر ایک دیو پیکر جن اُٹھا اور کہنے لگا جناب عالی یہ کام میں انجام دوں؟ آپ کے دربار برخاست کرنے سے پہلے پہلے اس تخت کو لے آؤں گا مجھکو یہ طاقت حاصل ہے اور میں ایک امانتدار جن ہوں۔ دیو پیکر جن کا یہ دعوٰی سُنکر اُسی دربار کے ایک اہل علم نے کہا

اور میں آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے اُس تخت کو آپکی خدمت میں پیش کرسکتا ہوں حضرت سلیمان علیہ السلام نے بس رُخ پھیر کر دیکھا ہی تھا کہ ملکۂ سبا کا شاہی تخت سامنے موجود تھا۔ فرمانے لگے یہ میرے پروردگار کا فضل و کرم ہے وہ مجھ کو آزماتا ہے کہ میں اُسکا شکرگزار بنتا ہوں یا نافرمان اور حقیقت تو یہ ہے کہ جو شخص اللہ کا شکر گزار ہوتا ہے دراصل اپنی ذات ہی کو نفع پہونچاتا ہے اور جو نافرمانی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکی نافرمانی سے بے نیاز ہے اور اُس کا وبال خود نافرمانی کرنے والے ہی پر پڑتا ہے۔

اس اہل علم کے بارے میں قطعی طور پر یہ معلوم نہیں کہ وہ کون تھے۔ اُن کے پاس کس قسم کا علم تھا اور کتاب سے مراد کونسی کتاب مراد ہے؟ قرآن حکیم نے اُن کا تعارف صرف اس حد تک کیا ہے:۔

وَقَالَ الَّذِیْ عِنْدَہٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتَابِ۔ الخ (النمل آیت ۴۰)

اور جس شخص کے پاس کتاب کا ایک علم تھا وہ بولا میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اُس تخت کو لے آتا ہوں۔

لہٰذا اِن امور کی کوئی وضاحت نہیں۔ نہ ہی احادیث صحیحہ میں اس کا پتہ چلتا ہے۔

بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے کوئی مصاحب تھے جسکو اللہ کی "الکتاب" کا کوئی غیر معمولی علم حاصل تھا اس علم خاص کی طاقت سے وہ تخت اُٹھالائے بعض کہتے ہیں کہ وہ کوئی بزرگ جن تھا جسکے پاس اسماء الٰہیہ کا علم تھا اسم اعظم کی طاقت سے اسکو اُٹھالیا۔ بعض لکھتے ہیں کہ وہ کوئی فرشتہ تھا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں رہا کرتا تھا۔

اسی طرح بعض مفسرین نے آصف بن برخیاہ کا نام لکھا ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے مُشیر تھے۔ بعض نے حضرت خضر علیہ السلام کا نام بتایا ہے۔ الغرض بیت المقدس سے ملک سبا کے پایۂ تخت مآرب کا فاصلہ پرندے کی اُڑان کے لحاظ سے بھی کم از کم ڈیڑھ ہزار میل کا تھا اتنے فاصلے سے ایک ملک کا عظیم الشان تخت اتنی مختصر بلکہ پلک جھپکنے کی مدت میں اُٹھالے آنا کسی انسان کا کام نہیں ہوسکتا خواہ قوم عمالقہ ہی میں سے کوئی طاقتور آدمی کیوں نہ ہو (قدیم زمانے میں قوم عمالقہ بہت بلند و بالا اور حیرت انگیز قوت و طاقت والی گزری ہے) بقول ایک جدید مفسر یہ کام تو آج کل کا جٹ طیارہ بھی انجام دینے پر قادر نہیں ہے (بلکہ

راکٹ بھی) مسئلہ صرف اتنا ہی نہ تھا کہ ایک شاہی تخت ملکہ کے محل سے اُٹھا لائے یقیناً اُس محل پر پہرہ دار مقرر ہوں گے اور وہ ملکہ کی غیر موجودگی میں ضرور محفوظ جگہ رکھا گیا ہوگا۔انسان جاکر اُٹھالانا چاہے تو اس کے ساتھ ایک چھاپہ مار دستہ ہونا چاہیئے کہ لڑ بھڑ کر اُسے پہرہ داروں سے چھین لائے اور یہ سب کچھ صرف اور صرف چند لمحات میں طے پا جائے۔اس چیز کا اگر تصور کیا جاسکتا ہے تو ایک حقیقی جن ہی کے بارے میں کیا جاسکتا ہے۔اس لئے قرآن حکیم کے الفاظ سے جو بات مترشح ہوتی ہے غالباً وہ اسی مضمون کی تائید کرتی ہے۔

بہر حال حضرت سلیمان علیہ السلام نے ادائے شکر کے بعد اپنے مصاحبین کو حکم دیا کہ اس تخت کی شکل میں کچھ تبدیلی کر دی جائے۔میں جاننا چاہتا ہوں کہ ملکہ سبا یہ یہ دیکھ کر حقیقت کی طرف راہ یاب ہوتی ہے یا نہیں؟ یعنی وہ اس حیرت انگیز معجزے کو دیکھ کر ہدایت پاتی ہے یا اپنی گمراہی پر قائم رہتی ہے۔

کچھ عرصہ بعد ملکۂ سبا حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں پہنچ گئی اور جب وہ دربار میں حاضر ہوئی تو اُس سے دریافت کیا گیا کیا آپ کا تخت ایسا ہی ہے؟

عقلمند ملکہ نے جواب دیا یہ تو گویا وہی ہے۔یعنی تخت کی ساخت اور مجموعی حیثیت تو یہ بتا رہی ہے کہ یہ میرا ہی تخت ہے لیکن معمولی سی تبدیلی اس یقین میں شک پیدا کر رہی ہے اسکے ساتھ ہی ملکہ حقیقتِ حال تک پہنچ گئی اور کہنے لگی ہم لوگوں کو تو اس واقعہ سے پہلے ہی آپ کی نبوت کی تحقیق ہو چکی ہے اور ہم اُسی وقت سے دل سے مطیع ہو چکے ہیں جبکہ قاصد سے آپ کے احوال معلوم ہوئے تھے۔

قرآن حکیم نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ واقعی سمجھدار خاتون تھی مگر چند روز جو ایمان نہیں لائی تو اسکی وجہ یہ تھی کہ اُس کو ایمان لانے سے غیر اللہ کی عبادت نے جسکو اُسکی عادت تھی روک رکھا تھا اور وہ عادت اس لئے پڑگئی تھی کہ اُس کی قوم کافر تھی لہذا جو سب کو دیکھا وہی آپ کرنے لگی۔قومی عادات اکثر اوقات انسان کے سوچنے سمجھنے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں اور انسان اُسی دھارے میں بہنے لگتا ہے۔

شیش محل

حضرت سلیمان علیہ السلام نے چاہا کہ نبوت کا اعجاز دیکھنے کے بعد ملکۂ سبا کو ظاہری شانِ سلطنت بھی دکھلادی جائے تاکہ وہ اپنے

کو دنیا کے لحاظ سے بھی عظیم نہ سمجھے اس کے لئے شیش محل بنوا کر اُسکے صحن میں ایک بڑا حوض بنوایا اور اُس میں پانی اور پانی کے جانور چھوڑ کر اسکو شیشہ سے پاٹ دیا۔ شفاف آبگینوں اور بلور کے ٹکڑوں سے ایسا نفیس فرش بنادیا کہ دیکھنے والے کی نگاہ دھوکہ کھاجاتی کہ صحن میں صاف وشفاف پانی بہہ رہاہے اور یہ حوض ایسے موقع پر تھا کہ اُس محل میں جانے والے کو لامحالہ اُس پر سے عبور کرنا پڑتا تھا۔ جنوں کی مدد سے یہ عالیشان شیش محل آناًفاناً تیار ہوگیا جو اپنی صنعت کاری کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھا۔

ملکہ سبا سے کہا گیا کہ قصرِ شاہی میں قیام کرے۔ ملکہ محل کے سامنے پہنچی تو شفاف پانی بہتا ہوا پایا۔ یہ دیکھ کر ملکہ نے اپنے کپڑوں کو پنڈلی تک اُٹھا لیا حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا اسکی ضرورت نہیں یہ پانی نہیں ہے سارے کا سارا محل اور اس کا خوبصورت صحن چمکتے ہوئے آبگینہ کا ہے۔

یہ آخری چیز تھی جس نے ملکہ کی آنکھیں کھول دیں۔

پہلی چیز حضرت سلیمان علیہ السلام کا وہ خط تھا جو عام بادشاہوں کے طریقے سے ہٹکر اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع کیا گیا تھا۔

دوسری چیز اُسکے بیش بہا ہدیوں کو رد کرنا تھا جس سے ملکہ کو اندازہ ہوا کہ یہ بادشاہ مال ومتاع کا حریص نہیں۔

تیسری چیز قاصدوں کا وہ بیان تھا جس سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی شخصی وخانگی زندگی اور ان کی اتقاء اور زاہدانہ زندگی کا حال معلوم ہوا۔

چوتھی چیز اُسکے اپنے عظیم الشان تخت کا ملکِ سبا سے آناًفاناً بیت المقدس پہنچ جانا تھا جس سے ملکہ کو یقین ہوگیا کہ اس شخص کی پشت پر اللہ تعالیٰ کی طاقت کارفرما ہے۔

پانچویں اور آخر چیز یہ تھی کہ اُس نے دیکھا جو شخص یہ سامانِ عیش ونعم رکھتا ہو اور ایسے ایسے شاندار محلات میں رہتا ہے وہ کس قدر غرورِ نفس سے پاک ہے۔ کتنا خدا ترس اور نیک نفس ہے؟ کس طرح

بات بات پر اس کا سر اللہ واحد کے آگے شکر گزاری میں جھکا جاتا ہے
یہی وہ چیزیں تھیں جسکی وجہ سے وہ یہ اعلان کرنے پر مجبور ہوگئی کہ :۔
اے میرے رب آج تک میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی
اور اب میں سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کرلی
(النمل آیت ۴۴)

اس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کا پیغام (وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ) پورا ہوا اور ملکۂ سبا مسلمان ہوگئی۔

قرآن حکیم نے ملکۂ سبا کے اس واقعہ کو ایسے معجزانہ اختصار کے ساتھ بیان کیا کہ نفس واقعہ کے ساتھ قرآن حکیم کا حقیقی مقصد "تذکیر" بھی نمایاں رہے اور واقعہ کے اہم اجزاء بھی بیان ہوجائیں۔

یہ ساری تفصیلات اس طرح مذکور ہیں :۔

قرآنی مضمون

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ. الخ (النمل آیات ۲۰ تا ۴۴)

(ایک موقع پر) سلیمان نے پرندوں کا جائزہ لیا اور کہا کیا بات ہے کہ میں فلاں ہُدہُد کو نہیں دیکھ رہا ہوں کیا واقعی وہ غائب ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں ضرور اُس کو سخت سزا میں ڈالوں گا یا اسکو پھر ذبح ہی کر دوں گا یا وہ پھر میرے پاس غیر حاضری کی کوئی معقول وجہ بیان کرے۔

کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اُس نے آکر کہا میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں میں ملک سبا کی ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں۔

میں نے ایک عورت وہاں دیکھی ہے جو اُس قوم پر حکمرانی کرتی ہے اسکو ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کیا گیا ہے اور اُس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے۔

میں نے اُسکو اس حال میں پایا ہے کہ وہ اور اُسکی قوم اللہ کو چھوڑ کر آفتاب کی پرستش کرتی ہے اور اُسکے سامنے سربسجود ہوتی ہے

اور شیطان نے اُن کے اعمال اُن کے لئے خوشنما بنا دیئے ہیں اور انہیں راہِ مستقیم سے ہٹا رکھا ہے اس وجہ سے وہ سیدھا راستہ نہیں پاتے۔

(تعجب ہے) کہ وہ کیوں اس اللہ کو سجدہ نہیں کرتے جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو نکالتا ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور ظاہر کرتے ہو۔

(وہ) اللہ کہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں جو عرش عظیم کا مالک ہے۔

سلیمان نے کہا ابھی ہم دیکھ لیتے ہیں کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے۔

میرا یہ خط لیجا اور اُن لوگوں کی طرف اسکو ڈال دے پھر الگ ہٹکر دیکھ کہ وہ کیا ردِعمل ظاہر کرتے ہیں۔

ملکہ بولی اے اہل دربار میری طرف ایک معزز خط ڈالا گیا ہے۔

وہ سلیمان کی جانب سے ہے اور یہ کہ وہ اللہ رحمٰن رحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے۔

(مضمون یہ ہے کہ) میرے مقابلہ میں سرکشی نکرو اور مسلم ہوکر میرے پاس آجاؤ۔

(خط سنا کر) ملکہ نے کہا اے سردارانِ قوم میرے اس معاملے میں مجھے مشورہ دو میں کسی معاملے میں فیصلہ تمہارے بغیر نہیں کرتی ہوں۔

اُنھوں نے جواب دیا ہم طاقتور اور لڑنے والے ہیں آگے فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے آپ خود دیکھ لیں کہ آپکو کیا حکم دینا ہے۔

ملکہ نے کہا کہ عام طور پر بادشاہ جب کسی ملک میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو اُسے خراب اور اُسکے عزت والوں کو ذلیل و خوار کردیتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ سلاطین ایسا ہی کرتے ہیں۔

اور میں ان کی جانب ہدیہ بھیجتی ہوں پھر دیکھوں گی کہ قاصد کیا جواب لیکر آتے ہیں۔

جب ملکہ کا سفیر سلیمان کے ہاں پہنچا تو سلیمان نے کہا کیا تم میری مالی اعانت کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ اللہ نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں دیا ہے تمہارا ہدیہ تم ہی کو مبارک رہے۔

اے سفیر واپس جا اپنے بھیجنے والوں کی طرف ہم اُن پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا وہ مقابلہ نہ کرسکیں گے اور ہم انہیں ایسی ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہوکر رہ جائیں گے۔

(پھر) سلیمان نے کہا اے اہل دربار تم میں سے کون اُس کا تخت میرے پاس لے آئے گا؟ قبل اسکے کہ وہ لوگ مطیع ہوکر میرے پاس حاضر ہوں گے؟

جنوں میں سے ایک قوی ہیکل جن نے کہا میں اُسے حاضر کردوں گا قبل اسکے کہ آپ اپنی مجلس برخاست کریں اور میں اس کی طاقت رکھتا ہوں اور امانتدار ہوں۔

جس شخص کے پاس الکتاب کا علم تھا وہ بولا میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اُس تخت کو لائے دیتا ہوں۔

پھر جب سلیمان نے (پلک جھپکتے ہی) اسکو اپنے پاس موجود پایا تو کہا یہ میرے پروردگار کا فضل ہے میری آزمائش کے لئے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری اور جو شکر کرتا ہے وہ اپنے نفس کے لئے کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو میرا پروردگار بے نیاز ہے اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے۔

سلیمان نے کہا اس تخت کی ہیئت کچھ بدل کر اسکو ملکہ کے سامنے پیش کرو دیکھیں کہ وہ صحیح بات تک پہنچتی ہے یا اُن لوگوں میں سے ہے جو راہِ راست نہیں پاتے ہیں (تاکہ اس لطیف پیرایہ سے ملکہ کا ذہین و فہیم ہونا معلوم ہوسکے۔)

ملکہ جب حاضر ہوئی تو اُس سے کہا گیا کیا آپ کا تخت ایسا ہی ہے؟ وہ بولی یہ تو گویا وہی ہے اور ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم نے

سرِ اطاعت جھکا دیا تھا۔

اُس کو ایمان لانے سے جس چیز نے روک رکھا تھا وہ ان معبودوں کی عبادت تھی جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتی تھی کیونکہ وہ ایک کافر قوم سے تھی۔

اُس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو اُس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ گہرا پانی بہہ رہا ہے اور پار ہونے کے لئے پائنچے اوپر اُٹھالئے (کسی نے کہا) یہ تو ایک محل ہے جس میں آبگینے جڑے گئے ہیں۔

کہنے لگی پروردگار میں نے ابتک اپنے نفس پر ظلم کیا ہے اور میں اب سلیمان کے ساتھ ایمان لاتی ہوں اُس اللہ پر جو تمام عالموں کا پروردگار ہے۔

نکاحِ ملکہ آیاتِ مذکورہ میں ملکۂ سبا کا واقعہ اسی پر ختم ہوگیا کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے اسلام کا اعلان کیا۔

اسکے بعد کیا حالات پیش آئے قرآن حکیم اور احادیث صحیحہ اس بارے میں ساکت ہیں۔ کسی شخص نے مشہور محدث ابن عُیَیْنَہؒ سے پوچھا کہ کیا حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا سے نکاح کرلیا؟

اُنھوں نے جواب دیا اِس کا معاملہ اسپر ختم ہوگیا أَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ مطلب یہ کہ قرآن حکیم نے یہیں تک اس کا حال بیان کیا ہے۔ ہم کو بھی اسکی تفتیش میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ یعنی وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر ایمان لائی۔

مگر محدث ابن عساکر نے حضرت عکرمہؒ سے روایت نقل کی ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا سے نکاح کر لیا پھر اسکو اُسکے ملک پر والی و حاکم کی حیثیت سے واپس روانہ کر دیا اور گاہے گاہے حضرت سلیمان علیہ السلام یمن تشریف لے جاتے تھے اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ کیلئے یمن میں تین ایسے عمدہ محل تیار کروائے جو اپنی نظیر آپ تھے۔

واللہ اعلم۔

ہاروت وماروت

ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کے زمانے میں بنی اسرائیل کے اندر یہ گمراہی شروع ہوگئی تھی کہ جنات علم غیب جانتے ہیں اور شیاطین نے یہ بات بھی مشہور کر دی تھی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام علم سحر کے ذریعہ جنات اور حیوانات پر حکومت کرتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب اسکی خبر ہوئی تو انھوں نے شیاطین کے تمام نوشتوں کو حاصل کرکے اپنے تخت کے نیچے دفن کر دیا تاکہ جن وانس کو کسی طرح وہاں پہنچنے کی جرأت نہ ہوسکے اور ساتھ ہی یہ فرمان بھی جاری کر دیا کہ جو شخص سحر کرے گا یا جنات کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے گا کہ وہ علم غیب کا علم جانتے ہیں اسکو قتل کی سزا دی جائیگی لیکن جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہوگیا تو شیاطین نے اُس مدفون ذخیرہ کو نکال کر بنی اسرائیل میں یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ جادو کا یہ علم حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم ہے وہ اسی قوت سے جن وانس اور چرند و پرند پر حکومت کرتے تھے اس طرح جادو پھر رائج ہوگیا۔

جب بنی اسرائیل کو شیاطین نے سحر سکھا کر گمراہ کیا اور وہ لوگ شیاطین کو غیب داں یقین کرنے لگے یہ وہ زمانہ تھا کہ اُس وقت اُن کے درمیان کوئی نبی یا رسول موجود نہ تھا تو بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے دو فرشتے ہاروت و ماروت نامی نازل کئے انھوں نے بنی اسرائیل کو تورات سے ماخوذ اسماء وصفات الٰہی کے اسرار کا ایسا علم سکھایا جو سحر کے مقابلہ میں ممتاز اور سحر کے ناپاک اثرات سے پاک تھا۔ اسکی وجہ سے ایک اسرائیلی بآسانی یہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ سحر ہے اور یہ پاکیزہ علم ہے۔ اور جب فرشتے بنی اسرائیل کو یہ علم سکھاتے تو ساتھ ساتھ یہ بھی نصیحت کرتے تھے کہ اب جبکہ تم پر حقیقت منکشف ہوگئی ہے اور تم کو حق وباطل کے درمیان امتیاز حاصل ہوگیا ہے تو اب کتاب اللہ کے اس علم کو پس پشت ڈال کر پھر بھی سحر کی جانب رجوع کروگے تو تم بلاشبہ کفر میں گر پڑوگے۔ کیونکہ اب اللہ تعالیٰ کی حجت تم پر پوری ہوچکی ہے اب تمہارے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہا اس طرح گویا ہمارا وجود تمہارے لئے ایک آزمائش ہے کہ تم ہماری تعلیم کے بعد شیاطین کے تابع ہوکر سحر ہی کے شیدائی رہتے ہو یا کتاب اللہ کے علم کی پیروی کرتے ہو جسمیں سحر کا علاج اور اُس کا رَد بیان کیا گیا ہے۔ لیکن بنی اسرائیل کی کج فطرت نے اس پاک علم کو بھی ناجائز اور حرام خواہشات کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

قرآن حکیم نے سحر کی اس نسبت کو جو شیاطین نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی جانب کر دی تھی اس طرح رد کیا ہے اور ضمناً ہاروت و ماروت کی حقیقت بھی بیان کر دی ہے۔

البتہ ہاروت و ماروت کے سلسلہ میں جو مشہور و معروف زُہرہ کا قصہ نقل ہوتا چلا آرہا ہے اس سے قرآن حکیم اور احادیث صحیحہ ساکت ہیں۔ اس قصے کے تعلق سے ابن کثیرؒ اور دوسرے اہل علم نے یہ فیصلہ دیا ہے:۔

"اس بارے میں جو مرفوع روایات نقل کی جاتی ہیں دراصل وہ کعب احبار کا اسرائیلی قصہ ہے جسکو وہ مسلمانوں میں بیان کر دیا کرتے تھے اور جس کو بعض جلیل القدر صحابہ نے بھی نقل کر دیا اور وہ مسلمانوں میں پھیل گیا۔ اس بارے میں کوئی صحیح روایت ذخیرۂ حدیث میں موجود نہیں۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۴۱)

ہاروت و ماروت کا یہ قصہ قرآن حکیم کی آیات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

قرآنی مضمون

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ الخ (بقرہ آیات ۱۰۱ تا ۱۰۳)

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی تو اِن اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اس طرح پسِ پشت ڈال دیا گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔

اور لگے اُن چیزوں کی پیروی کرنے جو شیاطین سلیمان کی سلطنت کا نام لیکر پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ سلیمان نے کبھی کفر نہیں کیا کفر کے مرتکب تو وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے، وہ پیچھے پڑے اُس چیز کے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر نازل کی گئی تھی، حالانکہ وہ فرشتے جب بھی کسی کو اسکی تعلیم دیتے تھے تو پہلے صاف طور پر خبردار کر دیتے تھے کہ دیکھو ہم محض ایک آزمائش

ہیں پس کفر میں مبتلا نہ ہونا۔ پھر بھی یہ لوگ اُن سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں، ظاہر تھا کہ اذنِ الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے مگر اسکے باوجود وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو خود اُن کے لئے منفع بخش نہ تھی بلکہ نقصان دہ تھی اور انھیں خوب معلوم تھا کہ جو اس چیز کا خریدار بنا اُس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور کتنی بُری متاع تھی جس کے بدلے انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا کاش انھیں معلوم ہوتا۔

اور اگر وہ ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کے ہاں اس کا جو بدلہ ملتا وہ اِن کے لئے زیادہ بہتر تھا کاش انھیں خبر ہوتی۔"

الغرض قرآن حکیم نے اس واقعہ کو جس غرض سے بیان کیا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ بنی اسرائیل کا حضرت سلیمان علیہ السلام کی جانب جادو (کفر) کی نسبت کرنا بہتان اور افترا ہے۔ یہ کام شیاطین کا تھا حضرت سلیمان علیہ السلام کا دامن اس سے پاک تھا اور یہ کہ بنی اسرائیل نے شیاطین کی پیروی اختیار کر لی اور اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور شہر بابل میں ہاروت و ماروت پر جو کچھ نازل کیا گیا تھا وہ بنی اسرائیل کے لئے بطور آزمائش تھا اور اُنھوں نے اس کا غلط استعمال کیا۔

وفات سیدنا سلیمانؑ علیہ السلام

بیت المقدس کی تعمیر جس کا آغاز حضرت داؤد علیہ السلام نے کیا تھا اپنی وفات کی وجہ سے مکمل نہ کر سکے۔ آپ کے صاحبزادے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی تکمیل کی۔ امام سُدّی کی روایت کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی خوشی میں بطور شکرانہ بارہ۱۲ ہزار گائے اور بیس ہزار بکریوں کی قربانی کر کے لوگوں کو دعوتِ عام دی اور اللہ کا شکر ادا کیا جو اُس نے اسکی توفیق بخشی۔

اس اصل تعمیر کے مکمل ہونے کے باوجود بھی کچھ ذیلی کام باقی تھا اور یہ کام جنات کے سپرد تھا جنکی طبیعت میں سرکشی غالب تھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے خوف سے کام کیا کرتے تھے۔ اس درمیان حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا وقت قریب

آگیا جیسا کہ انبیاء کرام کو اُنکی موت سے قبل اطلاع دے دی جاتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی جب موت کی اطلاع دی گئی تو اُنھوں نے سوچا کہ اگر جنات کو معلوم ہو گیا تو کام چھوڑ دینگے اور تعمیر رہ جائیگی۔ اس کا انتظام حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ کیا کہ موت سے کچھ قبل اپنی محراب میں داخل ہو گئے جو شفاف شیشے سے بنی ہوئی تھی باہر سے اندر کی سب چیزیں نظر آتی تھیں پھر اپنے معمول کے مطابق عبادت میں مشغول ہو گئے اور ایک عصا کے سہارے کھڑے ہو گئے کہ روح پرواز کرنے کے بعد بھی جسم اس عصا کے سہارے اپنی جگہ جما رہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی روح وقت مقررہ پر قبض کر لی گئی مگر وہ اپنے عصا کے سہارے اپنی جگہ باہر سے ایسے نظر آتے تھے کہ عبادت میں مشغول ہیں۔ جنات اِنکو زندہ سمجھ کر کام میں ہمہ تن مشغول رہے یہاں تک سال بھر گزر گیا اور لکڑی کمزور ہو گئی عصا کا سہارا ختم ہوا تو حضرت سلیمان علیہ السلام گر پڑے۔ اس وقت جنات کو ان کے موت کی خبر ہوئی اور انھیں افسوس ہوا کہ اگر یہ بات پہلے ہی معلوم ہو جاتی تو اس مشقت کے کام میں ہرگز نہ پڑتے۔

جنات کو اللہ تعالےٰ نے کچھ ایسی قوتیں عطا کی ہیں کہ وہ دور دراز کی مسافت کو چند لمحات میں طے کر لینے اور بہت سے ایسے حوادث و واقعات کو جن سے انسان واقف نہیں وقت سے قبل معلوم کر لیتے ہیں اور جب انسانوں کو یہ اُن واقعات کی خبر دیتے ہیں تو نادان انسان سمجھتا ہے کہ جنات غیب کی خبریں جانتے ہیں حالانکہ غیب سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔ جنات کو بھی یہ خیال ہو گیا تھا کہ وہ غیب کی خبریں جانتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کے اس عجیب واقعہ نے اس حقیقت کو ظاہر کر دیا کہ جنات عالم الغیب نہیں ہیں کیونکہ اگر اُنھیں غیب کا علم ہوتا تو انھیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا ایک سال قبل علم ہو جاتا اور یہ سال بھر کی محنت و مشقت جو ان کو زندہ سمجھ کر برداشت کر رہے تھے چھوڑ بیٹھے۔

امام بغویؒ نے علماء تاریخ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی عمر شریف ترپین سال کی ہوئی اور انکی سلطنت و حکومت چالیس سال رہی۔ تیرہ سال کی عمر میں سلطنت کا کام سنبھال لیا تھا اور بیت المقدس کی تعمیر اپنی حکومت کے چوتھے سال میں شروع کی تھی۔
(مظہری و قرطبی)

آپکی موت کا تذکرہ اس طرح موجود ہے۔

قرآنی مضمون

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ ۖ الخ (سبا آیت ۱۴)

پھر جب ہم نے سلیمان پر موت کا فیصلہ کیا تو جنات کو اُن کی موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز سوائے اس زمین کے کیڑے (دیمک) کے نہ تھی جو اُن کے عصا کو کھا رہا تھا، پھر جب سلیمانؑ گر پڑے تو جنوں پر یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔

کہا جاتا ہے کہ جنات پر یہ راز جب کھُلا کہ تعمیر مکمل ہو چکی تھی اس لئے جنّوں کو یہ بھی احساس ہوا کہ اگر وہ غیب داں ہوتے تو اس سے بہت پہلے آزاد ہو گئے ہوتے اور انھیں اپنی نادانی کا اعتراف کرنا پڑا۔

اسکے علاوہ اُن گمراہ انسانوں کو بھی معلوم ہو گیا کہ جنات اور شیاطین غیب کی خبریں نہیں جانتے ہیں اور غیب سے ایسے ہی بے خبر ہیں جیسا عام انسان ہوا کرتا ہے۔ زمانے قدیم کی یہ جہالت ہر دور میں دہرائی جاتی رہی کہ جنات غیب کی خبریں دیا کرتے ہیں خاص طور پر عاملوں کی دوکانیں اسی مکر و فریب سے چل رہی ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ قرآن حکیم نے جس نظریہ کی تردید کے لئے یہ واقعہ بیان کیا ہے مسلمانوں کی ایک جماعت نے اسی کو اپنی تائید و نصرت خیال کیا، إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

نتائج و عبر

ایک علمی خیانت حقیقت یا مجاز

حضرت سلیمان علیہ السلام طبقۂ انبیاء میں پہلے اور آخر نبی ہیں جن کی فوج میں انسانوں کے علاوہ جنات اور چرند و پرند شامل تھے اور یہ سب کے سب اطاعت گزار غلاموں کی طرح خدمت انجام دیتے تھے۔

سورہ النمل میں اس کی وضاحت آئی ہے:-

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ۔ (النمل آیت ۱۷)

اور سلیمان کے لئے جنات اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کئے گئے تھے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔

موجودہ زمانے کے بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جنّ اور طیر سے مراد جنّات اور پرندے نہیں ہیں بلکہ انسان ہی ہیں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں مختلف کام کیا کرتے تھے۔ اُن کا خیال ہے کہ جنّ سے مراد پہاڑی قبائل کے وہ لوگ ہیں جنہیں حضرت سلیمان علیہ السلام نے سخرو تابع کر لیا تھا اور یہ لوگ اِن کے ہاں نہایت حیرت انگیز کام کرتے تھے اور طیر سے مراد گھوڑا سواروں کے دستے ہیں جو پیدل دستوں کی بہ نسبت بہت زیادہ تیزی سے نقل و حرکت کرتے تھے۔

اسی طرح تختِ بلقیس کو یمن سے اُٹھا کر فلسطین لے آنے والا بھی ایک قوی ہیکل اور طاقتور انسان ہی تھا۔ اسی طرح ہُدہُد پرندہ بھی ایک فوجی خبر رساں افسر تھا وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ قرآن حکیم میں بے جا تاویل کی بدترین مثالیں ہیں۔ قرآن حکیم یہاں جنّ، انس، طیر تین الگ الگ اقسام کے لشکر بیان کر رہا ہے اور ہر ایک جنس کو مستقل طور پر واو (اور) کے لفظ کے ساتھ لایا گیا ہے۔ لہذا جن اور طیر انسان نہیں ہو سکتے بلکہ وہ دو مستقل مخلوق ہیں۔ علاوہ ازیں کوئی شخص جو عربی زبان سے ذرا بھی واقفیت رکھتا ہو یہ تصور نہیں کر سکتا کہ عربی زبان میں محض لفظ اَلجنّ بول کر انسانوں کا کوئی گروہ یا اَلطّیر بول کر سواروں کا دستہ مراد لیا جاتا ہو اور نہ کوئی عرب اِن الفاظ کو سن کر ان کے یہ معنی سمجھ سکتا ہے۔ محاورے میں کسی طاقتور کو جنّ یا کسی تیز رفتار کو طیر (پرندہ) کہہ لینا اور بات ہے زبان اور لغت میں اس کے یہ معنی لینا کسی قرینہ اور دلیل ہی کے بغیر ممکن نہیں آخر یہاں کونسا قرینہ ہے کہ الفاظ کے حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنی مراد ہوں؟

کسی کلام میں کسی لفظ کے حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنی کو صرف اُسی وقت استعمال کیا جاتا ہے اور سننے والے بھی اِن کو مجازی معنوں میں صرف اُسی وقت لے سکتے ہیں جبکہ آس پاس کوئی واضح علامت ایسی موجود ہو جو اُسکے مجاز ہونے پر تقاضہ کرتی ہو۔ اور آیت مذکورہ میں ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ پھر اِنس کا لفظ جنّ اور طیر کے درمیان

آیا ہے۔ اگر جنّ اور طَیر انسان کی جنس سے ہوتے تو اس طرح کہا جاتا :-

وَحُشِرَ لِسُلَیْمَانَ جُنُوْدُہٗ الْجِنُّ وَالطَّیْرُ مِنَ الْاِنْسِ۔

اور سلیمان کے لئے جن اور پرندے انسانوں میں سے جمع کئے گئے۔

یعنی انسانوں کے پہاڑی اور قبائلی لشکر اور تیز رفتار گھوڑا سواروں کی فوج جمع کی گئی۔

اگر اللہ تعالےٰ کو یہی مضمون بیان کرنا ہوتا تو کیا اسکے لئے عربی مُبین میں الفاظ موجود نہ تھے کہ اس ہیر پھیر کے ساتھ اس مضمون کو بیان کیا جاتا؟ یہ پہلیوں کی زبان آخر قرآن حکیم میں کہاں استعمال کی گئی ہے؟

اگر کسی شخص میں تعصب اور ہٹ دھرمی نہو بلکہ وہ اخلاص کے ساتھ حقیقت کا جُویا ہو تو اُسکو صرف ایک اشارہ بھی کافی ہے۔ البتہ اگر کسی کا دل قرآن حکیم کی بات پر یقین نہ کرنا چاہتا ہو تو اُسے صاف کہنا چاہیئے کہ میں اس بات کو نہیں مانتا۔ لیکن یہ بڑی بداخلاقی بزدلی اور علمی خیانت ہے کہ آدمی قرآن کے صاف صاف الفاظ کو توڑ مروڑ کر اپنے مَن مانے معنی مراد لے اور پھر یہ ظاہر کرے کہ وہ قرآن حکیم کے بیان کو مانتا ہے۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔

ہُدہُد ہُدہُد کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ پرندہ نہیں تھا بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا کوئی فوجی افسر تھا جو شعبۂ خبر رسانی کا ذمّہ دار تھا۔ اس دعوی کی بنیاد یہ نہیں کہ تاریخ کی کسی معتبر کتاب میں ہُدہُد نامی کوئی شخص حضرت سلیمان علیہ السلام کی فوجی فہرست میں معروف تھا بلکہ یہ عمارت صرف اس دلیل پر کھڑی کی گئی ہے کہ قدیم زمانے میں جانوروں کے نام پر انسانوں کے نام رکھ دیئے جاتے تھے اسی طرح اس خبر رساں انسان کا نام بھی ہُدہُد رکھ دیا گیا ہوگا نیز اُس کا گفتگو کرنا اور وہ کام انجام دینا جو صرف انسان ہی کر سکتا پرندہ کیوں کر ہو سکتا ہے؟

عقل کے ان مفلسوں کی یہ مجبوریاں ہیں جس کی وجہ سے وہ ہُدہُد کو پرندہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ پہلا جواب تو یہ ہے کہ یہ قرآن حکیم کے سیدھے سادھے مفہوم کی تفسیر نہیں بلکہ اسکی تحریف اور تغلیط ہے۔

قرآن حکیم کو اگر یہ ہی کہنا تھا تو آخر اسکو کیا مجبوری تھی کہ وہ اس کو پردے میں

رکھکر بیان کرے ؟

آخر یہ کہنا کیا مشکل تھا کہ سلیمان نے محکمہ خبر رسانی کا جائزہ لیا اور ایک ذمہ دار افسر کو نہ پایا۔الخ

بجائے اسکے یہ فرمانا کہ پرندوں کا جائزہ لیا اور اسمیں ہُدہُد کو نہ پایا۔صاف و واضح بات ہے کہ ہُدہُد پرندہ ہی تھا انسان نہ تھا۔

پھر حضرت سلیمان علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہُدہُد یا تو اپنے غیر حاضر ہونے کی کوئی معقول وجہ بیان کرے ورنہ میں اُسے سخت سزا دوں گا یا ذبح کر دوں گا۔

انسان کو قتل کیا جاتا ہے یا پھانسی دی جاتی ہے یا سزائے موت دی جاتی ہے؟ ذبح کون کرتا ہے؟ بڑے سے بڑے مجرموں کو بھی ذبح کرنے کا طریقہ نہ اب ہے نہ پہلے تھا کوئی بڑا ہی سنگدل اور بے درد آدمی جوشِ انتقام میں اندھا ہو چکا ہو تو شاید کسی آدمی کو ذبح بھی کر دے مگر کیا پیغمبر اور رسول سے ہم یہ توقع کریں کہ وہ اپنی فوج کے ایک آدمی کو محض غیر حاضری کے جرم میں ذبح کر دینے کا اعلان کر دیں گے؟ اور اللہ تعالیٰ بھی اس سنگین اعلان پر کوئی ایک مذمت کا لفظ بھی نہ فرمائیں۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی۔

دوسری بات یہ بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اُس ہُدہُد کو خط دیکر یہ فرماتے ہیں :-

(اَلْقِهْ اِلَيْهِمْ) یہ خط اُن کی طرف ڈال دے یا پھینک دے۔

ظاہر ہے کہ یہ ہدایت صرف پرندے کو دی جا سکتی ہے لیکن کسی آدمی کو اپنا سفیر یا قاصد بنا کر بھیجنے کی صورت میں یہ انتہائی غیر موزوں اور ناشائستہ عنوان ہوگا کہ یہ خط اُسکے آگے ڈال دے یا اسکی طرف پھینک دے۔ خاص طور پر جبکہ ایک بادشاہ دوسرے ملک کے بادشاہ کو کوئی اہم خط روانہ کر رہا ہو۔ ہم جیسے معمولی لوگ بھی اپنے کسی ہمسائے کے پاس اپنے ملازم کو بھیجتے ہوئے یہ عنوان اختیار نہیں کرتے کہ یہ میرا خط لیجا کر فلاں صاحب کے آگے پھینک آ۔

اگر کسی کی عقل ہی خبط ہوگئی ہو تو اور بات ہے۔ اب بھی اگر کوئی شخص یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہے کہ ہُدہُد کوئی پرندہ تھا تو ایسے شخص کو صاف و صریح الفاظ میں یہ اعلان

کہ دینا چاہیئے کہ میں قرآن حکیم کے اِن غیر معقول باتوں کو تسلیم نہیں کرتا، بھلا کوئی جانور بھی بات چیت کیا ہے جو ہُدہُد کرے گا؟
(اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا)

ملکۂ سبأ قبیلہ قحطانی کی ایک مشہور شاخ سبأ ہے۔ یہ اپنے قبیلہ کا جد اعلیٰ تھا اور اس کا نام عبد شمس تھا اور سبأ اس کا لقب۔ یہ عرب مؤرخین کی رائے ہے۔
تورات کا بیان ہے کہ اس کا نام خود سبأ تھا۔ یہ شخص بہت بہادر اور صاحب جرأت تھا۔ اس نے زبردست فتوحات کے بعد حکومت سبأ کی بنیاد ڈالی۔ سبأ کا زمانۂ عروج تقریباً ۱۱۰۰ء قبل مسیح کہا جاتا ہے۔ سبأ کی حکومت کا اصل مرکز عرب کے جنوبی حصہ یمن کے مشرقی علاقہ میں تھا اور دار الحکومت کا نام مآرب تھا۔ موجودہ یمن دار السلطنت صنعاء سے تقریباً ۵۵ میل بجانب شمال مشرق واقع تھا اس کا زمانۂ عروج مَعین کی سلطنت کے زوال کے بعد شروع ہوا۔
اس شہر کو سبأ بھی کہتے تھے اور پھر اس کا دائرہ وسیع ہو کر مغرب میں حضرموت تک پھیل گیا تھا اور دوسری جانب حبشہ افریقہ تک بھی اسکی حکومت قائم تھی۔ سبأ نے یمن اور اطرافِ یمن میں اپنے مشہور زمانہ قلعے تعمیر کئے تھے۔ ملوکِ سبأ کا آخری دورِ حکومت ۵۵۰ء قبل مسیح بیان کیا جاتا ہے۔
انہی ملوک سبأ میں شہرۂ آفاق ملکہ (بلقیس) بھی ہے جو حضرت سلیمان علیہ السّلام کے عہد میں اپنے ملک پر حکمران تھی۔ قرآن حکیم نے اس ملکہ کا نام ظاہر نہیں کیا ہے صرف خاتون کے لفظ سے تعبیر کی ہے۔ البتہ اسرائیلی روایات میں اِس کا نام بلقیس بیان کیا گیا ہے اور اسی نام سے اسلامی کتب میں وہ معروف ہے۔ اہل حبشہ جن کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ ملکۂ سبا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اپنی زبان میں ملکہ کا نام "ماکدہ" بیان کرتے ہیں۔
ملکِ سبأ کا سرکاری مذہب سورج کی پرستش تھا۔ یہ لوگ سورج کو سب سے بڑا خدا سمجھتے تھے اور اسکی پوجا کرتے تھے۔ ملکۂ سبأ کا ایمان لانا تو قرآن حکیم سے ثابت ہے البتہ کیا اس کا نکاح بھی حضرت سلیمان علیہ السلام سے ہوا؟ قرآن حکیم اس صراحت

سے ساکت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مشہور محدث ابن عینیہؒ سے کسی نے پوچھا کہ کیا حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا سے نکاح کرلیا تھا؟ تو انھوں نے فرمایا اس کا معاملہ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ پر ختم ہوگیا۔

یعنی قرآن حکیم نے اسی حد تک اس کا حال بیان کیا ہے اسکے بعد کا حال بتلانا قرآن حکیم نے چھوڑ دیا ہے تو ہمیں بھی اسکی تفتیش نہ کرنی چاہیئے۔ مگر ابن عساکر نے حضرت عکرمہ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا سے نکاح کرلیا تھا اور اسکو اپنے ملک پر حاکم برقرار رکھ کر واپس کردیا۔ واللہ اعلم۔

تصویر اور تصویر سازی

حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے تابع جنات سے جو کام لیا کرتے تھے اُن کی کچھ تفصیل قرآن حکیم نے اس طرح نقل کی ہے:۔ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ۔ (سبا آیت ۱۳)

"وہ جنات سلیمان کے لئے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتے تھے اونچی عمارتیں اور تصویریں اور حوض جیسے بڑے بڑے لگن اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی بھاری دیگیں۔"

اس آیت میں اُن کاموں کی کچھ تفصیل ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام جنات سے لیا کرتے تھے۔

محاریب۔ محراب کی جمع ہے جو بلند و بالا جگہ کے لئے بولا جاتا ہے جس سے بلند عمارتیں اور قلعے بھی مراد لئے جاتے ہیں۔ اگر اسکو حرب سے مشتق مانا جائے تو اسکے معنی فوجی قلعے کے ہوتے ہیں اور چونکہ مسجد میں امام کی جگہ معزز و محترم ہوتی ہے اس لئے مُصلّٰے کو محراب کہا جاتا ہے۔ بعض ائمہ تفسیر نے محاریب سے مراد مساجد لی ہیں الغرض لفظ محاریب سب کو شامل ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ سب کام جنات سے لیا ہے۔ اپنی مرضی کے مطابق بڑے بڑے قلعے، اونچی عمارتیں، بلند و بالا مساجد تعمیر کروائیں۔

تماثیل۔ تمثال کی جمع ہے۔ تمثال تصویر کو کہا جاتا ہے خواہ وہ جاندار چیزوں کی تصویریں

ہوں یا بے جان اشیاء کی، پھر بے جان تصاویر خواہ پتھر و مٹی کے ہوں یا درخت و پھل پھول کے ہوں، لفظ تماثیل عام ہے اس سے ہر قسم کی تصویر مراد لی جاتی ہے۔ ابن عربیؒ کی احکام القرآن میں یہ ساری تفصیل موجود ہے۔ بعض تاریخی روایات میں تخت سلیمان پر پرندوں کی تصاویر کا ہونا بیان کیا گیا ہے۔ الغرض حضرت سلیمان علیہ السلام جنات سے یہ کام بھی لیا کرتے تھے۔

جِفَانٍ[۳] ۔ جفنہ کی جمع ہے ایسے بڑے برتن کو کہا جاتا ہے جو پانی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جیسے تسلہ یا ٹب وغیرہ۔

الجَوَاب[۴] ۔ جابیہ کی جمع ہے۔ چھوٹے حوض اور تالاب کو کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ پانی بھرنے کے بڑے بڑے برتن ایسے بناتے تھے جس میں چھوٹے حوض کے برابر پانی آتا ہو۔

قدُوْر[۵] ۔ قِدر کی جمع ہے ہنڈیا کو کہا جاتا ہے۔

راسِیَات[۶] ۔ اپنی جگہ ٹھیری ہوئی جمی ہوئی۔ مراد یہ ہے کہ اتنی وزنی اور بڑی دیگیں بناتے تھے جو ہلائے نہ ہلیں۔ ممکن ہے کہ یہ دیگیں پتھر تراش کر پتھر ہی کے چولہوں پر رکھی رہتی ہوں جو ناقابل حمل ونقل ہوتی ہوں۔ امام تفسیر ضحاکؒ نے یہی معنی لکھے ہیں۔ غالباً حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاں بہت بڑے پیمانے پر مہمان نوازی ہوتی تھی حوض جیسے برتن اس لئے بنائے جاتے تھے کہ ان میں کھانا رکھا جائے اور بھاری بھاری دیگیں اس لئے بنائی جاتی تھیں کہ ان میں بیک وقت ہزاروں مہمانوں کا کھانا پکایا جاسکے۔

اس آیت میں لفظ تماثیل (تصویریں) سے بعض مغرب پرست ذہنوں کو یہ تقویت پہنچی کہ تصویر بنانا ممنوع نہیں کیونکہ اللہ تعالےٰ کے ایک جلیل القدر نبی حضرت سلیمان علیہ السلام تصویریں بنواتے تھے۔ اور قرآن حکیم نے اِس عمل کو اُن کی خصوصیات میں ذکر کیا ہے اور اسپر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا ہے لہذا یہ عمل حلال ہوگا۔

یہ استدلال دو وجوہ سے غلط ہوگا

اوّل یہ کہ تمثال ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو کسی قدرتی شئی کے مشابہ بنائی جائے قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی انسان ہو یا حیوان یا کوئی درخت ہو یا پھول و دریا وغیرہ۔

بے جان شئ جو خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کے مانند بنائی گئی ہو۔
لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں یہ تعریف کی گئی ہے۔
اَلتِّمْثَالُ اِسْمٌ لِلشَّیْئِ الْمَصْنُوْعِ مُشَبَّہًا بِخَلْقٍ مِّنْ خَلْقِ اللّٰہِ
ہر اُس مصنوعی چیز کو تمثال کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی کسی چیز کے مانند بنائی گئی ہو۔
تفسیر کشاف میں یہ معنی لکھے ہیں:۔
التمثَالُ کُلُّ مَا صُوِّرَ عَلٰی صُوْرَۃِ غَیْرِہٖ مِنْ حَیْوَانٍ وَ غَیْرِ حَیْوَانٍ۔
"تمثال ہر اُس تصویر کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کی صورت کے مماثل بنائی گئی ہو خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان۔"
لہٰذا قرآن حکیم کے اس بیان کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کیلئے جنّات جو تماثیل بنائے تھے وہ ضرور انسانوں اور حیوانوں کی تصویریں یا مجسمے ہی ہوں؟ ممکن ہے وہ نقش و نگار پھول پتیاں اور قدرتی مناظر ہوں جن سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی عمارتوں کو آراستہ کیا ہو؟

علاوہ ازیں محض اس لفظ کے سہارے یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ قرآن حکیم نے انسانی اور حیوانی تصاویر کو حلال قرار دیا ہے۔ جبکہ تماثیل کا لفظ جاندار اور بے جان دونوں کے لئے آتا ہو۔

دوسرے یہ کہ نہایت کثیر تعداد میں احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی روح اشیاء کی تصویریں بنانے اور اسکو رکھنے کی قطعاً اجازت نہیں دی اور اسکے بنانے والے پر شدید عذاب کی اطلاع دی ہے اور لعنت اور رحمت الٰہی سے دوری کی بھی خبر دی ہے۔

چند مشہور احادیث ملاحظہ ہوں:۔
عَنْ اَبِیْ جُحَیْفَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَعَنَ الْمُصَوِّرَ۔ (بخاری کتاب البیوع)
حضرت ابو جحیفہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصوّر

پر لعنت فرمائی ہے۔

عن ابن عباسؓ فقال سمعت محمداً صلی اللہ علیہ وسلم یقول من صور صورۃ فی الدنیا کلف یوم القیامۃ ان ینفخ فیھا الروح ولیس بنافخ۔ (بخاری باب التصاویر)

"ابن عباس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا جس نے دنیا میں کوئی تصویر بنائی قیامت میں اسکو مجبور کیا جائے گا کہ اسمیں روح ڈالے اور وہ ڈال نہ سکے گا۔"

عن ابن مسعودؓ قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان اشد الناس عذابا عند اللہ یوم القیامۃ المصورون۔

(بخاری کتاب اللباس باب التصاویر)

"ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے قیامت کے دن لوگوں میں سب سے زیادہ عذاب تصویر بنانے والوں کو ہوگا۔"

عن ابن عمرؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان الذین یصنعون ھذہ الصور یعذبون یوم القیامۃ یقال لھم احیوا ما خلقتم (بخاری کتاب اللباس باب التصاویر)

"ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو لوگ یہ تصویریں بناتے ہیں انھیں قیامت کے دن عذاب دیا جائیگا اور اُن سے کہا جائیگا جو تم نے پیدا کیا ہے اُسے زندہ بھی کرو۔"

ابو زرعۃ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کے ساتھ مدینہ کے ایک مکان میں داخل ہوا۔ دیکھا کہ مکان کے اوپر ایک مصوّر تصویر بنارہا ہے اسپر حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو میری تخلیق کے مانند تخلیق کی کوشش کرے یہ لوگ ایک دانہ یا ایک چیونٹی تو بنا کر دکھائیں۔ (بخاری کتاب اللباس باب التصاویر)

(مسند احمد اور مسلم شریف کی روایت میں یہ وضاحت ہے کہ یہ مکان مردان کا تھا جو مدینہ منورہ کا گورنر تھا)

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ فرماتی کہ ایک روز اُم حبیبہؓ اور اُم سلمہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملک حبشہ کے گرجا گھروں کا ذکر کیا جنمیں تصاویر تھیں، اسپر آپؐ نے ارشاد فرمایا:-

ان لوگوں کا یہ حال تھا کہ جب کبھی اُن میں کوئی نیک انسان مرجاتا تو اسکی قبر کو عبادت گاہ بنا لیتے اور اُس میں یہ تصویریں بنالیا کرتے تھے یہ لوگ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق ہوں گے۔

(بخاری کتاب الصلوٰۃ، مسلم کتاب المساجد)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازے میں شریک تھے آپؐ نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی ایسا آدمی ہے جو مدینہ جاکر کوئی بُت نہ چھوڑے جسے توڑ نہ دے اور کوئی قبر نہ چھوڑے جسے زمین کے برابر نہ کردے اور کوئی تصویر نہ چھوڑے جسے مٹا نہ دے؟

ایک شخص اس کے لئے تیار ہوا چنانچہ وہ گیا مگر ہمت ہار بیٹھا اہل مدینہ کے خوف سے کام کئے بغیر واپس آگیا۔ پھر حضرت علیؓ نے عرض کیا یارسول اللہ میں جاتا ہوں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا اچھا جاؤ۔ حضرت علیؓ نے واپس آکر عرض کیا یارسول اللہ میں نے کوئی بُت نہیں چھوڑا جسے توڑ نہ دیا ہو اور کوئی قبر نہیں چھوڑی جسے زمین کے برابر نہ کردیا ہو اور کوئی تصویر نہیں چھوڑی جسے مٹا نہ دیا ہو۔ اسپر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اب اگر کسی شخص نے ان چیزوں میں سے کوئی چیز بنائی تو اُس نے اس تعلیم سے کفر کیا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوئی ہے۔

(مسند احمد، مسلم کتاب الجنائز، نسائی کتاب الجنائز)

سعید بن ابی الحسن کہتے ہیں کہ میں ایک روز حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر تھا ایک شخص آیا اُس نے کہا اے ابو عباسؓ میں اپنے ہاتھ سے تصویریں بنا کر اپنی روزی کماتا ہوں میرا یہ عمل کیسا ہے؟

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہیں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی ہے کہ جو شخص تصویر بنائے گا اللہ اُسے عذاب دے گا جب تک کہ وہ اسمیں روح نہ پھونک ڈالے۔ یہ بات سنکر وہ مصوّر سخت برافروختہ ہوا اور اُسکے چہرے کا رنگ زرد ہوگیا۔ اسپر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اگر تیری یہی مجبوری ہے تو کسی درخت یا کسی بے جان چیز کی تصویر بناکر اپنی روزی پیدا کر۔ (بخاری کتاب البیوع، مسلم کتاب اللباس)

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے ایک تکیہ خریدا جسمیں تصویریں بنی ہوئی تھیں پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے اور دروازے ہی میں کھڑے ہوگئے اندر داخل نہ ہوئے۔ میں نے آپؐ کی اس ناراضی پر عرض کیا اے اللہ میں ہر اُس گناہ سے توبہ کرتی ہوں جو میں نے کیا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا یہ تکیہ کیسا ہے؟

میں نے عرض کیا یہ آپؐ ہی کے لئے ہے جب بیٹھیں تو اِسپر ٹیک لگالیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا ان تصویروں کے بنانے والوں کو قیامت کے روز عذاب دیا جائے گا اور اِن سے کہا جائیگا جو کچھ تم نے بنایا ہے اسکو زندہ کرو (اَحْيُوْا مَا خَلَقْتُمْ) اور (رحمت کے) فرشتے ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جسمیں تصویریں ہوں۔ (بخاری ومسلم کتاب اللباس)

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ اپنے دروازے پر ایک پردہ لٹکا دیا تھا جسمیں تصویریں تھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا پھر آپ نے اُس پردے کو پھاڑ دیا اور فرمایا قیامت کے دن سخت ترین عذاب جن لوگوں کو دیا جائے گا اُن میں وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ کی تخلیق کے مانند تخلیق کرتے ہیں۔ (بخاری ومسلم کتاب اللباس)

دوسری روایت میں ہے کہ اُس پردے پر گھوڑوں کی تصویریں تھیں۔
(نسائی کتاب الزینہ)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ جبرئیل امین نے نبیؐ کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کا وعدہ کیا تھا مگر بہت دیر لگ گئی وہ نہ آئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے پریشانی ہوئی اور آپ گھر سے نکلے تو وہ مل گئے آپؐ نے ان سے شکایت کی تو جبرئیل امین نے کہا ہم کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا تصویر ہو (تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ کتے کا ایک چھوٹا بچہ چارپائی کے نیچے آبیٹھا تھا) (بخاری کتاب اللباس)

اس مضمون کی اور کئی روایات حدیث کی مستند ترین کتابوں بخاری و مسلم کے علاوہ مسند احمد، ابو داؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، موطا وغیرہ میں موجود ہیں۔ یہ تو آپکے ارشادات تھے۔ رہا اصحاب رسول کا عمل وہ بھی قابل توجہ ہے :-

حضرت عمرؓ نے عیسائیوں سے کہا تھا کہ ہم تمہارے عبادتگاہوں میں اس لئے داخل نہیں ہوتے کہ اُن میں تصویریں ہیں۔

(بخاری کتاب الصلوٰۃ)

حضرت ابن عباسؓ گرجا (چرچ) میں نماز پڑھ لیتے تھے مگر کسی ایسے چرچ میں نہیں جس میں تصویریں ہوں۔ (بخاری کتاب الصلوٰۃ)

حضرت علیؓ نے اپنے ایک شاگرد ابو الہیاج اسدی سے فرمایا کہ میں تم کو اُس مہم پر روانہ نہ کروں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے روانہ کیا تھا؟

وہ یہ کہ تم کسی مجسمہ کو نہ چھوڑو جسے توڑ نہ دو اور کوئی اونچی قبر نہ چھوڑو جسے زمین کے برابر نہ کردو اور کوئی تصویر نہ چھوڑو جسے مٹا نہ دو۔

(مسلم، نسائی، کتاب الجنائز)

اس لئے امت کے علماء وفقہاء نے کسی بھی جاندار چیز کی تصویر کو نہ صرف حرام بلکہ سخت گناہ قرار دیا ہے۔ ہر حالت میں تصویر کشی حرام ہے کیونکہ اسمیں اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے مشابہت ہے جس پر اللہ کا غضب بیان کیا گیا ہے۔

امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ، سفیان ثوریؒ، ابن سیرینؒ، سعید بن جبیرؒ، سالم بن عبد اللہؒ، عکرمہ بن خالدؒ وغیرہم کی یہی رائے ہے۔

مزید تفصیل فتح الباری ج ۱۰ ص ۳۰۰ اور عینی شرح بخاری اور نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۱۹۱

میں موجود ہے۔
اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ تصویر کا مسئلہ کوئی مختلف فیہ یا قیاس ورائے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک واضح اور فیصلہ کن بات ہے۔ اس کو محض چند اقوال یا تاویلات کے ذریعہ بدلا نہیں جا سکتا۔

بعض شکوک کے جوابات

بعض لوگ فوٹو گرافی اور ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویر میں فرق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہتے ہیں کہ فوٹو گرافی تصویر بنانے کے حکم میں نہیں آتی کیونکہ یہ انسان کا عکس ہے جو کاغذ پر چسپاں ہو جاتا ہے یہ ایسے ہی جیسے آئینہ یا دھوپ میں انسان کا عکس آجاتا ہے۔
حالانکہ یہ ایک فریب خوردہ فکر اور حقیقت سے پہلوتہی ہے۔ شریعتِ اسلامی نے تصویر کو حرام قرار دیا ہے نہ کہ تصویر سازی کے کسی خاص طریقے کو۔ فوٹو گرافی اور ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر میں تصویر کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں دونوں ہی تصویریں ہیں۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو فوٹو گرافی کی تصویر دستی تصویر سے کچھ زیادہ ہی تصویر کہلانے کا حق رکھتی ہے۔
اگر دونوں میں کچھ فرق ہے تو وہ طریق تصویر سازی کے لحاظ سے ہے۔ تصویر یا غیر تصویر کے طور پر نہیں۔ اس لحاظ سے شریعت اسلامی کے احکام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پھر فوٹو گرافی کو دھوپ یا آئینہ کے عکس سے تشبیہ دینا انتہائی غیر معقول بات ہے۔ کوئی بھی اس منطق کو تسلیم نہیں کرسکتا۔ عکس کی حقیقت تو عکس ہی ہے اسکو فوٹو یا تصویر نہ عرفاً کہا جاتا ہے نہ شرعاً اور نہ ہی لغت کے اعتبار سے تصویر کہنا درست ہے۔ پھر خواہ مخواہ ایک فرضی خیال سے قرآن وحدیث کی واضح ہدایات کو بدل دینا دین ودانش کا کون سا تقاضہ ہے؟
بعض لوگوں کا یہ خیال کہ اسلام نے تصویر سازی کو شرک وبت پرستی کے اندیشہ کے طور پر منع کیا تھا اور اب ایسا کوئی خطرہ نہیں لہذا یہ حکم باقی نہ رہنا چاہیئے۔
یہ بھی ایک خود ساختہ علت ہے قرآن واحادیث میں کہیں یہ بات بیان نہیں کی گئی کہ تصویر کو شرک یا بت پرستی کے خطرے سے بچانے کے لئے حرام قرار دیا ہے۔ یہ تو ایسے ہی جیسے مدعی سست گواہ چست والی بات ہے۔ پھر دوسرے یہ کہ اگر اس اندیشہ

کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو سوال یہ ہے کیا اب دنیا میں شرک و بت پرستی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ حالانکہ آج خود برصغیر ہند و پاک میں کروڑوں بت پرست اور مشرک موجود ہیں۔ دنیا کے ہر خطہ میں شرک ہو رہا ہے۔ عیسائی دنیا کا تو مذہب ہی بت پرستی اور شرک ہے۔ حضرت عیسیٰ و مریم علیہم السلام کے مجسمے اِن کی عبادت گاہوں کی علامت ہیں۔

حتیٰ کہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی مخلوق پرستی کی لعنت سے محفوظ نہیں۔ پھر یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ اسلام نے شرک و بت پرستی کے خطرے کی وجہ سے تصویر کو منع کیا ہے اور اب وہ خطرہ باقی نہ رہا۔

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ تصویریں ممنوع ہونی چاہئیں جو مشرکانہ نوعیت کی ہیں جنکو معبود بنا لیا گیا ہو۔ رہی وہ تصویریں جو بغرض یادگار یا تفریح طبع کے طور پر لی جاتی ہیں اُنھیں حرام کہنے کی کوئی وجہ نہیں۔

لیکن شاید اس طرح کی باتیں بنانے والے یہ سمجھتے ہیں کہ حلال و حرام کی اصطلاحیں دراصل اللہ و رسول کی نہیں بلکہ انسانوں کی ذہنی پیداوار ہیں۔ انسانی عقل جس چیز کو چاہے حرام کہدے اور جس کو چاہے حلال۔ یہ وہ تباہ کن نظریہ ہے جو اسلام کی بنیاد ہی کو اکھیڑ پھینکتا ہے۔

اللہ و رسول پر ایمان لانے کے بعد ایک مؤمن پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ و رسول کی ہدایات سے احکام اور قانون اخذ کرے نہ یہ کہ کسی مفروضہ فکر کے تحت بعض چیزوں کو حلال قرار دے اور بعض کو حرام۔ پھر اس طرح سوچنے والوں کو یہ بھی جاننا چاہیئے کہ تصویر نہ صرف شرک و بُت پرستی کی موجب رہی ہے بلکہ ہر دور میں مختلف فتنوں کا سبب بھی رہی ہے اور آج بھی اِن فتنوں سے پاک نہیں۔

تصویر کی مضرتیں

تصویر کو دنیا میں شہوانیت پھیلانے کا بہت بڑا ذریعہ سمجھا گیا ہے اور آج یہ فتنہ ہر دور سے زیادہ برسرعروج ہے۔ عُریانیت کی تشہیر اسی کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ عورت کی ناموس کو سرِ بازار اسی فتنے کے ذریعہ پامال کیا گیا۔ تصویروں کے ذریعہ بے دین اور آخرت فراموش انسانوں کی عظمت عوام الناس کے ذہنوں میں پیوست کی جاتی ہے اور آج سب سے زیادہ استعمال کی جا رہی ہے۔

تصاویر قوموں میں نفرت اور عداوت کے بیج بونے، فساد ڈلوانے اور عام لوگوں کو طرح طرح سے گمراہ کرنے کے لئے بھی بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لئے یہ خیال کرنا کہ شریعت اسلامیہ نے تصویر کو صرف بُت پرستی کے اندیشے کے تحت حرام قرار دیا بالکل غلط نظریہ ہے۔

بعض لوگ بظاہر چند بے ضرر قسم کی جاندار تصویروں کی طرف اشارہ کر کے تصویر سازی کی پوری ثقافت کا جواز پیدا کر لیتے ہیں اور مسلمانوں میں رواج دینا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ یہ بھول جاتے ہیں یا اوروں کو بھلا دینے کے فریب میں مبتلا ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں امت کے لئے جو قانون یا ضابطہ چھوڑا ہے وہ کوئی مؤقتی یا سرسری نہیں بلکہ مکمل و واضح ہدایت ہے جسکی مضرت کو صاف صاف عنوان سے ظاہر فرمایا ہے۔

ہم قانون ساز نہیں قانون کی پیروی کرنے والے ہیں ہمیں جب صریح حکم مل جائے تو اس سے رُک جانا چاہیئے۔ یہی دین و دانش کا تقاضہ بھی ہے۔

تصویر سازی کے ممنوع ہونے کی ایک اور بھی وجہ ہے اور وہ یہ کہ صورت گری اللہ تعالیٰ کی خصوصی صفت ہے جیسا کہ خَلق اور اَمر اللہ کی خصوصی صفات ہیں۔ اللہ کے اسماء میں المصوّر بیان کیا گیا ہے وہ ہی ماؤں کے پیٹ میں صورت گری کرتا ہے اور یہ اُسی کی قدرت میں ہے کہ مخلوقات کی ہزارہا انواع میں کروڑوں افراد ہوتے ہیں ایک کی صورت دوسرے سے نہیں ملتی۔

انسان ہی کو لیجئے مرد اور عورت کی صورت میں نمایاں امتیاز ہے پھر عورتوں اور مردوں کے کروڑوں افراد میں سے دو فرد بالکل یکساں نہیں ہوئے۔ اسی طرح حیوانات، نباتات، جمادات پر غور کریں کوئی دو فرد ایک جیسے نہیں ہوتے اِن میں ایسا واضح فرق رہتا ہے کہ دیکھنے والوں کو بغیر کسی غور و فکر کے ہر دو میں امتیاز ہو جاتا ہے۔ یہ صورت گری اللہ ربّ العزت کے سوا کس کی قدرت میں ہے؟ اب اگر کوئی انسان کسی جاندار کا مجسمہ یا تصویر بناتا ہے وہ گویا عملی طور پر اس کا مدعی قرار پاتا ہے کہ وہ بھی صورت گری کر سکتا ہے اس لئے صحیح بخاری وغیرہ کی احادیث میں ہے کہ قیامت کے روز تصویر بنانے والوں کو کہا جائیگا کہ جب تم نے ہماری نقل اُتاری ہے تو اسکو مکمل کر کے دکھلاؤ اسمیں روح بھی ڈالو، اور یہ کام مخلوقات میں کسی کے بس کا نہیں۔

اس لئے شریعتِ اسلامی نے تصویر سازی کی قطعاً اجازت نہیں دی اور اسپر شدید وعیدیں بیان کی ہیں۔

رہے وہ امور جو موجودہ دُنیا کے عارضی تقاضے ہیں اس کے بارے میں علماء کرام سے مراجعت کی ضرورت ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

ایک عقلمند جانور سیدنا سلیمان علیہ السلام کے واقعات میں وادیٔ نملہ (چیونٹیوں کی وادی) کا ایک حیرت انگیز واقعہ گزشتہ صفحات میں درج کیا گیا ہے۔ اس واقعہ نے انسانوں کو پہلی مرتبہ اس کا احساس دلایا کہ جانوروں کو بھی عقل وشعور کسی نہ کسی درجے میں دیا گیا ہے۔

حیوانات سے عقل کی بالکلیہ نفی کرنا بے دلیل بات ہے۔ خاص طور پر چیونٹی کے بارے میں موجودہ زمانے میں ماہرین علم حیوانات نے بہت کچھ انکشافات کئے ہیں۔ ذہانت، ذکاوت، تنظیم، تقسیم کار کے لحاظ سے چیونٹی کی زندگی ہر طرح کامل اور مکمل ہوتی ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ کبوتر سب پرندوں میں زیادہ عقلمند ہے۔

ابن عطیہؒ کہتے ہیں کہ چیونٹی نہایت ذہین اور عقلمند جانور ہے۔ اسکی قوتِ شامّہ (سونگھنے کی قوت) بڑی تیز ہوتی ہے۔ زمین کے اندر سے زمین کے اوپر والی شئ کا ادراک کرلیتی ہے۔ اسکے قبضہ میں جو دانہ آجاتا ہے پہلے اُس کے دو ٹکڑے کردیتی ہے تاکہ وہ اُگے نہیں۔ سردی کے زمانے میں اپنے لئے غذا کا ذخیرہ جمع کرلیتی ہے۔ (قرطبی)

چیونٹی بڑی حقیر اور معمولی سی نظر آتی ہے لیکن محنت اور ذہانت میں ایک ایسا نادر نمونہ ہے جسکی مثال جانوروں میں مشکل سے ملیگی۔ یہ نہ کبھی بیکار بیٹھتی ہے اور نہ آرام کرتی ہے ہر وقت مشغول رہتی ہے۔

علم حیوانات کے ماہرین کا خیال ہے کہ چیونٹی حضرتِ انسان سے بہت کچھ مشابہت رکھتی ہے۔ ذہانت و ذکاوت کے علاوہ انسانوں کی طرح اپنے لئے خادم بھی رکھتی ہے، جانور پالتی ہے ان کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرتی ہے، فوج رکھتی ہے دشمن پر حملہ کرتی ہے، سکو کھیتی باڑی کا بھی سلیقہ آتا ہے۔ کھیتوں میں ناگر چلاتی ہے بیج بوتی ہے، کاشت تیار ہوتی ہے

تو اسکو نہایت احتیاط سے تہہ خانوں میں محفوظ اور منتقل کر دیتی ہے. اس مخلوق میں جاگیردارانہ نظام بھی پایا جاتا ہے. اِن کے جاگیر دار ہمارے جاگیر داروں کی طرح مطلبی، آرام پسند، قومی فرائض سے غافل، بطن پرور، تن آسان ہوتے ہیں، ان کو کسی کام سے کوئی غرض نہیں ہوتی دن بھر کھاتے پڑے رہتے ہیں۔

چیونٹی کی گائے بھینس ایک قسم کے کیڑے ہوتے ہیں جنکے شکم میں شہد بھرا رہتا ہے چیونٹی اپنے باریک ڈنکوں کی مدد سے ان کیڑوں کا شہد حاصل کر لیتی ہیں۔ ان کیڑوں کے انڈے، بچوں کی بڑی سختی سے حفاظت بھی کرتی ہیں۔ چیونٹی کی ایک قسم ایسی بھی ہے جو اپنے ہمجنس کو دودھ دیتی ہے. براعظم آسٹریلیا کے بعض حصوں میں یہ قسم کثرت سے پائی جاتی ہے. ان کی زندگی کا مقصد اپنے ہمجنسوں کو آرام اور غذا پہنچانا ہوتا ہے. یہ زمین کے اندر دیواروں سے اسطرح چمٹی لٹکتی رہتی ہیں جیسے انگور کے خوشے لٹک رہے ہوں. یہ چیونٹیاں عموماً چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوتیں ان کے پیٹ شہد سے بھرے رہتے ہیں. شہد کم ہوجائے تو انھیں چلتا پھرتا دیکھا گیا ہے. مزدور اور رضاکار چیونٹیاں جب بھوکی ہوجاتی ہیں تو ان کے پاس آکر اپنی غذا حاصل کر لیتی ہیں اور پھر کام میں مشغول ہوجاتی ہیں. چیونٹیوں کے گودام بڑے سلیقے کے بنے ہوئے ہوتے ہیں ان میں ان کے سال بھر کا غلّہ محفوظ طریقے پر جمع رہتا ہے. اگر گودام میں غلہ، نمی و رطوبت کی وجہ سے خراب ہونے لگے تو ساری چیونٹیاں پورے غلّے کو باہر نکال کر دھوپ میں خشک کر لیتی ہیں اور پھر اسکے گودام میں محفوظ کر دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی ان کا نظامِ زندگی بیان کیا گیا ہے جو خالقِ کائنات کی عظمت و کبریائی اور قدرتِ مطلقہ کے تصور میں غیر معمولی اضافہ کر دیتا ہے۔

فتبارک اللّٰہ احسنُ الخالقین۔

تذکرہ
سیدنا ایوب علیہ السلام
(نِعمَ العَبدُ)

قرآن حکیم اور سیدنا ایوب علیہ السلام

حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر مبارک قرآن حکیم کی چار سورتوں میں آیا ہے۔

سورۃ النساء ——— آیت ۱۶۳
" الانعام ——— " ۸۴
" الانبیاء ——— " ۸۳، ۸۴
" ص ——— " ۴۱ تا ۴۴

سورۂ نساء اور سورۂ انعام میں صرف اسم گرامی ملتا ہے بقیہ دو سورتیں الانبیاء ورص میں مختصر طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ اُن پر امتحان و آزمائش کا ایک سخت مرحلہ پیش آیا تھا اور مصائب و آلام نے اُنھیں ہر چار سمت گھیر لیا تھا مگر وہ صبر و شکر کے سوا حرف شکایت تک زبان پر نہیں لائے، اللہ کی جناب میں اپنا وہی عبدیت کا تعلق برقرار رکھا بلکہ کچھ اور ہی زیادہ رجوع ہوئے اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت میں اُنھیں ڈھانک لیا اور مصائب و آلام کے بادل دور کرکے اُن کو اپنے فضل و عطا سے مالا مال کر دیا اور انکی تعریف فرمائی کہ:-

"وہ بہت ہی اچھا بندہ تھا ہماری طرف کثرت سے رجوع ہونیوالا"

(ص آیت ۴۴)

تعارف

حضرت ایوب علیہ السلام کے زمانۂ بعثت اور اُن کی قومیت کے بارے میں دو ماخذ اہم جانے گئے ہیں۔

اوّل تورات۔ دوم۔ تاریخ قدیم کے بعض اقتباسات۔

ان ہی دو حوالوں سے حضرت ایوب علیہ السلام کا کچھ تعارف مل سکتا ہے قرآن حکیم اور احادیث صحیحہ میں ان کی قومیت، زمانۂ بعثت اور سلسلۂ نسب کے تعلق سے کوئی وضاحت نہیں ملتی اور جیساکہ پہلے بھی لکھا گیا قرآن حکیم کے مقاصد میں یہ بات شامل نہیں کہ وہ تاریخی حیثیت اور اُس کے موضوع سے بحث کرے۔ اُس کا اوّل و آخر مقصد تذکیر، دعوت و تبلیغ، عبرت و نصیحت ہے۔ ان ہی مقاصد کے تحت وہ انبیاء و رسل کے تذکرے اور اُسکے نتائج و عواقب بیان کرتا ہے تاہم بطور تعارف تاریخ قدیم کے بعض اقتباسات کا نقل کر دینا فائدے سے خالی نہیں۔

کتب تاریخ میں ایک نام یوباب ملتا ہے۔ اہل تحقیق کا خیال ہے کہ ایوبؑ اور یوبابؑ ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ عبرانی زبان میں یوباب کو اوب کہا گیا اور یہی عربی ادب میں ایوبؑ ہوگیا۔ (علیہ السلام)

مولانا آزادؒ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام بنی یقطان کی نسل سے ہیں اور عربی نژاد ہیں۔ اس لئے وہ یا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہم زمانہ ہیں یا پھر حضرت اسحٰق و حضرت یعقوب علیہم السلام کے معاصر ہیں، لکھتے ہیں :-

> اولاً محققین تورات اکثر اس طرف گئے ہیں کہ حضرت ایوب علیہ السلام عرب تھے۔ عرب میں ظاہر ہوئے اور سفر ایوب اصلاً قدیم عربی میں لکھی گئی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُسے قدیم عربی سے عبرانی میں منتقل کیا، سفر ایوب میں ہے کہ وہ شہر عوص (مشرقی فلسطین) میں رہے تھے اور آگے چلکر تصریح کی ہے کہ اُن کے مویشی پر شیبا (سبا) کے لوگوں نے حملہ کیا تھا۔
>
> ان دونوں تصریحوں سے بھی اسکی تصدیق ہوجاتی ہے کیونکہ کتاب پیدائش (تورات) اور تواریخ اوّل میں عوص کو آرام بن سام بن نوح (علیہ السلام) کا بیٹا کہا ہے اور آرامی بالاتفاق عرب عاربہ کی ابتدائی جماعتوں میں سے ہے۔
>
> (ترجمان القرآن ج ۲ ص۴۸۶)

عرب مؤرخ ابن عساکر بھی حضرت ایوب علیہ السلام کو ابراہیمی عہد کے قریب تسلیم کرتے ہیں اور اِن کو حضرت لوط علیہ السلام کا ہمعصر اور دین ابراہیمی کا پیرو خیال کرتے ہیں۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۳۲۶)

مؤلف قصص الانبیاء نجار مصری نے حضرت ایوب علیہ السلام کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ایک سو سال پہلے لکھا ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن عساکر نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ بنت لوط (علیہ السلام) کے صاحبزادے ہیں اور قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ وہ لیّا بنت یعقوب (علیہ السلام) یا رحمت بنت افرائیم بن یوسف (علیہ السلام) کے صاحبزادے ہیں۔

امام بخاری کی بھی غالباً یہی رائے ہے کیونکہ انھوں نے کتاب الانبیاء میں انبیاء کرام کی جو ترتیب قائم کی ہے اس میں حضرت ایوبؑ کا ذکر حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبل کیا ہے۔

الغرض حضرت ایوب علیہ السلام عربی ہیں کیونکہ تمام مختلف اقوال میں بھی اُنکے عرب ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ اور آپ کا عہد حضرت یعقوب و حضرت موسیٰ علیہم السلام کا درمیانی عہد ہے۔

صبرِ ایوبؑ

قرآن حکیم نے اگرچہ حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے لیکن واقعہ کی روح اور ان کا اُسوہ آیاتِ قرآنی میں نہایت واضح طور پر نقل کیا گیا ہے وہ ایک پاک اور مقدس انسان تھے جو اللہ تعالےٰ کے یہاں انبیاء و رسل کی جماعت میں شامل ہیں۔ وہ دولت و ثروت اور کثرت اہل و عیال کی وجہ سے بہت خوش بخت اور فیروزمند تھے مگر ایک امتحان و آزمائش میں آگئے۔ مال و متاع، اہل و عیال، جسم و جان سب پر آفت آئی۔ مال و متاع ختم ہوا، اہل و عیال فوت ہوئے، جسم و جان کو سخت بیماری نے گھیر لیا، تب بھی اُنھوں نے نہ شکوہ کیا نہ شکایت بلکہ صبر و شکر کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی جناب میں سوائے عرضِ حال کے اور کوئی حرف زبان پر نہ لائے۔

اللہ تعالیٰ کی جناب میں مختصر ترین الفاظ میں اپنی تکلیف کا اس طرح ذکر کیا:۔

اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ۔

(الانبیاء۔ آیت ۸۳)

(مجھکو بیماری لگ گئی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے)

دُعا کا انداز کس قدر لطیف اور باادب ہے صرف اپنی تکلیف کا اجمالی ذکر کرتے ہیں اور اسکے بعد یہ کہکر رُک جاتے ہیں "تو ارحم الراحمین ہے" آگے نہ شکوہ نہ شکایت، کوئی مدّعا نہیں کسی چیز کا مطالبہ نہیں۔ پاس ادب کا یہ عالم ہے کہ یہ نہیں کہا "تو نے مصیبت میں ڈال دیا" بلکہ شر کو شیطان کی جانب منسوب کیا اور فرمایا: "شیطان نے مجھے ایذا اور تکلیف کے ساتھ ہاتھ لگایا ہے۔"

اُن کی پکار کو اللہ نے سُنا اور قبول کیا جو مال ومتاع ختم ہوا تھا اور جو اہل وعیال فوت ہو گئے تھے اللہ نے اپنے فضل وکرم سے دوچند اور زیادہ بخش دیئے اور صحت وتندرستی کے لئے زیرِ قدم ایک ٹھنڈے پانی کا چشمہ پیدا فرما دیا۔ جس کے پانی میں یہ خاصیت تھی کہ اُس سے غسل کرنے اور اُسکے پینے سے اُن کی بیماری دور ہو گئی۔

اس قصے میں حضرت ایوب علیہ السلام کا کردار سراپا صبر تسلیم ورضا اور انکی زندگی عبادت گزاروں کے لئے "ابدی نمونہ" اور بلا وآزمائش میں مبتلا انسانوں کے لئے نصیحت ودرس کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس واقعہ کے بعد اللہ تعالےٰ نے اُنھیں جہاں ان کا مال ومتاع دوچند کر دیا وہاں اہل وعیال کی عطا کا بھی ذکر کیا ہے یعنی ان کی فوت شدہ اولاد اور اہل خانہ کو دوبارہ عطا کیا گیا۔ مفسرین میں ابن کثیرؒ، امام حسنؒ، امام قتادہؒ کی رائے یہی ہے کہ فوت شدگان کو حیاتِ نو بخشی گئی۔

امام رازیؒ اور ابن حیانؒ اندلسی کی رائے یہ ہے کہ فوت شدگان کی جگہ دوچند اہل وعیال عطا کئے گئے۔ آیت میں ہر دو مفہوم کی گنجائش ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا.

(ص الایہ ۴۳)

"اور ہم نے ان کو اُن کے اہل وعیال عطا کئے اور اُن کے ساتھ
اُتنے ہی اور اپنی طرف سے رحمت کے طور پر۔"

اور آخر میں اُن کے انجام پر بطور سند یہ توثیق فرما دی۔

"بلاشُبہ ہم نے اُنھیں صبر کرنے والا پایا اور وہ اچھا بندہ ہے
بیشک وہ اپنے رب کی طرف بہت رجوع ہونے والا بندہ تھا۔"

حضرت ایوب علیہ السلام کی بلا و آزمائش اور اُن کی فریاد اور صبر و استقامت اور اللہ تعالیٰ کی عطا و بخشش کا ذکر آیات ذیل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

قرآنی مضمون وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ. الخ (انبیاء آیت ۸۳، ۸۴)

"اور ایوبؑ کا حال بھی یاد کرو جب اُس نے اپنے رب کو پکارا تھا (الٰہی) مجھکو تکلیف پہنچ رہی ہے اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں۔ پھر ہم نے اُن کی دُعا قبول کرلی اور اُن کا دُکھ دور کر دیا اور ہم نے اُن کو اُن کا کُنبہ عطا کیا اور اُن کے برابر اور بھی اپنی رحمتِ خاص کے سبب دیا۔ اور عبادت گزار بندوں کی نصیحت کے لئے (یہ فضل و کرم فرمایا)"

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ. الخ (صٓ آیات ۴۱ تا ۴۳)

"اور ہمارے بندے ایوبؑ کا ذکر کرو جب اُس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھکو شیطان نے ایذا اور تکلیف کے ساتھ ہاتھ لگایا ہے۔

تب ہم نے اُن سے کہا اپنے پاؤں سے ٹھوکر مار (اُنھوں نے ایسا ہی کیا اور چشمہ زمین سے اُبل پڑا تو ہم نے کہا) یہ نہانے کا ٹھنڈا پانی ہے اور پینے کا۔

اور ہم نے اُس کو اُس کے اہل و عیال عطا کئے اور اُن کے مانند اور زیادہ اپنی مہربانی سے اور بطور یادگار عقلمندوں کے لئے۔"

ایفائے عہد حضرت ایوب علیہ السلام کے زمانۂ علالت میں سب نے اُنکا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ عزیز و اقارب، دوست احباب نے بھی منہ پھیر لیا تھا صرف ایک بیوی نے اس تمام بیماری میں ساتھ دیا وہ ہر روز ان کی خدمت انجام دیا کرتی تھی اور اُن کے دُکھ درد میں برابر کی شریک تھیں۔ ایک مرتبہ بیوی نے حضرت ایوب علیہ السلام کی انتہائی تکلیف سے بیقرار ہو کر کچھ ایسے کلمات کہہ دیئے جو صبر

وشکر کے خلاف تھے اور اللہ تعالٰی کی جناب میں شکوہ کا پہلو لئے ہوئے تھا حضرت ایوب علیہ السلام کو یہ شکایت پسند نہ آئی اور آپؑ کی زبان سے اس قسم کا عہد نکل گیا :۔

"اگر میں شفایاب ہوگیا تو واللہ تجھ کو سو کوڑے ماروں گا۔"

امام احمدؒ نے کتاب الزہد (مسند احمد میں) حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ :۔

"حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری کے زمانے میں ایک بار شیطان طبیب کی شکل میں آپؑ کی بیوی کے پاس آیا نیک بیوی نے علاج کرنے کی گذارش کی اُسپر اس نے آمادگی ظاہر کی اور اسکے لئے یہ شرط رکھی کہ اگر تمہارے شوہر صحت یاب ہوجائیں تو تم میرا اس طرح شکریہ ادا کرنا : آپ نے میرے شوہر کو شفا عنایت کی۔" میرے علاج کا یہی نذرانہ ہے۔ نیک بیوی نے وعدہ کرلیا اور اس کا ذکر حضرت ایوب علیہ السلام سے کیا۔ حضرت ایوب علیہ السلام کو اس سے سخت دکھ ہوا فرمایا کہ وہ شیطان تھا جو ایسے شرکیہ کلمات تم سے کہلوانا چاہتا تھا اور تم نے وعدہ بھی کرلیا تمہاری غفلت یہاں تک پہنچ چکی ہے ؟

پھر آپ بے قابو ہوگئے اور قسم کھالیا کہ جب میں صحت یاب ہوجاؤں گا تو تم کو سو کوڑے ماروں گا۔

بہرحال جب حضرت ایوب علیہ السلام کو اللہ تعالٰی نے شفا دی تو قسم (ایفائے عہد) کا سوال پیش آیا ایک جانب نہایت وفادار، غمخوار رفیقۂ حیات ہے دوسری طرف قسم کو پوری کرنے کا مسئلہ ؟

حضرت ایوب علیہ السلام سخت تردد اور فکر میں تھے لیکن بہت جلد اللہ تعالٰی نے نیک بیوی کو شوہر کے ساتھ وفاداری کا یہ صلہ دیا کہ ایک خاص طریقہ سے اِس قسم کو پورا کرنے کا حکم نازل کیا اور ارشاد فرمایا کہ آپ اپنی قسم نہ توڑیں بلکہ سو تنکوں کا ایک گٹھا بنائیں اور اُس سے اپنی بیوی کو ایک ضرب لگادیں۔ بس قسم پوری ہوجائیگی۔ چنانچہ حضرت

ایوب علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور اپنی قسم کو پورا کر دیا۔"

اس واقعہ کو قرآن حکیم نے اس اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے :۔

قرآنی مضمون

وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِب بِّهِ وَلَا تَحْنَثْ إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِّعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ (ص آیت ۴۴)

"اور (ہم نے انھیں حکم دیا) کہ بس اپنے ہاتھ میں تنکوں کا ایک مُٹھا اور اُس سے مار دے اور اپنی قسم نہ توڑیئے۔ بیشک ہم نے انھیں صبر کرنے والا پایا، بہت ہی عمدہ بندہ۔ یقیناً وہ اپنے رب کی طرف بہت رجوع ہونے والا تھا۔"

حاکم اور ابن حبان نے حضرت انسؓ کا ایک اثر نقل کیا ہے کہ :۔

حضرت ایوب علیہ السلام تیرہ سال تک مصائب کے امتحان میں مبتلا رہے حتیٰ کہ اُن کے تمام عزیز و اقارب نے اُن سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ البتہ عزیزوں میں سے صرف دو آدمی صبح و شام اُن کے پاس آتے اور خیر خیریت معلوم کرتے۔ ایک مرتبہ اُن میں سے ایک نے دوسرے سے کہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایوبؑ نے کوئی بڑا گناہ کیا ہے جسکی پاداش میں ان کو ایسی سخت سزا دی گئی ہے۔

یہ بات دوسرے نے حضرت ایوب علیہ السلام سے کہدی۔ حضرت ایوب علیہ السلام یہ طعنہ سنکر بہت ہی بے قرار ہوگئے اور اللہ تعالیٰ کی جناب میں نہایت آہ و زاری سے اس طرح پکارا کہ (شاید کبھی کسی نے ایسا پکارا ہو)

اللہ نے وحی نازل کی اور انھیں یہ ہدایت کی کہ اپنا پیر زمین پر ماریں۔ جب انھوں نے ٹھوکر ماری تو معًا پانی کا ایک ٹھنڈا چشمہ اُبل پڑا۔ پھر ہدایت کی گئی کہ اسمیں غسل کریں۔ جب غسل کرکے باہر نکلے تو پہلے سے زیادہ صحیح و تندرست نظر آنے لگے۔

پھر جب بیوی نے دیکھا تو انھیں قطعاً پہچان نہ سکیں۔ خود حضرت

ایوب علیہ السلام سے دریافت کرنے لگیں کہ یہاں میرے بیمار شوہر رہا کرتے تھے آج کہاں چلے گئے ؟

حضرت ایوب علیہ السلام نے انھیں اطمینان دلایا کہ میں ہی ایوبؑ ہوں اور اللہ کے فضل و کرم کا واقعہ سنایا، روزمرہ کے کھانے کیلئے حضرت ایوب علیہ السلام کے ہاں جو گٹھری گیہوں اور جَو کی تھی اللہ تعالےٰ نے اُنکی دولت میں اضافہ کرنے کے لئے گیہوں کو سونے اور جَو کو چاندی میں بدل دیا۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۳۲۶)

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں ایک روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب حضرت ایوب علیہ السلام غسل فرما رہے تھے اللہ تعالیٰ نے سونے کی چند ٹڈیاں اُن پر برسائیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے جب یہ دیکھا تو اُنھیں پکڑ پکڑ کر کپڑے میں رکھنے لگے۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کی طرف وحی نازل کی اور پوچھا ایوب! کیا ہم نے تم کو سب کچھ دیکر غنی نہیں بنا دیا ؟

حضرت ایّوب علیہ السلام نے عرض کیا پروردگار یہ صحیح ہے لیکن آپ کی نعمتوں سے کون بے نیاز ہو سکتا ہے ؟"

وَلٰكِنْ لَا غِنىٰ عَنْ بَرَكَتِكَ. (بخاری کتاب الانبیاء)

اسی طرح کا واقعہ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے بھی نقل کیا ہے۔

"وہب بن منبہ نے اس بیماری کی مدّت تین۳ سال بیان کی ہے اور حسن بصریؒ سے سات۷ سال منقول ہیں۔"

(تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۱۸۸)

"توراۃ کے باب سفرِ ایوبؑ میں مذکور ہے کہ ابتلاء سے نجات پانے کے بعد حضرت ایوب علیہ السلام ایک سو چالیس۱۴۰ تک بقیدِ حیات رہے اور اپنی اولاد کے چار پشت دیکھے۔"

نتائج و عبر

اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاۤءً قدیم زمانے سے اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ جسکو اللہ تعالیٰ کے ساتھ جتنا قرب و منزلت حاصل ہے انھیں بلا اور آزمائش بھی سخت رہی ہے۔ اور جب اُس بلا کے پیش آنے پر ایسے لوگ صبر و استقامت سے کام لیتے ہیں تو وہی آلام و مصائب اُن کے دنیاوی و اخروی درجات کے بلندی کا ذریعہ بنا دیئے جاتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو اسطرح ظاہر فرمایا ہے:-

اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاۤءً اَلْاَنْبِیَاءُ ثُمَّ الصَّالِحُوْنَ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ۔ الحدیث (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۱۸۸)

مصائب میں سب سے زیادہ سخت امتحان انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے۔ اسکے بعد صلحاء کا نمبر ہے اور پھر حسب مراتب و درجات۔

یُبْتَلٰی الرَّجُلُ عَلٰی قَدْرِ دِیْنِہٖ فَاِنْ کَانَ فِیْ دِیْنِہٖ صَلَابَۃً زِیْدَ فِیْ بَلَاۤئِہٖ۔ الحدیث (ابن کثیر ج ص ۱۸۸)

انسان اپنے دین کے درجات کے مناسب آزمایا جاتا ہے، اگر اُس کے دین میں پختگی اور مضبوطی ہے تو وہ مصیبت کی آزمائش میں بھی دوسروں سے زیادہ ہوگا۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا یہ واقعہ اسکی بہترین مثال ہے۔

ضبط و استقلال دولت و ثروت، عزت و جاہت اور خوشحالی کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کا شکر اور احسان کچھ زیادہ مشکل نہیں آسان ہے لیکن بلا و مصیبت، عسرت و تنگدستی میں حرف شکایت تک زبان پر نہ لانا اور صبر و استقل

کا ثبوت دینا بہت مشکل اور بڑا کٹھن کام ہے اور اسی منزل پر انسان کے ایمان باللہ کا وزن معلوم ہوجاتا ہے۔ لیکن جب کوئی بندہ اس زبون حالت میں بھی ضبط و استقلال کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور صبر و شکر کی زندگی اختیار کرلیتا ہے تو بہت جلد اللہ کی دستگیری شامل حال ہوجاتی ہے اور اُس پر فضل و کرم کی بارش ہونے لگتی ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی زندگی اس کی روشن مثال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی صبر و استقلال کی وجہ سے اُنھیں دوچند عطا کیا۔

وفا کی قدر و قیمت

ازدواجی زندگی میں بیوی کی وفاداری اور استقامت سب سے زیادہ محبوب شئے ہے۔ احادیث میں اُس عورت کو جنت کی بشارت دی گئی جو اپنے شوہر کے حق میں وفادار ثابت ہو۔ اور اس وفا و محبت کی قدر و قیمت اُس وقت قیاس و اندازے سے کہیں زیادہ قیمتی ہوجاتی ہے جب اس کا شوہر مصائب و آلام میں گرفتار ہو اور اس کے عزیز و اقربا تک اُس سے کنارہ کش ہو چکے ہوں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی زوجہ مطہرہ نے آپ کے زمانۂ مصیبت میں جس حُسن وفا، اطاعت و غمخواری کا ثبوت دیا اللہ نے اُس احترام میں حضرت ایوب علیہ السلام کی قسم کو پورا کرنے کے لئے عام احکام سے بالکل مختلف ایک ایسا حکم دیا جس سے اُس نیک بی بی کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔

حیلۂ شرعی

حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنی بیماری کی حالت میں ناراض ہوکر اپنی بیوی کو سَو کوڑے مارنے کی قسم کھائی تھی اور جب صحت ہوگئی تو یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ اگر قسم کو پورا کیا جائے تو خواہ مخواہ ایک وفادار بیوی کو مارنا پڑے گا۔ اور اگر قسم توڑ دی جائے تو یہ بھی ایک گناہ کا ارتکاب ہوگا۔ اس مشکل سے اللہ تعالےٰ نے انھیں اس طرح نکالا کہ انھیں حکم دیا ایک گٹھا لو جس میں اتنے ہی تنکے ہوں جتنے کوڑے مارنے کی قسم کھائی تھی۔ پھر اس گٹھے سے بیوی کو بس ایک ضرب لگادیں تاکہ قسم بھی پوری ہوجائے اور بے گناہ بیوی کو تکلیف بھی نہ پہنچے۔ یقیناً یہ ایک حیلہ (تدبیر) ہی تھا جو حضرت ایوب علیہ السلام کو بتایا گیا لیکن اس قسم کے شرعی حیلہ

کی پہلے حقیقت سمجھ لینی چاہیئے ورنہ حیلہ سازی کے حدود کفر سے جا ملتے ہیں. کیونکہ جو شخص ناپاک اغراض کے لئے حیلہ کرتا ہے وہ گویا اللہ کو اپنے زعم میں دھوکہ دینا چاہتا ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کو جو حیلہ بتایا گیا تھا وہ کسی فرض سے بچنے کے لئے نہیں بلکہ ایک بُرائی سے بچنے کے لئے بتایا گیا تھا۔ لہذا شریعت اسلامی میں صرف وہی حیلے جائز ہوں گے جو آدمی کو اپنی ذات سے یا کسی دوسرے شخص سے ظلم و گناہ اور بُرائی کو دفع کرنے کے لئے اختیار کئے جائیں، ورنہ حرام کو حلال کرنے یا فرائض کو ساقط کرنے یا نیکی سے بچنے کے لئے حیلہ سازی گناہ ہی نہیں گناہ در گناہ ہوگا۔

مثلاً ایک شخص زکوٰۃ سے بچنے کے لئے سال ختم ہونے سے پہلے اپنا مال اپنی بیوی کی ملکیت میں منتقل کر دیا اور جب اگلا سال ختم ہونے کو قریب ہوا بیوی نے شوہر کو ہبہ کر دیا۔ اس طرح دونوں پر زکوٰۃ واجب نہ ٹھیری، کیونکہ ہر ایک کی ملکیت میں سال بھر تک مال قائم نہ رہا اور ادائی زکوٰۃ سے معاف سمجھ بیٹھا۔ ایسا شخص نہ صرف ایک فرض سے فرار اختیار کرتا ہے بلکہ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ اللہ تعالےٰ اس کے اس ظاہری فعل سے دھوکہ کھا جائے گا اور اُسکو فرض سے سبکدوش سمجھ لے گا۔ (استغفر اللہ ربی)

فقہاء کرام نے اپنی کتابوں میں "کتاب الحیل" کے عنوان سے جو بھی مثالیں دی ہیں اُن کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کسی حیلہ کے ذریعہ سے فرض سے سبکدوشی یا نیکی سے فرار اختیار کیا جا سکتا ہے بلکہ اِس کا وہی مطلب ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے کہ کسی نامناسب یا مکروہ بات سے بچنے کے لئے کوئی شرعی حیلہ اختیار کیا جائے تو وہ جائز ہے جیسا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو تلقین کیا گیا تھا۔ واللہ اعلم۔

تنگ دلی یا صبر مندی

قرآن حکیم نے حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ نقل کرکے یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے نیک بندے جب مصائب اور شدائد میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے رب سے بدگمان نہیں ہوتے

اور نہ تنگ دل ہوتے ہیں بلکہ صبر و استقامت کے ساتھ اُس کی نازل کی ہوئی آزمائشوں کو برداشت کرتے ہیں اور اُسی سے مدد مانگتے ہیں، اُسی پر بھروسہ کرتے ہیں، اور اُسی سے آس لگائے رہتے ہیں۔ اُن کا یہ طریقہ نہیں ہوتا کہ اگر کچھ مُدت تک اللہ تعالےٰ سے دُعا مانگتے رہنے پر بَلا نہ ٹلے تو پھر اُس سے مایوس ہوکر دوسروں کے آستانوں پر ہاتھ پھیلانا شروع کر دیں۔ اِن کے قلوب پر اس بات کا پورا اطمینان رہتا ہے کہ جو کچھ بھی ملنا ہے اللہ ہی کے ہاں سے ملنا ہے اس لئے مصیبتوں کا سلسلہ چاہے کتنا ہی دراز ہو وہ اللہ تعالیٰ کے پرستار اور اُسی کے آستانے پر ہاتھ پھیلانے والے ہیں۔

مصائب و شدائد میں حضرت ایوب علیہ السلام کی یہ سیرت قرآن حکیم اس طرح بیان کرتا ہے :-

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ۔

(ص آیت ۴۴)

بلاشُبہ ہم نے ایوب کو صابر پایا، بہترین بندہ، اپنے رب کی طرف رجوع کرنے والا"

ذکرای انسان کو نہ اچھے حالات میں اللہ تعالیٰ کو بھولنا چاہیئے نہ بُرے حالات میں اُس سے مایوس ہونا چاہیئے ! اچھا اور بُرا سب اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کے قبضہ و اختیار میں ہے۔

انسان تقدیر کی گرفت میں ہے اور اُس کا پابند، لیکن اللہ تعالیٰ تقدیر کا نہ پابند ہے اور نہ مجبور، وہ چاہے تو انسان کے بُرے حالات کو بہترین حالات میں بدل دے اور چاہے تو بہترین حالات کو بُرے حالات میں بدل دے۔

اس لئے مسلمان کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور توکّل کرنا چاہیئے۔

سیدنا ایوب علیہ السلام نے اپنے ناموافق حالات میں نہ صرف اپنا تعلق برقرار رکھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف بار بار کثرت سے رجوع ہوتے

رہے اُسکے صلہ میں اُن کے اہل وعیال کو نہ صرف واپس دیا گیا بلکہ دُوچند اور دیا گیا۔ اور اس عطا کے بعد قرآن حکیم نے یہ درس دیا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ دوچند فضل وکرم ہر عقل والے کے لئے نصیحت ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ۔ (صٓ آیت ۴۳)

"ہم نے ایوب کو ان کے اہل وعیال عطا کئے اور اُن کے ساتھ اُتنے ہی اور دیئے اپنی طرف سے رحمت کے طور پر اور نصیحت (یادگار) کے طور پر عقل والوں کے لئے۔"

تذکرہ
سیدنا یونس علیہ السلام
(صاحب الحوت)

سیدنا یونس علیہ السلام اور قرآن حکیم

قرآن حکیم کی چھ سورتوں میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔ چار سورتوں میں نام مذکور ہے اور دو سورتوں میں لقب ذَالنّون اور صاحبُ الحوت، کہکر صفت کا اظہار کیا گیا ہے:-

سورہ نساء	آیت	١٦٣
" انعام	"	٨٦
" یونس	"	٩٨
" انبیاء	"	٨٧، ٨٨
" الصافات	"	١٣٩ تا ١٤٨
" القلم	"	٤٨ تا ٥٠

سورۂ نساء اور سورۂ انعام میں انبیاء کرام کی فہرست میں صرف نام مذکور ہے۔ بقیہ چار سورتوں میں واقعات پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے اور حضرت یونس علیہ السلام کی حیات طیبہ کے صرف اُسی پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے جو اُن کی پیغمبرانہ زندگی سے وابستہ ہے اور جس میں اُن کے رُشد و ہدایت کے مختلف گوشے دعوتِ بصیرت ہیں۔

تعارُف

مورخینِ اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام کے والد کا نام متّیٰ ہے۔ بخاری کی ایک روایت میں بھی یہی نام آیا ہے۔

٢١ کتاب مؤرخین ان کے والد کا نام ٹوناہ لکھتے ہیں اور زمانہ بعثت ۸۶۰ء تا ۸۰۴ء قبل

مسیح کے درمیان بتاتے ہیں۔
حضرت یونس علیہ السلام اسرائیلی نبی تھے مگر انھیں آشور (اسیریا) والوں کی ہدایت کے لئے عراق بھیجا گیا تھا اسی بنا پر آشوریوں کو قوم یونس کہا جاتا ہے۔ اس قوم کا مرکز اُس زمانے میں نینویٰ کا مشہور شہر تھا جس کے وسیع کھنڈرات آج بھی دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے موجودہ شہر موصل کے عین مقابل پائے جاتے ہیں اور اسی علاقے میں "یونس نبی" کے نام سے آج بھی ایک مقام موجود ہے۔
حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ یونس علیہ السلام کے زمانے کا تعین تاریخی روشنی میں مشکل ہے البتہ بعض مؤرخین نے کہا ہے کہ جب ایران (فارس) میں طوائف الملوکی کا دور تھا اُس وقت نینویٰ میں حضرت یونس علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا۔ قرآن حکیم نے اس شہر کی مردم شماری ایک لاکھ سے زائد بتائی ہے۔ ترمذی کی ایک روایت میں یہ تعداد ایک لاکھ بیس ہزار بیان کی گئی ہے۔

سیدنا یونس علیہ السلام قرآن وحدیث وتاریخ کی روشنی میں

حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ جس کا کچھ حصہ تو قرآن حکیم میں موجود ہے اور بقیہ روایات حدیث اور تاریخ سے ثابت ہے۔
جیسا کہ بیان کیا گیا حضرت یونس علیہ السلام عراق میں شہر موصل کے مشہور مقام نینویٰ کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ اس قوم میں شرک و کفر کی کثرت تھی حضرت یونس علیہ السلام کو ان کی ہدایت کے لئے مامور کیا گیا۔ وہ ایک طویل عرصہ تک قوم کو توحید کی دعوت دیتے رہے لیکن قوم نے ان کی دعوت پر کوئی توجہ نہ دی بلکہ اپنے کفر و شرک پر اصرار کرتے رہے اور گزشتہ قوموں کی طرح اِن کا بھی مذاق اُڑانے لگے، اور ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ جب اجتماعی طور پر قوم نے ایسا فیصلہ کر لیا تو اللہ تعالےٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کو حکم دیا کہ اِن لوگوں کو آگاہ کر دو کہ تین دن کے اندر اندر تم پر سخت عذاب آنے والا ہے۔
حضرت یونس علیہ السلام نے قوم میں یہ اعلان کر دیا، عذاب کے اس اعلان پر

قوم کے بعض سرداروں کو احساس ہوا کہ یونس علیہ السلام نے کبھی جھوٹ نہیں کہا اور نہ یہ بات اُن سے سُنی گئی لہذا اُن کا یہ اعلان نظرانداز کردینے کے قابل نہیں اسپر غور کرنا چاہیئے چنانچہ آپس میں مشورہ کیا گیا اور یہ طے پایا کہ یہ دیکھا جائے کہ یونس علیہ السلام رات کو ہمارے شہر میں اپنی جگہ مقیم رہتے ہیں یا نہیں

اگر وہ اپنی جگہ مقیم ہیں تو سمجھ لو کہ کچھ نہیں ہوگا اور اگر وہ یہاں سے چلے گئے تو یقین کرلیا جائے کہ صبح کو ہم پر عذاب آئے گا تیسرا دن آنے سے پہلے آدھی رات کو۔

حضرت یونس علیہ السلام وحی الٰہی کے اُس اشارہ پر شہر سے نکل گئے اور بہت دور چلے گئے صبح ہوئی تو عذاب الٰہی ایک سیاہ بادل کی شکل میں ان کے شہر پر منڈلانے لگا اور فضاء آسمانی سے نیچے ان کے قریب ہونے لگا۔ یہ اچانک اور وحشت ناک صورت دیکھ کر قوم کو یقین ہوگیا کہ اب ہم سب ہلاک ہونے والے ہیں۔ پھر حضرت یونس علیہ السلام کی تلاش میں نکل گئے اور یہ طے کرلیا کہ اُن پر ایمان لے آئیں گے اور پچھلے انکار سے توبہ کرلینگے۔ لیکن حضرت یونس علیہ السلام کو نہ پایا تو خود ہی پورے اخلاص کے ساتھ توبہ و استغفار کرتے ہوئے بستی سے ایک میدان میں نکل آئے۔ عورتیں بچے، مرد بوڑھے سب اس میدان میں جمع ہوگئے اور نہایت آہ وزاری سے توبہ اور عذاب سے پناہ مانگنے میں اسطرح مشغول ہوئے کہ پورا میدان آہ و بکا سے گونجنے لگا۔ اِن کی اس سچی حالت پر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور اُترنے والا عذاب اُن سے دور کردیا جیسا کہ قرآن حکیم نے بیان کیا ہے۔ روایات میں یہ وضاحت بھی ہے کہ یہ عاشورا یعنی دسویں محرم کا دن تھا۔

اِدھر حضرت یونس علیہ السلام بستی سے باہر اس انتظار میں تھے کہ اب اس قوم پر عذاب نازل ہوگا اور اِنھیں قوم کی توبہ و استغفار کا حال معلوم نہ تھا۔ جب عذاب ٹل گیا تو فکر ہوئی کہ قوم میں مجھے جھوٹا قرار دیا جائے گا اور اس قوم کا یہ قانون تھا کہ جس شخص کا جھوٹ واضح ہوجائے اسکو قتل کردیا جائے۔ حضرت یونس علیہ السلام کو یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ میں اب اپنی صفائی بھی پیش نہ کرسکوں گا اور قانون کی رو سے قتل کردیا جاؤں گا۔ انبیاء کرام اگرچہ ہر گناہ و معصیت سے پاک ہوتے ہیں مگر انسانی فطرت اور طبیعت سے جدا نہیں ہوتے۔ اس وقت طبعی طور پر یہ پریشانی اور خوف لاحق ہوا کہ اگر میں قوم میں واپس جاؤں تو قانون کی رُو سے قتل کردیا جاؤں گا۔ اس غم و پریشانی میں شہر چھوڑ ہجرت کے ارادے سے نکل پڑے

یہاں تک کہ بحر فرات کے کنارے پہنچ گئے وہاں ایک کشتی دیکھی جو لوگوں سے بھری ہوئی تیار کھڑی تھی لوگوں نے حضرت یونس علیہ السلام کو دیکھا تو سوار کر لیا کشتی روانہ ہوئی جب وسط دریا میں پہنچی اچانک ٹھیر گئی نہ آگے بڑھتی نہ پیچھے چلتی کشتی والوں نے اپنی کوشش پوری کرنے کے بعد اعلان کیا کہ ہماری کشتی میں کوئی بھاگا ہوا غلام ہے ایسے آدمی کو ظاہر ہو جانا چاہیئے تاکہ ایک آدمی کی وجہ سے سب پر مصیبت نہ آجائے۔ ہماری یہ کشتی منجانب اللہ چلتی بھی ہے اور رکتی بھی ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کہنے لگے اگر ایسا ہی اس کا دستور ہے تو وہ بھاگا ہوا غلام میں ہوں۔ کیونکہ میں نے اپنے شہر کو بغیر اذنِ الٰہی چھوڑا ہے مجھے اپنے رب کی اجازت کا انتظار کرنا چاہیئے تھا۔ لہٰذا مجھے دریا میں ڈال دو تاکہ اہلِ کشتی نجات پا جائیں۔ کشتی والے حضرت یونس علیہ السلام کی راست بازی اور نیک صورت دیکھ کر اس پر تیار نہ ہوئے انھیں یقین نہیں آتا تھا کہ ایسا شخص مجرم بھی ہو سکتا ہے؟

آخر بعد مشورہ طے پایا کہ قرعہ اندازی کر لی جائے جس کا نام نکل آئے اُس کو دریا میں پھینک دیا جائے۔

اتفاقاً قرعہ میں حضرت یونس علیہ السلام ہی کا نام نکل آیا لوگوں کو اس پر تعجب ہوا دو بار سہ بار قرعہ اندازی کی ہر بار انہی کا نام نکلا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ حضرت یونس علیہ السلام کے خصوصی مقام کی وجہ سے تھا اگرچہ انھوں نے کوئی ایسی خلاف ورزی نہیں کی تھی جسکو گناہ یا معصیت کہا جاتا لیکن پیغمبر کے بلند مقام کے یہ مناسب نہ تھا کہ وہ محض طبعی خوف کی وجہ سے بغیر اذن خداوندی ہجرت کر جائیں شاید اسی قصور کی وجہ سے ان کے ساتھ یہ معاملہ کیا گیا۔

الغرض جب بار بار حضرت یونس علیہ السلام ہی کا نام آتا رہا تو سب نے انھیں دریا میں ڈال دیا شاید کنارہ قریب تھا تیر کر کنارے تک پہنچ جانے کا ارادہ کیا لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ کچھ اور تھا رکی ہوئی کشتی چلنے لگی۔ ادھر اللہ تعالےٰ کے حکم سے ایک بہت بڑی مچھلی نے حضرت یونس علیہ السلام کو اپنا لقمہ بنا لیا اور حضرت یونس علیہ السلام سیدھے اس کے پیٹ میں چلے گئے۔

حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت یونس علیہ السلام

اس مچھلی کے پیٹ میں چالیس یوم تک رہے۔ یہ اِن کو پانی کی تہ تک لی جاتی اور دور دراز مسافتوں میں پھیراتی رہی۔ بعض مفسرین نے سات اور بعض نے تین دن اور بعض نے چند ساعات مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی مدت لکھی ہے۔ حقیقت حال اللہ ہی کو معلوم۔ (مظہری)

حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں اپنے آپ کو زندہ محسوس کیا، سجدہ میں جاکر اپنی اس ندامت کا اظہار کیا اور عفو و درگزر کی اس طرح مناجات کی :۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔

"الٰہی تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو ہی یکتا ہے میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں بلاشبہ میں اپنے نفس پر خود ہی ظلم کرنے والا ہوں"

اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کی درد بھری پکار کو سُنا اور قبول فرمایا، مچھلی کو حکم ہوا کہ یونس کو جو تیرے پاس ہماری امانت ہے اُگل دے۔ مچھلی نے ساحل پر حضرت یونس علیہ السلام کو اُگل دیا۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے اُن کا جسم ایسا ہوگیا تھا جیسا کہ کسی پرندے کا پیدا شدہ بچہ (جس کا جسم بیحد نرم ہوتا ہے) الغرض حضرت یونس علیہ السلام نہایت نحیف و ناتوان حالت میں خشکی پر ڈال دیئے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اُن پر ایک بیلدار درخت اُگا دیا جس کے پتوں کا سایہ حضرت یونس علیہ السلام پر سائبان کا کام دینے لگا اور ایک جنگلی بکری کو اللہ تعالیٰ نے مامور کردیا وہ صبح وشام ان کے پاس آ کھڑی ہوتی اور حضرت یونس علیہ السلام اس کا دودھ پی لیتے۔

چند دن بعد جب قوت وطاقت لوٹ آئی تو حکم دیا گیا کہ دوبارہ اپنے شہر نینوٰی جائیں اور قوم میں رہ کر اُنکی رہنمائی کریں۔ چنانچہ شہر واپس آئے قوم نے جب اُن کو دیکھا تو بے حد مسرت وخوشی کا اظہار کیا اور اُن کی رہنمائی میں دنیا و آخرت کی کامرانی حاصل کی۔ آخر کار پوری قوم حضرت

یونس علیہ السلام کے ہاتھ پر ایمان لے آئی۔

ابن کثیرؒ نے واقعہ کی جو ترتیب قائم کی ہے وہ کچھ اسی طرح ہے جو درج کر دی گئی۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر ابن کثیر سورہ الصافات)

اس واقعہ کے مختلف اجزاء جن جن سورتوں میں موجود ہیں وہ یہ ہیں :-

قرآنی مضمون فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ الخ (یونس آیت ۹۸)

"پھر کیوں ایسا ہوا کہ قوم یونسؑ کی بستی کے سوا اور کوئی بستی نہ نکلی کہ نزول عذاب سے پہلے یقین کر لیتی اور ایمان کی برکتوں سے فائدہ اُٹھاتی؟ یونس کی قوم جب ایمان لے آئی تو ہم نے رسوائی کا وہ عذاب اُن پر سے ٹال دیا جو دنیا کی زندگی میں پیش آنے والا تھا اور انھیں ایک خاص مدت تک زندگی سے بہرہ مند ہونیکی مہلت دی۔"

وَذَا النُّونِ إِذْ ذَهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادَىٰ فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ۔ (الانبیاء آیت ۸۷، ۸۸)

"اور ذوالنون (مچھلی والے کا واقعہ یاد کرو) جب ایسا ہوا تھا کہ وہ (راہِ حق میں) غضبناک ہو کر چلا گیا۔ پھر اُس نے خیال کیا کہ ہم اس کو تنگی (آزمائش) میں نہیں ڈالیں گے پھر (جب اُسکو آزمائش کی تنگی نے آگھیرا تو) اُس نے (مچھلی کے پیٹ میں اور دریا کی گہرائی کی) تاریکیوں میں پکارا، الٰہی! تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو ہر عیب سے پاک ہے حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنے اوپر بڑا ظلم کیا ہے۔ تب ہم نے اُسکی دُعا قبول کی اور اُسکو غم سے نجات دیدی۔ اور اسی طرح ہم ایمان والوں کو نجات دیا کرتے ہیں۔"

وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ۔ إِذْ أَبَقَ إِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ۔ الخ (الصافات آیات ۱۳۹ تا ۱۴۸)

"اور بیشک یونس پیغمبروں میں سے تھے۔
(اور وہ واقعہ یاد کرو) جبکہ وہ بھری ہوئی کشتی کی جانب بھاگے۔
(اور جب کشتی والوں نے غرق ہونے کے خوف سے قرعہ ڈالا) سو یونسؑ بھی شریک قرعہ ہوئے تو قرعہ میں ملزم ٹھیرے۔
پھر نگل گئی اُن کو ایک مچھلی اور وہ (قوم کے پاس سے بھاگ آنے پر) اپنے آپ پر ملامت کر رہے تھے۔ پس اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوئے ہوتے تو روزِ قیامت تک مچھلی کے پیٹ ہی میں رہتے۔
آخر کار ہم نے اُن کو (مچھلی کے پیٹ سے نکال کر) چٹیل میدان میں ڈال دیا اور وہ ناتواں اور بے حال تھے۔
اور ہم نے اُن پر (سایہ کے لئے) ایک بیلدار درخت اُگا دیا۔
اور ہم نے انھیں ایک لاکھ سے زائد انسانوں کی جانب پیغمبر بنا کر بھیجا۔ پس وہ ایمان لے آئے پھر ہم نے اُن کو ایک مدت (موت) تک سامان زندگی سے نفع اُٹھانے کا موقعہ دیا۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُومٌ الخ (القلم آیت ۴۸ تا ۵۰)

پس (اے نبی) اپنے پروردگار کے حکم کی وجہ سے صبر کو کام میں لاؤ اور مچھلی والے (یونسؑ) کی طرح (بے سکون) نہ ہو جاؤ جبکہ اُنھوں نے اللہ کو پکارا اور وہ غم سے گھُٹ رہے تھے۔ اگر خداوندی احسان اُن کی دستگیری نہ کرتا تو وہ اُس میدان میں بدحالی کے ساتھ ڈالے جاتے۔
پھر اُن کے رب نے اُن کو (اور زیادہ رتبہ کے) صالحین میں شمار کر دیا۔"

وفات

حضرت یونس علیہ السلام کے مقام وفات کے بارے میں مفسرین کے دو قول مشہور ہیں:-
اوّل شہر نینویٰ جسمیں وہ مبعوث کئے گئے تھے۔

دوم علاقہ فلسطین کے شہر الخلیل میں وفات پائی جو اکثر انبیاء کرام کا مدفن رہا ہے۔

اہل تحقیق نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ سے نجات پاکر نینوی واپس تشریف لے گئے اور انھوں نے اپنی بقیہ زندگی قوم کی ہدایت و رشد کے لئے وقف کر دی تھی۔ لہذا قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی وفات بھی شہر نینوی میں ہوئی ہو۔ واللہ اعلم۔

نتائج و عبر

تذکیر بایام اللہ تذکرہ سیدنا یونس علیہ السلام میں یہ بات خصوصیت کیساتھ ذکر کی گئی ہے کہ زندگی کی فرصت ایک قیمتی شئی ہے اسکی قدر نہ کرنا یا اس سے غفلت برتنا ایک ایسا نقصان ہے جسکی تلافی ممکن نہیں۔ اس تذکرہ میں غفلت شعار انسانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ زندگی کی فرصت کو غنیمت جانو انکار و سرکشی سے باز آجاؤ، ورنہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب توبہ کرو گے تو توبہ قبول نہ ہوگی ایمان لاؤگے تو ایمان مقبول نہ ہوگا اور وہ دو وقت ہیں:۔

آخرت کا عذاب آنکھوں سے نظر آجائے یا موت آجائے۔

قوم یونسؑ نے اپنی زندگی کی فرصت کو غنیمت جانا آخر لمحہ میں جب عذاب کے آثار شروع ہو رہے تھے توبہ و استغفار کرکے ایمان قبول کر لیا تو اللہ تعالے نے انکو رسواکن عذاب سے بچالیا۔ نازل ہونے والا عذاب روک لیا، اس طرح وہ ایک ہولناک عذاب سے بچ گئے

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ الخ (یونس آیت ۹۸)

اس آیت میں ارشاد ہے کہ منکر قومیں ایسے وقت ایمان لے آئیں جب اُن کا

ایمان ان کو نفع دے سکتا تھا لیکن یہ معذب قومیں عذاب نازل ہونے کے بعد ایمان لائیں جیسا کہ فرعون نے عذاب دیکھنے کے بعد ایمان کا اقرار کیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا کہ عذاب سے قبل ایمان لے آتے تو انھیں عذاب سے بچا لیا جاتا جیسا کہ قوم یونس نے ایمان قبول کر کے اپنے آپ کو عذاب سے محفوظ کر لیا۔

اے کاش کہ معذب قومیں قوم یونس کی تقلید کرتیں ؟ قرآن حکیم کی خیر خواہی نصیحت کے عنوان میں تذکیر بایام اللہ (حوادث و واقعات سے عبرت لینا) ایک مستقل عنوان ہے جو اقوام و ملل کے واقعات میں پایا جاتا ہے۔

ازالۂ غلط فہمی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر خیر کر کے یہ تنبیہ فرمائی :-

"تم میں سے کوئی شخص ہرگز یہ نہ کہے کہ میں (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) یونس بن متّیٰ (علیہ السلام) سے افضل ہوں" (بخاری کتاب الانبیاء)

آپ کا منشا یہ تھا کہ جو شخص حضرت یونس علیہ السلام کے واقعات کا مطالعہ کرے اُس کے دل میں آپ کی ذاتِ اقدس کے تعلق سے کوئی تنقیص کا پہلو ہرگز پیدا نہ ہونے پائے۔ اسی اندیشہ کے پیشِ نظر آپ نے اُن کی عظمتِ شان کو اس طرح نمایاں کرنا ضروری سمجھا۔ مقصود تنقیص و تحقیر کی نفی کرنی تھی۔ رہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا افضل الانبیاء ہونا وہ ایک علیحدہ حقیقتِ مسلّمہ ہے جس کا اس تنبیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

قوموں کی قسمت انبیاء کرام کی موجودگی میں

جن جن قوموں میں انبیاءؑ بقیدِ حیات رہے ہیں

قوموں کی قسمت نبی کی دعوت و تبلیغ سے وابستہ رہی ہے۔ جب وہ نبی کی دعوت سے منہ موڑ کر انکار و بغاوت پر اصرار کرنے لگیں اور نبی آخر لمحہ مایوس ہو کر اُن کو عذاب کی اطلاع دے دیتا ہے تو پھر اُس قوم کے لئے صرف دو راہیں باقی رہ جاتی ہیں :-

۱۔ یا عذاب آنے سے قبل ایمان لے آئے اور عذاب سے محفوظ ہو جائے۔

۲۔ یا انکار پر اصرار کر کے عذاب الٰہی کا شکار ہو جائے۔

تیسری کوئی صورت نہیں کہ انھیں معاف کر دیا جائے۔ قوم نوحؑ، قوم صالحؑ، قوم لوطؑ، قوم عادؑ و ثمود وغیرہ کا عذاب الٰہی سے بے نام و نشان ہو جانا سنت اللہ کی اس حقیقت کو آشکارا کرتی ہے۔

گزشتہ اقوام میں قوم یونسؑ کی ایک مثال ایسی ہے جس نے نزولِ عذاب سے کچھ قبل ایمان قبول کر لیا تھا اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہو کر عذابِ الٰہی سے محفوظ ہو گئی۔

کاش کہ بعد میں آنے والی نسلیں اور قومیں قوم یونس کے نقش قدم پر چل کر اسی طرح عذاب الٰہی سے محفوظ ہو سکتیں تھیں مگر افسوس ایسا نہ ہوا۔

ایک نازک ترین عنوان

انبیاء کرام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ عام انسانوں سے کچھ مختلف رہا ہے اور یہ اس لئے کہ یہ حضرات براہِ راست اللہ تعالیٰ سے شرفِ تخاطب و تکلم رکھتے ہیں۔ اِن پر اللہ کی مرضی اور نامرضی براہِ راست نازل ہوتی ہے۔ لہٰذا اِن کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ جو کام بھی انجام دیں وحی الٰہی کی روشنی و ہدایت میں ہو۔ خصوصاً تبلیغ دین اور پیغامِ حق میں وہ وحی الٰہی کے مطابق کام انجام دیتے ہیں۔

لیکن اگر وہ کسی کام یا فیصلہ میں عجلت کر جاتے ہیں خواہ وہ بات کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ اُن سے مواخذہ فرماتا ہے اور اس صورتِ حال کے لئے ایسی سخت تعبیر روا رکھتا ہے کہ سننے والا یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ انھوں نے کوئی بڑا قصور کر دیا ہے اور اس سخت تعبیر کے ساتھ ہی یہ حضرات فوراً متنبہ ہو کر اعترافِ ندامت کے ساتھ معافی اور درگزر کے لئے دست بدعا بھی ہو جاتے ہیں جو بہت جلد اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہو جاتی ہے اور ان کی مزید عزت و احترام کا باعث بن جاتی ہے۔

قرآن حکیم کا یہ اسلوبِ بیان بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے

اور جو لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں ایسے مواقع پر سخت خلجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ انبیاء و رسل سے بھی بڑے بڑے قصور ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

"حضرت یونس علیہ السلام نے آثارِ عذاب دیکھ کر ہجرت کا ارادہ کیا اور وحیٔ الٰہی کا انتظار نہ فرمایا تو ایک بڑے حادثے سے دوچار ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے اس حادثے کے لئے ایسا عتاب آمیز عنوان اختیار فرمایا جو کسی بڑے قصور یا غفلت پر استعمال کیا جاتا ہے۔"

(القلم آیت ۴۸ تا ۵۰)

تذکرہ
سیّدنا ذُو الکِفل علیہ السّلام

ذکرِ مبارک قرآن حکیم میں حضرت ذو الکفل علیہ السلام کا ذکر دو سورتوں میں آیا ہے اور دونوں میں صرف نام مذکور ہے۔ یعنی انبیاء کرام کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے۔ کوئی تفصیل یا واقعہ موجود نہیں۔ البتہ تفسیری روایات میں مختصر تفصیل ملتی ہے جو اُن کے تعارف اور شخصیت کے لئے کافی ہے۔

سورۂ انبیاء میں اس طرح مذکور ہے :-

وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِدْرِیْسَ وَذَا الْکِفْلِ کُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیْنَ ۔
وَاَدْخَلْنٰھُمْ فِیْ رَحْمَتِنَا اِنَّھُمْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۔

(انبیاء آیت ۸۵، ۸۶)

"اور اسمٰعیل وادریس اور ذو الکفل سب (راہِ حق میں) صبر کرنے والے تھے۔ ہم نے اُنھیں اپنی رحمت کے سایہ میں لے لیا۔ یقیناً وہ نیک بندوں میں سے تھے۔"

سورہ صٓ میں اس طرح مذکور ہے :-

وَاذْکُرْ اِسْمٰعِیْلَ وَالْیَسَعَ وَذَا الْکِفْلِ وَکُلٌّ مِّنَ الْاَخْیَارِ ۔ (صٓ آیت ۴۸)

اور یاد کرو اسمٰعیل اور الیسع اور ذو الکِفل (کے واقعات) اور یہ سب نیکو کاروں میں سے تھے۔

ایک تفصیلی روایت چونکہ قرآن حکیم نے حضرت ذو الکفل علیہ السلام کے

بارے میں سوائے اسم گرامی اور کوئی واقعہ بیان نہیں کیا ہے۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی روایات صحیحہ میں کچھ منقول نہیں ہے۔ لہذا قرآن اور احادیث کی روشنی میں اس سے زیادہ نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت ذوالکفل علیہ السلام اللہ واحد کے برگزیدہ نبی اور پیغمبر تھے اور کسی قوم کی طرف مبعوث کئے گئے اور دیگر انبیاء کی طرح انھوں نے بھی راہ حق میں مشقت ومصائب برداشت کئے اور کارِ نبوت کو کامل طور پر ادا کیا۔ اسکے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی خاص رحمت میں داخل کر لیا جیسا کہ دیگر انبیاء کرام کے ساتھ معاملہ فرمایا ہے۔

البتہ ابن جریر نے مشہور مفسر تابعی امام مجاہدؒ سے ایک تفصیلی روایت نقل کی ہے جس سے اُن کی شخصیت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ اسی طرح ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے بعض آثار نقل کئے ہیں اگرچہ ان کی سند میں انقطاع ہے تاہم نفس واقعہ میں دونوں مشترک ہیں۔

ذُوالکفل کا لفظی ترجمہ "صاحب نصیب" ہے۔ یعنی عادات واخلاق و بزرگی میں بہت بڑا حصہ پانے والا۔ قرآن حکیم نے اُن کو اسی لقب سے یاد کیا ہے اور یہ لقب انکے نام کی طرح استعمال کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ حضرت ایوّب علیہ السلام کے بیٹے ہیں جو انکے بعد نبوت سے سرفراز ہوئے اور ان کا اصل نام بِشر تھا۔

علامہ آلوسیؒ نے تفسیر روح المعانی میں لکھا ہے کہ اہلِ کتاب انکا نام "حزقی ایل" بتاتے ہیں جو بنی اسرائیل کی اسیری (۵۹۷ء قبل مسیح) کے زمانے میں نبوت سے سرفراز ہوئے۔ بُخت نصر بادشاہ نے عراق میں اسرائیلی قیدیوں کی ایک نوآبادی دریائے خابُور کے کنارے قائم کر دی تھی جس کا نام تل اَبیب تھا۔ اسی مقام پر ہدایت پر مامور رہے اور طرح طرح کی تکالیف اُٹھاتے رہے اور دوسری طرف یروشلم کے حکمرانوں کو بھی توحید کی دعوت دیتے رہے جسکی وجہ سے ان کے مصائب میں دو چند اضافہ ہوتا رہا۔ ممکن ہے ان کے اسی صبر وضبط کی وجہ سے انھیں ذُوالکفل کا لقب دیا گیا ہو۔ (ضبط وتحمل کا حصہ پانے والا۔) امام مجاہدؒ کی روایت حسب ذیل ہے:۔

جُب اسرئیلی نبی حضرت الیسع علیہ السلام بہت بوڑھے ہو گئے تو اُنھیں یہ بار بار خیال آیا کہ کاش میری زندگی ہی میں کوئی شخص ایسا

قابل ہو جاتا جو میرے بعد میری دعوت و تبلیغ کو صحیح طریقہ سے انجام دے سکے اور دین کا کام جاری رہ سکے۔

ایک دن اُنھوں نے بنی اسرائیل کا ایک بڑا اجتماع کیا اور اُن کے سامنے یہ بات رکھی اور اس کے بعد اعلان کیا کہ میں تم میں سے ایک شخص کو اپنا خلیفہ نامزد کرنا چاہتا ہوں بشرطیکہ وہ مجھ سے تین باتوں کا عہد کرے۔

(۱) دن بھر روزہ رکھے (۲) شب کو یادِ الٰہی میں مشغول رہے۔

(۳) کبھی غصّے میں نہ آئے۔

یہ سنکر ایک شخص کھڑا ہوا جو عام نگاہوں میں گمنام قسم کا تھا کہنے لگا میں اس خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ حضرت الیسع علیہ السّلام نے اپنی تینوں شرطیں دوبارہ بیان کیں اور دریافت کیا کہ کیا ان کی پابندی کروگے؟ اُس شخص نے جواب دیا ہاں! لیکن حضرت الیسع علیہ السّلام نے اسکو قبول نہ کیا۔

دوسرے دن پھر اجتماع کیا اور کل کی بات دُہرائی، سب خاموش رہے لیکن وہی شخص آگے بڑھا اور خود کو اس خدمت کے لئے پیش کیا اور تینوں شرطیں پوری کرنے کا عہد کیا۔ تب حضرت الیسع علیہ السّلام نے اُسکو اپنا خلیفہ نامزد کیا۔ شیطان مردود یہ ساری کاروائی دیکھ رہا تھا اسکو برداشت نہ ہو سکا اُس نے اپنی ذُریت کو جمع کیا اور کہا کہ ایسی صورتیں اختیار کرو جن سے یہ شخص بھٹک جائے اور اپنی شرطوں پر قائم نہ رہ سکے۔ شیاطین نے بہت کوششیں کیں لیکن سب ناکام رہے وہ شخص دن بھر روزہ رکھتا، شب بھر عبادت کرتا اور کبھی کسی پر غصّہ نہ کرتا تھا۔

آخر ابلیس لعین نے کہا کہ میں ہی اس کام کو انجام دوں گا تم مجھ پر چھوڑ دو۔

الیسع علیہ السّلام کے اس خلیفہ کا یہ دستور تھا کہ وہ دن رات میں صرف دوپہر کو تھوڑی دیر سو جاتے تھے تاکہ تھکان دُور ہو جائے۔

چنانچہ ایک دن ابلیس ملعون پراگندہ حال بوڑھے کی شکل میں اُسی وقت اُن کے دروازے پر پہنچا اور کھٹکھٹایا۔ خلیفہ آرام چھوڑکر باہر آیا پوچھا کہ کون ہو؟ ابلیس نے جواب دیا میں ایک مظلوم اور ناتواں بوڑھا ہوں میرے اور میری قوم کے درمیان ایک دیرینہ خصومت ہے اُن لوگوں نے مجھ پر ظلم کر رکھا ہے اور مجھے تھوڑے تھوڑے وقفہ سے پریشان کرتے ہیں اور پھر طویل داستان شروع کر دی یہاں تک کہ دوپہر کے سونے کا وقت ختم ہوگیا۔ خلیفہ نے کہا اب تم جاؤ شام کو جو مجلس ہوگی تب آنا میں تمہاری دادرسی کردوں گا۔ بوڑھا چلا گیا شام کو جب مجلس منعقد ہوئی تو خلیفہ نے دیکھا کہ وہ بوڑھا مظلوم موجود نہیں ہے یہاں تک کہ مجلس برخاست ہوگئی مگر وہ نہیں آیا۔

صبح کی مجلس میں انتظار کیا اس وقت بھی غیر موجود تھا خلیفہ نے خیال کیا شاید کوئی عذر پیش آگیا ہو۔ جب دوپہر کا وقت ہوا تو معمول کے مطابق لیٹے ہی تھے کہ دروازے پر کسی نے دستک دی، اُٹھ کر دیکھا تو وہی بوڑھا تھا پوچھا کہ کیا بات ہوئی جو تم عدالت کے وقت نہیں آئے؟ کہنے لگا اے ہمارے عزیز خلیفہ میرے مخالف بڑے خبیث قسم کے لوگ ہیں جب آپ کو مجلس میں دیکھتے ہیں تو آہستہ سے مجھ سے اقرار کر لیتے ہیں کہ مرافعہ نکرو ہم تمہارا حق دیدیں گے، لیکن جب آپ مجلس برخاست کر دیتے ہیں تو پھر انکار کر دیتے ہیں اور پھر ان کی شرارتیں سنانے لگا یہاں تک کہ آرام کا وقت ختم ہوگیا۔ خلیفہ نے کہا آج شام کو ضرور آجانا میں تیری موجودگی میں فیصلہ کردوں گا اور اس جھگڑے کو ہمیشہ کے لئے ختم کردوں گا۔ بوڑھا معذرت کرتا ہوا دُعائیں دیتا ہوا رخصت ہوا لیکن خلیفہ کو نیند نے بہت تھکا دیا تھا مسلسل دو دن آرام نہ کرنے پر مزاج میں تغیر پیدا ہونے لگا مگر شام کی مجلس حسب وعدہ منعقد کی اور دادرسی کے لئے بیٹھ گئے چاروں طرف نگاہ ڈالی بوڑھے کو نہ پایا، خیال کیا شاید پھر کوئی عذر پیدا ہوگیا ہو۔

تیسرا دن ہوا تو صبح کی مجلس اپنے وقت پر قائم کی سب لوگ آئے جنکے مقدمات تھے لیکن وہ بوڑھا آج بھی نہ آیا، خلیفہ نے سمجھا کہ ممکن ہے قوم کے ساتھ مصالحت ہوگئی ہو۔ عدالت سے فارغ ہوکر دوپہر کو آرام کے لئے گھر آئے اور اہلِ خانہ کو حکم دیا کہ آج دروازے پر کوئی شخص بھی آئے دروازہ نہ کھولا جائے۔ نیند نے مجھے بے بس اور عاجز کر دیا ہے۔ خلیفہ ابھی لیٹا ہی تھا کہ بوڑھے نے دروازے پر دستک دینی شروع کی، اندر سے جواب ملا کہ آج خلیفہ کا حکم ہے کہ کسی کے لئے بھی دروازہ نہ کھولا جائے۔

بوڑھے نے کہا کہ میں دو روز سے اپنے ایک اہم معاملہ میں حاضر ہورہا ہوں اور خلیفہ نے مجھے اس وقت بلایا ہے اس لئے دروازہ کھول دیا جائے مگر دروازہ نہ کھلا۔ کچھ دیر بعد گھر والوں نے دیکھا کہ باہر کا دروازہ بند ہونے کے باوجود وہ شخص اندر موجود ہے اور خلیفہ کے کمرہ کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ خلیفہ نے اس غیر معمولی صورت پر دروازہ کھولا اور گھر والوں سے کہا کیا میں نے تم کو منع نہ کیا تھا کہ آج دروازہ نہ کھولنا۔ پھر یہ شخص کیسے داخل ہو؟ پھر معاً دروازہ پر نظر ڈالی تو اسکو بند پایا اور بوڑھے کو اپنے قریب دیکھا۔ خلیفہ کو یقین ہوگیا کہ یہ ابلیس ہے ڈانٹ کر پوچھا اللہ کے دشمن کیا تو ابلیس ہے؟ کہا ہاں! میں ابلیس ہی ہوں۔ اے خلیفہ تو نے مجھے ہر طرح تھکا دیا اور میری ذرّیت بھی تجھ پر کسی طرح قابو نہ پاسکی تب میں نے یہ آخری صورت اختیار کی تاکہ کم از کم تجھ کو غضبناک ہی کردوں مگر افسوس کہ میں خود ہی ناکام رہا اور تو اپنے عہد میں پورا ثابت ہوا"

چنانچہ اس واقعہ کی بنار پر اللہ تعالیٰ نے انھیں ذُوالکفل کے نام سے مشہور کر دیا۔ یعنی حضرت الیسع علیہ السلام سے جو انھوں نے عہد کیا تھا اُسکو پورا کرنیوالا۔

تنقید | امام مجاہدؒ کی یہ روایت چونکہ سند کے اعتبار سے محلِ نظر ہے اس لئے

اسکی حیثیت ایک قصہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ نہ اسکو قرآن حکیم کی تفسیر قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی حضرت ذوالکفل علیہ السلام کی ذاتی سیرت کے لئے دلیل وحجت کہا جاسکتا ہے۔ نیز اسی روایت میں یہ بھی صراحت ہے کہ ذوالکفل نبی نہیں مردِ صالح تھے۔ چونکہ قرآن حکیم نے انھیں انبیاء کی فہرست میں شمار کیا ہے اس لئے یہ بات تو قطعی ہے کہ وہ یقیناً نبی تھے۔ رہی ان کی ذاتی سیرت اور واقعاتِ زندگی قرآن حکیم ان تفاصیل سے ساکت ہے۔ اس لئے اس روایت کو صرف ایک تاریخی روایت سے زائد حیثیت حاصل نہ ہوگی۔

شاہ عبد القادر محدثؒ نے لکھا ہے کہ ذوالکفل حضرت ایوب علیہ السلام کے صاحبزادے تھے اور انھوں نے حسبۃً للہ کسی شخص کی ضمانت قبول کرلی تھی جس کی پاداش میں ان کو کئی سال قید کی تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔ واللہ اعلم۔

نتائج وعبر

سیدنا ذُوالکفل علیہ السلام یا گوتم بُدھ

بعض حضرات کا یہ خیال کہ ذُوالکفل حضرت حزقیل علیہ السلام کا لقب ہے اور ایک دوسرے معاصر کی عجیب رائے یہ ہے کہ ذوالکفل "گوتم بدھ" کا لقب ہے۔ اور یہ تحقیق صرف اس لئے کہ گوتم کے دار السلطنت کا نام کپِل تھا جس کو عربی میں کِفل کر دیا گیا اور عربی زبان میں ذُو کا لفظ مالک یا صاحب کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ صاحبِ مال کے لئے ذو مالٍ اور شہر کے مالک کے لئے ذُو بَلَدٍ بکثرت استعمال ہے اس لئے یہاں بھی کپِل کے مالک اور بادشاہ کو ذوالکفل کہا گیا۔ پھر یہ حاشیہ بھی زیبِ قرطاس کیا گیا کہ گوتم بدھ کی اصل تعلیم توحید اور اسلام ہی تھی۔ موجودہ شکل وصورت دیگر ادیان کی طرح مسخ اور محرّف ہوگئی ہے۔

مگر یہ اقوال تخمین وظن سے زیادہ وزن نہیں رکھتے۔ تاریخی حیثیت سے بھی کوئی

وقعت نہیں رکھتے۔ یہ صحیح ہے کہ اگر تاریخ سے یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن حکیم نے جن انبیاء کرام کے صرف نام ہی ذکر کئے ہیں اُن سے مراد فلاں برگزیدہ ہستی ہے تو صرف اس لئے انکار کر دیا جائے کہ اس سے قبل ایسی بات چونکہ کسی نے نہیں کہی اس لئے قابل رد ہے۔

بلاشبہ حقائق کی جستجو کا باب بند نہیں ہر دن نئی تحقیقات سامنے آتی ہیں جنکے ذریعہ قرآن وحدیث کے بیان کردہ واقعات کی تصدیق بھی ہو رہی ہے جس کا بعض لوگ اس لئے انکار کرتے ہیں کہ قرآن حکیم کے بعض واقعات کا تاریخ اور فلسفہ تاریخ ساتھ نہیں دیتے۔ الغرض اگر قرآن حکیم کے بیان کردہ کسی ہستی کے بارے میں مزید انکشافات سامنے آجائیں تو ہمارے لئے باعثِ انکار نہیں، لیکن اس اقرار حقیقت کے باوجود اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی واقعہ کے متعلق محض قیاس ورائے اور ظن وتخمین سے کوئی دعوے کردے تو ضرور اُسکو مان ہی لیا جائے، چنانچہ حضرت ذوالکفل علیہ السلام کو گوتم بدھ قرار دینا ابھی تک اس سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا کہ وہ صرف اور صرف تخمین ہی ہے۔

اللہ کے فرستادہ نبیوں پر ایمان لانے کے لئے قرآن حکیم کی تین دفعات نہایت اہمیت رکھتی ہیں۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ۔ (فاطر آیت ۲۴)

اور کوئی قوم ایسی نہیں جس میں اللہ کی جانب سے ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ۔ (المؤمن آیت ۷۸)

بعض نبیوں کا ہم نے تم کو (نام لیکر) ذکر سنایا اور بعض کے واقعات تم کو نہیں سنائے۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (بقرہ آیت ۲۸۵)

ہم اللہ کے نبیوں میں سے کسی نبی کے درمیان تفریق نہیں کرتے یعنی سب نبیوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

ان ہدایات کے بعد ایک صاف اور مستقیم عقیدہ ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ کسی ملک

یا کسی خطہ کے انبیاء ورسل کے واقعات اگر ہمارے سامنے نہ آئے ہوں تو اسکے وجوہ اور اسباب دوسرے ہیں لیکن جہاں تک اُن پر ایمان لانے کا تعلق ہے وہ اجمالی طور پر کافی ہے۔ البتہ انکی تفصیلات پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔ ممکن ہے ہندوستان میں بھی اللہ تعالےٰ کے سچے نبی اور رسول مبعوث ہوئے ہوں جیسا کہ تاریخ کی روایات کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام اسی ہندوستان کے کسی گوشے میں اُتارے گئے، لیکن جب تک قرآن وحدیث کی صراحت یا پھر تاریخ کے دلائل وشواہد سے یہ ثابت نہ ہوجائے کہ ذُوالکفل علیہ السلام گوتم بدھ ہی کا لقب ہے۔ محض ظن وتخمین ہے اسکو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ جس طرح کسی نبی کو نبی نہ ماننا کفر ہے اسی طرح غیر نبی کو نبی تسلیم کرنا بھی کفر ہے۔ (وَالنَّاسُ عَنْهَا غَافِلُوْنَ)

حَدِیْثُ الْکِفْل

امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں حضرت ابن عمرؓ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ:۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص کِفل نامی تھا انتہا درجے کا بدکار ایک مرتبہ اُسکے پاس ایک حسین وجمیل عورت آئی کِفل نے اُسکو ساٹھ دینار دے کر بدکاری کیلئے راضی کرلیا لیکن جب اُس عورت سے مباشرت کا ارادہ کرلیا تو وہ کانپنے لگی اور زار وقطار رونے لگی۔ کِفل نے تعجب سے دریافت کیا کیوں روتی ہو؟ کیا میں نے جبر کیا ہے؟ عورت نے جواب دیا یہ بات نہیں۔ البتہ میں نے ساری عمر یہ کام نہیں کیا ہے۔ پوچھا کہ تو پھر کیوں آمادہ ہوئی؟ عورت نے جواب دیا معصوم بچوں کی بھوک پیاس نے یہاں تک کھینچ لایا ہے۔ کِفل نے یہ جو سنا تو فوراً اس سے الگ ہوگیا اور کہنے لگا کہ ایک عورت مجبور ہوکر اس حالت کو پہنچ گئی اور پھر بھی اللہ کے خوف سے کانپ رہی ہے اور میں سب کچھ ہوتے ہوئے اتنا بے خوف ہوں۔ یہ کہہ کر عورت کو رخصت کیا کہ اپنے گھر جا اور یہ دینار اپنے کام میں لا، پھر توبہ کیا کہ زندگی بھر کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ ساری رات بیقراری

میں گزار دی۔ اور اسی بیقراری میں اُسی رات انتقال ہوگیا۔ صبح کو لوگوں نے دیکھا کہ نورانی حروف میں اُسکے دروازے پر یہ عبارت کندہ تھی۔

اِنَّ اللّٰہَ قَدْ غَفَرَ لِلْکِفْلِ۔

اللہ نے کِفل کو بخش دیا۔

ابن کثیر نے یہ روایت مسند احمد سے نقل کی ہے اسکے راوی حضرت ابن عمرؓ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دو مرتبہ نہیں سات مرتبہ سنا ہے۔

ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ روایت سند کے لحاظ سے غریب ہے (اور صحاح ستہ میں بھی موجود نہیں) تاہم حدیث غریب ہونے کی وجہ سے واقعہ کی نفی نہیں ہوتی زیادہ سے زیادہ اس کی تائید کسی دوسرے ثقہ راوی سے ثابت نہ ہوگی اور اسکی چنداں ضرورت بھی نہیں خاص طور پر جب حدیث کا تعلق احکام شریعت سے نہ ہو۔ فضائل اعمال میں حدیث ضعیف تک نقل کی جاتی ہے۔

بہر حال یہاں اس واقعہ کو نقل کرنے کا یہ مقصد تھا کہ بعض حضرات نے اس کِفل نامی شخص سے مراد حضرت ذوالکفل علیہ السلام سمجھا ہے اور یہ واقعہ ان کے ابتدائی زندگی کا بیان کیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اِن حضرات کو نام کی مشابہت سے اشتباہ ہوگیا اور دونوں کو ایک شخص سمجھ لیا گیا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ کِفل اور ذوالکفل ایک نام نہیں ہیں دو مستقل نام ہیں اس لئے وہ واقعہ ذوالکفل علیہ السلام کا نہیں۔

دوسری وجہ یہ کہ قرآن حکیم نے حضرت ذُوالکفل علیہ السلام کو انبیاء کی فہرست میں بیان کیا ہے جیسا کہ سورہ انبیاء اور سورۂ صٓ میں واضح طور پر موجود ہے۔ اور یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ انبیاء کرام نبوت سے پہلے بھی ہر قسم کی معصیت اور فسق سے ایسے ہی پاک وصاف رہتے ہیں جیسا کہ نبوت کے بعد معصوم رہا کرتے ہیں۔ اِن کا

ماضی اور حال اور مستقبل یکساں حالت کا حامل ہوتا ہے۔

مسند احمد کی مذکورہ روایت میں یہ تصریح بھی ملتی ہے کہ کِفل ایک بد کردار آدمی تھا جو کسی گناہ سے پرہیز نہیں کرتا تھا۔ ظاہر ہے یہ انبیاء کرام کی سیرت سے بالکل مختلف زندگی ہے۔

اس لحاظ سے مذکورہ واقعہ حضرت ذوالکفل علیہ السلام سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ یقیناً کِفل کوئی دوسرا شخص ہی ہے جس نے گناہ کا ارادہ کیا تھا جس کا قصہ مسند احمد میں نقل کیا گیا ہے۔

(اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ)

تذکرہ
سیدنا عزیر علیہ السلام

قرآن حکیم اور سیدنا عزیر علیہ السلام

قرآن حکیم میں حضرت عزیر علیہ السلام کا صرف اسم گرامی ملتا ہے اور وہ بھی اس ضمن میں کہ یہودیوں نے اُن کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دے لیا ہے جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہا ہے۔

اس ایک جگہ کے علاوہ قرآن حکیم میں کسی اور مقام پر بھی اُن کا نام لیکر اُن کے حالات و واقعات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے:۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ الخ (توبہ آیت ۳۰)

"اور یہودیوں نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ اِن کی باتیں ہیں محض اِن کی زبانوں سے نکالی ہوئی۔ اِن لوگوں نے بھی اُن ہی کی سی بات کہی جو اس سے پہلے کفر کی راہ اختیار کر چکے ہیں۔ اِن پر اللہ کی لعنت یہ کدھر بھٹکے جا رہے ہیں"۔

سلسلۂ نسب

مؤرخ اسلام ابن عساکر نے حضرت عزیر علیہ السلام کے والد کا نام جروہ لکھا ہے۔ اور صحیفہ عزرا میں ان کا نام خلقیاہ بتایا گیا ہے۔ سلسلۂ نسب کے بعض ناموں میں مؤرخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ حضرت ہارون بن عمران علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔

تاریخی تعارف

ساتویں صدی قبل مسیح کے وسط شہر بابل میں بخت نصر کا ظہور ہوا اُس نے

اپنی قاہرانہ اور جابرانہ طاقت سے قرب وجوار کی تمام حکومتوں کو مسخر اور زیر کر لیا اور پھر فلسطین پر مسلسل حملہ کر کے یروشلم اور فلسطین کے تمام علاقے کو تباہ و تاراج کر دیا اور بنی اسرائیل کو قید کر کے بڑی ذلت کے ساتھ بابل لے گیا، تورات کے تمام نسخوں کو جلا دیا۔ اس طرح کہ ایک نسخہ بھی یہودیوں کے ہاتھ میں باقی نہ رہا۔

اسرائیلی روایات کے مطابق بنی اسرائیل کا یہ دورِ ابتلاء حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد کے بعد کا ہے۔ بابل کی اسیری تقریباً ستّر سال قائم رہی۔ اس طویل عرصہ میں بنی اسرائیل نے اپنی شریعت، روایات، تہذیب وتمدن حتیٰ کہ اپنی قومی زبان عبرانی تک سے ناآشنا ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں حضرت عزیر صغیرسن تھے اور اسرائیلیوں کے ساتھ بابل ہی میں رہتے تھے۔ چالیس سال کی عمر کو پہنچے تو فقیہ (مذہبی عہدہ) تسلیم کر لئے گئے اور اسکے بعد اُن کو منصبِ نبوت عطا ہوا۔ بنی اسرائیل کی اسیریٔ بابل سے لے کر رہائی اور تعمیر بیت المقدس کی درمیانی مدت تک وہ بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت میں مشغول رہے ہیں۔

گزشتہ سطور میں یہ ذکر آچکا ہے کہ جب بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ و برباد کر دیا اور بنی اسرائیل کے مرد، عورتوں اور بچوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکا کر لے چلا تو توراۃ کے تمام نسخوں کو بھی جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ بنی اسرائیل کے پاس نہ توراۃ کا کوئی نسخہ باقی بچا تھا اور نہ کوئی توراۃ کا حافظ تھا جسکو اوّل سے آخر تک توراۃ حفظ ہو۔ چنانچہ اسیری کے پورے دور میں وہ توراۃ سے محروم ہو چکے تھے۔ لیکن جب عرصۂ دراز کے بعد ان کو بابل کی اسیری سے نجات ملی اور وہ بیت المقدس میں دوبارہ آباد ہوئے تو اب انھیں فکر ہوئی کہ اللہ تعالےٰ کی کتاب توراۃ کو کسی طرح حاصل کریں تب حضرت عزیر علیہ السلام نے سب اسرائیلیوں کو جمع کیا اور اُن کے سامنے توراۃ کو اوّل سے آخر تک پڑھا اور تحریر کروا دیا۔ بعض اسرائیلی روایات میں ہے کہ جس وقت اُنھوں نے بنی اسرائیل کو جمع کیا تو سب کی موجودگی میں آسمان سے دو چمکتے ہوئے شہاب اُترے اور حضرت عزیر علیہ السلام کے سینے میں سما گئے تب حضرت عزیر علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو از سرِ نو توراۃ مرتب کر کے عطا کی۔ قوم میں اس خدمت سے حضرت عزیر علیہ السلام کی قدر و منزلت سوگنا بڑھ گئی اور پھر آہستہ آہستہ یہی محبت نے گمراہی کی شکل اختیار کر لی آخر انجام قوم نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اُسی طرح اللہ تعالےٰ کا بیٹا کہنا شروع کیا جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہا ہے اور بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے اپنے اس عقیدے کے لئے یہ دلیل قائم کرلی کہ موسیٰ علیہ السلام نے جب ہم کو توراۃ لاکر دی تھی تو الواح (تختیوں) پر لکھی ہوئی تھی مگر عزیر علیہ السلام نے تو کسی لوح یا قرطاس پر مکتوب لاکر دینے کے بجائے حرف بحرف اپنے سینے کی لوح سے اسکو ہمارے سامنے نقل کر دیا۔ اور عزیر علیہ السلام میں یہ قوت جب ہی ممکن ہوئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہوں۔ العیاذ باللہ۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعات کے ضمن میں ایک صحیح روایت اس طرح نقل کی گئی ہے کہ کسی نبی کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا تھا انھوں نے غصہ میں چیونٹی کے سوراخ میں آگ ڈال کر تمام چیونٹیوں کو جلوا دیا۔ اس عمل پر اللہ تعالیٰ نے اُن پر وحی بھیجی کہ ایک چیونٹی کی خطا پر تمام چیونٹوں کو جلا دینا کس طرح جائز تھا؟ اس واقعہ کے متعلق ابن کثیر نے اسحٰق بن بشیر کی سند سے یہ نقل کیا ہے کہ امام مجاہد، ابن عباس رضؓ اور حسن بصریؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ نبی حضرت عزیر علیہ السلام تھے۔ واللہ اعلم

(البدایہ والنہایہ، تاریخ طبری)

سیدنا عُزیر علیہ السلام اور آغوشِ موت

سورہ بقرہ میں ایک برگزیدہ ہستی کا یہ واقعہ درج ہے کہ وہ اپنے خچر پر سوار ایک ایسی بستی سے گزر رہے تھے جو بالکل تباہ و برباد اور کھنڈر ہو چکی تھی وہاں نہ کوئی مکین تھا نہ مکان، مٹے ہوئے چند نقوش باقی تھے۔ ان بزرگ نے جب یہ منظر دیکھا تو ان کے دل میں خواہش ہوئی کہ کاش اللہ تعالیٰ مجھے یہ دکھا دیتے کہ یہ مردہ بستی کس طرح دوبارہ زندگی اختیار کریگی اور یہ تباہ حال ویرانہ پھر کیسے آباد ہوگا؟

اس پر اللہ تعالیٰ نے اُسی جگہ اُن کی روح قبض کرلی اور سّو برس تک اُسی حال میں رکھا۔ یہ مدّت گزر جانے کے بعد اِن کو دوبارہ زندگی بخشی اور پوچھا بتاؤ کتنے عرصہ اس حالت میں رہے ہو؟

(وہ جس وقت موت کی آغوش میں سوئے تھے تو دن چڑھے

کا وقت تھا اور جب دوبارہ زندگی پائی تو آفتاب غروب ہو رہا تھا) جواب دیا ایک دن یا اس سے بھی کم۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ایسا نہیں ہے بلکہ تم ۱۰۰ برس تک اسی حالت میں رہے ہو اب تم ذرا اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو (جو توشہ ان کے ساتھ تھا) اسمیں ذرہ برابر بھی تغیر نہیں آیا ہے اور دوسری جانب اپنی سواری کے خچر کو دیکھو کہ اس کا جسم گل سڑ کر صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے اور پھر ہماری قدرت کا اندازہ کرو کہ جس چیز کو ہم نے چاہا کہ محفوظ رہے تو ۱۰۰ برس کے اس طویل عرصہ میں کسی قسم کے تغیر کے بغیر صحیح و سالم رہی اور جس چیز کے تعلق کا ارادہ کیا کہ اُس کا جسم گل سڑ جائے تو وہ گل سڑ گیا۔ پھر اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن بزرگ سے فرمایا اسی طرح ہم مرنے کے بعد دوبارہ زندگی عطا کرتے ہیں اور یہ سب کچھ اس لئے کیا تاکہ ہم تم کو اور تمہارے واقعہ کو لوگوں کے لئے "نشان" بنا دیں اور تاکہ تم یقین کے ساتھ مشاہدہ کر لو کہ اللہ تعالیٰ اس طرح مُردوں کو زندگی بخشے گا اور تباہ شدہ شئ کو دوبارہ آباد کرے گا۔ اِن بزرگ نے قدرتِ الٰہی کے یہ "نشانات" دیکھنے کے بعد شہر کی جانب نظر کی تو اسکو پہلے سے زیادہ آباد اور بارونق پایا۔ پھر وہ پکار اُٹھے کہ بلاشبہ تیری قدرت کاملہ کے لئے یہ سب کچھ آسان ہے۔ اور تو ہر چیز پر قادر ہے۔"

واقعہ زیر بحث قرآن حکیم میں اس طرح موجود ہے۔

قرآنی مضمون

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ؕ الخ (بقرہ آیت ۲۵۹)

اور کیا تم نے اُس شخص کا حال نہ دیکھا جس کا ایک ایسی بستی پر گزر ہوا جو اپنی چھتوں سمیت زمین پر ڈھیر تھی۔ تو وہ کہنے لگا (معلوم نہیں) اللہ تعالیٰ اس بستی کو (یعنی اسکے مردوں کو) اُس کے مرے پیچھے کس کیفیت سے (قیامت میں) زندہ کریگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُس شخص (کی جان قبض

کر کے اُس (اکو سو برس تک مردہ رکھا پھر (سو برس کے بعد) اسکو زندہ اٹھایا اور پوچھا کہ تو کتنی مدت تک اس حالت میں رہا؟ اُس شخص نے جواب دیا ایک دن یا دن کا بعض حصہ۔ اللہ نے فرمایا ایسا نہیں ہے بلکہ تم سو برس تک اس حالت میں رہے۔ پس تم اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ بگڑی تک نہیں ہیں اور پھر اپنی سواری کے خچر کو دیکھو کہ وہ گل سڑ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا تاکہ ہم آپ کو لوگوں کے لئے ایک دلیل و نشانی بنائیں (کہ مرنے کے بعد دوبارہ کس طرح زندہ کیا جاتا ہے) اور اب تم دیکھو کہ کس طرح ہم خچر کی ہڈیوں کو ایک دوسرے پر چڑھاتے ہیں اور آپس میں جوڑتے ہیں اور پھر اُن پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پس جب اُن صاحب کو ہماری قدرت کا مشاہدہ ہو گیا تو اُنھوں نے کہا میں یقین کرتا ہوں بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔"

تحقیقِ واقعہ

مذکورہ واقعہ میں قرآن حکیم نے اُن بزرگ کا نام ظاہر نہیں کیا جن کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا اور نہ یہ بتایا کہ وہ کون سی بستی تھی جس پر اُن کا گزر ہوا۔

علاوہ ازیں یہ ایک غیر ضروری بحث بھی ہے کہ وہ شخص کون تھا اور وہ بستی کہاں تھی؟

گزشتہ اوراق میں یہ حقیقت بار بار دہرائی گئی ہے کہ نقلِ واقعات میں قرآن حکیم کا اسلوب کتب تاریخ و جغرافیہ کی نوعیت کا نہیں ہے کہ واقعہ براہِ واقعہ بیان کیا جائے۔ قرآن حکیم نقلِ حکایات میں اپنا بنیادی مقصد وعظ و نصیحت، تذکیر و عبرت کا عنوان پیشِ نظر رکھتا ہے تاکہ غافل انسانوں کے لئے رُشد و ہدایت کا سامان فراہم ہو۔

الغرض جس مقصد کے تحت یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ نہایت واضح ہے۔

البتہ اسکی وضاحت کے لئے اس واقعہ سے اوپر والی آیات کا مطالعہ ضروری ہے۔

اس ویران بستی کے واقعہ سے پہلے یہ بیان کیا گیا ہے کہ مومن و مسلم کا

حامی و مددگار اللہ تعالیٰ ہوتا ہے وہ اُسکو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے اور کافرونافرمان کے مددگار شیاطین وطاغوت ہوتے ہیں اور وہ اُن کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔

اب اس حقیقت کے اظہار کے بعد بطور دلیل و مثال تین واقعات بیان کئے گئے ہیں جن میں دو حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے متعلق ہیں اور درمیان میں ایک واقعہ اسی ویران بستی کا ہے جسپر اُن بزرگ کا گزر ہوا تھا۔

پہلی مثال ظالم بادشاہ نمرود کے مناظرے کی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا تھا اور جس کے سامنے حقیقت پیش کی گئی اور وہ اسکے سامنے لاجواب بھی ہوگیا لیکن چونکہ اُس نے طاغوت (شیطان) کے ہاتھ میں اپنی نکیل دے دی تھی اس لئے حق واضح ہونے کے بعد بھی وہ روشنی میں نہ آسکا۔ (بقرہ آیت ۲۵۸)

بعد کی دو مثالیں (جن میں ایک اسی ویران بستی کا واقعہ شامل ہے) ایسے دو بزرگوں کا واقعہ ہے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کا سہارا پکڑا تھا اور اُسی کو اپنا دوست بنایا تھا سو اللہ تعالیٰ نے انھیں اسی دنیا کی تاریکیوں سے اس طرح روشنی میں نکال لایا کہ پردۂ غیب میں چھپی ہوئی حقیقتوں تک کا اُنھیں عینی مشاہدہ ہوگیا اور اللہ تعالیٰ کی وہ بات پوری ہوگئی کہ اللہ ایمان والوں کا دوست ہے جنہیں وہ تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکال لے جاتا ہے۔ (بقرہ آیت ۲۵۷)

اس وضاحت کے بعد ویران بستی پر گزرنے والے بزرگ کا واقعہ بھی اسی مقصد کے تحت بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے بھی اللہ تعالیٰ کا سہارا پکڑا تھا اور اُسی سے اپنی زندگی وابستہ کر رکھی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی خواہش پر عالم غیب کا پردہ اُٹھادیا اور دنیا کی ظلمت و تاریکی میں عالم آخرت کی روشنی اُن پر ظاہر کردی اور حیات بعد الموت کا عینی مشاہدہ کروادیا۔

بہرحال قرآن حکیم کے بیان کردہ عنوان کے تحت یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جن بزرگ کا یہ واقعہ ہے وہ کوئی نبی تھے۔ کیونکہ اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ کا کلام ۱۰ر

سوال اور اُن بزرگ کا جواب نقل کیا گیا ہے اور یہ طرزِ تخاطب عموماً نبیوں کے ساتھ ہی ہوا کرتا ہے لہذا یہ بزرگ یقیناً اپنے زمانے کے کوئی نبی اللہ ضرور تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

یہاں ایک خفیف سا شُبہ بھی دُور کر دینا ضروری ہے وہ یہ کہ
اِن بزرگ نے ویران و تباہ حال بستی کے مُردہ انسانوں کی دوبارہ زندگی
پر تعجب کا اظہار کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس خستہ و پستہ آبادی کو دوبارہ
کس طرح زندگی بخشے گا؟ (بقرہ آیت ۲۵۹)

اِن بزرگ کے اس سوال کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ حیات بعد الموت کے مُنکر تھے یا انھیں اس میں شک تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی کوئی بھی بات نہ تھی دراصل وہ حیات بعد الموت کا عینی مشاہدہ چاہتے تھے جیسا کہ انبیاء کرام کو کرایا جاتا رہا ہے اور اس قسم کا سوال انبیاء کرام کے لئے مناسب ہوا کرتا ہے تاکہ وہ غیبی حقیقتوں کو پورے اعتماد و بصیرت کے ساتھ انسانوں کے سامنے بیان کر سکیں۔

ان بزرگ کے نام کے سلسلے میں تفسیر روح المعانی کے مصنف نے مسند حاکم کی ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ یہ بزرگ حضرت عزیر علیہ السلام ہیں۔

اور ایک دوسری روایت کے مطابق اِن بزرگ کا نام حضرت ارمیاہ علیہ السلام بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اِنھیں حکم فرمایا تھا کہ تم یروشلم (فلسطین) جاؤ ہم اس کو دوبارہ آباد کریں گے۔ جب یہ وہاں پہنچے اور شہر کو تباہ و کھنڈر پایا تو بشری تقاضہ کے تحت اُن کی زبان مبارک پر یہ جملہ آیا کہ اللہ تعالیٰ اس مُردہ بستی کو دوبارہ کیسے زندگی عطا کرے گا؟

پھر اِن کے ساتھ وہ معاملہ پیش آیا جس کا ذکر آیات میں ہے اور جب وہ سَو سال بعد زندہ کئے گئے تو یروشلم (بیت المقدس) آباد ہو چکا تھا اور ایک نئی نسل آباد تھی۔ جب یہ منظر دیکھا تو بے اختیار بول پڑے کہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا یقین رکھتا ہوں۔

یہ ایک طبعی و اضطراری حالت ہے کہ نئی بات کو دیکھ کر اقرارِ قدرت کو تازہ کیا جاتا ہے جیسے سُبحان اللہ یا لاالٰہ الا اللہ یا اللہ اکبر، ایسے موقع پر ہمارے محاورات

میں بھی عادت ہے۔
حالانکہ اِن کے معنی و مطلب کا پہلے سے بھی عقیدہ رہتا ہے۔

ایک شبہ کا جواب قرآن حکیم کے اس اعلان پر کہ عُزیر علیہ السلام کو یہودی اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہتے ہیں۔ آج کے بعض یہودی عالم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہم نے تو عُزیر کو اللہ کا بیٹا کبھی نہیں مانا ہے۔ اس لئے قرآن کا دعویٰ غلط ہے۔

علماء یہود کا یہ اعتراض بھی اپنے آباء و اجداد کی طرح تلبیس اور حق پوشی پر مبنی ہے ورنہ تو وہ جانتے ہیں اور اُن کے علاوہ ہر وہ شخص جانتا ہے جس نے ممالکِ اسلامیہ کی سیر و سیاحت کی اور اُس کو اقوامِ عالم کے مذاہب کی تحقیق سے دلچسپی رہی ہو آج بھی نواح فلسطین میں یہودیوں کا وہ فرقہ موجود ہے جو حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتا ہے اور رومن کیتھولک عیسائیوں کی طرح اُن کا مجسمہ بنا کر اُن کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا۔

وفات ابن کثیر نے وہب بن منبہؒ، کعب احبارؓ اور عبد اللہ بن سلامؓ سے عزیر علیہ السلام کے متعلق جو طویل روایت نقل کی ہے اسمیں یہ تصریح موجود ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لئے توراۃ کی تجدید عراق میں کی تھی اور اُس کے نواح کے ایک قریہ سائر آباد میں اُن کی وفات ہوئی۔ اور ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ بعض آثار سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کی قبر دمشق (ملک شام) میں ہے۔ واللہ اعلم۔

نتائج و عِبَر

اَلعَبدُ عَبدٌ اِنَّ تَرَقّٰی انسان کتنا ہی بلند و بالا مقام پر پہنچ جائے اور اللہ کے ساتھ

اُس کو زیادہ سے زیادہ بھی قُرب حاصل ہو جائے تب بھی وہ "خدا کا بندہ" ہی رہتا ہے اور کسی بھی بلندی پر پہنچکر وہ خدا یا خدا کا بیٹا یا شریکِ خدا نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی ذات پاک وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے اور باپ بیٹے کی نسبتوں سے پاک اور وراءُ الوراء ہے۔ لہٰذا انسان کی سب سے بڑی گمراہی ہے کہ وہ جب کسی برگزیدہ انسان سے ایسے امور صادر ہوتے دیکھتا ہے جو عام طور پر عقل کے نزدیک حیرت زدہ اور ناقابلِ فہم ہوں تو وہ رُعب یا عقیدت کی بنا پر پکار اُٹھتا ہے کہ یہ ہستی تو خدا کا اوتار (خدا بشکل انسان) یا اُس کا بیٹا یا شریکِ خدا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور وہ یہ نہیں سوچتا کہ بلاشبہ اِن واقعات کا جاری ہونا اللہ تعالیٰ کی طاقت کے ذریعہ ہے جو بطور "نشان" اس برگزیدہ انسان کے ہاتھوں جاری ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ انسان نہ خُدا ہے نہ خدا کا بیٹا بلکہ اُس کا ایک پسندیدہ بندہ ہوتا ہے اور یہ امور اللہ تعالٰے کے خاص قوانین کے تحت محض اسکی تائید اور اسکی صداقت کے لئے ظاہر ہوتے ہیں ورنہ تو وہ بھی اللہ تعالٰے کے آگے اسی طرح مجبور ہے جس طرح دوسری مخلوق۔

قرآن حکیم نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام (جو بغیر باپ پاک مریم کے بطن سے پیدا ہوئے) کی حقیقت اس طرح بیان کی ہے:-

اِنَّ مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ
ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنَ۔ الایہ (آل عمران آیت ۵۹)

اللہ کے نزدیک عیسیٰؑ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اُنھیں مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گئے۔

یعنی اگر محض اعجازی پیدائش ہی کسی کو خُدا یا خُدا کا بیٹا بنانے کی دلیل ہو تو پھر حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق یہ عقیدہ بدرجہٗ اولیٰ رکھنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ حضرت مسیحؑ تو صرف بے باپ ہی کے پیدا ہوئے مگر حضرت آدم علیہ السلام ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے۔

یہ ایک قدیم گمراہی ہے کہ انسان کسی میں فوق الفطرۃ واقعات کو دیکھ کر اس میں خدائی اقتدار کا نظریہ قائم کر لیتا ہے اور اُس کو بشریت سے ماوراء خیال کرنے لگتا ہے۔

اہلِ تحقیق نے عبد و رب کے اس فلسفہ کو کس خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اَلْعَبْدُ عَبْدٌ اِنْ تَرَقّٰی
وَالرَّبُّ رَبٌّ اِنْ تَنَزَّلْ
بندہ بندہ ہی ہے اگرچہ بلند تر ہو جائے
اللہ اللہ ہی ہے اگرچہ وہ نزول کرے
تَعَالَی اللّٰہُ عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا۔

تذکرہ
سیدنا زکریا علیہ السلام

قرآن حکیم اور سیدنا زکریا علیہ السلام

قرآن حکیم میں حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر خیر چار سورتوں میں آیا ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:-

سورۂ آل عمران ——— آیات ۳۷ تا ۴۱
〃 انعام ——— 〃 ۸۵
〃 مریم ——— 〃 ۲ تا ۱۱
〃 انبیاء ——— 〃 ۸۹، ۹۰

سورۂ انعام کی آیت میں تو صرف فہرستِ انبیاء میں نام مذکور ہے اور باقی تین سورتوں میں مختصر تذکرہ موجود ہے۔

سلسلۂ نسب

قرآن حکیم میں جہاں جہاں بھی حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر آیا ہے اِن سے مراد وہ زکریا نہیں ہیں جن کا ذکر تورات کے صحیفۂ زکریا میں آیا ہے۔ اس لئے کہ تورات میں جن زکریا کا تذکرہ ہے ان کا وجود داریوس (دارا) کے زمانے میں رہا ہے۔ چنانچہ زکریا نبی کی کتاب میں ہے:-

"دارا کے دوسرے برس کے آٹھویں مہینے میں خداوند کا کلام زکریا بن برخیا بن عدد کو پہنچا"

اور دارا کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پانچ سو برس قبل ہے کیونکہ وہ کیقباد بن کیخسرو کے انتقال کے بعد ۵۲۱ قبل مسیح میں تخت نشین ہوا اور قرآن حکیم

نے جن زکریا علیہ السلام کا ذکر کیا ہے وہ حضرت مریمؑ کے سر پرست اور مربّی اور عیسےٰ علیہ السلام کے ہم زمانہ ہیں۔ لہٰذا تورات میں جن زکریا کا ذکر ہے وہ کوئی اور شخصیت ہیں۔ نام میں اشتراک کی وجہ سے بعض لوگوں کو اشتباہ ہو گیا۔ علاوہ ازیں حضرت زکریا علیہ السلام حضرت یحییٰ علیہ السلام کے والد بزرگوار بھی ہیں۔

مؤرخین حضرت زکریا علیہ السلام کے والد کے مختلف نام لکھتے ہیں اِن میں سے کوئی ایک نام وثوق کے ساتھ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اور ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر اور تاریخ میں مؤرخ ابن عساکر کے حوالہ سے وہ تمام اقوال نقل کر دیئے ہیں لیکن یہ بات سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔

حالاتِ زندگی

حضرت زکریا علیہ السلام کی حیاتِ طیّبہ کے واقعات کچھ تو قرآن حکیم میں موجود ہیں اور کچھ سیر و تاریخ کی قابل اعتماد روایات سے ثابت ہیں تاہم تفصیلات کا کوئی قابل اعتماد ماخذ نہیں ہے۔

گزشتہ اوراق میں آچکا ہے کہ بنی اسرائیل میں "کاہن[۱]" ایک معزز مذہبی عہدہ تھا اور اسکے ذمہ یہ خدمت تھی کہ وہ ہیکل (صخرۂ بیت المقدس) کی مقدس رسومات ادا کرے اس کے لئے مختلف قبائل میں سے الگ الگ کاہن منتخب ہوا کرتے تھے اور اپنی اپنی باری پر اِس خدمت کو انجام دیا کرتے تھے۔ حضرت زکریا علیہ السلام بنی اسرائیل میں معزز کاہن بھی تھے اور جلیل القدر پیغمبر بھی۔ چنانچہ قرآن حکیم نے فہرستِ انبیاء میں شمار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:-

وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ ۖ كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِينَ۔

(انعام آیت ۸۵)

زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس یہ سب نکوکاروں میں سے ہیں۔

اور لوقا کی انجیل میں اُن کو کاہن کہا گیا ہے۔

---

[۱] ضروری نوٹ: اسلام کے دور اول میں عرب کے اندر جو کاہن (جوتشی) مستقبل کے حالات بتایا کرتے تھے اور جنکی باتوں پر یقین کرنا اسلام کیساتھ کفر کرنا بتایا گیا ہے وہ بنی اسرائیل کے اس منصب سے الگ شئے ہے۔

"یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانے میں ابیاہ کے فریق
میں زکریا نام ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں سے
تھی اور اس کا نام ایشع تھا اور وہ دونوں خدا کے حضور راستباز اور
خداوند کے سارے حکموں اور قانون پر بے عیب چلنے والے تھے۔"

مگر انجیل برنابا میں بصراحت مذکور ہے کہ وہ خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام یہود کو مخاطب کرکے ارشاد فرما رہے ہیں:-

"وہ وقت قریب ہے جب تم پر اُن انبیاء (علیہم السلام) کا وبال
پڑنے والا ہے جن کو تم نے زکریا (علیہ السلام) کے زمانے تک قتل
کیا ہے اور جبکہ زکریا (علیہ السلام) کو ہیکل اور قربان گاہ کے درمیان
قتل کیا۔"

ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام ذرّیت داؤد سے تھے اور اُن کی زوجہ مطہرہ ایشاع حضرت ہارون علیہ السلام کی ذرّیت میں سے تھیں۔

انبیاء کرام کی عام سیرت یہی تھی کہ وہ خواہ صاحب حکومت ہی کیوں نہ ہوں اپنی روزی ہاتھ کی محنت سے پیدا کرتے اور قوم کے بار دوش نہیں ہوتے تھے۔ قرآن حکیم نے نبیوں کی دعوت و تبلیغ کا جہاں بھی تذکرہ کیا ہے خاص طور پر انبیاء کرام کا یہ قول دہرایا ہے کہ:-

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ۔ (الشعراء آیت ۱۰۹)

میں تم سے اس تبلیغ پر کوئی اُجرت نہیں مانگتا میرا اجر تو رب العالمین
کے پاس ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام بھی اپنی روزی کے لئے نجاری کا پیشہ کرتے تھے جیسا کہ کتب احادیث میں صراحت موجود ہے۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رض اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
قَالَ كَانَ زَكَرِيَّا نَجَّارًا۔ (مسلم کتاب الانبیاء)

حضرت ابوہریرہ رض فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا زکریا (علیہ السلام) نجاری کا پیشہ کرتے تھے۔"

الغرض حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام کی نسل میں عمران بن ناشی اور ان کی بیوی حنّہ بنت فاقود ایک نیک نفس انسان تھے۔ پارسائی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر لاولد تھے۔ حنّہ کی دُعا سے اِن کے گھر ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام انھوں نے مریم رکھا اور حنّہ نے اپنی منت کے مطابق سیدہ مریمؑ کو ہیکل (بیت المقدس) کی خدمت کے لیے نذر کر دیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ سیدہ مریمؑ کی کفالت اور پرورش کون کرے؟ کاہنوں کے درمیان اس "مقبول نذر" کے بارے میں اختلاف ہوا اور بات قرعہ اور فال پر آکر ٹھہری تو قرعہ حضرت زکریا علیہ السلام کے نام نکلا اور وہی سیدہ مریمؑ کے کفیل قرار پائے۔ یہ اس لئے کہ عمران کا انتقال سیدہ مریم کی پیدائش سے قبل ہو چکا تھا۔

علماء تاریخ کہتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام ویسے بھی سیدہ مریمؑ کی کفالت کے حقدار تھے کیونکہ حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی الیشاع اور سیدہ مریمؑ کی والدہ حنّہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں۔ اس لحاظ سے حضرت زکریا علیہ السلام رشتے میں مریمؑ کے خالو ہوے (سیدہ مریم کا تفصیلی ذکر تذکرہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام میں آرہا ہے) جب سیدہ مریمؑ سمجھدار ہو گئیں تو حضرت زکریا علیہ السلام نے اُن کے لئے ہیکل کے قریب ایک حجرہ (خلوت خانہ) مخصوص کر دیا جہاں وہ دن رات عبادت الٰہی میں مشغول رہتی اور رات اپنی خالہ الیشاع کے ہاں گزارتی تھیں۔ جب کبھی حضرت زکریا علیہ السلام حجرۂ مریم میں آتے اُن کے پاس بے موسم پھل رکھے ہوئے دیکھتے۔ ایک مرتبہ تعجب سے پوچھا مریمؑ یہ تیرے پاس کہاں سے آتے ہیں؟ سیدہ مریمؑ نے جواب دیا یہ اللہ کی جانب سے ہیں اور اللہ جسکو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے (یعنی بے موسم پھل دیتا ہے)

امام مجاہدؒ، عکرمہ، سعید بن جبیر، ضحاک، قتادہ، ابراہیم نخعی (رحمہم اللہ تعالیٰ) نے وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا آیت کی تفسیر میں رزق سے غیر موسمی پھل مراد لیا ہے (یعنی مریم علیہا السلام کے حجرے میں بے موسم پھل دیکھتے تھے)

قرآن حکیم میں حضرت زکریا علیہ السلام کی کفالت کا ذکر اس طرح آیا ہے :-

قرآنی مضمون | ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ

إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ
إِذْ يَخْتَصِمُونَ ۔ (آل عمران آیت ۴۴)

یہ واقعات غیب کی خبروں میں سے ہیں (اے نبی)، ہم آپ کے اوپر اُن کی وحی کر رہے ہیں اور آپ تو ان لوگوں کے پاس تھے نہیں جب وہ اپنے اپنے قلم (قرعہ کے لئے) ڈال رہے تھے کہ اُن میں سے کون شخص مریم کی کفالت کرے اور نہ تم اُن کے پاس تھے جب وہ مریم کی کفالت کے معاملہ میں جھگڑ رہے تھے۔

وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ
عِندَهَا رِزْقًا الخ (آل عمران آیت ۳۷)

اور زکریا (علیہ السلام) نے مریم کی کفالت کا بوجھ اپنے ذمہ رکھا۔ جب بھی زکریاؑ مریمؑ کے پاس محراب (حجرے) میں داخل ہوتے تو اُس کے پاس کھانے پینے کا سامان رکھا دیکھتے۔ زکریا نے دریافت کیا، مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آتا ہے؟ مریم نے کہا یہ اللہ کے پاس سے ہے وہ بلاشبہ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق عطا کر دیتا ہے۔"

اولاد کے لئے دُعا

حضرت زکریا علیہ السلام کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اپنے بعد بنی اسرائیل کی رُشد و ہدایت کے لئے کوئی وارثِ نبوت ہونا چاہیئے انھیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ میرے گھر والے اس مقدس سلسلہ کو باقی نہ رکھ سکیں گے۔ مگر چونکہ اُن کی عمر بقول ابن کثیرؒ ستّر سال اور بقول ثعلبی نوّے یا نوے سال ہو چکی تھی اور اُن کی بیوی بانجھ بھی تھیں اس لئے وہ ان ظاہری اسباب کی وجہ سے شکستہ دل تھے کہ اب اولاد ہونے کی بظاہر کوئی صورت نہیں ہے۔

لیکن جب اُنھوں نے حضرت مریم کے پاس بے موسم پھل پائے اور اللہ کا یہ فضل و انعام آنکھوں سے دیکھا تو خیال آیا کہ جو ذات بے موسم پھل مریمؑ کو عطا کرتی ہے تو کیا وہ موجودہ ناموافق حالات میں ثمر حیات (بیٹا) نہ بخشے گی؟ چنانچہ اسی وقت انھوں

نے بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ اُٹھایا:-

"پروردگار بڑھاپے میں میری ہڈیاں کمزور ہوگئیں، سر میں بالوں کی سفیدی پھیل گئی ہے۔ الٰہی! میں تنہا ہوں، وارث کا محتاج ہوں، حقیقی وارث صرف تیری ہی ذات ہے۔ ایسا وارث عطا فرما جو خاندانِ نبوت کا وارث بنے۔ الٰہی! مجھ کو نیک اولاد عطا فرما۔ میں تجھ سے مانگ کر کبھی ناکام نہیں ہوا۔ تو حاجت مند کی دُعا کو ضرور سُنتا ہے۔" (مریم آیت ۲-۷)

نبی کی دُعا اور دُعا بھی اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ قوم کی رُشد و ہدایت کے لئے تھی مستجاب ہوئی اور اسکی یہ صورت نمودار ہوئی کہ جب آپ ہیکل میں مشغول عبادت تھے خدا کا فرشتہ ظاہر ہوا اور اُس نے بشارت دی کہ تمہارے یہاں بیٹا پیدا ہوگا اور اُس کا نام یحییٰ رکھنا۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے مسرت اور تعجب سے دریافت کیا یہ بشارت کسطرح پوری ہوگی؟ یعنی کیا مجھ کو جوانی عطا ہوگی یا میری بیوی کا مرض (بانجھ پن) دور کر دیا جائیگا؟ فرشتے نے جواب دیا میں صرف اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ حالات کچھ بھی ہوں تمہارے یہاں ضرور بیٹا ہوگا۔ کیونکہ اللہ کا فیصلہ ہے اور تیرا رب کہتا ہے کہ میرے لئے یہ بہت آسان ہے۔

اب حضرت زکریا علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا پروردگار ایسا کوئی نشان عطا فرمائیے جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ بشارت نے وجود کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا علامت یہ ہے کہ جب تم تین یوم تک بات نہ کرسکو صرف اشاروں سے ہی اپنا مطلب ادا کرسکو تو سمجھ لینا کہ بشارت نے وجود اختیار کرلیا ہے۔ لیکن اِن ایام میں تم اللہ کی تسبیح و تقدیس میں زیادہ مشغول رہنا۔

چنانچہ جب وہ وقت آپہنچا تو زکریا علیہ السلام تسبیح و ذکرِ الٰہی تو اپنی جگہ بدستور کرتے رہے البتہ لوگوں سے بات چیت کی قوت تین دن تک حاصل نہ رہی۔ گویا یہ بات چیت نکرنے کا روزہ تھا جو قدیم مذاہب وادیان میں جزءِ عبادت رہ چکا ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام اِن دنوں اور زیادہ منہمکِ عبادت ہوگئے اور اُمت کو بھی اشاروں سے حکم دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ یادِ الٰہی میں مشغول رہیں۔ غالباً یہ اسلئے تھا کہ جہاں ولادت کی بشارت حضرت زکریا علیہ السلام کے لئے باعث صد ہزار مسرت تھی اسی طرح بنی اسرائیل کے لئے بھی کم خوشی کا باعث نہ تھی۔ کیونکہ حضرت زکریا علیہ السلام

کا ایک جانشین، حکومت و نبوت کا وارث، قوم کا رہنما عالم دُنیا میں آنے والا ہے۔

یہی وہ واقعات ہیں جو قرآن حکیم اور احادیث صحیحہ کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں اور جن پر قطعی طور پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ رہی وہ اسرائیلی روایات جو اکثر و بیشتر تو اس مسئلہ میں قرآن وحدیث کے بیان کردہ واقعات سے مطابقت نہیں رکھتی ہیں اور بعض ساقط الاعتبار ہیں اس لئے ہم نے بھی اسکو نقل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔
سیدنا زکریا علیہ السلام کا یہ تذکرہ قرآن حکیم کی آیات ذیل میں اسطرح آیا ہے:۔

قرآنی مضمون

كٓهيٰعٓصٓ ۔ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۔ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا الخ (مریم آیات ۱ تا ۱۱)

(اے پیغمبر) تیرے رب نے اپنے بندے زکریا پر جو مہربانی کی تھی یہ اس کا بیان ہے جب ایسا ہوا تھا کہ زکریا نے چپکے چپکے اپنے رب کو پکارا عرض کیا پروردگار میرا جسم کمزور پڑ گیا ہے اور میرے سر کے بال بڑھاپے سے بالکل سفید ہو گئے ہیں۔ اے میرے رب کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے تیری جناب میں دُعا کی ہو اور محروم رہا ہوں۔ مجھے میرے مرنے کے بعد اپنے بھائی بندوں سے اندیشہ ہے (نہ معلوم وہ کیا خرابی پھیلائیں) اور میری بیوی بانجھ ہے پس تو اپنے فضلِ خاص سے مجھے ایک وارث بخش دے ایسا وارث جو میرا بھی وارث ہو اور خاندانِ یعقوب کا بھی، اور اے رب اسے اپنا پسندیدہ بنالے۔ (اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا) اے زکریا ہم تجھے ایک لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ اس سے پہلے ہم نے کسی کے لئے یہ نام تجویز نہیں کیا ہے (زکریا نے تعجب سے پوچھا) پروردگار میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا میری بیوی بانجھ ہو چکی ہے اور میرا بڑھاپا دور تک پہنچ چکا ہے۔ ارشاد ہوا ایسا ہی ہوگا تیرا پروردگار فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے مشکل نہیں۔ میں نے اس سے پہلے خود تجھ کو پیدا

کیا ہے۔ حالانکہ تیری ہستی کا نام ونشان نہ تھا، اس پر زکریا نے عرض کیا، الٰہی! میرے لئے اس بارے میں کوئی علامت مقرر فرما دیجئے! فرمایا تمہاری علامت یہ ہے کہ صحیح وتندرست ہونے کے باوجود تم تین (دن) رات لوگوں سے بات نہ کر سکو گے۔ پھر وہ حجرے سے باہر اپنی قوم کے پاس آئے اور ان کو اشارہ سے کہا صبح وشام اللہ کی پاکی وثنا بیان کرتے رہو۔

وَزَكَرِيَّا إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ الخ (انبیاء آیت ۸۹، ۹۰)

اور اسی طرح اے نبی زکریا کا معاملہ یاد کرو جب انھوں نے اپنے رب کو پکارا تھا۔

پروردگار مجھے (اس دنیا میں) اکیلا نہ چھوڑ اور ویسے تو تو ہی ہم سب کا بہتر وارث ہے۔

ہم نے ان کی پکار سن لی، اُن کو ایک فرزند یحییٰ عطا فرمایا اور انکی بیوی کو اُن کے لئے تندرست کر دیا۔ یہ سب نیکی کی راہوں میں سرگرم تھے اور ہمارے فضل سے امید لگائے ہوئے اور ہمارے جلال سے ڈرتے ہوئے دُعائیں مانگتے تھے

اور ہمارے آگے عجز ونیاز سے جھکے ہوئے تھے۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ الخ (آل عمران آیات ۳۸ تا ۴۱)

اس وقت (جب حجرۂ مریم میں بے موسم پھل دیکھے) زکریاؑ نے اپنے رب سے دُعا کی، کہا اے میرے پروردگار مجھکو اپنے فضل وکرم سے پاکیزہ اولاد عطا فرما بلاشبہ تو دُعا کا سننے والا ہے۔ پھر جب زکریا حجرہ کے اندر نماز میں مشغول تھے تو فرشتوں نے ان کو آواز دی۔ اللہ تم کو یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے جو شہادت دیتا ہے اللہ کے ایک کلمہ (عیسیٰ علیہ السلام) کی اور صاحب مرتبہ ہوگا اور اپنے نفس کو بہت روکنے والا اور نبی اور اعلیٰ درجے کا شائستہ ہوگا۔

زکریا نے عرض کیا پروردگار میرے لڑکا کس طرح ہوگا جب کہ میں بہت بوڑھا ہوگیا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ فرمایا اللہ جو چاہے اسی طرح کرتا ہے۔ زکریا نے کہا پروردگار میرے لئے کوئی نشانی مقرر کر دیجئے۔ فرمایا یہ نشانی ہے کہ تو تین دن لوگوں سے اشارہ کے سوا (زبان) سے بات نہ کرے گا۔ اور اپنے رب کی یاد بہت کرنا اور صبح و شام اُسکی تسبیح کرنا۔"

نتائج و عبر

اور میں ہی تمہارا رب ہوں

سورۂ انبیاء میں پے در پے بہت سے انبیاء کی زندگی کے مفصل اور مختصر واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ تذکرۂ انبیاء کا یہ سلسلہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہو کر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر ختم ہوتا ہے۔ درمیان میں مندرجۂ ذیل انبیاء کرام کے واقعات آئے ہیں:-

سیدنا ابراہیم، سیدنا لوط، سیدنا اسحٰق، سیدنا یعقوب، سیدنا نوح
سیدنا داؤد، سیدنا سلیمان، سیدنا ایوب، سیدنا اسمٰعیل، سیدنا ادریس،
سیدنا ذوالکفل، سیدنا یونس (ذوالنون) سیدنا زکریا، سیدنا یحییٰ،
سیدنا عیسیٰ (علیہم السلام)

اِن عظیم تذکروں کا اختتام آیت "وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنَ" پر کر دیا گیا۔

یعنی ان پاکیزہ تذکروں سے یہ بات ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ یہ سارے نبی اللہ تعالیٰ کے بندے اور انسان تھے اُلوہیت کا اِن میں شائبہ تک نہ تھا دوسروں کو اولاد بخشنے والے نہ تھے بلکہ خود اللہ تعالیٰ کے آگے اولاد کے لئے ہاتھ پھیلانے والے تھے۔ اِن پر مصیبتیں بھی آتی تھیں تو وہ اُسی کے آگے ہی جھکتے تھے اُسی سے اپنا دُکھ درد بیان کرتے تھے اُسی کے فضل و کرم کے محتاج بھی تھے، وہ بیمار بھی ہوتے تھے تو اللہ تم

ہی کے آگے شفا کے لئے ہاتھ اُٹھاتے تھے وہ دوسروں کو شفا دینے والے نہیں تھے اللہ ہی سے شفا مانگنے والے ہوتے تھے۔ بڑے بڑے مصائب سے بھی گزرے ہیں سالہا سال آزمائشوں اور خطرات میں بھی مبتلا رہے ہیں، جانی اور مالی مصائب میں بھی اور اپنے مخالفوں کے ڈالے ہوئے مصائب میں بھی۔ مگر انجام کار اللہ کی نصرت و تائید انکو حاصل رہی اُس نے اپنے فضل و کرم سے اُنھیں نوازا، اُن کی دُعائیں قبول کیں، اُن کی تکلیفوں کو دور کیا، ان کے مخالفوں کو نیچا دکھایا اور معجزانہ طریقوں پر اُن کی مدد کی۔ یہ پاکیزہ نفوس اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقبول بارگاہ ہونے اور بڑی بڑی حیرت انگیز طاقتیں پانے کے باوجود بندے اور بشر ہی تھے اُلوہیت اِن میں کسی کو حاصل نہ تھی، یہ سارے کے سارے توحید ہی کے قائل تھے اسکی بندگی کرتے تھے۔

واقعات کے تسلسل کا اختتام اسی حقیقت پر ہو رہا ہے:-

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۔

(انبیاء آیت ۹۲)

اے لوگو! یہ تمہارا دین ہے کہ وہ ایک ہی دین ہے (جس کا خلاصہ یہ کہ) میں تمہارا رب ہوں سو تم سب میری عبادت کیا کرو۔

سُنّتِ انبیاء | سورۂ آل عمران کی آیت ۳۷ میں یہ تذکرہ ملتا ہے کہ جب کبھی سیدنا زکریا علیہ السلام سیدہ مریم کے حجرۂ عبادت میں داخل ہوتے قسم قسم کے بے موسم پھل ملاحظہ کرتے ایک دن پوچھا اے مریم یہ پھل کہاں سے آتے ہیں؟ سیدہ مریم نے جواب دیا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ یہ سب اللہ کی جانب سے آیا کرتے ہیں۔ اسی وقت سیدنا زکریا علیہ السلام نے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے اور اللہ تعالیٰ سے نیک اولاد کی خواہش ظاہر کی۔ دُعا قبول ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ صاحبزادے یحییٰ (علیہ السلام) کی بشارت پہنچا دی۔ سیدنا زکریا علیہ السلام زندگی کے آخری دور میں تھے بیوی صاحبہ بھی عقیم تھیں۔ سیدہ مریم کے حُجرے میں بے موسم پھل دیکھ کر دل و دماغ معاً اس زور و شور کے ساتھ اس جانب منتقل ہوا کہ جو اللہ اس پر قادر ہے کہ بلا اسباب ظاہری حجرہ میں یہ تر و تازہ پھل پہنچا دے وہ یقیناً اس پر بھی قادر ہے کہ مجھے عمر کے اس

آخری حصے میں نعمتِ اولاد سے سرفراز کرے۔

دعا کرنے والے سیدنا زکریا علیہ السلام کی نظر اس عالم اسباب میں اسباب سے کہیں زیادہ مسبب الاسباب پر ہے۔ اولاد کی خواہش ایک فطری خواہش ہے جو ہر بشر کی فطرت میں رکھی گئی ہے یہاں عام انسانوں کا ذکر نہیں ہے انبیاء کرام بھی اس فطری خواہش سے دور نہیں۔ انبیاء و رسل جہاں زُہد و قناعت کے مینار ہوتے ہیں وہاں طلبِ اولاد کے لئے بھی بے چین رہتے ہیں۔ انبیاء کرام کی زندگی میں ایسے بکثرت واقعات ملتے ہیں جنھوں نے اولاد کی نہ صرف خواہش کی ہے بلکہ کئی کئی نکاح بھی اس غرض کیلئے کئے ہیں صحیح بخاری میں طلبِ اولاد کے مستقل عنوانات موجود ہیں جن میں احادیثِ رسول نقل کئے گئے ہیں۔

اولاد کی طلب زاہدانہ زندگی کے خلاف تو کیا ہوتی کمالِ زہد کے بھی خلاف نہیں ہے۔ البتہ صرف اولاد ہی مطلوب نہیں ہونی چاہیئے نیک اولاد طلب کرنی چاہیئے۔

سیدنا زکریا علیہ السلام کی دعا میں ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً (نیک اولاد) کی خواہش نقل کی گئی ہے جو اسلام کے تقاضوں کو پورا کرنے والی ہو۔ وہ مذاہب حقیقت سے کتنی دُور ہیں جنھوں نے بیوی بچوں والی زندگی کو زُہد و تقویٰ کے خلاف کہا ہے اور ترکِ دنیا و مجردانہ زندگی کو پاکیزہ تر زندگی قرار دیا ہے۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔

مذہب اسلام نے طلبِ اولاد کو سنتِ انبیاء و سنت صدیقین قرار دیا ہے۔ (قرطبی)

ایک باریک نکتہ

سیدنا زکریا علیہ السلام اور سیدہ مریم بنت عمران رضہ کے واقعات میں غور کرنے سے یہ بات ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی مانگنے اور سوال کرنے پر عطا کرتے ہیں جیسا کہ سیدنا زکریا علیہ السلام کے سوال اور درخواست پر اللہ تعالیٰ نے سیدنا یحییٰ علیہ السلام جیسا جلیل القدر فرزند عطا کیا۔

اِن دونوں واقعات سے اللہ تعالیٰ کی ایک مخفی سنت معلوم ہوتی ہے جو سائلین نہ مانگنے والوں اور نہ مانگنے والوں کی طلب اور عدم طلب کی حیثیت کو واضح کرتی ہے۔

اگر اللہ تعالےٰ کی عطا و بخشش مانگنے پر ہی دی جاتی تو معلوم نہیں یہ دنیا کسقدر تنگ ہوجاتی اور انسان کس قدر مصائب و مشاکل سے دوچار ہوجاتا۔ وَاِنْ تَعُدُّوْا

نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا الآیة۔

سیدنا زکریا علیہ السلام اولاد کے لئے دُعا کرتے وقت عمر کے آخری حصے میں تھے اور زوجہ محترمہ بھی آخری عمر میں تھیں اور بانجھ بھی تھیں۔ ان حالات میں اولاد کا طلب کرنا عموماً خلاف توقع بات سمجھی جاتی ہے لیکن جن اہلِ بصیرت کی نگاہ اللہ عزوجل کے اقتدارِ اعلیٰ پر ہوا کرتی ہے وہ اسباب و وسائل پر نظر نہیں ڈالتے ہیں بلکہ قادرِ مطلق کی قدرت و طاقت غیر متناہی پر سب کچھ آسان جانتے ہیں۔

تذکرہ
سیّدنا یحییٰ علیہ السّلام

قرآن حکیم اور سیّدنا یحییٰ علیہ السّلام

جن سورتوں میں حضرت زکریا علیہ السلام کا تذکرہ موجود ہے اُنھی میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا ذکرِ خیر ملتا ہے۔ یعنی سورۂ آل عمران، انعام، مریم، انبیاء۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت زکریا علیہ السلام کے صاحبزادے اور ان کی پیغمبرانہ دعاؤں کا ثمرہ ہیں۔ جس عمر میں سلسلۂ توالُد منقطع ہوجاتا ہے "بطور معجزہ و نشانی" حضرت یحییٰ عطا کئے گئے اور نام بھی اللہ تعالےٰ کی طرف سے تجویز ہوا اور یہ ایسا نام تھا کہ اس سے پہلے کسی شخص کا نہ تھا۔ اور بعض خاص صفات بھی ایسے دیئے گئے جو گزشتہ انبیاء میں تھے۔ نام کی یکتائی اور صفات کی یہ خصوصیت حضرت یحییٰ علیہ السلام کا امتیاز رہاہے۔ وہ خصوصی صفات یہ ہیں:-

(۱) "حُکم" یعنی قوتِ فیصلہ، قوتِ اجتہاد، تفقہ فی الدین، معاملات میں صحیح رائے قائم کرنا، اللہ کی طرف سے معاملات میں فیصلہ دینے کا اختیار۔

(۲) "حنان" دل کی نرمی اور شفقت یعنی انتہائی درجے کی شفقت و عنایت جو ماں کو اپنے بچے پر ہوتی ہے جسکی بنا پر وہ بچے کی تکلیف پر تڑپ اُٹھتی ہے اس سے کہیں زیادہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے دل میں بندگانِ خدا کے لئے پیدا کی گئی تھی۔

(۳) "حصور" یعنی لذات و شہوات پر قابو پانے والا، نہایت درجہ محتاط و متقی جسکو زندگی بھر بُرا خیال نہ آیا ہو، جو ہر قسم کی معصیت سے محفوظ ہو۔

حالاتِ زندگی

تاریخی روایات کے مطابق حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام

سے چھ ماہ بڑے تھے۔ ان کی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ آپس میں حقیقی بہن اور ایک روایت کے مطابق خالہ زاد بہنیں تھیں۔ تقریباً تیس سال کی عمر میں منصب نبوت پر فائز کئے گئے۔ شرق اُردن کے علاقہ میں دعوت الی اللہ کا کام شروع ہو گیا۔ لوگوں کو گناہوں سے توبہ کراتے تھے اور توبہ کرنے والوں کو روحانی تسکین دیتے تھے، اونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنتے تھے، اُن کی خوراک جنگل کے پرندے اور شہد تھا۔ وہ اس فقیرانہ زندگی کیساتھ یہ منادی کرتے پھرتے تھے کہ توبہ کرو کیونکہ آسمانی بادشاہت قریب آگئی ہے۔ یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوتِ نبوت کا آغاز ہونے والا ہے اور لوگوں کو نماز و روزے کی تلقین کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو بچپن میں ہی حکم و حکمت سے معمور کر دیا تھا۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کی بشارت دیتے تھے اور اُن کی آمد سے قبل رشد و ہدایت کے لئے زمین ہموار کرتے تھے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام اپنے والد حضرت زکریا علیہ السلام کی طرح اولوالعزم نبی تھے تورات کی شریعت کے پابند تھے اللہ نے انھیں بچپن ہی میں نبوت کی صفات سے ممتاز فرمایا تھا۔ انکے بچپن کی زندگی عام بچوں سے جُدا تھی۔ جب بچے اُن سے کھیلنے پر اصرار کرتے تو وہ جواب دیتے: اللہ تعالیٰ نے مجھے لہو و لعب کے لئے نہیں پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو تین اہم و نازک اوقات میں سلامتی کی دُعا دی ہے:

۱۔ وقتِ ولادت
۲۔ وقتِ موت
۳۔ وقتِ حشر و نشر

یہ حقیقت ہے کہ انسان کے لئے یہی تین اوقات سب سے زیادہ نازک اور اہم ہیں۔ کیونکہ ہر انسان وقتِ ولادت جس میں بطنِ مادر سے جُدا ہو کر عالمِ دُنیا میں آتا ہے۔ وقتِ موت جس میں عالم دنیا سے رخصت ہو کر عالم برزخ میں پہنچتا ہے۔ وقتِ حشر و نشر، جس میں عالمِ برزخ (قبر) سے عالمِ آخرت میں اعمال کی جزا و سزا کے لئے پیش ہوتا ہے۔

لہٰذا جس شخص کو اللہ کی جانب سے اِن تینوں اوقات کے لئے سلامتی کی بشارت مل گئی اسکو دارین کا کل ذخیرہ مل گیا۔

قرآن حکیم کی مختلف آیات میں اِن حالات کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

قرآنی مضمون

یَا زَكَرِيَّا إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ اسْمُهُ يَحْيَىٰ لَمْ نَجْعَل لَّهُ مِن قَبْلُ سَمِيًّا۔ (مریم آیت ۷)

اے زکریا ہم تم کو بشارت دیتے ہیں ایک فرزند کی اُس کا نام یحییٰ ہوگا کہ اُس سے پہلے ہم نے کسی کے لئے یہ نام تجویز نہیں کیا۔

فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ الخ
(آل عمران آیت ۳۹)

فرشتوں نے زکریا کو آواز دی جب کہ وہ محراب میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے کہ اللہ تمہیں یحییٰؑ کی خوشخبری دیتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے ایک فرمان کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے گا (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کریں گے) اُس میں سرداری اور بزرگی کی شان ہوگی، کمال درجے کا ضابط ہوگا، نبوت سے سرفراز صالحین میں شمار کیا جائے گا۔

يَا يَحْيَىٰ خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا وَزَكَاةً وَكَانَ تَقِيًّا۔ الخ (مریم آیت ۱۲ تا ۱۵)

اے یحییٰ کتاب الٰہی کو مضبوط تھام۔

ہم نے بچپن ہی میں اُسے "حکم" سے نوازا اور اپنی طرف سے اُس کو نرم دلی اور پاکیزگی عطا کی۔ وہ بڑا پرہیزگار تھا، اور اپنے والدین کا حق شناس تھا، وہ سرکش اور نافرمان نہ تھا۔

سلام اُس پر جس روز کہ وہ پیدا ہوا اور جس دن کے وہ مرے اور جس روز زندہ کر کے اُٹھایا جائے۔

وَزَكَرِيَّا إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ۔ الخ (انبیاء آیت ۸۹، ۹۰)

اور اسی طرح زکریا کا واقعہ یاد کرو جب اُس نے اپنے رب کو پکارا کہ پروردگار مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور بہترین وارث تو تُو ہی ہے۔ پس ہم نے اُس کی دُعا قبول کر لی اور اُسے یحییٰ عطا کیا اور اُس کی بیوی کو اس کے لئے تندرست کر دیا۔ یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے تھے اور ہمیں

رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے اور ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے۔

دعوت و تبلیغ

حضرت حارث اشعریؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ بن زکریا (علیہما السلام) کو پانچ باتوں کا خصوصیت سے حکم فرمایا تھا کہ خود بھی ان پر عمل کریں اور بنی اسرائیل کو بھی ان کی تلقین کرتے رہیں، مگر یحییٰ علیہ السلام کو ان امور خمسہ کی تلقین میں کچھ تاخیر ہوگئی تب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میرے بھائی اگر تم مناسب سمجھو تو میں بنی اسرائیل کو ان کلمات کی تلقین کردوں جن کیلئے آپ کسی وجہ سے تاخیر کر رہے ہو؟

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا بھائی اگر میں تم کو اجازت دیدوں اور خود تعمیل حکم نہ کروں تو مجھے خوف ہے کہ کہیں مجھ پر کوئی عذاب نہ آجائے یا میں زمین میں دھنسا نہ دیا جاؤں، اس لئے میں ہی پیش قدمی کرتا ہوں، پھر انھوں نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں جمع کیا اور جب مسجد بھر گئی تو وعظ بیان کیا اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو (۵) باتوں کا حکم کیا ہے کہ میں خود بھی اُن پر عمل کروں اور تم کو بھی عمل کی تلقین کروں۔

(۱) پہلا حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو اور نہ کسی کو اُس کا شریک وسہیم ٹھہراؤ۔ کیونکہ مشرک کی مثال اُس غلام کی سی ہے جس کو اُس کے مالک نے اپنے روپے سے خرید امگر غلام نے یہ وطیرہ اختیار کرلیا کہ جو کچھ کماتا ہے وہ مالک کے سوا دوسرے شخص کو دے دیتا ہو تو اب بتاؤ کہ تم میں سے کوئی شخص یہ پسند کرے گا کہ اُس کا غلام ایسا ہو؟ لہٰذا سمجھ لو کہ جب اللہ تعالیٰ ہی نے تم کو پیدا کیا ہے اور وہی تم کو رزق دیتا ہے تو تم بھی صرف اُسی کی پرستش کرو کسی کو اُس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔

(۲) دُوسرا حکم یہ ہے کہ تم خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کرو۔ کیونکہ جب تک تم نماز میں کسی دوسری جانب متوجہ نہ ہوگے اللہ تعالےٰ تمہاری جانب رضا ورحمت کے ساتھ برابر متوجہ رہے گا۔

(۳) تیسرا حکم یہ ہے کہ روزہ رکھو اس لئے کہ روزہ دار کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو ایک

جماعت میں بیٹھا ہوا ور اُس کے پاس مُشک کی تھیلی ہو چنانچہ مشک اُس کو بھی اور
اُس کے رفقار کو بھی اپنی خوشبو سے شاد کام کرتا رہے گا اور روزہ دار کی منہ کی بُو کا خیال
نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک روزہ دار کی بُو (جو خالی معدے سے اُٹھتی ہے)
مشک کی خوشبو سے زیادہ پاک ہے۔

(۴) چوتھا حکم یہ کہ مال میں سے صدقہ و زکوٰۃ نکالا کرو کیونکہ صدقہ کرنے والے کی مثال اُس
شخص کی سی ہے جس کو اُس کے دشمنوں نے اچانک آپکڑا ہو اور اُس کے ہاتھوں
کو گردن سے باندھ کر مقتل کی جانب لے چلے ہوں اور وہ اس نا امیدی کی حالت
میں یہ کہے، کیا یہ ممکن ہے کہ میں اپنا مال دے کر اپنی جان چھڑالوں؟ دشمن اُس کی
اِس پیشکش کو قبول کر کے اُسکی جان بخش دیتے ہوں۔

(۵) پانچواں حکم یہ کہ دن رات میں اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتے رہو کیونکہ ایسے شخص کی
مثال اُس شخص کی سی ہے جو دشمن سے بھاگ رہا ہو اور دشمن تیزی کے ساتھ
اُس کا تعاقب کر رہا ہو اور وہ شخص بھاگ کر کسی مضبوط قلعہ میں پناہ لیکر دشمن سے
محفوظ ہو جائے۔ بلاشبہ انسان کے دشمن شیطان کے مقابلہ میں ذکر اللہ کے ساتھ
مشغول ہو جانا مضبوط قلعہ میں محفوظ ہو جاتا ہے۔

اسکے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کی جانب متوجہ ہو کر فرمایا میں بھی تم کو ایسی پانچ
باتوں کا حکم کرتا ہوں جن کا اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے:۔

لزومِ جماعت، سمعؔ (حق بات سننا)، طاعتؔ، ہجرتؔ، جہادؔ فی
سبیل اللہ۔

پس جو شخص جماعت (مسلمین) سے ایک بالشت بھی باہر نکل گیا
اُس نے بلاشبہ اپنی گردن سے اسلام کی رسّی کو نکال دیا مگر یہ کہ جماعت کا
لزوم اختیار کرے اور جس شخص نے دورِ جاہلیت کے باتوں کی دعوت
دی اُس نے اپنا ٹھکانہ جہنم کو بنالیا۔ حضرت حارث اشعریؓ (راوی حدیث)
کہتے ہیں کہ ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ اگرچہ وہ شخص نماز روزہ کا پابند
ہی کیوں نہ ہو؟

آپؐ نے ارشاد فرمایا ہاں اگرچہ وہ نماز اور روزہ کا پابند بھی ہو

اور یہ بھی سمجھتا ہو کہ میں مسلمان ہوں۔ تب بھی جہنم کا سزا وار ہے۔

(البدایہ والنہایہ ج ۲ ص۵۲ منقول مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

اسلامی مؤرخین نے اسرائیلی روایات سے نقل کیا ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی زندگی کا بہت بڑا حصہ صحرا میں بسر ہوا ہے وہ جنگلوں میں خلوت نشین رہتے، درختوں کے پتے اور جنگلی پرندے اُن کی خوراک تھی اور وہیں اُن پر اللہ کا کلام نازل ہوا تب انھوں نے دریائے یردن کے نواحی علاقوں میں دین الٰہی کی تبلیغ شروع فرمائی اور حضرت عیسیٰ کلمۃ اللہ کے ظہور کی بشارت دینے لگے۔ موجودہ انجیل سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے۔

مؤرخ ابن عساکر نے وہب بن منبہ رح سے جو روایات نقل کی ہیں اُن کا حاصل یہ ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی خشیت اتنی غالب تھی کہ وہ اکثر روتے رہتے تھے جسکی وجہ سے اُن کے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان پڑ گئے۔

ایک مرتبہ اُن کے والد حضرت زکریا علیہ السلام نے انھیں جنگل میں تلاش کر کے پا لیا تو فرمایا بیٹا! ہم تو تمہاری یاد میں مضطرب تم کو تلاش کر رہے ہیں اور تم یہاں آہ و گریہ میں مشغول ہو؟

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے جواب دیا، ابا جان آپ نے مجھ کو بتایا کہ جنت اور جہنم کے درمیان ایک ایسا لق و دق میدان ہے جو اللہ تعالےٰ کی خشیت میں آنسو بہائے بغیر طے نہیں ہوتا اور جنت تک رسائی نہیں ہوتی۔ یہ سنکر حضرت زکریا علیہ السلام بھی رو پڑے۔

ذکرِ شہادت حضرت یحییٰ علیہ السلام کی وفات کا تذکرہ مؤرخ ابن عساکر اور حافظ ابن کثیر رح نے اپنی اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے لیکن اہلِ تحقیق نے اِن ہر دو کی روایت پر تنقید کی ہے۔ درج شدہ روایت میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جس کی وجہ سے روایت ناقابلِ اعتبار ہو جاتی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ اس قصہ کی اصل حاکمؒ کی وہ روایت ہے جو اُنھوں نے اپنی کتاب مستدرک میں نقل کی ہے تاہم حاکم کی یہ روایت روایتہً اور درایتہً محل نظر ہے۔ البتہ مؤرخ ابن طبریؒ نے اسی واقعہ کو جس طرح نقل کیا ہے وہ قابل ذکر ہے :-

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں عام طور پہ بنی اسرائیل کے قلوب مسخر ہوتے جا رہے تھے اور جہاں بھی اُن کا وعظ ہوتا ہزاروں انسان پروانہ وار جمع ہو جاتے تھے۔ ان کے اس دور میں ارض یہودؔ کا بادشاہ ہیرودیس نہایت بدکار اور ظالم قسم کا تھا اسکو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی یہ مقبولیت سخت ناپسند آ رہی تھی اس کو یہ بھی اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں ملک کی یہ بادشاہت حضرت یحییٰ علیہ السلام کی جانب منتقل نہ ہو جائے۔ اسی زمانے میں اُسکے ایک سوتیلے بھائی کا انتقال ہو گیا اسکی بیوی بیحد حسین و جمیل تھی یہ اسپر عاشق ہو گیا اور اس سے عقد کر لیا۔ چونکہ یہ نکاح ملّتِ اسرائیلی کے قانون کے خلاف تھا اس لئے حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اسکو سرِ دربار اس حرکت سے باز رہنے کی تلقین کی اور اللہ کے عذاب سے ڈرایا۔ ہیرودیس کی محبوبہ نے یہ سُنا تو غم و غصہ سے پاگل ہو گئی اور ہیرودیس کو آمادہ کیا کہ وہ کسی طرح حضرت یحییٰ (علیہ السلام) کو قتل کر دے۔ ہیرودیس اگرچہ خود بھی چاہتا تھا مگر حضرت یحییٰ علیہ السلام کی عوام میں غیر معمولی مقبولیت کے باعث اقدام کرنے میں متردّد تھا۔

بادشاہ کی محبوبہ موقع کی تاک میں تھی آخر ہیرودیس کی سالگرہ کے جشن میں اُس نے یہ موقع پا لیا جشن کے دربار میں اُس کی بیٹی نے خوب رقص کیا جسپر خوش ہو کر ہیرودیس نے کہا مانگ کیا مانگتی ہے!! بیٹی نے اپنی فاحشہ ماں سے پوچھا کیا مانگوں ؟ ماں نے کہا کہ (حضرت) یحییٰ (علیہ السلام) کا سر مانگ لے۔ چنانچہ اُس نے ہیرودیس کے آگے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا مجھے یوحنا (یحییٰ) کا سر ایک تھال میں رکھوا کر ابھی دے دیا جائے۔ ہیرودیس یہ سنکر کچھ غمگین سا ہوا مگر محبوبہ کی بیٹی کا تقاضہ رد نہ کر سکا اور حضرت یحییٰ ع

کا سر کٹوا کر منگوایا اور ایک تھال میں رکھوا کر رقاصہ کی نذر کر دیا۔

(تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۲۵)

سخت حیرت کا مقام ہے کہ بنی اسرائیل میں کسی کی یہ جرأت نہ ہوئی کہ ہیرودیس کی اس ملعون حرکت پر کوئی آواز بلند کرتا۔ سب کے سب خاموش تماشائی بنے رہے۔ یہ واقعہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانیکے ایک سال قبل پیش آیا ۳۰ء میں۔ انجام کار حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اظہارِ حق کے سلسلے میں شہادت کا مقام حاصل ہوا۔

علماء تاریخ کا اسمیں اختلاف ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا واقعۂ شہادت کس جگہ پیش آیا؟

ایک قول یہ ہے کہ بیت المقدس میں ہیکل اور قربان گاہ کے درمیان ہوا۔ سفیان ثوری نے تمر بن عطیہ سے نقل کیا ہے کہ اس جگہ ستر انبیاء شہید کئے گئے۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۵۵)

قاسم بن سلام نے سعید بن مسیبؒ سے نقل کیا ہے کہ وہ دمشق میں شہید کئے گئے۔ جامع اُموی دمشق (شام) میں ایک قبر کے بارے میں عام شہرت ہے کہ وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ہے جسکی زیارت اس راقم نے بھی کی ہے۔ واللہ اعلم۔

حافظ ابن عساکر نے ولید بن مسلم کی سند سے نقل کیا ہے کہ زید بن واقد کہتے ہیں کہ دمشق میں عمودِ سکاسکہ کے نیچے ایک مسجد کو دوبارہ تعمیر کیا جا رہا تھا تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا کہ شرقی جانب محراب کے قریب ایک ستون کی کھدائی میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر برآمد ہوا۔ چہرہ مبارک اور بالوں میں تک کوئی تغیر نہیں آیا تھا اور خون آلود ایسا تھا کہ گویا ابھی ابھی کاٹا گیا ہو۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۵۵)

الحاصل اس بارے میں کوئی فیصلہ کن بات مہیا نہیں ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا مقتل کون سا مقام ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہود نے ان کو شہید کیا اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اُن کی شہادت کا علم ہوا

تو پھر اُنھوں نے اپنی دعوت و تبلیغ علی الاعلان شروع کر دی۔

قرآن حکیم نے متعدد جگہ اس بات کو دُہرایا ہے کہ یہود نے اپنی فتنہ پردازیوں میں جہاں بغاوت و سرکشی کو اپنا شعار بنالیا تھا وہاں اپنے نبیوں کو بھی قتل کئے بغیر نہیں چھوڑا۔ (آل عمران آیت ۲۱)

ابن ابی حاتم نے بسلسلۂ سند حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضؓ نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ بنی اسرائیل نے ایک دن میں تینتالیس نبیوں اور ایک سو ستر نیک لوگوں کو قتل کر دیا جو ان کو امر بالمعروف (نیکی کی دعوت اور بُرائی سے روکنے کا کام) کیا کرتے تھے۔

وہب بن منبہ کی ایک روایت ہے کہ جب یہودیوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا تو آپ کے والد بزرگوار حضرت زکریا علیہ السلام کی جانب متوجہ ہوئے تاکہ اُن کو بھی قتل کر دیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے جب یہ دیکھا تو وہ دوڑے تاکہ اُن کے ہاتھ نہ لگ سکیں۔ سامنے ایک درخت آگیا اور وہ اس کے شگاف میں گھُس گئے۔ یہودی تعاقب کر رہے تھے شیطان نے مقام کی رہبری کی۔ لوگوں نے بجائے باہر نکلنے پر مجبور کرنے کے درخت پر آرہ چلا دیا۔ درخت کے ساتھ حضرت زکریا علیہ السلام کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے (علیہ السلام)

شبِ معراج اور حضرت یحییٰؑ

امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح البخاری میں حدیث اِسرا کے تحت حضرت یحییٰ علیہ السلام کے ذکر میں صرف اُسی جملہ کو بیان کیا ہے جسمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرے آسمان پر اُن کے ساتھ ملاقات کرنا مذکور ہے :-

روایت یہ ہے :-

فَلَمَّا خَلَصْتُ فَإِذَا يَحْيٰى وَعِيسٰى وَهُمَا ابْنَا خَالَةٍ قَالَ هٰذَا يَحْيٰى وَعِيسٰى فَسَلِّمْ عَلَيْهِمَا فَسَلَّمْتُ فَرَدَّا ثُمَّ قَالَ مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ۔ (بخاری کتاب الانبیاء)

پس میں جب دوسرے آسمان پر پہنچا تو دیکھا کہ یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام موجود ہیں اور یہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں۔ جبرئیل نے کہا یہ یحییٰ اور عیسیٰ ہیں۔ انکو سلام کیجئے میں نے ان کو سلام کیا دونوں نے سلام کا جواب دیا اور پھر دونوں نے کہا آپ کا آنا مبارک ہو اے ہمارے نیک بھائی اور نیک پیغمبر!"

حضرت زکریا علیہ السلام کے تذکرے میں یہ آچکا ہے کہ یحییٰ علیہ السلام کی والدہ ایشع اور مریم علیہا السلام کی والدہ حنۃ حقیقی بہنیں تھیں اس لئے حدیثِ معراج میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام خالہ زاد بھائی ہیں اسی رشتے کی طرف اشارہ ہے۔

نتائج و عبر

شقی تر دنیا میں اُس شخص سے زیادہ شقی اور بدبخت دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا جو ایسی مقدس ہستی کو قتل کر دے جو نہ کسی کو ستاتی ہو اور نہ کسی کے مال و دولت پر نظر رکھتی ہو بلکہ اسکے برعکس بغیر کسی عوض و اجرت اسکی زندگی قوم کی اصلاح اور خیر خواہی کے لئے وقف ہو چکی ہو۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر حضرت ابو عبیدہ رض کے اس سوال پر کہ قیامت میں سب سے زیادہ مستحق عذاب کون ہوگا؟

یہ ارشاد فرمایا:۔

رَجُلٌ قَتَلَ نَبِيًّا أَوْ مَنْ أَمَرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهٰى عَنِ الْمُنْكَرِ۔

(الحدیث)

وہ شخص جو نبی کو یا ایسے شخص کو قتل کرے جو بھلائی کا حکم کرتا ہو اور بُرائی سے باز رکھتا ہو۔

اقوامِ عالم میں صرف یہود ہی ایک ایسی قوم ہے جنھوں نے ایسے پاکیزہ نفوس کو بے تحاشا قتل کیا ہے۔

قرآن حکیم شہادت دیتا ہے:۔

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ (بقرہ آیت ۶۱)

اور مار ڈالتے تھے پیغمبروں کو ناحق۔

حُسنِ ظن انسان کو اللہ کے فضل وکرم سے کسی بھی وقت اور کسی بھی حالت میں ناامید اور مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ بعض حالات میں خلوص کے ساتھ مسلسل دعائیں کرنے کے باوجود بھی مقصد حاصل نہ ہوتا ہو اسکے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اللہ کی نگاہ کرم نے رُخ پھیر لیا ہے۔ اس قسم کی مایوسی کُفر قرار دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے گزشتہ اقوام وملل کے سنگین حالات کے ضمن میں یہ بیان کیا ہے کہ اُن کی جان ومال میں ایسے حوادث اور پے در پے مصائب آئے کہ اہل ایمان اور اُن کے نبی نے بے اختیار پکارا:۔

مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اللہ کی مدد کب آئیگی

ایسی سخت اور انتہائی گھڑیاں خوش انجامی کا پیش خیمہ ہوتی ہیں اور ابتلار وآزمائش کا یہ دور اسپر ختم ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں وہ ایسے لمحہ مصائب وآلام کے دلدل سے نکل جاتے ہیں اور انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نئی زندگی عطا کی جاتی ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام زندگی بھر "وارثِ نبوت" کے لئے بے چین رہے اور اللہ تعالیٰ سے یہی حُسن ظن رکھا۔

وَلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا۔ (مریم آیت ۴)

اے پروردگار! میں تجھ سے مانگ کر نامراد نہیں رہا۔

عمر کے آخری حصے میں اسبابِ ولادت کے معدوم ہونے کے باوجود حضرت یحییٰ علیہ السلام جیسا نامور، پاکباز لڑکا عطا ہوا

ایک فطری خواہش سیدنا زکریا علیہ السلام (جو سیدہ مریم کے سرپرست اور نگراں تھے) جب کبھی حجرۂ مریم میں آتے تو وہاں بے موسم پھل دیکھا کرتے تھے

ایک دن تعجب سے پوچھا اے مریم یہ پھل کہاں سے آتے ہیں ؟ سیدہ مریم نے جواب دیا :-
هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ   اللہ کی جانب سے۔

حضرت زکریا علیہ السلام قدرتِ الٰہی کے تازہ مشاہدہ سے متأثر ہو کر اُسی جگہ ہاتھ اُٹھائے اور دُعا کی :-

"اے میرے پروردگار مجھکو نیک اولاد عطا فرما۔"

حضرت زکریا علیہ السلام کی عمر شریف آخری منزل میں آچکی تھی اور بیوی صاحبہ بانجھ تھیں ساری زندگی اولاد سے گود خالی رہا لیکن حجرۂ مریم میں جب ایک خارق عادت (کرامت) دیکھی تو آپ کا ذہن معاً اس طرف منتقل ہوا کہ جو اللہ اس بات پر قادر ہے کہ بلا اسباب ظاہری ہر روز تازہ تازہ پھل حجرے میں پہنچا دے وہ یقیناً اس پر بھی قادر ہے کہ میری اس آخری عمر میں مجھکو اولاد سے سرفراز کر دے۔

حقیقت یہ ہے کہ دُعا کرنے والے کی نظر اس عالم اسباب میں بھی اسباب و وسائل سے کہیں زیادہ مسبب الاسباب پر ہو تو درِ اجابت فوری کھُل جاتا ہے۔ سیدنا زکریا علیہ السلام کو دوسرے لمحے فرشتوں نے عظیم الصفات بیٹے کی بشارت دی۔

اولاد کی خواہش ایک فطری خواہش ہے زہد و قناعت تو کیا کمالِ زہد کے بھی خلاف نہیں، قرآن حکیم نے پیغمبروں کی زبان سے اس قسم کی دعائیں اور پکار نقل کر کے یہ حقیقت ظاہر کر دی کہ انبیاء و رسل جو زہد و قناعت کے مینار ہوتے ہیں ازدواجی زندگی سے دور نہیں رہے۔

اسلام میں اولاد کی خواہش کو فطری خواہش قرار دیا گیا ہے۔ البتہ یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیئے حضرت زکریا علیہ السلام صرف اولاد ہی نہیں چاہتے تھے اولادِ صالح چاہتے تھے جو ان کے بعد انکی دعوت و تبلیغ کو جاری رکھے اس لئے اپنی دعا میں ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً (نیک اولاد) کا اضافہ کیا۔

اللہ والوں کی نگاہ میں اخلاقی اور روحانی مقاصد بہرصورت مقدم رہتے ہیں۔ قرآن حکیم کا بھی یہی منشا ہے کہ

ازدواجی تعلقات صرف قضائے حاجت کا ذریعہ نہ بنے بلکہ ایک بامقصد زندگی کا ذریعہ ہونا چاہیئے۔ (بقرہ آیت ۲۲۳)

تذکرہ

اَصحابُ الجنّہ (باغ والے)

باغ والے سورۂ القلم میں قریش مکہ کی نافرمانیوں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے والوں میں خصوصیت کے ساتھ انہی کے ایک سردار ولید بن مغیرہ کی بداعمالیوں کا تذکرہ موجود ہے۔ اس ضمن میں گزشتہ اقوام سے ایک واقعہ "اُصحابُ الجنہ" باغ والوں کا بیان کیا گیا ہے کہ اُن لوگوں نے اپنی قوت وشوکت پر اتراتے اور گھمنڈ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا حق ادا نہ کیا جسکی پاداش میں اُن سے نعمتیں چھین لی گئیں اور انھیں ابدی ذلت وخسران کے سوا کچھ نہ ملا۔ اُن کے اندر جو شخص سب سے بہتر تھا اُسکی نصیحت بروقت نہ مانی گئی۔ آخر ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب ان کا سب کچھ برباد ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ بیان کر کے اہل مکہ کو متنبہ کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تم بھی تقریباً اُسی آزمائش میں پڑ گئے ہو جس میں وہ باغ والے پڑے تھے لہٰذا اگر تم نے اپنے اِن نبی کی بات نہ مانی تو دنیا کے علاوہ آخرت کے عذاب کا بھی مزہ چکھو گے۔

سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ یمن کی ایک بستی ہروان میں پیش آیا جو شہر صنعار سے چھ میل پر واقع تھی۔ اہل کتاب میں سے ایک شخص بہت مالدار، صاحبِ املاک اور نیک اور سخاوت پسند تھا۔ اپنی زمین اور باغات کی پیداوار میں سے فقرار ومساکین پر کافی خرچ کرتا تھا بلکہ فصل کا کچھ حصہ فقرار کے لئے مختص کر دیا تھا (یہی وجہ تھی کہ جب اسکی کھیتی کٹنے یا پھل توڑنے کا وقت آتا تو بہت سے فقرار اور مساکین جمع ہو جاتے تھے)

اس نیک مرد کا جب انتقال ہوا تو اسکے تین بیٹے باغ اور زمین کے وارث ہوئے اُنھوں نے آپسمیں گفتگو کی کہ اب ہمارا کنبہ بڑا ہو گیا ہے اور پیداوار ان کی ضرورت سے کم ہے اسلئے اب اِن فقرار کے لئے اتنا غلّہ اور پھل چھوڑ دینا مناسب نہیں۔ ہمارا باپ تو ایک ناعاقبت اندیش

آدمی تھا اپنی کثیر دولت کو فقراء میں تقسیم کر کے ہمارے لئے کوئی ذخیرہ نہیں چھوڑا۔ اگر ہم بھی یہی حرکت کریں تو ہماری اولاد ہم سے زیادہ مفلس اور پریشان حال ہوجائیگی۔ لہٰذا فقراء کو روکنے کے لئے یہ ترکیب کی جائے کہ پھل توڑنے اور کھیتی کاٹنے کا اعلان نہ کیا جائے اور جس روز کاٹنا ہو صبح سویرے اندھیرے میں اس کام سے فراغت کر لیں تاکہ فقراء کو معلوم نہ ہو اور ہم اسطرح پورا غلہ جمع کر لیں۔ اور آپس میں حلف و قسم کر کے یہ عہد کیا کہ آج سویرے جا کر کھیتی کاٹ لینگے اور اپنے اس منصوبے پر انھیں اتنا یقین تھا کہ انشاء اللہ کہنے کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ کے معنی عدم استثناء کے ہیں یعنی انھوں نے یہ طے کر لیا کہ فقراء کا کوئی حصہ مستثنیٰ نہیں ہوگا اور بعض مفسرین نے عدم استثناء کے معنی انشاء اللہ نہ کہنا مراد لیا ہے۔

ادھر انھوں نے یہ فیصلہ کیا دوسری طرف اللہ تعالےٰ نے اس باغ کی بربادی کا فیصلہ فرمادیا۔ بعض روایات میں صراحت ہے کہ رات کو ایک گرم ہوا چلادی گئی جس نے تمام باغ کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ صبح سویرے جلدی جلدی اس طرح وہاں گئے جیسے کہ وہ پھل توڑنے پر قادر ہیں مگر جب باغ دیکھا تو کہنے لگا ہم راستہ بھول گئے ہیں نہیں بلکہ ہم محروم رہ گئے ہیں۔ یعنی پہلے تو انھیں اپنا باغ دیکھ کر یقین نہ آیا کہ یہ انہی کا باغ ہے کہنے لگے شاید ہم راستہ بھول کر کسی اور جگہ نکل آئے ہیں۔ پھر جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ان کا اپنا ہی باغ ہے تو چیخ اُٹھے کہ اے افسوس ہماری قسمت ہی پھوٹ گئی ہے۔ اُن میں ایک بھلا انسان بھی تھا اُس نے ان لوگوں کو آگاہ کیا کہ تم اللہ تعالیٰ کو بھول گئے تھے اِنشاء اللہ کیوں نہیں کہا اسپر سب پکار اُٹھے پاک ہے ہمارا پروردگار واقعی ہم ہی اپنے پر ظلم کرنے والے ہیں۔ آخرکار ہر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگا اور افسوس کرنے لگا۔

مکہ کے بڑے بڑے سردار مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ہم کو یہ نعمتیں جو دنیا میں مل رہی ہیں یہ اللہ کے ہاں ہمارے مقبول ہونے کی علامت ہیں اور تم لوگ جس بدحالی و تنگ معاشی میں مبتلا ہو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم اللہ کے مغضوب بندے ہو۔ اس کا جواب اِن آیات میں دیا گیا۔

قرآنی مضمون

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ۔ الخ (القلم آیات ۱۷ تا ۳۳)

بلاشبہ ہم نے ان (کفار مکہ) کو اسی طرح آزمائش میں ڈال دیا
جس طرح باغ والوں کو آزمایا جبکہ انھوں نے یہ قسم کھائی کہ ہم صبح ہوتے ہی
ان پھلوں کو کاٹ لیں گے اور وہ انشاء اللہ بھی نہ کہتے تھے پس ابھی وہ
سو ہی رہے تھے کہ اُن کے باغ پر تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بلا
پھر گئی (یعنی عذاب الٰہی سے وہ باغ برباد ہوگیا) پس صبح کو ایسا ہوگیا گویا
جڑ سے کاٹ کر پھینک دیا گیا ہو۔

پھر جب صبح ہوئی تو انھوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ اگر
کھیتی کاٹنا چاہتے ہو تو سویرے چلے چلو اور وہ چلتے ہوئے آپس میں
چپکے چپکے باتیں کرتے جاتے تھے کہ جلدی کرو ایسا نہ ہو کہ کاٹتے وقت تم کو
فقیر آگھیر لیں اور وہ اپنے بخل کی وجہ سے بہت سویرے کھیت پر پہونچے اندازہ
لگاکر کہ اس وقت تک فقیر نہ پہنچ سکیں گے پس جب اُس باغ کو اس حال
میں دیکھا تو کہنے لگے یقیناً ہم راہ بھول گئے ہیں (یہ وہ مقام نہیں ہے مگر
ہم باغ کے نفع سے محروم رہ گئے ہیں۔

اِن میں سے ایک بھلے آدمی نے کہا: کیا میں نے تم سے پہلے ہی
نہیں کہا تھا کہ (اس نعمت الٰہی پر) کیوں اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان نہیں کرتے
(اب انجام بد دیکھ کر) کہنے لگے ہمارے پروردگار کے لئے پاکی ہے بیشک
ہم نے خود ہی اپنے نفس پر ظلم کیا ہے۔

پھر آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے (یہ کہ تو نے ہی
ہم کو پہلے سے کیوں نہ سمجھایا)

اور کہنے لگے ہائے بدقسمتی بلاشبہ ہم سرکش تھے جلد توقع
ہے کہ ہمارا پروردگار ہم کو اس سے بہتر بدل عطا فرمائے۔ بلاشبہ اب
ہم اپنے پروردگار ہی کی جانب متوجہ ہیں۔ (اے مکہ والو) خدا کا عذاب
اس طرح اچانک آجاتا ہے اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی ہولناک ہے
کاش کہ وہ جان لیتے۔

نتائج و عبر

عبرت ہی عبرت جو لوگ قرآن حکیم کی عطا کردہ تعلیمات حقوق اللہ اور حق العباد سے گریز کرکے اپنی قوت وشوکت پر اتراتے اور گھمنڈ کرتے ہیں اُن کا انجام وہی ہونے والا ہے جو "باغ والوں" کا ہوا اور یہ اس لئے کہ اوّل اللہ تعالیٰ کی جانب سے قانون اِمہال (مہلت دینے کا خدائی قانون) متکبّروں کو ڈھیل دیتا اور اصلاح حال کے لئے موقعہ عطا کرتا ہے مگر جب کوئی قوم اس قانون سے فائدہ نہیں اُٹھاتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی اس مہلت کو اپنی باطل پرستی کے لئے صداقت کی دلیل ٹھہرا کر اہل صداقت کی تحقیر وتذلیل پر آمادہ ہوجاتی ہے تو پھر اچانک "قانون گرفت" اُن کو ہلاک اور برباد کرکے دوسروں کو عبرت وبصیرت کا سامان مہیا کردیتا ہے۔ پھر اس وقت نہ حسرت کام آتی ہے نہ ندامت۔ اور اس گھڑی نہ ایمان لانا مفید ہوتا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی انقیاد واطاعت کا اعلان نجات دیتا ہے۔

حقِ معیشت اس عالم میں ایک جاندار بھی ایسا نہیں رہنا چاہئے جو حق معیشت سے محروم ہو۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ سب کو برابر برابر روزی ملے۔ وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ۔ لیکن درجاتِ معیشت کا یہ مطلب نہیں کہ اُس سے جو کچھ کمایا ہے وہ سب اس کا انفرادی حق ہے۔ بلکہ جو جس قدر زیادہ کمائے گا اُسی قدر اُسکی دولت میں اجتماعی حق زیادہ ہوگا۔ اور پھر یہ اجتماعی حق دو قسم پر تقسیم ہوجاتا ہے ایک حق اللہ دوسرا حق العباد۔ پس جو شخص اپنی دولت وثروت کو صرف انفرادی ملک سمجھتا ہے اور اسمیں حق اللہ اور حق العباد دونوں کا انکار کرتا ہے۔ اس کا انجام کبھی بھی بخیر نہیں ہوتا اور وہ کسی بھی وقت اللہ تعالےٰ کے غضب کا شکار ہوجاتا ہے جیساکہ باغ والوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

تذکرہ
مَثَلاً رَّجُلَین
(دو دوستوں کا قصہ)

دو دوستوں کا قصہ

اصحاب کہف کے واقعہ کے بعد قرآن حکیم نے زمانہ قدیم کے دو دوستوں کا ایک واقعہ بیان کیا ہے اور ساتھ ہی اس کا نتیجہ اور ثمرہ بھی مذکور ہے۔ یعنی ایک کی زندگی کامیاب رہی اور دوسرے کو ندامت وحسرت کا منہ دیکھنا پڑا۔

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ قرآن حکیم نے ان دو دوستوں کا یہ واقعہ مثال کے طور پر بیان کیا ہے یعنی زمانۂ ماضی میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا بلکہ اہل مکہ کا مسلمانوں کے ساتھ تحقیر و استہزار کا جو معاملہ تھا اسکو سامنے رکھ کر بطور تذکیر و نصیحت ایک مثال بیان کی جارہی ہے۔

لیکن ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ جمہور مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ جس طرح اصحاب کہف کا واقعہ پیش آیا ہے اسی طرح نزول قرآن سے قبل دو دوستوں کے درمیان یہ واقعہ بھی پیش آیا۔ ان میں ایک مومن تھا دوسرا کافر۔

ان دونوں واقعات کو مشرکین مکہ کی تذکیر و تنذیر کے لئے بیان کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں جسقدر بھی یہ واقعہ موجود ہے اس سے زیادہ نہ کتب احادیث میں ہے نہ سیر و تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس لئے قرآن حکیم کی وضاحت ہی اسکی اصل ہے۔

اس واقعہ سے قبل یہ ذکر ہورہا ہے کہ جو لوگ آخرت کے منکر ہیں ان کے لئے جہنم کی آگ مہیا کی گئی ہے۔ اور جو مؤمن اور مخلص ہیں اُن کے لئے ہمہ قسم کی خوش عیشیاں اور ابدی زندگی ہے۔ اسکے بعد آیات متعلقہ میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے انھیں نہ صرف آخرت کی محرومیاں ہیں بلکہ دنیا کی زندگی میں بھی

ناکامی اور نقصان سے دوچار ہوتا ہے۔ اِن کا یہ خیال کہ انھیں خوشحالی اور ہر قسم کی رفاہیت نصیب ہے۔ وہ مال و دولت کے مالک ہیں اِن کا جتھا اور خاندان بھی بڑا ہے۔ یہ سب چیزیں بہت جلد خاک میں مل جانے والی ہیں۔ اور اہل ایمان اپنی موجودہ تنگ حالی پر بددل نہ ہوں کیونکہ انکے لئے بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جس میں اُن کی بے چارگی و بے بسی، ہر قسم کی عزت و طاقت سے بدل جائیگی۔ نیز یہ کہ دنیا کی یہ خوش عیشی چڑھتی گھٹتی چھاؤں ہے جسپر کوئی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ آخرت فراموشوں کو جب کبھی کچھ شان و شوکت حاصل ہو جاتی ہے تو ہمیشہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انھیں دُنیا ہی میں جنت نصیب ہو چکی ہے اب اور کون سی جنت ہے جیسے حاصل کرنے کی وہ فکر کریں۔

چنانچہ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے دو دوستوں کا یہ واقعہ بیان کیا کہ دو دوست تھے ایک کو اللہ تعالےٰ دنیوی عیش و عشرت کے کل سامان دے رکھے تھے اور دوسرا تنگدست اور پریشان حال تھا۔ دولت مند اللہ تعالیٰ کا منکر اور متکبر قسم کا آدمی تھا۔ وہ اپنے نادار دوست سے غرور و نخوت کے ساتھ یہ کہتا تھا کہ میری یہ دولت اور حشمت پائیدار ہے کوئی طاقت نہیں کہ اسکو مجھ سے چھین لے اور قیامت کے بارے میں سمجھتا ہوں کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی گیا تو یقیناً اس سے کہیں شاندار زندگی پاؤں گا۔

اُسکے مؤمن دوست نے اُسکو تنبیہ کرتے ہوئے جواب دیا:۔

"تُو اپنی دولت کے نشہ میں اس درجہ مغرور نہ ہو کون جانتا ہے کہ لمحوں میں کیا سے کیا ہو جائے۔ تیرا یہ تکبر اور فخر کرنا اور آخرت کا انکار کرنا اللہ تعالیٰ سے کفر کرنے کے مرادف ہے۔ اگر آج تجھے خوشحالی میسر ہے تو اس غرے میں نہ رہے کہ یہ حالت لازوال ہے جس ذات کے حکم سے یہ جو کچھ ملا ہے اُسی کے حکم سے سب کچھ چھن بھی سکتا ہے۔"

آخر کار یہی ہوا کہ اس کے وہ تمام باغ جن کی شادابیوں پر اُسکو زعم تھا ایک آسمانی عذاب کے گھیرے میں آگئے اور وہ ہاتھ مل مل کر افسوس کرنے لگا۔

ایک روایت میں ہے کہ رات کو ایک گرم ہوا چلی اور اُس سے اس کا سارا باغ جلکر خاک ہو گیا۔

اِن دُو دوستوں کا یہ واقعہ سورۂ کہف میں اسطرح مذکور ہے :۔

قرآنی مضمون وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ الخ.

(کہف آیات ۳۲ تا ۴۴)

اور اے نبی لوگوں کو ایک مثال سنا دو، دُو آدمی تھے اِن میں سے ایک کے لئے ہم نے انگور کے دُو باغ مہیا کر دیئے تھے اور اطراف کھجور کے درختوں کا احاطہ تھا اور بیچ کی زمین میں کھیتی تھی۔

پس ایسا ہوا کہ دونوں باغ پھلوں سے لَد گئے اور پیداوار میں کسی طرح کی کمی نہ ہوئی اور ہم نے اُن کے درمیان (آب پاشی کے لئے) ایک نہر جاری کر دی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آدمی دولتمند ہوگیا، تب ایک دن گھمنڈ میں آکر اپنے دوست سے (جس کو خوشحالی میسر نہ تھی) باتیں کرتے کرتے بول پڑا دیکھو میں تم سے زیادہ مالدار ہوں اور میرا جتھا بھی بڑا طاقتور جتھا ہے۔

پھر وہ (یہ باتیں کرتے کرتے) اپنے باغ میں گیا اور وہ اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر رہا تھا کہنے لگا میں نہیں سمجھتا کہ ایسا شاداب باغ کبھی ویران ہوسکتا ہے، اور مجھے یہ بھی توقع نہیں کہ قیامت برپا ہوگی۔ اور اگر ایسا ہوا بھی کہ میں اپنے رب کی طرف لوٹایا گیا تو (میرے لئے کیا اندیشہ ہے)، مجھے وہاں ضرور اس سے بہتر ٹھکانہ ملے گا۔

یہ سُنکر اُس کے دوست نے کہا اور باہم گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کیا تو اُس ہستی کا انکار کرتا ہے جس نے تجھکو پہلے مٹی سے اور پھر نطفہ سے پیدا کیا اور پھر آدمی بنا کر نمودار کر دیا۔

لیکن میں تو یقین رکھتا ہوں کہ وہی اللہ میرا پروردگار ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔

اور جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا اُس وقت تیری زبان سے

یہ کیوں نہ نکلا کہ مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ اگر تو مجھے مال واولاد میں اپنے سے کمتر پا رہا ہے تو بعید نہیں کہ میرا رب مجھے تیرے باغ سے بہتر عطا کردے اور تیرے باغ پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس سے وہ صاف میدان بن کر رہ جائے۔ یا اس کا پانی زمین میں اُتر جائے اور پھر تو اسے کسی طرح نہ نکال سکے۔

آخر کار ہوا یہ کہ اس کا سارا ثمر مارا گیا اور وہ ہاتھ مل مل کر افسوس کرنے لگا کہ اِن باغوں کی درستگی پر میں نے کیا کچھ خرچ کیا تھا (وہ سب برباد ہوگیا) اور باغوں کا یہ حال ہوا کہ ٹٹیاں گر کے زمین کے برابر ہوگئیں اور وہ کہنے لگا کہ اے کاش میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا۔ نہ ہوا اللہ کو چھوڑ کر اُس کے پاس کوئی جتھا کہ اُسکی مدد کرتا، اور نہ کرسکا وہ آپ ہی اس آفت کا مقابلہ۔

یہاں سے معلوم ہوگیا کہ فی الحقیقت سارا اختیار اللہ ہی کے لئے ہے۔ وہی ہے جو بہتر ثواب دینے والا ہے اور اُسی کے ہاتھ بہتر انجام ہے۔

نتائج وعبر

تذکیر اور تنبیہ

واقعہ مذکورہ جس مقصد کے لئے بیان کیا گیا ہے اسکے پیش نظر مشرکینِ مکّہ اور مسلمانوں کے باہمی تقابل کا نہایت ہی جامع اور کامل نقشہ ہے۔ قریشِ مکّہ کے غرور و نخوت کا یہ حال تھا کہ پہلے تو وہ پیغامِ ہدایت پر توجہ ہی نکرتے تھے اور اگر کبھی سُننے پر آمادہ ہوتے تو یہ شرط لگاتے کہ جب تک ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بیٹھیں اُس وقت اِن خستہ حال مسلمانوں میں سے کوئی ہمارے برابر آکر نہ بیٹھے کیونکہ ان کے ساتھ بیٹھنا ہماری توہین ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہماری یہ دولت وحشمت غیر فانی ہے اور ہمارا یہ کرّوفر ابدی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو تنگدست دیکھ کر ان کا مذاق اُڑاتے اور اُنھیں حقیر و ذلیل سمجھتے تھے۔ قرآن حکیم نے اپنے معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ

مسلمانوں کے حق میں ایسے ناساز گار حالات میں اُن کی کامیابی اور مشرکین کی ناکامی کی خبر دی ہے جو کچھ عرصہ بعد ہونے والی تھی۔ چنانچہ بدر کی فتح اور مکہ مکرمہ کا اقتدار کفارِ مکہ کے لئے دائمی ذلت کا باعث ہو گیا۔

اعترافِ نعمت مومن کی یہ شان ہے اگر اللہ تعالیٰ اسکو دنیا کی نعمتوں سے نوازتا ہے تو غرور و تکبر کے بجائے درگاہِ الٰہی میں سر جھکا کر اعترافِ نعمت کرتا ہے اور دل و زبان سے یہ اقرار کرتا ہے کہ الٰہی اگر تو یہ عطا نہ کرتا تو اسکا حصول میری اپنی قوت و طاقت سے باہر تھا۔ یہ سب تیرے ہی عطا و نوال کا حصہ ہے۔ مومن دوست نے اپنے کافر ساتھی سے اسی حقیقت کو دُہرایا تھا۔ وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ تو نے اپنے باغ میں داخل ہوتے وقت یہ کیوں نہ کہا مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ جنت کے پوشیدہ خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔

یعنی بندہ اعتراف کرے کہ بھلائی کرنے کی طاقت اور بُرائی سے بچنے کی قوت اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ جو شخص اس حقیقت کو اپنے قلب میں جاگزیں کرلے اُس نے جنت کے پوشیدہ خزانوں کی کنجی حاصل کرلی۔

تذکرہ
اَصْحَابُ القَرْیَۃِ
(بستی والے)

اَصْحَابُ القَرْیَہ اور قرآن حکیم

قرآن حکیم میں ایک مختصر واقعہ "بستی والوں" کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ گزشتہ زمانہ میں ایک بستی میں کفر و شرک کو دور کرنے اور رُشد و ہدایت کا سبق دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو پیغمبر مامور کئے۔ اُنھوں نے اہل بستی کو حق کی تلقین کی اور صراط مستقیم کی جانب دعوت دی لیکن بستی والوں نے اِن دونوں پیغمبروں کو جھٹلایا اس پر اللہ تعالیٰ نے ایک ہادی کا اور اضافہ کیا۔ یہ تینوں ملکر ایک جماعت ہو گئے پھر انھوں نے بستی والوں کو یقین دلایا کہ بلاشبہ وہ سب اللہ تعالےٰ کے فرستادہ ہیں مگر اہل بستی نے ان سب کا بھی انکار کیا اور مذاق اُڑایا کہ تم بھی آدمی (بشر) ہو اور ہم بھی آدمی (بشر) ہیں۔ پھر تمہارے اندر وہ کونسی عجیب بات ہے کہ تم پیغمبر بنا دیئے گئے ہو۔ یہ سب تمہاری جھوٹ اور سازش ہے۔ اس پر اُن تینوں نے اللہ تعالیٰ کے نام پر حلف لیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ اس کا شاہد ہے ہم جھوٹے نہیں وہ دانا و بینا اسکو خوب جانتا ہے مگر پھر بھی تم نہیں مانتے تو ہمارا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام تم تک پہنچا دیں اور حق کی راہ دکھا دیں۔ بستی والوں نے کہا کہ ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں کہ تم نے خواہ مخواہ ہمارے ہاں آکر انتشار پیدا کر دیا ہے اگر تم لوگ اس سے باز نہ آئے تو ہم تم تینوں کو ہلاک کر دیں گے یا سخت تکلیف میں مبتلا کر دیں گے۔ پیغمبروں نے جواب دیا اللہ کی نافرمانی کر کے نحوست تو تم خود اپنے اوپر لاد چکے ہو اس سے زیادہ نحوست اور کیا ہو سکتی ہے کہ تم نصیحت اور خیر خواہی تک کو قبول نہیں کرتے بلکہ حد سے گزر جاتے ہو۔ یہ تمہاری انتہائی نادانی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور ہماری خیر خواہی قبول کرو۔ اُسی بستی کے آخری کنارے پر ایک نیک مرد رہتا تھا اُس نے جب سُنا کہ بستی والوں نے

اللہ کے رسولوں کا انکار کر دیا ہے اور اُنکو جھوٹا قرار دیا ہے اور طرح طرح کی دھمکیاں دے رہے ہیں تو عجلت کے ساتھ وہاں پہنچا اور کہنے لگا:۔

"اے قوم اللہ تعالےٰ کے پیغمبروں کی پیروی کرو، ایسے نیک لوگوں کی پیروی سے کیوں منہ موڑتے ہو جو تم سے اس خدمت کا کوئی معاوضہ تک طلب نہیں کرتے اور خود نہایت نیک اور بزرگ ہیں۔ آخر تم ہی بتاؤ کہ میں کیوں نہ صرف اللہ واحد کی پرستش کروں جس نے مجھ کو عدم سے وجود میں لایا اور مرنے کے بعد ہم سب کو اُسی کی جانب لوٹ جانا بھی ہے۔

تم لوگ جو اِن برگزیدہ انسانوں کی تکذیب کر رہے ہو تو میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا مجھ کو اللہ واحد کے سوا معبودانِ باطل کو اپنے لئے اِلٰہ تجویز کر لینا چاہیئے؟ وہ ذاتِ واحد جو نہایت ہی مہربان اور کریم ہے اگر مجھے کسی قسم کا نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے تو اِن معبودانِ باطل کی نہ سفارش مفید ہو سکتی ہے نہ وہ اس نقصان سے مجھے بچا سکیں گے۔ ایسی صورت میں بلاشبہ میں سخت گمراہی میں پھنس جاؤں گا۔ لہٰذا کان کھول کر سُن لو کہ میں تو اُس ذاتِ واحد پر ایمان لے آیا جو میرا اور تمہارا بھی پروردگار ہے۔"

قوم جب اس مردِ نیک کی باتیں سُن چکی تو غیض وغضب میں آگئی اور اُسکو شہید کر دیا۔
واقعہ کا اس حد تک بیان کرنے کے بعد اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا:۔

"ہم نے جرأتِ حق کی جزا میں اُس مردِ مجاہد کو جنت عطا کی اور جب اُس نے اپنا باعزت مقام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو وجد آفریں انداز میں کہنے لگا:۔

"اے کاش میری قوم کے لوگ یہ جان سکتے کہ میرے پروردگار نے مجھ کو مغفرت کا کیسا بیش بہا تحفہ عطا فرمایا اور میرا کس درجہ اعزاز و اکرام کیا ہے۔"

اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

اس مردِ نیک کی قوم کے افراد کو ان کی بدکرداری پر ہلاک کرنے یا عذاب دینے کے لئے ہمیں کسی لشکر بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی فقط ایک

ہولناک چیخ نے ان سب کا کام تمام کر دیا اور وہ جہاں کہیں تھے وہیں ڈھیر ہو کر رہ گئے۔"

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان ظالموں نے اللہ تعالےٰ کے اُن تینوں رسولوں کو بھی شہید کر دیا جیسا کہ انھوں نے دھمکی میں کہا تھا اگرچہ قرآن حکیم میں یہ صراحت نہیں ملتی مگر اُس مرد شہید کے ذکر کے بعد چونکہ ان رسولوں کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا اس لئے قرینہ یہی شہادت دیتا ہے۔

اصحاب القریہ کا یہ واقعہ قرآن حکیم میں اس طرح موجود ہے :-

قرآنی مضمون وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا أَصْحَابَ الْقَرْيَةِ إِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿۱۳﴾ (یٰسین آیات ۱۳ تا ۲۲)

اور اے نبی آپ ان کفار مکہ سے ایک بستی والوں کا قصہ بیان کیجئے جبکہ اُس بستی میں کئی رسول آئے۔ جبکہ ہم نے اُن کے پاس پہلے دو کو بھیجا سو اُن لوگوں نے دونوں کو جھوٹا قرار دیا۔ پھر تیسرے رسول سے اُن دونوں کی تائید کی (یعنی تائید کے لئے پھر تیسرے رسول کو وہاں جانے کا حکم دیا) سو اُن تینوں نے ان بستی والوں سے کہا کہ ہم تمہارے پاس اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں (تاکہ تم کو ہدایت کریں کہ توحید اختیار کرو اور بت پرستی چھوڑ دو)

اُن لوگوں نے کہا تم تو ہماری طرح بشر ہو (تم کو رسول ہونے کا امتیاز نہیں) اور اللہ رحمٰن نے تو کوئی چیز آسمان سے نازل ہی نہیں کی ہے تم لوگ خالص جھوٹ بولتے ہو۔

اُن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خوب جاننے والا ہے کہ بلاشبہ ہم تمہارے پاس بطور رسول بھیجے گئے ہیں۔

اور ہمارے ذمہ تو صرف واضح طور پر حکم کا پہنچا دینا ہے۔

وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم تم کو منحوس سمجھتے ہیں (یہ اس لئے کہا کہ اس وقت ملک پر قحط پڑا ہوا تھا) اگر تم اپنے اس دعویٰ سے باز نہ آئے تو یاد رکھو ہم سنگساری سے تمہارا کام تمام کر دیں گے اور تم کو ہماری

طرف سے سخت تکلیف پہونچے گی۔

اُن رسولوں نے کہا کہ تمہاری نحوست تو تمہارے ساتھ ہی لگی ہوئی ہے کیا اسکو نحوست سمجھتے ہو کہ تم کو نصیحت کی جائے بلکہ تم لوگ خود حد سے نکل جانے والے ہو۔

(اس گفتگو کی جب شہرت ہوئی تو) ایک شخص جو مسلمان تھا اُس شہر کے کسی دور مقام سے دوڑتا ہوا آیا (اور اُن لوگوں سے کہنے لگا) اے میری قوم اِن رسولوں کی راہ چلو ضرور ایسے لوگوں کی راہ پر چلو جو تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتے اور وہ خود راہِ راست پر بھی ہیں۔

اور میرے پاس کونسا عذر ہے کہ میں اُس معبود کی عبادت نہ کروں جس نے مجھ کو پیدا کیا اور تم سب کو اُسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

کیا میں اللہ کو چھوڑ کر ایسے ایسے معبود قرار دے لوں کہ اگر اللہ رحمٰن مجھکو کچھ تکلیف پہنچانا چاہے تو نہ ان معبودوں کی سفارش میرے کچھ کام آئے اور نہ وہ مجھکو چھڑا سکیں۔ اگر میں ایسا کروں تو صریح گمراہی میں جا پڑا۔ میں تو تمہارے پروردگار پر ایمان لاچکا سو تم بھی میری بات سن لو۔

(مگر اُن لوگوں پر اس وعظ کا کچھ اثر نہ ہوا بلکہ انھوں نے اس مردِ نیک کو پتھروں سے مار مار کر ہلاک کر ڈالا پھر اُس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے) ارشاد ہوا کہ جا جنت میں داخل ہو جا کہنے لگا کہ کاش میری قوم کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ میرے پروردگار نے مجھ کو بخش دیا اور مجھ کو عزت داروں میں شامل کر دیا۔ اور ہم نے اُس شہید کی قوم پر اسکے بعد کوئی لشکر (فرشتوں کا) آسمان سے نہیں اُتارا اور نہ ہم کو اُتارنے کی ضرورت تھی۔

(بلکہ) وہ سزا ایک سخت آواز تھی اور وہ سب اُسی دم اُس سے بُجھ کر یعنی مر کر رہ گئے۔

افسوس (ایسے) بندوں کے حال پر کبھی اُن کے پاس کوئی رسول نہیں آیا جسکی انھوں نے ہنسی نہ اُڑائی ہو۔ کیا اِن لوگوں نے اسپر نظر نہیں کی کہ ہم اِن سے پہلے بہت سی امتیں غارت کر چکے ہیں کہ وہ اِن کی طرف

لوٹ کر نہیں آتے۔

اور اِن سب میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اجتماعی طور پر ہمارے روبرو حاضر نہ کیا جائے۔

واقعہ کی دیگر تفصیلات قرآن حکیم نے اپنے مقصد تذکیر کے پیش نظر جسقدر بیان کیا ہے وہ ایک صاحبِ بصیرت کے لئے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس وسیع زمین پر حق و باطل کے جہاں سینکڑوں واقعات گزرے ہیں اور اس پیرِ فلک نے اس سلسلہ میں جتنے ورق بھی اُلٹے ہیں اِن میں ایک یہ واقعہ بھی اسی آسمان کے نیچے اور اسی زمین پر گزرا ہے۔ بستی کی تعین، مردِ صالح کا نام، مقدس رسولوں کے اسمارِ گرامی معلوم ہوں یا نہ ہوں نفس واقعہ پر اِن باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ واقعہ کا حاصل یہی تو ہے کہ چند مقدس پیغمبروں نے ایک بے راہ رو مخلوق کو سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کی اور اُس نے ازراہِ عناد وگمراہی اِن کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ ایسے ہادیوں کو قتل کر دینے سے بھی باز نہ آئے۔

ابن اسحاق نے بروایت کعب احبارؒ اور وہب بن منبہؒ اور عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ واقعہ شہر انطاکیہ (ملک شام) کا ہے۔ اس شہر کے لوگ بُت پرست تھے اور اِن کے بادشاہ کا نام انطخیس تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اِن کی ہدایت کے لئے تین پیغمبروں صادق، صدوق، شلوم (علیہم السلام) نامی بھیجے تھے[۱] اور شہر کے کنارے عبادت میں مشغول رہتا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ریشمی یا سوتی کپڑا بُننے کا کام کرتا تھا اور صاحبِ صدقات وخیرات تھا۔ اور یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے کا ہے۔

قتادہؒ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا ہے اور شہر انطاکیہ ہی کا واقعہ ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے تین حواری شمعون، یوحنا، پولس کو وہاں بھیجا تھا کہ جاکر اُن لوگوں کو حق کی دعوت دیں اور پیغامِ الٰہی سنائیں مگر اہل شہر نے اُنھیں قبول نہ کیا اور اُن کی بستی کے ایک مرد نیک نے جب اُن کی دعوت کو قبول کیا اور ترغیب دی تو اُنھوں نے اُسکو قتل کر ڈالا اور پیروں سے کچل کر اُس کی نعش کی توہین کی۔ اس شخص کا نام حبیب نجار تھا یہ بڑھی کا کام کرتے تھے۔

---

[۱] اور شہر کے آخری حصے سے جو مردِ صالح اُنکی تائید کیلئے آیا تھا اسکا نام حبیب تھا۔ یہ عابد و زاہد انسان تھا۔

تب اللہ تعالیٰ نے اس بستی پر چیخ کا عذاب مسلط کر دیا۔ کہتے ہیں کہ جبرئیل امین نے ایسی ہولناک چیخ ماری کہ شہر والے اسکو سُنکر جس حالت میں تھے اُسی حالت میں مُردہ ہوگئے۔

تنقید و تبصرہ

ابن اسحاق کی یہ روایت اسرائیلیات میں شمار کی جاتی ہے اسکی مکمل و مستند سند کا بھی پتہ نہیں۔ خود ابن اسحاق بَلَغَنِیْ یعنی مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہہ کر بیان کرتے ہیں۔ مشہور محدّث اور مؤرخ حافظ ابن کثیرؒ نے پہلے اور دوسرے واقعہ پر تو یہ مشترک اعتراض کیا ہے کہ شہر انطاکیہ اُن چار مسیحی شہروں میں سے ایک ہے جن کے متعلق یہ ثابت ہے کہ وہ دعوتِ مسیح کے مراکز شمار کئے جاتے ہیں اسلئے باختلاف زمانہ ان شہروں میں جس وقت دعوتِ مسیح پہنچی ہے انھوں نے برضا و رغبت اس پر لبیک کہا ہے اور وہ مسیحی پیغام کے لئے معاون ثابت ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ مسیحیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ چار مقامات "مقدس" ہیں۔ القدس، انطاکیہ، اسکندریہ، روما۔

القدس (بیت المقدس) اس لئے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وطن ہے۔

انطاکیہ۔ اس لئے کہ یہ پہلا شہر ہے جس کی کل آبادی بیک وقت حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لائی تھی۔

اسکندریہ۔ یہ اس لئے کہ یہ پہلا شہر ہے جسکے باشندوں نے صلح و آشتی کے ساتھ یہ منظور کیا کہ مسیحی مقدسین پوپ، مطران، اسقف، قسّیس، شمّاس، راہب (پادریوں کے اعلیٰ مناصب و عہدے) اپنے اپنے اختیارات کے ساتھ یہاں قیام کریں گے۔

روما (اٹلی)، اس لئے کہ قسطنطین اعظم کا دار السلطنت تھا جس نے عیسائی مذہب کو نئے سانچے میں ڈھال کر فروغ دیا اور دعوتِ مسیحؑ سے قبل بھی کسی تاریخی شہادت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ انطاکیہ کسی زمانہ میں غضب الٰہی سے برباد و تباہ کر دیا گیا تھا اور بعد میں پھر بارونق شہر بن گیا۔

لہٰذا ہر دو اقوال کے مطابق اس واقعہ کو شہر انطاکیہ سے وابستہ کرنا بعید معلوم ہوتا ہے اور قتادہؒ کی روایت پر مذکورہ بالا اعتراض کے علاوہ دوسرا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کا ظاہر سیاق یہ بتا رہا ہے کہ معذّب بستی کی ہدایت کے لئے جو برگزیدہ انسان بھیجے گئے تھے وہ حضرت مسیح علیہ السلام یا کسی دوسرے نبی کے فرستادہ نہ تھے بلکہ براہِ راست

اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اور نبی تھے۔ اس لئے کہ اگر وہ حضرات حضرت مسیح علیہ السّلام کے فرستادہ ہوتے تو قرآن حکیم کا کوئی اشارہ اس جانب ہوتا مگر ایسا نہیں ہے بلکہ تمام آیات میں ان حضرات کے لئے اَرْسَلْنَا (ہم نے اُن کو بھیجا) استعمال کیا گیا ہے۔

اسی طرح فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ (ہم نے قوت دی دونوں کو تیسرے کے ذریعہ)

فَقَالُوْآ اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ (بلاشبہ ہم تمہاری جانب بھیجے گئے ہیں)

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (انھوں نے کہا کہ تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے بشر)

یہ اعتراض جا بجا رسولوں کے حق میں کیا گیا ہے۔ بہرحال قرآن حکیم کا سیاق و سباق یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ حضرات مستقل نبی تھے کسی نبی یا رسول کے فرستادہ نہ تھے۔

طبرانی نے معجم میں ایک روایت حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

تین ہستیاں ہیں جو انبیاء کرام کی نقیب کہلاتی ہیں۔ ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نقیب یوشع علیہ السّلام، دوسرے اصحاب یٰسین (اصحاب القریہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نقیب۔ تیسرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقیب حضرت علی رضؓ۔

اس حدیث سے مفہوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں سے ہی وابستہ ہے۔ مگر محدثین کے نزدیک یہ حدیث ضعیف بلکہ ناقابل اعتماد ہے۔ کیونکہ اسکی سند میں ایک راوی حسین الاشقر ہے جو متروک الحدیث ہے۔ (فتح الباری)

امام بخاری نے اگرچہ اس واقعہ سے متعلق کوئی روایت نقل نہیں کی مگر انبیاء علیہم السلام کے تذکروں میں اس واقعہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرے سے مقدم رکھا اور آیت کو نقل کر کے صرف حلِ لغات پر اکتفا کیا ہے۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ ابن کثیر اور امام بخاری کا رجحان یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے کا ہے۔

الحاصل واقعہ کی جزئی تفصیلات کچھ بھی ہوں قرآن حکیم نے اس سلسلے میں جو حصہ نقل کیا ہے وہ اسکے مقصد و منشاء کو پورا کرتا ہے اور اہل مکہ اور ارباب بصیرت کو عبرت و دعوت دیتا ہے کہ اس سے فائدہ اُٹھائیں۔

نتائج و عبر

رحمٰن عزوجل:-

اصحاب القریہ کے پاس جب رسولوں کی یہ جماعت آئی اور اُنھوں نے اپنا پیغام دیا تو بستی والوں نے یہ کہہ کر اُنھیں جھٹلا دیا کہ تم لوگ تو ہم جیسے ہی بشر ہو اور رحمٰن نے تو ہرگز تم پر کچھ بھی نازل نہیں کیا اس لئے تم لوگ جھوٹے ہو۔

اصحاب القریہ اگرچہ مشرک و بت پرست تھے مگر اِن میں حق کی کچھ جھلک موجود تھی۔ اِن کے ہاں رحمٰن کا تصور پایا جاتا تھا جو اللہ واحد کے اسماء میں خصوصیت رکھتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ وَاِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ (فاطر آیت ۲۴) کوئی قوم ایسی نہیں گزری کہ جہاں ہمارا کوئی نذیر نہ پہنچا ہو۔

وہ اس دعوت سے قبل عرصہ تک کسی پیغمبر کے پیرو رہے ہوں اور آہستہ آہستہ زمانۂ دراز کے بعد شرک میں مبتلا ہو گئے جیسا کہ اکثر آسمانی مذاہب کے پیرو اس گمراہی میں پڑ گئے ہیں۔

قدیم جاہلانہ تصوّر:-

ماضی کی اقوام میں ہمیشہ سے یہ باطل عقیدہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر انسان نہیں ہونا چاہیئے بلکہ کسی مافوق الفطرۃ ہستی کو "رسول اللہ" ہونا چاہیئے۔ اس لئے قومِ نوح سے لیکر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت تک ہر گروہ نے سب سے پہلے اسی پر تعجب کیا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہماری ہی طرح کا انسان اور لوازمات بشری کا محتاج اللہ کا پیغمبر ہو۔

چنانچہ اصحاب القریہ نے بھی رسولوں کی اس جماعت پر یہی اعتراض دُھرایا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مشرکینِ مکہ نے یہی کہا:-

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ۔ (الفرقان آیت ۷)

یہ کیسا رسول ہے کہ ہماری طرح ہی کھاتا پیتا اور ہماری طرح
بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

أَبَشَرٌ يَهْدُونَنَا (تغابن آیت ۶)

کیا بشر ہماری ہدایت کریں گے؟

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا
أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا. (بنی اسرائیل آیت ۹۴)

اور حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی اللہ کی ہدایت دنیا میں ظاہر ہوئی
تو صرف اسی بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا کہ متعجب ہو کر کہنے
لگے کیا اللہ نے ہماری طرح کا ایک بشر پیغمبر بنا کر بھیج دیا ہے۔

مگر ان جاہلانہ سوالات کا قرآن حکیم نے یہ فیصلہ کُن جواب دے کر ہمیشہ کے لئے
اس بحث کا خاتمہ کر دیا:۔

قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا
عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا (بنی اسرائیل آیت ۹۵)

اے پیغمبر کہہ دو کہ ایسا ہوتا کہ زمین میں انسانوں کی جگہ فرشتے
بسے ہوتے اور اطمینان سے چلتے پھرتے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے
ایک فرشتہ پیغمبر بنا کر اُتار دیتے۔

یعنی اس سوال کی بنیاد ہی جہالت پر مبنی ہے۔ اس لئے جب دنیا میں انسان بس رہے
ہیں اور فرشتوں کی آبادی نہیں ہے تو پھر اُن کی ہدایت کے لئے رسول اور پیغمبر کو بھی
انسان ہی ہونا چاہیئے۔ نہ کہ فرشتہ یا اور کوئی مخلوق۔ لہذا یقیناً ہر نبی و رسول بشر ہی
ہوتے ہیں۔

اندھیرے میں نُور:۔

جہاں شر و فساد اور فتنہ و گمراہی کی گرم بازاری رہتی ہے وہاں خیر و سعادت
کی بھی کوئی کرن ضرور پوشیدہ رہتی ہے اور وہ حق کی تائید کے لئے جان کی بازی
لگانے سے بھی گریز نہیں کرتی۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قیام مصر کے دوران شہر کے دور دراز حصہ سے ایک نیک مرد بھاگ کر آیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حفاظتِ جان کے لئے ایک نیک مشورہ دے کر اپنا فرض ادا کیا تھا۔ اسی طرح اصحاب القریہ کے رسولوں کی حمایت کے لئے شہر کے آخری حصے سے ایک مرد نیک نکل آیا اور اُس نے اپنی قوم کو نصیحت کی اور اس صلہ میں جامِ شہادت نوش کیا۔ اس لئے اہلِ تبلیغ کو کم ہمت نہ ہونا چاہیئے۔ ہر اندھیرے میں نور چھپا ہوا رہتا ہے۔

ایک حقیقت :۔

حق و باطل کے معرکہ میں ایک کھُلا مظاہرہ یہ ہوتا ہے کہ حق جوں جوں اپنی صداقت کو جلوہ گر کرتا جاتا ہے باطل اُسی درجہ مشتعل ہو کر دلائل کی جگہ جنگ و جدل پر آمادہ ہو جاتا ہے مگر حق کے پرستار اسکی مطلق پروا نہیں کرتے اور شوق کے ساتھ حق پہ جاں قربان کر دیتے ہیں۔ اصحاب القریہ کا یہ واقعہ اسکی ایک اور شہادت ہے۔

نبوّت کی ایک کسوٹی :۔

مذکورہ واقعہ میں شہر کے دور دراز گوشے کا ایک مرد نیک دوڑتا ہوا آکر اصحٰب القریہ کو یہ فہمائش کرتا ہے :۔

اِتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۔ (یٰسٓ آیت ۲۱)

(اے میری قوم کے لوگو) پیروی کرو اُن لوگوں کی جو تم سے کوئی صلہ نہیں چاہتے اور وہ خود بھی ٹھیک راہ پر ہیں۔

نبی کی صداقت اِن دو باتوں سے بھی جانچی جاسکتی ہے ایک اُس کا بے غرض ہونا، دوسرے اس کا قول و عمل سچا ہونا۔

اُس مرد نیک کا یہ استدلال تھا کہ یہ لوگ سراسر معقول بات کہہ رہے ہیں اور انکی اپنی سیرت بالکل بے داغ ہے۔

کوئی شخص اس بات کی نشان دہی نہیں کرسکتا کہ اس دین کی دعوت یہ اپنے کسی ذاتی مفاد کی خاطر دے رہے ہوں اسکے بعد کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اِن کی بات کیوں نہ مانی جائے؟

کمالِ خیر خواہی :۔

مردِ نیک کی خیر خواہی کو برداشت نہ کرتے ہوئے اہلِ قریہ نے اُن کو شہید کر دیا۔ جونہی وہ موت کے دروازے سے گزر کر دوسرے عالم میں پہنچے فرشتے ان کے استقبال کو موجود تھے اور انھوں نے یہ خوشخبری سنائی کہ فردوسِ بریں آپ کی منتظر ہے۔ اسکے جواب میں وہ شہید کہتا ہے :۔

يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ۔ بِمَا غَفَرَلِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ۔ (یٰسین آیت ۲۷)

اے کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ میرے رب نے کس چیز کی بدولت میری مغفرت فرمادی اور مجھے باعزت لوگوں میں داخل فرمایا۔

اس مردِ مومن کے کمالِ خیر خواہی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ جن لوگوں نے اُسے ابھی ابھی ظلماً قتل کیا تھا اُن کے خلاف کوئی غصہ یا جذبۂ انتقام اُس کے دل میں نہ تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اُن کے حق میں بددُعا کرتا۔ اسکے بجائے وہ اب بھی انکی خیر خواہی کئے جارہا ہے۔ مرنے کے بعد اسکے دل میں اگر کوئی تمنا پیدا ہوئی تو وہ بس یہ تھی کہ کاش میری قوم میرے اس انجامِ نیک سے باخبر ہوجائے اور میری زندگی سے نہیں تو میری موت ہی سے سبق لے اور راہِ راست اختیار کرلے۔ وہ نیک نفس انسان اپنے قاتلوں کے لئے بھی جہنم نہ چاہتا تھا بلکہ چاہتا تھا کہ وہ ایمان لاکر جنت کے مستحق بنیں۔ اسی شخص کی تعریف کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

نَصَحَ قَوْمَهٗ حَيًّا وَّمَيِّتًا۔ (الحدیث)

جیتے جی بھی اپنی قوم کی خیر خواہی کی اور مر کر بھی۔

اَللّٰهُمَّ ارْفَعْ دَرَجَتَهٗ۔

حیاتِ برزخی کا ثبوت :۔

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ۔ بِمَا غَفَرَلِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ۔ (یٰسین آیت ۲۷)

یہ آیت بھی اُن آیات میں سے ایک ہے جن سے حیاتِ برزخی کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد سے قیامت تک کا زمانہ "خالص عدم" یا "کامل نیستی"

کا زمانہ نہیں ہے بلکہ اس محدود زمانے میں جسم کے بغیر روح زندہ رہتی ہے کلام کرتی اور کلام سنتی ہے اور جذبات اور احساسات بھی رکھتی ہے۔ خوشی اور غم بھی محسوس کرتی ہے، اہلِ دنیا کے ساتھ تعلقِ خاطر بھی باقی رہتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو مرنے کے بعد اُس مردِ مومن کو جنت کی بشارت کیسے دی جاتی اور وہ اپنی قوم کے لئے یہ تمنا کیسے کرتا کہ کاش وہ اسکے انجامِ خیر سے باخبر ہوجائے۔

اہلِ تبلیغ کے لئے :۔

بستی والوں کی طرف جو تینؑ رسول بھیجے گئے اُنھوں نے جس طرح خطاب کیا اور اُن کی سخت و تلخ باتوں اور دھمکیوں کا جس طرح جواب دیا اسی طرح ان رسولوں کی تائید کرنے والے مسلمان حبیب نجارؓ نے اپنی قوم سے جس طرح خطاب کیا ان سب باتوں کو مکرر پڑھیے۔ اسمیں دین کی تبلیغ اور خلق کی اصلاح کرنے والوں کے لئے عظیم درس ہے۔

ان رسولوں کی مخلصانہ تبلیغ کے جواب میں بستی والے کہتے ہیں :۔

(۱) تم تو ہم جیسے ہی بشر ہو ہم تمہاری بات کیوں مانیں

(۲) اللہ رحمٰن نے تو کسی پر کوئی پیغام اور کتاب نہیں اتاری

(۳) تم خالص جھوٹ بولتے ہو۔

بے غرض ناصحانہ کلام کے جواب میں یہ اشتعال انگیز غیر مہذب گفتگو کیا جواب چاہتی ہے؟

مگر ان رسولوں نے صرف یہ جواب دیا۔

رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّا إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُونَ۔ (یٰسین آیت ۱۶)

ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم تمہاری طرف بھیجے ہوئے آئے ہیں۔

اور وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (یٰسین آیت ۱۷)

ہمارا جو کام تھا وہ کرچکے آگے تمہیں اختیار ہے مانو یا نہ مانو۔

کیسا مشفقانہ جواب ہے۔

تینؑ خوش نصیب | تاریخی روایات میں امام مجاہدؒ اور امام مقاتلؒ سے منقول ہے

کہ وہ تینؔ خوش نصیب جو بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آپ پر ایمان لائے یہ ہیں:۔

پہلے یہی مردِ نیک حبیب نجارؓ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے چھ سو سال پہلے آپؐ پر ایمان لائے تھے۔

دوسرے تبّع اکبرؒ جو آپکی بشارت کتب سابقہ میں پڑھکر آپؐ کی ولادت سے بہت پہلے آپ پر ایمان لائے۔

تیسرے ورقہ بن نوفلؓ (حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے چچازاد بھائی) جن کا ذکر صحیح بخاری کی حدیث ابتدائے وحی کے واقعات میں آیا ہے۔ جنھوں نے آپکی دعوت سے پہلے تصدیق کی اور تعاون کا وعدہ فرمایا تھا۔

نوٹ: یمن کے حمیری بادشاہوں کا لقب تبّع رہا ہے۔ جنھوں نے ایک عرصہ دراز تک یمن کے مغربی حصہ پر حکمرانی کی ہے۔ انہی میں ایک کا نام تبّع اکبر تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سات سو سال پہلے گزرا ہے۔ اور حمیری بادشاہوں میں اسکی مدّتِ سلطنت سب سے زیادہ رہی ہے۔

مسند احمد کی ایک روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے:۔

لَا تَسُبُّوْا تُبَّعًا فَاِنَّہٗ قَدْ کَانَ اَسْلَمَ۔ الحدیث

تبّع کو بُرا بھلا نہ کہو کیونکہ وہ اسلام لے آیا تھا۔

تذکرہ
سیدنا لقمان الحکیم
(رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

ذاتی تعارف لقمان الحکیم کی شہرت جیسے عرب میں پائی جاتی ہے ویسے ہی عجم میں بھی معروف ہے۔ جو شخصیات نبی یا غیر نبی ہونے کا احتمال رکھتے ہیں اُن میں حضرت لقمانؓ کا بھی نام شامل ہے۔ اِن کے خاندان اور حسب و نسب کے متعلق مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس بارے میں کہ وہ ایک بڑے دانا (حکیم) تھے کسی کا اختلاف نہیں۔ اِن کے حکیمانہ اقوال "صحیفہ لقمان" کے نام سے مشہور و معروف تھے۔

حضرت لقمان کے خاندانی حالات کا یہ اختلاف جو مؤرخین نقل کرتے ہیں اس وجہ سے ہے کہ تاریخ قدیم میں لقمان نامی ایک اور شخصیت کا پتہ چلتا ہے جو عاد ثانیہ (قوم ہود علیہ السّلام) میں ایک نیک دل بادشاہ گزرا ہے اور وہ خالص عرب نژاد تھا۔ ابن جریرؒ، ابن کثیرؒ، سہیلیؒ جیسے مؤرخین کی یہ رائے ہے کہ لقمان حکیم افریقی النسل تھے اور عرب میں ایک غلام کی حیثیت سے آئے۔ نسب نامہ اسطرح بیان کیا جاتا ہے:-

لقمان بن عنقا بن سندون (یا) لقمان بن ثار بن سندول۔

اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ سوڈان کے نوبی قبیلہ سے تھے اور پستہ قد، بھاری بدن، سیاہ رنگ، ہونٹ موٹے، ہاتھ پیر بھدے تھے مگر نہایت نیک، زاہد و عابد، صاحب حکمت آدمی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں علم و حکمت کا ذخیرہ عطا فرمایا تھا اور بعض مؤرخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ حضرت داؤد علیہ السّلام کے زمانے میں عدالت کے قاضی تھے۔

"حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے فرماتے ہیں لقمان حبشی غلام تھے اور نجاری کا پیشہ کرتے تھے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ فرماتے تھے کہ لقمان پستہ قد،

موٹے ہونٹ والے، نُوبہ کے قبیلے سے تھے۔

حضرت سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں کہ لُقمان مصری سوڈانی تھے اور اُن کے ہونٹ بہت موٹے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ ان کو نبوّت عطا نہیں کی مگر حکمت و دانائی کا بہت بڑا حصہ عطا فرمایا تھا۔

حضرت عبد الرحمٰن بن حرملہؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک حبشی حضرت سعید بن مسیبؒ کے پاس آیا اور کچھ سوال کئے تو آپ نے فرمایا اس بات سے دل گیر نہ ہونا کہ تم کالے حبشی ہو، اس لئے کہ سوڈانیوں میں تین آدمی دنیا کے بہترین انسان ہوئے ہیں:۔

بلال حبشیؓ، حضرت عمرؓ کا غلام مہجعؓ، لقمان الحکیم جو سوڈانی نُوبی تھے اور اِن کے لب بہت موٹے اور بھدّے تھے۔"

(روض الانف ج۱ تفسیر ابن کثیر ج۳، تاریخ ابن کثیر ج۲)

ان تصریحات کے برخلاف مشہور مورّخ محمد بن اسحٰقؒ کہتے ہیں کہ لقمان حکیم عرب کے مشہور قبیلہ عاد سے یعنی عرب بائدہ کی نسل سے تھے اور غلام نہ تھے بلکہ بادشاہ تھے۔

وہب بن منبہؒ کہتے ہیں کہ جب شداد بن عاد کا انتقال ہوگیا تو حکومت اسکے بھائی لقمان بن عاد کو ملی اور اللہ تعالیٰ نے لقمان کو وہ چیز عطا فرمائی تھی جو اس زمانے کے انسانوں میں کسی کو عطا نہیں کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایکسَو انسانوں کے برابر ادراک وقوتِ حاسّہ عطا فرمایا تھا اور وہ اپنے زمانہ کے لوگوں میں سب سے زیادہ طویل قامت تھے۔

جیسا کہ لکھا گیا حضرت لقمان کی شخصیت کے بارے میں بڑے اختلافات ہیں۔ دراصل زمانۂ جاہلیت کی تاریک صدیوں میں کوئی مُدوّن تاریخ توموجود نہ تھی۔ معلومات وواقعات کا انحصار منھ درمنھ روایات سے چلتا تھا جو سینکڑوں برس سے چلی آرہی تھیں اور اس معاملہ میں ان لوگوں کی ضبطِ روایات اور یادداشت بڑی مضبوط قابلِ ذکر رہی ہیں۔ چنانچہ شعراء جاہلیت امراؤالقیس لبید، اعشیٰ، طرفہ وغیرہم کے کلام میں حضرت لقمان کا تذکرہ

موجود ہے۔ انہی روایات پر اعتماد کرکے ارض القرآن کے مؤلف سید سلیمان ندویؒ نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ قوم عاد پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آنے کے بعد اس قوم کے اہل ایمان حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ نجات پائے تھے۔ انہی کی نسل میں حضرت لقمان پیدا ہوئے اور یمن میں اس قوم نے جو حکومت قائم کی تھی یہ اسکے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھے۔ اہلِ عرب میں ایک قدیم صحیفہ "صحیفۂ لقمان" کے نام سے معروف تھا جسمیں اُن کے حکیمانہ اقوال جمع تھے۔ چنانچہ تاریخی روایات میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ ہجرت سے تین سال پہلے مدینہ منورہ کا ایک شخص سوید بن صامت مکّہ مکرمہ آیا وہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عادتِ طیّبہ کے مطابق مختلف علاقوں سے آئے ہوئے زائرین کعبہ کی قیام گاہوں پر جاجا کر دعوتِ اسلام پیش کر رہے تھے۔ سوید نے جب آپکی تقریر سُنی تو کہنے لگا کہ آپ جو باتیں پیش کر رہے ہیں ایسی ہی ایک چیز میرے ہاں موجود ہے۔ آپ نے دریافت کیا کہ وہ کیا ہے؟ اُس نے صحیفۂ لقمان بتایا اور آپؐ کی خواہش پر اُس کا کچھ حصہ پڑھکر سُنایا۔ پھر اسکے بعد اُس نے اعتراف کیا کہ آپ کا کلام "صحیفہ لقمان" سے بہتر ہے۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ سوید بن صامت مدینہ میں اپنی قابلیت، بہادری، شعروسخن کی بنا پر "کامل" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے بعد جب وہ مدینہ منورہ پہنچا تو کچھ عرصہ بعد جنگ بُعاث (قبائل کی ایک باہمی جنگ) میں مقتول ہوا۔ اسکے قبیلے کے لوگوں کا خیال یہ تھا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے بعد مسلمان ہو گیا"۔ (سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۶۷، اُسد الغابہ ج ۲ ص ۳۷۸)

وہب بن منبہؒ کی ایک روایت کے مطابق حضرت لقمان حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے تھے اور مقاتلؒ نے اُن کو خالہ زاد بھائی بتایا ہے۔ تفسیر بیضاوی میں ہے کہ اُن کی عمر دراز ہوئی یہاں تک کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ پایا۔

حضرت قتادہؒ سے ایک روایت یہ بھی منقول ہے کہ حضرت لقمان حکیم سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے حکمت کو نبوت پر کیوں ترجیح دی جبکہ آپکو دونوں کا اختیار دیا گیا تھا۔

آپ نے جواب دیا کہ نبوّت بڑی ذمہ داری کا منصب ہے اگر وہ مجھے بغیر میرے اختیار کے دیا جاتا تو اللہ تعالےٰ خود اسکی کفالت فرماتے کہ میں اُسکے فرائض ادا کرسکوں اور اگر میں اپنے اختیار سے اسکو طلب کرتا ہوں تو ذمہ داری مجھ پر ہوتی۔ (ابن کثیر)

بہر حال قرآن حکیم میں اسکی صراحت موجود ہے کہ حضرت لقمان کو حکمت عطا کی گئی تھی۔ لفظ حکمت قرآن حکیم میں متعدد معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ علم، عقل، حلم و بردباری، نبوت، صحیح فیصلہ۔ ابو حیّان اندلسیؒ نے لکھا ہے کہ حکمت سے مراد وہ کلام جس سے لوگ نصیحت حاصل کریں اور اُن کے دلوں میں مؤثر ہو اور جسکو لوگ محفوظ کر کے دوسروں تک پہنچائیں۔

قرآن حکیم اور سیّدنا لقمان رضؓ

حضرت لقمان کا ذکر خیر قرآن حکیم میں موجود ہے اور اور قرآن کی ایک سورت کا نام بھی سورۂ لقمان ہے۔

قرآن حکیم نے اپنے مقصد و منشاء کے پیش نظر ان کے حسب ونسب کی بحث نہیں کی تاہم اُن کے حکیمانہ اقوال کا جس انداز سے ذکر کیا ہے اُس سے اُنکی شخصیت عام انسانوں سے ممتاز معلوم ہوتی ہے۔

مشہور مؤرخ محمد بن اسحٰق کی روایت جو حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے اسمیں ان کے بعض حکیمانہ نصائح کا صراحتاً ذکر ہے۔ کوئی ایسی مزید وضاحت نہیں ملتی جو انکی نبوت پر دلالت کرتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور مفسرین اسکے قائل نہیں بلکہ خود حضرت ابن عباسؓ کا دوسرا قول اُنکے پہلے قول کے خلاف بھی مذکور ہے۔ چنانچہ ابن کثیرؒ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:۔

والمشہور عن الجمہور انہ کان حکیما ولیا ولم یکن نبیا وقد ذکر اللہ تعالیٰ فی القرآن فاثنیٰ علیہ وحکے من کلامہ فیما وعظ بہ ولدہ الذی ھو احب الخلق الیہ۔

(تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۲۵)

جمہور کا مشہور قول یہ ہے کہ لقمان اللہ تعالیٰ کے ولی اور صاحب حکمت تھے۔ نبی نہ تھے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کا قرآن میں ذکر کیا ہے اور ان کی تعریف کی اور اُن کے کلام کو بیان کیا جس میں اُنھوں نے اپنے بیٹے کو جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں اُن کے لئے سب سے زیادہ محبوب تھا نصیحت کی ہے۔"

ان کا یہ حکیمانہ کلام قرآن حکیم میں اس طرح موجود ہے:۔

قرآنی مضمون

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلَّهِ وَمَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ۔ الخ (لقمان آیات ۱۲ تا ۱۹)

اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی کہ اللہ کا شکر ادا کرے۔ اور جو کوئی شکر کرے گا اُس کا شکر اُس کے اپنے ہی لئے مفید ہے اور جو کوئی کفر کرے گا تو حقیقت میں اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے۔ اور یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہے تھے کہ بیٹا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا حقیقتاً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

اور ہم نے تاکید کی ہے انسان کو اپنے والدین کے متعلق (کہ انکا حق پہچانے) اُسکی ماں نے اُسکو تکلیف در تکلیف جھیل کر اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اُسکے دُودھ چوٹنے میں لگے (اسی لئے ہم نے اُسکو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا میری ہی طرف تجھکو پلٹنا ہے۔

اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی کو شریک ٹھہرائے جسے تو نہیں جانتا تو اِن کی بات ہرگز نہ ماننا۔ اور دنیا میں اِن کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ اور اُس شخص کی پیروی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو میری ہی طرف پلٹنا ہے۔ پھر اُس وقت میں تمہیں بتادوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو۔

اے میرے بیٹے اگر کوئی چیز رائی کے دانہ برابر بھی کسی چٹان میں
یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو اللہ اُسے نکال لائے گا۔ بیشک وہ
باریک بین باخبر ہے۔
اے میرے بیٹے نماز قائم کر اور نیکی کا حکم کر اور بُرائی سے منع کر
اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر۔ یہ سب ہمت کے کاموں میں سے ہیں۔
اور لوگوں سے اپنا رُخ نہ پھیر اور زمین پر اترا کر نہ چل بیشک
اللہ کسی خود پسند فخر جتانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
اور اپنی چال میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز ذرا پست
رکھ۔ درحقیقت سب آوازوں سے زیادہ بُری آواز گدھوں کی ہوتی ہے۔

خلاصہ تعلیم ان آیات میں حضرت لقمان حکیمؒ نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں کیں ہیں اور جو حکمت کی باتیں بتائی ہیں اُن میں سب سے پہلے جو اہم نصیحت کی وہ شرک باللہ سے اجتناب کرنا ہے کیونکہ اسلام میں یہی وہ حقیقت ہے جو ایک مومن کو مشرک سے ممتاز کرتی ہے۔ اور شرک کو ظلم عظیم کہا گیا۔ کہ آدمی اُن مجبور ہستیوں کو اپنے خالق ورازق کے برابر لا کھڑا کرتا ہے جن کا نہ اسکے پیدا کرنے میں کوئی حصہ ہے نہ اُس کو رزق پہنچانے میں کوئی دخل۔ یہ ایسی بے انصافی ہے جس سے بڑھکر اور کسی بے انصافی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ شرک کو ایسا گناہ قرار دیا گیا ہے جسکی کسی حالت میں بخشش نہیں مگر یہ کہ وہ اس سے تائب ہو جائے۔

حضرت لقمانؒ نے شرک کو ظلم عظیم فرمایا اس سلسلے میں ایک ضمنی وضاحت بھی ضروری ہے۔

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ (آیت ۱۳، لقمان)

بخاری کی ایک روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:-

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۔ (انعام آیت ۸۲)

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے مخلوط نہیں کیا ایسوں ہی کے لئے (آخرت کا) امن ہے۔ اور یہی ہدایت یافتہ لوگ ہیں (قرآن حکیم کی اس آیت کو آیتِ امن کہا جاتا ہے۔

صحابہ کرام پر یہ بات بڑی بھاری گزری۔ عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسا تو کوئی شخص بھی نہ ہوگا جس نے اللہ کے احکام میں کچھ نہ کچھ ظلم نہ کیا ہو۔

آپ نے ارشاد فرمایا آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کیا تم نے لقمان کا یہ قول نہیں سُنا، اے میرے بیٹے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرا بلا شبہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

(لقمان آیت ۱۳)

آیتِ امن میں ظلم سے مراد شرک ہے نہ کہ گناہ یا معصیت، مطلب یہ کہ ایمان لانے کے بعد شرک سے بچتے رہے تو ان کے لئے آخرت کی نجات یقینی ہے۔

حضرت لقمان کی حکیمانہ باتوں میں سب سے پہلے شرک سے اجتناب پر زور دیا گیا اور یہ نصیحت انھوں نے اپنے بیٹے کو کی تھی۔ اور ظاہر بات ہے کہ آدمی دنیا میں سب سے بڑھکر اگر کسی کے حق میں خیر خواہ مخلص ہو سکتا ہے تو وہ اسکی اپنی ہی اولاد ہے۔ ایک شخص دوسروں کو دھوکہ دے سکتا ہے منافقانہ باتیں کر سکتا ہے لیکن اپنی اولاد کو ایک بُرا سے بُرا آدمی بھی فریب دینے کی کبھی کوشش نہیں کرتا۔ اس لئے حضرت لقمان رض کا اپنے بیٹے کو نصیحت کرنا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ شرک حقیقتاً ایک ایسا بدترین فعل ہے جس سے اجتناب کرنا اولین فرض ہے۔

شرک باللہ تمام نیکیوں کو مٹا کر انسان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے خالی ہاتھ لیجاتا ہے قرآن حکیم نے اسکی قباحت کو ایک بلیغ تمثیل سے بیان کیا ہے۔

اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا، پھر اُسے پرندے اُچک لے جائیں یا ہوا نے اُسکو کسی دُور دراز جگہ لے جاکر پٹک دیا ہو۔ (الحج آیت ۳۱)

لیکن افسوس کہ مسلمان توحید جیسی عظیم نعمت کے بعد بھی شرک کی نجاست سے آلودہ ہوجاتے ہیں اور اس سے اجتناب کا اہتمام نہیں کرتے (والی اللہ المشتکی)

نتائج وعبر

ہمہ دانی وہمہ بینی:۔

حضرت لقمان رضؓ نے اپنی نصائح میں اللہ عزوجل کی ہمہ دانی وہمہ بینی کو اس طرح بیان کیا ہے:۔

"بیٹا کوئی چیز بھی جو رائی کے دانہ کے برابر ہو خواہ وہ کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو اللہ تعالیٰ اسکو قیامت کے دن نکال لائے گا وہ نہایت باریک بین اور باخبر ہے۔"

(یعنی اللہ تعالیٰ کے علم وگرفت سے کوئی باہر نہیں، چٹان کے اندر ایک دانہ انسان کے لئے مخفی ہے لیکن اللہ تعالیٰ پر عیاں ہے۔ آسمانوں کی بلندی میں کوئی بھی ذرّہ ہم سے بعید ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے لئے وہ بہت قریب۔ زمین کے تہہ خانوں میں پڑی کوئی چیز بھی ہمارے لئے سخت تاریکی میں ہے لیکن اللہ تعالےٰ کے لئے بالکل روشنی میں ہے۔

لہٰذا انسان کہیں بھی کسی حالت میں بھی نیکی یا بدی کا کوئی کام کرے گا وہ اللہ تعالیٰ سے مخفی نہ ہوگا بلکہ جب محاسبہ کا وقت آئے گا وہ سارا کا سارا اُسکی آنکھوں کے سامنے ہوگا۔

وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا۔ (کہف آیت ۴۹)

اور جو کچھ انھوں نے دنیا میں کیا آخرت میں موجود پایا۔

غرور کے تانے بانے:۔

ایک اور نصیحت وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ۔ (لقمان آیت ۱۸)

اور لوگوں سے اپنا رُخ نہ پھیر

عربی زبان میں صَعَر ایک بیماری کا نام ہے جو اونٹ کی گردن میں ہوتی ہے جسکی وجہ سے اونٹ اپنا منھ ہر وقت ایک ہی طرف پھیرے رکھتا ہے۔ اسی سے یہ محاورہ نکلا فُلَانٌ

صَعَّرَخَدَّہٗ۔ فلاں شخص نے اونٹ کی طرح اپنا کلّہ پھیر لیا یعنی تکبّر کے ساتھ پیش آیا منھ پھیر کر بات کی۔ یہ بدکیفیت اُسی وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب انسان کے دماغ میں تکبّر کی ہوا بھر جاتی ہے اور وہ اپنے کو بڑا ظاہر کرنا چاہتا ہے اور مقابل کو پست وحقیر۔

دولت، اقتدار، حُسن، شہرت، علم، طاقت، حسب ونسب یہ اور ایسی ہی دوسری جتنی بھی چیزیں ہیں انسان کے اندر تکبّر پیدا کرتی ہیں اگر ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔

اللہ کی حاکمیت، اُس کا اقتدار اور عظمت وکبریائی پیشِ نظر رہنے پر یہ صفات انسان کو فرشتہ بنا دیتی ہیں۔

ایک اور نصیحت وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا۔ وَاقْصِدْ فِی مَشْیِكَ۔ (لقمان آیت ۱۸)

اور زمین پر اکڑ کر نہ چل اور اپنی چال میں اعتدال اختیار کر۔

جو شخص اپنی دانست میں اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھتا ہے اور اپنی بڑائی کا اظہار کرتا ہے۔ ایسا شخص خود پسند اور متکبّر کہلاتا ہے۔ آدمی کی چال ڈھال میں اکڑ اور اتراہٹ کی شان اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اسکے دل ودماغ میں تکبّر کی ہوا بھر جاتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ دوسروں کو بھی اپنی بڑائی محسوس کرائے۔ یہی مطلب ہے ان آیات کا کہ آدمی خود پسندی اور غرور وکبریائی سے اجتناب کرے۔ اعتدال کی راہ اختیار کرے دراصل جو چیز یہاں مقصود بیان ہے وہ نفس کی اُس کیفیت کی اصلاح ہے جس کے اثر سے چال ڈھال میں شان اور بڑائی پیدا ہو۔ بڑائی کا گھمنڈ دل میں موجود ہو تو وہ لازماً ایک خاص طرز کی چال میں ظاہر ہوتا ہے جسے دیکھ کر نہ صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی کسی گھمنڈ میں مبتلا ہے بلکہ چال کی یہ مخصوص ادا بتا دیتی ہے کہ صاحب کسی گھمنڈ میں مبتلا ہیں۔

قرآن حکیم نے ایک اور موقعہ پر فرمایا:۔

وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا۔ (بنی اسرائیل آیت ۳۷)

اور زمین میں اکڑ کر نہ چل تو نہ زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکتا ہے۔

اسکے برخلاف چال کی سلامت روی قلب کی اُس مخفی کیفیت کی علامت قرار پائی ہے جو انسان میں تواضع اور شرافت کے اثر سے پیدا ہوتی ہے۔

کبھی انسان کے نفس کا مخفی تکبر ایک نمائشی تواضع اور انکساری کا روپ بھی اختیار کر لیتا ہے اور یہ چیز اسکی چال میں نمایاں نظر آتی ہے اور کبھی انسان واقعی طور پر دنیا اور اُسکے حالات سے شکست کھا کر اپنی نگاہ میں آپ حقیر ہو کر مریل چال چلنے لگتا ہے۔ حضرت لقمان کی نصیحت کا یہ منشاء ہے کہ اپنے نفس کی اِن مکروہ کیفیات کو دور کرو اور ایک سیدھے سادھے معقول شریف انسان کی سی چال چلو جس میں نہ کوئی اینٹھ اور اکڑ ہو نہ مریل پن اور نہ ریاکارانہ زہد و انکسار۔

اس سلسلے میں صحابہ کرام کا ذوق جیسا کچھ تھا اس کا اندازہ اُن واقعات سے کیا جا سکتا ہے جو تاریخ و سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔

حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ ایک شخص کو دیکھا کہ وہ سر جھکائے چلے جا رہے ہیں۔ آپ نے پکار کر فرمایا سر اٹھا کر چل اسلام مریض نہیں ہے۔

اسی طرح ایک اور صاحب کو دیکھا کہ مریل چال چل رہے ہیں فرمایا ظالم ہمارے دین کو کیوں عیب لگاتا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ایک صاحب کو بہت ہی مضمحل چلتے دیکھا پوچھا کہ انھیں کیا ہو گیا؟

عرض کیا گیا کہ یہ قُرّاء میں سے ہیں (یعنی قرآن پڑھنے پڑھانے والے علم و عبادت میں مشغول رہنے والے)

اسپر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا عمرؓ سید القراء تھے مگر اُن کا یہ حال تھا کہ جب چلتے تو زور سے چلتے اور جب بولتے تو قوت کے ساتھ بولتے اور جب پیٹتے تو خوب پیٹتے۔

قرآن حکیم نے نیک بندوں کی عادات و اطوار کے ضمن میں یہ بات خصوصیت سے ذکر کی ہے کہ وہ زمین پر نرم چال چلتے ہیں:۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا۔

(الفرقان آیت ۶۳)

یعنی اتراتے، اکڑتے ہوئے نہیں چلتے کہ اپنی چال سے اپنا زور جتلائیں بلکہ اِن کی چال ایک

شریف انسان کی سی ہوتی ہے۔ ایک اجنبی آدمی انکو دیکھ کر پہلی نظر میں جان لیتا ہے کہ یہ شریف، حلیم، نیک کردار انسان ہیں۔ انسان کی فطری چال کو نرم چال کہا جاتا ہے جو بغیر کسی تصنع و تکلف کے ظاہر ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفتار و گفتار، چال ڈھال کو جن صحابہ نے نقل کیا ہے وہ آپ کے چلنے کی کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

"جب آپ چلا کرتے تو مضبوط قدم رکھتے ہوئے چلتے تھے گویا نشیب کی طرف اُتر رہے ہیں۔"

اگر ذرا تامل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آدمی کی چال محض اُسکے انداز رفتار ہی کا نام نہیں بلکہ درحقیقت وہ اس کے ذہن اور اسکی سیرت و کردار کی اولین ترجمان بھی ہوتی ہے۔ ایک عیار آدمی کی چال، ایک غنڈے بدمعاش کی چال، ایک ظالم و قاتل کی چال، ایک ریاکار خود پسند کی چال، ایک متکبر مغرور کی چال، ایک باوقار مہذب آدمی کی چال، ایک غریب مسکین کی چال، ایک شریف متواضع کی چال، ایک نیک اور صالح آدمی کی چال۔ اسی طرح مختلف اقسام کے دوسرے انسانوں کی چال ایک دوسرے سے اسقدر مختلف ہوتی ہیں کہ ہر ایک کو دیکھ کر بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس چال کے پیچھے کس طرح کی شخصیت نمایاں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں نیکوں کی چال ڈھال نصیب کرے۔

حکمتِ لقمان:۔

گزشتہ صفحات میں یہ ذکر آچکا ہے کہ عرب میں حضرت لقمانؑ کے حکیمانہ اقوال اور امثلہ کا بڑا چرچا تھا اور اکثر مجالس میں ان کے حکیمانہ اقوال کو دُھرایا جاتا تھا۔ چنانچہ تابعین حضرات اور صحابہ کرام سے بھی اس سلسلے میں بعض اقوال منقول ہیں اُن میں سے چند یہ ہیں:۔

(۱) حکمت و دانائی مفلس کو بادشاہ بنادیتی ہے (۲) جب کسی مجلس میں داخل ہو تو اول سلام کرو پھر ایک جانب بیٹھ جاؤ اور جب تک اہل مجلس کی گفتگو نہ سن لو خود گفتگو شروع نہ کرو۔ پس اگر وہ اللہ تعالےٰ کے ذکر میں مشغول ہوں تو تم بھی اس میں سے اپنا حصہ لے لو، اور اگر وہ

فضولیات میں مشغول ہوں تو وہاں سے علیحدہ ہو جاؤ اور کسی دوسری عمدہ مجلس کو اختیار کرو (۳) اللہ تعالیٰ جب کسی کو امانتدار بنائے تو اُس کا فرض ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرے (۴) اے بیٹے اللہ تعالیٰ سے ڈر اور ریاکاری سے اللہ تعالیٰ کے ڈر کا مظاہرہ نہ کر کہ لوگ اس وجہ سے تیری عزت کریں اور تیرا دل حقیقتاً گنہ گار رہے (۵) اے بیٹے جاہل سے دوستی نہ کر کیونکہ وہ سمجھنے لگے گا کہ تجھ کو اُسکی جاہلانہ باتیں پسند ہیں اور عقلمند کے غصہ کو بے پرواہی میں نہ ٹال کہ کہیں وہ تجھ سے جدائی نہ اختیار کر لے۔
(۶) جان لے کہ عقلمندوں کی زبان میں اللہ تعالیٰ کی طاقت ہوتی ہے۔ (۷) اے بیٹے خاموشی میں کبھی ندامت اٹھانی نہیں پڑتی اور اگر کلام چاندی ہے تو سکوت سونا ہے (۸) بیٹا ہمیشہ شر سے دور رہو تو شر بھی تم سے دور رہیگا۔ اس لئے شر سے ہی شر پیدا ہوتا ہے (۹) بیٹا غیظ و غضب سے بچو اس لئے کہ شدتِ غضب عقلمند کے قلب کو مردہ بنا دیتی ہے (۱۰) بیٹا خوش کلام بنو، خوشروئی اختیار کرو تب تم لوگوں کی نظروں میں اُس شخص سے بھی زیادہ محبوب ہو جاؤ گے جو ہر وقت اُن کو داد و دہش کرتا رہتا ہے۔ (۱۱) نرم خوئی عقلمندی کی جڑ ہے (۱۲) جو بوؤ گے وہی کاٹو گے (۱۳) اپنے اور اپنے والد کے دوست کو محبوب رکھو۔

(۱۴) کسی نے لقمان سے پوچھا سب سے زیادہ صابر کون شخص ہے؟
کہا جس کے صبر کے پیچھے ایذا نہ ہو!
پھر دریافت کیا سب سے بڑا عالم کون ہے؟
جواب دیا جو دوسروں کے علم کے ذریعہ اپنے علم میں اضافہ کرتا رہا!
پھر سوال کیا سب سے بہتر آدمی کون ہے؟
فرمایا غنی!
سائل نے پھر کہا کیا غنی سے مالدار مراد ہے؟
جواب میں کہا نہیں بلکہ غنی وہ شخص ہے جو اپنے اندر خیر کو تلاش

کرے تو موجود پائے ورنہ خود کو دوسروں سے مستغنی رکھے۔

(۱۵) کسی نے دریافت کیا بدترین انسان کون ہے؟
فرمایا جو اس کی پرواہ نہ کرے کہ لوگ اسکی برائی دیکھ کر برا سمجھیں گے۔

(۱۶) بیٹا تیرے دسترخوان پر ہمیشہ نکوکاروں کا اجتماع رہے تو بہتر ہے اور مشورہ صرف علماء حق ہی سے لینا۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۳ و تاریخ ابن کثیر ج ۲
ماخوذ از امام احمد رح)

تذکرہ اصحاب السبت (ہفتے والے)

قرآن حکیم اور اصحاب السبت

اصحاب السبت (ہفتے والوں کا ذکر) قرآن حکیم کی پانچ سورتوں میں آیا ہے:-

سورہ بقرہ	آیت	۶۵، ۶۶
″ نساء	″	۴۷، ۱۵۴
مائدہ	″	۶۰
اعراف	″	۱۶۳ تا ۱۶۶
النحل	″	۱۲۴

یوم السبت

(ہفتہ کا دن) گزشتہ اوراق میں یہ آچکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے "دینِ حنیف" یعنی اللہ کے پسندیدہ دین کی تعلیم کا سلسلہ ان کی دو شاخوں بنو اسحٰق اور بنو اسمٰعیل کے ذریعہ قوموں اور ملکوں میں پھیلا ہے۔ دین حنیف کے اصول ان ہر دو شاخوں میں یکساں رہے ہیں اور شعائر اللہ کے احکام بھی مشترک تھے۔ مگر حضرت اسحٰق علیہ السلام کے صاحبزادے اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) کی اولاد نے جو بنی اسرائیل کے نام سے معروف ہے اپنے زمانے کے انبیاء کرام سے اختلاف اور جھگڑے کر کے بعض امور میں تشدد اور سخت احکام کا بوجھ اپنے کاندھوں پر ڈال لیا تھا۔ مثال کے طور پر جمعہ کا دن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی امت کے لئے عبادت کے لئے مقرر فرمایا تھا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہود نے اپنی روایتی کجروی کی بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اصرار کیا کہ ان کے لئے ہفتہ کا دن عبادت و برکت کا دن

مقرر کر دیا جائے۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے تو انھیں ہدایت کی کہ وہ اپنے غلط اصرار سے باز آجائیں اور ملّتِ ابراہیمی کے اس امتیاز کو جو اللہ تعالےٰ کے ہاں مقبول وپسندیدہ ہے تبدیل نہ کریں۔ لیکن جب ان کا اصرار حد سے متجاوز ہو گیا تو وحی الٰہی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ اطلاع دی کہ اللہ تعالےٰ ان کے بیجا اصرار کے نتیجہ میں جمعہ کی سعادت وبرکت کو اِن سے واپس لے لیتا ہے اور اِن کے لئے ہفتہ کا دن مقرر کرتا ہے۔ لہٰذا اب وہ لوگ اپنے اس مطلوبہ دن کی عظمت کا پاس ولحاظ رکھیں اور اسکی حرمت کو باقی رکھیں۔ اس دن خرید وفروخت زراعت وتجارت لہو ولعب شکار کرنے کو حرام رکھیں اور اس دن صرف عبادت الٰہی میں مشغول رہیں۔
کچھ عرصہ تو بنی اسرائیل نے اس حکم کا پاس ولحاظ رکھا لیکن اپنی جبلّت کی مطابق اسمیں سستی وغفلت کرنی شروع کی پھر اس دن کے بارے میں ہی اختلاف شروع کر دیا اور اس بارے میں مختلف جماعتیں ہو گئیں۔
قرآن حکیم نے مختصر الفاظ میں اس دن اور ان کے اختلاف کا اس طرح تذکرہ کیا ہے:۔

قرآنی مضمون

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ الخ
(النحل آیت ۱۲۴)

بیشک ہفتہ کا دن اِن لوگوں کے لئے (عبادت کا دن) مقرر کیا گیا جو اسکے متعلق جھگڑا کرتے تھے اور یقیناً تیرا رب قیامت کے دن اِن کے درمیان فیصلہ کر دے گا جس کے متعلق وہ اختلاف کرتے تھے کہ اسمیں حق کیا تھا اور باطل کیا۔

وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا۔ (نساء آیت ۱۵۴)

اور ہم نے بنی اسرائیل سے کہا ہفتہ کے بارے میں حد سے نہ گزرنا (خلاف ورزی نہ کرنا) اور ہم نے ان سے اسکے متعلق بہت سخت قسم کا عہد وپیمان لیا۔

لیکن بنی اسرائیل نے آگے چلکر اس قانون کی علانیہ مخالفت شروع کر دی۔ یرمیاہ نبیؑ کے زمانے میں (جو ۶۲۸ء اور ۵۸۶ء قبل مسیح کے درمیان گزرے ہیں) خاص طور پر یروشلم کے پھاٹکوں سے لوگ ہفتے کے دن مال و اسباب لیکر گزرتے تھے۔ اس پر نبی موصوف ان کو دھمکی دیتے تھے کہ اگر تم لوگ اس خلاف ورزی سے باز نہ آئے تو یروشلم نذر آتش ہو جائے گا۔ لیکن اس دھمکی سے بھی وہ خائف نہیں ہوئے پھر انکے بعد حزقیل نبیؑ (جن کا دور ۵۹۵ء اور ۵۳۶ء قبل مسیح گزرا ہے) نے بھی اپنی کتاب میں ہفتے کے دن کی بیحرمتی کو یہودیوں کے قومی جرائم میں سے ایک بڑا جرم قرار دیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم دنیا میں سب سے آخر آنے والے ہیں اور آخرت میں سب سے مقدم ہونگے۔ خصوصاً اہل کتاب سے جو ہم سے بہت پہلے ہو گزرے ہیں اور یہ جمعہ کا دن ہم سے پہلے اِن اہلِ کتاب کے لئے مقرر کیا گیا تھا مگر انھوں نے اسمیں اختلاف کیا اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس جمعہ کے دن کو قبول کر لینے کی توفیق دی۔ لہذا دنیا میں بھی اہل کتاب اس معاملہ میں ہم سے پیچھے رہ گئے۔ کیونکہ اہل کتاب میں یہود کا روز عبادت جمعہ سے ایک دن بعد (ہفتہ) کا ہو گیا اور نصاریٰ کا اسکے بعد (اتوار) کا دن مقرر ہوا ہے۔ (بخاری)

واقعہ کی تفصیلات

الغرض ایک طویل مدت تک یہود بنی اسرائیل اپنے مطلوبہ یوم کی عزت اور حرمت پر قائم رہے اور جن باتوں سے اُنہیں روکا گیا تھا اُنکی پابندی کرتے رہے مگر رفتہ رفتہ اُن احکام کی خلاف ورزی شروع ہوگئی اگرچہ ابتداء میں یہ خلاف ورزی انفرادی اور خفیہ طور پر ہوئی مگر شدہ شدہ علی الاعلان اجتماعی حیثیت اختیار کرلی اور بے خوفی و بے باکی کے ساتھ اسکو کیا جانے لگا بلکہ بہانے اور حیلے تراش تراش کر اپنی اس بدعملی پر فخر کیا جانے لگا تب اللہ تعالیٰ کے عذاب نے انہیں آپکڑا اور ایسی ذلت و رسوائی سے سابقہ پڑا کہ ہر زمانے کے لئے عبرت بن گئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے عرصۂ دراز کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت بحر قلزم کے کنارے آباد ہوگئی۔ اہل تاریخ کا غالب گمان

اس طرف ہے کہ یہ مقام اَیلہ یا ایلات تھا جہاں اب اسرائیل کی یہودی ریاست نے اسی نام کی ایک بندرگاہ بنائی ہے اور جس کے قریب ہی اُردن کی مشہور بندرگاہ عقبہ واقع ہے چونکہ یہ لوگ ساحل کے باشندے تھے اس لئے مچھلی کا شکار کرنا ان کا فطری مشغلہ تھا اور یہ ان کو بہت محبوب تھا۔ اسکی خرید و فروخت اور کاروبار کرتے تھے۔ ہفتے کے چھ دن میں تو مچھلی کا شکار کرتے اور اُسکی تجارت میں صرف کرتے اور سبت (ہفتہ) کے دن عبادت الٰہی میں مشغول رہتے۔ اس لئے قدرتی طور پر مچھلیاں چھ دن اپنی جان بچانے کی خاطر پانی کی تہہ میں پوشیدہ رہتیں اور سبت (ہفتے) کے دن پانی کی سطح پر تیرتی نظر آتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ بندوں کی آزمائش کے لئے جو طریقے اختیار فرماتا ہے اُن میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جب کسی شخص یا جماعت کے اندر فرماں برداری سے انحراف اور نافرمانی کی جانب میلان بڑھنے لگتا ہے تو اُس کے سامنے نافرمانی کے مواقع کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے تاکہ اُس کے وہ رجحانات جو اندر چھپے ہوئے ہیں کُھل کر پوری طرح نمایاں ہو جائیں اور جن جرائم سے وہ اپنے دامن کو خود داغدار کرنا چاہتے ہیں پوری طرح واضح ہو جائے۔ پھر اللہ تعالےٰ کا قانونِ جزا اُن پر لاگو ہو جاتا ہے۔

الغرض اسی طرح اُس بستی والوں کو آزمایا گیا اور کیفیت یہ ہونے لگی کہ ہفتے کے باقی دنوں میں مچھلیوں کا حاصل ہونا مشکل ہو گیا مگر سبت (ہفتے) کے روز اس کثرت سے پانی پر تیرتی نظر آتیں کہ بغیر کسی تدبیر کے باآسانی گرفتار ہو جاسکیں۔ کچھ دنوں تو یہود اس حالت کو صبر آزما طریقے پر دیکھتے رہے مگر بعض بعض نے خفیہ طریقوں سے ایسے حیلے ایجاد کر لئے کہ جس سے یہ بھی ظاہر نہ ہو سکے کہ وہ ہفتے کے احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ چنانچہ بعض تو یہ کرتے ہیں کہ جمعہ کی شام کو دریا کے قریب گڑھے کھود لیتے اور دریا سے اِن گڑھوں تک ایک نہر نکال لیتے اور جب ہفتے کے دن سطح آب پر مچھلیاں تیرنے لگتیں تو وہ دریا کے پانی کو کھول دیتے تاکہ پانی گڑھوں میں چلا جائے اور ان کے بہاؤ کے ساتھ مچھلیاں بھی چلی جائیں اور جب ہفتے کا دن گزر جاتا تو اتوار کی صبح کو اِن گڑھوں سے مچھلیوں کو نکال لیتے۔ اس طرح اپنے زعم میں یہ سمجھتے کہ ہم نے ہفتے کے دن شکار نہیں کیا۔

اور بعض یہ کرتے کہ جمعے کے دن دریا میں جال لگا آتے تاکہ ہفتے کے دن ان میں مچھلیاں پھنس جائیں اور اتوار کی صبح کو اِن جالوں میں پھنسی ہوئی مچھلیاں نکال لاتے اور

اپنی اِن ترکیبوں پر بے حد مسرور ہوتے اور فخر کرتے تھے اور جب اُن کے علماء اور اہل حق اس حرکت سے روکتے تو جواب دیتے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم تو صرف ہفتے کے دن شکار نہ کرنے کا ہے۔ لہٰذا ہم اُسکی تعمیل میں ہفتے کو شکار نہیں کرتے ہیں بلکہ اتوار کے روز شکار کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کا دل خود ان کو ملامت کرتا تھا مگر کجروی یہ جواب دیکر ان کو تسلی دیدیتی تھی کہ ہمارا یہ حیلہ اللہ تعالیٰ کے ہاں چل جائے گا۔ گویا خود فریبی میں مبتلا تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ ان چند حیلہ جُو انسانوں کی اِن حرکات کا علم دوسرے حیلہ ساز افراد کو بھی ہوا اور اُنھوں نے بھی اِن کی تقلید شروع کر دی اور پھر بستی کی ایک بہت بڑی تعداد ان کے شریک عمل ہوگئی۔ اسی طرح علی الاعلان یوم السبت کی بزرگی ختم ہوگئی اور وہ ایک عام دن کی طرح ہوگیا۔

اس جماعت کی اِن ذلیل حرکات کو دیکھ کر بستی ہی میں سے ایک سعادت مند جماعت نے ہمت چُست کی اور اِن کے مقابل آکر اِن کو اس بدعملی سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر قوم کا مزاج بگڑ چکا تھا۔ اِن لوگوں نے کچھ بھی لحاظ نہ کیا اور اپنی حرکت پر قائم رہے پھر اس سعادت مند جماعت میں دو فریق ہوگئے۔ ایک فریق نے دوسرے فریق سے کہا کہ اب اِن حیلہ بازوں کو نصیحت کرنا بیکار ہے یہ باز آنے والے نہیں کیونکہ اگر اسکو یہ لوگ گناہ کا کام سمجھتے تو امید کی جاسکتی تھی کہ توبہ کرلیں لیکن یہ حیلے تراش کر اپنی بدعملی پر نیکی کا غلاف چڑھاتے ہیں اور اسکو گناہ کا کام نہیں سمجھتے تو پھر توبہ کیوں کر کریں گے۔ لہٰذا انہیں انکے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ ہم کو اندیشہ پیدا ہوگیا ہے کہ اس جماعت میں اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائیگا یا یہ کسی سخت آفت میں مبتلا ہوں گے۔

اسپر سعادتمند جماعت کا دوسرا فریق کہتا کہ ہم اِن کو برابر نصیحت کرتے رہیں گے تاکہ قیامت کے دن اپنے پروردگار کے آگے یہ عذر پیش کرسکیں کہ ہم نے آخر وقت تک اِن کو سمجھایا اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے رہے لیکن قوم نے کسی طرح نہ مانا۔ اسکے علاوہ ہمیں یہ بھی توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں توفیق عمل دے گا اور یہ اس بدعملی سے باز آجائیں گے۔

بہرحال یہ جماعت مایوس نہیں ہوئی اور فریضہ تبلیغ ادا کرتی رہی۔ پہلا فریق ہمت ہار کر بیٹھ گیا۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ سعادتمند جماعت کا وہ طبقہ جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کر رہا تھا۔ جب یہ دیکھا کہ متمرد اور سرکش جماعت کسی طرح باز نہیں آتی تو انھوں نے فریضہ تبلیغ کے ساتھ ان سے ترک تعلقات کر لیا۔ کھانا پینا، خرید و فروخت ہر قسم کا اشتراکِ عمل ختم کر دیا اور بعض روایات میں یہاں تک تصریح ہے کہ انھوں نے بستی کے دو حصے کر لئے ایک میں یہ نافرمان لوگ بسے رہے دوسرے حصے میں خود ہو گئے۔ ایک دن اِن کو محسوس ہوا کہ جس حصہ میں یہ نافرمان لوگ رہتے تھے بالکل خاموشی اور سناٹا ہے۔ جا کر دیکھا تو سب کے سب بندر اور خنزیر کی شکلوں میں مسخ ہو گئے ہیں۔ حضرت قتادہ رح کی تفسیر میں مزید یہ وضاحت ملتی ہے کہ اُس قوم کے نوجوان بندر بنا دیئے گئے تھے اور بوڑھے خنزیر کی شکلوں میں۔ جب یہ نیک لوگ اُن کے قریب پہنچے تو مسخ شدہ بندر اپنے رشتہ داروں اور تعلق والوں کو پہچان گئے اور ان کے پیروں میں لوٹ لوٹ کر روتے تھے اور اپنی اس حالت زار کا اشاروں سے اظہار کرتے تھے۔ نیکو کاروں نے حسرت و غم کے ساتھ اِن سے کہا کیا ہم تم کو بار بار اس خوفناک عذاب سے نہیں ڈراتے تھے؟ انھوں نے جب یہ سُنا تو حیوانوں کی طرح سر ہلا کر اقرار کیا اور آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے اپنی رسوائی و ذلت کا اعتراف کیا۔

قرآن حکیم کی آیات ذیل اس رسواکن واقعہ کا اس طرح تذکرہ کرتی ہیں۔

قرآنی مضمون

وَاسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ

(اعراف آیات ۱۶۳ تا ۱۶۶)

اور آپ اے نبی اِن سے اُس بستی (والوں) کی بابت دریافت کیجیئے جو سمندر کے کنارے تھی جب کہ وہ لوگ ہفتے کے بارے میں (احکام سے) تجاوز کر رہے تھے (اور) جب کہ ان کے ہفتے کے روز تو اِن کی مچھلیاں ظاہر ہوتی تھیں اور جب ہفتے کا دن نہ ہوتا تو نہ آتیں۔ ہم نے اُن کی آزمائش اس طرح کی اس لئے کہ وہ نافرمانی کر رہے تھے۔

اور جب کہ اُن میں سے ایک جماعت نے کہا تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کئے جاتے ہو جنھیں اللہ پاک ہلاک کرنے والا ہے

یا انھیں (کسی اور) سخت عذاب میں گرفتار کرنے والا ہے۔ وہ بولے اپنے پروردگار کے روبرو عذر کرنے کے لئے اور شاید کہ یہ لوگ تقویٰ اختیار کرلیں۔ پھر جب وہ بھولے ہی رہے اس چیز کو جو انہیں یاد دلائی گئی تھی تو ہم نے اُن لوگوں کو بچا لیا جو بُری بات سے روکا کرتے رہتے تھے اور جو لوگ ظلم کرتے تھے اُنھیں ہم نے ایک سخت عذاب میں پکڑ لیا اس لئے کہ وہ نافرمانی کرتے رہتے تھے۔

پھر جب وہ اس چیز سے حد سے نکل گئے جس سے روکے گئے تھے ہم نے اُن سے کہہ دیا کہ ذلیل بندر بن جاؤ۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ الخ

(بقرہ آیت ۶۵، ۶۶)

اور تم خوب جان چکے ہو ان لوگوں کو جنھوں نے تم میں سے ہفتے کے بارے میں تجاوز کیا تھا تو ہم نے اُن سے کہا ذلیل بندر ہو جاؤ۔

پھر ہم نے اُسے (موجب) عبرت بنا دیا۔ اُس زمانے اور اسکے بعد کے لوگوں کے لئے اور ایک (موجب) نصیحت بنا دیا خوفِ خدا رکھنے والوں کے لئے۔

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ الخ

(مائدہ آیت ۶۰)

اے نبیؐ آپ کہہ دیجئے کیا میں تمہیں جتلادوں وہ جو اللہ کے ہاں پاداش کے لحاظ سے اس سے (بھی کہیں) بُرا ہے۔ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور اُن پر غضب کیا ہے اور اُن میں بعض کو بندر اور سُور بنا دیئے اور اُنھوں نے شیطان کی پوجا کی۔ ایسے لوگ مقام کے اعتبار سے بدتر اور راہِ راست سے بہت دُور ہیں۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا الخ (نساء آیت ۴۷)

اے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) تم اس کتاب پر ایمان لاؤ

جو ہم نے نازل کی ہے اُس کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے جو تمہارے پاس ہے (یعنی تورات) اس سے پہلے ایمان لاؤ کہ ہم چہروں کو مٹا ڈالیں اور چہروں کو اُن کے پیچھے کی جانب اُلٹا دیں یا ہم اُن پر لعنت کریں جس طرح ہم نے اصحاب السبت پر لعنت کی، اور اللہ کا حکم پورا ہو کر رہنے والا ہے۔

ملعون بستی کا مقام

جس بستی پر یہ بدترین حادثہ پیش آیا قرآن حکیم کے سورۂ اعراف میں صرف یہ بیان کیا گیا کہ وہ بستی ساحلِ سمندر پر واقع تھی۔

اَلْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ

مگر اہل تفسیر نے اُسکی تعین میں مختلف نام بیان کئے ہیں۔

"حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی جاتی ہے کہ یہ مدین کا واقعہ ہے (حضرت شعیب علیہ السلام بھی اسی شہر کی جانب مبعوث ہوئے تھے) حضرت ابن زیدؒ کہتے ہیں کہ اس قریہ کا نام تنتا تھا اور یہ مدین اور عینونا کے درمیان واقع تھا۔ حضرت عکرمہؒ، مجاہدؒ، قتادہؒ اور ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ اس بستی کا نام اَیلہ تھا اور یہ بحر قلزم کے ساحل پر واقع تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے بحر قلزم کے جنگی و تجارتی بیڑے کا صدر مقام اسی شہر کو بنایا تھا۔ عرب مؤرخین کہتے ہیں کہ مصر سے اگر مکہ مکرمہ چلیں تو یہ بستی درمیان راہ میں آتی ہے۔" (فتح الباری ج ۶)

جس حادثہ کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے اسکے متعلق یہودیوں کی مقدس کتابوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

اسی طرح انکی کتب تاریخ بھی اس باب میں خاموش ہیں۔ مگر قرآن حکیم نے جس انداز اور جس اہتمام سے یہ واقعہ بیان کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے دور میں بنی اسرائیل اس واقعہ سے خوب واقف تھے اور یہ بات اُن میں مشہور و معروف رہی ہوگی۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ مدینہ کے یہودیوں نے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور

قرآن حکیم کی مخالفت کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ قرآن حکیم کے اس بیان پر قطعاً کوئی اعتراض یا شک نہیں کیا اور خاموش کان لٹکائے سنتے رہے۔

زمانۂ حادثہ یہ رسوا کن حادثہ کس زمانے میں پیش آیا؟ اور یہ کس نبی کے دور میں واقع ہوا؟ قرآن حکیم نے اپنے موضوع اور مقصد کے پیش نظر اس کو بیان نہیں کیا۔ بعض مفسرین نے قرآنی اشارات سے یہ سمجھا ہے کہ یہ حادثہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا تھا۔

مفسر قرآن شاہ عبد القادرؒ کا یہی رجحان ہے۔ مؤلف قصص القرآن کی رائے یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے درمیانی زمانے میں کسی ایسے وقت پیش آیا جبکہ شہر ایلہ میں کوئی نبی موجود نہیں تھے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ وہاں کے علمارِ حق ہی کے سپرد رہا ہوگا یہ اس لئے کہ قرآن حکیم نے اس قصہ میں صرف اسی جماعت کا تذکرہ کیا ہے کسی نبی یا رسول کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اِن کا کہنا ہے کہ سورۂ اعراف میں اس واقعہ کو جس تفصیل سے بیان کیا ہے وہاں یہ بتایا ہے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا تو اہل بستی تین جماعتوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور اِن میں سے ایک مختصر جماعت نافرمانوں کو راہِ ہدایت کی تلقین کر رہی تھی۔ لہٰذا اگر یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا تھا تو یہ بات بعید از قیاس اور بعید از اسلوبِ قرآن معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایسے موقعہ پر جب کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی جماعت پر مسخ کا عذاب ہو رہا ہو تو اس زمانے کے پیغمبر کا اس سلسلہ میں قطعاً کوئی ذکر نہ کرے اور یہ نہ بتایا جائے کہ نافرمان قوم کے اور اِن کے درمیان کیا معاملہ پیش آیا؟

الحاصل قرآن حکیم کے اسلوب بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب السبت کا یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے درمیانی زمانے میں کسی ایسے وقت پیش آیا جبکہ شہر ایلہ میں کوئی نبی موجود نہ تھے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ وہاں کے علمارِ حق کے ہی سپرد تھا۔

مرتب کتاب کا یہ احساس ہے کہ مؤلف قصص القرآن کی رائے کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتی کیونکہ نفس واقعہ میں کسی نبی یا رسول کا ذکر نہ ہونا عدم وجود کی دلیل نہیں ہے بھر

جس علت کی وجہ سے مسخ کا عذاب آیا تھا وہ وہی ہے جسکو سورۂ مائدہ کی آیت ۷۹ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی نہی عن المنکر کا فریضہ ترک کر دینا۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ. كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ.

(مائدہ آیت ۷۸، ۷۹)

داؤدؑ اور عیسیٰؑ ابن مریم کی زبانی بنی اسرائیل میں سے وہ لوگ لعنت کیے گئے جنھوں نے کفر کیا اس لئے کہ وہ نافرمانی کے خوگر تھے اور حد سے گزرے ہوئے تھے۔

جو برا کام اُنھوں نے کر رکھا تھا اُس سے ایک دوسرے کو منع نہ کرتے تھے۔ بُرا طرز عمل تھا جو اُنھوں نے اختیار کیا۔

لہذا اگر یہ واقعہ حضرت داؤد و عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے درمیانی زمانے میں پیش پیش آیا ہوتا جیسا کہ مؤلف قصص القرآن کی رائے ہے تو حضرت داؤد علیہ السلام کی لعنت کرنے کا کوئی بنیادی سبب سمجھ میں نہیں آتا۔ جبکہ یہ واقعہ اُن کے بعد پیش آیا ہوا اور انھوں نے پوری جماعت بنی اسرائیل پر لعنت کر دی ہو جنھوں نے نہی عن المنکر کا فریضہ ترک کر دیا تھا۔ لہذا یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام ہی کے عہد میں پیش آیا ہو جیسا کہ شاہ عبد القادرؒ مفسر قرآن کا خیال ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

نتائج و عبر

چند حقائق

سورۂ بقرہ اصحاب السبت کے تذکرے میں یہ فقرہ

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ. (بقرہ آیت ۶۶)

پھر ہم نے بنا دیا اُن (اصحاب السبت) کے انجام کو اُس زمانے

کے لوگوں اور بعد کے لوگوں کے لئے عبرت اور اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے نصیحت۔

اس بعد کے لوگوں سے کیا مراد ہے؟ اسکے جواب میں متعدد اقوال ہیں بہتر قول حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے یعنی اس سے وہ بستیاں مراد ہیں جو شہر ایلہ کے گرد و پیش آباد تھیں اور مشہور تابعی سعید بن جبیرؒ کے قول سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

نَکَالًا۔ نکال وہ سخت سزا جو دوسروں کے لئے باعث عبرت ہو۔ گویا سزا ایسی تھی کہ مدتوں تک نسلاً بعد نسلٍ اس کا چرچا رہے اور لوگ اس کا تذکرہ سن سن کر ڈرتے اور لرزتے رہیں۔

مَوْعِظَۃً۔ نصیحت یا وعظ۔ یعنی متقین کو اس واقعہ سے راہ تقویٰ کی طرف ترغیب اور زیادہ ہو یا یہ مراد لی جائے کہ نصیحت کو قبول کرنے والے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے متقین ہی ہوں گے۔

صاحب روح المعانی نے اس موقعہ پر یہ نکتہ اہل عرفان کے لئے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عبادتوں کو خاص خاص شکلوں کے ساتھ مخصوص اوقات میں متعین کیا ہے تاکہ طبعی ظلمتیں دُور ہوں۔

لہٰذا جو شخص اِن خاص ہیئتوں کی رعایت نہیں کرتا اس کا نور استعداد ضائع ہوجاتا ہے اور وہ اصحاب السبت کی طرح مسخ کر دیا جاتا ہے۔ یعنی جس جانور کے اوصاف اس میں راسخ ہیں اُنہی کی طبیعت اُس میں پیدا کر دی جاتی ہے (کیونکہ اس امت کیلئے مسخ صوری نہیں ہے) پس انسان کو چاہیئے کہ وہ وظائف شرعیہ کے ذریعہ اپنی انسانیت کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں لگا رہے۔ چنانچہ بعض اہل کشف ایسے بھی پائے گئے ہیں جو انسان کو اُسی حیوان کی شکل میں دیکھا ہے جسکی صفت حیوانی اُس پر غالب ہوتی ہے۔ مثلاً ظلم و شقاوت جس انسان میں غالب ہوتی ہے اُسے آتا ہوا دیکھ کر کہنے لگے کہ بھیڑیا آرہا ہے جس پر حرام خوری کی گندگی غالب ہوتی ہے اُسے دیکھ کر اس طرح کہا ہے کہ سور آرہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ (اگرچہ اس قسم کا کشف کوئی حجت شرعیہ نہیں)

ارتقاءِ معکوس | اصحاب السبت کی مسلسل نافرمانی پر سزا تو اِن مجرموں کو یقیناً ملی

جمہور مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ سزا اسی طرح واقع ہوئی جیسی قرآن حکیم کے ظاہری الفاظ میں مذکور ہے۔ یعنی وہ انسان بندر بنے اور پھر تین دن کے بعد ہلاک ہو گئے۔

اس تفسیر پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ جو لوگ اللہ تعالےٰ کے قانون شرعی کے توڑنے میں اتنے جری اور بیباک ہوں اُن کے حق میں خالقِ کائنات اپنے قانونِ تکوینی کو کسی حد تک اگر بدل دے اور بجائے "ارتقار" کے کبھی "ارتقارِ معکوس" ہو جائے تو اسمیں کیا اشکال ہے۔

نظریہ ارتقار کے اصول پر ایک گوریلا بندر اپنی حقیقت سے منتقل ہو کر انسانی حقیقت اختیار کر سکتا ہے تو انسان کا بندر کی حقیقت میں بدل جانا کیوں محال اور ناممکن ہے۔

ہر شئ کا ردِ عمل (ری ایکشن) ممکن بھی ہے اور مشاہدہ بھی ہے تو اس اصول پر اگر یہ ثابت ہو جائے کہ جس طرح ایک ادنیٰ حقیقت اعلیٰ حقیقت میں تبدیل ہو جاتی ہے تو اسطرح کبھی خصوصی حالات اور نا موافق اثرات کی بنا پر اعلیٰ حقیقت ادنیٰ حقیقت میں منقلب ہو جائے تو اس نظریہ کے انکار پر کون سے دلائل ہیں؟

بہر حال ایک حقیقت کا دوسری حقیقت اختیار کر لینا عقلاً کوئی بعید بات نہیں ہے جو مسئلہ مسخ پر وارد ہو سکے۔ البتہ یہ امر کہ یہ واقعہ درحقیقت پیش آیا یا نہیں سو اس کا تعلق عقل سے نہیں ہے بلکہ علم تاریخ اور نقل صحیح پر موقوف ہے اور جبکہ قرآن حکیم کے علم یقین نے اس واقعہ کا بصراحت اظہار کیا ہے اور جمہور سلف و خلف اس واقعہ کی تفسیر میں مسخ حقیقی کا اعتراف کرتے چلے آتے ہیں تو محض اس لئے کہ عام طور پر ہم ایسے واقعات کا مشاہدہ نہیں کرتے۔ اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کسی شئ کے مشاہدہ نہ کرنے یا اس کے زیر نظر نہ آنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعہ میں وہ شئ موجود نہیں ہے یا نہیں ہو سکتی۔ اور پھر اس واقعہ کا نکال اور موعظت ہونا اسی وقت ممکن ہے جبکہ مسخ صوری ہوا ہو یعنی حقیقتاً وہ لوگ بندر ہو گئے ہوں۔ پس اگر مسخ کا یہ عذاب صرف مسخِ قلوب تک محدود تھا تو گرد و پیش کے بسنے والوں کے لئے یہ کس طرح "سامانِ عبرت" بن سکتا تھا۔

پھر یہی نہیں کہ وہ صرف بندر بنا دیئے گئے ہوں بلکہ قرآن حکیم نے ایک لفظ کے

مزید اضافہ کے ساتھ انھیں قِرَدَةً خَاسِئِينَ۔ یعنی محبوب بندر نہیں ذلیل وخوار بندر کہا ہے۔ یہ حکمت تو جب ہی صحیح ہو سکتی ہے کہ اِن سرکش انسانوں کو حقیقی طور پر بندر کی شکل میں مسخ کر دیا گیا ہو۔

سورۂ مائدہ میں مزید یہ بتایا گیا ہے کہ اصحاب السبت میں سے کچھ تو بندر بنا دیئے گئے اور کچھ خنزیر (سور) کی شکل میں مسخ کر دیئے گئے۔

وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ (مائدہ آیت ۶۰)

امام تفسیر مجاہدؒ کا ایک قول نقل ہوتا چلا آرہا ہے کہ مسخ کا یہ عذاب حقیقی مسخ نہ تھا بلکہ صوری تھا یعنی اُن لوگوں کے قلوب اور عادات و اطوار بندروں جیسے بنادیئے گئے تھے۔ مفسر قرآن ابن کثیرؒ نے اس پر تفصیلی بحث کرکے یہ تحریر کیا ہے:۔

> میں کہتا ہوں اِن ائمہ تفسیر کے بیانات کو ذکر کرنے سے میرا یہ مقصد ہے کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ یہ تمام ائمہ تفسیر مجاہدؒ کے قول کے مخالف ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ مسخ معنوی اور حقیقی دونوں حیثیت سے تھا۔ (یعنی اُن کے عادات واطوار کے ساتھ جسم بھی بندر و خنزیر کے بنا دیئے گئے) واللہ اعلم۔

پاداشِ عمل از جنسِ عمل

قرآن حکیم کے مطالعہ سے یہ بات بآسانی معلوم ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمیشہ "پاداشِ عمل از جنسِ عمل" ہو جیسا کہ واقعہ مذکورہ میں پیش آیا۔ اصحاب السبت نے حیلوں اور بہانوں کے ذریعہ ہفتے کے قانون کو مسخ اور محرّف کر دیا تھا۔ لہٰذا ان کے لئے سزا بھی "مسخ" تجویز کی گئی۔

حافظ ابن کثیرؒ اس حقیقت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:۔

> پس جب یہود نے (ہفتے کے دن یہ عمل) کیا تو اللہ تعالیٰ نے اِن کو بندروں کی شکل میں مسخ کر دیا اور یہ اس لئے کہ ظاہر شکل میں بندر انسان سے زیادہ مشابہ ہے اگرچہ حقیقت میں وہ انسان نہیں ہے۔ پس جب کہ اِن یہود کے اعمال بد اور حیلے ظاہر میں حق کے مشابہ اور باطن میں

اسکے مخالف ہیں تو اِن کو سزا بھی جنسِ عمل ہی سے دی گئی۔
(تفسیر ابن کثیر سورۂ اعراف)

مجھے یہ ورق رُلا رہے ہیں

حضرت عکرمہؒ جو حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد رشید اور ایک جلیل القدر تابعی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا دیکھا کہ ان کی گود میں قرآن حکیم کھلا رکھا ہوا ہے اور وہ رو رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر کچھ دیر تو میں انکی عظمت کی وجہ سے دور بیٹھا رہا مگر جب اس حالت میں ان پر کافی وقت گزر گیا تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے قریب جاکر سلام کے بعد عرض کیا اللہ تعالیٰ مجھ کو آپ پر قربان کرے۔ یہ تو فرمائیے کہ آپ کس لئے اس طرح رو رہے ہیں؟

حضرت ابن عباسؓ فرمانے لگے میرے ہاتھ میں یہ جو ورق ہیں مجھ کو رُلا رہے ہیں میں نے دیکھا تو وہ سورۂ اعراف کے ورق تھے۔ پھر مجھ سے فرمایا تم اَیلہ کو جانتے ہو؟ میں نے عرض کیا جانتا ہوں۔

اسکے بعد ارشاد فرمایا کہ اس بستی میں بنی اسرائیل رہتے تھے اِن کے ہاں ہفتے کے دن مچھلیاں پانی کی سطح پر آجاتی تھیں اور دوسرے دن پانی کی تہہ میں بیٹھ جاتی تھیں اور بمشکل ایک دو ہاتھ آتی تھیں۔ کچھ دن گزرنے پر شیطان نے اُن میں سے بعض کو یہ سکھایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہفتے کے دن مچھلی کھانے سے منع کیا ہے مچھلی کے شکار سے منع نہیں کیا۔ اس لئے اُن لوگوں نے یہ کیا کہ ہفتے کے دن ترکیب اور چالاکی سے مچھلیاں پکڑ لیتے اور دوسرے دن کھا لیتے تھے (معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب السبت کے مختلف حیلوں میں سے ایک حیلہ یہ بھی تھا) جب یہ حیلہ عام ہوگیا تو اہل حق نے اِن کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ ہفتے کے دن مچھلی پکڑنا، شکار کرنا اور کھانا سب منع ہے۔ تم لوگ اس حیلہ جوئی کو چھوڑ دو ورنہ اللہ کا عذاب تمہیں برباد کر ڈالے گا مگر اُنھوں نے نہ مانا تو اس اہل حق میں سے ایک جماعت اگلے ہفتے اِن سے جُدا ہوگئی اور مع اپنے اہل وعیال اِن سے دور جا بسی اور ایک جماعت نے ہفتے کی خلاف ورزی کو بُرا جانا مگر اِن نافرمانوں کے ساتھ ہی رہے سہے اور اِن سے ترکِ تعلق نہیں کیا۔ اور جب ترکِ تعلق کرنے والوں نے نافرمانوں کو ڈانٹا

اور عذاب الٰہی سے ڈرایا تو ترک تعلق نہ کرنے والوں نے نادانی سے کہا:۔

لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا۔ (اعراف آیت ۱۶۴)

ایسی قوم کو تم لوگ کیوں نصیحت کر رہے ہو جسکو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا کوئی شدید عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے۔

تو نصیحت کرنے والوں نے جواب دیا:۔

قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔ (اعراف آیت ۱۶۴)

وہ بولے اپنے پروردگار کے روبرو عذر خواہی کرنے کے لئے اور شاید کہ یہ لوگ تقویٰ اختیار کرلیں۔

بالآخر ایک روز نصیحت کرنے والی جماعت نے نافرمانوں کو مخاطب ہوکر کہا یا تو تم باز آجاؤ ورنہ کل تم پر کوئی عذاب نازل ہوکر رہے گا۔

اسکے بعد حضرت ابن عباسؓ نے نافرمانوں پر عذاب نازل ہونے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ میں دو جماعتوں کے انجام کا ذکر فرمایا ہے ایک سرکش و نافرمان انسانوں کی جماعت جو مسخ کے بعد ہلاک کر دی گئی۔ دوسری امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والی جماعت جو اس عذاب سے محفوظ رہی۔ لیکن تیسری جماعت جنھوں نے سکوت اختیار کیا (یعنی نہ امر بالمعروف کا فریضہ ادا کرتے رہے اور نہ ہی ترک تعلق کرلیا) ایسوں کے انجام کے ذکر سے قرآن حکیم ساکت ہے اور میرے دل میں ان لوگوں کے متعلق ایسے خیالات آتے ہیں کہ میں ان کو زبان سے کہنا پسند نہیں کرتا (یعنی کہیں وہ بھی عذاب میں پکڑ لئے گئے ہوں؟)

تب میں (عکرمہؓ) نے عرض کیا میں آپ پر فدا ہوجاؤں آپ اس بارے میں اس قدر پریشان نہ ہوں بلاشبہ یہ تیری جماعت بھی نجات پانے والوں میں ہی رہی اس لئے کہ خود قرآن حکیم ان کے متعلق کہتا ہے کہ انھوں نے

نصیحت کرنے والی جماعت سے کہا کہ تم ایسی جماعت کو کس لئے نصیحت کرتے ہو جسکی بداعمالیوں کی بنار پر اللہ تعالےٰ انھیں ہلاک کرے گا یا کسی سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا؟ تو اِن کے متعلق قرآن حکیم کی یہ تعبیر صاف صاف بتا رہی ہے کہ وہ ہلاک نہیں کئے گئے ورنہ اِن کا ذکر بھی ہلاک ہونے والوں ہی کے ساتھ کیا جاتا۔ نیز یہ جماعت اس عملِ بد کے بدکرداروں کی حرکات سے مایوس ہو کر ایسا کہتی تھی اس لئے بھی مستحق عذاب نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ سُنا تو بے حد مسرور ہوئے اور آیات کی اس تفسیر پر مجھکو خلعت بخشا۔ (انتہیٰ) (دُرِّ المنثور)

لیکن اس مسئلہ کی تفصیل یہ ہے کہ جہاں کہیں وعظ و نصیحت کے بے اثر ہو جانیکا ظنِ غالب ہو وہاں وعظ و نصیحت کرنا واجب نہیں رہتا سکوت کرنیکی اجازت ہو جاتی ہے البتہ عالی ہمتی پھر بھی یہی ہے کہ نصیحت کی جاتی رہے۔ اصحاب السبت میں اہل حق کی دونوں جماعتوں میں سے پہلی جماعت جو فریضہ تبلیغ ادا کرتی رہی اُس نے عالی ہمتی کو اختیار کیا اور دوسری جماعت نے رخصت و اجازت کو اختیار کیا (اگرچہ دل سے نفرت کرتے رہے)

غرض دونوں حق پر تھے اور دونوں کی نجات پانے کو حضرت عکرمہؒ نے استنباط کیا اور حضرت ابن عباسؓ نے اس استنباط کو پسند کر کے انعام بھی دیا۔

بخلاف اسکے کہ جہاں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ترک کر دیا جائے یا نفع کی اُمید کے باوجود تبلیغ نہ کی جائے یا نافرمانوں کے ساتھ خلا ملا رکھا جائے اور اُنکی نافرمانی کو بُرا بھی نہ سمجھا جائے وہاں ایسے لوگ نافرمان اور مجرمین میں شمار ہو جاتے ہیں۔

"مالک بن دینارؒ سے ایک روایت منقول ہے ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو حکم دیا کہ فلاں بستی کو اُلٹ دو، فرشتوں نے عرض کیا کہ اُس بستی میں آپ کا فلاں عبادت گزار بندہ بھی مقیم ہے۔ ایک اور روایت میں مزید یہ اضافہ ہے کہ اُس نے آنکھ جھپکنے تک بھی نافرمانی نہیں کی؟ حکم ہوا کہ اُس کو بھی اُنکے ساتھ عذاب کا مزہ چکھاؤ کیونکہ ہماری نافرمانیوں اور گناہوں کو دیکھ کر اسکو کبھی غصہ نہ آیا اُس کا چہرہ غصے سے

متغیر نہ ہوا۔

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ آپ کی قوم کے ایک لاکھ آدمی عذاب سے ہلاک کئے جائیں گے جنمیں چالیس ہزار نیک لوگ ہیں اور ساٹھ ہزار بدعمل۔ حضرت یوشع علیہ السلام نے عرض کیا رب العالمین بدکرداروں کی ہلاکت ظاہر ہے لیکن نیک لوگوں کو کیوں ہلاک کیا جا رہا ہے؟ ارشاد ہوا کہ یہ نیک لوگ بھی اِن بدکرداروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں۔ اِن کے ساتھ کھانے پینے اور ہنسی دل لگی کے شریک ہیں۔ میری نافرمانی دیکھ کر کبھی اِن کے چہروں پر کوئی ناگواری کا اثر تک نہ آیا۔

(تفسیر بحر محیط)

مسخ شدہ اقوام کا انجام

جو قومیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے مسخ کردی جاتی ہیں وہ زندہ باقی نہیں رکھی جاتیں بلکہ تین دن کے اندر اندر اِنکو فنا کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کی نسل کا سلسلہ جاری نہ ہو اور دنیا میں اُن کا وجود خود اُن کے لئے بھی عرصہ تک باعثِ ذلّت وخواری نہ رہے۔ روایات صحیحہ بھی اسکی تائید کرتے ہیں۔

حضرت ابن مسعودؓ سے منقول ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم نے دریافت کیا کہ کیا موجودہ بندر اور خنزیر مسخ شدہ یہود کی نسل میں سے ہیں؟

آپؐ نے ارشاد فرمایا نہیں! اللہ تعالےٰ جب کسی قوم پر مسخ کی لعنت مسلّط کرتا ہے تو اُس کی نسل نہیں چلاتا لیکن یہ جانور اللہ کی مستقل مخلوق ہیں۔ لہٰذا جب اللہ کا غضب یہود پر نازل ہوا تو اُن کو اِن جانوروں کی شکل میں مسخ کر دیا گیا تھا۔

(مسند احمد، ابوداؤد طیاسی، مسلم)

ایک اور روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ اللہ تعالےٰ

جب کسی قوم کو مسخ کرتا ہے تو نہ اُن کو باقی چھوڑتا ہے اور نہ اُن کی نسل چلتی ہے اور بندر و خنزیر تو مسخ کے واقعہ سے قبل بھی موجود تھے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مسخ شدہ انسان تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے اور نہ انھوں نے اس درمیان کھایا نہ پیا اور نہ اُن کی نسل کا سلسلہ چلا۔

(ابن کثیر ج جلد ۱)

واللہ تعالیٰ اعلم۔

تذکرہ
اصحابُ الرّسّ
(کنویں والے)

اصحابِ رسّ

لفظ رس عربی زبان میں مختلف معنی کے لئے آتا ہے۔ اسکے مشہور معنی "کچے کنویں" کے ہیں۔ یعنی ایسا کنواں جو اینٹ پتھر وغیرہ سے بنایا نہ گیا ہو۔ اسکے دوسرے معنی گڑھے اور غار کے بھی آتے ہیں۔ قرآن حکیم نے ایک قوم کو اسی نسبت کے ساتھ "کنویں والوں" کے نام سے ذکر کیا ہے۔

(۱) مؤرخ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں یہ رجحان ظاہر کیا ہے کہ اصحاب الرّس قوم عاد سے بھی صدیوں پہلے گزری ہے۔ جس جگہ یہ آباد تھے وہاں اللہ تعالیٰ نے ایک پیغمبر حنظلہ بن صفوان علیہ السلام کو مبعوث کیا تھا۔ اُنھوں نے اِن میں رہ کر تبلیغ اسلام کا فریضہ ادا کیا مگر اصحاب الرس نے انکی نصیحت قبول نہ کی اور اپنے پیغمبر کو قتل کر دیا۔ اس پاداش میں وہ سب ہلاک کر دیئے گئے۔

(۲) ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ آذربائیجان (روس) کے قریب ایک کنواں تھا اور یہ قوم اسکے اطراف آباد تھی اس لئے وہاں کے بسنے والوں کو اصحاب الرّس کہا گیا۔

(۳) عکرمہؒ کہتے ہیں کہ اس کنویں کے قریب آباد قوم نے اپنے نبی کو اُنکی دعوت و تبلیغ سے بیزار ہوکر کنویں میں زندہ دفن کر دیا تھا اسلئے اُس قوم کو اصحابُ الرّس کہا گیا (کنویں والے)

(۴) قتادہؒ کہتے ہیں کہ یمامہ کے علاقے میں فلج نامی ایک بستی تھی

اصحاب الرس وہیں آباد تھے اور یہ اور اصحاب یاسین (اصحاب القریہ) ایک ہی ہیں اور یہ مختلف نسبتوں سے پکارے جاتے ہیں۔

ابو بکر بن حسن نقاش اور علامہ سہیلی کہتے ہیں کہ اصحاب الرس کی آبادی میں ایک بہت بڑا کنواں تھا جس کے پانی سے وہ پینے اور کھیتی سیراب کرنے کا کام لیتے تھے۔ اس بستی کا بادشاہ بہت عادل تھا لوگ اس سے بیحد محبت کرتے تھے اسکا جب انتقال ہو گیا تو اہل شہر اسکی موت سے سخت غمگین ہوئے۔ ایک دن شیطان اس بادشاہ کی شکل بنا کر پہنچا اور اہل شہر کو جمع کر کے تقریر کی کہ میں تم سے چند دنوں کے لئے جُدا ہو گیا تھا مگر انہیں اب آگیا ہوں اور ہمیشہ زندہ رہوں گا۔ لوگوں نے انتہائی عقیدت میں یقین کر لیا اور اسکی آمد پر جشن عام کیا تب شیطان نے انکو حکم دیا کہ وہ ہمیشہ مجھ سے پسِ پردہ باتیں کیا کریں چنانچہ اسکے حکم کی تعمیل کی گئی اور وہ پسِ پردہ بیٹھ کر گمراہی پھیلانے لگا۔ اس وقت حضرت حنظلہ بن صفوان کو اللہ تعالےٰ نے پیغمبر بنا کر بھیجا۔ حضرت ابن صفوان نے توحید کی تعلیم اور شرک سے اجتناب کی تلقین کی اور بتایا کہ یہ تمہارا بادشاہ نہیں ہے بلکہ پسِ پردہ شیطان ہے۔ لوگوں کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور انھوں نے اللہ کے رسول کو کنویں میں بند کر دیا۔ اس پاداش میں اللہ تعالےٰ نے اُس قوم کو ایک عذاب سے ہلاک و برباد کر دیا۔ کل تک جس شہر میں چہل پہل تھی اور باغات اور نہروں کی شادابی تھی وہ جل بھن کر چٹیل میدان ہو گیا۔

(تفسیر ابن کثیر سورۂ فرقان و تاریخ ابن کثیر ج ۱)

(۶۱) محمد بن کعب قرظیؒ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں سب سے پہلے جو شخص داخل ہو گا وہ ایک سیاہ فام غلام ہو گا۔ اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے ایک بستی میں اپنا پیغمبر مبعوث کیا تھا مگر اس کالے کلوٹے غلام کے سوا کسی نے ان کو قبول نہ کیا اور کوئی ایمان نہیں لایا۔ پھر اہل بستی نے اسی پہ اکتفا نہیں کیا بلکہ نبی مرسل کو ایک کنویں میں بند کر دیا اور پھر کنویں کے منہ پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا تاکہ کوئی

کھول نہ سکے مگر یہ سیاہ فام غلام جنگل سے لکڑیاں لاتا اور بازار میں فروخت کر کے اس کا طعام خریدتا اور روزانہ کنویں پر پہنچکر کسی طرح اللہ تعالےٰ کے اس محبوس پیغمبر کی خدمت میں کھانا پیش کرتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد اللہ تعالےٰ نے اُس غلام پر جنگل ہی میں ایک گہری نیند طاری کردی اور یہ چودہ سال تک اسی حالت میں پڑا سوتا رہا۔ یہاں تک تو یہ ہوا اور اُدھر قوم کو اپنی نازیبا حرکت پر افسوس ہوا اور اُنھوں نے اللہ کے رسول کو کنویں سے باہر نکال لیا اور توبہ کے بعد ایمان قبول کرلیا اور اسی مدت کے اندر پیغمبر کا انتقال ہوگیا۔ چودہ سال کے بعد جب غلام کی آنکھ کھُلی تو اُس نے سمجھا کہ میں چند گھنٹے سویا ہوں جلدی سے لکڑیاں چن کر شہر پہنچا دیکھا تو حالات بدلے ہوئے تھے دریافت کیا تو سارا قصہ معلوم ہوا۔

اسی غلام کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں سب سے پہلے ایک سیاہ فام غلام داخل ہوگا۔

(مروج الذہب ص۸۶)

(۷) مؤرخ مسعودی کہتے ہیں کہ اصحاب الرس حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ یہ دو قبیلے تھے ایک قید ماں (قید ماہ) اور دوسرا یامین اور یہ یمن میں آباد تھے۔ مؤلف ارض القرآن علامہ سلیمان ندوی نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ (ارض القرآن ۲۲)

(۸) ضحاک اور دیگر مفسرین نے لکھا ہے کہ جب حضرت صالح علیہ السلام کی قوم (ثمود) پر عذاب آیا تو ان میں چار ہزار آدمی جو حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لاچکے تھے وہ عذاب سے محفوظ رہے۔ یہ لوگ اپنے مقام سے منتقل ہوکر حضر موت (یمن) میں مقیم ہوگئے۔ حضرت صالح علیہ السلام بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان لوگوں نے ایک کنویں کے قریب اپنی بستی قائم کی۔ کچھ عرصہ بعد حضرت صالح علیہ السلام کا انتقال ہوگیا۔ یہ لوگ یہیں پڑے رہے۔ پھر ان کی نسل میں بت پرستی شروع ہوگئی۔ انکی اصلاح کے لئے اللہ تعالےٰ نے ایک نبی کو بھیجا جسکو انھوں نے قتل

کر دیا۔ اسپر اللہ کا عذاب آیا ان کا وہ کنواں جس پر انکی زندگی کا انحصار تھا خشک ہو گیا اور عمارتیں ویران ہو گئیں۔ قرآن حکیم نے اس بستی کی تباہی کا حال اس آیت میں بیان کیا ہے:۔

وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ۔ (الحج آیت ۴۵)

یعنی عبرت والوں کے لئے ان کا ناکارہ کنواں اور پختہ عمارات ویران پڑے ہیں۔

قرآن حکیم اور اصحابُ الرّس

قرآن حکیم کی سورۃ فرقان اور سورۃ قٓ میں اصحاب الرس کا ذکر آیا ہے اور وہ بھی صرف گنہگار قوموں کی فہرست کے ضمن میں ان کے حالات و واقعات کا قرآن حکیم میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا اور نہ ہی صحیح روایات میں انکی تفصیل موجود ہے۔

یہ قرآن حکیم ہی کی نشان دہی ہے جس نے اس قوم کا تعارف کر دا یا ورنہ معدوم الذکر اقوام کی طرح اس قوم کا بھی کوئی ذکر نہ ہوتا۔ قرآن حکیم میں قدیم اقوام کا تذکرہ اپنے مقصد موعظت و عبرت کے لئے ہے۔ تاریخی تعینات اور مباحث اس کا نہ منشا ہے اور نہ مقصد۔

جو قومیں اس دنیا میں پیغامِ حق کو ٹھکراتی ہیں اور اسکی مخالفت کا عَلم بلند کرتی ہیں اور مسلسل ڈھیل دینے کے باوجود اپنی متکبرانہ و مجرمانہ زندگی کو ترک کر کے پاکیزہ زندگی بسر کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں۔ اِن پر اللہ تعالیٰ کی سخت گرفت (بطش شدید) آجاتی ہے اور وہ بے یار و مددگار ہلاک کر دی جاتی ہیں۔

انہی اقوام میں ایک گنہگار قوم اصحاب الرّس کی بھی گزری ہے جن کے بارے میں قرآن حکیم نے یہ انجام بتایا ہے۔

قرآنی مضمون

وَعَادًا وَّثَمُوْدَ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا۔ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا۔ (الفرقان آیت ۳۸، ۳۹)

اور عاد اور ثمود اور اصحاب الرس کو اور اِن کے درمیانی زمانے کی بہت

سی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا اور ہم نے ہر ایک کے واسطے مثالیں بیان کیں اور ہم نے اُن سب کو ہلاک کر دیا۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّأَصْحَابُ الرَّسِّ وَثَمُودُ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَإِخْوَانُ لُوطٍ وَّأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيدِ۔ (ق آیت ۱۲ تا ۱۴)

رسولوں کو جھٹلایا ان سے پہلے بھی نوح کی قوم نے اور کنویں والوں نے اور ثمود اور عاد اور فرعون اور قوم لوط اور اصحاب الایکہ اور تبع کی قوم نے۔ اِن میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا پھر ان پر عذاب لازم ہوا۔

نتائج و عبر

ایک گہری حقیقت کائناتِ انسانی کے پاس جس وقت سے اپنی تاریخ کا ذخیرہ موجود ہے وہ اس حقیقت سے خوب واقف ہے کہ دنیا کی جس قوم نے بھی پیغامِ حق کے ساتھ استہزار کیا اور اللہ کے ہادی اور رسولوں کے ساتھ سرکشی و بغاوت کا رویہ جاری رکھا۔ ان کی زبردست طاقت و شوکت اور عظیم الشان تمدن کے باوجود اللہ عظیم کے قاہرانہ اقتدار نے ہلاک و برباد کر کے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا۔

مگر عجیب بات ہے کہ اپنے پیشروں کے عبرتناک انجام کو دیکھنے اور سننے کے باوجود انکی وارث قوموں نے تاریخ کو پھر دہرایا اور اسی قسم کی روش اختیار کی جن کے انجام میں ان کے پیشرؤں کو روز بد دیکھنا پڑا تھا۔

قوم نوحؑ، قوم عادؑ، قوم ثمودؑ، قوم ابراہیمؑ، قوم شعیبؑ، قوم فرعون، قوم لوطؑ، اصحاب الایکہ، قوم تبع اور اصحاب الرس کے یہ قدیم تذکرے انہی عبرتناک واقعات سے پُر ہیں۔ اور آج بھی اقوام عالم کے لئے قرآن حکیم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس نے اقوام قدیم کی اِن داستانوں سے

قوموں کو آگاہ کیا اور ان کے عبرتناک انجام سے روشناس کروایا ہے ورنہ یہ وہ قومیں تھیں جنکی تاریخ پر صدیوں سے سیاہ پردے پڑے ہوئے تھے۔

قرآن حکیم نے اس گہری حقیقت کو مختلف مقامات پر ظاہر کیا ہے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِى الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ (قٓ آیت ۳۶، ۳۷)

اور ہم ان سے قبل بہت سی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو قوت وطاقت میں ان سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر تھے اور تمام شہروں کو چھانتے پھرتے تھے۔ پھر بھی انھیں کہیں بھاگنے کی جگہ نہ ملی۔ اس مضمون میں بڑی عبرت ہے اُس شخص کے لئے جس کے پاس دل ہے یا وہ متوجہ ہوکر کان ہی لگا دیتا ہے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ۔

(القصص آیت ۵۸)

اور ہم کتنی ہی بستیاں ہلاک کر چکے ہیں جنہیں اپنی خوش عیشی پر ناز تھا یہ اُن کے گھر اُجڑے پڑے ہیں کہ اُن کے بعد آباد ہی نہ ہوئے مگر تھوڑی دیر کے لئے (کہ کوئی مسافر چلتے راہ ستانے کو یا تماشہ دیکھنے کے لئے بیٹھ جائے) اور ہم ہی مالک رہے (یعنی ان کا کوئی ظاہری وارث بھی نہ رہا۔ اسمیں تنبیہ ہے دنیا والوں کو کہ وہ اپنی خوش عیشی اور خوشحالی پر نازاں نہ ہوں)

اہل مغرب کی خوشحالی آج بہت سے لوگوں کو ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے حالانکہ ان کی یہ تصویر واقعہ اور حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ مغرب کی یہ تجارتی منڈی یوں بھی بہت بڑی تجارتی منڈی ہے۔ اس صورت حال نے انھیں امیر کبیر بلکہ کہنا چاہیئے کروڑپتی بنا دیا ہے۔ ایسی خوشحال آبادی کے سامنے عبرت اور نصیحت کے لئے قرآن حکیم نے قدیم قوموں کے تذکرے بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔

سورۂ ہود میں سیدنا نوح علیہ السلام سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے

درمیانی واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ انبیاء ورسل کی دعوت و تبلیغ اور قوموں کو بغاوت اور سرکشی اور مخالفت کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ نقل کیا گیا ہے پھر آخر میں اقوام عالم کو اس بلیغ ترین انداز سے متنبہ کیا گیا جو صرف اللہ کے عظیم کلام ہی کا اعجاز ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ۔ الخ

(ھود آیت ۱۰۰ تا ۱۰۳)

یہ جو کچھ واقعات ہیں اِن غارت شدہ بستیوں کے بعض حالات تھے جن کو ہم آپ سے بیان کرتے ہیں۔ بعض بستیاں تو اُن میں اب بھی قائم ہیں اور بعض کا بالکل ہی خاتمہ ہو گیا ہے اور ہم نے اُن بستیوں والوں کو جو سزائیں دیں ہیں سو ہم نے اُن پر ظلم نہیں کیا لیکن اُن بستیوں والوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا ہے جن سے وہ سزا کے مستحق ہوئے سو اُن کے وہ معبود جن کو وہ پوجا کرتے تھے اللہ کو چھوڑ کر ان کو کچھ بھی فائدہ نہ پہنچا سکے۔ جب اے نبی آپ کے رب کا حکم آ پہنچا، فائدہ تو کیا پہنچاتے اور اُلٹا ان کو نقصان پہنچایا۔ اور آپ کے رب کی پکڑ ایسی سخت ہے جب وہ کسی بستی والوں پر گرفت کرتا ہے جبکہ وہ ظلم کیا کرتے ہوں، بلاشبہ اللہ کی گرفت بڑی تکلیف دہ اور سخت ترین ہے۔

اِن واقعات میں اُس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ آخرت کا دن ایسا دن ہوگا کہ اُس میں تمام آدمی جمع کیے جائیں گے اور وہ سب کی حاضری کا دن ہے۔

تذکرہ ذوالقرنین

تمہید ذوالقرنین کا واقعہ اپنی قدیم اور مستند تاریخی روایت کے لحاظ سے تین اہم حصوں پر مشتمل ہے :-

ذوالقرنین ۔ سدّ ذوالقرنین ۔ یاجوج و ماجوج

چونکہ ہر ایک حصہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے ۔ اس لئے کتب تاریخ میں ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ۔ سلف میں اگرچہ مسائل زیر بحث کے متعلق ایسے اقوال بکثرت ملتے ہیں جو ان واقعات کی تفسیر و تفصیل کی غرض سے بیان کئے گئے ہیں لیکن متاخرین علماء نے اس سلسلہ میں دو جُدا جُدا راہیں اختیار کی ہیں ۔

ان میں ایک طبقہ سلف کے بعض اقوال کو نقل کرنے کے بعد یہ کہہ دینے پر اکتفا کرتا ہے کہ زیر بحث مسائل سے متعلق اقوال چونکہ قرآن حکیم کی بیان کردہ شخصیت ذوالقرنین کے ساتھ پوری طرح مطابقت نہیں کرتے ۔ اس لئے ہمارے لئے یہ کافی ہے کہ قرآن حکیم نے جس حد تک ذوالقرنین کی شخصیت اور سدِّ ذوالقرنین اور یاجوج و ماجوج پر روشنی ڈالی ہے ۔ بلاشبہ وہ حق ہے اور باقی تفصیلات یعنی اُنکی شخصیت کا تاریخی مصداق ، سدّ ذوالقرنین کا جائے وقوع ، قوم یاجوج و ماجوج کا تعین ۔ ان کے علم کو علم الٰہی کے سپُرد کر دینا چاہیئے ۔ ذوالقرنین کا جسقدر قصہ قرآن حکیم نے بیان کیا ہے وہ صرف اتنا ہے :-

وہ ایک نیک عادل بادشاہ تھے جو مشرق و مغرب میں پہونچے اور اُن ممالک کو فتح کیا اور ان میں عدل و انصاف کی حکمرانی کی ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ہر طرح کے سامان اپنے مقاصد پورا کرنے کے لئے عطا کر دیئے گئے تھے ۔ اُنھوں نے فتوحات کرتے ہوئے تین بڑے

سفر کئے۔ مغرب اقصیٰ تک اور مشرق اقصیٰ تک۔ پھر جانب شمال کوہستانی سلسلے تک۔

اسی جگہ انھوں نے دو پہاڑوں کے درمیانی درّے کو ایک عظیم الشان آہنی دیوار کے ذریعہ بند کر دیا جس سے اُس علاقے کے لوگ یاجوج ماجوج کی یلغار سے محفوظ ہوگئے۔"

دوسرے طبقۂ علماء کی رائے ان مسائل میں پہلے طبقے سے مختلف ہے۔ یہ حضرات قرآن حکیم کی عطاکردہ روشنی میں ان کے حقائق کی تفصیلات کو واضح کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کیونکہ قرآن حکیم نے ذوالقرنین کے معاملہ کو یہودیوں کے سوال کرنے پر بیان کیا ہے اور اسی بناءً پر وہ ایسا اُسلوب بیان اختیار کیا ہے جس سے سوال کرنے والی جماعت اسکو تسلیم کرنے پر مجبور ہوجائے جیسا کہ اس واقعہ کے شانِ نزول سے بھی واضح ہے۔

نیز اس لئے بھی یہ مسائل قابل تحقیق ہیں کہ قرآن حکیم کے اسلوب بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی علماء اس تاریخی حقیقت سے بخوبی واقف تھے اور اُن کی قومی اور مذہبی زندگی کا اس کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔ کیونکہ اُنھوں نے اس مسئلہ کو مشرکین کی اعانت کے لئے اس لئے انتخاب کیا کہ اس سوال سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا بآسانی امتحان ہوجائے گا۔ لہٰذا جو معاملہ آج سے چودہ سو سال پہلے تک لوگوں کی معلومات میں تھا اور جسکی تفصیلات وہ قومیں بخوبی جانتی تھیں اسکے متعلق یہ کہہ کر سبکدوش ہوجانا کہ واقعہ کی تفصیلات غیر ضروری ہیں قرآن حکیم کی تفسیری خدمت کے مناسب نہیں ہے۔

علاوہ ازیں جب کہ ہم اللہ تعالیٰ کی اس وسیع وعریض زمین کے بہت سے حصوں سے ابھی تک ناواقف ہیں تو ممکن ہے کہ اس واقعہ سے متعلق شخصیتیں اور مقامات بھی اسی طرح غیر معلوم ہوں اور ہم ابھی تک ان کا پتہ لگانے سے قاصر رہے ہوں۔ چنانچہ علماء محققین مثلاً حافظ ابن کثیرؒ، حافظ ابن تیمیہؒ، ابوحیانؒ، ابن عبد البرؒ، امام رازیؒ، حافظ ابن حجرؒ، شیخ بدر الدین عینیؒ، ابن ہشامؒ وغیرہم ان مسائل سہ گانہ کی تحقیق و تدقیق کے درپے نظر آتے ہیں اور اپنے اپنے رجحان کے مطابق فیصلہ دینا چاہتے ہیں۔

ذُوالقرنین | قرآن حکیم نے ذُوالقرنین کے واقعہ کو از خود بیان نہیں کیا ہے بلکہ یہودیوں

کی جانب سے سوال کرنے پر ان کا تذکرہ کیا ہے۔

محمد بن اسحٰق نے حضرت ابن عباس رضؓ سے نقل کیا ہے کہ قریشِ مکہ نے اپنے دو آدمی نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط کو یہودی علماء کے پاس یہ پیغام دے کر روانہ کیا :۔

”چونکہ تم لوگ اپنے آپ کو اہل کتاب کہتے ہو اور تمہارا یہ دعویٰ بھی ہے کہ تمہارے پاس گزشتہ زمانے کے پیغمبروں کا وہ علم بھی ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے لہذا تم لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق ہم کو یہ بتائیں کہ اِن کے دعویٰ پیغمبری کی صداقت کے متعلق آپ حضرات کی الہامی کتابوں میں کوئی تذکرہ یا علامات موجود ہیں ؟“

چنانچہ قریش کا یہ دو رکنی وفد یثرب (مدینہ) پہونچکر علماء یہود سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا یہودی علماء نے اِن سے کہا تم اور باتوں کو چھوڑو ہم تم کو تین سوالات بتائے دیتے ہیں اگر وہ نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ان کا صحیح جواب دیدے تو سمجھ لینا کہ وہ اپنے دعویٰ نبوت میں سچے ہیں اور نبی مرسل ہیں تم پر ان کی پیروی واجب ہے۔ اور اگر وہ صحیح جواب نہ دے سکے تو وہ جھوٹا ہے پھر تم کو اختیار ہے کہ جو معاملہ ان کے ساتھ چاہو کر لو۔ وہ سوالات یہ ہیں :۔

(۱) اُس شخص کا حال بیان کیجئے جو مشرق و مغرب تک فتوحات کرتا چلا گیا۔

(۲) اُن چند نوجوانوں پر کیا گزرا جو کافر بادشاہ کے خوف سے پہاڑ کی کھوہ میں جا چھپے تھے ؟

(۳) رُوح کے متعلق بیان کیجئے کہ وہ کیا چیز ہے ؟

قریش کا یہ وفد مکہ واپس آیا اور اُس نے قریش کو یہودی علماء کی گفتگو سنائی۔ قریش نے سنکر کہا کہ اب ہمارے لئے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں فیصلہ کرنا آسان ہو گیا۔ کیونکہ یہود کے اِن سوالات کا جواب دینا ایک امی انسان کے لئے جب ہی ممکن ہے کہ اللہ کی وحی اسکی جانب آتی ہو۔

چنانچہ قریش مکہ نے آپکی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر تینوں سوالات پیش کیے، انہی سوالات کے جوابات کے لئے آپ پر سورہ کہف نازل ہوئی۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص۲۲) جسمیں

اِن تین سوالات کے جواب ہیں۔

ذُوالقرنین اور سکندر

ذوالقرنین کس شخصیت کا لقب ہے۔ اس بحث سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ بعض حضرات کو یہ سخت مغالطہ ہوگیا ہے کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے جس کا ذکر قرآن حکیم کی سورۂ کہف میں کیا گیا ہے۔ یہ قول باتفاق جمہور علماء سلف وخلف قطعاً باطل اور ناواقفیت پر مبنی ہے اس لئے کہ قرآن حکیم کی تصریحات کے مطابق ذوالقرنین صاحب ایمان اور مرد صالح بادشاہ تھے اور سکندر مقدونی (یونانی) مشرک اور ظالم بادشاہ گزرا ہے۔ جس کے شرک وظلم کی صحیح تاریخ خود اسکے بعض امراء دربار نے بھی مرتب کی ہے۔ امام بخاری نے اپنی کتاب میں احادیث الانبیاء کے عنوان کے تحت ذوالقرنین کے واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرے سے قبل نقل کیا ہے۔ اس تقدیم کی وجہ حافظ ابن حجرؒ اس طرح لکھتے ہیں:۔

> مصنف (بخاری) نے ذُوالقرنین کے واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرے سے قبل اس لئے بیان کیا ہے کہ وہ (بخاری) اُس شخص کے قول کی اہانت کرنا چاہتے ہیں جو سکندر یونانی کو ذوالقرنین کہتا ہے۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۴)

مقصد یہ ہے کہ ذوالقرنین جس کا تذکرہ قرآن حکیم میں آیا ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے پہلے کے ہیں یا بعض روایات کے تحت ہمعصر ہیں۔ اور سکندر مقدونی (یونانی) حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے صرف تین سو سال پہلے گزرا ہے اور جسکی جنگ مشہور زمانہ دارا سے ہوئی اور جس نے مصر کا مشہور شہر اسکندریہ آباد کیا تھا اور جس کا وزیر مشہور فلسفی ارسطو تھا۔

یہ مغالطہ بعض اکابر مفسرین کو بھی ہوگیا۔ ابوحیان نے تفسیر بحر محیط اور علامہ آلوسیؒ نے تفسیر روح المعانی میں اسی شخص کو ذوالقرنین کا مصداق قرار دیا ہے۔

الغرض جن حضرات نے سکندر مقدونی کو ذُوالقرنین کہا ہے۔ غالباً اُن کو اُس روایت سے مغالطہ ہوا ہوگا جو امام طبریؒ نے اپنی تفسیر میں اور محمد بن ربیع جیزیؒ نے کتاب الصحابہ میں نقل کی ہے۔ جس میں اسکو رُومی اور بانی شہر اسکندریہ کہا گیا ہے۔ مگر یہ روایت ضعیف

اور ناقابل اعتماد ہے۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۴)

اسحٰق بن بشر نے بروایت سعید بن بشیر قتادہ سے نقل کیا ہے کہ ذوالقرنین کا نام سکندر تھا اور یہ سام بن نوحؑ کی نسل سے تھے لیکن اسکندر بن فیلپس (مقدونی) کو بھی ذوالقرنین کہنے لگے ہیں جو رومی اور بانی شہر اسکندریہ ہے۔ مگر یہ واضح رہے کہ یہ دوسرا ذُوالقرنین پہلے سے بہت زمانہ بعد پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ سکندر مقدونی حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً تین سو سال پہلے ہوا ہے اور مشہور فلسفی ارسطاطالیس (ارسطو) اس کا وزیر تھا اور یہی بادشاہ ہے جس نے دارا کو قتل کیا اور ملک فارس کے بادشاہ کو ذلیل کر کے اس کے ملک پر قبضہ کر لیا۔ ہم نے یہ تنبیہ اس لئے کردی کہ بہت سے آدمی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی شخصیت ہیں اور یہ اعتقاد کر بیٹھتے ہیں کہ قرآن حکیم میں جس ذُوالقرنین کا ذکر ہے وہ یہی سکندر مقدونی ہے جس کا وزیر ارسطاطالیس فلسفی تھا اور اس اعتقاد کی بدولت بہت بڑی غلطی اور بہت بڑی خرابی پیدا ہو جاتی ہے اس لئے کہ ذُوالقرنین اوّل مسلمان اور عادل بادشاہ تھے اور ان کے وزیر خضر (علیہ السلام) تھے جن کے متعلق ہم ثابت کر آئے ہیں کہ وہ نبی تھے اور دوسرا (مقدونی) مشرک تھا اور اس کا وزیر فلسفی تھا اور ان دونوں کے درمیان تقریباً دو ہزار سال سے بھی زیادہ کا فصل ہے۔ پس کہاں یہ (مقدونی) اور کہاں وہ (عربی سامی) اور ان دونوں کے درمیان اس درجہ امتیازات ہیں کہ سوائے بے خبر اور حقائق سے ناآشنا انسان کے دوسرا کوئی شخص ان دونوں کو ایک کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

(البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۰۶)

امام رازی نے اگرچہ سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کا لقب دیا ہے مگر اس کے باوجود ان کو بھی یہ اقرار ہے کہ

ذوالقرنین نبی تھے اور سکندر مقدونی کافر تھا اور اس کا معلّم اور وزیر ارسطو تھا جو بلاشبہ کافر ہے۔ (تفسیر کبیر سورۂ کہف)

حافظ ابن حجرؒ نے بھی اس مغالطہ کی وجہ یہ نقل کی ہے کہ چونکہ قرآنی ذوالقرنین کی حکومت نہایت وسیع وعریض رہی ہے اور سکندر یونانی بھی وسیع حکومت پر حکمراں رہا ہے اس لئے اسکو بھی ذوالقرنین کہہ دیا گیا۔ نیز سب سے پہلے محمد بن اسحٰق نے اپنی کتاب سیرت میں ذوالقرنین کا نام سکندر نقل کیا ہے اور چونکہ ان کی یہ کتاب بہت مشہور ومقبول ہوئی ہے اس لئے یہ نام بھی شہرت پا گیا۔

الغرض حافظ حدیث شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، امام ابن عبد البرؒ، زبیر بن بکارؒ، ابن حجرؒ، ابن کثیرؒ اور علامہ عینی جیسے محققین نے اس مغالطہ کی شدت سے تردید کر دی ہے اور یہ حقیقت بھی ہے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ وہ ذوالقرنین جن کا ذکر قرآن حکیم میں ہے کون ہیں اُن کا کیا نام ہے؟ اور کس زمانے میں ہوئے ہیں؟

اسکے متعلق بھی علمار تاریخ کے اقوال مختلف ہیں۔ ابن کثیرؒ کی تحقیق اور رجحان یہ ہے کہ وہ نبی تھے اور اُن کا زمانہ سکندر مقدونی سے دو ہزار سال پہلے کا ہے اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہم زمانہ ہیں اور اِن کے وزیر حضرت خضر علیہ السلام تھے۔

نیز ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں سلف صالحین سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ذوالقرنین پیادہ پا حج کے لئے پہونچے، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اِن کے آنے کا علم ہوا تو مکہ مکرمہ سے باہر نکل کر استقبال کیا اور اُن کے لئے دُعا بھی کی اور چند نصیحتیں بھی فرمائیں۔ اور ایک روایت یہ بھی نقل کی کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ خانہ کعبہ کا طواف کئے اور قربانی دی۔ (البدایہ ج ۲ ص ۱۰۲)

ابو ریحان بیرونی نے اپنی کتاب الاثار الباقیہ عن القرون الماضیہ میں لکھا ہے ذوالقرنین کا نام ابو بکر بن سمیّ بن عمر بن افریقیس حمیری ہے۔ جس نے زمین کے مشارق ومغارب کو فتح کیا۔

ابن ہشام کی رائے ہے کہ ان کا نام مصعب بن عبد اللہ تھا۔ حافظ ابن حجرؒ کا رجحان بھی اسی جانب ہے۔ پھر نام کی طرح لقب "ذوالقرنین" کی وجہ تسمیہ میں بھی اختلاف نقل کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ چونکہ وہ روم اور فارس دو مملکتوں کے مالک تھے اور قرن کے معنی سینگ کے ہیں بطورِ استعارہ طاقت اور حکومت کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے یعنی دو حکومتوں کا مالک۔

امام زہری کی رائے یہ ہے کہ چونکہ وہ فتوحات کرتے ہوئے اقصائے مشرق و مغرب تک پہنچے اس لئے ذوالقرنین لقب ہوا۔ (یعنی دونوں جانب کے مالک)

بعض مؤرخین نے یہ وجہ نقل کی ہے کہ انھوں نے اس قدر طویل عمر پائی کہ دنیا کے دو قرن (دو صدیوں) تک زندہ رہے اس لئے ذوالقرنین کہا گیا۔ واللہ اعلم۔ (فتح الباری و تاریخ ابن کثیر ج ۲)

ذوالقرنین کے اس تاریخی واقعہ میں یہ بات پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ قرآن حکیم نے پورا قصہ اور اسکی تاریخ ذکر کرنے کا وعدہ نہیں کیا بلکہ اس تذکرے کا ایک حصہ بیان کیا ہے۔

قرآن حکیم کا یہ جملہ اسکی شہادت دیتا ہے:۔

قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا۔ (الکہف آیت ۸۳)

اے نبیؐ تم کہدو میں اس کا کچھ حال تمہیں پڑھکر سنا دیتا ہوں۔

لہٰذا ذوالقرنین کے بارے میں تاریخی بحث، نام و نسب و زمانے کی تفصیلات کو قرآن حکیم نے غیر ضروری قرار دیا ہے۔

بنیادی طور پر قرآن حکیم میں ذوالقرنین کے چار اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) ان کا لقب ذوالقرنین۔

(۲) وہ بہت بڑے فرمانروا تھے جنکی فتوحات مشرق سے مغرب تک پہنچی تھیں اور تیری جانب شمال یا جنوب میں بھی وسیع ہوئی تھیں۔

(۳) اُنھوں نے یاجوج و ماجوج کے حملوں سے بچاؤ کے لئے کسی پہاڑی درّے پر ایک مستحکم دیوار بنائی ہے۔

(۴) وہ صاحب ایمان اور عادل فرمانروا تھے۔

ذوالقرنین کا یہ مشہور زمانہ واقعہ قرآن حکیم اس طرح بیان کرتا ہے۔

قرآنی مضمون

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ. الخ

(الکہف آیات ۸۳ تا ۹۹)

اور اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ لوگ تم سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں اِن سے کہو میں ان کا کچھ حال تم کو پڑھ کر سناتا ہوں۔

ہم نے ان کو زمین میں اقتدار عطا کیا تھا اور ہر قسم کے اسباب و وسائل دیئے تھے۔

اُنھوں نے (پہلے مغرب کی طرف ایک مہم کا) سرو سامان کیا۔

حتّٰی کہ جب وہ غروب آفتاب کی حد تک پہنچ گئے تو انھوں نے سورج کو ایک کالے پانی کی جھیل میں ڈوبتے پایا اور وہاں اُن کو ایک قوم ملی، ہم نے کہا اے ذوالقرنین تمہیں یہ اختیار ہے کہ اِن کو تکلیف پہنچائیں یا یہ بھی کہ اِن کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کریں۔

اُنھوں نے کہا جو ان میں سے ظلم کرے گا ہم اُس کو سزا دینگے پھر وہ اپنے رب کی طرف پلٹایا جائے گا اور وہ اُسے اور زیادہ سخت عذاب دے گا۔

اور جو اُن میں سے ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اُسکے لئے اچھی جزا ہے اور ہم اسکو نرم احکام دیں گے۔

پھر انھوں نے ایک دوسری مہم کی تیاری کی یہاں تک کہ طلوع آفتاب کی حد تک جا پہنچے وہاں اُنھوں نے دیکھا کہ سورج ایک ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے جس کے لئے دھوپ سے بچنے کا کوئی سامان ہم نے نہیں کیا ہے۔ (غالباً جنگلی اور وحشی قوم ہوگی جو مکان وغیرہ بنانا جانتے نہ ہوں) یہ حال تھا اُن کا اور ذوالقرنین کے پاس جو کچھ تھا اُسے ہم جانتے تھے۔

پھر اُنھوں نے (ایک تیسری مہم کا) سامان کیا۔

یہاں تک کہ جب دو پہاڑوں کے درمیان پہنچے تو اُن پہاڑوں سے اُس طرف ایک قوم کو پایا جو مشکل ہی سے کوئی بات سمجھتی تھی۔

اُن لوگوں نے کہا اے ذوالقرنین یاجوج اور ماجوج اس سرزمین میں

فساد پھیلاتے ہیں تو کیا ہم آپ کو کوئی ٹیکس اس کام کے لئے دیں کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک بند تعمیر کر دیں۔

اُنھوں نے کہا، جو کچھ میرے رب نے مجھے دے رکھا ہے وہ بہت ہے۔ تو تم بس محنت سے میری مدد کر دیں تمہارے اور اُن کے درمیان بند بنائے دیتا ہوں۔

مجھے لوہے کی چادریں لاکر دو، آخر جب دونوں پہاڑوں کے درمیانی خلا کو اُنھوں نے پاٹ دیا تو لوگوں سے کہا کہ اب آگ دہکاؤ حتیٰ کہ جب (یہ آہنی دیوار) بالکل آگ کی طرح سُرخ کر دیا تو اُنھوں نے کہا لاؤ اب میں اُس پر پگھلا ہوا تانبا انڈیلوں۔

(یہ بند ایسا تھا کہ (یاجوج اور ماجوج اس پر چڑھ کر بھی نہ آسکتے تھے اور اُسمیں نقب لگانا اُن کے لئے اور بھی مشکل تھا۔

ذوالقرنین نے کہا یہ میرے رب کی رحمت ہے۔ مگر جب میرے رب کے وعدے کا وقت آئے گا تو اس کو ریزہ ریزہ کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے۔ (یعنی قیامت)

اُس روز (قیامت کے دن) ہم اُن کی یہ حالت کر دینگے کہ ایک میں ایک گڈمڈ ہو جائینگے اور صُور پھونکا جائیگا۔ پھر ہم سب کو ایک ایک کر کے جمع کر لینگے۔

یاجُوج وماجُوج، اور سدّ ذوالقرنین

ذوالقرنین کی شخصیت کے بعد دوسرا مسئلہ یاجوج وماجوج کی تعین کا ہے۔ مفسرین اور مؤرخین نے روایات کا وہ تمام ذخیرہ نقل کر دیا ہے جیسا کہ ذوالقرنین کی تعین میں بیان کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ چند روایات کے علاوہ اس سلسلے کی تمام روایات ناقابل اعتماد ہیں اور اسرائیلیات پر مبنی ہیں۔ قرآن حکیم نے ان کا مختصر حال بیان کیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بقدر ضرورت تفصیلات سے اُمت کو آگاہ کر دیا ہے۔ ایمان لانے اور اعتماد کرنے کی چیز صرف اتنی ہی ہے جو قرآن حکیم اور احادیث

صحیحہ میں آگئی ہیں۔ اس سے زائد تاریخی وجغرافیائی حالات اور اُن کا مصداق جو اہل تفسیر اور مؤرخین لکھتے ہیں وہ اُنکی اپنی اپنی رائے ہے۔ اِنکے صحیح یا غلط ہونے کا اثر قرآنی ارشادات پر نہیں پڑتا۔

اس سلسلے میں پہلے وہ احادیث نقل کر دینا مناسب ہے جو اس معاملہ میں محدثین کے نزدیک صحیح یا قابل اعتماد ہیں۔ اسکے بعد اُن تاریخی روایات سے آگاہی حاصل کرنا جن کی اِن احادیث سے تائید ہوتی ہے اس عنوان کی صحیح تعبیر ہوگی۔

قرآن وسنت کی تصریحات سے اتنی بات تو بلاشُبہ ثابت ہے کہ یاجوج و ماجوج انسانوں ہی کی قوم ہیں۔ عام انسانوں کی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ کیونکہ قرآن حکیم نے صراحت کر دی ہے کہ طوفان نوحؑ کے بعد جتنے انسان زمین پر باقی ہیں اور رہینگے وہ سب حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں ہوں گے۔

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ (الصافات آیت ۷۷)

اور تاریخی روایات اِسپر متفق ہیں کہ یاجوج و ماجوج یافث بن نوح کی اولاد میں سے ہیں۔

ایک ضعیف حدیث بھی اسکی تائید کرتی ہے۔ اِن کے باقی حالات کے متعلق سب سے زیادہ تفصیلی اور حدیث صحیح حضرت نواس بن سمعان رضؓ کی وہ روایت ہے جسکو صحیح مسلم اور تمام مستند کتب حدیث میں نقل کیا گیا ہے اور محدثین نے اسکو صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث میں خروج دجّال، نزول عیسیٰؑ پھر خروج یاجوج وماجوج کی پوری تفصیل مذکور ہے۔ اس حدیث کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

> حضرت نواس بن سمعانؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن صبح کے وقت دجّال کا تذکرہ فرمایا اور دورانِ کلام بعض باتیں اسکے متعلق ایسی فرمائیں جن سے اس کا حقیر و ذلیل ہونا معلوم ہوتا تھا۔ (مثلاً یہ کہ وہ کانا ہے وغیرہ) اور بعض باتیں ایسی فرمائیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا فتنہ سخت اور بڑا ہے (مثلاً فرضی جنت و دوزخ کا اسکے ساتھ ہونا اور دوسرے خوارق وغیرہ) آپ کے بیان سے (ہم پر ایسا خوف طاری ہوا) گویا دجّال کھجوروں کے (قریبی) جھنڈ میں موجود ہے۔ جب ہم شام کو آپکی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ہمارے قلبی تاثرات کو محسوس

فرمالیا اور دریافت فرمایا، تم نے کیا سمجھا ؟ ہم نے عرض کیا آپؐ نے دجّال کا تذکرہ فرمایا اور بعض باتیں ایسی فرمائیں جن سے اس کا معاملہ حقیر اور آسان معلوم ہوتا تھا اور بعض باتیں ایسی فرمائیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی بڑی قوت ہوگی۔ اس کا فتنہ بڑا سخت ہوگا۔ ہمیں تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ ہمارے قریب ہی کھجوروں کے جھنڈ میں موجود ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے تمہارے بارے میں جن فتنوں کا مجھے اندیشہ ہے اِن میں دجّال کی بہ نسبت دوسرے فتنے زیادہ قابلِ اندیشہ ہیں۔ (یعنی دجّال کا فتنہ اتنا بڑا نہیں جیسا تم نے سمجھ لیا ہے) اگر میری موجودگی میں وہ نکلا تو میں اِس کا خود مقابلہ کرلوں گا (تمہیں فکر کرنیکی ضرورت نہیں) اور اگر وہ میرے بعد آیا تو ہر شخص اپنی ہمت کے موافق اُسکو مغلوب کرنیکی کوشش کرے گا۔ اللہ تعالیٰ میری غیر موجودگی میں ہر مسلمان کا ناصر اور محافظ ہے (اسکی علامت یہ ہے کہ) وہ نوجوان پیچدار بالوں والا ہے۔ اُسکی ایک آنکھ اوپر کو اُبھری ہوئی ہے (اور دوسری آنکھ سے کانا ہے جیسا کہ دوسری روایات میں بیان کیا گیا) اور اگر میں (اسکی قبیح صورت میں) اسکو کسی کے ساتھ تشبیہ دوں تو وہ عبدالعزّیٰ بن قطن کے مشابہ ہے۔ (یہ زمانۂ جاہلیت میں بنوخزاعہ قبیلہ کا ایک بدشکل آدمی تھا) اگر تم میں سے کسی مسلمان کا دجّال کے ساتھ سامنا ہوجائے تو اسکو چاہیئے کہ وہ سورۂ کہف کی ابتدائی آیات پڑھ لے (اس سے وہ دجّال کے فتنے سے محفوظ ہوجائے گا۔

خروج دجّال

دجّال ملک شام اور عراق کے درمیان سے نکلے گا اور ہر جانب فساد مچادے گا۔ اے اللہ کے بندو اسکے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا۔ ہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ زمین میں کتنی مدت رہیگا؟ آپ نے ارشاد فرمایا چالیس دن رہے گا۔ لیکن اُس کا پہلا دن ایک سال کے برابر ہوگا۔ اور دوسرا دن ایک ماہ کے برابر ہوگا اور

تیسرا دن ایک ہفتہ کے برابر ہوگا اور باقی دن عام دنوں کے برابر ہونگے۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو دن ایک سال کے برابر ہوگا کیا ہم اُس میں صرف ایک دن کی (پانچ نمازیں) پڑھیں گے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا نہیں بلکہ وقت کا اندازہ کر کے پورے سال بھر کی نمازیں ادا کرنا ہوگا۔

پھر ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ زمین میں کتنی سُرعت کے ساتھ سفر کرے گا؟ فرمایا اُس بادل کے مانند تیز چلے گا جس کے موافق پیچھے ہوا ہوتی ہے۔ جب دجّال کسی قوم کے پاس سے گزرے گا تو اُن کو اپنے باطل عقائد کی دعوت دے گا۔ وہ لوگ اُس پر ایمان لائیں گے تو وہ بادلوں کو حکم دے گا کہ اُن پر برس پڑیں وہ بے ساختہ برس پڑیں گے اور زمین کو حکم دے گا تو وہ سرسبز و شاداب ہوجائے گی (اور اُن کے مویشی اسمیں چرنے لگیں گے) اور شام کو جب وہ جانور واپس آئیں گے تو اُن کے کوہان پہلے کی بہ نسبت زیادہ اونچے ہوں گے اور تھن دودھ سے بھرے ہوئے ہوں گے اور اُن کی پُشتیں پر گوشت ہوں گی۔

پھر دجّال دوسری قوم کے پاس سے گزرے گا اور اُن کو بھی اپنے کفر و الحاد کی دعوت دے گا لیکن وہ اسکی باتوں کو رَدّ کر دینگے وہ اُن سے مایوس ہو کر چلا جائے گا تو یہ مسلمان لوگ قحط سالی میں مبتلا ہوجائیں گے حتیٰ کہ اُن کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہے گا (لیکن وہ اپنے ایمان پر باقی رہیں گے)

پھر وہ ایک ویران زمین کے پاس سے گزرے گا اور اُس کو خطاب کرے گا کہ اے زمین اپنے خزانوں کو باہر لے آ؟ چنانچہ زمین کے خزانے اُس کے پیچھے پیچھے ہولیں گے جیسا کہ شہد کی مکھیاں اپنے سردار کے پاس ہولیتی ہیں۔ پھر دجّال ایک آدمی کو طلب کرے گا جس کی جوانی بھرپور ہوگی اُسپر تلوار مار کر دو ٹکڑے کر دے گا اور اُس کے دونوں ٹکڑے اس قدر فاصلہ پر کر دیئے جائیں گے جس قدر تیر مارنے اور

نشانہ کرنے کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے۔ پھر وہ اُس کو آواز دے گا وہ (زندہ ہوکر) دجّال کی طرف اُسکے اس عمل پر ہنستا ہوا روشن چہرے کے ساتھ آجائے گا (یعنی وہ مردِ مومن دجّال کو تسلیم نہیں کرے گا)

نزولِ عیسیٰ علیہ السلام

دریں اثناء اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نازل فرمادیں گے۔ وہ دو رنگدار چادریں اوڑھے ہوئے جامع دمشق (شام) کی مشرقی جانب کے سفید مینارے پر اس طرح نزول فرمائیں گے کہ اُن کے دونوں ہاتھ فرشتوں کے پَروں پر رکھے ہوئے ہوں گے۔ جب اپنے سر کو نیچے کریں گے تو اُس سے پانی کے قطرات جھڑیں گے (جیسے کوئی ابھی غسل کر آیا ہو) اور جب سر کو اوپر کریں گے تو اُس وقت بھی پانی کے متفرق قطرات جھڑینگے (جیسے کوئی ابھی غسل کر آیا ہو) اور جب سر کو اوپر کریں گے تو اُس وقت بھی پانی کے متفرق قطرات جو موتیوں کی طرح صاف شفاف ہونگے گریں گے۔ جس کافر کو بھی آپؑ کے سانس کی ہوا پہنچے گی وہ وہیں دم توڑ دے گا اور آپؑ کا سانس اس قدر دُور پہنچے گا جس قدر دُور آپ کی نگاہ جائے گی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجّال کو تلاش کرتے پھریں گے۔ یہاں تک کہ آپؑ اُسکو بابِ لُدّ پر جا پکڑلیں گے (یہ مقام آج بھی بیت المقدس (فلسطین) کے قریب اسی نام سے موجود ہے) وہاں اسکو قتل کردیں گے۔ اسکے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کے پاس آئیں گے اور بطورِ شفقت وعنایت اُن کے چہروں پر ہاتھ پھیریں گے اور جنت میں اعلیٰ درجات کی خوشخبری دیں گے۔

خروج یاجوج وماجوج

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی اسی حال میں ہوں گے کہ اللہ تعالےٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل کرے گا کہ میں اپنے بندوں میں سے ایسے لوگوں کو باہر

نکال رہا ہوں جنکے مقابلہ کی کسی کو طاقت نہیں. لہذا آپ مسلمانوں کو جمع کر کے کوہِ طور پر چلے جائیں. (چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایسا ہی کریں گے)

پھر اللہ تعالےٰ یاجوج و ماجوج کو کھول دیں گے. وہ نہایت تیز رفتاری کی وجہ سے ہر بلندی سے پھسلتے ہوئے دکھائی دیں گے. ان میں کی پہلی جماعت بُحیرۂ طبریہ سے گزریگی اور اُس کا سب پانی پی کر ایسا کر دیگی کہ جب دوسری جماعت اُس جگہ سے گزریگی تو دریا کو خشک دیکھ کر کہے گی کہ کیا کبھی یہاں بھی پانی تھا؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے رفقاء کوہ طور پر پناہ لیں گے اور دوسرے مسلمان اپنے قلعوں اور محفوظ مقامات میں پناہ لیں گے. کھانے پینے کا سامان ساتھ ہوگا مگر وہ کم پڑ جائے گا (قلّت کا یہ حال ہوگا کہ) ایک بیل کے سر کو سَو دینار سے بہتر سمجھا جائے گا. حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے مسلمان اپنی مصیبت دُور ہونے کے لئے اللہ تعالےٰ سے دُعا کریں گے (اللہ تعالےٰ اُنکی دُعا قبول فرمائیں گے) اور یاجوج و ماجوج پر ایک خاص قسم کی وبائی بیماری مسلّط کر دیں گے جس سے سب کے سب مر جائیں گے. پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے ساتھی کوہ طور سے نیچے آجائیں گے تو دیکھیں گے کہ زمین میں ایک بالشت جگہ بھی اِن کی لاشوں سے خالی نہیں (اور لاشوں کے سڑنے کی وجہ سے) سخت بدبو ہوگی. (اس کیفیت کو دیکھ کر دوبارہ) عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفقاء دُعا کریں گے (کہ یہ مصیبت بھی دور ہو جائے.)

اللہ تعالیٰ اِن کی دُعا قبول فرمائیں گے اور ایک خاص قسم کے بھاری بھر کم پرندوں کو بھیجیں گے جنکی گردنیں اونٹ کی گردن جیسی ہوں گی وہ اُن کی لاشوں کو اُٹھا اٹھا کر جہاں اللہ کی مرضی ہوگی پھینک آئیں گے. اور بعض روایات میں ہے کہ دریا میں ڈال دیں گے. پھر اللہ تعالےٰ بارش برسائیں گے. کوئی شہر اور جنگل ایسا نہ ہوگا جہاں

بارش نہ ہوئی ہوگی، اس سے ساری زمین دُھل جائیگی اور شیشہ کی مانند صاف ہو جائیگی۔ پھر اللہ تعالےٰ زمین کو حکم دیں گے کہ اپنے پیٹ سے پھلوں اور پھولوں کو اُگا دے اور اپنی برکات کو ظاہر کر دے (چنانچہ ایسے ہی ہوگا اور اس قدر برکت ظاہر ہوگی) کہ ایک انار ایک جماعت کے لئے کھانے کو کافی ہوگا اور لوگ اس کے چھلکے کی چھتری بنا کر سایہ حاصل کریں گے اور دودھ میں اس قدر برکت ہوگی کہ ایک اونٹنی کا دودھ ایک بہت بڑی جماعت کے لئے کافی ہوگا اور ایک گائے کا دودھ ایک قبیلہ کے سب لوگوں کے لئے کفایت کر جائیگا۔ اور ایک بکری کا دودھ پوری برادری (خاندان) کو بس ہو جائے گا۔ (یہ غیر معمولی برکات اور امن و امان کا زمانہ چالیس سال رہنے کے بعد قیامت کا وقت آجائے گا)

اس وقت اللہ تعالےٰ ایک خوشگوار ہوا چلائیں گے جس کی وجہ سے سب مسلمانوں کی بغلوں کی نیچے ایک خاص قسم کی بیماری پیدا ہو جائیگی اور سب کے سب وفات پا جائیں گے۔ اور جو باقی رہ جائینگے وہ صرف کافر و ظالم لوگ ہوں گے جو زمین پر علی الا علان جانوروں کی طرح حرام کاری کرتے پھریں گے۔ ایسے ہی لوگوں پر قیامت آجائیگی۔

(صحیح مسلم حدیث ۲۹۳۷ء کتاب الفتن)

احادیث متعلقہ

اور حضرت عبد الرحمٰن بن یزیدؒ کی روایت میں یاجوج ماجوج کے قصہ کی مزید یہ تفصیل ملتی ہے وہ یہ کہ بحیرۂ طبریہ سے گزرنیکے بعد یاجوج و ماجوج بیت المقدس کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ جبل الخمر پر چڑھ جائیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے زمین والوں کا خاتمہ کر دیا ہے اب آسمان والوں کا خاتمہ کریں گے۔

چنانچہ وہ اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے اور وہ تیر اللہ تعالےٰ کے منشاء سے خون آلود ہو کر اُن کی طرف

واپس آئیں گے (تاکہ یہ احمق یہ سمجھ کر خوش ہوں کہ آسمان والوں کا بھی خاتمہ کر دیا گیا) (صحیح مسلم کتاب الفتن)

اور دجّال کے قصہ میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ دجّال مدینہ منوّرہ سے دُور رہے گا حتیٰ کہ مدینہ کے راستوں پر بھی اِس کا آنا ممکن نہ ہوگا تو وہ مدینہ منورہ کے قریب ایک خشک کھاری زمین کی طرف سے آئے گا اسوقت شہر سے ایک آدمی دجّال سے مقابلہ کے لئے نکلے گا اور وہ آدمی اُس وقت کے بہترین لوگوں میں سے ہوگا۔ دجّال کو خطاب کر کے کہیگا کہ میں یقین کرتا ہوں کہ تو وہی دجّال ہے جسکی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خبر دی ہے۔

(یہ سنکر) دجّال کہیگا لوگو! مجھے یہ بتلاؤ کہ اگر میں اس آدمی کو قتل کر دوں اور پھر اُسے زندہ کر دوں تو کیا میرے خُدا ہونے میں شک کرو گے؟

لوگ جواب دیں گے نہیں! چنانچہ دجّال اس آدمی کو قتل کر دیگا اور پھر اسکو زندہ کر دے گا۔ (زندہ ہوتے ہی وہ آدمی) دجّال سے کہیگا کہ اب تو مجھے تیرے دجّال ہونے کا پہلے سے زیادہ یقین ہوگیا۔ دجال اِسکو دوبارہ قتل کرنے کا ارادہ کرے گا لیکن وہ اسپر[1] قادر نہ ہوسکیگا۔

(صحیح مسلم کتاب الفتن حدیث ص ۲۹۳۸)

صحیح بخاری و مسلم میں انہی ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ آپ اپنی ذُرّیت میں سے بعث النار (یعنی جہنمی گروہ) اُٹھائیے! وہ عرض کریں گے اے رب وہ کون ہیں؟ حُکم ہوگا ہر ہزار میں سے نوسو ننانوے جہنمی ہیں صرف ایک جنتی ہے۔ صحابہ کرام یہ سنکر سہم گئے اور دریافت کرنے لگے یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم میں سے وہ ایک جنتی کون ہوگا؟ آپ نے ارشاد فرمایا غم نکرو ہزار میں ایک

---

[1] ابواسحٰق (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ یہ شخص حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے۔ (صحیح مسلم حدیث مذکور)

جنتی تم لوگوں میں سے ہوگا اور نوسو ننانوے یاجوج وماجوج سے ہونگے۔

مستدرک حاکم کی ایک روایت میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے دس حصے کئے ہیں اِن میں سے نو حصے یاجوج وماجوج کے ہیں اور باقی ایک حصہ میں ساری دنیا کے انسان ہیں۔ (روح المعانی)

ابن کثیرؒ نے اپنی کتاب "البدایۃ والنہایہ" میں ان سب روایات کو نقل کرکے لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یأجوج وماجوج کی تعداد ساری انسانی آبادی سے بیحد زائد ہے۔

مسند احمد اور ابوداود میں باسنادِ صحیح حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے نزول کے بعد زمین پر چالیس سال رہیں گے۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں جو سات سال کا عرصہ بتلایا گیا ہے حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس روایت کو مؤوّل یا مرجُوح قرار دے کر چالیس سال ہی کا عرصہ صحیح قرار دیا ہے۔ اور حسب تصریح احادیث یہ پورا عرصہ امن وامان اور برکات کے ظہور کا ہوگا۔ بغض وعداوت آپس میں قطعاً نہ رہے گا، کبھی دو آدمیوں میں جھگڑا نہ ہوگا۔ (روایت مسلم احمد)

بخاری شریف میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت موجود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بیت اللہ کا حج وعمرہ خروج یاجوج وماجوج کے بعد بھی جاری رہے گا۔ (تفسیر مظہری)

بخاری ومسلم نے حضرت زینب بنت جحش امّ المومنین سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز نیند سے ایسی حالت میں بیدار ہوئے کہ چہرۂ مبارک سُرخ ہو رہا تھا اور آپؐ کی زبان مبارک پر یہ جملے تھے:۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَیْلٌ لِّلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ فُتِحَ الْیَوْمَ مِنْ رَدْمِ یَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مِثْلُ ھٰذِہٖ وَحَلَّقَ تِسْعِیْنَ۔
(بخاری ومسلم)

لا الٰہ الا اللہ عرب والوں کی خرابی ہے ایک ایسی بُرائی سے جو قریب آگئی ہے۔ آج کے دن یاجوج و ماجوج کی ردم یعنی دیوار میں اتنا سوراخ کُھل گیا ہے اور آپ نے عقد تسعین یعنی انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کو ملا کر حلقہ بنا کر دکھلایا۔

حضرت ام المومنینؓ فرماتی ہیں کہ اس ارشاد پر ہم نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا ہم ایسے حال میں ہلاک ہو سکتے ہیں جبکہ ہمارے معاشرے میں صالحین بھی موجود ہوں ؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا ہاں ہلاک ہو سکتے ہیں جبکہ خبث (بُرائی) کی کثرت ہو جائے۔

سدِ یاجوج و ماجوج میں بقدر حلقہ سوراخ ہو جانا اپنے حقیقی معنی میں بھی ممکن ہے اور بطور مجاز سدِ ذوالقرنین کے کمزور ہو جانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ (ابن کثیرؒ، ابو حیان)

مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

یاجوج و ماجوج ہر روز سدِ ذوالقرنین کو کھودتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اُس آہنی دیوار کے آخری حصہ تک اتنے قریب پہنچ جاتے ہیں کہ دوسری طرف کی روشنی نظر آنے لگے۔ مگر یہ کہہ کر لوٹ جاتے ہیں کہ باقی کل کھود کر پار کر دیں گے۔ مگر دوسرے دن اللہ تعالیٰ پھر ویسا ہی مضبوط اور درست کر دیتے ہیں۔ اگلے روز پھر نئی محنت اُسکے کھودنے میں صرف کرتے ہیں لیکن دوسرے دن دیوار ویسے ہی درست ہو جاتی ہے۔

یہ سلسلہ محنت کا اور اُسکی درستی کا اس وقت تک چلتا رہے گا جس وقت تک اللہ تعالےٰ کو یاجوج و ماجوج کو بند رکھنے کا ارادہ ہے اور جب اللہ تعالیٰ اُن کو کھولنے کا ارادہ فرمائیں گے تو اُس روز جب محنت کر کے وہ لوگ آخری حد میں پہنچ جائیں گے اُس دن اللہ تعالیٰ کی مرضی سے یوں کہیں گے کہ اگر اللہ نے چاہا تو ہم کل اسکو پار کر لیں گے (اللہ کے نام کی برکت سے آج انھیں توفیق ہو جائے گی) تو اگلے روز دیوار کا باقی

ماندہ حصہ اپنی حالت پر ملے گا اور وہ اُسکو توڑکر پار کر لیں گے۔

اس روایت کو امام ترمذی نے نقل کر کے اسکو غریب (حدیث کی ایک ضعیف قسم) قرار دیا ہے۔

ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اس روایت کو نقل کر کے فرمایا:۔

اِسْنَادُہٗ جَیِّدٌ قَوِیٌّ وَلٰکِنْ مَتْنُہٗ فِیْ رَفْعِہٖ نَکَارَۃٌ۔

اسکی سند جید اور قوی ہے۔ البتہ مضمونِ حدیث کے مرفوع ہونے میں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک منسوب کرنے میں ایک نکارت و اجنبیت معلوم ہوتی ہے)

اس نکارت یا اجنبیت کی غالباً یہ وجہ ہوگی کہ قرآن حکیم نے جہاں اس دیوار کا تذکرہ کیا ہے وہاں یہ وضاحت بھی کی ہے کہ

فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا۔

(یہ بند ایسا تھا کہ) یاجوج و ماجوج اسپر چڑھ کر بھی نہ آسکتے تھے اور اسمیں نقب لگانا اور بھی مشکل تھا۔

اور حدیث مذکور میں نقب لگانے کا ذکر ہے اور نقب لگانے میں کامیاب ہونے کا بھی تذکرہ ہے۔

لہذا حدیث مذکور قرآنی مضمون کے خلاف ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ نکارت جو اس حدیث میں پائی جاتی ہے۔ پھر ابن کثیرؒ نے اپنی کتاب "البدایۃ والنہایہ" میں اس کا جواب بھی دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ کعب احبار کی روایت ہے تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہ روایت کوئی قابل حجت نہیں ہے۔ اور اگر اس روایت کو ہم راوی سے محفوظ قرار دے کر اسکو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد قرار دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ یاجوج و ماجوج کا یہ عملِ تنقیب اُس وقت ہوگا جبکہ انکے خروج کا وقت قریب آجائے گا اور اسکے بعد قیامت برپا ہوگی۔ اور نقب نہ لگائے جا سکنے کا قرآنی ارشاد اُس وقت کا حال ہے جبکہ ذوالقرنین نے اسکو تعمیر کیا تھا۔ دوسرا جواب یہ بھی ممکن ہے کہ

نقب (قرآنی) سے مراد وہ سوراخ لیا جائے جو آر پار ہوجائے اور روایت مذکورہ میں اسکی تصریح ہے یہ سوراخ آر پار نہیں ہوتا۔

(البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۱۳)

اس تقریر کے بعد روایت کی غرابت (اجنبیت) ختم ہوجاتی ہے اور سند کے لحاظ سے ابن کثیرؒ نے خود اقرار کیا ہے کہ اسکی اسناد قوی ہے۔ لہذا حدیث مذکور قرآن حکیم کی وضاحت کے خلاف نہیں ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس روایت کو اپنی کتاب "فتح الباری" میں عبد بن حُمید اور ابن حبان کے حوالہ سے بھی نقل کرکے کہا ہے کہ ان سب کی روایت حضرت قتادہؓ سے ہے اور ان میں سے بعض کی سند کے رجال (راوی) صحیح بخاری کے رجال ہیں، پھر اُنھوں نے حدیث کو مرفوع قرار دینے پر بھی کوئی شبہ ظاہر نہیں کیا اور ابن عربیؒ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اس حدیث میں تین آیات الٰہیہ یعنی تین معجزات ہیں۔

اوّل یہ کہ اللہ تعالےٰ نے یاجوج و ماجوج کے ذہنوں کو اسطرف متوجہ ہونے نہیں دیا کہ دیوار کو کھودنے کا کام رات دن مسلسل جاری رکھیں ورنہ اتنی بڑی قوم کے لئے کیا مشکل تھا کہ دن اور رات کی ڈیوٹیاں الگ الگ مقرر کرلیتے۔

دوم۔ انکے ذہنوں کو اس طرف سے پھیر دیا کہ اس دیوار کے اوپر چڑھنے کی کوشش کریں اور اس کے لئے آلات سے مدد لیں۔ حالانکہ وہب بن منبہؒ کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ صاحب زراعت و صناعت بھی ہیں۔ ہر طرح کے آلات رکھتے ہیں۔ انکی زمین میں درخت بھی مختلف قسم کے ہیں۔ لہذا یہ کوئی مشکل کام نہ تھا کہ اوپر چڑھنے کے ذرائع اور وسائل پیدا کرلیتے۔

سوم۔ اس طویل مدت کے درمیان ان کے قلوب میں یہ بات نہ آئی کہ انشاء اللہ کہہ لیں، صرف اُس وقت یہ کلمہ اُن کی زبان پر جاری ہوگا جب ان کے نکلنے کا وقت مقرر آجائے گا۔

ابن عربیؒ نے فرمایا کہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج وماجوج میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے وجود اور اسکی مشیت وارادے کو مانتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بغیر کسی عقیدے کے اس وقت اُن کی زبان پر اللہ کا نام آجائے۔ لہذا یہ کوئی یقینی بات نہیں کہ یاجوج ماجوج اللہ تعالےٰ کے وجود کو مانتے ہوں۔ مگر اصولی طور پر یہ بات واضح ہے کہ اُن کے پاس بھی انبیاء کرام کی دعوت پہنچ چکی ہو ورنہ قرآنی تصریح کے مطابق اُنکو جہنم کا عذاب نہ ہونا چاہیئے۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُولًا۔

(بنی اسرائیل آیت ۱۵)

معلوم ہوا کہ دعوتِ ایمان اُن کو بھی پہنچ چکی ہے مگر یہ لوگ کفر پر جمے رہے۔ (واللہ اعلم)

مکمل ومدلل خلاصۂ کلام

یاجوج و ماجوج کے متعلق جو حالات قرآن حکیم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ثابت ہیں وہ حسب ذیل درج ہیں۔ (۱) یاجوج و ماجوج بھی عام انسانوں کی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ اکثر محدثین اور مفسرین ومؤرخین ان کو یافث بن نوح کی اولاد قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ یافث کی اولاد حضرت نوح علیہ السلام کے بعد دور دور تک مختلف قوموں اور آبادیوں میں پھیل چکی تھی۔ ان کے کچھ قبائل اور قومیں سدّ ذوالقرنین کے ذریعہ روک دیئے گئے۔

(۲) یاجوج وماجوج کی تعداد پوری دنیا کے انسانوں سے کئی گنا زائد ہے اور کم از کم ایک اور دس کی نسبت ہوگی۔

(۳) یاجوج وماجوج سدّ ذوالقرنین کے ذریعہ اِس طرف آنے سے روک دیئے گئے ہیں وہ قیامت کے قریب تک محصور رہیں گے، اِن کے نکلنے کا وقت ظہور مہدی (علیہ السلام) اور خروج دجّال کے بعد ہوگا

جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوکر دجّال کو قتل کر چکے ہوں۔

(۴) یاجوج و ماجوج کے نکلنے کے وقت سدّ ذوالقرنین منہدم ہوکر زمین کے برابر ہوجائیگی۔ اس وقت یاجوج و ماجوج کی یہ بے پناہ تعداد بیک وقت پہاڑوں کی بلندیوں سے اترتی ہوئی ایسے معلوم ہونگی کہ گویا یہ پھسل پھسل کر گر رہے ہیں اور یہ بیشمار وحشی انسان پوری انسانی آبادی پر ٹوٹ پڑیں گے اور ان کے قتل و غارت گری کا کوئی مقابلہ نہ کرسکے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اپنے ساتھی مسلمانوں کو لیکر کوہ طور پر پناہ لیں گے اور عام مسلمان دنیا کی آبادیوں میں جہاں کچھ مضبوط اور محفوظ قلعے ہوں گے وہ ان میں بند ہوکر اپنی جانیں بچائیں گے۔ کھانے پینے کا سامان ختم ہوجانے کے باعث ضروریاتِ زندگی نہایت گراں ہوجائیں گی اور باقی انسانی آبادی کو یہ وحشی انسان ختم کرڈالیں گے اور اِن کے دریاؤں کو چاٹ جائیں گے۔

(۵) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اور اُن کے اصحاب کی دُعاؤں سے یہ بلا بیک وقت ہلاک کردی جائیں گی اور ان کی لاشوں سے زمین پٹ جائیگی۔ اِن کی بدبو کی وجہ سے زمین پر بسنا مشکل ہوجائے گا۔

(۶) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے اصحاب ہی کی دُعاؤں سے اِن کی لاشیں دریا بُرد یا غائب کردی جائیں گی اور عالمگیر بارش کے ذریعہ پوری زمین کو دھوکر پاک صاف کردیا جائے گا۔

(۷) اسکے بعد تقریباً چالیس سال کا زمانہ امن وامان کا دور دورہ رہے گا۔ زمین اپنی برکات اُگل دیگی۔ کوئی مفلس و محتاج نہ رہے گا۔ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے گا۔ سکون وراحت عام ہوجائیگی۔

(۸) امن وامان کے زمانے میں بیت اللہ کا حج وعمرہ جاری رہیگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے اصحاب کے ساتھ بیت اللہ کی زیارت کریں گے اور مدینہ منورہ میں وفات پائیں گے اور حجرۂ نبوی میں دفن ہوں گے۔ جہاں ایک قبر کی جگہ آج تک بھی موجود ہے۔

(۹) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپکی آخری زندگی میں بذریعہ خواب (جو آپ کے وحی کی ایک قسم ہے) دکھلایا گیا کہ سدّ ذوالقرنین میں ایک سوراخ ہوگیا ہے جسکو آپ نے عرب کے لئے شر و فتنہ کی علامت قرار دی ہے۔

(۱۰) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے نزول کے بعد چالیس سال زمین پر زندہ رہیں گے۔ اِن سے پہلے حضرت مہدی علیہ السلام کا قیام بھی چالیس سال رہے گا جس میں کچھ زمانہ دونوں حضرات کے اجتماع واشتراک کا ہوگا۔

علامہ سید شریف برزنجیؒ نے اپنی کتاب اشراط الساعہ صہ ۱۴۵ پر لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قیام قتل دجّال اور امن و امان کے بعد چالیس سال ہوگا اور مجموعۂ قیام پینتالیس ۴۵ سال ہوگا اور صفحہ ۱۱۲ پر لکھا ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً تیس سال پہلے ظاہر ہوں گے۔ اس طرح پانچ یا سات سال تک دونوں حضرات کا اجتماع رہے گا۔ ان دونوں زمانوں کی یہ خصوصیت ہوگی کہ پوری زمین پر عدل و انصاف کی حکومت ہوگی۔ زمین اپنے برکات اور خزائن اُگل دے گی۔ کوئی فقیر و محتاج نہ رہے گا۔ لوگوں میں بُغض وعناد ختم ہوجائے گا۔ البتہ حضرت مہدی علیہ السلام کے آخری زمانے میں دجّال کا خطرناک فتنہ ہوگا لیکن مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ، بیت المقدس، کوہ طورؔ ان فتنوں سے محفوظ رہیں گے۔ اور یہ فتنہ دنیا کے تمام فتنوں سے سخت تر ہوگا۔ دجّال کا قیام اور اُس کا فساد صرف چالیس دن رہے گا۔ مگر اِن چالیس دنوں میں پہلا دن ایک سال کا، دوسرا دن ایک ماہ کا، تیسرا دن ایک ہفتہ برابر ہوگا اور باقی ایام عام دنوں کی طرح ہوں گے۔ اِن طویل دنوں میں عام دنوں کے مطابق اندازہ کرکے نمازیں اداکی جائینگی۔

اسکے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوکر دجّال کو قتل کردیں گے۔ مگر اسکے معاً بعد یاجوج و ماجوج کا خروج ہوگا جو پوری دُنیا

میں غارت گری عام کر دیں گے مگر اِن کا زمانہ چند ایام ہی ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں زمین پر سوائے مذہب اسلام اور کوئی مذہب نہ ہوگا۔

یاجوج وماجوج اور سدِّ ذوالقرنین کے متعلق یہ وہ معلومات ہیں جو قرآن حکیم واحادیث نبویہؐ نے امت کو بتلادیئے ہیں، انپر عقیدہ رکھنا ضروری اور مخالفت کرنا جائز نہیں ہے۔ باقی رہی ان کی جغرافیائی بحث کہ دیوار کہاں واقع ہے؟ اور قوم یاجوج وماجوج کونسی قوم ہے؟ اور اس وقت وہ کہاں موجود ہیں؟

اگرچہ اسپر نہ کوئی اسلامی عقیدہ موقوف ہے اور نہ قرآن حکیم کی کسی آیت کا مطلب سمجھنا اسپر موقوف ہے۔ لہٰذا جن مصنفین اور مؤلفین نے اس دیوار کی نشان دہی کے متعلق جو اپنے اپنے مقالات وخیالات جمع کئے ہیں یہ صرف ان کا اپنا اجتہاد اور ذاتی رائے ہے۔ لیکن قرآن وحدیث سے جو اسکے چند اوصاف معلوم ہوتے ہیں ان سب اوصاف کو پیش نظر رکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنی دیواروں کا لوگوں نے رائے اور قیاس سے پتہ دیا ہے یہ مجموعہ اوصاف ایک بھی اُن میں پایا نہیں جاتا۔ لہٰذا وہ خیالات صحیح معلوم نہیں ہوتے اور حدیثوں کا انکار کرنا یا آیات قرآنی کی تاویل کرنا خود دین کے خلاف ہے۔ رہا مخالفین کا یہ شُبہ کہ ہم نے تمام زمین کو چھان ڈالا ہے۔ کہیں بھی اُن کا پتہ نہیں ملا۔ غالباً اسی شُبہ سے متأثر ہوکر ہمارے مؤلفین حضرات نے پتہ بتلانے کی کوشش کی ہیں لیکن اس کا صحیح جواب وہ ہے جسکو علامہ آلوسیؒ نے (چھٹی صدی ہجری) اپنی تفسیر روح المعانی میں اختیار کیا ہے وہ ان لوگوں پر سخت گرفت کرتے ہیں جنھوں نے قوم تاتار (چھٹی صدی ہجری) کو یاجوج وماجوج قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ ایسا خیال کرنا کھلی گمراہی ہے اور احادیث کی وضاحت کے خلاف ہے۔

صاحب بیان القرآن نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے:۔

"سیدھی سادھی بات یہ ہے کہ ہم کو اس کا موقعہ معلوم نہیں اور ممکن ہے کہ ہمارے اور اُس کے درمیان بڑے بڑے سمندر حائل ہوں اور یہ دعویٰ کرنا کہ ہم نے پوری خشکی وتری کو چھان لیا ہے اسکا کہیں پتہ نہیں چلا۔ یہ دعوی قابل تسلیم نہیں ہے۔ عقلاً یہ جائز ہے کہ امریکہ کی طرح سمندر کے درمیان میں کوئی حصۂ زمین ایسا ہو جہاں ابتک رسائی نہ ہوئی ہو اور کسی چیز کا پتہ نہ چلنا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ چیز موجود نہیں ہے۔ خاص طور پر جب مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس دیوار کی مع اوصافِ خصوصی خبر دی ہے تو ہم پر واجب ہے کہ اُسکی تصدیق کریں جس طرح اور اُمور کی خبر دی ہے اور شک میں ڈالنے والوں کے فضول کلام سے مرعوب ہونا یا اُسکی جانب التفات کرنا قلتِ یقین اور ضعفِ دین کی علامت ہے۔

(بیان القرآن، سورۂ کہف)

بعض مؤرخین نے موجودہ روس یا چین یا دونوں کو یاجوج و ماجوج قرار دیا ہے۔ لیکن یہ قطعاً غلط اور گمراہ بات ہے۔ کیونکہ جس یاجوج و ماجوج کی خبر قرآن وحدیث نے بطور "علاماتِ قیامت" دی ہے اُس کا وقت نزول عیسیٰ علیہ السلام اور خروج مہدی علیہ السلام کے بعد بتایا گیا ہے اور نزولِ عیسیٰ اور خروج دجال اور خروج مہدی یقیناً ابھی ظاہر نہیں ہوئے ہیں۔

ابن کثیرؒ نے اپنی کتاب البدایہ والنہایہ میں ذکر کیا ہے کہ عباسی خلیفہ واثق باللہ نے سدِ ذوالقرنین کی تحقیق کے لئے ایک جماعت کو روانہ کیا تھا جنھوں نے واپس آکر یہ خبر دی کہ یہ دیوار لوہے سے تعمیر کی گئی ہے اسمیں بڑے بڑے دروازے بھی ہیں جن پر قفل پڑا ہوا ہے اور یہ شمال مشرق میں واقع ہے۔ تفسیر کبیر اور تفسیر طبری میں بھی اس واقعہ کو نقل کیا گیا ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۵ ص ۵۱۳، البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۱۱)

حجۃ الاسلام حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی کتاب "عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام" میں یاجوج و ماجوج اور سدّ ذوالقرنین کا تذکرہ کیا ہے جو درایت و روایت کے اعلیٰ معیار پر ہے جس کا خلاصہ یہ کہ مفسد اور وحشی انسانوں کی تاخت و تاراج سے حفاظت کے لئے زمین پر ایک نہیں بہت سی جگہوں پر سدّیں (دیواریں) بنائی گئی ہیں۔ اِن میں سے زیادہ بڑی اور مشہور دیوار "دیوارِ چین" ہے جس کا طول ابوحیان اُندلسی (دربار ایران کا شاہی مؤرخ) نے بارہ سو میل لکھا ہے۔ اس کا بانی چین ہی کا بادشاہ "فغفور" نامی تھا اور اسکی تاریخ بنا حضرت آدم علیہ السلام سے تین ہزار چار سو ساٹھ سال بعد بتلائی جاتی ہے۔ (واللہ اعلم)

اسی طرح دوسری سدّ (دیوار) وسط ایشیا میں بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے اور اس کے محل وقوع کا نام "دربند" ہے۔ یہ دیوار مغل بادشاہ تیمور لنگ کے زمانہ میں موجود تھی اور شاہ روم کے خاص درباری سمیلا برجر جرمنی نے بھی اس کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے اور اُندلس کے بادشاہ کسٹیل کے قاصد کلافچو نے بھی اپنے سفرنامہ میں اسکا ذکر کیا ہے۔ یہ شخص ۱۴۰۳ء میں اپنے بادشاہ کے سفیر کی حیثیت سے تیمور لنگ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس دیوار سے گزرا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ سدّ (دیوار) شہر موصل کے اُس راستہ پر جو سمرقند اور ہندوستان کے درمیان ہے۔ (تفسیر جواہر القرآن طنطاوی ج ۹ ص ۱۹۸)

تیسری سد روسی علاقہ داغستان میں واقع ہے۔ یہ دیوار بھی دربند اور باب الابواب کے نام سے مشہور ہے۔ مؤرخ یاقوت حموی نے "معجم البلدان" میں اور ادریسی نے جغرافیہ میں اور بُستانی نے دائرۃ المعارف میں اس دیوار کا تفصیلی حال لکھا ہے۔

چوتھی سدّ اسی باب الابواب سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے بہت بلند حصّوں میں ہے جہاں دو پہاڑوں کے درمیان ایک درّہ درّہ داریال

کے نام سے مشہور ہے۔ اسکو کوہِ قاف کی سد بھی کہا جاتا ہے۔ مؤرخ بُستانی نے اس دیوار کے بارے میں لکھا ہے۔

اسی کے (یعنی سد باب الابواب کے) قریب ایک اور سد ہے جو مغربی جانب بڑھتی چلی گئی ہے۔ غالباً اسکو اہل فارس نے شمالی بربروں سے حفاظت کی خاطر بنایا ہوگا۔ کیونکہ اسکے بانی کا صحیح حال معلوم نہ ہوسکا۔ بعض مؤرخین نے اس دیوار کی نسبت سکندر کی جانب کر دی ہے اور بعض نے کسریٰ اور نوشیروان کی طرف کی ہے۔ مؤرخ یاقوت حموی کہتا ہے کہ یہ تانبا پگھلا کر تعمیر کی گئی ہے۔ (معجم البلدان ج ۷ ص ۶۵)

چونکہ یہ سب دیواریں شمال ہی میں واقع ہیں اور تقریباً ایک ہی ضرورت کے لئے بنائی گئی ہیں اس لئے اسکے متعین کرنے میں اشکالات پیش آئے ہیں اور بڑا اختلاط ان آخری دو سدوں کے بارے میں پیش آیا کیونکہ دونوں مقامات کا نام بھی دربند ہے۔

مذکورۃ الصدر چار سدوں میں سے دیوار چین جو سب سے بڑی اور زیادہ قدیم ہے۔ اسکے سد ذوالقرنین نہ ہونے میں سب متفق ہیں کیونکہ وہ بجائے شمال کے مشرق اقصیٰ میں ہے اور قرآن حکیم نے سد ذوالقرنین کا شمال میں ہونا ظاہر کیا ہے۔ اب رہا باقی تین دیواروں کا معاملہ جو شمال ہی میں واقع ہیں۔ اسمیں مؤرخین کے مختلف اقوال ہیں کہ سد ذوالقرنین کونسی ہے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک دیوار کو متعین کرنا قیاس ورائے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

اہلِ یورپ کا یہ کہنا کہ ہم نے ساری زمین کا سروے کر لیا ہے ایسی کوئی دیوار کا پتہ نہیں چلا، کوئی وزن نہیں رکھتا۔ کیونکہ خود اہل یورپ کا یہ اعتراف ہے کہ سیاحت وتحقیق کے انتہائی معراج پر پہونچنے کے باوجود آج بھی بہت سے صحرا و دریا اور جزیرے ایسے باقی ہیں جن کا ہمیں علم نہ ہوسکا۔ لہذا سد ذوالقرنین کا انکار کر دینا کوئی معقول بات نہوگی۔ دوسرے یہ بھی امکان ہے کہ اب وہ دیوار موجود ہونے کے باوجود پہاڑوں کے

گرنے اور باہم مل جانے کے باعث ایک پہاڑ ہی کی شکل اختیار کرچکی ہو، بہرحال کسی چیز کے معلوم نہ ہونے پر یہ دعویٰ کرنا کہ اُس کا وجود ہی نہیں ہے، نامعقول بات ہوگی۔ واللہ اعلم۔

یہ چند منقول ہیں اُن محققین کے ذخیرۂ اقوال سے جو حدیث وتفسیر اور علم تاریخ کی ماہر ہستیاں سمجھی جاتی ہیں۔

اِن اقوال سے یہ بات قطعاً واضح ہوجاتی ہے کہ یاجوج وماجوج عام انسانوں کی طرح ربع مسکون کے باشندے اور نسل بنی آدم کی عام نسل کی طرح ہیں۔ وہ کوئی برزخی یا غیر انسانی مخلوق نہیں اور جو روایات اسکے خلاف پائی جاتی ہیں اِن کا اسلامی روایات سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اسرائیلیات کا وہ سرمایہ ہے جس کا ماخذ مشہور زمانہ راوی کعب احبارؓ پر جاکر ختم ہوتا ہے جو یہودی النسل ہونیکی وجہ سے اِن قصوں کے بہت بڑے عالم تھے اور اسلام قبول کرنے کے بعد یا تو تفریح کے طور پر سنایا کرتے تھے یا اس لئے کہ اس رطب ویابس میں جو دُور از کار باتیں ہوں وہ رد کردی جائیں۔ اور جن سے قرآن اور احادیث نبویہ کی تائید ہوتی ہوں اُن کو ایک تاریخی حیثیت سے لے لیا جائے مگر نقل کرنے والوں نے اس حقیقت کے خلاف پورے ذخیرہ کو اُن سے نقل کردیا جیسا کہ حدیثی سلسلہ کو نقل کیا جاتا ہے اور اگر سلف صالحین اور متاخرین میں وہ بے نظیر ہستیاں پیدا نہ ہوتیں جنھوں نے روایات واحادیث کے تمام ذخیرہ کو نقد وتبصرہ کی کسوٹی پر رکھ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کردیا نہ ہوتا تو نہ معلوم آج علماء کو کس قدر بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔

سورۂ انبیاء میں بھی یاجوج وماجوج کا مختصر ذکر آیا ہے۔

قرآنی مضمون

فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ الخ (الانبیاء آیات ۹۴ تا ۹۷)

پھر جو نیک عمل کرے گا اس حال میں کہ وہ مومن ہو تو اُس کے کام کی ناقدری نہ ہوگی اور اُسے ہم لکھ رہے ہیں۔

اور ممکن نہیں کہ جس بستی کو ہم نے ہلاک کردیا ہو وہ پھر پلٹ سکے۔

یہاں تک کہ جب یاجوج وماجوج کھول دیئے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے نکل پڑیں گے۔
اور وعدۂ برحق کے پورا ہونے کا وقت قریب آگیا تو یکایک اُن لوگوں کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ جائیں گے جنھوں نے کفر کیا تھا کہیں گے ہائے ہماری کم بختی ہم اُس چیز کی طرف سے غفلت میں پڑے ہوئے تھے بلکہ ہم خطاکار تھے۔
صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ بن اسیدؓ کی روایت سے نقل کیا گیا ہے کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک تم اُس سے پہلے دس علامتیں نہ دیکھ لو:۔
دھواں[1]، دجّال[2]، دآبۃ الارض[3]، مغرب[4] سے سورج کا طلوع ہونا، عیسیٰ[5] بن مریم کا نزول، یاجوج[6] وماجوج کا خروج، تین بڑے خسف (زمین کا دھنسا) ایک مشرق میں، دوسرا مغرب میں، تیسرا[9] جزیرۃ العرب میں۔ پھر سب سے آخر یمن[10] سے ایک سخت آگ اُٹھے گی جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانکے گی (یعنی اسکے بعد قیامت آجائیگی)

ذوالقرنین اور نبوّت

ذوالقرنین کا نیک وعادل بادشاہ ہونا تمام مفسرین کے ہاں متفق علیہ ہے۔ البتہ نبی ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ اکثر مفسرین اور محدثین نے انکو نیک وصالح بادشاہ قرار دیا ہے جن پر اللہ کا خاص فضل وکرم تھا۔
البتہ بعض مفسرین نے انھیں نبی قرار دیا ہے۔ ان کا استدلال قرآن کی اُن آیات سے ہے جسمیں اللہ تعالےٰ نے اِن سے خطاب فرمایا ہے۔ ابوحیّان اندلسی نے اپنی تفسیر بحر محیط میں انہی آیات سے استدلال کر کے انھیں نبی کہا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ جب ذوالقرنین نے مغرب کی مہم سر کی تو وہاں جس قوم سے انھیں سابقہ پڑا وہ مشرک قوم تھی جن کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے انھیں اختیار دیا تھا کہ یا انھیں قتل کر دیں یا انکے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ اختیار کریں۔

قُلْنَا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّا أَنْ تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا۔ (آیت ۸۶ کہف)

مفسر ابوحیانؒ کا کہنا ہے کہ یہاں ذوالقرنین کو جو حکم دیا گیا کہ اس قوم کو قتل کر سکتے ہیں۔ اس طرح کا کوئی حکم بغیر وحی نبوت کے نہیں دیا جا سکتا۔ یہ کام نہ کشف والہام سے ہو سکتا ہے نہ بغیر وحی نبوت کے کسی اور ذریعہ سے اس لئے اسکے سوا اور کوئی احتمال نہیں کہ ذوالقرنین نبی تھے۔

اسکے علاوہ قرآن حکیم نے ذوالقرنین کا تذکرہ جس عنوان سے ادا کیا ہے وہ بھی اس بات کو قوی بنا دیتا ہے کہ وہ نبی ہی تھے۔

امام تفسیر مجاہدؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضؓ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ وہ ذوالقرنین کو نبی قرار دیتے تھے۔

(فتح الباری ج ۶ ص ۲۶۵)

حافظ ابن حجرؒ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ قرآن حکیم کا ظاہر یہی بتاتا ہے کہ ذوالقرنین نبی ہی تھے۔

لیکن حضرت علیؓ کا ایک قول نقل کیا جاتا ہے :-

ذوالقرنین نبی نہ تھے اور نہ فرشتہ بلکہ ایک انسان تھے جنھوں نے اللہ تعالےٰ کو محبوب رکھا اور اللہ تعالےٰ نے بھی انکو محبوب رکھا۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۵)

حافظ ابن حجرؒ اس روایت کی توثیق کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ میں نے اس روایت کو حافظ حدیث ضیاء الدین مقدسی کی کتاب "مختارہ" کی احادیث سے بسند صحیح سُنا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ذوالقرنین بادشاہوں میں ایک بادشاہ تھے اکثر اہل علم کی یہی رائے ہے۔

(فتح الباری ج ص ۲۹۸)

حضرت علیؓ کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ نے بھی ذوالقرنین کو نیک و عادل بادشاہ فرماتے تھے۔ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے تھے کہ ذوالقرنین نیک و صالح بادشاہ تھے

اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو پسند فرمایا اور اپنی کتاب میں ان کی تعریف فرمائی اور وہ فاتح اور کامیاب بادشاہ تھے۔

(البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۱۳)

اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ بھی ذوالقرنین کو صالحین میں شمار کرتے تھے۔ ابن کثیرؒ نے اس سلسلے میں تمام روایات کو نقل کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا ہے:۔

والصحیح انہ کان ملکا من ملوک العادلین۔

(تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۳)

اور صحیح یہ ہے کہ ذوالقرنین عادل بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھے۔ (واللہ اعلم)

نتائج و عبر

علم تاریخ کی ضرورت

مطالب قرآن کی بصیرت کے لئے جس طرح علم لغت، احادیث، آثار صحابہؓ جیسے علوم کی ضرورت ہے اسی طرح صحیح علم تاریخ کی بھی معرفت ضروری ہے۔ قرآن حکیم کے بیان کردہ بعض واقعات ایسے بھی ہیں جنکو صرف علم تاریخ ہی کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ انھی میں سے ایک ذوالقرنین کا واقعہ بھی ہے جسکی مکمل وضاحت صحیح اور مستند تاریخ ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔

چنانچہ قرآن حکیم نے اقوام سابقہ کے حالات و واقعات بیان کر کے ان سے عبرت و بصیرت حاصل کرنے کے لئے زمین کی سیاحت کرنے پر زور دیا ہے:۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ۔ (انعام آیت ۱۱)

آپ فرما دیجئے کہ زمین کی سیاحت کرو پھر دیکھو (نبیوں) کو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ. (آل عمران آیت ۱۳۷)

بلاشبہ تم سے پہلے (اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ) قوانین گزر چکے ہیں پس زمین کی سیر کرو پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔

دلیلِ راہ :۔

جہاں تک اسلام کے بنیادی مسائل کا تعلق ہے اسمیں "سلف صالحین" کا مسلک ہی دلیلِ راہ ہے۔ اس سے تجاوز کرنا اور اسمیں اختلاف کرنا زیغ و گمراہی ہے۔ لیکن جہاں تک قرآن حکیم کے نکات، معارف، علوم و اسرار اور علمی و تاریخ مطالب کا تعلق ہے اس کیلئے کسی زمانے میں بھی درِ تحقیق بند نہیں ہوا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

فَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهَا. (الحدیث)

قرآن کے لطائف و حِکم کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔

خاص طور پر جب کہ تاریخی مطالب کے حصول کے لئے آج کے ذرائع معلومات، قدیم علوم تاریخ کے ذرائع سے زیادہ وسیع ہو چکے ہیں۔ لہذا سلف صالحین کے قدیم مسلک پر قائم رہتے ہوئے قرآن حکیم کے تاریخی مباحث کی تفصیلات وجزئیات میں بقدرِ ضرورت قدم اُٹھانا سلفِ صالحین ہی کی اقتدار ہے نہ کہ اِن کے مسلک سے انحراف و رُوگردانی، البتہ اہلیت شرط ہے۔

خلافت یا ملوکیت ؟

زمانۂ قدیم ہی سے یہ امتیازی فرق چلا آرہا ہے کہ عادل حکومت کا نصب العین رعایا اور عوام کی خدمت ہوتا ہے اور اس کے لئے عادل بادشاہ کا شاہی خزانہ رفاہِ عام اور عوامی خدمات کی خوشحالی کے لئے وقف ہوتا ہے اور وہ خود اپنی ذات پر ضروری صرفہ سے زیادہ خرچ نہیں کرتا اور نہ وہ عوام کو ٹیکسوں کی کثرت سے پریشان حال بناتا ہے۔ اسکے برخلاف جبر و ظلم کی حکومت کا منشار بادشاہ اور حکومت کا اقتدار، ذاتی تعیش اور اسکا اہتمام ہوتا ہے۔ اس لئے وہ نہ رعایا کے دکھ درد کی پرواکرتا ہے اور نہ اُن کے راحت

و آرام کا خیال رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر کچھ ہو بھی جاتا ہے تو وہ حکومت اور بادشاہ کے کے مفاد و مصالح کے پیش نظر ضمنی طور پر ہو جاتا ہے نیز اس حکومت میں رعایا ہمیشہ ٹیکسوں کے بوجھ سے دبی رہتی ہے اور اس ملک کی اکثریت افلاس و غربت ہی کا شکار رہتی ہے۔ ذوالقرنین چونکہ ایک صالح و عادل بادشاہ اور خلیفۃ اللہ تھے اس لئے انھوں نے اپنی شمالی سیاحت میں اُس قوم سے ٹیکس لینے سے انکار کر دیا جو یاجوج و ماجوج پر دیوار بنانے کے سلسلے میں دینا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے واضح طور پر اس بات کا اعتراف کیا کہ اللہ تعالےٰ مجھ کو حکومت و ثروت اس لئے نہیں دی کہ میں اُس کو ذاتی ضرورت پر صرف کروں۔ بلکہ یہ صرف اس لئے عطا ہوا ہے کہ اسکے ذریعہ مخلوق خدا کی خدمت انجام دوں۔ اسلام میں خلافت کا تصور دیا گیا ہے ملوکیت یا جمہوریت یا کسی اور اقتدار کی ہمت افزائی نہیں کی گئی۔

ناکام و نامراد

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد اس طرح نقل ہوا ہے:-

اِنَّ الْمُکْثِرِیْنَ هُمُ الْمُقِلِّیْنَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔ (الحدیث)

(بے دین) دولت والے ہی قیامت کے دن تہی دست ہونگے۔

سورۂ کہف کا اختتام ذوالقرنین کے تذکرے پر کیا گیا ہے اور اسکے بعد ان آیات کو بطور خلاصۂ کلام رکھا گیا۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا الخ۔

(آیت ۱۰۳ تا ۱۰۶)

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہو، کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟

یہ وہ لوگ ہیں جنکی دنیا میں کری کرائی محنت سب گئی گزری اور وہ اس خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کی آیات کا اور اُس سے ملنے کا انکا کر رہے ہیں سو اُن کے سارے کام غارت گئے تو قیامت کے دن ہم اُن کا ذرا بھی وزن قائم نہ کریں گے (یعنی اُنھیں آخرت کا عیش نصیب

نہ ہوگا) اُن کی سزا وہی ہوگی یعنی دوزخ اس سبب کہ اُنھوں نے کفر کیا
تھا اور میری آیتوں اور پیغمبروں کا مذاق بنایا تھا۔

یعنی اس طرح کے لوگوں نے دُنیا میں خواہ کتنے ہی بڑے کارنامے انجام دیئے ہوں بہرحال وہ دنیا کے خاتمے کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گے۔ اُن کے یہ قصر اور محلات، ان کی دولت وحشمت، اُن کے اپنے ذخیرے اور کارخانے اور اُن کی ایجادیں اور صنعتیں، جدید علوم وفنون اور دوسری وہ چیزیں جنپر وہ فخر کرتے تھے اِن میں سے کوئی بھی ایک چیز وہ اپنے ساتھ لیے ہوئے اللہ تعالےٰ کے حضور نہ پہنچ سکیں گے۔ وہاں کے لئے جو چیز باقی رہنے والی ہے وہ صرف "باقیات صالحات" اسلامی زندگی ہے۔

ناکام ونامراد وہ شخص جسکی زندگی کے اعمال میں ایسا کوئی کارنامہ نہیں جو اُسکو حشر کے دن میزان میں رکھ سکے۔ اُسکی ساری دوڑ دھوپ بلاشبہ اکارت گئی جو اُس نے دنیا میں کی تھی۔

تذکرہ اصحاب الکہف (غار والے)

اصحابُ الکہف والرّقیم

اس کا لفظی ترجمہ "کہف اور رقیم والے" ہے۔
کہف اُس پہاڑی غار کو کہتے ہیں جو وسیع اور کُشادہ ہو۔ اور جو وسیع وکشادہ نہیں ہوتا اسکو غار کہا جاتا ہے۔
رقیم کے لفظی معنی لکھی ہوئی تختی (کتبہ) کے ہیں۔
اس لحاظ سے اصحاب الکہف والرقیم کا ترجمہ کُشادہ غار والے اور کتبے والے ہوا۔ اور لکھی ہوئی تختی سے مراد امام ضحاکؒ اور امام سدّی اور ابن جبیرؒ نے وہ کتبہ مراد لیا ہے جس پر بادشاہِ وقت نے اصحاب کہف کے نام کندہ کر کے غار کے دروازے پر لگا دیا تھا۔ اسی وجہ سے اصحاب کہف کو اصحاب الرقیم بھی کہا جاتا ہے۔ (تختی والے) (تفسیر ابن جریر)
لیکن امام قتادہؒ، امام عطیہؒ، امام مجاہدؒ کا قول یہ ہے کہ رقیم ایک وادی کا نام تھا جو اُس پہاڑ کے نیچے واقع تھی اسی نسبت سے ان نوجوانوں کو اصحاب الرقیم بھی کہا گیا۔
کعب احبارؒ اور وہب بن منبہؒ نے حضرت ابن عباس رضؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رقیم اَیلہ (عقبہ) کے قریب ایک شہر کا نام تھا جو بلادِ روم میں واقع ہے۔
اصحاب کہف اور اصحاب الرقیم ایک ہی جماعت کے دو نام ہیں۔ غار میں پناہ لینے کی وجہ سے اصحاب کہف کہا گیا اور چونکہ اُس غار پر اُن کے نام کندہ کر دیئے گئے تھے اس لئے ان کو اصحاب الرقیم بھی کہا جانے لگا۔
امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح البخاری میں اصحاب کہف اور اصحاب الرقیم دو عنوان الگ الگ قائم کئے ہیں۔ پھر اصحاب الرقیم کے عنوان کے تحت وہ مشہور قصہ

تین آدمیوں کے غار میں بند ہو جانے اور پھر اپنے اپنے خاص اعمال کے وسیلے سے دُعا مانگنے پر راستہ کھل جانے والی حدیث نقل کی ہے جو صحاح ستہ کی کتب میں مفصل موجود ہے۔ امام بخاری کے اس طرز سے سمجھا جاتا ہے کہ اِن کے نزدیک اصحاب کہف ایک جماعت اور اصحاب الرقیم دوسری جماعت کا نام ہے۔

لیکن حافظ ابن حجرؒ نے شرح بخاری میں یہ واضح کر دیا کہ یہ کوئی صریح دلیل نہیں ہے چونکہ اِن تین شخصوں والے قصے میں لفظ رقیم آیا ہے اس لئے یہ اشتباہ ہوگیا کہ اصحاب الرقیم یہ تین شخص ہیں جو بارش کی وجہ سے غار میں بند ہو گئے تھے اور اصحاب کہف وہ سات نوجوان ہیں جو اہل وطن کی بُت پرستی سے بیزار ہو کر ایک غار میں پناہ لئے تھے۔

نیز قرآن حکیم میں اصحاب کہف کا جو قصہ مذکور ہے اُس کا عنوان خود بتا رہا ہے کہ دونوں ایک ہی جماعت کا نام ہے۔ اس قصہ کا آغاز اس طرح ہوا۔

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا۔ (آیت ۹ کہف)

کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ غار اور کتبے والے ہماری عجائبات میں سے کچھ تعجب کی چیز تھے۔

اسکے بعد اُن نوجوانوں کا قصہ بیان کیا جو غار میں پناہ لئے اور اپنے رب سے ہدایت کی دُعا مانگی۔ آخر تک انہی نوجوانوں کا قصہ بیان ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ اصحاب کہف اور اصحاب الرقیم ایک ہی جماعت کا نام ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ الخ (آیت ۱۳ کہف)

ہم اُن کا واقعہ آپ سے ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں۔

پھر اسکے بعد آخر تک صرف اصحاب کہف ہی کا واقعہ بیان کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور مفسّرین اور محدثین نے اِن دونوں کو ایک ہی جماعت قرار دیا ہے۔

قرآن حکیم نے اپنے حکیمانہ اصول اور اسلوب خاص کے تحت سارے قرآن میں صرف یکجا تذکرہ سیدنا یوسفؑ کے سوا کسی بھی قصے کے صرف وہ اجزاء بیان کئے ہیں جن سے انسانی ہدایات اور تعلیمات کا تعلق تھا۔

(قصۂ سیدنا یوسف علیہ السّلام اس اسلوب خاص سے مستثنیٰ ہے اس قصہ کو پوری

تفصیل اور ترتیب کے ساتھ ایک ہی جگہ بیان کر دیا گیا ہے اور اسکی وجہ تذکرہ سیدنا یوسف میں بیان کی جاچکی ہے)

اصحاب کہف کے قصہ میں بھی یہی اسلوب اختیار کیا گیا اس کے صرف وہ اجزاء بیان کیے گئے ہیں جو مقصود اصلی تھے باقی اجزاء جو تاریخی یا جغرافیائی تھے اُن کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا کہ وہ کس زمانے کے تھے؟ کس شہر میں رہتے تھے؟ اُن کا نام کیا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔

اِن عنوانات کی قرآن حکیم کو ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ کسی بھی بیان کردہ قصہ سے انسانوں کو ہدایت و نصیحت کرنا چاہتا ہے۔ قصہ برائے قصہ مقصود نہیں ہوتا جیسا کہ علم تاریخ کا موضوع ہے۔

واقعۂ اصحابُ الکہف

تفسیر حقانی میں اس واقعہ کا مقام اَفسوس یا طرسوس بیان کیا گیا ہے جو ایشیائے کوچک (موجودہ ٹرکی) میں تھا جہاں اب بھی اسکے کھنڈرات موجود ہیں۔ تاریخی شہادت کی بنا پر اصحاب کہف کا زمانہ غالباً ۲۵۰ء تھا۔ پھر یہ لوگ تین سو سال تک غار میں سوتے رہے۔ اس طرح مجموعہ ۵۵۰ء ہوا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت تقریباً ۵۷۰ء میں ہوئی۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے بیس سال پہلے اِن کے بیدار ہونے کا یہ واقعہ پیش آیا۔ شہر افسوس (ٹرکی)، جہاں اصحاب کہف کا واقعہ پیش آیا بُت پرستی کا بہت بڑا مرکز تھا یہاں چاند دیوی کی پوجا ہوتی تھی جسے ڈائنا کے نام سے پکارا جاتا تھا اِس کا بلند و بالا مندر عہد قدیم کے عجائبات عالم میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایشیائے کوچک کے لوگ اسکی پرستش کرتے تھے اور رومی سلطنت نے بھی اسکو اپنے معبودوں کی فہرست میں شامل کر لیا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب مسیحی دعوت رومی سلطنت میں پہنچی تو اس سے متأثر ہو کر شہر کے چند نوجوان شرک و بت پرستی سے تائب ہو گئے اور اللہ واحد پر ایمان لائے۔

یہ سات نوجوان تھے اِن کی تبدیلی مذہب کا حال سنکر بادشاہ وقت (قیصر ڈیسیس)

نے انھیں طلب کیا اور دریافت کیا کہ تمہارا مذہب کیا ہے؟ ان نوجوانوں کو خوب معلوم تھا کہ بادشاہ ہمارا دشمن ہے اور وہ توحید کو ہرگز برداشت نہیں کرتا۔ مگر اس کے باوجود اُنھوں نے کسی خوف کے بغیر صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے جو زمین و آسمان کا مالک ہے اسکے سوا ہم کسی کو معبود نہیں کہتے اگر ہم ایسا کہیں گے تو بڑا گناہ ہوگا۔

بادشاہ یہ سن کر سخت مشتعل ہوا اور انھیں دھمکیاں دینے لگا اور آخر فیصلہ کر لیا کہ انھیں قتل کر دیا جائے لیکن کسی کے مشورے پر یا از خود بولا کہ تم لوگ ابھی کم عمر ہو میں تم کو تین دن کی مہلت دیتا ہوں اس مدت میں تم نے اپنا رویہ بدل لیا تو ٹھیک ہے ورنہ تمہاری گردن ماردی جائیگی۔

اس مہلت سے فائدہ اٹھاکر یہ ساتوں نوجوان شہر سے بھاگ نکلے اور پہاڑوں کی راہ لی تاکہ کسی غار میں اپنی بقیہ زندگی یادِ الٰہی میں صرف کر دیں۔ راستے میں ایک کتا ان کے ساتھ لگ گیا انھوں نے ہر طرح کوشش کی کہ یہ پیچھا چھوڑ دے مگر وہ کتا کسی طرح ان سے الگ نہ ہوا اور ان کے ساتھ چلتا رہا یہاں تک کہ یہ لوگ ایک وسیع غار کے دہانے پر پہنچ گئے۔ یہاں اِن کو یہ جگہ محفوظ نظر آئی۔ سب نے فیصلہ کیا کہ اسی غار میں پناہ لی جائے۔ چنانچہ یہ ساتوں نوجوان اس غار میں داخل ہوگئے۔ لیکن کتا اندر داخل نہیں ہوا غار کے دہانے پر بیٹھ گیا۔ یہ سب تھکے ماندے تھے اس لئے فوراً سو گئے۔ اللہ تعالےٰ نے ان پر طویل نیند طاری کر دی اور وہ سوتے رہے اور اللہ تعالےٰ نے اُن کی حفاظت کا انتظام اپنی قدرتِ خاص سے فرمایا۔ اس طرح کہ نہ اُن کو بھوک پیاس لگی نہ ان کے جسم کو زمین نے متاثر کیا نہ کوئی جاندار اُن تک آنیکی ہمت کرسکا، وہ مسلسل تین سو نو سال تک سوتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب رومی باشندوں کے درمیان حیات بعد الموت اور حشر و نشر کے عقیدے میں سخت اختلاف برپا تھا۔ بادشاہ وقت جو عیسائی مذہب تھا اس بات پر فکرمند تھا کہ لوگوں کے دلوں سے انکارِ آخرت کا خیال کیسے نکالا جائے۔ ٹھیک اسی زمانے میں یہ نوجوان جاگ اُٹھے بیدار ہوکر آپس میں ایک نے پوچھا کہ ہم کتنی دیر سوئے ہوں گے؟ بعضوں نے کہا دن بھر یا دن کا کچھ حصہ۔ پھر یہ کہہ کر سب خاموش ہوگئے کہ اللہ تعالےٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اسکے بعد انھوں نے

اپنے ایک ساتھی کو جس کا نام (یملیخا) تھا چاندی کے سکّے دے کر کھانا لانے کیلئے شہر بھیجا اور اُس کو یہ بھی نصیحت کر دی کہ احتیاط سے جانا آنا کہیں شہر کے لوگ تم کو پہچان نہ جائیں۔ اگر ان لوگوں کو ہماری خبر پہنچ گئی تو ہمیں سنگسار ہی کر ڈالیں گے یا پھر زبردستی اپنی ملّت میں شامل کر لیں گے۔ اور اگر ایسا ہوا تو یقیناً ہم ہرگز فلاح نہ پائیں گے۔

جب یہ شخص شہر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دنیا بدل چکی ہے سب لوگ مسیحی مذہب اختیار کر چکے ہیں بُت پرستی نام کو نہیں پھر بھی وہ ڈرتا ڈرتا ایک دوکان پر پہنچ گیا اور چند روٹیاں خرید کر چاندی کا ایک سکّہ دیا جسپر صدیوں پرانے بادشاہ کی تصویر تھی۔ دُکاندار یہ سکّہ دیکھ کر حیران ہو گیا پھر اسکو شبُہ ہوا کہ شاید یہ کسی پُرانے زمانے کا دفینہ نکال لیا ہو۔ پوچھا کہ یہ سکّہ تم کو کہاں ملا ہے؟ اُس شخص نے کہا یہ تو میرا اپنا مال ہے کہیں سے نہیں لایا ہوں۔ اسپر دونوں میں تکرار شروع ہو گئی لوگ جمع ہو گئے یہاں تک کہ کوتوال شہر تک معاملہ پہنچا۔ کوتوال نے کہا تمہاری یہ بات ماننے کے قابل نہیں ہے۔ یہ صدیوں پرانا سکّہ ہے تم تو ابھی جوان لڑکے ہو ہمارے بڑے بوڑھوں نے بھی یہ سکّہ نہیں دیکھا ہے۔ یَملیخَا نے جب یہ سُنا کہ ظالم بادشاہ کو مرے زمانہ گزر چکا ہے جس کے خوف سے یہ اور اسکے ساتھیوں نے غار میں پناہ لی تھی تو وہ بھی دنگ رہ گیا اور کچھ دیر تک دم بخود رہا۔ پھر آہستہ بولا کل ہی تو میں اور میرے ساتھی اس شہر سے بھاگ کر گئے تھے اور ایک غار میں ہم نے پناہ لی تھی تاکہ بادشاہ کے ظلم سے بچے رہیں۔

اس غریب مسافر کی یہ بات سُن کر کوتوال بھی حیران ہو گیا اور اُس کو لے کر اُس غار کی طرف چلا جہاں اُس کے ساتھی چھُپے ہوئے تھے لوگوں کا ہجوم بھی ساتھ تھا وہاں پہنچ کر یہ بات پوری طور پر ثابت ہو گئی جو عام طور پر زبان زد تھی کہ پرانے زمانے میں چند نوجوان اپنا ایمان بچانے کے لئے بھاگ نکلے تھے اور وہ پھر غائب ہی رہے۔ یہ خبر آناً فاناً شہر کی عیسائی آبادی میں پھیل گئی وقت کے بادشاہ کو بھی اس کی اطلاع دی گئی وہ خود آکر اُن سے ملا اور اُن سے برکت لی۔ اب جو اصحاب کہف خبردار ہوئے کہ وہ تین سو سال تک سوتے رہے ہیں تو وہ اپنے عیسائی بھائیوں کو سلام دُعا کر کے پھر غار میں جا لیٹے۔

حضرت ابن عباس رضؓ کی ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ جب اس نوجوان

کے پیچھے بادشاہ اور عوام کا ہجوم اُس غار کے قریب پہنچا تو وہ معلوم نہ کر سکے کہ نوجوان کس جانب چلا گیا۔

بہت جستجو کے بعد بھی اِن نوجوانوں کا پتہ نہ پا سکے تب مجبور ہو کر واپس ہو گئے اور اُن کی یادگار میں پہاڑ پر ایک ہیکل (مسجد) تعمیر کر دی۔

اس طرح اصحاب کہف کا یہ واقعہ سب پر ظاہر ہو گیا اور اس سے قوم کا وہ اختلاف ختم ہو گیا جو حیات بعد الموت کے بارے میں پھیل گیا تھا۔ جس طرح سینکڑوں برس سوتے رہنے کے بعد اصحاب کہف بیدار کر دیئے گئے اسی طرح قبر (عالم برزخ) میں سینکڑوں اور ہزاروں برس مُردہ رہنے کے بعد قیامت کے دن زندہ کر دیئے جائینگے۔ اور یہ بات اللہ پر کچھ بھاری نہیں ہے۔

قرآن حکیم نے اصحاب کہف کا یہ واقعہ اسی عقیدے کی وضاحت کے لئے بیان کیا ہے:۔

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ
وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا الآیۃ (کہف آیت ۲۱)

اس طرح ہم نے شہر والوں کو ان کے حال پر مطلع کر دیا تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت کی گھڑی بیشک آکر رہے گی (اور اُس دن سب کو زندہ ہونا ہے)

اس واضح نشانی کو دیکھ کر لوگ مان گئے کہ واقعی موت کے بعد زندگی برحق ہے۔

اصحاب کہف کا یہ حیرت انگیز واقعہ قرآن حکیم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

قرآنی مضمون

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ
كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا۔ الآیۃ (کہف آیات ۹ تا ۲۶)

کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور پہاڑ والے (کتبہ والے) ہماری عجائباتِ قدرت میں سے کچھ تعجب کی چیز تھے؟ (یعنی اللہ تعالےٰ کے عجائباتِ قدرت اس سے کہیں اور زیادہ حیرت افزا ہیں)

وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ ان نوجوانوں نے اُس غار میں
جاکر پناہ لی پھر کہا اے ہمارے پروردگار ہمکو اپنے پاس سے رحمت
کا سامان عطا فرمائیے اور ہمارے لئے کام میں درستگی کا سامان مہیا
فرما دیجئے۔ سو ہم نے اُس غار میں اُن کے کانوں پر سالہا سال تک
نیند کا پردہ ڈال دیا۔
پھر ہم نے اُن کو اُٹھایا تاکہ معلوم کرلیں کہ اُن دونوں (اصحابِ
کہف کے) گروہوں میں سے کون اپنی مدتِ قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے۔
(کیونکہ جب وہ بیدار ہوئے تو آپسمیں اپنی مدتِ نیند میں اختلاف
کرنے لگے تھے)
ہم ان کا اصل قصہ تمہیں سناتے ہیں وہ چند نوجوان تھے جو
اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے اُن کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔
ہم نے اُن کے دل اس وقت مضبوط کر دیئے جب وہ اُٹھے
اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور
زمین کا رب ہے۔ ہم اُسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو ہرگز نہیں پکارینگے۔
اگر ہم ایسا کرینگے (یعنی غیر اللہ کو پکاریں) تو اس صورت میں ہم نے
یقیناً بڑی ہی بے جا بات کہی۔
(پھر انھوں نے آپس میں مشورہ کیا) یہ جو ہماری قوم ہے انھوں
نے اللہ کو چھوڑ کر اور معبود قرار دے رکھے ہیں۔ یہ لوگ اُن کے معبود ہونے
پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ آخر اُس شخص سے بڑا ظالم اور
کون ہوسکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟
اب جبکہ تم اُن سے اور اُن کے معبودوں سے جو اللہ کے سوا
ہیں بے تعلق ہو چکے ہو تو چلو اب غار میں پناہ لو تم پر تمہارا رب اپنی رحمت
پھیلا دے گا اور تمہارے لئے تمہارے اس کام میں کامیابی کا سامان
درست کر دے گا۔
اور اے پیغمبر تم سورج کو دیکھو گے کہ وہ نکلتے وقت اُنکے

غار سے دہنی جانب بچکر نکل جائے گا اور ڈوبتے وقت غار سے کترا کر بائیں جانب کو ہو جاتا ہے اور وہ نوجوان کشادہ کھوہ میں ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ اور جسکو وہ ہدایت دے وہی راہ یاب ہے۔ اور جس شخص کو (اُسکی مسلسل گمراہی کی بنا پر) گمراہ کرے تو اُس کے لئے کسی راہ دکھانے والے مددگار کو آپ نہ پاؤ گے۔

تم اُنھیں دیکھ کر یہ سمجھو گے کہ وہ جاگ رہے ہیں، حالانکہ وہ سو رہے ہیں۔ ہم اُنھیں وائیں بائیں کروٹ دلواتے رہتے تھے، اور ان کا کُتا غار کے دہانے پر ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا، اگر تم کہیں جھانک کر انھیں دیکھتے تو اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور تم پر اُن کے نظارے سے دہشت طاری ہو جاتی۔ اور اسی عجیب کرشمے سے ہم نے انھیں اُٹھا بٹھایا تاکہ ذرا آپسمیں پوچھ گچھ کریں۔ اِن میں سے ایک نے پوچھا کہو کتنی دیر اس حال میں رہے؟ بعضوں نے کہا شاید دن بھر یا اس سے کچھ کم رہے ہونگے۔ دوسرے بعضوں نے کہا اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ تم کسقدر رہے ہو۔ سو اب اپنے میں سے کسی کو چاندی کا سکہ دیکر شہر بھیجو اور وہ دیکھے کہ سب سے اچھا حلال کھانا کونسا ہے۔ سو اُس میں سے کچھ کھانا تمہارے لئے لے آئے اور یہ کام خوش تدبیری سے کرے اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے۔ اگر کہیں اُن لوگوں کا ہاتھ تم پر پڑ گیا تو بس سنگسار ہی کر ڈالینگے یا پھر زبردستی تم کو اپنی ملت میں واپس لے آئیں گے اور ایسا ہوا تو تم کبھی فلاح نہ پائیں گے۔

اس طرح ہم نے اہل شہر کو اِن کے حال پر مطلع کیا تاکہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت بیشک آکر رہے گی۔ وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب کہ اُس زمانے کے لوگ (تین سو سال بعد) آپس میں اس بات پر جھگڑ رہے تھے کہ ان (اصحاب کہف) کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے کچھ لوگوں نے کہا کہ ان اصحاب کہف پر ایک قبہ تعمیر کر دو اِن کا رب اِن کے حال کا خوب واقف کار ہے (یعنی

اِن سے کوئی تعرض نہ کرو) اُن لوگوں نے جو برسرِ حکومت تھے کہا ہم تو اُن کے غار پر ایک مسجد تعمیر کریں گے۔

اے پیغمبر کچھ لوگ کہیں گے وہ تین آدمی ہیں چوتھا اُن کا کُتا ہے اور کچھ لوگ ایسا بھی کہتے ہیں نہیں پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا ہے۔ یہ سب بے تحقیق بات کو ہانک رہے ہیں اور بعض کہتے ہیں وہ کل سات آدمی ہیں آٹھواں اُن کا کتا ہے (اے پیغمبر) آپ کہہ دیجئے اُن کی اصل گنتی تو میرا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے۔ کیونکہ ان کی تعداد بہت کم لوگ جانتے ہیں لہذا آپ سرسری بات سے بڑھ کر اُن کی تعداد کے معاملے میں لوگوں سے بحث نہ کرو اور نہ اُن کے متعلق کسی سے کچھ پوچھو۔

اور کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کرو کہ میں کل یہ کام کر دوں گا (تم کچھ نہیں کر سکتے) مگر (یہ کہہ کر) کہ ہوگا وہی جو اللہ چاہیگا اور جب کبھی بھول جاؤ تو اپنے پروردگار کی یاد تازہ کر لو تم کہدو اُمید ہے کہ میرا رب اس سے بھی زیادہ کامیابی کی راہ مجھ پر کھول دے گا۔

اور وہ لوگ اپنے غار میں تین سو برس تک رہے اور نو برس اوپر اور رہے۔

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے رہنے کی مدت کو زیادہ جانتا ہے تمام آسمانوں اور زمین کا غیب اُسی کو ہے وہ کیسا کچھ دیکھنے والا اور کیسا کچھ سننے والا ہے۔ اُن کا اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں اور نہ اللہ تعالےٰ کسی کو اپنے حکم میں شریک کرتا ہے۔

نتائج و عبر

اس سے یہ سبق ملتا ہے

اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں قرآن حکیم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح خطاب کیا ہے :-

قُلْ رَّبِّیْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِہِمْ مَّا یَعْلَمُہُمْ اِلَّا قَلِیْلٌ ۔ الخ

(آیت ۲۲)

آپ کہہ دیں کہ میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے، کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں۔ لہٰذا آپ سرسری بات سے بڑھکر اُن کی تعداد کے معاملے میں لوگوں سے بحث نہ کیجئے اور نہ اُن کے متعلق کسی سے دریافت کیجئے۔

مطلب یہ ہے کہ اصل چیز ان کی تعداد نہیں ہے بلکہ وہ سبق ہیں جو اس قصے سے ملتے ہیں۔

(۱) اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ایک مومن کو کسی حال میں حق سے منہ موڑنے اور باطل کے آگے سر جھکانے کے لئے تیار نہ ہونا چاہیئے۔

(۲) اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ مومن کا اعتماد دنیا کے اسباب پر نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ پر ہونا چاہیئے۔

(۳) اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جس عام عادت کو لوگ قانون فطرت سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اس قانون کے خلاف دنیا میں کچھ نہیں ہو سکتا، اللہ تعالےٰ درحقیقت اس کا پابند نہیں ہے۔ وہ جب اور جہاں چاہے اس عادت کو بدل سکتا ہے اُسکے لئے یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے کہ کسی کو دو چار سو برس تک میٹھی نیند سُلا کر اس طرح اُٹھا دے جیسے کہ وہ چند گھنٹے سویا ہو۔ اور اس طویل عرصہ میں اُسکی عمر، شکل، صورت، لباس، تندرستی غرض کسی پر بھی کچھ تغیر نہ آنے پائے۔

(۴) اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ نوع انسانی کی تمام اگلی پچھلی نسلوں کو بیک وقت زندہ کرکے اٹھا دینا جس کی خبر انبیاء کرام اور آسمانی کتابوں نے دی ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔

(۵) اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جاہل انسان کسی طرح ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو اپنے لئے نصیحت وعبرت بنانے کے بجائے اُلٹا گمراہی کا سامان بناتے رہے ہیں۔ اصحاب کہف کا جو معجزہ اللہ تعالیٰ نے اس لئے دکھایا تھا کہ لوگ اس سے آخرت کا یقین حاصل کریں اور مرنے کے بعد جی اُٹھنے پر دلیل حاصل کریں۔ لیکن انھوں نے اسی نشان کو یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ اور ولی پُوجنے کے لئے عطا کئے ہیں۔ (چنانچہ اولیاء اللہ اصحاب کہف کی اس جماعت کو مشرکین نے خدائی روپ دے لیا) یہ ہیں وہ اسباق جو آدمی کو اس قصے سے لینا چاہئیں۔

ان سے توجہ ہٹا کر اس کھوج میں لگ جانا کہ اصحاب کہف کتنے تھے؟ اور ان کے نام کیا تھے؟ اِن کا کتا کس رنگ کا تھا؟ ان امور میں غور کرنا اُن لوگوں کا کام ہے جو مغز کو چھوڑ کر صرف چھلکوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطے سے اہل ایمان کو یہ تعلیم دی گئی کہ آپ اِن غیر ضروری باتوں میں نہ اُلجھیں نہ انکی تحقیق میں اپنا وقت ضائع کریں۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کی صحیح تعداد بیان نہیں فرمائی تاکہ شوقِ فضول رکھنے والوں کو غذا نہ ملے۔

اُلٹا مفہوم

اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا۔ الخ (آیت ۲۱)

وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جبکہ اُس زمانے کے لوگ اُن اصحاب کہف کے معاملہ میں باہم جھگڑ رہے تھے سو اُن لوگوں نے یہ کہا کہ اُن کے پاس کوئی عمارت بنوا دو، اُن کا رب اُن کو خوب جانتا تھا جو لوگ اپنے کام پر

غالب تھے (اہلِ حکومت) اُنھوں نے کہا کہ ہم تو اُن کے پاس ایک مسجد بنا دیں گے (حقیقتاً یہی اسلامی مزاج ہے)

مسلمانوں میں بعض لوگوں نے قرآن حکیم کی اِس آیت کا بالکل اُلٹا مفہوم لیا ہے۔ یہ لوگ اس آیت کو دلیل ٹھیرا کر اولیاء اللہ کے قبور پر عمارتیں بنانا اور گنبد و قبے مساجد بنانا جائز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہاں قرآن حکیم اُن کی اسی گمراہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو نشانی اِن منکرین آخرت کو آخرت کا یقین دلانے کے لئے دکھائی گئی تھی اُسے انھوں نے ارتکابِ شرک کیلئے ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ چلو کچھ اور ولی پوجا پاٹ کے لئے ہاتھ آگئے۔ اِسْتَغْفِرُوا اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ۔

آخر اس آیت سے قبورِ صالحین پر تعمیرات بنانا اور انکو عبادت گاہ بنالینا کیسے ثابت ہوتا ہے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں واضح ہدایات دی ہیں:۔

لَعَنَ اللّٰہُ زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِیْنَ عَلَیْھَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ۔ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، احمد)

اللہ نے لعنت فرمائی ہے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور قبروں پر مساجد بنانے اور چراغ روشن کرنے والوں پر۔

اَلَا وَاِنَّ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ کَانُوْا یَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِیَاءِھِمْ مَسَاجِدَ فَاِنِّیْ اَنْھٰکُمْ عَنْ ذٰلِکَ۔ (مسلم)

خبردار رہو، تم سے پہلے لوگ اپنے نبیوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیتے تھے، میں تم کو اس حرکت سے منع کرتا ہوں۔

لَعَنَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَاءِھِمْ مَسَاجِدَ (بخاری، مسلم، نسائی، احمد)

اللہ نے لعنت کی ہے یہود اور نصاریٰ پر، اُنھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مساجد بنالیا۔

اِنَّ اُولٰٓئِکَ اِذَا کَانَ فِیْھِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ فَمَاتَ بَنَوْا عَلٰی قَبْرِہٖ مَسْجِدًا وَصَوَّرُوْا فِیْہِ تِلْکَ الصُّوَرَ اُولٰٓئِکَ شِرَارُ الْخَلْقِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔ (بخاری، مسلم، نسائی، احمد)

اِن لوگوں (یہود و نصاریٰ) کا حال یہ تھا کہ اگر اِن میں کوئی
مرد صالح ہوتا تو اُسکے مرنے کے بعد اُسکی قبر پر مسجد بناتے اور اُسکی
تصویریں تیار کرتے تھے۔ یہ لوگ قیامت کے دن بدترین مخلوق ہونگے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اِن واضح تصریحات کے بعد وہ یہودی یا نصرانی ذہن ہی ہوگا جو اس گمراہ فعل کو قرآن کی اس آیت سے حجت و دلیل قرار دے۔ اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔

علمی لطیفہ :۔

اصحاب کہف کی تعداد کے بارے میں قرآن حکیم نے کوئی واضح تعداد بیان نہیں فرمائی ہے۔ اس سلسلے میں لوگوں کے اندازے اور تخمین نقل کئے ہیں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ تینؔ تھے اور چوتھا ان کا کتا۔ بعضوں نے چار کہا اور پانچواں کُتا۔ بعضوں نے پانچ کہا اور چھٹا ان کا کتا۔ اور بعض نے سات کہا اور آٹھواں ان کا کُتا۔ اس لئے مفسرین نے قطعی تعداد کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے لیکن عام طور پر سات عدد نقل کیا گیا ہے۔

اصحاب کہف کے ساتؔ عدد ہونے کے متعلق تفسیر مدارک میں ایک لطیفہ بھی حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ :۔

جب وہ نوجوان سوکر اُٹھے ہیں تو اس قصہ میں ارشاد ہے
"قَالَ قَآئِلٌ" (اُن کے ایک نے کہا) یہ تو ایک ہوا آگے "قَالُوْا لَبِثْنَا" یہ
تین ہوئے کیونکہ جمع کا لفظ کم از کم تین پر صادق آتا ہے۔ پھر آگے "قَالُوْا
رَبُّکُمْ" آیا ہے۔ یہ اور تین ہوئے۔ اور ظاہری کلام سے معلوم ہوتا ہے
کہ قائلین قول مختلف ہیں۔ لہذا جملہ تعداد سات ہوگئی۔
مفسر بیان القرآن لکھتے ہیں کہ یہ کوئی مستقل دلیل نہیں ہوسکتی
البتہ موئد دلیل بن سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

غار والوں کے چند اور تذکرے

چونکہ دین مسیحی میں رہبانیت (ترک دنیا)

کو دین کا بہت مقدس کام سمجھا گیا ہے اور اسی طرح ہر زمانے میں ظالم بادشاہوں کے خوف سے اپنے دین کو چھپانے یا باقی رکھنے کے لئے بعض لوگوں نے غاروں اور پہاڑوں میں پناہ لی ہے۔ اس لئے ہر ملک میں ایسے متعدد واقعات پیش آئے ہیں جہاں بعض لوگ عبادتِ الٰہی کے لئے غاروں اور پہاڑوں میں اپنی عمریں گزار دیں ہیں۔

اب جہاں جہاں ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہے اس پر مؤرخ کو اصحاب کہف کا گمان ہوگیا جسکی وجہ سے اصحاب کہف کی تعداد اور محل وقوع کے بارے میں مختلف مقامات نقل کر دیئے گئے ہیں۔

امام تفسیر قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں چند واقعات جو کچھ تو سماعی ہیں اور چند چشم دید بھی نقل کئے ہیں جو مختلف شہروں سے متعلق ہیں۔

پہلا واقعہ امام ضحاکؒ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رقیم روم کے ایک شہر کا نام ہے جس کے ایک غار میں اکیس آدمی لیٹے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سو رہے ہیں۔

دوسرا واقعہ امام تفسیر ابن عطیہ رح سے نقل کیا ہے کہ میں نے بہت سے لوگوں سے سنا ہے کہ ملک شام میں ایک غار ہے جسمیں چند مُردہ لاشیں ہیں۔ وہاں کے مجاورین کا کہنا ہے کہ یہی لوگ اصحاب کہف ہیں۔ اس غار کے پاس ایک مسجد اور مکان کی تعمیر بھی ہے جسکو رقیم کہا جاتا ہے اور اِن مردہ لاشوں کے ساتھ ایک مُردہ کتے کا ڈھانچہ بھی موجود ہے۔

تیسرا واقعہ شہر اُندلس (غرناطہ) کا نقل کیا ہے۔ امام تفسیر ابن عطیہؒ کہتے ہیں کہ غرناطہ میں لَوشَہ نامی گاؤں کے قریب ایک غار ہے جسمیں کچھ مُردہ لاشیں ہیں اور اُن کے ساتھ ایک مُردہ کتے کا ڈھانچہ بھی موجود ہے۔ اِن میں اکثر لاشوں پہ گوشت

باقی نہیں رہا صرف ہڈیوں کے ڈھانچے ہیں اور بعض پر ابتک بھی گوشت پوست موجود ہے ان پر صدیاں گزر گئی ہیں۔

مگر صحیح سند سے اِن کا کچھ حال معلوم نہیں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہی اصحاب کہف ہیں۔ ابن عطیہؒ کہتے ہیں کہ یہ خبر سنکر میں خود ۵۰۴ھ میں وہاں پہنچا تو واقعی یہ لاشیں اسی حالت پر پائیں جیسا کہ میں نے سُنا تھا اور ان کے قریب ایک مسجد بھی ہے اور ایک رومی زمانے کی عمارت بھی ہے جسکو رقیم کہا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں یہ کوئی عالیشان محل ہوگا۔ اس وقت تک بھی اسکی بعض دیواریں صحیح وسالم ہیں اور یہ ایک غیر آباد جنگل میں ہے۔ اسکے بعد ابن عطیہؒ کہتے ہیں کہ غرناطہ (اندلس) کے بالائی حصّہ میں ایک قدیم شہر کے آثار اور نشانات پائے جاتے ہیں جو رومیوں کے طرز کے ہیں۔ اس شہر کا نام رَقیُوس بتایا جاتا ہے ہم نے اسکے کھنڈروں میں بہت سے عجائبات اور قبریں دیکھی ہیں۔

امام قرطبیؒ جو اُندلس ہی کے رہنے والے ہیں ان تمام واقعات کو نقل کرنے کے بعد بھی کسی کو متعین طور پر اصحاب کہف قرار دینے سے گرُیز کرتے ہیں اور خود ابن عطیہؒ نے بھی اپنے چشم دید واقعات کے باوجود یقینی طور پر نہیں کہا کہ یہی لوگ اصحاب کہف ہیں۔ محض عام شہرت نقل کرتے ہیں جیسا کہ محتاط اہل علم کا طرز ہے۔

مگر دوسرے اُندلسی مفسر ابو حیّان جو ساتویں صدی ہجری ۶۵۴ھ میں شہر غرناطہ ہی میں پیدا ہوئے، وہیں رہے بسے ہیں وہ بھی اپنی تفسیر بحر محیط میں غرناطہ کے اس غار کا اسی طرح ذکر کرتے ہیں جس طرح امام قرطبیؒ نے کیا ہے اور ابن عطیہؒ کے اپنے مشاہدہ کا تذکرہ لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ہم جب اُندلس میں تھے (یعنی قاہرہ منتقل ہونے سے پہلے) تو بہت لوگ اس غار کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ اگرچہ یہ لاشیں ابتک موجود ہیں اور زیارت کرنے والے اُن کو

شمار بھی کرتے تھے۔ مگر ہمیشہ انکی تعداد بتانے میں اختلاف کرتے رہے ہیں۔ پھر فرمایا کہ ابن عطیہؒ نے جس شہر رقیوس کا ذکر کیا ہے جو غرناطہ سے بجانب قبلہ واقع ہے میں اس شہر سے بے شمار مرتبہ گزرا ہوں اور اس میں بڑے بڑے غیر معمولی پتھر دیکھے ہیں اسکے بعد لکھتے ہیں :۔

ویترجح کون اھل الکھف بالاندلس لکثرۃ دین النصارٰی بھا حتیٰ ھی بلاد مملکتھم العظمیٰ۔

(تفسیر بحر محیط ج ۶ ص ۱۰۳)

یعنی اصحاب کہف کے شہر اندلس میں موجود ہونے کی ترجیح کے لئے یہ بھی قرینہ ہے کہ وہاں نصرانیت کا غلبہ ہے۔ یہاں تک کہ یہی خطہ ان کی سب سے بڑی مذہبی مملکت ہے۔ (تفسیر قرطبیؒ ج ۹ ص ۳۵۶)

اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفسر ابو حیان اُندلسی کی رائے بھی یہی ہے۔ واللہ اعلم۔

چوتھا واقعہ ابن ابی شیبہؒ، ابن منذرؒ، ابن ابی حاتم رہ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں ہم نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ رومیوں کے مقابلہ میں ایک جہاد کیا جسکو غزوۃ المضیق کہتے ہیں اس موقع پر ہمارا گزر اُس غار پر ہوا جس میں اصحاب کہف ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ حضرت معاویہؓ نے ارادہ کیا کہ غار کے اندر جائیں اور اصحاب کہف کی لاشوں کا مشاہدہ کریں مگر حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا مشاہدہ کرنے سے اُس ہستی کو منع فرمایا جو آپ سے بہتر تھی (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں آپ کو اس طرح خطاب کیا ہے :۔

لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا الآیۃ (کہف آیت ۱۸)

اگر آپ ان کو دیکھیں تو پیٹھ پھیر دیں اور رُعب وہیبت سے

مغلوب ہو جائیں۔

مگر حضرت معاویہؓ نے اسکے باوجود چند آدمیوں کو دیکھنے کیلئے روانہ کر دیا۔ وہ لوگ غار پر پہنچے مگر جب غار میں داخل ہونا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اُنپر ایک سخت ہوا بھیج دی جس نے اُن کو اندر جانے سے روک دیا۔

(روح المعانی ج ۱۵ ص ۲۲۷)

پانچواں واقعہ مملکت اُردن میں عمان کے قریب ایک سنسان جنگل میں ایک غار کا پتہ لگا تو حکومت کے محکمہ آثار قدیمہ نے ۱۹۶۳ء میں اس جگہ کھدائی کا کام جاری کیا اسمیں مٹی اور پتھروں کے ہٹانے کے بعد ہڈیوں اور پتھروں سے بھرے ہوئے چھ صندوق اور دو قبریں برآمد ہوئیں۔ غار کے جنوبی سمت میں پتھروں پر کندہ کچھ نقوش بھی دریافت ہوئے جو بزنطینی زبان میں ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہی جگہ رقیم ہے جس کے پاس اصحاب کہف کا یہ غار ہے۔ واللہ اعلم۔

الغرض یہ تمام تاریخی وجغرافیائی تفصیلات جو قدیم مفسرین کی روایات ہیں اِن سے نہ قرآن حکیم کی کسی آیت کا سمجھنا موقوف ہے اور نہ اس مقصد کا یہ کوئی ضروری حصہ ہیں جس کے لئے قرآن حکیم نے اِس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ پھر روایات وحکایات اور اِن کے آثار و قرائن اس درجہ مختلف ہیں کہ ساری تحقیق وتفتیش کے باوجود اس کا کوئی قطعی فیصلہ ممکن نہیں صرف ترجیحات اور رجحانات ہی ہو سکتے ہیں۔ بہرحال اتنا تخمینی طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ اصحاب کہف کا یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے قریب پیش آیا۔

ابن کثیرؒ نے اس سلسلے میں پُراز حقیقت ایک بات لکھ دی ہے جو غور کرنے کے قابل ہے:۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اصحاب کہف کے ان حالات کی خبر دی جن کا ذکر قرآن حکیم میں ہے تاکہ ہم اسکو سمجھیں اور ان میں تدبّر کریں اور

اس کی خبر نہیں دی کہ کہف کس زمین اور کس شہر میں ہے۔ کیونکہ اس میں نہ ہمارا کوئی فائدہ ہے اور نہ کوئی شرعی مقصد۔ (ابن کثیر ج ۳ ص۷۵)

سورہ کہف کی خصوصیات

حضرت ابو الدرداء رضؓ سے روایت ہے کہ جس شخص نے سورۂ کہف کی پہلی دس آیتیں حفظ کر لیں وہ دجّال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔

انہی سے ایک دوسری روایت میں یہی مضمون سورۂ کہف کی آخری دس آیات یاد کرنے سے متعلق منقول ہے۔

(مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، مسند احمد)

اور مسند احمد میں حضرت سہل بن معاذ رضؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص سورہ کہف کی پہلی اور آخری آیتیں پڑھ لے اسکے لئے اُس کے قدم سے سر تک ایک نور پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جو پوری سورت پڑھ لے تو اُس کے لئے زمین سے آسمان تک نور ہو جاتا ہے۔

اور بعض روایات میں ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف کی تلاوت کرلے اُسکے قدم سے لے کر آسمان کی بلندی تک نور ہو جائیگا جو قیامت کے دن روشنی دے گا اور پچھلے جمعہ سے اس جمعہ تک اسکے سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔ (امام ابن کثیرؒ نے اس روایت کو موقوف قرار دیا ہے)

حافظ ضیاء مقدسیؒ نے اپنی کتاب مختارہ میں حضرت علی رضؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص جمعہ کے دن سورہ کہف پڑھ لے وہ آٹھ روز تک ہر فتنہ سے محفوظ رہے گا اور اگر دجّال نکل آئے تو یہ اُسکے فتنے سے بھی محفوظ رہے گا۔ (یہ سب روایات تفسیر ابن کثیر سے لی گئی ہیں)

اِنْشَاءَ اللّٰہ :-

سورہ کہف کے شانِ نزول میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ جب مکہؔ مکرمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا چرچا ہوا اور قریش مکہؔ اس سے پریشان ہوئے تو اُنھوں نے اپنے دو آدمی نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو مدینہ طیبہ کے یہودی علمار کے پاس بھیجا تاکہ یہ معلوم کریں کہ توراۃ و انجیل میں ایسا کوئی ذکر موجود ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کی تصدیق کرتا ہو۔

علمار یہود نے اِن کو بتایا کہ تم لوگ اُس نبی سے تین سوالات کرو اگر انھوں نے صحیح جواب دیا تو سمجھ لو کہ وہ اللہ کے نبی و رسول ہیں اور اگر نہ دے سکے تو سمجھ لینا کہ یہ بات بنانے والے ہیں۔

ایک تو یہ سوال کہ اُن نوجوانوں کا کیا قصہ ہے جو قدیم زمانے میں اپنے شہر سے نکل گئے تھے اور غار میں اپنی زندگی گزاری۔

دوسرا سوال یہ کہ اُس شخص کا کیا حال ہے جس نے دنیا کے مشرق و مغرب اور تمام زمین کا سفر کیا ہے۔

تیسرا سوال یہ کہ روح کیا چیز ہے۔

چنانچہ یہ دونوں قریشی مکہ مکرمہ آئے، اور اپنی برادری سے کہا کہ ہم ایک فیصلہ کن بات لیکر آئے ہیں اور پھر اُن یہودی علمار کا قصہ سُنایا۔ آخر یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور یہ سوالات پیش کئے۔ آپؐ نے سنکر فرمایا کہ میں اس کا جواب کل دوں گا۔ مگر آپ اس وقت انشاء اللہ کہنا بھول گئے۔ یہ لوگ لوٹ گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے انتظار میں رہے تاکہ اِن کا جواب دیا جائے مگر وعدہ کے مطابق دوسرے دن تک وحی نہیں آئی اور نہ جبرئیل امین آئے۔ پندرہ دن اسی حالت پر گزر گئے۔ قریش مکہ نے مذاق اُڑانا شروع کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس صورت حال سے رنج و غم پہونچا۔ پندرہ دن بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام یہ پوری سورت کہف لیکر اترے اور تاخیر کی وجہ بھی بیان کردی کہ آئندہ زمانے میں کسی کام کے کرنے کا وعدہ کیا جائے تو اِنشاء اللہ کہنا چاہیئے۔ چونکہ آپ نے انشاء اللہ نہیں کہا تھا اس لئے وحی الٰہی میں تاخیر ہوگئی۔

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ۔ الآیۃ (کہف آیت ۲۳)

اصحاب کہف کے نام حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی صحیح حدیث میں اصحاب کہف کے نام موجود نہیں ہیں۔

تفسیری و تاریخی روایات میں مختلف نام بیان کئے گئے ہیں لیکن ان میں کچھ زیادہ مستحکم روایت وہ ہے جسکو طبرانی نے اپنی کتاب معجم اوسط میں حضرت ابن عباس رضؓ سے نقل کیا ہے۔ اُس میں انکے نام اس طرح بیان کئے گئے ہیں۔

مُکَسَلْمِینَا، تَمْلِیْخَا، مَرْطُوْنُسْ، سَنُوْنُسْ، سَارِیْنُوْنُسْ، ذُوْنُوَاس، کَعُسْطَطیُوْنُسْ۔　　　واللہ اعلم۔

تذکرہ
قومِ سبا اور سیلِ عرم
اور
مآرب

قومِ سبا ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ "سبا" یمن کے بادشاہوں اور اس ملک کے باشندوں کالقب ہے۔ تبابعہ (قوم تبع) جو اسکے مقتدا اور پیشوا تھے وہ بھی اسی قوم سبا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ملکۂ بلقیس جس کا واقعہ حضرت سلیمان علیہ السّلام کے تذکرہ میں آچکا ہے وہ بھی اسی قوم سے تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر اپنے رزق کے دروازے کھول دیئے تھے اور اُنکے شہر میں آرام و آسائش کے تمام وسائل مہیا تھے۔ ان کے عروج کا دور گیارہ سو برس قبل مسیح بیان کیا جاتا ہے۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السّلام کے زمانے میں ایک دولت مند قوم کی حیثیت سے اس قوم کا شہرۂ آفاق پھیل چکا تھا۔ اسکی دولت و ثروت کے افسانے روم اور یونان کے ایوانوں میں رشک وحسرت سے سنے جاتے تھے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ یہ لوگ سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرتے تھے۔ ان کے مکانوں کی چھتوں دیواروں اور دروازوں تک میں سونے اور چاندی ہاتھی دانت حتیٰ کہ جواہرات کا کام ہوا ہوتا تھا ان کے سرسبز و شاداب باغات[۱]، کھیتیاں اور مواشی ملک کا بیش بہا سرمایہ تھا۔ یہ لوگ عیش پسندی میں جلانے کی لکڑی کے بجائے دارچینی، صندل اور دوسری خوشبو دار لکڑیاں جلاتے تھے۔ انھوں نے تاریخ میں پہلی بار شہر صنعاء کے بلند پہاڑی مقام پر ایک فلک بوس عمارت تعمیر کی جو "قصرِ غُمدان" کے نام سے صدیوں تک مشہور رہی ہے۔ عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ اسکی ۲۰ منزلیں تھیں اور ہر منزل ۳۶ فٹ بلند تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انکو اپنے انبیاء کے ذریعہ توحید اور اپنے احکام کی اطاعت کے ذریعہ نعمتوں کے شکر کرنے کا حکم دیا تھا۔ ایک مدت تک یہ لوگ اسی حال پر قائم رہے۔ پھر ان میں عیش وعشرت نے

---

[۱] قرآن حکیم کی تعبیر کے مطابق ہر طرف باغ ہی باغ نظر آتا تھا۔

غفلت وانکار پیدا کر دیا اللہ تعالیٰ نے اِن کی تنبیہ کے لئے مزید تیرہ اور پیغمبر بھیجے جنھوں نے ان کی فہمائش کی اور راہ راست پر لانے کی پوری کوشش کی مگر یہ لوگ اپنی بے ہوش غفلت سے باز نہ آئے۔ آخراِن پر سیلاب کا عذاب بھیجا گیا جس نے ان کے شہر اور باغات کو ویران کردیا۔

امام احمدؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ قرآن میں جس سَبا کا ذکر ہے یہ کسی مرد یا عورت کا نام ہے یا زمین کے کسی خطہ کا نام ہے؟

آپؐ نے ارشاد فرمایا یہ ایک مرد کا نام ہے جس کی اولاد میں دس لڑکے ہوئے ہیں جن میں سے چھ یمن میں آباد رہے اور چار ملک شام چلے گئے۔ یمن میں رہنے والوں کے نام یہ ہیں:۔

مُذحِج، کِندہ، اَزْد، اَشعری، اَنمار، حِمْیر (ان چھ لڑکوں سے چھ قبیلے بنے جو انہی مذکورہ ناموں سے معروف ہیں)

اور شام میں بسنے والوں کے یہ نام ہیں:۔

لَخم، جُذام، عَامِلَہ، غسّان (انکی نسل کے قبائل انہی ناموں سے مشہور ہوئے)

(مسند احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن عبدالبر، ترمذی)

ابن کثیرؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ دس لڑکے سبا کے صلبی اور بلا واسطہ بیٹے نہیں تھے بلکہ سبا کی دوسری یا چوتھی نسل میں یہ لوگ ہوئے ہیں پھر انکے قبیلے شام و یمن میں پھیلے اور انہی ناموں سے مشہور ہوئے۔ سبا کا اصلی نام عبد شمس تھا شجرہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

سَبا عبد شمس بن یشجب بن یَعْرب بن قحطان۔

مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ سبا عبد شمس نے اپنے زمانے میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اپنی قوم کو سنائی تھی۔ ممکن ہے اسکو اس بات کا علم قدیم کتابوں تورات یا انجیل سے حاصل ہوا ہو جسمیں آپؐ کی علامات اور تشریف آوری کے تذکرے موجود تھے۔ نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کی شان میں اس نے چند اشعار بھی کہے ہیں جن میں آپکی بعثت کا ذکر کرکے یہ تمنا ظاہر کی ہے کہ کاش میں اُن کے زمانے میں ہوتا تو اُنکی بھرپور مدد کرتا اور اپنی قوم کو اُنپر ایمان لانے کی تلقین کرتا۔

اور حدیث میں یہ جو مذکور ہے کہ سبا کے دس لڑکوں میں سے چھ یمن میں آباد ہوئے اور بقیہ چار ملک شام میں چلے گئے۔ یہ واقعہ اِن پر سیلاب کا عذاب آنے کے بعد کا ہے۔ (ابن کثیر)

امام قرطبیؒ نے نقل کیا ہے کہ قوم سبا پر سیلاب کا عذاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیانی زمانے میں آیا تھا جسکو زمانہ فترت کہا جاتا ہے۔

ابن کثیرؒ نے اس سیلاب کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:۔

سیلِ عَرِم اور سدِّ مآرب

سیل کے معنی سیلاب اور عرم کے معنی بند کے ہیں جو پانی روکنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے یہی معنی منقول ہیں۔

یمن کے موجودہ دارالحکومت صنعاء سے تین منزل کے فاصلہ پر ایک شہر مآرب نامی تھا جسمیں قوم سبا رہتی تھی۔ یہ شہر دو پہاڑوں کے درمیان وادی میں آباد تھا اور ہمیشہ سیلابوں کی زد میں رہتا تھا ملکہ بلقیس نے اِن دو پہاڑوں کے درمیان ایک بند نہایت مستحکم تعمیر کردیا تھا۔ اس بند نے پہاڑوں کے درمیان سے آنے والے سیلابوں کو روک کر پانی کا ایک عظیم الشان ذخیرہ بنا دیا تھا۔ بارش کا پانی بھی اسمیں جمع ہونے لگا۔ اس بند سے پانی نکالنے کے لئے تین بڑے دروازے رکھے گئے تھے تاکہ یہ ذخیرہ آب انسانی ضرورت کے علاوہ باغات اور آب پاشی کے لئے کام آسکے۔

بند کے نیچے ایک بہت بڑا تالاب تعمیر کیا گیا تھا جس سے پانی کی بارہ نہریں شہر کے اطراف واکناف چلتی تھیں۔ شہر کے داہنے

اور بائیں جو دو پہاڑ تھے اِن کے کناروں پر باغات لگائے گئے تھے جن میں پانی کی نہریں جاری تھیں ان باغوں میں ہر طرح کے درخت اور ہر قسم کے پھل اس کثرت سے پیدا ہوتے تھے کہ بعض ائمہ سلف جیسے امام قتادہؒ وغیرہم سے مروی ہے کہ اِن باغوں میں اگر ایک عورت اپنے سر پہ خالی ٹوکری لیکر چلتی تو درختوں سے ٹوٹ کر گرنے والے پختہ پھلوں سے وہ ٹوکری خود بخود بھر جاتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعہ اس قوم کو یہ حکم دیا تھا کہ اللہ کے اس رزق سے خوب کھاؤ پیو اور اسکی شکر گزاری میں احکام الٰہیہ کی پابندی کرو اللہ نے تمہارے لئے اس شہر کو "بَلْدَۃٌ طَیِّبَۃٌ" پاکیزہ شہر بنایا ہے۔ جسمیں سردی و گرمی کا بھی اعتدال تھا۔ موذی جانوروں سے بھی یہ شہر پاک تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ایسی وسیع نعمتوں اور انبیاء علیہم السلام کی مسلسل تنبیہات کے باوجود اس قوم نے سرکشی اور روگردانی بدستور باقی رکھی تو اُن پر سَیلِ عَرِم چھوڑ دیا گیا۔ عَرِم اُس بند (ذخیرۂ آب) کا نام تھا جس پر شہر مآرب کی خوشحالی کا انحصار تھا۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے آفت و مصیبت بنا دیا۔ آخر بند کا تمام پانی پوری وادی میں پھیل گیا۔ شہر مآرب کے تمام مکانات منہدم ہوگئے۔ درخت و باغات تباہ ہوگئے۔ کھیتیاں بہہ گئیں، انسانی آبادی سیلاب کی نذر ہوگئی۔ پھر اللہ نے وہاں ان کے بے شمار پھلوں اور درختوں کے بدلے ایسے درخت اُگا دیئے جن کے پھل بدمزہ تھے اور خاردار تھے۔ قرآن حکیم نے اِن درختوں کے لئے تین لفظ استعمال کئے ہیں۔

خَمْطٍ، اَثْلٍ، سِدْرٍ

خمط ہر ایسے درخت کو کہا جاتا ہے جو خاردار بھی ہو اور کڑوا بھی، اور اَثل جھاؤ کے درخت کو کہتے ہیں جسپر کوئی پھل کھانے کے قابل نہیں ہوتا۔ بعضوں نے اس کا ترجمہ ببول اور کیکر کا درخت کیا ہے۔ سِدر کے معنی بیری کے ہیں۔ یہ دو قسم کی ہوتی ہے ایک وہ جو باغات میں اہتمام سے

لگائی جاتی ہے۔اس کا پھل خوش ذائقہ ہوتا ہے اور اسکے درخت میں کانٹے کم اور پھل زیادہ ہوتے ہیں۔ دوسری قسم جنگلی بیری کی ہے جو خود رو ہوتی ہے اسمیں کانٹے زیادہ اور پھل کم ہوتے ہیں اور بدمزہ ہوتی ہے۔ آیت مذکورہ میں یہی دوسری قسم مراد ہے۔لفظ سِدۡرٍ کے ساتھ قلیلٍ کا لفظ بھی مذکور ہے جو اسی جانب اشارہ کر رہا ہے۔

قرآن حکیم نے یہ بات بھی نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے کہ یہ سزا اُنھیں ناشکری اور انکار کی وجہ سے دی گئی۔ نعمت جسقدر بڑی ہوتی ہے شکرگزاری بھی اُتنی ہی بڑی چاہتی ہے اور اس کا انکار بھی بڑے عواقب و نتائج پیدا کرتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے وہ گویا زبانِ حال سے یہ کہتا ہے کہ الٰہی ! میں اِن نعمتوں کا مستحق نہیں ہوں۔اسی طرح جو قوم اللہ تعالیٰ کے فضل سے غلط فائدہ اُٹھاتی ہے وہ گویا اپنے رب سے دُعا کرتی ہے کہ پروردگار یہ نعمتیں ہم سے سلب کرلے کیونکہ ہم اِن کے قابل نہیں ہیں۔ نعوذ باللہ منہ۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کے غضب نے اس قوم کو انتہائی عروج سے گرا کر اُس گڑھے میں پھینک دیا جہاں سے پھر کوئی مغضوب قوم کبھی سر نہیں نکال سکی ہے۔

قرآنی مضمون

قرآن حکیم نے اس عبرتناک واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے :-

لَقَدۡ كَانَ لِسَبَاٍ فِيۡ مَسۡكَنِهِمۡ اٰيَةٌ الخ

(سبا آیات ۱۵ تا ۲۱)

سبا کے لئے اُن کے اپنے مسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھی۔ دو باغ دائیں اور بائیں۔ کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور شکر بجالاؤ اُس کا۔ ملک ہے عمدہ و پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشش والا۔

مگر وہ منہ موڑ گئے، آخرکار ہم نے اُن پر بند توڑ سیلاب بھیج دیا اور ہم نے اُن کے دو باغوں کی جگہ دو ایسے باغ بدل دیئے جن کے

کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی بیریاں۔ یہ تھا اُن کے کفر کا بدلہ جو ہم نے اُن کو دیا اور ناشکرے انسان کے سوا ایسا بدلہ ہم اور کسی کو نہیں دیتے۔

اور ہم نے اُن کے اور اُن بستیوں (ملک شام) کے درمیان جن کو ہم نے برکت عطا کی تھی نمایاں بستیاں بسا دی تھیں اور اُن میں سفر کی مسافتیں ایک اندازے پر رکھ دی تھیں، چلو پھرو اِن راستوں میں رات دن پورے امن کے ساتھ، مگر اُنھوں نے کہا اے ہمارے پروردگار ہمارے سفر کی مسافتیں لمبی کردے۔ اُنھوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا۔ آخرکار ہم نے انھیں افسانہ بنا کر رکھ دیا اور اُنھیں بالکل پارہ پارہ کر دیا۔ یقیناً اسمیں نشانیاں ہیں ہر اُس کے لئے جو بڑا صابر و شاکر ہو۔

اُن کے معاملہ میں ابلیس نے اپنا گمان صحیح پایا پس انھوں نے اُسی کی پیروی کی بجز ایک تھوڑے سے گروہ کہ جو مومن تھا۔

ابلیس کو اُن پر کوئی اقتدار حاصل نہ تھا مگر جو کچھ ہوا وہ اس لئے ہوا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کون آخرت کا ماننے والا ہے اور کون اس کی طرف سے شک میں پڑا ہوا ہے اور تیرا رب ہر شئے پر نگران ہے۔

نتائج و عِبَر

قرآنی تذکیر:۔

اللہ تعالٰی نے اپنی کتاب قرآن عظیم میں وعظ و نصیحت کے عموماً چار طریقے استعمال کئے ہیں۔ حسب موقع و محل انھی چاروں میں سے ایک طریقہ عبرت و نصیحت کے لئے اختیار فرمایا ہے۔

(۱) تذکیر بآلاء اللہ۔

یعنی اللہ کی نعمتوں کو یاد دلاکر نصیحت کرنا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جن نعمتوں کی ارزانی فرمائی ہے اُن کو یاد دلاکر اطاعت وانقیاد کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔

سورہ اعراف آیت ۶۹، ۷۴ میں ارشاد ہے :۔

فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۔

پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد کرتے نہ پھرو۔

(۲) تذکیر بایام اللہ۔

یعنی گزشتہ قوموں کے حالات بیان کرکے نصیحت وعبرت دلانا۔

جن قوموں نے اللہ تعالےٰ اور اُسکے رسولوں کی اطاعت وانقیاد کی اور دنیا وآخرت کی فلاح پائی۔ اُن کے تذکرے بیان کرکے انسانوں کو نصیحت کی گئی، یا جن قوموں نے سرکشی وبغاوت کی اور اُسکے نتیجے میں عذاب الٰہی کے مستحق ہوئے اُن کے تذکرے بیان کرکے عبرت دلائی گئی۔ سورہ ابراہیم میں اسی تذکیر کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ (آیت ۵)

اے نبی ان کو نصیحت کیجئے قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ یاد دلاکر۔

(۳) تذکیر بآیات اللہ۔

یعنی اللہ کی نشانیاں دکھلاکر خالقِ کائنات کی ہستی اور اسکی وحدت کا اعتراف کروانا۔

سورۂ یوسف میں ارشاد ہے :۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (آیت ۱۰۵)

اور زمین اور آسمان میں اللہ کے بہت سے نشانات ہیں کہ جن پر وہ بے توجہی کے ساتھ گزر جاتے ہیں اور پروا بھی نہیں کرتے۔

(۴) تذکیر بما بعد الموت۔

یعنی عالمِ برزخ اور آخرت اور قیامت کے حالات سنا کر وعظ و نصیحت کرنا۔

سورۂ قٓ میں ارشاد ہے:-

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ۔ (آیت ۴۵)

پس قرآن کے ذریعہ نصیحت کرو اُس شخص کو جو اللہ کی وعید یعنی بعد الموت کے عذاب سے ڈرتا ہے۔

قومِ سبا کا یہ واقعہ تذکیر بایّام اللہ سے تعلق رکھتا ہے اور ہم کو یہ سبق دیتا ہے کہ جب کوئی قوم عیش و عشرت طاقت و ثروت کے گھمنڈ میں آکر نافرمانی اور سرکشی پر آمادہ ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ابتداءً اسکو مہلت دیتا ہے اور راہِ راست پر لانے کے لئے اپنی حجّت کو آخری حد تک پورا کرتا ہے اسپر بھی اگر وہ قوم غفلت و بغاوت پر قائم رہتی ہے تو اللہ تعالیٰ کا قانونِ مکافات آگے بڑھتا ہے اور ایسی بدبخت قوم کو پارہ پارہ کر دیتا ہے اور اس قوم کی تباہی تاریخ کی ایک داستان بن کر رہ جاتی ہے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ۔ (النمل آیت ۶۹)

اے نبی آپ اُنھیں کہہ دیجئے کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرمین کا کیا انجام ہوا۔

باخبر حکمرانی اور قیامت:-

قومِ سبا کا یہ قصہ اس حقیقت کو ذہن نشین کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ مکافات اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ دنیا کا یہ نظام کوئی اندھے کی لاٹھی نہیں جو اندھا دھند

جس کو چاہے لگ جائے۔ بلکہ اس پر ایک سننے و دیکھنے والے اللہ عزوجل کی فرمانروائی ہے جو شکر کی راہ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ایک معاملہ کرتا ہے اور ناشکری کی راہ چلنے والوں کے ساتھ بالکل ہی دوسرا معاملہ کرتا ہے۔ کوئی سبق لینا چاہے تو اسی تاریخ سے یہ سبق لے سکتا ہے کہ جس حکیم مطلق کی سلطنت کا یہ مزاج ہے اُسکی حکومت میں نیکی اور بدی کا انجام کبھی یکساں نہیں ہوسکتا۔ اسکے عدل وانصاف کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ ایک وقت ایسا آئے جب نیکی کا پورا اجر اور بدی کا پورا بدلہ دیا جائے اور یہی دن قیامت کا ہوگا۔

بگڑے انسانوں کے نرالے طور طریق :۔

قوم سبا کے دار السلطنت مآرب سے ملک شام و فلسطین تک شاہراہ عام پر اللہ تعالیٰ نے سینکڑوں بستیاں قائم کردی تھیں۔ یہ بستیاں بہت زیادہ فاصلہ پر نہ تھیں بلکہ متصل تھیں۔ ایک بستی کے آثار ختم ہونے کے بعد دوسری بستی کے آثار نظر آنے لگتے تھے۔ سفر کی مسافتوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے حکیمانہ اندازے نے اس طرح قائم فرمادیا تھا کہ ایک مسافر کو اتنے دُور دراز کا سفر طے کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی وہ رات دن مسلسل چلنے کے باوجود کوئی تھکن یا تکلیف محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس کے علاوہ جابجا مسافر خانے، سایہ دار درخت، میٹھے پانی کے چشمے، پھل دار درخت اتنی کثرت سے تھے کہ ایک مسافر کو درمیان راہ کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے خاص انعامات تھے جو اس قوم کو میسّر تھے لیکن اس قوم نے ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے بجائے بنی اسرائیل کی طرح ناک بھوّوں چڑھاکر یہ کہنا شروع کردیا کہ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ انسان سفر کے ارادے سے گھر سے نکلے تو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ حالتِ سفر میں ہے یا اپنے گھر میں۔ وہ بھی کیا خوش نصیب انسان ہیں جو ہمت مردانہ کے ساتھ سفر کی ہمہ قسم تکالیف اُٹھاتے، پانی اور غذا کے لئے بے چین ہوتے۔ اس طرح اسباب راحت و آرام کے مہیّا نہ ہونے کی وجہ سے لذّتِ سفر کا ذائقہ چکھے، اے کاش ہمارا سفر بھی ایسا ہی ہوجائے۔ ہمارے سفر کی مسافتیں دراز ہوجائیں تاکہ ہم دُوری منزل کا لطف اُٹھاسکیں، لطف تو اسی میں ہے کہ کہیں زرا دراہ ختم ہوگیا۔ کہیں پیاس ہے، کہیں چوروں کا اندیشہ اور کہیں منزل کا اشتیاق۔

قرآن حکیم نے انکی اس تمنا کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا الآیۃ (سبا آیت ۱۹)

اے ہمارے رب ہمارے سفر کی مسافتیں لمبی کر دے۔

یہ دعا انھوں نے اپنی ظاہری زبان سے کی ہو یا زبانِ حال سے، حقیقت یہ ہے کہ بگڑے انسانوں کے طور طریقے نرالے ہوتے ہیں جو شخص بھی اللہ تعالےٰ کی دی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے وہ گویا زبانِ حال سے یہ کہتا ہے الٰہی! میں اِن نعمتوں کا مستحق نہیں ہوں۔ اور اسی طرح جو قوم اللہ تعالےٰ کے فضل وکرم سے غلط فائدہ اُٹھاتی ہے۔ وہ گویا اپنے رب سے یہ دُعا کرتی ہے کہ اے پروردگار یہ نعمتیں ہم سے سلب کرلے کیونکہ ہم اسکے قابل نہیں ہیں۔ قوم سبا کا بھی یہی حال تھا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کا غلط فائدہ اُٹھایا۔

ابلیس کے بال و پر:-

قوم سبا کی بے راہ روی اور اُن کا پورے طور پر گمراہ ہو جانا ایک ایسا حادثہ تھا جس نے ابلیس کے گمان کو صحیح کر دکھایا۔ کیونکہ ابلیس نے راندۂ درگاہ ہوتے وقت یہ گمان کیا تھا کہ میں آدم کی ذریت کو گمراہ کر دوں گا اور ان کو گمراہ کرنے کے لئے ہر چار سمت سے حملہ کر دوں گا۔

اس کا یہ گمان صحیح نکلا اور قوم سبا اسی کی راہ چلے بجز چند ایمان داروں کے جو حق پر قائم رہے۔ اسکے بعد اللہ تعالےٰ نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ ابلیس کو ایسا کوئی اقتدار نہیں دیا گیا ہے جو بنی آدم پر نافذ ہو کر ہی رہے۔ وہ صرف وسوسہ یا ترغیبات ہی دے سکتا ہے۔ اُسکو یہ قدرت حاصل نہیں کہ کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا ارادہ کرے اور وہ اسکو زبردستی ہاتھ پکڑ کر نافرمانی کی راہ پر کھینچ لائے۔ اللہ تعالیٰ نے اسکو جو کچھ بھی اختیار دیا ہے وہ صرف اسی حد تک ہے کہ وہ انسانوں کو بہکائے اور ایسے تمام لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لے جو خود اُسکی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔

اور اغوا کے یہ مواقع ابلیس کو اس لئے دیئے گئے ہیں تاکہ آخرت کے ماننے والوں اور اسکی آمد میں شک کرنے والوں کا فرق کُھل جائے کہ کون آخرت کا یقین رکھتا ہے اور کون اس سے غافل ہے۔

قرآن حکیم نے ابلیس کی اس قوتِ بازو کو اس طرح بیان ہے :۔
وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ الخ

(سبا آیت ۲۰ ، ۲۱)

قوم سبا کے معاملہ میں ابلیس نے اپنا گمان صحیح پایا اور انہوں نے اُسی کی پیروی کی بجز ایک تھوڑے سے گروہ کے جو مومن تھا۔
ابلیس کو ان پر کوئی اقتدار حاصل نہ تھا مگر جو کچھ ہوا وہ صرف اس لئے ہوا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کون آخرت کا ماننے والا ہے اور کون اُسکی طرف سے شک میں پڑا ہوا ہے اور تیرا رب ہر چیز پر نگراں ہے۔
دوسرے الفاظ میں شیطان ابلیس کی قوتِ بازو کو اس آیت میں اسطرح بیان کیا گیا کہ وہ گمراہ کرنے میں بے قوت و بے طاقت ہے۔ اسکو ایسا کوئی اقتدار نہیں دیا گیا کہ وہ انسانوں کو گمراہ کردے اور راہِ حق سے دور کردے۔ وہ صرف ترغیبات اور وسوسے بُرائی کے مواقع فراہم کرتا ہے اور مکر و فریب کے ذریعہ بُرائی کے قریب لے آتا ہے۔ شیطان کی قوتِ بال و پر کو قرآن حکیم نے خود اُسکی زبان سے اس طرح ادا کروایا ہے۔
وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ الخ (ابراہیم آیت ۲۲)

اور جب قیامت میں تمام مقدمات کا فیصلہ ہو جائیگا (یعنی اہل ایمان جنت میں اور کفار جہنم میں بھیج دیئے جائیں گے) تو (سب اہل جہنم شیطان کے پاس جو جہنم ہی میں کہیں پڑا ہوگا جاکر ملامت کریں گے (کہ کمبخت تو تو ڈوبا ہی تھا ہم کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبا اُس وقت شیطان جواب میں) کہے گا مجھ پر تمہاری ملامت ناحق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تم سے جتنے وعدے کئے تھے سب سچے وعدے کئے تھے (کہ قیامت ہوگی کفر سے ہلاکت ہوگی اور ایمان سے نجات ہوگی) اور میں نے بھی تم سے کچھ وعدے کئے تھے (کہ قیامت نہ ہوگی اور تمہارا عمل بھی تم کو

نجات دے گا وغیرہ وغیرہ)

سو میں نے وہ وعدے جھوٹے کئے تھے اور میرا تم پر اور کچھ تو زور چلتا نہ تھا سوائے اسکے کہ میں نے تم کو صرف دعوت دی تھی اور تم نے اپنے اختیار سے میرا کہنا مان لیا (اسمیں میرا کیا زور تھا) لہذا تم مجھ پر ملامت نہ کرو (قصور تمہارا ہی ہے) تم خود اپنے آپ پر ملامت کرلو اب نہ تو میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں اور نہ تم میری مدد کرسکو گے۔ میں خود تمہارے اس عمل سے بیزار ہوں کہ تم اس سے پہلے دنیا میں مجھکو اللہ تعالےٰ کا شریک قرار دیتے تھے۔ یقیناً ظالموں کے لئے دردناک عذاب مقرر ہے۔

نیز قرآن حکیم نے اس حقیقت کا بھی اظہار کیا ہے کہ شیطان کی پیروی صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو عقیدۂ آخرت سے غافل ہیں یا پھر وہ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ کیونکہ عقیدۂ آخرت ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو اللہ اور اُسکے رسول کی بتائی ہوئی تعلیمات پر قائم رکھ سکتی ہے۔ کیونکہ جو شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ تو وہ لازماً شیطان کی راہ پر نہیں چل سکیگا۔ اس لئے شیطان کا سب سے بڑا حربہ یہی ہوتا ہے کہ انسان کو آخرت سے غافل کردے۔ اور دنیا میں جو بھی گمراہ ہوا ہے وہ اسی وجہ سے کہ وہ یا تو آخرت کا منکر تھا یا وہ اس بارے میں شک کرتا تھا۔

قرآن حکیم نے قوم سبا کی آخرت فراموشی کو شیطان کے اسی حربہ کا سبب قرار دیا ہے کہ وہ انسان کو دنیا کی ترغیبات اور خواہشات کی ترغیب دیکر آخرت سے غافل کردیتا ہے۔

اب اس آیت کا ترجمہ پھر یکبار پڑھ لیجئے۔

ابلیس کو ان پر کوئی اقتدار حاصل نہ تھا مگر جو کچھ ہوا وہ اسلئے ہوا کہ ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ کون آخرت کا یقین کرنے والا ہے اور کون اُس کی طرف سے شک میں پڑا ہوا ہے اور تیرا رب تو ہر چیز پر نگراں ہے۔

(سبا آیت ۲۱)

تذکرہ
اَصحابُ الاُخدُود (خندق والے)
اور
قومِ تُبَّع

اُخدُود اُخدود کے معنی گڑھے، کھائی خندق کے ہیں۔ یہ مفرد لفظ ہے جس کی جمع اخاوید آتی ہے۔

چونکہ زیر بحث واقعہ میں کافر بادشاہ اور اسکے ارکان سلطنت نے گڑھے کھدواکر اور ان میں آگ دہکاکر عیسائی مؤمنین کو زندہ جلادیا تھا۔ اسی نسبت سے ان کافروں کو اصحاب اُخدود کہا گیا (خندق والے)

اَصحابُ الاُخدُود اور قرآنِ حکیم قرآن حکیم میں صرف ایک ہی جگہ (سورۂ بروج) میں اصحاب الاُخدود کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

قصص و واقعات کے سلسلے میں قرآن حکیم کا جو اسلوب خاص ہے اسی حد تک اس واقعہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے یعنی اس واقعہ کا صرف وہی حصہ بیان کیا گیا ہے جو رُشد و ہدایتِ انسانی کے لئے باعثِ عبرت تھا۔ باقی وہ تفصیلات جو محل وقوع اور زمانہ اور دیگر تاریخی امور سے تعلق رکھتی ہیں عمداً ترک کر دی گئیں۔ کیونکہ اسکی وضاحتیں نصیحت و عبرت کے لئے ضروری نہیں تھیں۔

اصحاب الاخدود کے واقعہ میں مفسرین نے متعدد واقعات نقل کئے ہیں مگر ان میں دو واقعات زیادہ مشہور اور قابل اعتماد سمجھے گئے ہیں۔ امام احمد نے اپنی کتاب مُسند میں اور امام مُسلم نے اپنی کتاب صحیح مسلم میں، اسی طرح امام ترمذی اور امام نسائی نے اپنی اپنی کتابوں میں حضرت صہیب رومیؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ قصہ سنایا کہ گزشتہ زمانہ میں ایک بادشاہ تھا اسکے دربار میں

ایک جادوگر اس کا ہمنشیں تھا جسکی وہ عزت کیا کرتا تھا جب وہ بوڑھا ہوگیا تو بادشاہ سے اپنی ایک تمنا کا اظہار کیا کہ اب میں بوڑھا ہوگیا ہوں اور موت کا وقت قریب ہے۔ اس لئے میری خواہش ہے کہ آپ ایک ایسے لڑکے کا انتخاب کریں جو ذہین اور فہیم ہونے کے علاوہ اعلےٰ خاندان سے بھی تعلق رکھتا ہو تا کہ میں اسکو اپنا یہ فن (جادوگری) سکھادوں۔ بادشاہ نے ایک ایسے ہی لڑکے کو اُسکے سپرد کردیا۔ اس لڑکے نے اس بوڑھے ساحر سے سحر کی تعلیم سیکھنا شروع کردیا۔ ہر روز یہ لڑکا جادوگر کے ہاں آیا کرتا تھا۔ درمیان راہ اسکو ایک راہب (حق پرست عیسائی عابد) کی کُٹی ملتی تھی جسکو جاتے آتے دیکھا کرتا تھا۔ ایک روز اس عابد کو عبادت کرتے دیکھا تو اسکی یہ عبادت لڑکے کو بہت پسند آئی اور وہ اسکی کٹی میں داخل ہوگیا اور راہب کے اخلاق و عادات سے متاثر ہوا۔ پھر ہر روز کچھ دیر کے لئے جاتے آتے اُس راہب سے ملنے لگا۔ اب جب دیر ہونے لگی تو ساحر اور بادشاہ مقررہ آمد و رفت میں تاخیر کرنے پر غصہ ہونے لگے۔ لڑکے نے راہب سے اس بات کی شکایت کی، راہب نے کہا کہ اس معاملہ کو پوشیدہ رکھنے کی صرف یہی صورت ہے کہ جب بادشاہ باز پرس کرے تو یہ عذر کردینا کہ جادوگر کے ہاں تاخیر ہوگئی اور جب جادوگر ناراض ہو تو کہدینا کہ بادشاہ کے پاس تاخیر ہوئی۔ غرض یہ سلسلہ عرصہ تک یونہی چلتا رہا اور لڑکا راہب سے دین و اخلاق سیکھتا رہا اور جادوگر کے ہاں بھی جاتا آتا رہا۔

ایک دن راہ میں ایک عجیب حادثہ پیش آیا ایک ہیبت ناک اور عظیم الجثہ درندہ لوگوں کی راہ روکے ہوئے ہے اور کسی کو یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ سامنے سے گزرجائے لڑکے کے دل میں خیال آیا کہ یہ بہترین وقت ہے اس بات کا کہ میں جانچ کروں آیا جادوگر کا مذہب سچا ہے یا راہب کا دین سچا ہے؟ یہ سوچ کر اُس نے ایک پتھر اُٹھایا اور دُعا کی الٰہی اگر تیرے نزدیک جادوگر کے مقابلہ میں راہب کا دین سچا ہے تو میرے اس پتھر سے اس جانور کو ہلاک کردے۔ یہ کہکر اُس نے درندے کو پتھر مارا۔ پتھر کا لگنا ہی تھا کہ وہ موذی اُسی وقت ہلاک ہوگیا اور لوگ راستہ پاگئے۔

پھر اُس لڑکے نے راہب سے سارا قصّہ کہہ سنایا۔ راہب نے کہا صاحبزادے تم مجھ پر سبقت لے گئے ہو لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ تم کہیں آزمائش میں نہ ڈال دیئے جاؤ۔ اگر ایسا وقت آگیا تو خبردار میرا ذکر نہ کرنا اور نہ میرے ہاں آنے جانے کی کسی کو خبر کرنا۔ اور

تم صبر و استقامت کا دامن نہ چھوڑنا۔

اِدھر بہت جلد لوگوں میں لڑکے کی یہ کرامت اور جرأت مشہور ہوگئی اور یہ خیال عام ہوگیا کہ لڑکے کو عجیب وغریب علم حاصل ہے جسکے ذریعہ سے وہ بڑے بڑے کام انجام دے سکتا ہے اسپر لوگوں کا ہجوم ہوگیا پُرانے پُرانے مریض حتیٰ کہ اندھے اور جذامی آنے لگے لڑکا اللہ کا نام لے کر انھیں اچھا کر دیتا تھا۔

بادشاہ کا ایک درباری نابینا تھا اُس نے لڑکے کی جو شہرت سُنی تو بکثرت تحفے تحائف لیکر اُس کے پاس آیا اور بینا کر دینے کی درخواست کی، لڑکے نے کہا میرے ہاں کوئی طاقت نہیں شفا کا دینے والا اللہ واحد ہے اگر تم اسپر ایمان لے آؤ اور اُسکے سوا کسی کی پرستش نہ کرو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے لئے دُعا کروں گا اور اللہ تم تمہیں بینائی عطا کر دے گا۔ درباری یہ سنکر اللہ واحد پر ایمان لے آیا اور مسلمان ہوگیا' پھر لڑکے کی دُعا سے وہ بینا ہوگیا۔

دوسرے دن جب دربار میں آیا تو بادشاہ کو تعجب ہوا پوچھا کہ تجھ کو یہ بینائی کس طرح حاصل ہوئی؟

درباری نے جواب دیا بادشاہ! میرے رب نے مجھے شفا دی ہے۔

بادشاہ نے کہا تیرا رب تو میں ہوں، درباری نے جواب دیا نہیں! بلکہ میرے اور تیرے اور کل جہاں کے رب نے شفا دی ہے۔ بادشاہ نے غصہ میں کہا کیا میرے سوا بھی تیرا کوئی رب ہے؟

درباری نے کہا ہاں اے بادشاہ میرا اور تیرا رب وہ ہے جس نے زمین و آسمان اور کل کائنات کو پیدا کیا ہے۔

اسپر بادشاہ نے اُس درباری کو گرفتار کر کے طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔

آخر کار ایک سخت آزمائش پر درباری نے لڑکے کا قصہ کہہ سنایا۔ بادشاہ نے لڑکے کو طلب کیا اور پوچھا بیٹا مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو سحر کے ذریعہ اندھوں کو بینا اور جذامی کو شفا دیتا ہے؟

لڑکے نے جواب دیا بادشاہ مجھ میں اتنی طاقت کہاں؟ یہ تو اللہ واحد کے شفا دینے سے شفایاب ہوتے ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا کیا میرے سوا بھی تیرا کوئی اِلٰہ ہے؟

لڑکے نے جواب دیا وہ ذات جو واحد و یکتا ہے میرا اور تیرا دونوں کا رب ہے۔

پھر بادشاہ نے اُس کو بھی عذاب میں مبتلا کر دیا مجبور ہو کر اُس لڑکے نے راہب سے متعلق تمام واقعہ بیان کر دیا۔ بادشاہ نے راہب کو طلب کیا اور اُس کو مجبور کرنے لگا کہ وہ اپنے دین سے پھر جائے مگر راہب نے کسی طرح بھی یہ بات قبول نہ کی۔ آخر کار اُسکے سر پر آرہ چلوا دیا جس سے وہ شہید ہو گیا، اسکے بعد لڑکے کی جانب متوجہ ہوا کہ وہ بھی راہب کے دین سے پھر جائے لیکن لڑکے نے صاف صاف انکار کر دیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اسکو کسی پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر وہاں سے گرا دیا جائے تاکہ اِس کا سر پاش پاش ہو جائے۔ جب سرکاری کارندے لڑکے کو پہاڑ پر لے کر چڑھے تو لڑکے نے دُعا کی الٰہی! تو ان لوگوں کے مقابلہ میں میری مدد فرما! چنانچہ اُسی وقت پہاڑ پر زلزلہ آگیا اور سرکاری کارندے گر گر کر ہلاک ہو گئے اور لڑکا صحیح وسالم بادشاہ کے سامنے حاضر ہو گیا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ تیرے ساتھ والے کہاں گئے؟ لڑکے نے کہا کہ اللہ واحد نے اُن کے مقابلہ میں میری مدد کی اور وہ ہلاک ہو گئے ہیں۔ بادشاہ نے غضبناک ہو کر حکم دیا کہ اسکو لیجاؤ اور کسی گہرے دریا میں غرق کر دو۔ سرکاری کارندے جب اسکو دریا کے بیچ لے گئے تو لڑکے نے پھر وہی دُعا کی الٰہی! مجھ کو اِن سے نجات دے! دریا میں اچانک طوفان اُٹھا اور وہ سب آدمی غرق ہو گئے اور لڑکا صحیح وسالم بادشاہ کے ہاں جا کھڑا۔

بادشاہ نے پھر وہی سوال کیا لڑکے نے وہی پہلا جواب دیا اور پھر کہنے لگا اے بادشاہ اس طرح تو مجھ پر ہرگز کامیاب نہ ہو سکے گا البتہ جو تدبیر میں بتا دوں اگر اس کو اختیار کرے تو یقیناً تو مجھ کو قتل کر سکتا ہے بادشاہ نے لڑکے سے وہ تدبیر دریافت کی، لڑکے نے کہا اے بادشاہ شہر کی تمام آبادی کو ایک بلند جگہ پر جمع کر جب سب جمع ہو جائیں تو اس وقت مجھ کو درخت پر سُولی دینا اور میرے ترکش سے ایک تیر لے کر بِسْمِ اللّٰہِ رَبِّ الْغُلَامِ (اللہ کے نام سے جو لڑکے کا پروردگار ہے) کہہ کر میرے سینے پر مارنا۔ تب ہی میں مر سکتا ہوں۔

بادشاہ نے لڑکے کی بات پر عمل کیا اور جب تمام اہل شہر جمع ہو گئے تو لڑکے کو سولی پر لٹکا کر لڑکے کی بتائی ہوئی عبارت پڑھکر تیر مار اگیا۔ لڑکا تیر کھا کر جان بحق ہو گیا۔ اہل شہر نے جب یہ دیکھا تو سب نے بیک آواز نعرہ بلند کیا:-

اٰمَنَّا بِرَبِّ الْغُلَامِ، اٰمَنَّا بِرَبِّ الْغُلَامِ۔

ہم لڑکے کے پروردگار پر ایمان لائے، ہم لڑکے کے پروردگار پر ایمان لائے۔

اس طرح پورا شہر مسلمان ہوگیا۔ اہلِ دربار کہنے لگے بادشاہ جس بات کا تمہیں اندیشہ تھا آخر وہی ہوکر رہا تمام رعایا مسلمان ہوگئی ہے۔ بادشاہ یہ دیکھ کر جامہ سے باہر ہوگیا اور حکم دیا کہ شہر کے ہر محلہ اور گلی کوچہ میں خندقیں کھودی جائیں اور ان میں آگ دہکائی جائے۔ پھر ہر محلہ کے لوگوں کو جمع کیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ اس دین سے باز آجائیں۔ جو باز آجائے انھیں چھوڑ دیا جائے اور جو انکار کردے اسکو دہکتی آگ میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ لوگ جوق در جوق جمع ہوتے اور دین حق سے باز نہ رہنے کا اقرار کرتے ہوئے دہکتی آگ میں کود پڑتے اور یہ منظر بادشاہ اور اسکے مصاحبوں کو بہت پسند آتا تھا۔ انہی لوگوں میں ایک عورت لائی گئی جسکی گود میں شیرخوار بچہ تھا۔ عورت بچے کی محبت میں کچھ تامل کر رہی تھی کہ بچہ معجزانہ طور پر گویا ہوا اماں صبر سے کام لے اور بے خوف خندق میں چلی جا، تو حق پر ہے اور یہ لوگ باطل پر ہیں۔ (مسلم، ترمذی، نسائی، مسند احمد)

اسلامی مؤرخ محمد بن اسحٰق نے لکھا ہے کہ اس طرح ظالم بادشاہ کے حکم پر بیس ہزار سے زائد مظلوم انسانوں کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑا، یہ واقعہ یمن کے شہر نجران میں پیش آیا۔ اس لڑکے کا نام عبداللہ بن تامر تھا اور اس کافر بادشاہ کا نام ذونواس اور اصلی نام زُرعہ تھا۔ مگر تخت نشین ہونے کے بعد یوسف ذونواس کے نام سے مشہور ہوا، اسکے باپ کا نام تبان اسعد اور ابوکرب کنیت تھی۔ یمن کے ان بادشاہوں کا لقب "تبع" ہوا کرتا تھا۔ اس لئے کتب تاریخ میں یہ خاندان تبابعہ یمن کہلاتا ہے۔ ان میں ابوکریب وہ پہلا تبع ہے جس نے بت پرستی چھوڑ کر یہودیت کو قبول کرلیا تھا۔ اسی نے مدینہ منورہ پر حملہ کرکے اسپر قبضہ کرلیا تھا مگر بنی قریظہ کے دو یہودی عالم کی تلقین پر سچے دین موسوی کو قبول کرلیا، اور مدینے سے واپس چلا آیا اور پھر مکہ مکرمہ پہنچ کر خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا اور اُن دونوں یہودی علماء کو اپنے

ساتھ یمن سے لایا اُنھوں نے یمن میں دینِ موسوی کی تبلیغ کی اور آہستہ آہستہ اہلِ یمن اسلام کو قبول کرتے چلے گئے۔

بادشاہ ذونواس نے جس دن نجران میں بیس ہزار حق پرستوں کو شہید کر دیا اِن میں ایک دَوس نامی شخص کسی طرح جان بچا کر نکل بھاگا تھا اور ملک شام میں مقیم قیصرِ روم کے دربار پہنچ کر نجران کے اس ہوش رُبا واقعہ کو بیان کیا۔ قیصرِ روم نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو لکھا کہ وہ یمن پر فوراً حملہ کر کے ذونواس کے اس ظلم کا انتقام لے۔ نجاشی نے یمن پر حملہ کیا اور ذُو نواس کو شکست دیکر سارے یمن پر قبضہ کر لیا۔ ذونواس دریا کے راستے فرار ہونیکی کوشش میں غرق ہوگیا۔

محدّث ابن ابی حاتمؒ نے حضرت انسؓ کے صاحبزادے حضرت ربیعؒ سے ایک حدیث نقل کی ہے۔ حضرت ربیع رہ فرماتے ہیں کہ اصحاب اخدود کے بارے میں ہم نے یہ سنا ہے کہ یہ واقعہ (زمانۂ فترت) یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیانی زمانہ میں پیش آیا تھا۔ اللہ تعالےٰ کے نیک بندوں کی ایک جماعت نے جب یہ دیکھا کہ زمانہ بہت ہی خراب ہوچلا ہے فتنوں اور معصیت کا دور دورہ ہے اور دینِ حق گروہ بندیوں کا شکار ہوگیا ہے۔ ہر شخص ذاتی رائے کا تابع ہوگیا ہے تو آپس میں مشورہ کیا کہ عام آبادی سے بہت دور ایک چھوٹی سی بستی آباد کر لی جائے اور اسمیں سچی عیسائیت کے مطابق زندگی گزار دی جائے چنانچہ اِن لوگوں نے ایسے ہی کیا اور شہر سے دور ایک ویرانے میں اپنا قیام کر لیا۔ لیکن ان کا یہ معاملہ پوشیدہ نہ رہ سکا۔ شدہ شدہ اُس زمانے کے بت پرست بادشاہ تک ان کا حال پہنچ گیا۔ اُس بادشاہ نے ان کی بستی کا محاصرہ کر لیا اور اِن کو توحید الٰہی کے خلاف بت پرستی پر مجبور کرنے لگا لیکن ان حق پرستوں پر اسکی سختیوں کا مطلق اثر نہ ہوا اور انھوں نے شرک و بت پرستی سے صاف انکار کر دیا۔ تب بادشاہ نے غضبناک ہو کر خندقیں کھدوائیں اور ان میں آگ دہکانے کا حکم دیا پھر

جو شخص بت پرستی سے انکار کرتا جاتا اسکو آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔ یہ حق پرست لوگ بے خوف آگ میں کود پڑتے تھے اور اپنے بچوں کو تسلی دیتے جاتے تھے کہ آج کا دن خوف کا دن نہیں ہے یہ آگ ہمارے لئے جہنم کی آگ سے محفوظ رہنے کا پیش خیمہ ہے۔ چنانچہ تمام حق پرستوں نے توحید پر قربان ہوجانا پسند کیا مگر شرک وبت پرستی پر راضی نہ ہوئے۔ اللہ تعالےٰ نے دنیا میں بھی اپنا یہ فضل فرمایا کہ جب وہ آگ میں ڈالے جاتے تو آگ میں پہونچنے اور اسکی تکلیف سہنے سے قبل ہی اُن کی روح قبض کرلی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں خندق کی آگ اس درجہ بھڑک رہی تھی کہ اتنے انسانوں کے اسمیں گرے جانے کے باوجود سرد نہ پڑی بلکہ بے قابو ہوکر کچھ اس طرح پھیل پڑی کہ بت پرست ظالم بادشاہ اور اُسکے تمام لشکری سب کے سب اسکے اندر گھر گئے اور جل بھن کر وہیں سیاہ خاک ہوگئے۔

قرآن کریم کی یہ آیت قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ (البروج آیت ۴ء۵)
اسی واقعہ کا تذکرہ کر رہی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۳)

حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ یہ واقعہ ملکِ فارس میں پیش آیا جب کہ فارس کے بادشاہ نے دینِ حق چھوڑ کر بت پرستی اختیار کرلی اور (غالباً تاریخ عالم میں پہلی دفعہ) اپنے اہل محرم (ماں، بہن، بیٹی وغیرہ) سے نکاح کرنا جائز قرار دے دیا تو اُن کے بعض علماء حق نے بادشاہ کو اس بے حیائی سے منع کیا۔ بادشاہ نے حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے بجائے غضبناک ہوکر یہ حکم دیا کہ خندقیں کھدوائی جائیں اور جو شخص بھی ایسے نکاح کو باطل کہے آگ میں جھونک دیا جائے۔ چنانچہ اہل حق کی ایک بڑی جماعت نذر آتش کر دی گئی۔ غالباً اسی وجہ سے

پارسیوں میں آج تک بھی نکاحِ محرم کو جائز سمجھا جاتا رہا ہے۔

امام تفسیر مقاتلؒ فرماتے ہیں کہ اُخدود کے تینؔ واقعے ہیں۔ ایک یمن کے شہر نجران میں پیش آیا (جسکی تفصیل آچکی ہے) دوسرا شام کے علاقہ فلسطین میں اور تیسرا ملک فارس میں پیش آیا۔ ان واقعات میں مظلوم و بے گناہ انسانوں کو دہکتی آگ میں ڈالا گیا۔ ملک شام کا واقعہ انطناتوس رومی کے ہاتھوں پیش آیا۔ اور ملکِ فارس کا بختنصر کے ہاتھوں اور نجران کا واقعہ یوسف ذونواس کے ہاتھوں پیش آیا، لیکن ملکِ فارس اور شام کے واقعات کا ذکر قرآن حکیم میں نہیں ہے البتہ نجران کا واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۴ سورۃ بروج)

قرآنی مضمون

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ الخ

(بروج آیات ۱ تا ۱۶)

قسم ہے آسمان کی جس میں بُرج ہیں اور اُس دن کی جس کا وعدہ ہے (یعنی قیامت کا دن) اور اُس دن کی جو حاضر ہوتا ہے (یعنی جمعہ کا دن) اور اُس دن کی جس میں لوگوں کی حاضری ہوتی ہے یعنی (عرفہ کا دن) ملعون ہوگئے خندق کھودنے والے یعنی بہت سی ایندھن کی آگ والے، جس وقت وہ لوگ اسکے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے، اور وہ جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ کر رہے تھے اُسکو دیکھ رہے تھے، اور ان مسلمانوں سے بدلہ نہیں لیتے تھے مگر صرف اس بات کا کہ وہ یقین لائے اللہ پر جو زبردست ہے تعریفوں کا مستحق ہے جسکی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین میں اور اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔ بیشک جنھوں نے مسلمان مرد اور مسلمان عورتوں کو تکلیف پہنچائی پھر توبہ نہیں کی تو

اُن کے لئے جہنم کا عذاب ہے اور اُن کے لئے جلنے کا عذاب ہے۔
بیشک جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کئے اُنکے لئے باغ ہیں جنکے نیچے نہریں جاری ہوں گی یہ بڑی کامیابی ہے۔ بیشک تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ وہی پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے اور دوبارہ پیدا کرے گا۔ اور وہی بڑا بخشنے والا بڑی محبت کرنے والا ہے عظمت والے عرش کا مالک ہے۔ وہ جو چاہے سب کر گزرتا ہے۔

دو عجیب وغریب قصے

ابن کثیرؒ نے مشہور محدث ابوبکر بن ابی الدنیا کے واسطے سے بروایت محمد بن جعفر بن ابی طالب یہ حکایت نقل کی ہے کہ اُنھوں نے بعض اہل علم سے سنا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ نے جب ملک اصفہان فتح کر لیا اور شہر میں فاتحانہ داخل ہوئے تو شہر پناہ کا معائنہ کیا۔ دیکھا کہ ایک جانب میں دیوار شکستہ ہے اُسپر اُنھوں نے حکم دیا کہ دیوار کا یہ حصّہ درست کر دیا جائے لیکن جب دیوار کو درست کر دیا گیا تو وہ ٹھیر نہ سکی اور یکلخت پھر گر گئی۔ چنانچہ دوبارہ مرمت کی گئی مگر پھر وہ منہدم ہوگئی۔ تب بعض لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ اس مقام پر کسی مرد صالح کی قبر معلوم ہوتی ہے۔ یہ سوچ کر جب بنیاد کو کھدوایا گیا تو دیکھا کہ ایک شخص کھڑا ہے اور اُس کے ہاتھ میں تلوار ہے اور جس پر ایک عبارت کندہ ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے "میں حارث بن مضاض ہوں جس نے اصحاب اُخدود سے انتقام لیا ہے۔"

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ نے اسکو وہاں سے نکال کر قبرستان میں دفن کر دیا اور دیوار کی تعمیر کرادی جسکے بعد وہ صحیح و سالم رہی۔
(تفسیر ابن کثیرؒ ج ۴)

دوسرا واقعہ مشہور محدث محمد بن ابی بکر بن حزمؒ نے بغیر سند کے بیان کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے زمانے میں نجران (یمن) کا ایک شخص زمین کھود رہا تھا اچانک ایک قبر ظاہر ہوگئی۔ اندر جھانک کر دیکھا تو ایک نعش کو اس طرح بیٹھے ہوئے پایا کہ وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے ہے۔ جب لوگوں نے اُس کے ہاتھ کو سر سے ہٹایا تو اُس سے خون بہنے لگا اور جب ہاتھ کو اُسی طرح رکھ دیا تو خون بند ہوگیا۔ اس شخص کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی اور اسکے نگینے پر یہ عبارت کندہ تھی "ربی اللہ" اُس واقعہ کی اطلاع حضرت عمرؓ کو دی گئی آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اس شخص کو اسکی موجودہ حالت پر ہی رہنے دو اور اسی جگہ دفن کر دیا جائے۔

چنانچہ ایسے ہی کیا گیا اُس زمانے کے لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ یہ نعش عبداللہ بن تامر کی ہے، جسکو ظالم بادشاہ نے تیر سے قتل کروا دیا تھا جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔

حارث بن مضاض کے بارے میں مؤرخین لکھتے ہیں کہ یہ عرب کے خاندان جُرہُم کا ایک بادشاہ تھا جس نے ثابت بن اسمٰعیل (علیہ السلام) کی اولاد سے مکہ مکرمہ کی حکومت لے کر حکمرانی کی تھی اور یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے تقریباً پانچ سو سال بعد کا زمانہ ہے۔ اس لحاظ سے اصحاب اخدود کا واقعہ بہت قدیم زمانے سے متعلق ہو جاتا ہے۔ حالانکہ مشہور یہ ہے کہ یہ واقعہ زمانہ فترۃ (یعنی نبی کریمؐ اور حضرت عیسیٰؑ کی درمیانی مدت) کا ہے۔

چونکہ یہ تاریخی روایت ہے اور اسکی سند بھی منقطع ہے لہذا اسکی حیثیت ایک حکایت سے زیادہ نہ ہوگی۔ اگر یہ واقعہ صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ یہ اُن مختلف واقعات میں سے ایک واقعہ ہو جن کا ذکر قرآن حکیم میں نہیں ہے مگر وہ آیاتِ بروج کے مصداق میں داخل ہیں۔ واللہ اعلم۔

نتائج و عبر

تفسیری نکات :-

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ الخ قرآن حکیم کی ان آیات میں اصحابُ الاخدود کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اُسکو چند ایک قسموں سے مؤکد کیا گیا ہے اور اسکے لئے لفظ واؤ جو قسم کے معنی میں آتا ہے چند چیزوں پر داخل کیا گیا ہے۔ ان آیات کے علاوہ قرآن حکیم کی متعدد سورتوں میں مختلف اشیاء پر قسم کھا کر آگے کا مضمون بیان کیا گیا ہے۔ عام طور پر ان مقامات کی تفسیر میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس طرح ہم آپس میں قسمیں کھاتے ہیں یا ایسی چیز کی قسم کھاتے ہیں جو ہمارے لئے بہت زیادہ عزت و عظمت کے لائق ہو جیسے اللہ کا نام یا اُسکے باعزت صفات کے نام پر قسم کھائی جاتی ہے تاکہ بات کی اہمیت کو پختہ کیا جائے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں مخاطب کے لحاظ سے بعض واقعات اور بعض اہم مضامین کو لفظ قسم کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن ہمارے قسمی محاورے اور قرآنی قسم میں یہ فرق ضرور ہے کہ ہم ایسی چیز کی قسم کھاتے ہیں جو ہماری نگاہ میں سب سے زیادہ برتر و اعلیٰ اور باعظمت ہو جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اُسکے صفات، لیکن اللہ برتر کی ذات سے کوئی برتر نہیں اسلئے اللہ تعالیٰ جس چیز کی بھی قسم کھائیں اُس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ چیز اللہ تعالےٰ کے ہاں بھی نہایت باعظمت و برتر ہوگی۔

قرآن حکیم میں جہاں جہاں بھی قسم کا مضمون آیا ہے وہاں قسم کو بطور تاکید کلام کے لایا گیا ہے یا بطور شہادت و استشہاد پیش کیا گیا ہے مثلاً کسی کلام میں ایسی بات کہی گئی ہے جس کے متعلق یہ اندیشہ ہے کہ وہ بات جس کے لئے گفتگو شروع کی گئی ہے دلنشین ہو جائے اس صورت میں لفظ واو (یعنی قسم) بطور تاکید آتا ہے۔ اسی طرح اگر متکلم کی جانب سے کوئی ایسی بات کہی گئی ہے جسکا سمجھنا مخاطب کے لئے اس وقت تک مشکل ہے جب تک اس بات سے متعلق ایسے شواہد پیش کئے جائیں مشکل ہے

جو اس بات کو دل نشین بنا سکیں تو ایسے موقعہ پر لفظ قسم کیساتھ

ایسے امور کو بیان کیا جاتا ہے جو اس مضمون کو مخاطب کے قلب میں پیوست کرنے کے لئے مدد دے سکیں جس کے لئے متکلم مخاطب سے کلام کر رہا ہو اور ایسے موقعہ پر قسم کا لفظ واؤ بمعنی شہادت کے ہوجاتا ہے اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں جن جن چیزوں پر قسم کھائی ہے وہ ضروری نہیں کہ حقیقتاً بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں محترم و معظم ہوں بلکہ صرف "تاکیدی مضمون" یا شہادت و استشہاد کے لئے مفید اور موقعہ کے مناسب حال ہوگا۔

پس قرآن حکیم میں جن مقامات پر لفظ قسم سے کلام کی ابتدا کی گئی ہے ان تمام مقامات میں قسم سے مراد متعارف قسم (رواجی قسم) مراد نہیں ہوگی بلکہ قرآنی محاورہ میں اکثر مقامات پہ واؤ بمعنی شہادت ہے اور بعض مقامات میں بمعنی تاکید ہے۔

مثلاً سورہ والتین میں اول تین چیزوں کو بطور شہادت کے پیش کیا گیا پھر اصل مضمون کو واضح کیا گیا ہے:-

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ الآیۃ

قسم ہے انجیر اور زیتون کی (یعنی بیت المقدس ملک شام)

کا وہ مقام جہاں بکثرت انجیر اور زیتون کے درخت و باغات پائے جاتے ہیں)۔ اس بات کے لئے شہادت دے رہا ہے کہ اس جگہ اللہ کا وہ سچا ہادی پیدا ہوا جس کا نام عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) ہے۔

اسی طرح قسم ہے طور سینا کی (خوبصورت پھل دار درختوں والا پہاڑ) جہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کے کلام سے سرفرازی ہوئی۔

اور اسی طرح اس بلد امین مکہ مکرمہ کی قسم جسکے آغوش میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسی مقدس ہستی اللہ کے آخری پیغمبر کی حیثیت سے پیدا ہوئے۔ یہ سب شہادت دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بلاشبہ انسان کو بہترین مخلوق کیا ہے پھر اس کو اسکی نافرمانی وبغاوت کے جرم میں "اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ" ذلت کے انتہائی گڑھے میں پھینک دیا ہے۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ (التین آیت ۶)

البتہ جس نے ایمان باللہ اور عمل صالح کو اختیار کیا یعنی اسلام کو راہ عمل بنایا اس نے اپنی انسانیت اور بہترین مخلوق کے شرف و امتیاز کو بچالیا اس کے لئے اللہ کے پاس

ختم نہ ہونے والا اجر و ثواب ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ۔

یہ ہے مطلب قرآنی قسموں کا جو اس ایک مثال سے ظاہر ہے لہذا قرآن حکیم کی باقی قسمیں بھی اسی طرح اپنی اپنی سورت میں بیان کردہ مضمون کو غیر مشکوک بنانے کے لئے مناسب حال شواہد و نظائر کا کام دیتی ہے اور بعض مقامات پر مضمون کی تاکید کا حق ادا کرتی ہیں۔

اس وضاحت کے بعد سورہ بروج کی قسموں کی تفسیر بہت سہولت کے ساتھ ذہن و فکر میں آسکتی ہے اس سورہ میں چند چیزوں کو واو قسم کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:۔

(۱) وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ

برجوں والے آسمان کی قسم یعنی بڑے بڑے ستاروں والے آسمان کی قسم۔

(۲) وَالْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ

قیامت کے دن کی قسم۔

(۳) وَشَاهِدٍ۔

جمعہ کے دن کی قسم۔

(۴) وَمَشْهُوْدٍ

عرفہ کے دن کی قسم۔ (ترمذی)

اسکے بعد کہا گیا:۔

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ الخ

یعنی باطل پرستوں نے خندقیں کھدوا کر اور ان میں آگ دہکا کر اہل ایمان کو توحید پرستی کے جرم میں زندہ جلا دیا اور خود کناروں پر بیٹھے اس انسانیت سوز حرکت کا تماشہ دیکھ رہے تھے حالانکہ انجام کے لحاظ سے ہلاکت و بربادی انہی ظالموں کے حصہ میں آئی اور دائمی سرور و کامرانی ان مظلوم بے گناہوں نے پائی۔

گویا اب پوری سورت کا یہ مطلب ہوا برجوں والا آسمان جو اپنی حیرت افزا صنعت کیساتھ اللہ واحد کی وحدانیت کا اقرار کر رہا ہے اور وہ قیامت کا دن جس دن میں اللہ قہار

کے سوا کسی کا اقتدار باقی نہ رہے گا اور وہ جمعہ کا دن اور عرفہ کا دن جس میں لاکھوں انسان اللہ واحد کے سامنے سربسجود ہوتے ہیں۔ یہ سب اس بات کے لئے شاہد و گواہ ہیں کہ اصحاب الاخدود اپنے ظلم کے نتیجے میں ناکام رہے اور ہلاک و برباد ہوئے اور مظلوم کے لئے دنیا و آخرت دونوں میں فوز و فلاح رہی۔

الغرض اصحاب الاخدود کے اس انجامِ بد کی تاکید کے لئے چار چیزوں کی قسم کھائی گئی تاکہ کلام میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے اور مخاطب اس سے عبرت و نصیحت حاصل کرے۔ واللہ اعلم۔

تذکرہ اَصحابُ الفیل (ہاتھی والے)

اصحابُ الفیل

امام الحدیث والتاریخ ابن کثیرؒ نے اصحاب الفیل کا واقعہ اس طرح نقل کیا ہے :-

"ملک یمن پر خاندان حِمیَر کا قبضہ تھا۔ یہ لوگ مذہباً مشرک تھے ان کا آخری بادشاہ یوسف ذو نواس تھا جس نے یمن کے اہل حق نصاریٰ پر شدید مظالم کئے تھے اور توحید پرست عیسائیوں کو خندقوں میں زندہ جلادیا تھا۔ اصحابُ الاخدود کا مشہور واقعہ اسی بادشاہ سے منسوب ہے۔ جس کا تذکرہ قرآن حکیم کی سورۃ البُروج میں آچکا ہے۔ خندق کے عذاب سے بچکر کسی طرح دو آدمی نکل بھاگے تھے اور انھوں نے ملک شام کے بادشاہ سے فریاد رسی کی کہ یوسف ذو نواس نے اہل ایمان پر ایسا ایسا ظلم کیا ہے۔ شام کے بادشاہ نے اپنے حلیف بادشاہ حبشہ کو خط لکھا کہ وہ اس کا انتقام لے اور ساتھ ہی ایک بہت بڑے لشکر کو دو کمانڈر اریاط اور ابرہہ کی قیادت میں یمن کے اس ظالم بادشاہ کے مقابلہ پر روانہ کردیا۔ یہ عظیم الشان لشکر یمن پر ٹوٹ پڑا اور پورے یمن کو حِمیَرُ خاندان کے اثر سے آزاد کرالیا۔ ملک حمیر ذو نواس بھاگ نکلا اور ایک دریا پار کرتے ہوئے غرق ہوگیا۔

اس طرح اریاط اور ابرہہ کے ذریعہ یمن پر حبشہ کے بادشاہ کا قبضہ ہوگیا جو خود نصرانی المذہب تھا۔

یہ واقعہ ۵۲۵ء میں پیش آیا تھا جس نے حمیری خاندان کا خاتمہ

کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد اِن دونوں کمانڈروں میں نزاع پیدا ہوگئی اور باہمی جنگ میں اریاط مارا گیا اور ابرہہ غالب آگیا اور پھر وہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی کی جانب سے ملک یمن کا حاکم (گورنر) مقرر ہوگیا۔

ابرہہ ذاتی طور پر کٹر عیسائی تھا اسکے عزائم میں یہ بات بھی شامل تھی کہ سارے عرب کو عیسائیت میں تبدیل کر دیا جائے اس طرح کہ مکہ مکرمہ کی عالمی مرکزی حیثیت بھی ختم ہوجائے۔ مذہبی جنون میں اس نے یمن کے شہر صنعاء میں ایک ایسا شاندار کنیسہ (گرجاگھر) بنایا جسکی نظیر اس وقت دنیا بھر میں نہ تھی، مؤرخ سہیلیؒ لکھتے ہیں کہ ابرہہ نے اس کی تعمیر پر یمن کی بے اندازہ دولت اور بیش بہا زر و جواہر صرف کئے۔ یہ قیمتی پتھروں کی بہت ہی خوبصورت طویل و عریض عمارت تھی۔ عجیب و غریب زر کار نقوش سے منقش، جواہر ریزوں سے مزین، ہاتھی دانت کی نفیس جالیاں، سونے چاندی کے اوراق سے در و دیوار کو سجایا گیا تھا۔ اس سے ابرہہ کا یہ مقصد تھا کہ یمن کے عرب لوگ جو ہر سال حج کرنے مکہ مکرمہ جاتے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس کنیسہ کی شان و شوکت سے مرعوب ہوکر کعبۃ اللہ کے بجائے اس کا طواف اور حج کریں، کچھ عرصہ بعد اُس نے پوری مملکت میں اعلان کروادیا کہ اب یمن سے کوئی شخص بھی حج کرنے کے لئے مکہ مکرمہ نہ جائیگا۔ ایسا شخص اسی کنیسہ میں آئے اور اس کا طواف کرے۔ عرب میں اگرچہ بت پرستی غالب آگئی تھی مگر دین ابراہیمی اور کعبۃ اللہ کی عظمت و محبت اُن کے دلوں میں پیوست تھی۔ اس لئے عدنان، قحطان، اور قریش کے قبائل میں اس اعلان سے سخت غم و غصہ کی لہر پیدا ہوگئی۔ اگرچہ اس وقت خانہ کعبہ کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ لوگ اسکو اللہ تعالیٰ کا مقدس گھر اور عبادت کا مرکز خیال کرتے تھے

مؤرخ محمد بن اسحٰق کا بیان ہے کہ ابرہہ کے اُس اعلان پر غضبناک ہوکر ایک عرب تاجر نے کسی نہ کسی طرح کلیسہ میں گھس کر

رفع حاجت کر ڈالی۔

ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ یہ فعل ایک قریشی نے کیا تھا۔ مقاتل بن سلیمان کی روایت ہے کہ قریش کے بعض نوجوانوں نے جاکر اُس گرجاگھر میں آگ لگادی تھی۔ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی واقعہ پیش آیا ہو تو کوئی تعجب خیز نہیں کیونکہ ابرہہ کا یہ اعلان یقیناً سخت اشتعال انگیز اور مفسدانہ تھا اور قدیم جاہلیت کے دور میں اسپر کسی عرب یا قریشی یا چند نوجوانوں کا مشتعل ہوکر کلیسا کو گندا کردینا یا اسمیں آگ لگادینا ناقابل فہم بات نہیں ہے۔

لیکن بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ عرب کے چند مسافروں نے کلیسا کے قریب اپنی ضرورت کے لئے آگ جلائی تھی جہاں اُن کا قیام تھا اتفاقاً ہواؤں کی لہر سے آگ کلیسا میں جاگری اور کلیسہ جل گیا۔

ابرہہ کو جب اسکی اطلاع ملی کہ خانہ کعبہ کے معتقدین نے یہ حرکت کی ہے تو غیض و غضب میں عہد کیا کہ اُس وقت تک چین نہ لوں گا جب تک خانہ کعبہ کو ڈھا نہ دوں۔

اسکے بعد اُس نے ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں اپنے بادشاہ نجاشی سے اجازت طلب کی کہ وہ انہدام کعبہ کی مہم کے لئے حجاز جانا چاہتا ہے۔ نجاشی نے اسکو اجازت دیدی اور خصوصی تعاون کے طور پر اپنی فوج کا سب سے طاقتور بلند و بالا ہاتھی جس کا نام محمود تھا ابرہہ کی مدد کیلئے روانہ کردیا اور اس ہاتھی کے تعاون کے لئے مزید سات آٹھ ہاتھی اور دیئے۔ ابرہہ ساٹھ ہزار فوج لیکر مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوا۔

عرب میں جب اس حملے کی خبر پھیلی تو سارا عرب مقابلہ کے لئے تیار ہوگیا۔ یمن کے عربوں میں ایک شخص ذو نفر نامی تھا اُس نے عربوں کی قیادت اختیار کی اور بہت سے عرب قبائل اسکے گرد جمع ہوکر ابرہہ کے خلاف جنگ کیے لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ ابرہہ نے ان کو شکست دیدی اور ذو نفر کو قید کرلیا اور آگے روانہ ہوگیا۔ پھر قبیلہ خثعم کے

مقام پر پہنچا تو اس قبیلے کا سردار نفیل بن حبیب خثعمی اپنے قبیلے کو لے کر ابرہہ کے مقابلہ کے لئے آیا مگر ابرہہ کے لشکر نے اسکو بھی شکست دیدی اور نفیل بن حبیب کو گرفتار کر لیا اور اسکے قتل کا ارادہ کیا مگر یہ سمجھکر زندہ رکھا کہ اُس سے مکّہ کے اہم راستوں کا پتہ معلوم کر لیا جائے گا۔

پھر جب یہ لشکر طائف کے قریب پہنچا تو طائف کے باشندے پچھلے قبائل کی جنگ اور ابرہہ کی فتح کے واقعات سن چکے تھے۔ انھوں نے اپنی خیر منانے کا فیصلہ کیا اور ابرہہ سے گزارش کی کہ وہ ان کے مشہور معبود "لات" کا مندر تباہ نہ کرے۔ چنانچہ ان کا سردار مسعود ثقفی ایک وفد کو لے کر ابرہہ سے ملا اور کہا کہ ہمارا بُت کدہ وہ معبد نہیں ہے جس کو آپ ڈھانے آئے ہیں وہ تو مکّہ مکرمہ میں ہے اس لئے آپ ہمارے معبد کو چھوڑ دیں ہم مکّہ مکرمہ کا راستہ بتانے کے لئے آپکو ایک آدمی فراہم کر دیتے ہیں جو قریب کے راستہ سے مکّہ تک رہنمائی کرے گا۔ ابرہہ نے یہ بات قبول کر لی اور بنو ثقیف نے اَبُو رِغال نامی شخص کو اِن کے ساتھ کر دیا۔ جب مکّہ مکرمہ تین کوس کے فاصلہ پر رہ گیا تو المغمس نامی مقام پر پہنچ کر ابو رغال فوت ہوگیا (اہل عرب زمانہ جاہلیت میں مدتوں اسکی قبر پر سنگ باری کرتے رہے ہیں اور بنو ثقیف کو بھی وہ عرصہ دراز تک طعنہ دیتے رہے ہیں کہ انھوں نے لات کے مندر کو بچانے کے لئے بیت اللہ پر حملہ کرنے والوں کا تعاون کیا تھا)

محمد بن اسحٰق کی روایت ہے کہ المغمس سے ابرہہ نے اپنے مقدمۃ الجیش کو آگے بڑھایا جہاں قریشِ مکہ کے اونٹ چر رہے تھے۔ ابرہہ کے اس لشکر نے ان پر چھاپہ مارا اور سب اونٹ ہانک لے گئے۔ ان میں حضرت عبد المطلب کے بھی دو سو اونٹ شامل تھے۔ اسکے بعد ابرہہ نے اپنے ایک سفیر حناطہ حمیری کو شہر مکّہ روانہ کیا اور اسکے ذریعہ اہل مکّہ کو یہ پیغام دیا کہ میں تم سے لڑنے نہیں آیا ہوں بلکہ اس گھر (کعبہ)

کو ڈھانے آیا ہوں اگر تم لوگ جنگ نہ کرو تو میں تمہاری جان و مال سے کوئی تعرض نہ کروں گا نیز اس سفیر کو یہ بھی ہدایت دی کہ اہل مکہ اگر بات کرنا چاہیں تو اُن کے سردار کو میرے پاس لے آنا، اُس وقت مکہ مکرمہ کے سب سے بڑے سردار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا حضرت عبدالمطلب تھے۔ سفیر نے اُن سے ملکر ابرہہ کا پیغام پہنچایا۔ عبدالمطلب نے کہا کہ ہم میں ابرہہ سے لڑنے کی قطعاً طاقت نہیں ہے یہ اللہ کا گھر ہے اور اسکے خلیل کا بنایا ہوا وہ چاہے گا تو اپنے گھر کی حفاظت خود کرلے گا۔ سفیر نے کہا کہ آپ میرے ساتھ ابرہہ کے پاس چلیں اور اُس سے بات کریں۔ وہ اسپر راضی ہو گئے۔

حضرت عبدالمطلب اسقدر وجیہ اور پُر وقار آدمی تھے کہ ابرہہ ان کو دیکھ کر متأثر ہو گیا اور اپنی جگہ سے اُتر کر اُن کو اپنے پاس بٹھایا اور پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ میرے جو اونٹ پکڑے گئے ہیں وہ مجھے واپس دیدیئے جائیں! ابرہہ نے کہا کہ آپ کو دیکھ کر تو میں بہت متأثر ہوا تھا مگر آپ کی بات نے آپکو میری نظر سے گرا دیا کہ آپ اپنے اونٹوں کا مطالبہ کر رہے ہیں اور یہ گھر (کعبہ) جو آپ کے دین آبائی کا قبلہ ہے اسکے بارے میں کچھ نہیں کہتے؟ خواجہ عبدالمطلب نے کہا میں تو صرف اپنے اونٹوں کا مالک ہوں اور انہی کے بارے میں آپ سے درخواست کرنے آیا ہوں۔ رہا یہ گھر (کعبہ) تو اس کا ایک رب ہے وہ خود اسکی حفاظت کرلے گا۔ ابرہہ کو خواجہ عبدالمطلب کی یہ بات معمولی سی محسوس ہوئی اُس نے کہا تمہارا رب اُس کو میرے ہاتھ سے نہ بچا سکے گا۔ خواجہ عبدالمطلب نے کہا پھر تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو۔

اور بعض روایات میں ہے کہ عبدالمطلب کے ساتھ قریش کے چند سردار بھی تھے۔ انھوں نے ابرہہ کے آگے یہ پیش کش کی کہ اگر آپ بیت اللہ پر دست اندازی نہ کریں اور لوٹ جائیں تو ہم

پورے تہامہ (حجاز) کی ایک تہائی پیداوار آپ کو بطور خراج ادا کرتے رہیں گے۔ مگر ابرہہ نے اس بات کو قبول نہ کیا۔ خواجہ عبدالمطلب اپنے اونٹ لے کر واپس چلے آئے اور سیدھے بیت اللہ میں داخل ہوئے اور چوکھٹ کا حلقہ پکڑ کر دُعا میں مشغول ہو گئے۔ قریش کی ایک بڑی جماعت بھی ساتھ تھی۔

محمد بن اسحٰق بیان کرتے ہیں کہ ابرہہ کے لشکر گاہ سے واپس آکر خواجہ عبدالمطلب نے اہل قریش سے کہا کہ اپنے بال بچوں سمیت پہاڑوں پر چلے جائیں تاکہ ان کا قتل عام نہ ہو جائے۔ پھر وہ اور قریش کے چند سردار حرم پاک میں حاضر ہوئے اور کعبہ کے دروازے کا کنڈا پکڑ کر اللہ تعالٰے سے دعائیں مانگیں کہ وہ اپنے گھر اور اُسکے خادموں کی حفاظت فرمائے۔ اُس وقت خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بُت موجود تھے مگر یہ لوگ ان نازک گھڑی میں بھی اُن سب کو بھول گئے اور صرف اللہ واحد کے آگے دست سوال پھیلایا، اُن کی جو دعائیں کتب تاریخ میں منقول ہیں اُن میں اللہ واحد کے سوا کسی دوسرے کا نام تک نہیں پایا جاتا۔ ابن ہشامؒ نے سیرت میں خواجہ عبدالمطلب کے جو اشعار نقل کئے ہیں وہ اس کی شہادت دیتے ہیں۔

اسی طرح مؤرخ سہیلیؒ نے روض الانف میں اور امام ابن جریرؒ نے طبری میں وہ اشعار نقل کئے ہیں۔

یہ دعائیں مانگ کر خواجہ عبدالمطلب اور ان کے ساتھی بھی پہاڑوں پر چلے گئے۔ دوسرے روز ابرہہ مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کیلئے آگے بڑھا مگر اُس کا وہ خاص ہاتھی محمود نامی جو آگے آگے تھا یکایک بیٹھ گیا اسکو بہت تبر مارے گئے تیرے کچو کے دیئے گئے یہاں تک کہ اسکو زخمی کر دیا گیا مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ آخر اسکو جنوب شمال مشرق کی طرف موڑ کر چلانے کی کوشش کی جاتی تو وہ دوڑنے لگتا مگر مکہ مکرمہ کی طرف موڑا جاتا تو فوراً بیٹھ جاتا کسی طرح آگے بڑھنے کیلئے تیار نہ ہوتا

اتنے میں پرندوں کی قطاریں آتی نظر آئیں جن میں سے ہر ایک کے پاس تین کنکریاں چنے یا مسور کی دال کے برابر تھیں ایک چونچ میں اور دو کنکریاں پنجوں میں۔

واقدیؒ کی روایت ہے کہ یہ پرندے عجیب طرح کے تھے جو اس سے پہلے کہیں بھی نہیں دیکھے گئے۔ بدن کبوتر سے کچھ چھوٹے تھے اور پنجے سُرخ قسم کے تھے، ان کی آواز بھی کچھ ارتعاش انگیز تھی کہ دل کپ کپائے جاتے تھے۔ پرندوں کے یہ جُھنڈ کے جُھنڈ نے ابرہہ کے لشکر پر سنگریزوں کی بارش کر دی۔ جس پر بھی یہ کنکر گرتے جسم سے پار ہو جاتے اور جسم گلنا شروع ہو جاتا۔

حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت ہے کہ کنکری کے لگتے ہی گوشت اور خون پانی کی طرح بہنے لگتا اور ہڈیاں نکل آتی تھیں۔ خود ابرہہ کے ساتھ بھی یہی ہوا اسکا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا پورے لشکر میں افراتفری پیدا ہو گئی۔ لشکر کے لوگ یمن کی طرف بھاگنا شروع ہو گئے۔ نفیل بن حبیب خشعمی جسکو ابرہہ راہنما کے طور پر ساتھ لے آیا تھا اسکو تلاش کر کے درخواست کرنے لگا کہ واپسی کا راستہ بتائیے مگر اُس نے صاف انکار کر دیا اور کہا

اَیْنَ الْمَفَرُّ وَ الْاِلٰہُ الطَّالِبُ

وَالْاَشْرَمُ الْمَغْلُوْبُ لَیْسَ الْغَالِبُ

اب بھاگنے کی جگہ کہاں ہے جبکہ اللہ تعاقب کر رہا ہے۔

اور نکٹا (ابرہہ) مغلوب ہے غالب نہیں ہے۔

اس بھگدڑ میں یہ لوگ گر گر کر مرتے گئے اور مر مر کر گرتے جاتے تھے۔ عطاءؒ بن یسارؒ کی روایت ہے کہ سب کے سب اُسی وقت ہلاک نہیں ہوئے بلکہ ایک بڑی تعداد تو وہیں ہلاک ہو گئی اور کچھ بھاگتے ہوئے ہلاک ہوئے۔ ابرہہ بھی انتہائی بُری حالت میں بلادِ خشعم پہنچکر مرا۔ ابرہہ کے ہاتھی محمود کے ساتھ دو ہاتھی بان تکنکر مر میں رہ گئے مگر اس طرح کہ دونوں اندھے

اپاہج ہوگئے تھے۔

محمد بن اسحٰق نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت نقل کی ہے وہ فرماتی تھیں کہ میں نے اُن دونوں کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ وہ اندھے اپاہج تھے اور بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بہن حضرت اسماءؓ بھی یہ بات نقل کیا کرتی تھیں۔

اصحاب الفیل کا یہ واقعہ مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان وادی محصب کے قریب مقام مُحسّر پر پیش آیا تھا۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مزدلفہ سے منیٰ کی طرف چلے تو وادی محسّر میں آپؐ نے اپنی رفتار تیز کر دی تھی۔ امام نووی اسکی شرح میں لکھتے ہیں کہ اصحاب الفیل کا واقعہ اسی وادی میں پیش آیا تھا اور اسی جگہ اُن پر ابابیل مسلّط کر دیئے گئے تھے۔ اس لئے سنت یہی ہے کہ آدمی یہاں سے جلد گزر جائے اور اس عذاب کی جگہ قیام نہ کرے۔

نیز امام مالکؒ اپنی کتاب موطا میں ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مزدلفہ پورا کا پورا ٹھہرنے کا مقام ہے سوائے وادی مُحسّر۔ (الحدیث)

اصحاب الفیل کا یہ عبرتناک واقعہ ماہ محرم میں پیش آیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت اس واقعہ کے چالیس یا پچاس دن بعد ہوئی۔

اہل عرب میں یہ واقعہ اس درجہ مشہور و معروف تھا کہ اُنھوں نے اس سال کا نام "عام الفیل" (ہاتھیوں والا سال) رکھ دیا۔ قرآن حکیم نے اس حادثہ کو اپنے معجزانہ کلام میں اس طرح بیان کیا ہے:—

قرآنی مضمون | اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۔ الخ

(سورۃ الفیل)

کیا تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔

کیا اُس نے اُن کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا؟

اور اُن پر پرندوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ بھیج دیئے۔ جو اُن پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے پھر اُن کا یہ حال کر دیا جیسے جانوروں کا کھایا ہوا بھُوسا۔

نتائج و عبر

آنکھوں دیکھا حال

عرب کا مشہور شاعر نفیل بن حبیب جو اصحاب الفیل کا چشم دید گواہ ہے۔ اپنے اشعار میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے جیسا کہ قرآن حکیم نے بیان کیا ہے۔

محمد بن اسحٰق نے اپنی تاریخ میں اس کے چند ایک اشعار نقل کئے ہیں:۔

رُدَیْنَۃُ لَوْ رَأَیْتِ وَلَا تَرَیْہِ ۔۔۔ لَدٰی جَنْبِ الْمُحَصَّبِ مَا رَأَیْنَا

اے رُدینہ کاش تو دیکھتی اور تو نہیں دیکھ سکیگی ۔۔۔ جو کچھ ہم نے وادی محصب کے قریب دیکھا ہے

حَمِدْتُ اللّٰہَ اِذْ اَبْصَرْتُ طَیْرًا ۔۔۔ وَخِفْتُ حِجَارَۃً تُلْقٰی عَلَیْنَا

میں نے اللہ کا شکر کیا جب پرندوں کو دیکھا ۔۔۔ اور میں ڈر رہا تھا کہ کہیں پتھر ہم پر نہ آپڑیں

وَکُلُّ الْقَوْمِ یَسْأَلُ عَنْ نُفَیْلٍ ۔۔۔ کَاَنَّ عَلَیَّ لِلْحُبْشَانِ دَیْنًا

اُن لوگوں میں کہ ہر ایک نفیل کو ڈھونڈ رہا تھا ۔۔۔ گویا کہ مجھ پر حبشیوں کا کوئی قرض آتا ہے۔

عرب کا ایک دوسرا شاعر عبد اللہ بن الزبعریٰ اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے:۔

سِتُّوْنَ اَلْفًا لَمْ یَؤُبُوْا اَرْضَھُمْ ۔۔۔ وَلَمْ یَعِشْ بَعْدَ الْاِیَابِ سَقِیْمُھَا

ساٹھ ہزار تھے جو اپنی سرزمین کیطرف واپس جا سکے ۔۔۔ اور نہ واپس ہونیکے بعد انکا بیمار (ابرہہ) زندہ رہا

کَانَتْ بِھَا عَادٌ وَجُرْھُمُ قَبْلَھُمْ ۔۔۔ وَاللّٰہُ مِنْ فَوْقِ الْعِبَادِ یُقِیْمُھَا

یہاں اس سے پہلے قوم عاد اور جُرہُم تھے ۔۔۔ اور اللہ بندوں کے اوپر موجود ہے جو اسے قائم رکھے ہوئے ہے۔

ابو قیس بن اسلت اس طرح بیان کرتا ہے :-

فَقُومُوْا فَصَلُّوْا رَبَّكُمْ وَتَمَسَّحُوْا بِاَرْكَانِ هٰذَا الْبَيْتِ بَيْنَ الْاَخَاشِبِ

اُٹھو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور مکہ و منیٰ کی پہاڑیوں کے درمیان بیت اللہ کے کونوں کا بوسہ لو۔

فَلَمَّا اَتَاكُمْ نَصْرُ ذِي الْعَرْشِ رَدَّهُمْ جُنُوْدُ الْمَلِيْكِ بَيْنَ سَافٍ وَحَاصِبِ

جب عرش والے کی مدد تمہیں پہنچی تو اُس بادشاہ کے لشکروں نے اُن لوگوں کو اس حال میں پھیر دیا کہ کوئی خاک میں پڑا ہوا تھا اور کوئی سنگسار کیا ہوا۔

كُوْنُوْا سِرَاعًا هَارِبِيْنَ وَلَمْ يُؤُبْ اِلٰى اَهْلِهٖ بِحَبْشٍ غَيْرُ عِصَائِبِ

پھر سارا لشکر شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا ان میں چند ایک کے سوا کوئی بھی ملک حبشہ نہیں پہنچ سکا۔

جب ستایا بتوں نے تو.....

اسلامی مؤرخ محمد بن اسحٰق بیان کرتے ہیں، ابرہہ سے گفتگو کرنے کے بعد خواجہ عبد المطلب واپس آئے اور اعلان کروا دیا کہ سب لوگ اپنے اپنے خاندان کے ساتھ پہاڑوں پر چلے جائیں کہیں انکا قتل عام نہ ہو جائے اسکے بعد وہ اور قریش کے چند سردار حرم مکی میں حاضر ہوئے اور کعبہ کی چوکھٹ پکڑ کر اللہ تعالے سے دعائیں مانگیں کہ وہ اپنے گھر اور اسکے خادموں کی حفاظت فرمائے۔

اِس وقت خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بت موجود تھے اور بزعم قریش ہر ایک بُت ایک ایک حاجت کا مالک تھا مگر یہ لوگ اُس نازک گھڑی میں اُن سب خداؤں کو بھول گئے صرف اللہ واحد کے سوا کسی دوسرے کا نام تک نہیں لیا، صرف اللہ صرف اللہ واحد کے آگے دستِ سوال پھیلایا۔

یہی نہیں بلکہ حضرت ام ہانی رضؓ اور حضرت زبیر بن العوام کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس واقعہ کے بعد قریش نے دس سال تک اللہ وحدہٗ لا شریک کے سوا کسی کی بھی عبادت نہیں کی۔

(طبرانی، حاکم، بیہقی، ابن عساکر)

حَابِسُ الفِیل :۔

بخاری شریف میں حدیبیہ کے واقعہ سے متعلق جو طویل روایت موجود ہے اُس کا ایک ٹکڑا اصحاب فیل کے واقعہ پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔

سنہ ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب مدینہ منورہ سے جنگ کی نیت سے نہیں بلکہ زیارت بیت اللہ (عمرہ) کے مقصد سے مکہ مکرمہ جا رہے تھے مگر مشرکین نے یہ سمجھا کہ جنگ کا ارادہ ہے اس لئے خالد بن ولید (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) مکہ سے مقدمۃ الجیش بنکر راہ روکنے کے لئے ایک چھوٹے دستے کے ساتھ آگے بڑھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ دیکھا تو کہا واللہ ہمارا ارادہ کعبہ کی زیارت کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اگر مشرکین مکہ ہمارے اس نیک مقصد میں حائل ہوتے ہوں تو ہم بلا شبہ ان کا مقابلہ کریں گے۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا راہ بدل کر چلو تاکہ خالد کو پتہ نہ چلے کہ ہم کس طرف سے ہوکر آرہے ہیں اور ایک لخت انکے سر پہ پہنچ جائیں۔ چنانچہ مسلمان ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے اچانک خالد بن ولید کے دستہ پر حملہ کیا جا سکتا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی (قصواء) بیٹھ گئی۔ صحابہ کرام نے ہرچند اسکو اٹھانا چاہا مگر وہ ہرگز تیار نہ ہوئی۔ اسپر لوگوں نے کہا قصواء بھڑک گئی ہے اور بے قابو ہوگئی ہے۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا قصواء نہ بھڑکی ہے نہ بے قابو ہوئی اور نہ یہ اُسکی عادت ہے بلکہ اسکو اُسی نے روک دیا ہے جس نے ہاتھیوں والوں کو روک دیا تھا۔

زبانِ رسالت کے یہ الفاظ ہیں :۔

مَا خَلَأَتْ وَمَا ذَاكَ لَهَا بِخُلُقٍ وَلٰكِنْ حَبَسَهَا حَابِسُ الْفِيلِ)

اسکے بعد آپؐ نے فرمایا اُس ذات کی قسم جسکے دستِ قدرت میں میری جان ہے مشرکین مکہ بیت اللہ کی عظمت کے سلسلے میں

جس بات کے بھی طالب ہوں گے میں اسکو پورا کروں گا۔

پھر آپؐ نے اونٹنی کو حرکت دی وہ فوراً کھڑی ہوگئی اور حدیبیہ کے آخری کنارے پر جا پہنچی۔ (بخاری غزوۃ الحدیبیہ)

جس طرح اصحاب فیل کو حرم کعبہ اور بیت اللہ کی بربادی سے اللہ تعالیٰ نے روک دیا اور اُنکا وہ ہاتھی جو فتح اور کامیابی کی علامت سمجھا جاتا تھا بیٹھ گیا۔ اسی طرح خالد بن ولید کے آمادۂ جنگ ہونے اور حضرت صدیق اکبرؓ کے ارادۂ مقابلہ نے حدود حرم میں صورتِ حال کو جنگ کے قریب کر دیا تو عظمتِ حرم کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ناقہ (اونٹنی) بیٹھ گئی تاکہ آپؐ کی زبان مبارک سے یہ اعلان کروایا جائے کہ مشرکین مکہ سے جنگ کا ارادہ نہیں ہے اور تمام سرزمین حرم میں ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ جنگ کے سلسلے میں شعائر اللہ کی حرمت وعظمت میں کوئی فرق آجائے۔ یہاں کعبۃ اللہ ہے۔ مقام ابراہیم ہے۔ مسجد حرام ہے۔ میزاب رحمت اور صفا ومروہ کے مقدس شعائر ہیں۔

چند تفسیری نکات :۔

(۱) اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ۔

(الفیل آیت ۱)

کیا آپؐ نے (اے نبیؐ) نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا ؟

آیت میں خطاب بظاہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر اصل مخاطب اہل مکہ بلکہ عرب کے عام لوگ ہیں۔ یہ اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت اس واقعہ کے کم وبیش پچاس دن بعد ہوئی ہے۔

اس لئے اسکے اصل مخاطب اُس وقت کے عام لوگ ہیں۔

اس سلسلے میں قرآن حکیم کا اپنا ایک مخصوص طرز ہے وہ جابجا واقعات وقصص کے سلسلے میں "اَلَمْ تَرَ" (کیا آپؐ نے نہیں دیکھا) کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور اس سے مقصود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ عام انسانوں کو مخاطب کرنا ہوتا ہے مثال کے طور پر۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

بِالْحَقِّ۔ الخ (ابراہیم آیت ۱۹)

کیا آپ (اے نبیؐ) نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان و زمین کو بالکل ٹھیک ٹھیک پیدا کیا ہے اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا کردے اور ایک دوسری نئی مخلوق پیدا کرے اور یہ اللہ پر کچھ بھی مشکل نہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ الخ (الحج آیت ۱۸)

کیا آپ کو (اے نبیؐ) معلوم نہیں کہ اللہ کے سامنے سب عاجزی کرتے ہیں جو کہ آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے آدمی بھی اور بہت سے ایسے بھی ہیں جن پر عذاب ثابت ہو گیا ہے اور اللہ جسکو ذلیل کرے اُس کا کوئی عزت دینے والا نہیں۔ بیشک اللہ جو چاہے کرے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّۃً۔ (الحج آیت ۶۳)

کیا آپ کو (اے نبیؐ) خبر نہیں کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا جس سے زمین سرسبز ہو گئی۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ۔ الخ (النور آیت ۴۱)

کیا آپ کو (اے نبی) معلوم نہیں کہ اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں وہ سب جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں اور پرندے جو پَر پھیلائے ہوئے ہیں سبکو اپنی اپنی دُعا اور اپنی تسبیح معلوم ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَ یُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی۔ الخ (لقمٰن آیت ۲۹)

کیا آپ نے (اے نبیؐ) نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ رات کو دن میں

اور دن کو رات میں داخل کر دیتا ہے اور اُس نے سورج و چاند کو کام میں لگا رکھا ہے کہ ہر ایک مقررہ وقت تک چلتا رہے گا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِى الْاَرْضِ الخ (الزمر آیت ۲۱)

کیا آپ نے (اے نبیؐ) نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اسکو زمین کے چشموں میں داخل کر دیا پھر اسکے ذریعہ کھیتیاں پیدا کرتا ہے جسکی مختلف قسمیں ہیں۔ الخ

یہ اور اس طرح کی کئی آیات ہیں جن میں خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا لیکن اصل مخاطب عام لوگ ہیں۔ یہ قرآن حکیم کا اپنا خاص طرز ہے جس سے اُس بات کی اہمیت کو زیادہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔

ایسے ہی اصحاب الفیل کے واقعہ میں آپؐ سے خطاب کیا گیا مقصود اُس وقت کے عام لوگ ہیں۔ مکہ اور اطراف مکہ بلکہ مکہ سے یمن تک ایسے بہت سے لوگ اُس وقت زندہ موجود تھے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے اصحاب الفیل کی تباہی کا واقعہ دیکھا تھا کیونکہ اس واقعہ کو گزرے ہوئے چالیس پچاس سال سے زیادہ زمانہ نہیں ہوا تھا اور یہ واقعہ لوگوں کے لئے آنکھوں دیکھا حال کی طرح یقینی تھا۔

(۱) اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِىْ تَضْلِيْلٍ :-

کیا اُن کے کید کو فنا نہیں کر دیا؟

عربی زبان میں لفظ کید خفیہ تدبیر اور خفیہ چال کو کہا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہاں خفیہ کیا چیز تھی؟ ساٹھ ہزار کا لشکر کئی ہاتھی لئے علانیہ طور پر یمن سے مکہ آیا تھا اور اُس نے یہ بات بھی چھپا نہیں رکھی تھی کہ وہ خانہ کعبہ کو ڈھانے آیا ہے۔ چنانچہ ابرہہ نے اسکا اظہار مکہ کے سردار خواجہ عبد المطلب سے بھی کر دیا تھا۔ لہذا قرآن حکیم کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی خفیہ تدبیر کو ناکام کر دیا کوئی معنی نہیں رکھتا؟

حقیقت یہ ہے کہ ابرہہ اور اسکے لشکر کی یہ غرض تھی کہ وہ کعبۃ اللہ کو ڈھا کر قریش کی مرکزی حیثیت ختم کر دے اور یمن میں عیسائی کعبہ کو اسکی جگہ دی جائے تاکہ سارے

عالم کا رُخ بجائے مکہ مکرمہ کے یمن کی طرف ہوجائے۔ یہ اُن کی خُفیہ بات تھی جسکو لیکر خانہ کعبہ ڈھانے آئے تھے۔ اللہ تعالےٰ نے اپنی ایک چھوٹی سی مخلوق سے اُن کو فنا کے گھاٹ پہنچادیا۔

(۲) تَضْلِیْل :-

کے معنی گمراہی میں ڈالنا، گُم کر دینا، حیران و پریشان کر دینا کے آتے ہیں لیکن عربی محاورے میں کسی تدبیر کو گمراہ کر دینے کا مطلب اُس کو ضائع اور ناکام کر دینے کے ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ایسا استعمال بکثرت آیا ہے۔

وَمَا کَیْدُ الْکَافِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ۔ (المؤمن آیت ۲۵)

اور کافروں کی تدبیر اکارت ہی گئی۔

وان اللہ لا یھدی کید الخائنین۔ (یوسف آیت ۵۲)

اور بیشک اللہ خیانت کرنیوالوں کی تدبیر کو کامیابی کی راہ پر نہیں لگاتا۔

وَمَا کَیْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِیْ تَبَابٍ۔ (المؤمن آیت ۳۷)

اور نہیں تھی فرعون کی تدبیر سوائے (اُس کی اپنی ہی) تباہی میں (یا) اور فرعون کی تدبیر غارت ہی گئی۔

وَمَا دُعَآءُ الْکَافِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلَالٍ۔

اور کافروں کی دُعا محض بے اثر ہے۔ (المومن آیت ۵۰) (الرعد آیت ۱۴)

(۳) طَیْرًا اَبَابِیْلَ :-

طیر کے معنی پرندے کے ہیں اور اَبَابِیل اَبالہٗ کی جمع ہے جسکے معنی متفرق گروہ کے ہیں جو پے در پے مختلف سمتوں سے ٹوٹ پڑیں۔ یہ گروہ خواہ آدمیوں کے ہوں یا جانوروں کے ہوں۔

حضرت عکرمہؓ اور قتادہؓ کہتے ہیں کہ یہ جھُنڈ کے جھُنڈ پرندے بحر احمر کی طرف سے آئے تھے۔

حضرت سعید بن جبیرؓ اور حضرت عکرمہؓ کہتے ہیں کہ اس قسم کے پرندے نہ پہلے کبھی دیکھے گئے تھے اور نہ بعد میں دیکھے گئے۔

حضرت ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ انکی چونچیں پرندوں جیسی تھیں اور پنجے کتّوں جیسے۔

حضرت عکرمہؒ کا یہ بھی بیان ہے کہ اِن کے سر شکاری پرندوں کے سروں جیسے تھے۔ اور تقریباً سب راویوں کا متفقہ بیان ہے کہ ہر پرندے کی چونچ میں ایک ایک کنکر تھا اور پنجوں میں دو دو کنکر۔

مکّہ مکرمہ کے بعض لوگوں کے پاس یہ کنکر عرصہ دراز تک محفوظ رہے۔ چنانچہ محدّث ابونعیم نے نوفل بن ابی معاویہ کا بیان نقل کیا ہے کہ میں نے وہ کنکر دیکھے ہیں جو اصحاب الفیل پر پھینکے گئے تھے وہ مٹر کے چھوٹے دانے کے برابر، سیاہی مائل سُرخ تھے۔ محدث ابن مردویہ کی روایت ہے کہ وہ بکری کی مینگنی کے برابر تھے۔

(۴) بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ:۔

سجیل کے معنی پکّی مٹّی کے ہیں یعنی وہ کنکریاں پکّی (آگ میں جلائی ہوئی) مٹی کے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ دراصل فارسی کے الفاظ سنگ اور گِل کا مجموعہ ہے۔ یعنی وہ پتھر جو مٹی کے گارے سے بنایا گیا ہو اور آگ میں پک کر سخت ہو گیا ہو۔

قوم لوط پر جن پتھروں کی بارش ہوئی تھی اُن کو بھی حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ کہا گیا ہے۔

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ مَّنضُودٍ مُّسَوَّمَةً عِندَ رَبِّكَ الآية۔ (ہود آیت ۸۲)

اور ہم نے اُس بستی پر پکّی مٹی کے پتّھر یکے بعد دیگرے برسائے جن میں سے ہر پتّھر تیرے رب کے ہاں نشان زدہ تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ عذابِ الٰہی کے لئے اس قسم کے پتھروں سے کام لیا گیا ہے۔

(۵) مقصود کلام:۔

جو تاریخی تفصیلات اوپر درج کی گئی ہیں اُن کو نگاہ میں رکھ کر سورۂ فیل پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس سورہ میں نہایت اختصار کے ساتھ بغیر کسی تفصیلات اصحاب الفیل پر عذاب کا ذکر کر دینے پر کیوں اکتفا کیا گیا ہے؟ اسکی وہ تفصیلات جو عام

طور پر ہر ایک کی زبان پر تھیں حذف کردی گئیں۔ یہ اس لئے کہ اصحاب الفیل کا واقعہ اہل مکہ اور اُسکے اطراف و اکناف کے لئے کچھ زیادہ قدیم نہ تھا۔ مکے کا بچہ بچہ اسکو جانتا تھا۔ عرب کے لوگ عام طور پر اس سے واقف تھے بلکہ اس واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے والوں کی بھی اُس وقت کمی نہ تھی۔ شعراء اپنے اشعار میں اور قصہ گو اپنی کہانیوں میں اسکو ایک واقعہ و حادثہ کے طور پر بیان کیا کرتے تھے۔ قریش کے سرداروں نے ابرہہ کے اس حملے سے کعبہ کی حفاظت کے لئے کسی دیوی دیوتا یا خود خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے ۳۶۰ خداؤں سے دُعا نہیں مانگی تھی بلکہ صرف اللہ واحد کا نام لیا تھا حتیٰ کہ چند سال تک قریش کے لوگ اس واقعہ سے اسقدر متأثر رہے کہ انھوں نے اللہ واحد کے سوا کسی کی عبادت بھی نہ کی۔ اس لئے سورہ فیل میں واقعہ کی تفصیلات کے ذکر کرنیکی ضرورت نہ تھی بلکہ صرف واقعہ کو یاد دلانا کافی تھا تاکہ قریش کے لوگ خصوصاً اور اہل عرب اور عالم کے انسان عموماً اس بات پر غور کریں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہ آخر اسکے سوا اور کیا ہے کہ تمام معبودوں کو چھوڑ کر صرف اور صرف رب کعبہ کی عبادت کی جائے جو اُن کا اور ان کے تمام آباء و اجداد اور کائنات کا رب ہے۔

نیز اس واقعہ میں یہ بھی تنبیہ ہے کہ دعوتِ حق کو دبانے کے لئے اگر انھوں نے زور اور زبردستی سے کام لیا تو جس ذات نے اصحاب الفیل کو جانوروں کے چارے کی طرح بھوسا کر دیا تھا اُسی کے غضب میں وہ بھی گرفتار ہو سکتے ہیں۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ
اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ (ھود آیت ۱۰۲)

اور آپ کے رب کی پکڑ ایسی ہی سخت ہے جب وہ کسی بستی والوں پر گرفت کرتا ہے جبکہ وہ ظلم و کفر کیا کرتے ہوں بلاشبہ اُس کی گرفت شدید دردناک ہے (یعنی ظالموں کو لمبی مہلت دی جاتی ہے جب کسی طرح باز نہیں آتے تو پکڑ کر گلا دبا دیا جاتا ہے۔)

(۶) بیت اللہ:۔

خانہ کعبہ اللہ کا گھر کہلاتا ہے اسکے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس گھر میں ساکن ہے یا

وہ گھر کا محتاج ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُس نے اپنی عبادت کی غرض سے سچے عبادت گزاروں کے لئے کعبہ کو مرکز اور جہت (سمت) قرار دیا ہے۔ یہ اس لئے کہ جب اللہ تعالےٰ جہات سے وراء الوراء اور پاک ہے اور انسان اپنے ہر کام میں جہات میں سے کسی جہت کا محتاج ہے تو اس لئے اللہ تعالےٰ نے بندگی خالص کے لئے ایک مرکز اور عمارت بنوائی تاکہ اہل توحید اپنی عبادت میں اللہ کی مقرر کردہ جہت کو اپنا مرکز بنائیں اور اُس طرف رُخ کرکے اُسکی عبادت کریں اور اللہ واحد کی عبادت کے لئے جہت واحد کو اپنا قبلہ تسلیم کریں۔ یہ مقدس عمارت اللہ کے خلیل ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے مقدس بیٹے اسماعیل علیہ السلام نے دنیا میں سب سے پہلے صرف اللہ واحد کی عبادت کے لئے تعمیر کیا تھا اور جو توحید کے اعلان کی سب سے پُرانی یادگار ہے۔

(۷) ابدی غیر فانی مرکز:-

ابرہہ مذہباً عیسائی تھا اس لئے وہ بیت اللہ (کعبہ) کی عظمت کو کسی طرح برداشت نہیں کرتا تھا اور اس کا وجود ایک کانٹے کی طرح اس کے دل میں کھٹک رہا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ خانہ کعبہ پتھروں اور مٹی کی سادہ عمارت ہے۔ اگر اسکے مقابلہ میں ایک ایسی خوبصورت اور بے نظیر عمارت بشکل کلیسا (گرجا) تیار کردی جائے جو بیش بہا قیمتی پتھروں اور جواہرات سے مزیّن ہو تو اس سے سارے عرب کی توجہ کعبہ سے ہٹا سکوں گا اور اس جدید معبد کو مرکز عالم بنا سکوں گا۔

یہ سوچ کر اُس نے یمن کے دار الحکومت صنعاء میں ایک بے نظیر گرجا (القُلیس) بنوایا۔ پھر ایک معمولی واقعہ کو حیلہ بناکر خانہ کعبہ کی بربادی کا تہیہ کرلیا۔

لیکن اُسکو یہ معلوم نہ تھا کہ توحید خالص کا یہ مرکز پتھر و مٹی کی عمارت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ سمت وجہت ہے جو ایک اللہ کی عبادت کے لئے مقرر کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی جابر وظالم کعبہ کی موجودہ عمارت کو تہس نہس کردے تب بھی مسلمانوں کا قبلہ وہی جہت برقرار رہے گا اور اُس کی عالمی ابدی مرکزیت میں کچھ بھی فرق نہیں آئے گا۔ چنانچہ علاماتِ قیامت والی احادیث میں یہ خبر بھی ملتی ہے کہ قُرب قیامت میں ایک حبشی غلام کعبہ کی عمارت کو ڈھادے گا۔

لیکن اسکے باوجود کعبہ بدستور کعبہ برقرار رہے گا۔

ادیانِ عالم میں صرف اور صرف اسلام کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کا قبلہ "ابدی غیر فانی" مرکزیت کا حامل ہے۔

ایک عارف نے اسی ابدی مرکزیت کی طرف اشارہ کیا ہے :۔

"قُبلہ کو اہل نظر قبلہ نُما کہتے ہیں"۔

تذکرہ
سیدنا عیسیٰ علیہ السلام
(کلمۃ اللہ)

تعارف حضرت عیسیٰ علیہ السلام جلیل القدر اور اولو العزم پیغمبروں میں سے ہیں اور جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و رسل کے خاتم ہیں۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام انبیاء بنی اسرائیل کے خاتم ہیں۔ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں جسقدر بھی نبی ہوئے ہیں اُن سب کے آخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

تمام اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیانی زمانے میں کوئی نبی اور رسول مبعوث نہیں ہوئے اور درمیان کا یہ زمانہ جسکی مدت تقریباً ۵۷۰ سال ہے زمانۂ فترۃ (انقطاعِ وحی کا زمانہ) کہلاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل پر کتاب تورات کے علاوہ "انجیل" سے زیادہ عظیم المرتبت دوسری کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی۔ نزولِ تورات کے بعد یہودیوں نے جو قسم قسم کی گمراہیاں دین حق میں ایجاد کرلی تھیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ کتاب تورات کی شرح بنکر بنی اسرائیل کو اِن گمراہیوں سے بچنے کی تعلیم دی۔ اس طرح اس کتاب نے تکمیلِ تورات کا فرض انجام دیا۔ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فراموش شدہ پیغامِ ہدایت حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی نے دوبارہ تازہ کیا۔

علاوہ ازیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سرورِ کائنات رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے مُنادی اور مُبشر بھی ہیں جیسا کہ قرآن حکیم نے انکشاف کیا ہے۔

قرآن حکیم نے جن مقدس ہستیوں کے واقعات سے بہت زیادہ بحث کی ہے انہیں ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں۔ قرآن حکیم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات

اور واقعات کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان کی حیاتِ طیّبہ کے سلسلے میں بطور دیباچہ اِن کی والدہ محترمہ سیّدہ مریم علیہا السلام کی واقعاتِ زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے تاکہ قرآن حکیم کا مقصد "تذکیر بایّام اللہ" پورا ہو۔ ان ہردوؑ کی حیات طیبہ دلیل، برہان، آیت، ہدایت، درس و نصیحت سب کچھ ہے۔

یہ ذکر پاک قرآن حکیم کی چودہ۱۴ سورتوں میں آیا ہے کہیں تفصیل کے ساتھ اور کہیں اختصار و اجمال کے ساتھ۔ ان میں کسی جگہ اسم مبارک "عیسیٰ" سے یاد کیا گیا ہے اور کہیں "مسیح" اور "عبد اللہ" کے لقب سے اور کسی مقام پر کنیت "ابن مریم" اور کہیں کلمۃ اور "روح" سے ذکر کیا گیا۔

قرآن حکیم کی وہ چودہ سورتیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ البقرہ ——— آیات ۸۷، ۱۳۶، ۲۵۳
۲۔ آل عمران ——— " ۴۲ تا ۶۴، ۸۴
۳۔ النساء ——— " ۱۵۶ تا ۱۵۹، ۱۷۱، ۱۷۲
۴۔ المائدہ ——— " ۱۷، ۴۶، ۷۲، ۷۵، ۷۸، ۱۱۰ تا ۱۲۰
۵۔ الانعام ——— آیت ۸۵
۶۔ التوبہ ——— آیات ۳۰، ۳۱
۷۔ مریم ——— ۱۶ تا ۳۵
۸۔ الانبیاء ——— آیت ۹۱
۹۔ المؤمنون ——— " ۵۰
۱۰۔ الاحزاب ——— " ۷
۱۱۔ الشوریٰ ——— " ۱۳
۱۲۔ الزخرف ——— آیات ۵۷، ۶۳
۱۳۔ الحدید ——— آیت ۲۷
۱۴۔ الصف ——— آیات ۶، ۱۴

مریم بنت عمران

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرے سے قبل حضرت سیّدہ

مریم کا ذکر اس لئے بھی ضروری ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ ہیں اور اسکے علاوہ ایک ایسی مقدس خاتون بھی ہیں جن کا تذکرہ قرآن حکیم نے مستقل طور پر کیا ہے۔

قوم بنی اسرائیل میں حضرت عمران ایک عابد وزاہد شخص تھے اور اُسی زہد وعبادت کی وجہ سے مسجد اقصیٰ میں نماز کی امامت بھی اِن ہی کے سپرد تھی۔ ان کی بیوی سیدہ حنہ بھی بہت ہی نیک اور پارسا خاتون تھیں۔ اپنی نیکی اور شرافت کی وجہ سے دونوں قوم میں بہت زیادہ احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

حضرت عِمران صاحبِ اولاد نہ تھے انکی بیوی حضرت حنّہ بہت زیادہ متمنی تھیں کہ اُن کے اولاد ہو اور اس کے لئے وہ ہمیشہ درگاہ الٰہی میں دست بدعا اور قبولیت دُعا کے لئے منتظر رہتی تھیں، کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت حنّہ اپنے مکان کے صحن میں چہلقدمی کر رہی تھیں دیکھا کہ ایک پرندہ اپنے بچّے کو بھرّا رہا ہے اور محبّت و پیار سے اس کو چوم رہا ہے۔ پیار و محبت کے اس منظر نے حضرت حنّہ کو بہت ہی متا ئثر کیا اولاد کی تمنّا نے دل کو مزید بیقرار کر دیا۔ حالتِ اضطراب میں دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ عرض کیا:-

"پروردگار اسی طرح مجھ کو بھی اولاد عطا کر جو ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنے"

بیقرار دل کی دُعا نے قبولیت کا جامہ پہنا اور حضرت حنّہ نے چند روز بعد محسوس کیا کہ وہ پُر اُمید ہیں۔ حضرت حنّہ کو اس احساس سے اس درجہ مسرّت ہوئی کہ اُنھوں نے نذر مان لی کہ جو بچہ پیدا ہوگا اُسکو ہیکل (مسجد اقصیٰ) کی خدمت کے لئے وقف کر دونگی۔[۱]

بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت عمران کی بیوی حضرت حنّہ کی دُعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور وہ مسرّت وشادمانی کے ساتھ اُمید بر آنے کی گھڑی کا انتظار کرنے لگیں۔

محمد بن اسحٰق اور حافظ ابن عساکر اور اکثر اہل علم کا اسپر اتفاق ہے کہ حضرت عمران حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ اسی طرح انکی بیوی حضرت حنّہ بھی حضرت داؤد علیہ السلام کی ذرّیت میں سے ہیں۔

ولادتِ مریم

حضرت حنّہ کی مدّتِ حمل جب پوری ہوگئی تو ولادت کا وقت آپہنچا

۱ بنی اسرائیل کے مذہبی رسوم میں یہ رسم بہت ہی مقدس سمجھی جاتی تھی کہ اپنی اولاد کو مقدس ہیکل کی خدمت کیلئے وقف کر دیا جائے۔

ولادت کے بعد حضرت حنہ کو اطلاع دی گئی کہ ان کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی ہے۔

جہاں تک اولاد کا تعلق ہے حضرت حنہ کے لئے یہ لڑکی بھی لڑکے سے کم نہ تھی مگر اُن کو شدت سے یہ احساس ہوا کہ میں نے جو نذر مانی تھی وہ پوری نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ لڑکی مسجد اقصےٰ کی خدمت کیوں کر انجام دے گی؟ یہ کام تو مرد ہی انجام دے سکتے ہیں۔

لیکن اللہ تعالےٰ نے بطور الہام یا ہاتف غیبی اُن کے افسوس کو مسرت سے یہ کہہ کر بدل دیا کہ ہم نے تیری لڑکی کو ہی قبول کر لیا ہے اور اسکی وجہ سے تیرا خاندان اور بھی معزز اور مبارک قرار پائے گا۔

حضرت حنہ نے لڑکی کا نام مریم رکھا اور دُعا کی کہ "اے پروردگار اسکو اور اسکی اولاد کو شیطان کے ہر فتنہ سے محفوظ فرما۔"

سُریانی زبان میں مریم کے معنی خادم کے ہیں۔ چونکہ یہ مسجد اقصےٰ کی خدمت کے لئے وقف کر دی گئی تھیں اس لئے یہ نام موزوں سمجھا گیا۔

بعض کہتے ہیں کہ مریم کے معنی "بلند" اور "عبادت گزار" کے ہیں۔

بشر بن اسحٰق کہتے ہیں کہ سیدہ حنہ ابھی حاملہ ہی تھیں کہ اُن کے شوہر حضرت عمران کا انتقال ہوگیا۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۳۶۴)

بعض دوسرے مؤرخین لکھتے ہیں کہ سیدہ مریم ابھی شیر خوار ہی تھیں کہ باپ کا انتقال ہوگیا۔

یتیم بچی مریم کی پرورش ماں نے بہت اچھے طریقے پر کی۔ اللہ تعالےٰ کا فضل و کرم بھی قدم قدم پر شاملِ حال رہا۔ جب وہ سنِ شعور کو پہنچیں اور نذر کے مطابق بیت المقدس کی عبادت گاہ (ہیکل) میں داخل کر دی گئیں تو یہ سوال پیدا ہوا کہ ہیکل کی یہ مقدس امانت کس کے سپرد کی جائے اور کون اس کا کفیل و نگراں ہو؟ ہیکل کے کاہنوں میں سے ایک نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس مقدس امانت کا کفیل مجھ کو بنایا جائے۔ ایک دوسرے کاہن نے کہا کہ اس امانت کو میرے حوالہ کیا جائے۔ بیت المقدس کے مقیمین اور عابدین میں حضرت زکریا علیہ السلام بھی تھے۔ انھوں نے بھی اس کا مطالبہ کیا اور وجہ ترجیح

یہ بیان کی کہ میری بیوی اِس لڑکی کی خالہ ہوتی ہیں اور خالہ بمنزلہٗ ماں کے ہوتی ہے اور ماں کے بعد خالہ ہی پرورش کی حقدار ہے۔ لہٰذا مجھکو اس بچی کا کفیل قرار دیا جائے۔ لیکن دوسرے مقدس کاہنوں نے اس دلیل کو قبول نہ کیا۔ آخر کار طے پایا کہ قرعہ اندازی کے ذریعہ اس کا فیصلہ کیا جائے۔ اُس زمانے میں قرعہ اندازی کو ایک سند و دلیل سمجھا جاتا تھا اور اُس کا ایک خاص طریقہ تھا جو اس وقت رائج تھا[1]۔ اُسی رواج کے مطابق ہر خواہشمند نے اپنے اپنے قلم دریا میں ڈالے مگر قرعہ کے مطابق ہر مرتبہ حضرت زکریا علیہ السلام کا ہی نام نکلا۔ بعض روایات کے مطابق یہ قرعہ اندازی تین مرتبہ کی گئی۔ مقدّس کاہنوں نے جب یہ معاملہ دیکھا تو سب نے یقین کر لیا کہ حضرت زکریا (علیہ السلام) کے ساتھ تائیدِ غیبی ہے۔ پھر سب نے دست برداری اختیار کر لی اور مقدس امانت (مریم) حضرت زکریا علیہ السلام کے سپُرد کر دی گئی۔ اس طرح سیدہ مریم کی پرورش اور نگرانی حضرت زکریا علیہ السّلام کے تحت ہو گئی۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے سیدہ مریم کے لئے مسجد کا ایک محراب (حجرہ) منتخب کیا اور اُس میں اُن کا قیام طے پایا۔ گزشتہ زمانے میں گرجاؤں اور کلیساؤں میں عبادت گاہ کی عمارت سے متصل سطح زمین سے کچھ بلندی پر حجُرے بنائے جاتے تھے جن میں عبادت گاہ کے منتظمین، خدّام اور معتکف حضرات رہا کرتے تھے انھیں محراب کہا جاتا تھا۔ اسی قسم کے کمروں میں سے ایک میں سیدہ مریم بھی معتکف تھیں۔ وہ تمام دن عبادت اور ذکر الٰہی میں مشغول رہتیں۔ رات کو حضرت زکریا علیہ السلام انھیں اپنے گھر لاتے اور وہ اپنی خالہ کے گھر رات بسر کرتیں۔ (روح المعانی، آل عمران)

---

[1] وہ اس طرح کہ بانس کے قلم جو تورات کے لکھنے میں کام آتے تھے ان پر تورات ہی کے چند کلمات لکھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا تھا۔ قلم عموماً دریا ہی کے رُخ بہنے لگتے۔ لیکن بعض قلم دریا کے مخالف رُخ کو بہتے اور رہی مخالف رُخ کامیابی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

ہیکل (مسجد اقصیٰ) کی تاریخ میں یہ ایک نئی بات تھی کہ کسی لڑکی کو مسجد کی خدمت کے لئے منتخب کر لیا گیا ہو۔

مسیحی روایات کے مطابق سیدہ مریم تین سال کی عمر میں ہیکل کی خادمہ کی حیثیت سے داخل ہوئیں جہاں عبادت گاہ کے چھوٹے بڑے سب خادم اس کمسن بچی کو دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ حضرت زکریا علیہ السلام ویسے بھی ہیکل کے افسر اعلیٰ تھے۔ اس لحاظ سے ہر خادم کی نگرانی کرنا اُن کے فرائض میں شامل تھا اور پھر سیدہ مریم کے تو آپ عزیز قریب اور قابل اعتماد سرپرست بھی تھے۔ اِن کے حجرے میں قدرتاً آپکی آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ قرآن حکیم کا ایک لفظ "کُلَّمَا دَخَلَ" اس سارے مفہوم کو ادا کرتا ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام جب بھی حجرۂ مریم میں آتے وہاں قسم قسم کے پھل میوے رکھے ہوئے دیکھتے بلکہ بعض تو پھل ایسے ہوتے کہ جن کا ان دنوں موسم بھی نہ ہوتا تھا۔ تعجب سے پوچھتے اے مریمؑ یہ "رزق" کہاں سے آیا ہے؟

سیدہ مریمؑ جواب دیتیں کہ یہ اللہ کی جانب سے آجاتا ہے۔ بیشک اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دے دیتا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو اپنے گھر سے سیدہ مریم کیلئے کھانے پینے کی چیزیں لانے کی نوبت نہیں آتی تھی۔

الغرض سیدہ مریمؑ شب و روز عبادت الٰہی میں رہتیں اور جب ہیکل کی خدمت کا وقت آتا تو اسکو بھی بخوبی انجام دیتی تھیں حتیٰ کہ اُن کا زہد و تقویٰ بنی اسرائیل میں ضرب المثل ہوگیا اور آپکی زہد و عبادت کی مثالیں دی جانے لگیں، حضرت زکریا علیہ السلام بھی ان کے تقویٰ و طہارت سے بیحد متاثر تھے کہ اللہ تعالےٰ نے اس یتیم لڑکی کی عظمت و جلالتِ قدر کو بہت بلند کیا ہے۔

سیدہ مریمؑ کا یہ مقام اور شب و روز تائید الٰہی دیکھ کر حضرت زکریا علیہ السلام کے قلب میں اسی طرح نیک و صالح اولاد کی تمنا پیدا ہوئی ابھی تک یہ لاولد تھے۔ سیدہ مریمؑ کے پاس بے موسم پھل آتے دیکھ کر یہ احساس شدید تر ہوگیا کہ یہ مقام مبارک اور نزولِ رحمت کا ہے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے:-

پروردگار مجھے بھی اپنی عنایت سے اُسی طرح دے جیسے کہ

تو بے موسم تر و تازہ میوے مریمؑ کو عطا کرتا ہے۔"

حضرت زکریا علیہ السلام کی یہ دُعا ایسے وقت ہوئی جبکہ وہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں تھے اور بیوی محترمہ بانجھ تھیں۔ اللہ تعالےٰ نے بے موسم میوؤں کی طرح حضرت زکریا علیہ السلام کو فرشتوں کے ذریعہ یہ بشارت سُنائی کہ عنقریب تمہیں بھی ایک لڑکا ہوگا جو بلند مرتبہ نبیوں میں شامل ہوگا۔ چنانچہ حضرت یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے (تفصیل تذکرہ سیدنا زکریا و یحییٰ علیہما السلام میں آچکی ہے)

سیدہ مریم چونکہ نہایت عابدہ وزاہدہ اور تقویٰ وطہارت میں ضرب المثل تھیں اور جبکہ عنقریب اُن کو ایک جلیل القدر نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہونے والا تھا تو منجانب اللہ اُن کی تقدیس وتطہیر (آیت تطہیر) کا یہ اعلان فرشتوں کے ذریعہ اُنھیں پہنچایا گیا:۔

اے مریم بیشک آپ کو اللہ نے پسند کرلیا ہے اور پاک کردیا ہے اور آپ کو دنیا جہان کی عورتوں کے مقابلہ میں منتخب (مقبول) کیا ہے۔
اے مریم اپنے پروردگار کی (اسی طرح) اطاعت کرتی رہیئے
اور سجدہ کرتی رہیئے اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہیے۔ (آل عمران آیت ۴۲)

عمران کی بیوی سیدہ حنّہ (والدہ مریم) کا تذکرہ، سیدہ مریم کی ولادت، اُن کی پرورش، ہیکل کی خدمت، حضرت زکریا علیہ السلام کی کفالت، حضرت مریم کی ز[illegible]بادت اور اللہ تع[illegible] کی خصوصی عنایت وکرم کا یہ تذکرہ قرآن حکیم کی آیاتِ ذیل میں اسطرح بیان کیا گیا ہے:۔

قرآنی مضمون

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ۔ الخ

(آل عمران آیات ۳۳ تا ۳۸)

بے شک اللہ نے پسند کیا ہے آدمؑ اور نوحؑ اور خاندانِ ابراہیمؑ اور خاندانِ عمران کو سارے دُنیا جہان سے۔
یہ ایک سلسلہ کے لوگ تھے جو ایک دوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے تھے اور اللہ سمیع وعلیم ہے۔

(اللہ تعالیٰ اس وقت سُن رہا تھا) جب عمران کی بیوی نے عرض کیا اے میرے پروردگار میں نے تیری نذر مانی ہے اس بچّہ کی جو میرے پیٹ میں ہے کہ وہ آزاد رکھا جائے گا (یعنی تیری ہی خدمت وعبادت کے لئے وقف رہے گا) سو تو مجھ سے یہ قبول کرلے بیشک تو خوب سننے والا ہے خوب جاننے والا ہے۔ (یعنی میری دُعاؤں کا سننے والا اور میرے اخلاص کا جاننے والا ہے۔)

پھر اُس نے جب (مریم کو) جنا تو بولی کہ اے میرے پروردگار میں نے تو لڑکی جنی ہے (اور لڑکی کس طرح تیرے گھر کی خدمت کرسکے گی؟) اور اللہ تو خوب جانتا تھا کہ اُس نے کیا جنا ہے (یعنی اس مولود سے جو عظمتیں وابستہ تھیں اُن کی خبر بیچاری ماں کو کیا ہوسکتی تھی اِن سے تو بس اللہ ہی خوب واقف تھا) اور لڑکا (اس) لڑکی جیسا نہیں ہوسکتا تھا (یعنی اللہ اس سے خوب واقف تھا)

اور (اے رب) میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اُسے اور اُسکی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں (کہ خدمتِ دین میں وہ کسی طرح بھی منحرف نہ ہونے پائے)

پھر اُس کے پروردگار نے اسکو بخوشی قبول کرلیا (یعنی خدمتِ ہیکل کی ساری تاریخ میں یہ ایک نئی بات تھی)

اور اس لڑکی کو اچھا نشوونما دیا اور اُس کا سرپرست زکریاؑ کو بنایا (یعنی جسمانی واخلاقی وروحانی اعتبار سے مریم کا اچھا نشوونما ہوا) جب کبھی زکریاؑ ان کے پاس حجرے میں آتے تو ان کے پاس کوئی چیز کھانے پینے کی پاتے (اور اس پر وہ قدرۃً حیرت کرتے اور ایک بار) بولے اے مریم یہ کہاں سے تجھے مل جاتی ہیں؟ وہ بولیں یہ اللہ کی طرف سے آجاتی ہیں بیشک اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

(بس) وہیں زکریاؑ اپنے پروردگار سے دُعا کرنے لگے عرض کیا اے میرے پروردگار مجھے اپنے پاس سے کوئی پاکیزہ اولاد عطا کر

(جو میرے کارِ نبوت کو آگے چلا سکے) بیشک تو دُعا کا بڑا سننے والا ہے (یعنی بڑا قبول کرنے والا ہے)

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَٰئِكَةُ يَٰمَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَٰكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَٰلَمِينَ. الخ (آل عمران آیات ۴۲ تا ۴۴)

اور وہ وقت یاد کرو جب فرشتوں نے کہا اے مریم بیشک آپ کو اللہ نے پسند کر لیا ہے اور پاک کر دیا ہے اور آپ کو دنیا جہان کی عورتوں کے مقابلہ میں منتخب کر لیا ہے۔

اے مریمؑ اپنے پروردگار کی اطاعت کرتی رہو اور سجدہ کرتی رہو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہو۔

یہ (واقعات) غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم آپؐ کے اوپر وحی کر رہے ہیں اور آپ تو (اے نبیؐ) اُن لوگوں کے پاس تھے نہیں جب کہ وہ لوگ اپنے قلم (قرعہ کے لئے دریا میں) ڈال رہے تھے کہ اُن میں سے کون مریمؑ کی سرپرستی کرے؟ اور نہ آپؐ اُن کے پاس اُس وقت تھے جب وہ باہم اختلاف کر رہے تھے۔ (یعنی یہ سب باتیں آپکو وحی الٰہی سے بتلائی جا رہی ہیں)

بشارتِ مسیحؑ

انبیاء و رسل کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ اُولوالعزم انبیاء کی پیدائش سے قبل بشارتیں، الہام، غیبی اشارے ظاھر ہوئے ہیں اور بعض دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ انبیاء سابقین اپنی وفات سے پہلے آنے والے نبی و رسول کی بشارت و خبر دے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت موسیٰؑ و یحییٰؑ و عیسیٰ علیہم السلام کے اسماء گرامی لئے جا سکتے ہیں جنھوں نے اپنی حیاتِ طیبہ ہی میں اپنے بعد آنے والے اُولوالعزم نبیوں کی بشارت دے گئے ہیں۔ یہ اس لئے بھی کہ اُن کی آمد سے پہلے دعوتِ حق کے لئے زمین ہموار رہے اور انسانیت کیلئے زیادہ سے زیادہ ہدایت فراہم ہو سکے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اُن چند اولوالعزم مقدس رسولوں میں سے ایک ہیں اور اسی بنار پر انبیار بنی اسرائیل میں سے متعدد انبیار کرام انکی بعثت سے قبل بشارت سناتے رہے ہیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن حکیم نے خاص طور پر یہ صراحت کی ہے کہ وہ "مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللهِ" یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرنے والے تھے۔

(آل عمران آیت ۳۹)

"عابدہ و زاہدہ پاک مریم اپنے خلوت کدہ میں مشغول عبادت رہتی اور ضروری حاجات کے علاوہ باہر نہ نکلتی تھیں، ایک مرتبہ مسجد اقصیٰ (ہیکل) کے مشرقی جانب لوگوں کی نگاہ سے دور ایک گوشہ میں مشغول عبادت تھیں کہ اچانک اللہ کا فرشتہ (جبرئیلؑ) انسانی شکل میں ظاہر ہوا۔ سیدہ مریمؑ نے ایک اجنبی آدمی کو اس طرح خلوت کدہ میں اچانک آتے دیکھا تو گھبرا گئیں اور کہنے لگیں اگر تجھ کو ذرا بھی اللہ کا خوف ہے تو میں تجھ کو اللہ رحمٰن کا واسطہ دے کر تجھ سے پناہ چاہتی ہوں۔ فرشتے نے کہا مریم! خوف نہ کھا میں انسان نہیں بلکہ اللہ کا فرستادہ فرشتہ ہوں اور تجھکو بیٹے کی بشارت دینے آیا ہوں"۔

سیدہ مریم نے جب یہ سنا تو انتہائی تعجب سے کہنے لگیں، میرے لڑکا کیسے ہوگا جبکہ آج تک مجھے کسی بھی شخص نے ہاتھ نہیں لگایا، اس لئے کہ میں نے نہ تو نکاح کیا ہے اور نہ میں کوئی بدکار ہوں۔

فرشتے نے جواب دیا میں تو تیرے رب کا قاصد ہوں اُس نے مجھے اسی طرح کہا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ تجھ کو اور تیرے لڑکے کو کائنات کے لئے اپنی قدرت کا "نشان" بنادوں گا اور لڑکا میری جانب سے "رَحْمَۃً" ثابت ہوگا اور میرا یہ فیصلہ اٹل ہے۔

اے مریمؑ! اللہ تعالیٰ تجھ کو ایک ایسے لڑکے کی بشارت دیتا ہے جو اُس کا "کَلِمَۃ" ہوگا اسکا لقب "مسیح" اور اس کا نام "عیسیٰ" ہوگا اور وہ دنیا و آخرت دونوں میں عظمت والا اور باوجاہت ہوگا۔ اور وہ

"مُقربین" میں سے ہوگا اور وہ اللہ کے نشان کے طور پر شیر خوارگی کے زمانے
میں لوگوں سے باتیں کرے گا اور بڑھاپے (کا ابتدائی دور) بھی پائے گا۔
اللہ تعالیٰ کا قانون قدرت ہے کہ جب وہ کسی شئ کو وجود میں لانا چاہتا
ہے تو اس کا محض یہ ارادہ اور حکم کہ "ہوجا" اُس شئ کو عدم سے وجود میں
کردیتا ہے۔ لہٰذا اے مریم! یہ یوں ہی ہوکر رہے گا اور اللہ تعالیٰ اسکو
اپنی کتاب عطا کرے گا، اسکو حکمت سکھائے گا اور اسکو بنی اسرائیل
کی رُشد و ہدایت کے لئے رسول اور اُولوالعزم پیغمبر بنائے گا"

قرآن حکیم نے ان واقعات کو معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ سورۂ آل عمران اور سورہ مریم میں اس طرح ذکر کیا ہے :-

قرآنی مضمون اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ الخ

(آل عمران آیات ۴۵ تا ۴۹)

(اور وہ وقت یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ آپکو
خوشخبری دے رہا ہے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی۔ ان کا نام (ولقب) مسیح
عیسیٰ ابن مریم ہوگا دُنیا اور آخرت دونوں میں معزز مقربوں میں سے ہوگا۔
اور وہ لوگوں سے گفتگو کرے گا گہوارہ میں بھی اور پختہ عمر میں بھی اور
صالحین میں سے ہوگا۔

وہ بولیں اے میرے پروردگار میرے لڑکا کس طرح ہوگا
جبکہ مجھے کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے؟

ارشاد ہوا ایسے ہی اللہ پیدا کردیتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے،
جب وہ کسی بات کو پورا کرنا چاہتا ہے تو بس اس سے کہتا ہے ہوجا سو
وہ چیز ہوجاتی ہے۔ (خواہ اسباب کے واسطے سے ہو یا بلا کسی سبب)
اور اللہ اُسے کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل سکھادے گا۔
اور وہ پیغمبر ہوگا بنی اسرائیل کے لئے (جیساکہ ہر پیغمبر اپنی

اپنی قوم کی جانب مبعوث ہوتا رہا ہے)

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا الخ (مریم آیات ۱۶ تا ۲۱)

اور (اے نبیؐ) اس کتاب میں مریمؑ کا حال بیان کرو جبکہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہوکر شرقی جانب گوشہ نشین ہوگئی تھی۔

پھر اُس نے ان لوگوں کی طرف سے پردہ کرلیا۔ پس ہم نے اُس کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا اور وہ ایک انسان کامل کی شکل میں نمودار ہوا۔

(مریم اُسے دیکھ کر گھبرا گئی) بولی اگر تو کوئی خدا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے اللہ رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔

اُس نے کہا میں تو تیرے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔ مریم نے کہا میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں ہے اور نہ میں کوئی بدکار عورت ہوں۔

فرشتے نے کہا ایسا ہی ہوگا تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے بہت آسان ہے اور ہم یہ اس لئے کریں گے کہ اُس لڑکے کو لوگوں کے لئے ایک نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے ایک رحمتِ خاص، اور یہ ایسی بات ہے جس کا پورا ہونا طے شدہ ہے۔

ولادتِ مسیحؑ جبرئیل امین نے سیدہ مریمؑ کو یہ بشارت سُنا کر اُن کے گریبان میں پھونک دیا۔ اس طرح اللہ کا حکم اُن تک پہنچ گیا۔ پھر سیدہ مریم نے کچھ عرصہ بعد خود کو حاملہ محسوس کیا تو بہ تقاضۂ بشری اُن پر ایک اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی اور دن بدن اُن کا یہ اضطراب بڑھتا چلا گیا اور اس کیفیت نے اُس وقت شدید صورت اختیار کرلی جب اُنھوں نے دیکھا کہ مدتِ حمل ختم ہوکر ولادت کا وقت قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر یہ بات قوم کے اندر رہ کر پیش آئی اور چونکہ قوم حقیقتِ حال سے واقف نہیں اس لئے معلوم نہیں کہ وہ کس کس طرح بدنام اور بہتان طرازیوں سے پریشان کرے گی۔

اس لئے اب اس مقام سے کہیں دُور چلے جانا چاہیئے اور اسکے لئے وہ بیت المقدس سے تقریباً نو میل کوہِ سَراۃ کے ایک ٹیلے پر چلی گئیں جو آج "بیت اللحم" کے نام سے مشہور ہے۔

سیدہ مریم کا اپنے اعتکاف گاہ سے نکل کر وہاں جانا ایک فطری امر تھا، بنی اسرائیل کے مقدس ترین خاندان بنی ہارون کی لڑکی اور پھر وہ جو بیت المقدس میں اللہ کی عبادت کے لئے وقف ہوکر بیٹھی تھی یکایک حاملہ ہوگئی۔ اس حالت میں اگر وہ اپنی جائے اعتکاف پر بیٹھی رہتیں اور ان کا حمل لوگوں پر ظاہر ہوجاتا تو خاندان والے ہی نہیں قوم کے دوسرے لوگ بھی اِن کا جینا مشکل کر دیتے اس لئے پاک مریم اس شدید آزمائش میں مبتلا ہونے کے بعد خاموشی کے ساتھ اپنے اعتکاف کا حجرہ چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئیں تاکہ جب تک اللہ کی مرضی پوری ہو قوم کی لعنت اور عام بد نامی سے تو بچی رہیں۔ "بیت اللحم" پہنچ کر چند گھنٹوں بعد دردِ زہ شروع ہوا تو تکلیف اور اضطراب کی حالت میں کھجور کے ایک درخت کے نیچے تنے کے سہارے بیٹھ گئیں اور پیش آنے والے نازک حالات کا اندازہ کر کے انتہائی قلق اور بے چینی میں کہنے لگیں کاش کہ میں اس سے پہلے مرچکی ہوتی اور میرا نام ونشان بھی گم ہوجاتا۔

سیدہ مریم کی زبان سے یہ الفاظ دردِ زہ کی تکلیف کے علاوہ اُس گہری فکر کی وجہ سے بھی ظاہر ہوئے کہ اللہ تعالے نے جس آزمائش میں اُنھیں ڈالا ہے اس سے وہ کس طرح بخیریت عہدہ برآ ہوں گی؟ حمل تو اب تک کسی نہ کسی طرح چُھپالیا اب اس بچے کو کہاں لیجائے اور کس طرح لوگوں کو یقین دلائے؟

حقیقت یہ ہے کہ اگر سیدہ مریم شادی شدہ لڑکی ہوتیں تو کوئی بات نہ تھی کیونکہ شادی شدہ لڑکی کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہورہا ہو تو وہ چاہے تکلیف سے کتنی ہی تڑپے اور بے چین ہولیکن اُسے رنج وغم کبھی لاحق نہیں ہوا کرتا کیونکہ ولادت ایک خوشی کا پیام بھی ہوتی ہے۔

اسی کرب وبیقراری میں نخلستان کے نشیب سے اللہ کے وہی فرشتے نے پھر آواز دی، مریمؑ غمگین نہ ہو تیرے پروردگار نے تیرے لئے پانی کا چشمہ جاری کر دیا ہے اور کھجور کا تنہ پکڑ کر اپنی جانب حرکت دے تو پکے اور تازہ کھجور تجھ پر گرنے لگیں گے پس تو کھا پی اور اپنے بچے کے نظارے سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر اور رنج وغم کو بھول جا۔

سیدہ مریمؑ چونکہ اس سے پہلے اس فرشتے کو دیکھ چکی تھیں اور اسکی آواز سے بھی

مانوس تھیں فوری سمجھ گئیں کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو چند ماہ پہلے خلوت کدہ میں اچانک آکر خوشخبری دے گیا تھا۔

فرشتے کی اس تسلّی اور پاکیزہ بچّے کی حسین وجمیل صورت نے کچھ دیر کیلئے رنج وغم اور تنہائی کے احساس کو دُور کر دیا، بچّے کو گود میں لیا اور اللہ کی نازل شدہ نعمت کھجور اور پانی استعمال کیا۔ بچّے کو لیکر ایک محفوظ جگہ آبیٹھیں، قدرے سکون ہوا تاہم یہ خیال ضرور کھٹکتا رہا اگرچہ اہل خاندان کو میری عصمت و پاکدامنی کا یقین ہے لیکن اُن کی اس حیرت کو کس طرح دُور کیا جا سکے گا کہ بن باپ کے کس طرح بچّہ پیدا ہو سکتا ہے ؟

مگر جس اللہ برتر نے اُن کو یہ بزرگی اور برتری بخشی وہ پاک مریم کو اس بے چینی میں کیوں بتلا رہنے دیتا ؟ اُس نے پھر فرشتے کے ذریعہ سیدہ مریمؑ کے پاس پیغام بھیجا کہ اے مریم جب تو اپنی قوم میں پہنچے اور وہ لوگ تجھ سے اِس معاملہ کے متعلق سوالات کریں تو خود جواب نہ دینا بلکہ اشارہ سے اُن کو بتانا کہ میں روزہ ہوں اور آج کسی سے بات نہیں کر سکتی تم کو جو کچھ دریافت کرنا ہو اس بچّے سے دریافت کرلو۔

سیّدہ مریم وحی الٰہی کے اِن پیغامات پر مطمئن ہوکر بچّہ گود میں لئے بیت المقدس کو روانہ ہوگئیں۔ جب شہر میں پہنچیں اور لوگوں نے اس حالت میں دیکھا تو چہار جانب سے اُنھیں گھیر لیا اور کہنے لگے، مریم یہ کیا ہوا؟ تو نے تو عجیب بات کر دکھائی اور بڑی تہمت کا کام کر گزری ہے۔ اے ہارون کی بہن[1]! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی بدچلن تھی پھر تو یہ کیا کر بیٹھی ؟

سیدہ مریمؑ نے اللہ کی ہدایات کی تعمیل کرتے ہوئے بچّے کی جانب اشارہ کیا کہ جو کچھ دریافت کرنا ہو اس سے معلوم کرلیں۔ میں تو آج روزہ ہوں (بنی اسرائیل کے ہاں روزے میں خاموشی بھی داخل عبادت تھی)

لوگوں نے یہ دیکھ کر انتہائی تعجب سے کہا۔ ہم اس بچے سے کیا بات کر سکتے ہیں جو گہوارے میں پڑا ہوا ہے؟ مگر بچّہ فوراً بول اُٹھا، میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے (اپنے فیصلۂ تقدیر میں) مجھ کو کتاب (انجیل) دی ہے اور نبی بنایا ہے اور اُس نے مجھے مبارک بنایا خواہ میں کسی حال میں اور کسی بھی جگہ ہوں اور اُس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں یہی میرا شعار ہوگا اور اُس نے مجھکو اپنی ماں کا خدمتگذار بنایا ہی

[1] یعنی اے خاندان ہارون کی چشم وچراغ۔

خود سر اور نافرمان نہیں بنایا اور اُس کی جانب سے مجھ کو سلامتی کا پیغام ہے جس دن کہ میں پیدا ہوا اور جس دن کہ میں وفات پاؤں گا اور جس دن پھر زندہ اُٹھایا جاؤں گا۔

پھر آگے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

"یہ ہے عیسیٰ (علیہ السلام) مریم کا بیٹا، وہ سچی بات جسمیں آج لوگ شک کر رہے ہیں اللہ کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے وہ اس سے پاک ہے۔ البتہ جب وہ کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو کہتا ہے ہو جا اور بس وہ ہو جاتی ہے۔"

یہاں جو بات واضح کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں "ابن اللہ" ہونے کا جو عقیدہ اختیار کر لیا ہے وہ باطل ہے۔ جس طرح ایک معجزے سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش نے اُن کو اللہ تعالےٰ کا بیٹا نہیں بنا دیا اُسی طرح ایک دوسرے معجزے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بھی ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کی بنا پر اُنھیں اللہ کا بیٹا قرار دیا جائے۔

یہ عیسائیوں کا غُلو ہے کہ وہ ایک معجزے سے پیدا ہونے والے حضرت یحییٰؑ کو اللہ کا بندہ کہتے ہیں (جیسا کہ ان کا عقیدہ ہے) اور دوسرے معجزے سے پیدا ہونے والے (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو اللہ کا بیٹا بنا بیٹھے ہیں۔

اس لئے اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ عیسیٰ ہمارے کلمۂ کُن سے پیدا ہوئے ہیں۔

اللہ تعالےٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور اُسکی تفصیلات کو سورۂ انبیاء، سورۂ تحریم، سورہ مریم میں اس طرح بیان کیا ہے:-

قرآنی مضمون

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ (الانبیاء آیت ۹۱)

اور اُس عورت (مریم) کا معاملہ جس نے اپنی پاکدامنی کو قائم رکھا، پھر ہم نے اُس میں اپنی روح (حکم) کو پھونک دیا اور اُس کو اور اُسکے بیٹے (عیسیٰ) کو تمام جہاں والوں کے لئے "نشان" ٹھہرایا۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا

فِيهِ مِن رُّوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ۔ (تحریم آیت ۱۲)

اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی عصمت و پاکدامنی کو محفوظ رکھا پس ہم نے اُس میں اپنی طرف سے روح پھونک دی اور اُس نے اپنے رب کے ارشادات اور اُس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزار لوگوں میں سے تھی۔

فَحَمَلَتْهُ فَانتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا الخ (مریم آیات ۲۲ تا ۲۸)

پھر اُس ہونے والے فرزند کا حمل ٹھیر گیا۔ وہ (اپنی حالت چھپانے کے لئے) لوگوں سے الگ ہوکر دور چلی گئی۔ پھر اسکو دردِزہ (کا اضطراب) کھجور کے ایک درخت کے نیچے لے گیا (اور وہ اسکے تنہ کے سہارے بیٹھ گئی) اُس نے کہا کاش میں اس سے پہلے مرچکی ہوتی اور مجھکو لوگ یک قلم بھول گئے ہوتے۔

اس وقت (ایک پکارنے والے فرشتے نے) اُسے نشیب سے پکارا، غمگین نہ ہو تیرے پروردگار نے تیرے تلے چشمہ جاری کر دیا ہے اور کھجور کے درخت کا تنہ پکڑ کر اپنی جانب ہلا، تازہ اور پکے پھل کے خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے۔ کھاپی (اور اپنے بچہ کے نظارے سے) اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر، پھر اگر کوئی آدمی نظر آئے (اور کچھ پوچھ کچھ کرنے لگے) تو (اشارہ سے) کہدے میں نے اللہ رحمٰن کے حضور روزہ کی منت مان رکھی ہے۔ میں آج کسی آدمی سے بات چیت نہیں کرسکتی۔

پھر ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کو ساتھ لے کر اپنی قوم کے پاس آئی لڑکا اُسکی گود میں تھا، لوگ دیکھتے ہی بول اُٹھے اے مریم تونے عجیب بات کر دکھائی اور بڑی تہمت کا کام کر گزری، اے ہارون کی بہن (کہتے ہیں کہ ہارون مریم کے خاندان میں ایک عابد و زاہد اور بہت ہی نیک نفس مشہور آدمی تھے (تفسیر ابن کثیر) نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا نہ تیری ماں بدچلن تھی (تو یہ کیا کر بیٹھی)

اس بات پر مریم نے لڑکے کی طرف اشارہ کر دیا (کہ یہ تمہیں بتا دیگا کہ حقیقت کیا ہے)

لوگوں نے کہا بھلا ہم اس سے کیا بات کریں جو ابھی گہوارے کا شیر خوار بچہ ہے۔ مگر لڑکا بول اُٹھا میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اُس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا اُس نے مجھے بابرکت کیا خواہ میں کسی جگہ رہوں۔ اُس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا جبتک زندہ رہوں (یعنی مستقبل کی ایک پیشگوئی تھی) اُس نے مجھے اپنی ماں کا خدمت گزار بنایا اور اُس نے مجھکو سرکش بدبخت نہیں بنایا، اور مجھ پر (اللہ کی جانب سے) سلام ہے جس روز میں پیدا ہوا اور جس روز میں مروں گا اور جس روز میں (قیامت میں) زندہ کرکے اُٹھایا جاؤں گا۔ یہ ہیں عیسیٰ ابن مریم، میں (بالکل) سچی بات کہہ رہا ہوں جسمیں یہ (افراط وتفریط کرنے والے) جھگڑ رہے ہیں۔

اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنی اولاد بنائے، وہ بالکل پاک ہے (کیونکہ اُسکی یہ شان ہے کہ) وہ جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو بس اسکو اتنا فرما دیتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جاتا ہے۔

بیشک اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے صرف اُسی کی عبادت کرو اور یہی سیدھا راستہ ہے۔

مگر پھر مختلف گروہ باہم اختلاف کرنے لگے سو جن لوگوں نے کفر کیا اُن کے لئے وہ وقت بڑی تباہی کا ہوگا جبکہ وہ ایک بڑا دن دیکھینگے جب وہ ہمارے سامنے حاضر ہوں گے اس روز تو اُن کے کان بھی خوب سن رہے ہوں گے اور آنکھیں بھی خوب دیکھتی ہوں گی مگر آج یہ ظالم کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔

اور آپ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اِن لوگوں کو حسرت کے دن سے ڈرائیے جبکہ اخیر فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اور وہ لوگ غفلت میں ہیں اور وہ ایمان نہیں لاتے۔

بیشک تمام زمین اور اسکے رہنے والوں کے ہم ہی وارث

رہ جائیں گے اور یہ سب ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے۔ (انتہی)

بہرحال لوگوں نے ایک شیرخوار بچے کی زبان سے جب یہ حکیمانہ کلام سُنا تو حیرت میں رہ گئے اور ان کو یقین ہو گیا کہ سیدہ مریم علیہا السلام کا دامن ہر قسم کی بُرائی اور تہمت سے پاک ہے اور اس بچہ کی پیدائش کا معاملہ یقیناً اللہ تعالےٰ کی ایک "عظیم نشانی" ہے۔ یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ پوشیدہ رہجاتی قریب و بعید سب جگہ اس حیرت زدہ واقعہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ ولادت کے چرچے ہونے لگے۔

ایک اسرائیلی روایت

قرآن حکیم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بچپن کے حالات میں سے صرف اسی اہم واقعہ (گہوارے میں کلام) کا ذکر کیا ہے باقی بچپن کے دوسرے واقعات جن کا ذکر قرآن حکیم کے مقصدِ تذکیر و موعظت سے تعلق نہیں رکھتے نظرانداز کر دیا ہے لیکن اسرائیلیات کے مشہور ناقل حضرت وہب بن مُنَبِّہ سے جو واقعات منقول ہیں اور انجیل میں بھی جن کا ذکر موجود ہے ان میں سے یہ واقعہ بھی ہے کہ:۔

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو اُسی شب ملکِ فارس کے بادشاہ نے آسمان پر ایک نیا ستارہ روشن دیکھا، بادشاہ نے درباری نجومیوں سے اسکے متعلق دریافت کیا تو اُن لوگوں نے بتایا کہ اس ستارے کا طلوع ہونا کسی عظیم الشان ہستی کی پیدائش کی خبر دیتا ہے اور یہ ملک شام کی جانب معلوم ہوتا ہے۔ اسپر بادشاہ نے خوشبوؤں کے عمدہ تحفے تحائف دیکر ایک وفد کو ملک شام روانہ کیا کہ وہ اُس بچہ کی ولادت کے متعلق حالات و واقعات معلوم کریں۔ وفد جب ملک شام پہنچا اور اُس نے وہاں کے یہودیوں سے دریافت کیا کہ ہم کو اُس بچہ کی ولادت کا حال سناؤ جو مستقبل قریب میں روحانیت کا بادشاہ ہوگا۔

یہود نے اہل فارس کی زبان سے یہ کلمات سنے تو اپنے بادشاہ ہیرودیس کو خبر کی۔ بادشاہ نے وفد کو دربار میں طلب کیا اور انکی زبانی واقعہ سن کر بہت گھبرایا اور پھر وفد کو اجازت دی کہ وہ اس بچہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کریں۔ پارسیوں کا یہ وفد بیت المقدس پہنچا اور جب اُس لڑکے مسیح کو دیکھا تو اپنے رسم ورواج کے مطابق انکو سجدۂ تعظیم کیا اور پھر مختلف قسم کی خوشبوئیں اُن پر نثار کیں اور چند روز وہاں قیام کیا، دوران قیام وفد کے بعض آدمیوں نے خواب دیکھا کہ ملک شام کا یہودی بادشاہ ہیرودیس اس بچہ کا دشمن ہوگیا ہے اور یہ کہ وفد کی فوری واپسی ضروری ہے صبح کو وفد نے واپسی کا ارادہ کرتے ہوئے سیدہ مریم علیہا السلام کو اپنا خواب سُنایا اور بتایا کہ بادشاہ کی نیت خراب ہوچکی ہے اور وہ اس مقدس بچہ کا دشمن ہے اس لئے مناسب ہے کہ تم اسکو ایسی جگہ لیجا کر رکھو جو اُس یہودی بادشاہ کی دسترس سے باہر ہو، اس مشورہ کے بعد سیدہ مریم ؑ نے اپنے بچے عیسیٰ کو اپنے بعض عزیزوں کے پاس ملک مصر لے گئیں اور وہاں سے شہر ناصرہ چلی گئیں جو ان کا آبائی وطن ہے اور جب حضرت عیسیٰ کی عمر مبارک تیرہ سال ہوئی تو اُن کو لیکر دوبارہ بیت المقدس آگئیں۔

یہی روایات یہ بھی ظاہر کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے بچپن کے واقعات اور حالات زندگی بھی غیر معمولی تھے اور اُن سے طرح طرح کی کرامات کا صدور ہوتا رہتا تھا۔ واللہ اعلم۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۲ صـ)

حضرت مریم بنت عمران بن ماثان والدۂ مسیح قوم بنی اسرائیل کے ایک معزز خاندان سے تھیں سالِ وفات مسیحی روایات کے مطابق ۶۳ئہ ہے۔ (تفسیر ماجدی ج ۱)

اعلانِ رسالت

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل بنی اسرائیل ہر قسم کی بُرائیوں میں مُبتلا تھے، انفرادی اور اجتماعی عیوب و نقائص کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو ان میں موجود نہ ہو۔ بُرے اعمال کے ساتھ اعتقادی گمراہیوں کا مرکز

بن گئے تھے۔ حتیٰ کہ دین بیزاری کا مرض یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ اپنے ہی قوم کے ہادیوں اور پیغمبروں کے قتل پر جری اور دلیر ہو گئے تھے۔ یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس نے حضرت یحییٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر کو محض اپنی محبوبہ کے اشارہ پر قتل کروا دیا تھا۔ اس کا یہ سفاکانہ اقدام صرف نیکی کی دعوت دینے اور بُرائی سے منع کرنے کے سلسلے میں ہوا تھا۔

یہ مظلومانہ حادثہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی زندگی ہی میں پیش آچکا تھا۔ اُن کے علماء اور احبار نے دنیا کے حرص و ہوس میں اللہ کی کتاب تورات تک کو تحریف کئے بغیر نہ چھوڑا۔ معمولی قیمت پر بھی اللہ کی آیات کو فروخت کر ڈالتے تھے۔ عوام سے نذر و نیاز حاصل کرنے کے لئے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بتاتے، بُرائی کو آنکھوں سے دیکھتے اور پھر صرفِ نظر کر جاتے، بُروں کے ساتھ خلا ملا رکھتے اور اُن کے حرام امور میں بے حجاب شرکت کرتے، سود اور رشوت کو پاک و حلال بتاتے، اہل شرک و کفر سے محبت رکھتے اور اُن کو اپنا دوست بناتے تھے۔

اس تاریک ماحول میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سنِ رُشد کو پہنچتے ہی یہ اعلان کر دیا کہ:۔

"وہ اللہ واحد کے پیغمبر و رسول ہیں اور رُشد و ہدایتِ خلق ان کا فرضِ منصبی ہے۔"

اس اعلان نے قوم میں ہلچل پیدا کر دی لوگ ارد گرد جمع ہو گئے پوچھا کہ تمہارا کیا پیغام ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعوت کا خلاصہ اس طرح بیان فرمایا:۔

"لوگو! اللہ نے مجھے اپنا رسول اور قاصد بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور تمہاری اصلاح کی خدمت میرے سپرد کی ہے۔ میں اُسکی جانب سے پیغامِ ہدایت لے کر آیا ہوں۔

تمہارے ہاتھ میں اللہ کا جو قانون (تورات) ہے اور جسکو تم نے اپنی نادانی اور غفلت سے پسِ پشت ڈال دیا ہے میں اسکی تصدیق کرتا ہوں۔ اللہ نے اس کتاب کی مزید تکمیل کے لئے ایک اور کتاب انجیل دی ہے۔ یہ کتاب تورات کی تصدیق کرتی ہے اور

اسکے حق کو حق ثابت کرتی ہے اور باطل کو باطل، سنو اور سمجھو اور اطاعت کے لئے خدا کے حضور جھک جاؤ یہی دنیا اور آخرت کی فلاح ہے۔"

قرآن حکیم نے ان حقائق اور انکے عواقب و نتائج کو اس طرح بیان کیا ہے جو قرآن حکیم کا مقصدِ عظیم ہے :۔

قرآنی مضمون

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ الخ (بقرہ آیات ۸۷، ۸۸)

اور بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) عطا کی اور اسکے بعد ہم تم میں پیغمبر بھیجتے رہے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلے معجزے عطا کئے۔ اور ہم نے اُسکو روح پاک (جبرئیل) کے ذریعہ قوت و تائید عطا کی۔

تو کیا جب کبھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس ان احکام کے ساتھ آیا جو تمہارے نفس کو نہ بھائے تو تم اکڑنے لگے، پھر بعض کو تم نے جھٹلایا اور بعض کو تم قتل ہی کرنے لگے (اور اس پیغمبر کی اطاعت و اتباع سے عار کرنے لگے) اور یہ کہتے ہو کہ ہمارے قلوب محفوظ ہیں (یعنی پیغمبروں کی دعوت ہم پر کچھ اثر نہیں کرسکتی) (نہیں) بلکہ اللہ نے اُن پر لعنت کر رکھی ہے اُن کے کفر کے باعث پس بہت تھوڑے سے ہیں جو ایمان لے آئے ہیں۔

وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ۔
(المائدہ آیت ۱۱۰)

اور (اے عیسیٰ) جب ہم نے بنی اسرائیل (کی گرفت اور ارادہ قتل) کو تجھ سے باز رکھا اس وقت جبکہ تو ان کے پاس کھلے معجزے لیکر آیا تو کہا بنی اسرائیل میں سے اُن لوگوں نے، یہ کچھ نہیں مگر کھلا جادو ہے۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم
بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ
وَأَطِيعُونِ ﴿٥٠﴾ (آل عمران آیات ۵۰ تا ۵۴)

اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اپنے سے پیشتر آئی ہوئی توراۃ کی اور میں (اس لئے آیا ہوں) کہ تم پر جو کچھ حرام کر دیا گیا تھا اُس میں سے تم پر کچھ حلال کر دوں (بہ ارشاد خداوندی)

اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کے ہاں سے نشان لے کر آیا ہوں (اپنی نبوت اور رسالت کا) سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

بیشک اللہ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے سو اُسکی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے (جسکی تعلیم ابتدا سے لیکر آخر تک سارے ہی پیغمبر دیتے آئے ہیں)

پھر جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے انکار ہی پایا (اپنی سعی و تبلیغ کے باوجود) تو بولے میرا کون مددگار ہوگا اللہ کے لئے؟ حواری بولے ہم ہیں اللہ کے مددگار ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور آپ گواہ رہیئے گا کہ ہم فرمانبردار ہیں۔

اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے ہیں اس پر جو کچھ تو نے نازل کیا ہے اور ہم نے پیروی اختیار کی رسول کی سو ہم کو بھی ان لوگوں کے ساتھ لکھ دیجئے جو تصدیق کرنے والے ہیں۔

اور انھوں نے بھی خُفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب خُفیہ تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے۔ (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کر کے سولی دینا چاہا اور اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہمشکل بنا دیا اور حضرت عیسے علیہ السلام کو آسمان پر اُٹھالیا اور وہ ہمشکل سولی پر چڑھا دیا گیا)

(النساء آیت ۱۵۷، ۱۵۸)

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ الخ۔ (الحدید آیت ۲۷)

پھر اِن کے (نوح و ابراہیم) کے بعد ہم نے اپنے رسول بھیجے اور ان کے بعد عیسیٰ بن مریم کو رسول بناکر بھیجا اور ان کو کتاب انجیل عطا کی اور جن لوگوں نے ان کی پیروی کی اُن کے دلوں میں ہم نے نرمی اور رحم ڈال دیا، اور رَہبانیت (ترک دنیا) انھوں نے خود ایجاد کرلی، ہم نے اُسے اُن پر فرض نہیں کیا تھا، مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں اُنھوں نے آپ ہی آپ اسکو اختیار کرلیا اور پھر اُسکی پابندی کرنے کا جو حق تھا اُسے ادا نہ کیا۔ اُن میں سے جو لوگ ایمان لائے ان کا اجر ہم نے انکو عطا کیا مگر ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِىْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ الخ (المائدہ آیت ۱۱۰)

وہ وقت یاد رکھو جب اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم سے کہے گا کہ (اے عیسیٰ) میرا انعام اپنے اوپر اور اپنی والدہ کے اوپر یاد کرو جبکہ میں نے تمہاری تائید روح القدس (جبرئیل) کے ذریعہ سے کی تھی۔ تم آدمیوں سے کلام (ماں کی) گود میں بھی کرتے تھے اور بڑی عمر میں بھی، اور جبکہ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دی۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ الخ (الصف آیت ۶)

اور وہ وقت یاد کرو جب عیسیٰ بن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں تصدیق کرنے والا ہوں تورات کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت سنانے والا ہوں ایک پیغمبر کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

جزات اربعہ | زمانۂ قدیم سے "سُنَّةُ اللّٰه" یہ جاری رہی ہے کہ جب کسی قوم کی

ہدایت یا کائناتِ انسانی کی صلاح و فلاح کے لئے نبی اور رسول مبعوث ہوتا ہے تو اس کو منجانب اللہ دلائل اور براہین اور معجزات سے نوازا جاتا ہے۔ وہ جہاں اللہ کے وحی اور پیغام سے زندگی کے طور وطریقے سکھاتا ہے وہاں دوسری جانب معجزات (خدائی نشانات) کے ذریعہ اپنی صداقت اور "مؤید من اللہ" ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ نیز ہر ایک پیغمبر کو اُسی قسم کے معجزات ونشانات عطا کئے جاتے ہیں جو اُس زمانے کے مناسب حال ہوتے ہیں اور جو انسانوں کی قدرت سے بالاتر ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت داؤد وسلیمان علیہما السلام کو پرندوں کی بولیاں، تسخیرِ جن وانس اور تسخیر ہوا، لوہے کا ہاتھ میں نرم ہوجانا وغیرہ وغیرہ۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو "تسع آیات" نو معجزات دیئے گئے۔

جن میں سے دو نشان "عصا" اور "ید بیضا" کو قرآن حکیم نے بڑے نشان کہا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دہکتی آگ کے شعلوں کو "بَرْدًا وَّسَلَامًا" بنا دیا۔

حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے لئے ناقۃُ اللہ (اونٹنی) کو نشان بنایا۔

حضرت نوح وہود علیہما السلام سے اُن کی قوم نے عذاب طلب کیا پیغمبر کی دُعا سے ایسا عبرتناک عذاب آیا جو آنے والے انسانوں کے لئے عبرت ثابت ہوا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن جیسا معجزہ عطا کیا گیا جس کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ نیز بدر کے معرکہ میں مٹھی بھر خاک کو ایک ہزار دشمنوں کی آنکھوں کا آزار بنا دیا اور "شقُّ القمر" کا معجزہ عطا ہوا۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب انسانی ہدایت ورشد کیلئے منتخب کیا گیا تو جہاں انھیں حجت وبرہان (انجیل) عطا کی اُس زمانے کے مخصوص حالات کے مناسب چند ایسے معجزات بھی عطا کئے گئے جو اس زمانے کے اربابِ کمال اور انکی پیروی کرنیوالوں پر اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہے اور انھیں اعتراف کئے بغیر چارہ نہ ہوا کہ بلاشبہ یہ اعمال ذاتی یا اکتسابی نہیں ہیں بلکہ محض اللہ کی جانب سے اُس کے رسول کی تائید میں رُونما ہوتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اِن معجزات میں سے جن کا مظاہرہ قوم کے سامنے ہوا قرآن حکیم نے چار معجزات (معجزاتِ اربعہ) کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

(۱) وہ اللہ تعالےٰ کے حکم سے مُردہ انسانوں کو زندہ کر دیا

کرتے تھے۔

(۲) پیدائشی نابینا کو بینا اور کوڑھی وجذامی کو چنگا کردیا کرتے تھے۔

(۳) مٹی سے پرندہ بناکر اُس میں پھونک دیتے اور وہ اللہ کے حکم سے اُڑنے لگتا تھا۔

(۴) وہ یہ بھی بتادیا کرتے تھے کہ کس نے کیا کھایا ہے اور گھر میں کیا ذخیرہ محفوظ کر رکھا ہے؟

اُس وقت قوم میں ایسے مسیحا موجود تھے جن کے علاج ومعالجہ وتدابیر خصوصی سے مریض شفا پاتے تھے لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُن لوگوں کے سامنے کسی اسباب و وسائل اور تدابیر اختیار کئے بغیر جب ان امور کا مظاہرہ کیا تو حق و باطل، ہدایت وضلالت، نور وظلمت قدرتی تقسیم کے مطابق یہی اثر پڑا کہ جس شخص کے قلب میں حق کی طلب موجود تھی اُس نے اقرار کیا کہ بلاشبہ اس قسم کا مظاہرہ انسانی وبشری طاقت سے باہر ہے اور گزشتہ نبیوں کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید ونصرت میں جاری ہوا ہے۔ اور جن لوگوں کے قلوب میں جحود وانکار اور بغض وعناد تھا اُن کے تعصب نے وہی کہنے پر مجبور کیا جو اُنکے پیشرو انبیاء ورسل کے بارے میں کہتے رہے ہیں۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ

کچھ نہیں یہ سب کچھ جادو اور نظر بندی ہے۔

ان معجزات اربعہ کے علاوہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بھی ایک "عظیم الشان نشانی" تھی جسکی تفصیل گزر چکی ہے۔

قرآن حکیم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اِن معجزات اربعہ کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ سننے والے کو موعظت وعبرت کا درس ملتا ہے اور اِن واقعات کی تذکیرے قرآن حکیم کا یہی عظیم مقصد ہے۔

قرآنی مضمون | وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ الخ (آل عمران ۴۸ تا ۵۱)

اور اللہ اُسے کتاب اور حکمت اور تورات و انجیل سکھا دیگا۔
(اور وہ پیغمبر ہوگا بنی اسرائیل کیلئے (اور کہیگا) میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں، میں تمہارے لئے مٹی سے پرندوں کی مانند صورت بنا دیتا ہوں پھر اُس میں دم کر دیتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ اور میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتا ہوں۔ اور میں اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں۔ اور تم جو کچھ کھاتے ہو اور جو کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو وہ تمہیں بتلا دیتا ہوں۔ بیشک ان سارے واقعات میں تمہارے لئے ایک نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو؟
اور میں اس لئے آیا ہوں کہ تم پر جو کچھ حرام کر دیا گیا تھا اُس میں سے تم پر کچھ حلال کر دوں، اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کے ہاں سے نشان لے کر آیا ہوں سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو بیشک اللہ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے سو اسکی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے۔

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِيْ الخ (مائدہ آیات ۱۱۰، ۱۱۱)

(اور اے عیسیٰ بن مریم میری اس نعمت کو یاد کرو) جبکہ تم مٹی سے پرندہ جیسی شکل میرے حکم سے وجود میں لاتے تھے۔ پھر اُس کے اندر پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا اور تم مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے اور جب تم مُردوں کو میرے حکم سے نکال کھڑا کرتے تھے اور جبکہ میں نے بنی اسرائیل کو تم سے روک رکھا جب تم اِن کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے تھے۔ پھر اِن میں سے جو کفر اختیار کئے رہے وہ بولے کہ یہ تو کچھ نہیں ایک کھلا جادو ہے۔
اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب میں نے حواریوں کو حکم

دیا کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر تو وہ بولے کہ ہم ایمان لے آئے اور آپ شاہد رہیں کہ ہم پورے فرمانبردار رہیں۔

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىۃِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ

(الصف آیت ٦)

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب کہ عیسیٰ ابن مریمؑ نے کہا اے بنی اسرائیل بیشک میں اللہ کا پیغمبر ہوں تمہاری طرف (بھیجا گیا ہوں) تصدیق کرنے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئیگا جس کا نام احمد ہوگا۔ پھر جب وہ اُن کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لیکر آیا تو انھوں نے کہا یہ تو صریح دھوکا ہے۔

خلاصۂ تعلیمات

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو دعوت دی اور جسکی وہ تبلیغ کرتے رہے اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اور اللہ کی توحید پر ایمان، انبیاء و رسل کی تصدیق، آخرت پر ایمان، ملائکۃ اللہ پر ایمان، تقدیر پر ایمان، اللہ کی کتابوں پر ایمان، اخلاق حسنہ کا اختیار اور اعمال سیئہ کا پرہیز و اجتناب، عبادت سے رغبت، دنیا و مافیہا اور اسمیں انہماک سے نفرت، مخلوق سے محبت، یہی وہ تعلیم و تلقین تھی جو اُن کی زندگی کا مشغلہ اور فرض منصبی بنا ہوا تھا وہ بنی اسرائیل کو تورات و انجیل اور حکیمانہ پند و نصائح کے ذریعہ اِن امور کی جانب توجہ دیتے مگر بے نصیب یہود اپنی کج فطرت اور مسلسل سرکشی و بغاوت کی بدولت اس درجہ سخت دل ہو گئے تھے کہ انبیاء و رسل کو قتل کرنا ان کا پسندیدہ عمل ہو گیا تھا۔ ایک مختصر جماعت کے سوا ان کی بڑی اکثریت مخالفت اور انکار ہی پر قائم رہی۔

قرآن حکیم نے آنجناب کی تعلیمات کو آیات ذیل میں اس طرح بیان کیا ہے:-

قرآنی مضمون

وَلَمَّا جَآءَ عِیْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُکُمْ بِالْحِکْمَۃِ وَلِاُبَیِّنَ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ تَخْتَلِفُوْنَ

فِیْہِ ۔الخ (زُخرف آیت ۶۳ تا ۶۵)

اور جب عیسیٰ (علیہ السلام) صریح نشانیاں لے کر آئے تو انھوں نے کہا (اے قوم) بلاشبہ میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور اس لئے آیا ہوں کہ تم پر بعض باتوں کی حقیقت کھول دوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو، لہذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی اُسی کی تم عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔

مگر (اُن کی واضح تعلیم کے باوجود) گروہ بندیوں نے آپس میں اختلاف کیا، پس تباہی ہے اُن لوگوں کے لئے جنھوں نے زیادتی کی ایک تکلیف دہ دن کے عذاب سے۔

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ الخ۔

(الصّف آیت ۶،۷)

اور (یاد کرو) عیسیٰ بن مریم کی وہ بات جو اُس نے کہی تھی کہ اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں تصدیق کرنے والا ہوں اُس تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے اور خوشخبری دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام (نامی) احمدؐ ہوگا۔)

پھر جب وہ رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انھوں نے کہہ دیا کہ یہ صریح دھوکا ہے۔ اب بھلا اُس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹی تہمت باندھے۔ حالانکہ اسکو اسلام کی دعوت دی جارہی ہو؟ اور ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتے ہیں۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْھُمُ الْکُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ۔الخ (آل عمران آیت ۵۲، ۵۳)

پھر جب عیسیٰ (علیہ السلام) نے اُن (بنی اسرائیل) سے کفر
وانکار محسوس کیا تو کہا۔
کون ہے جو اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے؟ حواریوں
نے جواب دیا، ہم ہیں اللہ کے (دین کے) مددگار! ہم اللہ پر ایمان
لے آئے اور تم گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں۔
اے ہمارے پروردگار جو تو نے نازل کیا ہے اُس پر ہم ایمان
لے آئے اور ہم نے رسول کی پیروی کی۔ پس تو ہم کو (دین حق کی) گواہی
دینے والوں میں لکھ لے۔

حَوَارِیُّوْنَ | نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد کتب حدیث میں نقل ہوتا آرہا ہے
کہ ہر نبی کے چند حواری (مددگار) رہے ہیں اور میرے حواری میں
(شامل) زبیرؓ ہیں۔

ایک دوسری روایت بھی اس مضمون کو اس طرح ادا کرتی ہے کہ ہر نبی کے
دو مددگار زمین پر اور دو مددگار آسمان پر رہے ہیں اور میرے زمینی مددگار ابوبکرؓ وعمرؓ
ہیں اور آسمانی مددگار جبرئیلؑ اور میکائیلؑ ہیں۔

قرآن حکیم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھی حواریوں کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے
آنجناب کی رفاقت اور اُن کی دعوت وتبلیغ میں سرگرم حصہ لیا اور دین حق کی تائید ونصرت
میں بڑے بڑے خطرات سے دوچار ہوئے۔ دین حق کی سربلندی اور کامیابی کے لئے
اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ اکثر وبیشتر حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ رہ کر تبلیغ ودعوت
کو سرانجام دیتے تھے۔ ان کے اس ایثار وجاں نثاری کی بدولت وہ حواری (رفیق) اور
"اَنْصَارُ اللّٰہ" (اللہ کے دین کے مددگار) کے مقدس القاب سے موسوم ہوئے۔ چنانچہ ان
بزرگ ہستیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات طیبہ کو اپنا اسوہ بنایا اور سخت سے سخت
اور نازک حالات میں بھی اُن کا ساتھ نہ چھوڑا اور ہر طرح کے معاون وپشت پناہ ثابت
ہوئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یہ حواری بیشتر غریب ومزدور طبقہ میں سے تھے
اور انبیاء کرام کی دعوت وتبلیغ پر اوّلاً لبیک کہنے والے اور حق کی آواز پر جان نثاری

کا مظاہرہ کرنے والے اکثر غریب و مزدور طبقہ ہی کے افراد ہوئے ہیں۔ مال و دولت والے اور اہل اقتدار اُس وقت آگے آئے ہیں جبکہ حق کا تسلط ہر طرف نظر آنے لگا اور انھیں اپنی خیر اسی میں نظر آنے لگی کہ اب اطاعت و انقیاد کے بغیر کوئی چارہ نہیں، الا ماشاء اللہ تعالیٰ۔

قرآن حکیم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی منقبت بیان کی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے جب دینِ حق کی نُصرت اور تائید کے لئے اُنھیں پکارا ہے تو سب سے پہلے جنھوں نے "نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ" کا نعرہ بلند کیا ہے وہ یہی غریب غربار کی جماعت تھی۔

سورۂ صف میں اللہ رب العالمین نے جب مسلمانوں کو مخاطب کرکے "کُوْنُوْا اَنْصَارَ اللّٰہِ" (اللہ کے دین کی مددگاری کے لئے اُٹھ کھڑے ہوجاؤ) کی ترغیب دی اور ماضی کے جن فداکاروں کا تذکرہ کیا ہے ان میں انہی مقدس حواریوں کا ذکر ہے اور ان کے قبولِ ایمان اور دعوتِ حق کے سامنے انقیاد و تسلیم کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ بھی ان کے خلوص، حق طلبی، حق کوشی کی زندہ جاوید تصویر ہے۔ حضرت شاہ عبد القادرؒ نے اسی بنار پر آیت زیر بحث کی تفسیر کرتے ہوئے اس تاریخی شہادت کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:-

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اِن کے یاروں (حواریوں) نے بڑی محنتیں کی ہیں تب ان کا دین نشر ہوا۔"

ہمارے حضرت کے پیچھے بھی خُلفار نے اس سے زیادہ کیا۔

(تفسیر موضح القرآن)

اگرچہ ہر مصلح اور پیغمبر کی جماعت میں ایک چھوٹا سا گروہ منافقین کا عموماً رہا ہے جو اپنی دنیاوی اغراض کی خاطر ظاہرداری کے طور پر شریک جماعت ہونا مفید سمجھا ہے مگر ایک مُصلح اور پیغمبر کے درمیان ہمیشہ یہ فرق رہا ہے کہ مصلح خواہ اپنی جماعت کے منافقین سے پوری طرح آگاہ نہ ہوسکے لیکن نبی و رسول کو "وحی الٰہی" کے ذریعہ شروع ہی میں مخلص و منافق کی اطلاع دے دی جاتی ہے تاکہ ایک منکر و کافر سے زیادہ جس گروہ سے جماعتِ حق اور اسکی دعوت و تبلیغ کو ضرر پہنچ سکتا ہے نبی اُس کے حالات سے غافل نہ رہے۔ اسی وجہ سے کوئی منافق کسی وقت اور کسی حالت میں نبی اور رسول کا محبوب، معتمد اور مقرب نہیں ہوا ہے۔

البتہ یہ جُدا بات ہے کہ نبی دینِ حق کی مصلحتوں اور اسکے عارضی تقاضوں کی بنار

پر ایسے منافق کے ساتھ اعراض، درگزر، عفو وکرم کا معاملہ مناسب سمجھا ہو، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک مخلص صحابیؓ کے اس سوال پر کہ

یا رسول اللہ جب آپ منافقین کے نفاق وکفر سے واقف ہیں
تو پھر اِن کا مقابلہ کر کے انہیں کیفرِ کردار تک کیوں نہیں پہنچا دیتے؟
تاکہ اسلام اور مسلمانوں کو اِن اندرونی فساد سے نجات ملے۔

اسپر آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا کہ :-

اُن کے ظاہری ایمانداری کے بعد ہمارے سخت گیر طریقہ کے متعلق غیر مسلموں کو یہ دھوکا نہ ہو اور وہ یہ کہہ اُٹھیں (محمدؐ) اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرنے سے نہیں چوکتے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ۔

الغرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جو کچھ عہد کیا تھا ان کی موجودگی میں اور ان کے بعد بھی سچی وفاداری کے ساتھ نبھایا اور مؤمنین صادقین ثابت ہوئے اور اس لئے اللہ تعالےٰ نے بھی ان کی مدد فرمائی اور انکو حق کے دشمنوں کے مقابلہ میں کامیاب کیا۔

قرآن حکیم نے حواریوں کی اس اطاعت وانقیاد کا اس طرح ذکر کیا ہے :-

قرآنی مضمون

وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَ بِرَسُوْلِیْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ۔

(مائدہ آیت ۱۱۱)

اور (اے عیسیٰ وہ وقت یاد کرو) جبکہ میں نے حواریوں کی جانب (تیری معرفت) یہ وحی بھیجی کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ تو انھوں نے جواب دیا، ہم ایمان لائے اور (اے اللہ) تو گواہ رہنا کہ ہم بلاشبہ مسلمان ہیں۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ ؕ

(الصف آیت ۱۴)

اے ایمان والو تم اللہ کے دین کے مددگار ہو جاؤ جیسا کہ
عیسیٰ بن مریمؑ نے حواریوں سے کہا تھا۔
اللہ کے راستہ میں کون میرا مددگار ہے؟
تو حواریوں نے جواب دیا ہم ہیں اللہ کی راہ کے مددگار، پھر
بنی اسرائیل کی ایک جماعت ایمان لے آئی اور ایک گروہ نے کفر
اختیار کیا سو ہم نے ایمان والوں کی اُن کے دشمنوں کے مقابلہ میں تائید
کی پس وہ ایمان والے غالب رہے۔

نزولِ مائدہ

مخلص اور فِداکار حواریوں کی جماعت اگرچہ صادق الایمان تھی لیکن علم وفہم کی کمی اور سادہ لوحی اور دنیاوی سروسامان کے اعتبار سے غرباء ومساکین کی جماعت تھی۔ دین حق کی تائید ونصرت کے لئے جہاں ایثار وقربانی ضروری ہے وہاں فارغ اُلبالی اور کسب معاش سے یکسوئی بھی اہمیت رکھتی ہے۔

ان غریب فداکاروں کے ہاں ایسا کوئی سامانِ زندگی نہ تھا جو اُن کو یکسوئی کیساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ میں ممد ومعاون ثابت ہوتا۔ رزق فردا تو کیا رزق اِمروز بھی میسر نہ تھا۔ وہ بارہا حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات اور تائیداتِ غیبی کو دیکھ چکے تھے۔ خود حضرت مسیح علیہ السلام کا وجود اقدس بھی اللہ تعالیٰ کا ایک مستقل نشان تھا۔ مخلص حواریوں نے ازراہِ سادگی یہ درخواست پیش کر دی کہ

اے عیسیٰ ابن مریم کیا آپ کا پروردگار ہم پر آسمان سے
کھانے کا ایک خوان (مائدہ) اُتار سکتا ہے؟

ان پڑھ اور کم علم انسانوں کا لب ولہجہ علم وادب والوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے وہ علمی ومجلسی گفت وشنید کے طور طریقوں سے بالکل ناآشنا ہوتے ہیں اُن میں ادب واحترام ضرور ہوتا ہے لیکن اُس کا اظہار غیر مہذب اور گنوارپن جیسا ہوتا ہے۔ بسا اوقات ان کا یہ طرز بے ادبی اور گستاخی کے حدود میں آجاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ عنوان حواریوں سے صادر ہو گیا۔ منشا تو ان کا یہ تھا کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کی تصدیقِ نبوت کے لئے بیشمار معجزات اور انعامات ظاہر فرمائے ہیں وہی ذات ہمارے لئے غیب کا ایک "خوانِ نعمت" (مائدہ) بھی

نازل کردے تاکہ ہم روزی کمانے کی فکر سے آزاد ہوکر شب و روز دین حق کی تائید ونصرت اور آنجنابؑ کی دعوت و تبلیغ میں مشغول رہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی یہ فرمائش سنکر پہلے تو یہ نصیحت فرمائی کہ اگرچہ اللہ تعالےٰ کی طاقت و قدرت بے حد وحساب ہے لیکن کسی نیک بندے کے لئے یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اس طرح اللہ تعالےٰ کو آزمائے، پس ایسے بے جا مطالبات سے ڈرو اور ایسے خیالات سے بچو۔

حواریوں نے جب یہ سُنا تو متنبہ ہوئے اور عرض کرنے لگے حاشا وکلاّ ہمارا تو یہ مقصد نہیں تھا کہ اللہ تعالےٰ کی قدرت وطاقت کو آزمائیں ہم صرف یہ چاہتے تھے کہ رزق کی جدوجہد سے دل کو فارغ کرکے اللہ تعالےٰ کی اس "عطا" کو زندگی کا سہارا بنالیں اور آپؑ کی تصدیق میں ہم کو اس خوانِ غیب سے اعتقادِ راسخ حاصل ہوجائے اور ہم اس پر کائناتِ انسانی کے لئے شہادت دینے والے بن جائیں۔

جواب معقول تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے اخلاص اور اصرار کو دیکھا تو قوم کو حکم دیا کہ وہ تیس۳۰ دن کے روزے رکھیں پھر آپ نے دُعا کی :۔

"الٰہی ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل کردے جو ہمارے لئے اور ہمارے اگلوں پچھلوں کے لئے خوشی کا موقع قرار پائے اور آپ کی طرف سے یہ ایک عظیم نشانی ہوجائے۔ ہم کو رزق عطا فرما اور تو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔"

اس دُعا کے جواب میں اللہ تعالےٰ نے وحی نازل کی۔

اے عیسیٰ! تمہاری دعا قبول ہیں اسکو نازل کردوں گا لیکن یہ واضح رہے کہ اس کھُلی نشانی کے نازل ہونے کے بعد اگر ان میں سے کسی نے ہمارے حکم کی خلاف ورزی کی تو پھر ان کو عذاب بھی ایسا ہی ہولناک دوں گا جو کائنات کے کسی مخلوق کو نہیں دیا گیا ہو۔"

قرآن حکیم نے حواریوں کی فرمائش اور اپنا جواب اس طرح نقل کیا ہے :۔

قرآنی مضمون | اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ

رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ الخ

(المائدہ آیت ۱۱۲ تا ۱۱۵)

اور یہ واقعہ بھی یاد رہے کہ جب حواریوں نے کہا اے عیسیٰ بن مریم کیا آپ کا پروردگار ایسا کرسکتا ہے کہ آسمان سے ہم پر ایک خوان اُتار دے؟ (یعنی ہماری روزمرہ کی غذا کے لئے آسمان سے غیبی انتظام کردے) عیسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اللہ سے ڈرو (اور ایسی فرمائش نہ کرو) اگر تم ایمان والے ہو۔

حواریوں نے جواب دیا (مقصود اس سے قدرتِ الٰہی کا امتحان کرنا نہیں ہے بلکہ) ہم چاہتے ہیں (ہمیں غذا میسر آئے تو) اسمیں سے کھائیں اور (ہمارے دل سکون پائیں اور (ہم جان لیں کہ آپ نے ہم سے جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے اور اسپر ہم گواہ ہو جائیں۔

اس پر عیسیٰ بن مریمؑ نے دُعا کی اے اللہ، اے ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے ایک خوان بھیجدے کہ اِس کا آنا ہمارے لئے اور (ہمارے اگلوں اور پچھلوں سب کے لئے عید قرار پائے اور تیری طرف سے (فضل وکرم کی) ایک نشانی ہو، ہمیں روزی دے تو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میں تمہارے لئے خوان بھیجوں گا لیکن جو شخص اسکے بعد بھی (راہ حق سے) انکار کرے گا تو میں اسے (پاداش عمل میں) عذاب دوں گا ایسا عذاب کہ تمام دنیا میں کسی آدمی کو بھی ویسا عذاب نہیں دیا جائے گا۔

ضروری نوٹ | یہ آسمانی خوان (مائدہ) نازل ہوا یا نہیں؟ قرآن حکیم اسکے متعلق کوئی تفصیل بیان نہیں کرتا اور نہ کسی مرفوع حدیث میں اس کا کوئی تذکرہ پایا جاتا ہے۔ البتہ بعض اقوال صحابہ وتابعین میں اسکے متعلق تفصیلات ملتی ہیں:۔

امام مجاہد وحسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ مائدہ کا نزول نہیں ہوا

کیونکہ حواریوں نے بعد کی خوفناک دھمکی سُن کر اپنی درخواست واپس لے لی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی لغزش یا خلاف ورزی کی بدولت دردناک عذاب سے دوچار ہو جائیں۔

علاوہ ازیں اگر مائدہ کا نزول ہوا ہوتا تو وہ ایسا نشان ثابت ہوتا کہ نصاریٰ اسپر جسقدر بھی فخر کرتے وہ کم تھا اور ان کے ہاں اس کی جسقدر بھی شہرت ہوتی وہ بے جا نہیں ہوتی تاہم نصاریٰ کے ہاں اس نزول کا کوئی تذکرہ نہیں پایا جاتا۔

حضرت ابن عباس اور حضرت عمار بن یاسرؓ سے منقول ہے کہ یہ واقعہ پیش آیا اور مائدہ کا نزول ہوا۔ جمہور مفسرین کا رجحان بھی اسی طرف ہے البتہ اسکی تفصیلات میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں مثلاً یہ "خوانِ نعمت" صرف ایک دن نازل ہوا۔ بعض حضرات بیان کرتے ہیں چالیس دن تک نازل ہوتا رہا پھر بند ہوگیا۔ اور اس کا یہ سبب ہوا کہ اس کے نزول پر یہ حکم بھی ہوا تھا کہ اس کو فقیر و مسکین اور مریض ہی کھائیں امیر و تندرست نہ کھائیں مگر چند روز تعمیل کے بعد لوگوں نے آہستہ آہستہ اسکی خلاف ورزی شروع کی۔ اور بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ اس نزول کے ساتھ یہ حکم تھا کہ اسکو کھائیں مگر اگلے روز کے لئے ذخیرہ نہ کریں۔ مگر کچھ عرصہ بعد اسکی خلاف ورزی ہونے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف مائدہ کا نزول ہی بند ہوگیا بلکہ خلاف ورزی کرنے والے خنزیر اور بندر کی شکل میں مسخ کر دیئے گئے۔ واللہ اعلم۔

لیکن یہ واضح رہے کہ جن اقوال میں خلاف ورزی اور اسکے متعلق عذاب کا ذکر ہے ان کا تعلق حواریوں میں سے کسی کی جانب مطلق نہیں ہے کیونکہ یہ بات قرآنی تصریحات کے خلاف پڑتی ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے عوام الناس تھے۔

خوانِ نعمت آثار صحابہ میں خوان نعمت کے تعلق سے جو تفصیلات ملتی ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالٰی نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کی دُعا قبول فرمائی تو لوگوں نے دیکھا کہ اللہ تعالےٰ کے فرشتے فضاءِ آسمانی سے ایک خوان لئے اُتر رہے ہیں۔ اُدھر فرشتے آہستہ آہستہ اسکو لئے اُتر رہے تھے اِدھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام انتہائی خشوع وخضوع کیساتھ درگاہِ الٰہی میں دست بدُعا تھے کہ مائدہ آپہنچا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اوّل دو رکعت نمازِ شکر ادا کی اور پھر مائدہ کھولا تو اُس میں تلی ہوئی مچھلی اور تر و تازہ پھل اور روٹیاں موجود پائیں اور خوان کھولتے ہی ایسی نفیس خوشبو نکلی کہ اسکی مہک نے سب کو بے خود کر دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ کھائیں مگر لوگوں نے اصرار کیا کہ ابتداء آپ کریں، آپؑ نے ارشاد فرمایا یہ میرے لئے نہیں ہے تمہاری طلب پر نازل ہوا ہے۔ یہ سُن کر سب گھبرائے کہ نہ معلوم اس کا کیا انجام ہو اللہ کا رسول تو نہ کھائے اور ہم کھائیں۔ آپ نے یہ دیکھ کر ارشاد فرمایا تو اچھا فقراء اور مساکین اور معذورین کو بلاؤ یہ ان کا حق ہے۔ تب ہزار ہا غرباء و مساکین نے شکم سیر ہو کر کھایا مگر مائدہ کی مقدار میں کوئی فرق نہ آیا۔ شاہ عبد القادر صاحب موضح القرآن میں لکھتے ہیں کہ یہ خوانِ نعمت یکشنبہ (اتوار کے دن) کو اترا تھا اس لئے نصاریٰ نے اتوار کا دن عبادت کا مقرر کر لیا۔ جیسا کہ اسلام میں جمعہ کا دن مقدس ہے اور شاید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس دُعا کا یہ اثر ہے کہ امتِ نصاریٰ میں آسودگی مال ہمیشہ سے رہی ہے۔

حضرت عمار بن یاسرؓ کا ایک بلیغ خطاب

حضرت عمار بن یاسرؓ جلیل القدر صحابہ کرام میں شمار کئے جاتے ہیں۔ نزول مائدہ کا تذکرہ کرنے کے بعد موعظت و عبرت سے لبریز یہ ایک خطاب اسطرح فرمایا:۔

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اُن کی قوم نے نزول مائدہ کی درخواست کی تو اللہ تعالےٰ کی جانب سے جواب ملا کہ تمہاری درخواست اس شرط کے ساتھ منظور کی جاتی ہے کہ نہ اسمیں خیانت کرنا، نہ اسکو چھپانا اور نہ اسکو ذخیرہ کرنا ورنہ یہ بند کر دیا جائے گا اور تم کو ایسا عبرت ناک عذاب دوں گا جو کسی کو نہ دیا جائے گا۔

اے عرب کی جماعت تم اپنی حالت پر غور کرو کہ اونٹوں اور بکریوں کی دُم پکڑ کر جنگلوں میں چراتے پھرتے تھے۔ پھر اللہ تعالےٰ نے اپنی رحمت سے تمہارے درمیان ہی میں سے ایک برگزیدہ رسول مبعوث فرمایا جس کے حسب ونسب سے تم اچھی طرح واقف ہو اُس نے تم کو خبر دی ہے کہ عنقریب تم عجم پر غالب آجاؤگے اور اس پر اپنا تسلط قائم کردو گے اور اس لئے اُس رسول نے تم کو سختی سے منع کیا ہے کہ مال ودولت کی فراوانی دیکھ کر تم ہرگز چاندی اور سونے کے خزانے جمع نہ کرنا، مگر اللہ کی قسم کچھ زیادہ دن نہیں گزریں گے کہ تم ضرور سونے چاندی کے خزانے جمع کرلو گے اور پھر اللہ برتر وبالا کے دردناک عذاب کے مستحق بنو گے۔" (تفسیر ابن کثیر ج ۲ سورۂ مائدہ)

آسمانی ہجرت

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نہ شادی کی اور نہ رہائش کے لئے گھر بنایا۔ وہ شہر شہر اور قریہ قریہ اللہ تعالیٰ کے دین کا پیغام سناتے اور دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیتے اور جس جگہ بھی رات آپہنچتی وہیں بغیر کسی سامانِ راحت کے شب بسر کرلیتے۔

چونکہ اُن کی ذات بابرکت سے اللہ کی مخلوق جسمانی اور روحانی دونوں طرح کی شفا اور تسکین پاتی تھی اس لئے جس جانب بھی اُن کا گزر ہوتا انسانوں کا انبوہ اُن کے اردگرد جمع ہوجاتا اور عقیدت ومحبت کے ساتھ اُن پر نثار ہوجانے کے لئے ہجوم کرجاتے۔

یہودیوں کو اُنکی یہ دعوت حق اور اُن کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کانٹے کی طرح چُبھ رہی تھی اور وہ بغض وعناد میں اندھے ہوئے جارہے تھے۔ انھیں یہ اندیشہ ہروقت بے قرار کئے رہتا تھا کہ "عیسائیت" غالب ہوجائے گی اور ہماری سرداری وحکمرانی کسی وقت بھی ختم ہوسکتی ہے تو اِن کے سرداروں اور مذہبی عہدہ داروں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازش شروع کردی اور آخر یہ طے پایا کہ کامیابی حاصل کرنے کی بجز اس کے اور کوئی صورت نہیں کہ بادشاہِ وقت کو مشتعل کرکے (حضرت) عیسیٰ (علیہ السلام) کو دار پر چڑھادیا جائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے مخالفین (یہودیوں) کا یہ

معرکہ ملک شام کے صوبۂ فلسطین میں پیش آیا۔ شام اس وقت رومی سلطنت کا ایک جز تھا اور یہاں کے یہودی باشندوں کو اپنے معاملات میں نیم آزادی اور نیم خود مختاری حاصل تھی۔ روم کے بادشاہ کی طرف سے ایک نائب سارے ملک شام کا گورنر تھا اور اسکے ماتحت ایک امیر صوبۂ فلسطین کا تھا۔

اہل روم کا مذہب اگرچہ شرک وبت پرستی تھا لیکن یہودیوں کو اتنا اختیار تھا کہ اپنے مقدمات اپنی مذہبی عدالتوں میں لائیں لیکن سزاؤں کے نفاذ کے لئے پھر اپنے مجرموں کو رومی عدالت میں لانا پڑتا تھا اور سزائے موت وغیرہ صرف رومی حکومت ہی دیتی تھی۔

یہودی اگرچہ روم کے اس بت پرست بادشاہ سے متنفر ضرور تھے مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف اُن کے قلوب میں بغض وحسد کی آگ نے انھیں ایسا اندھ کر دیا کہ انجام اور نتیجہ سے بے فکر ہوکر بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

> عالی جاہ! یہ شخص نہ صرف ہمارے لئے بلکہ حکومت کے لئے بھی خطرہ بنتا جارہا ہے اگر اس کا فوراً انسداد نہ کیا جائے تو نہ صرف ہمارا دین صحیح وسالم باقی رہ سکے گا بلکہ اندیشہ ہے کہ آپ کے ہاتھ سے حکومت کا اقتدار بھی چلا جائے۔ اس لئے کہ اس شخص (عیسیٰ علیہ السلام) نے عجیب وغریب شعبدے (معجزات) دکھاکر مخلوق کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے اور ہر وقت اس تاک میں ہے کہ عوام کی اس طاقت کے بل پر آپ کو شکست دیدے اور خود بنی اسرائیل کا بادشاہ بن جائے۔ اس شخص نے لوگوں کو نہ صرف دینی حیثیت سے گمراہ کر دیا ہے بلکہ اس نے ہمارے دین (یہودیت) تک کو بدل ڈالا ہے اور لوگوں کو بددین بنانے میں شب وروز مشغول ہے۔ لہذا اس کا انسداد ضروری ہے تاکہ بڑھتا ہوا یہ فتنہ ابتدائی منزلوں ہی میں کچل ڈالا جائے۔"

غرض کافی گفت وشنید کے بعد بادشاہ (پیلاطیس) نے ان کو اجازت دیدی کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو گرفتار کریں اور شاہی دربار میں مجرم کی حیثیت سے پیش کریں۔ بنی اسرائیل کے سردار اور کاہن یہ حکم نامہ لیکر بیحد مسرور ہوئے اور فخر کے ساتھ ایک

دوسرے کو مبارکباد دینے لگے اور کہنے لگے کہ اب موقعہ کا انتظار کیا جائے اور مناسب وقت تنہائی میں حضرت مسیح علیہ السلام کو گرفتار کر لیا جائے تاکہ عوام میں ہیجان نہ ہونے پائے۔ انجیل یوحنا میں اس واقعہ کے متعلق اس طرح مذکور ہے :۔

"پس سردار کاہنوں اور فریسیوں نے صدر عدالت کے لوگوں کو جمع کر کے کہا ہم کرتے کیا ہیں ؟ یہ آدمی تو بہت معجزے دکھاتا ہے اگر ہم اسے یوں ہی چھوڑ دیں تو سب اس پر ایمان لے آئینگے اور اہلِ روم آکر ہماری جگہ اور قوم دونوں پر قبضہ کر لیں گے۔ ان میں سے کائفا نامی ایک شخص نے جو اس سال سردارِ کاہن تھا کہا تم نہیں جانتے اور یہ نہ سوچتے ہو کہ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ ایک آدمی امت کے واسطے مرے نہ کہ ساری قوم ہلاک ہو۔" (باب ۱۱ آیات ۴۷ تا ۵۱)

مرقس کی انجیل میں اس طرح ہے :۔

"دو دن کے بعد عید ہونے والی تھی اور سردار کاہن اور فقیہہ موقع ڈھونڈ رہے تھے کہ اُسے کیونکر فریب سے پکڑ کر قتل کریں، کیونکہ کہتے تھے کہ عید کو کہیں ایسا نہ ہو کہ بلوہ ہو جائے۔"

(باب ۱۴ آیت ۲)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے حواریوں کے مکالمہ کو سورۂ آل عمران اور سورۂ صف کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب یہودیوں کے کفر وعناد اور ریشہ دوانیوں کو محسوس کیا تو ایک جگہ اپنے حواریوں کو جمع کیا اور اُن سے فرمایا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں اور کاہنوں کی سرگرمیاں تم سے پوشیدہ نہیں ہیں مجھکو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آزمائش اور امتحان کا وقت قریب آگیا ہے اب میں تم سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت کون اللہ کے دین کا ناصر و مددگار ثابت ہوگا؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ سوال سنکر حواریوں نے بڑے جوش و خروش اور صداقت ایمانی کے ساتھ جواب دیا :۔

"ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں۔ آپ گواہ رہیے کہ ہم اطاعت کرنے والے ہیں۔" (الصف آیت ۱۴)

پھر حواریوں نے بارگاہِ الٰہی میں اس طرح دعا کی :-

"اے پروردگار ہم تیری نازل کی ہوئی کتاب پر ایمان لے آئے اور سچے دل کے ساتھ تیرے رسول کی پیروی کی ہے۔ لہذا اے اللہ تو ہمیں فداکاروں کی فہرست میں شامل کرلے۔"

حواریوں کا یہ جواب ایسا ہی تھا جیسا کہ ہر نبی کے اصحاب نے ایسے موقعوں پر اپنے نبی کو دیا ہے۔

الغرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انھیں دُعا دی اور پھر اللہ تعالےٰ کی وہ وحی پڑھکر سُنائی جو اُن پر نازل ہوئی تھی۔

اللہ تعالےٰ نے یہودیوں کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ وعدے فرمائے تھے۔

پہلا وعدہ یہ تھا کہ اِن کی موت یہودیوں کے ہاتھوں قتل کے ذریعہ نہ ہوگی۔

دوسرا وعدہ۔ فی الحال عالم بالا کی طرف اُٹھالیا جائے گا۔

تیسرا وعدہ۔ اِن کو دشمنوں کی تہمت سے پاک کردیا جائے گا۔

چوتھا وعدہ۔ آپ کی پیروی کرنے والے مخلصوں کو قیامت تک اُن کے دشمنوں پر غالب رکھا جائے گا۔

پانچواں وعدہ۔ قیامت کے دن اللہ تعالےٰ ان کے باہمی مذہبی اختلافات کا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ (آل عمران آیت ۵۵)

حقیقت یہ ہے کہ کفار اور مشرکین کی مخالفت اور عداوت تو ہر نبی کے ساتھ رہی ہے اور سُنّت اللہ یہی رہی ہے کہ جب کسی نبی کی قوم اپنے انکار اور ضد پر قائم رہی اور پیغمبر کی بات نہ مانی اور اِن کے معجزات دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لائی تو دو صورتوں میں سے ایک صورت نافذ ہوکر رہی ہے۔

(۱) یا تو اُس قوم پر آسمانی عذاب بھیج کر سب کو فنا کردیا گیا جیسے عاد و ثمود اور قوم لوطؑ و قوم صالحؑ کے ساتھ معاملہ کیا گیا۔

(۲) یا پھر یہ صورت ہوتی ہے کہ اللہ اپنے نبی کو اس دار الکفر سے

ہجرت کر جانے کا حکم دیتا ہے اور وہاں اُس نبی کو ایسی قوت و تائید
نصیب ہوتی ہے کہ وہ پھر اپنی قوم پر فتح پاتا ہے جیسے حضرت ابراہیم
علیہ السلام نے عراق سے ہجرت کی اور ملک شام میں پناہ لی۔ اسی طرح
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر سے ہجرت کر کے مَدْیَنْ میں قیام کیا۔ اور
آخر میں حضرت خاتم الانبیاء علیہ السلام مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ
میں مقیم ہو گئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہی دوسری صورت اختیار فرمائی اور انھیں یہودیوں کے نرغہ سے بچانے کے لئے آسمان پر اُٹھا لیا اور ان کی ہجرت گاہ آسمان قرار پایا۔ اور یہ خصوصی موقف اس لئے قرار پایا کہ انھیں قیامت کے قریب دوبارہ زمین پر آنا تھا۔

الغرض یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے یا سُولی دینے کی سازشوں میں مشغول تھے اور اپنی دانست میں ایسی تدبیریں اور مکر و فریب اختیار کر رہے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کس طرح زندہ باقی نہ رہیں لیکن خالقِ کائنات نے ان مخالفین اور معاندین کی ساری تدبیریں، ساری سازشیں اُلٹ دیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی کی موت سے بچا لیا۔

اہلِ کتاب یہود اور نصاریٰ دونوں کا مشترک بیان ہے کہ یہودیوں کے سردار اور کاہنوں کو یہ اطلاع ملی کہ اس وقت حضرت مسیح علیہ السلام لوگوں کی بھیڑ سے الگ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایک بند مکان میں موجود ہیں۔ یہ موقع انھیں بہتر نظر آیا فوراً ہی ایک ہجوم مکان پر پہنچ گیا اور چاروں طرف سے مکان کا محاصرہ کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کر لیا اور توہین و تذلیل کرتے ہوئے بادشاہ پیلاطیس کے دربار میں لے گئے تاکہ وہ اِن کو سُولی دے دے۔ اِدھر ملک کی عدالت نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر قوم دشمنی اور مذہبی اختلاف کی وجہ سے واجب القتل ہونے کا فیصلہ صادر کر دیا تھا۔ یہودیوں کے اصرار پر بادشاہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب سپاہی بھیجے کہ اُنھیں سُولی کا لباس پہنا کر لایا جائے۔ یہودی سپاہی جب قید خانے میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اُنہی میں کے ایک شخص کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صورت و شکل میں

تبدیل کر دیا اور وہ بالکل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صورت وشکل جیسا ہوگیا۔ اسکے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی قاہرانہ قدرت کے ذریعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا۔ قرآن حکیم کے یہ واضح الفاظ ہیں:۔

وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ ۚ الآیۃ

وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ۚ الآیۃ (النساء آیت ۱۵۷)

حالانکہ نہ وہ آپ کو قتل کر سکے اور نہ آپ کو سولی ہی پر چڑھا سکے بلکہ معاملہ ان کے لئے مشتبہ کر دیا گیا۔ اور یقینی بات ہے کہ انھوں نے آپ کو قتل نہیں کیا، البتہ اللہ نے آپ کو اپنی طرف اٹھالیا۔

تاریخ کا بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سزائے موت اگرچہ رومی عدالت سے ملی اور وہی ملکی عدالت نفاذِ سزا پر قادر تھی لیکن آپ کو سزا دلوانے میں اور آپ کیلئے سزائے موت سنوانے میں تمامتر یہودی ہاتھ کام کر رہا تھا۔ اسی لئے قرآن حکیم نے اقدامِ قتل کی ذمہ داری یہود ہی پر رکھی ہے۔

چاروں انجیل اتنے جزء پر تو متفق ہیں کہ رومی عدالت کا حاکم پیلاطیس (جو عیسائی تھا) آپ کو سزا دینا ہرگز نہیں چاہتا تھا بلکہ اس سے برابر بچ رہا تھا۔ یہ یہودی ہی تھے کہ انھوں نے جھوٹا استغاثہ گھڑا، گواہیاں فراہم کیں اور بلوہ و فساد کی دھمکی دے دیکر عدالت کو سزائے موت سنانے پر مجبور کیا۔

انجیل متی کا ایک مختصر بیان یہ ہے:۔

جب پیلاطیس نے دیکھا کہ کچھ نہیں بن پڑتا بلکہ الٹا بلوہ ہوا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا کہ میں راست باز کے خون سے بری ہوں، تم جانو! سب لوگوں نے کہا اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر، اس پر اس نے برابا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالہ کر دیا تاکہ صلیب دی جائے۔ (انجیل آیت ۲۴، ۲۵، ۲۶)

انجیل لوقا میں مزید یہ صراحت ملتی ہے:۔

حاکم نے ملزم کو سزائے موت سے بچانے کی تین بار کوشش کی لیکن یہود نے ہر دفعہ اسکی بات کو رد کر دیا۔ (آیت ۲۲، ۲۳)

اسی طرح قدیم تاریخوں میں خود یہودیوں کی لکھی ہوئی عبارتوں میں اس بات پر فخر کا اظہار کیا گیا ہے کہ حضرت مسیح کو ہلاک کرنے کی ساری جد وجہد ہمارے ہی سر ہے۔

قرآن حکیم نے صراحت و وضاحت کے ساتھ یہ بتایا کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے قتل یا صلیب کی پوری داستان سرتاسر غلط اور جھوٹ ہے بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جسمانی زندگی کے ساتھ آسمان کی جانب اُٹھا لیا گیا اور اسکے بعد دشمن مکان کے اندر گھس پڑے تو اُن پر صورتِ حال مشتبہ کر دی گئی اور وہ کسی طرح بھی نہ جان سکے کہ آخر اس مکان میں سے مسیح (علیہ السلام) کہاں چلا گیا۔

قرآن حکیم نے "رفع الی السماء" کے اس معجزانہ واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے:۔

قرآنی مضمون

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ ۔الخ (النساء آیات ۱۵۷، ۱۵۸)

(اور یہود ملعون قرار دیئے گئے) اپنے اس قول پر کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم اللہ کے رسول کو قتل کر ڈالا۔ حالانکہ انھوں نے نہ انکو قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا بلکہ (اللہ کی خُفیہ تدبیر کی بدولت) اصل معاملہ اُن پر مشتبہ ہو کر رہ گیا اور جو لوگ ان کے قتل کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں بلاشبہ وہ اس (عیسیٰ) کی جانب سے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ اِن کے پاس حقیقتِ حال کے بارے میں ظنّ (اٹکل) کی پیروی کے سوا علم کی روشنی نہیں ہے اور انھوں نے عیسیٰ کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو اپنی جانب اٹھا لیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے"

امام تفسیر ضحاکؒ فرماتے ہیں کہ جب یہود نے حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کا ارادہ کیا تو آپ کے حواری ایک جگہ جمع ہوئے اور حضرت مسیح علیہ السلام بھی اُن کے ہاں تشریف لائے۔ ابلیس شیطان نے یہودیوں کی اُس جماعت کو جو حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کے لئے تیار کھڑی تھی حضرت مسیح علیہ السلام کا پتہ دیا۔ اسپر چار ہزار آدمیوں

آدمیوں نے مکان کا محاصرہ کر لیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایک شخص اس بات کے لئے آمادہ ہے کہ وہ باہر نکلے اور اُسکو قتل کر دیا جائے پھر وہ جنّت میں میرے ساتھ ہوگا۔ اِن میں سے ایک شخص نے اپنے آپ کو اسکے لئے پیش کیا آپ نے اپنا عمامہ اور کرتا اسکو عطا کیا پھر اُس شخص پر اللہ کی جانب سے حضرت مسیحؑ کی شباہت ڈال دی گئی۔ جب وہ شخص باہر نکل آیا تو یہود نے اُسے پکڑ لیا اور سولی پر چڑھا دیا اِدھر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اُٹھا لیا۔

بعض روایات میں یہ بھی صراحت ملتی ہے کہ یہودیوں نے ایک شخص کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے واسطے بھیجا تھا جب وہ شخص اُس مکان میں داخل ہوا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ پایا اور باہر نکلا تو اُسکی شکل حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسی تھی یہودیوں نے اسکو پکڑ لیا اور اُس کے لاکھ انکار کے باوجود اُس کو عیسیٰ سمجھ کر قتل کر دیا۔ (مظہری)

قتل کے بعد بھی بعض یہودیوں کو احساس ہوا انھوں نے آپس میں کہا کہ ہم نے اپنے ہی آدمی کو قتل کیا ہے اس لئے کہ یہ مقتول چہرے میں تو مسیح بن مریم کے مشابہ ہے لیکن باقی جسم اُن جیسا نہیں ہے۔ اور یہ کہ اگر یہ مقتول مسیح ہیں تو ہمارا آدمی کہاں ہے؟ اور اگر یہ آدمی ہمارا ہے تو مسیح کہاں گیا؟ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ الآیۃ کی ایک تفسیر یہ بھی ہے۔

الغرض حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کر کے طرح طرح کے دعوے کیے گئے اور یہ سب شک اور اٹکل کی باتیں تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یقیناً قتل نہیں کیا اور نہ سولی پر چڑھایا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف بلا لیا۔

اس واقعہ کے اختتام پر قرآن حکیم میں یہ آیت موجود ہے:۔

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ الآیۃ

(نساء آیت ۱۵۹)

آیت کی دو تفسیریں منقول ہیں ایک یہ کہ مَوْتِهٖ کی ضمیر اہل کتاب کی جانب مانی جائے تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ یہود (اہل کتاب) اپنی موت سے چند لمحے پیشتر جب کے

عالم برزخ کو دیکھیں گے تو عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آئیں گے اگرچہ اُس وقت کا ایمان لانا انھیں کوئی نفع نہ دے گا جس طرح کہ فرعون کو اُسکے اس ایمان نے فائدہ نہ دیا جو غرق ہونے کے وقت لایا تھا۔

دوسری تفسیر جسکو صحابہ وتابعین کی ایک بڑی جماعت نے اختیار کیا اور ایک حدیث صحیح سے بھی اُس کی تائید ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مَوْتِہٖ کی ضمیر کو حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف راجع کیا جائے۔ اب آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) اگرچہ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لاتے ہیں لیکن جب قیامت کے قریب وہ زمین پہ نازل ہوں گے تو یہ سب اہل کتاب اُن پر صحیح طور پر ایمان لے آئیں گے۔ اُس وقت کفر اپنی تمام اقسام کے ساتھ دنیا سے فنا کر دیا جائے گا اور زمین پر صرف اسلام ہی کی حکمرانی ہوگی۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ایک عادل حکمراں بنکر زمین پر نازل ہوں گے اور وہ دجّال اور خنزیر کو قتل کر دیں گے صلیب کو توڑ ڈالیں گے۔ اُن کے زمانے میں عبادت صرف رب العالمین ہی کی ہوگی۔

اسکے بعد حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا اگر تم چاہو تو قرآن حکیم کی یہ آیت بھی پڑھ لو جسمیں اس حقیقت کا ذکر کیا گیا ہے کہ اہل کتاب میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا مگر یہ کہ وہ اُن پر اُن کی موت سے پہلے ایمان لے آئے گا۔ یہ کلمہ آپ نے تین بار دہرایا۔ "قَبْلَ مَوْتِ عِيسَىٰ"
(قرطبی)

اس تفسیر کی بنا پر یہ آیت وضاحت کرتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ابھی نہیں ہوئی وہ قیامت کے قریب جب آسمان سے نازل ہوں گے اور اپنی ذمہ داریاں پوری کرینگے تب اس زمین پر ان کی وفات ہوگی۔ اس حقیقت کی تائید مزید سورہ زخرف کی آیت سے بھی ہوتی ہے:۔

وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ۔

(زخرف آیت ۶۱)

یعنی عیسیٰ (علیہ السلام) قیامت کے یقین کا ایک ذریعہ ہیں۔ لہٰذا تم قیامت کے آنے میں شک نہ کرو اور میرا کہا مانو یعنی جب وہ قیامت کے قریب آسمان سے اُتر پڑیں گے یہ حقیقت خود بخود ثابت ہو جائے گی کہ قیامت کا عقیدہ حق ہے۔ اس آیت کی ایک دوسری قرأت "لَعَلَمٌ" بھی منقول ہے۔ اس سے یہ معنی اور زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔ عَلَم کے معنی علامت کے ہیں۔ (یعنی حضرت عیسیٰ قیامت کی علامت ہیں) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس علامت سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جو قیامت سے پہلے تشریف لائیں گے۔ (ابن کثیر)

شاہد یوم القیامہ

قیامت کے دن عام انسانوں سے پہلے تمام انبیاء ورسل کو جمع کیا جائے گا اور ان سے جواب طلب کیا جائے گا کہ تمہاری امتوں نے تمہاری دعوت وتبلیغ پر تم کو کیا جواب دیا؟

یہ وقت اُمتوں کے لئے بڑا نازک اور ہوش رُبا ہوگا۔ کیونکہ وہاں ہر امت اپنے نبی کی سفارش وشفاعت کے انتظار میں ہوگی اور یہ توقع لگائے ہوئے ہونگے کہ نجات کا کوئی ذریعہ ہے تو بس یہی ایک صورت ہے لیکن جب رب العالمین سے خود یہ سوال سنا جائیگا کہ بتاؤ تمہاری امتوں نے تم کو کیا جواب دیا۔ تو رہی سہی توقع بھی ختم ہو جائیگی۔ رب العالمین کا یہ ابتدائی سوال تمام رسولوں سے بحیثیت مجموعی ہوگا۔ پھر ایک ایک رسول سے الگ الگ شہادت لی جائیگی۔ اس سلسلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جو سوال کیا جائے گا اُسکو قرآن حکیم نے بطور خاص نقل کیا ہے۔

قرآنی مضمون

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ الخ (مائدہ آیات ۱۱۶ تا ۱۲۰)

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جبکہ اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) فرمائیں گے اے عیسیٰ بن مریم کیا تم نے اُن لوگوں سے

کہدیا تھا کہ مجھکو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) اور میری ماں (سیدہ مریمؑ) کو بھی اللہ کے علاوہ معبود قرار دے لو۔ عیسیٰ (علیہ السلام) عرض کریں گے کہ (توبہ توبہ) میں تو (خود اپنے عقیدے میں) آپکو (شریک سے) منزہ سمجھتا ہوں (تو ایسی حالت میں) مجھکو کسی طرح زیبا نہ تھا کہ میں ایسی بات کہتا جسکے کہنے کا مجھکو کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے (واقع میں) کہا ہوگا تو آپ کو اس کا (یقیناً) علم ہوگا۔

آپ تو میرے دل کے اندر کی بات بھی جانتے ہیں۔ اور میں تو (دیگر مخلوقات کی طرح اتنا عاجز ہوں کہ) آپکے علم میں جو کچھ ہے اسکو نہیں جانتا۔ پس تمام غیبوں کے جاننے والے آپ ہی ہیں۔

میں نے تو اُن سے اور کچھ نہیں کہا صرف وہی بات جو آپنے مجھ سے کہنے کو فرمایا تھا کہ تم اللہ تعالےٰ کی بندگی اختیار کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے اور میں ان (کی حالت) پر مطلع رہا جب تک ان میں موجود رہا پھر جب آپ نے مجھکو اُٹھالیا تو آپ اُنکے احوال پر مطلع رہے (اسوقت کی مجھکو کچھ خبر نہیں) اور آپ ہر چیز کی پوری خبر رکھتے ہیں۔ اگر آپ اُن کو سزا دیں یہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ ان کو معاف فرمائیں تو آپ زبردست (قدرت والے) ہیں اور حکمت والے ہیں۔ (اسکے بعد) اللہ تعالےٰ ارشاد فرمائیں گے یہ وہ دن ہے کہ جو لوگ سچے تھے ان کا سچا ہونا ان کے کام آئے گا۔ اُن کو باغ ملیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ تعالےٰ اُن سے راضی اور خوش اور یہ اللہ تعالیٰ سے راضی اور خوش ہیں یہ بڑی بھاری کامیابی ہے۔"

آیات بالا کی تفسیر میں مشہور محدث حافظ ابن عساکرؒ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے ایک حدیث صحیح نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو تمام انبیاء علیہم السلام کو اور ان کی امتوں کو بلایا جائے گا اور عیسیٰ علیہ السلام بھی بلائے

جائیں گے۔ اللہ تعالےٰ پہلے ان کے سامنے اپنی ان نعمتوں کو شمار کرائینگے جو دنیا میں اُن پر نازل ہوتی رہی ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُن سب کا اعتراف کریں گے۔ اسکے بعد اللہ تعالےٰ ارشاد فرمائیں گے ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ الآیہ اُے عیسیٰ کیا تم نے اپنی قوم سے یہ کہا تھا کہ مجھکو اور میری ماں مریم کو اللہ کے علاوہ معبود قرار دے لو؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کا انکار فرمائیں گے۔ پھر نصاریٰ کو بلایا جائے گا اور اُن سے یہی سوال کیا جائے گا۔ یہ لوگ دروغ بیانی کرتے ہوئے کہیں گے کہ ہاں عیسیٰ نے ہم کو یہی تعلیم دی تھی۔ یہ سنکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر سخت خوف طاری ہو جائے گا، بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے اور خشیتِ الٰہی سے سجدہ ریز ہو جائیں گے اور یہ مدت ان کو ایک ہزار سال معلوم ہوگی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نصاریٰ کے خلاف حجت قائم کردی جائیگی اور اُن کی خود ساختہ صلیب پرستی کی حقیقت کھول دی جائیگی اور اس کے بعد اُن سب کو جہنم میں جھونک دیا جائیگا۔

(تفسیر ابن کثیر ج ا سورۂ مائدہ)

نتائج و عبر

حُلیۂ مُبارک بخاری کی حدیثِ معراج میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

میری ملاقات حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہوئی تو میں نے اُن کو درمیانہ قد، سُرخ و سپید پایا۔ بدن ایسا صاف شفاف تھا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی حمام سے نہا کر آئے ہیں۔ اور بعض دوسری روایات میں ہے کہ آپ کے زُلف کاندھوں تک لٹکے ہوئے تھے۔ (بخاری شریف)

حضرت مسیح علیہ السلام کا حلقہ دعوت و تبلیغ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنہیں کتاب انجیل دی گئی تھی۔ یہ کتاب دراصل تورات کا تکملہ تھی یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمی اساس اگرچہ تورات ہی پر قائم تھی مگر یہودیوں کی گمراہیوں اور مذہبی بغاوتوں اور تورات میں تحریفات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی معرفت انجیل کی شکل میں ایک اصلاحی کتاب نازل کی جو یہودیوں کی عملی اور اعتقادی گمراہی کے لئے اصلاح کا کام دیتی تھی۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے مبعوث ہو کر ان سب کی اصلاح کے لئے قدم اُٹھایا تاہم چند اہم بنیادی باتیں خصوصیت کے ساتھ قابل اصلاح تھیں جنکی اصلاح و درستگی کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام بہت زیادہ سرگرم عمل رہے۔

یہودیوں میں بنیادی طور پر چار مختلف نظریات کی جماعتیں یا افراد پیدا ہو گئے تھے جو بے دینی اور مذہبی انتشار کے باعث تھے۔

(۱) ان میں کی ایک جماعت کا یہ خیال تھا کہ انسان کے اعمال خواہ نیک ہوں یا بد اس کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے باقی قیامت، آخرت، حشر و نشر، حساب کتاب یہ سب باتیں غلط ہیں۔ اس نظریہ کی جماعت "صدوقی" کہلاتی تھی۔

(۲) دوسری جماعت اگرچہ آخرت اور حشر و نشر کو حق سمجھتی تھی مگر ساتھ ہی یہ یقین رکھتی تھی کہ اللہ کی رضا و خوشنودی کے لئے لذاتِ دنیا اور اہل دنیا سے کنارہ کش ہو کر زہد کی زندگی اختیار کی جائے۔ چنانچہ اس قسم کے لوگ شہروں اور آبادیوں سے دُور خانقاہوں اور بیابانوں میں رہنا پسند کرتے تھے مگر یہ جماعت حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے کچھ پہلے اپنی یہ حیثیت بھی کھو چکی تھی اور اب ترک دنیا کے پردے میں دنیا کی ہر قسم کی گندگی میں آلودہ تھی۔ ظاہر حال صوفیوں اور زاہدوں کا سا تھا مگر خلوت کدوں میں وہ سب کچھ ہوتا تھا جن سے رندانِ بادہ خوار بھی ایک مرتبہ حیا و شرم سے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ فرقہ "فریسی" کہلاتا تھا۔

(۳) تیسری جماعت قوم کے مذہبی راہ و رسم اور خدمت ہیکل (مسجد) سے متعلق تھی لیکن ان

کا بھی یہ حال تھا کہ جن رسوم و خدمات کو لوجہ اللہ کرنا چاہیئے تھا اور جن اعمال کے نتائج خلوص و تقویٰ پر مبنی تھے اِن کو تجارتی کاروبار بنالیا تھا اور جب تک ہر ایک رسم پر بھینٹ اور نذرانہ نہ لیتے تھے قدم نہ اُٹھاتے حتیٰ کہ اس مقدس کاروبار کے لئے انھوں نے تورات کے احکام تک میں تحریف کر دی تھی۔ یہ لوگ "کاہن" کہلاتے تھے۔

(۴) چوتھی جماعت ان سب پر حاوی اور مذہب کی اجارہ دار تھی۔ اس جماعت نے عوام میں آہستہ آہستہ یہ عقیدہ پیدا کر دیا تھا کہ مذہب اور دین کے اصول و اعتقادات کچھ نہیں ہیں مگر وہ جن پر یہ لوگ صاد کر دیں اِن کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دیں ضرورت اور تقاضہ کے وقت اضافہ یا کمی کر دیں، جس کو چاہیں جنت کا پروانہ لکھ دیں اور جس کو چاہیں جہنم کی سند تحریر کر دیں اللہ کے ہاں اِن کا یہ فیصلہ اٹل اور قطعی ہوتا ہے۔ یہ "اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ" بنے بیٹھے تھے اور تورات کی لفظی و معنوی تحریف میں اس درجے جری اور حریص تھے کہ اسکو دنیا طلبی کا مستقل ذریعہ اور سرمایہ بنالیا تھا۔ عوام اور خواص کی خوشنودی کیلئے معمولی معمولی نفع کے لئے احکام دین کو بدل ڈالنا ان کا مشغلۂ دینی تھا۔ یہ لوگ "اُحبار یا فقیہ" کہلائے جاتے تھے۔

یہ تھیں وہ جماعتیں اور یہ تھے ان کے وہ عقائد و اعمال جنکی اصلاح کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ آپ نے ہر ایک جماعت کے فاسد عقائد و اعمال کا جائزہ لیا۔ رحم و شفقت کے ساتھ اُن کے عیوب و نقائص پر متنبہ کیا۔ اصلاح حال کے لئے ترغیب دی اور اسکے لئے آپ نے اپنی زندگی وقف کر دی مگر اِن بدبختوں نے اپنے اعمال سیاہ کی اصلاح کر یکسر انکار کر دیا اور نہ صرف یہ بلکہ آپ کو "مسیح ضلالت" کہہ کر انکی پاکیزہ دعوت و تبلیغ کے دشمن ہو گئے اور ان کے خلاف سازشیں کر کے ان کی جان کے درپے ہو گئے۔

قرآن حکیم کی آیاتِ ذیل اِن کے اِن اعمال بد اور اعتقاد باطل کا اس طرح تذکرہ کرتی ہیں۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ
هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا الآیہ (بقرہ آیت ۷۹)

پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھوں
سے شریعت کا نوشتہ لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس
سے آیا ہوا ہے تاکہ اسکے معاوضہ میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کریں۔
اور لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز نہیں چھونے
والی ہے الا یہ کہ چند روز کی سزا مل جائے تو مل جائے۔

یہ یہودیوں کی عام غلط فہمی تھی جسمیں ان کے عامی اور عالم سب مبتلا تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کچھ کریں بہرحال ہم اللہ کے بیٹے ہیں لہذا دوزخ کی آگ ہم پر حرام ہے۔

یَاَھْلَ الْکِتَابِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَکْتُمُوْنَ
الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (آل عمران آیت ۷۱)

اے اہل کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مشتبہ
بناتے ہو؟ کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو؟

وَیَقُوْلُوْنَ ھُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ وَمَا ھُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ الآیۃ
(آل عمران آیت ۷۸)

اور وہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں یہ اللہ کی طرف سے
ہے۔ حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا۔

وَکَیْفَ یُحَکِّمُوْنَکَ وَعِنْدَھُمُ التَّوْرٰۃُ فِیْھَا حُکْمُ اللّٰہِ ثُمَّ
یَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ۔ (المائدہ آیت ۴۳)

اے نبی یہ لوگ آپ کو کیسے حَکَم (فیصلہ کرنے والا) بناتے ہیں جبکہ
ان کے پاس تورات موجود ہے جس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے اور پھر یہ
اس سے منہ موڑ رہے ہیں۔

یہاں خاص طور پر جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ تھا کہ خیبر کے معزز یہودی خاندان میں سے ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ناجائز تعلق پایا گیا۔ تورات کی رُو سے ان کی سزا سنگساری تھی لیکن یہودی علماء اس سزا کو نافذ کرنا نہیں چاہتے تھے اس لئے اُنھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس مقدمہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاکم بنایا جائے اگر وہ سنگساری کے سوا کوئی اور حکم دیں تو قبول کر لیا جائے اور اگر سنگساری ہی کا حکم دیں تو قبول

نہ کیا جائے۔ چنانچہ یہ مقدمہ آپ کے پاس آیا آپ نے قرآنی حکم کے مطابق سنگساری ہی کا حکم دیا لیکن اُن لوگوں نے حکم ماننے سے انکار کیا۔ اسپر آپ نے پوچھا کہ تمہارے مذہب میں اسکی کیا سزا ہے ؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ کوڑے مارنا اور منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرا دینا۔ آپؐ نے اُنکے علمار کو قسم دے کر پوچھا کیا تورات میں شادی شدہ زانی، زانیہ کی یہی سزا ہے ؟ اسپر اُن علمار نے پھر وہی جھوٹ بولا۔ لیکن اُن میں ایک شخص ابن صُوریا نامی خود یہودیوں کے مطابق اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم تھا خاموش رہا۔ آپؐ نے اُس سے مخاطب ہوکر فرمایا میں تجھے اُس اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے تم لوگوں کو فرعون سے بچایا اور کوہِ طور پر تمہیں شریعت عطا کی۔ کیا واقعی تورات میں زنا کی یہی سزا لکھی ہے ؟ اُس نے جواب دیا کہ اگر آپ مجھے ایسی بھاری قسم نہ دیتے تو میں نہ بتاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ زنا کی سزا تو سنگساری ہی ہے مگر ہمارے ہاں جب زنا کی کثرت ہوئی تو ہمارے حکام نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بڑے لوگ زنا کرتے تو انھیں چھوڑ دیا جاتا اور چھوٹے لوگوں سے یہی حرکت سرزد ہوتی تو اُنھیں سنگسار کر دیا جاتا تھا۔ پھر جب عوام میں اس یکطرفہ عمل سے ناراضی پیدا ہوگئی تو ہم نے تورات کے قانون ہی کو بدل دیا اور یہ قاعدہ بنا لیا کہ زانی اور زانیہ کو کوڑے لگائے جائیں۔ اور انھیں منہ کالا کر کے گدھے پر اُلٹے منہ سوار کرایا جائے۔

جب یہ حقیقت کھُل گئی تو یہودیوں کو کچھ بولنے کی گنجائش نہ رہی۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے زانی اور زانیہ کو سنگسار کر دیا گیا۔

قرآن حکیم کی اس آیت نے اِن لوگوں کی بددیانتی کو بے نقاب کر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوگیا کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے جس نے ایک گمشدہ حقیقت کو برمحل ظاہر کر دیا اور یہودی علمار نے بھی اسکی تصدیق کر دی۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ الخ

(بقرہ آیت ۸۹)

اور جب اُن کے پاس ایک کتاب اللہ کی جانب سے پہنچ گئی (قرآن حکیم) جو تصدیق کرنے والی اُس (کتاب) کی جو اُن کے پاس (پہلے سے) موجود ہے۔ (تورات) اور یہ لوگ اُس کتاب کی آمد سے پہلے خود کفار کے مقابلہ میں فتح ونصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے مگر جب وہ چیز

آگئی جسکو وہ پہچان بھی گئے تو انھوں نے ماننے سے انکار کر دیا، اللہ کی لعنت اِن انکار کرنے والوں پر۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے یہودی بے چینی کے ساتھ اُس نبی کے منتظر تھے جسکی بعثت کی پیشین گوئیاں اُن کے انبیاء نے کی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ دُعائیں مانگا کرتے تھے کہ وہ نبی جلد مبعوث ہو جائے تاکہ کفار کا غلبہ ختم ہو جائے اور ہم اُن کا ساتھ دیکر اپنے عروج کا دور شروع کریں۔ خود اہل مدینہ اس بات کے شاہد تھے کہ بعثت محمدی سے پہلے ان کے ہمسایہ یہودی ظلم و مصیبت کے وقت یہ کہا کرتے تھے کہ اچھا اب تو جس جس کا جی چاہے ہم پر ظلم کرلے جب وہ نبی آئے گا تو ہم اِن سب ظالموں کو دیکھ لیں گے۔

اہل مدینہ کو یہودیوں کی یہ باتیں خوب یاد تھیں۔ چنانچہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو اہل مدینہ نے آپس میں کہا کہ دیکھنا کہیں یہودی اسلام لانے میں ہم سے سبقت نہ لے جائیں چلیں ہم ہی پہلے اُس نبی پر ایمان لائیں۔ مگر ان کیلئے یہ عجیب بات تھی کہ وہی یہودی جو آنے والے نبی کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے تھے اُن کے آنے پر سب سے بڑھکر اُن کے مخالف ہو گئے۔

اس سلسلے کی سب سے زیادہ قابل اعتماد شہادت ام المومنین سیدہ صفیہؓ کی ہے جو خود ایک بڑے یہودی عالم کی بیٹی تھیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو میرے باپ اور چچا جو دونوں بڑے عالم تھے آپؐ سے ملنے کے لئے گئے بڑی دیر تک آپؐ سے گفتگو کی پھر گھر واپس آئے تو میں نے خود اپنے کانوں سے ان دونوں کو یہ یہ گفتگو کرتے سنا۔

چچا نے کہا کیا یہ واقعی وہی نبی ہیں جس کی خبریں ہماری کتابوں میں دی گئی ہیں؟
باپ نے کہا اللہ کی قسم یہ وہی معلوم ہوتے ہیں۔ چچا نے پوچھا کیا آپ کو اس کا کامل یقین ہے؟

والد نے کہا! ہاں ایسے ہی یقین ہے جیسے کہ ہم اپنے بچوں کو اپنا ہی سمجھتے ہیں۔
اسپر چچا نے پوچھا پھر آپ کا کیا ارادہ ہے؟
والد نے جواب دیا حقیقت تو یہی ہے لیکن جب تک جان میں جان ہے انکی مخالفت کروں گا اور انکی بات چلنے نہ دوں گا۔ (سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۶۵)

واقعہ یہ ہے کہ یہودی علماء یہ چاہتے تھے کہ آنے والا نبیؐ ان کی اپنی قوم بنی اسحاق میں پیدا ہوا مگر جب وہ دوسری قوم بنو اسمٰعیل میں پیدا ہوا جسے وہ اپنے مقابلہ میں ہیچ سمجھتے تھے تو اُسکے انکار پر آمادہ ہو گئے۔

وَتَرٰی كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. الآیۃ (المائدہ آیت ۶۲)

تم دیکھتے ہو کہ اِن میں سے بکثرت لوگ گناہ اور ظلم وزیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں اور حرام کے مال کھاتے ہیں، بہت بُری حرکات ہیں جو یہ کر رہے ہیں۔

تعجب تو یہ ہے کہ ان کے علماء ومشائخ بھی ان کو اِن بُرے کاموں سے روکا نہیں کرتے تھے بلکہ کہیں چپ سادھ لیتے تھے اور کبھی خود بھی شریکِ گناہ ہو جاتے، یہ قوم کے راہنما تھے۔ چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ الآیۃ (توبہ آیت ۳۱)

انھوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے اور اسی طرح مسیح بن مریم کو بھی حالانکہ ان کو صرف ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔

مشہور سخی حاتم طائی کے بیٹے عدی بن حاتمؓ مشرف باسلام ہو کر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو منجملہ سوالات ایک سوال یہ بھی کیا تھا یارسول اللہ قرآن حکیم نے یہودیوں کو یہ الزام دیا ہے کہ اُنھوں نے اپنے علماء ومشائخ کو معبود بنا لیا ہے حالانکہ یہودیوں کی پوری تاریخ اس واقعہ سے خالی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ انکے علماء ومشائخ جو کچھ بھی لوگوں پر حرام کر دیتے اسکو یہ لوگ حرام مان لیتے تھے اور جو کچھ بھی یہ حلال کر دیتے اسکو لوگ حلال مان لیتے تھے۔ اسپر عدی بن حاتمؓ نے عرض کیا ہاں یہ تو ضرور ہوتا تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا بس یہی تو ان کو معبود بنا لینا ہوا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الخ
(توبہ آیت ۳۴)

اے ایمان والو اِن اہل کتاب کے اکثر علماء، و مشائخ کا یہ حال
ہے کہ وہ لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور انھیں اللہ کی
سیدھی راہ سے روکتے ہیں۔

یعنی ظالم صرف یہی نہیں کرتے کہ رشوتیں کھاتے، نذرانے لوٹتے، سود کھاتے بلکہ ایسے ایسے طریقے ایجاد کرتے جو اللہ تعالےٰ کی سیدھی راہ سے پھیرنے والے ہوتے اور جس میں انکو اپنا اور صرف اپنا ہی اقتدار نظر آتا۔ اپنی معمولی معمولی اغراض کی خاطر یہ خلقِ خدا کو گمراہیوں کے چکر میں پھنسائے رکھتے۔ یہ عمل انکی زندگی کے لیل ونہار تھے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَأْخُذُوْنَ عَرَضَ
هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا الآیہ (اعراف آیت ع۱۶۹)

پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے
جو کتاب الٰہی کے وارث ہو کر اسی دنیائے دنی کے فائدے سمیٹتے رہے اور
یہ کہتے رہے کہ ہمیں توقع ہے کہ معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہی متاعِ دنیا
پھر سامنے آجاتی تو پھر لپک کر اُسے لے لیتے۔

یعنی گناہ کرتے اور جانتے کہ یہ گناہ ہے مگر اس بھروسے پر اس کا ارتکاب کر لیتے کہ کسی نہ کسی طرح بخشش ہو جائیگی اور اسی گمراہی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ گناہ کر کے شرمندہ نہیں ہوتے بلکہ پھر ویسے ہی گناہ کا موقع سامنے آجاتا تو پھر اُس میں مبتلا ہو جاتے۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ الآیۃ (مائدہ آیت ع۴۲)

جھوٹ کے بڑے سننے والے، حرام کے بڑے کھانیوالے۔

یہ دو لفظ مبالغہ کے ہیں یعنی یہ نہیں کہ یہ لوگ کبھی کبھی جھوٹ میں پڑ جاتے ہیں اور کبھی کبھی رشوت وحرام بھی لے لیتے ہیں بلکہ یہ دو صفت گویا اُن کے خمیر و سرشت میں داخل ہو گئے ہیں یعنی جھوٹ اور حرام کھانے کے ماہر ہیں۔

یہ وصف یہود کے خواص اور علماء دونوں میں پیدا ہو گئے تھے جو رشوت اور نذرانے لے لے کر غلط سلط احکام بتاتے اور حق کو مسخ کر دینے کے عادی ہو گئے تھے۔

علامہ رازی نے سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ کے معنی سَمّٰعُوْنَ لِاَجْلِ الْكَذِبِ بیان کئے ہیں یعنی یہودیوں کے یہ علماء ومشائخ اسلام کی خبریں اس لئے سنتے ہیں کہ جھوٹ بولیں اور

اسکی غلط شہرت دیں۔ (کبیر)

اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ۔ اکّال۔ اکل سے ماخوذ ہے لیکن اسکے معنی میں مبالغہ شامل ہے یعنی مال حرام اور رشوت کے تھوڑے حصے پر مطمئن ہونے والے نہیں بلکہ رشوت کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹنے والے اور اس پر بھی بس کرنے والے نہیں، دراصل جب حرام خوری کی عادت ہوجاتی ہے تو پھر بھوک اور بڑھ جاتی ہے۔

اناجیلِ اربعہ

حضرت مسیح علیہ السلام پر جو کتاب انجیل نازل ہوئی تھی کیا موجودہ چاروں انجیل وہی ہیں یا یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد کی تصانیف ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جسپر صدیاں گزرجانے کے بعد بھی سوال بدستور باقی ہے۔ اور عیسائیت پر اسلام کا یہ ایسا بھاری قرضہ ہے جسکی ادائیگی کے لئے وہ عاجز و درماندہ ہے۔

تمام اہل علم کا جسمیں علمار نصاریٰ بھی شامل ہیں اتفاق ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی انجیل نہیں ہے اور نہ اس کا خالص ترجمہ ہے۔

موجودہ چاروں انجیلوں کے متعلق نصاریٰ کے ہاں ایسی کوئی سند یا دستاویز نہیں جسکی بنا پر وہ یہ کہہ سکیں کہ ان کی روایات کا سلسلہ یا ان کی ترتیب وتالیف کا زمانہ حضرت مسیح علیہ السلام یا ان کے شاگردوں (حواریوں) تک پہنچتا ہے۔ خود عیسائیت کی مذہبی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ پہلی صدی عیسوی سے چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک عیسائیوں میں اکیسؔ سے زیادہ انجیلیں الہامی یقین کی جاتی تھیں۔ لیکن ۳۲۵ئہ میں "نایسیا" کی کونسل نے اِن میں سے صرف چار کو منتخب کر کے باقی کو متروک اور غیر معتبر قرار دے دیا اور یہ انتخاب بھی کسی تاریخی یا علمی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک طرح کی فال نکالی گئی اور اس کو الہامی اشارہ تسلیم کر لیا گیا۔ ساری انجیلوں کو ایک تخت پر رکھ دیا گیا اور انجیل کی آیات اور اللہ کا نام اور اُس سے استعانت طلب کرتے ہوئے ایک ایک پر ہاتھ رکھا گیا جو زمین پر گرتے چلی گئی وہ نامقبول قرار پائی اور جو باقی رہی وہ حقیقی کتاب مقدس سمجھی گئی۔ اسطرح چار کتابیں گرنے سے رہ گئیں اور وہ یہ ہیں:۔

(۱) ان بقیہ چاروں انجیل میں سب سے قدیم متیؔ کی انجیل تسلیم کی جاتی ہے لیکن اسکے باوجود نصاریٰ کے قدیم علمار اس بات کے قائل ہیں کہ یہ انجیل متیٰ اصلی نہیں بلکہ اسکا

ترجمہ ہے اس لئے کہ اصل کتاب عبرانی زبان میں تھی جواب ناپید اور ضائع ہوگئی ہے اور موجودہ ترجمہ کے بارے میں قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اصل زبان کا ترجمہ ہے جبکہ مترجم کا نام تک معلوم نہیں اور نہ یہ پتہ کہ کس زمانے میں یہ ترجمہ ہوا ہے؟

(۲) دوسری انجیل مرقس کی ہے اسکے متعلق مشہور عیسائی عالم پطرس گواناگ اپنی کتاب "مُروج الاخبار فی تراجم الابرار" میں مرقس کی سوانح حیات پر لکھتا ہے کہ یہ نسلاً یہودی لاوی اور پطرس حواری عیسیٰ کا شاگرد تھا۔ رومیوں نے جب عیسائیت اختیار کرلی تو ان کے مطالبہ پر یہ انجیل تصنیف کی۔ سنہ ۶۸ء میں اسکندریہ کے قید خانے میں بت پرستوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

(۳) تیسری انجیل سینٹ لوقا کی انجیل ہے۔ جس قدر اختلاف علماء نصاریٰ میں متی کی انجیل کے بارے میں ہے اس سے بھی زیادہ لوقا کی انجیل کے بارے میں اختلاف موجود ہے۔ خود لوقا نے اپنی انجیل کی ابتداء میں یہ لکھا ہے کہ یہ انجیل اس نے تھاوفیلس کے ساتھ خط و کتابت کی بناء پر لکھی ہے وہ اسکو مخاطب کر کے لکھتا ہے کہ مسیح کی باتیں جن لوگوں نے کانوں سے سنی تھیں انھوں نے ہم تک جسطرح پہنچائی ہیں اُن کو بہت سے لوگ ہم سے نقل کر رہے ہیں اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اِن کو خود ہی صحیح طریقہ پر جمع کر دوں تاکہ تم کو صحیح حقیقت معلوم ہو جائے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لوقا نے حضرت مسیح کا زمانہ نہیں پایا۔ نیز علماء نصاریٰ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ لوقا کی انجیل مرقس کی انجیل کے بعد وجود میں آئی اور پطرس اور پولوس کے مرنے کے بعد تصنیف کی گئی ہے۔ (قصص الانبیاء للنجار ص ۴۴۲)

اصل بات یہ ہے کہ لُوقا شہر انطاکیہ میں طب کا پیشہ کرتا تھا۔ اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کو نہیں دیکھا اور مسیحیت کو سینٹ پال (پولوس) سے سیکھا اور سینٹ پال کے متعلق یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ وہ اصلاً متعصب یہودی تھا اور عیسائیت کا بدترین دشمن تصور کیا جاتا تھا اُسنے نصاریٰ کے خلاف علی الاعلان اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھا مگر جب اس نے یہ دیکھا کہ اسکی ہمہ قسم مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود مسیحیت ترقی کرتے جارہی ہے اور رُوکے نہیں رُکتی تب اُس نے مکر و فریب سے کام لیا اور اچانک اعلان کیا کہ مجھ سے ایک عجیب معجزہ سرزد ہوا میں

بحالتِ صحت تھا کہ ایک دم اس طرح زمین پر گرا جیسا کہ کوئی کُشتی میں پچھاڑ دیتا ہے اور اسی حالت میں حضرت مسیح علیہ السلام نے مجھ کو چھوا اور پھر سخت زجر و تنبیہ کی کہ آئندہ تو ہرگز میرے پیروی کرنے والوں کے خلاف کوئی اقدام نہ کرنا۔ پس میں اسی وقت حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لے آیا اور حضرت مسیح کے حکم سے مسیحی دنیا کی خدمت کے لئے مامور ہو گیا ہوں۔ حضرت مسیحؑ نے مجھ سے فرمایا کہ میں لوگوں کو مسیح کی انجیل کی بشارت سنا دوں اور اسکے اتباع کی ترغیب دوں۔ چنانچہ اس نے آہستہ آہستہ "کلیسا" پر ایسا قبضہ کیا کہ دین عیسوی کی اصل صداقتوں کو مٹا کر بدعتوں اور رسومات کا مجموعہ بنا ڈالا۔ اُلوہیت مسیح، تثلیث، ابنیّت، کفارہ کی بدعتوں کو ایجاد کر کے پوری مسیحیت کو بُت پرستی میں تبدیل کر دیا۔ آج جو مسیحیت قائم ہے وہ اسی پولوس کی ایجاد کردہ مسیحیّت ہے۔
اسکے بعد کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ پولوس کے شاگرد لوقا کی انجیل الہامی انجیل ہے؟ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ لوقا کی انجیل میں بیس سے زیادہ مواقع پر متی کی انجیل سے اضافہ ہے اور مرقس کی انجیل سے تو اس سے بھی کہیں زیادہ۔ اِن تمام دلائل سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ لوقا کی انجیل ہرگز الہامی نہیں ہے اور نہ کسی حواری عیسیٰ کی تصنیف ہے۔

۴) چوتھی انجیل یوحنا کی ہے اسکے متعلق نصاریٰ کا عام عقیدہ یہ ہے کہ یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے محبوب شاگرد یوحنا زبدی کی تالیف ہے۔ زبدی صیاد، یوحنا کے والد کا نام تھا۔ خلیل کے بیت صیدا میں ولادت ہوئی اور حواری عیسیٰؑ کا شرف پایا۔ نصاریٰ میں مشہور بارہ۱۲ حواریوں میں سے سب سے زیادہ انہی کو تقدیس و شرف حاصل ہے۔ عیسائی علماء لکھتے ہیں کہ جس زمانے میں شیرنیطوس اور انکی جماعت اپنے عقیدہ کی تشہیر کر رہی تھی کہ اُلوہیت مسیح (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں) کا عقیدہ باطل ہے۔ وہ بشر تھے اور سیدہ مریم کے بطن سے پیدا ہوئے اور سیدہ مریم سے قبل وہ عالم وجود میں نہیں تھے۔ یہ زمانہ ۹۶ء کا ہے۔ اس وقت پادریوں اور لاٹ پادریوں کی مجلس مشاورت ہوئی اور انھوں نے یوحنا کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست پیش کی کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی باتیں تحریر کر دیں

اور جو باتیں دوسری انجیلوں میں پائی جاتی ہیں ان کے سوا جو کچھ معلوم ہو وہ لکھیں خصوصیت سے اُلوہیت مسیح کا مسئلہ ضرور لکھیں تاکہ شیرینطوں وغیرہ کی جماعت کے خلاف ہمارے ہاتھ مضبوط ہوں۔ تب یوحنا انکی بات ٹال نہ سکے اور یہ انجیل لکھنے پر مجبور ہوئے۔

مگر اس کے مقابلہ میں بہت سے مسیحی علماء یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یوحنا کی انجیل یوحنا کی تصنیف ہرگز نہیں ہے۔ مؤلف قصص الانبیاء نے چند ایسے مشہور و نامور علمائے مسیحی کے نام اپنی کتاب میں حوالوں کے ساتھ لکھے ہیں۔

ان اناجیل اربعہ کا یہ مختصر تعارف ہے جس سے ان کی حقیقت سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ علاوہ ازیں ان کتابوں کے الہامی نہ ہونے کی دو اور واضح دلائل یہ بھی ہیں کہ ان چاروں انجیلوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کے حالات میں ان کی گرفتاری، ان کا صلیب پر چڑھایا جانا، ان کا قتل، مرکر دوبارہ زندہ ہونا اور حواریوں سے کلام کرنا وغیرہ کے حالات بھی موجود ہیں۔ اگر یہ اناجیل اربعہ حضرت مسیح علیہ السلام کی الہامی انجیل ہوتیں یا اس کا کوئی حصہ ہوتا تو ان باتوں کا تذکرہ ناقابل فہم بات ہے یہ واقعات تو حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد شاگرد جمع کرتے نہ کہ خود حضرت مسیح علیہ السلام؟

لہٰذا ان اناجیل کی حیثیت ایک تاریخی کتاب کی ہوئی نہ کہ "کتاب اللہ" کہلانے کی مستحق ہوتی ہے۔

دوسری دلیل ان اناجیل کے غیر الہامی ہونے کی یہ ہے یہ اناجیل اربعہ جن جن زبانوں میں منقول ہوئیں ہیں ان کی عبارات و کلمات کے بقاء و تحفظ کی کبھی پرواہ نہیں کی گئی بلکہ ایک ہی زبان کے مختلف ایڈیشنوں اور اشاعتوں میں بہ کثرت الفاظ اور جملوں کی تبدیلی کمی بیشی موجود ہے۔

ان تحریفات لفظی اور معنوی اور تضاد بیان کی تفصیلات و تصریحات کو بنظر وسیع مطالعہ کرنا ہو تو مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب "میزان الحق" اور حافظ ابن قیم کی کتاب "ہدایۃ الحیاریٰ" اور علامہ باجی زادہ کی کتاب "الفارق بین الخالق والمخلوق" اور مولانا آل نبی امروہی کی کتاب "اظہار حق" لائق دید کتابیں ہیں۔ علاوہ ازیں

ان کے مطالعہ سے مسیحیت بے نقاب بھی ہو جاتی ہے۔
الغرض موجودہ چاروں انجیلیں نہ الہامی ہیں نہ ان کے الہامی ہونے کی کوئی مستند سند ہے اور نہ اُن کے مرتبین کے بارے میں قطعی یا یقینی علم حاصل ہے اور نہ زمانۂ تالیف ہی متعین ہے۔ علاوہ ازیں یہ ایک ایسی زبان کے ترجمے ہیں جن کا وجود دنیا سے مٹ چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

قرآن حکیم اور انجیل

قرآن حکیم نے حضرت مسیح علیہ السلام کی شان کو سراہا اور اعتراف کیا کہ وہ بھی اولو العزم رسولوں میں شامل ہیں اور ان کی الہامی کتاب انجیل "کتاب اللہ" ہے جسمیں نور و ہدایت اور صراط مستقیم کی تعلیمات ہیں لیکن ساتھ ہی جگہ جگہ غیر مبہم طور پر یہ بھی بتلایا کہ علماء اہل کتاب نے اس سچی تعلیم کو بدل ڈالا اور ہر قسم کی لفظی و معنوی تحریفات کر کے اسکی تعلیمات کو کفر و شرک کی تعلیم بنا دیا ہے۔
عہد نبوت میں قرآن حکیم نے بعض بعض مقامات پر اہل کتاب کو تورات و انجیل کے خلاف عمل کرتے ہوئے متنبہ بھی کیا اور ساتھ ہی تورات اور انجیل کے حوالے بھی دیئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت تورات اور انجیل کے اصل نسخے بھی اگرچہ محرّف شکل میں ہی کیوں نہ ہوں پائے جاتے تھے اور یہود اور نصاریٰ کے علماء قرآن حکیم کی اس تنبیہ پر چپ سادھ لیتے تھے بلکہ ایک موقعہ پر قرآن حکیم نے تحدّی (چیلنج) کے طور پر فَاتْلُوْهَا اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ۔ (آل عمران آیت ۹۳)

اگر تم سچے ہو تو تورات پڑھکر سناؤ۔

کا الزام دیا۔ بہرحال زمانۂ نبوّت میں یہ دونوں کتابیں تورات اور انجیل لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تحریفات سے اس درجے مسخ ہو چکی تھیں کہ توراتِ موسیٰ اور انجیلِ عیسیٰ کہلانے کی مستحق نہیں رہی تھیں۔ چنانچہ قرآن حکیم نے اصل کتابوں کی عظمت اور اہل کتاب کے ہاتھوں اُن کی تحریف اور اُن کا مسخ دونوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ اس سلسلے کی چند آیات کا ذکر اس حقیقت کے اظہار کے لئے کافی ہے۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ
اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ

الْفُرْقَانَ۔ (آل عمران آیت ۳،۴)

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ نے آپ پر کتاب نازل کی حق کے ساتھ جو تصدیق کرنے والی ہے ان کتابوں کی جو ان کے سامنے ہیں اور اُس نے تورات اور انجیل کو بھی قرآن سے پہلے نازل کیا جو انسانوں کیلئے ہدایت ہیں اور نازل کی فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب) یعنی قرآن حکیم۔

یَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنْزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔

(آل عمران آیت ۶۵)

اے اہل کتاب تم کس وجہ سے ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں جھگڑتے ہو (کہ وہ یہودی تھے یا نصرانی تھے؟) حالانکہ تورات اور انجیل کا نزول نہیں ہوا مگر ابراہیمؑ کے بعد کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ الخ (مائدہ آیت ۴۶، ۴۷، ۴۸)

اور ہم نے اُن (انبیاء بنی اسرائیل) کے پیچھے عیسیٰ بن مریمؑ کو بھیجا تصدیق کرنے والے اپنے سے قبل کی کتاب (یعنی) تورات کے اور ہم نے انھیں انجیل دی جس میں ہدایت اور نور ہے تصدیق کرنیوالی اپنے قبل کی کتاب (یعنی) تورات کی اور پرہیزگاروں کے لئے ایک ہدایت اور نصیحت۔ اور اہل انجیل پر لازم ہے کہ اللہ نے جو کچھ اسمیں نازل کیا ہے اُسکے مطابق فیصلہ کریں اور جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔

اور ہم نے آپ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر یہ کتاب (قرآن) اُتاری ہے سچائی کے ساتھ تصدیق کرنے والی ان کتابوں کی جو اس سے پیشتر اُتر چکی ہیں اور اُن پر محافظ ہے (یعنی قرآن حکیم ہی سب کتابوں کے لئے معیارِ صداقت ہے)

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰاۃِ وَالْاِنْجِیْلِ الآیۃ (اعراف آیت ۱۵۷)

(نیکوکار) وہ لوگ ہیں جو پیروی کرتے ہیں رسول کی جو نبی اُمّی ہے اور جن کا ذکر وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ وَقَدْ کَانَ فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ یَسْمَعُوْنَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَہٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْہُ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ۔ (بقرہ آیت ۷۵)

توکیا تم اسکی توقع رکھتے ہو کہ وہ لوگ (یہود ونصاریٰ) (تمہارے کہنے سے) ایمان لے آئیں گے دراں حالیکہ اُن میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اللہ کا کلام سنتے ہیں پھر اسے کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں بعد اسکے کہ اُسے سمجھ چکے ہیں۔

فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْھِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ لِیَشْتَرُوْا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا الخ

(بقرہ آیت ۷۹)

سو بڑی خرابی ہے اُن لوگوں کے لئے جو کتاب الٰہی کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف ہے تاکہ اس سے قدرے قلیل معاوضہ حاصل کریں۔ سو خرابی ہے ان کے لئے اسکی بدولت جو وہ اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور خرابی ہے ان کے لئے اس کی بدولت جو وہ حاصل کرتے ہیں۔

یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ الآیۃ (مائدہ آیت ۱۳)

وہ لوگ کلام کو اسکے موقع ومحل سے بدل دیتے ہیں اور جو کچھ اُنھیں نصیحت کی گئی تھی اس کا ایک بڑا حصہ بھلا بیٹھے ہیں۔ آپ کو اُن کے خیانت کی اطلاع ہوتی رہتی ہے۔

سورۂ مائدہ میں مزید ان کی بددیانتی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ۔ (مائدہ آیت ۴۲)

یہ جھوٹ کے بڑے سننے والے، حرام کے بڑے کھانیوالے ہیں۔

حواری

حواری کے لفظی معنی کپڑا دھوکر اُسے صاف اور اُجلا کر دینے والے کے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے ابتدائی مُرید چونکہ عموماً دریا کے کنارے کام کرنے والے ماہی گیر تھے اس لئے آپ کے رفیقوں، شاگردوں کا بھی لقب پڑگیا، مجازی اور مُرادی معنی مخلص و مددگار کے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں حضرت زبیرؓ کے لئے یہ لفظ آیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيٌّ وَحَوَارِيَّ الزُّبَيْرُ (الحدیث)

ہر نبیؑ کے حواری ہوا کرتے ہیں میرا حواری زبیرؓ بن العوامؓ ہے (یعنی مخلص و مددگار)

حواریین عیسیٰؑ کا گزشتہ صفحات میں تفصیل سے ذکر آچکا ہے لیکن قرآن حکیم نے صرف "حواریوں" کہکر مجمل تذکرہ کیا ہے کسی کا نام مذکور نہیں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری کون کون تھے؟

البتہ انجیل متی نے ان کے بارہ۱۲ نام شمار کئے ہیں اور چاروں انجیلوں سے خارج برنابا کی انجیل میں یہی تعداد مذکور ہے البتہ چند ناموں کا اختلاف پایا جاتا ہے۔

عورت اور نبوّت

سیدہ مریم کے تقدّس اور طہارت، عِفّت و عصمت کی شہادت قرآن حکیم نے جابجا دی ہے اور انھیں دنیا جہان کی عورتوں پر فوقیت دی گئی۔ اُن سے فرشتوں نے کلام کیا اور اللہ تعالےٰ کی وحی اُن کی جانب آئی گزشتہ صفحات میں یہ سب تذکرہ آچکا ہے۔

سلف میں محمد بن اسحٰق، شیخ ابوالحسن اشعری، امام قرطبی، ابن حزم وغیرہم اس جانب مائل ہیں کہ عورت نبی ہوسکتی ہے بلکہ ابن حزمؒ تو یہ بھی دعوی کرتے ہیں کہ سیدہ حوّاؑ، سیدہ سارہؑ، سیدہ ہاجرہؑ، سیدہ اُمّ موسیٰؑ، سیدہ آسیہؑ اور سیدہ مریمؑ یہ سب نبی تھیں۔

ان حضرات کے برعکس امام حسن بصری رح امام الحرمین شیخ عبدالعزیز رح اور قاضی عیاضؒ کا یہ رجحان ہے کہ عورت نبی نہیں ہوسکتی۔ لہذا متذکرہ بالا خواتین بھی نبی نہیں تھیں۔ ابن کثیرؒ یہ بھی کہتے ہیں کہ جمہور علمار کا یہ ہی مسلک ہے۔ ان علمار کی یہ دلیل ہے۔ قرآن حکیم ایک موقعہ پہ فرماتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا
اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. (النحل آیت ۴۳)

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تم سے پہلے جب بھی رسول بھیجے ہیں مرد ہی بھیجے ہیں جنکی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کرتے تھے سو اگر تم کو علم نہیں تو (دوسرے) اہل علم سے پوچھ لو۔

اور خصوصیت کے ساتھ سیدہ مریم کی نبوت کے انکار پر یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ قرآن حکیم نے انھیں صدیقہ کہا ہے۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ
الرُّسُلُ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ. (مائدہ آیت ۷۵)

بس مسیح ابن مریم تو ایک رسول ہیں جن سے پہلے بھی اور رسول گزر چکے ہیں اور ان کی والدہ صدیقہ تھیں۔

اور سورۂ نسار میں قرآن حکیم نے اپنے انعام یافتہ بندوں کی جو فہرست دی ہے وہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ صدیقیت کا درجہ نبوت سے کم ہے۔

اور وہ علمار جو عورت کے نبی ہونے کے قائل ہیں اُن کی دلیل قرآن حکیم کی وہ آیات ہیں جنمیں سیدہ اُم موسیٰ اور سیدہ مریم کے واقعات کے ضمن یہ صراحت موجود ہے کہ اِن پر اللہ تعالےٰ کے فرشتے وحی لے کر نازل ہوئے اور ان کو بشارات سنائے اور اِن سے کلام کیا اور بعض عبادات کا حکم بھی پہنچایا۔ چنانچہ سیدہ سارا کے لئے سورہ ہود اور سورۂ الذاریات میں اور سیدہ ام موسیٰ کے لئے سورہ قصص میں اور سیدہ مریم کے لئے سورۂ آل عمران اور سورۂ مریم میں فرشتوں کے ذریعہ اور بلا واسطہ بھی خطاب الٰہی موجود ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان مقامات پر وحی کے لغوی معنیٰ (وجدانی ہدایت یا مخفی اشارہ) کے نہیں ہیں جیسا کہ آیت وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ الآیہ میں شہد کی مکھی کے لئے وحی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ سیّدہ مریم کے نبی ہونے کی واضح دلیل یہ ہے کہ سورۂ مریم میں ان کا ذکر اُسی اسلوب کے ساتھ کیا گیا جسطرح دیگر انبیار و رسل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

مثلاً وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوسٰى، وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ، وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ، وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ، اسی طرح وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ (آیت ۱۶) یا مثلاً وَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا (مریم آیت ۱۷)

اور ہم نے مریم کی جانب اپنے فرشتہ جبرئیل کو بھیجا۔

الغرض عورت کے نبی ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں علماء اسلام کے دو نظریئے ہیں اور ہر ایک کے ہاں قرآنی دلائل اور اشارات ہیں جن کا یہ اجمالی ذکر غور و فکر کے لئے کافی ہے۔ علاوہ ازیں ہر دو نظریئے کی صحت اور سقم میں کلام بھی کیا گیا ہے جو ہماری اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔

اس موضوع پر مشہور زمانہ محدث ابن حزمؒ کا مقالہ اہل علم کے لئے کافی بصیرت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ موصوف نے اپنی تالیف "کتاب الفصل" میں جس قوت اور تفصیل کے ساتھ اسپر کلام کیا ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"یہ فصل ایسے مسئلہ سے متعلق ہے جسپر ہمارے زمانے میں شہر قرطبہ (اندلس) میں شدید اختلاف برپا ہوا۔ علماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ عورت نبی نہیں ہوسکتی اور جو ایسا کہتا ہے کہ عورت نبی ہوسکتی ہے وہ ایک نئی بدعت ایجاد کرتا ہے۔ اور دوسری جماعت قائل ہے کہ عورت نبی ہوسکتی ہے اور نبی ہوئی ہے۔ اور ان دونوں سے الگ تیسری جماعت کا مسلک "توقف" ہے۔ وہ اثبات و نفی دونوں باتوں میں سکوت کو پسند کرتے ہیں۔

مگر جو حضرات عورت سے متعلق منصب نبوت کا انکار کرتے ہیں اُن کے پاس اس انکار کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی۔ البتہ بعض حضرات نے اس آیت کو بنیاد بنایا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ الآية

(النحل آیت ۴۳)

(اور اے نبی ہم نے آپ سے پہلے بھی یہی مرد بھیجے تھے وحی کرتے تھے ہم ان کی جانب)

میں کہتا ہوں کہ اس بارے میں کس کو اختلاف ہے اور کس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو ہدایتِ خلق کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ یا اُس نے کسی عورت کو رسول بنایا ہے؟ بحث رسالت کے مسئلہ میں نہیں ہے بلکہ نبوت میں ہے (یعنی عورت نبی ہو سکتی ہے اور ہوئی ہے) لہٰذا حق طلبی کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے یہ غور کیا جائے کہ لغتِ عرب میں لفظ "نبوّت" کے کیا معنی ہیں؟ تو ہم اس لفظ کو "انبار" سے ماخوذ پاتے ہیں جسکے معنی اطلاع دینا ہیں۔ پس نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کسی معاملہ میں ہونے سے قبل بذریعہ وحی اطلاع دے یا کسی بھی بات کے لئے اس کی جانب وحی نازل فرمائے وہ شخص مذہبی اصطلاح میں بلاشبہ "نبی" ہے۔

آپ اس مقام پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وحی کے معنی اُس الہام کے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کی سرشت میں ودیعت کر دیا ہے جیسا کہ شہد کی مکھی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ الخ (النحل آیت ۶۸)

اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی جانب وحی کی۔

اور نہ وحی کے معنی ظن اور وہم کے لے سکتے ہیں اس لئے کہ ان دونوں کو علم یقین سمجھنا (جو وحی کا قدرتی نتیجہ ہے) مجنون کے سوا اور کسی کا کام نہیں ہے۔ اور نہ یہاں وہ معنی مراد ہو سکتے ہیں جو "کہانت" سے تعلق رکھتے ہیں (یعنی یہ کہ شیاطین آسمانی باتوں کو سننے اور چرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر شہاب ثاقب کے ذریعہ رجم کیا جاتا ہے) اور جس کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔ (انعام آیت ۱۱۲)

کیونکہ یہ "باب کہانة" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے وقت سے مسدود ہو گیا، اور نہ اس جگہ وحی کے معنی نجوم کے تجربات علمیہ

سے تعلق رکھتے ہیں جو خود انسانوں کے باہم سیکھنے سکھانے سے حاصل ہوجایا کرتے ہیں۔ اور نہ اسکے معنی اس رؤیا (خواب) کے ہو سکتے جن کے سچ یا جھوٹ ہونے کا کوئی قطعی علم نہیں ہے بلکہ ان تمام معانی سے جُدا وحی بمعنی "نبوّت" یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ اپنے قصد و ارادے سے ایک شخص کو ایسے امور کی اطلاع دے جن کو وہ پہلے سے نہیں جانتا ہو۔ اور مذکورہ بالا ذرائع علم سے الگ یہ امور حقیقت ثابتہ بنکر اُس شخص پر اس طرح منکشف ہوں جائیں گویا وہ آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور اللہ تعالےٰ اس علم خاص کے ذریعہ اُس شخص کو بغیر کسی محنت وکسب کے بداہتہً ایسا صحیح یقین عطا کردے کہ وہ ان امور کو اس طرح معلوم کرلے جس طرح وہ حواس اور بداہتہ عقل کے ذریعہ حاصل کرلیتا ہے اور اس کو کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور اللہ تعالےٰ کی یہ وحی یا تو اس طرح ہوتی ہے کہ فرشتہ آکر اُس شخص کو اللہ تعالےٰ کا پیغام سناتا ہے اور یا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست اس سے خطاب فرماتا ہے۔

لہٰذا اگر ان حضرات کے نزدیک جو عورت کے نبی ہونے کا انکار کرتے ہیں نبوّت کے معنی یہ نہیں ہیں تو وہ ہم کو سمجھائیں کہ آخر نبوّت کے معنی ہیں کیا؟

حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کے سوا اور کوئی معنی بیان ہی نہیں کرسکتے۔ اور جبکہ نبوت کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کئے تو اب قرآن کے اِن مقامات کو بغور مطالعہ کیجئے جہاں یہ مذکور ہے کہ اللہ عزوجل نے عورتوں کے پاس فرشتوں کو بھیجا اور فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اِن عورتوں کو "وحی حق" سے مطلع کیا۔ چنانچہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے امّ اسحٰق (سارہ علیہا السلام) کو حضرت اسحٰق علیہ السلام کی بشارت ولادت سنائی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَامْرَأَتُهُ قَائِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ إِسْحٰقَ يَعْقُوبَ۔ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰى أَأَلِدُ وَأَنَا عَجُوزٌ وَّهٰذَا بَعْلِي

شَيْخًا ۔ إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيبٌ ۔ قَالُوٓا أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ ۔

(ہود آیت ۷۳)

ان آیات میں فرشتوں نے اُم اسحٰق کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت اسحٰق اور اُن کے بعد حضرت یعقوب کی بشارت سنائی اور حضرت سارہ رض کے تعجب پر یہ کہہ کر دوبارہ خطاب کیا "أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ" تو یہ کیسے ممکن ہے کہ والدہ اسحٰق نبی تو نہ ہوں اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ اُن سے اس طرح خطاب کرے (جیسا کہ مرد نبیوں سے کلام کیا ہے) اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے جبرئیل فرشتے کو امّ عیسیٰ مریم علیہا السلام کے پاس بھیجا ہے اور ان کو مخاطب کرکے یہ کہتا ہے :۔

قَالَ إِنَّمَآ أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ۔

(مریم آیت ۱۹)

تو یہ "وحی حقیقی" کے ذریعہ نبوت نہیں تو اور کیا ہے ؟ اور کیا اس آیت میں صاف طور پر نہیں کہا گیا کہ حضرت مریم علیہا السلام کے پاس جبرئیل فرشتہ اللہ تعالےٰ کی جانب سے پیغامبر بن کر آیا ؟

نیز حضرت زکریا علیہ السلام جب کبھی معصوم مریم کے حجرہ میں آتے تو اُن کے پاس اللہ تعالےٰ کا دیا ہوا رزق پاتے تھے ۔ اور انھوں نے اسی رزق کو دیکھ کر بارگاہِ الٰہی میں صاحب فضیلت لڑکا پیدا ہونے کی دعا کی تھی۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۔

(آل عمران آیت ۳۷)

اسی طرح ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے معاملہ میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے ان پر وحی نازل فرمائی کہ تم اس بچے (موسیٰ) کو دریا میں ڈال دو اور ساتھ ہی اِن کو یہ بھی اطلاع دی کہ میں اس بچے کو تمہاری جانب واپس کروں گا اور اس کو نبی مرسل بناؤں گا ۔ چنانچہ ارشاد ہے :۔

وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ أُمِّ مُوسَىٰٓ أَنْ أَرْضِعِيهِ الخ (قصص آیت ۷)

اِذْ اَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّکَ مَا یُوْحٰی (طٰہٰ آیت ۳۸)

پس کون شک کرسکتا ہے کہ یہ نبوت کا معاملہ نہیں ہے؟ معمولی عقل وشعور رکھنے والا آدمی بھی بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا یہ عمل اللہ تعالےٰ کے عطا کردہ شرف نبوت سے وابستہ نہ ہوتا اور محض خواب کی بنا پر یا دل میں پیدا شدہ وسوسہ کی وجہ سے وہ ایسا کرتیں تو ان کا یہ عمل نہایت غیر معقول ہوتا اور اگر آج ہم میں سے کوئی ایسا کر بیٹھے تو ہمارا یہ عمل یا گناہ قرار پائے گا اور یا ہم کو مجنون اور پاگل کہا جائے گا اور علاج کے لئے پاگل خانہ بھیج دیا جائے گا۔ یہ ایک ایسی صاف اور واضح بات ہے جسمیں شک وشبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تب یہ کہنا قطعاً درست ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی والدہ کا موسیٰ کو دریا میں ڈال دینا اسی طرح کی وحی الٰہی تھی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے رُؤیا (خواب) میں اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السّلام کا ذبح کرنا بذریعہ وحی معلوم کر لیا تھا۔ اس لئے اگر حضرت ابراہیم علیہ السّلام نبی نہ ہوتے اور اُن کے ساتھ وحی الٰہی کا سلسلہ وابستہ نہ ہوتا اور پھر وہ عمل محض ایک خواب یا نفس میں پیدا شدہ ظن کی وجہ سے کر گزرتے تو ہر شخص ان کے اس عمل کو گناہ سمجھتا یا انتہائی خلافِ واقعہ یقین کرتا، تو اب بغیر کسی تردد کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ امّ موسیٰ علیہ السلام نبی تھیں۔

علاوہ ازیں سیدہ مریم علیہا السّلام کی نبوت پر ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے سورہ مریم میں ان کا ذکر انبیاء علیہم السّلام کے زُمرہ میں کیا ہے اور اسکے بعد ارشاد فرمایا:۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ مِنْ ذُرِّیَّۃِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا الآیہ (مریم آیت ۵۸)

یہی ہیں وہ انبیاء آدم کی نسل سے اور اُن میں سے جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار کیا جن پر اللہ کا انعام واکرام ہوا۔

تو آیت کے اس مفہوم میں سیدہ مریم علیہا السّلام کی تخصیص کرکے انکو

انبیاء کی فہرست سے الگ کر لینا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔
رہی یہ بات کہ قرآن حکیم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مریم علیہا السلام کے لئے یہ کہا:۔

وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ الآیہ

اور موسیٰ کی والدہ صدیقہ تھیں۔

تو یہ لقب اُن کی نبوت کے خلاف نہیں۔ جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے نبی و رسول ہونے کے باوجود ان کو صدیق کہا گیا۔

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ الآیہ (سورۂ یوسف آیت ۴۶)

اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے (و باللہ التوفیق)

اب رہا حضرت سارہؓ، حضرت مریمؑ، حضرت اُمِّ موسیٰؑ کے مسئلہ نبوت کے ساتھ فرعون کی بیوی حضرت آسیہؓ کو بھی شامل کر لیجئے اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

كَمُلَ مِنَ الرِّجَالِ كَثِيْرٌ وَّلَمْ يَكْمُلْ مِنَ النِّسَاءِ اِلَّا اٰسِيَةُ بِنْتُ مُزَاحِمٍ اِمْرَاَةُ فِرْعَوْنَ وَمَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَاِنَّ فَضْلَ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيْدِ عَلٰى سَائِرِ الطَّعَامِ (بخاری)

یعنی مردوں میں سے تو بہت سے آدمی کامل ہوئے ہیں مگر عورتوں میں صرف دو ہی کامل ہوئی ہیں آسیہ بنت مزاحم اور مریم بنت عمران۔ اور عائشہ صدیقہ کی فضیلت تمام عورتوں پر ایسی ہے جیسے کہ ثرید (کھانے کی ایک قسم) کی خوبی تمام کھانوں پر۔

اور واضح رہے کہ مَردوں میں یہ درجۂ کمال (بعض) رسولوں ہی کو حاصل ہوا ہے اگرچہ اِن کے علاوہ انبیاء و رسل بھی درجہ نبوت و رسالت پر مامور ہیں لیکن ان مرسلین کاملین کے درجے سے کم۔ اس لئے حدیث مذکور کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن عورتوں کو منصب نبوت سے سرفراز فرمایا ہے اُن میں صرف اِن دو عورتوں کو ہی درجۂ کمال کی فضیلت حاصل ہے باقی کو فضیلت حاصل ہے لیکن اِس درجے سے کم۔

بہرحال اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگرچہ بعض عورتیں بہ نصِ قرآنی نبی ہیں لیکن اِن میں سے اِن دوؔ عورتوں کو کمال حاصل ہوا۔ درجات کے اس فرق کو خود قرآن حکیم اس طرح بیان کرتا ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ الخ (بقرہ آیت ۲۵۳)

حقیقت یہ ہے کہ کامل اسکو کہا جاتا ہے جس کی نوع میں سے کوئی دوسرا اس درجے ہمسر نہ ہو۔ پس مردوں میں سے ایسے کامل چند ایک ہی رسول ہوئے ہیں جن کی ہمسری دوسرے انبیاء ورسل کو عطا نہیں ہوئی اور بلاشبہ ان ہی کاملین میں سے ایک ہمارے رسول حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جن کے متعلق نصوص (قرآن وحدیث) نے اُن فضائلِ کمال کا اظہار کیا ہے جو دوسرے انبیاء ورسل کو حاصل نہیں ہیں۔ اسی طرح عورتوں میں سے وہی درجۂ کمال کو پہنچی ہیں جن کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں کیا ہے۔" (کتاب الفصل ج ۵ صـ ۱۲، فتح الباری ج ۶ صـ ۳۴۸)

خُلاصۂ کلام

امام ابن حزمؒ کے اس فاضلانہ کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ وحی کے اصطلاحی معنی جن کو قرآن حکیم نے انبیاء ورسل کیلئے مخصوص کیا ہے دوؔ ہیں۔

ایکؔ معنی وہ وحی جو انسانوں کی رشد وہدایت تعلیم وتبلیغ کے لئے جاتی ہو۔

دوسرےؔ معنی وہ وحی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی شخص کو براہِ راست یا فرشتہ کے ذریعہ سے خطاب کی جائے جس میں بشارات ہوں یا کسی ہونے والے واقعہ کی اطلاع ہو یا خاص اُس شخص کی ذات کے لئے ہدایات ہوں۔ اب اگر پہلی صورت ہو تو یہ "نبوت مع الرسالۃ" ہوگی جو صرف مردوں کے ساتھ خاص ہے۔ کسی عورت کو یہ منصب نہیں دیا گیا کہ وہ عام انسانی ہدایت کے لئے کام کرے۔ جیسا کہ سورۂ النمل کی آیت سے واضح ہے اور اسمیں قطعاً دو رائے نہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ الآیہ

اور اگر وحی الٰہی کی دوسری شکل ہو تو امام ابن حزم رح اور ان کے موئدین علماء کی رائے

میں یہ بھی نبوت ہی کی ایک قسم ہے کیونکہ قرآن حکیم نے سورۂ شوریٰ میں انبیاء کرام پر نزولِ وحی کے جو طریقے بیان کئے ہیں وہ اس وحی پر بھی صادق آتے ہیں۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ.

(شوریٰ آیت ۵۱)

اور کسی انسان کے لئے یہ صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالےٰ اُس سے (بالمشافہ) گفتگو کرے مگر وحی کے ذریعہ یا پس پردہ کلام کے ذریعہ یا اس صورت سے کہ اللہ تعالےٰ کسی فرشتے کو پیغامبر بنا کر بھیجے پھر وہ اللہ تعالےٰ کی اجازت سے جسکو وہ چاہے اس بشر کو وحی لا کر سُنا دے۔ بلاشبہ وہ بلند و برتر حکمت والا ہے۔

وحی کی یہ دوسری قسم جہاں مردوں پر صادق آتی ہے عورتیں بھی اس میں شریک ہیں۔

لہٰذا جب قرآن حکیم نے وحی کی اس دوسری قسم کا اطلاق بہ نصِ صریح حضرت مریمؑ، حضرت سارہؑ، حضرت ام موسیٰؑ اور حضرت آسیہؑ پر کیا ہے جیسا کہ سورۂ ہود، قصص، مریم کی آیات سے ظاہر ہوتا ہے تو اِن مقدس خواتین پر "نبی کا اطلاق" قطعاً صحیح ہے اور اسکو بدعت کہنا سرتاسر غلط ہے۔

ایک شُبہ اور اُس کا جواب

وحی الٰہی کی اس تشریح پر جسکی وضاحت امام ابن حزمؒ اور ان کے موئد علماء نے کی ہے یہ شُبہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن حکیم نے جس طرح صاف الفاظ میں مرد انبیاء کو نبی و رسول کہا ہے اس طرح عورتوں میں سے کسی کو نہیں کہا؟

جواب کا حاصل یہ ہے کہ جبکہ "نبوۃ مع الرسالۃ" جو مردوں ہی کے لئے مخصوص ہے کائناتِ انسانی کی رُشد و ہدایت، تعلیم و تبلیغ نوع انسانی سے متعلق ہوتی ہے تو اسکا قدرتی تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے جس شخص کو اس شرف سے ممتاز کیا ہے اُسپر لازم ہے کہ وہ صاف صاف اعلان کر دے کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا نبی اور رسول ہوں تاکہ مخلوق

اسکی دعوت و تبلیغ کو قبول کرے اور اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہوجائے۔

اور چونکہ نبوت کی دوسری قسم جس کا اطلاق عورتوں پر بھی ہوتا ہے وہ عام نہیں ہوتی خاص اُس ہستی سے متعلق ہوتی ہے جسکو یہ شرف دیا جاتا ہے تو ایسی ہستی کے متعلق صرف یہی اظہار کر دینا کافی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اُس سے کلام کیا ہے یا فرشتے نے بشارت دی ہے یا اسکو کسی حکم کا پابند کیا گیا ہے۔ اس مخصوص نبوّت سے چند خواتین کو بھی مشرّف کیا گیا ہے۔ اور چونکہ عورتوں کو مردوں کی دعوت و تبلیغ کے لئے مبعوث نہیں کیا گیا اس لئے قرآن حکیم نے عورتوں کو اَیُّھَا النَّبِیّ ، اَیُّھَا الرَّسُوْل کہہ کر خطاب نہیں کیا۔

ضروری نوٹ

امام ابن حزمؒ کی یہ ساری بحث قرآن حکیم کی اُن آیات کی وجہ سے پیدا ہوئی جنمیں عورتوں کے لئے وحی، کلام، رسالۃ کے الفاظ آئے ہیں۔ ورنہ یہ اُن کا ہرگز مطلب نہیں اور نہ ہوسکتا ہے کہ "ختم نبوت" کے بعد وحی کی یہ دوسری صورت آج بھی ہوسکتی ہے۔

عورتوں کی نبوت کے اثبات و انکار کے علاوہ تیسری رائے اُن علماء کی ہے جو اس مسئلہ میں توقف اور سکوت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان میں شیخ تقی الدین سُبکیؒ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

فتح الباری میں اُن کا یہ قول مذکور ہے :۔

قال السبکی اختلف فی ھذہ المسئلۃ ولم یصح عندی فی ذلک شئ الخ (فتح الباری ج ۶ کتاب الانبیاء)

علامہ سبکی فرماتے ہیں کہ اس مسئلے میں علماء کی آراء مختلف ہیں اور میرے نزدیک اس بارے میں اثباتاً یا نفیاً کوئی بات ثابت نہیں ہے لہذا اس مسئلہ میں سکوت اختیار کرنا چاہیئے۔

ابن حزمؒ کی خدمت میں

عورت اور نبوت کے تحقیقی مقالہ کے ضمن میں امام ابن حزم کے اس مضمون پر نظر ثانی کی ضرورت

محسوس ہوتی ہے اور ہم کو اس کے مختلف پہلوؤں کا بھی جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اصولی طور پر تو یہ بات طے ہے کہ عقائد کے سلسلے میں صرف اور صرف نقل و ثبوت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جتنے بھی عقائد ہیں وہ سب قرآن و حدیث سے ثابت اور منقول ہیں۔ عقل و درایت کا اسمیں دخل نہیں ہوتا۔ ممکن ہے عقل و درایت سے کوئی بات ثابت ہوجائے لیکن کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوگا۔

عورت اور نبوّت کا مسئلہ عقیدے سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اسکو دلائل سے ثابت نہیں کیا جائے گا بلکہ قرآن و حدیث سے نقل و ثبوت تلاش کیا جائے گا۔

علامہ ابن حزمؒ نے اس اعتقادی مسئلہ کو دلیل سے ثابت کرنیکی کوشش کی ہے جو اصولی طور پر صحیح نہیں ہے۔ عقل و درایت کی قوت کسی موقع پر پتھر کے ستون کو سونا ثابت کردے ممکن ہے، لیکن پتھر پتھر ہی رہے گا سونا نہیں ہوگا۔ لہٰذا ہم امام موصوف کی خدمت میں ادباً عرض کریں گے کہ عورت کی نبوت پر نقلی دلیل پیش کریں۔

امام موصوف نے اپنے دلائل عقلیہ میں ایک دلیل نبوت کی لغوی تحقیق سے دی ہے جو کلاب عرب سے متعلق ہے۔ یقیناً وحی کے لغوی معنی وہی ہیں جو امام موصوف نے لکھے ہیں لیکن چونکہ یہ مسئلہ تشریعی حیثیت رکھتا ہے اس لئے نبوت کے معنی کی تعیین میں کلامِ عرب کا سہارا لینا کچھ معقول نظر نہیں آتا۔

اسلام کے اس اساسی مسئلہ کو خالص اور خالص قرآنی آیات ہی سے حل کرنا چاہیئے تھا جو امام موصوف سے ایسا نہ ہوسکا۔

امام موصوف نے نبوت کی تقسیم رسالت اور غیر رسالت کر کے دوسری قسم کے عموم میں عورتوں کو بھی شامل کیا ہے اور اس نبوت کو غیر تشریعی قرار دیا ہے۔ یعنی سیّدہ مریم، سیّدہ ام موسیٰ، سیّدہ ہاجرہ، سیّدہ سارا، سیدہ آسیہ، سیدہ حوا، اگرچہ نبی تھیں لیکن ایسی نبی نہیں جو دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیں اور اپنی نبوت کا اعلان کریں گویا ان مقدس خواتین کی ذوات، رسالت کے منصب کی حامل نہیں بلکہ صرف منصب نبوت کی حامل تھیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ نبوت کی یہ تقسیم خود قابل غور ہے۔ اگر تسلیم بھی کرلیا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن مردوں کو صرف نبوت دی گئی تھی (جیسے سیدنا ہارونؑ

سیدنا زکریا، سیدنا اسحق، سیدنا شعیب علیہم السلام وغیرہ) کیا ان مقدس انسانوں نے نبوت کا فریضہ (دعوت وتبلیغ) ادا نہیں کیا؟ اور کیا اِن بزرگوں نے اپنی نبوت کا اعلان نہیں کیا؟

ظاہر ہے تمام انبیاء کرام نے نہ صرف اپنی نبوت کا اعلان کیا بلکہ دعوت وتبلیغ کا کامل فریضہ بھی انجام دیا ہے تو پھر کس دلیل سے عورتوں کی نبوت کو پوشیدہ اور ساکت قرار دیا جائے گا؟

اگر یہ کہا جائے کہ وہ نبی چونکہ عورت ہے اس لئے مردوں کے سامنے کیسے آسکتی ہے؟ تو جواب دیا جائے گا کہ پردے کے احکام تو امت محمدیہ کی خواتین پر نازل کئے گئے ہیں مِلَل سابقہ کی خواتین پر یہ پابندی نہیں تھی وہ مردوں کو بھی خطاب کرسکتی تھیں۔ ولو بالفرض مردوں سے اختلاط مناسب نہیں تھا تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورت جنسِ عورت کی جانب مبعوث کیوں نہ کی گئی؟ ہدایت کے لئے جیسے مرد محتاج ہیں عورتیں بھی محتاج ہیں اور انسانی آبادی انہی دو طبقات پر مشتمل بھی ہے۔

علامہ ابن حزمؒ کے اس استدلال کو قبول بھی کرلیا جائے کہ عورت بہرحال عورت ہے وہ نبوّت کے تقاضوں کو کیونکر پورا کرسکتی ہے تو ہم عرض کریں گے کہ یقیناً عورت کیلئے اعلانِ نبوت مناسب نہیں ہے لیکن کیا وہ اظہار نبوت بھی نہیں کرسکتی تھی؟ اظہار کرنے میں نہ کوئی شرعی محظور تھا نہ دُنیاوی مفسدہ تو پھر متذکرہ خواتین نے اپنی نبوت کا اظہار کیوں نہ کیا؟ بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بُوالعجبی۔

انبیاء کرام کی طویل فہرست ہے جو قرآن وحدیث اور تاریخ سے ثابت ہے۔ اگر ان میں ایک ہی عورت کے نبی ہونے کا ذکر ملتا تو علامہ ابن حزمؒ کے دعویٰ کے لئے کافی تھا لیکن پوری فہرست انبیاء اس وجود سے خالی ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ علامہ ابن حزمؒ نے تو عورت کی نبوت کا دعوی کیا ہے لیکن کسی نبیہ نے اس کا اظہار تک بھی نہ کیا ہو؟ مدعی سُست گواہ چُست۔

علاوہ ازیں ان سب باتوں کو تسلیم بھی کرلیا جائے کہ ایسی مقدس خواتین نے نہ اپنی نبوت کا اعلان کیا اور نہ اس کا اظہار کیا ہے تو ہم کو اسکی بھی تحقیق کرنی چاہیئے کہ کیا اُس دور کے نبی ورسول نے ایسی خواتین کو نبی تسلیم کیا ہے؟ جبکہ اِن بقدس

خواتین میں بعض تو خود ان کے شوہر نبی تھے جیسے حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام، اور بعض کے صاحبزادے نبی تھے جیسے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام۔ اِن حضرات نے ان مقدس خاتون کو کیا نبی کہا ہے اور کیا نبیوں جیسا معاملہ کیا ہے؟ انبیاء کرام کی پوری تاریخ اس ثبوت سے خالی ہے۔ یہاں پر ہمارا احساس اس حد تک ہوجاتا ہے کہ صرف عقل و درایت کی روشنی میں یہ مسئلہ حل کیا گیا ہے جبکہ یہ مسئلہ عقائد سے تعلق رکھتا ہے جسمیں ثبوت و نقل کی ضرورت تھی۔

قرآن حکیم نے سیدہ مریم کا جو تعارف کروایا ہے وہ بھی اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ سیدہ مریمؑ نبی نہ تھیں بلکہ وہ ایک مقدس خاتون تھیں جنکی پاکدامنی، عفت وصداقت، غیر مشتبہ تھی۔ اُنپر یہودیوں نے جھوٹے الزامات عائد کئے اور اُنھیں متہم کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ سراپا صدق تھیں۔

قرآن حکیم نے سیدہ مریم کا تعارف اس طرح کروایا ہے:۔

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ الآیہ (مائدہ آیت ۷۵)

مسیح بن مریم (عیسیٰ علیہ السلام) سوائے نبی و رسول کے اور کچھ نہ تھے (نہ خدا نہ خدا کا بیٹا نہ شریک خدا) اور اُن کی ماں (مریم) صدّیقہ (ولی) تھیں۔

آیت مذکورہ میں قرآن حکیم نے اُس گمراہی کی تردید کی ہے جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بعض انسانوں کو شُبہ ہوگیا تھا کہ وہ شریک خُدا ہیں۔ اسی طرح سیدہ مریم سے بھی اُن الزامات کو دور کیا ہے جو دشمنوں نے اُن پر لگایا تھا۔

بہر حال اس خصوصی تعارف کے سلسلے میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو رسول کہا گیا ہے اور ان کی والدہ محترمہ کو صدیقہ کے لقب سے ظاہر کیا گیا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ نبی تھیں جیسا کہ علامہ ابن حزمؒ کا خیال ہے تو ایسے موقع پر وَأُمُّهُ نَبِيًّا کہنا کیا مشکل تھا؟ جبکہ اِن کے صاحبزادے کو واضح الفاظ میں رسول کہا گیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ صدیقیت نبوت سے کم درجہ منصب ہوتا ہے جیسا کہ آیت ۶۹ سورۃ النساء میں موجود ہے اور یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ ہر نبی صدیق ہوتا ہے۔ کیونکہ نبوت کے لئے صدیقیت لازم ہے لیکن ہر صدیق نبی نہیں ہوتا۔ اس اصولی بات کی موجودگی میں سیدہ مریم کو صدیقہ کہنا

واضح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ وہ نبی نہ تھیں۔ اس مرحلہ پر یہاں دوسری بار بھی اظہار کر دینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ جہاں انبیاء کرام نے ایسی خواتین کو نبی قرار نہیں دیا وہاں اللہ تعالیٰ کا کلام بھی اس کے اظہار سے ساکت ہے۔ اور اگر اظہار کرتا ہے تو صرف یہ کہ وہ صدیقہ تھیں۔

اب ہم علامہ ابن حزم کی اُس آخری دلیل پر کلام کرنا چاہتے ہیں جو آیاتِ قرآنی سے متعلق ہے۔ امام موصوف کی یہ ساری بحث قرآن حکیم کی اُن آیات کی وجہ سے پیدا ہوئی جس میں عورتوں کے لئے کلام، وحی، رسالت کے الفاظ آئے ہیں جیسا کہ ایسے ہی الفاظ مرد انبیاء کے لئے آئے ہیں۔ جس کا ماحصل یہ نکلتا ہے کہ جب مردوں کے لئے یہ عنوان نبوت اور رسالت کی دلیل ہے تو خواتین کے لئے نبوت کی دلیل کیوں نہیں ہوگی؟ غالباً امام موصوف کے عالمانہ خطاب کا محور یہی اشتباہ ہے اور اسی بنیاد پر اُنھوں نے عورتوں میں نبوت کا صرف امکان ہی نہیں بلکہ وقوع ثابت کیا ہے۔

امام ابن حزم کی اس دلیل پر غور کرنے سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ وحی کیلئے نبوت لازم ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحی اُس شخص ہی کی جانب ہوتی ہے جو منصب نبوت سے سرفراز ہے یا سرفراز ہوتا ہے۔

اور چونکہ بعض خواتین کی جانب اللہ تعالیٰ کی وحی اور کلام آیا ہے اس لئے سیدہ ام موسیٰ، سیدہ مریم، سیدہ ہاجرہ وغیرہم منصب نبوت کے حامل قرار پاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ذہنی وفکری اشتباہ ہے جس نے خواتین کو بھی نبوت کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔

علامہ موصوف کی یہ دلیل کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتی۔

پہلی وجہ تو یہ کہ خود علامہ نے قرآن حکیم کی وہ آیات بھی پیش کی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی وحی فرشتوں کے علاوہ حیوانات بلکہ جمادات تک میں آئی ہے۔

لہٰذا اس کا یہی تقاضہ ہونا چاہیئے کہ اِن اشیاء میں بھی نبوت کا کچھ نہ کچھ تصور قائم کیا جائے۔ ظاہر ہے نہ علامہ اسکے قائل ہوں گے اور نہ کوئی اور دوسرا۔ تو پھر ہم کس دلیل سے ان اشیاء کو نبوت میں حصہ دار بننے سے خارج کر دیں۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ امام موصوف نے وحی کے معنی نبوت ہی بیان کئے ہیں۔ بہرحال خواتین میں نبوت کا تصور نہ قرآن حکیم کی آیات سے ثابت ہوتا ہے اور نہ تاریخ وسیرت کی کتابوں سے۔

رہی وہ آیات جن میں خواتین کی طرف اللہ تعالٰے کی وحی و کلام کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ آیات ہمارے مقصد کے خلاف نہیں ہیں۔ کیونکہ خود امام ابن حزم نے فرشتوں، شہد کی مکھی اور زمین و آسمان کی جانب وحی کے معنی الہام، اشارہ، وجدان بیان کئے ہیں۔ اسی طرح عورتوں کی جانب وحی کے معنی الہام، اشارہ کے ہو سکتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالٰے نے سیدہ اُمّ موسٰی، سیدہ مریم کی جانب الہام کیا۔ اور یہ بات واضح ہے اور حقیقت بھی ہے۔

اب ہم اپنے اس مقصد کے لئے قرآن حکیم کی ایک دلیل بھی پیش کرتے ہیں جہاں وحی کے معنی الہام ہی کے ہیں۔

سیّدنا یوسف علیہ السلام کو جب بھائیوں نے کنویں میں ڈال دیا تھا اُسوقت اللہ تعالٰے کی وحی آئی اور سیدنا یوسف علیہ السلام کو تسلّی دی گئی کہ آپ غم و فکر نہ کریں ایک وقت ایسا آئے گا کہ آپ کے یہی بھائی محتاج و فقیر بن کر آپ کے پاس آئیں گے اور آپ ان کو یہ کارروائی یاد دلائیں گے :-

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَاَجْمَعُوْا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ -

(یوسف آیت ۱۵)

سو جب اُن کو (یعنی یوسف کو) لے گئے اور سب نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اِن کو کسی اندھیرے کنویں میں ڈال دیں اور ہم نے اُن (یوسف) کے پاس وحی بھیجی کہ تم اُن لوگوں (بھائیوں کو) یہ بات جتلاؤ گے اور وہ تم کو پہچانیں گے بھی نہیں (چنانچہ یہ وعدہ پورا ہوا)

یہاں قرآن حکیم نے سیّدنا یوسف علیہ السلام کی جانب اَوْحَيْنَآ وحی کا لفظ استعمال کیا ہے حالانکہ اسوقت سیّدنا یوسف علیہ السلام نبوّت کے منصب سے سرفراز نہ تھے یہ اُن کے بچپن کا واقعہ ہے۔ منصبِ نبوت تو جوان ہونے کے بعد دی گئی ہے جیساکہ خود قرآن حکیم کی وضاحت موجود ہے :-

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا۔ (یوسف آیت ۲۲)

اور جب وہ (یوسف) جوانی کو پہنچے ہم نے اُن کو حکمت (نبوت)

اور علم عطا کیا۔

اور ظاہر ہے یہ سرفرازی کنویں سے نکلنے کے بعد کی ہے۔ لہٰذا کنویں میں سیدنا یوسف علیہ السلام پر وحی آئی جس کا صاف اور واضح مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کنویں میں اُنپر الہام کیا اور انھیں تسلی دی۔ بہرحال وحی کے معنی الہام قرآن حکیم کی آیت میں موجود ہے۔ اس لحاظ سے ہم پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى (قصص آیت ۷) وغیرہ

کے معنی یہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی جانب الہام کیا یا فرشتہ کے ذریعہ اطلاع دی کہ بچے (موسیٰ) کے ساتھ یہ یہ معاملہ کرو۔ (تفصیل تذکرہ سیدنا موسیٰ میں آچکی ہے) اور ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کسی پر الہام کرنا یا اطلاع کر دینا نبوت کی دلیل نہیں ہے۔

لہٰذا متذکرہ مقدس خواتین نبی نہیں تھیں بلکہ صحابیات اور اولیاء اللہ میں شامل تھیں۔ وعلم اللہ اعظم واکبر۔

قارئین کی عدالت میں

اب ہم ناظرینِ کتاب کی عدالت میں قرآن حکیم کی اُن آیات کا ترجمہ و مطلب پیش کرتے ہیں، جن کو امام ابن حزم ظاہریؒ نے اپنے مخصوص فکری رجحان کے ثبوت میں پیش کیا ہے اور جن میں وحی کے مختلف معنی پیدا ہوتے ہیں۔ البتہ اس سے قبل یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ان آیات کا بے تکلف، سیدھا سادھا مفہوم بیان کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے جن آیات میں خواتین کی جانب وحی، کلام، رسالت، حکم وغیرہ کے الفاظ نقل کئے ہیں ان الفاظ کا سیدھا سادھا مفہوم یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدہ ام موسیٰؓ یا سیدہ مریم وغیرہا کی جانب الہام یا اشارہ اور ندا کی ہے اور ظاہر ہے الہام اور اشارہ یا ندا نبوت کی دلیل قرار نہیں پاتا تو پھر کیوں اس ظاہری مفہوم کو ترک کر کے وحی کے وہی معنی مراد لئے جائیں جو انبیاء و رسل کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

ہم اپنے اس دعویٰ میں کہ نبوت خواہ کسی قسم کی ہو صرف اور صرف مردوں کا حصہ رہی ہے عورتیں اس میں شامل نہیں رہی ہیں قرآن و حدیث کی دو دو دلیل پیش کرتے ہیں۔

اوّل: یہ کہ اللہ تعالےٰ نے مَردوں کو قوّام (حاکم اور صاحبِ اقتدار) بنایا ہے اور عورتیں محکوم اور ماتحت ہیں۔

رسالت اور نبوّت خواہ کسی بھی عنوان کے تحت ہوگی اگر عورتوں میں تسلیم کرلی جائے تو فی الجملہ عورتوں کی حاکمیت اور قوّامیّت ثابت ہوگی۔ کیونکہ نبی بہرحال اپنی امت میں حاکم اور قوّام ہوتا ہے۔ علامہ ابن حزمؒ کے اُس فکری رجحان کو قبول کرنے پر قرآنی منشاء فوت ہوجاتا ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورتیں بھی قوّام (حاکم) ہوئی ہیں۔

دوّم: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک خطاب میں عورتوں کو "ناقصاتِ عقل و دین" فرمایا ہے۔ ایک خاتونِ صحابیہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہماری عقل اور دین کیوں ناقص ہیں؟

آپ نے ارشاد فرمایا کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب میں قانونِ شہادت کے ضمن دوؔ عورتوں کو ایک مرد کے قائمقام قرار دیا ہے؟
اُن صحابیہ نے عرض کیا بیشک ایسے ہی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا یہ تمہارے عقل کے غیر کامل ہونیکی علامت ہے۔
پھر آپ نے فرمایا کیا تم ہر ماہ چند دن بغیر نماز روزے کے رہتی نہیں ہو؟
عرض کیا ہاں یہ واقعہ ہے۔
آپؐ نے ارشاد فرمایا یہ تمہارے دین کے نقصان (کمی) کا نتیجہ ہے۔ (ترمذی)
اب ہم قارئین کی عدالت میں یہ استغاثہ پیش کرتے ہیں اور غور وفکر کرنیکی دعوت دیتے ہیں کہ محکوم اور ماتحت و تابع اور ناقصاتِ عقل و دین کیا نبوت سے سرفراز ہوسکتا ہے؟

فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔[1]

اب آپ قرآن حکیم کی اُن آیات کا ترجمہ و مطلب ملاحظ فرمائیے جنکو امام ابن حزمؒ نے اپنے مخصوص رجحان کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ پہلے وحی کے لغوی و شرعی معنی جاننا ضروری ہے۔

وحی کے لغوی معنی لطیف اشارہ، خُفیہ بات کے ہیں (راغب)

---
[1] جاننے والوں سے پوچھو اگر تم جانتے نہ ہو۔

یعنی ایسی بات جو اشارہ کرنے والے اور اشارہ پانے والے کے سوا تیسرے کو محسوس نہ ہو۔
اب اگر یہ وحی فرشتے کے ذریعہ سے ہو اور فرشتہ اسکو پڑھکر سنائے تو ایسی وحی کو کلام اللہ (قرآن) کہا جاتا ہے۔ اور اگر بغیر فرشتے کے راست قلب پر وحی ہو تو اسکو کلام رسول (حدیث شریف) کہا جاتا ہے۔ یہ ہر دو صورت صرف انبیاءؑ و رسل کا حصہ ہیں۔
اور اگر دل میں کوئی بات آگئی یا پختہ خیال آگیا یا خواب میں کوئی بات پالیا یا کوئی غیبی ندا آئی اور یہ سب واقعہ کے مطابق ثابت ہوئے تو اسکو کشف یا الہام یا وجدان و اشارہ کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے اشارے انبیاء کرام کے علاوہ غیر نبی کو بھی ہوتے ہیں۔
گویا وحی کی بہت سی قسمیں قرار پاتی ہیں لیکن ان اقسام میں ایک مخصوص وحی وہ ہے جس سے انبیاء کرام نوازے جاتے ہیں اور یہ وحی اپنی خصوصیات میں دوسری تمام قسم کی وحی سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یعنی انبیاء و رسل کی جانب جو وحی کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے قصد و ارادہ سے نبی اور رسول کو ایسے امور کی اطلاع دیتا ہے جسکو وہ پہلے سے نہیں جانتے تھے اور وہ نبی و رسول اُس بات کو اپنے کانوں سے سنتے ہیں اور آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں اور دل کی گہرائی میں اسکو محسوس کرتے ہیں۔ ایسے طور پر کہ اسمیں شک و شبہ تو درکنار وسوسہ تک پیدا نہیں ہوتا۔ ایسی حقیقت ثابتہ کو انبیاء کرام کی وحی کہا جاتا ہے اور اس وحی کی یہ غرض ہوتی ہے کہ نبی اور رسول اسکے ذریعہ نوع انسانی کی رہنمائی کریں۔
قرآن حکیم میں وحی الٰہی کی مختلف نوعیتیں ملتی ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے جہاں انبیاء کرام کی جانب وحی کی ہے وہاں فرشتوں کی جانب، حیوانات کی جانب، جمادات کی جانب بھی وحی کا تذکرہ ملتا ہے۔
اور یہ بات ظاہر ہے کہ ہر ایک کی وحی کے معنی دوسرے سے مختلف ہوں گے۔
مثلاً: فرشتوں کی جانب وحی کا تذکرہ اس طرح ملتا ہے:۔

اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ الخ

(انفال آیت ۱۲)

یعنی اللہ تعالیٰ نے غزوہ بدر میں فرشتوں کو مسلمانوں کی تقویت اور جمعیت خاطر کے لئے میدان بدر میں نازل کیا تھا اور اُنپر یہ وحی نازل کی یعنی حکم دیا کہ مسلمانوں کی ہمت بڑھائیں۔

یہاں وحی الی الملائکۃ کے معنی حکم اور ہدایت کے نکلتے ہیں۔

۲۔ حیوانات کی طرف وحی کا تذکرہ اس آیت میں ملتا ہے:۔

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ الخ (النحل آیت ۶۸)

اور تیرے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کی کہ پہاڑوں میں گھر بنائے اور درختوں میں اور جو عمارتیں بناتے ہیں اُن میں (بھی اپنا گھر بنائے) پھر ہر قسم کے پھلوں کا رس چوسے اور اپنے رب کی ہموار کردہ راہ پر چلتی رہے۔

اس آیت میں شہد کی مکھی کی جانب وحی کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہاں وحی سے مراد الہام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ شہد کی فراہمی کے لئے دوڑ دھوپ کرے اور شہد کا ذخیرہ جمع کرے۔ اور اس عمل کے لئے اللہ تعالیٰ نے وہ تمام راہیں ہموار کردیں جو اس کیلئے ضروری تھیں۔

۳۔ آسمانوں کی جانب وحی کا تذکرہ اس آیت میں ملتا ہے:۔

وَاَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (حم سجدہ آیت ۱۲)

اور ہر آسمان میں اللہ نے وحی بھیجدی۔

یہاں وحی سے مراد اپنا ارادہ ومنشا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو دن میں سات آسمان بناکر ہر آسمان میں اُس کے لئے جو مناسب کام تھا اُس کا انتظام کردیا اور آسمانوں میں وہ سب کچھ محفوظ کردیا جو اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی۔

۴۔ زمین کی جانب وحی کا تذکرہ اس آیت میں آیا ہے:۔

یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا (زلزال آیت ۴-۵)

قیامت کے دن زمین اپنے (اوپر گزرے ہوئے) واقعات بیان
کرے گی۔ یہ اس لئے کہ تیرے رب نے اسکو کہنے کی وحی کی ہوگی۔
یہاں زمین کی جانب وحی سے مراد اللہ کا فیصلہ اور اشارہ ہے۔
ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور
صحابہ سے دریافت کیا کیا تم جانتے ہو کہ زمین اپنے کیا واقعات بیان
کرے گی؟ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں.
آپؐ نے ارشاد فرمایا وہ واقعات یہ ہیں کہ زمین ہر انسان کے بارے
میں گواہی دے گی کہ اِس نے میری پُشت پر یہ کام کیا اور اُس نے یہ
کام کیا (یعنی نیکی و بدی کی شہادت دے گی) (ترمذی، نسائی)

علاوہ ازیں قرآن حکیم میں وحی کے ایک اور معنی بھی آئے ہیں جس کا ترجمہ وسوسہ اور خیال سے کیا جاتا ہے۔ ایسا عنوان عموماً شیاطین اور جنّات کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔ سورۂ انعام میں حلال وحرام طعام کے سلسلے میں شیاطینِ الجنِ والانسِ کا یہ وسوسہ نقل کیا گیا اور مسلمانوں کو اس خطرناک شر سے آگاہ کیا گیا۔ قصہ یہ ہوا کہ مدینہ منورہ کے یہودی عالم مشرکین عرب کو جہاں اسلام کے خلاف آمادۂ بغاوت کیا کرتے تھے وہاں احکام اسلام کا بھی مذاق اڑانے کے لئے مشرکین کو یہ بات تلقین کرتے تھے کہ مسلمانوں سے پوچھا جائے آخر یہ کیا معاملہ ہے کہ جس جانور کو اللہ مار دے (یعنی اُسکی موت ہو جاوے) اس کا کھانا حرام ہے۔ اور جس جانور کو ہم ماریں (یعنی ذبح کریں) اس کا کھانا حلال ہے؟

یہ ایسا جاہلانہ سوال تھا جس سے سادہ ذہن مسلمان متأثر ہو سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کجروی پر مسلمانوں کو اس طرح متنبہ کیا:۔

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ

(انعام آیت ۱۲۱)

اُس جانور میں سے مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اور
بلاشُبہ یہ گناہ کی بات ہے اور یقیناً شیاطین اپنے دوستوں کے دلوں
میں وسوسہ ڈالتے ہیں تاکہ (اے مسلمانو) وہ تم سے حجت کریں۔

آیتِ بالا میں شیاطین کے وسوسے اور خیال کو لفظِ وحی سے ظاہر کیا گیا ہے۔ چونکہ وحی کے معنی میں راز اور پوشیدگی بھی شامل ہیں اس لئے شیاطین کی اس کارروائی کو وحی کے لفظ سے ادا کیا گیا۔ علاوہ ازیں اور بھی آیات ہیں جن میں وحی کے مختلف معنی آئے ہیں۔

بہر حال وحی کے ایک معنی خیال اور وسوسہ کے بھی نکل آئے۔ اس طرح قرآن حکیم میں وحی کے حسب ذیل معنی استعمال کئے گئے ہیں:۔

(۱) لطیف اشارہ (۲) خُفیہ کلام (۳) کشف (۴) الہام (۵) حکم (۶) ظن و وہم (۷) وسوسہ و خیال (۸) وِجدان (۹) منشا ارادہ (۱۰) ندا (۱۱) کتابت وتحریر۔ (تفسیر ماجدی)

ہم پھر یکبار امام ابن حزم رح کی خدمت میں رجوع ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں۔

اے علومِ نبوت کے وارث! عورتوں کی جانب وحی کے معنیٰ نبوت، آپ نے کس دلیل سے اخذ کیا ہے؟

فَالَی اللّٰہِ الْمُشْتَکیٰ۔

حقیقتِ گمشدہ

حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے متعلق تمام آیاتِ قرآنی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ قرآن حکیم نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق یہود کی تفریط اور نصاریٰ کی افراط دونوں کے خلاف اپنا وہ فرضِ منصبی ادا کیا ہے جسکے لئے قرآن حکیم کی دعوت کا ظہور ہوا ہے۔ یہود اور نصاریٰ اس بارے میں قطعاً دو مخالف اور متضاد عقیدوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہود کہتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام مفتری کاذب اور شعبدہ باز تھے۔ نصاریٰ کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ خُدا خدا کے بیٹے یا ثالث ثلثہ (تین خداؤں میں کا ایک) ہیں۔

قرآن حکیم نے چند لفظوں میں عیسائیوں کے عقیدۂ الوہیت مسیح کی ایسی صاف تردید کی ہے کہ اس سے زیادہ صفائی ممکن نہیں۔

مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ وَاُمُّہٗ صِدِّیْقَۃٌ کَانَا یَاْکُلَانِ الطَّعَامَ الآیہ۔

(مائدہ آیت ۷۵)

حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ فی الحقیقت وہ کیا تھے تو اِن علامات سے بالکل غیر مشتبہ طور پر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک انسان تھے، ایک عورت کے بطن سے پیدا ہوئے، جن کا شجرۂ نسب تک موجود ہے اور جو انسانی جسم رکھتے تھے۔ وہ اُن صفات سے متصف تھے جو انسان کے لئے مخصوص ہیں۔ وہ سوتے تھے، کھاتے تھے، گرمی سردی محسوس کرتے تھے، اُنھیں بھوک پیاس بھی لگتی تھی، دُکھ درد سے بھی سابقہ پڑتا تھا، خوف و امید بھی طاری ہوتی تھی، اُن کو آزمائش میں بھی ڈالا گیا۔ اِن سب کے باوجود وہ اللہ کے نبی اور رسول بھی تھے۔

اس قرآنی تفصیل کے بعد کون معقول انسان یہ تصور کر سکتا ہے کہ وہ خود خدا یا خدائی میں شریک یا خدا کا بیٹا تھے؟ لیکن یہ انسانی ذہن کی انتہائی گمراہی ہے کہ عیسائی خود اپنی مذہبی کتابوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کو صریحاً ایک انسانی زندگی پاتے ہیں اور پھر بھی اِنھیں خدائی سے متصف قرار دینے پر اصرار کئے چلے جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اُس تاریخی اور حقیقی مسیح کے قائل ہی نہیں جو عالم وجود میں ظاہر ہوئے تھے بلکہ اُنھوں نے خود اپنے وہم و گمان سے ایک خیالی مسیح تصنیف کر لیا اور اسکو خُدا بنا لیا۔

تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔

اب رہا حضرت مسیح علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا یہ کسی طرح بھی خدائیت کی دلیل نہیں بن سکتی۔ کیونکہ اِن کی مثال حضرت آدم علیہ السلام جیسی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اُنہیں مٹی سے پیدا کیا اور پھر اپنے کلمۂ کُن سے وجود بخشا۔

اگر بِن باپ کے ہونا حضرت مسیح علیہ السلام کے خُدا ہونے کی دلیل ہو تو حضرت آدم علیہ السلام اِسکے زیادہ مستحق ہیں۔ کیونکہ وہ بغیر باپ و ماں کے پیدا ہوئے ہیں۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ
ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ (آل عمران آیت ۵۹)

بیشک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم جیسی ہے کہ اُن کو
مٹی سے بنایا پھر کہا اُسکو کہ ہوجا وہ ہوگیا۔
حق بات وہی ہے جو تیرا رب کہے پھر تم شک کرنیوالوں سے نہ ہو۔

کَذٰلِکَ کنواری مریم کو فرشتوں نے یہ بشارت دی:۔

اے مریمؑ اللہ تجھے اپنے ایک فرمان کی خوشخبری دیتا ہے اُس کا
نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ دنیا اور آخرت میں معزز ہوگا اور اللہ کے مقرب
بندوں میں شمار کیا جائے گا۔ لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور
بڑی عمر کو پہنچ کر بھی اور وہ صالحین میں شمار ہوگا۔

یہ بشارت سنکر مریمؑ بولیں یارب میرے ہاں بچہ کہاں سے ہوگا
(جبکہ) مجھے کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے ؟

جواب ملا (کذٰلِک) "ایسے ہی" اللہ پیدا کر دیتا ہے جو وہ چاہتا
ہے۔ جب وہ کسی بات کو پورا کرنا چاہتا ہے تو بس اُس سے کہتا ہے کہ
"ہوجا" سو وہ ہو جاتی ہے۔ (آل عمران آیت ۴۵ تا ۴۷)

سورۂ مریم میں یہی بشارت اس طرح ہے:۔

مریم نے کہا میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا جبکہ مجھے کسی بشر نے
چھوا تک نہیں اور میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں۔

فرشتے نے جواب دیا (کذٰلک) "ایسے ہی ہوگا" تیرا رب فرماتا
ہے ایسا کرنا میرے لئے بہت آسان ہے۔ (مریم آیت ۲۰، ۲۱)

اسی سورۂ مریم میں حضرت زکریا علیہ السلام کے طلبِ اولاد پر اللہ تعالےٰ نے اُنھیں یحییٰؑ کی بشارت دی اسپر بوڑھے زکریا (علیہ السلام) نے تعجب کا اظہار کیا۔

عرض کیا پروردگار، بھلا میرے ہاں لڑکا کیسے پیدا ہوگا جبکہ
میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہوکر سوکھ چکا ہوں ؟

جواب ملا (کذٰلک) "ایسے ہی ہوگا" تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ تو
میرے لئے ایک ذراسی بات ہے۔ آخر اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں
جب کہ تو کوئی چیز نہ تھا۔ (مریم آیت ۸، ۹)

سورۂ ذاریات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتے ایک ذِی علم لڑکے کی بشارت دیتے ہیں۔

یہ سُنکر اُن کی بیوی سارہؑ تعجب سے چیختی ہوئی آگے بڑھی اور

اپنا منہ پیٹ کر کہنے لگی بوڑھی بانجھ کو ؟ فرشتوں نے جواب دیا (کذلک)
"ایسے ہی" تیرے رب کا ارشاد ہے وہ حکیم ہے سب کچھ جاننے والا ہے۔

(ذاریات آیت ۲۸، ۲۹، ۳۰)

اس ساری تقریر کا اصل مقصد عیسائیوں پر اُن کے اس عقیدے کی غلطی واضح کرنا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نہ خدا تھے اور نہ شریکِ خدا اور نہ خدا کا بیٹا۔ جس طرح حضرت زکریا علیہ السلام کو یحییٰ معجزانہ طور پر عطا ہوئے جبکہ اُن کی عمر سَو سال سے زائد تھی اور اُن کی بیوی نوّے سال کی اور بانجھ بھی ایسے ہی معجزانہ طور پر حضرت مسیحؑ بغیر باپ کے حضرت مریمؓ سے پیدا ہوں گے۔ اس سے اللہ تعالےٰ عیسائیوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ اگر یحییٰ کو ان کی اعجازی ولادت نے اِلٰہ نہیں بنایا تو مسیح محض اپنی غیر معمولی پیدائش کی بنا پر اِلٰہ کیسے ہو سکتے ہیں ؟

اور جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی بشارت پر ان کی بیوی حضرت سارہؓ تعجب سے کہتی ہیں کہ مجھ بوڑھی بانجھ کے ہاں بیٹا کیسے ہوگا جبکہ میرے شوہر بھی اپنی آخری عمر کو پہنچ چکے ہیں ؟

تو فرشتے اُن کو جواب دیتے ہیں کہ "ایسے ہی ہوگا" یعنی بڑھاپے اور بانجھ پن کے باوجود اولاد ہوگی۔ اگرچہ عادتاً اس عمر میں انسان کے ہاں اولاد پیدا نہیں ہوتی لیکن اللہ کی قدرت سے ایسا ہونا بعید نہیں ہے۔

اس وضاحت کے بعد سیدہ مریمؓ کو جو بشارت دی جارہی ہے کہ اے مریمؓ اللہ تجھکو بیٹے کی بشارت دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔

اسپر سیدہ مریمؓ کے تعجب پر فرشتے کا یہ کہنا کہ ایسا ہی ہوگا۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ تیرے ہاں لڑکا ہوگا باوجود اسکے کہ تجھے کسی بشر نے نہیں چھوا ہے۔

الغرض سیدہ مریمؓ کو صنفی مواصلت کے بغیر بچہ پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی اور فی الواقع اسی صورت سے حضرت عیسیٰ کی پیدائش ہوئی ورنہ اگر بات یہی تھی کہ مریمؓ کے ہاں اُسی معروف فطری طریقہ سے بچہ پیدا ہونے والا تھا جس طرح دنیا میں عورتوں کے ہاں ہوا کرتا ہے تو یہ سارا بیان نعوذ باللہ قطعی مہمل ٹھیرتا ہے جو سورۂ آل عمران کے چوتھے رکوع سے چھٹے رکوع تک چلا گیا ہے اور وہ تمام بیانات بھی بے معنی قرار پاتے جو ولادتِ مسیح کے باب میں قرآن کے دوسرے مقامات پر ہمیں ملتے ہیں۔ عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام

کو "اللہ" اور "ابن اللہ" اسی وجہ سے سمجھا تھا کہ اُن کی پیدائش غیر فطری طور پر بغیر باپ کے ہوئی تھی اور یہودیوں نے سیدہ مریم پر الزام بھی اسی وجہ سے لگایا کہ ایک لڑکی غیر شادی شدہ تھی اور اُس کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ اگر یہ سرے سے واقعہ ہی نہ تھا تب اِن دونوں گروہوں (یہود و نصاریٰ) کے خیالات کی تردید میں بس اتنا کہہ دینا بالکل کافی تھا کہ تم لوگ غلط کہتے ہو۔ وہ لڑکی شادی شدہ تھی۔ فلاں شخص اس کا شوہر تھا اور اُسی سے عیسیٰ پیدا ہوئے تھے۔ یہ مختصر سی دوٹوک بات کہنے کے بجائے مسیح بن مریم کہنے کی آخر کیا ضرورت تھی؟ جس سے بات سلجھنے کے بجائے اور اُلجھ جائے۔

نیز ولادت کے وقت سیدہ مریم کا اپنے جائے اعتکاف سے دور جنگل کی طرف نکل جانا خود اس بات کی بڑی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ اور اگر سیدہ مریم شادی شدہ ہوتیں اور شوہر ہی سے ان کے ہاں بچہ پیدا ہو رہا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میکے اور سسرال سب کو چھوڑ چھاڑ کر زچگی کے لئے تن تنہا ایک دور دراز مقام پر کیوں چلی جائیں؟

پھر شادی شدہ لڑکی کے ہاں جب پہلا بچہ پیدا ہو رہا ہو تو وہ چاہے تکلیف سے کتنی ہی تڑپے اور پریشان ہو عزیز و اقارب سے دور نہیں ہو سکتی۔ یہ ساری تفصیل اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اُس عام طریقہ سے نہیں ہوئی جو عورتوں کو پیش آتی ہے (یعنی صنفی مواصلت کے ساتھ)

پس جو لوگ قرآن کو اللہ کا کلام مانتے ہیں اور پھر حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اُن کی ولادت حسبِ معمول باپ اور ماں کے اتصال سے ہوئی تھی وہ لوگ گویا یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اظہار مانی الضمیر اور بیانِ مدعا کی اتنی قدرت بھی نہیں رکھتا جتنی خود یہ حضرات رکھتے ہیں۔

تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔

اللہ کی باادب بندیاں

سیدہ مریمؓ کی والدہ سیدہ حنہؓ (قرآنی زبان میں اِمْرَاَةُ عِمْرَانَ) حضورِ رب میں یہ دُعا کر رہی ہیں۔

"اے میرے پروردگار میں نے تیری نذر مانی ہے اُس بچہ کی جو

میرے پیٹ میں ہے کہ وہ آزاد رکھا جائے گا (ہر قسم کے دنیوی کاروبار سے اور
تیری ہی خدمت اور عبادت کے لئے وقف رہے گا۔) سو تو اے اللہ یہ نذر
مجھ سے قبول فرمالے۔ کیونکہ تو خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے (سننے والا
میری دعاؤں کا جاننے والا میرے اخلاص کا)

والدۂ مریم کی توحید پرستی، اخلاص وللّٰہیت مناجات کے لفظ لفظ سے نمایاں ہو رہی ہے اللہ والوں اور اللہ والیوں کو اپنی اولاد کے لئے فکر اُن کے دینی و اخلاقی تحفظ کی ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہ اللہ والوں کی طرح اللہ والیاں بھی اپنی دُعاؤں میں کس درجہ باادب ہوتی ہیں۔

ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً

حضرت زکریا علیہ السلام رشتہ میں سیدہ مریمؑ کے خالو ہوتے تھے۔ سیدہ مریمؑ کے والد حضرت عمرانؑ کے انتقال کے بعد مسجد اقصےٰ کے خادموں کی سرداری حضرت زکریا علیہ السلام کے حصہ میں آئی۔ آپ ایک تو سیدہ مریم کے عزیز قریب اور پھر خدام مسجد کے سردار بھی تھے۔ مسجد اقصیٰ کیلئے وقف شدہ معصوم مریم کی تربیت ونگرانی اللہ کی طرف سے آپ ہی کو سپرد کی گئی تھی۔

مسجد اقصیٰ کے خادموں کے رہنے اور عبادت کرنے کے لئے ہیکل (مسجد) کے اِدھر اُدھر حجرے یا خلوت خانے بنے ہوئے تھے جن کو محراب کہا جاتا تھا۔ انہی میں سے ایک حجرہ معصوم مریم کا تھا جسمیں وہ مشغولِ عبادت رہتیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام ایک تو یوں بھی سردارِ خدام تھے اور اس حیثیت سے ہر خادم وخادمہ کی نگرانی رکھنا آپکے فرائض میں داخل تھا اور پھر سیدہ مریم کے تو آپ عزیز قریب بزرگ سرپرست بھی تھے۔ اِن کے حجرے میں قدرۃً آپ کی آمد ورفت رہا کرتی تھی۔ آپ جب کبھی بھی سیدہ مریم کے پاس حجرے میں آتے تو اُن کے پاس تر و تازہ میوے موجود پاتے۔ ایک بار بولے اے مریمؓ یہ پھل کہاں سے تجھے مل جاتے ہیں؟ وہ بولیں یہ اللہ کی طرف سے آجاتے ہیں بیشک اللہ جسکو چاہتا ہے بے حساب رزق دے دیتا ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام اس وقت تک بے اولاد تھے۔ اس صالحہ لڑکی کو دیکھ کر فطرۃً اِن کے دل میں اپنی وہ آرزو رقت کے ساتھ پیدا ہوئی جو وارثِ نبوت کے لئے عرصہ دراز سے قائم تھی۔ جس طرح اللہ تعالےٰ اپنی قدرت سے اس گوشہ نشین لڑکی کو رزق

پہنچ رہا ہے انھیں امید ہوئی کہ اللہ تعالےٰ چاہے تو اس بڑھاپے میں بھی اِن کو اولاد دے سکتا ہے۔

بہرحال حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے رب کو بیقراری کے ساتھ پکارا:۔

”پروردگار اپنی قدرت سے مجھے نیک اولاد عطا کر تو ہی دُعا کا سُننے والا ہے۔“ (آل عمران آیت ۳۸)

یعنی مجھے بھی اپنی عنایت سے اُسی طرح دے جیسے یہاں بلا اسباب ظاہری تر و تازہ میوے پہنچ رہے ہیں۔ اولاد کی خواہش ایک امر طبعی ہے اور زُہد کیا کمالِ زہد کے بھی خلاف نہیں۔ قرآن حکیم نے بار بار پیغمبروں کی زبانی اس قسم کی دُعائیں نقل کی ہیں۔

وہ مذاہب حقیقت سے کتنی دُور ہیں جنھوں نے بیوی بچّوں کو ہر حال میں جنجال اور دنیا طلبی قرار دیا ہے۔ ہماری شریعت اسلامیہ نے اولاد کی خواہش کو سنّتِ انبیاً وصدیقین بتایا ہے۔ صحیح بخاری میں تو مستقل عنوانات طلبِ اولاد کے فضائل میں موجود ہیں۔

البتہ یہ حقیقت ضرور ہے کہ صرف اولاد طلبی مقصود نہیں ہوتی اہل اللہ کی نظر آخرت پر بہرحال رہتی ہے۔ اس لئے حضرت زکریا علیہ السلام نے محض اولاد ہی نہیں چاہا بلکہ ذُرِّیَّۃً طَیِّبَۃً نیک اولاد کی درخواست کی جو اُن کے بعد اُن کی دعوت و تبلیغ کے کام کو جاری رکھے۔

اثباتِ کرامت

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا۔ الآیہ (مریم آیت ۳۷)

جب کبھی زکریا مریم کے حجرہ میں آتے تو اُن کے پاس کوئی چیز کھانے کی پاتے۔ (مثلاً تر و تازہ میوے اور مشروبات)

سیدہ مریم اگر نبی تھیں جیسا کہ سلف کے ایک طبقے کی رائے ہے تو یہ غیبی رزق معجزہ اور آیت شمار ہوگا۔

اور اگر وہ نبی نہیں بلکہ صالحہ اور ولی اللہ خاتون تھیں جسمیں کسی بھی اہل علم کا اختلاف نہیں ہے تو یہ غیبی رزق ”کرامت“ سمجھا جائے گا۔ اسی بنا پر محققین اہل سنت نے

آیت مذکورہ کو "کرامات اولیاء" کے اثبات میں نصِ قطعی قرار دیا ہے۔ جیسا کہ قرآن کی بعض دیگر آیات سے بھی ثبوت ملتا ہے۔

اسمہٗ احمد وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ.

(الصف آیت ۶)

اور یاد کرو عیسیٰ بن مریم کی وہ بات جو انھوں نے کہی تھی کہ اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں تصدیق کرنے والا ہوں اُس تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعارفی سلسلہ میں قرآن حکیم کی یہ آیت نہایت اہمیت رکھتی ہے اور یہ ایک ایسا اعلانِ عام تھا جو نزولِ قرآن کے وقت پوری عیسائی دنیا کے لئے ایک تحدی (چیلنج) کی حیثیت رکھتا تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت خاص طور پر ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں جہاں یہ سورت نازل ہوئی ہے یہود اور عیسائیوں کی مستقل آبادیاں تھیں انہی کے درمیان یہ آیت پڑھی گئی جسمیں بغیر کسی ابہام کے واضح طور پر حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ بشارت نقل کی گئی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس بشارت پر جسکو قرآن حکیم نے نقل کیا ہے نہ یہود نے تعجب کیا نہ نصاریٰ نے انکار کیا۔ جبکہ یہودی اور عیسائی دنیا ہر اُس موقعہ کی تاک میں تھی کہ قرآن حکیم کو غلط ثابت کیا جائے اور اُسکو خدائی کلام کے خلاف ایک انسانی کلام قرار دیا جائے۔

بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ قرآن حکیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک اہم اور خصوصی اعلان شائع کرے اور اُسپر کم از کم مدینہ طیبہ کے عیسائی خاموش اور زبان بند ہو جائیں اور کوئی اعتراض نہ کریں؟

یہ بات ایسی نہ تھی کہ اسکو نظر انداز کر دیا جاتا یا اسکو غیر اہم تسلیم کر لیا جاتا۔ یہ

آیت تو عیسائیت کی ساری بنیاد کو متزلزل کرنے والی تھی، اُن کے لئے ایک کھلا چیلنج تھا، ایک للکار تھی، ایک ایسی بات تھی جو عیسائیوں کی نیند اُڑا دینے کے لئے کافی تھی۔ اِن سب کے باوجود عیسائیوں کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے اور دعویٰ کر بیٹھتے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی زندگی میں کبھی بھی ایسی کوئی بشارت نہیں دی اور نہ ہم اُن کی کتاب انجیل میں ایسی کوئی تصریح پاتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے بلکہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت یہ بات مشہور و معروف تھی کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے بعد ایک عظیم نبی و رسول کے آمد کی اطلاع دے چکے تھے اور انجیل مقدس میں بھی اس کا تذکرہ موجود تھا اور بہت سے نیک فطرت عیسائی اُس نبی موعود کے انتظار میں تھے اور بعض تو تلاش میں اپنے ملکوں سے نکل چکے تھے۔ جنمیں مشہور عیسائی عالم عبد اللہ بن سلامؓ اور سلمان فارسیؓ اور نجران کے عیسائی علماء کی ایک بڑی جماعت شامل ہے۔ اور اِن سب سے بڑھکر وہ مشہور زمانہ واقعہ ہے جسمیں حبشہ کے مہاجرین صحابہؓ کو نجاشی بادشاہ نے اپنے دربار میں طلب کیا تھا۔ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سُنیں۔ اسکے بعد اُس نے یہ کہا

مَرْحَبًا بِكُمْ وَبِمَنْ جِئْتُمْ مِنْ عِنْدِهٖ أَشْهَدُ أَنَّهٗ رَسُولُ اللّٰهِ وَأَنَّهُ الَّذِي نَجِدُ فِي الْإِنْجِيلِ وَأَنَّهُ الَّذِي بَشَّرَ بِهٖ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ (مسند احمد)[۱]

اِن سب نے اُس بات کی تصدیق کی جسکو قرآن حکیم نے نقل کیا ہے۔ اور آپ کی ذات بابرکات میں اُن علامات کو پایا جس کا تذکرہ انجیل مقدس میں وہ موجود پاتے تھے۔

قرآن حکیم کی اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی اَحْمَدُ نقل کیا گیا ہے تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک صرف محمدؐ ہی نہ تھا بلکہ اَحْمَدُ بھی تھا۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:۔

أَنَا مُحَمَّدٌ وَأَنَا أَحْمَدُ وَأَنَا الْحَاشِرُ۔

میں محمدؐ ہوں اور میں احمدؐ ہوں اور میں حاشر ہوں۔

اسی مضمون کی روایات امام بخاریؒ، امام مالکؒ، مسلمؒ، دارمیؒ، ترمذیؒ اور نسائیؒ نے

---

[۱] مبارک ہو تم کو اور اُسکو جسکی جانب سے تم آئے ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ یہ وہی ہیں جنکا تذکرہ کتاب

نقل کی ہیں۔ کتب مذکورہ کی مراجعت کر لی جائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اسم گرامی صحابہ کرام میں معروف تھا۔ چنانچہ حضرت حسان بن ثابتؓ کا یہ شعر کتب حدیث میں ملتا ہے:۔

صَلَّی الْإِلٰہُ وَمَنْ یَحُفُّ بِعَرْشِہٖ   وَالطَّیِّبُوْنَ عَلَی الْمُبَارَکِ اَحْمَدَ

اللہ تعالیٰ اور اُسکے حاملانِ عرش فرشے اور سب پاکیزہ ہستیوں نے بابرکت احمدؐ پر درود بھیجا ہے۔

امام بخاری اپنی کتاب تاریخ صغیر میں روایت نقل کرتے ہیں کہ علی بن زید فرماتے ہیں کہ خواجہ ابو طالب یہ شعر پڑھا کرتے تھے:۔

وَشَقَّ لَہٗ مِنِ اسْمِہٖ لِیُجِلَّہٗ   فَذُوالْعَرْشِ مَحْمُوْدٌ وَّھٰذَا مُحَمَّدٌ

اللہ نے اپنے نام پاک سے آپکا نام بنایا تاکہ عظمت ظاہر ہو۔ پس عرش والا محمود ہے اور آپ محمدؐ ہیں

(فتح الباری ج ۶ ص ۴۲۴)

علامہ ابوجعفر بغدادی المتوفی ۲۴۵ھ نے لکھا ہے کہ حضور اکرم کی بعثت سے پہلے کل سات آدمی اس نام کے گزرے ہیں۔ اِن میں ایک محمد بن سفیان بن مجاشع کی بابت یہ لکھا ہے کہ اِن کے والد نے ایک شامی راہب سے یہی سُنکر کہ آئندہ پیمبر کا نام محمدؐ ہوگا یہ نام اپنے لڑکے کا رکھ دیا۔

احمد کے دو معنی آتے ہیں۔ ایک وہ شخص جو اللہ کی سب سے زیادہ تعریف کرنیوالا ہو۔ دوسرے معنی۔ وہ شخص جسکی سب سے زیادہ تعریف کی گئی ہو یا بندوں میں سب سے زیادہ قابل تعریف ہو۔

قرآن حکیم میں آپؐ کا اسم گرامی محمدؐ بھی آیا ہے:۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ   (آل عمران آیت ۱۴۴)

محمدؐ کے لفظی معنی وہ شخص جسکی مدح بہت بار کی گئی ہو یا جو اعلیٰ صفات کا مجموعہ ہو۔

(راغب مفردات)

تاریخی طور پر ثابت ہے کہ آپ سے پہلے عرب میں اس نام کا رواج بہت ہی شاذ و نادر تھا۔ صاحب قاموس نے لفظ حمد کے ایک معنی قضاء الحق بھی لکھے ہیں۔ لہٰذا احمد کے معنی وہ ذات جس کا حق پورا کر دیا گیا۔ یعنی قدرت کی جانب سے نوع انسان کو جس جس سرحدِ کمال تک پہنچانا مقصود تھا وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پورا کر دیا گیا ہو۔

حضرت حسان بن ثابتؓ یوں مدح سرا ہوتے ہیں۔

وَاَحْسَنُ مِنْكَ لَمْ تَرَقَطُّ عَيْنِيْ ۔۔۔ وَاَجْمَلُ مِنْكَ لَمْ تَلِدَا لنِّسَاءُ

خُلِقْتَ مُبَرَّءً مِنْ كُلِّ عَيْبٍ ۔۔۔ كَاَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

میری آنکھوں نے آپ جیسا حسین کبھی نہیں دیکھا ۔۔۔ اور آپ جیسا صاحب جمال کسی عورت نے پیدا نہ کیا

آپ ہر ہر عیب سے پاک صاف پیدا کئے گئے ۔۔۔ گویا آپ اپنی خواہش ومرضی کے مطابق پیدا کئے گئے

صاحب قاموس نے محمد کے ایک معنی یہ بھی لکھے ہیں :۔

مُحَمَّدٌ اَلَّذِیْ یُحْمَدُ مَرَّةً بَعْدَ مَرَّةٍ۔

یعنی جسکی تعریف کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوا ہو۔

صاحب قاموس نے محمدؐ کو تحمید سے مشتق سمجھا ہے جسکا خاصہ مبالغہ اور تکرار ہے یعنی کسی کام کو ایسے طور پر پورا ہونے کو ظاہر کرے کہ کوئی جزو متروک نہ ہو جیسے قَتَّلَهٗ تَقْتِیْلًا ٹکڑے ٹکڑے کیا کوئی جزو باقی نہ رہا۔

ایسے ہی محمدؐ کے معنی یہ ہوئے : وہ ذات جس کا جزو جزو قابل حمد ہے۔

شہر بدایوں کے ایک غیر معروف شاعر لطف بدایونی نے آپ کے جمال وکمال کو اس خوبصورتی سے ادا کیا ہے کہ اُردو مدحت سرائی میں ایسا عنوان نظر نہیں آتا۔

رُخ مصطفےٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ

نہ ہماری بزم خیال میں نہ دُکان آئینہ ساز میں

البتہ فارسی زبان میں اس عنوان کو اس طرح ادا کیا گیا ہے۔

آفاقہا گردیدہ اَم مہر بتاں ورزیدہ ام ؎ بسیار خوباں دیدہ اَم لیکن تو چیزے دیگری

وصلی اللہ علےٰ سید المرسلین وخاتم النبیین وعلےٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

تذکرہ خاتم الانبیاء
سیدنا محمد بن عبداللہ
(صلی اللہ علیہ وسلم)

محمد رسول اللہ اور قرآن حکیم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد چند حضرات نے سیدہ عائشہ صدیقہ رض سے سوال کیا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات کے متعلق کچھ تفصیل بیان فرمائیے۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رض نے تعجب سے پوچھا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟

اُن لوگوں نے جواب دیا ہاں ضرور پڑھتے ہیں! فرمایا کہ آپ کی پوری زندگی قرآن ہی تو تھی۔ (یعنی قرآن حکیم کے جو تقاضے ہیں وہ آپ کی عملی زندگی میں موجود تھے۔

قرآن کلام الٰہی ہے اور خاتم الانبیاء اُسکے مہبط اور اُسکے اولین مخاطب ہیں، قرآن رُشد و ہدایت ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راشد و ہادی ہیں۔ قرآن دعوت و پیغام ہے اور نبی اکرم اُسکے داعی و پیغمبر ہیں۔

اس لئے قرآن حکیم کا ہر جملہ اور اُسکی ہر آیت کسی نہ کسی حیثیت میں آپ کے اخلاق وصفات سے تعلق رکھتی ہے تو اب کس طرح یہ بتایا جائے کہ قرآن حکیم میں آپ کا ذکر جمیل کتنی جگہ آیا ہے۔

البتہ قرآن حکیم نے جن آیات میں آپکے اسماء گرامی یا صفاتِ عالیہ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے یا آپ کو "یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اور یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ" کہہ کر مخاطب کیا ہے اُس کی تفصیل قرآن حکیم کی (۱۱۴) سورتوں میں مختلف مقامات پر ملتی ہے۔ ذیل میں وہ اسماء وصفات درج کئے جاتے ہیں :۔

(۱) ——— مُحَمَّدٌ ——— آل عمران آیت ۱۴۴، احزاب آیت ۴۰، سورہ محمد آیت ۲، الفتح آیت ۲۹
(۲) ——— اَحْمَدُ ——— الصف آیت ۶۔

۳ــ عَبْدُ اللہ ــ الحدید آیت ۹، الجن آیت ۱۹، الکہف آیت ۱۔

۴ــ شَاہِدٌ ــ الفتح آیت ۸، الاحزاب آیت ۴۵، المزمل آیت ۱۵۔

۵ــ مُبَشِّرٌ ــ الاحزاب آیت ۴۵، الفتح آیت ۸، الفرقان آیت ۵۶۔

۶ــ بَشِیْرٌ ــ الاعراف آیت ۱۸۸، ہود آیت ۲، سبا آیت ۲۸، فاطر آیت ۲۴، البقرہ آیت ۱۱۹

۷ــ نَذِیْرٌ ــ العنکبوت آیت ۵۰، الاعراف آیت ۱۸۸، الاحزاب آیت ۴۵،
ہود آیت ۲، الحجر آیت ۸۹، فاطر آیت ۲۳، ۲۴، ۳۷، ۴۲،
الفتح آیت ۸، الذاریات آیت ۵۰، ۵۱، الملک آیت ۸، ۹، ۱۷، ۲۶،
الفرقان آیت ۵۶، البقرہ آیت ۱۱۹، سبا آیت ۲۸، ۴۶، احقاف آیت ۹۔

۸ــ مُذَکِّرٌ ــ سورۃ الغاشیہ آیت ۲۱۔

۹ــ سِرَاجٌ مُّنِیْرٌ ــ الاحزاب آیت ۴۶۔

۱۰ــ دَاعِیْ اِلَی اللہ ــ الاحزاب آیت ۴۶، احقاف ۳۲۔

۱۱ــ حَقٌّ ــ سورۂ یونس آیت ۱۰۸۔

۱۲ــ عَزِیْزٌ ــ سورہ توبہ آیت ۱۲۸۔

۱۳ــ رَءُوْفٌ ــ سورہ توبہ آیت ۱۲۸۔

۱۴ــ رَحِیْمٌ ــ سورہ توبہ آیت ۱۲۸۔

۱۵ــ اَمِیْنٌ ــ سورہ دخان آیت ۱۸۔

۱۶ــ نُوْرٌ ــ سورہ مائدہ آیت ۱۵۔

۱۷ــ نِعْمَۃٌ ــ سورہ بقرہ آیت ۲۳۱، النحل آیت ۸۳۔

۱۸ــ ہَادِیْ ــ سورہ روم آیت ۵۳۔

۱۹ــ رَحْمَۃٌ ــ سورہ انبیاء آیت ۱۰۷۔

۲۰ــ طٰہٰ ــ سورہ طٰہٰ آیت ۱

۲۱ــ یٰسٓ ــ سورہ یٰسٓ آیت ۱

۲۲ــ اَلْمُزَّمِّلُ ــ سورہ مزمل آیت ۱

۲۳ــ اَلْمُدَّثِّرُ ــ سورہ مدثر آیت ۱

۲۴ــ مُنْذِرٌ ــ سورہ نمل آیت ۹۲، ص آیت ۴، ۶۵۔

۲۵ — خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ — سورہ احزاب آیت ۴۰

۲۶ — نَبِیٌّ — سورہ آل عمران آیت ۱۶۱، مائدہ آیت ۸۱، انفال آیت ۶۴، ۶۵، ۶۷، ۷۰، توبہ آیت ۶۱، ۷۳، ۱۱۳، ۱۱۷، حجرات آیت ۲، احزاب آیت ۱، ۶، ۲۸، ۳۲، ۳۸، ۴۵، ۵۰، ۵۳، ۵۶، ۵۹، تحریم آیت ۱، ۳، ۸، ۹، طلاق آیت ۱، الممتحنہ آیت ۱۲۔

۲۷ — رَسُوْلٌ — سورہ آل عمران آیت ۳۲، ۸۱، ۸۶، ۱۰۱، ۱۳۲، ۱۵۳، ۱۷۲، ۱۶۹، ۱۸۳، نساء آیت ۱۳، ۱۴، ۵۹، ۶۱، ۶۴، ۶۹، ۷۹، ۸۰، ۱۰۰، ۱۱۵، ۱۳۶، ۱۷۰، مائدہ آیت ۱۵، ۳۳، ۴۱، ۵۵، ۵۶، ۶۷، ۸۳، ۹۲، ۹۹، اعراف آیت ۱۵۷، ۱۵۸، انفال آیت ۱، ۱۳، ۲۴، ۴۱، ۴۶، توبہ آیت ۱، ۳، ۷، ۱۶، ۲۴، ۲۹، ۳۳، ۶۱، ۵۴، ۵۹، ۶۳، ۶۵، ۸۰، ۸۱، ۸۴، ۸۶، ۸۸، ۹۱، ۹۴، ۹۷، ۹۹، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۲۸، النحل آیت ۱۱۳، الاسراء آیت ۹۳، الحج آیت ۷۸، المومن آیت ۷۸، الزخرف آیت ۲۹، العنکبوت آیت ۱۸، الحجرات آیت ۱، ۳، ۷، ۱۴، ۱۵، الفتح آیت ۹، ۱۲، ۱۳، ۱۷، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹۔ الاحزاب آیت ۱۲، ۲۱، ۲۹، ۳۱، ۳۳، ۳۶، ۴۰، ۵۳، ۵۷، دخان آیت ۱۳، الحدید آیت ۷، ۸، ۲۸، المجادلہ آیت ۴، ۵، ۸، ۹، ۱۲، ۱۳، ۲۰، ۲۲، محمد آیت ۳۲، ۳۳، المنافقون آیت ۱، ۵، ۷، ۸۔ تغابن آیت ۸، ۱۲، الفرقان آیت ۷، ۲۷، ۳۰، ۴۱۔ الطلاق آیت ۱۱، الجمعہ آیت ۲، الصف آیت ۹، ۱۱۔ الحشر آیت ۴، ۶، ۷، ۸۔ الممتحنہ آیت ۱، الجن آیت ۲۳، ۲۷، الحاقہ آیت ۴۰، النور آیت ۴۷، ۴۸، ۵۱، ۵۲، ۵۴، ۶۲، ۶۳، بقرہ آیت ۱۴۳، ۱۵۱۔

۲۸ — شَہِیْدٌ — بقرہ آیت ۱۴۳، نساء آیت ۴۱، النحل آیت ۸۹، الحج آیت ۷۸۔

۲۹ — عَبْدٌ — الفرقان آیت ۱، اسراء آیت ۱

۳۰ — بُرْہَانٌ — نساء آیت ۱۷۵۔

قرآن حکیم اور احادیث صحیحہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جن صفات اور اسماء کا ذکر ہے اس پر

علماء اسلام نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ غالباً ان میں علامہ ابن دحیہؒ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اس عنوان پر سب سے پہلے کتاب مرتب کی۔

ان کے علاوہ امام ابن کثیرؒ اور محدث بیہقیؒ اور ابن عساکر جیسے محدثین نے اس سلسلے کی تمام احادیث اور آثار کو جمع کیا ہے جس میں آپؐ کے اسماء اور صفات و القاب مذکور ہیں۔ مشہور محدث ابوبکر بن عربیؒ نے شرح ترمذی میں اُن کی تعداد چونسٹھ (۶۴) شمار کی ہے۔ بعض نے ننانوے (۹۹) اور بعض نے تین سو (۳۰۰) اور بعض نے ایک ہزار صفات تک شمار کیا ہے۔ مگر یہ کثرت اس لئے بھی درست نہیں ہے کہ اس شمار میں اُن تمام انتسابات کو بھی شامل کر لیا ہے جو کسی مناسب حال آپؐ کی جانب منسوب ہیں۔ اگرچہ بحیثیت اسماء وصفات یا القاب اُن کا اطلاق آپؐ کی ذاتِ اقدس پر صحیح نہیں ہو سکتا۔ مثلاً آپ نے انبیاء کرام اور اپنے درمیان صفت نبوت کے تعلق کو ظاہر کرنے اور ختم نبوت کو واضح کرنے کے لئے خود کو قصر نبوت کی آخری لَبِنَہ (اینٹ) ظاہر فرمایا۔ تو جن بزرگوں کو آپؐ کے اسماء وصفات کی کثرت سے شغف تھا اُنھوں نے اس انتساب کو آپکی ایک صفت اَللَّبِنَۃ بھی شمار کیا ہے جو یقیناً ایک حقیقت ہے لیکن اِس کا اطلاق ذاتِ نبوی پر درست نہیں ہوگا۔

بخاری کی ایک حدیث مرفوع میں آپ کا یہ ارشاد منقول ہے ارشاد فرمایا میرے پانچ نام ہیں:- محمدؐ، احمدؐ، مَاحی (یعنی کفر و شرک مٹانے والا) حَاشر (یعنی قیامت میں سب سے پہلے میرا حشر ہوگا) عَاقب (بقول امام زہریؒ آخری پیغمبر)

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ پانچ کا یہ عدد حصر کے لئے نہیں ہے بلکہ آپؐ نے اس جگہ اپنے اُن اسماء وصفات کا ذکر فرمایا ہے جو کتب سابقہ اور امم ماضیہ میں آپ سے متعلق مشہور و معروف رہے ہیں اُسکے علاوہ حسب ذیل صفات بھی بہت مشہور و معروف ہیں:-

اَلمتوکل، اَلمختار، اَلمصطفیٰ، اَلشفیع، اَلمشفع، اَلصادق، اَلمصدوق۔

بہرحال محمد اور احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو آپ کے اسم گرامی ہیں اور باقی اسماء صفات یا القاب ہیں۔ قرآن حکیم میں آپؐ کے نام پاک کے انتساب سے ایک سورت کا نام محمد ہے جسکے شروع ہی میں آپؐ کا یہ اسم گرامی موجود ہے۔ اور سورہ صف میں اسم احمد مذکور ہے۔

اور یہ حقیقت بھی قابل ذکر ہے کہ آپ کے یہ اسماء وصفات محض رسمی یا اصحاب واحباب کی عقیدت کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ان اسماء صفات کا آپ کی عملی زندگی اور طبیعت

و فطرت کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے جیسا کہ آپؐ نے اپنے آپ کو ماحی (کفر و شرک کو مٹانے والا) اور حاشر و عاقب ظاہر فرمایا ہے حقیقت کا اظہار ہے۔ یا مثلاً محمدؐ اُس ذات کو کہتے ہیں جسکے تذکرے خوبی و نیکی کے ساتھ ہمیشہ ہوتے ہوں۔

صاحب قاموس نے محمدؐ کے ایک معنی یہ بھی لکھے ہیں وہ ذات جسکی تعریف کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوا ہو۔

اس اسم گرامی میں انبیاء سابقین کی بشارت اور مستقبل میں تذکرہ ہائے حیات کی جانب اشارہ ہے۔ اسی طرح احمدؐ کا اطلاق اُس ذات پر ہوتا ہے جو سب سے زیادہ حمد الٰہی کرتا ہو یا اُس شخصیت کو کہا جاتا ہے جسکی سب سے زیادہ تعریف کی گئی ہو۔ یہ ہر دو اسم گرامی آپ کی عبدیت کاملہ کو ظاہر کرتے ہیں۔ بلاشبہ آپؐ خدا پرست انسانوں کے لئے مُبشّر و بشیر ہیں اور فتنہ جُو مفسدوں کے لئے منذر و نذیر ہیں۔ روز قیامت صادق و کاذب دونوں پر شاہد و شہید ہیں۔ حقیقت طلب کرنے والوں کے لئے آپؐ مُذکّر (ناصح) ہیں۔ راہِ حق سے بھٹکے ہوئے لوگوں کے لئے ہادی اور خدا بیزار انسانوں کے لئے داعی ہیں۔ آپ کا وجود کائنات کے لئے رحمۃٌ ہے جہل و شرک کے لئے نور ہیں اور پیغام الٰہی کے لئے نبی و رسول ہیں۔ مصائب و آلام میں عزیز ہیں اور نوع انسانی کی حیات کے لئے رؤف و رحیم ہیں۔ آپ کی صدا حق ہے اپنی ذات میں الصادق و الامین خدا کے آخری پیغام کے حامل ہونے کی وجہ سے خاتم النبیین اور قصر نبوت کے سراج منیر، فاتح عالم ہونے کے باوجود گدائے کملی پوش ہیں اس لئے مزمّلؐ اور مدثر بھی ہیں۔ اللّٰھم صلّ وسلّم و بارک علیہ۔

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

یہ چند اشارات ہیں جو آپ کی ذات وصفات کے اظہار کے لئے شہادت دیتے ہیں کہ آپؐ کے یہ اسماء وصفات آپؐ کی ذات کے لئے سب سے بڑے "شاہد عدل" ہیں۔

بشاراتُ النّبیؐ

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ الآیہ۔

(آل عمران آیت ۸۱)

اور وہ وقت قابل ذکر ہے جب اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں سے
(عالم ارواح میں) عہد لیا کہ میں تم کو جو کچھ کتاب اور حکمت عطا کروں پھر تمہارے
پاس وہ پیغمبر آئے جو اِن کتابوں کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے پاس ہیں تم
اُس پر ضرور ایمان لانا اور اُسکی ضرور مدد کرنا۔
(پھر) اللہ نے فرمایا کہ تم اس عہد کا اقرار کرتے ہو؟ اور اسکو میرا
اہم عہد سمجھ کر قبول کرتے ہو؟ سب نے جواب دیا بیشک ہم نے اقرار کیا۔ اللہ
نے فرمایا اب تم اس عہد پر گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ بنتا ہوں۔

قرآن حکیم کی زبان میں یہ آیت آیتِ میثاق کہلاتی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جس عہد و پیمان کا ذکر ہے وہ عالم ازل (عالمِ آخرت کی ایک قسم) کا واقعہ ہے جہاں مبعوث ہونے والے تمام انبیاء و رسل کی ارواح کو جمع کیا گیا اور اُن سے یہ عہد لیا گیا کہ تم سب کے بعد ایک رسول آئیں گے جو تمہاری کتابوں اور شریعتوں کی تصدیق کرنے والے ہوں گے۔ تم اور تمہاری اُمتیں اُنپر ایمان لانا اور اگر اُن کا زمانہ پاؤ تو اُن کی بھرپور مدد بھی کرنا۔

اس عہد و پیمان کا سب نے اقرار کیا۔ اور دنیا میں جب کوئی نبی مبعوث ہوئے تو اُنھوں نے اپنی اپنی امتوں کو اس عہد کی یاد تازہ کروائی۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء و رسل کے کتابوں اور صحیفوں میں اس قسم کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے تین قسم کا عہد لیا ہے۔

ایکؔ کا ذکر سورہ اعراف آیت ۱۷۲ میں اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کے تحت کیا گیا ہے۔ اس عہد کا مقصد یہ تھا کہ تمام بنی نوع انسان اللہ کی ذات اور اسکی ربوبیت پر اعتقاد رکھیں۔

دوسرےؔ عہد کا ذکر وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَکْتُمُوْنَہٗ الخ (آل عمران آیت ۱۸۷) میں کیا گیا ہے۔ یہ عہد صرف اہل کتاب کے علماء سے لیا گیا تھا کہ وہ حق کو نہ چھپائیں بلکہ صاف صاف واضح طور پر لوگوں سے بیان کیا کریں۔

تیسراؔ عہد آیت میثاق ہے۔ جسکی تفسیر اوپر گزر چکی ہے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ آیت میثاق میں ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کیونکہ عالم دنیا میں کوئی بھی ایسا نبی نہیں گزرا۔ جس نے اپنی امت کو آپ پر ایمان لانے اور آپکی تائید و نصرت

کرنے کی وصیت نہ کی ہو۔ اور اگر آپ کی بعثت انبیاء کے زمانے میں ہوتی تو اُن سب کے نبی آپؐ ہی ہوتے اور وہ تمام انبیاء آپ کی امت میں شمار ہوتے۔ چنانچہ ایک حدیث صحیح میں خود آپؐ کا ارشاد منقول ہے:۔

اگر آج موسیٰ (علیہ السلام) بھی زندہ ہوتے تو اُن کو بھی میری اتباع کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے کہ آخری زمانے میں جب (عیسیٰ) (علیہ السلام) نازل ہوں گے تو وہ بھی قرآن حکیم اور تمہارے نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کے احکام پر عمل کریں گے (تفسیر ابن کثیرؒ)

یمن کے بادشاہ تُبَّع کا گزر جب مدینہ منورہ پر ہوا تو اُس کے ہمراہ چار سو (۴۰۰) علماء تھے۔ سب علماء نے بادشاہ سے استدعا کی کہ ہم کو اس سرزمین پر رہ جانیکی اجازت دی جائے۔ بادشاہ نے اس کا سبب دریافت کیا۔ علماء تورات نے کہا کہ ہم نبیوں کے صحیفوں میں یہ لکھا ہوا پاتے ہیں کہ آخر زمانے میں ایک نبی پیدا ہوں گے اُن کا نام محمدؐ ہوگا اور یہ سرزمین اُن کی دارالہجرت ہوگی۔

بادشاہ نے اُن سب کو قیام کی اجازت دیدی اور اپنی جانب سے ہر ایک کے لئے ایک ایک مکان تعمیر کروایا اور بہت سا مال و دولت بھی دیا اور ایک خاص مکان بھی تعمیر کروایا کہ جب نبی آخرالزماں یہاں ہجرت فرما کر آئیں گے تو وہ اس مکان میں قیام فرمائیں۔ اُس نے آپکے نام نامی ایک خط بھی لکھا تھا جسمیں اپنے اسلام لانے اور اشتیاقِ ملاقات کو ظاہر کیا ہے۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ احمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور اگر میری عمر نے وفا کی تو میں ضرور اُن کا مددگار ہونگا اور اُن کے دشمنوں سے جہاد کروں گا اور ان کے دل سے ہر غم کو دور کروں گا۔

یہ خط لکھ کر اُس نے اُسپر اپنی مُہر بھی لگائی اور ایک عالم کے سپرد کیا کہ اگر تم اُس نبی آخرالزماں کا زمانہ نہ پاؤ تو میرا یہ عریضہ اُن کی

خدمت میں پیش کر دینا ورنہ اپنی اولاد کو یہ خط سپرد کر کے وصیت کرنا جو میں تم سے کر رہا ہوں۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ جن کے مکان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد قیام فرمایا تھا وہ اسی عالم کی اولاد میں سے ہیں اور یہ مکان بھی وہی تھا جسکو تبع شاہِ یمن نے اسی غرض کے تحت تعمیر کروایا تھا اور بقیہ انصارِ مدینہ انہی چار سو علماء کی اولاد ہیں۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے آپؐ کی تشریف آوری کے بعد وہ عریضہ تبعؑ کی جانب سے آپؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ (زرقانی ج ۱ ص ۲۵۶ زاد المعاد ج ۲ صفحہ ۵۵)

حضرت عروہ ابن زبیر بیان کرتے ہیں کہ مدینہ منوّرہ کے یہودی علماء میں سب سے پہلے یاسر بن اخطب آپکی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کا کلام سن کر ایمان لے آئے اور اپنی قوم سے کہا کہ میرا کہا مانو یقیناً یہ وہی نبی ہیں جسکے ہم منتظر تھے وہ آگئے ہیں۔ لیکن ان کا بھائی حیّی بن اخطب جو قوم کا سردار تھا انکی مخالفت کیا اور قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

(فتح الباری ج ۷ ص ۲۱۳)

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے مدینہ منوّرہ کے یہودی بے چینی کے ساتھ اُس نبی کا انتظار کرتے تھے جن کے آمد کی پیشین گوئیاں وہ اپنی کتابوں میں درج پاتے تھے اور دُعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلد وہ زمانہ آئے جسمیں وہ نبی موعود موجود ہوں تاکہ کفار و مشرکین کا خاتمہ ہوا اور ہمارا دورِ عروج شروع ہو۔ مشرکین کے دباؤ اور ظلم کے وقت وہ یہ کہا کرتے تھے کہ اب جس جس کا جی چاہے ہم پر ظلم کر لے لیکن جب وہ نبی مبعوث ہوں گے تو پھر ہم اسکا بدلہ چکالیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مدینہ کو جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم ہوئے تو اُنکی اکثریت بغیر کسی ترغیب و دباؤ کے آپ پر ایمان لے آئی۔ اور آپس میں یہ کہا کہ دیکھو کہیں یہودی ایمان لانے میں ہم سے بازی نہ لے جائیں۔

مگر یہ بدترین حادثہ تھا کہ وہی یہودی جو آنے والے نبی کے انتظار میں

گھڑیاں گن رہے تھے آپؐ کے آنے پر سب سے بڑے مخالف ہو گئے۔

قرآن حکیم انہی کے بارے میں یہ حقیقت ظاہر کرتا ہے۔

فَلَمَّا جَاءَهُم مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ الآیۃ (بقرہ آیت ۸۹)

جب وہ نبی اُن کے ہاں مبعوث ہو گئے تو انھوں نے انکار کر دیا۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ مشہور و معروف وہ واقعہ ہے جسکو امّ المومنین حضرت صفیہ نے بیان فرمایا جو خود ایک بڑے یہودی عالم کی بیٹی تھیں فرماتی ہیں کہ:۔

"جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو میرے باپ اور چچا جو بڑے یہودی عالموں میں شمار ہوتے تھے آپ سے ملنے کیلئے گئے بڑی دیر تک آپ سے گفتگو کی۔ پھر جب گھر واپس آئے تو میں نے خود اپنے کانوں سے ان دونوں کو یہ گفتگو کرتے سُنا۔

چچا کیا یہ وہی نبی منتظر ہیں جن کا تذکرہ ہم اپنی کتابوں میں پڑھتے ہیں؟

والد نے کہا خدا کی قسم یہ وہی معلوم ہوتے ہیں!

پھر چچا نے کہا کیا آپ کو اس کا یقین ہے؟

والد نے کہا اسمیں کوئی شک نہیں!

پھر چچا نے پوچھا تو آپ کا کیا ارادہ ہے؟

والد نے کہا جب تک جان میں جان ہے میں انکی مخالفت کروں گا اور ان کی بات چلنے نہ دوں گا۔ (سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۶۵)

حقیقت یہ ہے کہ مدینہ کے یہودیوں کا خیال اور زعم یہ تھا کہ نبوت ہمارے ہی خاندان میں رہے گی اور وہ نبی جسکی خبریں انبیاء بنی اسرائیل دیتے آئے ہیں ہمارے خاندان بنو اسحٰق سے ہوگا۔ مگر جب وہ بنی اسمٰعیل میں پیدا ہوئے جس کو یہ لوگ حقیر سمجھتے تھے تو انکار پر آمادہ ہو گئے۔

انجیل یوحنا میں صراحت کے ساتھ یہ مضمون موجود ہے کہ

مسیح علیہ السلام کی آمد کے زمانے میں بنی اسرائیل تین شخصیتوں کے منتظر تھے۔ ایک حضرت مسیح کے دوسرے ایلیاہ نبی (یعنی

حضرت الیاس کی آمد ثانی) کے تیسرے "وہ نبی"

(باب ۱ آیات ۱۹-۲۵) انجیل یوحنا۔

وہ نبی یا اُس نبی کا تذکرہ اس قدر کثرت سے تھا کہ نام یا لقب ظاہر کرنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی جاتی تھی تورات میں تو اُس نبی کا نام تک موجود تھا۔ لیکن یہودیوں نے اپنی کتابوں میں اور عیسائیوں نے اناجیل اربعہ میں دانستہ و نادانستہ اتنی کثرت سے ردوبدل، تحریف و تاویل کی کہ اصل حقیقت ہی گم ہو کر رہ گئی۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (ایڈیشن ۱۹۴۶ء) کے مضمون (بائبل) کا مصنف لکھتا ہے۔

"اناجیل میں ایسے نمایاں تغیرات دانستہ طور پر کئے گئے ہیں جیسے مثلاً بعض پوری پوری عبارتیں کسی دوسرے ماخذ سے لیکر کتاب میں شامل کر دی گئیں۔ یہ تغیرات ایسے لوگوں نے کئے جو اپنے آپ کو اس کا مجاز سمجھا کرتے تھے تاکہ اللہ کی اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ مفید اور مؤثر بنایا جائے۔ اس کے لئے اُنھوں نے کتاب کے مناسب جو بھی مواد مل گیا اُسکو کتاب میں شامل کر دیا۔ بہت سے اضافے دوسری صدی عیسوی میں ہو گئے اور کچھ نہیں معلوم کہ ان کا ماخذ کیا تھا۔"

اسکے باوجود انجیل یوحنا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے بعد ایک آنے والے کی خبر دے رہے ہیں جسکے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ دنیا کا سردار ہوگا ابد تک رہے گا، سچائی کی تمام راہیں دکھائیگا۔ اور خود اُن کی (یعنی حضرت عیسیٰ) کی تصدیق کرے گا۔

ساتویں صدی کے آغاز تک حبشہ کے بادشاہ نجاشی تک کو یہ معلوم تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک نبی کی پیشنگوئی کر گئے تھے اور ایسی صاف نشاندہی انجیل میں موجود تھی جسکی وجہ سے نجاشی کو یہ رائے قائم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ نبی ہیں جسکی بشارت انجیل میں موجود ہے۔ چنانچہ مکہ مکرمہ سے جن مسلمانوں نے حبشہ کی جانب پہلی ہجرت کی ہے وہاں کے بادشاہ نجاشی نے حضرت

مرحبا تم لوگوں کو اور اُس ہستی کو جسکے ہاں سے تم آئے ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور وہ وہی ہیں جن کا ذکر ہم انجیل میں پڑھتے ہیں اور یہ وہی ہیں جنکی بشارت عیسیٰ بن مریم نے دی ہے۔

مَرْحَبًا بِكُمْ وَبِمَنْ جِئْتُمْ مِنْ عِنْدِهٖ، أَشْهَدُ أَنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَأَنَّهُ الَّذِيْ نَجِدُ فِي الْإِنْجِيْلِ وَأَنَّهُ الَّذِيْ بَشَّرَ بِهٖ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ۔ (مسند احمد)

اور قابل ذکر یہ بات بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور بشارات کا ذکر چاروں انجیلوں کے علاوہ ایک اور انجیل میں بھی ہے جسکو کلیسا نے غیر قانونی اور مشکوک الصحت قرار دیدیا ہے وہ انجیل برنا باس ہے جسکو چھپانے کا خاص اہتمام کیا گیا اور جسکی تلاوت ممنوع قرار دیدی گئی اور یہ کتاب عرصہ دراز تک دنیا سے ناپید رہی۔ کیونکہ اسکا مرتب وہ واحد شخص تھا جو مسیح علیہ السلام کے بارہ[12] حواریوں میں سے ایک ہے۔ وہ خود اپنے آپکو حواری لکھتا تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ میں شروع سے آخر وقت تک حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ رہا ہوں اور اس کتاب میں آنکھوں دیکھا حال اور کانوں سُنا اقوال نقل کر رہا ہوں۔ بلکہ کتاب کے آخر میں یہ بھی لکھتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت مجھ کو تاکیداً کہا تھا کہ میرے متعلق جو جو غلط فہمیاں لوگوں میں پھیل گئی ہیں انھیں تم دور کر دینا اور دنیا کے سامنے صحیح حالات پیش کر دینا۔

اس کتاب میں حضرت مسیح علیہ السلام کی بنیادی تعلیمات جو ہر نبی کی دعوت و تبلیغ میں موجود رہے ہیں پوری وضاحت کے ساتھ موجود ہیں۔ توحید، عقیدۂ آخرت، حشر ونشر، کفر و شرک کی تردید۔ صفاتِ خداوندی کی تفصیل وغیرہ سب کچھ موجود ہیں۔ یہ کتاب صدیوں تک ناپید رہی۔ سولھویں صدی میں اسکے اطالوی ترجمہ کا صرف ایک نسخہ پوپ سکٹس کے کتب خانے میں پایا گیا لیکن کسی کو اسکے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں ایک شخص جان ٹولینڈ کے ہاتھ یہ نسخہ لگا پھر مختلف جگہ گشت کرتا ہوا ۱۷۳۸ء میں ویانا کی امپریل لائبریری میں پہنچ گیا اور ۱۹۰۷ء میں اس کا انگریزی میں ترجمہ آکسفورڈ کے کلیرنڈن پریس سے شائع ہوا۔ اس کا شائع ہونا ہی تھا کہ عیسائی دنیا کا کلیسائی نظام

میں اضطراب و ہلچل پیدا ہوا اور یہ احساس شدت کے ساتھ پیدا ہو گیا کہ یہ کتاب عیسائیت ہی کی بنیاد ختم کر دینے کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ اسمیں نبیوں کی بنیادی تعلیم توحید، عقیدۂ آخرت، صفات خداوندی، جنت دوزخ، حشر و نشر سب کچھ موجود ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک نبی کی شان کے مطابق ہوا کرتا ہے وہ اپنے آپ کو اللہ کا بندہ اور اُس کا فرستادہ رسول قرار دیتے ہیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ کی تعلیم دیتے ہیں۔ شرک و کفر کی تردید کرتے ہیں۔ عبادت کی روح اور اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور سبق آموز اور مؤثر طریقے پر مضامین بیان کرتے ہیں۔ ایک نبی کی زبان اور طرز بیان طبیعت و مزاج جو ہر ایک نبی کا حصۂ مشترک اور ورثہ ہے۔ وہ اس کتاب میں پایا جاتا ہے۔ بخلاف اناجیل اربعہ جسمیں بے سر و پا حکایات، بے ربط مضامین، حلال و حرام کی ساری قیود کا کالعدم ہونا، مسیح کی اُلوہیت اور ان کا ابن اللہ ہونا اور صلیب پر جان دیکر تمام اولادِ آدم کے گناہوں کا کفارہ ہو جانا وغیرہ وغیرہ جو ظاہر ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ذاتی تعلیمات نہیں ہو سکتیں۔ یقیناً کسی کا تصنیف کردہ نقشہ ہے۔

الغرض انجیل برنا باس جو عیسائیت کی حقیقت تھی اسکے نسخوں کو بڑے اہتمام سے غائب کر دیا گیا اور کلیسا کے ذریعہ اسکو غیر مستند، ممنوع التلاوت اور جعلی قرار دیدیا گیا یہاں تک کہ اسکی دوبارہ اشاعت نہ ہو سکی۔

حقیقت یہ ہے کہ اسمیں جہاں حضرت مسیح علیہ السلام کا صحیح تعارف ہے وہاں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیشمار پیشین گوئیاں اور علامات موجود ہیں۔ جو موجودہ عیسائیت کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی ایسی تمام تعلیمات اور بشارات وغیرہ کی مکمل اور غیر مشکوک وضاحتیں علماء اسلام کی تصنیفات میں بکثرت موجود ہیں۔ خاص طور پر اس عنوان پر چار کتابیں مسلّم الثبوت اور بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

۱ میزان الحق۔ مؤلفہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی۔
۲ ہدایۃ الحیارٰی۔ مؤلفہ امام ابن قیم رحمہ۔
۳ الفارق۔ مؤلفہ باجی زادہ رحمہ۔
۴ اظہار حق۔ مؤلفہ مولانا آلِ نبی امروہوی رحمہ۔

انجیل برناباس عیسائیت کی غیر مسلّم کتابوں میں اس لئے بھی شامل کر دی گئی کہ قدیم مسیحیت کے سرکاری عقیدے کے خلاف تھی۔ اس کا مرتب آغاز کتاب ہی میں لکھتا ہے کہ

میں اس کتاب کے ذریعہ اُن لوگوں کے خیالات کی اصلاح کرنا چاہتا ہوں جو شیطان کے دھوکہ میں آکر یسُوع (عیسیٰ) کو ابن اللہ قرار دیتے ہیں اور حرام کھانوں کو حلال کر دیتے ہیں۔ انہی دھوکہ کھانے والوں میں پولوس بھی ہے جسکی کتاب انجیل اناجیل اربعہ میں مستند سمجھی جاتی ہے۔

برناباس لکھتا ہے کہ بائیبل میں جو چار انجیلیں قانونی اور معتبر قرار دی گئیں اُن میں سے کسی کا بھی لکھنے والا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا صحابی نہ تھا اور خود انھوں نے کبھی ایسا دعویٰ بھی نہیں کیا اُس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحابیوں (حواریوں) سے حاصل کردہ معلومات اپنی انجیل میں درج کی ہے۔ بخلاف انجیل برناباس جس کا مصنف دعویٰ کرتا ہے کہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کے اولین بارہ۱۲ حواریوں میں سے ایک ہوں۔ شروع سے آخر تک حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ رہا ہوں اور آنکھوں دیکھا حال اور کانوں سنا اقوال اسمیں درج کر رہا ہوں۔ اور اپنی کتاب کے آخر میں یہ بھی تصریح کرتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے دُنیا سے رخصت ہوتے وقت مجھ کو وصیت فرمائی کہ میرے متعلق جو جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں اُن کو تم دور کرنا اور صحیح حالات سے لوگوں کو آگاہ کرنا تمہارا اولین فرض ہے۔

وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں موجود تھے اُس زمانے میں اُن کے معجزات اور عجیب وغریب واقعات کو دیکھ کر سب سے پہلے مشرک رومیوں نے اُن کو خدا اور بعض نے خدا کا بیٹا کہنا شروع کیا۔ پھر یہ گمراہ عقیدہ بنی اسرائیل کے عوام میں بھی پھیل گیا۔ اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سخت پریشان ہوئے اور اُنھوں نے بار بار اس غلط عقیدے کی شدت کے ساتھ تردید کی اور لوگوں کو بتایا کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے نہیں ہیں۔ اللہ تعالےٰ ایسی تمام باتوں سے

پاک ہے۔ وہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں جیساکہ اِن سے پہلے بھی انسان رسول ہوئے ہیں۔ برناباس نے حضرت مسیح علیہ السلام کی بعض وہ تقریریں بھی نقل کی ہیں جو حضرت موصوف نے اِس عقیدے کے خلاف قوم کے سامنے کی تھیں۔

ان تقریروں میں حضرت مسیح علیہ السلام نے بڑی سختی کے ساتھ اس مشرکانہ عقیدے کی تردید کی ہے۔ مسیحی کتابوں میں جہاں کہیں بھی اس انجیل برناباس کا ذکر آتا ہے اسے یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ جعلی انجیل ہے جسے کسی مسلمان نے تصنیف کر کے برناباس کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ لیکن یہ ایک بڑا جھوٹ اور بہانہ ہے جو راہِ فرار کیلئے اختیار کیا گیا۔

اسکی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے تقریباً (۷۵) سال پہلے پوپ کلاسیس اول کے زمانے میں بدعقیدہ اور گمراہ کن کتابوں کی جو فہرست مرتب کی گئی اور ایک پاپائی فتوے کے ذریعہ سے جن کتابوں کا پڑھنا ممنوع کر دیا گیا تھا اُن میں انجیل برناباس بھی شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ اُس وقت کونسا مسلمان تھا جس نے یہ انجیل تصنیف کی؟

اسکے علاوہ خود عیسائی علماء نے تسلیم کیا ہے کہ ملک شام، اسپین، مصر وغیرہ ممالک کے ابتداء دورِ مسیحیت میں ایک مدت تک برناباس کی انجیل رائج رہی ہے اور اسکو چھٹی صدی عیسوی میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بڑا جھوٹ اس لئے بول دیا گیا کہ اس میں جابجا نبی آخر الزماں کے متعلق کثرت سے پیشین گوئیاں اور علامات موجود ہیں جنکو حضرت مسیح علیہ السلام نے بیان کیا تھا۔ اور اس میں چاروں انجیلوں کی بہ نسبت حضرت مسیح علیہ السلام کے حالات اور واقعات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور اس طرح بیان کئے گئے ہیں جیسے کوئی شخص فی الواقع وہاں موجود ہے۔ دیکھ اور سُن رہا ہے۔

اسمیں توحید کی تعلیم، شرک کی تردید، صفاتِ باری کی وضاحت، عبادات کی روح، اخلاق کا بیان بڑے ہی موزوں اور مؤثر انداز میں ملتا ہے۔ بخلاف اناجیل اربعہ جن کی بے ربط باتیں، متضاد حکایتیں عجب اور خود پسندانہ کلام، واضح طور پر ثبوت پیش کرتا ہے کہ ایسا طرز کلام کسی نبی ورسول کا نہیں ہوسکتا۔ الغرض انجیل برنا باس ہی اصل کتاب کے مشابہ تھی جسکو کلیسا نے غیر معتبر اور ممنوع تلاوت قرار دیا۔ اس کتاب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشین گوئیاں اور کثرت سے علامات موجود ہیں اور آپ کی ذات وصفات کی وضاحتیں اور آپکی اُنہی تعلیمات کا خلاصہ موجود ہے جسکو قرآن حکیم نے بھی بیان کیا ہے۔ ان تمام باتوں کی تفصیل متذکرہ بالا کتابوں میں جمع کر دی گئیں ہیں جنکے اُردو تراجم بھی ہوچکے ہیں۔

قرآن حکیم نے اِن حقائق کو اس طرح بیان کیا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی تعارف ہے۔

قرآنی مضمون

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ الآیۃ

(اعراف آیت ۱۵۷، ۱۵۸)

وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں اُس رسول کی جو نبی امّی ہے (امّی یا تو اُمّ (بمعنی والدہ) کی طرف منسوب ہے جسطرح بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے اور کسی کا شاگرد نہیں ہوتا۔ یا اُمّ القریٰ والا یعنی مکی بھی اور اُمتِ عرب والا بھی) جسے وہ اپنے ہاں لکھا ہوا پاتے ہیں تورات اور انجیل میں۔ (یعنی جسکی صفات و علامات کو وہ بالکل واضح اور غیر مشتبہ طور پر اپنی کتابوں تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اتنی تحریف و تبدیل کے بعد بھی یہ حوالے مروّجہ تورات وانجیل میں اب تک بالکل نہ گم ہوسکے ہیں) انھیں وہ نیک کرداری کا حکم دیتا ہے اور انھیں بدکرداری سے روکتا ہے اور اُن کے لئے پاکیزہ چیزیں

جائز بتاتا ہے اور اُن پر گندی چیزیں حرام رکھتا ہے اور اُن پر سے بوجھ اور قیدیں جو اُن پر (اب تک) تھیں اُتار دیتا ہے (اسکی شریعت تمام رسم ورواج اور سابقہ شریعتوں کی ناسخ اور اُن پر حاکم ہے) سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور اُن کا ساتھ دیا اور اُن کی مدد کی اور اُس نور کی پیروی کی جو اُن کے ساتھ اُتارا گیا ہے (قرآن) سو یہی لوگ تو ہیں پوری فلاح پانے والے (دنیا اور آخرت دونوں میں)

آپ کہہ دیجئے کہ اے انسانو! بیشک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف اُسی اللہ کا جسکی حکومت ہے آسمانوں اور زمین میں (جس طرح اللہ کی اُلوہیت اور حکومت عام ہے اسی طرح اُسکے رسول کی بھی دعوت ہمہ گیر و ہمہ مُلکی ہے) سوائے اُس کے کوئی معبود نہیں وہی جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ سو ایمان لاؤ اللہ اور اسکے امی رسول و نبی پر جو خود بھی ایمان رکھتا ہے اللہ اور اُس کے کلاموں پر اور اُس کی پیروی کرتے رہو تاکہ تم راہ پاؤ (یعنی راہ یابی، فلاح یابی، کامرانی جو کچھ بھی ہے اِس رسول امی کی پیروی و اتباع میں ہے۔

مثال کے طور پر ایک شاعر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ایک بہترین قصیدہ لکھ کر لاتا ہے جسمیں دُنیا بھر کے کمالات اور محاسن آپؐ کی ذات میں جمع کر دیتا ہے لیکن شاعر کا دل آپؐ کی رسالت کے اعتراف اور آپ کے اتباع سے یکسر خالی ہے تو وہ شاعر ہرگز اہل ایمان میں شامل نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی حُبِّ رسولؐ میں سرشار ہو کر آپؐ کو سب کچھ سمجھ رہا ہے لیکن اتباع سے دُور ہے تو وہ بھی فلاح یابی و کامرانی سے دُور رہے گا۔

وہ کچی آگ ہے جسمیں دُھواں ہو　　　وہ جھوٹا عشق ہو جسمیں فُغاں ہو

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ الآیۃ

(بقرہ آیت ۸۹)

اور جب اُن کے پاس ایک کتاب اللہ کے پاس سے پہنچ گئی تصدیق کرنے والی اُسکی جو اُن کے پاس پہلے سے موجود ہے (باوجودیکہ

وہ تورات کی پیشینگوئیوں کی بنا پر اس ظہور کے منتظر تھے) اور کافروں کے مقابلہ میں ان کا نام لیکر فتح ونصرت کی دعائیں مانگتے تھے لیکن جب وہی جانی بوجھی ہوئی بات سامنے آگئی تو صاف انکار کر گئے اور مخالفت پر کمر باندھ لی۔ پس ان لوگوں کے لئے جو دیدہ دانستہ کفر کی راہ اختیار کریں اللہ کی لعنت ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ الآیۃ (بقرہ آیت ۱۴۶)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے (مراد یہود ونصاریٰ) وہ آپؐ کو پہچانتے ہیں اس طرح جیسے کہ اپنی نسل کو پہچانتے ہیں۔ اور بیشک اُن میں سے کچھ لوگ حق کو چھپاتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ الآیۃ (الفتح آیت ۲۹)

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ (صحابہ) اُن کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم خو ہیں (اے مخاطب) تو ان کو دیکھے گا (اللہ کے سامنے) جھکنے والے سجدہ کرنے والے اور اس طریقہ سے اللہ کے فضل اور اُسکی رضا کے خواہشمند ہیں۔ اُنکی نشانی یہ ہے کہ اُن کے چہروں (پیشانیوں) پر سجدے کے نشانات ہیں۔ تورات اور انجیل میں ان کا ذکر اسی طرح ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۔ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۔ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ۔ الآیۃ (الشعراء آیت ۱۹۲ تا ۱۹۷)

اور یقیناً یہ قرآن جہانوں کے پروردگار کا اُتارا ہوا ہے اسکو روح الامین (جبرئیل) نے اللہ کی جانب سے تیرے قلب پر نازل کیا تاکہ تو اللہ کے نافرمانوں کو ڈرانے والوں میں شامل ہو۔ یہ صاف ستھری عربی زبان میں ہے اور اس کا ذکر گزشتہ پیغمبروں کی کتابوں میں موجود ہے۔ کیا ان اہل مکہ کے لئے یہ نشانی نہیں ہے کہ اس نبیؐ کو

بنی اسرائیل کے علماء جانتے ہیں۔

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان ہی بشارات کے بارے میں اس جانب اشارہ فرمایا تھا۔

اَنَا دَعْوَةُ اَبِیْ اِبْرَاهِیْمَ وَبُشْرٰی عِیْسٰے (الحدیث)

میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دُعا ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔

یعنی دُعائے خلیل و نوید مسیحا،

قرآن حکیم نے دُعائے ابراہیم علیہ السلام کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ الآیۃ (بقرہ آیت ۱۲۹)

اے ہمارے پروردگار ان اہل عرب ہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو اُن کو تیری آیات پڑھکر سُنائے اور اُن کو کتاب (قرآن) اور حکمت سکھائے اور اُن کو ہر قسم کی بُرائیوں سے پاک کرے۔ بے شبہ تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اور بشارتِ مسیح علیہ السلام کا ذکر اس طرح ہے :-

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ الآیۃ (الصف آیت ۶)

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب عیسیٰ بن مریم نے اپنی قوم بنی اسرائیل سے کہا اے بنی اسرائیل میں تمہاری جانب اللہ کا رسول ہوں تصدیق کرنے والا ہوں تورات کی جو میرے سامنے موجود ہے اور بشارات دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اُس کا نام احمد ہو گا۔ پس جب اُن کے پاس وہ اللہ کا پیغمبر آیات لیکر آیا تو کہنے لگے یہ تو کھلا جادو ہے۔

صبح سعادت

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات پر تقریباً چھ صدیاں گزر چکی تھیں دُنیا نے ایک لاکھ سے زائد انبیاء و رسل کی تعلیمات کو بھلا دیا تھا۔ کائناتِ انسانی حق پرستی کے بجائے مظاہر پرستی میں مبتلا ہو چکی تھی۔ ہر ہر ملک میں

نوعِ انسانی سے لے کر نوعِ جمادات تک کی پرستش مذہب اور ملت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کوئی انسان کو خدا کہہ رہا تھا تو دوسرا کسی کو خدا کا بیٹا قرار دے رہا تھا۔ سورج کی پوجا، چاند ستاروں کی پرستش، حیوانوں درختوں، پتھروں کی عبادت، آگ، پانی، ہوا، مٹی کے سامنے سجدہ ریزی، غرض کائنات کی ہر شئی پرستش اور پوجا کے لائق تھی۔ اگر نہیں ہے تو صرف ذاتِ واحد قابلِ پرستش نہیں ہے۔ نہ احدیت کا تصور نہ صمدیت کا عقیدہ۔ اگر کسی نے کسی بھی شکل میں اللہ کا نام لیا ہے تو واسطہ اور وسیلہ کا سہارا لیکر۔ یہی وہ تاریک دور تھا جس کو "زمانۂ جاہلیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

کفر و شرک کے اس اندھیرے میں نورِ ہدایت نمودار ہوا۔ یہ سال "عام الفیل" کہلاتا ہے۔ مہینہ ربیع الاوّل کا دن دوشنبہ (پیر) وقت صبح کا، تاریخ میں مؤرخین نے ۸، ۹، ۱۲ ربیع الاوّل بیان کیا ہے۔ تحقیقی روایات ۹ ربیع الاوّل کی زیادہ مضبوط ہیں۔ سنِ عیسوی کے لحاظ سے ۲۰ اپریل ۵۷۱ء خواجہ ابوطالب کے مکان میں ولادت باسعادت ہوئی۔

(سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۷۲)

طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۶۴ کی ایک روایت حضرت عباس رضؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مختون اور ناف بُریدہ پیدا ہوئے۔ خواجہ عبد المطلب کو یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا اور انھوں نے کہا کہ شاید میرے اس بیٹے کی بڑی شان ہوگی۔

خود حضرت آمنہ کی روایت ہے کہ جب میرا یہ بچہ پیدا ہوا تو بدن نہایت صاف ستھرا پاک تھا جسم پر کسی قسم کی آلائش و گندگی نہ تھی۔

(زرقانی ج ۱ ص ۱۲۴)

خواجہ عبد المطلب نے ساتویں دن آپ کا عقیقہ کیا اور محمدؐ آپ کا نام تجویز کیا۔ خاندان کے لوگوں نے عبد المطلب سے پوچھا اے ابو الحارث آپ نے ایسا نام کیوں تجویز کیا جو آپ کے آبار واجداد اور آپ کی قوم میں کسی نے آج تک نہیں رکھا؟

عبد المطلب نے جواب دیا میں نے یہ نام اس لئے رکھا کہ آسمانوں اور زمین میں اسکی تعریف ہو۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۱۲۴)

سلسلۂ نسب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عربی النسل ہیں۔ عرب کے معزز قبیلہ قریش کی سب سے مقتدر اور صاحب عزت شاخ بنو ہاشم سے ہیں۔ عرب کے علمُ الانساب کے مشہور عالم ومحدث علامہ ابن عبد البرؒ لکھتے ہیں کہ

علم انساب کے تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عدنان کی نسل سے ہیں۔ اور عدنان حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔

آپؐ کا سلسلہ نسب اس طرح ہے:۔

محمدؐ بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قُصی بن کلاب بن مُرّہ بن کعب بن لُوئی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مُدرکہ بن الیاس بن مُضر بن نزار بن معد بن عدنان بن اُدد بن المقوم بن تارح بن یشجب بن یعرب بن ثابت بن اسمٰعیل بن ابراہیم علیہما السلام (فتح الباری ج ۷ ص ۱۲۵)

سلسلۂ نسب میں عدنان تک تمام مؤرخین متفق ہیں۔ عدنان سے اوپر حضرت اسمٰعیلؑ تک کتنے نام ہیں اسمیں بعض مؤرخین تیئس ۲۳ نام لکھتے ہیں اور بعض چالیس ۴۰ نام۔ (واللہ اعلم)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنا نسب بیان فرماتے تو عدنان تک ہی بیان فرماتے اور آگے یہ کہکر توقف فرماتے کَذَبَ النَّسَّابُوْنَ نسب والوں نے غلط کہا ہے۔ یعنی علم انساب کے جاننے والوں کا یہ دعویٰ کہ ہم کو تمام انساب کا علم ہے بالکل غلط بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حقیقی علم نہیں۔

(طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۲۸)

آپ کی والدہ محترمہ سیدہ آمنہ کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے:۔

آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زُہرہ بن کلاب بن مُرّہ۔

(طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۳۱)

اسطرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پدری اور مادری سلسلۂ نسب کلاب پر جمع ہوجاتا ہے۔

قرآنی مضمون

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ الآیہ (جمعہ آیت ۲ تا ۴)

اللہ وہی ہے جس نے اُمّیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے مبعوث کیا جو انھیں اللہ کی آیات پڑھکر سناتا ہے اور اُن کو بُرے اخلاق سے پاک کرتا ہے اور اُنھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ اُس رسول سے پہلے وہ لوگ کھُلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے اور اس رسول کی بعثت اُن کے لئے بھی ہے جو ابھی اُن لوگوں سے نہیں ملے ہیں (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت صرف اہل عرب ہی کیلئے نہیں ہے بلکہ دنیا جہاں کے اُن انسانوں کیلئے بھی ہے جو ابھی آکر حلقہ بگوشِ اسلام نہیں ہوئے ہیں اور قیامت تک آنے والے ہیں) اور اللہ تعالیٰ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ۔ (توبہ آیت ۱۲۸)

اے لوگو تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو بلحاظ نسب تم ہی میں سے ہیں جنکو تمہارے نقصان کی بات نہایت گراں گزرتی ہے (چاہتے ہیں کہ تم کو کوئی ضرر نہ پہونچے) جو تمہارے نفع کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں (خاص طور پر) ایمانداروں کے ساتھ تو بڑے ہی شفیق و مہربان ہیں۔ (ایسے رسول کو تسلیم نہ کرنا سخت محرومی کی بات ہے)

بعض مفسرین نے (أَنفَسِكُمْ) میں (ف) پر زبر پڑھا ہے جسکے معنی نہایت شریف و اعلیٰ کے ہیں۔ اس قرأت پر آیت کا ترجمہ یہ ہوگا۔

بیشک تمہارے پاس ایک ایسا رسول آچکا ہے جو تم میں سب سے اعلیٰ اور اشرف خاندان کا ہے۔

اس مضمون کی تائید قیصرِ روم کی اُس تحقیق سے بھی ہوتی ہے جبکہ اُس نے ابوسفیان سے

(جو ابھی تک کافر تھے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب دریافت کیا تھا:۔

كَيْفَ نَسَبُهُ فِيكُمْ؟

اُن کا نسب کیا ہے؟

ابوسفیان نے جواب دیا:۔

هُوَ فِينَا ذُو نَسَبٍ!

وہ ہم میں بڑے خاندان والا ہے!

یہ جواب سنکر قیصر روم نے کہا:۔

وَكَذٰلِكَ الرُّسُلُ تُبْعَثُ فِي أَحْسَابِ قَوْمِهَا۔

پیغمبر ہمیشہ شریف ہی خاندان سے ہوتے ہیں۔

(بخاری شریف ج۱)

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا الآیہ (شوریٰ آیت ۷)

اور اسی طرح ہم نے آپؐ پر قرآن کو بہ زبان عربی اُتارا تاکہ آپ مکہ والوں کو اور اسکے اطراف رہنے والوں کو آگاہ کر دیں۔ اور تاکہ آپ یکجا ہونے والے دن سے خبردار کریں جسکے آنے میں کوئی شک نہیں (یعنی قیامت) ایک گروہ جنت میں جائیگا اور دوسرا گروہ جہنم میں۔

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ۔ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ۔ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ۔ (الضحیٰ۔ آیت ۶ تا ۸)

اے پیغمبر کیا تم کو اللہ نے یتیم نہیں پایا؟ پھر اپنی آغوش رحمت میں جگہ دی۔ اور کیا تم کو حیران و ناواقف نہیں پایا؟ پھر کلماتِ انسانی کی ہدایت کے لئے رہنمائی کی۔ اور کیا تم کو ضرورت مند اور محتاج نہیں پایا؟ پھر ہر قسم کی سروری دیکر غنی بنا دیا۔

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ

مُّسْتَقِيمٍ۔ (شوریٰ آیت ۵۲، ۵۳)

اور اسی طرح اے نبیؐ ہم نے اپنے حکم سے ایک رُوح آپکی طرف وحی کی ہے۔ آپ کو کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے؟ مگر اس رُوح کو ہم نے ایک نور بنا دیا جس کے ذریعہ ہم راہ دکھاتے ہیں۔ اپنے بندوں میں سے جسکو چاہتے ہیں اور یقیناً آپ سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کر رہے ہو اُس اللہ کے راستے کی طرف جو زمین و آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے۔ (اے لوگو) آگاہ ہو جاؤ سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ۔ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ۔ الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ۔ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ (سورہ الم نشرح آیت ۱ تا ۴)

کیا ہم نے قبولِ حق اور صداقت کے لئے آپؐ کا سینہ نہیں کھول دیا۔ اور معرفتِ الٰہی کی حقیقی طلب اور کائنات انسانی کی بے راہ روی پر اُن کی ہدایت کی تڑپ کا بوجھ ہم نے کیا آپؐ سے دور نہیں کر دیا۔ جس نے آپؐ کی کمر توڑ رکھی تھی اور ہم نے آپؐ کے ذکر خیر کو کائنات میں کیا بلند نہیں کر دیا؟

نبوت سے پہلے

عمر مبارک ابھی صرف چھ سال کی تھی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ آپؐ کو آپکے ننھیال (مدینہ) لیکر گئیں تھیں واپسی میں مقام ابواء پر بیمار ہوگئیں اور چند روز علیل رہ کر وہیں وفات پائی۔ والد ماجد عبداللہ کا انتقال تو اُسی وقت ہو چکا تھا جبکہ آپ بطنِ مادر ہی میں تھے۔

عمر کے آٹھویں سال دادا عبد المطلب نے بھی دُنیا سے منھ موڑ لیا۔ اس طرح عہد طفلی ہی میں وہ سب سرپرستیاں ختم ہوگئیں جو دنیا میں ایک معصوم بچے کو میسر آتی ہیں بچپن کا یہ دور شفیق چچا ابو طالب کے حصے میں آیا۔ چچا نے اپنے اِس دُرِّ یتیم کو وہ سب کچھ پیار و محبت دیا جو حقیقی ماں باپ دیا کرتے ہیں۔ ایسے طور پر کہ آپ کو بے سرپرستی کا احساس تک نہیں ہونے دیا۔

الغرض جب ولادت باسعادت ہوئی تو اس سے قبل ہی آپ کو یتیمی کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ چنانچہ قرآن حکیم نے آپؐ کی یتیمی اور دنیاوی وسائل سے دُوری کے باوجود آغوشِ رحمت کا تذکرہ نہایت معجزانہ انداز میں بیان کیا ہے :۔

اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی۔

اے پیغمبر کیا آپ کو اللہ نے یتیم نہیں پایا پھر اپنی آغوشِ رحمت میں جگہ دی۔

اس طرح اللہ تعالےٰ نے اس ذات اقدس کو ہر قسم کے مادی اسباب و وسائل سے بے نیاز رکھ کر اپنی آغوش رحمت میں لے لیا اور آپؐ کے نشو و ارتقاء کو خالص اپنی تربیت میں کامل و مکمل کیا۔ عہد طفولیت سے ازدواجی زندگی کے ابتدائی مراحل تک کے حالات و واقعات تفصیل کے ساتھ کتب سیرت و حدیث میں موجود ہیں۔ انبیاء و رسل کی قدیم سنت کے مطابق آپؐ نے اپنی روزی کا بار کسی پر نہیں ڈالا۔ دنیاوی مشاغل میں آپ نے بکریاں بھی چرائیں اور تجارت بھی کی۔ ملک شام کے تجارتی شہر بُصریٰ میں بھی اسی غرض سے تشریف لے گئے اور پچیس۲۵ سال کی عمر میں یہی سفر حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے عقد نکاح کا باعث ہوا۔ آپ حضرت خدیجہ کا مالِ تجارت بصریٰ کی منڈی میں لے گئے۔ حضرت خدیجہ کا غلام میسرہ بھی رفیقِ سفر تھا اِس نے دورانِ سفر آپکی صداقت و امانت، ایک یہودی راہب کی بشارات اور چند در چند منافع تجارت کا جو تجربہ اور مشاہدہ کیا وہ سب حضرت خدیجہ سے کہہ سنایا۔ چنانچہ یہی تأثر ازدواجی زندگی کا باعث بنا۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے ازدواجی رشتہ کے بعد آپکی زندگی میں ایک اور انقلاب آیا آپ کو خلوت گزینی کی رغبت ہوئی خانہ کعبہ سے کچھ فاصلہ پر غارِ حرا میں شب و روز کے اکثر اوقات یادِ الٰہی میں بسر ہونے لگے۔ بت پرستی جو قوم کا مذہب اور مزاج تھا۔ آپ کو شروع ہی سے نفرت اور دوری رہی ہے۔ اس لئے کبھی بھی کسی صنم کے آگے سر نہیں جھکایا اور نہ کسی ایسی مجلس میں شرکت کی جو صنم پرستی کے میلے کہلاتے تھے۔ غارِ حرا کے اِس خلوت کدہ میں آپ کی فطرتِ سلیمہ جس طرح رہنمائی کرتی۔ اللہ واحد کی عبادت اور اُسکی یاد میں رہا کرتے۔ مگر قلب میں ایک خلش ایسی تھی جو اس حالت میں بھی بے چین کیے رہتی تھی۔ اکثر یہ سوچ سوچ کر بیقرار ہو جاتے کہ میری قوم خصوصاً اور دنیائے انسانی عموماً

کس طرح اللہ واحد کو چھوڑ کر صنم پرستی اور مظاہر پرستی میں مبتلاہے؟ آخر وہ کونسا نسخہ ہے جو اس حالت میں انقلاب پیدا کردے اور اللہ پرستی اور نیک عملی عام ہوجائے۔ یہی وہ جذبات تھے جو قلب مضطرب میں موجزن تھے اور خلوت کدہ حِرا میں انہی کیفیات کے ساتھ مشغول عبادت رہتے تھے اور جب کئی کئی دن اسطرح گزر جاتے تو کبھی حضرت خدیجۃ الکبریٰ حاضر ہو کر آپ کو گھر لے آتیں اور کبھی خود آپ بنفس نفیس گھر آکر سامانِ خورد نوش لے آتے اور پھر حرار میں مشغولِ عبادت ہوجاتے۔ مشہور محدث و مؤرخ حافظ ابن کثیرؒ نے اس حالت کو ان مختصر الفاظ میں حسن وخوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دورِ شباب میں خلوت پسند ہوگئے تھے اور قوم سے الگ تنہائی میں وقت صرف کرتے تھے۔ کیونکہ آپ قوم کی کھلی گمراہی کو دیکھ کر کہ وہ بُت پرستی میں مبتلا اور بتوں کے سامنے سجدہ گزار ہے کڑھتے اور بیقرار رہتے اور جوں جوں آپ پر وحی الٰہی کے نزول کا زمانہ قریب ہوتا جاتا تھا اسی قدر آپ کی خلوت پسندی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

صلوات اللہ وسلامہ علیہ۔

بہرحال یہی وہ خلوت کدہ عبادت تھا جہاں آپؐ پر سب سے پہلے وحی الٰہی کا نزول ہوا اور بالترتیب سورہ اقراء اور سورۂ مدثر کی چند آیات نے آپ کو بشیر و نذیر کے منصب پر فائز کیا۔

یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ آپ بچپن اور جوانی کی زندگی میں جبکہ ابھی منصب نبوت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے۔ مراسم شرک سے ہمیشہ دور رہے۔ ایک دفعہ قریش نے آپ کے سامنے کھانا لاکر رکھا۔ یہ کھانا بتوں کے چڑھاوے کا تھا آپ نے کھانے سے انکار کیا۔

نبوت سے پہلے جو لوگ آپ کے احباب خاص تھے وہ سب نہایت پاکیزہ اخلاق، بلند کردار لوگ تھے ان میں سرِ فہرست حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے جو ابتداء سے آخر وقت تک شریک صحبت رہے۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے چچیرے بھائی حکیم بن حزام قریش کے معزز رئیس تھے۔ ضماد بن ثعلبہ جو قبیلۂ ازد کے تھے زمانۂ جاہلیت میں طبابت و جراحی کا پیشہ کرتے تھے۔ نبوت کے زمانے میں یہ مکہ آئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں دیکھا کہ راستہ

میں جا رہے ہیں اور پیچھے لونڈوں کا غول آپؐ پر آوازیں کس رہا ہے اور لوگ آپ کو مجنون کہہ رہے ہیں۔ ضماد نے یہی قیاس کیا اور آپؐ سے کہا محمدؐ میں جنوں کا علاج کر سکتا ہوں اس پر آپؐ نے حمد و ثنا کے بعد چند آیات کی تلاوت کی۔ ضماد مسلمان ہو گئے۔

زمانہ جاہلیت میں قریش نے یہ دستور بنا لیا تھا کہ ایام حج میں انہیں عرفات جانا ضروری نہیں ہے اور یہ کہ جو لوگ باہر سے حج کرنے آئیں وہ قریش کا لباس اختیار کریں ورنہ اُنھیں برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرنا ہوگا۔ چنانچہ اسی بنا پر "طواف عریاں" کا عام رواج ہو گیا تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں میں کبھی بھی اپنے خاندان کا ساتھ نہ دیا۔

عرب میں افسانہ گوئی کا عام رواج تھا۔ رات کو تمام لوگ جمع ہوتے ایک شخص جس کو اس فن میں کمال ہوتا تھا داستان شروع کرتا لوگ رات رات بھر بڑے ذوق و شوق سے سنتے: بچپن میں ایک دفعہ کسی ایسے ہی جلسہ میں شریک ہونا چاہا تھا لیکن راہ میں کوئی شادی کا جلسہ تھا دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے وہیں نیند آگئی اُٹھے تو صبح ہو چکی تھی۔

یہ سب واقعات آپؐ کی فطرت سلیم اور نیک نہادی کا تقاضہ تھے۔

جامع ترمذی میں یہ حدیث موجود ہے کہ نبوت سے پہلے سفر شام میں (بمقام بُصریٰ) جس درخت کے نیچے آپؐ بیٹھے تھے اُسکی تمام شاخیں آپؐ پر جُھک آئی تھیں جس سے بُحیرا راہب نے آپؐ کے نبی ہونے کا یقین کر لیا تھا۔

صحیح مسلم میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اُس پتھر کو پہچانتا ہوں جو نبوّت سے پہلے مجھ کو سلام کرتا تھا۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ علٰے سیدنا و مولانا محمد و آلہٖ وصحبہٖ و بارِک وسلم۔

بعثت اور نبوّت

آپؐ کس طرح نبی بنائے گئے اور اُسکی کیا صورت پیش آئی؟ اور آپ کو اپنی نبوت کا کیونکر یقین ہوا؟ اسکی تفصیل محدثین کرام نے مستند طور پر بیان کی ہیں ان میں سب سے زیادہ تفصیل اور قابل اعتماد روایت وہ ہے جسکو امام زُہریؒ (جو محدثین اولین میں سرفہرست ہیں) حضرت عُروہ بن زبیرؒ سے اور وہ

اپنی خالہ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے نقل کرتے ہیں۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضؓ اگرچہ اُس وقت تک پیدا نہیں ہوئیں تھیں تاہم وہ کسی صحابی ہی سے نقل کرتی ہیں کیونکہ صحابی جب بھی کوئی بات نقل کرے گا وہ یقیناً نبی سے یا کسی صحابی ہی کے ذریعہ ہو گا اس لئے بعثت و نبوت کا واقعہ حدیثِ مرفوع ہی کی تعریف میں آتا ہے جو حدیث کی ایک قوی قسم ہے۔ الغرض سیدہ عائشہ صدیقہ رضؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتداء سچے خوابوں سے شروع ہوئی آپ بکثرت خواب دیکھتے اور دوسرے دن اُسی طرح پیش آتا جو آپؐ نے خواب میں دیکھا تھا۔ آپؐ کے خواب ایسے ہوتے گویا دن کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔ پھر آپؐ پر تنہائی اور تجرّد کی کیفیت غالب آگئی۔ اکثر اوقات آبادی سے دُور جنگل میں خاص طور پر غارِ حرا میں جو خانہ کعبہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھا اپنا وقت صرف فرماتے۔ وہاں یادِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ اس یادِ الٰہی کا کوئی خاص طریقہ نہ تھا آپکی فطرتِ سلیمہ جس طرح تقاضہ کرتی ویسے اللہ تعالیٰ کو یاد فرمایا کرتے تھے۔ کیونکہ ابھی تک عبادات کے طور وطریقے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو نہیں بتائے گئے تھے۔ آپؐ کھانے پینے کا سامان گھر سے لے جاتے اور غارِ حرا میں چند روز گزارتے پھر سیدہ خدیجۃ الکبریٰ کے پاس واپس تشریف لاتے وہ آپؐ کے لئے مزید خورد و نوش کا انتظام فرما دیتیں۔

اس طرح ایک طویل مدّت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایک روز جبکہ آپؐ غارِ حرا میں موجود تھے اچانک آپؐ کے پاس ایک فرشتہ انسانی شکل میں سامنے آیا اور کہنے لگا پڑھو! اس کے بعد سیدہ عائشہ صدیقہ رضؓ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کرتی ہیں میں نے کہا

> "میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔" اس پر فرشتے نے مجھکو اس زور سے بھینچا کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو! میں نے کہا میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اُس نے پھر دوبارہ مجھے بھینچا اور میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ اُس نے پھر چھوڑ دیا اور کہا پڑھو! میں نے پھر بھی یہی کہا میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اُس نے تیسری مرتبہ مجھے بھینچا یہاں تک کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا:-

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ (العلق آیت ۱ تا ۵)

پھر آپ پڑھنے لگے یہاں تک کہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ تک ختم فرمایا۔ اسکے بعد وہ فرشتہ روانہ ہوگیا اور آپؐ کانپتے لرزتے سیدہ خدیجۃ الکبریٰ کے پاس پہنچے اور فرمایا کہ مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ، چنانچہ آپؐ کو اُڑھادیا گیا۔ جب سکون ہوا تو آپؐ نے سارا واقعہ بیان فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے۔ اسپر سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ نے آپؐ کو ایسی تسلی دی کہ شاید کسی بیوی نے اس آسمان کے نیچے اپنے کسی شوہر کو دی ہو:۔

"ہرگز نہیں ہرگز نہیں آپ مطمئن رہیں اللہ کی قسم آپؐ کو اللہ کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپؐ رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، امانتیں ادا کرتے ہیں، بے سہارا لوگوں کا بوجھ اُٹھاتے ہیں، ناداروں کی مدد کرتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں۔"

جب آپ کو اس سے تسلی ہوئی تو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ یہ صاحب زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہوگئے تھے۔ عربی و عبرانی زبان میں انجیل لکھا کرتے تھے۔ بہت بوڑھے تھے۔ سیدہ خدیجۃ الکبریٰ نے اُن سے کہا بھائی صاحب ذرا اپنے بھتیجے کا قصہ سنیئے۔ ورقہ نے آپؐ سے دریافت کیا آپؐ نے سارا واقعہ بیان کیا، اسپر ورقہ نے نہایت یقین کے ساتھ کہا بھتیجے مبارک ہو یہ وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوتا تھا۔ اے کاش میں اُس وقت توی اور زندہ رہتا جبکہ آپ کی قوم آپؐ کو شہر چھوڑنے پر مجبور کر دے گی اسپر آپؐ نے تعجب سے پوچھا کیا میری قوم مجھکو باہر کر دے گی؟

اسپر ورقہ نے کہا کہاں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا جو آپؐ لائے ہیں اور اُس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے وہ زمانہ پایا تو آپ کی پُرزور مدد کرونگا۔

مگر اس کے بعد کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ورقہ کا انتقال ہوگیا۔

اللّٰہم اجزل ثوابہ۔

ترمذی میں سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ سیدہ خدیجۃ الکبریٰ نے آپؐ سے ایک بار عرض کیا کہ ورقہ نے آپ کی نبوت اور رسالت کی تصدیق کی لیکن اعلانِ دعوت سے پہلے وفات پاگئے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا اے خدیجہؓ میں نے ورقہ کو خواب میں دیکھا کہ سفید لباس میں ہیں اگر وہ اہل نار میں سے ہوتے تو یہ لباس نہ ہوتا۔

سورۂ اقرأ کا دوسرا بقیہ حصہ (یعنی آیت ۶ تا ۱۹) اُس وقت نازل ہوا جبکہ آپؐ نے حرم شریف میں باقاعدہ نماز پڑھنی شروع کر دی تھی مشرکینِ مکّہ خاص کر ابوجہل نے آپؐ کو اس حالت میں دیکھ کر ڈرانا و دھمکانا شروع کیا کہ اس طریقے پر حرم کعبہ میں عبادت نہ کی جائے۔

ایک دفعہ آپؐ کو اسی نماز کی حالت میں ابوجہل نے دیکھا تو اپنے معبود لات اور عُزّٰی کی قسم کھا کر کہا کہ اگر دوبارہ ایسا دیکھوں گا تو محمدؐ کی گردن پر اپنا پاؤں رکھ دوں گا۔ پھر ایسا ہوا کہ آپؐ کو نماز پڑھتے دیکھ کر آگے بڑھا تاکہ آپؐ کی گردن پر پاؤں رکھ دے مگر لوگوں نے دیکھا کہ وہ یکایک پیچھے ہٹ رہا ہے اور اپنا منہ کسی چیز سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اُس سے پوچھا گیا کہ یہ تجھے کیا ہوا؟ اُس نے جواب دیا کہ میرے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان آگ کی ایک خوفناک خندق اور ایک ہولناک چیز تھی اور کچھ پَر تھے۔

اس واقعہ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اُسکے چیتھڑے اڑا دیتے۔ (احمد، مسلم، نسائی)

ابن عباسؓ کی ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مقام ابراہیم پر نماز ادا کر رہے تھے ابوجہل کا اُدھر گزر ہوا اُس نے آپؐ سے کہا اے محمدؐ میں نے تم کو اس سے منع نہیں کیا تھا؟ پھر دھمکیاں دینی شروع کی۔ آپؐ نے اسکی پرواہ نہیں کی اِس پر اُس نے کہا اے محمدؐ تم مجھے کس طاقت پر ڈراتے ہو؟ لات و عزّٰی کی قسم اس وادی میں میرے حمایتی سب سے زیادہ ہیں۔

سورۂ اقرار میں انہی واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔

قرآنی مضمون

۱ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ الخ (آیات ۱ تا ۱۹)

پڑھو اے نبیؐ اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے (کائنات) کو پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔

پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، انسان کو اُن چیزوں کی تعلیم دی جنکو وہ نہ جانتا۔ ہرگز نہیں بیشک آدمی حد سے نکل جاتا ہے اس وجہ سے کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے (حالانکہ) پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے۔ بھلا تم نے دیکھا اُس شخص کو جو ایک بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو منع کرتا ہے جبکہ وہ نماز پڑھتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ اگر یہ منع کرنے والا شخص حق کو جھٹلاتا اور منہ موڑتا ہو؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔

ہرگز نہیں، اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اُسکی پیشانی کے بال پکڑ کر اُسے کھینچیں گے۔ اُس پیشانی کو جو جھوٹی اور سخت خطا کار ہے۔ وہ بلالے اپنے حامیوں کی ٹولی کو، ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بلا لیں گے۔ ہرگز نہیں اُسکی بات نہ مانو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کا قرب حاصل کرو۔

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ الآية (جمعہ آیت ۲)

اللہ وہ ذات ہے جس نے اُمیین میں سے ہی ایک رسول بھیجدیا جو اُن پر اُسکی آیات پڑھتا ہے اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو الکتب (قرآن) اور حکمت سکھاتا ہے حالانکہ وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ الآية

(توبہ آیت ۱۲۸، ۱۲۹)

بلاشبہ تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آیا جو تمہاری جنس بشر سے ہے جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے (چاہتے ہیں کہ تم کو کوئی ضرر نہ پہونچے) جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں۔ بالخصوص ایمان والوں کے ساتھ تو بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔ پھر اگر (اس پر بھی آپؐ کو رسول ماننے سے اور آپ کی اتباع کرنے سے یہ لوگ) روگردانی کریں تو آپ کہہ دیجئے (میرا کیا نقصان ہے) میرے لئے تو اللہ کافی ہے اُس کے سوا کوئی معبود نہیں میں نے اُسی پر بھروسہ

کرلیا اور وہ بڑے بھاری عرش کا مالک ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْہِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِہِمْ (آل عمران آیت ۱۶۴)

درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ اُن کے درمیان خود اُنہی میں سے ایک ایسا پیغمبر مبعوث کیا جو اُس کی آیات اُنہیں پڑھ کر سناتا ہے اور اُن کو بُرے اخلاق سے پاک کرتا ہے اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَہَا الآیۃ (شوریٰ آیت ۷)

اور اسی طرح اے نبی یہ قرآن عربی ہم نے آپ کی جانب وحی کی ہے تاکہ تم بستیوں کے مرکز (شہر مکہ) اور اس کے گرد وپیش رہنے والوں کو خبردار کردو اور تاکہ سب کے جمع واکٹھا ہونے کے دن (قیامت) سے ڈراؤ جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ ایک گروہ کو جنت میں جانا ہے اور دوسرے گروہ کو دوزخ میں۔

وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ الآیۃ (شوریٰ آیت ۵۲)

اور اسی طرح اے نبی ہم نے اپنے حکم سے ایک روح آپ کی طرف وحی کی ہے۔ آپ کو کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔ مگر اُس روح کو ہم نے ایک نور بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں اور آپ یقیناً صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کررہے ہو۔

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْ بَلَغَ الآیۃ

(انعام آیت ۱۹)

اور میری جانب وحی کی گئی اِس قرآن کی تاکہ میں اسکے ذریعہ

تمہیں اور اُن لوگوں کو جن تک اسکی تعلیم پہنچ جائے انکار اور بدعملی کے نتیجہ سے ڈراؤں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا۔ الآیۃ (نساء آیت ۱۷۴)

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے برہان (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آچکے ہیں اور ہم تمہارے اوپر ایک کھلا ہوا نور اُتار چکے ہیں۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ قَدْ جَاءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيْنٌ۔ الخ (المائدہ آیات ۱۵، ۱۶)

اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارے یہ جو رسول آئے ہیں، یہ تمہارے سامنے کتاب الٰہی کے وہ مضامین کثرت سے کھول دیتے ہیں جنھیں تم چھپاتے رہے ہو۔ اور وہ بہت سے امور کو نظر انداز بھی کر جاتے ہیں (یعنی یہ حلم وعفو بجائے خود ایک شہادت ہے اِن کے پیغمبرانہ اخلاق وعادات کی) بیشک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور واضح کتاب آچکی ہے۔ اسکے ذریعہ اللہ انھیں سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے جو اسکی رضا وخوشنودی کی پیروی کرتے رہتے ہیں۔ اور انھیں اپنی توفیق سے نور کی طرف تاریکیوں سے نکال کر لاتا ہے اور انھیں سیدھی راہ دکھاتے رہتا ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ الخ (مائدہ آیت ۱۹)

اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارے یہ رسول جو تمہیں صاف صاف بتاتے ہیں آپہنچے ایسے وقت میں کہ رسولوں کا آنا بند تھا کہ کہیں تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہمارے پاس کوئی بھی نہ بشارت دینے والا آیا نہ تنبیہ کرنیوالا، اب تو آگیا تمہارے پاس بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا، اور

اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔

نبوّت اور دلیلِ وجدانی

نبوت کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے جہاں سینکڑوں دلائل اور براہین موجود ہیں اِن میں "وجدان" کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ "وجدان" ایک ایسی جستجو اور طلب کا نام ہے جسکو خالق نے فطرتِ انسانی میں امانت رکھدی ہے۔ طلب صادق اور اخلاصِ خالص کے ذریعہ اس کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنھوں نے حق کی تلاش میں اِن ۲ دو راہ نماؤں (طلب صادق اور اخلاص کامل) کو اپنا رہبر بنایا اُنھیں بہت جلد حق نظر آیا اور وہ راہ یاب ہو گئے۔ قرآن حکیم نے بھی معرفتِ الٰہی اور عالم غیب (آخرت) کیلئے دلیل وجدان ہی کو جا بجا معیار اور کسوٹی قرار دیا ہے۔ قرآن حکیم کا فکر اور تدبّر کو مخاطب بنانا "وجدانی دلیل" کا بیّن ثبوت ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ، اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ، اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ، اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ وغیرہ الفاظ وجدانِ قلبی سے تعلق رکھتے ہیں۔

مولانا ابو الکلام آزادؒ نے صداقتِ نبوّت کے سلسلے میں سورۂ یونس کی آیت ۱۶ کی تفسیر اس طرح بیان کی ہے:۔

> سار ی باتیں چھوڑ دو، صرف اس بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں ہوں جسکے خصائل وحالات کی تمہیں خبر نہ ہو۔ تم ہی میں سے ہوں اور اعلانِ وحی سے پہلے ایک عمر تم میں بسر کر چکا ہوں۔ یعنی چالیس برس تک کی عمر جو انسانی عمر کی پختگی کی کامل مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی۔ بتلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی ایک بات بھی تم نے سچائی اور امانت کے خلاف مجھ میں دیکھی ہے؟
>
> پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملے میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب اللہ پر بہتان باندھنے کے لئے تیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں کہ مجھ پر اُسکا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم نہیں پاسکتے؟

تمام علماءِ اخلاق ونفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس سال کا زمانہ اسکے اخلاق وخصائل کے اُبھرنے اور بننے کا اصل زمانہ ہوتا ہے۔ جو سانچہ اس عرصہ میں بن گیا پھر بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا۔ پس اگر ایک شخص چالیس برس کی عمر تک "صادق" اور "امین" رہا ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذّاب ومفتری بن جائے کہ انسانوں پر ہی نہیں بلکہ آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے اللہ پر افتراء کرنے لگے ؟

چنانچہ اسکے بعد فرمایا وہ باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے جو شخص اللہ پر افترار کرے اس سے بڑھکر کوئی شریر نہیں اور جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر انسان ہے اور شریر ومفتری انسان کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اب صورتِ حال نے یہاں دونوں فریق پیدا کر دیئے۔ اگر میں مفتری علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام ونامراد ہونا پڑیگا، اگر تم سچائی کے مکذّب ہو تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہے۔ فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا یہ فیصلہ صادر ہوگیا جو مکذّب تھے ان کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہا۔ جو صادق تھا اُس کا کلمۂ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہے گا۔ فصلواتُ اللہ وسلامہ علیہ۔"

بہرحال صاحب وحی کے دعوے صداقت کی یہ وجدانی دلیل یقین اور اعتماد پیدا کرنے کیلئے کافی ہے۔ اور یہ ایک ایسی کسوٹی اور دلیل ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶ھ میں بادشاہانِ عالم کے نام اسلام کی دعوت وپیغام کے سلسلہ میں والا نامے بھیجے تو وقت کی سب سے بڑی طاقت (رومن امپائر) کے بادشاہ ہرقل کے پاس حضرت دِحیَہ کلبیؓ نامہ والا لے کر پہنچے تب اُس نے بھی جب آپ کی صداقت کو پرکھنا چاہا تو سب سے پہلے اسی وجدانی دلیل کو معیار صداقت ٹھیرایا اور صورتِ حال یہ پیش آئی۔

اپنے دربار کے مصاحبوں سے پوچھا کیا یہاں کوئی حجازی قافلہ موجود ہے جس کے ذریعہ اُس نبی مبعوث کے حالات معلوم ہوسکیں ؟

اہل دربار نے یہ اطلاع پہنچائی کہ ابھی ابھی یہاں ایک حجازی قافلہ فروکش ہوا ہے ان کے ذریعہ تفصیلی حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ اس قافلہ میں قریشی سردار ابوسفیان (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) موجود تھے۔ بادشاہ کے حکم پر اِن کو شاہی دربار میں طلب کیا گیا۔ ہرقل نے نبی مبعوث صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق چند سوالات کئے۔ اِن میں ایک اہم سوال یہ بھی تھا:۔

وہ تم میں اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ بسر کیا ہے۔ کیا اس طویل دور میں اُس نے کبھی جھوٹ بھی کہا ہے؟

ابوسفیان نے جواب دیا کبھی نہیں۔ بلکہ وہ اپنی قوم میں "الصادق الامین" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ سن کر ہرقل نے جو فاضلانہ تبصرہ کیا تاریخ کے اوراق اُسے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

"میں نے تم سے یہ دریافت کیا کیا کبھی اُسکے اِس دعویٰ نبوت سے قبل تم نے اسکو جھوٹا پایا ہے؟

اسپر تم نے کہا "کبھی نہیں" تب میں نے یقین کر لیا کہ جو آدمی انسانوں پر جھوٹ کہنے کو آمادہ نہ ہو وہ کبھی اللہ پر جھوٹ نہیں بول سکتا"۔

ہرقل کا یہ تبصرہ دلیلِ وجدان ہی کا ترجمان ہے۔ یہاں عقلی ونقلی دلائل سے ہٹکر وجدان کے تقاضے سے پہلی دلیل جو پیش کی وہ وہی تھی جسکو وجدان کے خالق (اللہ برتر) نے اپنے پیغمبر سے صداقتِ دعویٰ کے لئے پیش کرائی ہے۔ قرآن حکیم اس دلیل وجدان کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

قرآنی مضمون

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔ الخ

(یونس آیت ۱۶، ۱۷)

آپ فرما دیجئے کہ اللہ اگر چاہتا تو میں قرآن تمہیں سُناتا ہی نہیں اور تمہیں اس سے خبردار ہی نہ کرتا (مگر اس کا چاہنا یہی ہوا کہ تم میں اسکا کلام نازل ہو اور تمہیں اقوام عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنائے) پھر دیکھو یہ

واقعہ ہے کہ میں اس معاملہ سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر
کر چکا ہوں کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟
پھر اُس سے بڑھکر ظالم اور کون ہوگا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر
اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی آیات کو جھُوٹا قرار دے۔ یقیناً مجرم
کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔"

قرآن حکیم نے یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کے ثبوت میں پیش کی ہے مکّہ کے لوگ خوب جانتے تھے کہ غارِ حراء سے جس روز آپ نبوت کا پیغام لے کر آئے اُس سے ایک دن پہلے تک آپکی زندگی کیا تھی؟ آپؐ کے لیل و نہار کس طرح گزرتے تھے؟ آپؐ کے عادات و اطوار کیا تھے؟ آپؐ کی گفتار و کردار کیا معیار رکھتی تھی؟ یہ پوری کی پوری زندگی صداقت، دیانت، امانت، شرافت، پاکبازی، صدق گفتاری، بلند کرداری سے لبریز تھی۔ آپؐ کی امن پسندی، پاس عہد، ادائے حقوق اور خدمتِ خلق کے نمایاں اوصاف بھی کسی پر مخفی نہ تھے۔ آپ کو کسی نے بھی کسی وقت جھوٹ کہتے نہ سنا نہ دیکھا، نہ کسی نے آپؐ کی پوری زندگی میں کسی کو یہ الزام دیتے سنا۔ پھر ایسے شخص کا اچانک ایک عظیم انقلابی پیغام دینا اور ایک مستقل نظامِ حیات پیش کرنا کیا کسی بناوٹ اور ذاتی کوشش کا نتیجہ ہوسکتا ہے؟ علاوہ ازیں ایسی ہر کوشش اور تیاری بہر حال تدریجی ارتقاء کے مراحل سے گزرتی ہے اور یہ مراحل اُن لوگوں سے کبھی پوشیدہ نہیں رہ سکتے جن کے درمیان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم شب و روز زندگی گزار رہے ہوں۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ایسا واضح ثبوت ہے کہ ایک حقیقت پسند انسان مشکل ہی سے اِس کا انکار کرسکتا ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔

دعوت و تبلیغ کی پہلی منزل

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات نازل ہوئیں، پھر نزولِ وحی کا سلسلہ ایک مختصر مدّت تک بند رہا۔ اِس کے بعد سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ اس درمیانی مدت (انقطاعِ وحی) کو "فترۃ" کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ یہ زمانہ کس قدر رہا ہے؟ اسمیں چھ ماہ سے ڈھائی سال تک کے متعلق روایات ملتی ہیں۔ محدثین کا رجحان چھ ماہ کی جانب

ہے۔ واللہ اعلم۔

ابھی تک آپ کو "اعلانِ عام" کا حکم نہ تھا بلکہ آپؐ کو علم ویقین، صبر واستقامت، طہارت نفس وبدن، شرک وبت پرستی سے دوری بیزارگی کی تلقین تھی۔ پھر آپ پر سورۂ شعرا کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں سب سے پہلے اپنے قرابت دار اور رشتہ داروں کو دعوت حق دینے کا حکم دیا گیا (آیت ۲۱۴) گویا یہ دعوتِ اسلام کی پہلی ندا تھی جو آپکے اپنے گھر سے شروع کی گئی۔ چنانچہ آپؐ نے صفا کی چوٹی پر کھڑے ہوکر اُس زمانے کے طریق اعلان کے مطابق "یَاصَبَاحَا" "یَاصَبَاحَا" کہہ کر خاندانِ قریش کو پکارا جب سب جمع ہو گئے تو آپؐ نے ایک مثال دے کر لوگوں کو خطاب فرمایا:۔

لوگو! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک لشکر جرار جمع ہے جو تم پر حملہ کرنے کے لئے تیار کھڑا ہے کیا تم مجھکو اس اطلاع پر سچا سمجھوگے؟

لوگوں نے جواب دیا بیشک ہم نے تجھ کو "الصادق الامین" پایا ہے تو جو کچھ بھی کہے گا وہ حق وصداقت پر مبنی ہوگا۔

تب آپؐ نے فرمایا، تو سنو! میں تم کو اللہ واحد کی جانب بلاتا ہوں اور بُت پرستی کی نجاست سے بچانا چاہتا ہوں، تم کو اُس دن سے ڈراتا ہوں جسمیں اللہ کے حضور حاضر ہوکر تم سب کو اپنے اعمال وکردار کا جواب دینا ہوگا۔

یہ صدائے حق جب قریش کے کانوں میں پہنچی تو وہ سب حیران رہ گئے اور اپنے آباء واجداد کے دین ومذہب کے خلاف آواز سنکر برافروختہ ہونے لگے۔ اور سب سے زیادہ آپؐ کے حقیقی چچا ابولہب کو طیش آیا، غضبناک ہوکر کہنے لگا:۔

تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ أَمَا دَعَوْتَنَا إِلَّا لِهٰذَا۔

تو ہمیشہ ہلاکت ورسوائی کا منھ دیکھے، کیا تو نے اس غرض سے ہم کو بلایا تھا؟ (نعوذ باللہ)

پھر افراتفری میں یہ لوگ منتشر ہو گئے اور آپؐ اپنے گھر تشریف لے آئے۔ یہ عجیب منظر تھا کہ اب سے چند گھڑیاں پہلے جس محمدؐ بن عبد اللہ کی صداقت، امانت اور اخلاق وکردار سے

ساری قوم متاثر تھی اور آپ کو صادق و امین تسلیم کرتی تھی۔ لیکن اس اعلان مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پر یکلخت بیگانہ اور اجنبی بن گئی۔ آپؐ نے اپنا کام جاری رکھا۔ خاندان کے چند ایک کے سوا سب نے عداوت و بغض کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ تب آپکی دعوت میں مزید وسعت کردی گئی۔ دعوت و ارشاد کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا اور آپؐ کو حکم ہوا کہ اپنے خاندان کے دائرے سے آگے بڑھ کر مکّہ اور اطرافِ مکّہ کے قبائل اور اقوام کو بھی یہ پیغامِ حق سنایا جائے۔

دعوت و تبلیغ کی دوسری منزل

چنانچہ آپؐ نے تبلیغ حق کو اطرافِ مکہ کیلئے عام کردیا اور طائف، حنین اور مدینہ طیبہ تک اپنی صدائے حق کو پہنچایا بلکہ مہاجرین اولین کی ایک مختصر جماعت کے ذریعہ حبشہ (افریقیا) کے عیسائی بادشاہ اصحمہ کو اپنی دعوت کا پیغام پہنچایا۔

جیساکہ اوپر بیان کیاگیا مشرکین مکّہ روزِ اوّل ہی سے آپکی مخالفت پر کمربستہ ہوگئے تھے۔ اُن چند مسلمانوں کو جو آپ پر ایمان لاچکے تھے۔ ایذا رسانی اور ظلم و ستم کا نشانہ بنارہے تھے۔ آپؐ نے انھیں حبشہ کی جانب ہجرت کرجانے کا حکم دیا جہاں کا بادشاہ عیسائی مذہب تھا لیکن مشرکین مکہ اسکو بھی برداشت نہ کرسکے اور اُنھوں نے اصحمہ کے دربار میں ایک وفد بھیج کر یہ مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کی اس جماعت کو ان کے حوالہ کردے جو اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ کر قوم میں تفرقہ پیدا کرنے کا باعث بنے ہیں۔ اور نیز خود ملک حبشہ کے لئے بھی خطرہ ہیں۔

اصحمہ نے وفد کا مطالبہ سنکر مسلمانوں کو جواب دہی کے لئے دربار میں طلب کیا اور اسلام کے بارے میں دریافت کیا۔ مسلمانوں کی اس مقدّس جماعت میں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے بادشاہ اور اہل دربار کو اس طرح مخاطب کیا:۔

> بادشاہ! ہم پر ایک طویل و تاریک زمانہ گزرا ہے۔ اس وقت ہماری جہالت کا یہ عالم تھا کہ اللہ واحد کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے تھے اور خود ساختہ پتھروں کو اپنا معبود بنائے ہوئے تھے۔ مردار خوری، زناکاری، لوٹ مار، قطع رحمی صبح و شام کا ہمارا مشغلہ تھا۔ ہمسایہ کے حقوق سے بیگانہ، رحم و انصاف سے ناآشنا، حق و باطل کے امتیاز سے ناواقف۔

غرض ہماری زندگی سرتاپا درندوں کی طرح تھی۔ ہم میں کا قوی، ضعیف کو کچلنے اور امیر غریب کو دبانے کا حق سمجھتا تھا۔ فخر وغرور ہمارا شعار تھا۔

ایسے گھناؤنے ماحول میں اللہ تعالےٰ نے ہم میں ایک بزرگ پیغمبر مبعوث کیا جس کے نسب سے ہم واقف، جسکی صداقت، امانت، دیانت وشرافت پہ دوست دشمن دونوں گواہ ہیں۔ خود ہماری قوم نے اسکو "محمد الامین" کا لقب دیا ہے۔ اُس نے ہم کو اللہ کی توحید کا سبق دیا، اُس نے بتایا کہ اللہ کا کوئی شریک اور سہیم نہیں، وہ ہر قسم کی شرکت سے پاک ہے۔ بت پرستی جہالت کا شیوہ ہے اس لئے وہ قابل ترک چیز ہے اور صرف خدائے واحد ہی عبادت کے لائق ہے۔ اُس نے ہم کو حق گوئی اور صداقت شعاری کی تلقین کی ہے، صلہ رحمی کا حکم دیا ہے، ہمسایوں اور کمزوروں کے ساتھ حُسنِ سلوک کی تعلیم دی ہے، قتل وغارت گری کی رسم کو مٹایا ہے، زناکاری کو حرام اور فحش کہہ کر ہم کو اُس سے نجات دلائی ہے، نکاح میں محرم اور غیر محرم کا فرق بتایا ہے۔ جھوٹ بولنے، ناحق مالِ یتیم کھانے کو حرام کہا ہے، نماز اور خیرات وصدقات کی تعلیم دی ہے اور ہر حیثیت سے ہم کو حیوانیت سے نکال کر انسانیت کے مرتبہ تک پہنچایا ہے۔

اے بادشاہ! ہم نے اس کی مقدس تعلیم کو قبول کیا ہے اور اس پر صدق دل سے ایمان لائے ہیں۔ یہ ہے وہ ہمارا قصور جسکی بدولت یہ مشرکین کا وفد آپ سے مطالبہ کرنے آیا ہے کہ آپ ہم کو ان کے حوالہ کر دیں!

حضرت جعفر طیار رضؓ کی اس سادہ مگر مؤثر تقریر نے بادشاہ اور اہل دربار کو بیحد متاثر کیا۔ بادشاہ نے خواہش ظاہر کی کہ اُس نبی پر جو کلام نازل ہوا ہے کچھ پڑھکر سنایا جائے حضرت جعفر طیار رضؓ نے سورۂ مریم کی چند آیات تلاوت فرمائیں۔ نجاشی کے آنکھ سے آنسو جاری ہوگئے۔ کہنے لگا بیشک یہ وہی کلام ہے جو مقدس عیسیٰ پر نازل ہوا تھا۔ پھر اُس نے اپنے اسلام کا اعلان کیا اور مشرکینِ مکہ کو بے نیل ومرام واپس کر دیا۔

دعوت وارشاد کی یہ دوسری منزل تھی جو مکہ کی زمین سے نکل کر اطراف

واکناف اور معمورۂ انسانی تک پھیل گئی۔ پھر کچھ ہی عرصہ بعد "شاہانِ عالم" کے ایوانوں میں گونج اُٹھی۔

قرآن حکیم نے آپکی اس دعوت و تبلیغ کا تذکرہ آیاتِ ذیل میں اس طرح کیا ہے۔

قرآنی مضمون

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ. قُمْ فَأَنذِرْ. وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ. الخ

(المدثر آیات ۱ تا ۷)

اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے اُٹھو اور (قوم کو) خبردار کرو، اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو۔ اور اپنے کپڑے پاک صاف رکھو، اور گندگی سے دُور رہو جاؤ، اور ایسا نہ کرو کہ احسان کرے اور بدلہ بہت چاہے، اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو۔

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ. وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ. الخ (شعراء آیات ۲۱۴، ۲۱۵)

اور اے نبی اپنے قریبی رشتہ داروں کو گمراہی سے ڈرائیے اور جو مسلمان آپؐ کے پیرو ہیں اُن کے لئے اپنے بازوؤں کو پست رکھیئے۔ (یعنی نرمی اور تواضع سے پیش آئیے) اگر وہ نافرمانی کریں تب تو اُن سے کہہ دیجئے کہ میں تمہارے اِن اعمال بد سے بری ہوں، اور غالب رحم کرنے والی ذات پر بھروسہ کرو جو تم کو اُس وقت بھی دیکھتی ہے جب تم اسکی بارگاہ میں کھڑے ہوتے ہو اور اس وقت بھی جبکہ تم سجدہ کرنے والوں میں ملکر اُسکے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہو۔ بلاشبہ وہ سننے، جاننے والا ہے۔

وَهَٰذَا كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا. الآية

(انعام آیت ۹۲)

اور یہ دیکھو یہ کتاب قرآن ہے جسے ہم نے (توراۃ کی طرح) نازل کیاہے۔ برکت والی ہے اور جو کتاب اس سے پہلے نازل ہو چکی ہے

اُسکی تصدیق کرنے والی، اور یہ اس لئے نازل کی تاکہ تم اُمّ القریٰ (یعنی شہر مکہ) کے باشندوں کو اور اُن کو جو اس کے چاروں طرف ہیں (گمراہیوں کے نتائج سے) ڈرائیے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا. (شوریٰ آیت ۷)

اور اسی طرح ہم نے آپؐ پر اے نبیؐ قرآن نازل کیا زبان عربی میں تاکہ گمراہیوں کے نتائج سے ڈرا شہرِ مکہ کے باشندوں کو اور اُن تمام کو جو اُس کے اطراف واکناف ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (سبا آیت ۲۸)

اور ہم نے آپؐ کو اے نبی کائناتِ انسانی کے لئے پیغام دیکر بھیجا ہے۔ اعمال نیک پر خوشخبری سنانے اور اعمال بد پر لوگوں کو ڈرانے کے لئے اور اکثر جاہل لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا۔ (فرقان آیت ۱)

پاک و برتر ہے وہ ذات جس نے حق و باطل کے درمیان تمیز دینے والی کتاب نازل فرمائی اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر تاکہ وہ تمام جہان والوں کو (انجام بد) سے ڈرائے۔

اسرار (معراج)

اسرار کے معنی رات کو چلانے یا لیجانے کے ہیں۔ چونکہ یہ واقعہ رات کے وقت پیش آیا تھا اس لئے اسکو اسرار کہا گیا اور قرآن حکیم نے اسی لفظ سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

معراج عروج سے مشتق ہے جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں۔ چونکہ احادیث میں آپؐ نے (ثُمَّ عُرِجَ بِیْ پھر مجھے اوپر چڑھایا گیا) کے الفاظ سے اس واقعہ کو بیان فرمایا ہے۔ اس لئے اس واقعہ کا نام "معراج" مشہور ہو گیا۔

انبیاء اور سیر ملکوت

انبیاء و رسل کے حالات و واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُولو العزم نبیوں کو آغاز نبوت کے کسی خاص وقت میں عالم آخرت کی سیر کرائی جاتی ہے تاکہ جب اُن کی دعوت و تبلیغ کا آغاز ہوتا ہے تو وہ اس عالم غیب کی حقیقتوں کو انسانوں کے سامنے "آنکھوں دیکھا حال" کی طرح بیان کریں۔ اس وقت وہ تمام مادی پردے جو اس عالم اور اُس عالم کے درمیان حائل ہیں انکی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیئے جاتے ہیں۔ اسبابِ سماعت کے دنیاوی قوانین اُن کے لئے منسوخ کر دیئے جاتے ہیں۔ زمانی اور مکانی حدود و بُعدِ مسافت کی کڑیاں ان کے آگے فنا کر دی جاتی ہیں، آسمان و زمین کے مخفی مناظر بے حجابانہ اُن کے سامنے آجاتے ہیں، ملکوت کی سیر و سیاحت اُن کے لئے مہیا کی جاتی ہے، وہ نور کا لباس اختیار کر کے فرشتوں کے جلو بارگاہِ الٰہی میں حاضری دیتے ہیں اور اپنے اپنے مقام و رُتبہ کے مناسب فیضِ ربانی سے معمور کئے جاتے ہیں۔ پھر وہاں سے اپنے منصب خاص کا فرمان لیکر اسی کاشانۂ آب و خاک میں واپس آجاتے ہیں۔ لہذا ان کا مقام ایک فلسفی کے مقام سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ فلسفی جو کچھ کہتا ہے اپنے قیاس و گمان سے کہتا ہے لیکن انبیاء کرام جو کچھ کہتے ہیں وہ علم مشاہدہ کی بناء پر کہتے ہیں۔

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سید اولادِ آدم اور سردارِ انبیاء و رُسل تھے اسلئے اس ملاء اعلیٰ میں آپ کو وہاں تک رسائی ہوئی جہاں تک کسی نبی و مُرسل کا قدم اس سے پہلے نہیں پہنچا تھا اور جو کچھ مشاہدہ کیا وُہ دوسرے مقربانِ بارگاہ کی حد نظر سے باہر تھا۔ اسی کو معراجِ نبی کہا جاتا ہے۔

معراج نبی

معراج کب اور کس تاریخ کو واقع ہوئی؟ صحیح اور مستند روایات کے مطابق ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ جبکہ تاریخ اور سنہ کا رواج نہ تھا تاہم وقت کے متعلق اتنا تو یقینی معلوم ہے کہ رات کا وقت تھا خود قرآن حکیم میں ہے (اسریٰ بعبدہٖ لیلا) یعنی لے گیا اپنے بندے کو رات کے وقت۔ لیکن دن اور تاریخ کا قطعی طور پر متعین کرنا مشکل ہے کیونکہ کسی بھی روایت صحیحہ کی تصریح موجود نہیں ہے۔ البتہ اہل تاریخ کے پانچ اقوال ملتے ہیں:-

ربیع الاوّل[۱]، ربیع الثانی[۲]، رجب[۳]، رمضان[۴]، شوال[۵]۔

ابن قتیبہ دینوری (المتوفی ۲۶۷ھ) اور علامہ ابن عبدالبرؒ (المتوفی ۴۶۳ھ) اور متاخرین میں امام رافعیؒ اور امام نوویؒ اور محدث عبدالغنی مقدسیؒ نے رجب ہی کے مہینے کو ترجیح دی ہے بلکہ مؤخرالذکر نے ۲۷ رجب کی بھی تصریح کی ہے۔ علامہ زرقانی رح نے لکھا ہے کہ قدیم زمانے سے یہی بات چلی آرہی ہے۔

سنہ کے بارے میں بھی یہی اختلاف ہے۔ متعدد اقوال مذکور ہیں لیکن دو باتوں پر سب کا اتفاق نظر آتا ہے۔ ایک یہ کہ یہ واقعہ ہجرت سے قبل پیش آیا۔ دوسری بات یہ کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات کے بعد پیش آیا۔ اور روایت بخاری کے مطابق حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات ہجرت سے تین سال پہلے اور ایک دوسری روایت کے مطابق نماز پنجگانہ کی فرضیت سے قبل ہو چکی تھی تو اس لحاظ سے واقعہ معراج کو ہجرت سے قبل کے ان تین برسوں کے اندر ہی ہونا چاہیئے۔ نیز کتب تاریخ وسیرت دونوں شاہد ہیں کہ معراج اور ہجرت کے درمیان کوئی اہم واقعہ موجود نہیں ہے تو یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ معراج ہجرت سے بہت قریب زمانے میں پیش آیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ابن سعد نے طبقات میں اور امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح البخاری میں واقعہ معراج اور ہجرت کو یکے بعد دیگر بغیر کسی تیسرے واقعہ کی مداخلت کے آگے پیچھے بیان کیا ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ ہر دو واقعات کے درمیان زمانہ اور تعلق انتہائی قریب ہے۔ تو اب یہ کہنا آسان ہو جاتا ہے جو اہل تاریخ وسیرت فرماتے ہیں کہ معراج کا واقعہ ہجرت سے ایک یا ڈیڑھ سال پہلے پیش آیا۔ بہرحال ایک کثیر جماعت کا جن میں بعض معتبر و ثقہ راوی ہیں۔ راجح قول یہی معلوم ہوتا ہے کہ مہینہ رجب کا اور تاریخ ۲۷ تھی۔

محدث زرقانی رح کہتے ہیں کہ معراج کا واقعہ پینتالیس ۴۵ صحابہؓ سے منقول ہے اور انکے نام بھی شمار کرائے ہیں (زرقانی ج ۶ ص ۱۶)

امام ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں ایسی بیشتر روایات جمع کر دی ہیں جنمیں صحیح، مرفوع، قوی، ضعیف، موقوف، مُرسل، منکر ہر قسم کی روایتیں ہیں۔ احادیث صحیحہ کی چھ مشہور کتب (صحاح ستہ) میں معراج کا واقعہ مستقلاً صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مذکور ہے۔ ترمذی اور نسائی میں ضمناً اور مختصراً اس کے واقعات ملتے ہیں۔

امام بخاری رح اور امام مسلمؒ نے اس واقعہ کو حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت مالک

بن صعصعہ رضؓ، حضرت انس بن مالک رضؓ، حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ، حضرت ابوہریرہ، حضرت جابر بن عبداللہ رضؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ۔ ان ثقات اکابر صحابہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت مالک بن صعصعہ رضؓ اور حضرت ابوذر رضؓ نے یہ تصریح بھی کی ہے کہ اُنھوں نے معراج کے واقعہ کو لفظ بلفظ اور حرف بحرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں تھے کہ آپؐ کے گھر کی چھت کھلی اور حضرت جبرئیلؑ امین نازل ہوئے اُنھوں نے پہلے آپؐ کا سینہ مبارک چاک کیا پھر اُسکو زمزم سے دُھویا اسکے بعد سونے کا ایک طشت ایمان و حکمت سے بھرا لائے اور اُن کو سینہ مبارک میں ڈال کر بند کر دیا پھر آپؐ کا ہاتھ پکڑ کر آسمان پر لے گئے۔ جب آپ آسمان پر پہنچے تو جبرئیل علیہ السلام نے آسمان کے داروغہ سے کہا کھولو! اُس نے کہا کون؟ اُنھوں نے جواب دیا جبرئیل! اُس نے پوچھا کیا تمہارے ساتھ کوئی اور ہے؟ اُنھوں نے کہا ہاں میرے ساتھ محمدؐ ہیں۔ اُس نے پوچھا کیا وہ طلب کیے گئے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا ہاں! بہر حال جب آپؐ پہلے آسمان پر چڑھے تو آپؐ کو ایک شخص بیٹھا نظر آیا جس کے دائیں بائیں بہت سی پرچھائیاں تھیں۔ جب وہ دائیں جانب دیکھتا تھا تو ہنستا تھا اور جب بائیں جانب نگاہ جاتی تھی تو روتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر اُس نے کہا مرحبا اے نبی صالح اور فرزند صالح! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون ہیں؟ انھوں نے جواب دیا یہ حضرت آدم (علیہ السلام) ہیں اور اُن کے دائیں بائیں کی پرچھائیاں اُن کی اولاد کی روحیں ہیں۔ دائیں جانب والے جنتی اور بائیں جانب والے دوزخی ہیں۔ اس لئے وہ دائیں جانب دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور بائیں جانب نگاہ کرتے ہیں تو روتے ہیں۔ اسکے بعد آپ دوسرے آسمان پر پہنچے تو اُسی قسم کا سوال و جواب جو پہلے آسمان پر ہوا تھا اور ہر آسمان پر کسی نہ کسی پیغمبر سے ملاقات ہوئی۔

پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام اور چھٹے آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام (حضرت انس رضؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابوذر رضؓ نے مجھ سے نبیوں کے منازل کی تعیین بیان نہیں کی) بہر حال حضرت جبرئیل علیہ السلام آپؐ کو حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس سے لے کر گزرے انھوں نے آپ کو دیکھ کر کہا مرحبا اے نبی صالح اور برادر صالح! آنحضورؐ نے اُن کا

نام پوچھا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نام بتایا۔ پھر یہی واقعہ حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے نبی صالح اور برادر صالح کہہ کر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نبی صالح اور فرزند صالح کہہ کر آپؐ کا خیر مقدم کیا۔ اسکے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام آپؐ کو اوپر لے گئے اور آپؐ اس مقام پر پہنچے جہاں قلم کے چلنے (لکھنے) کی آواز آتی تھی۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی امت پر پچاس وقت کی نمازیں فرض کی، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس عطیہ ربانی کو لیکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے تو اُنھوں نے پوچھا کہ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کی امت پر کیا فرض کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا پچاس وقت کی نمازیں فرض کی ہیں؛ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا آپؐ اللہ کے حضور دوبارہ جائیے کہ آپؐ کی امت اسکی متحمل نہیں ہوسکتی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس گئے اور اللہ تعالےٰ نے اس کا ایک حصّہ کم کر دیا۔ آپ واپس آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوبارہ اللہ کے ہاں جانے کا مشورہ دیا کہ آپکی امت اسکی بھی طاقت نہیں رکھتی۔ آپؐ تشریف لے گئے تو اللہ تعالیٰ نے ایک حصّہ کی پھر تخفیف کر دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر کہا کہ آپؐ کی اُمت میں اسکی بھی قوت نہیں۔ آپ پھر گئے تو اللہ تعالےٰ نے اس تعداد کو گھٹا کر پانچ وقت کر دیا اور ارشاد فرمایا کہ

"گو نمازیں پانچ وقت کی ہوں گی لیکن ثواب اُن کو پچاس نمازوں کا ملے گا کیونکہ میرے حکم میں تغیر و تبدیل نہیں ہوتی۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مزید کمی کے لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر جناب باری میں جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن آپ نے فرمایا اب مجھے شرم آتی ہے۔

اسکے بعد آپؐ کو سدرۃ المنتہیٰ کی سیر کرائی گئی جو ایسے مختلف رنگوں سے ڈھکا ہوا تھا جنکو آپ جان نہ سکے۔ پھر آپؐ کو حضرت جبرئیل علیہ السلام جنت میں لے گئے وہاں آپؐ کو موتی کی عمارتیں نظر آئیں اور آپؐ نے دیکھا کہ اُس کی مٹی مُشک کی ہے۔

(بخاری ج اول باب کیف فرضیۃ الصلوٰۃ فی الاسراء)

کتب حدیث میں واقعۂ معراج کے متعلق یہ اصح الروایات ہے۔ اسکے بعد حضرت مالک بن صعصعہ رضؓ کی روایت کا درجہ ہے۔ اس روایت میں بہت سی باتیں پہلی روایت سے زائد ہیں جو اضافہ نہیں بلکہ اجمال و اختصار کی وضاحت اور تفصیل ہے۔

حضرت ابوذر رضؓ کی روایت مجمل ہے اور حضرت مالک بن صعصعہ رضؓ کی روایت میں واقعات کی کسی قدر تفصیل ہے۔

حضرت ابوذر رضؓ کی روایت میں اسکی وضاحت نہیں کہ آپ اُس وقت بیدار تھے یا خواب میں تھے لیکن اس میں یہ ہے کہ آپ خواب و بیداری کی درمیانی حالت میں تھے۔ پہلی روایت میں ہے کہ آپؐ نے دیکھا کہ آپؐ کے گھر کی چھت کھُلی اور حضرت جبرئیلؑ نازل ہوئے اور اس روایت میں ہے کہ آپؐ حطیم یا حجر میں لیٹے ہوئے تھے (یہ حطیم یا حجر ایک ہی مقام کے دو نام ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی جو عمارت بنوائی تھی وہ سیلاب سے کئی دفعہ گر چکی تھی اور پھر بنتی رہی۔ اسی طرح قریش نے اپنے زمانے میں جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ابھی رسول نہیں بنائے گئے تھے ایک سیلاب سے عمارت گر گئی تھی قریش نے اسکو دوبارہ تعمیر کرنا چاہا تو سرمایہ کی کمی کے باعث ایک طرف اندر کی تھوڑی سی زمین چھوڑ کر دیوار کے طول کو کم کر دیا، اس طرح کعبہ کی تھوڑی سی زمین چار دیواری سے باہر رہ گئی اور آج تک اسی طرح ہے۔ اس زمین کا نام حجر اور حطیم ہے۔ قریش کے نوجوان اور رؤسا اکثر یہاں رات کو سویا کرتے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبھی کبھی یہاں آرام فرمایا کرتے تھے۔ جس شب کو معراج ہوئی آپ اسی مقام پر استراحت فرما تھے)

بیداری اور خواب کی ایک درمیانی حالت تھی کہ آپؐ نے دیکھا کہ آپؐ کے گھر کی چھت کھُلی اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے اُن کے ساتھ چند اور فرشتے بھی تھے وہ آپؐ کو چاہ زمزم کے پاس لے گئے اور وہاں آپؐ کے سینے مبارک کو چاک کیا اور قلب اطہر کو آبِ زمزم سے دھویا اسکے بعد سونے کا ایک طشت ایمان وحکمت سے معمور لایا گیا۔ جبرئیلؑ امین نے ایمان وحکمت کے اس خزانے کو آپؐ کے سینے میں رکھ کر اسکو برابر کر دیا۔ اس کے بعد ایک متوسط قد کا جانور براق نامی لایا گیا جسکی تیز رفتاری کا یہ حال تھا کہ اُس کا ہر قدم

وہاں پڑتا تھا جہاں نگاہ کی آخری حد ہوتی تھی (مسند احمد میں بروایتِ انس رضؓ اور ترمذی اور ابن جریر طبری میں ہے کہ جب آپؐ نے اس پر سوار ہونے کا قصد کیا تو اُس جانور نے شوخی کی۔ جبرئیل امین نے کہا کیوں شوخی کرتا ہے۔ تیری پشت پر آج تک محمدؐ سے زیادہ اللہ کے نزدیک برگزیدہ کوئی دوسرا سوار نہیں ہوا۔ یہ سُنکر بُراق پسینہ پسینہ ہوگیا۔ ترمذی نے یہ روایت نقل کرکے لکھا "غریبٌ لا نعرفہ إلا من حدیثہ" یعنی اس روایت کے بعض الفاظ میں نکارت اور غرابت ہے)

الغرض آپؐ اس پر سوار ہوکر بیت المقدس آئے اور براق کو اُس قلابہ میں باندھ کر جس میں سابقہ انبیاء اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے۔ آپؐ نے مسجد اقصٰے کے اندر قدم رکھا اور وہاں دو رکعت نماز ادا کی۔ حضرت شداد بن اوس رضؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ راستہ میں ایسی زمین پر گزر ہوا جس میں کھجور کے درخت بکثرت تھے۔ جبرئیل امین نے کہا یہاں اُتر کر نفل نماز پڑھ لیجئے۔ میں نے براق سے اُتر کر نماز پڑھی۔ جبرئیل امین نے کہا آپؐ کو معلوم بھی ہے کہ آپؐ نے کس جگہ نماز پڑھی ؟ میں نے کہا مجھکو معلوم نہیں۔ جبرئیل امین نے کہا آپؐ نے یثرب (مدینہ طیبہ) میں نماز پڑھی جہاں آپ ہجرت کریں گے۔ بعد ازاں یہاں سے روانہ ہوئے اور ایک زمین پر پہنچے۔ جبرئیل امین نے کہا یہاں بھی اتر کر نماز پڑھیئے۔ میں نے اُتر کر نماز پڑھی جبرئیل امین نے کہا آپؐ نے وادی سینا میں شجرۂ موسیٰ کے قریب نماز پڑھی جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا تھا۔ پھر ایک اور زمین پر گزر ہوا جبرئیل امین نے کہا اُتر کر یہاں بھی نماز پڑھیئے۔ میں نے نماز پڑھی جبرئیل امین نے کہا آپؐ نے مَدین میں نماز پڑھی (جو حضرت شعیب علیہ السلام کا مسکن تھا) وہاں سے روانہ ہوئے اور ایک زمین پر پہنچے۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا اُتر کر نماز پڑھیئے۔ میں نے اُتر کر نماز ادا کی جبرئیل امین نے کہا یہ بیت اللحم ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی

ولادت ہوئی۔ (فتح الباری ج۱ ص۱۵۳)

نیز آپؐ کو راستہ میں ایک بڑھیا نظر آئی اُس نے آپؐ کو آواز دی۔ جبرئیل امین نے کہا آگے چلئے اور اس طرف التفات نہ فرمائیے اور آگے ایک بوڑھا نظر آیا اُس نے بھی آپؐ کو آواز دی۔ جبرئیل امین نے کہا آگے چلئے پھر آگے آپؐ کا ایک جماعت پر گزر ہوا جنھوں نے آپؐ کو ان کلمات میں سلام پیش کیا:۔

اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَوَّلُ. اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اٰخِرُ. اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا حَاشِرُ۔

جبرئیل امین نے کہا آپؐ ان کا جواب دیجئے۔ بعد ازاں بتلایا کہ وہ بوڑھی عورت جو راستہ کے کنارے پر کھڑی تھی دنیا کی عمر اتنی ہی قلیل باقی رہ گئی ہے جتنی اُس عورت کی عمر باقی ہے۔ وہ بوڑھا مرد شیطان تھا دونوں کا مقصد آپ کو اپنی طرف مائل کرنا تھا۔ اور وہ جماعت جنھوں نے آپ کو سلام کیا حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام تھے۔ (ابن جریر والبیہقی عن انس رضؓ)

بخاری و صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شب معراج میں موسیٰ علیہ السلام اور دجّال اور خازنِ نار (یعنی داروغہ جہنم) کو دیکھا جس کا نام مالک ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا میرا گزر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہوا دیکھا کہ وہ قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔

نیز راستہ میں آپ کا ایسی قوم پر گزر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اپنے چہروں اور سینوں کو اِن ناخنوں سے چھیلتے تھے۔ جبرئیل امین نے بتایا کہ یہ لوگ وہ ہیں جو آدمیوں کا گوشت کھاتے تھے یعنی انکی غیبت کرتے ہیں اور اِن کی عزت و آبرو پر حرف گیری کرتے ہیں۔

(اخرجہٗ احمد و ابو داؤد)

نیز حضورؐ نے ایک شخص کو دیکھا کہ خون کی نہر میں تیر رہا ہے اور پتھر کو لقمہ بنا بنا کر کھا رہا ہے۔ جبرئیل نے بتایا کہ یہ سود خوار ہے۔

(اخرجہ ابن مردویہ عن سمرۃ بن جندبؓ)

نیز آپ کا ایک ایسی قوم پر گزر ہوا جو ایک ہی دن میں تخم ریزی کر لیتے ہیں اور اُسی دن کاٹ بھی لیتے ہیں اور کاٹنے کے بعد کھیتی پھر ویسے ہی ہو جاتی ہے جیسے پہلے تھی۔ جبرئیل امین نے فرمایا کہ یہ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں۔ ان کی ایک نیکی سات سو نیکی سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور یہ لوگ جو بھی خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اسکا نعم البدل عطا کرتا ہے۔ پھر آپؐ کا گزر ایک اور قوم پر ہوا جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے تھے۔ کچلے جانے کے بعد پھر ویسے ہی ہو جاتے ہیں جیسے پہلے تھے۔ اسی طرح یہ سلسلہ مسلسل جاری تھا۔ آپؐ نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیل امین نے کہا کہ یہ فرض نماز سے کاہلی کرنے والے ہیں۔ پھر ایک اور قوم پر گزر ہوا جنکی شرمگاہوں پر آگے پیچھے چیتھڑے لپیٹے ہوئے ہیں اور اونٹ بیل کی طرح چرتے پھرتے ہیں۔ ضریع اور زقوم یعنی کانٹوں اور جہنم کے پتھر کھا رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا یہ لوگ کون ہیں؟ جبرئیل امین نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے مال کی زکوٰۃ نہیں دیتے تھے۔ پھر آپؐ کا ایسی قوم پر گزر ہوا جن کے آگے ایک ہانڈی میں پکا گوشت اور دوسری ہانڈی میں کچا سڑا ہوا گوشت رکھا ہے۔ یہ لوگ سڑا گوشت کھا رہے ہیں اور تازہ پکا گوشت نہیں کھاتے۔ آپؐ کو بتایا گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس حلال اور پاکیزہ عورت (بیوی) موجود ہے مگر وہ زانیہ اور بدکار عورتوں کے ساتھ شب باشی کرتے ہیں۔ پھر آپؐ کا گزر ایک قوم پر ہوا جس نے لکڑیوں کا ایک بڑا بھاری گٹھا جمع کر رکھا ہے اور اُس کے اُٹھانے کی طاقت نہیں مگر لکڑیاں لا لا کر اسمیں اور اضافہ کیا جا رہا ہے۔ جبرئیل امین نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جن پر حقوق اور امانتوں کا بار گراں ہے جنکو وہ ادا نہیں کر سکتے اور اسکے باوجود

مزید بوجھ اپنے پر لادتے جاتے ہیں۔ پھر آپؐ کا ایک اور قوم پر گزر ہوا جن کی زبانیں اور لبیں لوہے کی قینچیوں سے کاٹی جارہی ہیں اور جب کٹ جاتی ہیں تو پھر پہلے کی طرح صحیح و سالم ہو جاتی ہیں۔ اس طرح یہ سلسلہ جاری ہے ختم ہونے نہیں پاتا۔ جبرئیل امین نے فرمایا یہ آپکی امت کے وہ خطیب وواعظ ہیں جو دوسروں کو نصیحت کہتے ہیں اور خود عمل نہیں کہتے پھر آپؐ کا گزر ایک ایسے مقام سے ہوا جہاں نہایت خوشگوار اور خوشبودار ہوا چل رہی تھی۔ جبرئیل امین نے کہا یہ جنت کی خوشبو ہے۔ بعد ازاں ایسے مقام پر گزر ہوا جہاں سے بدبو محسوس ہوئی۔ جبرئیل امین نے کہا یہ جہنم کی بدبو ہے۔ (الخصائص الکبریٰ ج ۱ ص ۱۷۲)

بظاہر یہ تمام واقعات سیر سمٰوات سے پہلے کے معلوم ہوتے ہیں اس لئے کہ روایات میں اِن واقعات کا ذکر بُراق پر سوار ہونے کے متصلاً بعد اور مسجد اقصےٰ میں پہنچنے سے پہلے ملتا ہے۔ اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ یہ واقعات عروج سماء سے پہلے پیش آئے۔ ممکن ہے یہ مختلف اعمال کی صورت مثالی ہوں یا عالم برزخ کے مناظر ہوں۔ واللہ اعلم۔ (اور عالم برزخ بھی ایک مستقل عالم ہے)

الغرض مسجد اقصیٰ میں نماز سے فراغت کے بعد انبیاء سابقین سے ملاقات رہی جو یہاں آپؐ کی تشریف آوری کے موقع پر جمع تھے۔ اولوالعزم انبیاء کرام میں بعض نے مختصر مختصر طور پر اللہ کی حمد و ثنا اور اپنا تعارف کروایا۔

زُرقانی اور خصائص کبریٰ ج ۱ ص ۱۷۳ پر انبیاء کرام کے یہ مختصر خطبے نقل کئے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ روایات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچیں تاہم کتب حدیث کی بعض کتابوں میں نقل ہوتے چلی آرہی ہیں۔

حمد ابراہیمیؑ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان الفاظ میں اللہ کی حمد و ثنا کی:۔

ترجمہ: "حمد ہے اس ذات پاک کی جس نے مجھکو اپنا خلیل بنایا اور ملک عظیم عطا کیا اور امت کا امام و پیشوا بنایا اور آگ کو میرے لئے برد و سلام کر دیا۔"

حمدِ موسوی ؑ حمد ہے اُس ذات پاک کی جس نے مجھ سے بلا واسطہ کلام کیا اور فرعون اور آل فرعون کی ہلاکت و تباہی اور بنی اسرائیل کی نجات میرے ہاتھ پر ظاہر فرمائی اور میری امت میں ایسی قوم بنائی جو ہدایت اور انصاف اور حق کی تبلیغ کرتی ہے۔

حمدِ داؤدی ؑ حمد ہے اُس ذات پاک کی جس نے مجھ کو ملک عظیم عطا کیا اور زبور سکھائی اور میرے لئے لوہے کو نرم کیا اور پہاڑوں اور پرندوں کو میرے لئے مسخر کیا کہ میرے ساتھ تسبیح پڑھیں اور مجھکو علم و حکمت اور بیان کی قوت و طاقت عطا کی۔

حمدِ سلیمانی ؑ حمد ہے اس ذات پاک کی جس نے ہوا اور شیاطین و جنات کو میرے لئے مسخر کیا جو میرے حکم پر چلتے تھے اور پرندوں کی بولی مجھ کو سکھائی اور جن و انس چرند و پرند کا لشکر میرے لئے تابع کیا اور ایسی سلطنت عطا کی جو میرے بعد کسی کے لئے مناسب نہ ہوگی اور نہ مجھ سے اس پر کوئی حساب و کتاب ہوگا۔

حمدِ عیسوی ؑ حمد ہے اُس ذات پاک کی جس نے مجھ کو کلمہ (حکم) خاص سے پیدا کیا اور حضرت آدم کی طرح مجھکو بغیر باپ کے پیدا کیا اور پرندوں کے بنانے اور مردوں کے زندہ کرنے اور کوڑھی اور مادرزاد اندھے کو اچھے کرنے کا معجزہ بخشا اور توراۃ وانجیل کا علم عطا کیا اور مجھکو اور میری ماں کو شیطان کے اثر سے محفوظ رکھا اور مجھکو آسمان پر اُٹھالیا اور کافروں کی صحبت سے پاک کیا۔

آخر میں خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خطبہ ارشاد فرمایا۔

حمدِ محمدی ؐ حمد ہے اس ذات پاک کی جس نے مجھکو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا اور تمام عالم کے لئے بشیر و نذیر بنایا اور مجھ پر قرآن کریم نازل کیا جسمیں تمام امور دینیہ کا بیان ہے اور میری امت کو بہترین امت بنایا اور انہی کو اولین و آخرین امت قرار دیا اور میرے سینے کو علم و حکمت کیلئے کھول دیا اور میرا ذکر بلند و بالا کیا اور مجھکو

فاتح اور خاتم بنایا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے خطبہ سے فارغ ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام انبیاء کرام کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

انہی فضائل و کمالات کی وجہ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑھ گئے۔ جب آپؐ اس محفل انبیاء سے باہر تشریف لائے تو آپ کی خدمت میں دو پیالے پیش کئے گئے آپؐ نے دودھ کا پیالہ اُٹھالیا جبرئیل امین نے کہا "آپ نے فطرت کو پسند فرمایا۔" اگر شراب کا پیالہ اُٹھاتے تو آپؐ کی ساری امت گمراہ ہو جاتی۔ بعض روایات میں ہے کہ شہد کا پیالہ بھی پیش کیا گیا اور آپؐ نے اس میں سے بھی کچھ نوش فرمایا۔

(زرقانی ج ۶ ص ۷۴)

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین پیالے سدرۃ المنتہیٰ کے بعد پیش کئے گئے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ اسکی یہ تاویل بیان کرتے ہیں کہ عجب نہیں کہ یہ پیالے دو مرتبہ پیش کئے گئے ہوں۔ ایک مرتبہ مسجد اقصیٰ میں نماز سے فراغت کے بعد اور دوسری مرتبہ سدرۃ المنتہیٰ پر۔ واللہ اعلم۔

اس محفل انبیاء کی شرکت کے بعد عروجِ سماء (سیر ملکوت) کا آغاز ہوا۔ بعض روایات کی صراحت کے مطابق عروج سماء کا یہ سفر اُسی براق پر ہوا اور بعض دیگر روایات کے مطابق جنت کی ایک سیڑھی (معراج) کے ذریعہ آسمان کی طرف عروج فرمایا۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ معتبر اور مستند راویوں نے (جس کے انھوں نے نام ظاہر نہیں کئے) مجھ کو خبر دی کہ حضرت ابو سعید خدریؓ یہ کہتے تھے کہ میں نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جب میں بیت المقدس کے امور سے فارغ ہوا تو ایک سیڑھی لائی گئی جس سے بہتر کوئی سیڑھی میں نے نہیں دیکھی۔ یہ وہ سیڑھی تھی جسپر بنی آدم کی ارواح آسمان کی طرف چڑھتی ہیں اور آدمی مرتے وقت اُسکی طرف نظر اُٹھاکر دیکھتا ہے۔ میرے رفیق جبرئیل امین نے مجھ کو اس سیڑھی پر چڑھایا یہاں

تک کہ میں آسمان کے ایک دروازے پر پہنچا جسکو "باب الحفظہ" کہتے ہیں۔

(شرح المواہب ج ۶ ص۵۵)

حافظ ابن کثیرؒ کی تحقیق یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی سیڑھی کے ذریعہ آسمان پر تشریف لے گئے اور براق بدستور مسجد اقصیٰ کے دروازے پر بندھا رہا۔ آسمان سے واپسی کے بعد آپؐ پھر اسی براق پر سوار ہو کر مکہ مکرمہ تشریف لائے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۳ ص۱۱)

پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی جنھوں نے آپؐ کو مرحبا نبی صالح اور فرزند صالح کہہ کر استقبال کیا۔ اسی آسمان میں آپؐ کو آمنے سامنے دو نہریں نظر آئیں۔ پوچھنے پر جبرئیل امین نے بتایا کہ یہ نیل اور فرات کی سوتیں ہیں۔ پھر آپؐ کو ایک اور نہر نظر آئی جس پر موتی اور زبرجد کا ایک محل تعمیر تھا اور اسکی زمین مشک کی تھی۔ جبرئیل امین نے کہا یہ نہر کوثر ہے جسکو پروردگار نے آپؐ کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔

دوسرے آسمان پر حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے جو دونوں خالہ زاد بھائی ہیں ملاقات ہوئی۔

تیسرے آسمان پر حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات ہوئی جن کو حسن وجمال کا ایک بڑا حصہ عطا ہوا تھا۔

چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام سے ملاقات ہوئی جن کی نسبت قرآن حکیم نے فرمایا:-

وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا۔ (ہم نے انھیں ایک بلند مقام تک اٹھایا ہے۔ (مریم آیت ۵۷)

پانچویں آسمان پر حضرت ہارون علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔

چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی انھوں نے بھی مرحبا اے پیغمبر صالح اور برادر صالح کہہ کر استقبال کیا۔ جب آپؐ آگے بڑھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام رو پڑے۔ آواز آئی کہ اے

موسیٰ اس گریہ کا کیا سبب ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا الٰہی میرے بعد تو نے اس نوجوان کو مبعوث کیا ہے۔ اسکی امت کے لوگ میری امت سے زیادہ جنّت میں جائیں گے۔

ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی آپ نے مرحبا اے نبی صالح اور اے فرزند صالح کہہ کر خیر مقدم کیا۔ جبرئیل امین نے بتایا کہ یہ آپؐ کے باپ ابراہیم ہیں (علیہ الصلوٰۃ والسلام) حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت المعمور (آباد گھر) سے پیٹھ لگائے بیٹھے تھے۔ (یہ بیت المعمور آسمانوں میں فرشتوں کا قبلہ ہے جو زمین کے قبلہ خانہ کعبہ کے بالکل مقابل ہے۔ روزانہ ستر ہزار فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں پھر ان کی دوبارہ نوبت نہیں آتی)

بعد ازاں آپکو سدرۃ المنتہیٰ کی طرف بلند کیا گیا جو ساتویں آسمان پر ایک بیری کے درخت کی طرح ہے۔ (سدرۃ المنتہیٰ ایک ایسا درخت ہے جس پر شانِ ربّانی کی تجلّیات واقع ہوتی ہیں۔ زمین سے جو چیزیں (ارواح یا اعمال وغیرہ) اوپر جاتی ہیں وہ سدرۃ المنتہیٰ پر آکر ٹھہر جاتی ہیں اور پھر اوپر اُٹھالی جاتی ہیں اور ملاءِ اعلیٰ سے جو چیزیں اُترتی ہیں وہ سدرۃ المنتہیٰ پر آکر ٹھہر جاتی ہیں پھر نیچے اُترتی ہیں اس لئے اس کا نام سدرۃ المنتہیٰ ہے) اسی مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل امین کو اپنی اصلی صورت میں دیکھا۔ پھر آپؐ کو جنّت کی سیر کرائی گئی جس کے گنبد موتی کے تھے اور مٹی مشک کی تھی۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا میں سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچا جہاں عجیب و غریب الوان دیکھنے میں آئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیا تھے؟ پھر میں جنت میں داخل کیا گیا تو اسکے گنبد موتیوں کے تھے اور مٹی مشک کی تھی۔ (الحدیث)

پھر آپ کو مزید عروج ہوا اور ایسے بلند مقام پر پہنچے جہاں صریف الاقلام (لکھنے کے وقت قلم کی جو آواز پیدا ہوتی ہے) سنائی دی

اس مقام پر قضاء و قدر کے قلم مشغولِ کتابت تھے۔ مقام صریف الاقلام سے گزر کر حجابات طے کرتے ہوئے بارگاہ قدس میں پہنچے جہاں آپؐ کی سواری کے لئے ایک رفرف (سبز مخملی مسند) آئی۔ اس پر سوار ہو کر دربار خداوندی میں حاضر ہوئے (رفرف کا ذکر احادیث صحیحہ میں موجود نہیں، ضعیف اور منکر روایتوں میں اس کا ذکر آتا ہے لہذا اسکو بالکل بے اصل بھی نہیں کہا جاسکتا واللہ اعلم)

حضرت انسؓ کی ایک روایت میں اس طرح موجود ہے۔ میرے لئے آسمان کا ایک دروازہ کھولا گیا اور میں نے نور اعظم کو دیکھا اور پردے میں سے موتیوں کی ایک رفرف (مسند) کو دیکھا پھر اللہ تعالیٰ نے جو کلام کرنا چاہا وہ مجھسے کلام فرمایا۔ اس وقت آپؐ کو بارگاہ الٰہی سے تین عطیئے مرحمت ہوئے :۔

(۱) سورہ بقرہ کی آخری آیتیں

(۲) آپکی امت میں جو شخص شرک کا مرتکب نہ ہوگا اللہ تعالےٰ اُسکے کبیرہ گناہوں سے درگزر فرمائیگا اور مغفرت سے سرفراز کیا جائیگا۔

(۳) پانچ نمازیں۔

اب آپ آسمانوں سے اُتر کر زمین پر تشریف لائے اور بیت المقدس میں داخل ہوئے دیکھا کہ یہاں انبیاء کا مجمع ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام نمازمیں مشغول ہیں۔ آپؐ نے اِن میں سے چند نبیوں کی شکل وصورت بھی بیان کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت فرمایا کہ اِن کا قد لمبا اور رنگ گندمی تھا اور بال اُلجھے ہوئے گھونگر قسم کے تھے۔ ازدشنوہ کے قبیلہ کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قد میانہ اور رنگ سرخ وسپید تھا۔ سر کے بال سیدھے اور لمبے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حمام سے نہا کر نکلے ہیں۔ عروہ بن مسعود ثقفی (صحابی) سے ان کی صورت ملتی تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صورت تمہارے پیغمبر (یعنی خود

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم) کی سی تھی۔

بہرحال اسی اثنار میں نماز (غالباً صبح کی نماز) کا وقت آگیا۔ سرورِ انبیار علیہ السلام منصب امامت سے سرفراز ہوئے (مسند احمد اور سیرت ابن اسحاق کی بعض روایتوں میں ہے کہ آسمان پر جانے سے پہلے ہی بیت المقدس میں انبیار نے آپ کی اقتدار میں یہ نماز پڑھی تھی، صحیح بخاری میں اِس کا ذکر نہیں، صحیح مسلم میں وقت کی تصریح نہیں مگر قرینہ سے مفہوم ہوتا ہے کہ یہ واپسی کا واقعہ ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اسی کو صحیح کہا ہے (تفسیر سورہ اسرار)

نماز سے فراغت ہوئی تو ندا آئی اے محمدؐ! دوزخ کا داروغہ حاضر ہے سلام کیجئے! آپؐ نے مڑ کر دیکھا تو داروغۂ جہنم نے آپؐ کو سلام کیا۔

بخاری میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ شب معراج میں آپؐ کو دجّال بھی دکھایا گیا۔

اِن تمام مراحل ومنازل کے طے کرنے کے بعد صبح ہونے سے پہلے پہلے آپؐ مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔

کُفّار کی تکذیب اور بیتُ المقدس کی جلوہ گری

خانہ کعبہ کے آس پاس سرداران قریش کی نشست رہتی تھی آپؐ بھی وہیں مقامِ حِجر (حطیم) میں تشریف فرما تھے آپؐ نے اِن سے یہ واقعہ بیان کیا سب نے سنکر سخت اچنبھا ظاہر کیا کسی نے تعجب سے سر پر ہاتھ رکھ لیا، کسی نے تالیاں بجائیں۔ جو زیادہ کور باطن تھے اُنھوں نے آپؐ کو جھوٹا کہا۔ اِن میں بعض تاجر قسم کے لوگ بھی تھے جنھوں نے بارہا بیت المقدس کو دیکھا تھا اور انہیں معلوم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی بیت المقدس سفر نہیں کئے ہیں اس لئے اُنھوں نے سوالات شروع کئے کہ بتاؤ بیت المقدس کا نقشہ کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرے ذہن میں عمارت کا صحیح نقشہ نہ تھا (ویسے بھی آپ عمارت دیکھنے نہیں گئے تھے) سخت بیقراری ہوئی کہ کیا جواب دوں؟ اچانک نظر کے آگے

بیت المقدس کی پوری عمارت جلوہ گر کر دی گئی۔ وہ سوال کرتے جاتے تھے اور ہیں اسکو دیکھ کر جواب دیتا جاتا تھا۔

اتنا واقعہ تو بخاری و مسلم میں موجود ہے۔ لیکن ابن اسحاق، ابن جریر طبری، ابن ابی حاتم، بیہقی اور حاکم میں اس واقعہ پر یہ اضافہ بھی موجود ہے کہ جب قریش کے سوالات کا آپؐ نے جواب دے دیا تو بعض نے کہا کہ اچھا اب راستہ کا کوئی واقعہ بیان کرو۔

آپؐ نے فرمایا کہ راستہ میں فلاں جگہ مجھکو ایک تجارتی قافلہ ملا جو ملک شام سے مکہ واپس آرہا ہے اِس کا ایک اونٹ گم ہوگیا تھا جو بعد میں مل گیا۔ انشاءاللہ وہ قافلہ تین دن کے بعد مکہ مکرمہ پہنچ جائے گا اور ایک خاکستری رنگ کا اونٹ سب سے آگے آگے ہوگا جس پر دو تھیلے لدے ہوں گے۔

چنانچہ تیسرے دن اسی بیان کردہ کیفیت کے ساتھ وہ قافلہ پہنچ گیا اور اپنے اونٹ کے گم ہوجانے کا واقعہ بھی بیان کیا، ولید بن مغیرہ نے یہ سنکر کہا کہ یہ صریح جادو ہے، لوگوں نے کہا ولید سچ کہتا ہے۔

(زرقانی ج ۶ ص ۱۲۶)

انہی روایات میں حبس شمس (سورج کا ٹھیر جانا) کا معجزہ بھی مذکور ہے کہ جب تیسرا دن ختم ہونے آیا اور وہ قافلہ مکہ مکرمہ نہ پہنچا تو آپکو بیقراری پیدا ہوئی کہ لوگ مزید شک میں پڑجائیں گے اور واقعہ کو جھٹلانے کا ایک اور حیلہ پیدا ہوجائے گا۔ آپؐ نے جناب باری میں دعا و فریاد کی کہ اللہ تعالیٰ نے اُس دن کچھ دیر کے لئے غروب ہونے سے آفتاب کو روک دیا یہاں تک کہ قافلہ آپؐ کی اطلاع کے مطابق اُسی دن شام کو غروب آفتاب سے پہلے مکہ مکرمہ پہنچ گیا۔ (زرقانی ج ۶ ص ۱۲۶)

شیخ الاسلام تقی الدین سبکیؒ نے اس معجزے کو اس طرح شعر میں ادا کیا ہے:۔

وَشَمْسُ الضُّحٰی طَاعَتْكَ عِنْدَ مَغِيْبِهَا ۔ فَمَا غَرَبَتْ بَلْ وَافَقَتْكَ بِوَقْفِهٖ

انہی روایتوں میں یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ کچھ کافر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ تمہارے دوست (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے

آج ایک نئی بات کا اعلان کیا ہے کہ وہ گزشتہ رات بیت المقدس گئے تھے اور صبح ہونے سے پہلے پہلے مکہ مکرمہ واپس آگئے، کیا تم ایسی بات کی بھی تصدیق کروگے؟

حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے؟

لوگوں نے کہا ہاں! اسپر حضرت ابوبکرؓ نے کہا میں اس بات کی تصدیق کرتا ہوں اور میں تو اس سے بھی بڑھکر اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہر روز آپؐ کی خدمت میں آسمان سے فرشتے آتے جاتے رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسی دن سے حضرت ابوبکرؓ کا لقب "صدیق" پڑگیا۔

(الخصائص الکبریٰ ج ۱ ص ۱۷۶)

دیدارِ الٰہی

معراج کے مشاہدات ولطائف اور آیاتِ ربانی کی نیرنگی تو آپؐ نے دیکھی لیکن کیا ذات الٰہی کا بھی مشاہدہ کیا اور کیا اس سے بھی آپؐ مشرف ہوئے؟ بعض روایات میں اس کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے شریک بن عبداللہ نے جو معراج کی روایت نقل کی ہے اُس کے آخر میں ہے:-

حتیٰ جاء سدرۃ المنتہیٰ ودنا الجبار رب العزۃ فتدلی حتی کان منہ قاب قوسین او ادنیٰ۔ الحدیث (بخاری کتاب التوحید)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تو عزت والا جبار اللہ یہاں تک قریب ہوا اور جھک آیا کہ اسکے اور آپؐ کے درمیان دو کمانوں یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا۔

محدثین نے شریک کی روایت کے اس آخری حصہ پر سخت اعتراضات کئے ہیں۔ سب سے پہلے امام مسلم نے اِن پر روایت میں بے احتیاطی کا الزام دیا ہے۔ صحیح مسلم باب المعراج میں شریک بن عبداللہ کی اس سند کو اور کسی قدر متن (حدیث) کو لکھ کر ناتمام چھوڑ دیا ہے اور اسکے بعد لکھا ہے:-

فقدم فیہ واخر وزاد ونقص۔ شریک نے اس روایت میں واقعات کو آگے پیچھے کردیا ہے اور گھٹا بڑھا دیا ہے۔ امام خطابی نے

لکھا ہے کہ صحیح بخاری میں کوئی حدیث ایسی نہیں جو بظاہر اس قدر قابل اعتراض ہو جس قدر یہ حدیث ہے اس کے بعد یہ تنقید کی ہے :-

فانہ کثیر التفرد بمناکیر الالفاظ التی لایتابعہ علیہا سائر الرواۃ۔

شریک بن عبداللہ ایسے منکر الفاظ خود تنہا بکثرت روایت کرتے ہیں جنکی تائید خود ان کے دیگر ہم درس راوی نہیں کرتے۔

حضرت انس رضؓ سے واقعہ معراج کو اور بہت سے راویوں نے نقل کیا ہے مگر شریک بن عبداللہ کے سوا کسی اور نے ان الفاظ کو حضرت انس رضؓ سے نقل نہیں کیا۔ امام بیہقی نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے اور یہی بات امام ابن کثیر بھی کہتے ہیں۔ علامہ ابن حزم نے بھی ایسے ہی کہا ہے۔ امام نسائی اور محدث ابن جارود کا قول نقل کیا جاتا ہے کہ شریک بن عبداللہ قوی راوی نہیں۔ یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں کہ اِن سے حدیث نقل نہ کی جائے۔ البتہ ابن سعید اور امام ابوداؤد نے ان کے ثقہ ہونے کی شہادت دی ہے۔

اس لئے عام محدثین کا اُن کے حق میں یہ فیصلہ ہے کہ جب وہ تنہا کسی بات کو بیان کریں تو ان کی یہ بات شاذ اور منکر قرار دی جائیگی۔ چنانچہ اس روایت میں یہ فقرہ بھی اسی قسم کا ہے۔ واللہ اعلم۔

صحیح مسلم اور جامع ترمذی حضرت ابوذر غفاری رضؓ کی روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یارسول اللہ ؐ کیا آپ نے اللہ تعالےٰ کو دیکھا ہے ؟

ارشاد فرمایا وہ تو نور ہے میں اس کو کہاں دیکھ سکتا ہوں۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا میں نے صرف ایک نور کو دیکھا ہے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۸۳، ترمذی تفسیر سورہ نجم)

اکابر صحابہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ، حضرت ابوہریرہ، حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کا وثوق کے ساتھ یہ کہنا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

اللہ کو نہیں دیکھا بلکہ قرآن حکیم میں رُویت کا جہاں جہاں تذکرہ ہے اُس سے مراد جبرئیل امین ہیں (ولقد رآہ بالافق المبین (تکویر) (ولقد رآہ نزلۃ اُخریٰ (نجم)

خود حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ فرماتی ہیں کہ سب سے پہلے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا، آپؐ نے فرمایا یہ جبرئیل امین تھے میں نے اِن کو دو موقعوں کے سوا کبھی اصلی صورت میں نہیں دیکھا۔

(صحیح مسلم ج ۱ صـ۹۸ باب ذکر سدرۃ المنتہیٰ)

حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ صحابہ کرام میں سے کوئی بھی حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ابن مسعود رضؓ کی اس تفسیر کا مخالف نہیں ہے۔

(تفسیر سورۂ اسراء)

البتہ حضرت ابن عباسؓ یا دوسرے جو صحابہ رُویت کے قائل ہیں اُن کا مطلب بقول حافظ ابن حجرؒ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دل کی آنکھوں سے جلوہ ربانی کا مشاہدہ کیا، ظاہری آنکھوں سے نہیں۔

(فتح الباری ج ۸ صـ۴۶۸)

الغرض اس تشریح کے بعد اس مسئلہ میں کوئی نزاع نہیں رہ جاتی۔ رہی یہ بات کہ دل کا دیکھنا اور قلب کا مشاہدہ کیا ہوتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس بات کو وہی سمجھتا ہے جس کے دل میں نورِ بصیرت اور جس کے قلب میں مشاہدہ کی طاقت ہو۔

نتائج و عِبَر

ایک تاریخی روایت

حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں حافظ ابونعیم اصبہانی کی کتاب دلائل النبوہ سے ایک روایت نقل کی ہے جسکے راوی محمد بن عمر واقدی ہیں (واقدی کو اگرچہ محدثین نے علم حدیث میں ضعیف قرار دیا ہے لیکن امام ابن کثیر جیسے محتاط محدث نے اُن کی روایت کو نقل کیا ہے۔ کیونکہ اس روایت کا

تعلق عقائد یا حلال وحرام سے نہیں ہے اور ایسے تاریخی معاملات میں اُنکی روایت نقل کی جاسکتی ہے)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن شاہانِ عالم کو تبلیغی خطوط روانہ کئے تھے اُن میں روم کے بادشاہ قیصر کے پاس اپنے قاصد حضرت دحیہ بن خلیفہؓ کو نامہ مبارک دے کر روانہ کیا تھا (جس کا تذکرہ صحیح بخاری کے علاوہ احادیث کی سب معتبر کتب میں موجود ہے) روم کے بادشاہ ہرقل نے آپؐ کا نامہ مبارک پڑھنے کے بعد عرب کے اُن تاجروں کو جمع کیا جو اُس وقت روم میں بغرض تجارت آئے ہوئے تھے تاکہ اُن نبی کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ ابوسفیان اور اُن کے ساتھی جو اُس وقت تجارت کے لئے آئے ہوئے تھے شاہی حکم کے مطابق اُنھیں طلب کیا گیا، شاہ ہرقل نے ابوسفیان سے مختلف سوالات کئے جنکی تفصیل بخاری شریف میں موجود ہے۔ ابوسفیان اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اِن کے دل میں یہ خواہش و تقاضہ پیدا ہوا کہ یہ موقع بہت اچھا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بیان کردی جائیں جن سے آپ کا بے حقیقت ہونا یا بے حیثیت ہونا ظاہر ہوجائے مگر ابوسفیان کے دل میں دوسرا خیال یہ بھی آیا کہ اگر میں نے کوئی بات آپؐ کے خلاف جھوٹ کہدی اور پھر کسی وجہ سے اُس کا جھوٹ ہونا ظاہر ہوجائے تو میں بادشاہ کی نظر میں ہمیشہ کے لئے جھوٹا ہوجاؤں گا اور میرے ساتھی بھی موقع بموقع مجھے جھوٹ کا طعنہ دیں گے۔ لہذا میں اُن نبیؐ کے بارے میں کوئی بات جھوٹ نہ کہہ سکا۔ البتہ میں نے یہ مناسب سمجھا کہ شاہ روم کو اُن کے معراج کا واقعہ سنا دوں تاکہ بادشاہ کو خود اس واقعہ کا جھوٹا ہونا معلوم ہوجائے گا۔ اسطرح خود بخود (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بے حیثیت ہونا ثابت ہوجائے گا۔ تو میں نے کہا اے بادشاہ اِن کا ایک واقعہ آپ سے بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ یہ مدعی نبوت بیان کرتے ہیں کہ وہ

ایک رات میں مکہ مکرمہ سے نکلے اور آپ کی اس مسجد بیت المقدس میں پہنچے اور پھر اُسی رات صبح ہونے سے پہلے پہلے مکہ مکرمہ واپس بھی ہوگئے۔

بیت المقدس (ایلیا) کا سب سے بڑا عالم جو اُس وقت بادشاہ کے دربار میں موجود تھا اچانک بول پڑا کہ "میں اُس رات سے واقف ہوں۔" بادشاہ نے پوچھا کہ تم کو کیونکر خبر ہوئی ؟

عرض کیا اے بادشاہ میری عادت تھی کہ رات کو اس وقت تک نہیں سوتا تھا جب تک کہ بیت المقدس کے تمام دروازے بند نہ کر دوں۔ اُس رات میں نے حسب عادت سب دروازے بند کر دیئے مگر ایک دروازہ بند نہ ہوسکا تو میں اپنے لوگوں کو بلایا اُنھوں نے پوری کوشش کی مگر دروازہ بند نہ ہوسکا۔ ہم بے بس ہوکر کاریگروں کو بُلا لائے اُنھوں نے دیکھ کر کہا اس دروازے کے اوپر چھت کا بوجھ پڑ گیا ہے اب صبح ہونے سے پہلے کوئی تدبیر نہیں کی جا سکتی۔ میں مجبور ہوکر لوٹ آیا اور دروازے کے دونوں پٹ کھلے رہے۔ صبح ہوتے ہی پھر اُس دروازے پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ دروازہ کے پاس ایک پتھر کی چٹان میں روزن کیا ہوا ہے۔ ایسا صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہاں رات کو کوئی آیا اور اپنا جانور اس چٹان سے باندھ دیا تھا اس وقت میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا آخر زمانے میں ایک نبی یہاں آنے والے تھے یقین ہے کہ وہ آج رات یہاں تشریف لائے تھے اُن کی آمد کے آثار بھی صبح تک ظاہر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دروازے کو بند ہونے سے روک دیا تھا۔ اس کے بعد اُس عالم نے اپنی مذہبی کتابوں سے اُس نبی موعود کی بہت سی باتیں نقل کیں۔

اس طرح ابوسفیان کا وہ خیال بھی پورا نہ ہوا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حیثیت یا جھوٹا ثابت کرنا چاہا تھا۔ (ابن کثیر ج ۳ ص ۲۴)

معراج جسمانی اور دلائل اربعہ

اس مسئلہ میں صحیح فیصلے کی یہی صورت ہے

کہ متکلمانہ اعتراضات اور عقلی محالات، فلسفی خدشات سے خالی الذہن ہو کر روایاتِ صحیحہ کے اصل الفاظ پر غور کیا جائے تو یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ معراج جسمانی تھی اور بیداری کی حالت میں تھی۔ خواب یا صرف روحانی نہ تھی، جسم اور روح کے ساتھ آپؐ مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تشریف لے گئے۔ پھر وہاں سے اسی حالت میں آسمانوں کی سیر فرمائی۔

مفسرین میں سے ابن جریر طبری سے لے کر امام رازیؒ تک سب نے اس مسلک پر چار عقلی دلیلیں قائم کی ہیں۔

(۱) قرآن حکیم نے اس واقعہ کی ابتداء اس طرح کی ہے :۔

"سُبحان الذی اسریٰ بعبدہ" (اسراء آیت ۱)

پاک ہے وہ ذات جو (شب معراج میں) لے گیا اپنے بندے (عبد) کو

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو لے گیا، بندہ یا عبد کا اطلاق جسم اور روح دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے۔ تنہا روح کو عبد یا بندہ نہیں کہا جاتا۔ لہٰذا معراج جسم اور روح کے ساتھ ہوئی۔

(۲) واقعات معراج میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ براق پر سوار ہوئے، دودھ کا پیالہ نوش فرمایا، سوار ہوئے، سلام و کلام کیا۔ یہ سب جسم کے خواص ہیں اور جسم پر ہی صادق آتے ہیں۔ روح کا سوار ہونا، کھانا پینا، کلام و سلام کرنا بے معنی مطلب ہوگا۔ لہٰذا معراج جسمانی تھی۔

(۳) اگر واقعہ معراج رویا یا خواب ہوتا تو کفار اسکی تکذیب کیوں کرتے؟ اور اتنا شور و پکار کیوں ہوتا؟ انسان خواب میں کیا کیا نہیں دیکھتا؟ محال سے محال چیز بھی اُسکو عالم خواب میں واقعہ بن کر نظر آتی ہے، خواب کی بات پر کوئی بھی تعجب نہیں کرتا چہ جائیکہ انکار اور تکذیب پر اُتر آئے۔ لیکن اس کے باوجود یہ سب کچھ ہوا۔ معلوم ہوا کہ معراج جسمانی طور پر ہوئی تھی اور آپؐ نے اسی حیثیت سے لوگوں کو بیان فرمایا تھا تب ہی تو کفار میں یہ شور و غل مچا۔

ورنہ آپؐ کے لئے یہ کہنا بہت آسان تھا کہ اے لوگو! تم کیوں تکذیب کر رہے ہو میں نے تو یہ خواب دیکھا ہے۔ بس قصہ ختم ہو جاتا۔

(۴) قرآن حکیم نے اس واقعہ کو "فتنۃ للناس" معیار آزمائش بنایا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ۔

(بنی اسرائیل آیت ۶۰)

(اور اس مشاہدہ معراج کو ہم نے لوگوں کے لئے معیار آزمائش بنایا ہے۔)

اگر یہ عام خواب ہوتا تو یہ آزمائشِ ایمان کیا چیز تھی اور اس پر ایمان لانا کیا مشکل تھا۔ اور پھر خواب وخیال کو معیار، آزمائش، امتحان بنانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حالانکہ اس واقعہ کو ایمان وکفر کی کسوٹی قرار دیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی کلام کا فطری قاعدہ یہ ہے کہ جب تک متکلم اپنے کلام میں یہ ظاہر نہ کردے کہ یہ خواب تھا تو طبعی طور پر یہی سمجھا جائیگا کہ یہ واقعہ بحالتِ بیداری پیش آیا۔ قرآن حکیم نے اِن الفاظ میں "سُبْحَانَ الَّذِيٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا" (پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندہ کو ایک رات لے گیا) میں کسی خواب کی تصریح نہیں۔ اسی طرح حضرت ابوذر غفاری رضؓ کی صحیح ترین روایت اور دیگر روایاتِ صحیحہ میں بھی ایسی کوئی تصریح نہیں۔ اس لئے بلا شک وشبہ یہ بیداری ہی کا واقعہ سمجھا جائے گا۔

معراج جسمانی کے یہ دلائل اربعہ (چار دلیلیں) عقلی، کلامی، فلسفی، منطقی، شرعی طور پر ہر لحاظ سے مضبوط اور مستحکم ہیں:۔ فَاسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ۔

دو۲ اعتراضات اور اُن کے جوابات

معراج کا ثبوت تو قرآن حکیم کی واضح آیت سے ثابت ہے جس کا انکار کسی مسلمان کے لئے ممکن نہیں۔ البتہ معراج کی تفصیلات احادیث میں مذکور ہیں اس لئے بعض منکرین حدیث نے معراج کی ان تفصیلات کا انکار کیا ہے۔ منجملہ اُن انکار کے ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آسمانوں کی سیر کے بعد سدرۃ المنتہیٰ سے اوپر اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی اور ہم کلامی کا شرف پایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص مقام پر مقیم تھا۔ حالانکہ قرآن حکیم کی صراحت کے مطابق وہ ہر

جگہ موجود ہے۔ اُس کو زمان اور مکان سے مقید نہیں کر سکتے۔ اَیْنَمَا کُنْتُمْ فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ الآیہ وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ الآیہ لہذا کسی بندے کو پیشی کے لئے سفر کرا کے ایک خاص مقام پر لے جانیکی کیا ضرورت تھی ؟

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ احادیث کی تفصیلات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرایا گیا اور بعض گنہگاروں کے مبتلائے عذاب ہونے کا معائنہ کرایا گیا، حالانکہ جزا اور سزا کا فیصلہ قیامت کے بعد ہوگا اور یہ جزا بندوں کے فیصلے سے پہلے کیسی ؟ لہذا احادیث کی تفصیلات قابلِ قبول نہیں ہوسکتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ اور اس قسم کے دیگر اعتراضات علم وعقل کی کمی کے باعث پیدا ہوئے ہیں۔ تھوڑے سے غور وفکر سے یہ دونوں اعتراضات خود بخود دُور ہوجاتے ہیں۔ پہلا اعتراض تو اس لئے غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں اگرچہ غیر مقید اور غیر محدود ضرور ہے لیکن جب وہ مخلوق کے ساتھ کوئی معاملہ (ملاقات یا کلام) کرتا ہے تو وسائل اور ذرائع اختیار کرتا ہے اور یہ طریقہ اپنی مجبوری یا کمزوری کی بنار پر اختیار نہیں کرتا بلکہ مخلوق کی معذوری یا مجبوری یا کمزوری کی وجہ سے اختیار کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جب وہ اپنی مخلوق میں نبیوں سے کلام کرتا ہے تو کلام کا وہ معروف ومحدود طریقہ استعمال کرتا ہے جیسے نبی سن سکے اور سمجھ سکے۔ حالانکہ وہ خود اپنے کلام کہنے میں وسائل وذرائع کا محتاج نہیں۔ اسی طرح جب وہ اپنے بندے (نبی) کو اپنی سلطنت کی عظیم الشان نشانیاں دکھانا چاہتا ہے تو اُسکو اسکے محدود اور مخصوص ذرائع کے ساتھ لے جاتا ہے اور جہاں جو چیز دکھانی ہوتی ہے اُسی جگہ اُسکو دکھائی جاتی ہے کیونکہ وہ بندہ ساری کائنات کو بیک وقت اُس طرح نہیں دیکھ سکتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کے مشاہدہ کے لئے کہیں جانے آنے کی قطعاً ضرورت نہیں پڑتی، مگر بندے کو ہوتی ہے۔ یہی معاملہ اللہ کے حضور میں باریابی کا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ بذاتِ خود کسی خاص مقام پر متمکن نہیں ہے اور نہ اِس کا وہ محتاج ہے۔ مگر بندہ اللہ کی ملاقات کے لئے ایک جگہ کا محتاج ہے جہاں اُس بندے کے لئے اُس مقام کو اپنی تجلیات وانوار کو مرکز بنایا جائے ورنہ اللہ کی شانِ اطلاقی میں بندۂ محدود کے لئے ملاقات ممکن نہیں ہے۔ لہذا یہ اعتراض کوئی حقیقت نہیں رکھتا کہ معراج کی رات اللہ تعالیٰ کسی خاص مقام پر مقیم تھا جس سے اس کا مقید اور محدود ہونا لازم آئے۔

فَتَعٰلَی اللّٰہُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ۔ رہا دوسرا اعتراض کہ قیامت سے پہلے گنہگار بندوں کو سزا اور عذاب کیسا؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ معراج کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو بہت سے مشاہدات کرائے گئے تھے اُن میں اکثر تو وہ تھے جو حقیقت اور واقعہ کے طور پر سامنے آئے تھے اُس میں مجاز یا تمثیل کی کوئی صورت نہ تھی وہ ایسے ہی واقعات تھے جو آنکھوں سے دیکھے گئے۔

البتہ بعض حقیقتوں کو جو عالم آخرت میں جزا وسزا کے طور پر پیش آنے والے ہیں مُمثّل کر کے دکھایا گیا تھا گویا یہ اُن جرائم کی پاداش تھی جنکو غافل لوگ دنیا میں کیا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک فتنہ انگیز بات کی یہ تمثیل کہ ایک ذراسے شگاف میں سے ایک موٹا بیل نکلا اور پھر اُس میں واپس نہ جاسکا۔ اسی طرح وہ اپنا سر ٹکرا رہا تھا۔ یہ اُس فتنہ گر کی جزا ہوگی جو دنیا میں فتنہ انگیزی کیا کرتا تھا۔

اسی طرح زنا کاروں کی یہ تمثیل کہ اُن کے آگے تازہ اور پاکیزہ گوشت موجود ہے مگر وہ لوگ اسکو چھوڑ کر سڑا اور گندہ گوشت کھارہے ہیں جو اُن کی دوسری جانب رکھا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے ہاں دنیا میں شریف اور پاکیزہ بیویاں تھیں لیکن انھوں نے ناپاک اور گندی عورتوں سے تعلق قائم کر رکھا تھا۔ اسی طرح بعض بُرے اعمال کی جو جزا آپؐ کو دکھائی گئیں وہ اسی قسم کی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عالم برزخ (عالم قبر) ایک ایسی دُنیا ہے جہاں مرنے کے بعد سے حشر ونشر تک نیک و بد دونوں کی ارواح کا مستقر ہے۔ اگرچہ یہ جزا وسزا کی جگہ نہیں لیکن نیکوں کے لئے جنت نشان اور گنہگاروں کے لئے جہنم کدہ جیسا ہے۔ معراج میں آپؐ کو اسی عالم کی سیر کرائی گئی اور وہ حقیقتیں دکھائی گئیں جن پر ایمان بالغیب لانے کی عام انسانوں کو دعوت دی گئی ہے۔ اب زمین پر آکر انبیار کرام جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ اپنے براہِ راست علم اور مشاہدے کی بنا پر کہتے ہیں اور پورے وثوق اور اطمینان سے یہ شہادت دیتے ہیں کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ قیاس یا گمان کی بنار پر نہیں بلکہ آنکھوں دیکھا حال ہے۔

انبیار کرام کے معراج کی یہی غرض وغایت ہوتی ہے۔

ہجرت ہجرت کے معنی چھوڑ دینے کے ہیں اور اسلامی زبان میں دین کی حفاظت کے لئے اخلاص کی بنیاد پر وطن ترک کر دینا۔

مکہ کی زندگی میں کفار مکہ اور مشرکین نے ہر قسم کے ظلم وستم کا نشانہ بنا کر مسلمانوں کو اسلام پر قائم رہنا مشکل بنا دیا تھا۔ ایسے نازک اور صبر آزما حالات میں باذن الٰہی مسلمانوں کو مکہ مکرمہ چھوڑ کر مدینہ طیبہ چلے جانے کا حکم دیا گیا تاکہ اپنے اسلام وایمان کو محفوظ رکھا جائے۔

یہ حکم سنتے ہی پوشیدہ طور پر ہجرت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سب سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی نے مع بیوی اور بچے کے ہجرت کا ارادہ کیا اور اسکے لئے سواری کا انتظام بھی کر لیا اور سوار ہوکر روانہ ہوگئے۔ اس وقت خاندان والوں کو اطلاع ہوئی ان کی بیوی ام سلمہؓ (جو کہ ابوسلمہ رضؓ کی وفات کے بعد ام المومنین بنیں) کے رشتہ داروں نے یہ کہا کہ اے ابوسلمہ رضؓ تم کو اپنے آپ کا اختیار ہے لیکن ہماری بیٹی ام سلمہؓ کو تم نہیں لے جا سکتے اور یہ کہہ کر ام سلمہ رضؓ کو اُتار لیا۔ کچھ دُور آگے چلے تھے کہ خود ابوسلمہ رضؓ کے رشتہ دار آپہنچے اور یہ کہہ کر کہ یہ بچہ ہمارے خاندان کا ہے اسکو تم نہیں لے جا سکتے، ابوسلمہ رضؓ کی گود سے چھین لیا۔ ماں، باپ، بچہ سب ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔ اب ابوسلمہ رضؓ تن تنہا مدینہ منورہ روانہ ہوئے۔ ام سلمہ رضؓ کہتی ہیں کہ جب صبح ہوتی تو میں مقام ابطح میں جاکر بیٹھ جاتی اور شام تک روتی رہتی۔ جب اس طرح ایک سال گذر گیا تو میرے رشتہ داروں میں سے ایک شخص کو مجھ پر رحم آیا اور اُس نے میرے خاندان کے بڑوں کو کہا کہ کیا تم کو اس مسکینہ پر رحم نہیں آتا؟ اسکی حالت پر رحم کرو، یہ روتے روتے مر جائیگی۔

اس سفارش پر مجھ کو مدینہ جانیکی اجازت مل گئی اور بنی الاسد نے بھی میرا بچہ واپس کر دیا۔ میں نے بچہ کو گود میں لیا اونٹ پر سوار ہوکر تنہا مدینہ کا راستہ لیا۔

جب مقام تنعیم پر پہنچی تو عثمان بن طلحہ ملے تنہا دیکھ کر پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟

میں نے کہا اپنے شوہر ابوسلمہ رضؓ کے پاس مدینہ جارہی ہوں۔ پوچھا تمہارے ساتھ کوئی نہیں؟

میں نے کہا:۔

لَا وَاللّٰهِ اِلَّا اللّٰهُ وَبُنَيَّ هٰذَا۔

خدا کی قسم کوئی نہیں سوائے اللہ اور میرے اس بچے کے۔

یہ سنکر عثمان کا دل بھر آیا اونٹ کی مہار پکڑ کر آگے آگے ہولئے۔ جب منزل آتی تو اونٹ بٹھلا کر خود پیچھے ہٹ جاتے۔ جب میں اُتر جاتی تو اونٹ کو دور لے جاتے...... .... اور ایک درخت سے باندھکر خود اس درخت کے سایہ میں لیٹ جاتے اور جب روانگی کا وقت آتا تو اونٹ کو لا کھڑا کرتے اور خود پیچھے ہٹ جاتے اور کہتے کہ سوار ہو جاؤ۔ جب سوار ہو جاتی تو مہار پکڑ کر چلتے جب کسی منزل پر اُترتے تو ایسا ہی کرتے۔ یہاں تک مدینہ پہنچے جب قُبا کے مکانات دُور سے نظر آنے لگے تو کہا کہ اس بستی میں تمہارے شوہر ابوسلمہؓ مقیم ہیں۔ پھر مجھکو میرے شوہر کے گھر پہنچا کر مکہ واپس ہو گئے۔ خدا کی قسم میں نے عثمان بن طلحہؓ سے زیادہ کسی کو شریف نہیں پایا۔ (البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۱۶۹) پھر عامر بن ربیعہ نے اپنی بیوی لیلہ بنت خثیمہ اور ابو احمد بن جحش اور ان کے بھائی عبد اللہ بن جحش نے مع اہل و عیال ہجرت کی اور اپنے مکان کو قفل ڈال دیا۔ عُتبہ اور ابو جہل کھڑے اس منظر کو دیکھ رہے تھے کہ لوگ ایک ایک کر کے مکہ سے کوچ کر رہے ہیں اور مکہ کے مکان خالی اور ویران ہو رہے ہیں۔ سانس بھر کر کہا کہ یہ سب کچھ ہمارے بھتیجے (محمدؐ) کا کام ہے جس نے ہماری جماعت میں تفریق ڈال دی ہے۔

۱۱ سنہ نبوت میں حج کے موقعہ پر الحرار اور منیٰ کے درمیان مقام عَقبہ میں مدینہ کے چند لوگوں نے شب کی تاریکی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنا اور اسلام قبول کیا۔ یہ چھ یا آٹھ شخص تھے دوسرے سال بارہ اور اشخاص جن میں سابقہ اشخاص بھی تھے حاضر خدمت ہوئے اور اسلام لے آئے۔ اسکو عقبۂ اولیٰ کی بیعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس واقعہ نے مدینہ کے ہر گھر میں اسلام کا چرچا کر دیا اور ۱۳ سنہ نبوت کو تہتر (۷۳) مرد اور دو عورتوں نے اسی مقام عقبہ پر حج کے زمانے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ انہی حضرات میں سے بارہ افراد کا انتخاب کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت و تبلیغ کے لئے اپنا نقیب مقرر فرمایا اور انھیں مدینہ روانہ کر دیا۔ اس بیعت کا نام عقبہ ثانیہ قرار پایا۔

اب مدینہ میں اسلام کی اشاعت نے روز افزوں ترقی اختیار کر لی اور مکہ میں

اِس کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا۔ مشرکینِ مکّہ پر یہ بات گراں تر ہونے لگی اور مسلمانوں کو ہجرت سے روکنے کے لئے مظالم میں اضافہ کر دیا اور انسدادِ ہجرت کے لئے ہر ممکن ذرائع کو اختیار کیا حتیٰ کہ اہلِ مکّہ نے مسلمانوں کو اپنے اموال اور اہل وعیال کو ساتھ لے جانے سے روک دیا۔ لیکن یہ مخلص مسلمان ہجرت کی خاطر ان سب چیزوں کو چھوڑ کر مدینہ روانہ ہونے لگے۔

ہجرتِ نبوی

اب مکّہ میں مشاہیر مسلمانوں میں سے صرف حضرت ابو بکرؓ حضرت علیؓ رہ گئے تھے اور ایک قلیل تعداد اُن مسلمانوں کی رہ گئی تھی جو بے بس تھے اور کفار کے پنجے میں پھنسے ہوئے تھے۔ قریش کے سرداروں نے سوچا کہ اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دینے کا اچھا موقعہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بھی چپکے سے مدینہ چلے جائیں، اس کے لئے انھوں نے "دار الندوہ" میں تمام سرداروں کو جمع کر کے قتل کا مشورہ چاہا۔ شیطان مردود ایک بوڑھے شخص کی شکل میں نمودار ہوا۔ لوگوں نے پوچھا آپ کون ہیں؟ کہا میں نجد کا ایک شیخ ہوں تمہاری گفتگو میں شریک ہونا چاہتا ہوں اور اپنی رائے سے تمہاری مدد کروں گا۔ لوگوں نے اندر آنے کی اجازت دے دی اور گفتگو شروع ہوئی۔ مؤرخ سہیلی کی روایت کے مطابق ابوالبختری ابن ہشام نے یہ مشورہ پیش کیا کہ اُن (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کو آہنی زنجیروں میں قید کر کے ایک کمرہ میں بند کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ فوت ہو جائے۔

یہ سنکر شیخ نجدی نے کہا یہ رائے درست نہیں، کیونکہ اگر تم نے ایسا کر دیا تو اسکی شہرت دور دور تک پہنچ جائیگی اور اُنکے چاہنے والے جمع ہو کر تم پر حملہ آور ہو جائیں گے اور انھیں قید سے چھڑا لیں گے۔ اسپر ہر جانب سے آوازیں اٹھیں کہ شیخ نجدی کی بات درست ہے۔

اسکے بعد ابو الاسود نے رائے پیش کی کہ اِن کو مکّہ سے باہر کر دیا جائے تاکہ ہمارا شہر ان کے فساد سے محفوظ ہو جائے۔ شیخ

نجدی یہ سنکر پھر بولا کہ یہ رائے بھی صحیح نہیں کیا تمہیں معلوم نہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیسے شیریں کلام آدمی ہیں لوگ اُن کا کلام سُن کر مسحور ہو جاتے ہیں اگر انھیں آزاد چھوڑ دیا جائے تو بہت جلد اپنی طاقتور جماعت بنالیں گے اور تم پر کسی وقت بھی حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ اسکے بعد ابوجہل نے کہنا شروع کیا کہ تم لوگوں کو جو کام کرنے کا ہے وہ میں نہیں سمجھا، میری سمجھ میں یہ بات آئی ہے کہ ہم عرب کے سب قبیلوں میں سے ہر قبیلہ کا ایک جوان منتخب کریں اور ہر ایک کو عمدہ کام کرنے والی تلوار دے دیں اور پھر ایک مقررہ دن سب کے سب حملہ آور ہو کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دیں۔ اس طرح ہم اُس کے فساد سے محفوظ ہو جائیں گے۔ اب رہا بنو عبد مناف کا مطالبہ جو ان کے خون بہا پر ہوگا ہم سب ادا کر دیں گے۔ قصاص (جان کا بدلہ جان) کسی پر عائد نہ ہوگا۔ کیونکہ قتل میں کوئی ایک قبیلہ شریک نہیں ہوگا۔ اور بنو عبد مناف تمام قبائل سے لڑ نہ سکیں گے۔ مجبوراً دیت (جرمانہ) پر راضی ہو جائیں گے۔ شیخ نجدی یکدم بول پڑا کہ بس رائے یہی ہے اور تم نے صحیح فیصلہ کیا۔ پوری مجلس نے بھی اس کی تائید کی اور یہ طے کیا کہ آج ہی کی رات یہ کام ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ اسکی تیاری شروع کر دی گئی۔ اِدھر وحی الٰہی کے ذریعہ حضرت جبرئیل امین نے دارالندوہ کی پوری روئیداد رات سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا دی اور اللہ کا یہ حکم بھی سنا دیا کہ آج رات آپؐ مکّہ سے ہجرت کر جائیں۔ آپؐ نے اپنے بستر پر حضرت علی رضہ کو لیٹا دیا اور قریش کی امانتیں اُن کے سپرد کیں کہ صبح ان کے مالکوں تک پہنچا دیا جائے اور اللہ کا حکمِ ہجرت بھی بتا دیا۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضہ سے روایت ہے کہ آپ عین دوپہر کے وقت ابو بکر صدیق رضہ کے گھر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ مجھ کو ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے۔ حضرت ابو بکر رضہ نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں کیا مجھکو بھی ساتھ چلنے کی اجازت ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں!

ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ یہ سنکر ابوبکرؓ رو پڑے۔ عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ اس سے پہلے مجھ کو گمان نہ تھا کہ فرطِ مسرت سے بھی کوئی رونے لگتا ہے۔ ابوبکر صدیقؓ نے پہلے ہی سے ہجرت کے لئے دو طاقتور اونٹنیاں تیار کر رکھی تھیں جنکو چار ماہ تک ببول کے پتے کھلا رہے تھے۔ الغرض جب رات کا وقت آیا اور تاریکی چھا گئی تو قریش نے حسب قرارداد آپؐ کے مکان کو گھیر لیا۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لٹا کر ایک مشت خاک اُٹھائی اور سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیات فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (الایہ ۹) تک پڑھکر ان کے سروں پر پھینک دی۔ اللہ تعالیٰ نے اِن کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور آپؐ ان کے سامنے سے شَاهَتِ الوجوہ، شَاهَتِ الْوُجُوْهُ کہتے نکل گئے کسی کو نظر نہ آئے، ان ہی کے درمیان سے گزر کر حضرت صدیق اکبرؓ کے ساتھ شہر مکہ سے نکل گئے اور قریب ہی غارِ ثور میں پناہ لی۔ رات ہی کو کسی طرح پتہ چل گیا کہ آپؐ گھر سے نکل گئے ہیں اور کسی کو بھی خبر نہیں ہوئی۔ تلاش شروع ہوئی، عرب میں اُس وقت قیافہ شناس لوگ کثرت سے تھے۔ پتہ لگاتے لگاتے غارِ ثور کے دہانہ تک پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ اگر ذرا جُھک کر دیکھتے تو آپؐ اِن کے سامنے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ فطری طور پر گھبرا گئے مگر آپؐ نے انھیں تسلی دی کہ

"غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

چنانچہ ساتھ والے اللہ نے یہ تدبیر کی کہ کافروں سے ان کی سوجھ بوجھ چھین لی کہ وہ ذرا جُھک کر دیکھیں اور اِن کے دل میں ایسی بات ڈال دی کہ وہ بے دیکھے واپس چلے گئے۔

تاریخ کی ضعیف روایتوں میں اور مسند ابن حنبل کی ایک روایت میں جو زیادہ کمزور نہیں ہے مذکور ہے کہ مکڑی نے غار کے منہ پر جالے تن دیئے تھے۔ کفار نے کہا اگر کوئی اس غار میں چھپتا تو ظاہر ہے یہ جالے ٹوٹ جاتے۔

کہا جاتا ہے کہ مشہور قیافہ شناس جو ساتھ تھا یہی کہتا رہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس حد سے آگے نہیں گئے۔ گھر سے چلتے وقت حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی بڑی صاحبزادی اسماء بنت ابی بکر رضؓ نے سفر کے لئے توشہ تیار کیا عجلت میں بجائے رسّی کے اپنی اوڑھنی پھاڑ کر ناشتہ دان باندھا۔ اسی دن سے حضرت اسماء کا نام ذات النطاقین (دو پٹکے والی) پڑ گیا۔ ابن سعد کی روایت میں ہے کہ ایک ٹکڑے سے توشہ دان باندھا اور دوسرے سے مشکیزہ کا منہ بند کیا۔ (طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۵۵)

حضرت عبداللہ بن ابی بکر (حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے فرزند) اُن دنوں جوان سال تھے۔ دن بھر مکہ میں رہتے اور رات کو آکر قریش کی خبریں بیان کرتے اور عامر بن فہیرہ رضؓ (حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے آزاد کردہ غلام) بکریاں چرایا کرتے تھے اور عشاء کے وقت آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضؓ کو بکریوں کا دودھ پلا جاتے تھے۔

(البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۱۸۴)

عبداللہ بن اریقط اگرچہ مذہباً مشرک تھا لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے راستہ کی نشان دہی کے لئے اُسکو اُجرت پر مقرر کیا اور اپنی اونٹنیاں اُسکے حوالہ کیں۔ وہ تیسرے دن جبل ثور پر اونٹنیاں لیکر حاضر ہوگیا اور پھر آپ مدینہ کیلئے روانہ ہوگئے۔ (بخاری شریف باب الہجرۃ)

غارِ ثور سے نکل کر جب آپؐ مدینہ کی راہ چلے تو قریش کے جو سوار آپکے تعاقب کے لئے نکلے تھے اُن میں سُراقہ آپکو نظر آیا وہ تیزی کے ساتھ آپؐ کے قریب پہنچ گیا لیکن دفعتہً اُسکے گھوڑے کے پیر زمین میں دھنس گئے، سُراقہ نے عرض کیا یقین ہے کہ تم دونوں نے بد دُعا کی ہو۔ اللہ کے واسطے میرے لئے دعا کرو خدا کی قسم میں آپؐ سے عہد کرتا ہوں کہ جو شخص بھی آپؐ کو تلاش کرتا ہوا ملے گا میں اُس کو واپس کر دوں گا۔

بخاری شریف کی روایت میں بد دُعا کے یہ الفاظ آئے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اصْرَعْہُ۔ اے اللہ اسکو پچھاڑ دے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ سراقہ بن مالک آپ کی بددُعا سے پیٹ تک دھنس گیا تھا۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۱۸۸)

آپؐ نے دُعا فرمائی زمین نے گھوڑے اور سراقہ کو چھوڑ دیا۔ سراقہ کہتا ہے کہ میں سمجھ گیا کہ اللہ تعالیٰ اب آپؐ کو ضرور غلبہ اور طاقت عطا کرے گا۔ پھر میں نے آپؐ سے کہا کہ قریش نے آپؐ کی گرفتاری کے لئے سَو اونٹ انعام دینے کے لئے اشتہار دیا ہے۔ اسی حرص میں میں نے یہ اقدام کیا تھا۔

اسکے بعد میں نے اپنا زادِ راہ آپؐ کے آگے پیش کر دیا آپؐ نے قبول نہیں کیا البتہ یہ فرمایا کہ ہمارا حال کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ میں نے وعدہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی کہ آپ ایک تحریر امن ومعافی کی مجھکو لکھوا دیں! آپؐ کے حکم سے عامر بن فہیرہ رضؓ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر معافی کی سند لکھ کر مجھ کو عطا کی اور میں امان نامہ لیکر واپس ہوا اور جو شخص بھی آپؐ کے تعاقب میں نظر آتا اُسکو یہ کہہ کر واپس کر دیتا کہ تمہارے جانے کی ضرورت نہیں میں دیکھ آیا ہوں۔

(بخاری ج ۱ ص ۵۱۰، ص ۵۱۵، ص ۵۵۴)

ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ آپؐ نے سُراقہ سے فرمایا، اے سراقہ اس وقت تیرا کیا حال ہوگا جس وقت تو کسریٰ (ایران کے بادشاہ) کے کنگن پہنے گا؟

سراقہ اس بات کو سمجھ نہ سکا لیکن خلافت فاروقی میں جب ایران فتح ہوا اور کسریٰ کا تاج اور خزانہ مسجد نبوی کے سامنے لاکر ڈال دیا گیا تو حضرت عمرؓ نے سراقہ کو طلب کیا اور اُس سے مخاطب ہوکر کہا اے سراقہ ہاتھ اُٹھا اور پھر کسریٰ کے کنگن اُسکے ہاتھوں میں پہنا کر فرمایا:-

اللہ اکبر حمد ہے اس ذات پاک کی جس نے یہ کنگن کسریٰ سے چھینے اور ایک گنوار دیہقانی سراقہ کو پہنائے۔ (اصابہ ترجمہ سراقہ بن مالک، استیعاب [illegible])

ہجرت کا یہ واقعہ ربیع الاوّل ۱۳ ؁ نبوت دوشنبہ کے دن پیش آیا۔

اہلِ تاریخ یہ بھی لکھتے ہیں کہ آپؐ مکہ مکرمہ سے ۲۷ صفر جمعرات کے دن برآمد ہوئے۔ تین دن غار ثور میں رہ کر یکم ربیع الاوّل بروز دوشنبہ مدینہ منورہ روانہ ہوئے اور ساحلِ سمندر کے راستہ چل کر ۸ ربیع الاوّل بروز دوشنبہ ہی کے دن دوپہر کے وقت قُبار میں نزول فرمایا، قبار میں قبیلۂ عمرو بن عوف کے سردار کلثوم بن ہدم کے مکان پر قیام فرمایا۔ اور آپؐ نے یہاں ایک مسجد کی بنیاد رکھی۔ یہ اس امت کی پہلی مسجد ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ قبار میں چند دن قیام فرماکر جمعہ کے دن مدینہ منورہ کا ارادہ فرمایا۔ اپنی ناقہ (اونٹنی) پر سوار ہوئے۔ راستہ میں محلہ بنی سالم پڑتا تھا یہاں جمعہ کا وقت آگیا نماز جمعہ ادا کی۔ اسلام میں آپ کا یہ پہلا خطبہ اور پہلی نماز جمعہ تھی۔ نماز جمعہ سے فارغ ہوکر ناقہ پر سوار ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو اپنے پیچھے بٹھایا شہر مدینہ کا رُخ فرمایا۔ انصار کا ایک جم غفیر آپؐ کے ساتھ تھا۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ آپؐ اُسکے گھر مہمان ٹھیریں آپؐ ان کو دُعا دیتے اور یہ فرماتے جاتے تھے کہ آج میری یہ ناقہ من جانب اللہ مامور (پابند) ہے جہاں اللہ کے حکم سے بیٹھ جائیگی وہیں قیام کروں گا۔ دَعُوْهَا فَاِنَّهَا مَامُوْرَةٌ۔ اسکو چھوڑ دو اسکو الہام کیا گیا ہے۔ (فتح الباری ج۷، ص۱۹۲)

آپؐ نے اپنی ناقہ کی لگام کو بالکل ڈھیلا چھوڑ رکھا تھا کسی بھی جانب حرکت نہیں دیتے تھے۔ بالآخر ناقہ محلہ بنی النجار (جو آپؐ کا ننہال تھا) میں خود بخود اُس مقام پر پہنچ گئی جہاں اس وقت مسجد نبویؐ کا دروازہ (باب السلام) ہے۔ مگر آپؐ ناقہ سے نہیں اترے۔ چند ہی لمحات بعد ناقہ پھر اٹھی اور حضرت ابو ایوب انصاری رضؓ کے دروازے پر جا بیٹھی اور پھر معاً اُٹھکر پہلی جگہ آبیٹھی اور اپنی گردن زمین پر ڈال دی۔ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ناقہ سے نزول فرمایا اور حضرت ابو ایوبؓ کے مکان پر قیام کیا۔

ع "مبارک منزلے کہ خانہ را ماہے چنیں باشد"
وہ گھر بھی کیا مبارک تھا جسکو آپؐ کے نزول نے بدرِ کامل بنادیا

قرآن حکیم نے ہجرت کے اس عظیم واقعہ کو کئی آیات میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

قرآنی مضمون

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْيَقْتُلُوْكَ اَوْيُخْرِجُوْكَ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ۔ (سورہ انفال آیت ۳۰)

اور یاد کرو اے نبی اُس وقت کو جب کہ کافر لوگ آپؐ کے خلاف سازش کر رہے تھے تاکہ آپؐ کو قید کرلیں یا مار ڈالیں یا مکّہ سے نکال باہر کردیں۔ وہ اپنی سازشوں میں لگے ہوئے تھے اور اللہ بھی اُن کے خلاف تدبیر کرچکا تھا۔ اور اللہ تدبیر کرنے والوں میں سب سے بہتر مدبر ہے۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ۔الخ (سورہ توبہ آیت ۴۰)

اے لوگو! اگر تم اللہ کے رسول کی مدد نہیں کروگے تو وہ تمہاری مدد سے بے نیاز ہیں کہ اللہ نے اُس وقت اُن کی مدد کی جب اُن کو کافروں نے مکّہ سے نکال دیا تھا۔ جبکہ وہ دونوں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضؓ) غار (ثور) میں تھے جبکہ وہ رسول اپنے دوست (ابوبکرؓ) سے کہہ رہے تھے گھبراؤ نہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پھر اللہ نے اُس (ابوبکر صدیق رضؓ) پر اپنی تسکین نازل کی اور اُس (رسولؐ) کی ایسے لشکروں سے مدد کی جنکو تم نہیں دیکھ رہے تھے۔ اور اس طرح اللہ نے کافروں کی بات کو نیچا کردیا۔ اور اللہ ہی کا کلمہ اُونچا رہا اور بلاشبہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا۔ (اسراء آیت ۷۶)

اور قریب تھا کہ کافر لوگ آپؐ کو بے بس کردیتے سرزمین مکہ سے تاکہ آپ کو وہاں سے نکالدیں۔ اور اگر وہ ایسا کردیتے تو اُن کی ہلاکت

بہت قلیل عرصہ میں سامنے آجاتی۔

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ الخ (آل عمران آیت ۱۹۵)

پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور میری راہ میں لڑے اور مارے گئے میں ضرور اُن کے گناہ اُن سے دور کردوں گا اور اُن کو ایسی جنتوں میں داخل کروں گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ یہ بدلہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ کے پاس اچھا بدلہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ الخ (النساء آیت ۹۷ تا ۹۹)

بیشک جن لوگوں کو فرشتوں نے ایسی حالت میں موت سے دوچار کیا جو اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے یعنی ہجرت سے باز رہ گئے تھے اِن سے فرشتوں نے موت کے وقت پوچھا کہ تم کس حالت میں تھے؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور تھے۔ فرشتوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی؟ کہ تم اسمیں ہجرت کر جاتے؟ سو یہی ہیں وہ لوگ جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت بُری جگہ ہے۔ مگر وہ کمزور مرد اور عورتیں اور بچے جو ہجرت کے لئے کوئی تدبیر نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہجرت کے لئے کوئی راہ پاتے ہیں تو یہ وہ ہیں کہ امید ہے اللہ تعالےٰ اُن کو معاف کردے اور اللہ بیشک معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ الخ (التوبہ آیت ۲۰)

جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا۔ اللہ کے نزدیک بہت بلند درجہ والے ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

نتائج و عبر

دَارُ النَّدْوَہ :-

مکہ مکرمہ میں یہ پہلا مکان تھا جس کو قصی بن کلاب نے مشوروں کے لئے تعمیر کیا تھا۔ قریش اسمیں جمع ہو کر مشورے کیا کرتے تھے۔ قصی بن کلاب کی وفات کے بعد یہ مکان بنی عبد الدار کے قبضہ میں آیا۔ اِن سے حکیم بن حزام رضؓ نے جو بعد میں مشرف باسلام ہوئے خرید ا تھا اور پھر انہی کے قبضہ میں رہا۔ یہاں تک کہ حضرت معاویہؓ کے زمانۂ خلافت میں حکیم بن حزام رضؓ نے یہ مکان ایک لاکھ درہم میں فروخت کر دیا۔ بعض لوگوں نے حضرت حکیم رضؓ کے اس عمل پر نکتہ چینی کی کہ آبار واجداد کی ایک نشانی کو تم نے اپنے ہاتھ سے کھو دیا۔ اسپر حکیم بن حزام رضؓ نے نہایت حکیمانہ جواب دیا۔

> اللہ کی قسم ساری بزرگیاں اور شرف ختم ہو گئے سوائے تقویٰ اور پرہیزگاری کے۔ واللہ میں نے یہ مکان زمانۂ جاہلیت میں صرف ایک شراب کی مشک دیکر خریدا تھا اور اب ایک لاکھ درہم میں فروخت کیا ہے اور میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ یہ ایک لاکھ سب کے سب اللہ کی راہ میں صدقہ ہیں۔ بتاؤ کیا میں نقصان میں رہا؟

(زرقانی ج ۱ صـ۳۲۱)

اسی مکان میں قریش کے سرداروں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا مشورہ کیا تھا اسی میں ابلیس لعین شیخ نجدی کی شکل میں مشورہ دینے آیا تھا۔ اب یہ زمین حرم شریف میں داخل ہوگئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ "باب الزیادات" اسی جگہ پر واقع ہے۔ واللہ اعلم

خوش نصیب خاتون :-

ہجرت کے موقعہ پر غار ثور سے نکل کر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے مدینہ کا راستہ اختیار کیا، راہ میں اُمِّ مَعْبد کے خیمہ پر گزر ہوا۔ یہ ایک شریف اور مہمان نواز خاتون تھیں جو سرِ راہ مسافروں کی خدمت کو سعادت اور نیکی سمجھا کرتی تھیں۔ آپؐ یہاں اُتر گئے۔ پوچھا کہ کچھ کھانے پینے کی چیز ہے؟ اُس خاتون نے جواب دیا اسوقت تو کچھ نہیں شاید میرے شوہر جو کچھ دیر بعد آنے والے ہیں اپنے ساتھ کچھ لیتے آئیں آپ لوگ مسافر ہیں بہتر ہے کچھ دیر ٹھیر جائیں، آپؐ اور ابوبکر صدیق رضؓ اسکے خیمہ میں ٹھیر گئے۔ دیکھا کہ ایک جانب ایک بکری کھڑی ہے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا اسے کیا ہوا؟ اُمّ معبد نے کہا یہ بکری لاغر و دبلی ہونے کی وجہ سے گلہ کے ساتھ جنگل نہیں جا سکی۔ آپؐ نے پوچھا کیا اسمیں کچھ دودھ بھی ہے؟ ام معبد نے کہا اسمیں دودھ کہاں!

اسپر آپؐ نے اُمّ معبد سے اجازت طلب کی کہ میں اس کا دودھ دوھ لوں؟

اُمّ معبد نے کہا میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں اگر اسمیں کچھ بھی دودھ ہو تو آپؐ ضرور دُوھ لیں۔

آپؐ نے بسم اللہ پڑھکر اُس بکری کے تھن پر اپنا دست مبارک رکھا تھن دُودھ سے بھر گئے اور آپؐ نے دُودھ دُوھنا شروع کیا ایک بڑا برتن دُودھ سے بھر گیا۔ ام معبد اس بات کو تعجب سے اور حیرت کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ آپؐ نے پہلے اُسکو عنایت فرمایا۔ ام معبد نے اتنا پیا کہ سیراب ہوگئیں۔ پھر آپؐ نے اپنے ساتھیوں حضرت صدیق اکبر رضؓ اور دلیلِ راہ عبداللہ بن اریقط کو عنایت فرمایا۔ جب یہ لوگ سیراب ہوگئے تو بقیہ آپؐ نے نوش فرمایا۔ پھر دوبارہ بکری کو دُوھیا یہاں تک کہ وہ برتن پھر بھر گیا۔ آپؐ نے وہ دودھ بھرا برتن اُمّ معبد کو عطا کیا کہ جب اپنا شوہر آئے اسکو دینا، پھر آپ سرِ شام وہاں سے روانہ ہوگئے۔ شام کے وقت جب اُمّ معبد کے شوہر ابو معبد بکریاں چرا کر جنگل سے واپس آئے تو دیکھا کہ ایک بڑا برتن دودھ سے بھرا رکھا ہے۔ پوچھا

اے اُم معبد یہ دُودھ کہاں سے آیا ہے ؟ ام معبد نے کہا آج یہاں سے ایک مبارک مسافر گزرا تھا خدا کی قسم بکری میں ایک قطرہ دودھ نہ تھا یہ سب اُسکی برکت ہے۔ پھر سارا قصہ سنایا۔

کہا جاتا ہے کہ وہ بکری ہمیشہ دودھ دیتی رہی اور اُم معبد ہر گزرنے والے مسافر کو اس کا دودھ پیش کیا کرتی تھی۔ ابو معبد اور ام معبد بعد میں مسلمان ہوگئے تھے۔

انہی ابو معبد خُزاعی سے امام ابو حنیفہ رح نے اپنی مسند میں حدیث قہقہہ کی روایت نقل کی ہے۔ (فتح القدیر ج ا ص۳۵)

نیک بخت نوجوان :۔

جس رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی اُس کی صبح قریش کے سرداروں نے یہ اعلان عام کر دیا کہ جو بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ابو بکر رض کو زندہ یا مُردہ گرفتار کر کے لائے گا اسکو ہر ایک کا بدلہ سَو سَو اونٹ انعام دیا جائے گا۔ سراقہ بن مالک (جس کا تذکرہ واقعہ ہجرت میں آچکا ہے) بھی اسی شوق میں نکلا تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ کر زمین میں دھنس گیا تھا۔ انہی نوجوانوں میں بُریدہ اسلمی بھی شامل تھا۔ یہ اپنے ستر ساتھیوں کے ساتھ آپ کی تلاش میں نکل پڑا تھا ایک مقام پہ آپؐ کو پالیا آپؐ نے دریافت فرمایا تم کون ہو ؟ جواب دیا میں بُریدہ ہوں (یہ لفظ بَرد سے بنا ہے جسکے معنی ٹھنڈے اور سرد کے ہیں) آپؐ نے بطور فالِ نیک ابو بکر صدیق رض سے فرمایا اے ابو بکر رض ہمارا کام ٹھنڈا اور درست ہوا۔

پھر آپؐ نے پوچھا تم کس قبیلہ سے ہو ؟ بُریدہ نے کہا قبیلہ اَسْلَمْ سے۔

آپؐ نے پھر بطور تفاول ابو بکر صدیق رض سے فرمایا۔
ہم سلامت اور محفوظ ہوگئے۔

اسکے بعد آپؐ نے پوچھا قبیلہ اسلم کی کس شاخ سے ہو؟

بُریدہ نے جواب دیا بنی سہم سے (سہم کے معنی حصہ اور نصیب کے ہیں۔)

آپؐ نے بُریدہ کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا تجھ کو اسلام سے حصہ ملے گا!

اس گفتگو کے بعد بُریدہ رضؓ کا دل اسلام قبول کرنے کے لئے بیقرار ہوگیا اور وہ مسلمان ہوگئے۔ یہ حال دیکھ کر بریدہ رضؓ کے ستر ساتھی بھی مشرف باسلام ہوئے۔

بُریدہ نے عرض کیا یارسول اللہ! مدینہ میں داخل ہوتے وقت آپؐ کے آگے ایک جھنڈا ہونا چاہیئے۔ آپؐ نے اپنا عمامہ اُتار دیا اور نیزہ سے باندھ کر بُریدہ کے حوالہ کیا۔ جس وقت آپؐ مدینہ منورہ پہنچے تو بریدہؓ جھنڈا لئے ہوئے آپؐ کے آگے تھے۔ (زرقانی ج ۱ ص ۳۴۹)

اسلام کا پہلا ترانہ:۔

مکہ مکرمہ سے آپؐ کے ہجرت کی اطلاع مدینہ طیبہ پہنچ چکی تھی۔ مدینہ منورہ کے سینکڑوں افراد ہر روز مقامِ حرّہ (باہر سے آنے والے مسافروں کی استقبال گاہ) پر آکر کھڑے ہوجاتے تھے۔ دوپہر تک انتظار کرکے واپس ہو جاتے۔ روزانہ یہی معمول تھا۔ ایک روز انتظار کرکے واپس ہو رہے تھے کہ ایک یہودی نے ٹیلہ پر سے آپؐ کو رونق افروز ہوتے دیکھا بے اختیار پکار کر کہا:۔

یَا بَنِیْ قِیْلَۃَ ھٰذَا جَدُّکُمْ.

اے بنی قیلہ یہ تمہارا بختِ مبارک اور خوش نصیبی کا سامان آپہنچا۔

لوگ بے تحاشہ دوڑ پڑے اور نعرۂ تکبیر سے قبیلہ بنی عمرو بن عوف کی آبادی گونج اٹھی۔ قُبا میں چند یوم قیام فرماکر جمعہ کے روز مدینہ منورہ کی طرف چل پڑے۔

راہ میں چھوٹی چھوٹی بستیوں پر آپ کا گزر ہوا۔ مکانوں کی چھت پر لڑکیاں آپؐ کا استقبال اس ترانہ سے کرتی تھیں جو یقیناً اسلام کا پہلا ترانہ تھا۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا		مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ

چودھویں رات کا چاند مقام "ثنیات الوداع" سے ہم پر جلوہ افروز ہوا ہے

وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا		مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعِ

ہم پر اللہ کا شکر واجب ہے جب تک اللہ کو کوئی پکارنے والا باقی ہے

أَيُّهَا الْمَبْعُوثُ فِينَا		جِئْتَ بِالْأَمْرِ الْمُطَاعِ

اے وہ مبارک ذات جو ہم میں نبی بنا کر بھیجے گئے ایسی بات لیکر آئے ہو جسکی اطاعت واجب ہے

صحیح بخاری میں حضرت براء بن عازبؓ سے منقول ہے کہ میں نے اہل مدینہ کو کسی چیز سے اتنا خوش ہوتے نہیں دیکھا جتنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے خوش ہوتے دیکھا۔

میزبانِ رسولؐ :-

تیسری صدی عیسوی کے وسط بادشاہانِ یمن میں شاہ تُبَّع ایک عظیم فرمانروا گزرا ہے جس کا تذکرہ قرآن حکیم میں موجود ہے کسی مہم سے واپسی پر مدینہ منورہ کی سرزمین سے اُس کا گزر ہوا اس قافلہ میں چار سو علماء اس کے ساتھ تھے۔ سب نے بادشاہ سے گزارش کی کہ ہم کو اس سرزمین پر قیام کرنے کی اجازت دی جائے۔ بادشاہ نے اس کا سبب دریافت کیا۔ علماء نے جواب دیا کہ ہم انبیاء کرام کے صحیفوں میں یہ لکھا ہوا پاتے ہیں کہ آخیر زمانے میں ایک نبی پیدا ہوں گے اُن کا نام "محمد" ہوگا اور یہ سرزمین اُن کا دارالہجرت ہوگی۔ بادشاہ نے اُن سب کو قیام کی اجازت دے دی اور ہر ایک کے لئے ایک ایک مکان تعمیر کروایا اور سب کے وہاں نکاح بھی کرا دیئے اور ہر ایک کو مال و دولت بھی دیا اور ایک مکان خصوصیت سے اُن نبی آخرالزماں کے لئے تیار کروایا کہ جب وہ ہجرت کر آئیں تو اس مکان میں قیام فرمائیں۔ آپؐ کے نام اُس بادشاہ نے ایک خط بھی لکھا جسمیں اپنے سلام اور ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا تھا۔ پھر اس خط کو سر بمہر کر کے ایک

بڑے عالم کے سپرد کیا اور یہ وصیت کی کہ اگر تم اس نبی کا زمانہ پاؤ تو میرا یہ خط پیش کر دینا ورنہ اپنی اولاد کو یہ خط سپرد کرکے وصیت کر دینا جو میں تم کو کر رہا ہوں۔ چنانچہ یہ وصیت اُس عالم کے خاندان میں چلتی رہی۔

حضرت ابوایوب انصاری رضؓ (میزبانِ رسول) اُسی عالم کی اولاد میں سے ہیں اور یہ مکان بھی وہی مکان تھا جسکو شاہِ تبّع نے آپؐ کیلئے تعمیر کروایا تھا۔ اور بقیہ انصارِ مدینہ انہی چارسو علماء کی اولاد ہیں۔

(روض الانف جلد ۱ صفحہ ۲۴)

غزوۂ بدر

(یوم الفرقان) غزوہ اُس جہاد کا نام ہے جسمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس قیادت فرمائی ہو۔ ایسے غزوات کی جملہ تعداد (۲۷) بیان کی جاتی ہے۔ اور جس جہاد میں آپؐ نے قیادت نہ کی ہو بلکہ اپنے اصحاب کو روانہ فرمایا ہے اسکو سَریّہ کہا جاتا ہے۔ ایسے سرایا کی جملہ تعداد (۴۰ تا ۵۶) بیان کی جاتی ہیں۔ (زرقانی ج صفحہ ۳۸۸)

قرآن حکیم نے جن اہم غزوات کا ذکر کیا ہے اُن میں غزوہ بدر سرفہرست ہے۔ اسلام کی سربلندی اور شان وشوکت کا آغاز اسی غزوہ سے شروع ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس غزوہ کو "یوم الفرقان" (یعنی حق و باطل میں فیصلہ کا دن) قرار دیا ہے۔

بدر ایک گاؤں کا نام ہے جو مدینہ منورہ سے تقریباً اسّی میل کے فیصلہ پر واقع ہے اور بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ بدر ایک کنویں کا نام تھا جسکی وجہ سے اُس بستی کا نام بھی بدر ہو گیا۔ آجکل یہ بستی جدّہ مدینہ کی شاہراہ عام پر واقع ہے۔ جہاں (۱۳) شہداء بدر ایک مختصر احاطہ میں آسودہ خواب ہیں۔ (نوّرَ اللہُ مَضجَعَہُم)

تمہید:-

مسلمانوں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ سے مشرکینِ مکہ اس درجہ چراغ پا ہو گئے کہ اب اُن لوگوں نے باضابطہ یہ طے کر لیا کہ بہرقیمت مسلمانوں کو نیست ونابود کر دیا جائے۔ چنانچہ ہجرت مدینہ کے بعد ہی مشرکین نے مدینہ طیبہ پر چھوٹے موٹے حملوں کا

آغاز کر دیا تھا اور موقع بموقع لوٹ مار، غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ مگر مشرکین مکہ کی آتشِ غضب کے لئے یہ کافی نہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں سے ایک فیصلہ کن جنگ ہوجائے اسکے لئے وہ ایسے حالات پیدا کر رہے تھے جس سے اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کا خاتمہ ہوجائے۔ چنانچہ انہی کارروائیوں میں سے ایک دستے نے کُرز بن جابر الفہری کی قیادت میں مدینہ طیبہ کے قریب ایک بڑا ڈاکہ مارا اور اہل مدینہ کے کثیر مواشی لوٹ لے گئے۔ مشرکین کی اس غارت گری کی روک تھام کے لئے ہجرت کے پہلے سال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار دستے مشرکین کی جانب روانہ کئے تھے جو تاریخ کی کتابوں میں سریّہ حمزہؓ، سریّہ عبیدہ بن حارثؓ، سریّہ سعد بن ابی وقاص رضؓ اور غزوۃ الابواء کے نام سے معروف ہیں۔ دوسرے سال کے ابتدائی مہینوں میں مزید دو حملے اُسی جانب کئے گئے تھے جسکو مؤرخین، غزوہ بواط، غزوہ ذوالعشیرہ کے نام سے ذکر کرتے ہیں۔ لیکن یہ مختصر اور محدود قسم کے حملے تھے جو کسی بڑے نفع ونقصان کے بغیر اختتام پذیر ہوتے۔

اسی درمیان قریش کے سرداروں نے مدینہ کے سردار عبداللہ بن اُبیّ کو (جیسے ہجرت سے پہلے اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانے کی تیاری کر چکے تھے اور جس کی تمناؤں پر اس کے قبیلے اوس وخزرج کی اکثریت مسلمان ہوجانے سے پانی پھر چکا تھا) خط لکھا کہ تم لوگوں نے ہمارے آدمی (محمدؐ) کو اپنے ہاں پناہ دی ہے اور مکہ سے نکلے ہوئے مسلمانوں کو پناہ دے رہے ہو۔ بہتر تو یہ ہے کہ خود تم ان سے لڑو یا ان سب کو اپنے شہر سے باہر کر دو ورنہ ہم سب تم پر حملہ آور ہوں گے اور تمہارے مردوں کو قتل اور عورتوں کو لونڈی غلام بنا لیں گے۔ عبداللہ بن ابیّ اسپر کچھ آمادہ فساد ہوا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بر وقت اسکے شر کی روک تھام کر دی۔

اسکے بعد مدینہ کے رئیس حضرت سعد بن معاذ رضؓ عُمرہ کے لئے مکہ گئے وہاں حرم شریف میں ابوجہل نے اُن کو ایک سخت دھمکی دی کہ

"تم ہمارے دین کے انکار کرنے والوں کو پناہ دیتے ہو؟
اور اُن کی اعانت کرتے ہو؟ اور کیا ہم تم کو یہاں مکہ میں اطمینان سے
طواف کرنے دیں گے؟
بخدا اگر تم اُمیہ بن خلف (مشہور مشرک سردار) کے مہمان

نہ ہوتے تو یہاں سے زندہ واپس نہیں جاتے۔

حضرت سعدؓ نے ایسا جواب دیا جس کی تعبیر معرکہ بدر کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

"واللہ اگر تم نے مجھے یا مسلمانوں کو طوافِ کعبہ سے روکا تو ہم تم کو اُس چیز سے روک دیں گے جو تمہارے لئے اس سے شدید تر ہے یعنی مدینہ پر سے تمہاری رہ گزر۔"

اہل مکّہ کی تمام تر تجارت اور معاشی زندگی ملک شام سے وابستہ تھی۔ اور اس کا واحد راستہ مدینہ ہی سے تھا۔

گویا اہل مکّہ کی طرف سے اس بات کا اعلان تھا کہ زیارت بیت اللہ کی راہ مسلمانوں پر بند ہے جس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ شامی تجارت کا راستہ مشرکین پر مسدود ہو جائے۔ اسکے علاوہ مسلمانوں کے لئے یہ بات بھی ضروری تھی کہ خود کفر کی طاقت کو کمزور تر کیا جائے۔ اور اسکے لئے انکی تجارتی گزرگاہ پر اپنی گرفت مضبوط کی جائے۔ تاکہ اہل کفر کی اقتصادی و معاشی حالت بڑھنے نہ پائے۔ جسکی بدولت آئے دن مسلمانوں کی جان و مال غیر محفوظ ہوتے جا رہی تھی۔ حالات غیر یقینی ہوتے چلے گئے۔ اسی درمیان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ ابوسفیان قریش کے ایک قافلۂ تجارت کے ساتھ ملک شام سے مکّہ واپس ہو رہا ہے جسکے ساتھ مال و اسباب کی بہت بڑی مقدار ہے۔ آپؐ نے مسلمانوں کو جمع کر کے اس بات کی خبر دی اور یہ بھی بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے دو جماعتوں (تجارتی قافلہ یا قریشی لشکر) میں سے ایک جماعت پر تسلّط اور قبضہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔

آخر کار یہی بات طے پائی کہ تجارتی قافلہ کو حاصل کیا جائے۔ بعض حضرات نے تو بخوشی آمادگی ظاہر کی اور بعض نے یہ سمجھ کر کہ جنگ کا معاملہ نہیں ہے اس لئے آمادگی کا ثبوت نہیں دیا۔

۱۲ رمضان ۲ھ مسلمانوں کا ایک مختصر دستہ جو قافلہ کے تعاقب میں نکلا تھا سامان حرب و ضرب سے بے پرواہ ہو کر روانہ ہوا۔ مشہور روایت کے مطابق ان کی تعداد تین سو تیرہ تھی۔ جبکہ مدینہ کے اندر مسلمانوں کی آبادی ہزار ہا نفوس پر مشتمل تھی۔ چند تلواریں دو تین گھوڑے، صرف ساٹھ اونٹ سواری کے ہمراہ تھے۔ یہ نہ کوئی جنگی لشکر تھا اور نہ جنگ کے ارادے سے نکلا تھا بلکہ مسلمانوں کا ایک مختصر سا قافلہ تھا جو قریش کے حرب

وضرب کے سرمایہ پر قابض ہوکر دشمن کو بے مایہ بنانے نکلا تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں جاسوسی کا نظام کچھ ایسا منظم تھا کہ آناً فاناً کسی بھی بات کی اطلاع دور دور تک پہنچ جاتی تھی۔ ابوسفیان (سالار قافلہ) کو کسی طرح معلوم ہوگیا کہ مسلمان اُسکے تعاقب کے لئے مدینہ سے نکل چکے ہیں اُس نے فوراً ضمضم نامی ایک جاسوس کو مکہ روانہ کیا کہ وہ قریش کو اس معاملہ کی اطلاع دے اور مدد طلب کرے۔ قریش نے جب حقیقتِ حال کو سُنا تو اِن میں بہت زیادہ جوش اور انتقام کا جذبہ پیدا ہوا اور ہر سردار قبیلہ اپنے اپنے لشکر کے ساتھ نہایت کرّوفر سے نکلا تعداد میں ایک ہزار تھے، نیزے اور تلواریں بے شمار تھیں۔ سات سو جنگی زرہ، ستر گھوڑے اور بے شمار اونٹ تھے۔ مقصد یہ تھا کہ اپنے تجارتی قافلہ کو بچالیں اور مسلمانوں پر حملہ کرکے اُنھیں نیست و نابود کر دیا جائے۔

اِدھر مسلمان بھی تجارتی قافلہ کے تعاقب میں آگے بڑھتے گئے۔ جب وادی صفراء کے قریب پہنچے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمی ابن عمرو اور عدی کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ وہ تجارتی قافلہ کا حال معلوم کر آئے۔

مؤرخ ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ جب یہ دونوں بدر کے قریب پہنچے تو وہاں کنویں کے قریب قبیلہ جُہینہ کے ایک شخص مجدی بن عمرو اور دو لڑکیوں کو دیکھا جو آپس میں یہ بات کر رہی تھیں کہ کل یا پرسوں یہاں ایک قریشی قافلہ آنے والا ہے میں اسمیں محنت مزدوری کر کے تیرا قرض ادا کر دوں گی۔ اسپر مجدی نے اُس لڑکی کی تصدیق کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جاسوس ابن عمرو نے جب یہ سُنا تو چُپکے سے اپنے اونٹ کو پانی پلاکر فوراً روانہ ہوگیا۔

دوسری جانب ابوسفیان چُھپتا چُھپاتا قافلہ سے آگے بڑھکر تجسّسِ حال کے لئے بدر پہنچا تو وہاں مجدی موجود تھا ابوسفیان نے اُس سے پوچھا کہ کیا تو نے کسی اجنبی کو تو یہاں نہیں دیکھا؟

مجدی نے کہا ایسی تو کوئی نئی بات نظر نہیں آئی البتہ تھوڑی دیر قبل دو آدمی اجنبی قسم کے یہاں آئے تھے اور اپنے اونٹوں کو پانی پلاکر واپس ہوگئے۔ ابوسفیان کنویں کے پاس آیا تو اونٹوں کی لید پڑی دیکھی۔ لید کو کُریدھا تو کھجور کی گٹھلیاں نکلیں۔ کہنے لگا بیشک یہ یثرب (مدینہ) کے اونٹ تھے۔ تیزی سے اپنے قافلہ پر پہنچا اور حالات سے باخبر کرکے قافلہ کا رخ ساحل سمندر کی جانب پھیر دیا اور بدر کو بائیں جانب چھوڑتا ہوا مکہ روانہ ہوگیا۔

اس مدت میں مسلمان وادیٔ صفراء سے گزر کر وادی ذفران تک پہنچ چکے تھے یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دونوں جاسوس ابن عمروؓ اور عدیؓ سے معلوم ہوا کہ عنقریب ابوسفیان کا قافلہ بدر پہنچنے والا ہے۔ اور دوسری جانب سے یہ اطلاع بھی آچکی تھی کہ مکہ سے قریش کا ایک بڑا لشکر مسلمانوں سے مقابلہ کے لئے بدر کی جانب بڑھ رہا ہے۔ بہرحال مسلمانوں کو جب وادی ذفران میں یہ دونوں خبریں ملیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے دوبارہ مشورہ ضروری سمجھا۔ کیونکہ اب معاملہ ویسا نہیں تھا جیسا کہ مدینہ سے نکلنے کے وقت پیش آیا تھا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ دشمن ہمارے سر پر ہے اور قافلہ قریب ہے۔ اب بتائیں کیا چاہتے ہو جنگ کر کے حق و باطل کا فیصلہ یا بغیر لڑے تجارتی قافلہ پر قبضہ؟ صحابہؓ نے جب یہ سنا تو بعض نے طبعی طور پر جنگ کو پسند نہیں کیا اور عرض کیا یا رسول اللہ ہم جنگ کے ارادے سے نہیں نکلے ہیں اس لئے بے سروسامان ہیں بہتر ہے کہ قافلہ پر قبضہ کر کے واپس لوٹ جائیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کمزور رائے کو ناپسند فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا قافلہ کا ذکر چھوڑو، اب اس قوم کے متعلق رائے دو جو تمہارے مقابلہ کے لئے مکہ سے نکل آئی ہے؟ بعض لوگوں نے جب دوبارہ عذر کیا تو آپؐ نے پھر پہلی بات لوٹا دی تب جلیل القدر صحابہ میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ سمجھ گئے کہ آپؐ کی مرضی مبارک حق و باطل کی جنگ سے وابستہ ہے۔ اپنے جذبۂ وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا یا رسول اللہؐ ہم جنگ کے لئے ہر طرح تیار ہیں۔ آپؐ اپنا حکم جاری فرمادیں۔ حضرت مقداد بن اسودؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا:۔

تاریخ شجاعت کا سرمایہ

یا رسول اللہؐ جس چیز کا اللہ نے آپؐ کو حکم دیا ہے اسکو انجام دیجئے۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ کی قسم ہم بنی اسرائیل کی طرح یہ ہرگز نہیں کہیں گے۔ اے موسیٰ تم اور تمہارا رب جاکر لڑے ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ یا رسول اللہ! ہم بنی اسرائیل کے برخلاف یہ کہیں گے کہ آپؐ اور آپؐ کا پروردگار جہاد و قتال کرے ہم بھی آپ کے ساتھ جہاد و قتال کریں گے۔ ہم آپؐ کے دائیں اور بائیں، آگے پیچھے ہر سمت

سے لڑیں گے۔
راوی حدیث حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں میں نے اُس وقت دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور فرطِ مسرّت سے چمک اُٹھا۔ (بخاری ص ۵۶۴ غزوۂ بدر)

صحابہ کرام کی اس اطاعت شعاری و جاں نثاری کے باوجود آپؐ نے پھر تیسری بار بھی ارشاد فرمایا:۔
انصاریوں کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ شاید آپ کا روئے سخن انصار کی طرف ہے؟
آپؐ نے ارشاد فرمایا ہاں! حضرت سعدؓ اسطرح گویا ہوئے جو قیامت تک تاریخ شجاعت کا سرمایہ رہے گا:۔

"یا رسول اللہ ہم آپؐ پر ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کی ہے اور اس بات کی گواہی دی ہے کہ آپؐ جو کچھ لائے ہیں وہی حق ہے۔ اسکے علاوہ ہم اطاعت و جاں نثاری کے پختہ عہد و میثاق آپکو دے چکے ہیں۔

یا رسول اللہ! آپؐ مدینہ سے کسی اور ارادے سے نکلے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے دوسری صورت پیدا فرمادی آپؐ کا جو منشار ہو کر گزرئیے۔ جس سے چاہیں تعلقات قائم فرمائیں اور جس سے چاہیں تعلق قطع کریں اور جس سے چاہیں صلح قائم کریں اور جس سے چاہیں دشمنی کریں۔ ہم ہر حال میں آپ کے ساتھ ہیں۔ ہمارے اموال سے جسقدر آپ چاہیں لیں اور جس قدر چاہیں ہم کو (بقیہ) عطا فرمائیں اور مال کا وہ حصہ جو آپ ہم سے لیں گے وہ ہمیں اُس حصے سے زیادہ محبوب و پسندیدہ ہوگا جو آپ ہمارے پاس چھوڑ دیں گے۔ اور اگر آپؐ ہم کو برک الغماد (دور دراز مقام کا نام) تک جانے کا حکم دیں تو ہم ضرور آپؐ کے ساتھ جائیں گے۔ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپؐ کو حق دے کر بھیجا ہے اگر آپؐ ہم کو سمندر میں کود پڑنے کا حکم دیں

تو ہم اُسی وقت کود پڑیں گے۔ ہم میں کا ایک شخص بھی پیچھے نہ رہے گا۔
ہمارے دل دشمنوں سے مقابلہ کے لئے تنگ نہ ہوں گے۔ انشاء اللہ
ہم لڑائی کے وقت صبر کرنے والے اور مقابلہ کے لئے سچے ہیں۔
اللہ تعالےٰ سے اُمید ہے کہ وہ ہم سے آپؐ کو وہ چیز دکھائیگا
جسکو دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ بس آپؐ اللہ کے نام پر ہم کو
لے چلئے۔ (زرقانی ج ۱ ص ۴۱۳)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحابؓ کے یہ جان نثارانہ جوابات سُن کر مسرور ہوئے اور فرمایا اللہ کے نام پر چلو اور تم کو بشارت ہے اللہ تعالےٰ نے مجھ سے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ ابوجہل یا ابوسفیان کی دو جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت پر ضرور فتح و نصرت عطا کرے گا اور مجھکو کفار کے مقتل دکھائے گئے ہیں کہ فلاں شخص فلاں جگہ اور فلاں شخص فلاں جگہ پچھاڑا جائے گا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان بدر پہنچکر ایک جگہ زمین پر ہاتھ رکھ کر بتایا کہ یہاں فلاں قریشی مارا جائے گا اور یہاں فلاں قتل ہوگا۔

مہاجرین و انصار سے آپؐ نے جو مشورہ لیا اُس کا تذکرہ قرآن حکیم کی آیاتِ ذیل میں موجود ہے:۔

قرآنی مضمون

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ الخ (انفال آیات ۵ تا ۸)

(جہاد کا مال غنیمت اللہ و رسول کی ملکیت ہیں) اس لئے کہ تیرے رب نے تجھکو حق کے لئے گھر سے نکالا اور حالت یہ ہوگئی کہ مسلمانوں کی ایک جماعت اس نکلنے پر گرانی کا اظہار کر رہی تھی۔

اور وہ لوگ آپ سے حق کے بارے میں باوجود کہ حق ظاہر ہوگیا تھا جھگڑا کر رہے تھے گویا وہ لوگ آنکھوں دیکھے موت کے منہ میں ہنکائے جا رہے ہیں۔

اور یہ واقعہ اُس وقت پیش آیا جبکہ اللہ تم کو وعدہ دے رہا تھا

کہ دونوں فریق (تجارتی قافلہ اور مشرکین مکہ کا لشکر) میں سے ایک فریق کو تمہارے قبضہ میں دے دیا گیا اور تم یہ چاہتے تھے کہ غیر مسلح جماعت (تجارتی قافلہ) تم کو ملے اور اللہ کی یہ مرضی تھی کہ حق (یعنی فتح) کو اپنی آیات سے ثابت کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا عیاناً واضح ہو جائے اگرچہ مجرموں کو یہ بات پسند نہ آئے۔

میدانِ بدر میں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں صحابہ کرام آگے بڑھے اور بدر کے قریب پہنچ کر مدینہ طیبہ کی جانب والے رُخ (عُدْوَۃُ الدُّنیا) پر خیمہ زن ہو گئے اور مشرکینِ مکہ آگے بڑھے تو بدر پہنچ کر مدینہ منورہ سے دور مکہ کی جانب والے رُخ (عُدْوَۃُ الْقُصْوٰی) پر اُترے۔ مگر مشرکینِ مکہ نے پہلے پہنچ کر پانی کے چشمہ پر قبضہ کر لیا اور مناسب موقعوں کو اپنے لئے چھانٹ لیا۔ بخلاف مسلمانوں کے اِن کو نہ پانی ملا اور نہ مناسب جگہ ملی۔ ریت کا میدان تھا جہاں چلنا پھرنا دشوار تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُسی وقت بارانِ رحمت نازل فرما دی جس سے تمام ریت جم گیا اور پانی جمع کرنے کے لئے مسلمانوں نے چھوٹے چھوٹے حوض بنا لئے۔ اس طرح ذخیرۂ آب کا قدرتی انتظام ہو گیا اور پیاسی ریت پانی پی کر مضبوط ہو گئی کہ قدم پھسلتے نہیں تھے۔ برخلاف مشرکین کا رخ والا حصہ نشیب میں ہونے کی وجہ سے پانی کا جل تھل ہو گیا اور پیر پھسلنے لگ گئے۔

قرآن حکیم نے میدان بدر کی اس خصوصی حالت کو اس طرح بیان کیا ہے :-

قرآنی مضمون

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ الآیہ

(انفال آیت ۴۲)

یہ وہ بدر کا دن تھا جبکہ تم اِدھر قریب کے کنارے پر تھے اور اُدھر دشمن دور کے کنارے پر تھا اور قافلہ تم سے نچلے حصہ میں تھا (یعنی سمندر کے کنارے کنارے گزر رہا تھا) اور اگر تم آپس میں لڑائی کی بات طے کر لیتے تو یقیناً وقت لڑائی کے بارے میں تم اختلاف کرتے (لیکن

تم چاہتے ہو کہ کسی حالت میں جنگ نہ ہو اور دشمن چاہتا تھا کہ ضرور جنگ ہو یعنی تمہیں دشمن کی کثرت اور اپنی بے سروسامانی کا اندیشہ تھا اور تجارتی قافلہ پر تسلط آسان نظر آرہا تھا اور دشمن اپنی کثرت اور ساز و سامان پر گھمنڈ کئے ہوئے تھا لیکن اللہ نے دونوں لشکروں کو جمع کر دیا) تاکہ جو بات ہونے والی تھی اُسے اللہ کر دکھائے۔ نیز اس لئے کہ جسے ہلاک ہونا ہے اتمامِ حجت کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہنے والا ہے وہ اتمامِ حجت کے بعد زندہ رہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ سبکی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً الآیہ (انفال آیت ۱۱)

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب اللہ نے اپنی طرف سے چین وسکون دینے کے لئے تم پر (میدان بدر میں) غنودگی طاری کر دیا تھا اور آسمان سے تمہارے اوپر پانی اُتار رہا تھا کہ اس کے ذریعہ سے تمہیں پاک کر دے اور تم سے شیطانی وسوسہ کو دفع کر دے۔ اور تاکہ مضبوط کر دے تمہارے دلوں کو اور اسکے باعث تمہارے قدم جما دے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (آل عمران آیت ۱۲۳ تا ۱۲۷)

اور یقیناً اللہ نے تمہاری نصرت کی غزوۂ بدر میں حالانکہ تم بے سروسامان تھے سو اللہ سے ڈرتے رہا کرو (اسی کا نام تقویٰ ہے) عجب کیا کہ شکر گزار بن جاؤ۔

اور وہ وقت یاد کرو جب آپ مومنین سے کہہ رہے تھے کہ کیا یہ تمہارے لئے کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار تمہاری مدد تین ہزار اُتارے ہوئے فرشتوں سے کرے؟ کیوں نہیں، بشرطیکہ تم نے صبر و تقویٰ قائم رکھا۔ اور اگر وہ دشمن تم پر فوراً آپڑیں گے تو تمہارا پروردگار تمہاری مدد پانچ ہزار نشان کئے ہوئے فرشتوں سے کرے گا۔ اور یہ تو اللہ نے اس لئے کیا کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہیں اس سے دلجمعی حاصل ہو جائے ورنہ

نصرت تو بس زبردست اور حکمت والے اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

اور یہ نصرت اس غرض سے تھی تاکہ کفر کرنے والوں میں سے ایک جماعت کو ہلاک کر دے یا انھیں ذلیل وخوار کر دے کہ وہ ناکام ہوکر واپس جائے۔

جنگ کی تیاری

شام کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہؓ کو قریش کے لشکر کی خبر لانے روانہ فرمایا۔ اتفاق سے ان لوگوں کو دو غلام ملے دریافت کرنے پر کہا کہ ہم مکہ کے رہنے والے ہیں پانی کی تلاش میں نکلے ہیں لیکن صحابہ کو اسپر یقین نہ آیا زدوکوب کیا تو کہنے لگے کہ ہم ابوسفیان کے آدمی ہیں۔ یہ سنکر صحابہ نے مارنا چھوڑ دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے آپؐ نے حال معلوم کیا اور فرمایا کہ جب ان غلاموں نے سچ کہا تو تم نے انھیں مارا اور جب جھوٹ کہا تو چھوڑ دیا۔ اللہ کی قسم یہ قریش کے آدمی ہیں (یعنی ابوسفیان کے جماعت کے نہیں) پھر آپؐ نے اِن سے پوچھا کہ قریش کہاں ہیں؟ ان غلاموں نے کہا واللہ ٹیلہ کے پیچھے ہیں۔ پھر آپؐ نے پوچھا کہ کتنے لوگ ہیں؟ جواب دیا کہ بہت ہیں تعداد معلوم نہیں اسپر آپؐ نے پوچھا اچھا یہ بتاؤ روزانہ کھانے کے لئے کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کبھی نو عدد اور کبھی دس عدد اونٹ ذبح کرتے ہیں۔

آپؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ لشکر کی تعداد ہزار اور نو سو کے درمیان ہے (عموماً سو آدمیوں کی خوراک ایک اونٹ ہوتا ہے) پھر آپؐ نے پوچھا کہ سرداروں میں کون کون آئے ہیں؟ اسپر اُن غلاموں نے چند نامی گرامی سرداروں کے نام بتائے۔ یہ سنکر آپؐ نے اپنے اصحاب سے کہا قریش نے آج اپنے تمام جگر گوشوں کو تمہاری طرف پھینک دیا ہے۔

حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ جس شب کی صبح میدانِ کارزار گرم ہونے والا تھا اُسی شب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو لیکر میدان

کی طرف چلے تاکہ اہل مکہ کی قتل گاہیں ہم کو آنکھوں سے دکھلادیں۔ چنانچہ آپؐ اپنے دست مبارک سے اشارہ فرماتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے یہ جگہ فلاں سردار کی قتل گاہ ہے اور یہ جگہ فلاں کی اور یہ جگہ فلاں کی۔ نام بنام اسی طرح ہم کو بتلاتے رہے۔ اللہ کی قسم جس نے نبی کریم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے کسی ایک سردار نے بھی سرمو تجاوز نہ کیا جہاں آپؐ نے اپنے دست مبارک سے اُسکے قتل گاہ کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔

ساری رات آپؐ نے نماز اور دُعا وگریہ زاری میں گزار دی۔ طلوع فجر پر صحابہ کو نماز کے لئے بیدار کر دیا اور نماز فجر ادا کی۔ اسکے بعد اللہ کی راہ میں جہاد اور قربانی کی ترغیب دی اور صحابہ کو جہاد کے لئے صبر اور استقامت کی تلقین فرمائی۔

آغاز جنگ

۱۷ رمضان المبارک ۲ھ (۱۷ مارچ ۶۲۴ء) جمعہ کا دن تھا میدان بدر میں صحابہؓ کی صفوں کو درست کیا اور پھر اللہ عظیم و برتر کی جناب میں اس طرح مناجات کی: "الٰہی تونے مجھ سے وعدۂ نصرت فرمایا ہے۔ الٰہی آج اسکو پورا فرما۔ الٰہی! اگر یہ مٹھی بھر مسلمان ہلاک ہوگئے تو پھر روئے زمین پر تیرا کوئی عبادت گزار باقی نہیں رہے گا۔"

بار الٰہ کفار قریش کی یہ فوج غرور وتکبر کے ساتھ مقابلہ کے لئے آئی ہے۔ یہ لوگ تیری مخالفت کرتے ہیں اور تیرے فرستادہ رسولؐ کو جھٹلاتے ہیں۔ اے اللہ اپنی فتح ونصرت نازل فرما جس کا تونے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے۔ اے اللہ ان کو ہلاک فرما۔ (سیرۃ ابن ہشام)

صدیق اکبرؓ نے آپ کی اللہ کے جناب میں آہ وزاری وبیقراری کو دیکھا، قریب تشریف لائے اور فرمایا: یارسول اللہ! بس کیجئے اللہ آپؐ کو ضائع نہ کرے گا۔ یقیناً اپنا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا۔

آپؐ نے دُعا کے بعد مسلمانوں کی صفوں کو درست فرمایا۔ دست مبارک میں ایک تیر تھا صف میں حضرت سواد بن غزیہ رضؓ ذرا آگے کو نکلے نظر آئے آپؐ نے اپنے تیر سے اُن کے پیٹ پر ہلکا سا کونچہ دیا اور فرمایا: اِسْتَوِیَا سَوَادُ۔ اے سوادؓ سیدھے ہوجاؤ۔

اس موقع پر اخلاقِ نبوت کا وہ بے مثال و نادرانہ واقعہ پیش آیا جو تاریخ اخلاق و کردار کا غیر فانی نمونہ ہے۔ سواد بن غزیہ رضؓ نے عرض کیا:۔

یا رسول اللہ آپؐ نے مجھکو دردمند کر دیا بلاشبہ اللہ نے آپ کو حق و عدل کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ میرا بدلہ دیدیجئے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے شکم مبارک سے چادر اُٹھا کر سواد رضؓ سے فرمایا اپنا بدلہ لے لو۔

سواد بن غزیہ رضؓ نے شکم مبارک کو گلے سے لگایا اور بوسہ دیا پھر عرض کیا یا رسول اللہ بس یہی مقصد تھا۔ شاید یہ آخری ملاقات ہو۔ آپ مسرور ہوئے اور دُعائے خیر فرمائی۔ (الاصابہ ج۲ ص۹۵)

قریش مکہ نے آغاز جنگ سے پہلے اپنے ایک جاسوس عُمیر بن وہب کو مسلمانوں کی جماعت کا اندازہ لینے کے لئے بھیجا اُس نے مسلمانوں کے اردگرد پھر کر قریش کو یہ خبر دی کہ کم و بیش تین سو آدمی معلوم ہوتے ہیں ممکن ہے ان کی مدد کے لئے کوئی بڑی تعداد کمین گاہ میں چھپی بیٹھی ہو پھر یکبار دور دور تک چکر لگا کر آیا اور قریش کو اطمینان دلایا کہ کوئی مکین اور مدد نہیں ہے۔

لیکن مسلمانوں کے حوصلے اور جوش و خروش اس درجہ بلند و بالا ہیں کہ مقابلہ میں سوائے موت و قتل کے ہمیں کچھ نہ ملے گا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہماری یہ طاقت و قوت بے نام و نشان ہو جائیگی۔

مشرکین کی صفوں میں اس بات سے کچھ انتشار ہوا لیکن ابوجہل کی جاہلی حمیت نے سبکو آمادۂ جنگ کر دیا۔

لشکرِ اسلام سے مقابلہ کے لئے تین شخص عوف بن حارث رضؓ اور معوذ بن حارث رضؓ اور عبد اللہ بن رواحہ رضؓ میدان میں آگے بڑھے اور آواز دی، مشہور مشرک سردار عتبہ نے پوچھا تم کون ہو؟

ان حضرات نے اپنے اپنے نام بیان کرنے کے بجائے "رَهْطٌ مِّنَ الْأَنْصَارِ" یعنی ہم "انصاری لوگ" ہیں۔

عتبہ نے کہا مَا لَنَا بِكُمْ مِنْ حَاجَةٍ. ہم کو تم سے کوئی سروکار نہیں ہم تو اپنی قوم سے لڑنا چاہتے ہیں۔

پھر اُس نے مزید آواز دی۔ اے محمدؐ ہماری قوم سے ہمارے ہم جوڑ کو مقابلہ کے لئے بھیجو!

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تینوں انصاریوں کو واپس ہو جانے کا حکم دیا اور سیدنا علی رضؓ سیدنا حمزہ رضؓ اور سیدنا عبیدة بن الحارث رضؓ کو نام بنام مقابلہ کے لئے نکلنے کا حکم دیا۔

تینوں آگے بڑھے سیدنا علی رضؓ ولید کے مقابل ہوئے، سیدنا حمزہ رضؓ شَیْبَہ کے مقابل اور سیدنا عبیدہ رضؓ عتبہ کے مقابل ہوئے، لڑائی شروع ہوگئی۔ سیدنا علی رضؓ اور سیدنا حمزہ رضؓ نے تو اپنے اپنے مقابل کو ایک ہی وار میں ڈھیر کر دیا البتہ سیدنا عبیدہ خود بھی زخمی ہوئے اور اپنے مقابل کو بھی زخمی کر دیا۔ آخر کار عتبہ نے سیدنا عبیدہ رضؓ پر تلوار کا ایک ایسا وار کیا جس سے اُن کا پیر کٹ گیا اور وہ گر پڑے۔ معاً سیدنا علیؓ اور سیدنا حمزہ رضؓ اُنکی مدد کو پہنچ گئے اور عتبہ کا کام تمام کر دیا اور سیدنا عبیدہؓ کو اُٹھا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے۔ بدر سے واپسی کے وقت اُنپر نزع کی سی کیفیت طاری تھی۔ ہوش سنبھالا اور اپنا رُخسار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک پر رکھ دیا اور اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ عَلَيْهِ رَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهٗ۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی وفات پر اس عظیم المرتبت سند کا اعلان فرمایا:۔

اَشْهَدُ اَنَّكَ شَهِيْدٌ۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ تم شہید ہو۔ (البدایہ النہایہ ج۳ صـ۲۷۴)

بدر سے جب کوچ ہوا تو درمیان راہ مقام صفراء میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ ایک سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے ساتھ مقام صفراء میں قیام فرمایا تھا صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ یہاں

مشک کی خوشبو آرہی ہے! آپؐ نے فرمایا تعجب کی بات نہیں یہاں عبیدہؓ
کی قبر ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت ملتی ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت سیدنا عمرؓ نے مجھ سے بیان کیا کہ بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ مشرکین مکہ ایک ہزار ہیں اور آپؐ کے اصحاب صرف تین سو سے کچھ زائد تو آپ اپنے چھپر (عریش) میں آئے اور قبلہ رو ہوکر بارگاہِ الٰہی میں دُعا کے لئے اس طرح ہاتھ پھیلائے :۔

"اے اللہ تونے مجھ سے وعدہ کیا ہے اسکو پورا فرما۔
اے اللہ مسلمانوں کی یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہوگئی تو پھر زمین پر
تیری پرستش نہ ہوگی"

دیر تک آپؐ یہی دُعا فرماتے رہے۔ بخاری کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ نے آپؐ کا ہاتھ تھام لیا اور عرض کیا

یا رسول اللہ بس کافی ہے آپؐ نے اپنے پروردگار کے حضور
بہت آہ وزاری کی وہ اپنے وعدہ کو ضرور پورا کرے گا۔

جب آپ چھپر سے باہر تشریف لائے زبان مبارک پر یہ آیت تھی۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ الایہ (القمر ۴۵)

عنقریب کافروں کی یہ جماعت شکست کھائیگی اور پشت پھیر کر
بھاگ جائے گی۔

مؤرخ ابن اسحٰق کی روایت ہے کہ دُعا مانگتے مانگتے آپؐ پر نیند کی کیفیت طاری ہوگئی تھی تھوڑی دیر بعد آپ بیدار ہوئے اور سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ سے مخاطب ہوکر ارشاد فرمایا:۔

اے ابوبکر رضؓ تم کو بشارت ہو تمہارے پاس اللہ کی مدد آگئی ہے۔
یہ جبرئیل امین اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے کھڑے ہیں چہرے پر گرد وغبار
کے آثار ہیں۔ (بخاری باب بدر)

اس لڑائی میں اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کی مدد وتقویت کے لئے
ایک ہزار پھر تین ہزار اور بعد میں پانچ ہزار فرشتے آسمان سے اتارے تھے۔
یہ فرشتے اکثر انسانوں کی صورت میں تھے۔ حضرت ابو اُسید ساعدی رضؓ جو شریک جنگ

تھے فرماتے ہیں کہ بدر کے معرکہ میں فرشتے زرد رنگ کے عماموں میں تھے شملے مونڈھوں کے درمیان چھوڑے ہوئے تھے انھیں اللہ کا یہ حکم تھا کہ کافروں کی گردنوں پر ضرب لگائیں اور ہر ہر جوڑ پر ماریں، حضرت ربیع بن انس رض کا بیان ہے کہ فرشتوں کے مارے ہوئے کافر صحابہؓ کے مارے ہوئے کافروں سے علیحدہ واضح طور پر پہنچانے جاتے تھے۔ اِن کی گردنوں اور جوڑوں پر آگ سے داغ دیئے جیسے سیاہ نشان تھے۔

(فتح الباری باب بدر)

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ ایک انصاری صحابی ایک کافر کے پیچھے دوڑے اوپر سے ایک کوڑے اور سوار کی آواز سنائی دی کہ اے حیزُوم (حضرت جبرئیل امین کے گھوڑے کا نام) آگے بڑھ! تھوڑی ہی دیر نہ گزری تھی کہ وہ انصاری صحابی دیکھتے کیا ہیں کہ وہ کافر زمین پر چت پڑا ہے اور اُسکی ناک اور چہرہ کوڑے کی ضرب سے پھٹ کر نیلا ہو گیا ہے۔ انصاری صحابی رض نے یہ تمام واقعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا تو نے سچ کہا یہ تیسرے آسمان کی مدد تھی۔ (فتح الباری ج، ص۲۴۲)

حضرت سہیل بن حنیف رض کا بیان ہے کہ بدر کے دن ہم نے یہ دیکھا کہ ہم میں کوئی شخص جب کسی مشرک کی طرف اشارہ کرتا ہے تو قبل اسکے کہ تلوار اُس تک پہنچے اس کا سر کٹ کر زمین پر گر جاتا تھا۔

(زرقانی ج ۲ ص۴۲۷)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میدان بدر میں جہاد وقتال کی مسلسل ترغیب دیتے رہے۔ ایک موقعہ پر فرمایا اس ذات پاک کی قسم ہے جسکے دست قدرت میں محمدؐ کی جان ہے آج جو شخص صبر وتحمل اخلاص وصدق نیت کے ساتھ اللہ کے دشمنوں سے سینہ سپر ہو جائے اور پھر اللہ کی راہ میں مارا جائے اللہ تعالیٰ اسکو ضرور جنت میں داخل فرمائیگا۔

حضرت عُمیر بن حمام رض کے ہاتھ میں اس وقت چند کھجور تھے

جنکو بھوک کی شدت کی وجہ سے کھا رہے تھے یکایک جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ کلمات اِن کے کانوں سے ٹکرائے تو بول اُٹھے :۔

اُوہ اُوہ میرے اور جنت کے درمیان فاصلہ ہی کیا رہ گیا ہے کھجوریں ہاتھ سے پھینک دیں اور تلوار سنبھال کر جہاد شروع کر دیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۶)

حضرت عوف بن حارث رضؓ نے میدان جنگ میں عرض کیا :۔

یا رسول اللہ رب العالمین کو بندے کی کیا چیز ہنساتی ہے (یعنی خوش کرتی ہے)

آپؐ نے ارشاد فرمایا بندے کا بے خوف ہو کر دشمن کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لینا۔

حضرت عوف رضؓ نے سنتے ہی جسم کی زرہ (آہنی لباس) اتار پھینکی اور تلوار لیکر قتال شروع کر دیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ و برکاتہٗ۔

نوٹ : حضرت عوف بن حارث رضؓ کی ماں کا نام سیدہ عفرا رضؓ ہے۔ ان کے یہ تینوں بیٹے حضرت عوف رضؓ اور حضرت معاذ رضؓ اور حضرت معوذ رضؓ پہلے شوہر کے ہیں۔ اِن کے علاوہ دوسرے شوہر سے چار لڑکے پیدا ہوئے جن کے نام حضرت ایاس رضؓ، حضرت عاقل رضؓ، حضرت خالد رضؓ، حضرت عامر رضؓ ہیں۔ صحابیات میں سیدہ عفرا رضؓ وہ واحد خاتون ہیں جنکے ساتوں بیٹے جنگ بدر میں شریک ہوئے ہیں۔ (زرقانی ج ۱ ص ۲۱۶)

لڑائی کی ابتدا ہی میں مشرکین کے تین بڑے سردار عتبہ، شیبہ، ولید مارے گئے۔ اس صورتِ حال سے مشرکوں کی صف میں عام بے چینی اور خوف و ہراس پھیل گیا۔ ابوجہل نے لوگوں کو یہ کہہ کر ہمت دلائی اور جنگ پر آمادہ کیا کہ اِن تینوں سرداروں نے عجلت سے کام لیا اور حزم و احتیاط اختیار نہیں کیا تھا۔ قسم ہے لات و عزیٰ (عرب کے مشہور بُت) کی ہم اس وقت تک ہرگز واپس نہیں ہوں گے جب تک

ہم مسلمانوں کو رسیوں میں باندھ نہ لیں گے۔

اسکے بعد ابوجہل نے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا مانگی، اے اللہ ہم میں سے جو رشتہ داری وتعلقات کا قطع کرنے والا ہے اسکو ہلاک فرما اور ہم میں جو تیرے پاس سب سے زیادہ محبوب وپسندیدہ ہے اسکو آج فتح ونصرت عطا کر۔

حضرت ابن عباس رضؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوجہل کی دعا کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور عرض کیا: یا اللہ اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو پھر زمین پر تیری پرستش نہ ہوگی۔

اس کے بعد گھسان کی لڑائی شروع ہوگئی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم چھپّر سے باہر تشریف لائے اور صحابہ کو یہ بشارت دی کہ جو کوئی اس لڑائی میں مارا جائے اللہ اسکو جنت میں داخل کرے گا۔

بعد ازاں آپ نے جبرئیل امین کے اشارے سے ایک مشتِ خاک لیکر مشرکین کی طرف پھینک دی اور صحابہ کو حکم دیا کہ کافروں پر ٹوٹ پڑو۔ مشرکین میں سے کوئی بھی ایسا نہ رہا جس کی آنکھ اور ناک اور منھ میں یہ خاک نہ پہنچی ہو۔

مشہور محدث ابن شہاب زہری اور عروہ بن زبیر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس مشتِ خاک کی عجب شان بنائی ہر کافر حیران وپریشان تھا کہ کہاں اور کدھر جائے؟ بڑے بڑے سرداروں کے پیر اُکھڑ گئے۔ مسلمان اللہ کے دشمنوں کو قتل کرنے اور گرفتار کرنے میں مشغول ہوگئے۔

اُمیہ بن خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید ترین دشمنوں میں ایک تھا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جبکہ جنگ بدر کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ حضرت سعد بن معاذ رضؓ کی زبانی مکہ ہی میں اُمیہ نے یہ سُن لیا تھا کہ اصحاب محمدؐ کے ہاتھوں تو مارا جائے گا اس لئے وہ جنگ میں شریک ہونے سے جان چراتا تھا لیکن ابوجہل کے عار دلانے پر آمادہ ہوگیا اور اپنی بیوی

ام صفوان سے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ ام صفوان نے کہا کیا تم کو اپنے یثربی بھائی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا قول یاد نہیں کہ تم اُن کے ہاتھوں مارے جاؤ گے؟ امیہ نے کہا نہیں خوب یاد ہے لیکن میں تھوڑی دور تک ساتھ دے کر واپس لوٹ جاؤں گا تاکہ بزدلی کا طعنہ نہ سن سکوں۔ لیکن اللہ کے ہاں اُسکے قتل کا فیصلہ تو ہو چکا تھا رواں دواں میدان بدر تک پہنچ گیا۔ بدر کے میدان میں حضرت بلال حبشی رضؓ نے اُمیہ کو دیکھا تو انصار کو للکارا (یہ وہی اُمیہ تھا جو مکہ میں حضرت بلال رضؓ کو گرم گرم ریت پر لٹا کر تکلیفیں دیا کرتا تھا تاکہ یہ اسلام کو چھوڑ دیں) انصار نے جب حضرت بلالؓ کی آواز سنی تو دوڑ پڑے اور اُمیہ پر حملہ کر دیا۔ اور آناً فاناً اُس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ لعنۃ اللہ علیہ۔

ابوجہل کا قتل

حضرت عبد الرحمن بن عوف رضؓ بیان کرتے ہیں کہ میں بدر کے دن صف میں کھڑا تھا اچانک نظر پڑی تو دیکھتا ہوں کہ میرے دائیں بائیں جانب دو کم عمر انصاری لڑکے ہیں۔ مجھے یہ وسوسہ آیا کہ کیوں نہ میری پشت پر کوئی طاقتور نوجوان ہوتے تاکہ وقت پر مدد کر سکیں۔

میں اسی خیال میں تھا کہ ایک لڑکے نے آہستہ سے کہا چچا جان مجھکو ابوجہل کی نشان دہی کیجئے کہ وہ کون ہے؟ میں نے کہا صاحبزادے ابوجہل کو دیکھ کر کیا کرو گے؟ اُس لڑکے نے کہا میں نے اللہ سے عہد کیا ہے کہ اگر ابوجہل کو دیکھ پاؤں تو اسکو قتل کر ڈالوں یا خود مارا جاؤں۔ یہ اس لئے کہ مجھے معلوم ہوا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں سخت ترین گستاخیاں کیا کرتا ہے۔ اگر میں اُسے دیکھ لوں تو واللہ میرا سایہ اُس کے سایہ سے جُدا نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ ہم میں جسکی موت پہلے مقدر ہو چکی ہے مر نہ جائے۔ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضؓ کہتے ہیں کہ ان بچوں کی یہ گفتگو سن کر میرا وہ وسوسہ دور ہو گیا کہ اے کاش میری پشت پر کوئی بڑی طاقت ہوتی۔

الغرض میں نے اُن دونوں بچوں کو اشارہ سے بتایا کہ ابوجہل وہ کھڑا ہے۔ بس یہ سنتے ہی دونوں شکرے اور باز کی طرح ابوجہل کی طرف

دوڑ پڑے اور ایسی بے جگری سے اُسپر وار کردیا کہ وہ سنبھل بھی نہ سکا اور دیکھتے دیکھتے ہی زمین پر ڈھیر ہوگیا۔

صحیح بخاری کی روایت جو غزوۂ بدر کے بیان میں مذکور ہے یہی بتاتی ہے کہ یہ دونوں لڑکے معاذ رضؓ اور معوذ رضؓ (سیدہ عفراء رضؓ) کے صاحبزادے تھے۔

ابوجہل کا بیٹا عکرمہ (جو فتح مکہ کے دن مسلمان ہوگئے) نے اپنے باپ کی حمایت میں حضرت معاذ رضؓ کے شانے پر اس زور سے تلوار ماری کہ ہاتھ کٹ گیا لیکن کاندھے سے لٹک گیا۔ حضرت معاذ رضؓ شام تک اسی حالت میں لڑتے رہے۔ جب ہاتھ کے مسلسل لٹکتے رہنے سے تکلیف بڑھ گئی تو ہاتھ کو اپنے قدم کے نیچے دباکر اتنی زور سے کھینچا کہ وہ کاندھے سے علیٰحدہ ہوگیا۔ اپنا ہاتھ پھینک کر دوسرے ہاتھ سے جنگ کرتے رہے یہاں تک کہ مسلمانوں کو فتح حاصل ہوگئی۔

حضرت معاذ رضؓ سیدنا عثمان غنی رضؓ کی خلافت تک زندہ رہے لیکن ان کے بھائی حضرت معوذ رضؓ نے اسی جنگ بدر میں جام شہادت نوش کیا۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن فرمایا تھا کہ کوئی ابوجہل کی خبر لائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ نے جاکر نعشوں میں تلاش کیا دیکھا کہ ابھی اسمیں ذراسی جان باقی ہے فوراً اسکے سینے پر چڑھکر بیٹھ گئے۔ ابوجہل نے آنکھیں کھولیں اور کہا، اے بکریوں کے چرانے والے آج تو بہت بلند مقام پر چڑھ بیٹھا ہے۔ میں نے کہا:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ مَکَّنَنِیْ مِنْ ذٰلِکَ۔

اُس ذات پاک کی حمد ہے جس نے مجھے یہ قدرت دی۔

اسکے بعد فرمایا:۔

اَخْزَاکَ اللّٰہُ یَا عَدُوَّ اللّٰہِ۔

اے اللہ کے دشمن آج تجھکو اللہ نے رسوا کردیا ہے۔

ابوجہل نے پوچھا تیرا کیا ارادہ ہے؟ حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ نے

فرمایا تیرا سر کاٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرنا ہے۔
اس پر ابوجہل کہنے لگا اچھا تو اُن کو میرا یہ پیام بھی پہنچا دینا کہ میرے دل میں بہ نسبت گزشتہ دنوں کے آج کے دن تمہاری عداوت اور بغض کہیں زیادہ ہے۔
حضرت ابن مسعود رضؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اس خبیث کا سر قلم کر دیا اور اسکو گھسیٹتا ہوا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! یہ اللہ کے دشمن ابوجہل کا سر ہے اور اُس کا پیام بھی نقل کر دیا۔ آپؐ نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور فرمایا یہ میرا اور میری امت کا فرعون تھا جس کا شر فرعونِ موسیٰ (علیہ السّلام) کے شر سے کہیں بڑا تھا۔
بعد ازاں آپؐ نے ابوجہل کی تلوار حضرت ابن مسعود رضؓ کو عطا فرما دی۔

(شرح سیر الکبیر سرخسی رحؒ)

اسی جنگ بدر میں حضرت عُکاشہ بن محصن رضؓ کی تلوار لڑتے لڑتے ٹوٹ گئی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی ایک ٹہنی ان کے ہاتھ مرحمت فرمائی جو عُکاشہ رضؓ کے ہاتھ میں آتے ہی آہنی تلوار بن گئی اسی سے قتال کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میدانِ بدر فتح فرما دیا۔ اس تلوار کا نام عَوْن تھا۔ حضرت عُکاشہ رضؓ اس تلوار کو ہر غزوہ میں استعمال کرتے اور اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت پایا کرتے تھے۔ عہد صدیقی میں شہادت پائی۔

(طبقات ابن سعد ج ۳ ص۶۴)

مشہور مشرک سردار عبیدہ بن سعید بن العاص بدر کے دن سر تا قدم آہنی لباس تھا۔ سوائے آنکھوں کے بدن کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا تھا۔ سیدنا زبیر رضؓ نے تاک کر اسکی آنکھ پر ایسا نیزہ مارا کہ آر پار ہوگیا اور وہ کافر اُسی وقت ڈھیر ہوگیا۔ حضرت زبیر رضؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اُسکے سر پر پیر رکھ کر پوری قوت کے ساتھ نیزہ کھینچا تب کہیں نیزہ باہر آیا لیکن اس کے کنارے ٹیڑھے ہوگئے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور یادگار اس نیزہ کو حضرت زبیر رضؓ سے مانگ لیا تھا۔ آپؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضؓ کے پاس رہا۔ پھر حضرت عمر رضؓ اور عثمان رضؓ و علی رضؓ کے ہاں رہا۔ حضرت علی رضؓ کی وفات کے بعد

حضرت زبیرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے ہاں آگیا۔

الغرض لڑائی گھمسان کی ہوتی رہی صبح سے شام تک میدان کارزار گرم رہا سرشام مسلمانوں کو فتح مبین حاصل ہوئی۔ قریش کے ستر آدمی مارے گئے جن میں اُن کے نامی گرامی سردار شامل تھے اور ستر آدمی گرفتار ہوئے جن کے ہاتھ شانوں سے باندھ دیئے گئے۔ مشرکین کی نعشوں کو بدر کے ایک کنویں میں ڈال دیا گیا۔ علامہ ابن حجرؒ کی تحقیق یہ ہے کہ بدر کے کنویں میں صرف چوبیس سردار ڈالے گئے باقی نعشوں کو کسی اور جگہ پھینک دیا گیا۔

(فتح الباری ج ۷، ص ۲۳۴)

تیسرے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر سے کوچ کرنے کا حکم دیا سب روانہ ہوئے اچانک کنویں پر کھڑے ہوئے اور نام بنام فلاں بن فلاں کہہ کر پکارا اور یہ فرمایا :۔

تم کو یہ اچھا نہ معلوم ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ؟ جس بات کا ہمارے رب نے ہم سے وعدہ کیا تھا ہم نے اُسکو حق پایا کیا تم نے بھی اپنے رب کا وعدہ حق پایا ؟ (بخاری)

ابن اسحاق کی روایت میں مزید یہ اضافہ ہے :۔

اے گڑھے والو تم اپنے نبی کے حق میں بہت بُرا قبیلہ تھے تم نے مجھ کو جھٹلایا اور لوگوں نے میری تصدیق کی، تم نے مجھکو نکالا اور لوگوں نے ٹھکانہ دیا، تم نے مجھ سے قتال کیا اور لوگوں نے میری مدد کی۔ امین (امانت دار) کو تم نے خائن بتلایا اور صادق کو کاذب کہا، اللہ تم کو بُری جزا دے۔

بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ ان بے جان نعشوں سے کلام فرماتے ہیں۔؟

آپ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اُس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میرے کلام کو تم اِن سے زیادہ نہیں سنتے مگر وہ جواب نہیں دے سکتے۔ (زرقانی ج ۱ ص ۴۴۳)

غزوۂ بدر کا یہ تذکرہ قرآن حکیم کی مختلف آیات میں موجود ہے جس کا ترجمہ و مطلب اختصار

کے ساتھ درج کیا جا رہا ہے۔

قرآنی مضمون

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ .الخ

(انفال آیت ۵ تا ۱۹)

جیسا کہ آپؐ کے پروردگار نے آپؐ کو حکمت کے ساتھ آپ کے گھر سے باہر نکالا (معرکۂ بدر کے لئے) اور اہل ایمان کی ایک جماعت اس کو گراں (بھاری) سمجھ رہی تھی۔

وہ آپؐ سے اس حقیقت کے بارے میں اُلجھ رہے تھے جبکہ اِسکا ظہور ہو چکا تھا گویا وہ موت کی جانب ہنکائے جا رہے ہوں اور وہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔

اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا دو جماعتوں میں سے ایک کے لئے کہ وہ تمہارے ہاتھ آجائے گی۔ (یعنی وہ جماعت مغلوب ہو جائے گی اور تم اُسپر غالب آجاؤ گے) اور تم یہ چاہ رہے تھے کہ غیر مسلح جماعت تمہارے ہاتھ آجائے مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے، تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

اور اُس وقت کو یاد کرو جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے پھر اُس نے تمہاری سن لی اور فرمایا کہ میں ایک ہزار فرشتوں کے بعد دیگرے آنے والوں سے تمہاری امداد کروں گا۔

اور اللہ نے یہ اس لئے کیا کہ تمہیں خوشخبری ہو اور تاکہ تمہارے دلوں کو اطمینان ہو جائے ورنہ مدد تو جب بھی ہوتی ہے اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ یقیناً اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

اور وہ وقت بھی یاد کرو جب اللہ نے اپنی طرف سے چین

وسکون دینے کے لئے تم پر غنودگی طاری کر دی تھی اور آسمان سے تم پہ پانی اُتار رہا تھا کہ اسکے ذریعہ تمہیں پاک کر دے اور تم سے شیطانی وسوسہ کو دفع کر دے اور تاکہ مضبوط کر دے تمہارے دلوں کو اور اس کے باعث تمہارے قدم جما دے۔

اور اُس وقت کو یاد کرو جب آپ کا پروردگار وحی کر رہا تھا فرشتوں کی جانب کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم ایمان والوں کے قدم ثابت رکھو میں ابھی اِن کافروں کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں پس تم اُن کافروں کی گردن کے اوپر مارو اور اُن کے جوڑ جوڑ پر ضرب لگاؤ۔

یہ اس لئے کہ اُن کافروں نے اللہ اور اُسکے رسول کا مقابلہ کیا ہے اور جو اللہ اور اسکے رسول کا مقابلہ کرے تو اللہ سزا دینے میں سخت ہے۔

یہ ہے تم لوگوں کی سزا اب اس کا مزہ چکھو اور جان لو کہ کافروں کے لئے جہنم کا عذاب ہے۔

اے ایمان والو جب تم ایک لشکر کی صورت میں کفار سے دوچار ہو جاؤ تو ان کے مقابلہ میں پیٹھ نہ پھیرو، جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیر دی اِلّا یہ کہ جنگی چال کے طور پر ایسا کرے یا اپنی جماعت کی طرف پناہ لے رہا ہو، (تو اسکو اجازت ہے) ورنہ وہ اللہ کے غضب میں آجائے گا اور اُس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت ہی بُری جگہ ہے۔

سو حقیقت یہ ہے کہ تم نے اُن کافروں کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انھیں قتل کیا اور آپ نے اُن پر جب مُشتِ خاک پھینکی تو آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی تاکہ ایمان والوں کی اپنی طرف سے خوب اچھی طرح آزمائش کرے۔ بیشک اللہ خوب سننے والا ہے خوب جاننے والا ہے۔

یہ تو ہو چکا اور بیشک اللہ کمزور کر کے رہے گا کافروں کے داؤ پیچ کو۔ (روایتوں میں آتا ہے کہ جب مشرکین مکہ کا لشکر بدر کے لئے روانہ ہو رہا تھا تو سردار قریش ابوجہل نے غلافِ کعبہ پکڑ کر دُعا کی تھی کہ اے اللہ کامیابی اُس لشکر کو عطا کر جو حق پر ہے۔ اسی کا جواب اس آیت میں ہے)

اگر تم لوگ فیصلہ چاہتے ہو تو وہ فیصلہ تو تمہارے سامنے آموجود ہوا۔ اور اگر باز آباؤ تو یہ تمہارے لئے نہایت خوب ہے۔ اور اگر تم پھر (وہی) کام کروگے تو ہم بھی پھر (وہی کام) کریں گے۔ اور تمہاری جمعیت تمہارے ذرا بھی کام نہ آوے گی گو کتنی ہی زیادہ ہو۔ اور واقعی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (اصل میں) ایمان والوں کے ساتھ ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ الخ

(انفال آیت ۴۱ تا ۴۵)

اور (اس بات کو) جان لو کہ جو شے (کفار سے) بطور غنیمت تم کو حاصل ہو تو (اس کا حکم یہ ہے کہ) کل کا پانچواں حصہ اللہ کا اور اسکے رسول کا ہے اور (ایک حصہ) آپ کے قرابت داروں کا ہے اور (ایک حصہ) یتیموں کا ہے۔ اور (ایک حصہ) مسافروں کا ہے۔ اگر تم اللہ پر اور اس چیز پر ایمان رکھتے ہو جسے ہم نے اپنے بندے (محمدؐ) پر نازل کیا تھا فیصلہ کے دن (معرکہ بدر کے دن) جس دن کے دونوں جماعتیں (مسلمانوں اور مشرکوں کی) مقابل ہوئیں اور اللہ ہر شئی پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب تم میدان جنگ کے نزدیک والے کنارے پر تھے اور وہ کافر دور والے کنارے پر اور تجارتی قافلہ (قافلہ ابوسفیان) تم سے نیچے کی جانب کو تھا (یعنی وہ تجارتی قافلہ جسکے تعاقب میں تم آرہے تھے وہ تم سے بچتا ہوا سمندر کے کنارے کنارے چلا جارہا تھا) اور اگر تم اور وہ کوئی وقت مقرر کر لیتے (یعنی فریقین اپنے قصد وارادے سے کوئی میدان اور تاریخ مقرر کر لیتے) تو ضرور اس تقرر میں اختلاف ہو جاتا۔ لیکن جو بات ہونی تھی اللہ اسکو پورا کر دیتا ہے تاکہ جسے برباد و ہلاک ہونا ہو وہ دلیل و نشان سے ہلاک ہو اور جس کو زندہ رہنا ہو وہ بھی دلیل ونشان سے زندہ رہے اور بیشک اللہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔ (مطلب یہ ہوا کہ حکمت الٰہی کو یہ جنگ اس لئے منظور ہوگئی کہ اس سے ایک خاص حکمت کے تحت اسلام کا حق ہونا ظاہر ہو جائے اور دنیا دیکھ لے کہ قلتِ عدد اور بے سروسامانی کے باوجود مسلمان غالب آئے یہ نشان و دلیل یقین پیدا

کرنے کے لئے کافی تھی کہ اسلام حق ہے)

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب اللہ نے آپؐ کے خواب میں آپکو وہ کافر لوگ کم دکھلائے (یعنی آپؐ نے اپنا وہ خواب صحابہ سے بیان کیا جس سے اُن کے دل توی ہوگئے) اور اگر اللہ اُنھیں آپؐ کو زیادہ دکھا دیتا تو تم لوگ ہمت ہار جاتے اور آپس میں جھگڑنے لگتے۔ اس باب میں (یعنی ایسی بے سروسامانی کی حالت میں جنگ بھی کی جائے یا نہیں ؟) لیکن اللہ نے تم کو اختلاف سے بچالیا۔ بے شک وہ دلوں کی باتوں کو خوب جانتا ہے۔ اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جبکہ اُس نے اُن کافروں کو تمہاری نظروں میں کم کرکے دکھلایا اور اُن کی نگاہوں میں تمہیں کم کرکے تاکہ اللہ اُس امر کو پورا کردے جو ہوکر رہنا تھا اور اللہ ہی کی طرف سارے امر رجوع ہوتے ہیں۔

اے ایمان والو جب تم کسی جماعت (کافرہ) کے مقابل ہوا کرو تو ثابت قدم رہا کرو ———— اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہا کرو تاکہ فلاح پاؤ۔

اور اللہ اور اُسکے رسول کی اطاعت کرو اور آپسمیں جھگڑا نہ کرو ورنہ کم ہمت ہوجاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی اور صبر کرتے رہو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اور اُن لوگوں جیسے نہ بنو جو اپنے گھروں سے نکلے تو اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھلانے کے لئے اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے، اور اللہ اُنکے اعمال کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب شیطان نے کافروں کو اُنکے اعمال خوشنما کر دکھائے (یعنی جو رسول اور اسلام کی مخالفت میں وہ کررہے تھے) اور کہا کہ لوگوں میں سے آج کوئی تم پر (یعنی کافروں پر) غالب آنیوالا نہیں اور میں تمہارا پشت پناہ ہوں۔ پھر جب دونوں لشکر (مسلمانوں کے اور مشرکین کے میدان بدر میں) آمنے سامنے ہوئے تو وہ اُلٹے پاؤں بھاگا اور کہنے لگا میں تم سے بری الذمہ ہوں میں وہ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے۔

یعنی فرشتوں کے لشکروں کو جو مسلمانوں کی مدد کے لئے آسمان سے اتر رہے تھے) میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ شدید سزا دینے میں (کہیں کسی فرشتے سے دنیا ہی میں میری خبر نہ لے لے) اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب (مسلمانوں کا بے سروسامانی کے ساتھ مشرکین کے مقابلہ میں بے تکلف آجانا دیکھ کر) یوں کہتے تھے کہ ان مسلمان لوگوں کو ان کے دین نے دھوکہ میں ڈال رکھا ہے جو وہ ایسے خطرے میں آ پڑے اللہ تعالیٰ جواب دیتے ہیں) اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرتا ہے سو اللہ بڑا زبردست ہے بڑا حکمت والا ہے۔

اور کاش آپ دیکھیں جب فرشتے اُن کافروں کی جان قبض کرتے جاتے ہوں اُن کے منہ پر اُن کی پشتوں پر مارتے جاتے ہوں اور یہ کہتے جاتے ہوں کہ اب آگ کی سزا کا مزہ چکھو۔ یہ عذاب اُس کے پاداش میں ہے جو کچھ تمہارے ہاتھوں نے سمیٹا ہے اور اللہ ہرگز ظالم نہیں ہے بندوں کے حق میں۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔الخ (آل عمران آیات ۱۲۳ تا ۱۲۹)

اور یقیناً اللہ نے تمہاری نصرت کی بدر میں حالانکہ تم بہت کمزور حالت میں تھے پس اللہ سے ڈرتے رہو عجب کیا کہ تم شکر گزار بن جاؤ۔

(میدان بدر میں یہ خبر اڑ گئی تھی کہ دشمن کو زبردست کمک پہنچ گئی ہے تو آپ ﷺ اہل ایمان کو تسلی دے رہے تھے) وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب آپ ﷺ مومنین سے کہہ رہے تھے کہ کیا یہ بات تمہارے لئے کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار تمہاری مدد تین ہزار نازل شدہ فرشتوں سے کرے؟ کیوں نہیں، بشرطیکہ تم نے صبر و تقویٰ قائم رکھا (میدان جنگ میں اور اطاعت رسول سے منہ نہ موڑا) اگر وہ کافر تم پر فوراً آپڑیں تو اسی آن تمہارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں سے مدد کرے گا۔

یہ بات اللہ نے تمہیں اس لئے بتادی کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہارے

دل مطمئن ہو جائیں ورنہ مدد و نصرت تو صرف زبردست حکمت والے اللہ ہی کی طرف سے ہے (اور یہ نصرت تو اسی غرض سے تھی) تاکہ کفر کرنے والوں میں سے ایک جماعت کو ہلاک کردے یا انہیں ذلیل و رسوا کردے کہ وہ ناکام ہو کر واپس آجائے۔

اے نبی آپ کو اس امر میں کوئی دخل نہیں کہ اللہ خواہ ان کی توبہ قبول کرے خواہ انہیں عذاب دے اس لئے کہ وہ ظالم ہیں اور اللہ ہی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ بڑا مغفرت کرنے والا اور بڑا رحمت والا ہے۔

بدر سے کامیاب واپسی

بدر کے میدان میں تین دن قیام فرما کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اس سے پہلے حضرت زید بن حارثہ رض کو مدینہ منورہ روانہ فرما دیا تھا تاکہ معرکۂ بدر کی خوشخبری مسلمانوں کو سنائی جائے۔ زید بن حارثہ رض کے صاحبزادے اُسامہ رض بن زید فرماتے ہیں کہ ہمارے والد بزرگوار نے یہ خوشخبری ہم کو ایسے وقت پہنچائی جس وقت کہ ہم لوگ رسول اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی سیدہ رقیہ رض (زوجۂ محترمہ حضرت عثمان غنی رض) کی تدفین کر رہے تھے۔ بدر میں جو مال غنیمت ہاتھ آیا تھا اُسکو آپ نے درمیانی راہ مقام صفراء میں تقسیم فرما دیا۔ ابتداءً مال غنیمت کی تقسیم میں بعض صحابہ مختلف رائے ہو گئے۔ نوجوان صحابہ کہتے تھے کہ مالِ غنیمت ہمارا حصہ ہے کیونکہ ہم نے کافروں کو قتل کیا ہے۔ بوڑھے چونکہ صرف ہماری پشت پر رہے قتل و قتال میں زیادہ حصہ نہیں لیا اس لئے انھیں حق نہیں پہنچتا۔

بوڑھے صحابہ کہتے تھے کہ ہم کو بھی مالِ غنیمت میں پورا شریک کیا جائے اس لئے کہ فتح و کامیابی ہماری پشت پناہی کے باعث ہوئی ہے۔

ایک اور جماعت جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہی تھی وہ اپنے کو اس مال کا زیادہ مستحق سمجھتی تھی۔

اس موقعہ پر قرآن حکیم کی یہ آیت نازل ہوئی اور اہل ایمان کو متنبہ کیا گیا۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ الخ

(انفال آیت ۱)

اے نبی آپ سے مال غنیمت کا حکم دریافت کرتے ہیں۔
آپ کہہ دیجئے کہ مال غنیمت اللہ کا ہے اور اسکے رسول کا ہے (یعنی مال غنیمت کے مالک حقیقی اللہ تعالیٰ اور ان کے نائب اللہ کے رسول ہیں جس طرح مناسب سمجھیں تقسیم کر دیں۔)

ان آیات میں یہ حقیقت ظاہر کر دی گئی ہے کہ فتح اور کامیابی صرف اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے حاصل ہوتی ہے۔ کسی کا سہارا اور زور اللہ تعالیٰ ہی کی تائید و توفیق کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا مال غنیمت کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو حکم دیں اُسی کے موافق غنیمت کی تقسیم عمل میں آئے گی۔

ایمان کا تقاضہ یہی ہے کہ ہر معاملہ میں اللہ تعالےٰ سے ڈریں اور آپس میں خلوص و محبت کا معاملہ رکھیں، اپنے جذبات و خواہشات کو اللہ اور اسکے رسول کی مرضیات کے تابع رکھیں۔

ایمان کی علامت تو یہی ہے کہ جب کسی معاملہ میں اللہ اور اُسکے رسول کا نام آجائے تو خوف و ہیبت سے دل کانپ اُٹھیں، احکام الٰہی سنکر ان کا ایمان و یقین اور زیادہ مضبوط ہو جائے۔ اس قدر قوی اور مضبوط ہو جائے کہ ہر معاملہ میں اُن کا اصلی بھروسہ اور اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی پر باقی نہ رہے۔

نزول آیات کے بعد اُن صحابہ کرام نے جو مال غنیمت کو اپنا حق سمجھ رہے تھے اللہ اور اُسکے رسول کے حوالے کر دیا اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم پر راضی ہو گئے۔

علاوہ ازیں مال غنیمت میں اُن آٹھ صحابہ رض کو بھی حصہ دیا گیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یا اجازت سے بدر میں حاضر نہیں ہوئے تھے۔ (ابن الاثیر ج ۲ ص ۲۱)

اسیرانِ بدر کا انجام

مقام صفراء میں مالِ غنیمت کی تقسیم کے بعد روانگی سے قبل قیدیوں میں سے ایک کو قتل کر دینے کا حکم جاری فرمایا۔ اس کا نام حارث بن نضر تھا۔ اسکو سیدنا علی رض نے قتل

کر دیا۔ آگے چل کر مقام عرق الظبیہ میں عقبہ بن ابی معیط کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔ اسکو سیدنا عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ نے قتل کر دیا۔ بقیہ قیدیوں کو جنکی تعداد ستر بیان کی جاتی ہے، مدینہ منورہ لایا گیا۔

نضر اور عقبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید ترین دشمنوں میں سے تھے۔ نہایت بدزبان، بدتمیز آدمی تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑانا، ایذا دینا ان کا محبوب مشغلہ تھا، یہی وہ عقبہ تھا جس نے حرم کعبہ میں جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا فرما رہے تھے آپ کی پشت پر اونٹ کی غلاظت کا بوجھ رکھ دیا تھا اور آپ کا گلہ گھونٹا تھا اور ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر تھوک بھی دیا تھا۔ خذلہ اللہ فی الدنیا والاخرۃ۔

(الخصائص الکبریٰ ج ۱ ص)

الغرض آپ منزل بمنزل ٹھیرتے ہوئے اور قیدیوں کا قافلہ ہمراہ لئے مدینہ منورہ پہنچے۔ مدینہ منورہ پہنچکر آپ نے جملہ قیدیوں کو صحابہ کرام میں تقسیم فرما دیا اور یہ ارشاد فرمایا:-

اِسْتَوْصُوْا بِالْاُسَارٰی خَیْرًا۔ (رواہ الطبرانی)

قیدیوں کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرو۔

چنانچہ صحابہ کرام کا یہ حال تھا کہ وہ پہلے قیدیوں کو کھانا کھلاتے اور بعد میں خود کھاتے۔ اگر نہ بچتا تو خود کھجور پر اکتفا کر لیتے۔

چند روز بعد آپ نے اکابرین صحابہ سے قیدیوں کے بارے میں مشورہ کیا کہ ان کا انجام کیا ہونا چاہیئے؟

سیدنا عمر الفاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ مناسب یہی ہے کہ ان سب کی گردن ماردی جائے۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو پسند نہ فرمایا اور ارشاد فرمایا

یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَمْکَنَکُمْ وَاِنَّمَا هُمْ اِخْوَانُکُمْ بِالْاَمْسِ۔

اے لوگو اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر پوری قدرت دی ہے اور کل تک یہ تمہارے بھائی تھے۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ میری رائے یہ ہے کہ ان سے فدیہ (جرمانہ) لے لیا جائے اور پھر انھیں آزاد کر دیا جائے۔ یہ لوگ آپ ہی کی قوم سے ہیں کیا عجب ہے کہ اللہ انھیں اسلام لانے کی توفیق دے دے۔

حضرت سعد بن معاذ رضؓ کی رائے بھی یہی تھی کہ قیدیوں کو قتل کر دیا جائے۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ رضؓ اگرچہ فدیہ لینے کے مخالف تھے مگر ان کا خیال یہ تھا کہ ان سب کو آگ میں جلا دیا جائے تاکہ حق کا غلبہ ہو اور کفر و شرک کے رہنما آنے والوں کے لئے عبرت بن جائیں۔

دیگر بعض صحابہ رضؓ نے فدیہ لینے پر زور دیا کیونکہ ان قیدیوں میں اکثر صاحب دولت و ثروت تھے اُس وقت مسلمانوں کو مال و دولت کی ضرورت بھی تھی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ کی رائے کو پسند فرمایا اور قیدیوں سے فدیہ لیکر چھوڑ دیئے جانے کا حکم فرمایا۔
(صحیح مسلم و مستدرک ج ۳ ص ۲۱)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ و حضرت عمر فاروق رضؓ کی رائے سنکر یہ ارشاد فرمایا: اے عمر رضؓ تمہاری مثال (سیدنا) نوح و (سیدنا) موسیٰ علیہما السلام کی سی ہے جنھوں نے اپنی اپنی قوم کے حق میں یہ دعا کی تھی:

سیدنا نوح علیہ السلام نے یہ دُعا کی تھی۔

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ (سورہ نوح آیت ۲۶، ۲۷)

اور نوحؑ نے کہا میرے رب ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ۔ اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور

ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا بدکار اور سخت کافر ہی ہوگا۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تھی :۔

رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ۔ (سورہ یونس آیت ۸۸)

اے رب ان کے مال غارت کردے اور ان کے دلوں پر ایسی مہر کردے کہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔

پھر اسکے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضہ سے فرمایا اے ابوبکر تمہاری مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سی ہے جنھوں نے اپنی قوم کے لئے یہ دعا کی تھی۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی :۔

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

(سورہ ابراہیم آیت ۳۶)

پس جس نے میری پیروی کی وہ مجھ سے وابستہ ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو اے رب آپ بڑے کثیر المغفرت اور کثیر الرحمت ہیں۔ (اور ان کو ایمان کی توفیق دے سکتے ہیں)

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن اپنی امت کے بارے میں اس طرح دعا فرمائیں گے۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (سورہ مائدہ آیت ۱۱۸)

اے رب اگر آپ انھیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں۔ (کہ آپ کو اختیار ہے) اور اگر آپ معاف کردیں تو آپ غالب اور حکمت والے ہیں (جس مجرم کو چاہیں معاف کردیں اور آپ کی معافی حکمت سے خالی نہیں)

الغرض آپ نے صدیق اکبر رضہ کی رائے کو پسند فرمایا ممکن ہے فدیہ کا مشورہ دینے والوں میں کچھ اور افراد بھی ہوں جو حضرت صدیق اکبر رضہ کی تائید کئے ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غریب مسلمانوں کی مالی منفعت کے پیش نظر بھی فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ دیا جانا مناسب خیال

فرمایا کہ شاید یہی لوگ آئندہ مسلمان ہوجائیں اور اسلام کے معین و مددگار بن جائیں۔ ایسا ہی خیال بعض اکابر صحابہ کا بھی تھا۔

لیکن منشار الٰہی میں کفر کی سرکوبی اور خون ریزی پسندیدہ تھی اور یہ سب قیدی ائمۃ الکفر تھے۔ ان کا قتل کرنا کفر و شرک کی بیخ کنی کے برابر تھا۔ ان کو چھوڑ دینے پر عتاب آمیز خطاب نازل ہوا۔

قرآنی مضمون

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ. لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ الخ (سورہ انفال آیت ۶۷، ۶۸، ۶۹)

(اے مسلمانو تم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ان قیدیوں سے کچھ لیکر چھوڑ دینے کا مشورہ دیا یہ بیجا تھا کیونکہ) نبی کی شان کے لائق نہیں کہ اُن کے قیدی باقی رہیں (بلکہ قتل کردیئے جائیں) جب تک کہ وہ زمین میں کفار کی خون ریزی نہ کرلیں (تاکہ کفر مغلوب ہوجائے اور اسلام غالب، پس ایسی نامناسب رائے تم نے کیوں دی) تم تو دنیا کا مال اسباب چاہتے ہو؟ اور اللہ تعالیٰ آخرت (کی مصلحت) چاہتے ہیں (کہ کفار مغلوب ہوجائیں اور اسلام کا نورِ ہدایت درانہ ہوجائے) اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست بڑی حکمت والے ہیں۔

اگر اللہ کا نوشتہ مقدر نہ ہوا ہوتا (وہ یہ کہ اِن قیدیوں میں سے کچھ لوگ مسلمان ہوجائیں گے جس سے فسادِ امکانی واقع نہ ہوگا یا خطائے اجتہادی پر مواخذہ نہیں ہوا کرتا) یا (مالِ غنیمت جو اس امت پر حلال ہونے والا تھا) تو جو امر تم نے اختیار کیا ہے اُسکے بارے میں تم پر کوئی بڑی سزا واقع ہوجاتی (چونکہ فساد نہ تھا اور تمہارا مشورہ درست نکل آیا اس لئے تم سزا سے بچ گئے۔ بندے لاکھ صالح و متقی سہی بہرحال ان کی نظر محدود ہی ہوگی، علیم و خبیر تو صرف اللہ ہی کی ذات ہے) (ہم نے اُس فدیہ کو جائز

کر دیا) لہذا جو کچھ تم نے اُن سے فدیہ میں لیا ہے اسکو حلال پاک سمجھ کر کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو (کہ آئندہ ہر طرح کی احتیاط رکھو) بیشک اللہ تعالےٰ بخشنے والا بڑی رحمت والا ہے (کہ تمہاری لغزش بھی معاف کر دی اور فدیہ بھی حلال کر دیا)

صحیح مسلمؔ کی روایت ہے کہ آیت کے نزول پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رو پڑے۔ سیدنا عمرؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ ارشاد فرمایا کہ قیدیوں سے فدیہ لینے پر اللہ کا عذاب قریب آگیا تھا اگر وہ نازل ہوجاتا تو سوائے عمرؓ کے اور سعد بن معاذؓ کے اور کوئی نہ بچتا۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۹۳)

فدیہ کی نوعیت اور اطلاع علی الغیب

فدیہ کی تعداد میں ہر قیدی کی حیثیت کا لحاظ رکھا گیا تھا کم سے کم مقدار ایک ہزار درہم تھی اور زیادہ سے زیادہ چار ہزار درہم۔

جو لوگ، نادار اور غریب تھے وہ بغیر ادائی کے آزاد کر دیئے گئے۔ جو قیدی پڑھنا لکھنا جانتے تھے اُن سے یہ شرط لگائی گئی کہ دس دس مسلم بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں پھر آزاد ہو جائیں یہی ان کا فدیہ تھا۔ حضرت زید بن ثابت رضؓ نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔

سب سے زیادہ فدیہ حضرت عباس پر عائد کیا گیا جسکی مقدار سَو اُوقیہ تھی (ایک اُوقیہ مساوی ۳۷ گرام)

عقیل بن ابی طالب پر اسّی اوقیہ فدیہ لگایا گیا۔

حضرت عباسؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نادار ہوں میرے ہاں کچھ بھی مال نہیں۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا اچھا وہ مال کہاں ہے جو تم نے اور تمہاری بیوی ام فضل نے ملکہ دفن کیا تھا؟

حضرت عباسؓ یہ سنتے ہی حیران رہ گئے اور عرض کیا بیشک میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ یقیناً میرے اور ام فضل کے سوا کسی کو بھی اِس کا علم نہ تھا۔ (مستدرک ترجمۃ العباسؓ)

اسیرانِ بدر میں نوفل بن حارث بھی تھے جب اُن سے فدیہ دینے کو کہا گیا تو کہا میرے پاس تو کچھ بھی نہیں میں نادار آدمی ہوں۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا وہ نیزے کہاں ہیں جو تم جدہ میں چھوڑ آئے ہو؟

نوفل نے کہا اللہ کی قسم اللہ کے بعد میرے سوا کسی کو بھی اُسکا علم نہیں تھا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ اللہ کے رسول و نبی ہیں۔

پھر نوفل نے وہ نیزے فدیہ میں دیدیئے جن کی تعداد ایکہزار تھی۔ (مستدرک ترجمہ نوفل بن حارث)

عُمیر بن وہب اسلام کے شدید ترین دشمنوں میں تھا۔ مکہ کے زمانۂ قیام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو سخت ترین ایذائیں پہنچائی تھیں۔ اسیرانِ بدر میں اسکا بیٹا وہب بن عمیر بھی تھا۔ بدر کی شکست کے بعد ایک دن عُمیر اور صفوان بن اُمیہ (مشہور مشرک) حطیم کعبہ میں بیٹھے ہوئے بدر کی شکست پر تبصرہ کر رہے تھے۔ صفوان نے کہا اب زندگی کا مزہ نہیں رہا۔ سردارانِ قریش کی ہلاکت کے بعد زندگی بے لُطف ہوگئی۔ اِسپر عُمیر نے بھی یہی بات دُہرائی اور مزید یہ اضافہ کیا کہ اگر میرے ذمّے قرض نہ ہوتا اور اور اپنے بچّوں کی کفالت کا کوئی انتظام ہوجاتا تو میں ابھی مدینہ جاکر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر آتا۔

عُمیر کی اس طُوطاچشمی پر صفوان بہت خوش ہوا اور کہنے لگا تیرا قرض اور اہل وعیال کی خبرگیری سب میرے ذمہ ہوگی اگر تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دے۔

یہ سُنکر عمیر اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک زہر آلود تلوار لیکر مدینہ روانہ ہوگیا۔ مسجد نبوی کے قریب سیدنا عمرؓ نے اُسکو دیکھتے ہی تاڑ لیا کہ یہ کسی ناپاک ارادے سے آرہا ہے۔ فوراً اس کی تلوار چھین لی اور کھینچتے ہوئے اُسکو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لا کھڑا کر دیا۔ آپؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا اے عمرؓ اسے چھوڑ دو۔ پھر آپؐ نے عُمیر سے پوچھا

کیوں آئے ہو؟

عمیرؓ نے کہا اپنے قیدی کو چھڑانے آیا ہوں۔آپؐ نے فرمایا سچ کہو کیا تم اپنے قیدی کو چھڑانے آئے ہو؟ عمیر نے وہی جواب دیا ہاں اسی کام کے لئے آیا ہوں!

آپؐ نے ارشاد فرمایا سچ بتاؤ تم نے اور صفوان نے حطیم کعبہ میں بیٹھکر کیا مشورہ کیا تھا؟

عُمیر نے گھبرا کر کہا میں نے کیا مشورہ کیا تھا؟ آپؐ نے فرمایا تونے میرے قتل کا ذمہ لیا تھا اس شرط پر کہ صفوان تیرے اہل وعیال کی خبرگیری کرے اور تیرا قرض ادا کرے!

عُمیر گھبرا گیا اور فوری اعتراف کر لیا اور کہنے لگا۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسولؐ ہیں کیونکہ اس واقعہ کا سوائے میرے اور صفوان کے کسی کو علم نہیں۔پس اللہ ہی نے آپؐ کو اسکی خبر دی ہے۔میں آپؐ پر ایمان لاتا ہوں"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا اپنے بھائی کو دین کی باتیں سمجھاؤ اور قرآن پڑھاؤ اور اسکے قیدی کو چھوڑ دو۔

عُمیر نے کہا یا رسول اللہ میں نے اسلام کو مٹانے کی بہت کوشش کی اور مسلمانوں کو ہر طرح سے ستایا ہے۔اب آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں مکہ جا کر اسلام کی تبلیغ کروں اور اُسکے دشمنوں کو ستاؤں جیسا کہ اس سے پہلے اللہ کے دوستوں کو ستایا کرتا تھا۔آپؐ نے مکہ جانے کی اجازت دے دی۔

عمیرؓ مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے اُدھر مکہ میں صفوان بن امیہ لوگوں سے کہتا پھرتا تھا کہ اے لوگو! چند روز بعد میں تم کو ایسی بشارت سناؤں گا جو تم کو بدر کا صدمہ بھلا دے گی۔ اتنے میں مدینہ سے عمیرؓ کے اسلام قبول کر لینے کی خبر پہنچی تو صفوان آگ بگولہ ہوگیا اور قسم کھائی کہ عمیرؓ سے بات بھی نہ کروں گا اور نہ اسکے اہل وعیال کی کفالت کروں گا۔حضرت عمیرؓ مکہ مکرمہ پہنچے اور دعوت اسلام میں مشغول ہو گئے۔ بہت سے لوگوں نے آپکی دعوت قبول کی اور مسلمان ہو گئے۔حضرت عمیرؓ نے کچھ طاقت جمع کر کے اسلام کے دشمنوں کو خوب پریشان بھی کیا۔

نتائج و عبر

کلمہ توحید کی سربلندی کے لئے کفار سے جو مقابلہ کیا جاتا ہے اسکو قرآنی اصطلاح میں جہاد کہا جاتا ہے۔ اس جہاد فی سبیل اللہ میں مقابلہ کے بعد جو مال و اسباب اور قیدی حاصل ہوتے ہیں اُس کو "مال غنیمت" کہا جاتا ہے۔

جنگ بدر اسلام کا سب سے پہلا معرکہ ہے اسی جہاد میں مسلمانوں کو کثیر مقدار میں مال غنیمت اور بکثرت قیدی ہاتھ آئے۔

اسلام سے پہلے سابقہ انبیاء کرام کی شریعتوں میں مالِ غنیمت سے مجاہدین کو فائدہ اُٹھانا حلال و جائز نہ تھا بلکہ جہاد سے حاصل شدہ سارا مال کسی بلند مقام پر رکھدیا جاتا تھا ایسے وقت آسمان سے ایک آگ نمودار ہوجاتی اور اسکو جلاکر راکھ کا ڈھیر بنادیتی تھی۔ یہی علامت اُس جہاد کے مقبول اور پسندیدہ ہونے کی قرار پاتی تھی۔

اور اگر مال غنیمت کو جلانے کے لئے آسمان سے آگ نہ آتی تو یہ اس بات کی علامت ہوتی کہ جہاد میں کوئی کوتاہی رہی ہے جسکی وجہ سے وہ مال اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہوا۔

صحیح بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مجھکو پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئیں ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوئیں۔ اُن میں سے ایک یہ کہ کفار سے حاصل ہونے والا مالِ غنیمت کسی کے لئے حلال نہیں تھا مگر میری اُمّت کے لئے حلال کردیا گیا ہے۔

فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا الآیہ۔

(انفال آیت ۶۹)

آیت میں مالِ غنیمت کے حلال اور طیّب ہونے کا واضح حکم موجود ہے۔ جو اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

آئینِ جوانمرداں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرتِ مدینہ کے بعد ایک مرتبہ حضرت سعد بن معاذ رضؓ عمرہ کرنے مکہ مکرمہ آئے اور دستور کے مطابق اُمیہ (جو مشرک تھا) کے ہاں قیام کیا۔ دوپہر کے وقت اُمیہ کو لیکر طواف کرنے نکلے طواف کر رہے تھے کہ سامنے ابوجہل آگیا پوچھا اے ابوصفوان (یہ اُمیہ کی کنیت تھی) یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ اُمیہ نے کہا سعد بن معاذ رضؓ ہے جو مدینہ سے عمرہ کرنے آئے ہیں۔

ابوجہل کو غصہ آگیا کہنے لگا اے ابوصفوان تم ایسے بے دینوں کو کیوں جگہ دیتے ہو جنہوں نے ہمارے باپ دادا کے دین و مذہب کو چھوڑ دیا ہے؟ اُمیہ خاموش ہوگیا۔

پھر ابوجہل حضرت سعد بن معاذ رضؓ سے کہنے لگا خدا کی قسم اگر اُمیہ تمہارے ساتھ نہ ہوتا تو تم یہاں سے صحیح و سالم واپس نہیں ہوتے۔

حضرت سعد رضؓ نے بلند آواز سے کہا اگر تو مجھے طواف کرنے سے روکے گا تو اللہ واحد کی قسم ہے میں تیرا مدینہ سے ملک شام کا راستہ بند کر دوں گا۔

اسپر اُمیہ نے حضرت سعد رضؓ سے کہا اے سعد رضؓ تم ابوالحکم (ابوجہل) پر اپنی آواز بلند نہ کرو یہ اس وادی کا سردار ہے۔ حضرت سعد رضؓ نے نہایت بیباکی سے کہا اے اُمیہ بس رہنے دو اللہ کی قسم میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ تو بھی اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھوں مارا جائے گا۔

اُمیہ نے پوچھا کیا میں اپنے شہر مکہ میں مارا جاؤں گا؟

حضرت سعد رضؓ نے کہا مجھے یہ معلوم نہیں کہ تو کہاں اور کس وقت مارا جائے گا لیکن تیری موت اُن کے ہاتھوں ہوگی۔

یہ سنکر اُمیہ گھبرا گیا اور گھر جا کر اپنی بیوی ام صفوان سے اس کا تذکرہ کیا اور کہنے لگا:۔

وَاللّٰہِ مَا یَکْذِبُ مُحَمَّدٌ فَکَادَ اَنْ یُحْدِثَ۔

اللہ کی قسم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کبھی غلط نہیں کہتے۔

(فتح الباری ج۷ ص۲۲۳)

اسکے بعد اُمیّہ پر اس درجہ خوف وہراس طاری ہوگیا کہ مکّہ سے کبھی باہر نہیں نکلتا تھا چنانچہ جب ابوجہل نے معرکۂ بدر کے لئے لوگوں کو اُکسایا تو اُمیّہ پر یہ بات نہایت گراں گزری اُس نے اپنی بیوی ام صفوان سے ابوجہل کا اصرار بیان کیا اور ابوجہل کا یہ پیشکش بھی بیان کیا کہ وہ اس سفر میں ایک تیزرو طاقتور گھوڑا فراہم کرے گا تاکہ خطرہ کی صورت میں اس پر سوار ہوکر مکّہ واپس ہوجائے۔ بیوی نے غصہ سے کہا کیا تم کو اپنے یثربی بھائی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات یاد نہیں کہ تو اُن کے ہاتھوں مارا جائے گا!

اُمیّہ نے کہا مجھے خوب یاد ہے لیکن اگر میں پیچھے رہ گیا تو مکّہ کا بچہ بچہ مجھے بُزدلی کا طعنہ دے گا اور عورتیں میرا مذاق اُڑائیں گی۔

اسکے بعد وہ ابوجہل کے طاغوتی لشکر کے ساتھ بدر کی جانب روانہ ہوا اور ہر منزل پر واپس ہونے کا ارادہ کرتا لیکن بدر کی مقتل گاہ نے اُسے بھاگنے کا موقعہ نہ دیا۔ بدر پہنچا اور میدان قتال میں صحابہ کے ہاتھوں ذلت وخواری سے مارا گیا۔

خسر الدنیا والآخرۃ۔

پُرحقیقت خواب

میدانِ بدر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو یہ خبر دی کہ کل شام تک اس میدان میں فلاں فلاں قریشی سردار مارا جائے گا اور اللہ نے مجھے وہ مقامات دکھائے ہیں جہاں مشرکین کے سردار مارے جائیں گے۔

اُدھر مکہ مکرمہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپی عاتکہ بنت عبدالمطلب نے یہ خواب دیکھا کہ ایک شتر سوار آیا ہے اور مقام ابطح میں اپنے اونٹ کو بٹھاکر باوازبلند یہ پکار رہا ہے:۔

اَلَا انْفِرُوْا يَا آلَ غُدَرٍ لِمَصَارِعِكُمْ فِيْ ثَلَاثٍ۔

اے غدّارو اپنے اپنے قتل گاہوں کی جانب تین دن میں پہنچ جاؤ۔

اس آواز پر لوگ اُس اعلان کرنے والے کے اطراف جمع ہوگئے ہیں پھر وہ اپنا اونٹ

لئے ہوئے مسجد حرام میں داخل ہوا اور پھر یہی آواز دی۔ اسکے بعد وہ جبل ابوقبیس پر چڑھا اور اوپر سے پتھر کی ایک چٹان پھینکی۔ جب وہ چٹان پہاڑ کے دامن میں پہنچی تو چور چور ہوگئی اور مکہ کا کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں اس کا کوئی نہ کوئی ٹکڑا گرا نہ ہو۔

عاتکہ بنت عبدالمطلب نے اپنا یہ خواب اپنے بھائی عباس بن عبدالمطلب سے بیان کیا اور یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ آپکی قوم پر کوئی سخت بلا اور مصیبت آنے والی ہے تم اپنی احتیاط ملحوظ رکھو۔ لیکن اے بھائی اس خواب کو کسی اور سے بیان نکرنا۔

مگر ولید نے اپنے باپ عُتبہ سے اس خواب کا تذکرہ کر دیا۔ اسی طرح شُدہ شُدہ یہ بات پورے مکہ میں پھیل گئی۔ دو تین دن بعد عباس بن عبدالمطلب مسجد حرام میں گئے تو دیکھا کہ ابوجہل ایک مجمع کے ساتھ بیٹھا ہے۔ عباس کو دیکھتے ہی کہنے لگا اے ابوالفضل (عباس کی کنیت) تمہارے مرد تو نبوت کے مدعی تھے ہی اب تمہاری عورتیں بھی نبوت کا دعویٰ کرنے لگیں ہیں۔

عباس بن عبدالمطلب نے دریافت کیا اے ابوالحکم کیا بات ہے ؟

ابوجہل نے عاتکہ بنت عبدالمطلب کا خواب بیان کیا اور کہا کہ تمہاری بہن ہماری ہلاکت و بربادی کا فیصلہ کر رہی ہے۔ اسی اثنا ضمضم غفاری ابوسفیان کا پیام لے کر اس شان سے مکہ پہنچا پیراہن چاک ہے اور اونٹ کی ناک کٹی ہوئی ہے اور یہ پکارتا آرہا ہے:-

"اے گروہ قریش اپنے تجارتی قافلہ کی خبر لو اور جلد از جلد ابوسفیان اور اس کے تاجر ساتھیوں کی مدد کو پہنچو۔"

یہ خبر سنتے ہی مشرکین مکہ سامانِ حرب وضرب سے لیس ہوکر بدر کی جانب نکل پڑے۔

پھر میدانِ بدر میں عاتکہ بنت عبدالمطلب کے خواب کی تعبیر بحالتِ بیداری آنکھوں سے دیکھ لی۔ (مستدرک ج ۳ ص ۱۹)

الغرض قریش کا یہ فوجی لشکر گاتے بجاتے روانہ ہوا مقام جُحفہ میں پہنچے تو جُہیم بن صلت نے یہ خواب دیکھا کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار ہے اور ایک اونٹ اُسکے ہمراہ ہے وہ آکر کھڑا ہوا اور یہ کہتا ہے قتل ہوا عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) امیہ بن خلف اور

فلاں فلاں۔

پھر اس شخص نے اپنے اونٹ کو ایک برچھا مار کر لشکر میں چھوڑ دیا۔ لشکر کا کوئی خیمہ ایسا نہ رہا جس پر اُس کے خون کے چھینٹے نہ پڑے ہوں۔

ابوجہل کو جب اس خواب کی اطلاع ہوئی تو بہت بگڑا اور برہم ہوا اور کہنے لگا کہ یہ بنی مطلب میں دوسرا نبی پیدا ہوا ہے۔ کل کو جب مقابلہ ہوگا تب اس کو معلوم ہو جائے گا کہ جنگ میں ہم میں سے کون قتل ہوگا۔

(البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۶۵)

کھلی آزمائش

۱۷ رمضان المبارک ۲ھ مطابق ۱۱ مارچ ۶۲۴ء بدر کے مقام پر مسلمانوں کا مشرکین مکہ سے مقابلہ ہوا۔ جب دونوں لشکر مقابل ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کیا کہ ایک مسلمان کا مقابلہ تین کافروں کے ساتھ ہے جو سامان حرب وضرب سے پوری طرح مسلح ہیں۔

آپؐ نے نہایت خشوع وخضوع کی حالت میں اپنے رب کی جناب میں اس طرح استغاثہ پیش فرمایا:۔

"الٰہی! یہ قریش کی جماعت اپنے سامانِ غرور کے ساتھ آئی ہے تاکہ تیرے رسول کو جھوٹا ثابت کریں،

الٰہی! میں تیری اُس مدد کا منتظر ہوں جس کا تونے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا، اے اللہ! اگر آج یہ مٹھی بھر مسلمان جماعت ہلاک ہوگئی تو روئے زمین پر تیری پرستش نہ ہوگی۔"

اس معرکہ میں سب سے زیادہ سخت امتحان مہاجرینِ مکہ کا تھا جنکے اپنے بھائی بند سامنے صف آرا تھے۔ کسی کا باپ، کسی کا بیٹا، کسی کا چچا، کسی کا ماموں، کسی کا بھائی، کسی کا بھتیجا بھانجہ اسکی اپنی تلوار کی زد میں آرہا تھا اور اپنے ہاتھوں اپنے جگر گوشوں کو ٹکڑے کرنے پڑ رہے تھے۔ یہ ایسی سخت ترین اور دل سوز آزمائش تھی کہ اسمیں صرف اور صرف وہی اہل ایمان ثابت قدم کامیاب ہوئے جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر غیر مشکوک اور غیر متزلزل ایمان رکھا ہو اور پورے یقین واعتماد کے ساتھ حق کیساتھ

رشتہ جوڑا ہو اور جو کفر و شرک کے سارے رشتے قطع کر ڈالے ہوں۔
اس قسم کی آزمائش کو قرآن حکیم نے اپنی زبان میں بَلَاءٌ مُّبِیْنٌ (کھلی آزمائش) کے عنوان سے تعبیر کیا ہے۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

تعداد بدریین

حضرت رافع بن رافع رضؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ جبرئیل امین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ سوال کیا کہ آپؐ اہل بدر کو کیا سمجھتے ہیں؟ : آپؐ نے ارشاد فرمایا سب سے افضل و بہتر ہیں۔ جبرئیل امین نے کہا اسی طرح وہ فرشتے جو بدر میں حاضر ہوئے سب فرشتوں سے افضل اور بہتر ہیں۔ (صحیح بخاری)

اسی صحیح بخاری میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضؓ کے قصے میں سیدنا علی رضؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سیدنا عمر رضؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا :-

لَعَلَّ اللّٰہَ اِطَّلَعَ اِلٰی اَھْلِ بَدْرٍ فَقَالَ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ وَجَبَتْ لَکُمُ الْجَنَّۃُ۔

بلاشبہ اللہ نے اہل بدر کی جانب نظر رحمت فرمائی اور یہ فرمادیا جو چاہے کرو جنت تمہارے لئے واجب ہو چکی ہے۔ (بخاری)

اصحاب بدر کی تعداد میں مؤرخین نے مختلف روایات نقل کی ہیں لیکن مشہور و معروف روایت تین سو تیرہ (۳۱۳) کی ہے۔

اس اختلاف کی وجہ سے محدثین کے اقوال مختلف ہیں۔ حافظ ابن سید الناس نے اپنی کتاب عیون الاثر میں سب روایات جمع کر دی ہیں اور تین سو تریسٹھ (۳۶۳) نام شمار کرائے ہیں تاکہ کسی بھی قول کی بنا پر کوئی نام چھوٹنے نہ پائے۔ احتیاطاً سب کو ذکر کر دیا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ بدریین کی تعداد اتنی ہی تھی۔

حضرت ابن عباس رضؓ سے مروی ہے کہ اہل بدر تین سو تیرہ تھے۔
(مسند احمد، مسند بزار، معجم طبرانی)

حضرت براء بن عازب رضؓ سے بھی تقریباً یہی تعداد منقول ہے

فرماتے ہیں کہ ہم لوگ عہد نبوت میں یہ کہا کرتے تھے کہ اصحاب بدر تین سو دس سے کچھ زیادہ تھے جتنے کہ حضرت طالوت کے ساتھ تعداد تھی جنھوں نے نہر کو پار کیا اور اللہ کی قسم نہر سے وہی لوگ پار ہوئے جو نہایت مخلص مؤمن تھے۔

(بخاری)

علامہ سہیلیؒ فرماتے ہیں کہ جنگ بدر میں مسلمانوں کی امداد کے لئے ستر جنات بھی حاضر ہوئے تھے۔ آٹھ صحابہ ایسے بھی تھے جو اس جنگ میں شرعی عذر کے تحت شریک نہ ہو سکے تھے لیکن اُن کو اہل بدر میں شمار کیا گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت میں سے اُن کو حصہ بھی عطا فرمایا تھا

(طبقات ابن سعد)

جنگ بدر میں فرشتوں کا نزول قرآن حکیم کی آیت ۱۲ سورہ انفال میں موجود ہے۔ روایات حدیث سے تین فرشتوں کے نام بھی معلوم ہوتے ہیں :۔

حضرت جبرئیل امین، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل (علیہم السلام)
فَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ۔

شہداء بدر :۔

غزوۂ بدر میں جب کچھ صحابی شہید ہو گئے تھے تو نافہم کافروں نے کہنا شروع کیا کہ انھوں نے خواہ مخواہ اپنی زندگی گنوا دی اور زندگی کے لطف سے محروم ہو گئے۔

قرآن حکیم نے ایسے بے بہروں کو جواب دیا کہ جس معنی میں تم لوگ انھیں مُردہ سمجھ رہے ہو وہ ایسے مُردہ نہیں بلکہ زندوں سے کہیں زیادہ لُطف ولذت سے لذّت یاب ہو رہے ہیں۔

شہدار کی موت عام انسانوں کی موت کی طرح نہیں ہوتی بلکہ اُنھیں عالم برزخ میں ایک مخصوص قسم کی زندگی حاصل رہتی ہے اور یہ حیات کے ساتھ رزق بھی دیئے جاتے ہیں جو اُسی عالم کے مناسب ہوتا ہے۔

یہ اپنے رب کے مقرب بھی ہوتے ہیں۔ اِن کا بسیرا عرشِ عظیم کے فانوسوں میں ہوتا ہے۔ شہیدوں کی یہ زندگی اُس عالم میں ایک خصوصی اور امتیازی زندگی کی حامل ہوتی ہے۔ آثارِ حیات میں دوسروں سے کہیں زیادہ قوی بقول مفسر تھانویؒ شہید کی اس حیات کی قوت کا ایک اثر اُس کے جسدِ ظاہری تک پہونچتا ہے کہ اس کا جسد باوجود گوشت پوست ہونے کے خاک سے متأثر نہیں ہوتا اور جسم زندہ کی طرح صحیح وسالم رہتا ہے۔ جیسا کہ احادیث اور مشاہدات گواہی دیتے ہیں۔ دراصل یہی حیات ہے جس میں حضرات انبیاء کرام شہیدوں سے بھی زیادہ قوت اور امتیاز رکھتے ہیں۔ (بیضاوی)

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۔ فَرِحِيْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

(آل عمران آیت ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے انھیں ہرگز مُردہ مت خیال کرو بلکہ وہ لوگ اپنے پروردگار کے پاس زندہ ہیں رزق پاتے رہتے ہیں۔

اُن نعمتوں سے مسرور ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے عطا کی ہیں اور جو لوگ اِن کے بعد والوں سے ابھی اُن سے نہیں جاملے ہیں اِن کی بھی اس حالت سے خوش ہیں کہ ان پر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (مطلب یہ کہ شہداء اپنے اُن عزیز واقارب سے مطمئن ہیں جن کو وہ دنیا میں ایمان اور عمل صالح پر چھوڑ آئے ہیں)

وہ لوگ خوش ہو رہے ہیں اللہ کے انعام اور فضل پر اور اِس پر کہ اللہ ایمان والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ (یعنی اس حقیقت کا انھیں عینی مشاہدہ ہو رہا ہے)

غزوۂ بدر میں چودہ (۱۴) صحابہ شہید ہوئے ہیں۔ حضرت

عبداللہ بن مسعود رضؓ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو لوگ بدر میں شہید ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ نے اُن پر اپنی تجلی فرمائی اور اپنے دیدار سے اُن کی آنکھوں کو منوّر فرمایا اور کہا اے میرے بندو کیا چاہتے ہو؟

اُنھوں نے عرض کیا اے پروردگار جن جن نعمتوں سے تو نے ہمیں سرفراز کیا ہے کیا اُس سے بھی بڑھکر کوئی نعمت اور ہے؟ اللہ تعؐ نے فرمایا بتاؤ کیا چاہتے ہو؟

چوتھی مرتبہ شہدار بدر نے عرض کیا اے پروردگار! ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری روحیں پھر ہمارے جسموں میں لوٹادی جائیں تاکہ پھر آپکی راہ میں ہم شہید ہوں جیسے اب شہید ہوئے ہیں۔

(زرقانی ج۱ ص۴۲۵)

اِن عالی مرتبت شہدار کرام کے اسمار مبارکہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) عبیدہ بن الحارث بن مطّلب مہاجری رضؓ

معرکہ بدر میں ان کا پیر کٹ گیا تھا۔ بدر سے واپسی پر مقام صفرار (حمرار طریق المدینۃ المنورہ) میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک سفر کے دوران مقام صفرار میں قیام فرمایا تھا، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہؐ ہم یہاں مُشک کی خوشبو پاتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا تعجب کیا ہے یہاں ابومعاویہ (عُبیدہؓ) کی قبر ہے۔ (اصابہ ج۱ ص۴۲۵)

(۲) عُمیر بن ابی وقاص مہاجری رضؓ

یہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ حضرت سعد رضؓ فرماتے ہیں کہ جب بدر میں جانے کے لئے لوگ جمع ہو رہے تھے تو میں نے اپنے بھائی عُمیر رضؓ کو دیکھا کہ اِدھر اُدھر چُھپتا پھر رہا ہے۔ میں نے کہا اے بھائی تجھکو کیا ہوگیا ہے؟ کہا مجھکو اندیشہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر مجھکو دیکھ لیں تو کم عمر سمجھ کر واپس

فرمادیں گے اور میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ شاید اللہ تعالیٰ مجھے شہادت نصیب فرمادیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لشکر کا معائنہ فرمایا تو حضرت عُمیرؓ بھی پیش کئے گئے۔ آپؐ نے انھیں کم عمری کی وجہ سے واپس ہوجانے کا حکم دیا۔ یہ سُنکر عُمیرؓ رو پڑے۔ پھر آپؐ نے ان کا ذوق و شوق دیکھ کر اجازت دے دی۔ بالآخر جنگ میں شریک ہوئے اور جامِ شہادت نوش فرمایا۔ حضرت عمیرؓ کی عمر اس وقت سولہ سال تھی۔ (اصابہ ج ۳ ص ۳۵)

(۳) ذو الشمالین بن عبد عمر مہاجری رضؓ

مشہور امامِ حدیث حضرت زہری رحؒ اور مشہور مؤرخ ابن سعدؒ فرماتے ہیں کہ ذُو الیدین اور ذو الشمالین ایک ہی شخص کے دو نام ہیں لیکن اکثر محدثین کہتے ہیں کہ ذو الشمالین تو جنگ بدر میں شہید ہوئے اور ذو الیدین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی زندہ رہے۔

(۴) عاقل بن البکیر مہاجری رضؓ

سابقین اولین میں شمار ہوتے ہیں۔ دار ارقم (جہاں سیدنا عمرؓ کے بہن بہنوئی رہا کرتے تھے) مشرف باسلام ہوئے ان کا پہلا نام غافل تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام لانے کے بعد نام تبدیل کردیا۔ غزوۂ بدر میں شہید ہوئے۔ چونتیس (۳۴) سال کی عمر تھی۔

(۵) مَہْجَعْ بن صالح رضؓ (مولیٰ عمر بن الخطاب)

مشہور تابعی سعید بن مسیبؒ سے منقول ہے کہ جنگ بدر میں عین قتل وقتال کے وقت حضرت مہجع رضؓ کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔

اَنَا مَھْجَعُ وَاِلٰی رَبِّی اَرْجِعُ۔

(میں مہجع ہوں اور اپنے رب کی جانب لوٹنے والا ہوں)

(۶) صفوان بن بیضاء مہاجری رضؓ (صفوان بن وہب فی روایۃ)

غزوۂ بدر میں شریک ہونا ثابت ہے البتہ ابن حبان محدث کہتے ہیں کہ ۳۰ھ میں وفات پائی اور امام حاکم رحؒ کہتے ہیں ۳۸ھ میں وفات پائی۔

لیکن امام موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق رحؒ اور ابن سعد رحؒ کہتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں طُعیمہ بن عدی کے ہاتھ شہید ہوئے۔ (اصابہ ترجمہ صفوان بن بیضاء)

(۷) سعد بن خیثمہ انصاری رضؓ

صحابی ابن صحابی ہیں۔ شہید ابن شہید ہیں۔ حضرت سعدؓ غزوۂ بدر میں شہید ہوئے اور والد حضرت خیثمہ رضؓ غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے۔

حضرت سعدؓ بیعتِ عقبیٰ میں بھی شریک ہوئے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو قبیلہ بن عمرو کا نقیب بنایا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں جب قافلہ ابوسفیان کے تعاقب کیلئے حکم دیا تھا تو حضرت سعد رضؓ کے والد خیثمہ رضؓ نے اپنے بیٹے حضرت سعد رضؓ سے کہا بیٹا ہم میں سے ایک کا بچوں اور عورتوں کی حفاظت کے لئے گھر رہنا ضروری ہے۔ بیٹا تم ایثار کرو اور مجھکو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جانے کی اجازت دو اور تم گھر کی نگرانی کے لئے ٹھیر جاؤ۔

اسپر حضرت سعد نے ادب سے انکار کردیا اور یہ عرض کیا:۔

لَوْکَانَ غَیْرَ الْجَنَّۃِ اٰثَرْتُکَ بِہٖ اِنِّیْ اَرْجُوْ الشَّہَادَۃَ فِیْ وَجْھِیْ ھٰذَا۔

اباجان جنت کے سوا اگر کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں ضرور ایثار کرتا اور آپ کو اپنے نفس پر ترجیح دیتا۔ لیکن اس سفر میں اپنے شہید ہونے کی قوی امید رکھتا ہوں۔

اسکے بعد باپ بیٹے میں قرعہ اندازی ہوئی۔ قرعہ بیٹے سعد رضؓ کے نام پر نکلا۔ باپ نے اتفاق کرلیا اور گھر پر ٹھیر گئے۔ صاحبزادے حضرت سعد رضؓ شاداں و فرحاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ بدر کی طرف روانہ ہوگئے۔ معرکۂ بدر میں بڑی

بے جگری سے لڑتے رہے بالآخر شہید ہو گئے اور اپنی مراد کو پالیا۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ (احزاب آیت ۲۳)

ان صحابہ میں بعض وہ ہیں جنھوں نے اپنی مراد پالی اور بعض منتظر ہیں۔

(۸) بُشّر بن عبد المنذر انصاری رضؓ

(۹) یزید بن حارث انصاری رضؓ

(۱۰) عُمیر بن الحمام انصاری رضؓ

صحیح مسلم شریف میں حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن ارشاد فرمایا تھا اے لوگو دوڑ و جنّت کی طرف جس کا عرض آسمان و زمین کے برابر ہے۔ حضرت عُمیر رضؓ نے بَخٍ بَخٍ (واہ واہ) کہنا شروع کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اے عمیر رضؓ کس چیز نے تجھ کو بَخٍ بَخٍ کہنے پر آمادہ کیا؟

حضرت عمیر رضؓ نے کہا یا رسول اللہ اللہ کی قسم کچھ بھی نہیں مگر صرف یہ اُمید کہ شاید میں بھی جنت والوں میں شامل ہو جاؤں!

آپؐ نے فرمایا:۔

فَاِنَّكَ مِنْ اَهْلِهَا۔

بلاشبہ تو اہل جنت میں شامل ہے۔

اسوقت حضرت عُمیر رضؓ بھوک کی وجہ سے خشک کھجوریں کھا رہے تھے کھجوریں پھینک دیں اور کہنے لگے اگر میں ان کے کھانے میں مشغول ہو گیا تو پھر زندگی بڑی طویل ہو گی۔ فوراً جہاد میں مشغول ہو گئے اور جامِ شہادت نوش کیا۔

فسقاہ اللہ من انہار الجنۃ۔ (اصابہ ج ۲ ص ۳۱)

(۱۱) رَافِع بن مُعَلّٰی انصاری رضؓ

(۱۲) حارثہ بن سراقہ انصاری رضؓ

حضرت حارثہ رضؓ صحابی ابن صحابی اور شہید ابن شہید ہیں۔

حضرت حارثہ بن سراقہ رضؓ غزوہ بدر میں شہید ہوئے اور ان کے والد محترم حضرت

سُراقہ بن حارث رضؓ غزوۂ حنین میں شہید ہوئے۔

حضرت حارثہ رضؓ شہادت کے وقت نوجوان تھے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بدر سے مدینہ طیبہ واپس تشریف لائے تو حضرت حارثہ رضؓ کی والدہ سیدہ رُبیّع بنت نضر رضؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ آپؐ کو خوب معلوم ہے کہ مجھکو حارثہ رضؓ سے کس قدر محبت تھی اگر وہ جنت میں ہے تو میں صبر کروں گی اور اللہ سے اپنے لئے اجر کی اُمید رکھوں گی۔ اور اگر دوسری صورت ہے تو پھر آپؐ دیکھیں گے کہ میں کیا کروں گی۔ (گریہ وزاری آہ وبکا)

آپ نے ارشاد فرمایا کیا تو دیوانی ہوگئی ہے؟ تیرا بیٹا ایک جنت میں نہیں اُس کے لئے بہت سی جنتیں ہیں اور وہ تو جنت الفردوس میں مقیم ہے۔

(بخاری غزوۂ بدر)

(۱۳) عوف بن حارث انصاری رضؓ

(۱۴) مُعَوَّذ بن حارث انصاری رضؓ

یہ دونوں حقیقی بھائی ہیں اِن کی والدہ کا اسم گرامی سیّدہ عفرار رضؓ ہے۔ یہ وہ مبارک خاتون ہیں جن کے سات بیٹے جنگ بدر میں شریک ہوئے ہیں۔

(زرقانی ج ا ص ۴۱۶)

نوٹ: اِن چودہ شہداء میں سے تیرہ شہید میدان بدر کے ایک مختصر احاطہ میں آسودۂ خواب ہیں۔ جو قدیم شاہراہِ جدّہ مدینہ طیبہ کے درمیان واقع ہے۔ البتہ ایک شہید حضرت عبیدہ بن الحارث رضؓ مقام صفراء میں آرام فرما ہیں۔

(رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ)

غزوۂ اُحُد

معرکۂ اُحد بیک نظر غزوہ اُحد بھی اسلامی غزوات میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ حقیقتاً یہ اسلام کی دوسری بڑی جنگ تھی جو حق و باطل کے معرکہ میں عبرت اور موعظت کا بے شمار ذخیرہ رکھتی ہے۔ اس غزوہ کے تفصیلی حالات کتب حدیث و تاریخ اور قرآن حکیم میں مکمل طور پر مذکور ہیں۔

اُحُد مدینہ منورہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے جو بجانب جنوب تقریباً ۲ دو میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ماہ شوال ۳ھ مطابق ماہ جنوری ۶۲۵ء میں اسلام وکفر کا دوسرا عظیم معرکہ پیش آیا جس کی تفصیل یہ ہے:۔

میدانِ بدر میں قریشِ مکہ کو جو ذلت آمیز شکست ہوئی تھی جس میں ان کے ستر سردار مارے گئے تھے اور ستر قید کرلئے گئے تھے۔ یہ ایک ایسی رسوائی تھی جس سے مشرکین مکہ کا ہر گھر سوگوار تھا۔ اسی طرح قریش کے دوست قبائل بھی نوحہ خواں تھے۔ ابوسفیان نے جو قریش کا سردار تھا یہ قسم کھالی تھی کہ جب تک بدر کا انتقام نہ لوں گا نہ غسل کروں گا نہ لباس تبدیل کروں گا۔

ابوجہل کا جوان سال لڑکا عکرمہ بن ابی جہل اور دوسرے نوجوانوں کی تقریریں اور عورتوں کی نوحہ خوانی وطعنہ زنی ایک فیصلہ کن مقابلہ کے لئے ماحول پیدا کررہی تھیں وہ چاہتے تھے کہ جس طرح بدر میں مسلمانوں کو سربلندی اور غلبہ حاصل ہوا اسی طرح اہل مکہ کو بھی اسلام اور مسلمانوں پر سربلندی حاصل ہو اور سردارانِ قریش کے خون کا بدلہ پورے طور پر لیا جائے۔

ابوسفیان جو رؤسار قریش میں اسوقت نمایاں حیثیت کا حامل تھا اپنی سرکردگی میں مکہ کے تین ہزار سورماؤں کا لشکر لیکر مسلمانوں اور اسلام کو مٹانے کے لئے نکلا اور مدینہ منورہ کے قریب جبل اُحد کے سامنے

خیمہ زن ہوگیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اسکی خبر ہوئی تو آپؐ نے تجربہ کار صحابہ سے مشورہ کیا کہ ایسی صورت میں کیا اقدام کرنا چاہیئے؟ اور کس طرح ان کا مقابلہ کرنا چاہیئے؟

تجربہ کار عمر رسیدہ صحابہ نے یہ رائے دی کہ ہم کو مدینہ سے باہر نکلکر جنگ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ہم شہر کے اندر ہی دشمن کا انتظار کریں جب وہ ازخود حملہ آور ہو تو پھر ہم بھرپور مقابلہ کریں اسطرح ہم کو اپنے شہر میں ہر طرح کی سہولت اور طاقت حاصل رہے گی اور دشمن کے لئے یہ آسان نہ ہوگا کہ وہ شہر پر ازخود حملہ کرے۔ اگر وہ ایسا اقدام کرے گا تو بلاشبہ شکست اُٹھائے گا۔

لیکن بعض اُن صحابہ کو جو جنگ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے اور بدر کی فضیلت کو اس وقت حاصل کرنا چاہتے تھے یہ رائے پسند نہیں آئی۔ مزید برآں نوجوان صحابہ نے بھی اِن کا ساتھ دیا اور اکثریت کی رائے یہ قرار پائی کہ شہر سے باہر نکل کر ہی دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا اور اپنے حجرہ میں تشریف لے گئے۔ عمر رسیدہ صحابہ نے اپنے چھوٹوں کی رائے پر ملامت کی کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رجحان کے خلاف رائے دی اور آپؐ کو متوحش کر دیا ہے۔

جب آپ حجرہ مبارک سے باہر تشریف لائے تو جنگی لباس زیب تن تھا۔ نوجوان صحابہ نے اپنی رائے پر اظہارِ ندامت کیا اور عرض کیا یا رسول اللہ یہی مناسب ہے کہ آپؐ شہر کے اندر ہی دشمن کا مقابلہ کریں۔ آپؐ نے یہ سنکر ارشاد فرمایا نبی کی شان کے یہ خلاف ہے کہ جب وہ اللہ کی راہ میں ہتھیار لیکر کھڑا ہو جائے تو پھر بغیر مقابلہ ہتھیار نہیں رکھدیتا۔ اب اللہ کا نام لے کر میدان میں نکلو۔ چنانچہ جب آپؐ مدینہ منورہ سے نکلے تو ایک ہزار کا لشکر ساتھ تھا۔

کچھ ہی دور آگے چلے تھے کہ رأس المنافقین عبد اللہ بن اُبیّ لشکر میں شریک اپنے تین سو ساتھیوں کو علیحدہ کر لیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگا کہ آپؐ نے ہم جیسے تجربہ کار عمر رسیدہ لوگوں کی بات نہ مانی اور نوجوان غیر آزمودہ کار لڑکوں کی بات مان کر مقابلہ کے لئے نکل گئے آپؐ نے ہماری جانوں کو خطرہ میں ڈال دیا ہم آپؐ کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

دراصل یہ ایک گہری سازش تھی جو منافقین نے مشرکین مکہ سے خُفیہ طور پر کر لی تھی تاکہ مخلص مسلمانوں کو عین وقت پر ہراساں و پریشان کر دیں۔ لیکن اِن منافقین کا مقصد پورا نہ ہوا جبکہ انھوں نے دیکھا کہ بقیہ سات سو مخلص مسلمان اپنے پورے عزم و ارادے کے ساتھ ذوق وشوق سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ تین سو منافقین کی یہ جماعت عبد اللہ بن اُبیّ کی سرکردگی میں مدینہ واپس ہوگئی۔

جانثارانِ اُحد کے چند واقعات

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے بڑھکر جانباز اور جانثارانِ اسلام کا جائزہ لیا اسمیں چند کم عمر بچے بھی تھے اُنھیں مدینہ واپس ہوجانے کا حکم دیا۔ حضرت رافع بن خدیج رضؓ جو اس وقت کم عمر تھے یہ صورت حال دیکھ کر مجاہدین کی صف میں پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے تاکہ دراز قد نظر آئیں چنانچہ ان کی یہ فدا کارانہ تدبیر کارگر ہوگئی اور وہ نبرد آزماؤں میں شریک ہو گئے لیکن انھی کے ہم عمر سمرہ بن جندبؓ کو جب واپس ہوجانے کا حکم ملا تو وہ بے ساختہ رونے لگے اور اسی حالت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:۔

یارسول اللہؐ اگر رافع رضؓ اس جنگ میں شریک ہوسکتا ہے تو

میں کیوں خارج کیا جارہا ہوں ؟ جبکہ میں قوت و طاقت میں رافع رضؓ سے بہتر ہوں۔ میں نے بارہا رافع رضؓ کو کشتی میں پچھاڑ دیا ہے۔ آپؐ نے سمرہ کی اُولوالعزمی دیکھ کر دونوں میں کشتی کرائی۔ سمرہ رضؓ نے آناً فاناً رافع رضؓ کو پچھاڑ دیا۔ اسی طرح وہ بھی مجاہدین اسلام میں شامل کرلئے گئے۔

(طبری ج ۳ صـ۱۲)

البتہ مسلمانوں کے دو قبیلے بنو سلمہ اور بنو حارثہ میں کچھ بددلی سی پیدا ہوچلی تھی مگر فدا کار مسلمانوں کے جوش و ولولہ کو دیکھکر انکی ہمت بھی بلند و مضبوط ہوگئی۔ یہ اللہ کا فضل و کرم تھا جو ان دو مسلمان قبیلوں پر ہوا جس کا قرآن حکیم نے اشارۃً ذکر کیا ہے۔

(آل عمران آیت ۱۲۲)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدین اسلام کی اس طرح صف بندی کی کہ جبل اُحد پشت پر آگیا اور پچاس تیر انداز صحابہ کو حضرت عبد اللہ بن جُبیر رضؓ کی قیادت میں پہاڑ کی ایک اہم گھاٹی پر مقرر فرمادیا اور سب کو یہ تاکید کردی کہ فتح یا شکست کسی حال میں بھی اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔

ایک اور روایت میں ہے آپؐ نے فرمایا اگر پرندوں کو بھی دیکھو کہ وہ ہمارے گوشت پوست کو نوچ رہے ہوں تب بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا۔

جب فریقین کی صفیں مرتب ہوگئیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تلوار ہاتھ میں لیکر یہ فرمایا :-

مَنْ يَأْخُذُ هٰذَا السَّيْفَ بِحَقِّهٖ -

کون ہے جو اس تلوار کو اسکے حق کے ساتھ لے !

یہ سُنکر بہت سے ہاتھ اس سعادت کے حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک روک لیا۔ اتنے میں حضرت ابودُجانہ رضؓ اُٹھے اور عرض کیا یارسول اللہ اس تلوار کا حق کیا ہے ؟

آپؐ نے ارشاد فرمایا حق یہ ہے کہ اس سے اللہ کے دشمنوں کو مارے یہاں تک کہ یہ خم ہو جائے۔

حضرت ابو دجانہ رضؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ میں اس تلوار کو اس کے حق کے ساتھ لیتا ہوں۔

آپؐ نے وہ تلوار حضرت ابو دجانہ رضؓ کو دے دی۔

(صحیح مسلم، مسند احمد)

حضرت ابو دجانہ رضؓ بڑے شجاع اور دلیر انسان تھے انھوں نے اپنا سرخ عمامہ نکالا اور سر پر باندھا اور اکڑتے، اتراتے، ناز و مستی کے انداز میں مشرکین کی صفوں کی جانب چلے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انھیں اس حالت میں دیکھا تو فرمایا یہ چال اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے مگر ایسے وقت (یعنی حالت جہاد میں اللہ اس چال سے خوش ہوتا ہے)

ابو دجانہ رضؓ مشرکین کی صفوں کو چیرتے پھاڑتے چلے جارہے تھے جو بھی مقابل ہوتا اُسکی لاش زمین پر نظر آتی تھی۔ یہاں تک کہ ابُوسفیان (سالارِ مشرکین) کی بیوی ہندہ بالکل سامنے آگئی ابو دجانہ رضؓ نے اس پر تلوار اُٹھائی مگر فوراً ہاتھ روک لیا۔ بعد میں کہا کرتے تھے کہ مجھے یہ بات اچھی معلوم نہ ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار کو ایک بے پناہ اور بے سہارا عورت پر چلاؤں۔

(البدایہ والنہایہ ج ۴ ص۱۶)

باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی۔ سیدنا حمزہ رضؓ کے دلیرانہ حملوں سے مشرکین کی صفوں میں سراسیمگی اور انتشار پھیل چکا تھا۔ جس پر بھی تلوار اُٹھاتے اُسکی لاش موت کے گھاٹ اترتی تھی۔ جس طرف بھی نکل جاتے میدان خالی ہوجاتا تھا، مشرکین پر اللہ کا قہر و غضب تھا جو سیدنا حمزہ رضؓ کے بال بال سے پھوٹ رہا تھا، مشرکین کی صفیں درہم برہم ہوگئیں۔

وحشی بن حرب جو حبشی غلام تھا سیدنا حمزہ رضؓ کی تاک میں

چھپتا چھپاتا پھر رہا تھا اور ایک موقع پر وہ حضرت حمزہ کی تاک میں ایک بڑے پتھر کے نیچے چھپا بیٹھا تھا۔ حضرت حمزہ رضؓ ادھر سے گزر رہے تھے کہ وحشی نے پیچھے سے آپ کو نیزہ مارا جو آر پار ہو گیا، سیدنا حمزہ رضؓ چند قدم چلے مگر لڑکھڑا کر گر پڑے اور جامِ شہادت نوش کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

حضرت حنظلہ کا اسی معرکہ میں ابوسفیان سے مقابلہ ہو گیا۔ حضرت حنظلہؓ نے دوڑ کر ابوسفیان پر وار کرنا چاہا ہی تھا کہ ایک کافر شداد بن اوس نے آپ پر وار کر دیا جس سے حضرت حنظلہ رضؓ شہید ہو گئے۔ شہادت کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں نے دیکھا کہ حنظلہ رضؓ کی لاش کو بادلوں میں فرشتے غسل دے رہے ہیں (اسی وجہ سے حضرت حنظلہؓ کا لقب "غسیل الملائکہ" مشہور ہوا) لڑائی کے بعد جب ان کی لاش اٹھائی گئی تو جسم سے تازہ پانی ٹپک رہا تھا۔ (روض الانف ج ۲ ص ۱۳۳)

مسلمانوں کے اس دلیرانہ اور جانبازحملوں سے قریشِ مکہ کے پیر اکھڑنے شروع ہو گئے اور وہ اِدھر اُدھر منہ چھپا کر بھاگ کھڑے ہوئے، اُن کی عورتیں جو اس جنگ میں شرکت کرنے آئیں تھیں پریشان اور بدحواس ہو کر پہاڑوں کی جانب دوڑ پڑیں۔ اس وقت مسلمان مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔

ناگہانی مصیبت

تیر اندازوں کی جماعت نے جسکو گھاٹی پر حفاظت کے لئے بٹھایا گیا تھا جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کو فتح ہو گئی ہے اور وہ مال غنیمت جمع کر رہے ہیں تو اِن میں سے اکثر لوگ اس طرف بڑھے لیکن ان کے امیر حضرت عبداللہ بن جبیر رضؓ نے ہر چند انہیں روکا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد یاد بھی دلایا جس میں آپؐ نے گھاٹی سے بہرصورت ہٹنے سے منع فرمایا تھا، لیکن وہ لوگ یہ کہہ کر روانہ ہو گئے کہ آپؐ کا منشا جنگ تک محدود تھا۔ اب جبکہ جنگ ختم ہو گئی ہے اور مقصد حاصل ہو گیا ہے۔ لہٰذا اب ٹھہرنے کی ضرورت نہیں ہم بھی مال غنیمت جمع کریں گے۔ پہاڑ کی اُس گھاٹی پر حضرت عبداللہ بن جبیر رضؓ کے ساتھ صرف

دسٌ حضرات رہ گئے۔ حصولِ غنیمت کے شوق نے اِدھر مسلمان تیر اندازوں سے جگہ خالی کرادی اُدھر خالد بن الولید جو مشرکین مکہ کی صفوں میں تھے اپنے جنگی دستے کے ساتھ درّہ خالی دیکھ کر گھاٹی کی جانب چڑھ آئے اور اُن محافظین کو شہید کر دیا۔ پھر میدان میں مسلمانوں پر اچانک ٹوٹ پڑے۔ مشرکین کی اس ناگہانی اور یکبارگی حملہ سے مسلمانوں کی صفیں درہم برہم ہوگئیں۔

لمحۂ آخیر

مسلمانوں کے علمبردار حضرت مُصعَب بن عمیرؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب تھے۔ دشمنانِ اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل قریب ہوگئے۔ سیّدنا مصعبؓ نے کافروں کا مقابلہ کیا لیکن شہید ہوگئے۔ آپؐ نے جنگی عَلَم حضرت علیؓ کے سپرد فرما دیا۔ سیدنا علیؓ آپؐ کی حفاظت کیلئے سامنے آگئے۔ چونکہ حضرت مُصعبؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمشکل تھے اس لئے کسی شیطان نے یہ افواہ اُڑادی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) شہید ہوگئے۔ اس افواہ نے مسلمانوں میں مزید اضطراب پھیلا دیا اور مسلمان بدحواس ہوگئے۔ اسی بدحواسی میں دوست و دشمن کا بھی امتیاز نہ رہا اور آپس میں ایک دوسرے پر تلواریں چلنے لگیں۔ حضرت حذیفہؓ کے مسلمان والد حضرت یمانؓ بھی اسی اضطراب و بدحواسی میں ایک مسلمان کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔

مگر چند صحابہ فوراً سنبھلے اور ثابت قدم صحابہ نے للکارا کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو اب ہم زندہ رہ کر کیا کریں؟ آؤ اور جنگ کا فیصلہ کرکے دم لو۔

مشہور مؤرخ ابن سعدؒ فرماتے ہیں کہ اس ہلچل اور اضطراب میں صرف چودہ اصحابِ کرام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ مہاجرین میں سے سات اور انصار میں سے سات حضرات جن کے نام بھی ابن سعدؒ نے نقل کئے ہیں۔

رفیقِ جنّت

صحیح مسلم میں حضرت انسؓ سے ایک روایت منقول ہے کہ جب مشرکین کا دباؤ آپؐ پر بڑھ گیا تو آپ نے بلند آواز سے اعلان کیا کون ہے جو ان مشرکین کو مجھ سے دُور کرے اور جنّت میں میرا

رفیق بنے ؟

انصار میں کے ساتوں آدمی اس وقت آپؐ کے پاس تھے۔ سات کے سات انصاری باری باری سے آپؐ کے سامنے آئے اور مشرکین سے لڑ کر شہید ہو گئے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۰۷)

اِن میں حضرت زیاد بن سکن رضؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ جب وہ زخم کھا کر گر پڑے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِن کو میرے قریب لاؤ۔ صحابہؓ نے اِن کو آپؐ کے قریب کر دیا۔ حضرت زیاد رضؓ نے اپنا رُخسار آپؐ کے قدم مبارک پر رکھ دیا اور اسی حالت میں اپنی جان اللہ کے حوالہ کر دی۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ۔ (ابن ہشام ج ۲ ص ۸۲)

دندانِ مبارک

حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کے کافر بھائی عُتبہ بن ابی وقاص نے موقع پاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک پتھر پھینکا جس سے آپؐ کا دندان شہید ہو گیا اور نیچے کا ہونٹ زخمی ہو گیا۔ حضرت سعد رضؓ فرماتے ہیں کہ اس موقع پر میں اپنے حقیقی بھائی عُتبہ کے قتل کا جسقدر حریص و خواہشمند رہا اتنا کسی کے قتل کا کبھی حریص نہ ہوا۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۲۸۱)

عبداللہ بن قمیہ نے جو قریش کا نامی گرامی پہلوان تھا آپؐ پر اس زور سے حملہ کیا کہ رُخسار مبارک زخمی ہو گیا اور آہنی خُود کے دو حلقے رُخسار مبارک میں گھس گئے۔

اسکے بعد کہنے لگا :-

خُذْهَا وَأَنَا ابْنُ قِمْئَةَ

مزہ چکھو میں ابن قمیہ ہوں۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا :-

أَقْمَأَكَ اللّٰہُ۔

اللہ نے تجھے ذلیل و خوار کر دیا۔

چند روز بھی نہ گزرے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر ایک پہاڑی بکرا مسلّط کر دیا جس نے اُسے اپنے سینگوں سے مار مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

(فتح الباری ج ۷، ص ۲۸۱)

عبد اللہ بن شہاب مشرک نے پتھر مار کر آپؐ کی پیشانی مبارک کو زخمی کر دیا۔ چہرہ انور پر جب خون بہنے لگا تو حضرت ابو سعید خدری رضؓ کے والد ماجد مالک بن سنان رضؓ نے تمام خون چوس کر چہرۂ انور کو صاف کر دیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:۔

لَنْ تَمَسَّكَ النَّارُ۔

جہنم کی آگ تجھکو ہرگز نہ چھوئے گی۔　　(زرقانی ج ۲ ص ۳۸)

سیّدنا طلحہ رضؓ کی جانبازی

مشرکین کے اس پتھراؤ اور دباؤ کے باعث آپؐ ایک گڑھے میں گر پڑے حضرت علی رضؓ اور حضرت طلحہ رضؓ نے سہارا دے کر آپؐ کو کھڑا کیا۔ ایک موقعہ پر سیدنا طلحہ رضؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کندھوں پر اُٹھا کر ایک بلند مقام پر چڑھا دیا۔ سیدنا زبیر رضؓ فرماتے ہیں کہ اس وقت میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا:۔

اَوْجَبَ طَلْحَۃُ

طلحہ رضؓ نے اپنے لئے جنّت واجب کر لی۔

حضرت قیس بن ابی حازم رحؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت طلحہ رضؓ کا وہ ہاتھ دیکھا جس سے اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُحد کے دن مشرکین کے حملے سے بچایا تھا وہ بالکل شل ہو گیا تھا۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضؓ کہتے ہیں کہ دشمنوں کے وار روکتے روکتے حضرت طلحہ رضؓ کی انگلیاں کٹ گئیں تھیں۔ اس روز حضرت طلحہ رضؓ کو (۳۵) یا (۲۹) زخم لگے تھے۔

سیدہ عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضؓ جب

کبھی غزوۂ اُحد کا ذکر کرتے تو فرمایا کرتے :۔

كَانَ ذٰلِكَ الْيَوْمَ لِطَلْحَةَ رض۔

یہ دن تو سارا طلحہ رض کیلئے رہا۔

حضرت سعد رض اور حضرت ابُو دجانہ رض کی فِداکاری

حضرت سعد بن ابی وقاص رض بڑے تیرانداز تھے۔ اُحد کے دن ایک ہزار سے زائد تیر چلائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی پیٹھ کے پیچھے لے لیا اور مشرکین کے جس قدر بھی تیر آتے اسکو اپنے ہاتھ اور سینے سے روک لیتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ترکش کے تمام تیر نکال کر اِن کے سامنے ڈال دیئے اور فرماتے تھے۔

اِرْمِ فِدَاكَ اَبِیْ وَاُمِّیْ

تیر چلا تجھ پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔

سیدنا علی رض فرماتے ہیں کہ میں نے سوائے سعد بن ابی وقاص رض کے کسی اور کے لئے یہ جُملہ نہیں سُنا (بخاری غزوۂ اُحد صا۵۸)

حضرت ابو دجانہ رض بھی سپر بنکر آپؐ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور پُشت مشرکین کی جانب کر دی تھی۔ تیر پر تیر چلے آرہے تھے مگر ابو دجانہ رض حرکت نہیں کرتے تھے کہ کہیں کوئی تیر آپؐ کو لگ نہ جائے۔

حضرت قتادہ رض کی جاں نثاری

حضرت قتادہ بن نعمان رض فرماتے ہیں کہ اُحد کے دن میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس کی حفاظت کے لئے سامنے کھڑا ہو گیا تھا تاکہ دشمنوں کا کوئی تیر آپؐ کو زخمی نہ کر دے۔

دشمنوں کا آخری تیر میری آنکھ پر ایسا لگا کہ آنکھ کا ڈھیلا باہر نکل آیا میں نے اُسکو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آپؐ کی خدمت میں

حاضر ہوا آپؐ یہ دیکھ کر آب دیدہ ہوگئے اور میرے لئے دُعا فرمائی :-

"اے اللہ جس طرح قتادہ رضؓ نے تیرے نبی کے چہرے کی حفاظت کی ہے اسی طرح تو بھی اُسکے چہرے کی حفاظت فرما۔"

یہ دُعا دے کر آپؐ نے آنکھ کے ڈھیلے کو اُسکی اپنی جگہ رکھ دیا، اللہ کی قسم اُسی وقت میری آنکھ بالکل صحیح و سالم بلکہ پہلے سے بہتر اور تیز ہوگئی۔ (الاصابہ ج ۳ ص ۲۲۵)

حضرت انس بن نضرؓ کی شہادت

حضرت انس رضؓ فرماتے ہیں کہ میرے چچا انس بن نضر رضؓ کی شہادت بھی عجیب و غریب ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کرتے تھے یا رسول اللہ میں اسلام کی پہلی لڑائی غزوۂ بدر میں شریک نہ ہوسکا تھا اگر دوبارہ ایسا کوئی موقع آئے تو آپ دیکھیں گے کہ میں اللہ کی راہ میں کیسی جانبازی اور سرفروشی دکھاؤں گا۔ جب معرکہ اُحد میں کچھ لوگ شکست کھا کر بھاگ رہے تھے تو حضرت انس بن نضر رضؓ نے اللہ کو پکارا اور کہنے لگے اے اللہ مسلمانوں سے جو فعل سرزد ہوگیا ہے میں تیری جناب میں اسکی معذرت پیش کرتا ہوں اور جو عمل مشرکین نے کیا ہے میں اُس سے بری اور بیزار ہوں۔

اسکے بعد آگے بڑھے تو حضرت سعد بن معاذ رضؓ نظر آئے فرمایا: أَيْنَ يَا سَعْدُ إِنِّي أَجِدُ رِيحَ الْجَنَّةِ دُونَ أُحُدٍ۔

"اے سعد رضؓ کہاں جارہے ہو؟ میں جبل اُحد کے نیچے جنّت کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے اور دشمنوں کا سخت مقابلہ کیا یہاں تک کہ شہید ہوگئے۔ لڑائی کے بعد جب شہیدوں کو جمع کیا گیا تو حضرت انس بن نضر رضؓ کے جسم پر تلوار و تیر کے اسّی سے زیادہ زخم شمار کئے گئے۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَرَضُوا عَنْهُ۔ (بخاری کتاب المغازی ج ۱ ص ۵۷۹)

ایک جاں افزا ندا

صحابہ کی پریشانی اور بے چینی کا بنیادی سبب وہ افواہ تھی جسکو مشرکین نے اُڑایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قتل ہوگئے ہیں۔ اس سراسیمگی کی حالت میں سب سے پہلے حضرت کعب بن مالکؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صحیح وسالم حالت میں دیکھا تو پکار اُٹھے :-

اے مسلمانو تمہیں بشارت ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں۔

حضرت کعبؓ کی ایک ہی آواز پر صحابہ پروانہ وار آپؐ کے گرد آکر جمع ہونے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر مشہور مشرک سردار اُبیّ بن خلف گھوڑا دوڑاتا ہوا مجمع کے قریب پہنچ گیا۔ مکّہ میں اُس نے اپنے گھوڑے کو خوب کھلا پلا کر موٹا تازہ کیا تھا اور یہ کہا کرتا تھا کہ اس پر سوار ہو کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کروں گا۔ جب وہ قریب ہوا تو صحابہ نے آپ کو اس کی اطلاع دی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا انشاء اللہ میں ہی اس کو قتل کروں گا۔ جب وہ بالکل قریب آگیا تو حضرت حارث بن صمہ رضہ کا نیزہ لے کر آپؐ نے اُس کی گردن پر ایک کوچہ دیا جس سے وہ بلبلا اُٹھا اور چلاتا ہوا واپس ہوا کہ اللہ کی قسم محمدؐ نے مجھے مار ڈالا۔ اسکے لوگوں نے اسکو عار دلائی کہ معمولی زخم پہ اتنا شور و پکار؟ لیکن وہ اسی طرح چیختا چلاتا مقام سرف پہنچ کر مرگیا۔ (البدایہ والنہایہ ج ۴ صـ۳۵)

مشرکین نے مسلمانوں کی نعشوں پہ اپنا بغض و عناد نکالنا شروع کیا۔ نعشوں کے ناک، آنکھ، کان، ہاتھ، پیر کاٹنے لگے۔ عورتیں بھی اس بُزدلی میں شریک ہوگئیں۔ ہندہ نے جس کا باپ عُتبہ جنگ بدر میں حضرت حمزہ رضہ کے ہاتھوں مارا گیا تھا اُس نے سیدنا حمزہ رضہ کا پیٹ اور سینہ چاک کیا اور حالتِ غضب میں جگر نکال کر چبا دیا لیکن وہ حلق سے اُتر نہ سکا تو اُگل دیا اور اس خوشی میں سیدنا حمزہ رضہ کے قاتل وحشی بن حرب کو اپنے گلے کا زیور دے دیا۔ (زرقانی ج ۲ صـ۴۴)

مشرکین کا یہ آخری کام تھا جو میدانِ اُحد میں مسلم نعشوں کے ساتھ ہو رہا تھا اس کے بعد

مشرکین منتشر ہونے لگے اور میدان خالی ہوگیا۔

شہادت حضرت سعد بن ربیع رضؓ

قریش کی روانگی کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت رضؓ کو حکم دیا کہ سعد بن ربیع رضؓ انصاری کو تلاش کرو اگر وہ زندہ موجود ہوں تو میرا اسلام کہنا اور خیریت پوچھنا۔

حضرت زید رضؓ فرماتے ہیں کہ نعشوں میں ڈھونڈتا ہوا حضرت سعد بن ربیع رضؓ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ ابھی اُن میں زندگی کے کچھ آثار باقی ہیں جسم پر تیر اور تلوار کے ستر زائد زخم ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام اور آپ کا پیغام پہنچایا۔ حضرت سعد بن ربیع رضؓ نے نہایت بشاشت اور مسرت سے جواب دیا:۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر سلام ہو اور تم کو بھی سلام،
میرے سرکار رضؓ کو میرا ابھی یہ پیام پہنچا دینا۔
یا رسول اللہ! اس وقت میں جنت کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں،
اور میری قوم انصار سے یہ کہہ دینا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف پہنچی جبکہ تم میں سے ایک آنکھ بھی دیکھنے والی موجود ہو تو سمجھ لینا کہ اللہ کے ہاں تمہارا کوئی بھی عذر مقبول نہ ہوگا۔

اس سلام و پیام کے بعد حضرت سعد بن ربیع رضؓ انصاری کی روح پرواز کر گئی۔ رَحْمَۃُ اللہِ عَلَیْہِ۔ (زرقانی ج ۲ ص ۴۹)

حضرت اُبی بن کعب رضؓ بھی اس موقعہ پر موجود تھے وہ فرماتے ہیں کہ میں واپس ہوا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر دی آپؐ نے سنکر فرمایا:۔

اللہ اُس پر رحمت فرمائے۔ اللہ اور اسکے رسول کا خیر خواہ اور وفادار رہا، زندگی میں بھی اور مرتے وقت بھی۔

(استیعاب ابن عبد البر ج ۲ ص ۳۵)

(حاشیہ اصابہ)

شہادت سیدنا حمزہ رضؓ

سیدنا حمزہ رضؓ سیدنا الشہداء کی تلاش میں خود بنفس نفیس

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نکلے۔ جبل اُحد کی بطن وادی میں ناک آنکھ، کان کٹے ہوئے شکم وسینہ چاک حالت میں پائے گئے دشمنوں نے بڑی بیجگری سے شہید کر دیا تھا۔ یہ دل آزار منظر دیکھ کر آپؐ کے آنسو نکل آئے دل بھر آیا فرمایا:۔

"پیارے چچا تم پر اللہ کی رحمت ہو جہاں تک مجھے معلوم ہے تم بڑے نیک اور صلہ رحمی کرنے والے تھے۔

اگر صفیہ رضؓ (سیدنا حمزہ رضؓ کی بہن) کے حُزن وغم کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں تم کو اسی حالت میں چھوڑ دیتا کہ درندے اور پرندے تم کو کھالیتے پھر قیامت کے دن پوری عزت وشان کے ساتھ تمہارا ہر ہر جانور کے پیٹ سے حشر ہوتا۔"

پھر اسی جگہ کھڑے کھڑے آپؐ نے یہ بھی اعلان فرمایا:۔

"اللہ کی قسم اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کافروں پر غلبہ دیا تو آپکے بدلہ ستّر کافروں کی لاشوں کو بگاڑ دوں گا۔"

ابھی آپؐ ہٹنے بھی نہ پائے تھے کہ سورۂ نحل کی آیت ۱۲۶ نازل ہوئی اور آپؐ کو ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔ (مستدرک ج ۳ صفحہ ۱۹۷)

معجم طبرانی کی ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے سیدنا حمزہ رضؓ کو "سیّد الشہداء" کا خطاب دیا ہے۔

(حضرت حمزہ رضؓ قیامت تک کے تمام شہیدوں کے سردار ہیں۔)

شہادت حضرت عبد اللہ بن جحش رضؓ

اسی غزوۂ اُحد میں حضرت عبد اللہ بن جحش رضؓ کی والہانہ شہادت کا واقعہ بھی پیش آیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کہتے ہیں کہ اُحد کے دن جنگ شروع ہونے سے پہلے عبد اللہ بن جحش رضؓ نے مجھکو ایک طرف بلا کر تنہائی میں یہ کہا:۔

اے سعد رضؓ آؤ ہم دونوں کہیں علیحدہ بیٹھکر دُعا مانگیں اور ہر ایک دوسرے کی دُعا پر آمین کہے۔

پھر ہم دونوں میدان کے ایک گوشہ میں چلے گئے۔ پہلے میں نے اس طرح دُعا مانگی۔

"اے اللہ! آج میرا ایسے دشمن سے مقابلہ ہو جو کہ نہایت دلیر اور غضبناک ہو۔ کچھ دیر تک میں اُس کا مقابلہ کروں اور وہ میرا مقابلہ کرے پھر اسکے بعد مجھے اُسپر غلبہ نصیب ہو یہاں تک کہ میں اُسکو قتل کر دوں اور اس کا مال غنیمت بنا لوں"

حضرت عبد اللہ بن جحش رضہ نے میری اس دُعا پر آمین کہی۔ پھر اسکے بعد وہ اس طرح دُعا کیلئے ہاتھ اُٹھائے :-

اے اللہ! آج میرا ایسے دشمن سے مقابلہ ہو جو بڑا سخت اور زور آزما ہو اور میں اُس سے صرف تیری رضا و خوشنودی کے لئے مقابلہ کروں اور وہ بھی مجھ سے قتال کرے اور بالآخر وہ مجھے شہید کر دے اور میری نعش کو بگاڑ دے۔

اور اے پروردگار جب میں آپ سے ملاقات کروں تو آپ مجھ سے دریافت فرمائیں اے عبد اللہ یہ تیرے ناک، کان، ہاتھ، پیر کہاں کٹے ہیں ؟ تو میں عرض کروں کہ

اے اللہ تیری اور تیرے رسولؐ کی راہ میں بگاڑا گیا ہوں!

اسپر اے اللہ تو یہ فرمانا: يَا عَبْدَ اللّٰهِ قَدْ صَدَقْتَ

اے عبد اللہ تو سچا ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضہ فرماتے ہیں کہ میں نے اِن کی اس دُعا پر آمین کہی۔

پھر اُحد کا معرکہ شروع ہوا دونوں حضرات کو ایسے ہی دشمن سے سابقہ پڑا جس کی انھوں نے دُعا مانگی تھی۔ حضرت سعد رضہ فرماتے ہیں کہ شام کے وقت نعشوں میں حضرت عبد اللہ بن جحش رضہ کو دیکھا کہ اُنکی ناک، آنکھ، کان کٹے ہوئے ہیں۔ خدا کی قسم اُن کی دُعا میری دُعا سے کہیں بہتر تھی۔ (حدیث مرسل صحیح مستدرک ج ۳ ص۲۰۰)

اس واقعہ کے بعد حضرت عبد اللہ بن جحش رضہ "مُجَدَّعٌ فِي اللّٰهِ" (راہِ خدا میں کٹا پھٹا بدن) کے لقب سے مشہور ہوئے۔ (اصابہ ج ۲ ص۲۸۷)

سیدنا عبدُاللہ بن عمرو بن حرام رضؓ کی شہادت

یہ صحابی حضرت جابر رضؓ کے والد ماجد ہیں جو اسی معرکہ میں شہید ہوئے۔ حضرت جابر رضؓ فرماتے ہیں میرے والد غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے۔ کافروں نے اِن کا مُثلہ کیا (ناک، آنکھ کان وغیرہ کٹے ہوئے) جب ان کی لاش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائی گئی تو میں نے اپنے والد کے منھ سے کپڑا اٹھاکر دیکھنا چاہا تو صحابہ کرام نے منع کیا۔ میں نے دوبارہ منھ دیکھنا چاہا تو پھر منع کیا گیا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔ میری پھوپی فاطمہ بنت عمرو رضؓ یہ منظر دیکھ کر بہت رونے لگی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کیوں روتی ہو؟ اس پر تو فرشتے برابر سایہ کئے ہوئے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء یہ تھا کہ یہ واقعہ رنج وغم کا نہیں ہے بلکہ بڑی عزت ومسرت کا مقام ہے کہ فرشتے اُنپر سایہ کئے ہوئے ہیں۔

خود حضرت جابر رضؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا اے جابر رضؓ تجھ کو کیا ہوگیا ہے کہ میں اکثر تجھ کو شکستہ حال دیکھتا ہوں؟

میں نے عرض کیا یارسول اللہ آپ کو معلوم ہے میرے باپ عبداللہ رضؓ جنگ اُحد میں شہید ہوئے ہیں اور کثیر آل وعیال اور قرض کا بوجھ چھوڑ گئے ہیں کچھ زمین وجائیداد بھی نہیں چھوڑی جس کے ذریعہ میں گھر والوں کی کفالت کرسکوں یہی غم وفکر مجھے ستائے رکھتا ہے۔

آپؐ نے میری یہ بات سنکر فرمایا کیا میں تجھ کو ایک خوشخبری نہ سناؤں؟ میں نے عرض کیا کیوں نہیں ضرور سنائیے! آپؐ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے کسی بھی بندے سے منھ درمنھ کلام نہیں کیا مگر تیرے باپ سے بعد شہادت بالمشافہ بات کی ہے اور یہ کہا اے میرے بندے اپنی تمنا میرے آگے پیش کر! تیرے باپ نے عرض کیا اے میرے

رب میری تمنا یہ ہے کہ مجھے دوبارہ زندہ کر اور اپنی راہ میں دوبارہ شہادت کا موقعہ عطا فرما۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ تو نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ واپسی نہیں ہوگی۔

(فتح الباری ج ۶ ص ۲۵ باب تمنی المجاہد اَن یرجع الی الدنیا)

سیّدنا عمرو بن الجموح رضؓ کی شہادت

اسی غزوۂ اُحد میں حضرت عمرو بن الجموح رضؓ کی شہادت پیش آئی۔ یہ صحابی حضرت جابر رضؓ کے پھوپا ہوتے ہیں۔ اِن کی شہادت کا واقعہ بھی عجیب وغریب ہے۔ حضرت عمرو بن الجموح رضؓ کے پیر میں لنگ تھا اور یہ لنگ معمولی نہ تھا بلکہ نمایاں تھا۔ ان کے چار بیٹے تھے جو ہر غزوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہا کرتے تھے۔ اُحد کے دن چلتے وقت اُنھوں نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ اس غزوہ میں میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا! بیٹوں نے کہا اباجان! آپ معذور ہیں اللہ کی کتاب نے آپ کو گھر بیٹھے رہنے کی اجازت دی ہے۔ آپ اس اجازت سے کیوں نہیں استفادہ کرتے؟

باپ کو شوقِ شہادت نے بیتاب کر دیا تھا۔ بیٹوں کے مشورے کو قبول نہیں کیا لنگڑاتے لنگڑاتے بارگاہِ نبوی میں حاضری ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہؐ میرے بیٹے مجھ کو آپؐ کے ساتھ جہاد میں شریک ہونے سے روک رہے ہیں۔

وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَرْجُوْ اَنْ اَطَأَ بِعَرْجَتِیْ ھٰذِہٖ فِی الْجَنَّۃِ۔

اللہ کی قسم میں پوری اُمید رکھتا ہوں کہ اپنے اسی لنگڑے پیر کے ساتھ جنت کی زمین کو روندوں۔

آپؐ نے ان کے اس شوقِ شہادت کو دیکھ کر بطور تسلی فرمایا اللہ نے تم کو معذور کیا ہے تم پر جہاد فرض نہیں ہے۔ پھر آپؐ نے

اُن کے بیٹوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا اگر انھیں نہ روکو تو کیا حرج ہے؟ شاید اللہ تعالیٰ انھیں اپنی راہ کی شہادت نصیب کرے۔

(سیرت ابن ہشام ج ۲ ص۹۰)

یہ سنتے ہی حضرت عمرو بن الجموح رضؓ اپنے گھر واپس ہوئے اور جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ اُحد کی جانب چلتے وقت قبلہ کی جانب منھ کیا اور یہ دُعا مانگی:-

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي الشَّهَادَةَ وَلَا تَرُدَّنِي إِلٰى أَهْلِي.

اے اللہ مجھے شہادت نصیب فرما اور مجھے میرے گھر کی جانب نہ لوٹا۔

ذوق و شوق کے ساتھ میدان جہاد کی جانب چل پڑے۔ اپنی طاقت اور بساط کے مطابق جہاد میں حصہ لیا اور جامِ شہادت نوش کیا۔ رضی اللہ عنہ۔ اور اپنی اُس قسم کو پوری کیا جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پیش کی تھی۔

ایک عظیم کرامت

اسی غزوہ اُحد میں سیدنا عمرو بن الجموح رضؓ کے علاوہ ان کے بیٹے خلاّد بن عمرو رضؓ اور بہنوئی عبداللہ بن عمرو رضؓ بھی شہید ہوئے۔ حضرت عمرو بن الجموح رضؓ کی بیوی ہندہ بنت عمرو رضؓ بیان کرتی ہیں کہ جہاد ختم ہونے کے بعد نعشوں کو جب دفن کرنے کی تیاری کی جارہی تھی تو میں نے اپنے شوہر حضرت عمرو بن الجموح رضؓ اور بیٹے خلاّد بن عمرو رضؓ اور بھائی عبداللہ بن عمرو رضؓ کی لاشوں کو ایک اونٹ پر رکھ کر مدینہ طیّبہ کی جانب لے جانا چاہا تاکہ وہاں ان تینوں کی تدفین عمل میں آئے لیکن جب میں اونٹ کو مدینہ طیّبہ کی جانب ہانکتی تو تیز چلنے لگتا تھا۔ یہ صورتِ حال میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی۔ آپؐ نے مجھ سے دریافت کیا کیا عمرو بن الجموح رضؓ نے مدینہ طیّبہ سے چلتے وقت کچھ کہا تھا؟

میں نے جواب دیا یا رسول اللہ وہ چلتے وقت یہ دُعا کر رہے تھے:-

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي الشَّهَادَةَ وَلَا تَرُدَّنِي إِلٰى أَهْلِي.

"اے اللہ مجھے شہادت نصیب فرما اور گھر کی طرف واپس نہ لوٹا۔"
اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تب ہی تو اونٹ مدینہ کی جانب نہیں چلتا اور یہ ارشاد فرمایا:-

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ اِنَّ مِنْکُمْ مَنْ لَّوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ مِنْہُمْ عَمْرُو بْنُ الْجَمُوْحِ رض
وَلَقَدْ رَاَیْتُہٗ یَطَأُ بِعَرْجَتِہٖ فِی الْجَنَّۃِ۔

(زرقانی ج ۲ صفحہ ۵)

قسم ہے اُس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم میں بعض بندے ایسے بھی ہیں اگر وہ کسی بات پر قسم کھالیں تو اللہ اُسے ضرور پورا کردے گا۔ ایسے لوگوں میں عمرو بن الجموح رض بھی شامل ہیں۔ یقیناً میں نے اُنھیں اپنے پیر کے لنگ کے ساتھ جنت میں چلتا ہوا دیکھا ہے۔

اسکے بعد آپؐ نے اُن کی بیوی کو مشورہ دیا کہ اُنھیں جبل اُحد کے دامن ہی میں دفن کردیں۔ چنانچہ اُحد کے قریب ہی اُنھیں دفن کر دیا گیا۔

سیّدنا خُثَیمہ رض کی شہادت

حضرت خثیمہ رض جن کے بیٹے حضرت سعد بن خثیمہ رض غزوۂ بدر میں شہید ہوگئے تھے۔

غزوۂ احد کے دن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہؐ جنگ بدر کے موقعہ پر میرے اور بیٹے سعدؓ کے درمیان قرعہ اندازی کی گئی تھی کہ آپؐ کا کون ساتھ دے اور کون گھر کی نگرانی پر رہے؟ قرعہ میرے بیٹے کے نام نکلا اور غزوۂ بدر میں شرکت کی سعادت اُس کی قسمت میں تھی اور وہ اُس غزوہ میں شہید بھی ہوگیا۔ یارسول اللہؐ میں اس سعادت کا بڑا ہی حریص اور مشتاق تھا لیکن میں گھر پر رہ گیا۔ یارسول اللہؐ آج شب میں نے اپنے بیٹے سعد رض کو خواب میں دیکھا ہے نہایت حسین وجمیل شکل میں

جنت کے باغات میں سیروتفریح کررہا ہے اور مجھ سے یہ کہتا ہے ابا جان !
آپ بھی یہاں آجایئے تاکہ دونوں جنت میں یکساتھ رہیں۔

یارسول اللہ! اس وقت میں اپنے بیٹے کی مرافقت کا مشتاق ہوں،
بوڑھا ہوگیا ہوں، ہڈیاں کمزور ہوگئیں ہیں اب تمنا یہ ہے کہ کسی طرح اپنے
رب سے جا ملوں! یارسول اللہؐ! آپ دُعا فرمایئے کہ غزوہ اُحد میں مجھے شہادت
نصیب ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوڑھے خثیمہ کے لئے دُعا فرمائی۔
حضرت خثیمہؓ پورے ذوق وشوق سے معرکہ اُحد میں شریک ہوئے اور
جامِ شہادت نوش کیا۔ (زاد المعاد ج ۲ ص ۹۶)

سیدنا عمرو بن ثابتؓ کی شہادت

اِن کا لقب اُصَیرم تھا اسی
لقب سے مشہور ومعروف
تھے۔ ابتداء میں اسلام اور مسلمانوں کے سخت مخالف تھے۔ جب اُحد کا
دن آیا تو اسلام کی محبت دل میں از خود اُتر آئی تلوار لیکر میدان اُحد میں
آگئے اور کافروں سے نہایت دلیری وشجاعت سے قتال کیا یہاں تک کہ
زخمی ہوکر گر پڑے۔ کسی نے پوچھا اے اُصَیرم کیا تم کو اسلام کی محبت نے
یا قومی غیرت نے مجبور کیا کہ کافروں کے ساتھ شدید قتال کریں ؟ حضرت
اُصَیرمؓ نے جواب دیا پہلے مجھے اسلام کی رغبت پیدا ہوئی تو میں اللہ اور
اسکے رسولؐ پر ایمان لے آیا اور بلا توقف تلوار لیکر میدان اُحد میں آتر آیا
یہاں تک کہ کافروں سے لڑتے لڑتے زخمی ہوگیا۔ یہ کلام ختم کیا اور خود
بھی ختم ہوگئے۔ رضی اللہ عنہ۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا حال سُنا تو جنت کی
بشارت دی۔

حضرت ابوہریرہؓ فرمایا کرتے تھے بتاؤ وہ کون شخص ہے جو جنت
میں پہنچ گیا حالانکہ اُس نے ایک نماز بھی نہیں پڑھی تھی ؟ (یہی وہ صحابی ہیں)
(اصابہ ترجمہ عمرو بن ثابت)

قرآنِ حکیم اور غزوۂ اُحد

مؤرخ ابن اسحٰق کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غزوۂ اُحد کی شان میں سورۂ آل عمران کی تقریباً ساٹھ آیات نازل کی ہیں۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ غزوۂ اُحد کا آنکھوں دیکھا حال بیان فرمائیے؟

فرمایا کہ سورۂ آل عمران کی ایک سو بیس آیات پڑھو تم کو خود سارا قصہ معلوم ہو جائے گا۔ (فتح الباری ج ۷، ص ۲۷۵)

مسلمانوں کا غزوۂ اُحد کے لئے تیار ہو جانا، درمیانِ راہ منافقین کا لشکرِ اسلام سے جُدا ہو کر مسلمانوں میں انتشار پھیلانا اور پست ہمت کرنا، ابتداءِ معرکہ میں مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہونا، ایک جماعت کا ہدایتِ رسول سے اختلاف کرنا، پھر فتح کا شکست سے بدل جانا، مسلمانوں میں انتشار و افراتفری کا پیدا ہو جانا اور کثرت سے صحابہ کا شہید ہو جانا، اور آخر میں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کا نازل ہونا اور مسلمانوں کے دلوں پر سکون اور طمانیت کا اترنا۔ ان تمام امور کو قرآن حکیم کی آیاتِ ذیل نہایت اعجاز و بلاغت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔

قرآنی مضمون

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ. الآیہ

(سورہ آل عمران آیات ۱۲۱ تا ۱۲۲)

اور وہ وقت بھی یاد کیجئے جب آپ اے نبی اپنے گھر والوں (حجرۂ عائشہ) کے پاس سے نکلے مسلمانوں کو جہاد کے لئے مناسب مقامات لے جاتے ہوئے (یہ ۷ رشوال ۳ھ ہفتے کی صبح کا وقت تھا) اور اللہ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے۔

جب تم سے دو جماعتیں (قبیلہ اوس کے بنی حارثہ اور قبیلہ خزرج کے بنی سلمہ) اس کا خیال کر بیٹھی تھیں کہ ہمت ہار دیں (لیکن اس ارادے پر عمل کرنے نہیں پائیں) اور اللہ تو دونوں جماعتوں کا مدد گار تھا اور مسلمانوں

کو تو اللہ ہی پر اعتماد رکھنا چاہیئے (کہ آئندہ ایسی بدہمتی کا خیال بھی نہ آنے پائے) اور یقیناً اللہ نے تمہاری نصرت کی بدر کے میدان میں حالانکہ تم کمزور تھے تو اللہ سے ڈرتے رہو عجب کیا ہے کہ تم شکرگزار بن جاؤ. (تقویٰ کی عادت تمہیں شکرگزار بنا دے گی)

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. الآیہ (آل عمران آیات ۱۳۹ تا ۱۵۵)

اور نہ ہمت ہارو اور نہ غم کرو تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن رہے
اگر تم کو کوئی زخم اُحد میں پہنچا ہے تو اِن (کافر) لوگوں کو بھی تو ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے (بدر کے معرکہ میں) دراصل یہ ہار جیت کے اوقات ہیں جنھیں ہم انسانوں میں اِدھر اُدھر پھراتے رہتے ہیں. اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو (ظاہری طور پر بھی) جان لے اور تم میں سے چند کو شہید بنائے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا. اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو میل کچیل سے صاف کر دے اور کافروں کو مٹا دے.

شاید تم لوگ اس گمان میں ہو کہ جنت میں یوں ہی داخل ہو جاؤ حالانکہ ابھی اللہ نے (ظاہری طور پر) تم میں سے اُن لوگوں کو دیکھا ہی نہیں ہے جنھوں نے جہاد کیا ہو اور نہ اُن کو دیکھا جو جہاد میں ثابت قدم رہنے والے ہوں. (یعنی یہ بات ظاہر ہی نہ ہوئی کہ اُنھوں نے جہاد میں ثابت قدمی دکھائی ہو) اور تم لوگ تو شہادت کی تمنا کر رہے تھے قبل اسکے کہ موت سامنے آجائے سو اُسکو تو اب تم نے کھلی آنکھوں دیکھ لیا (پھر اس سے خوف وہراس کیوں؟ معرکہ بدر میں مسلمانوں کی غیر معمولی کامیابی سنکر بعض صحابہ کے دل میں یہ خیالات آتے تھے کہ افسوس ہم اس موقعہ پر حاضر نہ تھے کاش کوئی معرکہ پھر اس قسم کا آجائے تو ہم اپنی جانوں کی بازی لگا دیں گے. آیت مذکورہ میں انہی کو جواب دیا جا رہا ہے کہ پہلے تو یہ ہمت تھی اب ایسی پست ہمتی کیوں)

اور محمد تو رسول ہی ہیں (اللہ نہیں جس پر موت یا قتل محال ہے) اُن سے پہلے اور بھی بہت رسول گزر چکے ہیں سو اگر یہ وفات پاجائیں یا شہید

ہوجائیں تو کیا تم لوگ اُلٹے پاؤں واپس چلے جاؤ گے۔ اور جو کوئی بھی اُلٹے پاؤں واپس چلا جائے گا وہ اللہ کا کچھ بھی نقصان نہیں کرے گا۔ اور اللہ عنقریب شکر گزاروں کو بدلہ دے گا۔

اور ممکن نہیں کسی جاندار کے لئے کہ وہ ایک میعادِ مقرر پر حکم الٰہی کے بغیر مرجائے۔ اور جو کوئی دنیا کا فائدہ چاہتا ہے ہم اُسکو دنیا کا حصّہ دے دیتے ہیں اور جو کوئی آخرت کا نفع چاہتا ہے تو اُسے آخرت کا حصّہ دے دیں گے۔ اور عنقریب ہم شکر گزاروں کا بدلہ دے دیں گے۔

اور کتنے نبی ہو چکے ہیں کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والے لڑے ہیں۔ سو جو کچھ انھیں اللہ کی راہ میں پیش آیا اس سے نہ تو اُنھوں نے ہمت ہاری اور نہ کمزور پڑے اور نہ وہ دبے اور اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اور اُن کا کہنا تو بس اتنا ہی تھا کہ وہ کہتے رہے اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہمارے کاموں میں ہمارے حد سے نکل جانے کو بخش دے اور ہم کو ثابت قدم رکھیئے اور ہم کو کافروں پر غالب رکھیئے۔ سو اللہ نے انھیں دنیا کا بھی حصّہ دیا اور آخرت کا بھی عمدہ بدلہ دیا اور اللہ نیکوکاروں سے محبت رکھتا ہے۔

اے ایمان والو اگر تم اِن لوگوں کا کہنا مانو جو کافر ہیں تو وہ تم کو اُلٹا پھیر دیں گے پھر تم ناکام ہو جاؤ گے بلکہ اللہ تمہارا دوست ہے اور وہ سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے۔

ہم ابھی کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دینگے اس لئے کہ اُنھوں نے اللہ کا شریک ایسی چیز کو ٹھیرایا ہے جس کے لئے کوئی دلیل اللہ نے نازل نہیں کی اور اُن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور کیسی بُری جگہ ظالموں کے لئے ہے۔ اور یقیناً تم سے اللہ نے اپنا وعدہ سچّا کر دکھایا تھا جس وقت کہ تم اُن کافروں کو بحکم خداوندی قتل کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب تم ہی خود کمزور ہو گئے اور آپس میں اختلاف کرنے لگے اور تم کہنے پر

نہ چلے (یعنی حکم رسولؐ کی اطاعت نہ کی) بعد اسکے کہ اللہ نے تمہیں دکھا دیا تھا جو کچھ کہ تم چاہتے تھے۔ بعض تم میں سے وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے (یعنی غنیمت لوٹنے میں مشغول ہو گئے) اور بعض تم میں ایسے تھے جو آخرت چاہتے تھے (یعنی یہ وہ دس تیر انداز صحابی تھے جو حکم رسول کے احترام میں آخر وقت تک اپنی جگہ پر قائم رہے) پھر تم کو اللہ نے اُن سے ہٹا دیا تاکہ اللہ تمہاری آزمائش فرمائے۔ اور یقین جانو کہ اللہ نے تمہیں معاف کر دیا اور اللہ بڑے فضل والے ہیں مسلمانوں پر۔

وہ وقت یاد کرو جب تم چڑھے جا رہے تھے اور مڑ کر بھی کسی کو نہ دیکھتے تھے اور رسولؐ تم کو پکار رہے تھے تمہارے پیچھے کی جانب سے (معرکہ اُحد میں خالد بن الولید کے اچانک حملہ سے مسلمانوں میں بدحواسی اور افراتفری پھیل گئی تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند ساتھیوں کو ساتھ لے کر دشمن کا تعاقب کر رہے تھے اور آواز دے رہے تھے کہ اِدھر آؤ ادھر آؤ۔ سو اللہ نے تمہیں غم دیا۔ غم کی پاداش میں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دُکھ پہنچنے کے بدلے دُکھ ملا) تاکہ تم رنجیدہ نہ ہوا کرو اُس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اُس مصیبت سے جو تم پر پڑے اور اللہ تو تمہارے کاموں سے خوب باخبر ہے۔

پھر اللہ نے اُس غم کے بعد تمہارے اوپر راحت نازل کی یعنی غنودگی کہ اس کا تم میں سے ایک جماعت پر غلبہ ہو رہا تھا اور ایک جماعت (منافقوں کی) وہ بھی تھی کہ اُسے اپنی جانوں کی پڑی تھی۔ یہ لوگ اللہ کے بارے میں بُرے خیالات کر رہے تھے جو کہ محض حماقت کا خیال تھا، وہ یوں کہہ رہے تھے کہ ہمارا کچھ اختیار چلتا ہے؟ اے نبی آپ کہہ دیجئے کہ اختیار تو سارا اللہ ہی کا ہے۔ یہ لوگ دلوں میں ایسی بات چھپائے ہوئے ہیں جو آپؐ پر ظاہر نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ کچھ بھی ہمارا اختیار چلتا تو ہم یہاں مارے نہ جاتے۔ آپؐ کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تب بھی وہ لوگ تو جن کے لئے قتل مقدر ہو چکا تھا اپنی قتل گاہوں کی

طرف ہی نکل پڑتے (مطلب یہ کہ احکام تقدیری سے باہر رہنا کسی صورت ممکن نہیں) اور یہ سب اس لئے ہوا کہ اللہ تمہارے باطن کی آزمائش کرے اور تاکہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اُسے صاف کردے اور اللہ باطن کی باتوں کو خوب جانتا ہے۔

یقیناً تم میں سے جو لوگ اُس (اُحد کے) دن پُشت پھیر دیئے تھے جس دن کہ دونوں جماعتیں باہم مقابل ہوئی تھیں (میدان اُحد میں) اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوئی کہ شیطان نے اُن کے بعض اعمال کے سبب لغزش دے دی، اور یقین جانو کہ اللہ نے انھیں معاف کردیا۔ واقعی اللہ بڑی مغفرت کرنے والے بڑے برداشت کرنے والے ہیں (کہ فوراً مواخذہ نہیں کرتے بلکہ توبہ واستغفار کا موقعہ دیتے ہیں)

نتائج و عبر

کرمِ عظیم

غزوہ اُحد میں سیدنا حمزہ رضؓ کے دلیرانہ حملہ سے مشرکین کی صفوں میں انتشار تھا۔ جس پر تلوار اُٹھاتے اُس کی لاش زمین پر نظر آتی تھی۔

جُبیر بن مطعم کا حبشی غلام وحشی بن حرب اپنے آقا کو خوش کرنے اور اپنی آزادی حاصل کرنے کے لئے سیدنا حمزہ رضؓ کی تاک میں چُھپتا چُھپاتا پیچھے سے حملہ کیا اُس کا نیزہ آپ کی ناف پر لگا اور آرپار ہوگیا۔ سیدنا حمزہ رضؓ چند قدم لڑکھڑا کر گر پڑے اور جامِ شہادت نوش کیا

سنہ ۸ھ میں جب مکہ فتح ہوا تو طائف کے ایک وفد کے ساتھ وحشی بھی بارگاہِ نبوت میں مشرف باسلام ہونے کے لئے مدینہ منورہ آئے۔ لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا یارسول اللہ یہ

وحشی سیدنا حمزہ رضؓ کا قاتل ہے ؟

آپؐ نے ارشاد فرمایا اسکو چھوڑ دو ایک شخص کا مسلمان ہونا میرے نزدیک ہزار کافروں کے قتل سے بہتر ہے. پھر آپؐ نے وحشی سے سیدنا حمزہ رضؓ کے قتل کا واقعہ دریافت کیا، وحشی نے ندامت و شرمندگی کی حالت میں پوری تفصیل سنائی ، آپؐ آبدیدہ ہوگئے اور وحشی کا اسلام قبول کرلیا اور یہ فرمایا اگر ہوسکے تو میرے سامنے نہ آیا کرو تم کو دیکھ کر چچا کا صدمہ تازہ ہوجاتا ہے۔

وحشی رضؓ نے زندگی بھر اس خواہش کا احترام کیا آپؐ کی مجلس میں آتے تو پس پشت بیٹھتے اور اس فکر میں رہتے کہ کوئی ایسا کام کر جاؤں جو قتلِ حمزہ کا بدلہ ہوجائے۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مُسلیمہ کذّاب نے جب اپنی نبوّت کا اعلان کیا تو اِنھیں موقعہ ہاتھ آیا اُسی نیزہ سے اُس کا کام تمام کردیا جس سے سیدنا حمزہ شہید ہوئے تھے. اسکے بعد بڑے جوش وخروش سے کہا کرتے تھے :-

قَتَلْتُ فِي الْكُفْرِ خَيْرَ النَّاسِ وَفِي الْإِسْلَامِ شَرَّ النَّاسِ.

(فتح الباری ج ۷، ص ۲۸۴)

حالتِ کفر میں بہترین انسان کو قتل کیا اور مسلمان ہوکر بدترین انسان کو قتل کیا۔

تِلْكَ بِتِلْكَ . یہ اُس کا بدلہ ہے۔

قومی و وطنی نعرے اور اسلامی نعرہ

غزوۂ اُحد کے اختتام پر واپسی کے وقت ابوسفیان نے وطن و قوم کے ایک مشہور بُت کا نعرہ بلند کیا :-

اُعْلُ هُبَلُ اُعْلُ هُبَلُ

اے ہُبل تو بلند ہو تیرا نام بلند ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عمر رضؓ سے فرمایا اسکو جواب دو

اَللّٰہُ اَعْلٰی اَللّٰہُ اَجَلّ۔

اللہ ہی سب سے اعلیٰ اور سب سے برتر ہے۔

پھر ابو سفیان نے کہا

اِنَّ لَنَا الْعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ

ہمارے یہاں عُزّٰی (مشہور بُت) ہے تمہارے پاس عُزّٰی نہیں (ہم کو عزت حاصل ہوئی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب یہ جواب دو:۔

اَللّٰہُ مَوْلٰنَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْر۔

اللہ ہمارا مددگار ہے تمہارا کوئی مددگار نہیں وہی مددگار ہے اور کوئی نہیں۔

شہیدِ قوم

معرکہ اُحد میں قزمان نامی ایک شخص نے بڑی جانبازی وسرفروشی دکھلائی تھی تن تنہا اُس نے سات یا آٹھ مشرکوں کو قتل کیا تھا اور آخر میں زخموں سے چور ہو کر گر پڑا، جب اسکو اُٹھا کر گھر لے آئے تو بعض صحابہؓ نے اُس کو مبارکباد دی۔

کہ آج تو نے بڑا کارنمایاں انجام دیا ہے تجھکو مبارک ہو!

قزمان نے جواب دیا

تم مجھے کس بات کی بشارت دیتے ہو میں نے تو اپنی قوم وقبیلہ کی حمایت میں قتال کیا ہے!

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسکی خبر دی گئی تو آپؐ نے ارشاد فرمایا:۔

اَمَا اِنَّہٗ مِنْ اَھْلِ النَّار۔

لیکن وہ تو دوزخی ہے۔

بعد میں آپ کو بتایا گیا کہ قزمان نے زخموں کی تاب نہ لاکر خودکشی کرلی ہے۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَیُؤَیِّدُ ھٰذَا الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ۔

اللہ تعالیٰ کبھی کبھی فاسق و فاجر انسان کے ذریعہ بھی اپنے دین کی خدمت لے لیتا ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۶ ص ۶۳۱)

اقتدارِ اعلیٰ

حضرت سیدنا انسؓ راوی ہیں کہ اُحد کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چہرۂ انور سے خون پونچھتے جاتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ وہ قوم کیسے فلاح و نجات پا سکتی ہے جس نے اپنے نبی و رسول کا چہرہ خون آلود کر دیا ہو۔ حالانکہ وہ اِن کو اُن کے پروردگار کی جانب دعوت دیتا ہے۔ (ترمذی، نسائی)

صحیح بخاری میں حضرت سالم سے مرسلاً روایت نقل کی گئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکینِ مکہ میں سے صفوان بن امیہ، سہیل بن عمرو، حارث بن ہشام کے حق میں بددعا فرمائی اس پر قرآن حکیم کی یہ آیت نازل ہوئی۔

لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْھِمْ اَوْ یُعَذِّبَھُمْ فَاِنَّھُمْ ظَالِمُوْنَ۔ (آل عمران آیت ۱۲۸)

آپؐ کو اس امر میں کوئی دخل نہیں کہ اللہ خواہ ان کی توبہ قبول کرے خواہ عذاب دے اس لئے کہ وہ ظالم ہیں۔

حافظ عسقلانی رحمہ لکھتے ہیں کہ یہ تینوں فتح مکہ میں مشرف باسلام ہوئے۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۲۸۱)

لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ الآیہ

ان الفاظ سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ مشیتِ الٰہی میں کسی مخلوق اور بندے کو دخل نہیں یہاں تک کہ مقرب ترین بندوں رسول و نبی کو بھی اختیار نہیں۔ چہ جائیکہ کسی ولی، کسی بزرگ، کسی مشائخ کو اللہ کی مشیت میں دخیل یا مختار سمجھا جائے؟

نہ اس کا کوئی شریک ہے نہ کوئی وزیر نہ کوئی مشیر و مددگار وَھُوَ الْوَاحِدُ

الْاَحَدُ الصَّمَدُ الْفَرْدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ۔
فَسُبْحَانَ مَنْ لَّا شَرِیْکَ لَہٗ
وَلَا وَزِیْرَ لَہٗ وَلَا مَثِیْلَ لَہٗ

شہداءِ اُحد کی تجہیز و تکفین

غزوۂ اُحد میں ستّر صحابۂ کرام نے جام شہادت نوش کیا ہے۔ اِن میں اکثر تعداد اہل مدینہ (انصار) کی ہے۔ جنھوں نے مسلمان، اسلام، اللہ و رسول کی رفاقت کا عملی ثبوت دیا ہے۔ بے سروسامانی کا یہ حال تھا کہ کفن کی پوری چادریں بھی میسّر نہ تھیں۔ چنانچہ سیّدنا مصعب بن عمیرؓ جو ایک رئیس خاندان کے فرد تھے اسلام قبول کرنے کی پاداش میں گھر سے نکال دیئے گئے تھے اس غزوہ میں شہید ہوئے۔ جب انہیں کفن پہنایا گیا تو چادر اتنی چھوٹی تھی کہ سر اگر ڈھانکا جاتا تو پیر کُھل جاتے اور اگر پیر ڈھانکے جاتے تو سَر کُھل جاتا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس صورتِ حال کی اطلاع دی گئی آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ سر ڈھانک دو اور پیروں پر اِذْخِر (گھاس) ڈال دو۔ (بخاری غزوہ اُحد)

ایسا ہی واقعہ سیدنا حمزہ رضؓ کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ اور بعض کے لئے یہ بھی میسّر نہ آیا۔ دو دو شہیدوں کو ایک ہی چادر میں کفن دیا گیا۔ دو دو تین تین شہیدوں کو ملا کر ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔ دفن کے وقت آپؐ دریافت فرماتے اِن میں سے زیادہ قرآن کس کو یاد تھا؟ جس شہید کی طرف اشارہ کیا جاتا اُسی کو قبر میں قبلہ رُخ رکھ دیا جاتا۔

آپؐ یہ بھی ارشاد فرماتے تھے :-

اَنَا شَہِیْدٌ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔

میں قیامت کے دن اِن سب کی شہادت دوں گا۔

تمام شہداء کو سنتِ اسلام کے مطابق بلا غسل، خون آلود حالت ہی میں دفن کیا گیا۔ (بخاری کتاب الجنائز)

بعض صحابہؓ نے اپنے عزیزوں کو شہر مدینہ لیجا کر دفن کرنا
چاہا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ جہاں
شہید ہوئے ہیں وہیں دفن کئے جائیں۔ (ابن ہشام ج ۲ ص۹۱)

غزوہ اُحد کے اِجمالی نتائج

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے غزوۂ اُحد کے بیان میں ساٹھ آیات نازل فرمائی ہیں۔ اِن آیات میں فتح و شکست کے اسباب، اللہ کی مرضیات و نامرضیات کا بیان، اسلام و ایمان کی علامت، مخلص اور غیر مخلص کا امتیاز، ذوقِ شہادت کا انجام، سنۃ اللہ کی وضاحت، نعمت پر شکر گزاری اور غم و مصیبت پر صبر و تحمل کا درس، ابتلاء و آزمائش کے نتائج وعواقب کی نشاندہی، تعلق مع اللہ کا معیار وغیرہ نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جنکو اجمالی طور پر سلسلہ وار بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) حسب وعدۂ خداوندی معرکہ اُحد میں پہلے ہی دن مسلمانوں کو کافروں پر غلبہ اور تسلط حاصل ہو گیا تھا مگر مسلمانوں کی ایک جماعت اُس مرکز سے ہٹ گئی جس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح و شکست ہر حال میں قائم و دائم رہنے کا حکم دیا تھا اِن میں سے بڑی تعداد نے مرکز چھوڑ دیا اور پہاڑ سے نیچے اُتر آئے اور مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔ میدان جنگ کا نقشہ پلٹ گیا فتح شکست سے بدل گئی، نظم وضبط پراگندہ ہو گیا، اسلامی افواج افراتفری کا باعث ہو گئی، نبی و رسول کے حکم کی عملی پیروی نہ کرنے پر نعمت، زحمت و مصیبت سے بدل گئی۔

(آل عمران آیت ۱۵۲)

(۲) غزوۂ اُحد میں بعض صحابہ کی یہ لغزش کسی بغاوت و نافرمانی یا دیدہ و دانستہ انحراف و سرکشی کا نتیجہ نہ تھی بلکہ ایک بھول و غفلت اور عدم اہتمام کا نتیجہ تھا جو ابتدائی فتح و نصرت میں پیدا ہو گیا تھا۔ جسکی شہادت خود قرآن حکیم نے دی ہے اور اس کو شیطانی لغزش قرار دیا ہے۔ (آل عمران آیت ۱۵۵)

(۳) مخلص اور غیر مخلص، پکے اور کچے، جھوٹے اور سچے کا امتیاز ہوگیا، مومن ومنافق کا ایسا واضح فیصلہ ظاہر ہوگیا کہ پھر کوئی اشتباہ باقی نہ رہا۔ اس غزوہ کے آغاز میں منافقوں کی ایک بڑی تعداد (تقریباً تین سو آدمی) درمیان راہ سے جدا ہوگئے اور وہ مدینہ واپس لوٹ آئے۔ (آل عمران آیت ۱۶۷، ۱۶۸)

(۴) ذوقِ شہادت رکھنے والوں کو شہادتِ عظمیٰ کا درجہ دیا جاتا ہے اور وہ اپنے مقصدِ حیات کو دنیا میں پالیتے ہیں۔ ان کی نیت اور عمل کو ضائع نہیں کیا جاتا۔ یہ دنیا میں بھی سرخرو ہوتے ہیں اور آخرت تو انھیں کے لئے بنائی جاتی ہے۔

(آل عمران آیت ۱۴۰)

(۵) ہر دور میں سنت اللہ یہی رہی ہے کہ مخلصین صادقین کی لغزشوں اور گناہوں کو دنیا کی زندگی ہی میں صاف و معاف کیا جاتا ہے تاکہ آخرت کا داخلہ پاک وصاف حالت میں ہوجائے اور اللہ کی عنایات وکرم کا پورا پورا حصہ نصیب ہو۔ اسکے لئے نیکیوں پر ابتلاء و آزمائش، مشاکل اور مصائب رنج وغم کے حالات پیش آتے ہیں لیکن اللہ کے یہ نیک بندے صبر وضبط ہمت و استقامت سے ثابت قدم رہتے ہیں۔ اسپر اللہ کی تائید ونصرت شامل حال ہوجاتی ہے اور اللہ تعالیٰ دنیا وآخرت میں ان کا دوست ہوجاتا ہے۔ (آل عمران آیت ۱۴۱)

(۶) زمانۂ قدیم سے اللہ تعالیٰ کا قانون یہی رہا ہے کہ زمین کی خلافت وحکومت پر کسی بھی مخلوق کی اجارہ داری روا نہیں رکھی گئی، کبھی نیکوں اور دوستوں کو فتح ونصرت سے سرفراز کرتے ہیں اور کبھی دشمنوں کو غلبہ دے دیتے ہیں لیکن آخرت کا انجام صرف اہل ایمان ہی کو دیا جاتا ہے۔ (آل عمران آیت ۱۴۰)

(۷) بغیر محنتِ عمل اور جُہدِ مسلسل کے کوئی مشکل آسان نہیں ہوتی۔ خاص طور پر اللہ تعالےٰ کی راہ میں جدوجہد بلند مراتب اور اعلیٰ درجات کا سبب بنتی ہیں۔ محض تمنا اور شوق، تصور وخیال سے منزل قریب نہیں ہوتی۔ لسانِ نبوت نے ایسے شخص کو عاجز اور بیوقوف بتایا ہے جو خواہشات میں پڑا رہے اور اللہ سے عمدہ عمدہ تمنائیں دل میں رکھے۔ (آل عمران آیت ۱۴۲)

(۸) نیکوں کے لئے وقتی ہزیمت وشکست اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم حکمت ومصلحت پر مبنی رہتی ہے

جسکا ایک درس یہ ہے کہ زہد وقناعت، صبر وتحمل، ایثار وقربانی کے اعلیٰ کردار ظاہر ہوں۔ دنیا کا وجود اور عدم دل کی نگاہوں میں برابر ہو جائے۔ دنیا کے آنے سے دل غافل نہ ہو جائے اور دنیا کے جانے سے دل برداشتہ اور آخرت سے دور نہ ہو جائے۔ معرکہ اُحد میں صحابہ کرام کو یہ جو غم دیا گیا کہ فتح شکست سے بدل گئی اسمیں اللہ تعالیٰ کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ آئندہ سے اہل ایمان دنیا کے فوت ہو جانے کا غم نہ کریں بلکہ قضاء الٰہی پر راضی اور خوش ومطمئن رہیں۔

(آل عمران آیت ۱۵۳)

(۹) دورانِ معرکہ بعض نے یہ افواہ اُڑا دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ بعض صحابہ کے قلوب اس وحشتناک اثر خبر کی تاب نہ لا سکے اور اس درجے پریشان ہو گئے کہ میدانِ جنگ سے پیر اُکھڑ گئے اور اسلامی فوج میں ابتری پھیل گئی۔

اس واقعہ پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو قیامت تک کے لئے انتباہ دیا کہ اسلام اللہ کا دین ہے۔ اُسی کی عبادت اور اُسی کی توحید کا تم نے کلمہ پڑھا ہے۔ اُسی کے نام پر تم نے کفر سے خروج کیا ہے اور اسلام میں داخل ہوئے ہو، وہ حیّ قیوم باقی اور غیر فانی ہے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُسی کے بندے اور رسول ہیں، اللہ کے ہادی ورہبر ہیں، اُسی کی مرضیات اور تعلیمات کے امین ومحافظ، وہ عبد ہیں رب نہیں۔ مطلب سوال کا یہ ہے کہ جب دینِ اسلام کی حقیقت تمہاری نظروں میں ثابت ہو چکی اور نبی ورسول کا مرتبہ تم نے اسلام میں خوب سمجھ لیا اور اس کا اعتراف واقرار بھی کر لیا ہے تو اب اللہ کے قاصد وپیغامبر کی شہادت یا موت کی وجہ سے اقرار کردہ حقیقت وصداقت پر کچھ منفی اثر نہ ہونا چاہیئے! کیا تم محض اس خبر سے کفر کی طرف لوٹ جاؤ گے کہ اب (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وفات پا گئے ہیں؟

اگر تمہارا اسلام وایمان ایسا کمزور اور ضعیف ہے کہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی تم اپنے سابقہ دین ومذہب کی طرف

پلٹ جاؤ جس سے نکل کر تم آئے تھے تو اللہ کو تمہارے ایسے دین کی ضرورت نہیں ہے۔

موت تو ہر مخلوق کے لئے مقدّر ہو چکی ہے اگر آج یہ رسول وفات پا جائیں تو ان سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی میعادِ عمر پوری کر کے دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ یا جیسے حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام دشمنانِ دین کے ہاتھوں شہید ہو چکے ہیں کسی بھی انسان کا اسلام و ایمان اپنے نبی و رسول کی صرف حیات یا موت تک وابستہ نہیں ہوتا۔ نبی و رسول تو وفات پاتے ہی ہیں اللہ کی ذات زندہ اور باقی ہے اسکو فنا نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا حادثہ بھی اس قدر سخت تھا کہ حضرت فاروق اعظم رضؓ جیسے باوقار اور عالی ظرف انسان بھی صبر وضبط کھو بیٹھے اور بے اختیار ہو گئے تھے۔ عین اُس وقت پر اُن سے بھی برتر شخصیت سیّدنا ابو بکر صدیق رضؓ نے اسی حقیقت کا برمحل اظہار کر کے اُن کے اور سب کے جذبات کو قابو میں لے آئے تھے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ الخ

(آل عمران آیت ۱۴۴)

اور محمدؐ تو بس ایک رسول ہی ہیں، اِن سے قبل اور بھی رسول گزر چکے ہیں، سو اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم اُلٹے پاؤں واپس چلے جاؤ گے ؟

اور جو کوئی بھی اُلٹے پاؤں واپس چلا جائیگا وہ اللہ کا کچھ بھی نقصان نہ کریگا اور اللہ عنقریب شکر گزاروں کو بدلہ دیگا۔

(۱۰) سیّدنا حمزہ رضؓ کی شہادت کا تذکرہ اوپر آچکا ہے دشمنوں نے جس بے دردی سے قتل کیا اور نعش مبارک کو جس طرح بگاڑ دیا تھا وہ جہالت اور قساوتِ قلب کی بدترین مثال ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بے حرمتی کو دیکھ کر قسم کھالی اور یہ اعلان کر دیا تھا۔

"اللہ کی قسم اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کافروں پر غلبہ دیا تو حمزہ رضؓ کے بدلے میں ستّر کافروں کی لاشوں کو بگاڑ دوں گا۔"

ابھی آپؐ اپنی جگہ سے ہٹنے بھی نہ پائے تھے کہ قرآن نازل ہوا اور آپؐ کو ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِيْنَ الخ (النحل آیت ۱۲۶)

"اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اُسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہے لیکن اگر تم صبر کرو (یعنی بدلہ نہ لو) تو یقیناً یہ بات صبر کرنے والوں کے حق میں بہتر ہے۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صبر سے کام لو اور آپ کا صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہوگا۔ اُن لوگوں کی حرکتوں پر رنج وغم نہ کیجئے اور اُن کی چالبازیوں پر تنگ دل نہ ہوں بیشک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور وہ جو نیک عمل کرتے ہیں۔"

جس کا خلاصہ یہ کہ راہ جہاد و تبلیغ میں اگر تم کو کچھ سختیاں اور تکلیفیں پہنچائی گئی ہوں تو قدرت و طاقت حاصل ہونے کے بعد اس کا برابر بدلہ لیا جا سکتا ہے لیکن صبر کا مقام اس سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہے۔ اگر صبر کرو گے اور ظلم و زیادتی سے درگزر کرو گے تو یہ عمل خود آپ کے حق میں اور دیکھنے والوں بلکہ خود زیادتی کرنے والوں کے حق میں بہتر ثابت ہوگا۔

مظالم و شدائد پر صبر کرنا کچھ سہل کام نہیں ہے اللہ تعالیٰ ہی مدد فرمائے تو ہو سکتا ہے کہ آدمی ظلم سہتا رہے اور اف تک نہ کر سکے لیکن انسان جسقدر بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اقتدار کا تصور کرے گا یہ بات آسان ہو جائے گی اور ظلم کرنے والوں کو نہ صرف وہ معاف کر دے گا بلکہ ان پر اپنے عفو و درگزر کے علاوہ احسان و نیکی کا تاثر قائم کرے گا۔ یہ اخلاقِ انسانی کی انتہائی معراج ہے۔ انبیاء کرام اسی خلقِ عظیم پر فائز ہوا کرتے ہیں۔

ان آیات کے نزول کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا اعلان واپس لے لیا اور قسم کا کفارہ ادا فرما دیا۔

اسی سلسلہ میں آپ کا یہ ارشاد روحِ اخلاق کی حیثیت رکھتا ہے۔

صِلْ مَنْ قَطَعَكَ وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ وَاَحْسِنْ اِلٰى مَنْ اَسَاءَ اِلَيْكَ۔ (الحدیث)

جو تجھ سے کٹ جائے تو اُس سے تعلق قائم رکھ اور جس نے تجھ پر ظلم کیا ہے اسکو معاف کر دے اور جس نے تیرے ساتھ بُرا سلوک کیا ہے تو اسکے ساتھ نیکی و احسان کر۔

غَزْوَۂ اَحْزَاب

(غزوۂ خندق)

تعارُفِ غزوہ اس غزوہ کے دو نام ہیں غزوۂ احزاب، غزوۂ خندق۔ حزب کے معنی گروہ جماعت کے ہیں اور اسکی جمع احزاب آتی ہے۔

چونکہ اس غزوہ میں عرب کے بہت سے قبائل مشترکہ طور پر جمع ہوکر اسلام اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے جمع ہوگئے تھے اور مدینہ کے اندر بھی منافقین کا گروہ خفیہ طور پر اُن کافر جماعتوں کی مدد کر رہا تھا اس لئے اس غزوہ کا نام احزاب (کافر جماعتوں کا مشترکہ حملہ) ہوگیا۔ علاوہ ازیں اسی غزوہ میں حضرت سلمان فارسی رضؓ کے مشورے پر عرب میں پہلی مرتبہ شہر مدینہ کے اطراف خندق کھود کر شہر کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کی تدبیر اختیار کی گئی تھی اس لئے اس غزوہ کو غزوۂ خندق بھی کہا گیا۔ یہ غزوہ تمام غزوات میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے بھی نرالا ہے۔ کیونکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پہلی مرتبہ اتنی بڑی اور منظم سازش کی گئی تھی جو خاک آلود ہوکر رہ گئی۔

یہ غزوہ ماہ شوال ۵ھ مطابق ماہ فروری ۶۲۷ء میں پیش آیا جبکہ قریشِ مکہ غزوۂ بدر اور غزوۂ اُحد میں ناکام و نامراد

ہو کر واپس ہوگئے تھے۔ غزوۂ بدر میں تو ان کے ستّر سردار مارے گئے تھے اور اتنے ہی قید و گرفتار کرلئے گئے تھے۔ اور غزوۂ اُحد میں اگرچہ انھوں نے مسلمانوں کی ایک تعداد پر قتل و غارت گری کی تھی لیکن بعد میں مسلمانوں کے متحد اور مقابل ہو جانے پر راہِ فرار اختیار کیا تھا۔ اسکے بعد ان کے بغض و عناد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ غزوہ اُحد سے واپس ہوتے وقت لشکر کے سردار ابوسفیان نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پیام دیا تھا کہ سال آئندہ ہماری اور تمہاری لڑائی میدانِ بدر میں پھر ہوگی۔

اسپر آپؐ نے بھی ہاں کرلی تھی۔ آپ حسب وعدہ ماہ شعبان ۴ھ میں پندرہ سو صحابہ کو لیکر بدر کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں آٹھ روز تک ابوسفیان کا انتظار کیا لیکن وہ مرعوب و خائف ہوگیا تھا مقابلہ کی ہمت نہ کرسکا۔ اس طرح جنگ کا ایک بڑا خطرہ ٹل گیا۔

لیکن مشرکین مکہ کی ہمتیں اُن سازشوں سے اُبھرنے لگیں جو مدینہ کے جلا وطن یہود و نصاریٰ اور منافقینِ مدینہ کی ریشہ دوانیوں سے تقویت پارہی تھیں۔ چنانچہ قریشِ مکہ نے بہت سے قبائل کی مدد سے ایک بڑی جمعیت تیار کرلی تاکہ سب ملکر مدینہ پر ٹوٹ پڑیں۔

ماہِ شوّال ۵ھ مطابق ماہ فروری ۶۲۷ء قریش مکہ کے سردار ابوسفیان دس ہزار سے زائد نفری تعداد لیکر مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لئے مکہ سے روانہ ہوا۔ قبائل عرب کی یہ اتنی بڑی جمعیت تھی جو اس سے پہلے عرب میں کبھی جمع نہ ہوئی تھی۔

یہ خبر مدینہ میں تیزی سے پھیل گئی جس سے ایک ہلچل پیدا ہوگئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا کہ ایسے موقعہ پر کیا کرنا چاہیئے؟ حضرت سلمان فارسی رضؓ (ایران کے باشندے) نے عرض کیا یارسول اللہ ہم اہلِ فارس کا یہ دستور ہے کہ ایسے موقع پر شہر کے اطراف خندق کھود کر دشمن سے خود کو محفوظ

کر لیتے ہیں اور اسکو مجبور و بے بس بنا دیتے ہیں۔

عرب کے جنگی طور طریقوں میں خندق کھدوانے کا رواج نہ تھا پہلی مرتبہ یہ تجربہ کیا گیا اور حضرت سلمان رضؓ کا مشورہ قبول کیا گیا، یہ خندق شہر کے مشرقی و مغربی جانب تیار کی گئی۔ جدھر سے دشمن کے حملہ کا اندیشہ تھا اس طرح شہر کو محفوظ کر لیا گیا، یہ جنگی تدبیر کفار قریش کے جنگی نقشے میں بالکل نہ تھی کہ انھیں مدینہ کے باہر ایک طویل و گہری خندق سے سابقہ پڑے گا۔ کیونکہ اہل عرب اس طریق دفاع سے قطعاً آشنا نہ تھے۔ جب ان کا لشکر مدینہ کے قریب پہنچا تو انھیں ایک طویل محاصرے کے لئے تیار ہونا پڑا جس کے لئے وہ چلتے وقت تیار ہو کر نہ آئے تھے۔ جاڑے کا زمانہ تھا، محاصرہ (۲۵) دن سے زیادہ طویل ہو گیا اتنے بڑے لشکر کے لئے چارے پانی غذا کی فراہمی مشکل سے مشکل تر ہو رہی تھی۔ دوسری جانب "حزب اللہ" اللہ کا لشکر جوش و خروش اور پورے عزم و بیداری کے ساتھ خندق کی حفاظت میں مشغول تھے۔ کائناتِ انسانی کی تاریخ میں آقا و غلام، حاکم و محکوم، خادم و مخدوم کے درمیان یہ پہلا منظر تھا جو آنکھوں نے دیکھا کہ دوجہاں کا سردار (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اپنے ہاتھ میں کدال لئے تین دن کے مسلسل فاقہ کے ساتھ شریک کار ہے۔ ایک موقعہ پہ ایک بڑی چٹان نے صحابہ کرام کو بے بس کر دیا تھا سرورِ کائنات نے بسم اللہ کہہ کر اپنی ایک ضرب سے چٹان کو پارہ پارہ کر دیا۔ (بخاری باب غزوۂ احزاب)

خندق کی تیاری میں آپ بطور رجز (کلمات ہمت افزائی) اس طرح فرماتے تھے:۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّ الْعَیْشَ عَیْشُ الْاٰخِرَہْ

فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَ الْمُھَاجِرَہْ

الٰہی زندگی تو آخرت ہی کی زندگی ہے۔ پس تو مہاجرین و انصار کو مغفرت سے نواز۔

صحابہ کرام جب یہ کلمات سنتے تو والہانہ انداز میں اس طرح جواب دیتے۔

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا ؛ عَلَی الْجِہَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا

"ہم تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر زندگی بھر کے لئے جہاد کا عہد کر لیا ہے"۔ اس فدا کاری و اقرارِ عہد پر آپؐ اس طرح دُعائیہ کلمات فرماتے :۔

اَللّٰھُمَّ لَا خَیْرَ اِلَّا خَیْرُ الْاٰخِرَۃ
فَبَارِکْ فِی الْاَنْصَارِ وَالْمُھَاجِرَۃ۔

الٰہی خیر و نیکی تو بس آخرت ہی کی ہے پس تو انصار و مہاجرین کے درمیان اپنی برکت نازل فرما۔ (بخاری غزوۃ الاحزاب)

حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ غزوۂ خندق میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت یہ تھی کہ خندق سے مٹی اُٹھا کر اِدھر اُدھر منتقل کر رہے تھے اور جسم مبارک گرد آلود ہو رہا تھا اور زبان مبارک پر یہ رجز جاری تھا :۔

وَاللّٰہِ لَوْلَا اللّٰہُ مَا اھْتَدَیْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّیْنَا
اللہ کی قسم اگر اُسکی ہدایت رہنمائی نہ کرتی۔ تو نہ ہمکو ہدایت ملتی نہ صدقہ و نماز ادا کرتے
فَاَنْزِلَنْ سَکِیْنَۃً عَلَیْنَا وَثَبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَاقَیْنَا
پس اے اللہ تو ہم پر طمانیت نازل فرما۔ اور میدان جنگ میں ثابت قدم رکھ
اِنَّ الْاُلٰی قَدْ بَغَوْا عَلَیْنَا اِذَا اَرَادُوْا فِتْنَۃً اَبَیْنَا
ان لوگوں نے ہم پر بڑا ظلم کیا ہے۔ یہ جب کبھی ہم کو فتنہ میں بتلا کرنا چاہتے ہیں تو ہم اسکو قبول نہیں کرتے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا خندق کی کھدائی میں ایک بڑی چٹان حائل ہو گئی تھی جس نے سب کو تھکا دیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ کہہ کر اپنی کدال سے ایک ضرب لگائی جس سے وہ پارہ پارہ ہو گئی۔ یہ روایت بخاری شریف کی ہے البتہ مسند احمد اور نسائی شریف میں اس قدر مزید اضافہ نقل کیا گیا ہے کہ جب آپؐ نے بسم اللہ کہہ کر پہلی ضرب لگائی تو وہ چٹان ایک تہائی ٹوٹ گئی آپؐ نے اس پر ارشاد فرمایا اللہ اکبر مجھکو ملک شام کی کنجیاں عطا کی گئیں اللہ کی قسم اس وقت مجھے ملکِ شام کے سرخ محل نظر آرہے ہیں۔

پھر آپؐ نے دوسری بار اُسی چٹان پر ضرب لگائی دوسرا تہائی حصہ ٹوٹ کر گر پڑا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا اللہ اکبر ملکِ فارس (ایران) کی کنجیاں مجھکو عطا ہوئیں، اللہ کی قسم شہر مدائن کے قصر ابیض (سفید محل) کو اس وقت میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

تیسری بار بسم اللہ کہہ کر کدال ماری تو بقیہ چٹان بھی ٹوٹ گئی۔ آپؐ نے فرمایا اللہ اکبر ملک یمن کی کنجیاں مجھکو عطا ہوئیں۔ اللہ کی قسم شہر صنعاء کے دروازوں کو میں اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رح فرماتے ہیں کہ اس روایت کی سند حَسَنٌ ہے۔

ایک اور روایت میں مزید یہ بھی اضافہ منقول ہے کہ صحابہ کرام نے آپؐ کی تکبیر پر اللہ اکبر کہا پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا جبرئیل امین نے مجھکو خبر دی کہ میری امت اِن شہروں کو فتح کرے گی۔

(فتح الباری ج ۷ ص ۳۰۲)

تاریخ نے بعد میں ثابت کر دیا کہ خلافتِ فاروقی رض میں یہ تمام شہر خلافتِ راشدہ کے ماتحت تھے۔ (فَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ جَمِیْعًا)

مؤرخ ابن سعد لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام صرف چھ۶ دن میں اس طویل وعریض خندق سے فارغ ہوگئے۔ اس طرح دشمن سے حفاظت کا پوری طرح سامان ہوگیا۔ اس درمیان قریش کا دس۱۰ ہزار افراد پر مشتمل لشکر مدینہ کے قریب آپہنچا اور کوہ اُحد کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار مسلمانوں کی جمعیت لیکر مقابلہ کے لئے کوہِ سَلع کے قریب جا ٹھہرے۔ خندقیں دونوں فریقین کے درمیان حائل تھیں۔ دو ہفتے اس طرح گزر گئے مگر دست بدست لڑائی کی نوبت نہ آئی۔ دونوں جانب سے تیر اندازی ہوتی رہی۔ ایک موقع پر قریش کے چند نوجوان ایک خندق کو جس کا عرض کچھ کم تھا پھاند کر مسلمانوں کی طرف بڑھے اور ان میں سے عمرو بن عبد جو سر سے پیر تک غرق

آہن تھا مقابلہ کے لئے آواز دی۔ سید نا علیؓ اسکے مقابلہ کے لئے آگے بڑھے اور کہا اے عمرو میں تجھکو اللہ اور اسکے رسول کی طرف بلاتا ہوں اور اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ عمرو نے کہا مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

سیدنا علیؓ نے فرمایا اچھا تو میں لڑائی اور مقابلہ کی دعوت دیتا ہوں، عمرو نے کہا تم کمسن ہو اپنے سے بڑے کو میرے مقابلہ کے لئے بھیجو میں تمہارے قتل کو پسند نہیں کرتا۔

سیدنا علیؓ نے جواب دیا لیکن میں تیرے قتل کو پسند کرتا ہوں۔ یہ سنکر عمرو کو طیش آگیا گھوڑے سے نیچے اُترا اور آگے بڑھکر حضرت علیؓ پر وار کیا جس کو حضرت علیؓ نے اپنی سپر سے روکا لیکن پیشانی پر زخم آگیا۔ پھر معاً حضرت علیؓ نے اُس پر وار کیا جس نے اس کا کام تمام کر دیا۔ انہی مشرکوں میں نوفل بن عبداللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے آگے بڑھا گھوڑے پر سوار تھا خندق کو پھاندنا چاہتا تھا کہ خندق میں گر پڑا اور گردن ٹوٹ گئی اور مر گیا۔ چونکہ یہ قوم کا سردار اور رئیس تھا مشرکین نے دس ہزار درہم آپؐ کی خدمت میں پیش کیے کہ ہمارے اس سردار کی لاش حوالہ کر دی جائے۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا وہ بھی خبیث تھا اور اس کا بدلہ بھی خبیث و ناپاک ہے۔ اللہ کی لعنت ہے اسپر اور اسکے بدلہ پر بھی۔ آپؐ نے دونوں چیزیں لوٹا دیں۔

حملہ کا یہ دن نہایت ہی سخت تھا۔ تمام دن تیر اندازی اور سنگ باری میں گزرا۔ یہی وہ غزوہ ہے جسمیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کی چار نمازیں قضا ہوگئیں تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کو ایک قلعہ میں محفوظ کر دیا تھا اور حضرت حسان بن ثابت رضؓ کو قلعہ کی حفاظت پر مقرر کر دیا تھا۔ یہود مدینہ کی آبادی وہاں سے قریب ہی تھی ایک

جاسوس قلعہ کے قریب گشت کر رہا تھا۔ حضرت صفیہ رضؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپی تھیں اسی قلعہ میں اُس جاسوس کو دیکھ لیا اور اندیشہ کیا کہ کہیں یہ جاسوس نہ ہو اور دشمنوں کو ہماری مخبری نہ کردے حضرت حسان رضؓ سے کہا کہ اس کو قتل کر دو! حضرت حسان رضؓ نے جواب دیا اے صفیہ رضؓ تم کو معلوم ہے کہ میں اس کام کا نہیں ہوں۔ حضرت صفیہ رضؓ خود اُٹھیں اور خیمہ کی ایک لکڑی لیکر اُس یہودی کے سر پر اس زور سے وار کیا کہ اُس کا سر ہی پھٹ گیا اور وہ گر پڑا۔

واپس آکر حضرت حسان رضؓ سے کہا میں نے اُس کا کام تمام کر دیا ہے۔ چونکہ وہ اجنبی مرد ہے اور میں عورت ہوں اس لئے اُس کو ہاتھ نہیں لگا سکتی تم اُسکے ہتھیار اُتار لاؤ!

حضرت حسان رضؓ نے کہا مجھے اسکے ہتھیار اور سامان کی بھی ضرورت نہیں۔ (سیرت ابن ہشام)

محاصرہ بڑا سخت تھا بیسؔ دن سے زائد ہو گئے تھے سردی کا زمانہ تھا اثنار محاصرہ ایک دن قبیلہ غطفان کے ایک رئیس نعیم بن مسعود اشجعی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، یارسول اللہ میں نے آپؐ پر ایمان لایا ہے میری قوم کو میرے ایمان لانے کا علم نہیں اگر آپؐ اجازت دیں تو میں کوئی ایسی تدبیر کروں جس سے یہ حصار ختم ہو جائے؟

آپؐ نے فرمایا ہاں تم تجربہ کار آدمی ہو کوئی ایسی تدبیر ہو تو کر گزرو۔ چنانچہ نعیم رضؓ نے ایسی تدبیر کی کہ کفار قریش اور اُن کے مددگار بنو قریظہ میں (جو اس جنگ میں قریش کا ساتھ دے رہے تھے) پھوٹ پڑ گئی (مفصل قصہ فتح الباری ج ۷ ص ۳۰۹ اور تاریخ طبری ج ۳ ص ۵۰ میں مذکور ہے)

مسند احمد میں حضرت ابوسعید خدری رضؓ سے روایت ہے کہ ہم نے حصار کی شدت اور سختی کا ذکر کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کی آپؐ نے یہ دعا تلقین فرمائی۔

اَللّٰھُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِنَا وَاٰمِنْ رَوْعَاتِنَا۔

"اے اللہ ہمارے عیبوں کو چھپا اور ہمارے خوف کو دور فرما۔"

اور صحیح بخاری میں یہ دُعا منقول ہے :-

اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ وَمُجْرِيَ السَّحَابِ وَهَازِمَ الْاَحْزَابِ اِهْزِمْهُمْ وَانْصُرْنَا عَلَيْهِمْ۔ (بخاری کتاب الجہاد)

اے قرآن کے نازل کرنے والے، بادلوں کو چلانے والے، کفار کی جماعتوں کو ہلاک کرنے والے انھیں شکست دے اور ہماری مدد فرما۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کی دُعا قبول فرمائی۔ ایک رات ایسی سخت ہوا کا طوفان اُٹھا جس نے آن کی آن میں دشمن کے تمام لشکر کو زیر وزبر کر دیا۔ ہوا میں سخت سردی اور کڑک وچمک تھی اور اندھیرا اتنا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھائی دیتا تھا خیمے اُکھڑ گئے، چوپائے بھڑک بھڑک کر بھاگنے لگے اور سارے لشکر میں ابتری پھیل گئی۔ دشمن محاصرہ چھوڑ چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کرنے لگے۔ قدرتِ خداوندی کا یہ ایسا کاری وار تھا جسکو وہ برداشت نہ کر سکے۔ راتوں رات ہر ایک نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ جب صبح ہوئی تو ایک دشمن بھی نہ تھا۔ اس موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:-

نُصِرْتُ بِالصَّبَا وَاُهْلِكَتْ الْعَادُ بِالدَّبُوْرِ۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے مجھکو پُروا ہوا کے ذریعہ فتح عطا کی گئی اور قومِ عاد پچھوا ہوا سے ہلاک کئے گئے تھے۔

اسی ہوا کے طوفان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ بن الیمان رض صحابی کو کفار قریش کی خبر لانے کے لئے حکم دیا تھا۔ حضرت حذیفہ رض کہتے ہیں میں نے عرض کیا یارسول اللہ میں پکڑا نہ جاؤں ؟

آپؐ نے ارشاد فرمایا

اِنَّكَ لَنْ تُؤْسَرَ۔

تو ہرگز گرفتار نہ ہوگا۔

پھر جب میں چلنے لگا تو آپ نے یہ دُعا دی :۔

اَللّٰهُمَّ احْفَظْهُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ وَعَنْ يَمِيْنِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ وَمِنْ فَوْقِهِ وَمِنْ تَحْتِهِ.

"اے اللہ آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر، نیچے سے حُذیفہ کی حفاظت فرما۔"

آپکی اس دُعا سے میرا تمام خوف دور ہوگیا۔ میں نہایت اطمینان سے جب چلنے لگا تو آپ نے ارشاد فرمایا حذیفہ رض کوئی نئی بات نہ کرنا!

جب میں دشمن کے لشکر میں پہنچا تو ہوا اس قدر تیز تھی کہ کوئی چیز اپنی جگہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ تاریکی ایسی تھی کہ کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ اتنے میں میں نے ابوسفیان لشکر کے سردار کو یہ کہتے سُنا :۔

اے لوگو! یہ ٹھیرنے کا مقام نہیں ہے۔ ہمارے جانور ہلاک ہوگئے ہیں۔ ہمارے مددگار بنو قُریظہ نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور اس تیز و تند ہوا نے ہم کو سخت پریشان کر دیا ہے۔ چلنا پھرنا، بیٹھنا اُٹھنا مشکل ہوتا جارہا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ فوراً لوٹ جاؤ! یہ کہکر ابوسفیان اپنے اونٹ پر سوار ہوگیا۔

حضرت حذیفہ رض فرماتے ہیں کہ میرے دل میں خیال آیا کہ اِسکو ایک تیر سے مار ڈالوں لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یاد آگیا کہ، اے حذیفہ رض کوئی نئی بات نہ کرنا۔ پھر میں واپس آگیا۔

(زرقانی ج ۲ ص ۱۱۸)

صبح کو آپ نے میدانِ جنگ خالی دیکھ کر فرمایا :۔

اَلْاٰنَ نَغْزُوْهُمْ وَلَا يَغْزُوْنَنَا نَحْنُ نَسِيْرُ اِلَيْهِمْ.

(بخاری)

اب ہم اُن پر حملہ آور ہوا کریں گے اور وہ لوگ ہم پر آئندہ حملہ نہ کرسکیں گے اب آئندہ اقدام ہمارا ہی ہوگا (یعنی مذہب

مذہب کفر اب اتنا کمزور ہوگیا کہ اسمیں اتنی قوت وطاقت نہیں رہی کہ وہ اسلام کے مقابلہ میں کوئی اقدام کرسکے گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی تھی) اس طرح یہ بڑا حادثہ ٹل گیا اور مسلمانوں کو فتح ونصرت حاصل ہوئی۔

صَدَقَ اللّٰہُ وَعْدَہٗ وَنَصَرَ عَبْدَہٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَہٗ (بخاری صٓ۵۹)

قرآن حکیم کی ایک سورت کا نام سورۃ الاحزاب بھی ہے۔ اسی میں غزوہ احزاب کا تذکرہ ملتا ہے۔ جسکی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

قرآنی مضمون

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ اِذْ جَاءَتْکُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَکَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا۔ (احزاب آیات ۹ تا ۲۷)

اے ایمان والو اللہ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو جب تم پر کئی کئی لشکر چڑھ آئے تھے (یعنی کفار قریش کا لشکر قبیلہ غطفان کا لشکر اور یہود مدینہ کا لشکر) پھر ہم نے اُن پر ایک آندھی بھیجی اور ایسی فوج (فرشتوں کی) جو تم کو دکھائی نہیں دیتی تھی اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا تھا۔ جب کہ وہ لوگ تم پر آپڑے تھے تمہارے اوپر کی طرف سے بھی اور نیچے کی طرف سے بھی اور جبکہ آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آرہے تھے (یعنی شدید خوف کی حالت طاری ہوگئی تھی) اور تم اللہ کے ساتھ طرح طرح کے گمان کررہے تھے (یعنی وسوسہ میں مبتلا ہورہے تھے)

اس موقع پر مسلمانوں کا پورا امتحان لیا گیا اور وہ سخت زلزلہ میں ڈالے گئے۔

اور جبکہ منافقوں نے اور اُن لوگوں نے جن کے دلوں میں مرضِ نفاق ہے یوں کہنا شروع کیا تھا کہ ہم سے اللہ اور اُس کے

رسول نے تو محض دھوکہ کا ہی وعدہ کر رکھا ہے۔

اور یہ اسوقت ہوا جب اُن میں سے ایک گروہ نے کہا (یعنی منافقین) اے یثرب (مدینہ) کے لوگو تمہارے ٹھیرنے کا موقع نہیں ہے سو اپنے گھروں کو واپس ہو جاؤ اور بعض لوگ اِن میں نبی سے اجازت مانگتے تھے کہتے تھے کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں۔ حالانکہ وہ ذرا بھی غیر محفوظ نہیں ہیں۔ یہ محض بھاگنا ہی چاہتے تھے۔ اور اگر اِن لوگوں پر مدینہ کے اطراف سے کوئی لشکر کافروں کا آگھُسے پھر اِن سے فساد کی درخواست کی جائے تو یہ اسے منظور کر لیں گے اور گھروں میں بس برائے نام ہی ٹھیریں گے۔

حالانکہ یہی لوگ پہلے اللہ سے عہد کر چکے تھے کہ پیٹھ نہ پھیریں گے اور اللہ سے جو عہد کیا جاتا ہے اُسکی باز پُرس ہوگی۔

اے نبی آپؐ کہہ دیجئے تمہیں بھاگنا کچھ بھی نفع نہیں دے سکتا اگر تم موت یا قتل سے بھاگتے ہو اور اس سے نفع بھی حاصل نہیں کر سکتے بجز چند روز کے (یعنی عمر کا بقیہ حصہ)

آپؐ کہہ دیجئے کہ وہ کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچاوے؟ اگر اللہ تمہارے ساتھ بُرائی کرنا چاہے یا اسکو روک سکے جب وہ تم پر فضل کرنا چاہے؟ اور وہ لوگ اللہ کے سوا نہ اپنا کوئی حمایتی پائیں گے اور نہ مددگار۔ اور اللہ تم میں سے اُن لوگوں کو خوب جانتا ہے جو روکنے والے ہوتے ہیں اور جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس آجاؤ اور یہ لوگ تو لڑائی میں بس نام ہی کو آتے ہیں۔

تمہارے حق میں بخیل ہو کر (انھیں یہ گوارا ہی نہیں کہ مسلمانوں کو مالِ غنیمت ملے) پھر جب کوئی خطرہ پیش آتا ہے تو آپؐ ان کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپؐ کی طرف اس طرح دیکھنے لگتے ہیں کہ اُن کی آنکھیں چکرائی جاتی ہیں جیسے کسی پر موت کی بےہوشی طاری ہو۔ پھر جب وہ خطرہ دور ہو جاتا ہے تو تم کو تیز زبانوں سے طعنہ دیتے ہیں مالِ غنیمت پر حرص کئے ہوئے

(مالِ غنیمت لینے کے لئے مسلمانوں سے دلخراش باتیں کرتے ہیں مثلاً یہ کہ ہماری وجہ سے تم کو فتح ہوئی ہے وغیرہ وغیرہ) یہ لوگ ایمان نہیں لائے چنانچہ اللہ نے اُن کے اعمال بیکار کر رکھے ہیں (یعنی ظاہری اطاعت تک کا اجر نہیں ملا) اور یہ بات اللہ کے لئے آسان ہے۔ ان منافقوں کا خیال ہے کہ لشکر ابھی تک گئے نہیں ہیں (اُن کی بزدلی کا یہ حال کہ فوج چلی بھی گئی اور یہ ابتک اُس کے ڈر سے دبے سہمے ہوئے ہیں) اور اگر یہ لشکر آپڑیں تو یہ لوگ یہ چاہیں گے کاش ہم دیہاتوں میں باہر جا رہتے اور وہیں سے تم لوگوں کی خبریں پوچھتے رہتے اور اگر تم ہی میں رہیں تو جب بھی برائے نام ہی لڑیں۔

رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ تمہارے لئے موجود ہے۔ یعنی اُس کے لئے جو ڈرتا ہو اللہ اور روزِ آخرت سے اور ذکرِ الٰہی کثرت سے کرتا ہو۔

اور جب اہلِ ایمان نے لشکروں کو دیکھا تو کہنے لگے یہی وہ موقع ہے جس کی ہمیں اللہ اور اُسکے رسول نے خبر دی ہے۔ اور اللہ اور اُس کے رسول نے سچ کہا تھا اور اس سے ان کے ایمان و طاعت میں ترقی ہی ہوئی اہلِ ایمان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ اُنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اُس میں سچے اُترے۔ سو اُن میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور کچھ اُن میں کے راستہ دیکھ رہے ہیں اور اُنھوں نے ذرا فرق نہ آنے دیا۔ یہ اس لئے ہوا تاکہ اللہ سچوں کو بدلہ دے انکی سچائی کا اور منافقین کو چاہے تو عذاب دے یا چاہے تو اُن کو توبہ کی توفیق دے بیشک اللہ بڑا مغفرت والا نہایت رحم والا ہے۔

اور اللہ نے کافروں کو اُس غصہ میں بھرا ہوا لوٹا دیا کہ اُن کے کچھ بھی ہاتھ نہ لگا (محاصرۂ مدینہ سے ناکام واپس ہونا پڑا) اور بیشک اللہ اہلِ ایمان کے لئے جنگ میں کافی ہوگیا اور اللہ تو ہے ہی بڑی قوت والا زبردست۔

اور جن اہل کتاب (یہودیوں) نے ان کافروں کی مدد کی تھی
اللہ نے انھیں ان کے قلعوں سے نیچے اتار دیا اور اُن کے دلوں میں تمہارا
رعب بٹھا دیا۔ پھر بعض کو تم قتل کرنے لگے اور بعض کو قید کر لیا اور تمہیں
مالک بنا دیا ان کی زمین کا اور ان کے گھروں کا اور اُن کے مال کا اور اُس
زمین کا بھی جس پر تم نے ابتک قدم نہیں رکھا اور اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔
(اشارہ ہے قبائل یہود کی اُن زمینوں اور جائداد کا جو چند دنوں بعد مسلمانوں
کے قبضے میں آگئیں)

ضروری نوٹ:۔ آخری آیت میں غزوہ بنی قریظہ کی جانب اشارہ ہے۔
بنو قریظہ مدینہ کے قریب یہودیوں کا ایک طاقتور قبیلہ تھا
جس نے اسلام اور مسلمانوں سے اتحاد کا عہد کیا تھا۔ پھر جب مکّہ کے
کفار مدینہ پر حملہ کرنے آئے تو انھوں نے عہد توڑ کر کافروں کا ساتھ
دیا تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خندق سے فارغ ہو کر نماز فجر
کے بعد مدینہ واپس ہوئے آپؐ اور صحابۂ کرام نے ہتھیار اُتار دیئے۔ جب
ظہر کا وقت آیا تو جبرئیل امین ایک خچر پر سوار عمامہ باندھے ہوئے تشریف
لائے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر فرمایا کیا آپؐ نے
ہتھیار اُتار دیئے؟

آپؐ نے فرمایا ہاں! اسپر جبرئیل امین نے کہا فرشتوں نے
تو ابھی ہتھیار نہیں اُتارے ہیں اور نہ وہ واپس ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
نے آپؐ کو بنی قریظہ کی جانب حملہ کرنے کا حکم دیا ہے اور میں خود بھی
بنی قریظہ کی جانب جا رہا ہوں اور جا کر اُن کو متزلزل کرتا ہوں۔

(ابن ہشام ج ۲ ص ۱۲۵)

جبرئیل امین روانہ ہو گئے ادھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو فوری
کوچ کرنے کا حکم دیا اور ہدایت کی کہ کوئی شخص بھی سوائے بنو قریظہ کے

اور کہیں راہ میں نماز عصر نہ پڑھے۔
پچیس دن تک بنی قریظہ کا محاصرہ کیا گیا آخر وہ صلح پر آمادہ ہو گئے اور کہلا بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم دیں گے وہ ہمیں منظور ہے۔ آپؐ نے حضرت سعد بن معاذ رضؓ کو مقرر کیا کہ وہ فیصلہ کریں؛ چنانچہ بنو قریظہ نے بھی ان کو پسند کیا۔

حضرت سعد بن معاذ رضؓ نے یہ فیصلہ دیا کہ اُن میں کے لڑنے والوں یعنی مردوں کو قتل کیا جائے اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا جائے اور ان کا مال وجائداد مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فیصلہ پر ارشاد فرمایا اے سعدؓ تو نے اللہ کے منشاء کے مطابق فیصلہ کیا ہے؛ چنانچہ تمام بنی قریظہ کو گرفتار کر کے مدینہ لایا گیا اور فیصلہ چکا دیا گیا۔ (احزاب آیت ۲۷)

حضرت جابر رضؓ سے روایت ہے کہ اِن گرفتار شدگان کی جملہ تعداد چار سو تھی۔ (ترمذی، نسائی)

شُہدائے غزوۂ اَحزاب :- اس غزوہ میں مشرکین کے تین آدمی قتل ہوئے اور مسلمانوں میں چھ افراد شہید ہوئے۔

(۱) سعد بن معاذ رضؓ (۲) انس بن اویس رضؓ (۳) عبداللہ بن سہل رضؓ (۴) طفیل بن نعمان رضؓ
(۵) ثعلبہ بن عنمہ رضؓ (۶) کعب بن زید رضؓ۔

لیکن مؤرخ حافظ دمیاطی نے دو نام اور شمار کئے ہیں۔
(۱) قیس بن زید رضؓ (۲) عبداللہ بن ابی خالد رضؓ۔ واللہ اعلم۔

نتائج و عبر

نبوّت اور بادشاہت

غزوۂ خندق میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مخلص رفقاء کے ساتھ بھوک و پیاس کی شدت میں خندق کھودنے اور مٹی منتقل کرنے میں برابر کا حصّہ لے رہے تھے۔

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ آپؐ سر سے پیر تک گرد آلود ہو رہے ہیں۔ دُنیاوی بادشاہ اور نبی و رسول اعظمؐ کی عملی زندگی میں یہ واقعہ کسقدر واضح فرق ظاہر کرتا ہے۔

دونوں کی عملی زندگی میں کتنا تضاد ہوتا ہے اور ایسے نازک وقت پر ایک بادشاہ کا کیا کردار ظاہر ہوتا ہے تاریخ میں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہر دور میں آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

رسول اکرمؐ کا ایک سپاہی کے دوش بدوش ادنیٰ سے ادنیٰ کام انجام دینا آپکے اخلاق و کردار کی وہ بلند مثال ہے جس سے شاہانِ عالم کی زندگیاں خالی نظر آتی ہیں۔

رُخِ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہمارے بزمِ خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

اخلاص کی بلندی

حضرت سعد بن معاذ رضؓ غزوۂ خندق میں شدید زخمی ہو گئے تھے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قیام کیلئے مسجد نبوی کے ایک حصے میں خیمہ لگا دیا تھا تاکہ وقتاً فوقتاً انکی عیادت کی جا سکے۔ بنی قریظہ کی عہد شکنی پر ان کے مستقبل کا فیصلہ حضرت سعد بن معاذ رضؓ ہی کے حوالہ کیا گیا تھا۔

حضرت سعدؓ نے اِن دشمنانِ اسلام کے بارے میں یہ فیصلہ دیا کہ قبیلہ کے مرد قتل کر دیئے جائیں اور عورتیں اور بچے قید کر لئے جائیں اور ان سب کا مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

اسکے بعد حضرت سعدؓ نے یہ دُعا مانگی :-

"اے اللہ! آپ کو خوب معلوم ہے کہ مجھکو اس سے زیادہ اور کوئی چیز محبوب نہیں کہ اُس قوم سے جہاد کروں جس قوم نے آپ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا اور ان کو حرم مکی سے نکالا۔ اے اللہ! میں نیک گمان کرتا ہوں کہ آپ نے ہمارے اور ان کے درمیان لڑائی ختم کر دی ہے۔ پس اگر قریش سے ابھی لڑنا باقی ہے تو مجھکو زندہ رکھ تاکہ آپ کی راہ میں اُن سے جہاد کروں اور اگر آپ نے لڑائی ختم کر دی ہے تو میرے اس زخم کو جاری فرما دے اور اسی کو میری شہادت کا ذریعہ بنائیے۔"

دُعا کا ختم کرنا ہی تھا کہ زخم جاری ہوگیا اور اسی میں وفات پائی۔

• حضرت جابر بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا کہ سعد بن معاذؓ کی موت پر عرشِ عظیم دَہل گیا۔ (بخاری)

ایک اور روایت ہے کہ آسمان کے تمام دروازے ان کے لئے کھول دیئے گئے اور آسمانوں کے فرشتے ان کی روح کے چڑھنے سے مسرور ہوئے۔ (فتح الباری)

اور ستر ہزار فرشتے ان کے جنازے میں شریک ہوئے جو اس سے پہلے کبھی آسمان سے نازل نہ ہوئے تھے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۴ ص ۱۲۸)

کتاب روض الانف میں یہ اضافہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ ان کی قبر سے مشک کی خوشبو آتی تھی۔ (روض الانف ج ۲ ص ۱۹۳)

واللہ اعلم

توبہ کی عظیم مثال

حضرت ابو لُبابہ بن عبد المنذرؓ ایسے صحابی رسول ہیں جن کے تعلقات اور معاہدات یہود کی آبادی بنو قریظہ سے قائم تھے۔ جب بنی قریظہ پر حملہ کیا گیا تو یہ لوگ اپنے مضبوط قلعوں میں پناہ لے لئے تھے۔ پچیس ۲۵ دن تک اِن کے قلعوں کا محاصرہ کیا گیا یہ لوگ مجبور اور بے بس ہو گئے۔ ان کے سردار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ درخواست روانہ کی کہ آپؐ حضرت ابو لبابہؓ کو ہمارے

پاس بھیج دیجئے تاکہ ہم اُن سے مشورہ کرکے آپکو اپنے فیصلہ کی اطلاع دیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابولبابہ رضؓ کو روانہ کر دیا جب یہ اُن کے قلعوں میں پہنچے تو سب یہودی جمع ہو گئے۔ عورتیں اور بچے ان کو دیکھ کر رونے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت ابولبابہ رضؓ کا دل بھر آیا۔ بنی قریظہ نے جب اِن سے یہ دریافت کیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو ہم قبول کرلیں ؟

حضرت ابولبابہ رضؓ نے کہا بہتر یہی ہے۔ لیکن حلق کی جانب اشارہ کرکے بتایا کہ تم سب لوگ قتل بھی کئے جاؤ گے۔

حضرت ابولبابہ رضؓ اپنی جگہ سے ہٹنے بھی نہ پائے تھے کہ فوراً احساس ہوا کہ میں نے اللہ اور اسکے رسول کے ساتھ خیانت کی ہے (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راز میں نے ظاہر کر دیا ہے) سیدھے وہاں سے مسجد نبوی پہنچے اور اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھ لیا۔ (آج یہ مقام مسجد نبوی کے حصے ریاض الجنۃ میں اُسطوانہ ابی لبابہ رضؓ کے نام سے معروف ہے) اور قسم کھالی کہ جب تک اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول نہ فرمائے اُس وقت تک اس جگہ سے نہ ہٹوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اسکی خبر ہوئی تو ارشاد فرمایا اگر ابولبابہ رضؓ سیدھے میرے پاس آجاتا تو میں اُس کے لئے دُعائے مغفرت کر دیتا لیکن وہ ایسا کام کر گزرا ہے کہ میں اُس کو اپنے ہاتھ سے نہ کھولوں گا جب تک کہ اللہ تعالےٰ اس کی توبہ قبول نہ فرمائے۔

حضرت ابولبابہ رضؓ مسجد کے ستون سے بندھے رہتے تھے صرف نماز اور قضائے حاجت کے لئے کھول دیئے جاتے تھے۔ کھانا پانی بھی بند کر لیا تھا۔ لوگوں کے پوچھنے پر کہتے تھے کہ میں اسی طرح رہوں گا یا مرجاؤں یا اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول فرمالیں۔ چھ دن کے بعد ان کی توبہ نازل ہوئی اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ اُم سلمہ رضؓ کے مکان میں آرام فرما تھے۔ سحر کا وقت تھا آپؐ نے ارشاد فرمایا جبرئیل امین نے اطلاع دی کہ اللہ تعالیٰ نے ابولبابہ رضؓ کی توبہ قبول کر لی ہے۔ حضرت اُم سلمہ رضؓ نے آپؐ کی اجازت سے ابولبابہ رضؓ کو یہ بشارت سُنائی اور مبارکباد دی۔ صحابہ کرام دوڑے کہ اِن کو ستون سے کھول دیں۔

ابولبابہ رضؓ نے کہا میں قسم کھا چکا ہوں کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دست مبارک سے نہ کھولیں گے اُس وقت تک میں بندھا رہوں گا۔ چنانچہ جب آپؐ فجر کی نماز کے لئے مسجد تشریف لائے تو اپنے دستِ مبارک سے اِن کو کھولا۔

سورۂ انفال کی آیت نمبر ۲۷، ۲۸ اسی واقعہ پر نازل ہوئی ہیں۔

یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ الخ

اے ایمان والو جانتے بوجھتے اللہ اور اسکے رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو۔ اپنی امانتوں میں خیانت کے مرتکب نہ ہو۔

اور یاد رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد حقیقت میں سامانِ آزمائش ہے اور اللہ کے پاس اجر وصلہ دینے کے لئے بہت کچھ ہے۔

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خیانت مال و دولت ہی میں ہوتی ہے اور اس میں بیجا تصرف کرنے کو خیانت کہا جاتا ہے (یہ ایک حقیقت بھی ہے) لیکن آیت مذکورہ نے مزید اس کی یہ بھی تشریح کی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام اور منشاء کے خلاف کرنا بھی خیانت ہے۔ کیونکہ ایمان لاکر یہ عہد کیا گیا کہ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات پر عمل کروں گا۔ پھر اگر ان تعلیمات کے خلاف کیا تو یہ صریح خیانت ہوگی۔ زبان سے تو اپنے آپ کو مسلمان کہیں اور کام کافروں کے کریں۔ حضرت ابولبابہ رضؓ نے راز کا افشا کر دیا جو منشار رسول کے خلاف تھا اسی پر آیت نازل ہوئی اور اسکو خیانت قرار دیا گیا۔

حدیث میں یہ حقیقت اور واضح کی گئی:-

اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ (الحدیث)

جس سے مشورہ لیا جاتا ہے وہ بات کا امین ومحافظ ہوتا ہے۔

یعنی مشورہ کی بات کو بغیر اجازت کسی دوسرے سے بیان نہ کی جائے۔ مشورہ کی بات امانت ہوا کرتی ہے۔

صُلح حُدیبیہ

واقعہ حُدیبیہ حدیبیہ ایک کنویں کا نام ہے جس کے متصل ایک گاؤں آباد تھا جو اسی نام سے مشہور ہوا۔ آجکل اس کا نام شُمیسی ہے۔

مکہ مکرمہ سے اس کا فاصلہ تقریباً ۱۳ میل ہے۔ یہ بستی قدیم شاہراہ جدہ پر واقع ہے۔

مورخ طبری کہتے ہیں کہ اس کا اکثر حصہ حدودِ حرم میں داخل ہے

باقی حِل میں (خارجِ حرم اور داخل میقات) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں ایک دن خواب دیکھا کہ آپؐ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ معظمہ میں امن کے ساتھ داخل ہو کر عمرہ ادا کر رہے ہیں اور عمرہ کے بعد بعض اصحاب نے سر منڈالیا اور بعض نے بال ترشوائے۔ نبی و رسول کا خواب چونکہ وحی کی ایک قسم ہوتی ہے اس لئے یہ خواب فقط خواب و خیال نہ تھا بلکہ خداوندی اشارہ تھا جس کی پیروی نبی اور مسلمانوں کو کرنی ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ سورہ الفتح کی آیت ۲۷ میں اللہ تعالیٰ نے خود توثیق کر دی کہ یہ خواب ہم نے اپنے رسول کو دکھایا تھا۔

مکہ مکرمہ میں داخلہ کے بظاہر اسباب موجود نہ تھے کیونکہ قریشِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لئے تقریباً آٹھ سال سے بیت اللہ کا داخلہ بند کر دیا تھا اور اس پوری مدت میں کسی مسلمان کو انھوں نے حج یا عمرہ کرنے کا موقعہ نہ دیا تھا۔ ان حالات میں کوئی شخص یہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے اس اشارے پر کیونکر عمل کرنیکا موقع ملیگا؟ مگر رسول و نبی کی شان اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے وہ اللہ کے حکم و منشاء پر عمل کرنے کے لئے دنیاوی اسباب کا سہارا نہیں لیتے۔ وہ بے خوف اور بغیر اندیشہ اسپر عمل شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے صحابہ کو اپنا یہ خواب سُنایا اور سفر کی تیاری شروع کر دی۔ زیارت بیت اللہ کے شوق نے سب کو بے چین و بے تاب کر دیا۔

پہلی ذوالقعدہ ۶ھ دوشنبہ کے دن آپ بقصد عمرہ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ آس پاس کے قبائل میں بھی آپؐ نے اعلان کروادیا کہ ہم عمرہ ادا کرنے مکہ معظمہ جا رہے ہیں جو ہمارے ساتھ چلنا چاہے وہ آجائے۔ چنانچہ تقریباً پندرہ سو مہاجرین وانصارِ مدینہ کا قافلہ آپؐ کے ہمراہ ہو گیا۔ مقام ذوالحلیفہ (جسکو آجکل بئرعلی کہا جاتا ہے اور مدینہ منورہ کے حاجی اسی مقام سے حج اور عمرہ کا احرام باندھتے ہیں) پہنچکر آپؐ نے اور آپ کے اصحاب نے عمرہ کا احرام باندھا اور قربانی کے

تقریباً ستر اونٹ ساتھ لئے جن کی گردنوں میں قربانی کے جانور کی علامت کے طور پر قلاوے ڈالے گئے۔ اس طرح یہ مقدس قافلہ لبیک لبیک کی صدائیں بلند کرتا ہوا بیت اللہ کی جانب چل پڑا۔ چونکہ جنگ کا ارادہ قطعاً نہ تھا اس لئے کسی قسم کا سامان حرب وضرب ساتھ نہ تھا، صرف اسی قدر ہتھیار ساتھ تھے جو ہر مسافر کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔

(فتح الباری وطبقات ابن سعد ج ۲ ص ۶۹)

درمیان راہ آپؐ نے ایک شخص کو مخبر کی حیثیت سے آگے روانہ کر دیا تاکہ قریشِ مکہ کے ارادوں اور اُن کی نقل وحرکت سے آپ کو مطلع کرتا رہے۔ مقام عُسفان پر اُس مخبر نے آپ کو یہ اطلاع دی کہ قریشِ مکہ نے پوری جنگی تیاری کے ساتھ مقام ذی طُویٰ میں اپنا پڑاؤ ڈال دیا ہے اور خالد بن ولید کو (جو ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے) دو سو سواروں کیساتھ آگے بھیج دیا ہے تاکہ وہ آپ کا راستہ روکیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اطلاع پاتے ہی اپنا راستہ بدل دیا اور ایک دشوار گزار راستے سے مشقت اٹھا کر مقام حدیبیہ پر پہنچ گئے جو حدودِ حرم کی سرحد پر واقع تھا۔ اس مقام سے جب آپ نے اپنی اونٹنی کو مکہ مکرمہ کی جانب موڑنا چاہا تو وہ بیٹھ گئی۔ صحابہ نے اُسکو اٹھانا چاہا مگر اونٹنی اپنی جگہ سے نہ اُٹھی۔ بعض لوگوں نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اونٹنی نافرمان ہوگئی ہے۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا یہ اسکی عادت نہیں ہے بلکہ اِسکو اسی اللہ عزوجل نے روک دیا ہے جس نے ابرہہ کے ہاتھی کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ پھر آپؐ نے فرمایا قسم ہے اُس ذات پاک کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے۔ اگر قریش مکہ مجھ سے کسی ایسے امر کی درخواست کریں جس میں شعائر اللہ کی تعظیم ہوتی ہو تو میں اُس کو ضرور منظور کر لوں گا۔ یہ کہہ کر آپؐ نے ایک کنویں کے پاس قیام کیا پیاس کی شدت تھی اور پانی قلیل مقدار میں تھا جو کھینچ لیا گیا۔ صحابہ نے صورتِ حال بیان کی آپ نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکال کر اُس کنویں

میں گاڑ دیا۔ اُسی وقت پانی اس قدر جوش مارنے لگا کہ تمام لشکر سیراب ہو گیا۔ حدیبیہ پہنچکر آپؐ نے خراش بن اُمیہ خزاعی رضؓ کو بطور سفیر مکہ مکرمہ روانہ کیا تاکہ قریش سے بات کریں اور انھیں واضح طور پر بتا دیں کہ مسلمانوں کا یہ قافلہ صرف اور صرف بیت اللہ کی زیارت کے لئے آیا ہے جنگ کے لئے نہیں۔ لیکن اہل مکہ نے حضرت خراش رضؓ کے ساتھ بُرا سلوک کیا اور اُن کے اونٹ کو ذبح کر دیا۔ حضرت خراش رضؓ اپنی جان بچا کر حدیبیہ واپس آگئے اور واقعہ بیان کیا، پھر آپؐ نے مشورہ فرمایا اور طے یہ پایا کہ حضرت عثمانؓ کو مکہ روانہ کیا جائے۔ حضرت عثمان رضؓ جب مکہ میں داخل ہوئے تو سرداران قریش سے گفتگو کی اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ صرف بیت اللہ کی زیارت کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب لوگ احرام میں ہیں اور ساتھ سامان حرب وغیرہ کچھ بھی نہیں ہے۔ لہذا تم کو روکنا مناسب نہیں ہے۔

لیکن اہل مکہ نے ایک بات نہ مانی اور صاف جواب دے دیا کہ اس سال تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلمان مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ البتہ اگر تم چاہو تو بیت اللہ کا طواف کر لو

حضرت عثمان رضؓ نے جواب دیا یہ تو میں ہرگز کر نہیں سکتا میں بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کبھی طواف نہ کروں گا۔ قریش نے حضرت عثمان رضؓ کا یہ جرأت مندانہ جواب سنکر اُنہیں روک لیا۔ کسی شریر نے یہ افواہ پھیلادی کہ حضرت عثمان رضؓ قتل کر دیئے گئے۔

بیعتُ الرِّضوانْ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر ملی تو آپؐ بے چین ہو گئے اور اپنے اصحاب میں اعلان کر دیا کہ جب تک میں عثمانؓ کا بدلہ نہ لوں واپس نہ ہوں گا۔ اس وقت آپ حدیبیہ میں کیکر کے درخت کے نیچے تشریف فرما تھے۔ اپنے اصحاب کو طلب فرمایا اور "بیعت علی الموت"، یعنی ہر ایک سے اللہ کی

راہ میں شہید ہو جانے کا اقرار لیا۔ اس بیعت نے صحابہ میں ایسا جوش وخروش پیدا کر دیا کہ کوئی بھی پیٹھ پھیرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ شدہ شدہ یہ خبر مکہ مکرمہ پہنچی، مشرکین مکہ بہت گھبرائے اور خوفزدہ ہو کر مسلمانوں تک یہ خبر پہنچائی کہ قتلِ عثمان رضؓ کی اطلاع غلط ہے اور حضرت عثمان رضؓ کو واپس کر دیا۔

چونکہ جہاد کی یہ بیعت بہت ہی نازک اور اہم موقع پر لی گئی تھی اور صحابہ کرام نے پورے عزم و حوصلے اور جذبۂ ایثار کے ساتھ اقرار کیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اِن کی اس جانثاری اور فداکاری کی قدر و منزلت فرمائی اور اِن سب کو اپنی رضا وخوشنودی کا پروانہ عطا فرمایا اور قرآن میں اس واقعہ کے ذکر کر کے قیامت تک کے لئے صحابہ کرام کے ایمان واخلاص کی توثیق فرما دی۔ مشرکین مکہ کو جب اس بیعت کا علم ہوا تو مرعوب اور خوفزدہ ہو کر صلح کیلئے نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کر دیا۔ (فتح الباری ج ۷، ص۳۴۵)

قبیلۂ خزاعہ کا سردار بُدیل بن ورقاء اور اس کے بعد عروہ بن مسعود ثقفی باری باری سے بات چیت کرنے آئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو ایک ہی جواب دیا کہ ہم صرف بیت اللہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں تین دن کے اندر واپس ہو جائیں گے۔ لیکن بات تکمیل کو نہ پہنچی۔ یہ دونوں واپس ہو گئے۔ اسکے بعد قریشِ مکہ نے سُہیل بن عمرو کو صلح کی چند شرائط دے کر روانہ کیا۔ جب یہ پہنچے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کے نقطہ خیالی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا طویل گفت و شنید کے بعد چند ایک دفعات پر دونوں جانب سے اتفاق کیا گیا۔ آپؐ نے حضرت علی رضؓ کو معاہدہ لکھنے کا حکم دیا اور سرورق بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوایا۔

معاہدہ صلح

حضرت علی رضؓ نے لکھنا شروع کیا۔ سُہیل نے کہا میں بسم اللہ الرحمٰن

الرحیم کو نہیں جانتا۔ عرب کے قدیم دستور کے مطابق بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ لکھو۔ (اے اللہ تیرے نام سے)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا یہی لکھو۔ اسکے بعد آپؐ نے فرمایا یہ لکھو:-

هٰذَا مَا قَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

یہ وہ عہد نامہ ہے جس پر محمد اللہ کے رسول نے صلح کی ہے۔

سہیل نے کہا اگر ہم آپؐ کو اللہ کا رسول تسلیم کرلیتے تو پھر نہ آپؐ کو بیت اللہ سے روکتے اور نہ آپ سے لڑائی جاری رکھتے۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا اللہ کی قسم میں اُس کا رسول ہوں اگرچہ تم لوگ میری تکذیب کرتے ہو۔ پھر آپؐ نے حضرت علی رضؓ سے فرمایا یہ الفاظ مٹا کر اُن کی خواہش کے مطابق صرف میرا نام لکھ دو۔

حضرت علی رضؓ نے عرض کیا یارسول اللہؐ میرے ہاتھ سے یہ کیونکر ممکن ہے؟

آپؐ نے جب یہ محسوس کیا تو لفظ رسولُ اللہ کو اپنے دستِ مبارک سے محو کر دیا۔ اور محمد بن عبد اللہ لکھنے کا حکم فرمایا۔ (تاریخ طبری ج ۳ ص ۸۰)

حضرت علی رضؓ نے شرائط صلح لکھنا شروع کیا:-

(۱) اس سال مسلمان اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ میں داخل ہوئے بغیر ہی واپس چلے جائیں۔

(۲) آئندہ سال عمرہ کرنے کی اجازت رہے گی دو۲ شرطوں کے ساتھ۔ پہلی یہ کہ بغیر جنگی ہتھیار مکہ میں داخل ہوں۔ دوسری شرط یہ کہ صرف تین۳ دن قیام کرسکیں گے۔

(۳) معاہدہ کی مدت کے اندر دونوں جانب امن و عافیت کے ساتھ آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہے گا۔

(۴) اگر کوئی شخص مکہ سے اپنے ولی (ذمہ دار) کی اجازت کے بغیر مسلمان ہوکر مدینہ چلا جائے تو اُسکو مکہ واپس کرنا ہوگا۔ اور اگر مدینہ سے

کوئی شخص بھاگ آئے گا تو ہم اُس کو واپس نہیں کریں گے۔
(۵) قبائلِ عرب میں سے جو قبیلہ بھی فریقین میں سے کسی ایک کا حلیف (دوست) بن کر اِس معاہدے میں شامل ہونا چاہے تو اُسکو اختیار ہوگا۔
(۶) یہ معاہدہ دس سال تک قائم رہے گا اور کوئی فریق اس مدت میں اسکی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

جس وقت معاہدے کی شرائط طے ہو رہی تھیں اُس وقت اسلامی فوج میں سخت اضطراب اور بے چینی پیدا ہو رہی تھی۔ کوئی شخص بھی اُن مصلحتوں کو نہیں سمجھ رہا تھا جسکو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر و فکر دیکھ رہی تھی۔ کفارِ قریش اسکو اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے اور مسلمان بے تاب تھے کہ یہ صلح دب کر کیوں کی جارہی ہے ؟

صلح نامہ ابھی لکھا ہی جا رہا تھا کہ سہیل بن عمرو (وفدِ مکّہ کا سردار) کے بیٹے حضرت ابو جندل رضؓ جو مکہ میں مسلمان ہو چکے تھے اور کفارِ مکّہ نے انھیں قید کر رکھا تھا پابزنجیر قید سے نکل کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حدیبیہ حاضر ہو گئے اور آپ سے فریاد کی۔ یا رسول اللہؐ! اسلام لانے کی پاداش میں مشرکینِ مکہ نے مجھے بہت ستایا ہے اور مجھے قید کر رکھا ہے۔ یارسول اللہ مجھے اس مصیبت سے نجات دلائیے۔ ابوجندلؓ کے پیر میں زنجیر تھی اور جسم پر مار پیٹ کے نشان تھے۔

سہیل بن عمرو نے کہا یہ پہلا شخص ہے جو عہد نامہ کے مطابق ہم کو واپس ہونا چاہیئے ؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابھی تو صلح نامہ پورا لکھا نہیں گیا اور نہ دستخط ہوئے ہیں۔ لہذا ابھی اسپر عمل ضروری نہیں ہے۔ لیکن سُہیل برابر اصرار کرتا گیا۔ آخر کار آپؐ نے ابوجندل رضؓ کو سُہیل کے حوالہ فرما دیا۔ یہ منظر بڑا دل گداز تھا جبکہ ابوجندل رضؓ نے حسرت بھرے الفاظ میں مسلمانوں کو خطاب کر کے کہا ! اے مسلمانو کیا میں اب بھی

کافروں کے حوالہ کیا جارہا ہوں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجندل رضؓ کو تسلی دی فرمایا اے ابوجندل صبر کرو اور اللہ سے امید رکھو اور یقین کرو کہ اللہ تعالےٰ عنقریب تمہارے نجات کی صورت نکالے گا۔

حضرت ابوجندل رضؓ کافروں کے حوالہ کر دیئے گئے۔ مگر عام صحابہ پر اِن کی واپسی نہایت شاق گزری۔ حضرت عمرؓ فاروق جیسے مدبّر بالغ النظر صحابی سے ضبط نہ ہوسکا عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپؐ اللہ کے برحق نبی نہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا کیوں نہیں! پھر حضرت عمر رضؓ نے عرض کیا کیا ہم حق پر اور وہ لوگ باطل پر نہیں؟ آپ نے فرمایا بیشک! حضرت عمر رضؓ نے کہا پھر یہ ذلّت کیوں گوارہ کی جائے؟ آپ نے ارشاد فرمایا اے عمر رضؓ میں اللہ کا رسول اور نبی ہوں اُسکے حکم کے خلاف نہیں کرسکتا وہ میرا مُعین و مددگار ہے۔ حضرت عمر رضؓ نے کہا یا رسول اللہؐ کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ کا طواف کریں گے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا میں نے یہ کب کہا تھا کہ اسی سال طواف کریں گے!

حضرت عمر رضؓ یہاں سے اُٹھے اور حضرت صدیق اکبر رضؓ کے ہاں آئے اور اُن سے بھی یہی گفتگو کی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے لفظ بلفظ وہی جواب دیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوا تھا۔

حضرت عمر رضؓ فرماتے ہیں کہ بعد میں مَیں اپنی اس جرأت پر بہت نادم ہوا اور اسکے کفّارہ میں بہت سی نمازیں پڑھیں اور روزے رکھے اور صدقہ وخیرات کرتا رہا اور غلام بھی آزاد کئے۔

الغرض صلح کے شرائط تحریر کئے گئے اور فریقین نے اُس پر دستخط کر دیے۔

تکمیل صلح کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا کہ اپنے قربانی کے جانور ذبح کر دیں اور اپنا احرام بغیر طواف اُتار دیں۔ لیکن صحابہ کے قلوب اس قدر مغموم اور شکستہ خاطر تھے کہ باوجود تین بار

ارشاد فرمانے کہ کوئی شخص بھی اُٹھ نہ سکا۔ آپؐ اپنے خیمے میں جاکر اپنی زوجہ سیدہ امّ سلمہؓ سے اس غیر متوقع صورتِ حال کا ذکر کیا۔ حضرت سیدہ ام سلمہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپؐ کبیدہ خاطر نہ ہوں آپؐ خاموشی سے جاکر اپنا اونٹ ذبح کر دیں اور حجّام کو بلوا کر اپنا سر منڈ والیں۔ اسکے بعد لوگ خود بخود آپؐ کے عمل کی پیروی کریں گے اور سمجھ لیں گے کہ جو فیصلہ ہوچکا ہے وہ اب بدلنے والا نہیں ہے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آپؐ کے عمل کو دیکھ کر صحابہ نے بھی اپنی اپنی قربانی ذبح کرلیں اور سر منڈوالیا اور احرام سے باہر ہوگئے۔

(فتح الباری ج ۵ ص۲۴۵)

حدیبیہ میں دو ہفتے قیام کرکے آپؐ مع صحابہ مدینہ منورہ روانہ ہوئے۔ درمیان راہ مقام کراع الغمیم پر سورہ فتح نازل ہوئی اور اس صلح کو "فتح مبین" کا خطاب دیا گیا۔

اس سورۃ کے نازل ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ آج مجھ پر وہ چیز نازل ہوئی ہے جو میرے لئے دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی ہے۔

اگرچہ اہل ایمان تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنکر مطمئن ہوگئے تھے مگر کچھ زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ اس صلح کے فوائد ایک ایک کرکے ظاہر ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اس صلح کا فتح مبین ہونا آنکھوں سے دیکھا گیا۔

صحابہ میں حضرت ابن مسعودؓ، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت براء بن عازبؓ تینوں حضرات سے قریب قریب ایک ہی معنی میں یہ قول منقول ہے کہ :-

"لوگ فتح مکہ کو فتح کہتے ہیں حالانکہ ہم اصل فتح صلح حدیبیہ کو سمجھتے ہیں۔" (بخاری، مسلم، مسند احمد)

قرآن حکیم نے صلح حدیبیہ اور صحابہ کی "بیعت علی الموت" کا ذکر

اور صلح کی برکات و فوائد کا بیان تفصیل سے کیا ہے :-

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ﴿١﴾ (سورہ الفتح آیات ۱ تا ۲۹)

قرآنی مضمون

اے نبیؐ ہم نے آپؐ کو کھلی فتح عطا کر دی تاکہ اللہ آپؐ کی اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے اور آپؐ پر احسانات کی اور زیادہ تکمیل کر دے. اور آپؐ کو سیدھا راستہ دکھائے اور آپؐ کو زبردست نصرت بخشے.

وہ اللہ وہی ہے جس نے ایمان والوں کے دلوں میں تحمل پیدا کیا تاکہ اپنے پہلے ایمان کے ساتھ اُن کا ایمان اور زیادہ ہو جائے اور زمین و آسمان کے سب لشکر اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ وہ بڑا جاننے والا بڑا حکمت والا ہے۔

اُس نے یہ کام یہ اس لئے کیا ہے تاکہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ہمیشہ رہنے کے لئے ایسی جنتوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی اور تاکہ اُن کے گناہ دور کر دے اور اللہ کے نزدیک یہ بڑی کامیابی ہے۔

اور اُن منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو سزا دے جو اللہ کے متعلق بُرے گمان رکھتے ہیں اُن پر بُرا وقت آنے والا ہے اور اللہ اُن پر غضبناک ہوگا اور اُنہیں رحمت سے دور کر دے گا اور اُن کے لئے جہنم تیار رکھی ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔

اور زمین و آسمانوں کے لشکر اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور اللہ بڑا زبردست حکمت والا ہے۔

اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تم کو شہادت دینے والا اور بشارت دینے والا اور خبردار کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ اے لوگو تم اللہ اور اُسکے رسول پر ایمان لاؤ اور اُس کے دین کی مدد کرو

اور اُسکی تعظیم کرو اور صبح و شام اُسکی تسبیح کرتے رہو۔

(اے نبیؐ) جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ اللہ ہی سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں پر ہے۔ لہٰذا جو کوئی عہد توڑے گا تو اُسکے عہد توڑنے کا وبال اُسی پر پڑے گا اور جو کوئی اُس عہد کو پورا کرے گا جو اُس نے اللہ سے کیا ہے۔ اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

(اے نبی) جو دیہاتی اس سفر (حدیبیہ) میں پیچھے رہ گئے تھے وہ عنقریب آکر آپؐ سے کہیں گے ہم کو ہمارے مال اور بال بچوں کی فکر نے مشغول کر رکھا تھا۔ لہٰذا آپؐ ہمارے لئے مغفرت کی دُعا فرمائیں۔ یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کرتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں۔

اے نبی آپؐ ان سے کہہ دیجئے وہ کون ہے جو اللہ کے مقابلہ میں تمہارے لئے کسی چیز کا بھی اختیار رکھتا ہے؟ اگر اللہ تمہیں کچھ نقصان پہنچانا چاہے یا کوئی نفع پہنچانا چاہے؟

نہیں بلکہ اللہ ہی تمہارے سب اعمال سے خوب باخبر ہے۔ دگر اصل بات وہ نہیں جو تم کہہ رہے ہو، بلکہ تم نے یوں سمجھا کہ رسول اور مومنین اپنے گھر والوں میں ہرگز پلٹ کر نہ آسکیں گے اور یہ خیال تمہارے دلوں کو بہت بھلا لگا اور تم نے بہت بُرے گمان کئے اور تم برباد ہونے والے لوگ ہوگئے۔ اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان نہ لایا سو ہم نے کافروں کے لئے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔ اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک اللہ ہی ہے جسے چاہے معاف کردے اور جسے چاہے سزا دے اور وہ غفور و رحیم ہے۔

اور یہ پیچھے رہ جانے والے عنقریب جب تم مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لئے جانے لگو گے تو تم سے یہ لوگ ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے فرمان کو بدل دیں۔ ان سے صاف کہہ دینا کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے۔

اللہ پہلے ہی یہ فرما چکا ہے۔ یہ کہیں گے کہ نہیں بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کر رہے ہو۔ (حالانکہ بات حسد کی نہیں ہے) اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ بہت کم ہی بات سمجھتے ہیں۔

آپؐ اِن پیچھے رہ جانے والوں (منافقوں) سے کہہ دیجئے کہ عنقریب تم ایسے لوگوں سے لڑنے کے لئے بلائے جاؤ گے جو بڑے زورآور ہیں تم کو ان سے جنگ کرنی ہوگی یا پھر وہ مطیع و فرمانبردار ہو جائیں۔ اُس وقت اگر تم نے حکم جہاد کی پیروی کی تو اللہ تمہیں اچھا اجر دے گا۔ اور اگر تم پھر اُسی طرح مُنہ موڑ دیئے جس طرح پہلے موڑ چکے ہو تو اللہ تم کو دردناک عذاب دے گا۔

کوئی گناہ نہ اندھے پر ہے اور نہ لنگڑے پر ہے اور نہ بیمار پر (جبکہ یہ لوگ جہاد نہ کریں) اور جو کوئی اللہ اور اُسکے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اُسے ان جنتوں میں داخل کرے گا جس کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں اور جو کوئی روگردانی کریگا اُسے وہ دردناک عذاب دے گا۔

بیشک اللہ خوش ہوا اُن مسلمانوں سے جبکہ وہ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے سو اللہ کو اُن کے دلوں کا حال معلوم تھا اس لئے اُس نے اُن پر اطمینان نازل کیا اور اُن کو انعام میں ایک قریبی فتح بخشی اور بہت سا مالِ غنیمت اُنھیں عطا کر دیا جسے وہ عنقریب حاصل کریں گے اور اللہ بڑا زبردست حکمت والا ہے (اشارہ فتح خیبر کی جانب ہے جو یہودیوں کا دولت مند شہر تھا)

اللہ تم لوگوں سے بکثرت اموالِ غنیمت کا وعدہ کرتا ہے جنہیں تم حاصل کرو گے سو اُس نے اِن میں سے یہ فتح تم کو فوری دیدی اور دشمنوں کے ہاتھ تمہارے خلاف اُٹھنے سے روک دیئے تاکہ یہ بات مومنوں کے لئے ایک نشانی بن جائے اور تاکہ اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشے۔

اسکے علاوہ دوسری ایک اور فتح کا بھی وہ تم سے وعدہ

کرتا ہے جن پر تم ابھی تک قادر نہیں ہوئے ہو اللہ اُسے احاطۂ قدرت میں لئے ہوئے ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے (یعنی فتح مکّہ)

اور اگر تم سے یہ کافر (یہود خیبر) لڑتے تو ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے پھر نہ انھیں کوئی یار ملتا نہ مددگار۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آرہی ہے اور تم اللہ کی سُنت (دستور) میں کوئی تبدیلی نہ پاؤگے۔ وہ اللہ وہی تو ہے جس نے مکّہ کی وادی میں اُن کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ اُن سے روک دیئے۔ حالانکہ وہ اُن پر تم کو غلبہ عطا کر چکا تھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اُسے دیکھ رہا تھا (یعنی صلح حدیبیہ کی جانب اشارہ ہے۔ حدیبیہ کو بطن مکّہ کہا گیا ہے)

یہ وہی لوگ تو ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام (بیت اللہ) سے روکا اور قربانی کے اونٹوں کو اُن کی جگہ (حدود حرم) میں پہنچنے نہ دیا۔ اور اگر مکّہ میں ایسے مومن مرد اور مومن عورتیں موجود نہ ہوتے جنھیں تم نہیں جانتے تھے اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ لاعلمی میں تم انہیں پامال کر دوگے پھر اس سے تم پر حرف آئے گا (تو جنگ نہ روکی جاتی اور مکّہ بھی فتح ہو جاتا لیکن جنگ روکی گئی) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کرے۔ اور اگر مکّہ کے یہ بے بس مسلمان وہاں سے الگ ہو گئے ہوتے تو اہل مکّہ میں سے جو کافر تھے اُن کو ہم ضرور سخت سزا دے دیتے۔ (یعنی یہ تھی وہ مصلحت جسکی بنا پر اللہ تعالیٰ نے حدیبیہ میں جنگ نہ ہونے دی)

(یہی وجہ ہے کہ) جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں عصبیت بٹھالی جاہلی عصبیت تو اللہ نے اپنے رسولؐ اور ایمان والوں پر صبر و تحمل نازل فرمایا اور اللہ نے انھیں تقویٰ کی بات پر قائم رکھا اور وہ اسکے مستحق بھی ہیں اور اہل بھی اور اللہ تو ہر شئے کا پورا علم رکھتا ہے۔

فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچّا خواب دکھایا تھا جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا۔ انشاء اللہ تم مسجد حرام (بیت اللہ شریف) میں پورے اطمینان و امن کے ساتھ داخل ہوگے۔ تم میں کوئی سر منڈاتا ہوگا اور کوئی

بال کترا تا ہوگا، کسی طرح کا اندیشہ نہ ہوگا۔ سو اللہ تعالیٰ کو وہ باتیں معلوم ہیں جو تم کو معلوم نہیں۔ اس لئے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے اُس نے یہ قریبی فتح دے دی (یعنی خیبر کی فتح)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اُس کو تمام دینوں پر غالب کر دے اور اس حقیقت پہ اللہ کی گواہی کافی ہے۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کی صحبت یافتہ ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں آپس میں مہربان ہیں۔ (اے مخاطب) تو اُنھیں دیکھے گا کہ کبھی رکوع کر رہے ہیں کبھی سجدہ کر رہے ہیں۔ اللہ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ اُن کے آثار سجدہ کی تاثیر سے اُن کے چہروں پر نمایاں ہیں۔ یہ اُن کے اوصاف کتاب تورات میں ہیں اور کتاب انجیل میں اُنکی مثال یوں دی گئی جیسے کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی پھر اُس کو قوی کیا پھر وہ کھیتی اور موٹی ہوئی پھر وہ اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ کاشت کرنے والوں کو خوش کرتی ہے (یہ نشو ونما صحابہ رسول کو اس نے دیا) تاکہ کافروں کو اُن سے جلائے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن صاحبوں سے جو ایمان لائے ہیں اور نیک کام کر رہے ہیں مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔

نتائج و عبر

اسلامی مزاج

صلح حدیبیہ کے واقعہ میں مشرکینِ مکّہ کی جانب سے بات چیت کرنے جو سردار آپ کی خدمت میں آئے تھے اُن میں عُروہ بن مسعود ثقفی بھی شامل ہے جس کو قریشِ مکّہ نے اپنا سفیر بنا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا تھا، عُروہ جب کبھی کوئی بات کرتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کو ہاتھ لگاتے (جو اُس زمانے میں احترام کی علامت تھی) حضرت مغیرہ بن شعبہ (عروہ کے بھتیجے) جنگی لباس میں ملبوس تلوار ہاتھ میں لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر کھڑے تھے بارگاہ نبوی میں اپنے چچا کی یہ جرأت برداشت نہ کی فوراً کہا اپنا ہاتھ رسول اللہ علیہ وسلم کی داڑھی سے ہٹائیے کسی مشرک کو زیبا نہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہاتھ لگائے۔

اسکے بعد عروہ بن مسعود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کی حُسن عقیدت اور اخلاص وجاں نثاری کا ایسا عجیب وغریب منظر دیکھا جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ یہ کہ جب آپؐ کسی صحابی کو کوئی حُکم دیتے تو ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ میں اسکو پورا کروں۔ جب آپ کے دہن مبارک سے تھوک یا بلغم نکلتا تو وہ زمین پر گرنے نہیں پاتا تھا۔ آپؐ کے اصحاب اسکو اپنے ہاتھوں میں لے لیتے، جب آپؐ وضو فرماتے تو یہی حال ہوتا تھا کہ وضو کا پانی زمین پر گرنے نہیں پاتا تھا۔ جب آپ کوئی کلام فرماتے تو ایک سناٹا سا ہو جاتا تھا گویا ہر شخص سراپا گوش ہے، ہر ایک کی نگاہیں نیچی ہو جاتی ہیں۔

عروہ جب آپؐ کے پاس سے واپس ہوئے تو قریش سے

جاکر کہا: اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی قسم میں نے قیصر روم اور ایران کے کسریٰ اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے دربار دیکھے ہیں مگر ایسی عقیدت اور محبت و تعظیم کا یہ عجیب و غریب منظر کہیں نہیں دیکھا ہے۔ محمد بادشاہ نہیں لیکن بادشاہوں سے بڑی شان رکھتے ہیں۔ (زرقانی ج ۲ ص ۱۹۲)

پوشیدہ حکمت اور برکاتِ صلح

جس وقت معاہدے کی شرائط طے ہو رہی تھیں صحابہ کرام میں عام بے چینی اور اضطراب کی کیفیت طاری تھی۔ کسی کا ذہن اُن مصلحتوں اور برکات کو محسوس نہیں کر رہا تھا جنکو چشمِ نبوت دیکھ رہی تھی۔ اس صلح کے نتیجے میں جو خیر عظیم رونما ہونے والا تھا اس کا ادراک ہر ایک کی نظر سے باہر تھا۔ معاہدے کی دو باتیں خاص طور پر صبر آزما تھیں جس سے ہر ایک متأثر تھا۔

اوّل یہ کہ مکہ سے جو مسلمان بھاگ کر مدینہ جائے اسکو واپس کرنا ہوگا اور جو مسلمان مدینہ سے مکہ آجائے اُسکو ہم واپس نہیں کریں گے۔

دوسری بات یہ کہ اس سال مسلمان بغیر عمرہ ادا کئے مدینہ واپس چلے جائیں آئندہ سال صرف تین دن کے لئے مکہ آئیں اور عمرہ ادا کریں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری شرط کے بارے میں صحابہ سے فرمادیا کہ یقیناً ہم نے مدینہ میں خواب دیکھا تھا کہ بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں لیکن اسی سال ایسا ہوگا ایسی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ انشاء اللہ آئندہ سال طواف کریں گے۔

پہلی بات اگرچہ صلح کے معاہدات میں یقیناً نامساوی شرط اور بظاہر مسلمانوں کی ذلت و شکست کا باعث نظر آرہی تھی لیکن اس شرط کے مابعد نتائج و فوائد ایسے تھے جسکو فتح مبین قرار دیا گیا۔

مشہور محدث امام زہری رحؒ لکھتے ہیں کہ

اسلام میں جو عظیم الشان فتوحات شمار کی گئی ہیں اُن میں صلح حدیبیہ اسلام کی سب سے پہلی فتح عظیم ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ صلح سے پہلے کفار مکہ سے جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری تھا کسی وقت بھی چین و امن کا موقعہ نہ تھا۔ اس صلح کی وجہ سے ہر دو فریق کو امن و اطمینان کا موقعہ ملا۔ ایک

دوسرے سے ملنے ملانے کی صورت نکل آئی اور تبادلۂ خیالات کا موقعہ فراہم ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو شخص بھی اسلامی تعلیمات کو آزادی سے سُنتا اُس پر اسلام کی حقانیت واضح ہوئی اور وہ مسلمان ہو گیا۔ چنانچہ معاہدہ کے ان ڈیڑھ سال میں جسقدر مسلمان ہوئے اس سے پہلے اتنی بڑی تعداد مسلمان نہیں ہوئی۔"

مؤرخ ابن ہشام نے امام زہریؒ کی تائید میں یہ کھُلی شہادت پیش کی ہے کہ :-

واقعہ حدیبیہ میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نکلے تھے تو چودہ سو مسلمان آپ کے ساتھ تھے۔ اس معاہدہ کے صرف ڈیڑھ سال بعد فتح مکہ کے لئے آپؐ نے کوچ فرمایا تو دس ہزار مسلمان آپ کے ساتھ ہیں۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۳۵۵)

حافظ ابن حجر عسقلانی رح لکھتے ہیں کہ :-

"صلح حدیبیہ نے فتح مکہ کے لئے راہ کھول دی تھی۔ یہ اس لئے کہ جب جنگ کا خطرہ درمیان سے جاتا رہا اور امن و اطمینان کی صورت پیدا ہو گئی تو مکہ اور مدینہ کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حضرت عمرو بن العاص رض اور حضرت خالد بن الولید رض جیسے فاتحان اسلام کا مسلمان ہو جانا اسی صلح کے باعث ہوا۔"

اُس نامسادی اور یکطرفہ شرط کے تعلق سے جب عرض کیا گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں جو شخص ہم میں کا اُن مشرکینِ مکہ سے جا ملے ہمیں اُس کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کو اپنی رحمت سے دُور پھینک دیا (اور ہم کو اُسکے شر سے بچا دیا) اور جو شخص اُن مشرکینِ مکہ سے مسلمان ہو کر ہماری طرف مدینہ آجائے گا تو اگرچہ ازروئے معاہدہ وہ واپس کر دیا جاوے لیکن اُس پر اندیشہ کرنیکی بات نہیں اللہ تعالیٰ اُس کے لئے عنقریب نجات کی کوئی صورت پیدا کر دے گا (اس طرح کفر کے ماحول میں ایک مسلمان داخل ہو کر تبلیغ اسلام کا ماحول پیدا کر دیا اور مکہ میں اسلام کی تبلیغ کا ایک قانونی موقع فراہم

ہوگیا) (صحیح مسلم)

اس سلسلے میں اس دوران ایک واقعہ پیش آیا جس نے اس پوشیدہ حکمت کو طشت از بام کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ واپس پہنچ گئے کچھ دنوں بعد مکہ سے ایک مسلمان ابوبصیرؓ نامی مشرکین مکہ کی قید و بند سے فرار ہوکر مدینہ پہنچے۔ قریش مکہ نے ان کے پیچھے دو آدمی روانہ کئے تاکہ انھیں پکڑلائیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے از روئے معاہدہ ابوبصیرؓ کو مشرکین کے حوالہ کر دیا اور ابوبصیرؓ سے فرمایا میں خلاف عہد نہیں کرتا بہتر ہے تم مکہ واپس چلے جاؤ۔

ابوبصیرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ مشرکین مجھکو طرح طرح سے ستاتے ہیں اور مجھکو دین اسلام سے پھیرنا چاہتے ہیں۔ میں ان کے ظلم سے بڑی مصیبت میں ہوں۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا ابوبصیرؓ صبر کرو اور اللہ تعالےٰ سے امید رکھو انشاء اللہ تمہارے لئے نجات کی صورت نکل آئیگی۔ ابوبصیرؓ اُن دونوں مشرکوں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ مقام ذوالحلیفہ پر پہنچے تو وہ دونوں آرام لینے کے لئے کچھ دیر ٹھیر گئے۔ ابوبصیرؓ نے ایک سے کہا کہ تمہاری تلوار بہت عمدہ معلوم ہوتی ہے یہ تم کو کہاں سے حاصل ہوئی؟ اُس مشرک نے کہا خدا کی قسم یہ نہایت عمدہ تلوار ہے میں نے اس کو بارہا آزمایا ہے۔ دراصل یہ میرے آباء واجداد سے چلی آرہی ہے۔

حضرت ابوبصیرؓ نے خواہش ظاہر کی کہ ذرا مجھے دکھا بھی دو؟ اُس نے فوراً نیام سے نکال کر ابوبصیرؓ کو دے دیا۔ ہاتھ میں آنا ہی تھا کہ ابوبصیرؓ نے ایک زبردست وار کر دیا اور وہ مشرک اُسی وقت ڈھیر ہوگیا۔ اس کا ساتھی یہ منظر دیکھتے ہی بھاگ پڑا اور سیدھے مدینہ طیبہ پہنچا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ میرا ساتھی تو مارا گیا اور اب میں بھی مارا جانے والا ہوں مجھ پر رحم کیجئے اور میری مدد فرمائیے۔ آپؐ نے اُس مشرک کو روک لیا۔ اتنے میں حضرت ابوبصیرؓ

حاضرِ خدمت ہوگئے اور عرض کرنے لگے یارسول اللہ آپؐ نے تو اپنا عہد پورا کر دیا ہے اور مجھکو اُن کے حوالہ فرما دیا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے مجھکو اُن سے نجات دی ہے اور جو کچھ کارروائی میں نے کی ہے وہ اس لئے کہ میرے اور اُن مشرکین کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ میں کسی عہد و معاہدہ کا پابند نہیں ہوں۔ یارسول اللہ اگر آپ مجھکو ان لوگوں کے حوالہ فرمادیں تو وہ لوگ مجھکو دین اسلام سے منحرف کرنے کے لئے وہ سب کچھ کریں گے جو ظالم مظلوم پر کیا کرتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ ناگواری کے انداز میں فرمایا:-

"لڑائی کا بھڑکانے والا ہے کاش کہ اسکا کوئی ساتھی ہوتا۔"

حضرت ابوبصیرؓ سمجھ گئے کہ اگر میں مدینہ میں رہ گیا تو کسی بھی وقت کفار مکّہ کے حوالہ کر دیا جاؤں گا۔ موقع پاکر مدینہ سے بھاگ پڑے اور ساحل بحر احمر کے اُس راستہ پر جا بیٹھے جس راستے سے قریش کے کاروانِ تجارت ملکِ شام کو جایا آیا کرتے تھے۔ حضرت ابوبصیرؓ یہاں ٹھہر گئے۔ شُدہ شُدہ یہ بات مکّہ کے بے بس و مجبور مسلمانوں کو معلوم ہوئی جنکو ہجرتِ مدینہ سے روک دیا گیا تھا۔ یہ مظلوم و غریب مسلمان چھُپ چھُپ کر ابوبصیرؓ کے ہاں پہنچنے لگے۔ اسی درمیان حضرت ابوجندلؓ (جنکا تذکرہ صلح حدیبیہ میں آچکا ہے) بھی حضرت ابوبصیرؓ کے ہاں پہنچ گئے۔ اسی طرح چند ہی دنوں میں ستّر مسلمانوں کا ایک جتھا وہاں جمع ہوگیا۔ مشہور مؤرخ علّامہ سُہیلی لکھتے ہیں کہ تین سو آدمی جمع ہوگئے۔ امام زہریؒ اور موسیٰ بن عقبہ سے بھی یہی تعداد منقول ہے۔ (زرقانی ج ۲ ص ۲۰۳)

اِدھر کفارِ قریش کا جو بھی تجارتی قافلہ ساحل بحر سے گزرتا اُنپر حملوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جو بھی مالِ غنیمت ملتا اُس سے گزر بسر کرلیتے اس طرح مکہ کا ہر تجارتی قافلہ غیر محفوظ ہوگیا۔

کفارِ قریش اس ناگہانی مصیبت سے پریشان ہوگئے اور انکی تجارت ٹھپ ہوگئی چند آدمیوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

مدینہ روانہ کیا اور رحم کی درخواست کی اور قرابت و رشتہ داری کا واسطہ دے کر گزارش کی کہ آپ ابوبصیرؓ اور اُن کی جماعت کو مدینہ بلا لیں۔ علاوہ ازیں صلح حدیبیہ کی چوتھی شرط سے بھی دست برداری کا اعلان کیا کہ جو شخص بھی ہم میں سے مسلمان ہو کر مدینہ چلا جائے اُسکو ہم واپس طلب نہیں کریں گے۔ کفار قریش کی اس بے بسی اور جزع فزع پر نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبصیرؓ کے نام ایک مکتوب روانہ کیا جسمیں مدینہ طیبہ آجانے کی خواہش کا اظہار تھا جس وقت یہ والا نامہ پہنچا ہے اُس وقت حضرت ابوبصیرؓ دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ نزع کا عالم تھا آپؐ کا مکتوب گرامی پڑھ کر سنایا گیا خوشی و مسرت سے بے خود ہو ہو جاتے تھے۔ اسی حالت میں روح پرواز کر گئی۔ رضی اللہ عنہ۔

ایک روایت میں ہے کہ والا نامہ ہاتھ میں تھا۔ (فتح الباری)

حضرت ابوجندل بن سہیلؓ نے تجہیز و تکفین کی اور اُسی جگہ انہیں سپرد خاک کیا گیا۔ (برّد اللہ مضجعہٗ)

بعد ازاں حضرت ابوجندلؓ اپنے تمام ساتھیوں کو لے کر مدینہ منورہ حاضر ہو گئے۔

جس صلح کو کفار مکہ اپنی فتح اور عزت سمجھ رہے تھے خود اُن کے ہاتھوں شکست و ذلت کا باعث ہو گئی۔ صلح حدیبیہ پر تین ماہ بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ یہودیوں کا سب سے بڑا گڑھ خیبر فتح ہو گیا اور اتنا مالِ غنیمت ہاتھ آیا کہ عہد نبوت میں اسکی نظیر نہیں ملتی۔ ان کے بعد فدک وادی القریٰ، تیما اور تبوک کی یہودی بستیاں اسلام کے زیر نگیں آتی چلی گئیں۔ پھر وسط عرب کے وہ تمام قبیلے جو یہود اور قریش مکہ کے ساتھ گٹھ جوڑ رکھتے تھے ایک ایک کر کے تابع فرمان ہو گئے۔ اس طرح حدیبیہ کی صلح نے دو سال کے اندر اندر عرب میں قوت و طاقت کا توازن اتنا بدل دیا کہ قریش و مشرکین کی طاقت بے حقیقت ہو کر رہ گئی۔ فَلِلّٰہِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ۔

حدیبیہ میں مسلمانوں اور کفارِ قریش کے درمیان جنگ کو اللہ نے روک دیا اور پھر اسکو اپنے احسانات میں شمار کیا ہے اور یقیناً یہ اللہ کا بہت بڑا فضل و کرم تھا۔

لیکن یہ جنگ اللہ تعالیٰ نے اس لئے نہیں روکی کہ وہاں مسلمانوں کے شکست کھا جانے کا امکان تھا بلکہ اسکی مصلحت کچھ اور تھی جسکو قرآن حکیم میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اگر یہ مصلحت مقصود نہ ہوتی تو جنگ ہوجاتی اور کفار کو یقیناً شکست ہوتی اور مکہ مکرمہ اُسی وقت فتح ہوجاتا۔

اُس مصلحت کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ اُس وقت مکہ مکرمہ میں بہت سے مسلمان مرد و عورت ایسے موجود تھے جنھوں نے یا تو اپنا ایمان و اسلام چھپا رکھا تھا جسکی وجہ سے وہ جانے پہچانے نہیں جاتے تھے یا مشہور و معروف تو تھے لیکن اپنی مالی و جسمانی کمزوری کے باعث ہجرت سے معذور تھے اور مکہ میں ظلم و ستم کا شکار ہورہے تھے۔ اس صورتِ حال میں اگر جنگ ہوجاتی تو لاعلمی میں یہ مجبور و معذور مسلمان بھی کافروں کے ساتھ مارے جاتے اور اُن کا کوئی تحفظ نہ ہوسکتا تھا۔ انکی معذوری و مجبوری کا علم اللہ علیم و خبیر ہی کو تھا۔ اب اگر یہ مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جاتے تو خود مسلمانوں کو اِس کا شدید صدمہ ہوتا اور دوسری طرف مشرکین مکہ کو یہ طعنہ دینے کا موقعہ ہاتھ آجاتا کہ مسلمان خود اپنے مسلمان بھائیوں کو قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اِن بے بس مسلمانوں پر رحم کرکے اور صحابہ کرام کو رنج و بدنامی سے بچانے کے لئے حدیبیہ کے موقع پر جنگ کو ٹال دیا۔

اُس مصلحت کا دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ حرمِ پاک (ارضِ حرم) کو خون ریز جنگ سے آلودہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ وہ ارضِ مقدس ہے جسمیں جنگ و جدال تو درکنار ہتھیار اُٹھانا بھی حرام کیا گیا ہے تو پھر رسول اور اہل ایمان سے تلوار اُٹھوا کر اسکی حُرمت کیونکر متأثر کی جاتی؟

اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتے تھے کہ صلح حدیبیہ کے ضمن میں قریش مکہ

کو دو سال کے اندر اندر مسلمان ہر طرف سے گھیر کر اس طرح بے بس و بے طاقت بنا دیں کہ وہ کسی مزاحمت کے بغیر اللہ کے گھر کو مسلمانوں کے حوالہ کر دیں اور لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو جائیں۔

قرآن حکیم کی آیاتِ ذیل ان مصلحتوں کی تائید کرتی ہیں:-

وَاُخْرٰی لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا الآیۃ (الفتح آیت ۲۱)

وَلَوْ قَاتَلَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ الآیۃ (الفتح آیت ۲۲)

وَهُوَ الَّذِیْ کَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَکَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَکُمْ عَلَیْهِمْ الآیۃ (الفتح آیت ۲۴)

وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ الآیۃ (الفتح آیت ۲۵)

سندِ خوشنودی

بسا اوقات ہماری ظاہری آنکھیں ایک معاملہ کو اپنی شکست و محرومی دیکھتی ہیں لیکن اللہ علیم و خبیر کے علم و نگاہ میں وہ سراپا خیر و برکت اور موجبِ سعادت ہوتی ہیں۔ اسی طرح کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی چیز کے بارے میں ہم خیر و برکت کا تصور کرتے ہیں لیکن وہ نتیجہ و انجام میں ناکامی اور نقصان کا باعث ثابت ہوتی ہے۔

قرآن حکیم کی ہدایات میں یہ راز حکمت کا عظیم خزانہ ہے جس نے اللہ و رسول کے احکام کو ہر معاملہ میں راہنما بنا لیا اور اُسی میں اپنی صلاح و فلاح کا عقیدہ قائم کر لیا اُس کی نہ صرف دنیا کامیاب رہی بلکہ آخرت کی دائمی فلاح بھی نصیب ہو گئی۔

جو لوگ قلت تعداد اور اسباب ظاہری کے فقدان کے باوجود اللہ کے رسول کے ہاتھ پر فداکاری و جاں نثاری کا عہد کر رہے تھے اللہ نے اُن کے ایثار و قربانی کی جزائے عظیم یہ عطا فرمائی کہ قرآن حکیم میں کامل صراحت کے ساتھ ان کو اپنی خوشنودی و رضامندی کی سند بخشی اور اسی مبارک سند کی بنا پر اُن کا وہ عہد و پیمان "بیعت رضوان" کے نام سے رہتی دنیا تک موسوم پایا۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ

الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ الخ

(الفتح آیت ۱۸)

یقیناً اللہ تعالیٰ اُن مسلمانوں سے راضی ہوگیا جبکہ یہ لوگ آپ سے (اے نبیؐ) درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے اور اُن کے دلوں میں جو کچھ بھی (اخلاص وتقویٰ) تھا اللہ کو وہ بھی معلوم تھا۔ پس اللہ نے (اُن کے دلوں) میں اطمینان پیدا کر دیا (جس سے اُن کو اللہ تعالیٰ کا اور اُسکے رسول کا حکم ماننے میں ذرا پس و پیش نہیں ہوا) اور اُن کو ایک ہاتھ در ہاتھ فتح دے دی (یعنی یہودیوں کا دولت مند شہر خیبر بغیر کسی جنگ وجدال قبضہ میں آگیا۔)

انعامِ عظیم

شرائط صلح حدیبیہ کے فوائد و برکات کتنے تھے اور کتنے ظاہر ہوئے؟ یہ اللہ علیم وخبیر ہی کے علم میں ہے۔ علماء اسلام نے تو چند ایک کا ذکر کیا ہے لیکن مرکزِ اسلام مکۃ المکرمہ کی بازیابی بھی اسی صلح کا ثمرہ ہے جس نے قیامت تک کے لئے اس مقدس شہر (بلد امین) کو ایمان و اسلام کا مرکز بنا دیا اور تاریخ یہ شہادت دیتی ہے کہ اس ڈیڑھ ہزار سال میں اسپر کفر وشرک کا اقتدار طاری نہیں ہوا۔

(حَفِظَهُ اللّٰهُ وَاَبْقَاهُ)

فتحِ مکّہ

نصراللہ والفتح

حدیبیہ کے معاہدے میں قبائلِ عرب کو یہ آزادی دی گئی تھی کہ وہ جس قبیلے سے بھی دوستی اور عہد و پیمان کے تعلقات قائم کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ انہی قبائل میں قبیلہ بنوخزاعہ اور قبیلۂ بنوبکر نے جنھیں زمانۂ قدیم سے سخت دشمنی اور اختلاف چلا آرہا تھا اس آزادی سے فائدہ اٹھایا۔

بنوخُزاعہ نے اعلان کیا کہ ہم مسلمانوں کے دوست اور حلیف ہونا پسند کرتے ہیں .بنوبکر نے کہا ہم قریشِ مکہ (مشرکین) کے حلیف بننا چاہتے ہیں۔

اس طرح دونوں قبیلے الگ الگ دو جماعتوں کے دوست ہوگئے اور ضرورت پر ایک دوسرے کی مدد اور لڑائی میں تعاون کا معاہدہ کر لیا۔ اس طرح دونوں قبیلے ایک دوسرے سے مامون اور بے خوف بھی ہوگئے۔ لیکن ایک دوسرے میں جو بغض و عناد تھا وہ دور نہ ہوا۔ ہر ایک قبیلہ اس تاک میں تھا کہ دوسرے سے اپنا سابقہ انتقام لے۔

تقریباً ڈیڑھ سال تک تو ہر دو جانب سے معاہدہ پر عمل ہوتا رہا لیکن بغض و عناد کی آگ بھڑک پڑی۔ بنوبکر (قریش کے دوست) نے ایک شب بنوخزاعہ پر اچانک حملہ کر دیا اور اُن پر تباہی مچادی۔

اس غارت گری میں قریش نے بنوبکر کا ساتھ دیا اور ہتھیار اور افراد سے ان کی مدد کی۔ مقصد ان کا یہ تھا کہ بنوخُزاعہ کو جنھوں نے مسلمانوں سے عہد و پیمان کیا ہے مزہ چکھایا جائے۔ اور یہ خیال کیا کہ شب کا وقت ہے پیغمبر اسلام اور مسلمان یہاں سے بہت دور مدینہ میں ہیں انھیں اسکی کیا خبر ہوسکتی ہے۔ چنانچہ بنوبکر نے قریشِ مکہ کی تائید و تعاون سے بنوخزاعہ پر قیامت ڈھادی۔ بنوخزاعہ نے بھاگ کر حرم شریف میں پناہ لی لیکن ان کو یہاں بھی پناہ نہ مل سکی۔

دوسرے دن صبح بنوخزاعہ کے سردار عمرو بن سالم خُزاعی اپنے چالیس آدمیوں کا ایک وفد لیکر مدینہ منورہ بارگاہِ نبوی میں روانہ ہوا اور مسجد نبوی میں پہنچکر بنوخزاعہ کی دردناک داستان سنائی اور مدد و تعاون کا طالب ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس عہد شکنی

کی تفصیل سُنی تو ارشاد فرمایا :۔

"اللہ کی قسم جس بات کو میں پسند نہیں کرتا اُس سے تم کو بھی محفوظ رکھوں گا۔"

شُدہ شُدہ یہ بات قریش مکہ کو پہنچی تو انھیں اندیشہ ہوا کہ مسلمان بنو خُزاعہ کی تائید میں ہماری اس عہد شکنی کا بدلہ لیں گے۔

جب یہ وفد واپس ہوگیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک قاصد قریش مکہ کے ہاں روانہ کیا اور انھیں یہ پیام پہنچایا کہ تین باتوں میں سے ایک بات اختیار کرلیں۔

(۱) بنو خزاعہ کے جن لوگوں کو مارا گیا اُسکی دِیت (جُرمانہ) ادا کریں۔

(۲) یا بنو بکر کی حمایت اور عہد و پیمان سے علیحدہ ہو جائیں۔

(۳) یا حدیبیہ کے معاہدے کو ختم کر دینے کا اعلان کریں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد نے جب یہ پیام پہنچایا تو قریش کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ ہم کو پہلی دو باتیں قبول نہیں ہیں البتہ حدیبیہ کے معاہدے کو ہم ختم کر دینا پسند کرتے ہیں۔

اللہ کے رسول کا قاصد مکہ سے روانہ ہوا لیکن اس کے چند گھنٹوں بعد ہی قریش کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اُنھوں نے سردار قریش ابوسفیان کو معاہدہ کی تجدید اور مدت صلح کو بڑھانے کے لئے مدینہ منورہ روانہ کیا۔ ابوسفیان مدینہ پہنچکر سب سے پہلے اپنی بیٹی اُمّ حبیبہ رضؓ کے گھر داخل ہوا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مکرمہ تھیں۔ جوں ہی آپ کے بستر پہ بیٹھنے کا ارادہ کیا سیدہ اُمّ حبیبہؓ نے بستر فوراً لپیٹ دیا کہنے لگیں :۔

ابا جان! یہ اللہ کے رسول کا بستر ہے۔

ابوسفیان نے کہا تو پھر کیا ہوا؟ میں تیرا باپ ہوں۔

سیدہ اُمّ حبیبہ رضؓ نے کہا یہ صحیح ہے لیکن آپ مشرک ہیں اور یہ رسول اللہ کا پاک بستر ہے۔

ابوسفیان اگرچہ اس وقت بڑبڑاتا ہوا وہاں سے نکل گیا لیکن اس حیرت فزا واقعہ نے اسکی آنکھیں کھول دیں اور وہ سمجھ گیا کہ حقیقتِ حال کچھ اور ہی ہے۔ یہاں سے وہ سیدھے مسجد نبوی میں آیا اور آپ سے صلح حدیبیہ کی تائید و توثیق کرنے لگا۔ آپؐ نے دریافت کیا

معاہدے کی تجدید یا توثیق کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟ کیا کوئی نیا واقعہ پیش آیا ہے ؟
ابوسفیان نے کہا نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا تو پھر تم مطمئن رہو ہم اپنے عہد پر قائم ہیں۔ ابوسفیان اس جواب کو سنکر مطمئن نہ ہوا کیونکہ وہ حقیقتِ حال کو چھپا کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاف اور سچے جواب نے اُسکے فریب کو ناکام کر دیا۔ مسجد نبوی سے نکل کر صدیق اکبرؓ فاروق اعظمؓ اور علی مرتضیٰؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جُدا جُدا گفتگو کی اور چاہا کہ قریش کے حسب مراد معاملہ طے ہو جائے لیکن خواہش پوری نہ ہوئی اور وہ بے نیل و مرام مکہ واپس ہو گیا۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔
صدیق اکبرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمارے اور قریش کے درمیان تو معاہدہ ہے۔
آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ تھا مگر قریش نے از خود نقضِ عہد کر دیا ہے۔ اب ہم اپنے عہد کے پابند نہیں ہیں۔

اب جہاد کی تیاری شروع ہوگئی۔ آپ نے مدینہ طیبہ اور اطرافِ مدینہ میں اعلانِ عام کرا دیا کہ: جو شخص بھی اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے وہ ماہ رمضان تک مدینہ طیبہ پہنچ جائے۔
مگر عام طور پر کسی کو معلوم نہ تھا کس جانب حملہ کا ارادہ ہے۔
آپؐ کی خواہش یہ تھی کہ ہماری تیاری کا علم قریشِ مکہ کو نہ ہونے پائے اور رازداری کے ساتھ اسلامی لشکر کوچ کرے لیکن اس درمیان ایک حادثہ پیش آگیا۔
حاطب بن ابی بلتعہؓ ایک بدری صحابی تھے اِن کے اہلِ وعیال مکہ مکرمہ ہی میں مقیم تھے۔ حاطب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے کی پوری خبر تھی ان کو اپنے خاندان والوں کا خیال ستایا کہ اگر مکہ پر اچانک حملہ ہو گیا تو میرے افرادِ خاندان بھی زد میں آجائیں گے۔ پھر یہ بھی خیال آیا کہ مشرکینِ مکہ کو بہر حال علم تو ہو ہی جائے گا کیوں نہ میں قریشِ مکہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے کی اطلاع کر دوں اس طرح انکی ہمدردی حاصل کر کے اپنے اہل خاندان کو محفوظ کر سکوں گا۔
چنانچہ مشرکینِ مکہ کے نام ایک خط لکھ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عنقریب ایک بڑے لشکر کے ساتھ تمہاری جانب کوچ کرنے والے ہیں۔ اور مخفی طور پر ایک عورت کے

ذریعہ اس خط کو مکہ روانہ کر دیا۔ یہ عورت مدینہ سے روانہ ہوئی مگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بذریعہ وحی اس واقعہ کی اطلاع کر دی آپؐ نے فوری طور پر حضرت علی رضؓ حضرت زبیر رضؓ حضرت مقدادؓ کو روانہ کیا کہ تم برابر چلتے رہو یہاں تک کہ مقام روضۂ خاخ میں تم کو اونٹ پر سوار ایک عورت ملیگی اُس کے پاس مشرکین مکہ کے نام حاطبؓ بن ابی بلتعہ کا ایک خط ہے اُس کو حاصل کر لو۔ چنانچہ یہ حضرات جب روضۂ خاخ پر پہنچے تو اُس عورت کو پایا اور خط کا مطالبہ کیا اُس نے ایسے کسی بھی خط کا انکار کیا مگر جب اِن حضرات نے جامہ تلاشی کی دھمکی دی تو مجبور ہو کر اُس نے اپنے سر کے بالوں میں سے ایک پرچہ نکال کر دیا

یہ حضرات وہ خط لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آپ کے حوالہ کر دیا۔

آپؐ نے حاطب بن ابی بلتعہ کو طلب فرمایا اور پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟

حاطبؓ رضؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ مواخذہ میں عجلت نہ فرمائیں میرا عذر سماعت فرمائیں۔ یا رسول اللہ قریش سے میری کوئی رشتہ داری نہیں ہے صرف دوستانہ تعلقات ہیں۔ اِن دنوں میرے اہل وعیال مکہ میں مقیم ہیں جن کا کوئی حامی اور مددگار نہیں ہے بخلاف مہاجرین مدینہ کے اُن کی قرابتیں اور رشتہ داریاں وہاں موجود ہیں۔ اِن رشتہ داریوں کی وجہ سے اُن کے اہل وعیال محفوظ ہیں۔ اس لئے میں نے چاہا کہ جب قریش سے میری کوئی رشتہ داری نہیں تو اُن کے ساتھ کوئی ایسا احسان کروں جسکے صلہ میں وہ لوگ میرے اہل وعیال کی حفاظت کریں۔ یا رسول اللہ اللہ کی قسم میں نے دین سے مرتد ہو کر یا اسلام کے بعد کفر سے راضی ہو کر یہ کام ہرگز ہرگز نہیں کیا۔ میری غرض ونیت وہی تھی جو میں نے عرض کی ہے۔

صحیح بخاری کی روایت ہے کہ جب آپؐ نے یہ عذر سُنا تو فرمایا :۔

أَمَا إِنَّهُ قَدْ صَدَقَكُمْ.

(یقیناً اس نے سچ سچ بیان کر دیا)

یہ سُنکر حضرت عمر رضؓ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور عرض کیا اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ اَعْلَمُ۔

حاطب بن ابی بلتعہ رضؓ کے اسی واقعہ پر قرآن حکیم کی یہ آیت نازل ہوئی۔ (بخاری)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ الخ

(سورہ الممتحنہ آیت ۱تا۱)

"اے ایمان والو تم میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ تم اُن کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہو۔ حالانکہ جو دین حق تمہارے پاس آچکا ہے اُس کو وہ لوگ ماننے سے انکار کر چکے ہیں۔

اُن کی روش تو یہ ہے کہ رسولؐ کو اور تم کو صرف اس وجہ سے جلا وطن کر چکے ہیں کہ تم اللہ پر ایمان لائے ہو جو تمہارا رب ہے۔ جبکہ تم میری راہ میں جہاد کرنے نکل چکے ہو اور میری خوشنودی کے لئے گھروں اور وطن کو چھوڑ چکے ہو۔ تم چھُپا کر اُن کو دوستانہ پیغام بھیجتے ہو۔ حالانکہ جو کچھ تم چھُپا کر کرتے ہو اور جو علانیہ کرتے ہو ہر چیز کو میں خوب جانتا ہوں۔ جو شخص بھی تم میں سے ایسا کرے گا وہ یقیناً راہِ راست سے بھٹک گیا۔"

بہرحال ماہ رمضان کی ابتدائی تاریخیں تھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دس ہزار جان نثاروں کے ساتھ مکہ مکرمہ کی جانب کوچ فرمایا۔ گرمی کا زمانہ تھا بعض روزے دار تھے اور بعض نے سفر کی اجازت سے روزہ نہیں رکھا تھا۔ آپ کی ازواج میں حضرت سیدہ ام سلمہؓ اور سیدہ میمونہؓ ہمراہ تھیں۔ جب آپ مقام عسفان کے قریب پہنچے تو محسوس فرمایا کہ مسلمانوں پر روزے کی سختی حد سے متجاوز ہو چکی ہے۔ آپ نے پانی طلب فرمایا اور علی الاعلان مجمع کے سامنے نوش فرمایا تاکہ صحابہ دیکھ لیں اور سمجھ لیں کہ حالت سفر میں اور پھر جہاد کے موقع پر افطار کرنے کی اجازت ہے۔ روایات میں ہے کہ بعض صحابہ نے اس اجازت سے استفادہ نہیں کیا اور اپنے روزے پر قائم رہے۔ دن کے آخری حصے میں ایک روزے دار صحابی پر غشی طاری ہو گئی۔ آپ کو جب اس بات کا علم ہوا تو ناراض ہوئے اور ارشاد فرمایا:-

أُولٰٓئِكَ الْعُصَاةُ أُولٰٓئِكَ الْعُصَاةُ

یہ گنہگار لوگ ہیں یہ گنہگار لوگ ہیں۔

(بخاری باب الغزوات)

اسی سفر میں آپؐ کے چچا سیدنا عباس رضہ مسلمان ہو کر حاضر خدمت ہوئے۔ آپ نے اُن سے ارشاد فرمایا اہل و عیال کو مدینہ روانہ کر دو اور آپ ہمارے ساتھ مکہ مکرمہ کی مہم میں شریک ہو جائیے۔

اسلامی لشکر جب مکہ کے قریب پہنچا تو سردار قریش ابوسفیان چُھپ کر لشکرِ اسلام کا صحیح اندازہ کر رہے تھے مسلمانوں نے انہیں گرفتار کر کے خدمتِ اقدس میں پیش کیا۔ آپؐ نے ابوسفیان پر نظر کرم ڈالتے ہوئے معاف کر دیا اور قید سے بھی آزاد کر دیا۔ حضرت ابوسفیان رضہ رحمۃ للعالمین کا یہ خُلق عظیم دیکھ کر مشرّف باسلام ہو گئے۔ آپؐ نے ان کے اسلام لانے پر بہت ہی مسرّت کا اظہار فرمایا اور حضرت عباس رضہ سے فرمایا کہ قریب کی پہاڑی پر ابوسفیان کو لیجاؤ تاکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی شان و شوکت دیکھیں! چنانچہ حضرت ابوسفیان رضہ اور حضرت عباس رضہ پہاڑی پر کھڑے اسلامی لشکر کا نظارہ کر رہے تھے۔ مہاجرین اور انصار کے قبائل اپنے اپنے پرچم لئے سامنے سے گزر رہے تھے۔ حضرت ابوسفیان رضہ ان کو دیکھ دیکھ کر متاثر ہو رہے تھے۔ قریب سے ایک انصاری قبیلہ کا لشکر گزرا جسکی قیادت حضرت سعد بن عبادہ انصاری رضہ کر رہے تھے انھوں نے حضرت ابوسفیان رضہ کو دیکھ کر پُرجوش لہجہ میں یہ رجز پڑھا:—

الیوم یوم الملحمہ   الیوم تستحل الکعبہ
آج کا دن جنگ کا دن ہے   آج خانہ کعبہ میں بھی جنگ حلال ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ سُنا تو فرمایا سعد بن عبادہ رضہ نے غلط کہا۔ آج اللہ تعالیٰ خانہ کعبہ کی عظمت و شوکت کو دوبالا کرے گا اور آج خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا جائے گا۔ (بخاری)

اسکے بعد مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کی تیاری شروع ہو گئی۔ حضرت خالد بن ولید رضہ کو حکم فرمایا کہ تم اپنے لشکر کے ساتھ مکہ مکرمہ کے نچلے حصے کُدی سے داخل ہوں اور دیکھو خبردار کسی کو قتل نہ کرنا اور نہ کسی پر زیادتی کرنا۔ لیکن درمیان راہ بعض قبائل کے افراد نے مزاحمت کی اور

اس کشاکشی میں چند مشرک مارے گئے اور دو مسلمان شہید بھی ہوئے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مقام کداء (مکہ مکرمہ کا بالائی حصہ) سے گزرتے ہوئے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ داخلہ کے بعد ہی آپ اپنی چچازاد بہن حضرت ام ہانی بنت ابی طالب کے گھر تشریف لے گئے (جہاں آپؐ نے پرورش پائی تھی) اور غسل کرکے آٹھ رکعت نماز ادا کی۔ یہ چاشت (دن چڑھے) کا وقت تھا۔ (بخاری)

بعد ازاں آپؐ نے یہ اعلان کروایا۔

(۱) جو شخص ہتھیار ڈال دے اُسکو امن ہے۔

(۲) جو شخص اپنا دروازہ بند کرلے اسکو امن ہے۔

(۳) جو شخص ابوسفیان کے گھر داخل ہوجائے اُسکو امن ہے۔

(۴) جو شخص مسجد حرام (بیت اللہ شریف) میں پناہ لے اسکو امن ہے۔

البتہ اس امنِ عام اور عفوِ عظیم میں چند ایسے افراد کو معاف نہیں کیا گیا جنھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بے پناہ ظلم وستم کیا تھا اور جو نہایت درجہ گستاخ و دریدہ دہن تھے۔ اِن کے متعلق یہ حکم ہوا کہ یہ جہاں کہیں ملیں انھیں قتل کردیا جائے۔

مَلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا الآیۃ

(احزاب آیت ۶۱)

ایسے مجرموں کی جملہ تعداد پندرہ یا سولہ بیان کی جاتی ہے۔ لیکن اِن میں سے چند ایک ہی کو قتل کیا گیا بقیہ یا تو فرار ہوگئے یا اسلام قبول کرلیا اور قتل سے محفوظ ہوگئے۔ (سیرت ابن ہشام)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اونٹنی پر سوار ہوکر سورہ الفتح کی آیات بلند آواز سے تلاوت فرماتے ہوئے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ تواضع کا یہ عالم تھا کہ آنکھیں نیچی سر مبارک جھکا ہوا۔

سب سے پہلے آپ مسجد حرام میں داخل ہوئے اور حکم فرمایا کہ تمام بت نکال باہر کئے جائیں اور خانہ کعبہ کی دیواروں پر جو تصاویر

منقوش تھیں وہ مٹا دیئے جائیں۔ چنانچہ جب تین سو ساٹھ بتوں کے سرنگوں ہونے کا وقت آیا تو ان میں دو مورتیاں سیدنا ابراہیم خلیل اللہ اور سیدنا اسمٰعیل ذبیح اللہ کے نام نامی اس حالت میں نظر آئیں کہ ان کے ہاتھوں میں جوئے کے تیر تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا اللہ مشرکوں کو ہلاک کرے وہ خوب جانتے تھے کہ یہ ہر دو مقدس ہستیاں اس ناپاک عمل سے بالکل پاک وصاف و بری تھے۔

جب بیت اللہ شریف بتوں کی نجاست سے پاک کر دیا گیا تو آپؐ نے بیت اللہ کا طواف کیا۔ پھر آپؐ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اور چاروں گوشوں میں گھومتے ہوئے بلند آواز سے تکبیرات کہتے رہے اور نفل نماز ادا کی۔ باہر تشریف لا کر مقام ابراہیم پہ دو رکعت نماز ادا فرمائی۔

نماز کے بعد باب کعبہ پر تشریف لائے اسوقت حرم شریف مسلمانوں سے بھر گیا تھا۔ پھر آپؐ نے ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا جس میں اللہ عزوجل کی حمد وثنا کے بعد ضروری ہدایات تھیں اور چند بنیادی احکام کی تلقین تھی۔ پھر عام مجرموں کو معافی کا مژدہ سنایا۔

خطبہ سے فارغ ہو کر آپؐ حرم شریف میں بیٹھ گئے اسوقت بیت اللہ کی کنجی آپؐ کے ہاتھ میں تھی۔

سیدنا علیؓ اور سیدنا عباسؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ یہ کنجی ہم کو عنایت فرما دیجئے تاکہ زمزم (سقایہ) کی خدمت کے ساتھ بیت اللہ کی دربانی (حجابہ) کا شرف بھی ہمیں حاصل ہو جائے۔

اس درخواست پر اُسی وقت قرآن نازل ہوا:-

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا الآیہ

اللہ تو تم کو حکم دیتا ہے امانتیں پہنچا دو امانت والوں کو۔ (نساء آیت ۵۸)

آپ نے عثمان بن طلحہ حجبی (جن کے خاندان میں زمانۂ قدیم سے بیت اللہ کی خدمتِ دربانی چلی آرہی تھی) کو طلب فرمایا اور کنجی حوالہ کی اور ارشاد

فرمایا یہ کنجی ہمیشہ کے لئے لے لو (یعنی ہمیشہ تمہارے خاندان ہی میں رہے گی) میں نے یہ کنجی خود نہیں دی بلکہ اللہ تعالےٰ نے تم کو دلائی ہے۔ سوائے ظالم اور غاصب کے کوئی تم سے نہ چھین سکے گا۔

(فتح الباری ج ۸ ص۱۵)

(یہ وہی عثمان بن طلحہ ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرتبہ خانہ کعبہ میں داخل ہونے نہیں دیا تھا اور کلید کعبہ کو اپنا حق بتایا تھا۔ یہی خاندان آج تک کلید بردار ہے اور شیبی لقب سے مشہور ہے)

ظہر کی نماز کا وقت آیا آپؐ نے سیدنا بلال حبشی رضؓ کو حکم دیا کہ خانہ کعبہ کی چھت پر اذان دیں۔ یہ رمضان المبارک کی ۲۰ ر تاریخ تھی۔ خانۂ کعبہ میں اسلام کی یہ پہلی اذان تھی۔

مکہ مکرمہ میں تقریباً پندرہ یوم قیام فرماکر مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ روانگی سے قبل حضرت عتاب بن اسید رضؓ کو مکہ مکرمہ کا حاکم تجویز کیا۔ اس وقت اِن کی عمر اکیس ۲۱ سال کی تھی۔ (روض الانف ج ۲ ص۲۷۶) اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک امیر مکہ کی حیثیت سے رہے۔ صدیق اکبر رضؓ نے بھی انھیں اس خدمت پر برقرار رکھا۔ جس دن صدیق اکبرؓ کی وفات ہوئی اُسی دن حضرت عتاب بن اسید رضؓ نے بھی وفات پائی۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

فتح مکہ کا ذکر سورہ النصر میں وضاحت کے ساتھ اور سورہ الحدید اور سورہ الفتح میں ضمناً واشارۃً آیا ہے:۔

قرآنی مضمون

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا۔ الخ (النصر)

جب اللہ کی مدد اور فتح (مکہ) آپہنچے اور اے نبی آپ لوگوں کو اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے دیکھ لیں تو آپ اپنے پروردگار کی پاکی حمد وثنا کے ساتھ ادا کیجئے اور اُس سے مغفرت طلب کیجئے۔ بیشک

وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

شہر مکہ فتح ہوجانے کے بعد کہنا چاہیئے کہ سارے حجاز پر اسلام کا تسلط ہوگیا۔ شہر مکہ، شہر طائف اور ملک یمن اور قبیلۂ ہوازن و قبیلۂ ثقیف کے لوگ فتح مکہ کے بعد کثیر تعداد میں داخل اسلام ہونے لگے۔

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ الآية

(حدید آیت ۱۰)

تم میں سے جو لوگ فتح مکہ سے قبل خرچ کرچکے اور لڑ چکے وہ لوگ اُن لوگوں کے برابر نہیں جو فتح مکہ کے بعد لڑے اور خرچ کئے۔ وہ لوگ درجے میں بڑھے ہوئے ہیں اُن لوگوں سے جنھوں نے بعد کو خرچ کیا اور لڑے اور اللہ تعالیٰ نے بھلائی کا وعدہ تو سب ہی سے کر رکھا ہے اور اللہ کو تمہارے اعمال کی پوری خبر ہے۔

یعنی جن مجاہدین نے شروع زمانۂ اسلام میں جان و مال سے جہاد کیا یہ لوگ اُن مجاہدین سے اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں جنھوں نے مکہ فتح ہونے کے بعد جبکہ اسلام اور مسلمانوں کو قوت و طاقت حاصل ہوگئی تھی جان و مال سے جہاد کیا ہو۔ یہ اس وجہ سے کہ ابتداء اسلام میں جن مصائب و مشکلات کا سامنا تھا وہ فتح مکہ کے بعد نہ رہا۔

وَأُخْرَىٰ لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا۔ (الفتح آیت ۲۱)

اور ایک اور فتح بھی ہے جو ابھی تمہارے قابو میں نہیں آئی ہے اللہ اُسے احاطۂ قدرت میں لئے ہوئے ہے۔ اور اللہ ہر شئی پر قادر ہے۔ (اس فتح سے مراد فتح مکہ ہے)

وَيَنْصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا۔ (الفتح آیت ۳)

اور اللہ آپ کو باعزت غلبہ دے گا۔ (اس غلبہ سے مراد فتح مکہ ہے)

نتائج و عبر

کامیابی اور فتحمندی کے وقت

مکہ مکرمہ ۸ھ میں فتح ہوا۔ اگرچہ بزورِ طاقت فتح ہوا لیکن خوں ریزی یا قتل و غارت گری سے بالکل محفوظ رہا۔ پورے حجاز سے کفر کی طاقت پاش پاش ہوگئی۔ ایمان و اسلام کا مرکز جو پوری زمین کا بھی مرکز ہے مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ اگر آج یہ بات پیش آتی تو مسلمان کیا کرتے؟ اور عہدِ اوّل کے مسلمانوں نے کیا کیا۔

انتہائی فتحمندی، کامیابی، کامرانی کے وقت یہ نہیں ہوا کہ جشن دھوم دھام سے منایا گیا ہو؟ جلسہ جلوس نکالے گئے ہوں؟ نقارے بجے ہوں؟ چراغاں روشن کئے ہوں؟ زندہ باد، پائندہ باد کے نعرے لگے ہوں؟ مرد عورتیں باہر نکل آئے ہوں؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے برخلاف عہد اوّل کے مسلمانوں کو قرآن حکیم یہ ہدایت دیتا ہے کہ ایسے موقعوں پر اللہ کی حمد و ثنا، توبہ و استغفار میں زیادہ مشغول ہوجانا چاہیئے۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا۔ (النصر)

اخلاص کا ایک اور پیمانہ

مکہ مکرمہ سے ہجرت کرتے وقت مسلمانوں نے اپنی زمینیں، باغات، مکانات سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ صرف اور صرف ایمان و اسلام کی بقا و تحفظ میں یہ سب کچھ گوارا کر لیا تھا۔ مسلمانوں کی اِن املاک پر مشرکینِ مکہ نے قبضہ کر لیا تھا۔

جب مکہ فتح ہوا اور مسلمان فاتحانہ داخل ہوئے تو بعض صحابہ نے چاہا کہ انھیں اپنی زمین اور مکان واپس ملجائیں حضرت ابواحمد بن جحش رضہ صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا مکان ابوسفیان نے لے لیا ہے مجھے واپس دلا دیجئے! آپؐ نے اُن کو بلا کر کچھ آہستہ سے کان میں کہا۔ ابواحمد رضہ سنتے ہی خاموش ہوگئے۔ بعد میں جب اُن سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے کیا فرمایا تھا ؟

ابو احمد رضؓ نے کہا آپؐ نے مجھ سے یہ فرمایا تھا اگر تو صبر کرے تو یہ بہتر ہے اسکے معاوضہ میں تجھ کو جنت کا ایک گھر مل جائے گا۔

میں نے عرض کیا تو پھر میں صبر ہی کروں گا۔

اِن کے علاوہ بعض اور مہاجرینِ صحابہ نے چاہا کہ اُن کے مکانات اُن کو دلائے جائیں۔

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے یہی فرمایا کہ جو مال اللہ کی راہ میں جاچکا ہے میں اُس کی واپسی کو پسند نہیں کرتا۔ اس ارشاد پر سب صحابہ نے دستبرداری اختیار کرلی۔

(الصارم المسلول صـ ۱۵۴ امام ابن تیمیہ رح)

نبی یا بادشاہ

دنیاوی بادشاہ اور نبی الرحمہ کے درمیان فرق وامتیاز کا ایک اور واضح ثبوت یہ بھی ہے کہ جب کوئی بادشاہ کسی ملک کو فتح کرتا ہے تو مفتوح قوم پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے، قتل و غارت گری عام ہو جاتی ہے، مجرم اور مشتبہ لوگ قتل کردیئے جاتے ہیں، شریف وعزت والے ذلیل ورسوا ہو جاتے ہیں، عورتیں اور بچے تک محفوظ نہیں رہتے۔ یہ سب کچھ فاتح قوم کی ہوا وہوس کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اور زمین پر عام فساد مچ جاتا ہے۔

لیکن نبی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اقتدار حاصل ہوا اور فتح مکہ کی صورت میں کفار ومشرکین پر قدرت حاصل ہوئی تو تاریخ شہادت دیتی ہے کہ آپ نے اعلان عام کروادیا :-

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ.

آج تم پر کوئی ملامت نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔

ایک شخص زندگی بھر آپ کی اور مسلمانوں کی اور اسلام کی مخالفت کرتا رہا فتح مکہ کے دن کانپتا لرزتا خوف کھاتا حاضر ہوا آپؐ نے فرمایا : ”خوف نہ کر میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں ایک غریب قریشی عورت کا بیٹا ہوں“ اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلَيْهِ.

غزوۂ حُنَین

معرکہ حنین

فتح مکہ کے بعد مشرکین عرب کی قوت وطاقت کا قریب قریب خاتمہ ہوگیا تھا اور عرب قبائل فوج در فوج اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ انقلاب و ترقی دیکھ کر دو قبائل کی جاہلی حمیت بھڑک اٹھی اور وہ اسلام کی شان وشوکت کو برداشت نہ کر سکے۔ یہ دو قبائل قبیلۂ ہوازن اور قبیلۂ ثقیف تھے۔ طائف اور مکہ کے درمیان حنین نامی ایک بستی تھی جسمیں یہ دو قبیلے آباد تھے۔ نہایت جنگجو، تیرانداز اور سفاک قسم کے لوگ تھے۔ ان کے سرداروں کا اجتماع ہوا اور مشورہ کیا گیا کہ اب ہم کو کیا کرنا چاہیئے؟ کیونکہ اسلام اور مسلمانوں کے قدم جم گئے ہیں کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ وہ ہم پر بھی اچانک حملہ کر دیں۔ کیوں نہ ہم خود پیش قدمی کر کے مسلمانوں پر حملہ کر دیں اور انہیں شکست دیدیں۔

مشورہ کے بعد طے ہوا کہ مالک بن عوف نصری کو اپنا امیر تسلیم کیا جائے اور اُسکی قیادت میں اس مہم کو پورا کیا جائے۔ چنانچہ مالک بن عوف نے بیس ہزار تیراندازوں کا لشکر لیکر کوچ کیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ حال معلوم ہوا تو آپؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا اور اسکے مقابلہ کے لئے آپؐ روانہ ہوئے۔ آپؐ کے ہمراہ بارہ ہزار مسلمان تھے۔ یہ اتنی بڑی تعداد تھی کہ اس سے پہلے کسی غزوہ میں جمع نہ ہوئی تھی۔ یہ ماہ شوال ۸ھ ہجری مطابق ماہ فروری ۶۳۰ء کا واقعہ ہے (یعنی فتح مکہ سے دو ہفتے بعد) مجاہدین اسلام کا لشکر جب حنین پہنچا تو آپ نے فوج کی صف آرائی کی اور خود بنفسِ نفیس پوری فوج کی قیادت فرمائی۔ ابھی جنگ کا آغاز نہ ہوا تھا کہ مسلمانوں کے دلوں کو لشکرِ اسلام کی کثرت اور قوت وطاقت کی فراوانی نے

متأثر کر دیا اور بعض کی زبانوں سے یہ کلمات نکل پڑے :۔

لَنْ نُغْلَبَ الْيَوْمَ مِنْ قِلَّةٍ۔

آج ہماری قوت کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

یہ کلمات ایسے تھے جسمیں خود پسندی اور غرور کا عنوان نمایاں ہو رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو مسلمانوں کا یہ فخر پسند نہ آیا اس نے اپنی تائید ونصرت اُٹھالی اور مسلمانوں کو خود اُن کے اپنے نفس کے حوالہ کر دیا گیا۔

جب جنگ کا آغاز ہوا اور مسلمانوں نے پیش قدمی شروع کی تو دشمن جو پہلے سے منظم تھا اچانک چاروں سمت سے حملہ کر دیا اور اسلامی لشکر پر بارش کی طرح تیر برسنے لگے۔ مسلمانوں کے لئے تیراندازی کا یہ غیر متوقع حادثہ تھا۔ دشمن کی بے پناہ تیراندازی نے مسلمانوں کو سنبھلنے نہ دیا انتشار اور تفریق پیدا ہوگئی اور کچھ دیر بعد قدم اُکھڑ گئے۔ میدان جنگ تنگ ہوگیا اور مسلمان پیٹھ پھیر پھیر کر بھاگنے لگے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اطراف اکابر صحابہ کی ایک مختصر جماعت باقی رہ گئی تھی آپؐ نے تین بار بلند آواز سے فرمایا :۔

اے لوگو اِدھر آؤ میں اللہ کا رسول اور محمد بن عبداللہ ہوں۔

أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ۔ (بخاری ومسلم)

حضرت سیدنا عباسؓ بلند آواز تھے آپؐ نے انھیں حکم دیا کہ مہاجرین وانصار کو آواز دیں۔ سیدنا عباس رضؓ نے اونچی آواز سے یامعشرالانصار یااصحاب السمرہ کے کلمات سے مسلمانوں کو آواز دی۔ اے گروہ انصار اے وہ لوگو جنھوں نے کیکر کے درخت کے نیچے بیعت رضوان کی تھی۔ آواز کا کانوں تک پہنچنا ہی تھا ایک دم سب کے سب پلٹے گئے اور پروانہ وار شمع نبوت کے گرد جمع ہوگئے۔ آپؐ نے مشرکین پر بھرپور حملہ کرنیکا حکم دیا۔ گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی اور میدان کارزار گرم ہوگیا۔ آپؐ نے ایک مشتِ خاک لیکر کافروں کی جانب پھینک دی اور فرمایا :۔

شَاهَتِ الْوُجُوهُ۔ چہرے خاک آلود ہوں۔ (مسلم)

اس کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا:۔

اِنْهَزَمُوْا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ۔

قسم ہے رب محمد کی اُنھوں نے شکست کھائی۔

دشمنوں کی صف میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جس کی آنکھ میں مشتِ خاک کا غبار نہ پہنچا ہو اور چند لمحات بعد دشمن کے قدم اکھڑنے شروع ہو گئے۔ مسلمانوں کا دباؤ شدید تر ہوتا گیا دم کے دم میں کایا پلٹ گئی۔ قبیلہ ہوازن کے تیر انداز جو اپنی قوتِ تیراندازی میں شہرتِ عام رکھتے تھے بدحواس ہو کر بھاگنے لگے اور بہت سے قتل بھی ہوئے ایک بڑی تعداد قید کر لی گئی۔

اس جنگ میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آیا چھ ہزار قیدیوں کے علاوہ چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں اور چار ہزار اُوقیہ چاندی تھی۔ (ایک اُوقیہ مساوی ۳۷ گرام) (فتح الباری ج ۸ صـ۳۸)

چند روز بعد قبیلۂ ہوازن کے چند آدمی آپؐ کی خدمت میں آئے اور اسلام قبول کیا اور آپؐ سے درخواست کی کہ قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ آپؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ تمہارے یہ بھائی مسلمان ہو کر آئے ہیں میں نے اپنا اور اپنے خاندان کا مالِ غنیمت ان کو دیدیا ہے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اور مسلمان بھی ان قیدیوں کو واپس کر دیں۔ سب نے آپؐ کی خواہش کو قبول کیا۔ اس طرح چھ ہزار قیدی رہا کر دیئے گئے۔ ان ہی قیدیوں میں آپؐ کی رضاعی بہن شیما بھی تھیں لوگوں نے جب انھیں گرفتار کیا تو انھوں نے کہا اے لوگو میں تمہارے نبی کی بہن ہوں۔ صحابہ تصدیق کے لئے آپ کی خدمت میں لے آئے۔ شیما نے کہا اے محمدؐ میں آپ کی بہن ہوں حلیمہ سعدیہ کا دودھ آپ اور میں نے پیا ہے۔ اور یہ علامت بتائی کہ بچپن میں ایک مرتبہ آپؐ نے میرے ہاتھ کو اپنے دانت سے کاٹا تھا جس کا یہ نشان موجود ہے۔ آپؐ نے پہچان لیا اور عزت و اکرام کے ساتھ اِن کو اپنی چادر پر بٹھایا فرطِ مسرت

میں آپؐ کے آنسو نکل آئے اور ارشاد فرمایا اگر تم یہاں رہنا چاہو تو تمھیں عزت واحترام کے ساتھ رکھا جائے گا اور اگر اپنے قبیلہ میں جانا چاہو تو تم کو اختیار ہے۔

شیما نے کہا میں اپنی قوم میں جانا چاہتی ہوں اسکے بعد مسلمان ہو کر قبیلہ ہوازن روانہ ہو گئیں۔ چلتے وقت آپؐ نے انھیں چند اونٹ اور بکریاں اور ایک خادمہ عطا فرمائی۔ (اصابہ ترجمہ شیما ج ۴ ص ۳۴۴)

غزوۂ حنین کا تذکرہ قرآن حکیم نے اس طرح بیان کیا ہے :-

قرآنی مضمون

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ. الخ

(توبہ آیت ۲۵، ۲۶، ۲۷)

تم کو اللہ تعالیٰ نے لڑائی کے بہت موقعوں میں کفار پر غلبہ دیا (جیسے بدر وغیرہ میں) اور حنین کے دن بھی (جس کا قصہ عجیب وغریب ہے تم کو غلبہ دیا) جبکہ یہ واقعہ ہوا کہ تم کو اپنے مجمع کی کثرت سے غرہ ہو گیا تھا پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور (کفار کے تیر برسانے سے ایسی پریشانی ہوئی کہ) تم پر زمین باوجود اپنی اس فراخی کے تنگ ہو گئی پھر آخر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے اس کے بعد اللہ نے اپنے رسولؐ کے قلب پر اور دوسرے مومنوں کے قلوب پر اپنی طرف سے تسلی نازل فرمائی اور (مدد کے لئے) ایسے آسمانی لشکر نازل فرمائے جنکو تم نے نہیں دیکھا (مُراد فرشتے ہیں جس کے بعد تم پھر مستعد ہو گئے اور غالب آئے) اور اللہ نے کافروں کو سزا دی (کہ ان کو شکست ہوئی اور وہ قید کر لئے گئے) اور یہ کافروں کی دنیا میں سزا تھی پھر اللہ نے اُن کافروں میں سے جس کو چاہا تو بہ نصیب کر دیا (چنانچہ بہت سارے مسلمان ہو گئے) اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنیوالے بڑی رحمت کرنیوالے ہیں۔

غزوۂ تبوک

(خاتم الغزوات)

سفر تبوک فتح مکہ کے بعد اسلام اور مسلمانوں کا مؤقف نہایت مستحکم ہو گیا۔ جزیرۃ العرب میں ایسی کوئی طاقت باقی نہ رہی جو سر اُبھار سکے۔ لیکن بعض عیسائیوں نے ملک روم کے بادشاہ ہرقل کو ایک جھوٹا خط لکھ کر روانہ کر دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انتقال ہو گیا ہے اور لوگ منتشر ہو گئے ہیں۔ علاوہ ازیں لوگ قحط سالی سے بھوکے مر رہے ہیں۔ عرب پر حملہ کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔

ہرقل نے اس اطلاع کو صحیح سمجھ کر فوراً تیاری کا حکم دے دیا۔ چالیس ہزار رومیوں کا لشکر مقابلہ کے لئے تیار ہو گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ اطلاعات ملیں کہ ہرقل کی فوج روانہ ہو چکی ہے تو آپ نے فوراً سفر کی تیاری کا حکم جاری فرما دیا اور اعلان کیا کہ دشمنوں کی سرحد تبوک پر پہنچکر اُن کا مقابلہ کیا جائے گا۔ ماہ رجب ۹ھ موسم سخت گرمی کا تھا قحط سالی اور گرانی کا زمانہ تھا۔ پھر مسافت کی دوری یہ ایسے اسباب تھے جسمیں مسلمانوں کے لئے سخت آزمائش تھی لیکن اسلام کے یہ مخلص مجاہدین عیش دنیا اور مصائب و آلام سے بے پرواہ ہو کر مدینہ منورہ میں جمع ہو گئے۔ ایسے نازک وقت میں جہاد کے لئے نکلنا صرف اور صرف اہل ایمان ہی کا اقدام ہو سکتا تھا۔ منافقین جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے گھبرا اُٹھے خود بھی جان چرانے لگے اور دوسروں کو بھی یہ کہکر بہکانے لگے۔

لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ ایسی گرمی میں ہرگز نہ نکلو

(توبہ آیت ۸۱)

ایک مسخرے نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ لوگوں کو معلوم ہے میں حسین و جمیل

عورتوں کو دیکھ کر بے تاب ہوجاتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ میں رومیوں کی عورتوں کو دیکھ کر کسی بڑے فتنے میں مبتلا ہوجاؤں۔ لیکن مخلصین تیار ہوگئے۔ غزوات نبوی میں یہ پہلا موقع تھا کہ آپؐ نے مجاہدین کی مالی امداد کے لئے عام اعلان فرمایا۔ صدیق اکبرؓ نے اپنا کل مال آپؐ کی خدمت میں پیش کر دیا جسکی مقدار چار ہزار درہم تھی۔ آپؐ نے دریافت کیا اہل وعیال کے لئے کیا چھوڑا ہے؟ صدیق اکبرؓ نے کہا اللہ اور اُسکے رسول کا نام چھوڑ آیا ہوں!

فاروق اعظمؓ نے گھر کا نصف مال پیش کیا۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ نے دو سو اوقیہ چاندی لاکر دیا۔ حضرت عاصم بن عدیؓ نے ستر وسق (قدیم پیمانہ) کھجوریں پیش کیں۔ سیدنا عثمان غنیؓ نے تین سو اونٹ مع ساز و سامان حرب اور ایک ہزار دینار آپکی خدمت میں پیش کیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہایت مسرور ہوئے دینار کو بار بار پلٹتے تھے اور یہ فرماتے جاتے تھے کہ اس نیک عمل کے بعد عثمانؓ کو کوئی عمل ضرر پہنچا نہ سکے گا۔ اے اللہ میں عثمانؓ سے راضی ہوں تو بھی راضی ہوجا۔ (زرقانی ج ۳ ص ۶۴)

اکثر صحابہ نے اپنی اپنی حیثیت کے موافق اس تعاون میں حصہ لیا۔ مگر پھر بھی سواری اور زادِ راہ کا پورا انتظام نہ ہوسکا۔ چند غریب صحابہ حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ ہم بالکل نادار ہیں ہمارے ہاں اس سفر کے لئے نہ سواری ہے نہ زادِ راہ۔ اے اللہ کے رسول ہم کو کچھ ملجائے تو ہم اس سفر سعادت میں شریک ہوں۔ آپؐ نے فرمایا میرے پاس کوئی سواری نہیں جو تمہیں دے سکوں۔ اسپر وہ حضرات روتے ہوئے واپس ہوئے اور آنسو اُنکی آنکھوں سے جاری تھے۔ انکے اس اخلاص و ناداری پر یہ آیت نازل ہوئی:- وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوا وَأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ. (التوبہ آیت ۹۲)

اور نہ اُن لوگوں پر کوئی گناہ ہے کہ جب آپؐ کے پاس آئے کہ آپؐ ان کو جہاد میں جانے کے لئے کوئی سواری عطا فرمائیں تو آپؐ نے یہ فرمایا کہ اس وقت کوئی چیز نہیں پاتا جس پر تم کو سوار کر دوں۔ تو یہ

لوگ اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں اس غم میں کہ ان کو کوئی چیز میسر نہیں جسے وہ سفر جہاد میں خرچ کرسکیں۔"

جب کوچ کا وقت آیا تو آپ نے حضرت محمد بن مسلمہ انصاری رضؓ کو اپنا قائم مقام اور مدینہ کا حاکم مقرر فرمایا اور حضرت علی رضؓ کو اپنے اہل وعیال کی حفاظت و نگرانی کے لئے مامور فرمایا۔ اس پر حضرت علی رضؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ مجھکو بچوں اور عورتوں میں چھوڑ جاتے ہیں؟ ارشاد فرمایا اے علی رضؓ کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ تم کو مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارون (علیہ السلام) کو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے تھی مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

الغرض مسلمانوں کا لشکر جرار پورے جوش و ولولے کیساتھ تبوک کی جانب کوچ کیا تو روم کے بادشاہ ہرقل کو اُس کے جاسوسوں نے خبر کر دی۔ ہرقل یا تو کرّ و فر کے ساتھ جنگ کی تیاریوں میں مشغول تھا یا یہ خبر سنتے ہی ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ ایک لاکھ فوج میں خوف وانتشار پھیل گیا اور مسلمانوں کے تبوک پہنچنے سے پہلے پہلے ساری فوج منتشر ہوگئی، الغرض آپ تیس ۳۰ ہزار فوج کے ساتھ مدینہ منورہ سے روانہ ہوگئے جس میں دس ۱۰ ہزار گھوڑے تھے۔

راہ میں وہ عبرتناک مقام بھی پڑتا تھا جہاں قوم ثمود پر اللہ کا عذاب نازل ہوا تھا جب آپ اس مقام سے گزر رہے تھے تو اس درجہ متاثر تھے کہ چہرۂ انور پر کپڑا ڈال لیا اور اپنی اونٹنی کو تیز کر دیا اور صحابہ کو تاکید فرمائی کہ کوئی شخص ثمود کے کھنڈرات میں داخل نہ ہو اور نہ یہاں کے کنوؤں سے پانی پیئے۔ جن لوگوں نے غلطی سے پانی لے لیا تھا اُس کو بہا دینے کا حکم دیا۔ (بخاری شریف کتاب الانبیاء)

آگے چل کر ایک منزل پر ٹھہرے تو پانی نہ تھا لوگ سخت پریشان ہوگئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا فرمائی۔ کچھ ہی دیر بعد موسلا دھار بارش ہوئی سب سیراب ہوگئے۔ اسی مقام پر آپ کی اونٹنی

گم ہوگئی۔ ایک منافق نے کہا کہ آپؐ تو آسمان کی خبریں بیان کرتے ہیں مگر اپنی اونٹنی کی خبر نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا اللہ کی قسم مجھ کو کسی چیز کا علم نہیں سوائے اسکے کہ اللہ تعالےٰ نے مجھ کو بتلایا ہو۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا اب مجھکو معلوم ہوا ہے کہ وہ اونٹنی فلاں وادی میں ہے اور اِسکی مہار ایک درخت سے اٹک گئی ہے جس سے وہ رُکی ہوئی ہے۔ چنانچہ صحابہ اس وادی کی جانب دوڑ پڑے۔ دیکھا کہ اونٹنی کھڑی ہے اور اُسکو لے آئے۔ (رواہ البیہقی)

تبوک پہنچنے سے ایک دن پہلے آپؐ نے صحابہ سے فرمایا کل صبح کے وقت تم تبوک کے چشمے پر پہنچ جاؤ گے لیکن کوئی شخص اُس چشمہ سے پانی نہ لے۔ دوسرے دن جب اُس مقام پر پہنچے تو دیکھا کہ پانی کا ایک ایک قطرہ اُس چشمے سے رِس رہا ہے بدقت تمام تھوڑا سا پانی ایک برتن میں جمع ہوگیا آپؐ نے اس پانی سے اپنا چہرہ مبارک اور ہاتھ دھوکر پھر اُسی چشمے میں پانی ڈال دیا۔ اچانک وہ چشمہ فوارہ بن گیا۔ تمام لشکر سیراب ہوا پھر آپؐ نے معاذ بن جبل رضؓ کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا اے معاذ اگر تم زندہ رہو تو اس خطہ کو باغات سے سرسبز و شاداب دیکھو گے۔

(رواہ مسلم)

تبوک پہنچکر آپ نے بیسؓ دن قیام کیا مگر مقابلہ کے لئے کوئی نہ آیا دشمن مرعوب ہوگیا آس پاس کے قبائل نے حاضر ہوکر اطاعت قبول کی۔ پھر آپؐ مدینہ کے لئے روانہ ہوگئے۔

کتب حدیث میں اس غزوہ کو آخر غزوات النبی کہا گیا ہے اس لئے علماء اسلام اسکو خاتم الغزوات لکھتے ہیں۔

مسجدِ ضرار | جب آپ مدینہ کے قریب پہنچے تو حضرت مالک بن دخشم رضؓ اور حضرت معن بن عدی رضؓ کو مسجد ضرار کے منہدم کرنے اور اُسکو آگ لگانے کے لئے آگے روانہ کیا۔ یہ مسجد منافقین نے اس لئے بنائی تھی کہ اسمیں بیٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے خلاف مشورہ کیا جائے۔

جس وقت آپ تبوک جا رہے تھے اُس وقت منافقین نے آکر آپ سے درخواست کی کہ ہم نے بیماروں اور معذوروں کے لئے ایک مسجد بنائی ہے براہِ کرم آپ اسمیں ایک مرتبہ نماز پڑھا دیں تاکہ وہ مقبول و متبرک ہو جائے۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ اس وقت تو میں تبوک جا رہا ہوں واپسی کے بعد دیکھا جائے گا۔ چنانچہ جب واپس ہو رہے تھے تو قرآن حکیم کی آیات نازل ہوئیں جسمیں اُس مسجد کی حقیقت ظاہر کی گئی۔

قرآنی مضمون

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ الخ (توبہ آیت ۱۰۷ تا ۱۱۰)

اور بعض لوگ ایسے ہیں جنھوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لئے کہ (اسلام کو) نقصان پہنچائیں اور (اسمیں بیٹھ بیٹھ کر) کفر کی باتیں کریں اور (اسکی وجہ سے اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں (اور یہ بھی غرض ہے کہ) اُس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس مسجد بنانے سے قبل اللہ اور اُس کے رسول کا مخالف رہا ہے (یعنی ابو عامر راہب) اور پوچھو تو قسمیں کھا جائیں گے کہ بجز نیکی و بھلائی کے اور کچھ ہماری نیّت نہیں ہے۔ اور اللہ گواہ ہے کہ وہ اس دعوے میں بالکل جھوٹے ہیں (جب اُس مسجد کی یہ حالت ہے کہ وہ واقع میں مسجد ہی نہیں ہے) تو آپؐ اے نبی اُس میں کبھی نماز کے لئے کھڑے نہ ہوں۔ البتہ جس مسجد کی بنیاد یوم اوّل سے تقوی اور اخلاص پر رکھی گئی ہے (یعنی مسجد قُبا) وہ واقعی اس لائق ہے کہ آپ اسمیں نماز کے لئے کھڑے ہوں۔ اُس (مسجد قُبا) میں ایسے اچھے لوگ ہیں کہ وہ خوب پاک صاف ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے (جب دونوں مسجدوں کے بانیوں کا حال معلوم ہو گیا تو) پھر سمجھ لو آیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت (یعنی مسجد) کی بنیاد اللہ سے ڈرنے پر اور اللہ کی خوشنودی پر رکھی ہو یا وہ شخص بہتر ہو گا جس نے اپنی عمارت (یعنی مسجد) کی بنیاد کسی غار کے کنارے پر رکھی ہو جو گرنے کے قریب ہے پھر وہ عمارت اس بانی کو لیکر آتش جہنم میں

گر پڑے۔ اور اللہ ایسے ظالموں کو دین کی سمجھ ہی نہیں دیتا۔

اُن کی یہ عمارت (مسجد ضرار) جو انھوں نے بنائی ہے ہمیشہ
اُن کے دلوں میں (کانٹے کی طرح) کھٹکتی رہے گی (کیونکہ جس غرض کیلئے
بنائی ہے وہ پوری نہ ہوئی) البتہ اگر اُن کے دل ہی فنا ہو جائیں تو اور
بات ہے اور اللہ تعالےٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں۔"

اوپر کی آیات میں جس دشمنِ خدا اور رسول کا ذکر آیا ہے اس سے مراد مدینہ کا عیسائی راہب ابو عامر ہے۔ یہ اپنے ہم مذہب اور منافقینِ مدینہ کو ساتھ لے کر اسلام کے خلاف مسلسل کوشش کر رہا تھا منافقین مدینہ نے اسی کے قیام وطعام کے لئے یہ مسجد بنائی تھی۔ الغرض اس مسجد کو ڈھا دیا گیا اور اسمیں آگ بھی لگا دی گئی۔

حدیثِ کعبؓ (ایک سبق آموز واقعہ)

بخاری و مسلم کے علاوہ کتب حدیث میں ایک تفصیلی روایت حدیثِ کعبؓ کے عنوان سے بیان کی گئی ہے جو غزوۂ تبوک سے متعلق ہے۔ غزوۂ تبوک سخت گرمی کے موسم میں پیش آیا تھا۔ صحابہ کی تنگدستی کا یہ حال تھا کہ روزمرّہ کی خوراک تک میسر نہ تھی۔ سفر دور دراز مقام کا تھا۔ ہر دس آدمی کے حصّے میں ایک اونٹ آتا تھا۔ دشمن کی قوت وتعداد بہت زیادہ تھی اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جہاد کا کھل کر اعلان کر دیا تھا تاکہ مسلمان اس جہاد کے لئے پوری تیاری کر سکیں۔

صحیح مسلم کی روایت کے مطابق دس ہزار مسلمان روانہ ہوئے تھے جس وقت آپ روانہ ہو رہے تھے یہ وہ وقت تھا کہ کھجوریں پک رہی تھیں۔ باغات والے ان میں مشغول تھے ایسے وقت کوچ کرنا ایک سخت آزمائش تھی۔

حضرت کعب بن مالکؓ خود اس واقعہ کو اپنی زبان میں بیان کرتے ہیں۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے غزوات میں شرکت کی ہے
اُن سب میں سوائے غزوہ تبوک کے میں آپ کے ساتھ شریک رہا تھا
البتہ غزوۂ بدر کا واقعہ چونکہ اچانک پیش آیا تھا علاوہ ازیں آپ نے سب
کو شریک ہونے کا حکم بھی نہیں دیا تھا اور شریک نہ ہونے والوں پر

کوئی عتاب بھی نہیں فرمایا تھا اسمیں میں بھی شریک نہ ہو سکا۔ البتہ لیلۃُ العقبہ (قبل الہجرۃ) کی بیعت میں بھی شریک تھا۔ جس میں ہم نے اسلام کی حمایت وحفاظت کا عہد کیا تھا اور مجھکو یہ بیعت عقبہ کی حاضری غزوۂ بدر کی حاضری سے بھی زیادہ محبوب ہے۔ اگرچہ غزوۂ بدر کا زیادہ شہرہ ہے۔

میرا واقعہ غزوۂ تبوک میں غیر حاضری کا یہ ہے کہ میں کسی وقت بھی اُس وقت سے زیادہ خوشحال اور مالدار نہ تھا۔ اللہ کی قسم میرے پاس کبھی اس واقعہ سے پہلے دو سواریاں جمع نہیں تھیں جو غزوۂ تبوک کے موقع پر موجود تھیں۔

غزوات میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ کوچ کرنے سے پہلے مخالف سمت کی معلومات حاصل کرتے تھے تاکہ دشمن کو علم ہو جائے کہ آپؐ ہم پر حملہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں۔ (اسطرح دشمن کی غفلت سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا جنگی اصطلاح میں ایسے عمل کو توریہ کہا جاتا ہے)

لیکن غزوۂ تبوک کے موقع پر اللہ کے رسول نے توریہ کا عمل اختیار نہیں کیا بلکہ اس جہاد کا کھُل کر اعلان کر دیا تاکہ مسلمان اس جہاد کی پوری تیاری کر لیں۔ وجہ اسکی یہ تھی کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ ایک طاقتور فوج رکھتا تھا۔ پھر سفر بھی مدینہ سے بہت دور کا تھا جو اس سے پہلے کبھی پیش نہ آیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمان سفر کی تیاری شروع کر دیئے لیکن میرا یہ حال تھا کہ میں ہر صبح ارادہ کرتا کہ آج جہاد کی تیاری کروں گا مگر بغیر کسی تیاری کے دن گزر جاتا پھر مجھے خیال آتا تھا کہ میرے پاس سامان جہاد موجود ہے تیاری کی ضرورت بھی کیا ہے جس وقت چاہوں نکل پڑوں گا مگر آجکل آجکل ہی میں میرا ارادہ ملتوی ہوتا گیا یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان جہاد کے لئے روانہ ہوگئے۔ پھر بھی میرے دل میں یہی خیال

آتا کہ میں بھی روانہ ہو جاؤں گا اور راستے میں مل جاؤں گا۔ کاش کہ میں ایسا ہی کر لیتا مگر یہ کام بھی نہ ہو سکا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے مدینہ سے کوچ کر جانے کے بعد جب میں گھر سے باہر نکلتا تو یہ بات مجھے غمگین کر دیتی تھی کہ اس وقت شہر مدینہ میں یا تو وہ لوگ نظر آتے جو نفاق میں ڈوبے ہوئے تھے یا پھر ایسے بیمار یا معذور تھے جو سفر کے قطعاً قابل نہ تھے۔

دوسری طرف پورے راستے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا خیال نہیں آیا۔ جب آپ مقام تبوک پہنچ گئے اُس وقت آپ نے ایک مجلس میں ذکر فرمایا کہ کعب بن مالک کو کیا ہوا؟ اور وہ کہاں ہیں؟ بنو سلمہ کے ایک آدمی نے کہا یا رسول اللہ ان کو دنیا کی زندگی اور اُسکے عیش نے جہاد سے روک دیا ہے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اس شخص نے بدگمانی کی ہیں نے اُن میں سوائے خیر کے اور کچھ نہیں پایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سُنکر خاموش ہو گئے۔

الغرض میں آج اور کل کے ارادے میں اتنا سُست ہو گیا کہ پورے بیسؔ دن گزر گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واپس تشریف لانے کی خبر ملی۔ مجھ پر بڑی فکر سوار ہو گئی کہ اپنی غیر حاضری کا کیا عذر پیش کروں جسکے ذریعہ آپؐ کی ناراضی سے محفوظ ہو جاؤں اور مختلف خیالات و وساوس نے مجھے گھیر لیا۔ پھر مجھے یہ خبر ملی کہ آپؐ تشریف لا چکے ہیں تو اُس اطلاع پر میرے وساوس و خیالات فاسدہ یکدم دُور ہو گئے اور مجھے شدت سے یہ بات محسوس ہوئی کہ سچ بولنے ہی میں نجات ہے اور مجھکو سچ سچ کہہ دینا چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے تو عادت شریفہ کے مطابق پہلے مسجد تشریف لے گئے دوؔ رکعت نماز ادا فرمائی۔ پھر آپ مسجد میں بیٹھ گئے۔ غزوۂ تبوک میں نہ جانے والے منافقین جنکی تعداد اسیؔ سے کچھ زائد تھی یکے بعد دیگرے آپؐ کی خدمت میں آکر جھوٹے عذر پیش کئے اور اسپر قسمیں

بھی کھائیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن کے ظاہری قول و قرار کو قبول کر لیا اور دلوں کی نیتوں کو اللہ علیم وخبیر کے حوالہ کر دیا۔ اسی درمیان میں بھی حاضر خدمت ہوا اور قریب پہنچکر سلام کیا۔ آپؐ نے مجھ کو دیکھ کر تبسّم فرمایا ایسا تبسّم جو ناراض آدمی کیا کرتا ہے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپؐ نے اپنا رُخ پھیر لیا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے مجھ سے چہرہ کیوں پھیر لیا۔ اللہ کی قسم میں نہ منافق ہوں اور نہ دین کے معاملہ میں کسی شک وشبہ میں مبتلا ہوں اور نہ میں نے اسمیں کوئی تبدیلی کر لی ہے۔

آپؐ نے فرمایا پھر جہاد میں کیوں نہیں گئے؟ کیا تم نے سواری خرید نہ لی تھی؟

میں نے عرض کیا بیشک یا رسول اللہ اگر میں آپؐ کے سوا دنیا کے کسی دوسرے آدمی کے سامنے بیٹھتا تو مجھے یقین ہے کہ میں کوئی معقول عذر گھڑ کر اُسکی ناراضی سے بچ جاتا۔ کیونکہ مجھکو بات بنانے میں مہارت حاصل ہے۔ لیکن قسم ہے اللہ کی میں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اگر آپؐ سے کوئی جھوٹی بات کہدی جس سے آپ وقتی طور پر راضی ہو جائیں تو مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ حقیقتِ حال آپ پر واضح کر کے مجھ سے ہمیشہ کے لئے ناراض کر دیگا۔ اور اگر میں نے سچی بات بتلا دی تو مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کر دینگے۔ یا رسول اللہ صحیح بات یہی ہے کہ جہاد سے غائب رہنے میں میرا کوئی عذر نہیں تھا۔ میں کسی وقت بھی مالی اور جسمانی حیثیت سے قوی اور بہتر نہیں ہوا تھا جتنا کہ اس وقت تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنتے ہی فرمایا:۔

اَمَّا هٰذَا فَقَدْ صَدَقَ فَقُمْ حَتّٰى يَقْضِيَ اللّٰهُ فِيْكَ۔

تم نے سچ سچ بات کہدی۔ اب جاؤ اور اللہ کے فیصلہ کا انتظار کرو۔ میں اُٹھ کر چلا تو قبیلہ بنو سلمہ کے چند آدمی میرے پیچھے پڑ گئے۔ کہنے لگے اے کعب! یہ تم نے کیا غلطی کر دی اس وقت کوئی عذر پیش کر دیتے جیسا کہ

دوسرے لوگ کر چکے ہیں اور تمہارے گناہ کی معافی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار کافی تھا۔

اللہ کی قسم یہ لوگ مجھے بار بار ملامت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میرے دل میں خیال آیا کہ پھر لوٹ جاؤں اور عرض کر دوں یا رسول اللہ میں نے جو بات پہلے کہی ہے وہ غلط تھی میرا صحیح عذر یہ ہے۔ لیکن اللہ نے میری مدد کی دل نے کہا کہ میں ایک گناہ کے بجائے دو گناہ نہ کر لوں۔ ایک جہاد میں شریک نہ ہونے کا گناہ دوسرا جھوٹ بولنے کا گناہ۔ پھر میں اس خیال سے دور ہو گیا اور اُن لوگوں سے پوچھا، کیا پیچھے رہ جانے والوں میں کسی نے میری طرح جرم کا اعتراف کر لیا ہے؟ اُن لوگوں نے بتایا کہ دو آدمی اور ہیں جنھوں نے تمہاری طرح اقرارِ جُرم کر لیا ہے۔ اور اُن کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی جواب دیا ہے جو تم کو دیا ہے۔ میں نے پوچھا وہ کون ہیں؟

اُن لوگوں نے کہا مُرارہ بن ربیع، ہلال بن اُمیّہ۔

(کعب بن مالکؓ کہتے ہیں کہ جب میں نے ایسے دو بزرگوں کا نام سُنا جو غزوۂ بدر کے مجاہدین میں سے ہیں تو میرا غم کچھ ہلکا ہوا اور میں نے اُن لوگوں سے کہا بس میرے لئے اِن دو بزرگوں کا عمل قابل تقلید ہے۔ یہ کہہ کر میں اپنے گھر چلا آیا۔

میرے جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو حکم فرمادیا کہ اِن تینوں سے سلام و کلام، لین دین سب ترک کر دیا جائے۔ چنانچہ تمام مسلمانوں نے ہم تینوں سے قطع تعلق کر لیا۔

اللہ کی قسم اس واقعہ نے ہم تینوں پر جو کچھ اثر کیا اُس کا اندازہ کوئی دوسرا ہرگز نہیں کر سکتا۔ میرے دونوں ساتھی مُرارہ بن ربیع رضؓ اور ہلال بن اُمیہ رضؓ پر تو اس درجہ اثر پڑا کہ انھوں نے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ دن رات اپنے گھر میں روتے پڑے رہے ہیں جوان آدمی تھا نمازوں کے اوقات میں مسجد نبوی حاضر ہوتا اور نماز سے فارغ ہو کر کسی کو سلام کرتا تو نہ کوئی جواب

دیتا اور نہ کوئی کلام کرتا۔

مسند عبدالرزاق کی روایت میں ہے کہ اسوقت ہماری دنیا بالکل بدل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نہ وہ لوگ ہیں جو پہلے تھے اور نہ ہمارے باغ ومکان وہ ہیں جو پہلے تھے سب اجنبی نظر آتے تھے لیکن سب سے زیادہ فکر جو مجھکو ستارہی تھی وہ یہ کہ اگر میں اسی حال میں مرگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے جنازے کی نماز نہیں پڑھائیں گے۔ یاخدانخواستہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو میں عمر بھر اسی طرح لوگوں میں ذلیل وخوار پھرتا رہوں گا۔ اس احساس نے مجھکو ہر وقت بیقرار کر رکھا تھا۔ اللہ کی کشادہ زمین مجھ پر تنگ ہوگئی۔ اس حال میں ہم پر پچاس راتیں گزر گئیں۔ چونکہ میں جوان آدمی تھا اس لئے ہر روز باہر نکلتا، بازار جاتا، نمازوں میں سب مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوتا مگر کوئی بھی نہ مجھ سے کلام کرتا نہ سلام کا جواب دیتا اور نہ ہی قریب ہوتا۔ جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتا تو دیکھتا کہ کیا آپؐ کے لب مبارک کو حرکت ہوئی یا نہیں مگر محرومی کے سوا اور کچھ نہ پاتا۔ البتہ یہ محسوس کرتا تھا کہ جب میں نماز میں مشغول ہوتا ہوں تو آپؐ میری جانب دیکھتے ہیں اور جب میں فارغ ہوکر آپؐ کی جانب متوجہ ہوتا تو آپؐ میری جانب سے رُخ مبارک پھیر لیتے ہیں۔

جب مسلمانوں کی بےتعلقی دراز ہوگئی تو ایک روز میں اپنے چچازاد بھائی ابو قتادہ رضؓ کے پاس گیا جو میرے محبوب ترین دوست تھے میں اُن کے باغ میں دیوار پھاندکر داخل ہوا اور اُن کو سلام کیا۔ اللہ کی قسم اُنھوں نے بھی سلام کا جواب نہیں دیا۔ میرا دل بھر آیا پوچھا اے ابو قتادہ رضؓ کیا تم نہیں جانتے کہ میں اللہ اور اسکے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے محبت رکھتا ہوں؟

اسپر بھی ابو قتادہؓ نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب میں بار بار یہ سوال دُھرایا تو تیسری یا چوتھی مرتبہ اُنھوں نے صرف اتنا کہا اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ

اَعْلَمُ۔ اللہ اور اُس کا رسول ہی خوب جانتا ہے۔

میں یکدم رو پڑا اور اسی طرح دیوار پھاند کر باغ سے باہر آگیا۔ انہی دنوں ایک روز مدینہ کے بازار میں تھا دیکھا کہ ملکِ شام کا ایک نبطی شخص جو غلّہ فروخت کرنے مدینہ آیا تھا لوگوں سے دریافت کر رہا ہے کہ تم میں کعب بن مالکؓ کون ہے؟ لوگوں نے میری جانب اشارہ کیا وہ آدمی میرے قریب آیا اور مجھکو بادشاہِ غسّان کا ایک خط دیا جو ریشمی رومال پر لکھا ہوا تھا جس کا مضمون یہ تھا:۔

"امابعد! مجھکو یہ خبر ملی ہے کہ آپ کے نبیؐ نے آپ سے بیوفائی کی ہے اور آپ کو دور کر رکھا ہے اور اللہ نے آپ کو ذلت و رسوائی کا مقام نہیں دیا ہے۔ لہذا اگر آپ ہمارے ملک آنا پسند کریں تو ہم آپ کی ہر طرح مدد کریں گے۔"

میں نے جب یہ خط پڑھا تو بے ساختہ میری زبان سے نکلا کہ میری ایک اور آزمائش آئی ہے اور یہ پہلی آزمائش سے زیادہ کٹھن ہے۔ اے اللہ کفار کو میرے بارے میں یہاں تک توقع ہوگئی ہے۔ میں نے اُس نبطی سے کچھ نہ کہا آگے بڑھا ایک دوکان پر تنور جل رہا تھا اس خط کو اُسمیں جھونک دیا اور اُس نبطی سے کہا اپنے بادشاہ کو کہنا کہ یہ اُس کا جواب ہے۔ یہ کہہ کر میں اپنے گھر آگیا۔

الغرض اس طرح چالیس رات‌یں گزر چکی تھیں۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد خُزیمہ بن ثابت میرے ہاں آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پیام دیا کہ تم اپنی بیوی سے بھی علیحدگی اختیار کر لو۔

میں نے پوچھا کیا اس کو طلاق دے دوں؟ قاصد نے کہا نہیں، عملاً اُن سے دور رہو۔

حضرت کعب بن مالکؓ کہتے ہیں کہ اسی طرح کا حکم میرے دونوں ساتھیوں کے پاس بھی پہنچا۔ میں نے تو اپنی بیوی سے کہا کہ تم اپنے میکے چلی جاؤ اور وہیں رہو جب تک اللہ کا کوئی فیصلہ نہ آجاوے۔

ہلال بن امیہ رض کی بیوی خولہ بنت عاصم رض نے قاصد کا یہ پیام سنکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ ہلال بن امیہ رض بوڑھے ضعیف آدمی ہیں اور ضعیف البصر بھی ان کے ہاں کوئی خادم بھی نہیں جو ان کی خدمت کر سکے۔ یا رسول اللہ اگر آپؐ اجازت دے دیں تو میں ان کی خدمت کرتی رہوں۔ آپؐ نے انھیں صرف خدمت کر دینے کی اجازت دے دی۔ کہنے لگی یا رسول اللہ وہ تو اس حادثے سے ایسے متأثر ہیں کہ اُن میں کوئی حرکت ہی نہیں، اللہ کی قسم اُن پر مسلسل گریہ طاری ہے۔ رات دن روتے رہتے ہیں۔

کعب بن مالک رض کہتے ہیں کہ مجھ سے بھی میرے خاندان والوں نے کہا کہ اے کعب رض تم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے برائے خدمت بیوی کی اجازت لے لو۔ جیسا کہ ہلال بن امیہ رض کو اجازت مل گئی ہے۔

میں نے کہا میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا معلوم نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا جواب دیں! اسکے علاوہ میں جوان آدمی ہوں (مجھے خدمت کی چنداں ضرورت بھی نہیں) چنانچہ اس حال پر مزید دس راتیں اور گزر گئیں۔ اس طرح پچاس راتیں مکمل ہوگئیں تھیں۔ ایک دن صبح کی نماز پڑھکر میں اپنے گھر کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا اور میری حالت وہی تھی جس کا ذکر اللہ تعالےٰ نے قرآن میں کیا ہے کہ اُن پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا۔ اچانک کوہِ سلع کے اوپر کسی پکارنے والے آدمی کی آواز سنی جو بلند آواز سے کہہ رہا ہے :۔

"اے کعب بن مالک رض تم کو بشارت ہو اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی ہے"!

مسند عبدالرزاق کی روایت میں ہے کہ ہماری توبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک تہائی رات گزرنے کے وقت نازل ہوئی ام المومنین سیدہ ام سلمہ رض جو اس وقت حجرۂ نبوی میں تھیں عرض کیا اگر اجازت ہو تو میں کعب بن مالک رض کو اسکی خبر دوں؟ آپؐ نے فرمایا ابھی لوگوں کا

ہجوم ہو جائے گا رات کی نیند مشکل ہو جائے گی۔

الغرض جب کوہِ سلع سے میں نے آواز سنی تو سجدہ میں گر پڑا اور فرط مسرت سے رونے لگا اور مجھے یقین ہو گیا کہ میری نجات کی صورت ظاہر ہوئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز کے بعد صحابہ کرام کو ہماری توبہ قبول ہونے کی خوشخبری دی۔

اب ہر طرف سے لوگ ہم کو مبارکباد دینے کے لئے دوڑے بعض لوگ گھوڑے پر سوار ہو کر میرے پاس پہنچے مگر پہاڑ سے آواز دینے والے کی خوشخبری سب سے پہلے پہنچ گئی۔

محمد بن عمرو کی روایت میں ہے کہ یہ آواز دینے والے سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ تھے۔ رضی اللہ عنہ

کعب بن مالکؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لئے نکلا تو دیکھا کہ لوگ جوق در جوق مجھے مبارکباد دینے کے لئے آرہے ہیں۔ میں اسی حالت میں مسجد نبوی حاضر ہوا دیکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور آپؐ کے اطراف صحابہ کرام کا مجمع ہے۔ مجھکو دیکھ کر سب سے پہلے طلحہ بن عبید اللہ رضؓ کھڑے ہوئے اور دوڑ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارکباد دی۔ طلحہ رضؓ کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولا۔ جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا تو آپؐ کا چہرۂ انور خوشی سے چمک رہا تھا فرمایا:۔

"اے کعب رضؓ تم کو ایسے مبارک دن کی بشارت ہو جو تمہاری زندگی میں سب سے بہتر دن ہے!"

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ حکم آپؐ کی طرف سے ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے؟

آپؐ نے فرمایا نہیں! یہ حکم اللہ کا ہے۔ تم نے سچ کہا تھا اللہ نے تمہاری سچائی ظاہر فرما دی۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خوش ہوتے تو آپؐ کے

چہرۂ مبارک سے نور کی کرنیں ظاہر ہوتی تھیں گویا چہرۂ اقدس چاند کا ٹکڑا ہے اور ہم یہ واضح طور پر دیکھا کرتے تھے۔ پھر میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میری توبہ کی علامت یہ ہے کہ میں اپنا کل مال و متاع اللہ کی راہ میں صدقہ کر دوں۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا نہیں! کچھ مال اپنی ضرورت کے لئے باقی رکھو یہ بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا تو پھر میں اپنا آدھا مال صدقہ کروں؟ آپ نے اسکی بھی اجازت نہ دی۔ میں نے کہا اپنے ایک تہائی مال کو صدقہ کروں؟ آپؐ نے اجازت دے دی۔

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ نے سچ بولنے کی وجہ سے مجھے نجات دی ہے اس لئے میں عہد کرتا ہوں کہ زندگی میں کبھی بھی جھوٹ نہ بولوں اور ہمیشہ سچ کہوں گا۔

اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد کعب بن مالکؓ یہ بھی فرماتے تھے کہ اللہ کی قسم اسلام لانے کے بعد اس سے بڑی نعمت مجھکو نہیں ملی کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے میں سچ کہا اور جھوٹ سے پرہیز کیا ہے۔ اگر میں جھوٹ کہدیتا تو اسی طرح ہلاکت میں پڑ جاتا۔ جس طرح جھوٹی قسمیں کھانے والے ہلاک ہوئے جن کے بارے میں قرآن کی یہ آیات نازل ہوئیں:۔

سَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ إِذَا انْقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ الخ

(توبہ آیت ۹۵، ۹۶)

اور میں اللہ سے یہ اُمید رکھتا ہوں کہ اپنی بقیہ زندگی سچائی پر گزرے گی۔ اللہ نے اپنی کتاب قرآن حکیم میں یہ آیات ہمارے بارے میں نازل فرمائی ہیں:۔

لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ الخ

(توبہ آیت ۱۱۷ تا ۱۲۱)

(بخاری ج ۲ ص ۶۳۴ فتح الباری ج ۸ ص ۹۷)

قرآن حکیم اور غزوۂ تبوک

قرآن حکیم میں غزواتِ نبوی کا تذکرہ موجود ہے لیکن غزوۂ تبوک کا تذکرہ نہایت تفصیل اور اہتمام سے بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس سلسلے میں پند و موعظت کے ذریعہ مسلمانوں کی رشد و ہدایت کا سامان بھی مہیا کیا ہے۔ چنانچہ سورہ توبہ کے چھٹے رکوع سے آخر سورت تک اسی غزوہ سے متعلق حالات اور مواعظ کا تذکرہ ملتا ہے۔

اور اسی غزوۂ تبوک کے تذکرہ میں حضرت کعب بن مالکؓ اور اُن کے دونوں ساتھیوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ منافقین کی ریشہ دوانیاں اور جہاد سے گُریز کرنا اور مسلمانوں میں بے اعتمادی پیدا کرنے کی سازشوں کا تفصیلی ذکر بھی ملتا ہے۔

غزوۂ تبوک کے لئے مدینہ کے سب مسلمانوں کو نکلنے کا حکم عام دیا گیا تھا۔ اسوقت اہل مدینہ کے لوگوں کی پانچ قسمیں ہوگئی تھیں۔

(۱) پہلی قسم اُن مخلص مسلمانوں کی تھی جو حکم جہاد سنتے ہی بغیر کسی تردّد جہاد کے لئے تیار ہوگئے۔ اِن کا ذکر سورہ توبہ آیت ۱۱۷ اِتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ۔ میں ملتا ہے کہ مشکل وقت میں ان لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔

(۲) دوسری قسم ان مخلصین کی تھی جو ابتداءً تو کچھ فکر و تردد میں پڑگئے تھے مگر پھر سنبھل گئے اور جہاد کے لئے سب کے ساتھ ہوگئے۔ ان کا بیان اسی آیت ۱۱۷ کے اس جملے میں ہے:۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ الآیہ

بعد اسکے کہ قریب تھا دل پھر جائیں بعضوں کے اُن میں سے پھر مہربان ہوا اللہ اُن پر (یعنی توفیق جہاد مل گئی)

(۳) تیسری قسم اُن مومنین کی تھی جو اگرچہ وقتی سستی و کاہلی کی وجہ سے جہاد میں نہ گئے مگر بعد میں نادم اور تائب ہوئے۔ بالآخر اِن سب کی توبہ قبول ہوگئی۔ یہ کل دَس مسلمان تھے جن میں سے سات افراد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبوک سے واپسی کے بعد فوراً اپنی ندامت و توبہ کا اظہار کیا اور اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا کہ جب تک ہماری توبہ قبول نہ ہوگی بندھے رہیں گے۔ اِن حضرات کی آیت توبہ تو اُسی وقت نازل ہوگئی۔ اس کا ذکر آیت ۱۰۲ میں موجود ہے۔

وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ الآیۃ (توبہ آیت ۱۰۲)

اور اُن میں کچھ ایسے ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیا ہے امید ہے کہ اللہ اُن پر رحم فرمادیں۔

ان ہی دس افراد میں سے تین افراد حضرت کعب بن مالکؓ، مرارہ بن ربیع رضؓ، ہلال بن اُمیہ رضؓ، نے توبہ کا وہ طریقہ اختیار نہیں کیا تھا جیساکہ اُن کے بقیہ سات ساتھیوں نے کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن کے بارے میں عام مقاطعہ کا حکم دے دیا تھا کہ کوئی اِن سے سلام وکلام نہ کرے۔ چنانچہ پچاس دن کے بعد ان کی توبہ قبول ہوئی۔ اس کا ذکر آیت ۱۱۸ میں آیا ہے:-

وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا الخ (توبہ آیت ۱۱۸)

اور اُن تین شخصوں پر بھی اللہ نے رحم فرمادیا جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا۔

(۴) چوتھی قسم ان بوڑھے اور بیمار حضرات کی تھی جو واقعی طور پر معذور تھے۔ اس عذر شرعی کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہوسکے۔ ان کا ذکر آیاتِ ذیل میں اس طرح ملتا ہے۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى الخ (توبہ آیت ۹۱)

گناہ نہیں ہے ضعیفوں پر اور نہ مریضوں پر اور نہ اُن لوگوں پر جن کے پاس جہاد میں خرچ کرنے کے لئے کچھ نہیں۔ جبکہ یہ لوگ اللہ اور اسکے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ خلوص رکھتے ہوں۔

اِن نیکو کاروں پر کسی قسم کا الزام نہیں (کہ وہ جہاد میں شریک نہ ہوسکے) اور اللہ مغفرت والا رحمت والا ہے۔

(۵) پانچویں قسم منافقین کی تھی جو کفر و نفاق کی وجہ سے جہاد میں شریک نہیں ہوئے ان کی ریشہ دوانیاں، حیلے حوالے، مکر و فریب، دروغ گوئی قول و فعل کا تضاد اور دیگر منافقانہ اعمال کا کُھلا ذکر سورہ توبہ کی بکثرت آیات میں موجود ہے۔

قرآن حکیم کی آیاتِ ذیل میں غزوۂ تبوک کا تذکرہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

قرآنی مضمون

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ الخ

(توبہ آیت ۱۱۷ تا ۱۲۱)

اللہ نے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حال پر توجہ فرمائی اور مہاجرین اور انصار کے حال پر بھی توجہ فرمائی کہ اُن کو ایسے مشکل جہاد (تبوک) میں مضبوط رکھا جنھوں نے ایسی تنگی کے وقت نبی کا ساتھ دیا بعد اسکے کہ اُن میں سے ایک جماعت کے دلوں میں کچھ کمزوری سی ہو چلی تھی (اور غزوۂ تبوک میں جانے سے ہمت ہارنے کو تھے مگر) پھر اللہ نے اُس جماعت کے حال پر توجہ فرمائی (کہ اُن کو سنبھال لیا اور وہ آخر مسلمانوں کے ساتھ ہوئے۔) بلاشبہ اللہ تعالیٰ سب پر بہت ہی شفیق مہربان ہے۔

اور اُن تین شخصوں کے حال پر بھی توجہ فرمائی جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا یہاں تک کہ جب اُن کی پریشانی کی یہ حالت ہو گئی کہ زمین باوجود اپنی وسعت کے اُن پر تنگی کرنے لگی اور وہ خود بھی اپنی جان سے تنگ آ گئے اور اُنھوں نے سمجھ لیا کہ اللہ کی گرفت سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی سوائے اسکے کہ اُسی کی طرف رجوع کیا جائے۔ پھر اللہ نے اُن کے حال پر خاص توجہ فرمائی تاکہ وہ آئندہ بھی (ہر مواقع پر) اللہ کی طرف رجوع رہا کریں۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت توجہ فرمانے والے بڑے رحم کرنے والے ہیں۔

اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور (عمل میں) سچوں کے ساتھ رہو۔

مدینہ کے رہنے والوں کو اور جو دیہاتی اُن کے گرد و پیش میں رہتے ہیں اُن کو یہ زیبا نہ تھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ نہ دیں اور نہ یہ زیبا تھا کہ اپنی جان کو اُن کی جان سے عزیز سمجھیں (کہ آپ تو تکلیف اُٹھائیں اور یہ آرام سے بیٹھے رہیں) اور یہ مصاحبت اس لئے ضروری ہے کہ اُن کو اللہ کی راہ میں جہاد میں جو پیاس لگی اور جو تھکن پہنچی اور جو بھوک لگی اور جو چلنا چلے جو کافروں کے لئے باعث غیظ و غضب ہوا اور دشمنوں کی جو کچھ

خبر لی اُن سب پر اُن کے نام ایک ایک نیکی لکھی گئی۔ یقیناً اللہ مخلصین کا اجر
ضائع نہیں کرتے اور جو کچھ چھوٹا یا بڑا خرچ اُنھوں نے اس راہ میں کیا اور
جتنے میدان اُن کو طے کرنے پڑے یہ سب بھی اُن کے نام نیکیوں میں لکھا گیا
تاکہ اللہ تعالیٰ اِن کو اُن کے سب کاموں کا اچھے سے اچھا بدلہ دے۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ
سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

(توبہ آیت ۱۰۲ تا ۱۰۴)

اور کچھ لوگ وہ ہیں جنھوں نے اپنی خطا کا اعتراف کر لیا جنھوں نے
ملے جلے (اچھے بُرے) عمل کئے تھے (جیسے اعتراف جو نیک عمل تھا اور بلا عذر
عدم شرکت جہاد جو بُرا عمل تھا) اللہ سے امید ہے کہ اُن کے حال پر رحمت
کے ساتھ توجہ فرما دیں (یعنی توبہ قبول کر لیں) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت
والے بڑی رحمت والے ہیں۔ (وہ شات مخلص مسلمان جنھوں نے اپنے آپ کو
مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا تھا جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) اے نبی
آپ اِن کے اموال میں سے صدقہ (جسکو یہ لوگ لائے ہیں) لے لیجئے جس کے
لینے کے ذریعہ سے آپ اِن کو (گناہ کے آثار سے) پاک صاف کر دیں گے
اور آپ اُن کے لئے دُعا کیجئے بلاشبہ آپ کی دُعا اُن کے لئے باعثِ اطمینان ہے
اور اللہ تعالیٰ اُن کے اعتراف کو خوب سنتے ہیں اور اُن کی ندامت کو خوب
جانتے ہیں۔ کیا اِن کو یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے
اور وہی صدقات کو قبول کرتا ہے اور بیشک اللہ ہی توبہ قبول کرنے والا
رحمت فرمانے والا ہے۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ
لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ الخ

(توبہ آیت ۹۱ تا ۹۳)

کم طاقت لوگوں پر کوئی گناہ نہیں اور نہ بیماروں پر اور نہ اُن
لوگوں پر جن کو (سامان جہاد کی تیاری میں) خرچ کرنے کو میسر نہیں جبکہ یہ

لوگ اللہ اور اسکے رسول کے ساتھ خلوص رکھیں (اطاعت کرتے رہیں) اِن نیکوکاروں پر کسی قسم کا الزام نہیں اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں۔

اور نہ اُن لوگوں پر (کوئی گناہ اور الزام ہے) کہ جس وقت وہ آپؐ کے پاس اس واسطے آتے ہیں کہ آپ اِن کو کوئی سواری دیدیں اور آپؐ اُن سے کہہ دیتے ہیں کہ میرے پاس تو کوئی چیز نہیں جس پر میں تم کو سوار کرادوں تو وہ مایوس ہوکر اس حالت میں واپس چلے جاتے ہیں کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے ہیں۔ اس غم میں کہ اُن کو جہاد کی تیاری میں خرچ کرنے کو کچھ میسّر نہیں۔

بس الزام تو صرف اُن لوگوں پر ہے جو باوجود اہل سامان ہونے کے گھر رہنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ یہ لوگ خانہ نشین عورتوں کے ساتھ رہنے پر راضی ہوگئے اور اللہ نے اُن کے دلوں پر مہر کردی جس سے وہ (گناہ وثواب) کو جانتے ہی نہیں (تفسیر دُرِّ منثور میں اُن صحابہ کے نام لکھے گئے ہیں جنھوں نے سامانِ جہاد کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری مانگی تھی لیکن آپؐ کے معذرت کردینے پر وہ بچشم تر واپس ہوگئے۔

ایک حدیث صحیح میں یہ مضمون ملتا ہے کہ غزوۂ تبوک میں آپؐ نے مجاہدین کو مخاطب فرمایا تھا کہ اے لوگو تم مدینہ میں ایک ایسی جماعت کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو جو ہر قدم پر تمہارے اجر وثواب میں شریک ہے (یہی لوگ مراد ہیں)

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (توبہ آیت ۴۱ تا ۴۵)

جہاد کے لئے نکل پڑو خواہ تھوڑے سامان سے ہو اور خواہ زیادہ سامان سے ہو اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم یقین رکھتے ہو۔

اگر کچھ لگے ہاتھ ملنے والا ہوتا اور سفر بھی معمولی سا ہوتا تو یہ

منافق لوگ ضرور آپؐ کے ساتھ ہو لیتے لیکن اُن کو تو راہ کی مسافت ہی دور دراز معلوم ہونے لگی (اس لئے مدینہ ہی میں رہ گئے) اور ابھی (جب تم لوگ جہاد سے واپس آؤ گے تو) اللہ کی قسمیں کھا جائیں گے کہ اگر ہمارے بس کی بات ہوتی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے. یہ لوگ (جھوٹ بول بول کر) اپنے آپکو تباہ کر رہے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں (بلاشبہ ان کو نکلنے کی استطاعت تھی)

اللہ نے آپ کو معاف تو کر دیا لیکن آپؐ نے اُنکو ایسی جلدی اجازت کیوں دے دی تھی جب تک کہ آپؐ کے سامنے سچے لوگ ظاہر نہ ہو جاتے اور جب تک کہ جھوٹوں کو معلوم نہ کر لیتے؟

اور جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنے جان و مال سے جہاد کرنے کے بارے میں آپؐ سے چُھٹی نہ مانگیں گے (بلکہ وہ حکم کے ساتھ ہی دوڑ پڑیں گے) اور اللہ ان متقیوں کو خوب جانتا ہے۔ البتہ وہ لوگ جہاد میں نہ جانے کی آپ سے چُھٹی مانگتے ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور اُن کے دل (اسلام کی) شک میں پڑے ہیں سو وہ اپنے شکوک میں پڑے ہوئے حیران ہیں. اور اگر وہ لوگ جہاد میں چلنے کا ارادہ کرتے (جیسا کہ عذر کرتے وقت کہہ رہے تھے) تو اُس چلنے کا کچھ سامان تو درست کرتے لیکن (اُنھوں نے شروع ہی سے ارادہ ہی نہ کیا تو) اللہ نے اُن کے جانے کو پسند نہیں کیا اس لئے اُن کو توفیق نہیں دی اور یوں کہہ دیا گیا کہ اپاہج لوگوں کے ساتھ تم بھی یہاں ہی بیٹھے رہو۔

اگر یہ منافق لوگ تمہارے ساتھ شامل ہو جاتے تو سوائے فساد کے اور کچھ زیادہ نہ کرتے اور مسلمانوں کے درمیان فتنہ پردازی کی فکر میں دوڑے دوڑے پھرتے. اور اب بھی تم میں اُن کے کچھ جاسوس موجود ہیں اور اللہ ان ظالموں کو خوب سمجھے گا.

اُن کو تو پہلے (جنگ اُحد وغیرہ میں) بھی فتنہ پردازی کی فکر

تھی اور (اس کے علاوہ بھی) آپ کی (ضرر رسانی کے) لئے کارروائیاں کرتے ہی رہے یہاں تک کہ سچا وعدہ آگیا اور اللہ کا حکم غالب رہا اور اُن منافقوں کو ناگوار ہی گزرتا رہا۔

اور اُن منافقین میں (جد بن قیس نامی ایک مسخرے نے یہ بہانہ تراشا تھا کہ حضرت مجھے تو مدینہ ہی میں رہنے دیں ملک روم کی عورتیں بہت حسین ہوتی ہیں انھیں دیکھ کر دل قابو میں نہ رکھ سکوں گا لہٰذا مجھے لیجا کر فتنہ میں نہ ڈالیے)

بعض شخص وہ ہے جو آپ سے کہتا ہے کہ مجھ کو (گھر رہنے کی) اجازت دے دیں اور مجھ کو فتنے میں نہ ڈالئے۔ خوب سمجھ لو کہ یہ لوگ فتنے ہی میں پڑے ہوئے ہیں اور بلاشبہ جہنم ان کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الخ

(توبہ آیت ۸۱ تا ۸۲)

یہ پیچھے رہ جانے والے (منافقین) خوش ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے (تبوک جانے کے) بعد اپنے گھر بیٹھے رہنے پر اور اُن کو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کرنا ناگوار ہوا (دلی کفر اور آرام طلبی کی وجہ سے) اور وہ دوسروں کو بھی کہنے لگے کہ تم ایسی تیز گرمی میں گھر سے نہ نکلو آپ (اے نبی جواب میں) کہہ دیجیے کہ جہنم کی آگ اس سے بھی زیادہ تیز اور گرم ہے کیا خوب ہوتا اگر وہ سمجھتے۔

سو تھوڑے دنوں وہ ہنس لیں اور (پھر آخرت میں) بہت دنوں (یعنی ہمیشہ) روتے رہیں گے۔ یہ جزا ہے ان کاموں کی جو وہ کیا کرتے تھے۔

تو اگر اللہ تعالےٰ آپ کو (اس سفر سے صحیح و سالم) اُن کی کسی جماعت کی طرف واپس لائے پھر یہ لوگ (براہ خوشامدی) آپ کے ساتھ

چلنے کی اجازت مانگیں تو آپ یوں کہہ دیجئے کہ تم کبھی بھی میرے ساتھ جہاد میں نہ چلنا اور نہ میرے ہمراہ ہو کر کسی دشمن سے لڑنا تم نے پہلے بھی گھر بیٹھے رہنے کو پسند کیا تھا سو اب بھی اُن لوگوں کے ساتھ بیٹھے رہو جو پیچھے رہ جانے کے ہی لائق ہیں۔

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ الخ (توبہ آیت ۹۴ تا ۹۶)

یہ منافق لوگ تمہارے سامنے عذر پیش کریں گے جب تم اُن کے پاس جاؤ گے (سوائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (سب کی طرف سے صاف صاف) کہہ دیجئے کہ (بس رہنے دو) یہ عذر پیش نہ کرو ہم تم کو کبھی سچا نہ سمجھیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہم کو تمہاری خبر دے چکے ہیں (کہ تم کو کوئی بھی عذر نہ تھا) اور آئندہ بھی اللہ اور اُس کا رسول تمہاری کارگزاری دیکھ لیں گے۔ پھر تم ایسی ذات کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو پوشیدہ اور ظاہر سب کا جاننے والا ہے۔ پھر وہ تم کو بتا دے گا جو جو تم کیا کرتے تھے۔

ہاں وہ لوگ اب تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھا جائیں گے (کہ ہم واقعی معذور تھے اس لئے جہاد کے لئے نہیں نکل سکے) جب تم اُن کے پاس واپس جاؤ گے تاکہ تم اُن کو اُن کی حالت پر چھوڑ دو (اور ملامت وغیرہ نہ کرو) سُو تم اُن کو اُن کی حالت پر چھوڑ دو کیونکہ وہ لوگ بالکل گندے ہیں اور اُن کا ٹھکانہ جہنم ہے اُن کاموں کے بدلہ میں جو کچھ وہ کیا کرتے تھے۔

یہ اس لئے قسمیں کھائیں گے کہ تم اِن سے راضی ہو جاؤ (بالفرض) اگر تم اُن سے راضی بھی ہو جاؤ (ان کو کیا نفع ہوگا کیونکہ) اللہ تعالیٰ تو ایسے شریر لوگوں سے راضی نہیں ہوتا۔

نتائج و عبر

مسجدِ تفاخر سورہ توبہ میں منافقین کی جس مسجد کا ذکر آیا ہے اُس کی بنیاد تین مقاصد پر تھی :-

(۱) کفر کا استحکام (۲) اہل ایمان میں تفریق پیدا کرنا (۳) ایک دشمن خُدا اور رسول کا ٹھکانہ بنانا۔

قرآن حکیم نے منافقین کے یہ تینوں مقاصد واضح طور پر بیان کر دیئے ہیں۔

(توبہ آیت ۱۰۷)

چونکہ اس تعمیر کی غرض و غایت عام مساجد کی غرض و غایت سے مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد اور مخالف تھی۔ اس لئے منافقین کی اس تعمیر کا نام مسجد ضرار (سراپا شرّ) رکھدیا گیا۔ جس کا تذکرہ پچھلے صفحات میں تفصیل سے آچکا ہے۔ اہلِ علم نے یہاں ایک بحث یہ پیدا کی ہے کہ آج بھی اگر مسلمان کوئی ایسی مسجد تعمیر کرے جس کے قریب ہی کوئی آباد مسجد موجود ہو اور اس دوسری مسجد کا مقصد باہمی تفرقہ یا پہلی مسجد کی جماعت توڑنا یا ضد وعناد، ریاکاری وشہرت وغیرہ اغراض فاسدہ پیش نظر ہوں تو کیا اِس نئی مسجد کو مسجد ضرار کہا جائے گا؟ اور کیا اس مسجد کا وہی حکم ہوگا کہ اُسکو ڈھا دیا جائے اور اسمیں آگ لگا دی جائے؟ علماء کے ایک طبقے نے ایسا ہی سمجھا ہے اور اِن فاسدہ اغراض کے تحت جو بھی مسجد بنائی جائے وہ مسجد ضرار ہی کے حکم میں آئے گی اور ایسی مسجد کو مسجد ضرار کہا جائے گا۔

لیکن اہل علم کا ایک دوسرا طبقہ اس طرز فکر سے اختلاف رکھتا ہے۔ اِن حضرات کا یہ خیال ہے کہ مسجد ضرار ایک خاص مسجد تھی جو زمانۂ نزول وحی میں تعمیر کی گئی اور تعمیر کرنیوالے خالص منافقین تھے۔ جنکی تصریح قرآن حکیم میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں اس مسجد کی غرض وغایت بھی وحی الٰہی نے بیان کر دی ہے کہ وہ مسجد نہ تھی بلکہ سو فیصد اسلام دشمنی کا گھر تھا۔ ان وضاحتوں کے بعد منافقوں کی وہ تعمیر قطعی طور پر نہ مسجد تھی اور نہ مسجد کے مشابہ۔

لیکن جو مسلمان مسجد کے پڑوس میں ایک اور نئی مسجد تعمیر کرلیں اگرچہ ان کے

اغراض میں نام ونمود، شہرت، باہمی تفرقہ، یاضد وعناد شامل ہوں تب بھی وہ مسجد ہی شمار کی جائیگی اور اُس کا حکم مسجد ضرار کے حکم سے مختلف ہوگا اُسے ڈھادینے یا اسمیں آگ لگا دیئے جانے کا حکم نہیں دیا جائے گا۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ اوّل تو نزولِ وحی کا سلسلہ بند ہو چکا ہے ختم نبوت وختم رسالت کا دور ہے اب دلوں کے حقیقی نیتوں کا حال سوائے اللہ علیم وخبیر کے کسی اور کو حاصل نہیں۔ دوسری شخصیت اس حال سے عاجز و بے بس ہے۔ وحی الٰہی ایک واحد ذریعہ تھا جسکے ذریعہ کھرا کھوٹا، حق وباطل، ایمان ونفاق کا قطعی فیصلہ کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسجد ضرار کی تعمیری حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کی اطلاع پر "دارِ کفر" قرار دیا اور اُسکو ڈھادینے اور جلادینے کا حکم جاری فرمایا۔

چونکہ ختم نبوت کے بعد ایسی قطعی اطلاعات کا امکان نہیں رہا اس لئے کسی اور مسجد کو مسجد ضرار نہیں کہا جائے گا۔ گویا مسجد ضرار ایک خاص تعمیر تھی جو عہد نبوت میں منافقوں نے تعمیر کی تھی جسکو ڈھادیا گیا اور اسمیں آگ لگادی گئی۔

اب رہا موجودہ دور میں مسلمانوں کا کوئی ایسی مسجد تعمیر کرنا جسکے اغراض فاسدہ اور واہی تباہی ہوں یقیناً یہ کارِ ثواب تو کجا باعثِ گناہ وظلم شمار ہوگا اور ایسی تعمیر تفریق بین المسلمین کہلائیگی۔ لیکن ان ناپاک اغراض کے باوجود وہ تعمیر مسجد ہی کہلائیگی اُسکو ڈھادینا یا اس میں آگ لگادینا درست نہ ہوگا۔ جولوگ اس میں نماز پڑھیں گے اُن کی نماز ادا ہوجائے گی لیکن ایسی نماز کا دُھرانا واجب ہوگا۔ کیونکہ یہ نماز ایسی جگہ پڑھی گئی ہے جس کے بانی کی نیت میں شرّ وفساد تھا اور وہ محل اللہ کے لئے خالص نہ تھا۔

تاہم ایسی مسجد کو مسجد ضرار نہیں کہا جائے گا کیونکہ وحی جیسا قطعی ویقینی ذریعہ ہم کو میسّر نہیں ہے۔

علاوہ ازیں مسجد ضرار کے بانیوں نے تو بنیادی طور پر مسجد نہیں بنایا تھا کیونکہ وہ منافق خالص تھے اُن کے اعتقاد میں مسجد کا تصور بھی نہ تھا بخلاف اغراض فاسدہ کے تحت موجودہ دور میں تعمیر کرنے والے مسلمانوں کی نیت واعتقاد ویسا نہیں جیسا کہ منافقین خالصین کا تھا۔ لہٰذا اغراض فاسدہ کے تحت مسجد تعمیر کرنے والوں کی مسجد، مسجد ضرار نہ ہوگی بلکہ مشابہ مسجد ضرار یا مسجدِ تفاخر ہوگی۔ احکام ظاہری میں وہ مسجد ہے مگر عند اللہ وہ مقبول نہ ہوگی اور اُس کے بانیوں کو آخرت میں کوئی ثواب تو کجا اغراضِ فاسدہ کی وجہ سے عذاب ہوگا۔ اِلّا یہ کہ ایسے لوگ

دنیا ہی میں اپنے فاسد اغراض سے رجوع کر لیں اور خالص توبہ کر لیں۔

(۲) عدوّ اللہ اور مسجدِ ضرار

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ نے شہر میں داخل ہونے سے پہلے قبیلہ بنی عمرو بن عوف کے محلہ میں چند روز قیام فرمایا جو شہر کے ایک کنارے آباد تھا۔ یہاں قیام کر کے آپ مدینہ طیبہ تشریف لائے اور مسجد نبوی کی تعمیر کی۔ اُس محلہ میں جہاں آپ نماز پڑھتے تھے وہاں کے مسلمانوں نے ایک مسجد تیار کر لی جو مسجد قُبا کے نام سے مشہور ہوئی۔

بعض منافقین نے چاہا کہ اس مسجد کے قریب ایک اور تعمیر مسجد کے نام سے کر لی جائے تاکہ اپنی جماعت علیٰحدہ قائم کر لی جائے اور بعض سادہ دل مسلمانوں کو مسجد قُبا سے ہٹا کر اپنی جماعت میں شامل کر لیا جائے۔

درحقیقت اس ناپاک تعمیر کا محرک (ابو عامر راہب خزرجی تھا۔ یہ شخص زمانۂ جاہلیت میں نصرانی ہو گیا تھا اور ابو عامرِ راہب کے نام سے مشہور ہو گیا (یہ وہی شخص ہے جن کے لڑکے حضرت حنظلہ رضی مشہور صحابیٔ صاحبِ سرِّ رسول اللہ غسیل ملائکہ کے لقب سے معروف ہیں جنکی لاش کو فرشتوں نے غسل دیا تھا)

الغرض ابو عامر نصرانی بنکر راہبانہ زندگی اختیار کر لیا تھا مدینہ اور اطراف مدینہ کے لوگ خصوصاً قبیلہ خزرج کے لوگ اسکے زہد اور درویشی کے معتقد تھے اور بڑی تعظیم کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے اور اسلام و ایمان کا آفتاب طلوع ہوا تو اِسکی درویشی کا بھرم کھلنے لگا۔ ابو عامر یہ دیکھ کر چراغ پا ہو گیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسکو اسلام کی دعوت دی اور ارشاد فرمایا کہ میں ملّتِ ابراہیمی لیکر آیا ہوں اور اُسی کی دعوت دیتا ہوں۔

ابو عامر نے کہا میں پہلے ہی سے اسی ملّت پر قائم ہوں لیکن

تم نے ملت ابراہیمی میں اپنی جانب سے اُسکے خلاف بہت ساری چیزیں داخل کر دی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری شدت سے اس الزام کی تردید کی لیکن وہ تسلیم کرنے آمادہ نہ ہوا آخرکار اسکی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہے اللہ اُس کو وطن سے دور غُربت و بے کسی کی موت مارے۔ آپؐ نے آمین فرمایا۔ پھر اُس نے کہا تمہارے مقابلہ میں جو بھی دشمن آئے گا میں اُس کی مدد کروں گا۔ چنانچہ غزوۂ حنین تک تمام غزوات میں مسلمانوں کے خلاف شرکت کیا۔ معرکۂ احد میں قریش کے ساتھ آیا تھا اور اسی کی تجویز پر میدان اُحد میں چھوٹے چھوٹے گڑھے کھدوائے گئے تھے جس سے صحابہ کو بڑی زحمت اُٹھانی پڑی۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک موقع پر اسی گڑھے میں گر پڑے تھے۔ اسی حادثے میں آپؐ کا چہرہ زخمی اور دندان مبارک ٹوٹ گئے تھے۔ غزوۂ حنین میں قبیلہ ہوازن جو اپنی قوت وطاقت اور تیراندازی میں مشہور تھا شکست کھا گیا تو ابو عامر مایوس ہوکر ملک شام بھاگ گیا کیونکہ یہی ملک اُس وقت نصرانیوں کا مرکز تھا وہاں سے منافقین مدینہ کو خط لکھا کہ میں قیصر روم سے ملکر ایک بڑا لشکر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقابلہ میں لانے والا ہوں جو چشم زدن میں مسلمانوں کو بے نام ونشان کر دے گا۔ لہذا فی الحال تم ایک عمارت مسجد کے نام پر بنالو جہاں نماز کے بہانے جمع ہوکر اسلام کے خلاف ہر قسم کے مشورے ہوں لیکن میرا قاصد وہاں تم کو میرے خطوط اور ہدایات پہنچا دیا کریگا اور جب میں مدینہ آؤں تو اپنا قیام اُسی عمارت میں رکھوں چنانچہ منافقین نے اِسکی ہدایت پر عمارت تعمیر کی جس کا نام اُنھوں نے مسجد رکھا، جب تعمیر مکمل ہوگئی تو یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور یہ بہانہ کیا کہ یارسول اللہ بارش اور سردی وغیرہ میں خاص طور پر بیماروں، کمزوروں اور بوڑھوں کی سہولت کے لئے مسجد قباء کے قریب ایک مسجد تعمیر کر لی گئی ہے تاکہ ایسے لوگوں کو سہولت ہو۔ علاوہ ازیں مسجد قبا میں گنجائش بھی کم ہے۔ گرمی وسردی کے زمانے میں سب لوگ

سما نہیں سکتے۔ یا رسول اللہ بخدا ہماری نیت خیر ہے اسکے سوا اور کوئی مقصد نہیں۔ براہِ کرم آپ تشریف لاکر ایک نماز اس مسجد میں ادا فرما دیں تاکہ اس کے آغاز میں برکت ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت غزوۂ تبوک کی تیاری میں مشغول تھے آپ نے وعدہ کر لیا کہ اس وقت تو ہمیں سفر درپیش ہے واپسی کے بعد ہم اس میں نماز پڑھ لیں گے۔

جب آپ تبوک سے واپس ہو کر مدینہ طیبہ کے قریب تھے جبرئیل امین یہ آیات لیکر آئے جن میں ان منافقین کی سازش کھول دی گئی اور اُس تعمیر کے ناپاک اغراض کو ظاہر کر دیا گیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ کو جنمیں مالک بن دخشم رضؓ، معن بن عدی اور وحشی (قاتل حمزہ رضؓ) شامل تھے آگے روانہ کیا اور حکم فرمایا کہ اس نام نہاد مسجد کو پیوند خاک کر دیا جائے اور اُس میں آگ لگا دی جائے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی اس طرح منافقین اور اُن کے سردار ابو عامر راہب کے ارمان دل کے دل میں رہ گئے اور قیامت تک اُس تعمیر کا نام "مسجد ضرار" سراپا شر پڑ گیا۔ اور ابو عامر راہب اپنی دُعا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمین کے موافق شہر قنسرین (ملک شام) میں تنہائی و بے لبسی غربت کی حالت میں فوت ہوا۔ قرآن حکیم نے اسکو دشمنِ خدا و رسول کے نام سے یاد کیا ہے۔ (ابن کثیر آیت ۱۰۷)

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

وعدہ خلاف ثعلبہ

اہل مدینہ میں ثعلبہ بن حاطب انصاری نامی ایک غریب شخص تھا ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ میرے لئے دُعا فرما دیجئے کہ اللہ مجھے کثیر مال عطا کرے۔ آپؐ نے اسکے اس مطالبہ پر فرمایا:-

"اے ثعلبہ تھوڑا مال جس کا تو شکر ادا کرے اُس کثیر مال

سے بہتر ہے جس کا شکر ادا نہ ہو سکے۔" یہ سنکر ثعلبہ چلا گیا۔ دوسرے دن پھر آیا اور وہی درخواست پیش کی۔

آپؐ نے ارشاد فرمایا:-

"اے ثعلبہ کیا تجھ کو یہ بات پسند نہیں کہ تو میرے نقش قدم پر چلے؟ اُس ذات کی قسم جسکے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ اگر میں چاہوں کہ مدینہ کے یہ پہاڑ سونا چاندی ہو جائیں تو یہ ضرور سونا ہو جائیں گے۔ لیکن اے ثعلبہ کثیر مال کی ہوس اچھی نہیں!"

ثعلبہ نے اس نصیحت وخیر خواہی کو قبول نہ کیا کہنے لگا یا رسول اللہ اُس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے اگر اللہ نے مجھے کثیر رزق دے دیا تو میں ہر حق والے کا حق ادا کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اصرار پر ہاتھ اُٹھا دیئے اور فرمایا:-

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْ ثَعْلَبَۃَ مَالاً۔

اے اللہ ثعلبہ کو مال کثیر عطا فرما۔

راوی حضرت ابو اُمامہ الباہلی رضؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا کی برکت سے ثعلبہ کی بکریوں میں اس تیزی سے افزائش شروع ہو گئی جیسا کہ غلاظت میں بیشمار کیڑے پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ ہی عرصہ بعد اُس کا گھر تنگ ہو گیا۔ شہر مدینہ سے دور ایک وادی میں زمین خریدی اور وہاں اپنی بکریوں کا انتظام رکھا اور وہ بکریاں اسی طرح تیزی سے بڑھ رہی تھیں اس مشغولیت اور مسافت کی دوری کی وجہ سے نماز ظہر اور عصر کو مسجد نبوی میں مسلمانوں کے ساتھ ادا کر لیتا تھا باقی نمازیں چھوڑ کر کاروبار میں مشغول ہو جاتا لیکن بکریوں میں اور اضافہ ہو گیا تو اُس جگہ سے بھی منتقل ہو کر شہر سے بہت دور جا بسا اور وہاں اپنی بکریوں کا انتظام قائم کیا۔ اب سوائے جمعہ کے مسجد نبوی کی حاضری ختم ہو گئی۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ شہر آتا اور جمعہ پڑھکر اپنے مقام واپس ہو جاتا۔ راوی کہتے ہیں کہ اُس کی بکریوں کی افزائش کا وہی سلسلہ تھا کیڑوں کی طرح اُبل رہی تھیں اور

ثعلبہ نہایت مسرور تھا۔ مال کی کثرت اور کام کی مشغولیت اور مسافت کی دوری نے ثعلبہ کو اور زیادہ مشغول کر دیا۔ اب اسکو اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ نماز جمعہ کے لئے سہی شہر مدینہ آئے۔ اس طرح جمعہ بھی چھوٹ گیا اور وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے دور ہو گیا۔

لیکن آنے جانے والوں سے پوچھا کرتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان میرے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں؟ اور کیا میرا کوئی ذکر بھی ہوتا ہے؟ لوگ نفی میں جواب دے دیا کرتے تھے۔

ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثعلبہ کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ کہاں ہے اور اُس کا کیا حال ہے؟

لوگوں نے کہا یا رسول اللہ اُس نے بکریوں کا کاروبار شروع کیا تھا لیکن بکریوں کی اتنی کثرت ہو گئی کہ اُس کا مکان تنگ ہو گیا اُس نے شہر سے دور ایک وادی میں زمین خریدی اور وہاں منتقل ہو گیا پھر اتنا پھیلاؤ ہوا کہ اُن میں مشغول ہو کر جمعہ و جماعات بھی ترک کرنے لگا۔ اب وہ شہر سے بہت دور اپنے کاروبار میں مشغول ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا افسوس ہے ثعلبہ پر۔ افسوس ہے ثعلبہ پر، افسوس ہے ثعلبہ پر، تین مرتبہ فرمایا اور بات ختم ہو گئی۔

چند دنوں بعد زکوٰۃ کے احکام نازل ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دو آدمی کو ثعلبہ اور ایک دوسرے شخص سُلمی کی طرف روانہ کیا کہ اُن کے جانوروں کی زکوٰۃ وصول کی جائے اور اس کے لئے آپؐ نے اپنا نامہ مبارک بھی دیا جسمیں وصولی زکوٰۃ کے قوانین مکتوب تھے۔

جب یہ قاصد ثعلبہ کے ہاں پہنچے اور اُسکو فرمان مبارک بتایا تو یہ نہایت تعجب سے فرمان مبارک کو پڑھا پھر کچھ تامل کر کے کہنے لگا یہ تو ٹیکس یا ٹیکس جیسا قانون معلوم ہوتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ زکوٰۃ کیا ہوتی ہے؟ اچھا میں کچھ غور کر لوں گا پہلے سُلمی کی زکوٰۃ وصول کر لو واپسی میں میرے ہاں آنا۔ اللہ کے رسول کے یہ دونوں قاصد ثعلبہ کے پاس سے روانہ ہو گئے اور

سُلمی کے قبیلے پہنچے سُلمی کو جب یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد زکوٰۃ وصول کرنے آئے ہیں تو اِس سے پہلے کہ قاصدِ رسول سُلمی کے ہاں آتے سُلمی نے اپنے جانوروں میں سے عُمدہ فربہ جانور لیکر حاضر ہوگئے اور عرض کیا کہ یہ میرے جانوروں کی زکوٰۃ ہے قبول فرمائیے۔ قاصدِ رسول نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں زکوٰۃ میں عمدہ جانور لینے سے منع کیا ہے اور یہ سب کے سب عمدہ ترین جانور ہیں درمیانی قسم کے جانور لے آؤ۔ لیکن سُلمی نے کہا مجھکو اللہ کی راہ میں عمدہ مال خرچ کرنا پسند ہے۔ میں یہ خوش دلی سے لے آیا ہوں اسپر قاصدوں نے زکوٰۃ کے جانور لے لئے اور سُلمی کو دُعا دی۔ پھر حسب وعدہ ثعلبہ کے پاس آئے اور زکوٰۃ کا مطالبہ کیا۔ ثعلبہ نے کہا ذرا وہ نامہ مبارک تو بتاؤ قاصد نے پھر دے دیا ثعلبہ نے پڑھکر وہی کہا جیسا کہ پہلے کہا تھا کہ یہ تو ٹیکس یا ٹیکس جیسا معلوم ہوتا ہے اچھا تم لوگ چلو میں خود کوئی فیصلہ کرلوں گا اور اپنی زکوٰۃ خود لے آؤں گا۔

قاصد وہاں سے روانہ ہوگئے جب مسجد نبوی کے قریب پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنھیں دیکھتے ہی ارشاد فرمایا:۔

یَا وَیْحَ ثَعْلَبَہ

ثعلبہ ہلاک ہوگیا

اور پھر آپ نے سُلمی کو خیر و برکت کی دُعا دی۔ اسکے بعد قاصدوں نے ساری تفصیل بیان کردی۔

اس موقع پہ قرآن حکیم کی آیات نازل ہوئیں:۔

وَمِنْهُم مَّنْ عَاهَدَ اللَّهَ لَئِنْ آتَانَا مِن فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ الصَّالِحِينَ الخ (توبہ آیت ۷۵ تا ۸۰)

اور اِن منافقین میں وہ بھی ہیں جو اللہ سے عہد کرتے ہیں کہ اگر وہ اپنے فضل و کرم سے ہمیں مال عطا کرے تو ہم اس میں سے خوب خوب صدقہ کریں گے اور نیک کام کیا کریں گے۔

پھر جب اللہ نے اُن کو اپنے فضل سے مال دے دیا تو وہ

اسمیں بخل کرنے لگے اور منھ پھیر دیا اور وہ تو روگردانی کے عادی ہیں۔

سو اللہ نے اُس کی سزا میں اُن کے قلوب کے اندر نفاق قائم کر دیا جو قیامت کے دن تک رہے گا اس سبب سے کہ انھوں نے اللہ سے اُس کے خلاف کیا جو کچھ اُس سے وعدہ کر چکے تھے اور اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے۔ کیا انھیں خبر نہیں کہ اللہ کو ان کے دلی راز اور اور اُن کی سرگوشی کا علم ہے اور یہ کہ اللہ چھپی باتوں سے خوب واقف ہے۔

یہ ایسے لوگ ہیں کہ صدقات کے بارے میں نفل صدقہ دینے والے مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں اور خصوصاً اُن لوگوں پر جنہیں سوائے محنت مزدوری کے اور کچھ نہ ملتا ہو۔ سو یہ لوگ اِنپر ٹھٹھہ کرتے ہیں۔ اللہ ان کا ٹھٹھہ کرنا ان پر اُلٹ رہا ہے اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔

اے نبیؐ آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں اگر ان کیلئے ستر بار بھی استغفار کریں جب بھی اللہ انھیں ہرگز نہیں بخشے گا یہ اس لئے کہ اُنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

واقعہ کے راوی کہتے ہیں کہ نزولِ آیات کے وقت ثعلبہ کے عزیزوں میں ایک شخص موجود تھا وہ اُسی وقت اُٹھا اور ثعلبہ کے ہاں پہنچا اور کہا اے ثعلبہ تجھ پر افسوس ہے تیرے بارے میں قرآن کی آیات نازل ہوئی ہیں اور تیرے منافق ہونے کی اطلاع دی گئی ہے۔

ثعلبہ یہ سنتے ہی اپنی زکوۃ کی بکریاں لیکر مسجد نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ یہ میری زکوۃ ہے اسکو قبول فرمائیے!

آپؐ نے ارشاد فرمایا اللہ نے تیری زکوٰۃ وصول کرنے سے مجھکو منع کر دیا ہے میں ہرگز قبول نہیں کرسکتا۔ ثعلبہ اصرار کرنے لگا اور آخر روتے روتے اپنے سر پر خاک ڈال لی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا یہ تیرا اپنا عمل ہے میں نے تجھ کو جو مشورہ دیا تھا تو نے اسکو قبول نہ کیا، آخر مایوس ہوکر اپنے گھر واپس ہوا اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے

تاحیات اُسکی زکوٰۃ قبول نہ کی۔ جب آپ کا انتقال ہوگیا اور سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ خلیفہ تسلیم کرلئے گئے تو آپ کی خدمت میں اپنی دوچند زکوٰۃ لے آیا اور عرض کیا خلیفۃ المسلمین یہ ثعلبہ کی زکوٰۃ حاضر ہے اسکو قبول فرمائیے!

صدیق اکبر رضؓ نے فرمایا جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہ فرمایا ہو میں اُسکو کیوں کر قبول کرسکتا ہوں! اپنی زکوٰۃ واپس لے جاؤ میں ہرگز قبول نہ کروں گا۔ مایوس و ناکام واپس ہوگیا۔ پھر سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ کا انتقال ہوا اور سیدنا عمر فاروق رضؓ خلیفۃ المسلمین نامزد ہوئے آپ کی خلافت میں اپنی زکوٰۃ کی بہت بڑی مقدار لے آیا اور وہی گزارش کی کہ میری زکوٰۃ قبول کی جائے!

سیّدنا عمر فاروق رضؓ نے جواب دیا جس چیز کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے خلیفہ سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ نے قبول نہ کیا ہو بھلا اُس کو عمر بن الخطاب کیوں قبول کریگا؟ اپنی زکوٰۃ واپس لے جاؤ میں ہرگز قبول نہ کروں گا۔ خلافتِ فاروقی کے بارہ سال گزر گئے ثعلبہ کی زکوٰۃ کسی سال قبول نہ کی گئی۔ یہاں تک کہ سیدنا عمر فاروق رضؓ شہید ہوگئے اور سیّدنا عثمان غنی رضؓ خلیفہ مقرر ہوئے۔ ثعلبہ نے آپکی خدمت میں بھی اپنی زکوٰۃ پیش کی اور بہت سے صحابہ سے سفارش بھی کروائیں لیکن سیدنا عثمان غنی رضؓ نے بھی وہی جواب دیا کہ جس چیز کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے خلیفہ ابوبکر صدیق رضؓ اور خلیفۃ المسلمین عمر بن الخطاب رضؓ نے رد کردیا ہو اسکو میں کیوں کر قبول کرسکتا ہوں؟ اپنی زکوٰۃ واپس لے جاؤ میں ہرگز قبول نہ کروں گا۔

تفسیر خازن کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ ثعلبہ ذلیل و خوار ہوکر سیدنا عثمان غنی رضؓ کی مجلس سے اُٹھا اور مدینہ طیبہ کے بازاروں میں اعلان کرنے لگا کہ اے مدینہ کے فقیرو فلاں جگہ زکوٰۃ تقسیم ہورہی ہے جسکو جتنے جانور چاہیئے وہ حاصل کرلے۔

فقیر اور محتاج اس آواز پر دوڑ پڑے۔ جب قریب پہنچے

تو معلوم ہوا کہ ثعلبہ کی زکوٰۃ کے جانور ہیں فوراً لوٹ جاتے۔ کسی فقیر نے بھی ہاتھ نہ لگایا۔ اس طرح ثعلبہ کی زکوٰۃ مدینہ طیبہ کے فقیروں نے بھی قبول نہ کی۔ عہد عثمانی کے آخر دور میں اسی ذلت و رسوائی کی حالت میں ثعلبہ فوت ہوا۔ (تفسیر ابن کثیر سورۂ توبہ - آیت ۷۵)

(۴) معذور وفادار

غزوۂ تبوک کے سفر میں جن تین مخلص مسلمانوں نے شرکت نہ کی تھی اُن میں ایک مرارہ بن ربیع رضؓ اور دوسرے ہلال بن اُمیہ رضؓ ہیں۔ تیسرے صاحب کعب بن مالک رضؓ کا مفصل تذکرہ گزشتہ صفحات میں "حدیث کعب" کے عنوان سے آچکا ہے۔

اِن تینوں حضرات کے ہاں عدم شرکت کا کوئی معقول عذر نہ تھا۔ حضرت مُرارہ بن ربیع رضؓ کی عدم شرکت کا سبب ابن ابی حاتم کی روایت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اِن کا ایک باغ تھا جس کا پھل اُس وقت پک رہا تھا اور یہی باغ اُن کی زندگی کا سرمایہ تھا۔ انھوں نے اپنے دل میں کہا اے مُرارہ رضؓ تو نے اس سے پہلے بہت سے غزوات میں حصہ لیا ہے اگر اس سال جہاد میں نہ جائے تو کیا حرج ہے آئندہ کسی وقت بھی اسکی تلافی کر دینا۔ اس خیال نے انھیں پیچھے کر دیا۔ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان تبوک سے واپس آئے تو مُرارہ بن ربیع رضؓ کو اپنی غفلت اور خطا کا شدت سے احساس ہوا اور افسوس و ندامت نے انھیں بے چین کر دیا۔ اس سے پہلے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں معذرت کے لئے حاضر ہوں اپنا وہ محبوب باغ اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیا۔ پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اعترافِ قصور کر لیا۔

دوسرے صاحب ہلال بن اُمیہ رضؓ جو عمر رسیدہ بزرگ تھے اِن کا یہ واقعہ ہوا کہ اُن کے اہل و عیال ایک عرصے سے باہر تھے اور وہ تنہا زندگی بسر کر رہے تھے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر مدینہ طیبہ میں یہ

سب جمع ہوگئے۔ حضرت ہلال بن اُمیہ رضؓ کو خیال آیا کہ اس سال جہاد میں شرکت کے بجائے اہل وعیال میں وقت گزاروں اور ویسے بھی اس بڑھاپے میں اتنی دور دراز کا سفر میرے لئے ضروری بھی نہیں ہے۔ اس طرح کے وساوس نے انھیں بھی شرکتِ جہاد سے پیچھے کر دیا اور وہ سفر نہ کرسکے۔ بعد میں انھیں بھی شدت سے اپنی خطا کا احساس ہوا تو عہد کر لیا کہ اب میں اپنے اہل وعیال سے علیحدگی اختیار کرلوں گا۔

چونکہ یہ حضرات صادق الایمان تھے اسی ایمانی احساس وحمیّت نے انھیں اعترافِ گناہ پر مجبور کر دیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سچ سچ بیان کر دیا منافقین کی طرح جھوٹے عذر پیش نہیں کئے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن کا فیصلہ وحی الٰہی پر موقوف رکھا اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ اِن حضرات سے سلام وکلام ترک کر دیا جائے یہاں تک کہ اللہ کا کوئی حکم آجائے۔

اِن تینوں حضرات کے علاوہ سات اور مخلص بھی تھے جنہوں نے سستی اور کاہلی کی بنیاد پر غزوہ تبوک میں شرکت نہ کی تھی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے اور ان حضرات کو معلوم ہوا کہ پیچھے رہ جانے والوں کے متعلق اللہ اور رسول کی کیا رائے ہے تو انہیں سخت ندامت ہوئی اس سے پہلے کہ اِن سے باز پُرس ہو ان سب حضرات نے اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا اور عہد کر لیا کہ ہم پر نیند اور کھانا پینا حرام ہے جب تک ہم معاف نہ کر دیئے جائیں یا پھر ہم اسی حالت میں مرجائیں۔ ان سات حضرات میں ابو لُبابہ بن عبد المنذر رضؓ پیش پیش تھے۔

چنانچہ اسی طرح کئی دن تک یہ حضرات بے آب وخواب بندھے رہے حتیٰ کہ اُن میں بعض بے ہوش ہوکر گر پڑتے تھے۔ آخر کار جب انھیں بتایا گیا کہ اللہ اور اُس کے رسول نے تم سب کو معاف کر دیا ہے تو یہ حضرات اپنی قید بندی سے آزاد ہوکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ عرض کیا یا رسول اللہ ہماری توبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ جس گھر کی

آسائش و رہائش نے ہمیں اللہ کے فرض سے غافل کر دیا وہ اور اُس کا سب ساز و سامان اللہ کی راہ میں صدقہ کرتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سارا مال دینے کی ضرورت نہیں صرف ایک تہائی کافی ہے۔ چنانچہ ان ساتوں حضرات نے اپنے اپنے گھر کا ایک تہائی حصہ اُسی وقت خیرات کر دیا۔ (توبہ آیت ۱۰۲، ۱۰۶)

یہ سب حضرات مخلص مؤمن تھے۔ اِن کا پچھلا کارنامۂ زندگی ہر عیب سے خالی تھا یہ اللہ اور اس کے رسول کے سچے وفادار تھے انھوں نے اپنی عملی زندگی کو کفر و نفاق سے ہمیشہ دور رکھا تھا۔ اسلام کے عظیم معرکوں میں پورے جوش و اخلاص سے شرکت بھی کرتے تھے۔ اسلام کی سربلندی کے لئے جان و مال کی بازی لگا دینا اِن کا مقصدِ حیات تھا۔ ان کی زندگی کے یہی لیل و نہار تھے لیکن بشری کمزوریوں سے کون خالی ہوتا ہے۔ لغزش اور کوتاہی ہر انسان کا لازمہ ہیں۔ اگر کسی انسان سے بھول و غفلت ہو جائے یا خطا و نسیان سے ایک فریضہ ترک ہو جائے یا دانستہ بھی کوئی بُرا عمل اتفاقاً ہو جائے تو یہ اُسکے عدمِ اخلاص یا کفر و نفاق کی علامت نہیں ہوتا اور نہ اِس کا یہ طرزِ عمل دین بیزاری اور آخرت فراموشی قرار پائے گا۔ یہ بڑی جسارت کی بات ہوگی کو کسی کے گاہے ماہے عمل کو دیکھ کر کوئی حتمی و قطعی فیصلہ کر دیا جائے۔ غزوۂ تبوک میں مذکورہ بالا حضرات کی عدمِ شرکت بھول و غفلت، لغزش و کوتاہی، خطا و نسیان کے باعث تھی۔ کفر و شرک، الحاد و بے دینی ارتداد و نفاق کے باعث نہ تھی جیسا کہ عام منافقوں کی روش رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ان حضرات کی توبہ قبول کی گئی بلکہ اِن کا ابدی تذکرہ قرآن حکیم کی آیات میں قیامت تک کے لئے رُشد و ہدایت کا عظیم درس قرار پایا۔ یہ اللہ سے راضی رہے اللہ بھی اِن سے راضی ہوا۔

(۵) تلافیِ عمل غزوۂ تبوک میں جن حضرات سے لغزش ہوگئی تھی اُن کے تذکرے میں یہ بات بھی ملتی ہے کہ جہاں ان لوگوں نے اعترافِ قصور کر لیا وہاں اپنے مال و اسباب کا ذخیرہ بھی اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیا تھا۔

(توبہ آیت ۱۰۳)

یہاں جھوٹے و سچے، مخلص و غیر مخلص، مومن و منافق کا فرق

صاف صاف واضح ہوتا ہے کہ مومن مخلص سے جب کوئی خطا سرزد ہو جاتی ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ فوری توبہ کر لیتا ہے بلکہ اپنے عملِ بد کی تلافی کیلئے بے چین ہو جاتا ہے اور ایسا عمل خیر کر جاتا ہے جو اُس شر کی تلافی کر دے ان کو اِس بُرے عمل سے اُتنا ہی صدمہ ہوتا ہے جتنا کسی بڑے نفع کے موقع سے محروم رہ جانے کا ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ بھول و غفلت نے اُنھیں روک لیا تھا ورنہ وہ خود رُکنے والے نہ تھے۔ گناہوں کی تلافی کے لئے جہاں قلب و زبان کی توبہ ہوتی ہے وہاں عملی توبہ بھی ہونی چاہیئے۔ مذکورہ تذکرہ میں عملی توبہ کی ایک شکل یہ بھی تھی کہ انسان اپنے مال سے راہ خدا میں کچھ خرچ کر دے۔ اس طرح وہ بگاڑ جو قلب میں پرورش پا رہا تھا اور جس کی بدولت آدمی سے گناہ کا صدور ہوا دور ہو جائے اور نیکی کی جانب متوجہ ہونے کی استعداد پیدا ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات میں ایک ہدایت یہ بھی موجود ہے کہ کسی گناہ کے بعد نیکی کا عمل کرنا اُس گناہ کو صاف کر دیتا ہے۔ یہ اسی حقیقت کی جانب اشارہ ہے کہ کسی خطا یا معصیت کے بعد کوئی نہ کوئی نیک کام کر لینا چاہیئے۔

غزوۂ تبوک میں جن مخلص مسلمانوں نے شرکت نہیں کی تھی انہیں مال و اسباب ہی کی مشغولیت نے اس خیر کثیر سے روک دیا تھا اس کی تلافی بھی مال و اسباب کے صدقہ خیرات سے کی گئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے انکے اس عملِ خیر کو قبول فرمایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی کہ اِن مخلص مسلمانوں کے صدقات کو قبول فرمائیں اور اِنھیں دُعا دیں۔

(توبہ آیت ۱۰۳)

(۶) بیعتِ عقبہ

عہدِ صحابہ میں جیسے بیعتِ رضوان کو اہمیت حاصل تھی اسی طرح بیعت عُقبہ کو بھی بڑی حیثیت حاصل ہے۔

عَقبہ دراصل پہاڑ کے ایک حصّہ کو کہا جاتا ہے اور یہاں پہاڑ کا وہ حصّہ مراد ہے جو مِنیٰ (مکّہ) میں جمرۂ عقبہ (جس کا عُرفی نام بڑا شیطان ہے) سے متصل ہے (لیکن آجکل حجاج کی کثرت کی وجہ سے پہاڑ کا یہ حصّہ

صاف کر کے میدان بنا دیا گیا ہے۔ صرف جمرہ کنکری مارنے کا مقام رہ گیا ہے)
اس پہاڑی کے خصہ عقبہ پر مدینہ منورہ کے چند حضرات سے تین مرتبہ بیعت لی گئی تھی۔

پہلی بیعت بعثت نبوی کے گیارہویں سال ہوئی جسمیں مدینہ منورہ کے چھ حضرات نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام پر بیعت کی اور مدینہ طیبہ واپس ہو گئے۔ اس بیعت کی وجہ سے مدینہ طیبہ کے گھر گھر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کا چرچا ہوا۔

اگلے سال موسم حج میں بارہ حضرات اسی جگہ جمع ہوئے جنمیں پانچ حضرات تو سابقہ بیعت کے تھے اور سات دوسرے حضرات تھے سب نے آپؐ کے ہاتھ اسلام پر بیعت کی۔

اس بیعت نے اسلام کی اشاعت کو دوچند کر دیا۔ چند ہی دنوں میں مدینہ طیبہ میں مسلمانوں کی تعداد چالیس سے زائد ہو گئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو اسلام کا مبلغ بنا کر مدینہ طیبہ روانہ فرما دیا تاکہ وہ مسلمانوں کو قرآن پڑھائیں اور اسلام کی تبلیغ کریں۔
حضرت مصعبؓ کی جد و جہد نے مدینہ طیبہ میں بڑی وسعت پیدا کر دی اور بڑے بڑے قبائل میں اسلام داخل ہوا اور کثیر لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

اسکے بعد بعثتِ نبوی کے تیرہویں سال ۷۳ مرد دو عورتیں اسی سابقہ جگہ آئے اور آپ سے اسلام پر بیعت کی۔ یہ تیسری اور آخری بیعت تھی جو ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں پیش آئی۔

تاریخِ اسلام میں یہی تیسری بیعت بیعتِ عُقبہ کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ اس بیعت کے مقاصد میں جہاں عقائد اسلام اور اعمال صالحہ کا عہد و پیمان تھا خصوصیت سے یہ عہد بھی لیا گیا تھا کہ جب آپ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ پہونچیں گے تو آپ کی اور مسلمانوں کی حفاظت و حمایت کی جائیگی۔ اسی بیعت عقبہ میں حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے عرض کیا تھا:-

یا رسول اللہ! اس وقت جو معاہدہ ہو رہا ہے آپؐ جو شرائط اپنے رب کے متعلق یا اپنے متعلق کرنا چاہیں وہ واضح فرما دیں!

آپ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کے لئے تو میں یہ شرط رکھتا ہوں آپ سب اُسکی عبادت کریں گے اور اُس کے سوا کسی کی عبادت نہ ہوگی۔

اور اپنے لئے یہ شرط رکھتا ہوں کہ میری حفاظت اس طرح کرینگے جیسے اپنی جان و مال اور اولاد کی حفاظت کرتے ہو۔ پھر اِن لوگوں نے دریافت کیا اگر ہم یہ دونوں شرطیں پوری کر دیں تو اس کا ہمیں کیا بدلہ ملے گا؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا جنّت ملے گی! اس خوشخبری پر سب نے بیک زبان کہا کہ ہم اس سودے پر راضی ہیں اور اس پر قائم رہیں گے۔

اس موقعہ پر یہ آیات نازل ہوئیں:۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ۔ الخ

(توبہ آیت ۱۱۱)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے ایمان والوں سے اُن کے نفس اور اُن کے مال جنت کے عوض میں خرید لئے ہیں، وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں پھر مارتے ہیں اور مرتے ہیں۔

ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے۔ کتاب تورات اور کتاب انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟

پس تم لوگ اپنی اس بیع پر جس کا تم نے معاملہ ٹھیرایا ہے خوشیاں مناؤ اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

(۷) بُری نیّت بُرے ارادے، کَلِمَةُ الْكُفْر

سورہ توبہ آیت ۷۴ کا ترجمہ یہ ہے:۔

یہ منافق لوگ اللہ کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے وہ بات نہیں کہی۔ حالانکہ اُنھوں نے وہ کافرانہ بات ضرور کہی ہے اور وہ اسلام قبول کرنے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے اور اُنھوں نے وہ سب کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے وہ کر نہ سکے۔ الخ

منافقوں کی وہ کیا بات تھی جس کا آیت میں اشارہ کیا گیا ہے؟

بنیادی طور پر تو منافقوں کی وہ تمام باتیں مراد ہیں جو وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کہا کرتے تھے تاہم مفسرین نے چند ایک باتیں خاص طور پر نقل کی ہیں اِن میں سے ایک واقعہ تو یہ نقل کیا ہے کہ غزوہ تبوک کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ میں منافقین کی بدحالی اور اُن کے انجام بد کا تذکرہ فرمایا تھا۔ حاضرین میں ایک منافق جُلاّس نامی بھی موجود تھا اُس نے اپنی مجلس میں جا کر کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ کہتے ہیں اگر وہ سچ ہے تو پھر ہم گدھوں سے بھی بدتر ہیں۔ اس کا یہ کلمہ حضرت عامر بن قیس رضہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا، لیکن جُلاّس نے انکار کر دیا اور حضرت عامر رضہ پر تہمت لگا دی کہ اُنھوں نے مجھ پر جھوٹ کہا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو حکم دیا کہ منبر نبوی کے قریب کھڑے ہو کر قسم کھائیں۔

جُلاّس نے بے دھڑک جھوٹی قسم کھا لی کہ میں نے ایسا نہیں کہا ہے۔ حضرت عامر رضہ نے بھی قسم کھائی کہ میں نے اپنے کانوں سے ایسے ہی سُنا ہے پھر دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور اس طرح فریاد کی اے اللہ اپنے رسول پر اس واقعہ کی حقیقت ظاہر فرما دے۔ اِن کی اس دُعا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے آمین کہی۔

ابھی یہ لوگ اس جگہ سے ہٹنے بھی نہ پائے تھے کہ جبرئیل امین آیت مذکورہ لیکر حاضر ہو گئے اور اُس کافرانہ بات کا اظہار کر دیا۔

(تفسیر بغوی)

تفسیر مظہری کے مؤلف نے مزید یہ بھی صراحت کی ہے کہ جُلاّس اس واقعہ کے بعد تائب ہوگئے اور ان کے حالات درست بھی ہوگئے۔ واللہ اعلم

ایک اور روایت بھی نقل کی جاتی ہے کہ تبوک کے سفر میں ایک مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی گم ہوگئی تھی صحابہ تلاش کر رہے تھے اسپر منافقوں کی ایک جماعت نے اپنی مجلس میں اس واقعہ کا خوب مذاق اُڑایا اور کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو آسمانوں کی خبریں سناتے ہیں مگر اِن کو اپنی اونٹنی کی کچھ بھی خبر نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے ؟ (تفصیل غزوۂ تبوک میں)

محدثین نے ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ تبوک سے واپسی پر بارہ منافقین کی ایک جماعت نے یہ سازش طے کرلی کہ جب آپ فلاں پہاڑ کی گھاٹی سے گزریں گے تو اچانک آپ پر حملہ کرکے کھائی میں ڈھکیل دیا جائے۔ چنانچہ یہ بارہ خبیث چوری سے آگے نکل گئے اور گھاٹی میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جبرئیل امین نے آپ کو وقت سے پہلے اس سازش اور مقام کی نشان دہی کردی۔ آپ نے دوسرا راستہ اختیار کرلیا۔ اسطرح ان کی سازش خاک میں مل گئی۔

ایک اور سازش کا بھی ذکر ملتا ہے تبوک میں دراصل اہل روم کی ایک لاکھ فوج سے مقابلہ تھا۔ منافقین کو یہ ہرگز توقع نہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان خیریت سے مدینہ واپس لوٹیں گے اور انھوں نے یہ طے کرلیا تھا کہ جونہی تبوک سے ایسی کوئی خبر ملے تو مدینہ میں عبداللہ بن اُبیّ (رئیس المنافقین) کے سر پہ تاج شاہی رکھ دیا جائے اور اپنی حکومت کا اعلان کردیا جائے۔

دراصل یہ سب کافرانہ باتیں تھیں جو ان منافقین کی زبانوں سے بے تحاشہ نکلا کرتی تھیں اور جب اِن سے پوچھا جاتا تو صاف انکار کردیتے تھے۔ مزید برآں قسمیں بھی کھا جاتے۔ اور ان سب باتوں کو

"کَلِمَةُ الْكُفْر" کا لقب دیا ہے۔ (توبہ آیت ۷۴)

(۸) عبرت ہی عبرت

صحیح مسلم میں حضرت ابن عمرؓ سے یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ جب (رئیس المنافقین) عبداللہ بن اُبی بن سلول مر گیا تو اسکے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ جو مخلص مسلمان صحابی رسول ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور باپ کے مرنے کی اطلاع دی اور یہ خواہش کی کہ اپنا قمیص مبارک عطا فرمائیں تاکہ باپ کے کفن میں اسکو شریک کیا جائے۔ آپؐ نے اپنا قمیص مبارک عنایت کر دیا۔ پھر صاحبزادے نے عرض کیا یا رسول اللہ ان کی زبان سے آپ کی شان میں بڑی بڑی گستاخیاں ہوئیں ہیں کہیں اللہ کا عذاب اسے پکڑ نہ لے۔ یا رسول اللہ اپنا لعاب مبارک بھی اسکے منھ میں ڈال دیجئے (تاکہ اسکی برکت سے یہ عذاب الٰہی سے محفوظ ہو جائے) آپؐ نے یہ عمل بھی کر دیا۔ (مسند احمد و نسائی)

اسکے بعد جب نماز جنازہ پڑھنے کا وقت آیا تو عبداللہؓ نے درخواست کی یا رسول اللہ نماز جنازہ بھی آپ پڑھا دیں۔ آپؐ نے یہ بھی قبول فرما لیا اور نماز جنازہ کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اس موقع پر حضرت عمر فاروقؓ نے آپ کا دامن پکڑ کر عرض کیا یا رسول اللہ یہ وہی خبیث تو ہے جس نے فلاں فلاں وقت ایسی ایسی حرکتیں کی تھیں! ہمیشہ کفر و نفاق کا علمبردار رہا ہے۔ اللہ نے آپ کو منافقوں کی نماز جنازہ پڑھنے سے منع کیا ہے کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ الآيَة (توبہ آیت ۸۰)

آپ نے ارشاد فرمایا اے عمرؓ مجھکو استغفار کرنے سے منع نہیں کیا گیا بلکہ اختیار دیا گیا ہے کہ استغفار کروں یا نہ کروں، یہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ اُن کو معاف نہ کرے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا اگر میں جانتا کہ ستر مرتبہ سے زائد استغفار کرنے پر اسکی مغفرت ہوجاتی تو میں ایسا کردیتا۔

اس کلام سے معلوم ہوا کہ آپؐ بھی اُس منافق کے حق میں استغفار کو غیر مفید تصور کررہے ہیں۔ گویا حضرت عمرؓ کی نظر بغض فی اللہ پر منحصر تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نقطۂ نظر عام پیغمبرانہ شفقت اور لطف و احسان تھا جو آپ کا خلق عظیم ہے۔ آخر کار آپ نے نماز جنازہ ادا کردی اور صحابہؓ نے بھی شرکت کی۔ (بخاری و مسلم)

نماز کے کچھ ہی دیر بعد یہ آیت وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ الآیہ (توبہ آیت ۸۴)

اور اُن میں سے کوئی مرجائے تو اسکے جنازہ پر کبھی نماز نہ پڑھئے اور نہ اُسکی قبر پر کھڑے ہوں)

نازل ہوئی تو آپؐ نے منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے یا اُن کے کفن دفن میں کبھی بھی حصہ نہیں لیا۔ اور جب کوئی جنازہ آجاتا تو آپ دریافت فرماتے اگر اُسکی تعریف کی جاتی تو آپ نماز جنازہ ادا فرمادیتے ورنہ یہ فرماکر علیحدہ ہوجاتے کہ اپنے ساتھی کی نماز جنازہ ادا کردی جائے۔

(ابن کثیر سورہ توبہ آیت ۸۴)

تاریخ اور بعض تفسیر کی کتابوں میں ایک روایت یہ بھی نقل ہوتی آرہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرا قمیص اُس کو اللہ کے عذاب سے بچا نہ سکا مگر میں نے یہ کام اس لئے کیا ہے کہ مجھے اُمید ہے اس عمل سے اُس کی قوم کے ہزار آدمی مسلمان ہوجائیں گے۔ چنانچہ اس واقعہ "خلق عظیم" کو دیکھ کر قبیلۂ خزرج کے ایک ہزار آدمی مسلمان ہوگئے۔

مُتفرّقات

(۱) تَبَنّی (بیٹا بنا لینا) زمانۂ جاہلیت میں ایک رسم رائج تھی کہ کسی کے بچّہ کو گود لے کر اپنا بیٹا بنا لیا جائے۔ یہ طریقہ مشرکین عرب وعجم دونوں میں جاری تھا۔ جب یہ بات طے ہو جاتی تو بچہ اپنے حقیقی ماں باپ سے کٹ کر ایک اجنبی آدمی کے نسب میں شامل کر دیا جاتا تھا پھر خاندان کے ساتھ اُس کا وہی رشتہ ہو جاتا جیسا کہ حقیقی اولاد کا ہوا کرتا ہے۔ نسبی رشتوں میں اسطرح کی دخل اندازی سے وہ بچّہ اپنے منھ بولے باپ کا وارث بھی قرار پاتا تھا اور حقیقی ورثاء محروم وراثت ہو جاتے تھے۔ اس خلافِ فطرت مصنوعی رشتوں کی وجہ سے نسبی انتساب اور معاشرتی نظام میں خلط ملط اور فساد وبگاڑ پیدا ہوا کرتا تھا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں بھی یہ رسم رائج تھی جب اسلام کی بنیاد قائم ودائم ہوئی تو معاشرہ کا یہ ناسور بھی دور کر دیا گیا اور مسلمانوں میں ہمیشہ کے لئے اس رسم بد کا خاتمہ کر دیا گیا۔ انسداد تبنّی کیلئے اللہ عزّوجلّ نے جس واقعہ کو منتخب فرمایا اس کی روئداد حضرت زید بن حارثہ رض کی زندگی سے وابستہ ہے۔

حضرت زید بن حارثہ رض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور نہایت محبوب صحابی ہیں۔ یہ عرب کے معزز قبیلہ بنی کلب کے ایک فرد تھے مگر بچپن ہی میں ایک حادثہ کی وجہ سے غلام بنالئے گئے تھے، واقعہ یہ پیش آیا کہ ان کی والدہ اِن کو اپنے ساتھ لے کر اپنے خاندان قبیلہ طے کی شاخ بنی مَعَن جا رہی تھیں کہ درمیان راہ ایک ڈاکو قبیلہ بنی قین نے اِن کو لوٹ لیا اور کم عمر زید رض کو بھی چھین لے گئے اور طائف کے بازار عکاظ میں فروخت کر دیا۔ سیّدہ خدیجہ کے برادرزادہ حکیم بن حزام نے زید کو اپنی پھوپھی سیّدہ خدیجہؓ کی خدمت کے لئے خرید لیا۔ حضرت زید بن حارثہ ابھی آٹھ سال ہی کے تھے کہ سیّدہ خدیجہ رض کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفیقۂ حیات

ہونے کا شرف حاصل ہو گیا۔ نکاح کے بعد سیدہ خدیجہ رضؓ نے زید بن حارثہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زید بن حارثہ رضؓ کے عادات و اطوار بہت پسند آئے اور آپؐ نے ان کو اپنا بیٹا بنا لیا۔

(حضرت عبد اللہ بن عمر رضؓ کی روایت ہے کہ لوگ اُس دن سے زید کو زید بن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنے لگے۔ اور اُس وقت تک کہتے رہے کہ اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی :-

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ الآیہ

(احزاب آیت ۵)

(تم اپنے منہ بولے بیٹوں کو اُن کے باپ دادا ہی کی نسبت سے پکارا کرو اللہ کے ہاں انصاف کی بات یہی ہے)

الغرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضؓ اور اپنے چچا حضرت حمزہ رضؓ کے درمیان بھائی چارہ کروا دیا اور وہ دونوں حقیقی بھائیوں کی طرح رہنے لگے (یہ نبوت سے قبل کا واقعہ ہے)

حضرت زید رضؓ کی گمشدگی نے اُن کے والد حارثہ رضؓ کو بے چین و بیقرار کر دیا تھا اور وہ زید کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ حُسنِ اتفاق سے قبیلہ بنو کلب کے چند آدمی حج کرنے مکہ مکرمہ آئے اور وہاں حضرت زید رضؓ کو دیکھا اور پہچان گئے۔ حضرت زید رضؓ نے بھی اُن لوگوں کو پہچانا اور اپنی موجودگی کی اطلاع دی۔ حارثہ رضؓ اور ان کے بھائی کعب نے جب یہ سُنا تو تیزی سے مکہ مکرمہ آئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا آپ زید کو ہمارے حوالہ کر دیجئے اور جو بھی زرِ فدیہ ہو لے لیجئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں سے فرمایا کہ زید رضؓ جس صورت کو پسند کرتا ہے میں اسکو اختیار دیتا ہوں چاہے وہ تمہارے ساتھ چلا جائے یا میرے ساتھ رہنا پسند کرے۔ حارثہ اور ان کے بھائی

کعب نے اس رائے پر اتفاق کیا کیونکہ اُنھیں یقین تھا بیٹا بہرحال باپ ہی کو ترجیح دے گا. چنانچہ زیدرضؓ کو بلایا گیا آپؐ نے ارشاد فرمایا کیا اِن کو تم جانتے ہو؟

زیدرضؓ نے کہا کیوں نہیں، یہ میرے باپ ہیں اور یہ چچا ہیں!

آپؐ نے ارشاد فرمایا تو پھر تم کو یہ لینے آئے ہیں اب تم کو اختیار ہے چاہے اِن کے ساتھ جاؤ یا میرے ہاں رہو!

حضرت زیدرضؓ نے فوری عرض کیا میں آپؐ پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا میرے باپ وچچا جو بھی ہوں وہ آپؐ ہی ہیں۔

حارثہ کو یہ خلافِ توقع بات بہت ناگوار گزری کہا اے زید تجھ پر افسوس ہے تو نے غلامی کو آزادی پر، اور باپ دادا اور خاندان پر اجنبی کو ترجیح دے دی!

زیدرضؓ نے اپنے باپ کو جواب دیا اس ذاتِ اقدس کے ساتھ رہ کر میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے اسکے بعد دنیا و مافیہا کی کوئی قیمت میری نظروں میں موجود نہ رہی. میں نے اپنی بقیہ زندگی آپؐ ہی کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہے!

اس جواب پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حارثہ کو اور حاضرین کو بتایا کہ میں نے زیدرضؓ کو آزاد کر دیا ہے۔ اب وہ میرا غلام نہیں بلکہ بیٹا ہے۔ حارثہ نے جب یہ سُنا تو بہت خوشی کا اظہار کیا اور باپ اور چچا دونوں مطمئن واپس ہو گئے اور حضرت زیدرضؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ زندگی گزارتے رہے اور حارثہ گاہے گاہے آکر دیکھ جاتے اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لیا کرتے تھے۔

(اُسد الغابہ ابن اثیر جزری)

جلد ۲ صـ ۲۳۴

جامع ترمذی کی ایک مختصر روایت میں حارثہ کی جگہ اُن کے دوسرے بیٹے جبلہ کی آمد اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

مذکورہ بالا گفتگو کا ذکر ملتا ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ واقعہ دورِ نبوت سے پہلے کا ہے۔ پھر جب آپ نبوت سے سرفراز ہوئے تو اُن چار سابقین اولین میں ایک زید بن حارثہ بھی ہیں جو سب سے پہلے آپؐ پر ایمان لائے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کو جہاں اپنا بیٹا جیسا قرار دے لیا تھا۔ مزید یہ بھی عزت دی کہ ان کا نکاح اپنے بچپن کی خدمت و نگرانی کرنے والی (حَاضِنَہ) اُمّ ایمن کے ساتھ کر دیا۔ جن کے بطن سے حضرت اُسامہؓ پیدا ہوئے جو محبوبِ رسول اللہؐ کے لقب سے مشہور ہیں۔ (اُمّ ایمن ابولہب کی باندی تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ولادت کی اطلاع اسی خاتون نے ابولہب کو دی تھی۔ اس خوشخبری پر ابولہب نے اُم ایمن کو آزاد کر دیا تھا) پھر اس نکاح کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپی زاد بہن زینب بنت جحش کے ساتھ حضرت زیدؓ کا نکاح کرنا چاہا یہ ہاشمی خاندان کی چشم و چراغ اور آپؐ کی پھوپی اُمیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی تھیں۔ خاندانی شرافت اور ناموری بہرحال ایک خصوصی امتیاز تھا۔ حضرت زینبؓ اور ان کے بھائی عبداللہ بن جحشؓ اس نکاح پر راضی نہ تھے۔ کیونکہ زید بن حارثہ بظاہر داغ غلامی اُٹھا کر آزاد ہوئے تھے۔ یہ اُس زمانے کا عُرفی عار تھا کہ کوئی بلند خاندان کی لڑکی کسی ادنیٰ خاندان کے فرد سے نکاح کرلے۔ اس غیر ضروری امتیاز کی وجہ سے حضرت زینبؓ اس نکاح پر راضی نہ تھیں لیکن اس موقع پر قرآن نازل ہوا اور یہ حکم دیا کہ جس بات کا حکم اللہ اور اُس کا رسول دیدے پھر اسکی خلاف ورزی کسی مؤمن مرد اور کسی مومن عورت کے لئے جائز ہی نہیں ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ الخ (احزاب آیت ۳۶)

اور جب اللہ اور اُس کا رسول کوئی فیصلہ کر دے تو پھر

کسی مرد مؤمن اور کسی عورت مؤمنہ کو ان کے اپنے معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔ اور جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی بلاشبہ وہ گمراہی میں پڑ گیا۔

وحی الٰہی کے نزول پر حضرت زینبؓ اور اُن کے بھائیوں نے آپؐ کا فیصلہ قبول کر لیا اور حضرت زید بن حارثہؓ سے حضرت زینبؓ بیاہی گئیں۔ اس طرح خاندانِ نبوت ہی سے فخر بالانساب کی جڑ کاٹ دی گئی اور تقویٰ و نیکی کو شرافت و بزرگی کا اصل معیار قرار دیا گیا۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ

حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت زینبؓ اگرچہ عقد نکاح میں منسلک تھے لیکن حضرت زینبؓ کا یہ خاندانی رُجحان مٹ نہ سکا کہ وہ قریشی ہاشمی ہیں اور اِن کے شوہر بہرحال ایک آزاد شدہ غلام اور غیر قریشی ہیں۔ اگرچہ حضرت زید بن حارثہؓ نسلاً کوئی غلام خاندان سے نہ تھے اور نہ ان کے باپ دادا کسی کے غلام و زر خرید تھے۔ اس لئے حضرت زیدؓ کو اپنے کم درجہ ہونے کا احساس نہ تھا۔ علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے ہونے کا شرف بھی پایا تھا اور جب حضرت زینبؓ کے شوہر ہو گئے تو پھر کسی کمتری کا احساس کیوں آتا؟ بہرحال حضرت زینبؓ اور حضرت زیدؓ کی دو متضاد فکر نے آپس میں خلوص و محبت کا رشتہ قائم نہ ہونے دیا۔ بے لطفی کی زندگی کا دور دورہ شروع ہو گیا اور دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔

ایک سال سے کچھ ہی زیادہ مدت گزری تھی کہ حضرت زیدؓ نے طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر بار بار شکایت پیش کرتے تھے اور عرض کرتے یا رسول اللہؐ میں زینبؓ کو طلاق دینا چاہتا ہوں لیکن آپ ہر بار یہی فرماتے کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ مطلب یہ تھا کہ تقویٰ اختیار کرو۔ کیونکہ تقویٰ کی زندگی اچھے نتائج پیدا کرتی ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے اے لوگو! عورتوں کے بارے میں
اللہ سے ڈرتے رہو، یہ اللہ کی امانتیں ہیں جو تم کو دی گئی ہیں۔ (الحدیث)

حضرت زینبؓ نے اگرچہ اللہ اور اُس کے رسول کا حکم مان کر حضرت زیدؓ سے نکاح کر لیا تھا لیکن وہ اپنے دل سے اُس احساس کو کبھی دور نہ کر سکیں کہ زیدؓ ایک آزاد کردہ غلام ہیں اور اُن کے اپنے خاندان کے پروردہ ہیں اور وہ عرب کے شریف ترین گھرانے کی بیٹی ہونے کے باوجود اس کمتر درجے کے آدمی سے بیاہی گئی ہیں۔ اسی احساس نے ازدواجی زندگی میں حضرت زید کو کبھی اپنے برابر نہ سمجھا۔ اس ناتفاقی صورتِ حال نے وحی الٰہی کا وہ ابدی فیصلہ قریب کر دیا کہ اسلام جو دین فطرت ہے اسمیں تبنّی کی رسم جاہلی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ جس طرح رسول محترم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خاندان ہی سے فخر بالانساب کا بُت ڈھا دیا گیا تھا اسی طرح تبنّی کی رسم جاہلی کا خاتمہ بھی اسی رسولِ اکرم کے عمل سے کیا گیا۔ چنانچہ وحی الٰہی نے آپ کو اس بات کی اطلاع دی کہ زیدؓ اپنی بیوی زینبؓ کو طلاق دیدیں گے اور اسکے بعد زینبؓ آپؐ کے نکاح میں آئیں گی۔ اور آپؐ کو زینبؓ سے نکاح کرنا ہوگا۔

چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ خوب جانتے تھے کہ عرب کے موجودہ ماحول میں منھ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ سخت ترین آزمائش اور الزامات سے دوچار ہونا ہے۔ کیونکہ منافقین اور خاص طور پر مشرکین عرب کو یہ موقع ہاتھ آجائے گا کہ اب وہ نبیؐ پر اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کرنے اور اس پر نظر رکھنے کا الزام عائد کریں گے اور عام لوگوں کو گمراہ کرنے اور برگشتہ کرنے کا ایک نیا حربہ ہاتھ آئے گا۔ چنانچہ واقعات نے ایسا ہی ثبوت فراہم کیا۔ بہرحال آپؐ نے وحیِ الٰہی کے اس فیصلہ کو نہ حضرت زیدؓ سے ظاہر کیا اور نہ کسی اور صحابی سے بلکہ اسکو اپنے دل میں محفوظ رکھا۔ چونکہ اللہ کا یہ فیصلہ زیدؓ کے طلاق دینے کے بعد کا تھا اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر بار زیدؓ کو یہی مشورہ دیتے کہ زینبؓ کو طلاق نہ دو اور صبر وضبط سے کام لو۔ منشاء یہ تھا کہ جب طلاق ہی نہ ہوگی تو نکاح کرنے کا فی الحال سوال پیدا نہ ہوگا۔ اس طرح مشرکین اور مخالفین کے جھوٹ وبہتان اور طعن وتشنیع اور طوفان بدتمیزی سے نجات ملے گی اور انھیں سادہ دل انسانوں کو گمراہ کرنے کا موقع بھی فراہم نہ ہوگا۔

مگر جب ہر طرح کی مصالحت سے دونوں میں موافقت نہ ہوسکی تب حضرت زید بن حارثہؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی۔ اس طرح یہ ازدواجی رشتہ ختم ہوگیا۔

اب آپؐ نے منشاء الٰہی پورا کرنے کا قصد فرمایا اور عدت گزرنے کے بعد حضرت زینبؓ سے نکاح کرلیا۔

یہ کام ہونا ہی تھا کہ آپؐ کے خلاف طعن و تشنیع کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور الزامات واتہامات کا سیلاب بہ پڑا لیکن اللہ کو اپنے دین کی تکمیل مقصود تھی اور اسلام کے اُن اقدار کو غالب کرنا تھا کہ پھر اسکے بعد کوئی جاہلی رسم پروان نہ چڑھے اور اللہ کا قانون اُس کی زمین پر جاری وساری ہوجائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راہ میں وہ سب کچھ برداشت کیا جو اُولوالعزم رسول برداشت کیا کرتے ہیں۔ آخر اللہ کا دین غالب آیا اور جاہلیت کی یہ قدیم رسم آپ کے ہاتھوں پامال کردی گئی کہ منہ بولا بیٹا کوئی حقیقت نہیں اور نہ اِس کا کوئی وزن ہے۔ منہ بولے رشتے میں خواہ کتنا ہی تقدس پیدا کر دیا جائے۔ بہرحال وہ مصنوعی رشتہ ہے اس کو اسلام میں کوئی اہمیت نہیں۔

قرآن حکیم نے تبنّی کی اس رسم جاہلی کا ذکر اور حضرت زید بن حارثہؓ کا واقعہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس واقعہ سے تعلقِ خاطر واضح طور پر آیاتِ ذیل میں بیان کیا ہے:۔

قرآنی مضمون

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا الخ (سورہ احزاب آیت ۱ تا ۵)

اے نبیؐ اللہ سے ڈرتے رہیئے اور کفار و منافقین کا کہنا نہ مانیے۔ بلاشبہ اللہ علم والا حکمت والا ہے۔ اور پیروی کرو اُس بات کی جو آپؐ کے رب کی طرف سے آپؐ کی طرف وحی کی گئی ہے۔ بیشک اللہ جو کچھ تم لوگ کیا کرتے ہو خوب جانتا ہے۔ اور اللہ ہی پر توکل کرو اور اللہ ہی وکیل ہونے کے لئے کافی ہے۔

اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل پیدا نہیں کئے اور نہ اللہ نے تم لوگوں کی اُن بیویوں کو جن سے تم ظہار[1] کرتے ہو تمہاری ماں بنادیا ہو۔

---

[1] ظہار کے معنی بیوی کو ماں جیسی قرار دینا۔

اور نہ تمہارے لئے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا قرار دیا ہے۔ یہ صرف تمہارے منہ سے کہنے کی بات ہے (جو واقع کے مطابق نہیں) اور اللہ حق بات فرماتا ہے اور وہی سیدھا راستہ بتلاتا ہے۔

تم اُن کو (متبنّٰی بنانے والوں کا بیٹا نہ کہو بلکہ) اُن کے حقیقی باپ کی طرف منسوب کیا کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک سچائی کی بات ہے۔ اور اگر تم (اُن مُنہ بولے بیٹوں کے) باپ کو نہ جانتے ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی اور تمہارے دوست ہیں اور تم کو اسمیں جو بھول چوک ہو جائے تو اس سے تم پر کچھ گناہ نہ ہوگا لیکن جو دل سے ارادہ کرکے کرو (تو اس سے گناہ ہوگا) اللہ تعالےٰ غفور رحیم ہیں۔"

(تفسیر رُوح المعانی میں) ایک شخص کی حکایت درج ہے جو ذُو قلبین (دو دل والا) ہونے کا مدعی تھا۔ جنگ بدر میں میدان سے اس حال میں بھاگا کہ ایک جوتا پیر میں تھا اور دوسرا ہاتھ میں۔ ابوسفیان نے جب اسکو اس حال میں دیکھ کر ٹوکا تو اُس نے بیان کیا کہ میں دونوں جوتے دونوں پیر میں سمجھا تھا۔ (کیا دو دل والا بھی اسقدر بے خبر ہوا کرتا ہے)

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ الخ (احزاب آیت ۳۶ تا ۴۰)

کسی ایمان دار مرد اور کسی ایمان دار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اُس کا رسول کسی کام کا حکم دیں کہ پھر اُن کو اُس کام میں کوئی اختیار باقی رہے (یعنی عمل کرنا واجب ہوتا ہے) اور جو شخص اللہ کا اور اُس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا (چنانچہ اس آیت کے سُننے کے بعد حضرت زینبؓ کا نکاح حضرت زید بن حارثہ سے ہوگیا)

(آگے اس نکاح کے بعد کا قصہ ہے کہ اُس وقت کو یاد کیجئے جب آپؐ (اے نبی بطور مشورہ) اُس شخص (زید بن حارثہ) سے فرما رہے تھے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا (کہ اسلام کی توفیق دی اور غلامی سے آزادی بھی دی) اور آپؐ نے بھی انعام کیا (کہ اپنی پھوپی زاد بہن زینبؓ سے نکاح

کروادیا) کہ اپنی بیوی (زینبؓ) کو اپنی زوجیت میں رہنے دے (کہ اُس کی معمولی اور بے وزن باتوں سے درگزر کر) اور اللہ سے ڈر، اور اُس وقت آپؐ اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسکو اللہ ظاہر کرنا چاہتا تھا (اللہ نے اس سے پہلے آپؐ کو اطلاع دے دی تھی کہ زیدؓ کے طلاق دینے کے بعد زینبؓ کا نکاح آپؐ سے ہوگا) اور آپؐ لوگوں (کے طعن) سے اندیشہ کر رہے تھے اور ڈرنا تو آپ کو اللہ ہی سے زیادہ سزاوار ہے۔ پھر جب زیدؓ کا اُس (زینبؓ) سے جی بھر گیا (یعنی طلاق دے دی اور عدّت بھی گزر گئی تو) ہم نے آپؐ سے اُس (زینبؓ) کا نکاح کر دیا تاکہ مسلمانوں پر اپنے منھ بولے بیٹوں کی بیویوں کے نکاح کے بارے میں کچھ تنگی نہ رہے۔ جب وہ منھ بولے بیٹے اُن عورتوں سے اپنا جی بھر چکیں ہوں اور اللہ کا یہ حکم تو ہونے والا ہی تھا۔ نبیؐ پر کسی ایسے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اللہ نے اُن کے لئے مقرر کر دی ہے۔ یہی اللہ کی سُنت اُن سب نبیوں میں جاری رہی ہے جو پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ کا حکم ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے۔ یہ سب (پیغمبرانِ گزشتہ) ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تبلیغ کیا کرتے تھے اور اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے (پس آپؐ کو بھی منھ بولے بیٹے کی مطلّقہ بیوی زینبؓ سے نکاح کرنے میں کوئی اندیشہ وفکر نہ کرنی چاہیئے) اور اللہ (اعمال کا حساب لینے کے لئے کافی ہے (لہذا آپؐ پر طعن وتشنیع کرنے والوں کو سزا دے گا)

(اے لوگو) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں۔

(یعنی رسول ہونے کی حیثیت سے اِن پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ جس حلال چیز کو تمہاری مروّجہ رسموں نے خواہ مخواہ حرام کر رکھا ہے اِس بارے میں اُس کا فیصلہ کر دیں اور عمل سے اُس کا باطل ہونا بھی ظاہر کر دیں یہی رسالت کا عین منصب بھی ہے)

اور (آپ) خاتم النبیّن ہیں۔ (چونکہ آپؐ کے بعد کوئی نبی و رسول

آنے والا نہیں ہے کہ معاشرہ کا کوئی قانون آپ کے زمانے میں نافذ ہونے سے رہ جائے تو بعد کا آنے والا رسول یا نبی یہ کمی پوری کر دے! لہذا یہ بات اور بھی ضروری تھی کہ اس جاہلی رسم کا خاتمہ آپؐ خود کر دیں اسکے بعد مزید تاکید کے لئے فرمایا گیا) اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے (یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اس رسم جاہلی کو ختم کرا دینا کیوں ضروری ہے اور ایسا نہ کرنے میں کیا حرج تھا۔ ولو بالفرض بعد آنے والے ائمہ یا مصلحین اس رسم کو توڑ بھی دیں گے تو ان میں سے کسی کا عمل بھی تمام انسانیت کے لئے نہ "اسوۂ حسنہ" قرار پاتا اور نہ دائمی و ابدی قانون بنتا کہ ہر زمانے میں لوگ اس کا اتباع کریں۔ اس لئے مذکورہ بالا مسئلہ نبی کے لئے تجویز کیا گیا)

(۲) ایک نازک امتحان :- پہلا واقعہ

تفسیر بحر محیط میں امام ابوحیانؒ نے بیان کیا کہ غزوۂ احزاب کے بعد بنو نضیر اور بنو قریظہ کی فتوحات اور اموال غنیمت کی تقسیم نے عام مسلمانوں میں ایک گونہ خوشحالی پیدا کر دی تھی۔ ان دونوں فتوحات میں بکثرت مال ہاتھ آیا تھا۔ اسی زمانے میں ازواج مطہرات رضؓ کو بھی خیال آیا کہ نبی کا گھر بھی اس سے مستفید ہونا چاہیئے۔ خرچ کی تنگی جو عرصے سے چل رہی تھی دور ہو جانی چاہیئے۔ پھر آپس میں مشورہ کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ قیصر و کسریٰ (روم و فارس کے بادشاہ) کی بیگمات طرح طرح کے زیورات اور قیمتی لباس میں ملبوس ہیں اور ان کی خدمت کے لئے کنیزیں ہیں اور ہمارا حال فقر و فاقہ کا ہے کیا ہمارا درجہ اُن سے بھی کم تر ہے کہ ہمیں ضروری خرچہ بھی میسر نہیں ہے۔ یا رسول اللہ ہمیں سال بھر کا خرچہ دے دیا جائے تاکہ سکون و اطمینان سے ہماری ضرورتیں پوری ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مطالبات پر خاموش تھے۔ حسنِ اتفاق سے حضرت ابو بکر صدیق رضؓ اور حضرت عمر فاروق رضؓ

نے اپنی صاحبزادی سیدہ حفصہ رضؓ کو سخت سُست کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ کرتی ہو اور وہ چیز طلب کرتی ہو جو آپؐ کے پاس موجود نہیں ہے۔ اسی صورت حال کے باعث آپ اپنی ازواج مطہرات سے ایک ماہ کے لئے علیحدہ بھی ہو گئے تھے۔ اس وقت حضور کے نکاح میں چار بیویاں تھیں۔ سیدہ سودہؓ، سیدہ عائشہؓ، سیدہ حفصہؓ، سیدہ امّ سلمہؓ ابھی حضرت زینبؓ سے حضور کا نکاح نہیں ہوا تھا۔ (احکام القرآن ابن العربی ج۳ ص۱۳)

جب یہ آیت نازل ہوئی کہ اے نبیؐ اپنی بیویوں سے کہدو کہ اگر تم دنیا اور اُسکی زیب و زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلاکر بھلے طریقے سے رخصت کردوں۔ اور اگر تم اللہ اور اُس کے رسول اور دار آخرت کو چاہتی ہو تو پھر جان لو کہ تم میں سے جو نیکوکار ہیں اللہ ان کے لئے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔ (احزاب آیت ۲۹)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے گفتگو کی اور فرمایا:-

اے عائشہؓ! میں تم سے ایک بات کہتا ہوں لیکن تم جواب دینے میں عجلت نہ کرنا بلکہ اپنے والدین سے مشورہ کرکے مجھے جواب دینا۔ اسکے بعد آپؐ نے انھیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آیا ہے اور تم سب کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ چاہے موجودہ زندگی پر قناعت کرکے نبی کی زوجیت کو پسند کریں یا پھر اپنا اپنا حق لیکر نبی کے گھر سے رُخصت ہو جائیں۔ اور آپؐ نے یہ آیت سنادی۔

اسپر سیدہ عائشہ صدیقہؓ نے فوری عرض کیا یا رسول اللہ بھلا یہ بات بھی مشورہ کرنے کی ہے اور میں اپنے والدین سے پوچھوں؟ میں نے تو اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کو اختیار کر لیا ہے۔ مجھکو مشورہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر مسرت کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ مجھکو تم سے یہی توقع تھی۔ اسکے بعد آپؐ نے باقی ازواج مطہرات سے بھی فرداً فرداً یہی بات فرمائی۔ سب نے

وہی جواب دیا جو سیّدہ عائشہ صدیقہ رضؓ نے دیا تھا۔

(مسند احمد، مسلم، نسائی، ترمذی)

قرآن حکیم نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے:۔

قرآنی مضمون

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا الخ۔ (احزاب آیت ۲۸ تا ۳۴)

اے نبیؐ آپ اپنی بیویوں سے فرما دیجئے (کہ تم سے دو ٹوک بات کہی جاتی ہے تاکہ ہمیشہ کے لئے بات ختم ہو جائے وہ یہ کہ) تم اگر دنیوی زندگی کا عیش اور اُس کی بہار چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ مال ومتاع دے دوں اور تم کو خوبی کے ساتھ رخصت کردوں (یعنی سنت کے مطابق طلاق دے دوں تاکہ جہاں چاہو جاکر دنیا حاصل کرلینا) اور اگر تم اللہ کو چاہتی ہو اور اُسکے رسول کو اور عالم آخرت (کے بلند درجات) کو تو تم میں سے نیک کرداروں کے لئے اللہ نے (آخرت میں) اجر عظیم مہیا کر رکھا ہے۔

اے نبی کی بیویو جو کوئی تم میں کُھلی ہوئی بیہودگی کرے گی (جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنگ و پریشان ہوں) اُسکو (اسپر آخرت میں) دوہری سزا دی جائیگی اور یہ بات اللہ کو آسان ہے۔

اور جو کوئی تم میں سے اللہ کی اور اُس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گی اور نیک کام کرے گی تو ہم اُس کو اُس کا ثواب (بھی) دوہرا دیں گے اور ہم نے اس کے لئے ایک خاص عمدہ روزی تیار کر رکھی ہے (جو جنت میں نبی کی ازواج کے لئے خاص ہے)

اے نبی کی بیویو تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم تقویٰ اختیار کرو۔ پس تم (ضرورت کے وقت نامحرم مردوں سے) دب کر بات نہ کرو کہ ایسے شخص کو خیال ہونے لگے جس کے دل میں خرابی و فساد ہے اور قاعدہ کے موافق بات کہو[1]۔

---

[1] عبدالقادر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ قرآن نے عورتوں کو یہ ادب سکھایا کہ کسی مرد سے بات کہو تو اسطرح کہو جیسے ماں کہے بیٹے کو اور بات کہی عمل اور معقول ہو۔

اور تم اپنے گھروں میں قرار پکڑو اور دکھلاتی نہ پھرو جیسا کہ دستور تھا زمانۂ جاہلیت میں آزاد پھرنے کا۔ اور تم نمازوں کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ کا اور اُس کے رسول کا کہنا مانو (کیونکہ) اللہ کو یہی منظور ہے (اے نبی کے گھروالو) تم سے معصیت و نافرمانی کی آلودگی کو دور رکھے اور تم کو (گناہوں سے) پاک صاف رکھے۔ اور تم اُن آیاتِ الٰہیہ (قرآن) کو اور اُسکے علم (احکام) کو یاد رکھو جس کا تمہارے گھروں میں چرچا رہتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ رازداں ہے پورا خبردار ہے۔

دوسرا[۲] واقعہ :-

سیدہ عائشہ صدیقہ رض فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر روز معمول تھا کہ عصر کی نماز کے بعد تمام ازواج کے گھر تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے جاتے اور خیر خیریت دریافت فرماتے۔

ایک دن سیدہ زینب بنت جحش رض کے گھر کچھ زیادہ دیر بیٹھ گئے ان کے ہاں کہیں سے شہد آیا ہوا تھا اور حضور کو شہد پسند بھی تھا۔ سیدہ زینبؓ نے آپؐ کی خدمت میں شہد پیش کیا اور آپ نوش فرمائے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رض کا بیان ہے کہ اس طرح یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن مجھے حضرت زینبؓ پر رشک آیا میں نے سیدہ حفصہؓ اور سیدہ سودہ رض اور صفیہؓ سے ملکر مشورہ کیا کہ اس تاخیر پر کس طرح بند لگانا چاہیئے۔ مشورہ میں یہ طے ہوا کہ جب آپ زینبؓ کے پاس سے واپس آئیں تو آپؐ سے یہ کہا جائے کہ یارسول اللہ آپؐ کے دہن مبارک سے مغافیر کی بُو آرہی ہے (یہ ایک قسم کا پھول ہوتا ہے جسمیں کچھ بساندسی بو آتی ہے۔ اور اگر شہد کی مکھی اس سے شہد حاصل کرے تو شہد کے اندر اس کا بساندپن بھی آجاتا ہے۔ اور یہ بات سب کو معلوم تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بُودار چیزیں پسند نہیں تھیں)

بہرحال آپ کو سیدہ زینبؓ کے گھر زیادہ ٹھیرنے سے روکنے

کیلئے یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ جب آپ دوسری بیوی کے گھر تشریف لائیں تو کہا جائے کہ آپؐ کے منھ سے آج بُو آرہی ہے۔ جب متعدد بیویوں نے ایسا کہا تو آپؐ نے عہد کرلیا کہ اب یہ شہد استعمال نہ کریں گے بلکہ قسم بھی کھالی۔ امام نسائیؒ کہتے ہیں کہ شہد کے معاملہ میں سیدہ عائشہؓ کی حدیث حدیثِ صحیح ہے۔ یہی رائے قاضی عیاضؒ، قاضی ابوبکر بن العربیؒ، امام نوویؒ، علامہ عینیؒ اور امام ابن کثیرؒ کی ہے۔

الغرض آپؐ نے حضرت زینبؓ کے گھر زیادہ ٹھہرنا ترک کردیا اور جو وہ شہد سے آپ کی تواضع کرتی تھیں وہ بھی ترک ہوگیا۔ اس طرح حضرت عائشہؓ وحفصہؓ وحضرت سودہؓ نے اپنا منشا پورا کرلیا۔ اِدھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی اور آپؐ پر احتساب کیا گیا کہ آپؐ نے محض اپنی بعض ازواج کی خاطر ایک حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کرلیا۔ حالانکہ یہ ایسی کوئی ضرورت نہ تھی اب آپؐ اپنی قسم کو توڑ دیں اور کفارہ ادا کریں۔ چنانچہ آپؐ نے اس آیت کے بعد اپنی قسم کو توڑ دیا اور کفارہ میں ایک غلام آزاد فرمایا۔ (درمنثور) از بیان القرآن۔

قرآنی مضمون

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ الخ.

(تحریم آیت ۱، ۲)

اے نبیؐ جس چیز کو اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے۔ آپ (قسم کھاکر) اُس کو اپنے اوپر کیوں حرام کرتے ہو (پھر وہ بھی) اپنی بیویوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے (جو کوئی ضروری نہ تھا) اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے لئے تمہاری قسموں کا کھولنا (یعنی قسم توڑنے کے بعد اُس کے کفارہ کا طریقہ) مقرر فرمادیا ہے اور اللہ تمہارا کارساز ہے اور وہ بڑا جاننے والا بڑی حکمت والا ہے۔

تیسرا۳ واقعہ:۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک مدت سے اس فکر میں تھا حضرت عمر فاروق رضؓ سے پوچھوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں وہ دو۲ بیویاں کون ہیں جن کے بارے میں قرآن حکیم نے یہ ارشاد فرمایا ہے:۔

اِنْ تَتُوْبَا اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا الآیۃ

(تحریم آیت ۴)

(اے نبی کی دونوں بیویو) اگر تم اللہ کے سامنے توبہ کرلو تو (بہتر ہے کیونکہ) تمہارے دل (اس طرف) مائل ہو رہے ہیں (کہ دوسری بیویوں سے ہٹا کر آپ کو اپنا ہی بنالیں)

لیکن حضرت عمرؓ کی ہیبت کی وجہ سے میری ہمت نہ پڑتی تھی. آخر وہ ایک مرتبہ حج کے لئے تشریف لے گئے میں بھی آپ کے ساتھ ہولیا اور درمیان راہ یہ سوال کیا جبکہ مجھے وضو کرانے کا موقع ملا تھا. حضرت عمرؓ نے جواب دیا ابن عباسؓ تعجب ہے یہ تم کو معلوم نہیں؟ میں نے کہا جی نہیں۔ فرمایا یہ دونوں عائشہؓ اور حفصہؓ تھیں. پھر تفصیل بیان کرنی شروع کی کہ ہم قریش کے لوگ اپنی بیویوں پر حاوی رہا کرتے تھے مگر جب ہم ہجرت کرکے مدینہ آئے تو ہمیں ایسے لوگ ملے جن پر اُن کی بیویاں حاوی تھیں (یعنی انصار مدینہ) یہاں آکر ہماری بیویوں نے بھی انصاری عورتوں کا یہ طریقہ سیکھ لیا۔

ایک روز میں اپنی بیوی سے کسی بات پر ناراض ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ مجھ کو پلٹ کر جواب دے رہی ہے. یہ طرز مجھکو بہت ناگوار معلوم ہوا. اسپر میری بیوی نے کہا آپ اس بات پر کیوں ناراض ہوتے ہو کہ میں نے آپ کو جواب دیا ہے! اللہ کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں بھی حضور کو دو بدو جواب دیا کرتی ہیں اور ان میں کوئی دن بھر آپ سے روٹھی بھی رہتی ہیں (بخاری کی روایت میں کہ حضور اکرم اس سے

دن بھر ناراض بھی رہتے ہیں)

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہ سنکر میں گھر سے نکلا اور اُمّ المومنین حفصہؓ کے گھر گیا (جو حضرت عمرؓ کی بیٹی اور حضور اکرمؐ کی بیوی ہیں) میں نے اُن سے پوچھا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوبدو جواب دیتی ہو؟ اُس نے کہا ہاں! میں نے پوچھا اور کیا تم میں سے کوئی دن دن بھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روٹھی رہتی ہو؟ اُس نے کہا ہاں! میں نے کہا پھر تو وہ نامراد ہوگئی اور خسارہ میں پڑگئی۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات سے بے خوف ہوگئی ہے کہ اپنے رسول کی ناراضی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اُس پر ناراض ہوجائے اور وہ ہلاکت میں پڑجائے! اے حفصہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ مطالبات کر اور نہ کسی بارے میں اصرار کیا کر اور نہ بات چیت بند کیا کر تجھ کو جو ضرورت پیش آئے آپؐ سے مانگ لیا کر، تو اس خیال میں نہ پڑ کہ تو اپنی سوکن (عائشہؓ) کے برابر ہوجائے اور اُس جیسا معاملہ کرے۔ کیونکہ عائشہؓ تجھ سے زیادہ خوبصورت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھ سے زیادہ محبوب ہے۔

اسکے بعد میں امّ سلمہؓ کے گھر پہنچا جو میری رشتہ دار تھیں اور میں نے اِن سے بھی وہی بات کی جو اپنی بیٹی حفصہؓ سے کی تھی۔ اُمّ سلمہؓ نے سنکر کہا ابن خطابؓ تم عجیب آدمی ہو ہر معاملے میں دخل دیتے ہو یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے بارے میں بھی دخل دینے لگے ہو؟

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اُمّ سلمہؓ کی اس بات نے میری ہمت پست کردی اور میں خاموش اپنے گھر چلا آیا۔ پھر ایسا ہوا کہ میرے ایک انصاری پڑوسی نے رات کے وقت میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دراصل ہم دونوں باری باری سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے ایک دوسرے کو اُس دن کی بات بتادیا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اہل مدینہ کو بادشاہ غسان کے اچانک حملہ کا ہر وقت خطرہ لگا ہوا تھا

اُس انصاری کے میرے دروازے پر پکارنے پر میں باہر نکلا تو اُس نے کہا ایک بڑا حادثہ پیش آگیا ہے۔ میں نے کہا کیا غسّان کا حملہ ہو گیا ہے؟ اُس نے کہا نہیں بلکہ اس سے بھی بہت بڑا حادثہ ہو گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ یہ سنتے ہی میری زبان سے نکلا حفصہؓ ناکام ہو گئی اور خسارہ میں پڑ گئی۔ مجھے پہلے ہی یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ یہ بات ہونے والی ہے۔ پھر میں نے فجر کی نماز مسجد نبوی میں ادا کی۔ نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک چھوٹے سے حجرے میں چلے گئے جو مسجد کے ایک جانب بنایا گیا تھا۔ میں سیدھا حفصہؓ کے گھر آیا دیکھا تو وہ رُو رہی تھی۔ میں نے کہا تم کیوں رو رہی ہو؟ میں نے کہا نہ تھا کہ تمہارے اس رویہ سے کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں طلاق نہ دے دیں!

کہنے لگیں مجھے علم نہیں لیکن آپؐ نے علیحدگی اختیار کر لیا ہے۔ میں مسجد نبوی واپس آیا دیکھا کہ چند لوگ منبر مسجد کے اطراف بیٹھے رو رہے ہیں میں بھی کچھ دیر بیٹھ گیا لیکن مجھ سے رہا نہ گیا اُٹھا اور آپؐ کے حجرے پر آیا اور دربان سے کہا میرے لئے اجازت حاصل کر۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنا چاہتا ہوں اُس نے آپؐ سے عمرؓ کی حاضری طلب کی لیکن آپؐ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس اطلاع پر حضرت عمرؓ پھر مسجد میں آگئے اور اُن لوگوں کے ساتھ بیٹھ گئے لیکن کچھ دیر بعد پھر دربان سے کہا کہ اب اجازت حاصل کر! غلام نے آپؐ سے عمرؓ کی اجازت طلب کی۔ اس دفعہ بھی جواب نہ ملا۔ جب لوٹ رہے تھے تو دربان نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اے عمرؓ ابھی ابھی اجازت دی ہے تشریف لائیے!

حضرت عمرؓ جب حجرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ کھجور کی چٹائی پر آپؐ لیٹے ہوئے ہیں درخت کی چھال کا ایک تکیہ ہے پہلو پر ریت کے نشان پڑ گئے ہیں میں نے سلام کیا۔ پھر عرض کیا یا رسول اللہؐ کیا

آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے ؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا نہیں!
پھر میں آپؐ سے اور قریب ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ! ہم قریشی لوگ
مکّہ میں اپنی عورتوں پر حاوی تھے جب ہم مدینہ آئے تو ہم کو ایسی قوم سے
سابقہ پڑا جو اپنی بیویوں سے مغلوب ہوجاتے ہیں اور ان کی بیویاں اُن پر
حاوی ہیں۔ یہی رنگ ہماری عورتوں نے بھی اختیار کرلیا ہے۔ اب وہ ہم
پر حاوی ہوگئی ہیں۔ یہ سنکر آپؐ نے تبسّم فرمایا۔ پھر میں نے کہا یا رسول اللہ
میں نے تو حفصہؓ سے کہدیا تھا کہ تم عائشہؓ کی نقل نہ کرنا وہ تو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم پر ناز کرتی ہیں اور تجھ سے زیادہ محبوب بھی ہے۔ اسپر
آپؐ نے دوبارہ تبسم فرمایا۔ پھر میری نظر حجرے کے اطراف پر پڑی دیکھا تو
صرف دو تین چیزیں حجرہ کا کل اثاثہ ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ
اپنی امّت کے لئے دُعا فرمائیے کہ اللہ اُنہیں کشادگی عطا کرے۔ یا
رسول اللہ ملک فارس اور روم کے لوگ جو اللہ کی عبادت نہیں کرتے اُنہیں
دُنیا کی فراخی اور کشادگی حاصل ہے۔ اسوقت آپ ٹیکہ لئے ہوئے تھے
اُٹھ بیٹھے اور فرمایا :-

أَوَ فِي شَكٍّ أَنْتَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ .

اے عمرؓ ابھی تم شک ہی میں پڑے ہوئے ہو؟

یہ وہ قومیں ہیں جن کی خوشحالی اُن کی حیاتِ دنیوی ہی میں دے دی گئی
ہے اور آخرت کا کوئی حصہ انمیں نہ ہوگا۔

میں نے کہا یا رسول اللہ مجھ سے خطا ہوگئی میرے لئے استغفار
فرمائیے۔ پھر میں واپس ہوگیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس بات
کی وجہ سے اپنی بیویوں سے علیحدہ ہی رہے جس کا اظہار حفصہؓ نے سیّدہ
عائشہؓ سے کیا تھا اس طرح یکماہ گزر گیا۔ انتیس[29] دن بعد آپ حجرۂ عائشہؓ
میں داخل ہوئے اور فرمایا کہ میں نے یکماہ جُدا رہنے کی قسم کھائی تھی اور
مہینہ پورا ہوگیا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ فرماتی ہیں کہ اس موقع پر آیت تخییر

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ الخ (احزاب آیت ۲۸)

نازل ہوئی جن کی تفصیل گزشتہ صفحات میں پہلا واقعہ کے ضمن آچکی ہے۔

(بخاری ج۲ ص۷۳۳، مسلم، ترمذی، نسائی، مسند احمد)

قرآن حکیم کی آیاتِ ذیل انہی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔

قرآنی مضمون

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا الخ

(تحریم آیت ۳ تا ۵)

(اور یہ معاملہ بھی قابل توجہ ہے کہ) جب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی کسی بیوی سے ایک بات چپکے سے فرمائی (وہ بات یہ تھی کہ میں زینبؓ کے گھر شہد کبھی نہیں پیوں گا) پھر جب اُس بیوی نے وہ بات (دوسری بیوی کو) بتلادی اور نبیؐ کو اللہ تعالیٰ نے (بذریعہ وحی) اُس بات کی خبر کردی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (اُس ظاہر کردینے والی بیوی کو تھوڑی بات تو جتلادی (کہ تو نے ہماری یہ بات دوسری بیوی سے کہدی) اور تھوڑی بات کو نبی ٹال گئے (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کرم اس درجے تک ہے کہ اپنے حکم کے خلاف کرنے پر جو شکایت کرنے بیٹھے تو شکایت کے وقت بھی پوری باتوں کا اعادہ نہیں کیا کہ تو نے میری یہ بات بھی کہدی وغیرہ۔ اگر آپ ایسا کرتے تو اُس بیوی کو یقیناً زیادہ شرمندگی ہوتی) سو جب نبیؐ نے اُس بیوی کو وہ بات جتلائی تو وہ کہنے لگی کہ آپؐ کو اسکی کس نے خبر کردی ہے؟ آپؐ نے فرمایا مجھکو اُس ذات نے خبر دی جو سب کچھ جانتا (اور) باخبر ہے۔

اے نبی کی دونوں بیویو اگر تم اللہ کے سامنے توبہ کرلو تو (بہتر ہے) کیونکہ تمہارے دل اس طرف مائل ہو رہے ہیں کہ (دوسری بیویوں سے ہٹا کر آپ کو اپنا ہی بنالیں۔ لیکن چونکہ اسمیں دوسری بیویوں کے حقوق کا نقصان اور دل شکنی ہے اس لئے توبہ کرنی ضروری ہے) اور اگر (اسی طرح نبی کے مقابلہ میں تم دونوں کارروائیاں کرتی رہیں تو

(یاد رکھو کہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا رفیق اللہ ہے جبرئیل ہیں اور نیک مسلمان ہیں اور ان کے علاوہ فرشتے (بھی آپ کے) مددگار ہیں (مطلب یہ کہ تمہاری ان سازشوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی نقصان نہیں ہے بلکہ تمہارا خود اپنا نقصان ہوگا۔ اور اے نبی کی بیویو تم یہ وسوسہ دل میں نہ لانا کہ آخر تو مرد کو بیویوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم سے بہتر عورتیں کہاں ہیں اس لئے چار و ناچار ہماری سب باتیں سہی جائیں گی۔ سو یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ) اگر پیغمبر تم عورتوں کو طلاق دے دیں تو اُن کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے اُن کو تم سے اچھی بیویاں دے دیگا جو اسلام والیاں، ایمان والیاں، فرمانبرداری کرنے والیاں، توبہ کرنے والیاں، عبادت کرنے والیاں، روزہ رکھنے والیاں، شوہر دیدہ بھی اور کنواریاں بھی ہوں گی (یعنی سیرت وصورت کے اعتبار سے ہر طرح کامل ومکمل فراہم کرنے پر قادر ہے)

زوجین کے خانگی معاملات بعض اوقات ابتداءً بہت معمولی اور حقیر نظر آتے ہیں لیکن اگر ذرا باگ ڈور ڈھیلی چھوڑ دی جائے تو آخر کار نہایت خطرناک اور تباہ کن صورت اختیار کر لیتے ہیں خصوصاً جب عورت کسی اونچے گھرانے کی ہو تو اس کو طبعاً اپنے باپ بھائی اور خاندان پر بھی گھمنڈ ہو سکتا ہے۔

قرآن حکیم نے ازدواجی زندگی کے اس مخفی گوشے پر متنبہ کر دیا کہ اے نبی کی بیویو اگر تم دونوں اس طرح کارروائیاں کرتی رہیں تو یاد رکھو ان حرکات سے اللہ کے نبی کو کچھ ضرر نہ ہوگا۔ کیونکہ اللہ اور فرشتے اور نیک بخت ایماندار درجہ بدرجہ جس کے رفیق و مددگار ہوں اُنکے سامنے کوئی انسانی تدبیر کامیاب نہیں ہو سکتی البتہ تم کو خود نقصان پہنچ جانے کا امکان ہے۔

حَدیثِ اِفک ؁ھ

(جھوٹی تہمت)

بُہتانِ عظیم سلسلۂ غزوات میں ایک غزوۂ بنی المُصْطَلِق جس کا دوسرا نام غزوہ مُرَیسِیع بھی ہے۔ اس حیثیت سے مشہور و معروف ہے کہ اسمیں منافقین نے ایک خطرناک فتنہ برپا کیا تھا اور فتنہ بھی ایسا شدید کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جانثار صحابہ کے کمال درجہ ضبط وتحمل کا نشان بن گیا۔ یہ سیّدہ عائشہ صدیقہ رضؓ پر تہمت والزام کا فتنہ تھا جس کی تفصیل خود سیدہ عائشہ صدیقہ رضؓ اپنی زبان سے بیان فرماتی ہیں۔ حدیث کی مستند ومعتبر کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے:۔

"ماہِ شعبان ۵ھ یا ۶ھ میں قبیلہ بنی مصطلق کے سردار حارث بن ضرار کی فتنہ سامانیوں کی وجہ سے یہ غزوہ پیش آیا۔ منافقینِ مدینہ کا یہ دستور بن گیا تھا کہ جس غزوہ میں فتح ونصرت کے آثار محسوس کرتے اس میں مالِ غنیمت کے لالچ سے ضرور شریک ہو جاتے۔ چنانچہ اس غزوہ بنی مصطلق میں یہ منافق اتنی کثرت سے شامل ہو گئے تھے کہ مؤرخ ابن سعد کا بیان ہے کہ اس سے پہلے اتنی بڑی تعداد کسی اور غزوہ میں شریک نہ تھی۔

قبیلہ بنو مصطلق (مشہور قبیلہ بنو خُزاعہ کی ایک شاخ تھی) جو ساحل بحر احمر پر جدّہ اور رابغ کے درمیان قُدید کے علاقے میں آباد تھے۔ اس قبیلہ کے چشمے کا نام مُرَیسِیع تھا۔ اس مناسبت سے کتب احادیث میں اسپر فوج کشی کا نام غزوہ مُرَیسِیع بھی بیان کیا گیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ماہ شعبان ۶ھ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ قبیلہ بنو مصطلق کے لوگ مدینہ منورہ پر حملہ کرنیکی تدبیر کر رہے ہیں اور اس مہم میں دوسرے قبائل کو بھی شریک کر رہے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک لشکر لیکر اس جانب روانہ ہو گئے تاکہ اس فتنہ کو سر اُٹھانے سے پہلے ہی کچل دیا جائے۔ مسلمانوں کے ساتھ عبداللہ بن اُبَی بھی اپنے

منافق دوستوں کی ایک بڑی تعداد لے کر شامل ہوگیا، مُریسیع کے مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن پر اچانک حملہ کر دیا اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد پورے قبیلے کو مال و اسباب کے ساتھ گرفتار بھی کر لیا، ابھی اسلامی لشکر مُریسیع پر موجود تھا کہ منافقین نے پانی پر ایک مصنوعی جھگڑا پیدا کر دیا اور انصار مدینہ کو یہ کہہ کر بھڑکانا شروع کیا۔ یہ مہاجرین جنکو تم نے اپنے شہر مدینہ میں لاکر بسایا اور اپنے مال و جائیداد کا حصہ دار بنایا آج تم پر غلبہ رکھتے ہیں اور تم پر سر اٹھاتے ہیں اگر تم ان کا ہاتھ نہ پکڑتے تو آج یہ ہم پر کیوں بھاری ہوتے؟ اس قسم کی بکواس کرکے مہاجرین اور انصار میں انتشار پیدا کرنا چاہا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی عقل و فراست نے اسکے مکر و فریب کو ناکام کر دیا اور پانی کا جھگڑا ختم ہوگیا۔ عبداللہ بن اُبیّ (رئیس المنافقین) اس ناکامی سے آگ بگولہ ہوگیا اور اس موقع پر اسکی ناپاک زبان سے وہ کلمۂ کفر نکلا جس کی نقل قرآن حکیم نے ظاہر کی ہے:۔

"قسم کھا کر کہنے لگا، مدینہ پہنچنے کے بعد جو ہم میں عزت والا ہے (یعنی منافقین) وہ ذلیل لوگوں (یعنی مسلمانوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو نکال باہر کر دے گا۔" (سورہ منافقون آیت ۸)

اُس کی اِن بیہودہ باتوں کی اطلاع جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو حضرت سیدنا عمر رضؓ نے مشورہ دیا کہ اس شخص کو قتل کروا دینا چاہیئے مگر آپؐ نے فرمایا اے عمر رضؓ کافر لوگ کہیں گے کہ محمدؐ خود اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔ پھر آپؐ نے اس مقام سے فوری کوچ کرنے کا حکم دیا۔

جب اس غزوہ سے واپس ہو رہے تھے تو درمیانِ راہ شب میں ایک مقام پر پڑاؤ کیا۔ روایت بخاری کے مطابق خود سیدہ عائشہ صدیقہ رضؓ اس "بہتانِ عظیم" کی تفصیل اس طرح بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب آپؐ سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی ازواج کے درمیان قرعہ ڈال کر فیصلہ فرماتے جس کا نام آجاتا اس کو سفر میں ساتھ لیجاتے۔

غزوہ بنی المصطلق کے موقع پر قرعہ میرے نام نکلا اور میں آپؐ کے ساتھ ہوگئی۔
یہ وہ زمانہ تھا کہ پردے کے احکام نازل ہو چکے تھے مجھکو ہودج پر سوار کر دیا جاتا تھا اور منزل پر اُتار دیا جاتا تھا۔ اس طرح یہ سفر پورا ہوا۔ واپسی میں جب ہم مدینہ منورہ کے قریب تھے کہ ایک منزل پر رات کے وقت پڑاؤ کیا گیا اور ابھی رات کا کچھ حصّہ باقی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوچ کا اعلان کر وایا۔ میں نیند سے اُٹھکر رفع حاجت کے لئے کچھ دور چلی گئی اور پھر واپس ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے گلے کا ہار گر گیا ہے۔ میں اسکی تلاش میں پھر لوٹ گئی اتنی دیر میں قافلہ روانہ ہوگیا۔ قاعدہ یہ تھا کہ کوچ کے وقت میں اپنے ہودج میں بیٹھ جاتی اور مقرر شدہ چار آدمی اُسکو اُٹھاکر اونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ اُس زمانے کی عورتیں ہلکی پھلکی ہوتی تھیں۔ ہودج اُٹھانے والوں کو احساس نہیں ہوا کہ میں ہودج میں موجود نہیں ہوں اُن لوگوں نے میرے ہودج کو اونٹ پر رکھ دیا اور قافلہ روانہ ہوگیا اور وہ لوگ یہ سمجھتے رہے کہ میں ہودج میں موجود ہوں ویسے بھی میں نوعمر لڑکی تھی جس کا کوئی خاص وزن نہ تھا، ادھر قافلہ روانہ ہوگیا اُدھر میں اپنا ہار ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے اپنی منزل پر پہنچی تو اپنا گم شدہ ہار اُسی جگہ پایا لیکن قافلہ روانہ ہو چکا تھا۔ میں نے ہمت مضبوط کی اور خیال کیا کہ آگے جاکر جب لوگوں کو معلوم ہوگا تو یقیناً وہ میری تلاش میں واپس آئیں گے۔ لہٰذا مجھکو اسی مقام پر ٹھیر جانا چاہیئے۔ چنانچہ میں چادر اوڑھکر بیٹھ گئی لیکن مجھ کو نیند آگئی اور میں اُسی جگہ سوگئی۔

صبح کے وقت صفوان بن معطل سُلمی اس جگہ سے گزرے جہاں میں سو رہی تھی اور مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے کیونکہ پردے کا حکم آنے سے پہلے وہ مجھکو دیکھ چکے تھے اُنھوں نے اونچی آواز سے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہا۔ ان کی آواز پر میں بیدار ہوگئی اور میں نے اپنے منھ پر چادر ڈال لی۔ اُنھوں نے مجھ سے کچھ بھی نہیں پوچھا اور اپنا اونٹ میرے سامنے

لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان بن معطلؓ کو اس خدمت پر مقرر کیا تھا کہ وہ قافلہ کے پیچھے رہیں تاکہ کوچ کے وقت کوئی چیز چھوٹ گئی ہو تو اُسے لیتے آئیں۔

بٹھا دیا اور الگ ہٹکر کھڑے ہوگئے میں اُس اونٹ پر سوار ہوگئی اور وہ نکیل پکڑ کر چلنے لگے۔ دوپہر کے قریب ہم نے لشکر کو پالیا جبکہ وہ دھوپ کی وجہ سے درختوں کے نیچے آرام کر رہے تھے۔ بس یہی وہ واقعہ تھا کہ جس کے نصیب میں ہلاک ہونا تھا وہ ہلاک ہوا اور اسپر تہمت و الزام کی تعمیر کی گئی اور اس کا معمار رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبیّ تھا۔

مگر میں اُس وقت اس سے بے خبر تھی کہ میرے بارے میں کیا کیا افواہیں پھیل رہی ہیں۔ الغرض مدینہ منورہ پہنچکر میں بیمار ہوگئی اور تقریباً یکماہ بیمار رہی۔ اس عرصے شہر میں مختلف افواہیں گشت کر رہی تھیں اور میں اس سے بالکل بے خبر تھی نہ مجھکو کسی نے بتایا اور نہ مجھے کبھی خیال آیا۔ البتہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ توجہ اور عنایت جو آپ مجھ سے فرمایا کرتے تھے اس علالت کے زمانے میں بہت کم محسوس کرتی تھی۔ آپؐ تشریف لاتے اور سلام کے بعد پوچھتے کہ اب کیا حال ہے؟ اس کے بعد آپؐ لوٹ جاتے۔ مجھکو اپنی بیماری اور کمزوری کے باعث آپؐ کے اس طرز عمل پر غور و فکر کرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔ میں بیماری سے بہت کمزور ہو چکی تھی۔ اُس زمانے میں ہمارے گھروں کے اندر بیت الخلاء نہیں ہوا کرتے تھے۔ عورتیں رات کے وقت جنگل میں رفع حاجت کیا کرتی تھیں۔ انہی دنوں ایک رات میرے ساتھ مسطحؓ بن اُثاثہ کی ماں بھی تھیں جو میرے والد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی خالہ زاد بہن ہوتی تھیں (ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے خاندان کی کفالت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے ذمّے لے رکھی تھی مگر اس احسان کے باوجود مسطحؓ بھی اُن لوگوں میں شریک ہوگئے تھے جو سیّدہ عائشہ صدیقہ رضؓ کے خلاف بدترین تہمت کو پھیلا رہے تھے) چلتے چلتے مسطحؓ کی ماں کو ٹھوکر لگی اور بے ساختہ اُن کی زبان سے "تَعِسَ مِسْطَحٌ" نکلا (اللہ مسطح کو غارت کرے) سیدہ عائشہ صدیقہ رضؓ فرماتی ہیں کہ مجھکو اس بد دُعا پر تعجب ہوا اور میں نے کہا تم نے بُرا کہا اور وہ بھی ایسے شخص کو جو غزوۂ بدر میں حصہ لیا تھا! اسپر اُنھوں نے کہا بیٹی

تجھے اُسکی باتوں کی کچھ خبر بھی ہے؟ میں نے کہا کیا بات ہے؟ پھر اُنھوں نے سارا قصہ سُنایا کہ افترا، پرداز لوگ اور منافقین میرے متعلق کیا کیا افواہیں اُڑا رہے ہیں (منافقین کے علاوہ مسلمانوں میں تو ایک تو یہی مسطح بن اثاثہ رضؓ، حسّان بن ثابت رضؓ، حمنہ بنت جحش رضؓ (ام المؤمنین حضرت زینبؓ کی بہن) بھی ان منافقوں کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے)

یہ داستان سُنکر میں دم بخود رہ گئی اور میرا مرض بڑھ گیا۔ میں گھر واپس ہوئی اور ساری رات رونے میں گزری۔ دوسرے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر تشریف لائے جیسا کہ آپ کا معمول تھا میری خیریت پوچھی میں نے کہا مجھکو آپ اجازت دیں کہ میں اپنے ماں باپ کے گھر جاؤں۔ آپؐ نے اجازت دے دی۔ دراصل میں اپنے والدین سے حقیقتِ حال معلوم کرنا چاہتی تھی۔ گھر آکر میں نے اپنی والدہ اسمار بنت عُمیسؓ سے پوچھا اماں جان لوگ میرے بارے میں کیا افواہ اُڑا رہے ہیں میں جاننا چاہتی ہوں؟ میری ماں نے کہا بیٹی! ایسی باتوں پر توجہ نہ دو اکثر ایسا ہوا ہے کہ کسی کی کئی ایک بیویاں ہوں اور اُن میں کوئی حسین وجمیل ہو تو اُس کے خلاف دوسری بیویاں مختلف شرارتیں کیا کرتی ہیں۔ بیٹی اس وقت تیرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو رہا ہے۔ میں نے کہا سبحان اللہ! یہ صرف معمولی سی بات ہے؟ جبکہ شہر مدینہ ان افواہوں سے گونج رہا ہے۔ یہ کہہ کر میں الگ ہو گئی نہ میرا رونا بند ہوا نہ مجھے نیند آئی۔

میرے پیچھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسامہ بن زیدؓ اور علی بن ابی طالبؓ سے مشورہ طلب کیا کہ عائشہ رضؓ کے بارے میں مجھے کیا فیصلہ کرنا چاہیئے؟ کیونکہ وحی الٰہی اس بارے میں خاموش ہے۔

حضرت اُسامہ رضؓ نے تو میرے بارے میں حُسنِ ظن کا اظہار کیا اور کہا یا رسول اللہ آپ کی بیوی عائشہ رضؓ میں سوائے خیر کے اور کچھ تصور نہیں کیا جا سکتا (یقیناً یہ اُنپر جھوٹی تہمت ہے)

لیکن علی بن ابی طالبؓ نے کہا یا رسول اللہ عورتوں کی کمی نہیں ہے

اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر نکاح کے بارے میں کوئی تحدید مقرر نہیں کی ہے (آپؐ دوسرا نکاح کرلیں) اور اگر آپ تحقیق ہی کرنا چاہیں تو عائشہؓ کی خدمت گزار باندی سے حالات دریافت فرمائیں وہ آپ کو سچ سچ بیان کردے گی۔ چنانچہ خادمہ کو طلب کیا گیا اور اُس سے پوچھا گیا اُس نے کہا اللہ کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر مبعوث کیا ہے میں نے عائشہؓ میں کوئی بُرائی نہیں دیکھی جس سے اُن کی پاک دامنی پر حرف آئے۔ بس عیب اتنا ہے کہ میں آٹا گوندکر کسی کام سے باہر جاتی ہوں اور جاتے وقت عائشہؓ سے کہے جاتی ہوں کہ بی بی ذرا آٹے کا خیال رکھیں مگر وہ سو جاتی ہیں اور بکری آکر آٹا کھاجاتی ہے (اس بات کے سوا اور کوئی عیب میں نے اُن میں نہیں دیکھا)

اسی روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

"مسلمانو! کون ہے جو اُس شخص (منافق عبد اللہ بن اُبیّ) کے حملوں سے میری عزّت بچائے جس نے میرے گھر والوں پر الزام لگاکر مجھکو اذیت دینے میں انتہا کردی ہے! اللہ کی قسم میں نے نہ اپنی بیوی عائشہؓ میں کوئی بُرائی دیکھی ہے اور نہ اُس شخص (صفوان بن معطل) میں جس کے متعلق تہمت لگائی جاتی ہے۔ وہ تو کبھی کسی وقت میری غیر موجودگی میں میرے گھر بھی نہیں آیا۔"

اس خطبہ پر حضرت اُسید بن حُضیرؓ اور بعض روایات میں سعد بن معاذؓ نے اُٹھ کر کہا یارسول اللہ! اگر وہ تہمت لگانے والا ہمارے قبیلے اوس کا آدمی ہے تو آپؐ اس کا نام ظاہر فرمائیں ہم اس کی گردن مار دیتے ہیں، اور اگر ہمارے پڑوسی قبیلہ خزرج کا آدمی ہے تو آپ جو حکم دیں ہم اس کی تعمیل کریں گے! یہ سنتے ہی قبیلہ خزرج کے رئیس سعد بن عبادہؓ اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے تم جھوٹ کہتے ہو تم ہرگز اسے نہیں مار سکتے تم اپنے قبیلے کی حمایت میں ہمارے قبیلے کا نام لیتے ہو۔ حضرت اُسید بن حُضیرؓ نے جواب دیا اے سعدؓ تم جھوٹ کہتے ہو ہم ایسے آدمی کو

ضرور قتل کر دیں گے۔ تم منافقت کرتے ہو۔ اس پر مسجد نبوی میں ہنگامہ جیسا ہو گیا۔ قبیلۂ اوس اور قبیلۂ خزرج کے لوگ آپس میں اُلجھ گئے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما تھے۔ آپؐ نیچے اُتر آئے اور دونوں قبیلوں کو خاموش کیا۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضہ فرماتی ہیں کہ اس بہتان کی افواہیں پھیلتی رہیں اور میرا وہی حال تھا نہ نیند تھی نہ چین تھا سارا دن اور ساری رات رونے میں گزری حتیٰ کہ خود مجھکو احساس ہونے لگا کہ میرا یہ رونا میرے جگر کو کھا جائے گا۔ میرے والدین میرے ساتھ رنج وغم میں مبتلا رہے۔ ایک انصاری عورت بھی میرے رونے میں شریک ہو گئی۔ آخر کار ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھ گئے۔ اس پوری مدت میں آپؐ کبھی میرے پاس نہ بیٹھے تھے۔ اِن افواہوں کو ایک ماہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ اس پوری مُدت میں وحی الٰہی نے بھی میرا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ میرے ماں باپ (ابو بکر صدیق رضہ اور اُم رومان رضہ) بھی اس وقت میرے قریب بیٹھ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اوّل اللہ کی حمد و ثنا کہی پھر مجھ سے مخاطب ہوتے، فرمایا:۔

"اے عائشہ رضہ مجھکو تمہارے بارے میں ایسی اور ایسی خبریں پہنچی ہیں۔ اگر تم بے گناہ ہو تو اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری برآت ظاہر فرما دے گا۔ اور اگر واقعی تم سے کسی گناہ کا ارتکاب ہو گیا ہو تو اللہ تعو کی جناب میں توبہ کرو اور معافی چاہو، بندہ جب اپنے گناہ کا اعتراف کر کے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سنکر میرے آنسو خشک ہو گئے میں نے اپنے والد (ابو بکر صدیق رضہ) سے عرض کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب دیں!

اُنھوں نے کہا بیٹی میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں؟

میں نے اپنی والدہ سے کہا اماں جان! آپ ہی جواب دیں!

اُنھوں نے بھی یہی کہا کہ بیٹی میں حیران ہوں کیا جواب دوں ؟ بس اس پر میری جرأت بڑھ گئی اور میں نے کہنا شروع کر دیا حالانکہ میں ایک کم عمر لڑکی تھی قرآن بھی زیادہ نہ جانتی تھی میں نے کہا :۔

"آپ لوگوں کے کان میں ایک بات پڑگئی اور دلوں میں بیٹھ چکی ہے اب اگر میں کہوں کہ میں بے گناہ ہوں۔ اور یقیناً اللہ گواہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں تو آپ لوگ ہرگز یقین نہیں کریں گے۔

اور اگر میں ایک ایسی بات کا اعتراف کر لوں جو میں نے نہیں کی ہے۔ اور یقیناً اللہ جانتا ہے کہ میں نے نہیں کیا ہے تو آپ لوگ مان لیں گے۔ اس صورتِ حال میں میرے لئے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہی بات کہوں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے والد نے کہی تھی (فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ) (یوسف آیت ۱۸) (اس وقت مجھے حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام یاد نہیں آیا) یہ کہہ کر میں لیٹ گئی۔ پھر میرے دل میں شدت سے یہ احساس پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ بہت جلد میری پاک دامنی ظاہر کر دے گا۔ اگرچہ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میرے بارے میں قرآن نازل ہوگا جو قیامت تک پڑھا جائے گا۔ میں اپنی ذات کو اس قابل بھی نہیں سمجھتی تھی کہ اللہ تعالیٰ خود میری طرف سے وکیل بن کر میری پاک دامنی بیان کرے گا۔ میرا زیادہ سے زیادہ یہ احساس تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی خواب دیکھیں گے جس میں اللہ تعالےٰ میری برارت ظاہر فرما دے گا۔ بس۔

اتنے میں یکایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ کیفیت طاری ہوگئی جو وحی نازل ہوتے وقت ہوا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ سخت سردی کے زمانے میں آپ کی پیشانی سے موتی کی طرح پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ ہم سب خاموش ہوگئے۔ میں تو بالکل مطمئن تھی لیکن میرے والدین کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ وہ ڈر رہے تھے کہ دیکھیئے اللہ تعالیٰ کیا حقیقت کھولتا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ کیفیت جاتی رہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے حد خوش تھے۔ آپؐ نے مسکراتے ہوئے جو پہلی بات کہی وہ یہ تھی:۔
اے عائشہ رضؓ مبارک ہو اللہ تعالیٰ نے تمہاری پاک دامنی نازل کر دی ہے۔"

پھر آپؐ نے نازل شدہ آیات تلاوت فرمائی۔ میری ماں نے کہا بیٹی اٹھو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ ادا کرو! میں نے کہا واللہ میں کسی کا شکریہ ادا نہیں کروں گی سوائے اپنے اللہ عزّوجل کے جس نے میری پاک دامنی نازل فرمائی ہے آپ لوگوں نے تو اس بہتان کا انکار تک نہیں کیا تھا۔" (بخاری ج ۱ ص ۳۶۳)

سیدہ عائشہ صدیقہ رضؓ کی پاک دامنی میں دس آیات یہ ہیں جو اُس وقت نازل ہوئی تھیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ (النور آیت ۱۱ تا ۲۱)

قرآنی مضمون جن لوگوں نے یہ طوفان (حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی نسبت) برپا کیا ہے (اے مسلمانو) وہ تم میں کا ایک چھوٹا گروہ ہے۔ تم اس طوفان کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو بلکہ یہ (باعتبار انجام کے) تمہارے حق میں بہتر ہی بہتر ہے (کیونکہ اس غم سے تم کو اجر عظیم ملا) اُس گروہ میں سے ہر شخص کو جتنا کسی نے کچھ کیا تھا گناہ ہوا اور ان میں سے جس نے اس طوفان میں سب سے بڑا حصہ لیا (عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین) اُس کو سب سے بڑھکر سزا ہو گی (مراد عذاب جہنم ہے)

جب تم لوگوں نے یہ تہمت سُنی تھی تو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے نیک گمان کیوں نہ کیا اور کیوں نہ کہدیا کہ یہ کھلا بہتان ہے۔

وہ لوگ اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ کیوں نہ لائے (جو بدکاری کے ثبوت کے لئے ضروری ہیں)

اب جبکہ وہ گواہ نہ لائے ہیں تو اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔

اگر تم لوگوں پر (اے مسلمانو) اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا دنیا اور آخرت میں تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے ان کی پاداش میں تم پر سخت عذاب واقع ہو جاتا (یعنی وہ چند سادہ دل مسلمان جو اس افواہ میں ملوث ہو گئے تھے [illegible] بیبہ کی جارہی ہے۔ مردوں میں حسان بن ثابت رضؓ اور مسطح بن اثاثہ رضؓ عورتوں میں حمنہ بنت جحش رضؓ غیر شعوری طور پر منافقوں کا ساتھ دے رہے تھے اور جنھوں نے بعد میں توبہ کرلی) (ذرا غور تو کرو اُس وقت تم کیسی سخت غلطی کر رہے تھے) جبکہ تمہاری زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی چلی جارہی تھی اور تم اپنے منھ سے وہ سب کچھ کہے جا رہے تھے جس کا تمہیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے۔ حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑی بات تھی (یعنی گناہِ عظیم) اے مسلمانو تم نے اس افواہ کو سُنتے ہی کیوں نہ کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا۔ سبحان اللہ یہ تو ایک بہتان عظیم ہے۔

اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا اگر تم مومن ہو اللہ تمہیں صاف صاف ہدایت دیتا ہے اور اللہ علم والا حکمت والا ہے۔

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں فحش پھیلے وہ دنیا و آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

اور اگر اللہ کا فضل اور اُس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا شفیق و رحیم ہے (تو پھر یہ چیز جو ابھی تمہارے اندر پھیلائی گئی تھی بدترین نتائج ظاہر کر دیتی)

اے ایمان والو! شیطان کے نقش قدم پہ نہ چلو اور جو کوئی اسکی پیروی کرے گا تو وہ اُسکو فحش و بدکاری ہی کا سبق دے گا اور اگر اللہ کا فضل اور اُس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی شخص پاک نہ ہوتا۔ مگر اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

آیاتِ مذکورہ میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضؓ کی کامل مکمل برأت اور انکی عِفت و پاکدامنی

کی وضاحت کے علاوہ منافقین خاص طور پر رئیس المنافقین عبد اللہ بن اُبی کی شرارت اور منافقت کا تذکرہ ملتا ہے اور اُن چند نیک دل مسلمانوں کو تنبیہ اور نصیحت کا سبق دیا گیا جو سادہ لوحی کی وجہ سے منافقین کا ساتھ دے رہے تھے۔ نزول آیات کے بعد تہمت لگانے والوں کو شرعی قانون کے تحت حدِ قذف (تہمت کی سزا) جاری کی گئی ہر ایک کو اسّی اسّی کوڑے لگائے گئے۔

مسند بزار اور مسند ابن مردویہ میں حضرت ابوہریرہ رضؓ کی روایت ملتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مسلمانوں پر حد قذف جاری کروائی۔ مسطح بن اثاثہ رضؓ، حسان بن ثابت رضؓ، حمنہ بنت جحش رضؓ، اور طبرانی نے حضرت عمر فاروق رضؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن اُبی منافق پر جو اس تہمت کا بانی مبانی تھا دوہری حد جاری فرمائی، پھر مؤمنین نے توبہ کرلی اور منافقین اپنے حال پر قائم رہے۔ (بیان القرآن)

نتائج و عِبَر

مزاجِ مُسلم

حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضؓ پر منافقین کے علاوہ جن سادہ لوح مسلمانوں نے تہمت میں حصہ لیا اُن میں حضرت مسطح بن اثاثہؓ اور حضرت حسان بن ثابت رضؓ ہیں۔ یہ دونوں بدری صحابی ہیں مگر اِن سے ایک لغزش ہوگئی پھر اِن دونوں نے سچی توبہ بھی کرلی تھی۔ حضرت مسطح رضؓ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے رشتہ دار تھے اور غریب و مفلس بھی۔ حضرت صدیق اکبرؓ اُن کی اور اُن کے اہل خاندان کی مالی امداد کیا کرتے تھے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضؓ فرماتی ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے میری پاک دامنی نازل فرمائی تو میرے والد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے قسم کھالی کہ وہ آئندہ سے مسطح رضؓ کی امداد نہ کریں گے کیونکہ اُنھوں نے نہ رشتہ داری کا پاس و لحاظ کیا نہ احسان و صلہ رحمی کا خیال کیا، اس طرح اُن کی مالی امداد بند کردی۔

اس واقعہ کے بعد قرآن حکیم کی یہ آیت نازل ہوئی:۔

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ۔ الخ (النور آیت ۲۲)

تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور حیثیت والے ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ اپنے رشتہ دار اور مساکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے۔ انھیں معاف کر دینا چاہیئے اور درگزر کرنا چاہیئے! کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کر دے؟ اور اللہ مغفرت والا رحمت والا ہے۔"

اس آیت کو سنتے ہی سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ نے کہا بَلَىٰ وَاللَّهِ إِنَّا نُحِبُّ أَنْ تَغْفِرَ لَنَا يَا رَبَّنَا (واللہ ہم ضرور چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہماری خطائیں معاف کی جائیں۔)

چنانچہ آپؓ نے مسطح رضؓ کی مالی مدد جاری کردی اور پہلے سے زیادہ ان پر احسان کرنے لگے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کی ایک روایت ہے کہ اس طرح کی قسم حضرت ابوبکر صدیقؓ کے علاوہ بعض اور صحابہ نے بھی کھالی تھی کہ جن جن لوگوں نے اس بہتان میں حصہ لیا تھا اُن کی وہ کوئی مدد نہیں کریں گے۔ اس آیت کے نزول کے بعد سب نے اپنے عہد سے رجوع کرلیا۔

اللہ اور اُسکے رسول کی اطاعت میں اخلاق و کردار کی یہ بلندی عالمِ انسانیت کیلئے لازوال نمونہ ہے۔

عزتِ مُسلم

کسی پاک دامن مرد یا عورت کو بدکاری (زنا) کی تہمت لگانا قرآن حکیم نے بدترین گناہ قرار دیا ہے اور ایسی تہمت لگانے والے کو بدترین گناہگار کہا گیا ہے اور اس کے لئے قرآن حکیم نے اپنا "قانونِ قذف" جاری کیا ہے (قانونِ تہمت) یہ قانون اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (النور آیت ۴)

جو لوگ تہمت لگائیں پاک دامن عورتوں کو (زنا کی) اور پھر چار
(چشم دید) گواہ پیش نہ کر سکیں تو (ایسی تہمت لگانے والوں کو) اسّی دُرّے
لگاؤ اور (آئندہ) کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو اور ایسے ہی لوگ بدکار ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک مسلمان مرد اور مسلمان عورت کی عزت کے تحفظ کا کس قدر اہتمام کیا گیا ہے کہ ایسے بدترین جرم کو منسوب کرنے کے لئے ایک دو نہیں پورے چار گواہ پیش کرنا ضروری ہیں اور چاروں کے چاروں چشم دید گواہ ہوں۔ اگر ان میں صرف ایک چشم دید گواہ نہیں ہے باقی چشم دید گواہ ہوں تو چاروں پر حدِ قذف تہمت کی سزا جاری کی جائیگی۔ یعنی اسّی اسّی کوڑے اُن کی پُشت پر لگادیئے جائیں گے اور اسی پر بس نہ ہوگا بلکہ ایسے غیر محتاط اور فحش پھیلانے والوں کی اس سلسلے میں آئندہ کبھی گواہی بھی قبول نہ کی جائیگی۔ یہ ملتِ اسلامیہ کے قانونِ شہادت سے محروم انسان قرار پائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے لوگ بدکاروں کی فہرست میں شمار ہوں گے۔

مسلمان کی آبروریزی اور اُسکو ذلیل کرنا کتنا شدید جرم ہے قرآن حکیم کی مذکورہ آیت اس پر پوری روشنی ڈالتی ہے۔ زنا خود ایک شدید گناہ ہے تو اس کی تہمت بھی کسی کلمہ گو کے حق میں اس کی شدید توہین کے مرادف ہوئی اور سزا بھی اس کے لئے ایسی ہی سخت آئی۔

موجودہ معاشرے کا یہ کُھلا عیب ہے کہ کسی مسلمان عورت کی مشتبہ حالت کو فوری طور پر بُرائی کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک مسلمان کی عزت سارے عالم کے کافروں سے افضل ہے۔ سیدنا عمر فاروق رضؓ نے خانہ کعبہ پر نہایت عزت و احترام سے نگاہ ڈالی اور پھر فرمایا: "اے عزّت والے گھر میں تیری عزّت کو خوب جانتا ہوں لیکن ایک مسلمان کی عزّت اللہ کے ہاں تجھ سے کہیں زیادہ ہے۔"

مسئلہ لعان

لِعان کے لغوی معنی ایک دوسرے پر لعنت کرنا اور غضبِ الٰہی کی بددُعا کرنے کے ہیں۔ شریعت اسلامی میں میاں اور بیوی دونوں کو چند خاص قسمیں دینے کو لِعان کہا جاتا ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ شوہر نے اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگایا یا اپنے بچّے کے بارے میں کہا کہ یہ میرا نہیں ہے۔ اور بیوی اپنے شوہر کو

جھوٹا قرار دے اور شوہر کو اپنے الزام کے ثبوت میں ۴ چار گواہ پیش کرنے کا حکم دے گی۔ اگر شوہر نے چار چشم دید گواہ پیش کر دیئے تو بیوی پر زنا کی سزا جاری کر دی جائے گی اور شوہر بَری ہو جائے گا۔ (زنا کی سزا عورت سنگسار کر دی جائیگی)

اور اگر شوہر چار گواہ پیش نہ کرسکا تو میاں بیوی دونوں میں لِعان کروایا جائے گا۔ یعنی پہلے شوہر سے کہا جائے گا کہ وہ ۴ چار مرتبہ اُن الفاظ سے جو قرآن میں مذکور ہیں یہ شہادت دے کہ اللہ کی قسم میں بیوی پر الزام دینے میں سچّا ہوں اور پانچویں مرتبہ اس طرح شہادت دے کہ اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو۔

اسکے بعد بیوی سے اُن الفاظ میں ۵ پانچ قسمیں لی جائینگی جو قرآن میں عورت کے لئے مذکور ہیں یعنی ۴ چار مرتبہ اس طرح قسم کھائے کہ اللہ کی قسم میرا شوہر مجھ پر الزام لگانے میں جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ اس طرح کہے کہ مجھ پر اللہ کا غضب ٹوٹ پڑے اگر میرا شوہر اپنے الزام میں سچّا ہے۔

میاں بیوی کی اِن ۱۰ دس قسموں کے بعد لِعان پورا ہو گیا جس کے نتیجے میں دنیا کی سزا (عدم ثبوت کی وجہ سے شوہر پر اسّی کوڑے اور ثبوت کی وجہ سے بیوی پر سنگساری کی سزا) سے دونوں محفوظ ہو جائیں گے۔ رہا آخرت کا معاملہ وہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہی ہے کہ اُن دونوں میں کون جھوٹا ہے۔ جھوٹے کو وہاں سزا ملے گی۔ الغرض لِعان پورا ہو جانے کے بعد دونوں میاں بیوی ایک دوسرے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام ہو جائیں گے۔ اس موقع پر شوہر طلاق دے کر بیوی کو آزاد کر دے۔ اگر شوہر طلاق نہ دے گا تو عدالتِ اسلامی دونوں میں تفریق کا حکم نافذ کر دے گی۔ یہ تفریق طلاق شمار ہوگی۔ بہرحال اب دونوں کا آپس میں کبھی بھی نکاح نہیں ہو سکتا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جُدا ہو جائیں گے۔ اور بچّے کا نسب باپ سے کٹ جائے گا اور ماں کی جانب منسوب ہوگا۔ ایسے بچّے کو ولد الحرام نہ کہا جائے گا۔

اس سلسلے میں یہ تفصیل بھی آیاتِ لِعان کو سمجھنے میں مفید ثابت ہوگی۔

حضرت ابن عباس رضہ فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم میں جب حد قذف (تہمت کی سزا) کے احکام کی آیات نازل ہوئیں یعنی

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً ؕ (۲۴ نور آیت ۴)

(جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت زنا لگائیں پھر چار گواہ پیش نہ کریں اُن کو اسّی کوڑے مارو اور اُن کی شہادت کبھی قبول نہ کرو اور یہی لوگ فاسق ہیں)

ان آیات میں کسی عورت پر زنا کا الزام لگانے والے مرد پر لازم کیا گیا ہے کہ اس الزام پر چار چشم دید گواہ پیش کرے تاکہ عورت پر سزا جاری کی جاسکے۔ اور اگر وہ گواہ پیش نہ کر سکے تو اسکو جھوٹا قرار دے کر اُس مرد پر اسّی کوڑوں کی سزا جاری کر دی جائیگی اور ہمیشہ کے لئے مردود الشہادت قرار دیا جائے گا۔ یعنی کسی معاملہ میں اُس کی گواہی معتبر نہ ہوگی۔

جب یہ آیات نازل ہوئیں تو عام لوگوں میں یہ سوال پیدا ہوگیا کہ اجنبی مرد اور اجنبی عورت کی بدچلنی دیکھ کر آدمی صبر تو کرسکتا ہے۔ گواہ موجود نہ ہوں تو سکوت اختیار کرسکتا ہے اور معاملہ کو رفع دفع کرسکتا ہے لیکن آدمی اگر خود اپنی بیوی کو اس بُری حالت میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لے تو کیا کرے؛ اگر قتل کر دیا تو سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ گواہ ڈھونڈنے جائے تو واپس آنے تک مجرم اپنا کام کر کے بھاگ جائے گا۔ صبر کرے تو کیسے کرے؟ عورت کو طلاق دے دے تو نجات پاسکتا ہے لیکن نہ بدکار عورت کو مادّی یا اخلاقی سزا ملی نہ اُسکے بدکار آشنا کو۔ یہ وہ امکانات تھے جو اپنی بیوی کی بدکاری پر پیدا ہورہے تھے، چنانچہ انصار مدینہ کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہؐ کیا یہ آیات (حدِ قذف کی) اسی طرح نازل ہوئی ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سعد بن عبادہ رضؓ کی زبان سے ایسی بات سُنکر بڑا تعجب ہوا آپ نے انصار سے فرمایا اے لوگو سُن رہے ہو آپ کے سردار کیا بات کہہ رہے ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپؐ ان پر ناراض نہ ہوں یہ اپنی شدتِ غیرت کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہیں۔ پھر خود حضرت سعد بن عبادہؓ نے ایک امکانی سوال کی حیثیت سے اس طرح عرض کیا یا رسول اللہ! اگر خدانخواستہ میں اپنے گھر میں یہ معاملہ دیکھوں تو میں گواہوں کی تلاش میں باہر نہیں جاؤں گا بلکہ تلوار سے اُسی وقت دونوں کا سر اُڑادوں گا۔ (بخاری مُسلم)

آیاتِ قذف نازل ہونے اور حضرت سعد بن عبادہ رضؓ کے اس کلام پر تھوڑی مدت بھی نہیں گزری تھی کہ انصارِ مدینہ میں ایک شخص (حضرت عُوَیمِر عجلانی رضؓ) نے حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ اگر ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ غیر مرد کو پائے اور منہ سے بات نکالے تو آپؐ اسپر حدِ قذف (اسّی کوڑوں کی سزا) جاری کر دیں گے، اگر بیوی کو قتل کر دے تو آپؐ اسکو قصاص میں قتل کر دیں گے۔ اگر خاموش ہو جائے تو غیظ و غضب میں مبتلا رہے گا۔ آخر وہ کیا کرے؟

اسپر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا کی الٰہی! اس مسئلے کا فیصلہ نازل فرما (ابوداؤد، نسائی)

کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ حضرت ہلال بن اُمیہ رضؓ کو یہ واقعہ پیش آیا کہ وہ عشاء کے بعد اپنے باغ سے گھر واپس ہوئے تو ایک اجنبی مرد کو اپنی بیوی کے ساتھ ملوّث ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اُن کی فحش باتیں اپنے کانوں سے سُنیں مگر کوئی اقدام نہیں کیا یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ عرض کیا آپ یہ واقعہ سُن کر غمزدہ ہو گئے لیکن قرآنی فیصلہ کے مطابق آپؐ نے ہلال بن اُمیہ رضؓ سے فرمایا ثبوت پیش کرو (یعنی چار چشم دید گواہ لاؤ) ورنہ تم پر حدِ قذف (اسّی کوڑوں کی سزا) جاری ہوگی۔

صحابہ کرام میں اس صورتِ حال سے عام بے چینی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ لیکن ہلال بن اُمیہ رضؓ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا یا رسول اللہ اُس اللہ کی قسم جس نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے میں بالکل صحیح واقعہ بیان کر رہا ہوں جیسے میری آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا ہے۔ یا رسول اللہ مجھکو یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے معاملے میں ایسا حکم نازل فرما دے گا جو میری پیٹھ کو سزا سے بچا دے۔ یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ جبرئیل امین وہ آیات جن میں لِعان کا قانون ہے لیکر نازل ہوئے:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّا

أَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ إِنَّهُ لَمِنَ الصّٰدِقِينَ الخ

(النور آیت ۶ تا ۱۰)

اور جو لوگ اپنی بیویوں کو زنا کی تہمت لگائیں اور ان کے پاس خود اِن کے اپنے سوا دوسرے کوئی گواہ نہ ہوں (جن کا تعداد میں چار گواہ ہونا ضروری ہے) تو اُن کی شہادت یہی ہے کہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر یہ کہدے کہ (اللہ کی قسم میں اپنے الزام دینے میں) سچا ہوں اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر اللہ کی لعنت ہو اگر میں جھوٹا ہوں (اپنے الزام دینے میں) اور اس کے بعد اُس عورت سے سزا اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار بار قسم کھا کر کہے کہ اللہ کی قسم بیشک یہ میرا شوہر جھوٹا ہے (الزام لگانے میں) اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر اللہ کا غضب ہو جائے اگر میرا شوہر (اپنے الزام لگانے میں) سچا ہو۔ (اس طریقے کی حلف برداری کے بعد میاں، بیوی دونوں دنیا کی سزا سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ البتہ وہ عورت اُس مرد پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتی ہے اور موجودہ نکاح ختم ہو جاتا ہے) اور اے مسلمانو اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تم پر اللہ کا فضل اور اُس کا کرم ہے (کہ ایسے ایسے احکام مقرر کئے) اور یہ کہ اللہ توبہ قبول کرنے والا حکمت والا ہے (تو تم بڑی مشقتوں میں پڑ جاتے)

ان آیات کے نزول کے بعد ہلال بن اُمیہ رضؓ اور اُن کی بیوی دونوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کئے گئے۔ آپؐ نے پہلے تو قانون الٰہی سنایا۔ پھر ارشاد فرمایا:-

اچھی طرح سمجھ لو کہ آخرت کا عذاب دنیا کے عذاب سے سخت تر ہے۔ ہلال بن اُمیہ نے کہا یا رسول اللہ میں نے اسپر بالکل صحیح الزام لگایا ہے۔ بیوی نے کہا یا رسول اللہ یہ بالکل جھوٹ ہے۔

آپؐ نے فرمایا اللہ تعالےٰ خوب جانتا ہے کہ تم میں سے ایک جھوٹا ہے۔ کیا تم میں کوئی ہے جو اللہ کے عذاب سے ڈر کر توبہ کرے اور سچی بات ظاہر کردے؟

اسپر ہلال بن اُمیہ نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپؐ پر

قربان ہوں میں نے بالکل سچی بات کہی ہے اور جو کچھ کہا ہے حق کہا ہے۔ تب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ نازل شدہ آیاتِ قرآنی کے مطابق دونوں میاں بیوی میں لعان کرا دیا جائے۔

پہلے حضرت ہلال بن اُمیہ سے کہا گیا کہ تم چار مرتبہ اِن الفاظ سے شہادت دو جو قرآن حکیم میں مذکور ہیں۔

"یعنی میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں اپنے الزام دینے میں سچا ہوں"

ہلال رضؓ نے چار مرتبہ اِن کلمات کو دُہرایا۔ جب پانچویں شہادت کا نمبر آیا جسکے الفاظ قرآنی یہ ہیں :-

"اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو"

اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید و تنبیہ کے طور پر ہلال بن اُمیہ سے فرمایا ہلال اللہ سے ڈرو کیونکہ دنیا کی سزا آخرت کے عذاب سے ہلکی ہے اور اللہ کا عذاب انسانوں کی دی ہوئی سزا سے کہیں زیادہ سخت ہے اور یہ پانچویں شہادت آخری شہادت ہے اسی پر فیصلہ ہونا ہے۔

مگر ہلال بن اُمیہ نے عرض کیا یا رسول اللہ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھکو اس شہادت پر آخرت میں عذاب نہیں دیں گے (کیونکہ میری بالکل سچی شہادت ہے) اسکے بعد حضرت ہلال رضؓ نے پانچویں شہادت کے الفاظ ادا کر دیئے۔

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلال بن اُمیہ رضؓ کی بیوی سے اسطرح کی چار قسمیں لیں۔ اس نے بھی ہر دفعہ قرآنی الفاظ کے مطابق یہ شہادت دی کہ "میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر شہادت دیتی ہوں کہ میرا شوہر اپنے الزام میں جھوٹا ہے"

جب پانچویں شہادت کا نمبر آیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ذرا ٹھیرو۔ پھر اُس عورت سے ارشاد فرمایا اللہ سے ڈر کہ یہ پانچویں شہادت آخری بات ہے اور اللہ کا عذاب انسانوں کے عذاب سے یعنی (زنا کی حدِ شرعی) سے کہیں زیادہ سخت ہے۔ یہ سنکر عورت قسم کھانے میں جھجکنے لگی اور چند

لمحات تردّد میں پڑگئی. لوگوں نے سمجھا کہ اعترافِ گناہ کرنا چاہتی ہے مگر کہنے لگی میں ہمیشہ کے لئے اپنے قبیلے کو رُسوا نہیں کرنا چاہتی اور پانچویں قسم بھی کھا گئی کہ، "اگر میرا شوہر اپنے الزام میں سچا ہے تو مجھ پر اللہ کا غضب نازل ہو۔"

جب لعان کی یہ کارروائی مکمل ہوگئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں میں تفریق کرادی اور فیصلہ فرمایا کہ اس حمل سے جو بچہ پیدا ہوگا وہ اس عورت کا بچہ کہلائے گا باپ کی طرف منسوب نہ ہوگا. کسی کو اس عورت پر یا اس کے بچے پر الزام لگانے کا حق نہ ہوگا اور اس عورت کے زمانۂ عدت کا نان ونفقہ ہلال بن اُمیہ کے ذمہ نہ ہوگا (کیونکہ بیوی طلاق یا وفات کے بغیر شوہر سے جدا کی جارہی ہے) اب بیوی کو اختیار ہے چاہے کسی دوسرے سے نکاح کرلے یا ویسے ہی زندگی گزارے۔ (تفسیر مظہری بحوالہ مسند احمد)

اس طرح تاریخ عالم کا یہ پہلا حادثہ تھا جسمیں اللہ تعالیٰ کا قانون "لعان" روئے زمین پر پہلی مرتبہ نافذ کیا گیا اور قیامت تک کے لئے ازدواجی زندگی کے اس ناسور کا علاج قرار پایا۔

اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا وَلِلْمُسْلِمِیْنَ مِنْہُ۔

بَنُو نَضِیر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد جب مدینہ طیبہ قیام فرمایا تو وہاں یہودیوں کے مختلف قبائل بھی آباد تھے۔ اُن میں ایک بڑا قبیلہ بنونضیر نامی بھی تھا جو اپنی دولت و ثروت قوت و طاقت میں مشہور و معروف تھا۔ بنونضیر دراصل حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد ہیں جو ملکِ شام سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں آباد ہوگئے تھے کیونکہ اِن کی آسمانی کتاب توراۃ میں خاتم الانبیاء کی نشان وہی موجود تھی اور اُن کا مقام ہجرت مدینہ طیبہ بتایا گیا تھا۔ بنونضیر اسی کی جستجو میں مدینہ طیبہ آ گئے تھے۔

الغرض جب آپؐ مدینہ طیبہ مقیم ہوگئے تو حکیمانہ سیاست کے تحت شہر کے اطراف جو یہودی قبائل آباد تھے اُن سے معاہدۂ صلح کر لیا کہ کوئی ایک دوسرے پر حملہ نہ کریں گے اور نہ کسی جنگ کرنے والے کی اعانت کریں گے اور اگر اِن پر کوئی حملہ آور ہوا تو مسلمان اِن یہود کی امداد کریں گے وغیرہ۔

اس طرح معاہدہ صلح میں بنونضیر بھی شریک تھے جن کے قلعے اور باغات مدینہ طیبہ سے ۲-۳ میل کے فاصلہ پر واقع تھے۔

غزوہ اُحد ۳ھ تک تو یہ لوگ بظاہر صلح نامہ کے پابند رہے مگر غزوۂ اُحد کے بعد اُنھوں نے غداری کی اور خفیہ سازشیں شروع کر دی۔ اس غداری اور خیانت کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ بنونضیر کا ایک سردار کعب بن اشرف اپنے چالیس یہودی ساتھیوں کے ایک قافلہ کے ساتھ مکہ مکرمہ پہنچا اور کفارِ قریش کے ساتھ ایک معاہدہ کیا کہ مسلمانوں کے خلاف ایک بڑی جنگ کی جائے۔ معاہدہ کی تکمیل کے بعد کعب بن اشرف یہودی نے اپنے چالیس ساتھیوں کے ساتھ دوسری جانب قریش کے سردار ابوسفیان اپنے چالیس آدمیوں کو لے کر خانہ کعبہ میں آئے اور بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر دونوں جماعتوں نے

معاہدہ کی پابندی کا اقرار کیا کہ ہم ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں گے۔

جب کعب بن اشرف مدینہ طیبہ واپس آیا تو جبرئیل امین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سارا واقعہ اور معاہدہ کی تفصیل بتلادی۔ آپؐ نے کعب بن اشرف کے قتل کا حکم جاری فرمایا چنانچہ حضرت محمد بن مسلمہ رضؓ نے اسکو قتل کر دیا۔ (قتل کا یہ واقعہ کتب حدیث میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

(بخاری ج ۲ ص ۵۷۶، ابو داؤد ج ۲ ص ۶۱)

اسکے بعد بنونضیر کی مختلف خیانتیں اور سازشیں ظاہر ہوتی رہیں جن میں مشہور واقعہ یہ تھا:-

حضرت عمرو بن اُمیّہ ضمری رضؓ کے ہاتھ دو کافر قتل ہو گئے تھے جس کا خون بہا سب مسلمانوں کو ادا کرنا ضروری تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے چندہ حاصل کیا پھر از روئے معاہدہ چونکہ بنونضیر بھی صلحنامہ میں مسلمانوں کے ساتھ تھے اِن کو بھی اس رقم میں شریک کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ آپ قبیلۂ بنونضیر کے ہاں تشریف لے گئے لیکن بنونضیر نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر آپ کو شہید کر دینے کا منصوبہ تیار کیا وہ اس طرح کے آپؐ کو ایک مخصوص جگہ بٹھلا دیا اور کہا کہ ہم فدیہ کی رقم جمع کرنے کا انتظام کرتے ہیں اور خفیہ طور پر ایک شخص عمر بن جحّاش کو دیوار کے اوپر ایک بڑا پتھر دے کر بٹھا دیا کہ مناسب موقع پر پتھر آپؐ کے سر پہ گرادے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی اور جبرئیل امین نے عین موقع پر آپؐ کو وہاں سے اُٹھ جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ آپؐ فوری اُٹھ کر واپس تشریف لائے اور اُن کو کہلا بھیجا کہ تم لوگوں نے عہد شکنی کرکے معاہدہ توڑ دیا۔ اب تمہیں صرف دس دن کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس مدت میں تم جہاں چاہو چلے جاؤ۔ اسکے بعد جو کوئی بھی **نظر آئے گا** اُس کو قتل کر دیا جائے گا۔

اس فیصلہ پر بنو نضیر نے جلا وطنی کا ارادہ کر لیا لیکن عبد اللہ بن اُبی منافق نے انھیں روکا اور کہا تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فیصلہ ہرگز ہرگز قبول نہ کرنا میرے ہاں دو ہزار آدمیوں کی جمعیت ہے جو تمہاری تائید میں اپنی جان کی بازی لگادیں گے۔

بنو نضیر اسکی باتوں میں آگئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں پیام بھیجا کہ ہم اپنے شہر سے کہیں بھی نہیں جائیں گے آپؐ کو جو کرنا ہو کر لیجئے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کرام کے ساتھ اس قبیلہ پر حملہ آور ہونے کا فیصلہ فرمایا۔ حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم رضؓ کو مدینہ طیبہ کا امیر مقرر فرمایا اور آپؐ بنفسِ نفیس صحابہ کرام کے ساتھ بنو نضیر پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوئے حضرت علی رضؓ کو اسلامی پرچم دیا۔ بنو نضیر نے جب یہ دیکھا تو قلعہ بند ہو گئے اور یقین کر لیا کہ اب مسلمان ہمارا کچھ بھی بگاڑ نہ سکیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ دن تک اُن کے قلعہ کا محاصرہ کیا لیکن بنو نضیر نے اطاعت قبول نہ کی۔ پھر آپؐ نے صحابہ کو حکم فرمایا کہ اُن کے باغات کو ویران کر دیا جائے، درختوں کو کاٹ دیا جائے جو اِن کے لئے پھل مہیا کرتے ہیں۔ بنو نضیر کو یقین تھا کہ عبد اللہ بن اُبیّ اپنی جمعیت روانہ کرے گا لیکن انھیں سخت ناکامی ہوئی۔ آخر تنگ آکر انھوں نے جلا وطنی منظور کر لی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی رعایت بخشی اور حکم دے دیا کہ جسقدر بھی سامان اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو لیجاؤ البتہ ہتھیار اور سامانِ حرب ہمارا ہوگا۔ چنانچہ ان لوگوں نے قلعہ سے اتر کر اپنا ساز و سامان جمع کر لیا اور بغض و عناد میں اپنے گھروں کی کڑیاں تختے، کواڑ تک اُکھاڑ لے گئے اور اپنے مکانات کو اپنے ہاتھوں ویران کر دیا۔ کچھ لوگ ملک شام چلے گئے اور کچھ خیبر میں آباد ہو گئے۔

یہ واقعہ غزوۂ اُحد کے بعد ماہ ربیع الاوّل ۴ھ میں پیش آیا۔ پھر سیدنا عمر فاروق رضؓ نے اپنے دورِ خلافت میں خیبر کے یہودیوں کو ملک شام کی طرف نکال دیا۔

خیبر کے یہودیوں کی یہ دونوں جلاوطنی قرآنی الفاظ میں حشرِ اوّل اور حشر ثانی کہلاتی ہے۔ (زاد المعاد)

اسی واقعہ کے سلسلے میں قرآن حکیم کی سورہ حشر نازل ہوئی۔ اسمیں بنو نضیر کی غدّاری، منافقینِ مدینہ کی فتنہ پردازی، مسلمانوں پر اللہ کا احسان و کرم اور جنگ کے موقع پر سبز درختوں کے کاٹے جانے کا حکم، اور ایسی صورت میں جبکہ باضابطہ جنگ پیش نہ آئی ہو مالِ غنیمت کا حصول، اِن تمام امور کا تفصیل کے ساتھ اس سورت میں تذکرہ موجود ہے۔

قرآنی مضمون

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ الخ (سورہ حشر پارہ ۲۸)

اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں موجود ہیں اور وہ اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ وہ اللہ وہی ہے جس نے ان کفار اہل کتاب (بنی نضیر) کو اُن کے گھروں سے پہلی ہی بار اکٹھا کر کے نکال دیا (بقول امام زہری رح اس سے پہلے اُن پر یہ مصیبت کبھی واقع نہ ہوئی تھی)

(اے مسلمانو بنو نضیر کا سامان اور شان و شوکت دیکھ کر) تمہارا گمان بھی نہ تھا کہ وہ (کبھی اپنے گھروں سے) نکلیں گے اور خود اُنھوں نے گمان کر رکھا تھا کہ اُن کے قلعے اُن کو اللہ کے انتقام سے بچالیں گے سو اُن پر اللہ کا عذاب ایسی جگہ سے پہنچا کہ اُن کو خیال وگمان بھی نہ تھا اور اُن کے دلوں میں (اللہ نے مسلمانوں کا) رعب ڈالدیا (اور اُس وقت اُن کی یہ حالت تھی کہ) اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے بھی اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے بھی اُجاڑ رہے تھے سواے دانشمندو اس حالت کو دیکھ کر عبرت حاصل کرو (کہ اللہ و رسول کی مخالفت کا انجام بعض اوقات دنیا میں بھی بُرا ہوتا ہے) اور اگر اللہ اُن کی قسمت میں جلاوطنی کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو اُن کو دنیا ہی میں قتل کی سزا دیتا (جس طرح کہ اُن کے بعد یہود بنو قریظہ کے ساتھ معاملہ کیا گیا) اور (اگرچہ بنو نضیر دنیا میں عذابِ قتل سے بچ گئے

لیکن) اُن کے لئے آخرت میں جہنم کا عذاب تیار ہے اور یہ (سزائے جلا وطنی دنیا میں اور سزائے جہنم آخرت میں) اس سبب سے ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی اور اُس کے رسول کی مخالفت کی اور جو شخص اللہ کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ سخت سزا دینے والا ہے (اور اے مسلمانو) جو کھجور کے درخت تم نے کاٹ ڈالے (اسی طرح جو جلا دیئے) یا اُن کو اُن کی جڑوں پر (جُوں کا توں) کھڑا رہنے دیا سو (دونوں باتیں) اللہ ہی کے حکم (اور رضا) کے موافق ہیں (تاکہ اللہ مسلمانوں کو عزت دے) اور تاکہ کافروں کو ذلیل کرے (یعنی دونوں عمل میں مصلحت ہے) (الغرض یہ جو ہوا وہ تو بنو نضیر کی جانوں کے بارے میں تھا اور اُن کے اموال کے ساتھ جو معاملہ ہوا اس کا بیان یہ ہے) اور یہ جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو اُن سے دلوا دیا سو (اُس میں تم کو کوئی مشقت نہیں پڑی چنانچہ) تم نے اُنپر (یعنی اس کے حاصل کرنے کو) نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ (نہ سفر کی مشقت ہوئی کیونکہ یہ بستی مدینہ سے صرف ڈھائی میل پر تھی اور نہ جنگ و جدال کی ضرورت پیش آئی)

لیکن اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ اپنے رسولوں کو (اپنے دشمنوں میں سے) جس پر چاہے مسلّط کر دیتا ہے (یعنی محض رعب داب سے مغلوب کر دیتا ہے) اور اللہ کو ہر چیز پہ قدرت ہے (اسی طرح) جو کچھ بھی اللہ اپنے رسول کو دوسری بستیوں کے کافر لوگوں سے دلوا دے (جیسا کہ فدک اور خیبر کا مال اسی طرح ہاتھ آیا) سو وہ بھی اللہ کا حق ہے اور رسول کا حق ہے اور آپ کے قرابت داروں کا حق ہے اور یتیموں کا حق ہے اور غریبوں کا حق ہے اور مسافروں کا حق ہے (اور اللہ نے یہ حکم مذکور اس لئے مقرر کر دیا) تاکہ وہ مال تمہارے تونگروں (اہل دولت) کے قبضہ میں نہ آجائے (جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں مال غنیمت صرف ذی اختیار لوگ ہی کھا جاتے تھے)

لہٰذا اے مسلمانو! جب رسول تم کو جو کچھ دیدیا کریں وہ لے لیا کرو

اور جس چیز کے لینے سے تم کو روک دیں تم رک جایا کرو (یہی حکم افعال واحکام
میں بھی ہے) اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ تعالیٰ (مخالفت کرنے والوں) کو
سخت سزا دینے والا ہے (نوٹ:۔ یہاں تک آیت نمبر ۱ تا ۷ تک کا ترجمہ و مطلب
تھا آگے آیت نمبر ۱۱ تا ۲۰ کا ترجمہ و مطلب لکھا جاتا ہے)

کیا آپؐ نے اے نبی اُن منافقین (یعنی عبداللہ بن اُبی وغیرہ)
کی حالت نہیں دیکھی کہ اپنے بھائیوں سے جو کفار اہل کتاب ہیں (یعنی بنونضیر
سے) کہتے ہیں کہ اللہ کی قسم اگر تم اپنے وطن سے جبراً نکالے گئے تو ہم بھی
تمہارے ساتھ نکل جائیں گے اور تمہارے معاملہ میں ہم کسی کا کہنا نہ مانیں گے
اگر تم سے کسی کی لڑائی ہوئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور اللہ گواہ ہے
کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔

(اور اللہ فرماتا ہے) اگر اہل کتاب (یعنی بنونضیر) نکالے گئے تو
یہ منافقین اُن کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر اُن سے لڑائی ہوئی تو یہ اُنکی
مدد نہ کریں گے اور اگر بالفرض اُن کی مدد بھی کی تو پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے پھر
اُن کے بھاگ جانے کے بعد اُن اہل کتاب کی کوئی مدد نہ ہو گی۔

(اے مسلمانو) بیشک تم لوگوں کا خوف اُن منافقین کے دلوں
میں اللہ سے بھی زیادہ ہے۔ یہ اس سبب سے کہ وہ ایسے لوگ ہیں (جو
اللہ تعالیٰ کی عظمت وقدرت کو) سمجھتے نہیں۔

یہ لوگ تو سب ملکر بھی تم سے نہ لڑیں گے مگر حفاظت والی بستیوں
یا دیوار کی آڑ میں (یعنی قلعہ اور شہر پناہ کی دیواریں) سو خود اُن کی آپس ہی
کی لڑائی بڑی تیز ہے۔ تم اُن کو (ظاہری طور پر) متفق الخیال تصور کرتے ہو حالانکہ
اُن کے قلوب غیر متفق ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو صحیح عقل
نہیں رکھتے (پس بنونضیر کی مثال تو) اُن لوگوں جیسی ہے جو اُن سے کچھ ہی
پہلے ہوئے ہیں جو دنیا میں بھی اپنے کردار کا مزہ چکھ چکے ہیں اور آخرت
میں بھی اُن کے لئے دردناک عذاب ہے (مراد ان سے یہود بنو قینقاع جنکو
شہر بدر کر دیا گیا تھا) (اِن منافقین کی مثال) شیطان کی سی ہے (اوّل تو)

انسان سے کہتا ہے کہ تو کافر ہو جا۔ پھر جب وہ کافر ہو جاتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں ہے میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں (کہیں دنیا ہی میں کسی فرشتے سے میری خبر نہ لے لے) سو آخری انجام دونوں کا یہ ہوا کہ دونوں دوزخ میں گئے جہاں ہمیشہ رہیں گے اور ظالموں کی یہی سزا ہے۔"

نَبَأ فاسِق

(بے بُنیاد خبر)

۵ھ میں غزوہ بنی المصطلق پیش آیا اور اللہ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے مشورہ پر سردار قبیلہ حارث بن ضرار کی بیٹی حضرت جُویریہ رضی سے نکاح کر لیا۔ اس رشتے کی وجہ سے صحابہ کرام نے اُن تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا جو جنگ کے بعد مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے تھے۔ مسلمانوں کا یہ فیصلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سُسرالی رشتہ کے احترام میں تھا۔ اس حُسن سلوک اور اخلاق کریمانہ سے متاثر ہو کر پورا قبیلہ بنی مصطلق مسلمان ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عُقبہ کو زکوٰۃ کے احکام دے کر بنو مصطلق کے ہاں روانہ کیا کہ وہ قبیلہ کے اہل دولت سے زکوٰۃ وصول کر کے اُن ہی کے فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیں۔

اہل قبیلہ کو جب ولید بن عقبہ کی اس آمد کا علم ہوا تو وہ اُن کے استقبال کے لئے اپنے شہر سے باہر آئے۔ زمانۂ جاہلیت میں اس قبیلہ کے اور ولید بن عُقبہ کے درمیان کچھ نااتفاقی رہ چکی تھی اور پُرانی عداوت کا رشتہ چلا آ رہا تھا۔ قبیلہ کے اس استقبال کو ولید بن عُقبہ نے شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھا اور بدگمانی میں مبتلا ہو گئے اور پھر از خود اپنی غلط فکر سے متاثر ہو کر یہ رائے قائم کر لی کہ اہل قبیلہ اپنی قدیم دشمنی کے باعث مجھ کو قتل نہ کر دیں اور یہ کہ اہل قبیلہ کا استقبال کسی گہری سازش کا نتیجہ ضرور ہے۔ اس غلط

فکر ورائے نے اِن کو اہل قبیلہ سے بات چیت کئے بغیر ہی واپس کر دیا اور وہ مدینہ طیبہ واپس آگئے اور بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا :-

"یا رسول اللہ اُن لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے اور مجھکو قتل کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا میں اپنی جان بچا کر لوٹ آیا ہوں - یا رسول اللہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بغاوت و سرکشی پر آمادہ ہو گئے ہیں۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ حالات سن کر غمگین ہو گئے اور مسلمانوں میں انتقامی جذبات پیدا ہو گئے اور جہاد کی تیاری شروع ہو گئی۔

اُدھر بنی المصطلق کو جب یہ معلوم ہوا کہ ولید بن عُقبہ نے غلط بیانی کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو متاثر کر دیا ہے اور مسلمان فوج کشی کی تیاری کر رہے ہیں تو قبیلہ کے سردار حارث بن ضرار (ام المؤمنین حضرت جویریہ رضہ کے والد محترم) نے اس دوران ایک وفد کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا :-

"یا رسول اللہ! اُس ذات کی قسم جس نے آپ کو اپنا رسول بنا کر مبعوث کیا ہے ہم نے ولید بن عُقبہ کو دیکھا تک نہیں اور نہ وہ ہمارے پاس آئے۔"

اس بیان پر آپ نے سکوت اختیار فرمایا اور وحیٔ الٰہی کا انتظار کیا، کچھ ہی دیر بعد قرآن نازل ہوا اور نہ صرف معاملہ کی حقیقت ہی کو واضح کیا بلکہ ایسے معاملات میں مستقل قانون معیارِ تحقیق مقرر کر دیا۔

(ابن کثیر بحوالہ مسند احمد)

قرآنی مضمون

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِن جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓا أَن تُصِيبُوا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَٰدِمِينَ۔ الخ (حجرات آیت ۶ تا ۸)

اے ایمان والو اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے (جس میں کسی کی شکایت ہو) تو خوب تحقیق کر لیا کرو کہیں کسی قوم کو نادانی

سے کوئی نقصان نہ پہنچا دو پھر اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔

اور جان رکھو کہ تم میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف فرما ہیں (جو اللہ کی بڑی نعمت ہیں پس اس نعمت کا شکریہ ہے کہ تم کسی بات میں آپ کے خلاف نہ کرو کیونکہ) بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر اُس میں وہ تمہارا کہنا مانا کریں تو تم بڑی مضرت میں پڑ جاؤ گے لیکن اللہ نے (تم کو مصیبت سے بچالیا اس طرح کہ) تم کو ایمان کی محبت دی اور اُسکو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا اور کفر اور فسق (یعنی گناہِ کبیرہ) اور عصیان (یعنی گناہِ صغیرہ) سے تم کو نفرت دے دی۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل و انعام کی بدولت راہِ راست پر ہیں اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔"

مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص کسی کے بارے میں کوئی اطلاع دے یا کوئی خبر پھیلا دینا چاہے تو اُسکو پہلے اس بات کی تحقیق کر لینی چاہیئے آیا یہ اطلاع یا خبر صحیح بھی ہے یا نہیں بغیر تحقیق ویسے ہی سُنی سُنائی بات کو نقل کر دینا جیسا کہ موجودہ معاشرہ کا عام رواج ہے قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ حدیث شریف میں تو ایسے شخص کو جھوٹا کہا گیا ہے۔

كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ۔ (مسلم)

آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ ثبوت کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو نقل کر دے۔

تحقیق کی ایک کسوٹی

مفسرین کرام نے آیتِ مذکورہ سے تحقیق کا ایک معیار اخذ کیا ہے۔

۱۔ **تحقیقِ واجب**: مثلاً خلیفہ یا حاکم جب یہ سنے کہ فلاں شخص بے دین ہو رہا ہے یا فلاں شخص قتل و غارت کا اقدام کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسے موقع پر تحقیق کرنا یعنی بات کی اصلیت معلوم کرنا واجب ہے تاکہ فتنہ و فساد کا انسداد ہو اور دوسرے لوگ محفوظ ہو جائیں۔

۲۔ **تحقیقِ جائز**: مثلاً کسی نے یہ سُنا کہ فلاں شخص مجھکو مالی یا جانی نقصان پہنچانا چاہتا ہے

یا اُس کے بُرے ارادے ہیں تو ایسی صورت میں واقعہ کی تحقیق کرنا جائز ہے گناہ نہیں۔ کیونکہ اپنا تحفظ کرنا جائز ہے۔

(۳) **تحقیقِ حرام** : مثلاً کسی شخص کے بارے میں یہ سُنا گیا کہ وہ شراب پیتا ہے یا جوا کھیلتا ہے یا اور کوئی حرام کام خُفیہ طور پر کرلیتا ہے تو ایسی تحقیق میں پڑنا حرام ہے کیونکہ ایسے موقع پر تحقیق نہ کرنے سے اپنا کوئی نقصان نہیں اور نہ کوئی جائز فائدہ بلکہ تحقیق و تجسّس کرنے میں اُس شخص کی ذلّت اور رسوائی ہے اس لئے انجان ہوجانا چاہیئے اللہ علیم و خبیر کافی ہیں۔

قرآن حکیم نے تجسُّس کرنے اور غیبت کرنے سے منع کیا ہے۔
(الحجرات آیت ۱۲)

خَاتَمُ التَّذکِرَہ

(اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُم مَّیِّتُوْنَ)

۹ھ میں حج بیت اللہ کی فرضیت نازل ہوئی اسی سال آپؐ نے صدیق اکبرؓ کو امیر الحجاج بناکر مکہ مکرمہ روانہ فرمایا۔ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے صدیق اکبرؓ کی زیر امارت اسلام کا پہلا حج ادا کیا۔

دوسرے سال ماہ ذُوالقعدہ ۱۰ھ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لاکھ چودہ ہزار صحابہ کرام کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے مدینہ طیبہ سے کوچ فرمایا۔ ازواج مطہراتؓ میں نو بیبیاں اور سیدہ فاطمہ الزہراءؓ ساتھ تھیں۔ ۴ ذُوالحجہ ۱۰ھ اتوار کے دن آپؐ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور مناسک حج ادا فرمائے۔

۹ ذوالحجہ ۱۰ھ جمعہ کے دن میدانِ عرفات میں وہ عظیم الشان خطبہ دیا جو پیغاماتِ نبوت میں "خاتم الخطبات" کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی بلیغ و جامع خطبہ میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:۔

"اے لوگو جو میں کہتا ہوں وہ سُنو، مجھ سے حج کے مناسک حاصل کرلو۔ غالباً آئندہ سال میں تم سے نہ مل سکوں گا،

میں تم میں ایسی محکم چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ اگر تم نے اُسکو مضبوطی سے پکڑ لیا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔

اللہ کی کتاب اور میری زندگی (سُنّتی)

اسی میدان عرفات میں تکمیلِ دین اور اِتمام نعمت کی بشارت نازل ہوئی:۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (مائدہ آیت ۳)

آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی

نعمت تم پر پوری کردی اور ہمیشہ کے لئے دینِ اسلام کو تمہارے لئے پسند کرلیا۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پہلے اور آخری حج سے فارغ ہوکر ذوالحجہ کے آخری دنوں مدینہ طیبہ پہنچے۔ چند ہی روز گزرے تھے کہ ۱۰ھ ختم ہوکر ۱۱ھ کا آغاز ہوا اور یہی وہ سن ہے جس میں رُشد و ہدایت کے چراغوں کا آخری چراغ گُل ہوگیا۔ حجۃ الوداع سے واپسی کے بعد آپؐ نے سفرِ آخرت کی تیاری شروع فرمادی اور تسبیح و تحمید، توبہ واستغفار کی کثرت فرمانے لگے۔ انہی ایام میں آپؐ ایک دن مدینہ منورہ کے قبرستان جنّت البقیع تشریف لے گئے آٹھ سال کے بعد شہداءِ اُحد کی قبور پر نمازِ جنازہ پڑھی اور اُن کے لئے دُعائے خیر فرمائی جیسا کہ کوئی کسی سے رُخصت ہوتا ہو۔ بقیع سے واپس ہوکر مسجد نبوی کے منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا:-

اے لوگو! میں تم سے پہلے جا رہا ہوں تاکہ حوضِ کوثر پر تمہارا انتظار کروں اور میں اپنے اس مقام سے حوضِ کوثر کو دیکھ رہا ہوں، مجھکو زمین کے خزانوں کی کنجیاں دے دی گئی ہیں، مجھکو اپنے بعد اِس کا اندیشہ نہیں کہ تم سب کے سب شرک میں مبتلا ہوجاؤ گے۔ البتہ خوف یہ ہے کہ تم پر دنیا کی فراوانی ہوگی اور تم اُس میں مبتلا ہوجاؤ گے۔ (زرقانی ج ۸ ص ۲۵۱)

آغازِ مرض:-

ماہِ صفر ۱۱ھ کے اخیر عشرہ میں آپؐ ایک بار شب کو اُٹھے اور اپنے غلام کو جگایا اور فرمایا کہ مجھکو یہ حکم ہوا ہے کہ اہلِ بقیع (مدینہ منورہ کا قبرستان) کے لئے استغفار کروں، قبرستان سے جب آپؐ تشریف لائے تو دفعتًہ مزاج ناساز ہوگیا سر میں درد اور بخار کی شدت پیدا ہوگئی، یہی تکلیف آپ کے لئے مرض الوفات ثابت ہوئی۔ یہ بدھ کا دن تھا جب مرض میں شدت ہوئی تو ازواج مطہرات سے اجازت لے کر دوشنبہ کے دن حجرۂ عائشہؓ میں منتقل ہوگئے اور آئندہ دوشنبہ (پیر کے دن) کو حجرۂ عائشہؓ ہی میں رحلت فرمائی۔

تیرہ یا چودہ دن آپ علیل رہے۔ اثنارِ علالت آپ کو اسودعنبی، مسیلمہ کذاب، طلیحہ اسدی (جنھوں نے انہی ایام میں اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا) کے دعویٔ نبوت کی اطلاع دی گئی۔ آپؐ نے اِن سے جہاد کرنے اور مقابلہ کرنے کی وصیت و تاکید فرمائی اور اسودعنبی کی سرکوبی کے لئے انصار کی ایک جماعت کو روانہ فرمایا۔ آپؐ کی وفات سے ایک دن پہلے اسودعنبی قتل کیا گیا۔

اسی علالت کے زمانے میں آپ نے ایک مرتبہ فاطمہ الزہرارضؓ کو بلایا اور سرگوشی کی حضرت فاطمہؓ روپڑیں اسکے بعد دوبارہ سرگوشی فرمائی تو ہنس پڑیں۔ سیدہ عائشہ صدیقہؓ نے آپؐ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہؓ سے اِس ہنسنے اور رونے کا سبب پوچھا تو کہا کہ پہلے آپؐ نے مجھ سے فرمایا کہ جبرئیل امین مجھ سے ہر سال رمضان میں قرآن کا ایک مرتبہ دور کیا کرتے تھے لیکن اس سال ۲ دومرتبہ دور کیا۔ میرا خیال ہے کہ اسی بیماری میں میری وفات ہوگی۔ یہ سُنکر میں رو پڑی۔ پھر دوبارہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میرے گھر والوں میں تُو سب سے پہلے مجھ سے آملے گی۔ یہ سُن کر میں خوشی سے ہنس پڑی۔ (چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ۶ چھ ماہ بعد سیدہ فاطمۃ الزہرا کا انتقال ہوگیا۔) (فتح الباری ج ۸ ص ۱۱۳)

وفات سے چار یوم پہلے جمعرات کے دن مرض میں شدت ہوگئی تھی کچھ لوگ حجرۂ نبوی میں موجود تھے اِن سے فرمایا کاغذ قلم لے آؤ تاکہ تمہارے لئے ایک وصیت لکھوا دوں اسکے بعد تم گمراہ نہ ہوگے!

یہ سنکر حاضرین میں اختلاف ہوا کسی نے کہا کہ تعمیل کی جائے کوئی کہتا تھا کہ ایسی حالت میں آپؐ کو تکلیف نہ دینا چاہیئے۔ سیدنا عمر فاروقؓ نے کہا آپؐ بیمار ہیں درد کی شدت ہے ایسی حالت میں آپ کو تکلیف نہ دینا چاہیئے۔

کتابُ اللہ ہمارے پاس ہے (جو ہم کو گمراہی سے بچانے کے لئے) کافی ہے۔ بعض حضرات نے کہا آپ نے

کوئی مبہم بات کہی ہے خود آپ ہی سے دریافت کر لو وغیرہ۔

مجلس میں جب اختلاف زیادہ ہوا اور کچھ شور سا پیدا ہوا تو آپؐ نے فرمایا میرے پاس سے اٹھ جاؤ مجھکو میرے حال پر چھوڑ دو میں جس حالت میں ہوں وہ بہتر ہے۔ پھر مجلس برخاست ہوگئی۔ اُسی دن یا دوسرے دن آپؐ نے تین باتوں کی زبانی وصیت فرمائی:۔

(۱) مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دو (یعنی جزیرۂ عرب میں کوئی مشرک رہنے نہ پائے)

(۲) کسی وفد کو رُخصت کرتے وقت ہدیہ وتحفہ دیا کرو جیسا کہ میں دیا کرتا تھا۔

(۳) تیسری بات سے آپؐ نے سکوت فرمایا (یا راوی بھول گیا)

(بخاری ومُسلم)

بخاری ومسلم میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دورانِ علالت یہ فرمایا کہ میرا ارادہ ہو رہا تھا کہ ابوبکر رضؓ اور اُن کے بیٹے عبدالرحمٰن رضؓ کو بلانے کے لئے کسی کو بھیج دوں اور اُن کو وصیّت کر دوں اور اُن کو اپنا نائب بنا دوں تاکہ کہنے والے کچھ کہہ نہ سکیں اور تمنّا کرنے والے کچھ تمنّا نہ کر سکیں لیکن پھر میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور کہا کہ وصیّت کی ضرورت نہیں اللہ بھی انکار کریگا اور اہل ایمان بھی انکار کریں گے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ملتے ہیں:۔

مَعَاذَ اللّٰہِ اَنْ یَّخْتَلِفَ النَّاسُ عَلٰے اَبِیْ بَکْرٍ رضؓ

اللہ کی پناہ کہ لوگ ابوبکر کی خلافت میں اختلاف کریں۔

(فتح الباری ج ۸ صـ۱۰۳)

زرقانی صـ۲۵۷

وفات سے پانچ دن قبل آپؐ کو کچھ افاقہ ہوا۔ حضرت عباس رضؓ اور حضرت علی رضؓ کے سہارے مسجد تشریف لائے۔ ظہر کی نماز پڑھائی،

بعد ازاں خطبہ دیا۔ یہ آپ کا آخری خطبہ تھا۔ درمیانِ خطبہ ارشاد فرمایا:۔

"اے لوگو! اللہ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا ہے کہ خواہ وہ دنیا کی زندگی اختیار کرے یا آخرت کو اختیار کرے لیکن اُس بندے نے آخرت کو اختیار کر لیا۔"

حضرت ابوبکرؓ یہ سنتے ہی رو پڑے۔ کہنے لگے یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔

لوگوں کو تعجب ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بندے کی حکایت نقل فرما رہے ہیں اور ابوبکرؓ اس پر رو رہے ہیں۔

وفاتِ رسول کے بعد لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ بندہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور ابوبکرؓ ہم سب میں زیادہ علم و فہم والے تھے۔

یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جس جس نے مجھ پر احسان کیا ہے میں نے اُس کا بدلہ ادا کر دیا ہے سوائے ابوبکرؓ کے۔ اُن کے احسانات کا بدلہ اور صلہ اللہ ہی قیامت کے دن اُنہیں دے گا۔ اِس کے علاوہ اور بہت سی خوبیاں حضرت ابوبکرؓ کی بیان فرمائی۔

جیش اُسامہؓ کو جلد روانہ کرنے کی تاکید فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا، "اے اللہ میری قبر کو صنم کدہ نہ بنا کہ لوگ عبادت کریں!" جب تک طاقت رہی اُس وقت تک آپؐ مسجد میں تشریف لاتے رہے اور نماز پڑھاتے رہے۔ سب سے آخری نماز جو آپؐ نے پڑھائی وہ جمعرات کی مغرب کی نماز تھی جس کے چار یوم بعد پیر کے دن آپؐ کا انتقال ہو گیا۔ (بخاری)

جب عشاء کا وقت آیا تو دریافت فرمایا کہ کیا لوگ نماز پڑھ چکے ہیں؟ عرض کیا گیا یا رسول اللہ لوگ آپؐ کے منتظر ہیں۔ آپؐ نے کئی بار اُٹھنے کا ارادہ فرمایا مگر مرض کی شدت کی وجہ سے بے ہوش ہو ہو جاتے تھے۔ آخیر میں فرمایا کہ ابوبکرؓ کو میری طرف سے حکم دو کہ وہ نماز پڑھائیں۔

سیدہ عائشہ رضؓ نے فرمایا یا رسول اللہ ابوبکر بہت ہی رقیق القلب ہیں لہذا آپؐ عمر رضؓ کو نماز پڑھانے کے لئے حکم دیں۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم دینے کے بعد سیدہ عائشہ صدیقہ رضؓ نے تین بار یہی جملہ دُھرایا مگر آپؐ نے ہر بار تاکید اور اصرار کے ساتھ فرمایا کہ ابوبکر رضؓ کو حکم دو کہ وہی نماز پڑھائیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نماز پڑھانے لگے۔

اسطرح صدیق اکبر رضؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارک میں جملہ سترہ نمازیں پڑھائیں۔ دوشنبہ (پیر) کے دن جو آپ کی حیاتِ دنیاوی کا آخری دن تھا۔ فجر کی نماز کے وقت اپنے حجرے کا پردہ اُٹھایا دیکھا کہ لوگ صف باندھے اپنی نماز میں مشغول ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر خوشی ومسرت سے آپؐ کا چہرۂ مبارک چمک اُٹھا۔ صدیق اکبر نماز پڑھا رہے تھے ارادہ کیا کہ پیچھے ہٹیں۔ آپؐ نے اشارہ سے فرمایا کہ نماز پوری کرو ضعف وناتوانی کی وجہ سے آپ زیادہ کھڑے نہ ہوسکے حجرہ کا پردہ ڈال دیا اور اندر واپس تشریف لے گئے (بخاری)

صدیق اکبر رضؓ نماز سے فارغ ہوکر حجرۂ مبارک میں تشریف لے گئے اپنی صاحبزادی سیدہ عائشہ رضؓ سے کہا میرا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اب سکون وآرام ہے پہلی جیسی تکلیف وبے چینی نہیں ہے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضؓ نے فرمایا ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔

پھر آپ سے اجازت لیکر اپنی خانگی ضرورت کے لئے مدینہ طیبہ سے تین میل کے فاصلہ پر جہاں صدیق اکبر رضؓ کی دوسری بیوی رہا کرتی تھیں چلے گئے۔

دوسرے لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اب آرام ہوگیا ہے تو مسجد سے سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔

اسکے بعد سیدنا علی رضؓ حجرۂ مبارک سے باہر آئے۔ بعض لوگوں

نے آپ کا مزاج دریافت کیا۔ سیدنا علیؓ نے کہا بحمد للہ آپؐ اچھے ہیں۔ لوگ مطمئن ہو کر منتشر ہو گئے۔ سیدنا عباس رضؓ نے حضرت علی رضؓ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: اے علی رضؓ تین دن بعد تم کسی کے ماتحت ہو جاؤ گے! اللہ کی قسم میرا خیال ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس بیماری میں وفات پائیں گے۔ میں بنی ہاشم کے سرداروں کی موت سے خوب واقف ہوں۔ وفات سے پہلے اُن پر صحت وسکون کے آثار پیدا ہوا کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی حال نظر آرہا ہے بہتر ہے ہم آپؐ سے دریافت کریں کہ آپؐ کے بعد کون خلیفہ ہوگا؟ اگر ہم اہل بیت سے ہوگا تو واضح ہو جائیگا ورنہ آپؐ اس بارے میں کوئی وصیت فرمادیں گے۔

حضرت علی رضؓ نے کہا اس سوال کی مجھ میں ہمت نہیں ہے ممکن ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے متعلق انکار فرما دیں تو پھر ہم ہمیشہ کے لئے اس سے محروم ہو جائیں گے اور اگر ہم میں سے کسی کو نامزد کردیں تو وہ ہر صورت میں نامزد ہو جائے گا۔ اللہ کی قسم میں آپؐ سے اس بارے میں ایک حرف بھی نہ کہوں گا۔ (البدایہ والنہایہ ج۵ ص۲۲۷)

عالمِ نزع

عام صحابہ یہ سمجھ کر کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اب سکون و آرام ہوگیا ہے اپنے اپنے گھر چلے گئے کچھ دیر نہ گزری تھی کہ آپؐ پر نزع کی کیفیت طاری ہوگئی اس وقت آپؐ حجرۂ عائشہ میں تھے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ کے آغوش میں سر رکھ کر لیٹ گئے۔ اتنے میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضہ کے بھائی عبد الرحمن بن ابی بکر رضہ حجرۂ مبارک میں داخل ہوئے ہاتھ میں مسواک تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی طرف دیکھنے لگے، سیدہ عائشہ صدیقہ رضہ نے سمجھا کہ آپؐ مسواک چاہتے ہیں۔ مسواک کو اپنے دانتوں سے نرم کرکے آپؐ کو دی گئی آپؐ نے مسواک فرمائی۔ آپؐ کے قریب پانی کا ایک پیالہ بھی تھا درد کی شدت سے بیقرار ہوکر بار بار پیالہ میں ہاتھ ڈالتے اور اپنے چہرۂ مبارک پر پھیرلیتے اور یہ فرماتے تھے:۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اِنَّ لِلْمَوْتِ سَکَرَاتٌ۔

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں بے شک موت کی بڑی سختیاں ہیں۔

رفیقِ اعلیٰ:۔

پھر آپؐ نے چھت کی طرف نظر فرمائی اور ہاتھ اُٹھاکر فرمایا:۔

اَللّٰھُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی۔

اے اللہ میں تیری رفاقت چاہتا ہوں۔

(سیدہ صدیقہ رضہ فرماتی ہیں کہ میں نے آپؐ سے بارہا سنا تھا کہ کسی پیغمبر کی روح اُس وقت تک قبض نہیں کی جاتی جب تک کہ اُس کا مقام جنت میں اسکو دکھایا نہ جاتا ہو۔ اسی طرح موت کے وقت اُسکو دُنیا و آخرت کا اختیار نہ دیا جاتا ہو کہ جو چاہے زندگی اختیار کرلے)

جب یہ کلمات میں نے سُنے تو اُسی وقت سمجھ گئی کہ اب آپ ہم میں نہیں رہیں گے۔ آپؐ نے عالم آخرت کو اختیار فرمالیا ہے۔ الغرض آپؐ کی زبانِ مبارک سے یہ کلمات نکلے اور روح مبارک عالم بالا کو پرواز کر گئی اور دست مبارک نیچے گر گیا۔ (بخاری)

یہ عظیم سانحہ اور روح فرسا واقعہ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ دوشنبہ (پیر کے دن) دوپہر کے وقت پیش آیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ انتقال کے وقت آپؐ کی عمر شریف تریسٹھ (۶۳) سال کی تھی۔

(فتح الباری ج ۸ ص ۱۱۴)

اس خبر کا منتشر ہونا تھا کہ مدینہ طیبہ کی زمین پر قیامت ٹوٹ پڑی صحابہ کے ہوش اُڑ گئے جس نے سُنا اُسی جگہ ششدر و حیران رہ گیا۔ سیدنا عثمان غنی رضؓ پر ایک عالم سکتہ طاری تھا خاموش دیوار سے پُشت لگائے بیٹھے تھے شدتِ غم سے بات تک نہیں کر رہے تھے، سیدنا علی رضؓ زار و قطار روتے روتے بے ہوش ہو گئے، سیدنا عباس رضؓ بھی حیرانی و پریشانی کا مجسم تھے، سیدنا عمر فاروق رضؓ کی حیرانی عجیب و غریب صورت اختیار کر گئی تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے اور با آواز بلند کہنے لگے کہ منافقین کا گمان ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ آپ اپنے پروردگار سے ملاقات کرنے تشریف لے گئے ہیں جسطرح سیدنا موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر ملاقات کے لئے گئے تھے اور پھر واپس آ گئے۔ اللہ کی قسم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح واپس تشریف لائیں گے اور منافقین کا قلع قمع کریں گے۔ اس وقت کسی کی مجال نہ تھی کہ یہ کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا ہے اور تمام صحابہ سیدنا عمر فاروق رضؓ کے اس اعلان پر دم بخود تھے کہ اچانک سیدنا ابوبکر صدیق رضؓ مسجد نبوی کے دروازے پر پہنچے گھوڑے سے اتر کر غم و الم کی حالت میں حجرۂ مبارک کی طرف بڑھے۔ سیدنا عائشہ صدیقہ رضؓ سے اجازت لیکر اندر داخل ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بستر مبارک پر تھے۔ آپ کی تمام ازواج

آپ کے گرد بیٹھی ہوئی تھیں سب نے پردہ کر لیا۔ صدیق اکبرؓ نے چہرۂ مبارک سے چادر ہٹائی پیشانی پر بوسہ دیا اور رو پڑے۔ (مسند احمد) اور کہا میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں آپ موت وحیات دونوں حالت میں پاکیزہ رہے۔ اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ آپؐ کو دو مرتبہ موت کا مزہ نہیں چکھائے گا جو موت آپؐ کے لئے مقدر تھی وہ پوری ہوچکی۔ یہ کہکر حجرۂ مبارک سے باہر آئے دیکھا کہ سیدنا عمر فاروق رضؓ کا وہی حال ہے۔ صدیق اکبرؓ نے انھیں ٹوکا اور فرمایا اے عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتقال فرما گئے ہیں کیا تم نے اللہ کا یہ قول نہیں سُنا:-

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔ (زمر آیت ۳۰)

اے نبی آپؐ کو بھی مرنا ہے اور یہ لوگ بھی مرنے والے ہیں۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ۔ (انبیاء آیت ۳۴)

اور ہم نے آپؐ سے پہلے کسی بھی بشر کو ابدی حیات نہیں دی ہے۔

پھر آپؐ منبر نبوی کی جانب بڑھے اور لوگوں کو جمع کیا اور حمد وثنا کے بعد یہ خُطبہ دیا:-

اُے لوگو! جو کوئی تم میں سے اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا اُسکو معلوم ہونا چاہئیے کہ اللہ زندہ ہے دائم و قائم ہے اس پر موت نہیں آتی۔ اور اگر بالفرض کوئی شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا تو اُس کو جان لینا چاہئیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں۔ اور محمد تو اللہ کے رسول ہی ہیں اُن سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ لہذا اگر آپ کا انتقال ہوجائے یا آپ شہید ہوجائیں تو کیا تم دین اسلام سے پھر جاؤ گے؟

اور جو شخص دین اسلام سے پھر گیا تو وہ اللہ کو ذرّہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچائے گا اور اللہ عنقریب شکر گزاروں کو بھرپور بدلہ دے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مخاطب بناکر یہ فرمایا ہے:-

"اے نبی بیشک آپ وفات پانے والے ہیں اور یہ لوگ بھی مرنے والے ہیں اور ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ صرف اللہ ذُوالجلال کی ذات باقی رہنے والی ہے۔"

• اللہ نے اپنے نبی کی عمر دراز کی یہاں تک کہ آپؐ نے اللہ کے دین کو قائم کر دیا اور اُس کے حکم کو غالب کر دیا اور اللہ کا پورا پیغام پہنچادیا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ پھر اللہ نے آپؐ کو اپنے پاس بُلا لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو ایک سیدھے اور واضح راستے پر چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ (زرقانی ج ۸ ص ۲۸۰)

صدیق اکبرؓ کا یہ خطبہ اور آیات الٰہی کے اس بیان نے یکلخت حیرت وسکوت کے عالم کو دور کر دیا۔ سب کو یقین ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ صحابہ کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سے پہلے نہ یہ آیات پڑھی گئیں اور نہ سُنی گئیں تھیں۔ اب ہر شخص انہی آیات کی تلاوت کر رہا تھا۔ سیدنا عمر فاروق رضؓ فرماتے ہیں کہ میری حالت بھی یہی ہوئی گویا میں نے اِن آیات کو آج ہی پڑھا ہے۔ پھر میں نے اپنے خیال سے رجوع کر لیا۔ (تفسیر قرطبی ج ۴ ص ۲۲۳)

غُسل اور تجہیز و تکفین :۔

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب غسل دینے کا ارادہ کیا گیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ آپؐ کے کپڑے اُتارے جائیں یا اُنہی کپڑوں میں غسل دیا جائے؟ ابھی کوئی تصفیہ ہونے نہ پایا تھا کہ موجود صحابہ پر اچانک ایک غنودگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور غیبی طور پر ایک گوشے سے آواز آئی کہ اللہ کے رسول کو برہنہ نہ کرو کپڑوں ہی میں غسل دو، چنانچہ پیراہن مبارک ہی میں غسل دیا گیا اور بعد میں اُتار دیا گیا۔ سیدنا علی رضؓ نے آپ کو غسل دینے کا فریضہ انجام دیا۔ سیدنا عباس رضؓ اور آپ کے دونوں

صاحبزادے فضل بن عباس رضؓ، قثم بن عباس رضؓ آپؐ کو کروٹیں بدلتے تھے۔ حضرت اُسامہ بن زید رضؓ اور حضرت شقران رضؓ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام) نے پانی ڈالنے کا فریضہ انجام دیا۔ (البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۲۶۰)

غسل کے بعد آپ کو تین کپڑوں میں کفن دیا گیا جس میں نہ قمیص تھی نہ عمامہ تھا۔

شمائل ترمذی میں روایت ہے کہ لوگوں نے صدیق اکبر رضؓ سے دریافت کیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ پڑھی جائے؟ آپ نے کہا ہاں صلوٰۃ جنازہ پڑھو! لوگوں نے پوچھا کس طرح؟ صدیق اکبرؓ نے کہا لوگوں کا ایک گروہ حجرہ میں داخل ہو اور تکبیر کہے پھر درود و دُعا پڑھکر واپس آجائے اس طرح سب لوگ صلوٰۃ جنازہ ادا کریں۔

ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے روایت ہے کہ منگل کے دن جب آپ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے آپ کا جنازہ آپکی قبر شریف کے کنارے رکھ دیا گیا ایک ایک جماعت حجرۂ شریف میں داخل ہوتی اور نماز پڑھکر باہر آجاتی۔ کوئی کسی کی امامت نہیں کرتا تھا سب لوگ بغیر امام کے علیحدہ علیحدہ نماز پڑھکر حجرہ سے واپس لوٹتے تھے۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ صحیح یہی ہے کہ آپؐ پر نماز جنازہ پڑھی گئی۔ امام شافعی رحؒ نے "کتابُ الاُمّ" میں نہایت صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ آپؐ پر نماز جنازہ پڑھی گئی۔

مرض الوفات میں آپؐ نے ایک مرتبہ اپنے اہلِ خانہ سے فرمایا تھا کہ جب میری تجہیز و تکفین ہو جائے تو تھوڑی دیر کے لئے سب لوگ حجرہ سے باہر ہو جانا۔ سب سے پہلے مجھ پر جبرئیل امین نماز پڑھیں گے پھر میکائیل پھر اسرافیل اسکے بعد ملک الموت اور بعد میں دیگر فرشتے نماز پڑھیں گے۔ اس کے بعد تم میں کی ایک ایک جماعت حجرے میں داخل ہو اور مجھ پر صلوٰۃ و سلام پڑھے۔

(مسند بزار، مستدرک حاکم)

تدفینِ نبیؐ :-

تجہیز و تکفین کے بعد پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ آپؐ کو کہاں سپردِ خاک کیا جائے ؟ کیونکہ یہ ایسے مسائل تھے کہ کسی کو دریافت کرنے کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ لیکن صدیق اکبرؓ کے ہاں اِن باتوں کا علم موجود تھا۔ آپؓ نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ پیغمبر اُسی جگہ سپُرد خاک ہوتے ہیں جہاں اُن کی روح قبض کی جاتی ہے۔

(ترمذی، ابن ماجہ)

چنانچہ اُسی جگہ آپ کا بستر اُٹھوا کر قبر تیار کرنا تجویز کیا گیا لیکن پھر ایک مسئلہ اور پیش آیا کہ کس قسم کی قبر تیار کرنی چاہیئے ؟ کیونکہ مدینہ طیّبہ میں عام طور پر "لحد" (بغلی قبر) کا رواج تھا اور مکّہ مکرمہ میں "شق" (صندوقی قبر) کا رواج تھا۔ مہاجرین نے شقؔ والی قبر کا مشورہ دیا اور انصار مدینہ نے لحد کا مشورہ دیا۔ صحابہ کرام میں حضرت ابو عبیدہؓ شق والی قبر کھودنے کے ماہر تھے اور حضرت ابوطلحہؓ لحدؔ کھودنے کے ماہر تھے۔ آخر طے یہ پایا کہ دونوں کے پاس آدمی روانہ کیا جائے۔ دونوں میں جو بھی پہلے آجائے وہی اپنا کام کرے گا۔ چنانچہ حضرت ابوطلحہؓ پہلے آ پہنچے اور اُنھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لحدؔ تیار کی۔

(زرقانی ج ۸ ص ۲۸۹ طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۵۹)

اور قبر شریف کو کوہان کی شکل پر بنا دیا گیا۔ (بخاری)

جب قبر شریف تیار ہوگئی تو ایک صحابیؓ نے شہادت دی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا تھا

اَللَّحَدُ لَنَا وَالشَّقُّ لِغَيْرِنَا (الحدیث)

(لحد ہم اہل مدینہ کا دستور ہے اور شق دوسروں کا طریقہ ہے)

دوشنبہ (پیر کا دن) دوپہر کے وقت آپ کی وفات ہوئی تھی۔ سہ شنبہ (منگل کے دن) آپؐ کی تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی۔ چہار شنبہ (بدھ کے دن) شب میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ یہی جمہور علمار کا قول ہے۔ بعض علماؔ

کہتے ہیں کہ سہ شنبہ (منگل کے دن) ہی تدفین ہوئی۔ واللہ اعلم۔

سیدنا عباس رضؓ اور سیدنا علی رضؓ اور حضرت فضل بن عباس رضؓ اور حضرت قثم بن عباس رضؓ نے جسدِ اطہر کو قبر شریف میں اُتارا، سپردِ خاک کرنے کے بعد پائینتی سے مٹی بھرنا شروع کیا گیا جب قبر شریف پُر ہوگئی تو اُسکو کوہان کی شکل دی گئی اور تُربتِ پاک پر پانی چھڑکا گیا۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفینِ مبارک سے فارغ ہوکر ایک روایت کے مطابق تیس ۳۰ ہزار سے زائد صحابہ کرام آنسو بہاتے اپنے اپنے گھر واپس ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

يَا خَيْرَ مَنْ دُفِنَتْ بِالْقَاعِ اَعْظُمُهُ
فَطَابَ مِنْ طِيبِهِنَّ الْقَاعُ وَالْاَكَمُ
نَفْسِي الْفِدَاءُ لِقَبْرٍ اَنْتَ سَاكِنُهُ
فِيهِ الْعَفَافُ وَفِيهِ الْجُودُ وَالْكَرَمُ

وصلی اللہ تعالٰی علٰی خاتم النبیین ورحمۃ للعالمین وآلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

لیلۃ القدر،
۲۹ رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ
قریب مقام ابراہیم
مسجد الحرام، مکۃ المکرمہ۔

رحمتِ دو عالم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پر
معروف و مستند کتاب کا اردو ترجمہ

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم (کامل)

ابنِ ہشام

تالیف

محمد بن اسحاق بن یسار — ابو محمد عبدالملک بن ہشام

م ۱۵۱ھ — م ۲۱۳ھ

اردو ترجمہ

سید یسین علی حسنی نظامی دہلوی

تہذیب جدید

سعود اشرف عثمانی

ناشر: ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور ۲

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ

سیرتِ ائمہ اربعہ

اسلامی فقہ کی ابتدائی تاریخ و ترویج کی تفصیل، ائمہ اربعہ، امام ابُوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد حنبل رحمہم اللہ کے حالاتِ زندگی اور ان کے دینی کاموں کا مُستند تذکرہ

از: حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری

ناشر: ادارہ اسلامیات
۱۹۰- انارکلی لاہور (پاکستان)

ترجمان السنّہ

مصوّر

عربی - اردو

دورِ حاضر کی ضرورتوں کے مطابق جدید عنوانات اور قدیم مباحث کے ہمراہ
احادیثِ طیبّہ کا جامع و مستند عظیم الشّان مجموعہ

تالیف
زبدۃ المحدّثین حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی قدس سرّہٗ
استاذ الحدیث دارالعلوم دیوبند و رفیق ندوۃ المصنّفین دہلی

ادارۂ اسلامیات
انارکلی ۰ لاہور ۲

مسائل السلوک

من

کلام ملک الملوک

یعنی

مسائلِ تصوّف قرآن کی روشنی میں

تحریر دلپذیر

جامع شریعت و طریقت

حکیم الامّۃ، مجدد الملّۃ حضرۃ مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات: جناب محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہم

★

ناشر

ادارۂ اسلامیات ۱۹۰-انارکلی لاہور ۲